امیر تیمور گورگاں
حصّہ اوّل
الماس
ایم۔ اے

پیش لفظ

جس طرح مولوی نذیر احمد نے مراۃ العروس لکھ کر اردو ناول نویسی کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی نے اسلامی تاریخی ناول کا آغاز کیا۔ تاریخ اور ناول اگرچہ دو متضاد نثری اصنافِ سخن ہیں لیکن شرر لکھنوی نے ان متضاد اصناف اور اسلوب کو اس انداز سے ملایا کہ یہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج کا ایک نادر نمونہ بن گیا۔ تاریخی ناول کے بارے میں یہ جواز درست ہے کہ شرر لکھنوی نے اسکاٹ جیسے مغربی متعصب ناول نگاروں کے جواب آں غزل کے طور پر یہ قدم اٹھایا تھا۔ دراصل یورپ اور ایشیا کی صلیبی جنگوں نے مغربی ناول نگاروں کو اپنے صلیبی سورماؤں کا قصیدہ خواں بنا دیا تھا۔

صلیبی جنگ ان مذہبی جنگوں کو کہا جاتا ہے جن میں ایک طرف تثلیث پرست (عیسائی) اور دوسری طرف ایک خدائے واحد کے پرستار مسلمان میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے تھے۔ ہم اسے جہاد کا نام بھی دیتے ہیں۔ صلیبی جنگوں میں تین صلیبی جنگیں بہت مشہور ہوئیں۔ جہاں تک جہاد کا تعلق ہے تو یہ چونکہ مسلمانوں کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ اس لیے یہ آغازِ اسلام سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

جہاد مختلف صورتوں میں، مختلف انداز میں کیے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا جہاد تو جان کا جہاد ہے۔ جب مسلمان اسلام کی سربلندی یا اسلامی اقدار کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں سر سے کفن باندھ کر نکلتا ہے۔ جہاد دراصل برائیوں کے خلاف ایک جنگ ہے جسے ہر مسلمان ہر وقت اختیار کیے رہتا ہے۔ ہم اگر برائیوں کے خلاف مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں تو اسے قلم کا جہاد کہا جاتا ہے۔ اگر برائیوں کا انسداد لیکچروں اور بیانات و تقریروں سے کرتے ہیں تو اسے زبان کا جہاد کہتے ہیں اور اگر ہم راہِ حق میں اور عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی جائز کمائی سے خرچ کرتے ہیں تو اسے مال کے جہاد کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں نے وہ تمام جنگیں جو اشاعتِ اسلام یا حفاظتِ اسلام کے لیے غیر مسلموں سے لڑیں ان سب کو جہاد کہا جاتا ہے۔ ہمارے علمائے کرام نے بغیر تلوار کے بھی اشاعتِ اسلام کا بہت بڑا کام کیا ہے اور دنیا کے وہ حصے جہاں مجاہدینِ اسلام نہ پہنچ سکے وہاں اسلام کو پھیلانے کا کام ہمارے عالموں اور مسلمان ملاحوں اور تاجروں نے کیا ہے۔

مولوی شرر لکھنوی نے اسلامی ناول دراصل متعصب مغربی ناول نگاروں کے جواب میں لکھے تھے۔ ان مغربی ناول نگاروں نے، جن میں بہت سے مورخ بھی شامل ہیں، اسلام، اسلامی جنگوں اور مسلمان بادشاہوں کے خلاف بڑا زہر اگلا ہے اور ایسی غلط سلط باتیں لکھی ہیں جنہوں نے اسلام اور مجاہدین کو سخت بدنام کیا ہے۔ مولوی شرر لکھنوی کے سامنے جب ایسے ناول پہنچے جن میں صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والے مسلمان سرداروں اور بادشاہوں کو بزدل، عیاش، مکار اور ظالم کے ناموں سے پکارا گیا تھا تو اُن کا خون کھول اٹھا۔ چنانچہ انہوں نے عیسائیوں کے خلاف منظم بنا کر قلم کا جہاد شروع کیا اور یہ جہاد آج تک جاری ہے۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کے اسلامی تاریخی ناولوں کی سخت مخالفت کی گئی۔ اس وقت برصغیر پاک و ہند پر انگریز قابض تھے۔ وہ مسلمانوں کے پہلے ہی مخالف تھے کیونکہ انگریزوں سے پہلے برصغیر پاک و ہند پر مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک حکومت کی تھی اور انگریزوں نے مسلمانوں ہی سے یہ حکومت دھوکہ بازی، مکاری، مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر اور نفاق پیدا کر کے حاصل کی تھی۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت تو نکل گئی تھی مگر انہوں نے انگریزوں کو کبھی معاف نہیں کیا اور انہیں جب بھی موقع ملا وہ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان مسلمانوں نے برصغیر کی دوسری قوم ہندو کے ساتھ مل کر اور کبھی تنہا انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور آزادی کے لیے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔

انگریزوں کے خلاف جن لوگوں نے کھل کر جنگ کی ان میں جنگِ پلاسی کے سراج الدولہ، دکھن ہند کے ٹیپو سلطان، سید احمد اور اسمٰعیل شہید اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (جسے انگریز بغاوت کہتے ہیں) کے ہزاروں شہداء شامل ہیں جنہوں نے انگریزوں کو برصغیر سے نکالنے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

پس مسلمانوں نے عیسائیوں یا دوسری قوموں کے خلاف جو مذہبی جنگیں لڑیں وہ سب ہمارے اسلامی تاریخی ناولوں کے موضوعات ہیں جن پر ہمارے بزرگوں نے قلم اٹھایا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی جو ایک مورخ بھی ہیں اور جنہوں نے اسلامی تاریخی ناولوں کے علاوہ بہت رومانی اور معاشرتی ناول بھی تحریر کیے ہیں، ان کے بعد اسلامی تاریخی ناولوں کا کوئی باقاعدہ سلسلہ دکھائی نہیں دیتا۔ برصغیر کے مختلف شہروں سے تاریخی یا نیم تاریخی ناول لکھے گئے۔ پھر ہمیں بعض ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جنہوں نے باقاعدگی سے اسلامی ناول تحریر کیے۔

ان بزرگوں میں نسیم حجازی، ایم اسلم، رشید اختر ندوی، رئیس احمد جعفری اور صادق احمد صدیقی سردھنوی نمایاں نظر آتے ہیں۔ صادق احمد صدیقی سردھنوی اس میں سرِفہرست ہیں۔ انہوں نے تاریخ کو اپنا خاص موضوع بنایا اور بے شمار ناول تحریر کیے۔ اب تاریخی ناول لکھنے والوں کا نیا دور آتا ہے۔ اس دور میں تاریخی ناول کے ساتھ ساتھ ڈائجسٹوں نے ایک زبردست مقبولیت حاصل کی اور وہ پورے اردو ادب پر چھا گئے مگر اردو ڈائجسٹوں نے بھی اسلامی تاریخ کو اہمیت دی اور اسے ڈائجسٹوں کا باقاعدہ حصہ بنا دیا۔ ان ڈائجسٹوں میں عام طور پر تاریخی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔

ڈائجسٹوں میں الیاس سیتاپوری، زیب ملیح آبادی ایم اے، قمر اجنالوی، اسلم راہی ایم۔ اے، محترمہ منورہ نوری اور الماس ایم۔ اے شامل ہیں۔ یہ تمام لکھنے والے تعلیم یافتہ اور اپنے اپنے اسلوب کے بادشاہ ہیں۔

زیرِ نظر ناول امیر تیمور گورگاں ایک خوبصورت تاریخی ناول ہے جس میں صاحبقراں امیر تیمور گورگاں کی پیدائش سے لے کر انتقال تک کے مکمل حالات اور اس عظیم فرمانروا کی جدوجہدِ آزادی اور فتوحات کا ذکر بڑے رومانوی انداز میں موجود ہے۔ یہ ایک تاریخ بھی ہے اور ایک ناول بھی۔ اس ناول میں خود امیر تیمور کی داستانِ عشق کے علاوہ اور بہت سی رومانی کہانیاں موجود ہیں۔

ناول کی زبان بے حد شستہ اور بامحاورہ ہے۔ الماس ایم۔ اے کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے اس لیے کہ ان کا تعلق لکھنؤ کے مردم خیز خطے سے ہے۔

امیر تیمور گورگاں کے بارے میں یہ اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ یہ ناول نئے افق ڈائجسٹ گروپ آف پبلی کیشنز کے مالک مشتاق احمد قریشی اپنے ڈائجسٹ "نیا رخ" میں قسط وار شائع کرتے رہے ہیں۔

محمد علی قریشی
مکتبہ القریش
لاہور

شہر سبز کی شہزادی

○

تیز رفتار سوار، گھوڑا روکتے روکتے الجائی خاتون سے دس گز آگے نکل گیا۔ پھر اس نے گھوڑا موڑا، الجائی کے پاس آیا اور اسے ادب سے سلام کیا۔

الجائی خاتون نے پوچھا:

"اس طرح بے تحاشا کیوں بھاگ رہے تھے؟"

"مغربی سرحد سے لٹیرے گھس آئے ہیں۔" سوار نے سانس پر بمشکل قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"خدا خیر کرے۔" الجائی خاتون گھبرا گئی۔ پوچھا: "لٹیروں کی تعداد کتنی ہو گی؟"

"سو کے اوپر۔" سوار جواب دے کر آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گیا۔

الجائی ایک لمحہ رک کر بولی:

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"سرائے سالی۔ امیر کو خبر کرنے۔" سوار جانے کے لیے بے چین تھا۔

الجائی کو اس کی بے چینی پر غصہ آ گیا۔ سختی سے بولی:

"تم سرائے سالی جاؤ گے۔ امیر کو خبر دو گے۔ پھر کمک لے کر واپس آؤ گے۔ اس وقت تک وہ حملہ آور لوٹ مار اور قتل و غارت کر کے واپس بھی جا چکے ہوں گے۔"

بات سوار کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے تھکے لہجہ میں کہا:

"پھر آپ ہی بتایئے۔ ہمارے پاس نہ ہتھیار ہیں نہ گھوڑے۔ حملہ آور خیموں کو آگ ل

ہیں اور انہوں نے ہمارے گھوڑے پکڑ لیے ہیں۔"

الجائی کچھ سوچتے ہوئے بولی:

"اچھا تم جاؤ لیکن جلد واپس آنا۔"

امیر سمرقند قزغن کی پوتی الجائی خاتون شکار کے لیے آئی تھی۔ اس کے ساتھ پانچ سہ

پانچ کنیزیں اور پانچ ہی غلام تھے۔ الجائی اور اس کی سہیلیاں ترکش و تلوار سے مسلح تھیں۔ غلام

سردار کے پاس نیمچہ (چھوٹی تلوار) تھا۔ بقیہ غلاموں اور کنیزوں کے پاس صرف خنجر تھے۔

چودہویں صدی عیسوی کے چوتھے عشرے میں جب یورپ کی عورتیں، قالین بافی اور کشیدہ کا

میں اپنا وقت گزارتی تھیں۔ اس وقت تاتاری عورتیں، جنگ آزمائی اور شہسواروں کے دوش بدو

میدانِ جنگ میں حصہ لیتی تھیں۔ وہ سپاہی بچوں کی پرورش بھی کرتیں اور مردوں کے تمام کاموں میں

شریک رہتیں۔ گھر گرہستی کے بقیہ تمام کام عمر رسیدہ عورتوں کے سپرد تھے۔ امن کے زمانہ میں تا

عورتوں کا محبوب مشغلہ شکار کھیلنا تھا۔

تیز رفتار سوار دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ الجائی کی نظریں سوار پر لگی تھیں جب

اس کے گھوڑے کی ٹاپوں سے اٹھنے والی گرد ہوا میں تحلیل ہو گئی تو اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کو دیکھ

ایک طرحدار کنیز گھوڑا بڑھا کر الجائی کے پاس آئی اور بولی:

"ہمیں اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کرنا چاہیے۔ یہ کتنی بزدلی ہے کہ انھیں ہمارے سامنے لو

جائے۔"

الجائی خاتون، کنیزوں اور غلاموں کو دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے فق تھے۔ سوائے سردار غلا

سردار غلام کی آنکھوں سے شجاعت کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ بار بار نیمچہ کی طرف بڑھ رہا تھ

الجائی خاتون نے پژمردہ چہروں سے نظریں پھیرتے ہوئے کہا:

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ہمارے پاس صرف چھ تلواریں اور ایک نیمچہ ہے اور دشمن پوری طر

دوسری سہیلی تلوار کھینچ کر بولی: "لیکن ہماری غیرت نیام کے اندر کیسے رہ سکتی ہے!"

الجائی نے متانت سے کہا:

"لیکن غیرت اندھی تو نہیں ہوتی۔ سات تلواریں، ایک سَو سے ٹکرائیں گی تو انجام کیا ہو گا؟"

سہیلی نے جھلا کر باہر نکالی ہوئی تلوار، نیام میں ڈالی اور غصہ سے بولی:

"الجائی! آج تم پہلی بار ہمیں بزدلی کا سبق پڑھا رہی ہو۔"

الجائی خاتون کا بدن دہک اٹھا۔ اسے چنگاریاں سی لگنے لگیں۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ بولی:

"نہیں نہیں۔ تاتاری عورت کو بزدلی کا سبق نہیں پڑھایا جا سکتا۔"

الجائی خاتون نے تلوار بلند کر لی۔ اس نے گھوڑے کا منہ مغربی سرحد کی طرف موڑا۔ چھ اور تلواریں

اُس کی تقلید میں باہر نکل آئیں۔ غلاموں اور کنیزوں کے بے رنگ چہروں پر غیرت کے خون کی سرخی دوڑ گئی

انھوں نے کمر میں اڑسے ہوئے خنجر کھینچ کر ہاتھوں میں لے لیے۔

الجائی خاتون نے پانچ سہیلیوں اور دو کنیزوں کو اپنے ساتھ لے کر ایک ٹولی بنائی۔ باقی غلاموں اور

کنیزوں پر مشتمل دوسری ٹولی ترتیب دی۔

الجائی نے غلام سردار کو سمجھایا:

"ہمارے پاس تلواریں ہیں۔ حملہ ہم کریں گے۔ تم پشت پر رہ کر ہماری حفاظت کرنا۔"

غلام نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

اسی وقت شمال مشرق میں گرد اڑتی دکھائی دی۔ سب کی نظریں اُدھر اٹھ گئیں۔ امید و بیم سے

بھری نظریں۔ وسوسے اور امیدیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

ایک غلام چلّایا: "سرائے سالی سے کمک آ گئی۔"

"الحمدُ للہ۔" الجائی خاتون کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

گرد کا سینہ چاک ہوا۔ وہ کمک نہ تھی۔ گرد کی چادر سے صرف دو سوار نمودار ہوئے۔ دیکھنے والوں

کی امیدیں ڈوبنے لگیں۔

دونوں سوار بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ الجائی خاتون نے سب کو خبردار کیا۔ "کیا پتہ وہ بھی

دشمن ہوں۔"

سوار، الجائی خاتون کے پاس آ کر رک گئے۔ ان میں ایک دبلا پتلا سا نوجوان اور دوسرا نو عمر لڑکا تھا۔

نوجوان کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن وضع قطع سے طرحدار معلوم ہوتا تھا۔ نرم چمڑے کے گھٹنوں تک کے جوتے
نمدے کی سفید نوکدار ٹوپی۔ اعلیٰ قسم کے باریک چمڑے کی آدھی آستین کی جاکٹ۔ کمر میں بھاری چمڑے
کا پٹکا جس پر چاندی کا کام تھا۔ اور فیروزے سے ٹکے ہوئے تھے۔ نوعمر لڑکے کا لباس معمولی تھا۔ گھریلو ملازموں
جیسا۔

الجائی خاتون، اجنبی لباس اور اجنبی صورتوں کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ الجائی نے ایک
سہیلی کو اشارہ کیا۔

سہیلی نے نووارد جوان سے پوچھا:

"تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

جوان بڑی لاپرواہی سے بولا:

"دریائے آمو کے شمال میں شہر سبز میرا وطن ہے۔ ترکان گورگانی قبیلہ برلاس کا نام لیوا ہوں میرا
نام تیمور اور یہ لڑکا میرا خانہ زاد عبداللہ ہے۔"

الجائی خاتون کی دلچسپی اور حیرت بڑھ گئی۔ تیمور نے ایک سوال کے جواب میں تمام ضروری باتیں بیان
کر دیں تاکہ دوسرے سوال کی گنجائش ہی نہ رہ جائے۔ یہ اس کی ذہانت کی دلیل تھی۔ الجائی خاتون کا دل
آپ ہی آپ اس کی طرف کھنچنے لگا۔

الجائی نے خود سوال کیا:

"اے نوجوان! تم نے سب کچھ بتانے کے باوجود یہ نہیں بتایا کہ ادھر کس مقصد سے آئے ہو اور کہاں
جا رہے ہو؟"

"میرائے سالی کے امیر قزغن نے مجھے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔" اب تیمور کے لہجہ میں لاپرواہی
کے ساتھ اکتاہٹ بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے مزید سوالات سے بچنے کے لیے اپنا گھوڑا بڑھایا اور بولا:

"میں قبیلہ برلاس کے سردار ترغائی کا بیٹا ہوں۔ اگر سوالات ختم ہو گئے ہوں تو میں آگے بڑھوں؟"

الجائی خاتون کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ بولی:

"تیمور! تم دربار قزغن میں جا رہے ہو اور میں امیر قزغن کی پوتی الجائی خاتون ہوں۔"

تیمور نے فوراً گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں اور پہلی بار مشتاق نظریں الجائی کی طرف اٹھیں۔ اس نے

دیکھا ایک پندرہ سالہ سرو قامت، سیمیں بدن ماہ پارہ اسے شرر بار نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

تیمور کی عمر سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ شمشیر زنی اور تیراندازی اس کے محبوب مشغلے تھے لیکن اچھی
صورتیں اسے بھی اچھی لگتی تھیں۔ پھر الجائی خاتون تو چاند کا ٹکڑا اور حسن کا ترشا ہوا پیکر تھی۔

تیمور رشک آلود نظروں سے الجائی خاتون کو گھورتا رہا۔ پھر "ماشاء اللہ" اس کی زبان سے آپ ہی آپ
نکل گیا۔ الجائی کی نظریں تیمور کی نظروں سے متصادم تھیں۔ تیمور کی آواز پر اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

تیمور کو فوراً امیر قزغن کا خیال آ گیا۔ اس نے اپنا گھوڑا تھوڑا سا پیچھے ہٹایا۔ پھر ادب سے بولا:

"میں شہزادی کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔" پھر ذرا ٹھہر کر کہا: "میں نووارد ہوں۔ کیا شہزادی
مجھے میرائے سالی جانے کا سیدھا راستہ بتائیں گی؟"

الجائی اور زیادہ شرماتے ہوئے بولی:

"تیمور! تم میرائے سالی نہیں جاؤ گے۔"

"جی!" تیمور الجائی خاتون کو حیران نظروں سے دیکھنے لگا۔

شہزادی نے کہا:

"ہاں تیمور۔ ہماری مغربی سرحد میں کچھ ایرانی گھس آئے ہیں۔ میں اور میرے یہ تمام ساتھی ادھر
ہی جا رہے تھے۔ اچھا ہوا کہ تمہارے جیسا ایک بہادر ہم میں اور شامل ہو گیا۔"

تیمور کے لیے لڑائی اور جنگ کے الفاظ اتنے ہی مرغوب تھے جتنے بچوں کے لیے کھلونوں کے
نام ہوتے ہیں۔ اس نے تمکنت سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا:

"اگر تیمور کا ترکش و تلوار، شہزادی کے کچھ کام آ سکے تو یہ میری عزت افزائی ہو گی۔"

"اب ہمیں دیر نہیں کرنا چاہیے۔" شہزادی نے کہا اور اس کا گھوڑا مغرب کی طرف بھاگنے لگا۔ الجائی
کا گھوڑا مشکی تھا لیکن تیمور کو سفید رنگ زیادہ پسند تھا۔ اس کی ران کے نیچے عربی سفید مرکب تھا۔ تیمور کا
گھوڑا بار بار آگے نکلنے کی کوشش کرتا لیکن تیمور اسے روکتا۔ اسے شہزادی کے حفظِ مراتب کا خیال تھا۔

ایک گھنٹے بعد انہیں سامنے کی طرف شعلے اٹھتے ہوئے دکھائی دیے۔ شہزادی الجائی خاتون نے گھوڑا
روک لیا۔ باقی لوگ بھی رک گئے۔

الجائی نے تیمور سے کہا: "ہم نے آٹھ آٹھ کی دو ٹولیاں بنائی ہیں۔ پہلی ٹولی کے ساتھ میں حملہ کر دوں گی

تم دوسری ٹولی کے ساتھ رہنا اور پشت سے میری حفاظت کرنا۔"

تیمور کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا لیکن آنکھوں کی پتلیاں سرخ ہو کر پھڑک رہی تھیں۔ اس نے بائیں طرف کمان اور دائیں جانب ترکش پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"شہزادی میری گستاخی معاف کریں۔ حملہ میں خود کروں گا۔ شہزادی چاہیں تو پشت پر رہ کر حفاظت کر سکتی ہیں۔"

الجائی خاتون تیمور کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ پکار کر کہے کہ اسے تیمور۔ تیرا سپاٹ چہرہ تو کچھ نہیں کہتا لیکن تیری بدلتی ہوئی آنکھیں، اندر چھپی ہوئی شجاعت کی چغلی کھا رہی ہیں۔

حملہ آور جھونپڑیاں جلا چکے تھے۔ لوٹ کا مال گاڑیوں پر بار کیا ہوا تھا اور مویشیوں کے گلّے کے گلّے کھلے میدان میں جمع تھے۔ حملہ آور بڑے اطمینان سے واپسی کی تیاریاں کر رہے تھے کہ انہوں نے مشرق سے گرد کا ایک بگولہ اٹھتا دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس بگولے سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ حملہ آور خطرہ محسوس کرتے ہی دو حصوں میں بٹ گئے۔ پچاس سوار مویشیوں کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور باقی پچاس مقابلے کے لیے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

تیمور نے چھوٹی ڈھال بائیں بازو کے ذرا اوپر کس لی تھی۔ اس کے بائیں ہی ہاتھ میں کمان تھی اور دایاں ہاتھ بجلی کی طرح ترکش سے تیر نکالتا اور ترکش میں جوڑ کے اسے چھوڑ رہا تھا۔ ترکش سے ایک تیر نکلنے کے بعد دوسرا تیر اس طرح ترکش میں جڑ جاتا جیسے وہ ترکش سے خود اچھل کر وہاں تک پہنچ گیا ہے۔ تیمور اور تاتاریوں کے حملے کا یہی طریقہ تھا۔ وہ پہلے دور سے بڑی تیزی کے ساتھ تیر برساتے پھر قریب پہنچ کر تلوار سے کام لیتے۔

تیمور کے پیچھے الجائی خاتون اپنے سواروں کے ساتھ گھوڑا بڑھائے چلی آ رہی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والے گرد کے بگولے اس طرح بلند ہو رہے تھے کہ سامنے کھڑے حملہ آوروں کے لیے یہ مشکل ہو رہا تھا کہ وہ آنے والوں کی تعداد کا صحیح اندازہ کر سکیں۔

تیمور نے قریب پہنچتے ہی کمان پشت پر ڈال لی اور تلوار کھینچ کر پچاس کی اس ٹکڑی پر حملہ آور ہوا جو مقابلے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ حالانکہ بظاہر مویشیوں اور سامان کے محافظوں پر حملہ کرنا زیادہ آسان اور مفید معلوم ہوتا تھا۔ تیمور کے حملہ کرتے ہی شہزادی الجائی خاتون بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔

یمور کا خانہ زاد غلام عبداللہ دیکھنے میں ایک نو عمر لڑکا تھا لیکن جب وہ شمشیر کھینچ کر حملہ آوروں پر ٹوٹا تو یکھنے والے عش عش کر اٹھے۔ وہ حملہ کرنے کے ساتھ ساتھ تیمور کی پشت کی طرف سے حفاظت بھی کر ہا تھا۔

لڑائی نے زیادہ طول نہ کھینچا اور فیصلہ منٹوں میں ہو گیا۔ تیمور کی شمشیر آبدار سے کئی حملہ آور جہنم رسید ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ان میں سراسیمگی اور گھبراہٹ پیدا ہوئی اور ان کے قدم اکھڑ گئے۔ ان کے وہ پچاس دمی جو مویشیوں کے پاس تماشہ دیکھ رہے تھے انہیں چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں کی مدد کو پہنچتے لیکن وہ انہیں بھاگتا دیکھ کر مال متاع چھوڑ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ تیمور اور الجائی خاتون نے ان کا سرحد پار تک تعاقب کیا۔

واپسی پر الجائی نے تیمور سے پوچھا:

"تیمور۔ تم نے ان حملہ آوروں کو پہلے نشانہ کیوں نہ بنایا جو مویشیوں کی حفاظت کر رہے تھے ان کی دوہری ذمہ داری تھی۔ انہیں ہراساں کرنا زیادہ آسان تھا۔"

تیمور نے اپنی ہلکی خود جس کی زنجیریں اس کی گردن اور شانوں پر لٹک رہی تھیں سر سے اتاری اور جواب دیا:

"شہزادی! مجھے علم تھا کہ اگر میں نے مویشیوں کے محافظوں کا رخ کیا تو لڑنے کے لیے تیار حملہ آور ان کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔ اس لیے میں نے لڑنے والوں کو پہلے نشانہ بنایا اور آپ نے دیکھا کہ ان کے بھاگتے ہی مویشیوں کے محافظ لڑے بھڑے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے۔"

الجائی خاتون، تیمور کی بہادری کے ساتھ اس کی ذہانت اور فوجی سوجھ بوجھ کی بھی دل سے قائل ہو گئی۔

جھونپڑیوں کی اس آبادی کے نہتے لوگ حملہ آوروں کو آتے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور ادھر جا کر کھیتوں اور جھاڑیوں میں چھپ گئے تھے۔ جب حملہ آور شکست کھا کر بھاگ گئے تو یہ لوگ بھی واپس آ گئے اور اظہار تشکر کے طور پر تیمور اور دوسرے لوگوں کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

الجائی خاتون نے انہیں ان کا سامان اور مویشی واپس کر دیے۔ پانچ تلواریں اور پانچ ترکش و کمانیں بھی انہیں دی گئیں تاکہ وہ ایک حفاظتی گروہ بنائیں۔ الجائی خاتون نے انہیں یہ بھی یقین دلایا کہ وہ بہت جلد

اس علاقہ میں ایک فوجی چوکی قائم کرا دے گی تاکہ دوبارہ حملے کا خطرہ باقی نہ رہے۔

○

تیمور سے سو سال پہلے، سمرقند اور اس کے اطراف کے تمام علاقے پر، جس میں سرائے بھی شامل تھا۔ چنگیز خان کے منجھلے بیٹے چغتائی خان کی حکومت تھی۔ چغتائی کے قبضہ میں جنوب کی جانب ا کا ملک اور تخت سلیمان کی پشت کے کوہستانی علاقے بھی تھے لیکن چغتائی کی اولاد زیادہ اہل ثابت نہ صرف شراب و شکار سے دل لگا بیٹھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے تاتاری صوبیدار یکے بعد دیگرے خود ہوتے گئے اور چغتائی خوانین پسپا ہو کر شمال میں چلے گئے۔

الجائی خاتون کے دادا قزعن کو ایک چغتائی خان نے سمرقند کا حاکم مقرر کیا تھا۔ خوانین دولت کی میں، اکثر و بیشتر سمرقند کے اطراف میں لوٹ مار کرتے رہتے۔ قزعن ان کی اس روش سے بڑا پریشان تاتاری نسل کا تھا اور تقریباً تمام تاتاری قبائل اسلام قبول کر چکے تھے جبکہ چغتائی خوانین اب تک چنگیزی کے پابند تھے۔ مذہب کے اس اختلاف کی بنا پر بھی تاتاری، چغتائیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے بڑا خوددار، عادل اور منصف مزاج انسان تھا۔ وہ تاتاریوں پر خوانین کے ظلم وستم زیادہ دن برداشت نہ اور تمام قبائل کو اکٹھا کر کے بغاوت کر دی۔

یہ جنگ بہت طول کھینچ گئی۔ اس دوران چغتائیوں کے "خان" کا انتقال ہو گیا اور اس کے قزعن کو سمرقند کا واحد حاکم تسلیم کر لیا۔

قزعن بلا کا ذہین تھا۔ اسے معلوم تھا کہ خوانین اسے چین سے نہ بیٹھنے دیں گے اور موقع پاتے کریں گے۔ اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی اس نے ایک عجیب تدبیر کی۔ اس نے تمام تاتاری کے سرداروں کو اکٹھا کیا اور انہیں سمجھا بجھا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ خاندانِ چنگیزی کی طرح ایک شہزادے جانشین نامزد کریں اور اسے برائے نام بادشاہ مان لیں۔

اس بات کو تمام سرداروں نے تسلیم کر لیا۔ اس طرح قزعن نامزد شہزادے کے نام پر سمرقند مالک بن گیا۔

شہزادی الجائی، شمالی علاقہ میں اپنے باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس کا باپ قبیلے کا سردار تھا۔ قزعن نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے الجائی کو شمال سے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔ شہزادی اپنی پانچ سہیلیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اپنے دادا کے پاس آ گئی تھی۔ اس وقت قزعن دو ہزار تاتاری سرداروں، سپہ گروں اور جوانانِ قوم کے ساتھ سرائے سالی کے قریب ایک جنگل میں خیمہ زن تھا۔ وہ سال میں ایک بار اپنے تمام علاقوں کا دورہ کرتا تھا۔ جنگل میں یہ اجتماع اس کے دورے کا ایک حصہ تھا۔

پھر ایک دن جب اسے ایک تیز رفتار قاصد نے آ کر اطلاع دی کہ مغربی سرحد عبور کر کے ایرانی اس کے علاقے میں لوٹ مار کر رہے ہیں تو اس کی واحد آنکھ غصے سے سرخ ہو گئی۔ اس کی ایک آنکھ خوانین کے مقابلہ میں تیر لگنے سے ضائع ہو گئی تھی۔ اسے جب سوار سے یہ معلوم ہوا کہ شہزادی الجائی خاتون، مغربی سرحد کے قریب موجود ہے اور حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے سرحد کی طرف روانہ ہو چکی ہے تو قزعن کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ شہزادی الجائی اسے دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اس نے فوراً پانچ سو "بہادروں" کو سرحد کی طرف روانہ کر دیا۔ یوں تو سب ہی تاتاری بہادر تھے لیکن قزعن نے تمام قبائل سے بہترین جانبازوں کو منتخب کر کے ایک الگ دستہ بنایا تھا اور اس کا نام "بہادروں کا رسالہ" رکھا تھا۔ یہ بہادر جس قدر شجاع تھے اتنے ہی خودسر بھی تھے۔ یہ اپنے خیمے دوسروں سے الگ لگاتے اور اپنی محفل میں کسی غیر "بہادر" کو آنے کی اجازت نہ دیتے۔

برق رفتار "بہادر" تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ انہیں تیمور اور شہزادی الجائی خاتون واپس آتے ملے۔ شہزادی نے انہیں بتایا کہ حملہ آور مار کر بھگا دیے گئے ہیں۔ ان بہادروں نے شہزادی کے ساتھ ایک ہلکے جسم کے جوان کو بھی دیکھا جس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی لیکن انہوں نے اس نوجوان کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ دراصل "بہادر" رسالے کے سوار نہ تو عام لوگوں سے میل جول رکھتے تھے اور نہ اجنبی لوگوں کے متعلق کسی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا غرور اور خودسری انہیں اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔

قزعن، شہزادی کے لیے بہت پریشان تھا۔ وہ اپنے خیمہ کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رکتا اور مغرب کی جانب دیکھ کر اپنی چھدری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اے مغرب سنبھل جا! میں آ رہا ہوں۔ لیکن اسے مغرب میں جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ اس کے بھیجے ہوئے پانچ سو سوار اور شہزادی بخیریت واپس آ گئے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ دورِ تیموری میں نہ حسنِ تاتار نقاب کی قید کا پابند تھا اور نہ اس وقت خوا
کو حرم کی چار دیواری میں قید کرنے کا تصور موجود تھا۔ عورتیں، سیر و شکار، سفر اور حضر، امن و جنگ
حج و زیارت ہر موقع پر مردوں کے ساتھ ہوتیں۔ یہی نہیں بلکہ قوم کی یہ بیٹیاں، فتوحات اور حرب و
میں بھی حصہ دار ہوتی تھیں اور جنگ جیتنے کے بعد اپنے سر کو مردوں کی طرح فخر سے بلند کرتی تھیں۔ صحت
ماحول، کھلی ہوا اور آزاد طبیعت کی جولانیوں نے ان کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ جوان عورتیں آزا
گھومتی تھیں۔ گھر اور گھر کے تمام امور کی ذمہ داری بوڑھی خواتین کے سپرد تھی۔ عمر رسیدہ خواتین جانور
دودھ دوہتی اور چمڑے کے موزے تک تیار کرتی تھیں۔

شہزادی الجائی خاتون بڑے بے باکانہ انداز میں، ہنستی ہوئی گھوڑے سے اتری اور دادا کے گلے
لگ گئی۔ شہزادی کے بخیریت واپس آنے کی تمام لوگوں کو خوشی ہوئی لیکن اس کے چہرے یا سراپا کی طرف کوئی
نہ ہوا جیسے جمالیات کے کسی انداز یا زاویے سے وہ بالکل نابلد ہیں۔ واپس آنے والے پانچسو بہادروں کے جر
نے قزعن کے پاس آنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ چپ چاپ اپنے خیموں میں چلے گئے۔

شہزادی الجائی خاتون، دادا سے گلے مل کر الگ ہوئی تو قزعن نے کہا:

"ہم تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔ ہمیں جیسے ہی معلوم ہوا کہ تم سرحد کے قریب ہو ہم نے فو
پانچ سو بہادروں کو تمہاری مدد کے لیے بھیج دیا۔"

شہزادی نے ہنس کر کہا:

"اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی دادا جان۔"

قزعن کے چہرے پر تو مسکراہٹ محسوس نہ ہوئی لیکن اس کی آنکھ ہنستی دکھائی دی۔ اس نے کہا:

"بہت خوب! حملہ آور ہمارے بہادروں کو دیکھ کر ہی بھاگ گئے ہوں گے۔"

"اس کی بھی نوبت نہیں آئی۔" شہزادی نے اکتائے لہجہ میں کہا، پھر اپنے غلام سردار کی طرف دیکھتے ہوئے
بولی: "یہ آپ کو لڑائی کی تفصیل بتا دے گا۔"

قزعن چونکا، پوچھا:

"تو کیا تم حملہ آوروں سے لڑنے گئی تھیں۔ کوئی زخم تو نہیں آیا؟"

شہزادی نے جواب دیا: "دادا جان۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے تو خراش تک نہیں آئی۔ مجھے اجازت

بہت تھک گئی ہوں۔ اپنے خیمے میں جا رہی ہوں۔"

الجائی خاتون، اپنی کنیزوں اور غلاموں کو لے کر اپنے خیمے کی طرف چل پڑی۔ اس نے قزعن کے جواب
کا بھی انتظار نہ کیا۔ مزید گفتگو کے لیے وہ غلام سردار کو وہیں چھوڑ گئی تھی۔

قزعن کچھ سوچتا، سفید نمدے کی مسند کے پاس گیا اور ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ غلام سردار اس کے
سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔

قزعن نے پوچھا: "شہزادی حملہ آوروں سے لڑنے گئی تھی؟"

"جی ہاں والیِ سمرقند۔" غلام سردار فخریہ انداز میں بولا: "شہزادی صاحبہ خوب خوب لڑیں۔ بڑا سخت
مقابلہ ہوا۔"

"حملہ آور تعداد میں کتنے تھے؟" قزعن نے پوچھا۔

"دو سو کے قریب۔" غلام سردار نے مبالغہ سے کام لیا۔

"دو سو!" قزعن مسند سے آگے جھک گیا۔ اس نے غلام سردار کو گھورتے ہوئے پوچھا: "تم سب
کی تعداد کتنی تھی؟"

غلام سردار نے دل میں گنتی گنی۔ پھر بولا:

"کل اٹھارہ لیکن تلواریں صرف آٹھ تھیں۔" اس نے اپنے نیچہ پر ہاتھ رکھ کر بڑے غرور سے کہا۔ "اگر
اسے بھی تلوار سمجھ لیا جائے تو تلواروں کی تعداد نو ہو جاتی ہے۔"

قزعن کی سمجھ میں یہ معمہ نہ آیا۔ اس نے بگڑ کر کہا:

"اٹھارہ۔ آٹھ۔ نو۔ کیا بکواس کر رہا ہے؟"

غلام سردار گھبرایا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ بولا: "اے امیرِ سمرقند۔ غلام آپ کے سامنے غلط بیانی نہیں
کر سکتا۔ ہم تمام مردوں اور عورتوں کی تعداد اٹھارہ تھی لیکن ہمارے پاس تلواریں صرف آٹھ تھیں۔ کنیزوں اور
غلاموں کے پاس خنجر تھے۔"

قزعن کو اپنی لاڈلی پوتی کی بہادری پر بڑا تعجب ہوا۔ اس نے سوچا کہ شہزادی صرف حسین و دلربا نہیں۔
بہادر بھی ہے اور بہادر بھی اتنی کہ اس نے آٹھ تلواروں سے دو سو بہادروں کو مار بھگایا اور اسے ایک خراش
تک نہ آئی۔ یہ واقعہ بڑا حیرت انگیز تھا۔ غلام اس کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا لیکن بات ایسی تھی کہ اس کا

دل قبول نہیں کر رہا تھا۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا:

"حملے میں پہل کس نے کی۔ شہزادی نے خود بڑھ کر حملہ کیا یا لٹیروں کو حملہ کرنے کا موقع دیا۔ کس کی طرف سے پہل ہوئی؟"

"پہل کس کی طرف سے ہوئی؟" غلام سردار زیرِ لب بڑبڑایا۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ تیمور اور عبداللہ اس کے قریب ہی کھڑے تھے۔ غلام سردار کے چہرے پر جیسے رونق آ گئی۔ اس نے تیمور کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے قزغن سے کہا:

"اے امیرِ سمرقند! حملے میں پہل اس نوجوان نے کی۔ یہ وہ فرشتہ ہے جو اگر وقت پر نہ پہنچ جاتا تو آج میں آپ کے سامنے زندہ موجود نہ ہوتا۔"

سب کی نظریں اک دم غلام سردار کے ہاتھ کے اشارہ کی طرف اٹھ گئیں۔ تیمور نظریں جھکائے عبداللہ کے برابر کھڑا تھا۔ نوعمر عبداللہ دل میں بہت خوش ہوا۔ اس نے بڑے فخر سے امیر قزغن سے آنکھیں چار کیں لیکن جلد ہی مرعوب ہو کر گردن جھکا لی۔

امیر قزغن نے جیسے خود سے سوال کیا: "یہ نوجوان کون ہے؟"

غلام سردار نے امیر قزغن کی بات اَن سُنی کر دی اور اپنی رَو میں بولا:

"جی ہاں امیرِ سمرقند! اس نوجوان کے ترکش سے تیر اس طرح نکل رہے تھے جیسے بھری برسات میں اولوں کی بارش ہو۔ اس کی تلوار کوندے کی طرح لپکتی۔ اس کا سفید گھوڑا دشمنوں کے گھیرے میں، سیاہ بادل سے آنکھ مچولی کھیلتے چاند کی طرح چمکتا اور شکار سے مار رہا تھا۔ جدھر یہ گھومتا، لٹیرے کائی کی طرح پھٹ جاتے۔"

"مگر یہ ہے کون؟" امیر قزغن کی آواز میں دنیا جہان کی محبت کا رس گھل گیا۔

امیر قزغن کی آواز سن کر غلام سردار فوراً چپ ہو گیا۔

امیر تیمور نے غلام سردار کو بولنے کا موقع نہ دیا۔ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا:

"اے والیِ سمرقند! میں قبیلہ برلاس کے سردار قراغائی کا بیٹا تیمور ہوں۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں حاضر ہوا ہوں۔"

امیر قزغن کو جیسے اس پر ڈھیروں پیار آ گیا۔ وہ گردن جھٹک کر بولا: "تیمور! تم صرف قراغائی کے نہیں ہو، خاندانِ گورگان کے ایک فرد بھی ہو۔ تم ترک (چغتائی) نہیں تاتاری ہو۔"

تیمور نے سر اٹھا کر تیمور کو دیکھا پھر نظریں نیچی کر لیں۔ اس کا قبیلہ برلاس، تاتاریوں کا ایک مشہور قبیلہ تھا۔ امیر نے ٹھیک ہی کہا تھا اس کا تعلق چنگیز خان کی کسی شاخ سے نہ تھا۔

امیر قزغن نے نوجوان تیمور کو اس پہلی ملاقات میں تمام سرداروں کے سامنے پہلا سبق پڑھایا:

"تیمور! تمہاری پیدائش سے سالہا سال پہلے تمہارے جدِ امجد نے خاندانِ چنگیزی کے جدِ امجد سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ فوج کے سپہ سالار تمہارے خاندان سے ہوا کریں گے لیکن حکومت چنگیز کی اولاد کے ہاتھ میں رہے گی۔ یہ عہد نامہ ایک فولادی تختی پر کندہ کیا گیا تھا جو چنگیزی خوانین کے پاس محفوظ ہے۔ یہ بات تمہارے باپ قراغائی نے مجھے بتائی تھی اور یہی سچ بھی ہے۔"

تیمور کو ان باتوں کا پہلے ہی سے علم تھا۔ تیمور کا باپ سرداری چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا تھا اور اب اپنی زندگی یادِ اللہ میں بسر کر رہا تھا لیکن اس نے تیمور کو تاتاریوں اور منگولوں کی پوری تاریخ سے آگاہ کر کے اسے اپنی زندگی کی راہیں خود متعین کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

بہادروں کے جتھے کے جو لوگ شہزادی کی مدد کے لیے بھیجے گئے تھے وہ تو اپنے خیموں میں پہلے ہی پہنچ گئے تھے لیکن امیر قزغن کے پاس اس وقت چند "بہادر" دوسروں سے ذرا الگ اپنا جھرمٹ بنائے بیٹھے تھے۔ انہیں امیر قزغن کی تیمور پر اتنی زیادہ مہربانی بڑی شاق گزری لیکن وہ خاموش رہے۔ پتہ نہیں تیمور کی اس مہم کا تاثر تھا یا امیر قزغن کی دُوربیں نظروں نے تیمور کے بشرے سے اس کے روشن مستقبل کا پتہ لگا لیا تھا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس کا والا و شیدا ہو گیا تھا۔

امیر قزغن نے اسی محفل میں ایک اور اعلان کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے کہا:

"ہم قبیلہ برلاس کے سردار قراغائی کے بیٹے تیمور کو اپنے "بہادروں" کے جتھے میں شامل کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔"

اس اعلان کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ تیمور کو "بہادر" کا خطاب دیا گیا ہے۔ "بہادر" تاتاری سرداروں کا اعلیٰ ترین اعزاز تھا۔ یہ اعزاز مختلف قبائل کے جانباز اور قوی ہیکل افراد کو دیا جاتا تھا۔ تیمور اگرچہ سترہ سال کا دبلا پتلا نوجوان تھا لیکن اس معرکے نے امیر قزغن کے دل میں کچھ ایسا گھر کر لیا کہ اس نے بے جھجک اور بغیر کسی سفارش کے اسے "بہادروں" میں شامل کر دیا۔

قبائلی سرداروں میں سے زیادہ سرداروں نے امیر قزغن کے اس قدم کو سراہا لیکن اس محفل میں شریک "بہادروں" کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ان کے خیال میں ایک دبلا پتلا جوان خواہ وہ کتنا ہی پھرتیلا کیوں نہ ہو۔ "بہادروں" جیسے گرانڈیل اور خونخوار افراد میں شامل ہونے کا اہل نہ تھا۔ بہادر بے جگری سے لڑنے میں مشہور تھے، رزم اور بزم ہر جگہ وہ خود کو دوسرے شہسواروں اور شمشیر زنوں سے الگ رکھتے تھے۔ وہ میدان جنگ کی طرف جاتے اتنے ہی خوش ہوتے جس طرح وہ ضیافت کی محفل میں شریک ہونے جاتے تھے۔

تیمور کو "بہادر" کا خطاب ملا تو اس کے خانہ زاد عبداللہ نے تیمور کے کان کے پاس منہ لے جا کر اسے مبارک باد دی۔

تیمور نے بھی اس کے کان میں کہا: "عبداللہ، بخدا میں جانتا تھا کہ مجھے یہ اعزاز ملے گا!"

عبداللہ حیرت سے تیمور کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ اس وقت گفتگو کا موقع نہ تھا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔

امیر قزغن کا فرشی دربار برخاست ہوا۔ تیمور کو "بہادروں" کے خیموں کی قطار میں ایک خیمہ دیا گیا۔ تیمور بڑی تمکنت سے اپنے خیمے کی طرف جا رہا تھا۔ عبداللہ خاموش خاموش کچھ سوچتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ "بہادروں" کے گروہ جگہ جگہ خیموں کے سامنے دس دس پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ تیمور کی طرف کوئی بھی متوجہ نہ ہوا۔ تیمور نے بھی ان کی پروا نہ کی اور سیدھا اپنے خیمے میں پہنچ گیا۔ نمدے کا چوبچدار خیمہ۔ اندر قالین بچھا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔

چودہ سالہ عبداللہ خیمے میں پہنچ کے بھی خاموش تھا۔

تیمور قالین پر مع جوتوں کے پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا:

"عبداللہ، تو خاموش ہے۔ کیا تجھے میرے اس اعزاز پر خوشی نہیں ہوئی؟"

"کیوں نہیں میرے آقا!" عبداللہ نے جواب دیا۔ "خانہ زاد کے لیے اس سے بڑھ کر اور کونسی خوشی ہو سکتی ہے لیکن ___"

"لیکن کیا؟" تیمور نے اس کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا: "دیکھ عبداللہ! بات دل میں نہیں رکھا کرتے۔ اس سے شک و شبہ پیدا ہوتا ہے۔ بزرگ کہتے ہیں کہ دل پر بوجھ نہ رکھو۔ کوئی اعتماد کے قابل نہ ملے تو دل کا حال دیواروں سے کہہ ڈالو۔ اس سے بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

عبداللہ شرمندہ سا ہو گیا۔ بولا: "آقا! آپ سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کون ہو سکتا ہے۔ بس ایک بات

سمجھ میں نہیں آ رہی۔ سوچتا ہوں کہوں کہ نہ کہوں۔"

"ضرور کہو عبداللہ"۔ تیمور نے کہا۔ "تم میرے غلام نہیں چھوٹے بھائی ہو۔"

عبداللہ فرطِ جذبات سے تیمور کے قدموں پر گر پڑا۔ روتے ہوئے بولا:

"آقا! مجھے معاف کر دیجیے۔ میں نے آپ پر خواہ مخواہ شک کیا۔ بات یہ ہے کہ میں نے مسجد کے ا سے یہ سنا تھا کہ آیندہ کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ اگر کوئی مستقبل کا حال بتانے کا دعویٰ کرے تو وہ کافر ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ اس اعزاز اور خطاب کا حال آپ کو پہلے سے معلوم تھا۔ بس میں اسی الجھن میں پڑ گیا۔"

تیمور اپنے غلام کے خیالات سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہا:

"عبداللہ! امام مسجد نے بالکل سچ کہا۔ غیب کا حال صرف خدا جانتا ہے لیکن خدا نے ہی انسان کو عقل دی ہے۔ وہ اپنی عقل سے کچھ اندازہ لگاتا ہے۔ اگر اس کا اندازہ درست نکلے تو اسے غیب دانی نہیں کہہ سکتے۔ میں نے جو تم سے کہا کہ میں اس خطاب کے بارے میں پہلے سے جانتا تھا تو اس کی ایک وجہ تھی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ میں اس وقت مشکل سے دس سال کا تھا۔ ایک دن مسجد کے گوشہ میں بیٹھا قرآن پاک کا پہلا سپارہ پڑھ رہا تھا۔ ایک سفید ریش بزرگ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے بڑھ کر اٹھ کر میرے پاس آ گئے۔ میرا نام پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔ انھوں نے سپارے پر جھک کر وہ آیت دیکھی جو میں پڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک آنکھیں بند کر کے سوچتے رہے پھر مجھ سے کہا:

"بیٹا! جب تک تم اسلام کا تحفظ کرتے رہو گے خدا تمہاری حفاظت کرتا رہے گا۔"

یہ سن کر میں نے اندازہ لگایا کہ خداوند تعالیٰ ضرور مجھے کوئی بڑا مرتبہ دینا چاہتا ہے۔ اس طرح اُن بزرگ کی پیش گوئی اور میرا اندازہ درست ہو گیا۔"

عبداللہ کو اطمینان ہو گیا اور وہ خوشی خوشی تیمور کے گھٹنوں تک چڑھے ہوئے نمدے کے جوتے اتارنے لگا۔

⊙

لال تری، شہزادی الجائی خاتون کی سب سے زیادہ شوخ اور چنچل کنیز تھی مگر تھی بڑی بدقسمت۔ بارہ سال

کی عمر میں ایک بانکے غلام سے دل لگا بیٹھی۔ غلام بھی اس پہ ریجھ گیا۔ دونوں نے بھاگ دوڑ کر کے آقا کو راضی کر لیا اور شادی ہو گئی۔ مگر قسمت کی ایسی ہیٹی کہ ایک سال کے اندر ہی اس کا محبوب شوہر چٹ پٹ ہو گیا۔ معمولی نزلہ پھر بخار۔ ابھی دوا دارو کی فکر ہو رہی تھی کہ تیسرے دن وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس سہاگ کیا اجڑا دنیا اجڑ گئی۔ غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ الجائی خاتون کی خدمت میں آ گئی ورنہ میں گھل گھل کے خود بھی ختم ہو گئی ہوتی۔ اس کی چنچلتا اور شوخی پھر لوٹ آئی۔

الجائی خاتون کی ماں مر چکی تھی اور باپ ایک نئی نویلی دلہن لے آیا تھا۔ الجائی کو تنہائی کا عارضہ لگا۔ کچھ دنوں بعد اسے لال تری مل گئی۔ پھر دادا کا بلاوا آ گیا۔ اندھا کیا چاہے۔ الجائی کو بہانہ ہاتھ آیا۔ کنیزوں سہیلیوں کے ساتھ دادا کے پاس اٹھ آئی اور یہیں کی ہو کر رہ گئی۔

سرحدی چھڑپ ہوتے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ الجائی اداس تھی۔ لال تری ہزار جتن کرتی، حکایتیں اور لطیفے سناتی۔ چھیڑتی۔ گدگداتی لیکن الجائی کا جیسے غنچۂ دل نہ کھلتا۔ کوئی بات اس کے دل کو کبھی لگ سے خیالات میں کھو جاتی۔ کبھی سناٹوں میں گھورنے لگتی۔ لال تری تھک ہار کر رہ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ شہزادی کسی طرح نہیں کھلتی تو ایک رات سر درد کا بہانہ کر کے دوسرے خیمے میں چلی گئی اور صبح کو واپس نہ آئی۔ دن چڑھا تو شہزادی کو فکر ہوئی۔ دوسری کنیز بھیج کر اسے بلایا۔ لال تری آئی لیکن منہ پھلائے، منہ لٹکائے جیسے کسی سے لڑ کر آ رہی ہو۔

شہزادی سمجھ گئی کہ لال تری، اس سے ناراض ہے۔ کتنے دنوں سے شہزادی نے اس سے سیدھے بات نہ کی تھی۔ ناراض نہ ہوتی تو کیا خوش ہوتی۔ شہزادی کا دل پسیجا۔ بولی:

"لال تری! تو نے کسی سے محبت کی ہے؟"

"جی، کی ہے۔" لال تری یوں بولی جیسے لڑ رہی ہو۔

شہزادی کو ہنسی آ گئی۔ کہنے لگی:

"بھلا بتا تو کس سے محبت کی ہے؟"

"ہائے شہزادی بی بی۔ یہ قصہ نہ چھیڑو۔" لال تری سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "میں نے محبت کی اور ڈٹ کے کی۔ وہ ایک ترخان کو کھانا کھلانے پر مامور تھا اور میں ان کی بیگم کی خادمہ تھی۔ آتے جاتے اس کا سامنا ہو جاتا۔ چھیڑ چھاڑ، دیکھنا دکھانا ہی دل کا روگ بن گیا۔ ایک دن وہ نظر نہ آتا تو یوں تڑپتی جیسے جل بن مچھلی۔ پھر جب وہ

میں اس سے بات نہ کرتی۔ منہ پھلا کر بیٹھ جاتی۔"

"ایسے ہی نا جیسے آج منہ پھلا کے آئی تھی۔" شہزادی نے اس کی بات کاٹ دی۔

لال تری کھسیانی ہو گئی۔ بولی:

"کیا کرتی۔ سینہ بھر سے آپ کے آگے پیچھے گھوم رہی ہوں لیکن آپ تو گھاس بھی نہیں ڈالتیں۔"

"اچھا یہ دکھڑا چھوڑ۔ بتا پھر کیا ہوا؟" شہزادی کو اس کی باتوں میں مزا آنے لگا۔

لال تری سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے کہا:

"کچھ دن یہی چکر چلتا رہا۔ وہ جب آتا میرے لیے ایک پوٹلی میں اچھے اچھے کھانے باندھ کر لاتا۔ ہم دونوں خوب مزے لے لے کر کھاتے۔"

"پھر کیا ہوا۔ آگے بڑھ۔" شہزادی اس کی محبت کا انجام معلوم کرنا چاہتی تھی۔

لال تری سنجیدگی سے بولی: "پھر ہماری شادی ہو گئی۔"

شہزادی چونک پڑی! پوچھا:

"تو شادی شدہ ہے۔ تیرا شوہر کہاں ہے؟"

"اللہ میاں کے گھر۔" لال تری نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: "شادی کے بعد وہ ایک سال بھی زندہ نہ رہا اور اکیلا ہی اللہ کے گھر چلا گیا۔"

"بڑا افسوس ہوا سن کے۔" شہزادی نے اظہارِ ہمدردی کیا۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا: "تیری عمر کتنی ہے لال تری؟"

"چودہ سال۔"

"اور شادی کس عمر میں ہوئی تھی؟"

"جب میں بارہ سال کی تھی۔" لال تری نے بتایا۔

"تجھ کو بڑی دکھی ہے لال تری۔" شہزادی نے کہا۔ "یہ بات تو نے پہلے کبھی نہیں بتائی؟"

"کیا کرتی بتا کے شہزادی بیگم۔" لال تری اداس ہو گئی۔ "آپ کے پاس آ کے تو میں نے ہنسنا بولنا شروع کیا ہے۔ پہلے تو میں منہ لپیٹے پڑی رہتی تھی۔"

لال تری کے غم نے شہزادی کو بھی غمگین کر دیا۔

لال تری نے پوچھا: "پر آپ کیوں چپ چپ رہتی ہیں شہزادی؟"

"تو آپ ہی غم کی ماری ہے۔ تجھ سے کیا کہوں"۔ شہزادی گہری افسردگی میں ڈوب گئی۔

لال تری نے کہا:

"شہزادی! میری ماں کہتی تھی کہ اپنا مرض الحکیم سے اور دل کی بات اچھی سہیلی سے ضرور بتانا چاہیے۔ میں آپ کی سہیلی تو نہیں ہاں کنیز ضرور ہوں لیکن تجربے میں آپ سے آگے ہوں۔ دنیا جو دیکھی ہے میں نے"۔

شہزادی تیمور کے خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔ لال تری اسے ہمدرد معلوم ہوئی۔ آخر اس نے راز اگل دیا۔

"لال تری، تیرا اس نوجوان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

لال تری چونکی۔ پوچھا:

"کون۔ وہ نوعمر جوان"؟

"ہاں ہاں۔ وہی"۔ شہزادی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ لال تری جیسے مست ہو گئی۔ کہا:

"اس کا کیا کہنا شہزادی صاحبہ! بڑا دل رُبا ہے۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل پر چوٹ سی پڑی تھی۔ مجھے اپنا شوہر یاد آگیا۔ ایسا ہی دبلا پتلا چابک منک۔ وہ اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ پر میں۔۔۔۔"

لال تری کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے شہزادی کو دیکھا۔ شہزادی اسے حیران حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی غصہ آ رہا تھا کہ یہ ٹکے کی کنیز کتنی ڈھٹائی سے تیمور سے اپنا عشق جتا رہی ہے۔

لال تری بولی:

"شہزادی بی! اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ مجھے اچھا ضرور لگتا ہے لیکن میں اس سے شادی نہیں کروں گی"۔

شہزادی کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کا دل چاہا کہ لال تری کا منہ نوچ لے۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ کہاں برلاس قبیلے کے سردار کا بیٹا تیمور کہاں یہ کنیز۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔

شہزادی نے جل کر کہا:

"کرے نا شادی۔ کیا عیب ہے اس میں؟"

لال تری کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ وہ سمجھی کہ شاید شہزادی بھی یہی چاہتی ہے۔ پہلے ہنستی رہی۔ پھر بولی: "کرتو نوں پر جی ڈرتا ہے۔ دودھ کا جلا مٹھا پھونک کے پیے۔ آنکھ ہوتے مکھی نہیں کھائی جاتی"۔

شہزادی کا خون کھول گیا۔ چیخ کے بولی:

"تو رانی ہے کہیں کی نا۔ کیا بُرائی ہے اس میں۔ کس بات میں کم ہے تجھ سے؟"

لال تری شہزادی کی لال پیلی نظروں اور لہجہ کی سختی کو پھر بھی نہ سمجھی۔ اٹھلا کر بولی:

"کم تو نہیں ہے۔ عمر میں بھی برابر ہی ہوگا جوڑا اچھا رہے گا۔ پر اب میں نے طے کیا ہے کہ کسی عمر دراز آدمی سے شادی کروں گی۔ جس کے مونچھیں ہوں داڑھی ہو۔ میرے ساتھ چلے تو بھاری بھرکم لگے۔ یہ میرے ساتھ چلے گا تو شوہر کے بجائے بھائی لگے گا۔ پھر ان بارہ چودہ سال کے چھوکروں کا کیا اعتبار۔ ادھر شادی کی ادھر سال کے اندر اندر مر گئے"۔

شہزادی کے چہرے کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی نفرت و غصہ تو کبھی پیار اور خوشی۔ لال تری کی باتوں نے اسے عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور چلتی چلی جا رہی تھی۔

لال تری شہزادی کے اور قریب کھسک آئی اور رازدارانہ انداز میں بولی:

"ابھی تو اس کی مونچھیں بھی نہیں نکلیں۔ مجھے تو وہ چودہ سال سے بھی کم کا لگتا ہے"۔

شہزادی نے ایک لمبی سانس لی۔ اطمینان کی سانس۔ اس کے دل کا بوجھ جیسے ہلکا ہو گیا۔ شہزادی نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

"یہ تو اتنی دیر سے کس کی تعریف کیے جا رہی ہے"۔

"لیجیے شہزادی یہ کیا بات ہوئی"۔ لال تری نظریں نیچی کر کے بولی۔ "میں تعریف کر رہی ہوں تو اس کا نام لیتے کیوں شرماؤں۔ پھر ابھی نکاح کب ہوا ہے کہ ٹوٹ جائے گا۔ آپ سو بار پوچھیں۔ سو بار بتاؤں گی۔ اس کا نام ہے عبداللہ، عبداللہ، عبداللہ"۔

شہزادی نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے میں لال تری نے اپنا ہلکا قہقہہ بھی شامل کر دیا۔ شہزادی یوں ہنسی کہ اس کا شک دور ہوا اور دل ہلکا پڑ گیا اور لال تری کا قہقہہ محض قہقہہ تھا۔ اس نے تو شہزادی کو خوش کرنے کے لیے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

"جانتی ہے میں کیوں ہنسی تھی"۔ شہزادی انجائی نے پوچھا۔

"اجی۔ ہنسی کا کیا ہے، بس آ گئی تو آ گئی۔" لال تری نے بھولپن سے جواب دیا۔

شہزادی اسے پیار سے دیکھتی ہوئی بولی:

"نہیں ری۔ میں سمجھی تھی کہ تو تیمور کی تعریف کر رہی ہے۔"

"ہائے۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" لال تری ٹھنک کے بولی: "مجھ پر آسمان گرے۔ ڈھائی گھڑی کا ہیضہ ہو جو کبھی ایسا سوچوں بھی۔ وہ تو شہزادہ ہے شہزادہ۔ کیا پھرتیلا جوان ہے۔ یہ جو پہاڑ جیسے ڈیل لیے گھومتے ہیں آپ کے "بہادر"۔ یہ اس کے پیر کی دھول بھی نہیں۔ کیا لڑا تھا اس دن۔ تلوار تھی کہ بجلی۔ تیر تو اس کی کمان سے یوں نکلتے ہیں جیسے آگے پیچھے تار میں جڑے ہوں۔ پتہ ہی نہیں لگتا۔ کب تیر ترکش سے نکلا، کب کمان پہ جڑا اور کب چلا۔ ایک تانتا باندھ دیا تھا اس نے۔ جیسے ساون جھم جھم برسے۔ تیر یونہی برسائے اس نے میں تو کہتی ہوں۔"

لال تری پھر شہزادی کے قریب سرک آئی۔ بولی:

"میں تو کہوں بس آپ کا جوڑ ہے۔ پورا پورا جوڑ۔ اللہ نے بنا کے آسمان سے اتارا ہے۔"

شہزادی کا انگ انگ جھوم اٹھا۔ کہنے لگی: "تو تیمور تجھے بھی اچھا لگا۔"

"نا بی بی شہزادی۔" لال تری نے منہ بسورا۔ "آپ پھر شبہ میں پڑ جائیں گی۔ شہزادے اچھے ہیں۔ بہت اچھے مگر آپ کے لیے۔"

دونوں دیر تک سر جوڑے باتیں کرتی رہیں۔ کبھی تیمور کی تو کبھی عبداللہ کی۔

شام کو لال تری، تیمور کے خیمے کے گرد منڈلا رہی تھی۔ تیمور کا خیمہ "بہادروں" کے خیموں کی قطار میں تھا۔ بہادر تو پھر بہادر تھے۔ وہ عام سپاہیوں سے بات نہ کرتے لال تری کی طرف کیا توجہ دیتے۔ جگہ جگہ ان کی ٹولیاں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ قصے، کہانیاں۔ ایران توران کی لڑائیوں کی کہانیاں۔ چنگیز کی بربریت اور ہلاکو خان کی سفاکی کی داستانیں۔ ان کہانیوں میں شاید انہیں لطف آتا۔ جب کوئی کہتا کہ چنگیز خان بڑے بڑے شاہوں کو شکست دے کر ان کی کھوپڑیوں کے پیالے بناتا اور ان میں سفید گھوڑیوں کا دودھ پیتا تھا تو وہ خوب ہنستے اور قہقہے لگاتے۔ پتہ نہیں وہ بربریت کا مذاق اڑاتے یا انسانیت کی بے بسی کا۔

لال تری کو اس طرح گشت کرتے رات ہو گئی۔ ہر خیمے میں شمع روشن تھی لیکن نہ وہ کسی سے بولتی نہ کوئی اسے منہ لگاتا۔ تیمور کے خیمے کے اس نے چار پانچ چکر لگائے تھے۔ ایک مرتبہ عبداللہ کی نظر اس پر پڑی تھی

شبہ ہوا کہ یہ شہزادی کی کنیزوں میں شامل تھی۔ عبداللہ نے باہر نکل کر اسے دیکھنا چاہا مگر تیمور نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا:

"یہ بہادروں کی خیمہ گاہ ہے دریا کا کنارہ نہیں۔" تیمور کی بھاری آواز خیمے میں گونجی اور عبداللہ دبک کر بیٹھ گیا۔

لال تری کو غصہ آ گیا۔ اس کی انا کی توہین ہوئی تھی۔ وہ ایک گھنٹے سے گھوم رہی تھی اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اسے کسی اور سے تو شکوہ نہ تھا مگر عبداللہ پر تاؤ ضرور تھا۔ بلاوجہ کا تاؤ۔ بھلا عبداللہ اس کا کیا لگتا تھا۔ نہ کوئی رشتہ نہ ناتہ۔ ابھی تو ان دونوں میں بات بھی نہ ہوئی تھی مگر لال تری اپنے ہی طور پر اس پر اپنا حق سمجھتی تھی۔

اس نے تیمور کے خیمہ کا آخری چکر لگایا یہ سوچ کر کہ اگر اس بار بھی عبداللہ نے اسے آواز نہ دی تو وہ واپس چلی جائے گی اور پھر عبداللہ سے کبھی نہ بولے گی۔

لال تری جھپک کر خیمہ کے سامنے سے نکلی۔ خیمہ کے دروازے کے بالکل پاس سے۔ اس کا منہ دروازے کی طرف تھا۔ اندر کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو عبداللہ تڑپ اٹھا۔ وہ چپکے سے اٹھا۔

"کدھر چلا؟" تیمور کی بھاری آواز پھر ابھری۔

"باہر جا رہا ہوں۔" عبداللہ منمنایا۔ "کوئی ملنے آیا ہے۔"

"کون آیا ہے؟" تیمور نے اسے گھورا۔

"وہ۔۔۔ وہی۔ شہزادی کی کنیز۔" عبداللہ نے بڑی ہمت کر کے کہا۔

تیمور سوچ میں پڑ گیا۔ شہزادی کی کنیز کیوں آئی۔ کیا شہزادی نے اسے بھیجا ہے۔ مگر کیوں؟ مختلف خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوئے۔

تیمور نے پوچھا:

"کیا یہ کنیز پہلے بھی آئی تھی؟"

"نہیں۔ پہلی بار آئی ہے۔" عبداللہ کمزور آواز میں بولا۔ "چلا جاؤں میں؟"

تیمور سوچ ہی رہا تھا کہ عبداللہ لپ سے باہر نکل گیا۔

عبداللہ کو ایک سایہ سا خیمے سے ذرا دور دکھائی پڑا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب پہنچا۔ یہ یقین

کر لینے کے بعد کہ سایہ کنیز ہی کا ہے وہ زور سے کھنکارا۔ کنیز نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں سائے ذرا اور قریب آ گئے۔ روشنی بہت کم تھی۔ جب وہ دور کسی خیمہ کے آگے الاؤ سے شعلہ اٹھتا تو ایک لمحہ کے لیے جگنو پیدا ہو جاتا۔

لال تری مرد کی قربت سے آشنا تھی۔ عبداللہ کو اتنا قریب پا کر اس کی رگیں پھڑکنے لگیں۔ شوخی رخصت ہو گئی۔ غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور جسم جلنے لگا۔

"تو میرے پیچھے کیوں آیا؟" لال تری کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

عبداللہ ناتجربہ کار، نادان تھا۔ بولا:

"تو نے بلایا۔ میں آ گیا۔ شام سے جو میرے خیمہ کے چکر کاٹ رہی ہے۔"

عبداللہ کے انداز میں بچپنا تھا اور بھولا پن تھا۔ ابھی وہ بچپن اور جوانی کے اتصال پر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی عورت سے اس قدر قربت کا احساس، اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا مگر لذت آمیز۔

لال تری نے اس کی فطری کمزوری محسوس کر لی۔ لپک کے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتی ہوئی خیموں سے دور لے گئی۔ عبداللہ نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ عورت کے لمس سے اس کے جسم میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔

لال تری، میدان کے کنارے پہنچ کر بیٹھ گئی۔ خیموں کا جنگل اس کی پشت پر تھا اور سامنے کھلا میدان۔ چاند آہستہ آہستہ اپنا چہرہ ابھار رہا تھا۔

دونوں خاموش تھے۔ کئی لمحے اسی طرح گزر گئے۔ لال تری کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ عبداللہ پرسکون تھا۔ یہ سکون دراصل ایک ایسا کیف تھا جس میں عبداللہ سرتاپا ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے لال تری کو دیکھے جا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ یونہی دیکھتا رہے۔

دور خیمہ گاہ سے کئی بھیانک قہقہے گونجے۔ یہ "بہادروں" کے خوشی کے اظہار کا نقطۂ عروج تھا۔ جب وہ کسی بات پر بہت خوش ہوتے تو آواز سے آواز ملا کر خوفناک قہقہے بلند کرتے۔ عبداللہ اور لال تری ایسے قہقہوں کے عادی تھے۔ انہوں نے اس طرف توجہ نہ دی لیکن لال تری کو جیسے اپنی ذمہ داری یاد آ گئی۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ لال تری اس کے قریب کھسک آئی۔ بولی:

"تیرے آقا نے کبھی شہزادی کے بارے میں کچھ کہا؟" اس کی آواز اکھڑی اکھڑی تھی۔

عبداللہ کو اس کی زلفیں اپنے شانوں پر لہراتی محسوس ہوئیں۔ اس نے مستی کے عالم میں کہا:

"شہزادی کیا چیز ہے تو اپنی بات کر۔ میرے پاس کیوں آئی ہے تو؟"

لال تری کی نسوانی حیا جیسے عود کر آئی۔ بولی:

"میں کیوں آنے لگی تیرے پاس۔ تجھ میں کیا لعل ٹکے ہیں۔ میں ایسے دیسوں کو تو منہ بھی نہیں لگاتی۔ تجھے اچھی نہیں لگتی تو ابھی چلی جاؤں گی۔"

عبداللہ بوکھلا گیا۔ اس کا مقصد لال تری کو ناراض کرنا نہیں تھا۔ محبت سے بولا: "اتنی جلدی کیا ہے۔ ذرا اپنا نام تو بتا مجھے؟"

"لال تری۔" لال تری مچلتے ہوئے بولی۔ اس کی زلفیں پھر عبداللہ کے شانے پر آ گئیں۔

"لال تری۔ بڑا پیارا نام ہے۔" عبداللہ جیسے جھوم اٹھا۔

لال تری کا سر، عبداللہ کے شانے پر ٹک گیا۔ بولی:

"میں اچھی لگتی ہوں تجھے؟"

"بہت اچھی۔" لال تری کی ایک زلف کھل کر عبداللہ کے چہرے پر لٹک پڑی۔ عجیب سی مہک تھی اس کے بالوں میں۔

"کیوں آئی ہے میرے پاس؟" عبداللہ نے بے تکا سا سوال کیا۔

لال تری کا سر، عبداللہ کے شانے پر تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ اس نے اپنا سر ایک ہلکے جھٹکے کے ساتھ عبداللہ کے شانے سے ہٹایا۔ پھر مصنوعی غصہ طاری کرتے ہوئے بولی:

"تجھے بے تکی باتیں ہی آتی ہیں یا کوئی اور کام بھی آتا ہے؟"

"اور کام؟" عبداللہ سوچنے لگا۔ بولا: "ہاں اور بہت سے کام جانتا ہوں۔ تلوار چلانا۔ تیر پھینکنا۔ گھوڑے کی مالش کرنا۔ آقا کے پیر دبانا۔"

اس کا ناپختہ ذہن بس یہیں تک سوچ سکا۔ لال تری کی اڑان اس سے بہت آگے تھی۔ اس نے محسوس کر لیا کہ عبداللہ تو ابھی پر پھڑپھڑانا بھی نہیں جانتا۔ وہ اس کے ساتھ کیسے اڑ سکے گا!

لال تری نے کہا:

"میں نے پوچھا تھا تیرا آقا کبھی شہزادی کا ذکر نہیں کرتا۔"

"تو یہ بار بار کیوں پوچھ رہی ہے؟" عبداللہ الجھتے ہوئے بولا۔ "آقا کو کیا پڑی ہے کہ شہزادی کو پوچھتا پھرے وہ خود شہزادہ ہے۔"

"کبھی نہیں پوچھا شہزادی کو؟" لال تری نے مایوسی سے پوچھا۔

"تو کیوں افسوس کرتی ہے۔ میں جو تجھے پوچھتا ہوں۔" عبداللہ، لال تری کا سر اپنے شانہ پر جھکاتے ہوئے بولا۔

"آقا نے ایک دن کہا تھا عبداللہ تجھے شہزادی کیسی لگتی ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ مجھے شہزادی سے کیا مطلب۔ مجھے تو۔ مجھے تو۔" عبداللہ، لال تری کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

"تو تیرے آقا نے شہزادی کو پوچھا تھا؟" لال تری کو جیسے اطمینان ہو گیا۔

لال تری جانے لگی تو عبداللہ نے کہا:

"ذرا اور بیٹھ۔ باتیں کریں گے۔"

لال تری منہ بنا کر بولی: "تیرے تو ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔ تو کیا جانے مرد کس طرح باتیں کرتے ہیں۔"

اور لال تری، لپ جھپ کرتی۔ یہ جا۔ وہ جا۔ عبداللہ دیکھتا رہ گیا۔

لال تری کو دو ڈھائی گھنٹے لگ گئے تھے۔ شہزادی الجائی خاتون، بے چینی سے خیمہ میں ٹہل رہی تھی۔ اُسے خوف تھا کہ کوئی مبادر، لال تری سے الجھ نہ پڑے۔ لال تری واپس آئی تو جیسے اس کی جان میں جان آئی۔

"اتنی دیر لگا دی۔" شہزادی نے شکایت کی مگر اپنائیت کے انداز میں۔

لال تری کھلی پڑ رہی تھی۔ اس نے ہنس کر کہا،

"کیا بتاؤں شہزادی بیگم۔ وہ تو بس چمٹ کے رہ گیا۔"

"کون تجھے چمٹ گیا؟" شہزادی بھی مسکرائی۔

"وہی عبداللہ"۔ لال تری بیٹھتے ہوئے بولی۔ "بس ذرا چھوکرا ہی ہے ابھی۔ کہوا ایران کی سنتا ہے توران کی۔ مگر ہے جیدار۔ گھنٹہ بھر اکیلے میں بیٹھا مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اسے ذرا ڈر نہ لگا۔ بہادر سے قریب بیٹھے گھبراتے لگاتے ہیں اور وہ مجھ سے لگا بیٹھا رہا۔"

"تجھ سے لگا بیٹھا رہا؟" شہزادی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "تجھے ذرا بھی شرم نہیں آئی؟"

"شہزادی جی! جس نے کی شرم۔ اس کے پھوٹے کرم۔" لال تری نے کہہ دیا۔ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ بولی: "ہائے میرے تو کرم پھوٹے ہی ہے۔"

اور پھر جو لال تری نے اپنی ملاقات کی باتیں شروع کیں تو چپ ہونے کا نام ہی نہ لیا۔ ایک ایک مکالمہ اور ایک ایک لفظ یاد کر کے شہزادی کو سنایا۔ جو گزرا تھا وہ بھی اور جو نہ گزرا تھا وہ بھی نمک مرچ لگا کر مزے لے لے کر بیان کر ڈالا۔ شہزادی بے چاری چپ چاپ سنتی رہی مگر قسم لے لو جو لال تری نے ایک بار بھی تیمور کا نام لیا ہو یا اس کی طرف اشارہ تک کیا ہو۔

لال تری نے بولتے بولتے اٹھ کر پانی پیا۔ شاید وہ تھک گئی تھی۔

شہزادی نے غنیمت جانا۔ بولی: "کسی اور کی بھی بات کی تھی تیرے عبداللہ نے؟"

لال تری کو جیسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اپنی بکواس پر اس نے کوئی اظہارِ ندامت نہ کیا۔ سینہ تان کر بولی:

"لو جی۔ بات کیوں نہ کرتا۔ شہزادے تیمور تو آپ کے لیے دن رات آہیں بھرتے ہیں۔ آپ کی تصویریں ہر دم آنکھوں میں گھوم رہی ہیں۔ ایسی ایسی تعریفیں کرتے ہیں آپ کے حسن کی کہ کیا کوئی شاعر کرے گا۔ بس آپ ہی کا خیال انہیں گھیرے۔ بتلاہے بیگم یہ ان کا خانہ زاد، عبداللہ بالکل نکھٹو ہے۔ ایک بار بھی میری تعریف نہیں کی کمبخت نے۔ گھنٹہ بھر کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا رہا اور کوئی بات بھی نہ کی۔"

شہزادی دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ خوش ہونا ہی تھا اسے۔ تیمور تمام بہادروں سے نرالا، طرحدار اور شجاع تھا۔ اس کے جوہر وہ میدانِ جنگ میں دیکھ چکی تھی۔

○

افغانستان کی شمالی سرحد سے نکلنے والا دریائے آمو، مدتوں قدیم ایران اور توران کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتا رہا۔ دریائے آمو، چونے کی چٹانوں میں بل کھاتا جب ہموار علاقوں میں پہنچ کر انگور کی بیلوں اور شہتوت کے درختوں سے لپٹی ہوئی وادی میں پہنچتا تو اس کی رفتار سست پڑ جاتی۔ اس میں سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی گئی تھیں جو دھان، جو اور تربوز کے کھیتوں کو سیراب کرتیں۔ اس کے جنوب میں خراسان کا مشہور شہر آباد ہے جہاں فارسی بولنے والے عمامہ پوش کاشت کار ایشیائے قدیم کے شریف طبع، درویش صفت لوگ کہلاتے تھے۔

دریا پار شمال کی طرف توران تھا۔ یہیں سے گھوڑے اور مویشی پالنے والے خانہ بدوش ابھرے تھے۔ ان کے سروں پر خوشنما ٹوپیاں ہوتی تھیں۔ ایران اور توران میں اس کے سوا اور کوئی حدِ فاصل نہ تھی۔ دریا پار کی سرزمین کو

ماوراء النہر یعنی دریا پار کا علاقہ کہتے ہیں۔

سمرقند جانے والوں کو یہاں سے ضرور عبور کرنا پڑتا۔ وہ ایک تنگ درہ سے گزرتے، اس کا نام باب الحدید تھا۔ اس تنگ و تاریک راستہ سے دو سے زیادہ اونٹ ایک ساتھ نہ گزر سکتے تھے۔ باب الحدید سے گزرنے کے بعد سرسبز و شاداب علاقہ آتا تھا جس کے گرد اگرد پہاڑ کھڑے تھے اور چاروں طرف خندقیں تھیں جو پانی سے بھری رہتی تھیں۔ اس مقام کا نام شہر سبز تھا۔ تیمور یہیں پیدا ہوا۔ تیمور کا مورثِ اعلیٰ قراچار نویان اور چنگیز خان ایک ہی دادا کی اولاد سے تھے۔

قراچار و چنگیز ابنِ عم اند
بکشور کشائی قرین ہم اند

قراچار کا بیٹا ایجل خان، عقل و دانش اور خدا شناسی میں مشہور تھا۔ ہلاکو خان نے ایجل کو تبریز کا حاکم مقرر کیا تھا۔ یہ اس کی خدا شناسی تھی کہ اس کا لڑکا ایلنگر خان مشرف بہ اسلام ہو کر امیراں عظام کے عہدے پر سرفراز ہوا۔ ایلنگر خان کا پوتا امیر طرا غائی تھا۔ یہی تیمور کا باپ تھا۔

بعض تواریخ تاتار، تیمور کی ماں نگینہ خاتون کو چنگیزی نسل سے ظاہر کرتی ہیں۔ بہرحال یہ طے ہے کہ تیمور تاتاری النسل تھا۔

تیمور ۱۳۳۶ء میں شہر سبز (سبزوار) میں ایک ایسے مکان میں پیدا ہوا جو لکڑی اور کچی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مکان کے چاروں طرف کھیت تھے اور قریب ہی مسجد تھی جس سے بلند ہونے والی آواز تیمور کے کانوں میں پانچوں وقت آتی رہتی تھی۔

اس علاقے کے بچے گھوڑوں اور تلواروں کے سائے میں جوان ہوتے تھے۔ بچوں کا محبوب کھیل جنگ تھا۔ انہوں نے آگے کو جھکی ہوئی ایک چٹان کے نیچے ایک غار کو اپنا قلعہ بنایا تھا۔ نصف بچے لکڑی کی تلواریں لے کر قلعہ کی حفاظت کرتے اور نصف اس قلعہ پر حملہ کرتے۔ تیمور کبھی حملہ آور فوج میں شامل ہوتا تو کبھی قلعہ کی حفاظت پسند کرتا مگر ہر دفعہ وہ سردار کا کردار ادا کرتا۔

جب تیمور ذرا جوان ہوا تو اسے سچ مچ کی تلوار دی گئی۔ شہسواری میں وہ پہلے ممتاز تھا۔ شمشیر زنی میں بھی مہارت حاصل کی کہ اس کے ساتھی اس کا لوہا مان گئے۔ امیر طرا غائی بیٹے کو شہسواری اور شمشیر زنی کرتے دیکھتا تو تیمور میں قائدانہ صلاحیتیں نظر آتیں۔ رات کو سونے سے پہلے وہ تیمور کو نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی تلقین کرتا۔

اس نے تیمور کو اپنا مستقبل بنانے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ گفتگو کے آخر میں طرا غائی کہتا:

"مرد کے سامنے صرف ایک راستہ ہوتا ہے"

اور اس راستہ کی طرف تیمور آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔

تیمور کی ماں اس کے بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ وہ اس کربناک تنہائی کو اپنے گھوڑے، کتے اور باز سے دور کرتا تھا۔ وہ انہیں لے کر نکل جاتا اور سیر و شکار کرتا رہتا۔ کبھی تیمور اپنے بچپن کے قلعہ میں جا بیٹھتا اور سمرقند جانے والی سڑک پر گزرنے والے قافلوں کو دیکھتا رہتا۔

تیمور کا برلاس قبیلہ بھی نسلاً تاتاری تھا۔ برلاس قبیلے والے اونچے قد، چوڑے چکلے اور مضبوط ہاتھ پیر کے ہوتے تھے۔ ان کے چہروں پر داڑھیاں ہوتیں۔ وہ پیدل ہوں یا سواری پر، ان کی چال میں ایک خاص تمکنت ہوتی۔ چھت کے نیچے مرنا ان کے لیے توہین کے مترادف تھا۔

طرا غائی باوجود مسلمان ہونے کے اب تک اپنا رشتہ چنگیز خان سے جوڑنے پر فخر کرتا تھا۔ وہ بڑے افسوس سے منگولوں کا انجام بتاتے ہوئے کہتا:

"لیکن خان بزرگ چنگیز خان، تسخیرِ عالم سے پہلے ہی مر گئے۔ تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے ساری دنیا (منگول خانا بشمال اور مغربی ایشیا کو دنیا سمجھتے تھے) اپنے چاروں بیٹوں میں تقسیم کر دی۔ انہوں نے منجھلے بیٹے چغتائی خان کو اس خطہ کی سلطنت بخشی تھی جس میں ہم آباد ہیں لیکن چغتائی خوانین، مے و مینا اور سیر و شکار میں الجھ گئے۔ اور تباہ ہو کر شمالی پہاڑوں میں چلے گئے۔ وہاں خان تراہ ضیافتیں کھانے اور سیر و شکار میں مصروف رہتا ہے اور سمرقند، نیز جملہ ماوراء النہر کی حکومت امیر قزغن کے حوالے کر رکھی ہے۔"

تیمور کے باپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور قبیلہ برلاس کی سرداری تیمور کے چچا حاجی برلاس کے سپرد تھی۔ حاجی برلاس سخت مغرور، وحشی اور مردم بیزار شخص تھا۔ وہ شہر سبز میں بہت کم آتا۔ تیمور کی طرف بھی اس نے کبھی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبیلہ کے تمام جنگجو اور بہادر امیر قزغن کے پاس چلے گئے۔

امیر قزغن بہادروں کا قدر دان تھا۔ وہ بہادروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے پاس بلاتا۔ تیمور کے باپ نے اسے بھی امیر قزغن کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ پس تیمور کو جیسے ہی امیر کا پیغام ملا وہ اپنے گھر اور مویشیوں کا انتظام کر کے امیر قزغن کے دربار میں پہنچ گیا۔

امیر قزغن کی پوتی الجائی خاتون کی وہ رات بڑی اضطرابی تھی۔ اسے کسی پہلو چین نہ آتا۔ ہر کروٹ اسے

تیمور ایک نئے انداز سے مسکراتا نظر آتا۔ کبھی اسے گھورتا۔ کبھی ہنستا۔ کبھی اسے محسوس ہوتا جیسے تیمور دوڑا
ہاتھ کھولے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ بھی اپنے خیالوں میں اس کی طرف بڑھتی۔ پھر یک لخت خیال تو
کا رشتہ ٹوٹ جاتا اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

آدھی رات سے زیادہ گزر گئی لیکن نیند اس کے قریب نہ پھٹکی۔ الجھن زیادہ بڑھی تو الجھائی اٹھ
بیٹھ گئی۔ نمسے کی مسند اور قالین کا فرش ہی ان خیموں کا بستر تھا۔ لال تری ذرا ہٹ کر اس کے پائنتی فرش پر
اوندھی لیٹی تھی۔ شاید وہ بھی جاگ رہی تھی۔ شہزادی کو بیٹھے دیکھا تو خود بھی اٹھ بیٹھی۔

"شہزادی کو نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟" لال تری نے بیٹھے بیٹھے انگڑائی لی۔

"تو بھی تو جاگ رہی ہے۔" شہزادی نے انگڑائی کا جواب انگڑائی سے دیا۔

"میں ــــ میں کب جاگ رہی ہوں۔" لال تری نے سفید جھوٹ کا سہارا لیا اور شہزادی کے قریب
آ گئی۔

شہزادی نے اس کا منہ اوپر اٹھایا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی: "ان میں نیند نام کی تو کوئی
چیز نظر نہیں آتی۔"

لال تری جھینپ گئی۔ بولی: "کیا کروں شہزادی بیگم۔ میری نیند تو جیسے اس کے پاس رہ گئی۔"

"کس کے پاس؟" شہزادی نے اسے چھیڑا۔

"آپ کے شہزادے تیمور کے خانہ زاد عبداللہ کے پاس۔" لال تری نے پٹ سے جواب دیا۔

شہزادی بوکھلا گئی۔ بولی:

"میرا شہزادہ کیوں ہونے لگا۔ میں اسے کیا جانوں؟"

"پھر کوئی اور ہوگا جس کے لیے آپ اب تک جاگ رہی ہیں۔" لال تری، حاضر جوابی میں اپنا جواب
رکھتی تھی۔ شہزادی زچ ہو گئی۔ ہار مان گئی۔ اسے جواب نہ بن پڑا۔

لال تری نے کہا: "یہ مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ بالکل بھوت۔ جن کو چمٹ جائیں پھر ان کا پیچھا
نہیں چھوڑتے۔"

شہزادی پھر بھی نہ بولی۔

"شہزادے سے ملاقات کی ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے۔" لال تری نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"کیا ترکیب ہے؟" شہزادی ایک دم بول پڑی۔

لال تری نے ہنس کر کہا:

"آخر آپ کو بولنا ہی پڑا۔ لیکن آپ تو شہزادے کو جانتی ہی نہیں۔ پھر ترکیب سُن کے کیا کریں گی۔"

"نہیں بتاتی ہو تو نہ بتاؤ۔ میں اب نہیں پوچھوں گی۔" شہزادی الجھائی روٹھ گئی۔ اس نے لال تری کی طرف
اپنے پھیلے ہوئے قدم کھینچ لیے۔

لال تری نے بڑھ کے پیر پکڑ لیے۔ بولی:

"اے میں صدقے جاؤں شہزادی کے۔ آپ روٹھ جائیں گی تو میں زندہ کس کے سہارے رہوں گی۔"

شہزادی کو ہنسی آ گئی۔

"ترکیب بتاؤں؟" لال تری نے پیر دباتے ہوئے کہا۔

"تیری مرضی ہے۔ چاہے بتا چاہے نہ بتا۔" شہزادی نے لاپروائی اور بے تعلقی ظاہر کرنے کی بہت
کوشش کی لیکن کان لال تری کی آواز پر لگا دیے۔

"شہزادے سے ملنے کی ترکیب یہ ہے۔" لال تری کہتے کہتے رکی اور شوخی سے شہزادی کو دیکھا۔ شہزادی
ہمہ تن گوش بنی لال تری کو دیکھ رہی تھی۔

لال تری نے بات دہرائی:

"شہزادے سے ملنے کی ترکیب یہ ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیجیے۔"

شہزادی اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔ لال تری ہنس رہی تھی۔ لال تری نے واقعی بات ہنسی میں کہی تھی لیکن وہ
شہزادی کے دل کو لگ گئی۔

شہزادی سنجیدگی سے بولی: "لال تری۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

لال تری اب تک ہنس رہی تھی۔ شہزادی کے سوال پر اس کی ہنسی رک گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ آج ہنسی
ہنسی میں اس کے منہ سے ایک اہم بات نکل گئی ہے۔

لال تری نے پوچھا:

"شہزادی صاحبہ! کیا آپ واقعی شہزادے سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

"یہی بات میں تجھ سے خدا کے لیے پوچھوں تو!" اس بار شہزادی نے لال تری کو لاجواب کر دیا۔

لال تری جواب دینے کے بجائے دانت نکال کے ہنسنے لگی۔

شہزادی بولی: "کل جمعہ ہے نا؟"

"جی ہاں۔" لال تری نے جواب دیا۔ "لیکن آپ نے کیوں پوچھا؟"

"کل میں میدان میں جاؤں گی۔" شہزادی نے اعلان کیا۔

لال تری بغیر کچھ سمجھے بولی: "کیا شہزادے سے شمشیر زنی کا ارادہ ہے؟"

شہزادی نے کہا: "تو اس بات کو چھوڑ۔ بس کسی طرح عبداللہ کے ذریعے یہ بات شہزادے تک پہنچا دے۔"

لال تری کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

جمعہ کے جمعہ، نماز کے بعد "بہادر" گروہ در گروہ میدان میں جاتے اور جنگ و جدل کی مشق کیا کرتے۔ امیر قزغن بھی تھوڑی دیر کے لیے آتا اور اپنے بہادروں کی بہادری دیکھ دیکھ کے خوش ہوتا۔ تیمور کو "بہادروں" کی رسم معلوم ہوئی تو وہ بھی جمعہ کو ہتھیار سجا کر میدان میں جانے لگا لیکن اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ تیمور کو اس قابل ہی نہ سمجھتے تھے۔

بہادر گھڑ سواری اور شمشیر زنی کے کرتب دکھاتے اور چلے جاتے۔ تیمور اُن کا منہ تکتا رہ جاتا۔ وہ بہت کڑھتا۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ کسی بہادر کو مقابلہ کی دعوت دے اور اسے بتلائے کہ شمشیر زنی اور گھڑ سواری کیا ہوتی ہے۔ لیکن اپنی نظروں میں اس کا بھی ایک مقام تھا، ایک وقار تھا۔ بہادر اس کی طرف سے لاپروا تھے تو وہ ان کی طرف سے لاپروا ہو گیا۔ کتنے ہی جمعے اس طرح گزر چکے تھے۔

لال تری اور عبداللہ سے ہوتا ہوا شہزادی کا پیغام تیمور تک پہنچا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے عبداللہ سے کہا:

"دعا کر عبداللہ۔ آج کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔"

عبداللہ نے فوراً جواب دیا: "میری تو دعا ہے کہ پانچ بہادروں کے سر آپ کے قدموں میں ہوں۔"

"انشاءاللہ۔" تیمور کی زبان سے نکلا۔ "بہادروں کے سروں کے بجائے میں ان کی بہادری اپنے قدموں کے نیچے مسلنا چاہتا ہوں۔"

جمعہ کی اذان ہوئی۔ یہاں مسجد نہ تھی۔ امیر قزغن کا پڑاؤ جنگل میں تھا۔ میدان میں ایک طرف چادریں بچھا دی گئیں۔ تاتاری باوجود وحشی، خونخوار اور خود سر ہونے کے نماز کے سختی سے پابند تھے۔ جب تک ان کے سر سجدے میں رہتے ان کے دل گداز رہتے۔ موم کی طرح نرم مگر سلام پھیرتے ہی وہ گداز اور نرمی سے منہ موڑ لیتے تھے۔ نہ ڈرتے تو صرف خدا سے ڈرتے۔ موت انہیں نہ ڈرا پاتی۔ وہ خود ڈر کر ان سے دور دور رہتی۔

نماز کے بعد "بہادروں" کے گروہ میدان میں آنے شروع ہو گئے۔ ایک سے ایک گرانڈیل، دیو قامت، چلتا پھرتا پہاڑ یا مست ہاتھی۔ ان کے گھوڑے منہ زور، رانوں سے نکلے جاتے۔

خلافِ امید آج امیر قزغن بھی میدان میں آ گیا۔ دراصل شہزادی نے اس سے میدان میں مشق کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ عورتوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔ امیر قزغن نے اجازت دے دی اور خود بھی تماشہ دیکھنے چلا آیا۔

تھوڑی دیر بعد شہزادی بھی مع اپنی سہیلیوں اور لال تری کے آ گئی۔ بہادروں نے اپنے گھوڑے کنارے کر لیے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ آج شہزادی بھی اپنے کرتب دکھائے گی۔ انہوں نے شہزادی کو پہلے موقع دیا۔

سب سے آخر میں تیمور میدان میں پہنچا۔ وہ اپنے گھوڑے کو کبھی دُلکی کبھی پُویا چال چلاتا بڑی شان سے میدان میں داخل ہوا۔ زین کے بائیں تلوار، دائیں ترکش، کاندھے پر کمان، بازو پر بندھی ہوئی ڈھال، سر پر آہنی جھالردار خود۔ اس وقت اس کے بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں وہ انگوٹھی موجود تھی جو اسے مولانا زین الدین نے دی تھی۔ اس انگوٹھی کا نگینہ فیروزے کا تھا۔ مولانا زین الدین شہر سبز کے ایک مردم شناس، دانشمند اور رہنما قسم کے بزرگ مشائخ میں سے تھے۔ مولانا نے ایک دن تیمور کو صحنِ مسجد میں سب سے آخری صف میں نمازیوں کے جوتوں کے پاس بیٹھے دیکھا۔ تیمور بڑی توجہ سے خطبہ سن رہا تھا۔ مولانا کی جوہر شناس نظریں تیمور کے دل میں اتر گئیں۔ انہوں نے اپنے پاس بلا کر تیمور کو اپنی چادر، کلاہ اور فیروزہ کی انگوٹھی دی۔ تیمور اس انگوٹھی کو خاص موقعوں پر پہنا کرتا تھا۔

امیر قزغن کے دونوں طرف بہادر پرے باندھے کھڑے تھے۔ امیر قزغن اگرچہ سن رسیدہ تھا مگر اس کے چہرے سے جلال ٹپکتا تھا۔ یہ اسی کا حوصلہ تھا کہ اس نے تاتاریوں کے مختلف قبائل کو یکجا کر کے ترکستان کا سلطان بنا دیا تھا اور اب تک ان خونخوار سرداروں کو اپنے قابو میں کیے ہوئے تھا۔

سب سے پہلے شہزادی الجائی خاتون نے اپنی گھڑ سواری اور شمشیر زنی کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنی پانچوں سہیلیوں کے ساتھ بیچ میدان میں آئی۔ گھوڑے سے اتری اور گھوڑا سہیلی کے حوالے کر دیا۔ سہیلی شہزادی کا گھوڑا لے کے دور چلی گئی اور پھر اسے چابک مار کر شہزادی کی طرف دوڑا دیا۔ گھوڑا بھاگتا ہوا شہزادی کے پاس آیا تو شہزادی جست لگا کر اس پر سوار ہو گئی اور گھوڑے کی بندھی راسیں کھول کر اس پر قابو پا لیا۔

امیر قزغن اپنی پوتی کے اس کرتب پر مسکرایا۔ بہادروں کے چہروں پر بھی ایک مسکراہٹ پھیل کر فوراً ختم ہو گئی۔ تیمور بہادروں کی سب سے آخری قطار میں کھڑا ہوا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔

اب شہزادی نے اپنی شمشیر زنی کا مظاہرہ کیا۔ پہلے اس نے ایک سہیلی کو دعوت مبارزت دی۔ پھر دوسری کو اس کی مدد کے لیے بلایا۔ اس طرح باری باری پانچوں سہیلیاں اس کے مقابلہ پر آ گئیں۔ شہزادی ان سب کا بڑی ہوشیاری سے مقابلہ کرتی رہی۔ کبھی مدافعت کرتی۔ کبھی بڑھ کے خود حملہ کرتی۔

شہزادی کا مظاہرہ ختم ہو گیا۔ اب بہادروں کی باری تھی۔

بہادروں میں سے ایک اپنا گھوڑا میدان میں لے گیا اور تلوار نکال کر بلند کی۔ یہ ایک قسم کا چیلنج تھا۔ اس وقت امیر قزغن موجود تھا اس لیے امیر نے ایک دوسرے بہادر کو اشارہ کیا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر پہلے کے مقابل پہنچ گیا۔ دونوں میں تلواریں چلنا شروع ہوئیں۔ ایک ساتھ بیٹھنے والے دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے پر بڑھ بڑھ کر حملہ کرتے۔ اس لڑائی میں انہیں زخم بھی آئے لیکن امیر قزغن نے تاشہ پر چوٹ لگوا کر مقابلہ ختم کرا دیا

مقابلے کے وقت ایک تاشہ امیر قزغن یا اس کی عدم موجودگی میں سن رسیدہ بہادر کے قریب رکھ دیا جاتا۔ جب وہ دیکھتا کہ دو میں سے ایک مارا جائے گا تو وہ تاشہ بجانے والے کو اشارہ کرتا۔ تاشہ بجایا جاتا۔ اور مقابلہ برابری پر ختم ہو جاتا۔

اس طرح کے دو تین اور مقابلے ہوئے۔ جب مقابلہ خطرناک صورت اختیار کر لیتا تو تاشہ بجا کر مقابلہ ختم کر دیا جاتا۔ پھر ایک گرانڈیل بہادر گھوڑا بڑھا کر میدان میں آیا۔ امیر قزغن نے دونوں طرف نظریں دوڑائیں۔ بعض بہادر اس کے مقابلے سے جان چرانے لگے اور انہوں نے امیر قزغن سے آنکھیں ملانے کے بعد گردنیں نیچی کر لیں۔

امیر قزغن کی نظریں سب کا جائزہ لیتے ہوئے تیمور تک پہنچیں۔ تیمور نے امیر قزغن کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ امیر کی نظریں جیسے ہی تیمور پر ٹھہریں، تیمور نے گھوڑے کو ایڑ دی اور ہوا کی طرح اڑتا ہوا اپنے مد مقابل کے سامنے پہنچ گیا۔

بہادروں میں کھلبلی مچ گئی۔

گردن جھکانے والوں نے تیمور کو حیرت سے دیکھا۔ دوسرے بہادروں نے تیمور کو حقارت سے دیکھا۔ شہزادی الجائی خاتون کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی سہیلیاں آسمان کی طرف دیکھ کر دعائیں مانگنے لگیں۔ لالہ تری اور عبداللہ جو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دور ایک پیڑ کے نیچے کھڑے پیار کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ اس پورے مجمعے میں صرف امیر قزغن ہی تھا جس کا چہرہ تاثرات سے خالی تھا۔ وہ بڑے غور سے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

گرانڈیل بہادر پوری طرح آہن پوش تھا۔ سر پر آہنی خود، گردن کے گرد دوہری زنجیروں کا گلوبند۔ سینہ بند جوشن۔ غرضیکہ وہ تمام مروجہ اسلحہ سے پوری طرح لیس تھا۔ اس نے ایک سترہ سال کے لڑکے کو اپنے مقابل دیکھا تو زور کا قہقہہ بلند کیا اور اپنی بھاری، لانبی تلوار سے تیمور پر ایک بھرپور وار کیا۔ تیمور کے شانے پر ڈھال کسی ہوئی تھی۔ تیمور چاہتا تو اس وار کو اپنی ڈھال پر روک سکتا تھا لیکن اسے آج اپنی شمشیر کو شمشیر تیمور ثابت کرنا تھا۔ اس نے تلوار کا وار تلوار پر روکا اور پھر کلائی کو پھرکی کی طرح گھمایا۔ لوگوں نے دیکھا کہ گرانڈیل بہادر کی تلوار اس کے مضبوط پنجے سے چھوٹ کر ہوا میں رقص کرتی ہوئی دور جا گری۔

پورے ماحول پر سناٹا طاری ہو گیا۔ لوگ سکتے میں آ گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ طاقت اور شمشیر زنی کا فیصلہ ایک لمحہ میں ہو گیا۔ خود تیمور کا مقابلہ کرنے والا بہادر اپنی جگہ بت بن کر رہ گیا۔ بہادر بڑی دیر پھٹی پھٹی نظروں سے تیمور کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے تیمور سے کچھ کہا۔ تیمور نے اپنی تلوار نیام میں ڈال لی۔ اور دایاں ہاتھ بہادر کی طرف بڑھا دیا۔ گرانڈیل بہادر نے بڑی عقیدت سے سر جھکا کر تیمور کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

لوگوں کو جیسے ہوش آ گیا۔ انہوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کرنا شروع کر دیے۔ شہزادی الجائی خاتون کا چہرہ غنچہ کی طرح ایک دم کھل گیا لیکن اس کی یہ خوشی پھر گہنا گئی۔ ایک اور بہادر گھوڑا اڑاتا ہوا تیمور کے مقابل پہنچ گیا۔ تیمور کا ہاتھ نیام تک پہنچا ہی تھا کہ بہادر نے تیزی سے حملہ کر دیا۔ تیمور کے ہاتھ میں بجلیاں بھری تھیں۔ اس نے تیزی سے تلوار کھینچی۔ پھر تلواریں اتنے زور سے ٹکرائیں کہ ان میں سے چنگاریاں نکل پڑیں۔

تیمور مقابلے کے لیے پوری طرح تیار نہ ہو سکا تھا اس لیے اسے مدافعت کرنا پڑی لیکن فوراً ہی اس [illegible] تلوار اٹھا کے بہادر پر حملہ کر دیا۔ بہادر نے بھی یہ وار تلوار پر ہی روکا مگر لوگوں کی نظروں میں ایک بار پھر [illegible] منظر گھوم گیا۔ بہادر کی تلوار ہوا میں اڑتی ہوئی بہت دور جا کر گری۔

تیمور نے پانچ بہادروں کی تلواریں اسی طرح اڑا کر اپنی شمشیر زنی کو تسلیم کرایا۔ اب کوئی بہادر خود [illegible] اس کے مقابلے پر جانے کو تیار نہ تھا۔

امیر قزغن دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اس نے تیمور کے مستقبل کے لیے کئی فیصلے کر ڈالے [illegible] اس کے اظہار کا وقت نہ آیا تھا۔

امیر قزغن نے دیکھا کہ ہر بہادر تیمور کے سامنے جانے سے کترا رہا ہے تو اس نے ایک بہت خود سر [illegible] سرکش بہادر کو مقابلے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنا گھوڑا میدان کی طرف بڑھایا مگر بڑی بے دلی سے۔ اس کی قسمت [illegible] بھی کہ بے عزتی سے بچ گیا۔ اس کی عزت ایک بے زبان جانور بچا گیا۔

بہادر نیم دلی سے تیمور کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس وقت جنگل سے ایک ہرن نکل کر میدان میں بھاگنے [illegible] امیر قزغن کے پڑاؤ کی وجہ سے اس جنگل کے تمام جانور اور چرند پرند یا تو بھاگ نکلے تھے یا بہادروں کے تیروں [illegible] نشانہ بن گئے تھے۔ اس وقت اس ہرن کا اس طرح میدان میں آنا امیر قزغن کو بدشگونی محسوس ہوا۔ تاتاری ہر چند [illegible] مسلمان ہو گئے تھے لیکن آباؤ اجداد کی بعض کمزوریاں ان میں ابھی تک موجود تھیں۔ امیر قزغن نے ہرن کو دیکھ [illegible] ہی تیمور کو آواز دی:

"جانے نہ پائے یہ کم بخت!"

اس آواز کے ساتھ تیمور نے اپنا گھوڑا ہرن کے پیچھے ڈال دیا۔ ترکش اتارا، تیر جوڑا مگر ہرن قلانچ [illegible] بھرتا اس کی زد سے دور نکل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہرن اور تیمور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اسی وقت بہادر [illegible] صف میں سے دس بارہ بہادر نکلے اور وہ بھی تیمور کے پیچھے چل پڑے۔ یہ وہ بہادر تھے جنہوں نے تیمور [illegible] بہادری دیکھ کر اس کی عظمت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اب وہ اس کے غلام تھے اور اسے آقا سمجھ کر اس کی مدد کو روانہ [illegible] ہوئے تھے۔

ہرن جھکائیاں دیتا اور تیمور گھوڑا اڑاتا چلا جا رہا تھا۔ تیمور نے کئی بار نشانہ لینا چاہا مگر ہرن ز[illegible] آیا۔ میدان ختم ہونے پر پہاڑی علاقہ آ گیا مگر تیمور نے ہرن کا پیچھا نہ چھوڑا اور آخر اسے جا لیا۔ تیمور نے [illegible]

ہرن زخمی ہوا اور اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ تیمور نے گھوڑا اور تیز کر دیا۔ زمین ہموار نہ تھی۔ اونچی نیچی چٹانوں پتھروں آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ تیمور ہرن کے بالکل سر پر پہنچ گیا۔ ہرن ایک اونچی جگہ جا کر ٹھہرا۔ پھر ایک دم دائیں جانب گھوم گیا۔

تیمور اس کے بالکل قریب تھا۔ اس نے تیز رفتار گھوڑے کو روکنا چاہا مگر گھوڑا اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں سے ہرن گھوما تھا۔ اس اونچائی کے دوسری طرف ایک چوڑا نالہ تھا جو تیمور کو نظر نہ آیا تھا اور اب اس کا گھوڑا نالہ کے منہ پر تھا۔ اتنا وقت نہ تھا کہ تیمور راسیں کھینچ کر خود کو نالے میں گرنے سے بچا سکے یا اسے دائیں بائیں گھما سکے۔ تیمور کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ گھوڑے کو نالہ پار کرنے پر مجبور کرے۔ اس نے تیزی سے گھوڑے کو مہمیز کیا۔ وفادار جانور ہوا میں اچھلا اور پوری طاقت سے نالہ پار کرنے کے لیے جست لگائی لیکن پہاڑی نالہ اس کی جست سے زیادہ چوڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑے کی اگلی ٹانگیں تو دوسرے کنارے پر پہنچ گئیں لیکن پچھلی ٹانگیں نالے میں جھول گئیں۔

قدرت نے اس وقت تیمور میں بلا کی پھرتی بھر دی۔ اس نے فوراً اپنے دونوں پیر رکابوں سے آزاد کیے اور گھوڑے سے جست لگا کر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ تیمور تو بچ گیا مگر اس کا وفادار جانور اس پر قربان ہو گیا۔ گھوڑا تیس فٹ نیچے نالے میں گر کر مر گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب تیمور کے ہمدرد اور مطیع بہادر اسے تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ تیمور بڑے اطمینان سے دوسرے کنارے پر بیٹھا ہے اور اس کا گھوڑا نیچے گہرے نالے میں مرا پڑا ہے۔ وہ سخت حیران تھے کہ تیمور نے اتنا چوڑا نالہ کیسے پار کیا اور اگر تیمور گھوڑے کی پیٹھ پر تھا تو اس کا بچ جانا عجوبہ یا معجزہ سے کم نہ تھا۔ بہادر نالہ کے ساتھ ساتھ دور دور تک چلے گئے۔ ایک جگہ نالے کو پایاب دیکھ کر اسے پار کر کے تیمور کے پاس پہنچے۔ تیمور نے جب انہیں اس حیرت انگیز حادثہ کی تفصیل بتائی تو وہ فرطِ محبت سے تیمور سے لپٹ گئے اور اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔

پھر جب میدان میں واپس آ کر بہادروں نے یہ باتیں امیر قزغن کو بتائیں تو اس نے بڑے تجربے کی بات بتائی۔ اس نے کہا:

"ہر بہادر کے لیے ضروری ہے کہ وہ شمشیر زن اور تیر انداز ہو لیکن ایک قائد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں بجلی کی سی پھرتی اور قوتِ فیصلہ کی تیزی ہو۔"

اس وقت ہر ایک کی زبان پر تیمور کا نام تھا۔ شہزادی، لال تری اور عبداللہ تو تیمور کے گرد بھونرے کی طرح منڈلا رہے تھے۔ تیمور، امیر قزغن کے پاس کھڑا تھا اور تمام بہادر اسے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ بہادر جو تیمور کی اہلیت کے قائل ہو گئے تھے وہ اسے بڑی محبت اور خلوص سے دیکھ رہے تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے جو اسے دیکھ تو رہے تھے لیکن ان کی نظریں حسد اور جلن میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اس رات امیر قزغن نے خیمہ گاہ کے سامنے تمام بہادروں کی ضیافت کی۔ یہ دعوت دراصل تیمور کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ رات گئے جب ضیافت ختم ہوئی تو امیر قزغن نے کھنکتی آواز میں اعلان کیا:

"آج سے پورے پندرہ دن بعد یعنی اگلے جمعے سے اگلے جمعہ کو برلاس قبیلے کے سردار طراغائی کے بیٹے تیمور کی شادی ہماری پوتی الجائی خاتون کے ساتھ ہوگی۔"

یہ اعلان بالکل غیر متوقع تھا۔ خود تیمور کو بڑی دیر بعد اپنے کانوں پر یقین آیا۔ ہر بہادر یہ اعلان سن کر حیران رہ گیا لیکن بہادروں کی اکثریت نے اس رشتہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ کچھ بہادروں کو یہ رشتہ پسند نہ آیا۔ شاید وہ خود اس کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

امیر قزغن نے تاتاری قبائل کی متحدہ قوت کی مدد سے شمال کے "ترا خان" کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ قبائلی سرداروں کو یہ زعم تھا کہ قزغن کو ان کی وجہ سے سمرقند کی امارت ملی ہے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک قزغن کے بعد امیرِ سمرقند بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اب تیمور ان کی راہ میں حائل ہو رہا تھا اور ان کے خواب کے تار بکھر گئے تھے۔ امیر قزغن نے قوتِ بازو سے ان سرداروں کو اپنے قابو میں رکھا تھا لیکن اب وہ بوڑھا ہو رہا تھا۔ اسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ یہ سہارا جب تیمور بن کر اس کے سامنے آیا تو امیر قزغن اسے فوراً سینے سے لگانے پر آمادہ ہو گیا۔

○

الجائی خاتون بڑی دیدہ زیب اور جاذب نظر لڑکی تھی۔ اس کا حسن کیمانشے زمانہ تھا۔ چھریرا بدن، درمیانہ قد، موٹی موٹی غلافی آنکھیں اور عمر برس پندرہ یا کہ سولہ کے سن کے مصداق۔ وہ چلتی تو نغمے جگاتی۔ گلاب کی لرزیدہ شاخ کی طرح۔ ہنستی تو پھول برستے۔ ستارہ شناس اس کے درخشندہ مستقبل کی پہلے ہی پیشین گوئی کر چکے تھے۔

آج وہ اس ہستی کی دلہن بننے جا رہی تھی جو تاریخ میں فاتحِ اعظم اور لرزندۂ جہاں کے نام سے مشہور ہوا۔ سکندر کی فتوحات اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

تیمور نے اپنے باپ طراغائی کو شہر سبز سے بلوایا۔ انہیں یہ پیغام بھیجا کہ مولانا زین الدین کو اپنے ساتھ ضرور لائیں۔

میدان میں بچھے ہوئے قالین مہمانوں کے لیے کم پڑ گئے۔ دوسرا فرش بچھایا گیا۔ امیرِ سمرقند کی دعوت سے کون انکار کر سکتا تھا۔

شہزادی الجائی خاتون کو اس کے خیمہ میں دلہن بنایا جا رہا تھا۔ مشاطائیں اسے سنوار رہی تھیں۔ سہیلیاں اور کنیزیں پروانہ وار صدقے ہوئی جاتی تھیں۔ الجائی کو پہلے عرقِ گلاب سے غسل دیا گیا۔ اس کے لانبے بالوں میں پہلے روغنِ کنجد لگایا گیا۔ پھر ان بالوں کو گرم گرم دودھ سے مل مل کر دھویا گیا۔ بال ریشم کی طرح نرم ہو گئے۔ اس کے مرمریں بدن اور دراز بالوں کو نرم کپڑے سے پونچھ کر خشک کیا گیا۔ بالوں میں کنگھی کر کے مانگ نکالی گئی لیکن انہیں نہ تو گوندھا گیا اور نہ مینڈھیاں بنائی گئیں۔ جب شہزادی کو زردوزی کا سرخ عروسی جوڑا پہنایا گیا تو لال تری نے سب سے پہلے دوڑ کر شہزادی کو سینے سے چمٹا لیا۔

شہزادی کا سینہ اس وقت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لال تری آہستہ سے شہزادی کے کان میں بولی:

"یہ دھڑکنیں جب دھڑکنوں سے ملیں گی تو طوفان رک جائے گا۔"

بھڑکیلے چمکدار عروسی جوڑے پر شہزادی کو ایک گنگا جمنی کام کا لانبا سا جُبّہ پہنایا گیا۔ شہزادی کے شانوں پر بکھرے ہوئے ریشمی بال، اس کے درمیان دمکتا چمکتا مکھڑا جیسے کالی کالی بدلیوں سے چاند آنکھ مچولی کھیل رہا ہو۔ شہزادی کے کانوں میں آویزے ڈالے گئے اور گلے میں زمرد کا گلوبند، سر پہ طلائی ٹوپی پہنائی گئی جس میں ریشمی پھولدار طرّہ لٹک رہا تھا۔

نکاح شرعی انداز میں محفل میں پڑھایا گیا۔ مولانا زین الدین قاضی کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے دلہا دلہن کے نام بآوازِ بلند پکارے۔ دلہا نے ایجاب و قبول کے فقرے دہرائے۔ نکاح نامہ پر معتبر گواہوں کے دستخط ہوئے۔ نکاح کا خطبہ پڑھنے سے پہلے دلہن کو محفل میں بلوایا گیا۔ لڑکی کی رضامندی معلوم کرنے کا تاتاریوں میں یہی دستور تھا۔ اگر لڑکی محفل میں آ جائے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ لڑکی عقد پہ رضامند ہے۔

دلہن الجائی خاتون سجی دھجی، لجاتی ہوئی، سہیلیوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں محفل میں داخل ہوئی۔ سب کی

نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

دلہن، محفل میں زیادہ دیر نہ بیٹھی اور خطبۂ نکاح ختم ہوتے ہی پھر اپنے خیمے کے اندر واپس چلی گئی۔

ذرا دیر بعد وہ پھر فتنے اٹھاتی اور جادو جگاتی محفل میں لائی گئی۔ اب اس پر دوسری ہی بہار تھی۔ اس کے مرمریں بدن پر عروسی جوڑے کے بجائے صرف شب خوابی کی عبا اور اوپر جبّہ تھا۔ چہرے پر آٹے کے چاول پوڈر اور غازہ لگایا گیا تھا جس سے اس کا حسن اور نکھر آیا تھا۔ اس کی دونوں بھوؤں کے درمیان کسی درخت کے پتّے کے عرق سے ایک سیاہی مائل نیلا خط کھینچا گیا تھا۔ اس خط نے اس کی پیشانی کی تابندگی میں چار چاند لگا دیے تھے۔

دلہن شہزادی جب شرماتی، لجاتی اور گھبراتی مہمانوں کے درمیان سے گزری تو امیر قزغن نے مٹھی بھر کے دلہن پر سے موتی نچھاور کیے اور حکم دیا کہ نقاروں پر ضرب لگائی جائے۔ تاتاری، جشن اور جنگ دونوں موقعوں پر نقارے ضرور بجواتے تھے۔

مولانا زین الدین نے بلند آواز سے کہا:

"دلہا اور دلہن پر خدائے تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں۔"

حاضرین محفل نے آمین کہہ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ دلہن پھر زنانے خیمے میں چلی گئی۔ امیر قزغن نے اپنے سرداروں اور مہمانوں میں انعام و اکرام کی بارش کر دی۔ تلواریں، خنجر، خلعتیں، دیبا و زربفت کے اور بہت سی نفیس نفیس چیزیں۔

تمام مہمان خوش تھے مگر امیر قزغن کو ایک بات کا ملال تھا۔ اس کے دو سردار اس محفل میں شریک ہوئے۔ ایک تو تیمور کا چچا حاجی برلاس۔ دوسرا البانی کے قبیلہ کا سردار بایزید جلائر۔

جشن کا بازار گرم ہوا۔ مہمان ٹولیاں بنا کر ادھر ادھر جا بیٹھے۔ کچھ قالینوں پر، کچھ ہری ہری گھاس کے فرشِ زمردیں پر۔ داستان گوؤں نے چکارے کی دھیمی دھن پر تاتاریوں کی رزمیہ داستانیں چھیڑ دیں۔ کی جھن جھن اور تن تن میں جب داستان گوؤں کی پاٹ دار آوازیں بلند ہوتیں تو سماں بندھ گیا۔ یہ داستان گو الفاظ و آواز کے اتار چڑھاؤ میں ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے شامل کر کے داستان میں حقیقت کا رنگ بھرتے اور سامعین جھوم جھوم اٹھتے۔

اسی دوران شام ہو گئی۔ غلام مشعلیں اور قندیلیں لے کر آ گئے۔ پھر کیا تھا! درختوں کے نیچے سرے سے دریا کے کنارے تک کہکشاں سی کھنچ گئی۔ پھر سینیوں میں لگا ہر ایک کے سامنے ماحضر پیش کیا گیا۔ گھوڑوں کے پٹھوں کے کباب، گرم گرم بھاپ اٹھتی ہوئی اور بھیڑوں کے سالم بھنے ہوئے بچے، جنہیں دیکھ کر اشتہا بڑھتی ہے۔ روٹیاں موٹی موٹی جو کے آٹے کی۔ ان روٹیوں پر شہد چپڑا ہوا تھا۔ مہمانوں نے دل بھر کر کھایا اور کھانے کی تعریف کی۔

دلہن شہزادی آخری بار محفل میں آئی۔

اس وقت تیمور محفل میں موجود نہ تھا۔ اسے اس کے خیمہ میں بھیج دیا گیا تھا تاکہ وہ دلہن کے آخری پھیرے میں اسے رخصت کرانے آئے۔

دلہن خراماں خراماں مہمانوں کے درمیان سے گزر کر فرشِ محفل کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔

اسی وقت تیمور ایک عربی گھوڑے پر سوار فرشِ قالین تک آیا۔ تیمور کے گھوڑے کی زین کی اونی اور ریشمی جھالریں، قالین کا منہ چڑھتی معلوم ہوتی تھیں۔

تیمور نے دزدیدہ نظروں سے حاضرینِ محفل کو دیکھا۔ پھر دلہن شہزادی کو پھول کی طرح فرش سے اٹھا کر اپنے آگے بٹھا لیا اور خیمۂ عروسی کا رخ کیا۔

خیمہ عروسی میں الجائی خاتون کے میکے کی عورتیں، سہیلیاں اور کنیزیں، جہیز کے سامان کو حفاظت سے صندوقوں میں دھر رہی تھیں۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی تو وہ جلدی جلدی صندوق بند کر کے دلہن کے استقبال کو کھڑی ہو گئیں۔

تیمور، دلہن کو لیے خیمہ پر پہنچا۔

پہلے دلہن کو اتارا، پھر خود گھوڑے سے اترا۔ اس نے دلہن کا ہاتھ پکڑ کر خیمہ کے اندر بھیج دیا۔

اور خود باہر انتظار کرنے لگا۔

خیمہ میں موجود تمام سہاگنوں نے بڑھ کر دلہن کا استقبال کیا۔ پھر انہوں نے دلہن کا جبّہ اتار دیا۔ اب شہزادی کے بدن پر صرف کھلی آستینوں کی ایک عبا باقی رہ گئی تھی۔

شہزادی حیا سے پانی پانی ہو گئی۔

عورتیں ایک ایک کر کے باہر نکلیں اور تیمور کو سلام کر کے رخصت ہو گئیں۔

تیمور دبے پاؤں خیمے کے اندر داخل ہوا۔ اس رات الجائی اپنے شوہر کے پہلو میں لیٹی ہو
کی لہروں کے دھیمے نغمے اور نقاروں کا بے ہنگم شور سنتی رہی۔

صبح کو جب وہ امیر قزغن کو سلام کرنے گئی تو سب سے پہلے اس نے امیر سے لال تری اور
کی شادی کی اجازت حاصل کی تھی!

○

ملکوتی

حاکمِ ہرات نے حکم دیا: "سفیروں کو پیش کیا جائے"۔

دو نوجوان قلعۂ ہرات کے اس کمرے میں لائے گئے جہاں ہرات کا خودسر اور خودمختار حاکم ملک معزالدین حسین، اپنے سرداروں کے ساتھ بڑی شان سے بیٹھا تھا۔

یہ نوجوان حکومتِ سمرقند کے امیر قزغن کا ایک ضروری پیغام لے کر آئے تھے۔ دونوں کی عمریں یکساں اور صورتیں بھی تقریباً ملتی جلتی تھیں۔ سفیروں نے حسبِ دستور حاکمِ ہرات کو کورنش (تعظیم) پیش کی اور نظریں نیچی کر کے کھڑے ہو گئے۔

ملک معزالدین نے ایک سفیر سے پوچھا:

"تمہارا نام؟"

"عبداللہ!" سفیر نے جواب دیا۔

ملک دوسرے سفیر سے مخاطب ہوا:

"تمہارا نام؟"

"عبداللہ!" اس نے بھی ادب سے جواب دیا۔

والیِ ہرات کی تیوریاں ایک دم چڑھ گئیں۔ گرج کر بولا:

"بدتمیز۔ ذلیل کتو! تم والیِ ہرات سے مذاق کر رہے ہو؟"

ایک عبداللہ نے کہا:

"اے والیِ ہرات! یہ مذاق ہرگز نہیں۔ ہم دونوں عبداللہ ہیں اور حاکمِ سمرقند امیر قزعن کا ایک اہم پیغام لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ آپ ہماری توہین نہ کیجیے۔ سفیر کی توہین، سفیر بھیجنے والے کی توہین ہوتی ہے۔ اس کے نتائج خراب نکل سکتے ہیں۔"

والیِ ہرات کو اور زیادہ تاؤ آگیا۔ بولا:

"تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو۔ ہم تمہارے ٹکڑے اڑا دیں گے۔ دیکھیں تمہارا امیر ہمارا کیا بگاڑتا ہے"۔

دوسرا عبداللہ جواب دینے والا تھا کہ قلعہ ہرات کا قاضی تاج الملک جو ملک معزالدین کے برابر بیٹھا تھا۔ بول پڑا:

"اے ملکِ ہرات کے خود مختار تاجدار۔ یہ دونوں سفارت کار ہیں۔ ان کا کام اپنے آقا کا پیغام پہنچانا اور جواب لے جانا ہے۔ انہیں نہ تو مذاق کرنے کا حق ہے اور نہ رعب ڈالنے کا حکم۔ ملکی اور سیاسی دستور کے مطابق سفیروں کا پیغام سننا اور اس کا جواب دینا ضروری ہے۔ جو حاکم سفیروں کو قتل کرتے ہیں وہ اپنے ملک کو بدنام کرتے ہیں"۔

قاضی تاج الملک، ملکِ ہرات کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا تھا۔ دربار میں سوائے اس کے اور کوئی اس وقت تک گفتگو نہ کر سکتا تھا جب تک ملک معزالدین حسین اسے خود اجازت نہ دے۔ ملک انتہائی اُجڈ اور بددماغ قسم کا افغان حکمران تھا۔ مغلوں کی جہالت اور تاتاریوں کی سرکشی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی لیکن وہ بڑا شمشیر زن اور جاہ و جلال کا حکمران تھا۔ جبھی تو وہ نہ شمال کے مغل خانِ اعظم کی پروا کرتا اور نہ سمرقند کے امیر قزعن کو خاطر میں لاتا تھا۔

قاضی کی باتوں کا اس پر تھوڑا بہت اثر تو ہوا لیکن اسے غصہ آجاتا تو اس پر قابو پاتے بھی دیر لگتی تھی۔ منہ بنا کر بولا:

"ملکی اور سیاسی دستور کا خیال تو بعد میں رکھا جائے گا پہلے یہ بتایا جائے کہ دو سفیروں کا ایک نام کیوں رکھا گیا؟"

ظاہر ہے کہ یہ انتہائی جاہلانہ سوال تھا۔ ایک نام کے کتنے ہی آدمی ہوتے ہیں۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ

سمرقند کے دونوں سفیروں کا ایک ہی نام تھا۔

ان سفیروں میں ایک عبداللہ تو امیر تیمور کا خانہ زاد غلام تھا اور دوسرا عبداللہ تیمور کے رسالہ کا ایک کمسن سوار تھا۔

جس وقت سمرقند کے حاکم امیر قزعن نے تیمور سے سفارت پر بھیجنے کے لیے دو قابلِ اعتماد آدمی طلب کیے تو تیمور نے ان دونوں کو پیش کر دیا۔ اسے بھی انہیں پیش کرتے ہوئے یہ خیال نہ گزرا کہ ان دونوں کے نام، عمریں اور کسی حد تک صورتیں بھی یکساں تھیں۔ پہلی نظر میں دونوں عبداللہ آپس میں جڑواں بھائی دکھائی دیتے تھے۔

قاضی نے دیکھا کہ ملک معزالدین کا غصہ اب بھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور اس نے ایک اور الٹا سوال کر دیا ہے تو بات کو ختم کرتے ہوئے بولا:

"اے تاجدار، یہ بے چارے تو سفیر ہیں۔ ایک نام کے دو آدمی بھیجنے کی غلطی تو ان کے آقاؤں سے ہوئی ہے۔ اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں"۔

ملک معزالدین کو قاضی کے جواب سے اطمینان نہ ہوا۔ ایک سفیر سے پوچھا:

"تیرا آقا کون ہے؟"

جس سفیر سے سوال کیا گیا وہ تیمور کا خانہ زاد غلام عبداللہ تھا۔ اس نے بڑے فخر سے جواب دیا:

"میرا آقا شہر سبز کا سردار تیمور گورگانی ہے"۔

ملک کے جیسے آگ لگ گئی۔ حقارت سے بولا:

"کون تیمور۔ وہ طراغائی کا نالائق بیٹا۔ قبیلہ برلاس کا آوارہ گرد۔ امیر قزعن کا داماد بن جانے سے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں اس کی گردن مروڑ دوں گا"۔

عبداللہ اپنے آقا کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ بگڑ کر بولا:

"والیِ ہرات میرے آقا کی توہین کر رہے ہیں۔ میں بغیر پیغام دیے واپس جانا چاہتا ہوں"۔

"تو واپس نہیں جا سکتا"۔

ملک دانت کٹکٹاتے ہوئے بولا:

"میں تجھے قید میں رکھوں گا۔ تیرے آقا میں ہمت ہو تو چھڑانے آجائے"۔

قاضیِ ہرات اپنی جگہ بڑا جز بز ہو رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ حاکمِ سمرقند کے سفیر ہیں۔ ان کے ساتھ ذرا بھی زیادتی ہوئی تو امیر قزغن ہرات کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ ہرات اگرچہ افغان قبائل کی ایک مضبوط ریاست تھی لیکن امیر قزغن تمام تاتاری قبائل کا حاکمِ اعلا تھا۔ اس سے ٹکر لینا ہرات کے لیے کسی طرح مناسب نہ تھا۔

قاضی نے ملک کو سمجھانے کی کوشش کی:

"اے والیِ ہرات! ایک آزاد و خودمختار تاجدار کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ معمولی سفیروں سے بحث کرے۔ ان سے پوچھا جائے کہ یہ کس کا اور کیا پیغام لائے ہیں۔"

قاضیِ ہرات کا یہ حربہ کام کر گیا۔ ملک معزالدین فوراً بولا:

"قاضی صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ ان ادنیٰ اور ذلیل آدمیوں سے ہمیں بحث نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو واقعی بڑی ذلت کی بات ہے۔ آپ نے یہ ہمیں پہلے ہی کیوں نہ بتایا۔"

قاضی صاحب دل میں بہت خوش ہوئے کہ چلو کسی طرح ملک معزالدین حسین کا غصہ ٹھنڈا تو ہوا۔ وہ بولے:

"والیِ ہرات کی کوئی ذلت نہیں ہوئی۔ آپ نے ان سے گفتگو کر کے ان کی عزت افزائی کی ہے۔ یہ آپ کے احسان مند رہیں گے کہ آپ نے انہیں بات کرنے کا اعزاز بخشا۔"

"اچھا اچھا۔ یہ بات ہے۔"

یہ کہتے ہوئے ملک معزالدین نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ قہقہے کی گونج کم ہوئی تو بولا:

"ہاں قاضی صاحب! اب ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔"

قاضی نے جواب دیا:

"ان کو حکم دیجیے کہ یہ پیغام سنائیں۔ اگر پیغام خط کی صورت میں ہے تو خط پیش کریں۔"

عبداللہ نے کہا:

"پیغام زبانی ہے اور جواب بھی زبانی مانگا گیا ہے۔ یہ پیغام حاکمِ سمرقند امیر قزغن کی طرف سے ہے جو تمام تاتاری قبائل کا سردارِ اعلا ہے۔ جس کی سلطنت ایران سے ماوراءالنہر، بخارا اور ترکستان تک پھیلی ہے۔ جسے بلادِ شمال کے خانِ اعظم نے حکومت کا پروانہ دیا ہے۔ وہ امیر قزغن، والیِ ہرات ملک معزالدین حسین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔"

والیِ ہرات غرور سے اکڑ گیا۔ بولا:

"امیر قزغن واقعی ایک بڑا حاکم ہے۔ میں بھی اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

دوسرے عبداللہ نے فوراً لقمہ دیا:

"والیِ ہرات، ابھی امیر قزغن کا پیغام مکمل نہیں ہوا۔"

"ہاں۔ پورا پیغام سنایا جائے۔" ملک معزالدین اور اکڑ کر بیٹھ گیا۔

پہلے عبداللہ نے کہنا شروع کیا:

"امیر قزغن حاکمِ سمرقند ملک معزالدین حسین کو مطلع کرتا ہے کہ حکومتِ ہرات کے کچھ لٹیرے حکومتِ سمرقند کی سرحد میں گھس کر دو سو گھوڑے اور کچھ سامان زبردستی لے آئے ہیں اس لیے امیر سمرقند مطالبہ کرتا ہے کہ چوری کیا ہوا سامان فوراً واپس کیا جائے اور ان لٹیروں کو گرفتار کر کے سمرقند کے دربار میں بھیج دیا جائے۔"

یہ پیغام نہ تھا بلکہ کھلا ہوا الٹی میٹم تھا۔

ملک معزالدین حسین کے دربار میں بیٹھے ہوئے تمام سرداروں کے چہرے غصہ سے سرخ ہو گئے۔ وہ بار بار اپنی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھتے۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ وہ اس الٹی میٹم کا جواب تلوار سے دینا چاہتے ہیں۔ پھر بھی کسی سردار نے نیام سے تلوار نہیں نکالی۔

افغان جاہل ضرور تھے لیکن اُن کے دربار کے کچھ اصول تھے جس کی وہ سختی سے پابندی کرتے تھے افغان قبائل بڑی مشکل سے متحد ہوتے لیکن جب وہ متحد ہو کر کسی ایک کو اپنا حاکم تسلیم کر لیتے تو پھر اس کے سامنے دم نہ مارتے اور اس کے صحیح اور غلط ہر حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتے۔ دربار میں اس وقت تک کوئی تلوار نہ نکال سکتا تھا جب تک والیِ ہرات تلوار نکال کر اعلانِ جنگ نہ کرتا۔

والیِ ہرات ملک معزالدین حسین نے دربار میں بیٹھے ہوئے تمام سرداروں کے چہرے فرداً فرداً دیکھے۔ ملک کا چہرہ خود بھی غصہ سے تمتما رہا تھا۔ اس کے سردار بھی غصے سے کانپ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

والیِ ہرات آہستہ آہستہ اپنے قریب رکھی ہوئی تلوار پر ہاتھ لے گیا۔ نیام سے تلوار باہر نکالی اور پھر تلوار ہوا میں لہراتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ تمام سرداروں نے اس کی تقلید کی۔

ملک معزالدین سفیروں کو گھورتے ہوئے بولا:

"ہمارا جواب تلوار ہے۔ امیر قزعن سے جا کر کہہ دو کہ ملک معزالدین حسین اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ نبرد آزما ہو چکا ہے۔ اسے حوصلہ ہو تو پھر مقابلے پر آ جائے۔ حکومت ہرات کے افغان جوان اسے سرحد پر مل ملیں گے"۔

قاضی تاج الملک کو علم تھا کہ امیر قزعن اور ملک معزالدین حسین میں کئی معرکے ہو چکے ہیں جن میں ملک کا پلہ بھاری رہا ہے لیکن یہ اُن دنوں کی بات تھی جب امیر قزعن محض ایک تاتاری سردار تھا اور اس کے قبضے میں صرف تھوڑا سا علاقہ تھا اور اب تو امیر قزعن حاکمِ سمرقند تھا۔ تمام تاتاری سردار اسے اپنا امیر اور بادشاہ سمجھتے تھے۔ اس کی طاقت پہلے سے دس گنا زیادہ ہو چکی تھی۔ اگر خدانخواستہ یہ ٹکراؤ ہوا تو ہرات کو یقیناً اس میں شکست ہو گی۔

قاضی ہرات نے جنگی بخار اتارنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا:

"تاجدارِ ہرات کا فیصلہ افغان قوم کا فیصلہ ہے۔ امیر سمرقند کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک خود مختار حاکم کو چوری اور چوری کا مال برآمد کرنے کا حکم دے۔ دو سو گھوڑوں اور کچھ مال کے لیے جنگ کا پیغام بھیجنا اس کے لیے کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اتنے گھوڑے تو ہرات کے ایک معمولی آدمی کے پاس بھی ہوتے ہیں۔ اگر امیر سمرقند کو گھوڑوں کی ہی ضرورت تھی تو اس نے کہلا بھیجا ہوتا۔ ہم دو سو کے بجائے چار سو گھوڑے بھیج دیتے"۔

قاضی ہرات کی باتیں ملک معزالدین بڑے غور سے سنتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ قاضی سے زیادہ عقلمند اور ذہین انسان دنیا کے پردے پر موجود نہیں۔ اس لیے وہ قاضی کی اتنی عزت کرتا اور اسے اپنے برابر بٹھایا کرتا تھا۔ قاضی کی باتوں نے اس پر بہت اثر کیا۔

والیِ ہرات نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا:

"قاضی! تم کس قدر ذہین اور عقلمند ہو۔ اگر تم سمرقند کے دربار میں ہوتے تو امیر قزعن، محض دو سو گھوڑوں کے لیے ہم سے جنگ نہ کرتا۔ تم اسے سمجھا کے اس حماقت سے ضرور باز رکھتے"۔

قاضی نے ملک کی باتوں سے فائدہ اٹھایا اور بولا:

"یہ تاجدارِ عادل کی ذرہ نوازی ہے جو ایک حقیر قاضی کو اتنی عزت دے رہے ہیں۔ دو سو گھوڑوں کی

ہزاروں افغانوں یا تاتاریوں کا خون بہانا نہ تو امیر قزعن کے لیے مفید ہے اور نہ والیِ ہرات کے لیے۔ اگر والیِ ہرات پسند فرمائیں تو اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ امیر قزعن کو تین سو گھوڑے بطور تحفہ روانہ کر دیے جائیں تاکہ وہ شرمندہ ہو جائے اور والیِ ہرات کی فیاضی اور اعلاظرفی کی تعریف کرے"۔

"لیکن گھوڑے واپس کرنے سے کیا امیر قزعن افغانوں کو بزدل نہیں سمجھے گا؟" ملک معزالدین نے سوال کیا۔

"ہرگز نہیں والیِ ہرات"۔

قاضی نے بات بنانے کی کوشش کی:

"تحفہ بھیجنا بزدلی نہیں بلکہ اظہارِ دوستی ہے۔ اپنے طاقتور پڑوسیوں سے دوستی رکھنا عقل مندی کی دلیل ہے"۔

ملک معزالدین غصہ میں آ کر تلوار تو بلند کر چکا تھا لیکن قاضی کی باتوں میں اسے بڑا وزن محسوس ہوا۔ وہ امیر قزعن کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ تھا اور جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قاضی کی باتیں اس کے موٹے دماغ میں بیٹھ گئیں۔ اس کا غصہ جاتا رہا اور جنگ کے اُمڈتے ہوئے بادل چھٹ گئے۔

ملک معزالدین نے حکم دیا:

"تین سو اعلیٰ قسم کے گھوڑے امیر قزعن کو بطور تحفہ روانہ کیے جائیں۔ ایک سفیر تحفہ لے کر سمرقند جائے۔ دوسرا سفیر اس وقت تک مہمان رہے جب تک سمرقند سے جواب نہیں آ جاتا"۔

والیِ ہرات کی تلوار کے ساتھ تلوار بلند کرنے والے سرداروں میں سے بعض افغان سردار ایسے بھی تھے جو اس جنگ کے خلاف تھے لیکن دوسروں کی دیکھا دیکھی انہیں بھی تلوار بلند کرنا پڑی تھی۔ ملک کے اس فیصلے سے وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے۔ سب سے زیادہ خوشی قاضی تاج الملک کو تھی۔ اس نے اپنی فراست سے جنگ کے خطرے کو فی الحال ٹال دیا تھا۔

ملکوتی، ہرات کی شہزادی تو نہ تھی لیکن اسے شہزادیوں جیسا مقام حاصل تھا۔ وہ والیِ ہرات کے مرحوم بھائی

ملک اعزازالدین کی بیٹی تھی۔

ملکوتی باپ کی طرف سے افغان اور ماں کی جانب سے تاتاری تھی۔ ملکوتی کی ماں کی پہلی شادی تاتاریوں کے مشہور قبیلہ اوجائی بوغائی کے سردار سے ہوئی تھی۔ شادی ہوتے ہی سردار کے چھوٹے بھائی نے بغاوت کر دی اور سرداری کا دعویدار ہوا۔ بڑا بھائی نیک نفس اور صلح پسند تھا۔ وہ قبیلہ کی سرداری سے دست بردار ہو گیا اور نئی نویلی دلہن کو ساتھ لے کر ترکِ وطن کر کے ہرات میں پناہ گزیں ہوا۔ ہرات بھی اسے راس نہ آیا اور ایک ہی سال کے اندر حسین و جمیل اور گلاب جیسی بیوی کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

جوان جہان عورت، خوبصورت اتنی کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جائے۔ وہ سخت پریشان تھی کہ کیا کرے، کہاں جائے؟ اپنا وطن چھوٹ چکا تھا۔ دیارِ غیر میں کس سے فریاد کرتی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو روتی پیٹتی والیِ ہرات کے دربار میں پہنچ گئی۔ والیِ ہرات ملک معزالدین حسین نے اس کے شوہر کو پناہ دی تھی۔ اس نے اس پناہ کی لاج رکھی اور اپنے چھوٹے بھائی سے اس کی شادی کر دی۔ ملکوتی اسی بھائی کی بیٹی تھی۔

کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ ملکوتی کی ماں، شاہی خاندان کی بہو بن کر دو سال بھی نہ گزار سکی تھی کہ دوسرا شوہر بھی داغِ مفارقت دے گیا۔

ملکوتی کی ماں نے ننھی ملکوتی کو سینے سے لگا کر قسم کھائی کہ اب وہ شادی نہ کرے گی۔ جب سے اب تک وہ بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی اور ملکوتی جوانی کی حدوں میں داخل ہو چکی تھی۔

والیِ ہرات ملک معزالدین حسین کے درجنوں بیٹے تھے لیکن اللہ نے بیٹی ایک بھی نہ دی تھی۔ ملک نے ملکوتی کی پرورش شہزادیوں کی طرح کی اور اسے بیٹی کی طرح چاہتا تھا۔

ملکوتی، واقعی ملکوتی حسن کا نمونہ تھی۔ ہنستا چہرہ۔ ہر وقت مسکراتی رہتی۔ شوخ و شنگ۔ بذلہ سنج۔ حاضر جوابی میں تو جواب نہ رکھتی تھی۔ مسیحا، مرض کا علاج کرتا ہے لیکن ملکوتی غم کا علاج تھی۔ غمزدہ سے غمزدہ اس سے باتیں کرلے تو اپنا غم بھول جائے۔ والیِ ہرات جس دن آزردہ خاطر ہوتا فوراً ملکوتی کو بلواتا۔ ملکوتی سے بات کرتے ہی اس کا آدھا غم دور ہو جاتا۔ ملک نے ان ماں بیٹیوں کو الگ محل دے رکھا تھا۔ نوکر چاکر غلام لونڈی، کسی بات کی کمی نہ تھی۔

ملکوتی کی ماں کو خبر ملی کہ والیِ ہرات کے دربار میں دو تاتاری آئے ہیں تو وہ تڑپ اٹھی۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ وطن کی یاد جاگ اٹھی۔ دل چاہا کہ تاتاری سفیروں سے ملے۔ کچھ اپنی کہے کچھ ان کی سنے۔

پوچھے کہ بلخ کا حاکم اب کون ہے؟ وہاں کے لوگ کیسے رہتے بستے ہیں؟ اپنے عزیزوں کے بارے میں دریافت کرے۔ شاید کوئی زندہ ہو؟ مگر یہ سب کیسے ہو؟ تاتاری سفیروں سے کس طرح ملا جائے؟ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ اسے ملکوتی کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی تاتاریوں سے ملنے کی ایک ترکیب بھی سوجھی۔ اس نے فوراً ملکوتی کو آواز دی۔ تیرہ چودہ سال کی الھڑ ملکوتی، مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

ماں نے بیٹی کا ماتھا چوما۔ پاس بٹھایا۔ پھر بولی:

"ملکوتی! تو نے کبھی تاتاری دیکھے ہیں۔"

"نہیں امی!"

ملکوتی نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں:

"میں نے تو کبھی ہرات سے باہر قدم ہی نہیں رکھا۔ جب آپ ملک تاتار کا ذکر کرتی ہیں تو مجھے یہ سب ایک خواب سا لگتا ہے۔"

"تو تاتاریوں کو دیکھے گی؟" ماں نے ملکوتی کو ٹٹولا۔

"ضرور دیکھوں گی امی۔ بھلا تاتاری کیسے ہوتے ہیں؟" ملکوتی کے دل میں تاتاریوں کو دیکھنے کے شوق نے انگڑائی لی۔

"بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ افغانوں سے زیادہ"۔

ماں نے ملکوتی کے شوق کو مہمیز کیا۔

"کہاں ہیں وہ امی۔ ان سے مل کے میں بہت خوش ہوں گی"۔ ملکوتی سوال کر کے بڑی بے چینی سے ماں کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

اس کی ماں کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی سوچ ہرات سے نکل کر بلخ کے کوچہ و بازار میں گردش کر رہی تھی۔

ملکوتی سے زیادہ انتظار نہ ہو سکا۔ بولی:

"امی۔ آپ بھی تو ان سے مل کر خوش ہوں گی۔ آپ بھی تو تاتاری ہیں؟"

ماں نے ایک سرد آہ بھری۔ کہا:

"ہاں بیٹی! میں تاتاری تھی۔ وہ اک خواب تھا جو ادھورا رہ گیا۔"

"مجھے ملاؤ نا تاتاریوں سے امی!" ملکوتی نے ضد کی۔

وطن کی یاد آنسو بن کے ملکوتی کی ماں کی آنکھوں سے ٹپک پڑی۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولی:

"والیِ ہرات اجازت دے تو ہم تاتاریوں سے مل سکتے ہیں۔ دربار میں دو تاتاری سفیر، سمرقند سے آئے ہوئے ہیں۔"

ملکوتی اٹھ کھڑی ہوئی چٹکی بجاتے ہوئے بولی:

"والیِ ہرات سے میں ابھی اجازت لے کر آتی ہوں۔"

ملکوتی، ملک معز الدین حسین کے محل میں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

ماں نے کہا:

"سن بیٹی! اگر ملک اجازت دیدیں تو تاتاریوں کی دعوت کی بھی اجازت مانگ لینا۔ میں انہیں کھانے پکا کر کھلاؤں گی۔"

"اچھا"۔ کہہ کر ملکوتی مٹکتی، اٹھلاتی چلی گئی۔

ملکوتی محل میں پہنچی۔ دیکھا کہ ملک معز الدین حسین کھانا کھا رہا ہے۔ ہنستی ہوئی قریب جا کر بیٹھ گئی۔ شہزادے ملک کے ساتھ کھانے میں مشغول تھے۔ انہوں نے نظر اٹھا کر بھی ملکوتی کو نہ دیکھا۔ سب ہی ملکوتی سے جلتے تھے۔ ملک معز الدین کی تمام تر نوازشیں اور مہربانیاں ملکوتی پر تھیں۔ شہزادوں کو تو جلنا ہی تھا۔ باپ اپنے بیٹوں کو چھوڑ کر بھتیجی پہ مہربان ہو تو انہیں کوفت ہونا لازمی تھا۔

ملکوتی کھانے میں شامل ہو گئی۔ کھاتے ہوئے رک کر بولی:

"سمرقند کے تاتاری آئے ہوئے ہیں؟"

"ہاں!"

ملک نے ہاتھ روک کر کہا:

"تمہیں کیا تاتاریوں کا اچار ڈالنا ہے۔"

ملک نے اس زور کا قہقہہ لگایا کہ اسے اُچھو ہو گیا۔

ملکوتی، پہاڑی بکری کی ٹانگ چچوڑتی ہوئی بولی:

"میں نے تاتاری کبھی نہیں دیکھے۔"

"ہوں۔ تو ان سے ملنا چاہتی ہے؟" ملک معز الدین نے اس کے ہاتھ سے ٹانگ چھین لی۔

ملکوتی پٹ سے بولی:

"ہاں۔ اگر آپ اجازت دے دیں"۔

"تجھے کون روک سکتا ہے ملکوتی۔ تُو تو میری بیٹی ہے"۔

کچھ رک کر پوچھا:

"لیکن ایک بات سچ سچ بتانا ہو گی"۔

"آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی"۔ ملکوتی نے ایک شہزادے کو دیکھا جو اسے بڑی نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تو یہ بتا، تاتاریوں سے تُو ملنا چاہتی ہے یا یہ تیری ماں کی خواہش ہے؟" ملک نے تحقیق کی۔

ملکوتی گھبرا گئی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ ہنس کے بولی:

"میں یہ نہیں بتاؤں گی"۔

"اب بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تیری ماں تاتاری ہے"۔ ملک معز الدین نے ٹانگ کی ہڈی بس یونہی اچھال دی۔ ہڈی کھڑکی سے ٹکرائی اور باہر جا گری۔

افغان ہوں یا مغل۔ عرب قبائل ہوں یا تاتاری۔ وحشیانہ جبلت سب میں قدرِ مشترک تھی۔ بلادِ تمام کا چنگیزی شہزادہ تغلق تمور خاں، آج بھی نمدے پر بیٹھتا اور سفید گھوڑی کا دودھ پیتا تھا۔ افغان اور تاتاری اسلام قبول کر چکے تھے مگر ان کا وحشی پن کم نہ ہوا تھا۔ بڑے بڑے محلوں میں رہتے مگر محل کے کھڑکی دروازے روز ٹوٹتے، روز بنائے جاتے۔

ملکوتی ہاتھ چاٹتے ہوئے بولی:

"میں ان کی دعوت کروں گی"۔

"یہ بات بھی تیری ماں نے کہی ہو گی!"

ملک معز الدین نے اس کی دوسری چوری پکڑ لی۔

ملکوتی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

ملکوتی، ماں کے پاس پہنچ کے اپنی اور ملک معزالدین حسین کی باتیں بتا رہی تھی کہ ایک کنیز ہانپتی ہوئی ان کے پاس آئی۔

اس کی حالت دیکھ کے دونوں گھبرا گئیں۔

کنیز سانس روکتے ہوئے بولی:

"شہزادی، ایک جوان، بڑا خوبصورت، کہیں کا شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔"

"فراجی، کیا بکواس کر رہی ہے۔" ملکوتی کی ماں ڈپٹ کر بولی۔

فراجی سنبھل گئی۔ سر جھکا کے بولی:

"ملک حضور نے کسی کو دعوت کھانے بھیجا ہے۔"

ملکوتی کی ماں کو غصہ آ گیا۔ چیخ کے کہا:

"فراجی تیرا دماغ تو ٹھکانے ہے۔ کیسی دعوت۔ کس کو بھیجا ہے ملک حضور نے؟"

ملکوتی بات کی تہ کو پہنچ گئی۔ مسکرائی اور بولی:

"امی ناراض نہ ہوں۔ ملک حضور نے تاتاری سفیروں کو بھیجا ہو گا۔ میں نے دعوت کی اجازت لے لی تھی۔ میں دیکھتی ہوں جا کر۔"

ملکوتی دروازے کی طرف چلی تو ماں نے کہا:

"تاتاری سفیر ہوں تو ذرا عزت سے لانا ان کو۔ مذاق نہ اڑانے لگنا ان کا۔"

ملکوتی دروازے کے باہر آ گئی۔ ایک شکیل، دراز قامت جوان نظر آیا۔ سولہ سترہ سے عمر زیادہ نہ ہو گی۔ مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ داڑھی میں صرف دو چار بال تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں اور ملی رہ گئیں۔ وہ ایک دوسرے کو کن نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بس دیکھے جا رہے تھے۔

فراجی کنیز، ملکوتی کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی تھی۔ اس نے دونوں کو اس قدر انہماک سے دیکھتے دیکھا تو کھانس کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ ملکوتی گڑبڑا گئی۔ فراجی مسکرانے لگی۔

ملکوتی نے جھجکتے ہوئے پوچھا:

"شاید تم تاتاری سفیر ہو؟"

"جی۔۔۔۔ اور آپ شاید شہزادی ہیں۔" نوجوان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار

"دوسرا سفیر کیوں نہیں آیا؟" ملکوتی کو اس کے اکیلے آنے پر تعجب ہوا۔

شہزادی نے نوجوان کو جواب دینے کے بجائے دوسرا سوال کر دیا تو نوجوان کچھ پریشان ہوا۔ اس نے سوچا کہ اس کا سوال شہزادی کو ناگوار گزرا ہے۔ سنبھل کر بولا:

"میرے ساتھی عبداللہ کو والیٔ ہرات نے سمرقند بھیجا ہے۔ میں تنہا رہ گیا ہوں۔"

"تمہیں لوگ کس نام سے پکارتے ہیں؟" ملکوتی نے بڑے مہذب انداز میں پوچھا۔

"عبداللہ۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

ملکوتی کو زور کی ہنسی آئی۔ ضبط کرتے ہوئے بولی:

"جو تاتاری جوان ایک لڑکی کو دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھے۔ وہ میدانِ جنگ میں کس طرح لڑتا ہو گا؟"

عبداللہ سمجھ تو کچھ نہ سکا لیکن اسے اس گہرے طنز پر غصہ سا آ گیا۔ سوچتے ہوئے بولا:

"اگر آپ کا اشارہ میری طرف ہے تو یقین کیجیے میں بالکل حواس میں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"میں نے تمہارا نام پوچھا تھا!" ملکوتی نے چڑ کر کہا۔

"میں نے بتا دیا۔"

"کیا نام بتایا تھا تم نے؟" ملکوتی کو غصہ آ گیا۔

"عبداللہ۔ یہی نام میں نے پہلے بھی بتایا تھا۔" عبداللہ بھی ذرا تن گیا۔

"تمہارا جو ساتھی سمرقند گیا ہے اس کا کیا نام ہے؟" ملکوتی نے اپنی طرف سے تاتاری نوجوان کو لاجواب کرنے کی کوشش کی۔

عبداللہ فوراً سمجھ گیا کہ سب ناموں کی گڑبڑ ہے۔ ہنس کر بولا:

"میں سمجھ گیا۔ دربار والی غلط فہمی آپ کو بھی ہو گئی۔ یہ غلط فہمی بڑی حسین اور دلچسپ ہے۔ میرا جو ساتھی سمرقند گیا ہے اس کا نام عبداللہ ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ میرا نام بھی عبداللہ ہی ہے۔ والیٔ ہرات کے دربار میں بھی اس پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ آپ کے سامنے بھی یہی گڑبڑ ہوئی۔ بہرصورت یہ میری غلطی تھی۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔"

ملکوتی اور فراجی بھی اس انکشاف پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔

ملکوتی نے ہنس کر کہا:

"غلطی میری بھی تھی۔ میں بھی اس بات کو سمجھ نہ سکی۔ تمہیں پہچاننے میں تو لوگوں کو بڑی دقّت ہو
ہوگی۔"

عبداللہ نے ملکوتی کو کھل کر بات کرتے دیکھا تو اسے حوصلہ ہوا۔ بولا:

"ہم دونوں کا نام تو ایک ہے لیکن ہم دونوں میں ایک بڑا فرق ہے جس کی وجہ سے ہم فوراً پہچان
لیے جاتے ہیں۔"

"وہ کیا؟" ملکوتی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"سمرقند جانے والے عبداللہ کی شادی ہو چکی ہے اور میں..... میں ابھی....." کہتے کہتے اس
نے نظریں نیچی کر لیں۔

شوخ و شنگ ملکوتی کی کنیز فراجی بھی بڑی زبان دراز تھی، فوراً بولی:

"اسے ہے تم تو لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو۔ کہتے کیوں نہیں کہ ابھی تک تمہیں کسی لڑکی نے
نہیں لگایا۔"

ملکوتی سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

اندر سے آواز آئی:

"ملکوتی بیٹی! مہمان کو اندر لے آؤ۔"

ملکوتی، عبداللہ کو لے کر اندر آ گئی۔ اس نے عبداللہ کو بتایا:

"یہ میری ماں ہیں اور....."

ماں نے ملکوتی کو اشارہ کیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ عبداللہ نے بڑی بی کو سلام کیا۔

"یہ عبداللہ ہے امی۔ تاتاری سفیر۔" ملکوتی پھر بولی۔

ملکوتی کی ماں، تاتاری جوان کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا:

"تم تاتاری ہو۔"

عبداللہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کس قبیلے کے ہو بیٹے؟" ماں نے دوسرا سوال کیا۔

"ہمارا قبیلہ ادجائی بوغائی ہے چچی جان۔" عبداللہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً رشتہ جوڑ

ملکوتی کی ماں چونک پڑی۔ حیرت بھرے لہجے میں پوچھا:

"ادجائی بوغائی قبیلہ کا سردار سلووز تھا۔"

عبداللہ اس کی زبان سے سلووز کا نام سن کر بڑا حیران ہوا:

"چچی جان۔ سلووز ہمارے قبیلے کا سردار ہے۔ آپ اسے جانتی ہیں؟"

"ہاں بیٹا۔ میں اسے جانتی ہوں۔ سلووز بھی مجھے جانتا ہے۔"

بڑی بی نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا پھر کہا:

"بیٹے عبداللہ! ذرا میرے قریب آ۔"

عبداللہ بڑی بی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

بڑی بی بولیں:

"میں بھی ادجائی بوغائی قبیلے کی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے بڑی بی نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ عبداللہ بے جھجک ان کے گلے لگ گیا۔
بڑی بی اسے سینے سے بھینچ کر رونے لگیں۔ ملکوتی اور فراجی انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

کچھ دیر آنسو بہانے کے بعد بڑی بی نے عبداللہ کو سینے سے الگ کیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولیں:

"تجھے دیکھ کر مجھے اپنا گھربار اور بچپن یاد آ گیا۔ سردار سلووز کے کتنے بچے ہیں؟"

"انہیں اللہ نے کوئی اولاد نہیں دی۔"

عبداللہ نے بتایا:

"اسی غم میں گھل گھل کے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں جوانی میں سردار سلووز بڑے ظالم تھے۔ آپ
نے انہیں کب دیکھا تھا چچی جان؟"

"میں نے..... میں نے اسے اس وقت دیکھا تھا جب اس کا ظلم انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔" بڑی بی کی
آواز میں کراراپن آ گیا۔

"خدا ہر ظالم کو سزا دیتا ہے۔"

ملکوتی کھڑی کھڑی الجھ رہی تھی۔ بولی:

"امی۔ آپ بھی کہاں کی پرانی باتیں لے بیٹھیں۔ کچھ کھانے پینے کا انتظام کیجیے۔ میں نے عبداللہ کو

دعوت پر بلایا ہے"۔

ماضی کی باتوں نے بڑی بی کو جوان بنا دیا تھا۔ ملکوتی نے یاد دلایا تو وہ ماضی سے حال میں آ گئیں، پھر بوڑھی ہو گئیں۔ دھیمی آواز میں بولیں:

"عبداللہ کی دعوت ضرور ہو گی۔ میں اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ازبکی پکا کر کھلاؤں گی"۔

ازبکی، تاتاریوں کا من بھاتا کھانا تھا۔ یہ ایک طرح کا سالن تھا جس میں تمام ترکاریاں سالم شکل یا بڑے ٹکڑوں کے ساتھ ڈالی جاتیں۔ اس سالن میں پانی کے بجائے میٹھا ہوا دودھ ڈالا جاتا۔ ازبکی کا نام سن کر عبداللہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔

بڑی بی کھانے کا انتظام کرنے چلی گئیں۔ ملکوتی، عبداللہ کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ کمرہ چھوٹا مگر سلیقہ سے آراستہ تھا۔

عبداللہ نے کمرے کو دیکھ کر ملکوتی کی نفاست پسندی کا اندازہ لگا لیا۔ ملکوتی کی خوش سلیقگی سے اس کا دل بہت خوش ہوا۔ ملکوتی کو تو وہ پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھا تھا لیکن یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ کہاں دس سواروں کا رسالدار عبداللہ اور کہاں ملکِ ہرات کی شہزادی ملکوتی۔

عبداللہ نے پوچھا:

"والیِ ہرات آپ کے کون ہیں؟"

"میرے چچا ہیں"۔ ملکوتی نے ایک اندازِ معشوقانہ سے جواب دیا۔

"ملکِ ہرات تو افغان نسل سے ہیں لیکن آپ کی والدہ اوجاقی بوغانی قبیلے کا نام لے رہی تھیں!" عبداللہ نے دو ٹوک سوال کیا۔

اس نے سوچا کہ بات بڑھنے سے پہلے ہی فیصلہ ہو جائے تو بہتر ہے۔ اگر ملکوتی اس کی دسترس سے باہر ہے تو خواہ مخواہ اپنا دل کیوں جلائے۔

ملکوتی جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کی نظر فراجی پر پڑ گئی۔ وہ ان کے ساتھ ہی کمرے میں آ گئی تھی اور کچھ دور کھڑی بڑے غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی یا پھر ان کی نظریں پڑھ رہی تھی۔

"تو یہاں کیا کر رہی ہے؟" ملکوتی نے فراجی کو ڈانٹ پلائی۔

وہ غریب چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

ملکوتی نے کہا:

"میری امی تمہاری طرح تاتاری ہیں۔ ان کی داستان بڑی دردناک ہے۔ ان کے پہلے شوہر قبیلہ اوجاقی بوغانی کے بڑے سردار تھے۔ سلودزان کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے بڑے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی۔ میری امی اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے ہرات آ گئیں۔ یہاں امی کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور والیِ ہرات نے اپنے بھائی کے ساتھ میری امی کی شادی کر دی۔ یوں میں والیِ ہرات کی بھتیجی ہوئی۔ باپ کی طرف سے افغان اور ماں تاتاری ہے"۔

عبداللہ، ملکوتی کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا:

"یہ باتیں میں نے اپنے باپ سے سنی ہیں۔ بلخ کا ہر بوڑھا آدمی جانتا ہے کہ سلودزان نے اپنے بھائی کو بلخ سے نکال دیا تھا لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس نے ہرات میں پناہ لی تھی"۔

عبداللہ اور ملکوتی پہلی ہی ملاقات میں یوں گھل مل گئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ ان کی باتیں ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔

کھانا تیار ہو گیا۔ عبداللہ نے بڑے مزے لے لے کر کھایا۔ ازبکی تو اسے بہت پسند آئی۔

عبداللہ بولا:

"چچی جان۔ ایسی اچھی ازبکی تو میں نے بلخ میں بھی نہیں کھائی"۔

بلخ کے نام پر بڑی بی پھر آبدیدہ ہو گئیں۔ بولیں:

"بلخ تو اب میرے لیے خواب ہے۔ ایک بار اپنا شہر، اپنا وطن دیکھنے کی آرزو ہے لیکن مجھے وہاں کون لے جائے گا"۔

"چچی جان۔ بلخ دکھانے کا تو میں وعدہ نہیں کرتا لیکن بلخ کے تاتاری بہت جلد یہاں آنے والے ہیں"۔

یہ بات بے ساختہ عبداللہ کے منہ سے نکل گئی۔ یہ کہنے کے بعد اسے افسوس ہوا لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

ملکوتی اور اس کی ماں نے حیرت سے عبداللہ کو دیکھا۔ یہ جملہ ایسا نہ تھا جو اپنا اثر نہ کرتا۔

ماں نے پوچھا:

"بیٹا۔ تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ بلخ کے تاتاریوں کو کیا پڑی ہے جو مجھ غریب کو دیکھنے وہ

اتنی دور کا سفر کر کے آئیں۔ پھر میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میرا ذکر سلوز سے کیا جائے۔ میری عمر تو کٹ چکی ہے جو باقی ہے وہ بھی رو دھو کے کٹ جائے گی۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ؟"

عبداللہ جذبات میں آ کر ایک ایسی بات کہہ بیٹھا تھا جس کا اظہار خطرے سے خالی نہ تھا لیکن اب ملکوتی کی ماں کو مطمئن بھی کرنا تھا۔ وہ ملکوتی کی نظروں میں بھی گرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ بات ٹالنے کی کوشش کرتا تو اس پہلی ہی ملاقات میں اس کے وقار کے مجروح ہونے کا خطرہ بھی تھا۔ وہ خود تو ملکوتی کے قریب پہنچ ہی گیا تھا لیکن ملکوتی نے اس سے جس بے تکلفی اور لگاوٹ سے باتیں کی تھیں اس سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید ملکوتی بھی اس کے قریب آنے کی کوشش کر رہی ہے۔

عبداللہ نے مجبوراً زبان کھولی مگر ڈر ڈر کے۔ اُس نے کہا:

"چچی جان۔ یہ ایک راز کی بات ہے۔ آپ وعدہ کریں کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کریں گی تو میں کچھ باتیں آپ کو بتاؤں؟"

ماں بولی:

"عبداللہ! تم تاتاری ہو۔ میرے بیٹے کی مانند۔ اگر راز کھولنے سے تمہیں نقصان پہنچ رہا ہو تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہ راز ہمیشہ راز ہی رہے گا۔ میں یا ملکوتی اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیں گی۔"

عبداللہ نے رازدارانہ انداز میں کہا:

"چچی جان۔ سمرقند اور ہرات میں جنگ ہونے والی ہے۔ سمرقند کا لشکر لڑائی کی تیاری کر رہا ہے۔ ہرات والوں نے ہماری سرحد میں گھس کر لوٹ مار کی ہے۔ مجھے اور عبداللہ کو والیِ ہرات کے پاس اس لیے بھیجا گیا کہ لوٹ کے مال کا مطالبہ کریں۔ والیِ ہرات نے لوٹ کا مال واپس کرنے کے بجائے امیر قزغن کو ۲۰۰ گھوڑوں کا تحفہ بھیجا ہے۔ امیر قزغن اسے قبول نہ کرے گا اور جنگ شروع ہو جائے گی۔"

ملکوتی اور اس کی ماں اس خبر سے بہت خوفزدہ ہوئیں۔ ماں نے کہا:

"بیٹا۔ کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ یہ جنگ رک جائے۔ ذرا سی بات پر ہزاروں بندگانِ خدا کا خون بہ جائے گا۔"

"چچی جان! جنگ تو ضرور ہو گی۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔" عبداللہ نے صاف صاف کہہ دیا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ لوگوں پر آنچ نہ آنے دوں گا۔"

"مگر بیٹا۔ کیا پتہ کسے شکست ہو۔"

ماں نے ایک اصولی بات کہی:

"ہو سکتا ہے کہ تاتاری ہرات پر قبضہ کر لیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہرات کے افغان، سمرقند تک پہنچ جائیں۔"

"نہیں چچی جان۔ ایسا نہیں ہو گا۔"

عبداللہ نے زور دے کر کہا:

"والیِ ہرات کو سمرقند کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ اس وقت سمرقند کے دربار میں ایک ایسا تاتاری سردار موجود ہے۔ جو ہرات تو کیا، پورے ایران اور افغانستان کو فتح کر سکتا ہے۔"

"کیا وہ سمرقند کے حاکم کا بیٹا ہے؟" ماں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"بیٹے سے بھی بڑھ کر ہے چچی جان۔" عبداللہ نے جواب دیا۔

"اس کا نام تیمور گورگانی ہے۔ سمرقند کے حاکم نے اپنی پوتی کی شادی اس سے کر دی ہے۔ اس وقت وہ ایک ہزار جوان تاتاریوں کا سردار ہے۔ اس نے بڑے بڑے خودسر تاتاری سرداروں کے سر جھکا دیے ہیں ہرات کی مہم کا سردار وہی ہو گا۔ اس کی سرداری فتح کا نشان بن جاتی ہے۔"

عبداللہ نے اپنی باتوں سے ماں بیٹی کو سخت ہراساں کر دیا۔ ان کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے یہ دیکھ کر فوراً کہا:

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں چچی جان۔ ہرات میں داخل ہوتے ہی میں اپنے آدمیوں کے ساتھ آپ کے مکان پر آ جاؤں گا۔ آپ کی طرف کوئی نگاہ بھی نہ اٹھا سکے گا۔"

عبداللہ اپنی رَو میں اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے ہرات فتح ہو چکا ہے اور وہ فاتح کی حیثیت سے قلعۂ ہرات کے بڑے پھاٹک سے ابھی داخل ہونے والا ہے۔

افغان، شجاعت اور بہادری میں تاتاریوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ ان کی فوجی طاقت بھی ایسی نہ تھی کہ ہرات پر آسانی سے قبضہ کیا جا سکے۔ والیِ سمرقند کو افغانوں پر صرف اس وجہ سے فوقیت حاصل تھی کہ اس وقت تمام بڑے بڑے تاتاری سردار، حاکمِ سمرقند کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے۔ ورنہ اس سے پہلے والیِ ہرات تقریباً تمام تاتاری سرداروں کو فرداً فرداً شکست دے چکا تھا یا کم از کم ان سے اپنی طاقت کا لوہا منوا چکا تھا۔

دعوت ختم ہو گئی لیکن عبداللہ کی باتوں نے ملکوتی اور اس کی ماں کو اس قدر خوفزدہ کر دیا کہ اب وہ خاموش خاموش اور فکرمند رہنے لگیں۔

عبداللہ جب تک ہرات میں رہا دوسرے تیسرے روز ان سے ملنے جاتا رہا لیکن اس نے اپنی غلطی سے ان کا سکون چھین لیا۔ وہ انہیں لاکھ تسلیاں دیتا لیکن ملکوتی کچھ بجھی بجھی سی رہتی۔

○

والیٔ سمرقند امیر قزغن کی پوتی الجائی خاتون سے تیمور کی شادی کیا ہوئی کہ اس کے لیے ترقی کی راہیں کھل گئیں۔ بوڑھا امیر قزغن ایک جوہر شناس حاکم تھا۔ اس کی عمر لڑائیاں لڑتے گزری تھی۔ بڑے بڑے سرداروں اور بہادروں کو اس نے زیر کیا تھا۔ لڑائی کے دوران ہی اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔

حکومتِ سمرقند کے اصل حاکم بلادِ شمال کے چغتائی منگول تھے۔ منگول خانِ اعظم نے اپنی طرف سے امیر قزغن کو سمرقند کا حاکم مقرر کیا تھا لیکن خانِ اعظم کے لالچی سردار اکثر سمرقند میں لوٹ مار کرنے گھس آتے تھے یہ صورت حال امیر قزغن اور دوسرے تاتاری سرداروں کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔

سمرقند کی حکومت کئی تاتاری سرداروں میں بٹی ہوئی تھی۔ خجند پر بایزید جلائر کی حکومت تھی۔ بلخ کا حاکم سلدوز نادبائی بوغائی تھا۔ شبرغان میں محمد خواجہ اپردی کی عملداری تھی بدخشاں کے پہاڑوں کا سردار ختلان تھا۔ اور ارہنگ پر کیخسرو اور بیانیوا پردی کا قبضہ تھا۔

یہ سب بڑے جنگجو اور بہادر تاتاری سردار تھے۔ ہر سردار کے پاس دس دس ہزار سواروں کی فوج ہر وقت تیار رہتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ ان میں اتفاق نہ تھا۔ وہ ہر وقت ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے۔ تاتاری سرداروں کے آپس کے اختلافات سے شمال کا خانِ اعظم خوب فائدہ اٹھاتا اور جب چاہتا کسی علاقہ کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیتا۔ دوسرے سردار تماشا دیکھتے رہتے۔

امیر قزغن بڑا جہاندیدہ سردار تھا اس نے تمام تاتاری سرداروں کو خفیہ پیغام بھیجا کہ اگر منگولوں کے ان آئے دن کے حملوں سے بچنا چاہتے ہو تو میرا ساتھ دو۔ کیونکہ تاتاریوں کا متحدہ لشکر ہی منگولوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہے۔

یہ بات تاتاری سرداروں کے دماغ میں بیٹھ گئی۔ ان سب نے اپنے جھگڑے دفن کر کے امیر قزغن کو اپنا سردارِ اعلیٰ تسلیم کر لیا۔ امیر قزغن نے فوراً خانِ اعظم کے خلاف بغاوت کر دی۔

منگولوں اور تاتاریوں میں بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ دونوں طرف کے ہزاروں آدمی کام آئے۔ تاتاری اس قدر جم کے لڑے کہ منگولوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اسی دوران خانِ اعظم مر گیا۔ نئے خانِ اعظم نے امیر قزغن کو صلح کا پیغام دیا اور اسے سمرقند کا خود مختار حاکم تسلیم کر لیا۔ اس طرح امیر قزغن نہ صرف سمرقند بلکہ تاتاریوں کا بھی حاکم بن گیا۔

تاتاریوں میں یہ صفت تھی کہ جب وہ کسی کو اپنا سردار تسلیم کر لیتے تو پھر اس کے حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرتے۔ امیر قزغن کے حاکمِ سمرقند ہو جانے سے شمال کے منگولوں کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور ہر سردار اپنے علاقہ میں آرام و سکون سے حکومت کرنے لگا۔

تیمور جب اپنا گھوڑا چمکارتا امیر قزغن کے سامنے آتا تو اسے دیکھ کر امیر کو اپنی جوانی یاد آ جاتی۔ وہ تیمور کے پیکر میں اپنی شبیہ دیکھتا۔

امیر قزغن نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اس نے اپنی پوتی الجائی خاتون کے لیے نہ صرف ایک بہترین شوہر منتخب کیا ہے بلکہ یہ منچلا نوجوان مستقبل کا ایک درخشندہ ستارہ ہے اور اگر یہ بہک نہ گیا تو دنیا میں ضرور نام پیدا کرے گا۔

امیر قزغن نے تیمور کو پہلے چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں آزمایا۔ تیمور نے جلد ہی خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا۔ امیر قزغن نے اس کی شجاعت سے متاثر ہو کر اسے مینک باشی (ایک ہزار سواروں کا کرنل) بنا دیا۔ تیمور کے لیے یہ پہلا اہم اعزاز تھا۔ ہزاروں بہادروں کی موجودگی میں اس اعزاز کے پانے پر سب نے اسے مبارک دی لیکن اس نے دو زبردست دشمن بھی پیدا کر لیے۔ ایک دشمن اس کا چچا حاجی برلاس تھا اور دوسرا بایزید جلائر۔ بایزید خجند کا حاکم تھا اور امیر قزغن کے بعد حاکمِ سمرقند ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ امیر قزغن کا عزیز ہونے کی وجہ سے وہ خود کو حکومت کا حق دار سمجھتا تھا۔

تیمور اپنے دونوں دشمنوں کو خوب جانتا تھا مگر مصلحتاً خاموش رہتا۔ یہ دونوں تیمور کی شادی میں بھی شریک ہوئے تھے۔

تیمور کو اللہ نے جب چاند سا بیٹا دیا تو قصرِ سفید مہمانوں سے بھر گیا۔ قصرِ سفید ایک قدیم ایرانی قلعہ تھا اور

تیمور کے باپ طراغائی خاں کے قبضے میں تھا۔ تیمور نے اس شکستہ قلعہ کے ایک حصے میں اپنے لیے ایک گھر تعمیر کر لیا تھا جسے لڑائیوں میں حاصل ہونے والے بہترین قالینوں اور طلائی ظروف سے آراستہ کیا گیا تھا۔

تیمور نے بیٹے کی پیدائش پر دل کھول کر خرچ کیا اور خوب جشن منایا۔ جشن کا تمام انتظام اس کے غلام عبداللہ کے سپرد تھا۔ عبداللہ نے اتنے سلیقے سے انتظام کیا کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔ تیمور نے بڑے چھوٹے تمام سرداروں کو دعوت دی۔ سب نے اس ضیافت اور جشن میں شرکت کی، سوائے اس کے چچا حاجی برلاس اور بایزید جلائر کے۔

جشن کے دن قصرِ سفید میں میلہ سا لگ گیا۔ تاتاری سرداروں نے تیمور کے بیٹے کو حسبِ توفیق تحائف دیے شہر شہر کے کھلونے، پالنے، کپڑے، بستر۔ تحفوں کا انبار لگ گیا۔ تحفے قیمتی بھی تھے اور معمولی قیمت کے بھی تیمور کو ان کی قیمت کی فکر نہ تھی۔ وہ تو ان تحفوں کے پیچھے چھپے ہوئے تاتاریوں کے اس خلوص کو دیکھ رہا تھا جو ان کے دل میں میںنک باشی تیمور کے لیے پیدا ہو گیا تھا۔

عصر اور مغرب کے درمیان نومولود بچے کو تیمور اپنی گود میں لیے باہر آیا۔ تاتاری سرداروں نے تیمور کے سر پر تلواروں کی قوس سی بنا دی۔ یہ تلواروں کا سایہ تھا۔ اس سائے میں تیمور بچے کو لے کر مولانا زین الدین کے پاس آیا اور بچہ ان کی گود میں دے دیا۔

مولانا نے بسم اللہ کہہ کر اس کے کان میں اذان دی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ تمام حاضرین نے آمین کہہ کر اس میں شرکت کی۔ مولانا نے نومولود کا نام جہانگیر رکھا۔

تاتاری باوجود اکھڑ اور جاہل ہونے کے، نماز کے بڑے پابند تھے۔ تیمور تو بچپن ہی سے نماز کا سختی سے پابند تھا۔ نمازِ مغرب کے بعد ضیافت شروع ہوئی۔ مسلمان کہیں کا ہو گوشت اس کی مرغوب غذا ہے۔ بھنے ہوئے گوشت کے تھال محفل میں آتے اور خالی ہوتے رہے۔ پرندوں اور شکار کیے ہوئے جانوروں کا گوشت بھی تھا لیکن پہاڑی بکروں کا گوشت زیادہ کھایا گیا۔ بکروں کی آلائش نکال کر انہیں مسلّم بریاں کیا گیا۔ ان کے پیٹ میں طرح طرح کے میوے بھرے ہوئے تھے۔ گوشت اس کثرت سے کھایا گیا کہ بظاہر اس کے بعد بھوک کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن تاتاری ضیافت میں یہ کھانے کا پہلا دور کہلاتا تھا۔

دوسرا دور شروع ہوا تو تھالوں اور سینیوں میں گھوڑے کے پٹھوں کے کباب لائے گئے۔ اس کے ساتھ جَو کی موٹی موٹی روٹیاں تھیں جن پر شہد لگایا گیا تھا۔ اسے آج کل کی سویٹ ڈش بھی کہا جا سکتا ہے۔ تا

نے اس دور میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس قدر کھایا کہ ان کے لیے بیٹھنا دشوار ہو گیا۔

مغربی مؤرخوں نے تاتاریوں کی ضیافتوں میں بے دھڑک شراب کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کی ذہنی پستی اور تعصب کی دلیل ہے۔ بھلا جن محفلوں میں مولانا زین الدین جیسے بزرگ شریک ہوں وہاں شراب کا دور کیسے چل سکتا تھا لیکن یورپی مؤرخ، مسلمانوں کی کردار کشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور بغیر کسی سند یا ثبوت کے اُن پر الزام تراشی کرتے نظر آتے ہیں۔

قندیلیں شام ہوتے ہی روشن کر دی گئی تھیں۔ قصرِ سفید کے چپے چپے پر قندیلیں آویزاں تھیں۔ فدد دیوار اور درختوں کی شاخوں پر دور دور تک قندیلیں لٹکتی نظر آتیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان کی کہکشاں زمین پر اتر آئی ہے۔ کھانے کے بعد تاتاری مہمان خیموں، قالینوں اور سبزہ زار پر دراز ہو گئے اور داستان گو نے داستانیں سنانا شروع کر دیں۔ یہ داستانیں تاتاریوں کے آباؤ اجداد کے مربوط اور غیر مربوط قصے تھے جنہیں داستان گو دھن اور لے کے ساتھ گاتے تھے۔ ہر قصہ خواں کے ہاتھ میں تاروں کا بنا ہوا چھنارہ ہوتا جو ان کی آواز میں شامل ہو کر ایک عجیب سماں پیدا کرتا۔ ہر چند کہ یہ داستانیں ان کی سنی ہوئی ہوتیں لیکن ہر بار انہیں اس میں ایک نیا مزہ آتا اور وہ جھوم جھوم اٹھتے۔

یہ جشن بچہ کی پیدائش کے چھٹے دن منعقد ہوا تھا۔ اس رات تیمور کی بیوی الجائی خاتون جو خاتونِ آغا کے لقب سے یاد کی جاتی تھی، کو دوبارہ دلہن بنایا گیا۔ مشاطاؤں نے اسے سجا بنا کر چوتھی کی دلہن بنا دیا۔ نصف شب گزرنے کے بعد الجائی خاتون مہمانوں کو سلام کرنے کے لیے محفل میں آئی۔ اس کی کنیزِ خاص لال زری گود میں ننھے جہانگیر کو لیے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

بزرگ تاتاریوں نے الجائی خاتون کے سر پر ہاتھ پھیر کر جہانگیر کو درازیٔ عمر کی دعائیں دیں۔ دوسرے تاتاری سرداروں نے ان پر سیم و زر کی بارش کی۔

والیٔ سمرقند امیر قزغن جنوبی علاقوں میں شکار کھیل رہا تھا اس لیے وہ اس جشن میں شریک نہ ہو سکا۔ امیر قزغن اپنا زیادہ وقت سیر و شکار ہی میں صرف کرتا۔ تیمور کے مل جانے سے ملکی معاملات میں بڑی آسانی ہو گئی تھی۔ اس نے اس ذہین اور نڈر جوان کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس کے بڑے بیٹے مُسلّا کا انتقال ہو چکا تھا اور پوتا یعنی الجائی خاتون کا بھائی افغانستان کے شمالی علاقہ کا حاکم تھا۔ امیر قزغن کا چھوٹا بیٹا جس کا نام بھی اتفاق سے عبداللہ ہی تھا، ابھی کمسن تھا۔ اب لے دے کے تیمور ہی اس کے سب سے

زیادہ قریب تھا۔

امیر قزعن نے سمرقند واپس آکر نئی فتوحات کا منصوبہ بنایا۔ اس نے پہلے تیمور کو مغربی صحرا کی طرف روانہ کیا۔ تیمور تو ایسے موقعوں کی تلاش ہی میں رہتا تھا۔ وہ پانچ ہزار سواروں کے ساتھ جن میں اس کا ایک ہزا کا ذاتی رسالہ بھی شامل تھا، مغربی صحرا میں جا گھسا اور ان لوگوں کی خوب پٹائی کی جو آئے دن سمرقند کی سرحدوں میں گھس کر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ یہ لٹیرے کچھ تو تیمور کے لشکر کے ہاتھوں مارے گئے اور باقی دور دور بھاگ گئے۔ پھر انہوں نے سرحد پر فتنہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔

O

جب تیمور مغربی صحرا سے کامیاب و کامران، لٹیروں کے چند سرداروں کو گرفتار کرکے امیر قزعن کے دربار میں پہنچا تو امیر نے اسے اٹھ کر گلے لگایا اور کہا:

"کیوں نہ ہو، تیمور تو گورگانِ اعظم کی اولاد میں سے ہے۔"

پھر ایک لمحہ ٹھہر کے کہا:

"حکومت کا حق صرف اسے حاصل ہے جس کی تلوار میں زور ہو!"

اور تیمور نے امیر قزعن کی یہ بات ہمیشہ کے لیے گرہ میں باندھ لی۔

امیر قزعن کو مغربی صحرا کی طرف سے اطمینان ہوا تو اب اس کی نظر ہرات پر پڑی۔ ہرات کے حاکم ملک معز الدین حسین اور اس میں دیرینہ دشمنی چلی آ رہی تھی۔ دونوں میں کئی معرکے ہو چکے تھے۔ کبھی سرحدی جھڑپیں ہوتیں تو کبھی کھلے میدان میں بے مقصد مقابلہ ہوتا۔ اس دور میں تمام لڑائیاں بے مقصد ہی ہوا کرتی تھیں۔ حملہ آور کا مقصد محض تاخت و تاراج ہوتا۔ مخالف کے گھوڑے پکڑے جاتے۔ سامان لوٹ لیا جاتا۔ دونوں طرف خاموشی چھا جاتی۔ ملک گیری یا دوسرے کے علاقہ پر قبضہ کرنے کا وہ تصور بھی نہ کرتے تھے۔ ادھر لڑائی ختم ہوتی۔ ادھر دونوں فریق اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جاتے۔

امیر قزعن اور ملک معز الدین کے مقابلے اکثر برابر رہتے تھے لیکن یہ حقیقت تھی کہ والیِ ہرات کا پلہ لڑائیوں میں بھاری رہا تھا۔ تاہم یہ اس وقت کا ذکر تھا جب تاتاری سردار منتشر حالت میں تھے۔ ان کی کوئی حکومت نہ تھی۔ اب صورتِ حال تبدیل ہو چکی تھی۔ امیر قزعن میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے شمال کے خانِ اعظم کو آنکھیں دکھا کر سمرقند پر اپنی حاکیت تسلیم کرا لی تھی۔ امیر قزعن اور ملک معز الدین میں کئی سال پہلے صلح کا معاہدہ ہوا تھا جس کی پابندی دونوں حکمران کر رہے تھے لیکن سرحد پر غیر سرکاری جھڑپیں اور مار دھاڑ ہوتی رہتی تھی۔

پھر ایک دن ہرات کی سرحد سے ملنے والے سمرقندی علاقے کے کچھ سردار امیر قزعن کے دربار میں آئے۔ انہوں نے دربار میں بڑا واویلا مچایا۔ ان کے دو سو گھوڑے اور بہت سا سامان ہرات والے لوٹ کر لے گئے تھے۔ امیر قزعن اگر پہلے جیسا تنہا ہوتا تو شاید وہ ضبط کر جاتا اور انہیں کچھ لے دے کے رخصت کر دیتا مگر یہ اس کی انا کا سوال تھا۔ والیِ ہرات کتنا ہی مضبوط سہی لیکن امیر قزعن بہر صورت اس سے اب زیادہ طاقتور تھا۔

امیر قزعن نے فریادیوں کو مہمان خانہ میں ٹھہرایا اور اپنے چند خاص خاص سرداروں کو مشورہ کے لیے طلب کیا۔ ایک ہفتہ کے اندر سب بڑے بڑے سردار سمرقند پہنچ گئے۔ اس اچانک طلبی پر سب ہی حیران تھے۔ سمرقند پہنچ کے انہیں اس کی تو بھنک پڑ گئی تھی کہ والیِ ہرات نے کچھ شرارت کی ہے لیکن تفصیل انہیں امیر ہی کی زبانی معلوم ہوئی۔

امیر قزعن نے بڑے بارعب لہجے میں اپنے سرداروں کو مخاطب کیا:

"اے گورگان! ترکمان اور اغز قوم کے جیالو!

تم سے تاتاریوں کی عزت قائم ہے۔ تم نے ہی بلادِ شمال کے خانِ اعظم کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ آج تمہیں پھر للکارا گیا ہے۔ دشمن اپنی محفوظ سرحدوں اور مضبوط قلعوں پر نازاں ہے لیکن تاتاری اب پہلے جیسے کمزور نہیں۔ ان میں انتشار نہیں۔ وہ ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو چکے ہیں۔ یہ ہمارے اتفاق اور اتحاد کی برکت ہے کہ ہم نے چنگیزی خانِ اعظم کو اس کی شمالی سرحدوں میں محدود کر دیا ہے۔ ہم آنکھ اٹھانے والے کی آنکھ پھوڑ سکتے ہیں۔ ہاتھ اٹھانے والے کے ہاتھ توڑ سکتے ہیں۔"

امیر قزعن نے اپنی پرجوش تقریر ختم کی۔ اپنے سرداروں کے چہروں کا ایک سرسری جائزہ لیا اور نظریں نیچی کر کے ان کے ردِ عمل کا انتظار کرنے لگا۔ امیر کی اس تقریر پر تاتاری سرداروں نے شدید ولولہ انگیز

ردِعمل کا اظہار کیا۔

علاقہ سرپول کے سردار امیر خضر یسوری نے کھڑے ہوکر تلوار ہوا میں لہرائی اور گرج کر بولا:

"امیر قزغن! ہمیں دشمن کا نام بتائیں۔ ہم اس کے سر کا نذرانہ امیر کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں"

بدخشاں کے سردار نے اور زیادہ سخت رویہ اختیار کیا اس نے کہا:

"ہم دشمن کا سر ہی نہیں لائیں گے بلکہ اس کے علاقہ کو اس طرح پامال کریں گے کہ آبادیوں کا نام نشان مٹ جائے گا"

تیمور بھلا کیوں پیچھے رہتا اس نے کہا:

"میرا خیال ہے کہ امیر کا اشارہ ملک معزالدین حسین والیِ ہرات کی طرف ہے۔ اس کے لشکری ہماری سرحدوں میں داخل ہو کے اکثر لوٹ مار کرتے رہتے ہیں۔ اگر میرا خیال درست ہے تو مجھے اجازت دی جائے میں اسے گرفتار کر کے پا بجولاں دربارِ سمرقند میں لاؤں تاکہ دنیا دیکھ سکے کہ حاکمِ سمرقند سے گستاخی کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے"۔

امیر قزغن نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولا:

"ہاں میرے بہادر سردارو! والیِ ہرات کی حرکتیں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ ہماری سرحدی بستیاں اس کے لشکریوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہی ہیں"۔

علاقہ شبرغان کا سردار محمد خواجہ بڑا جوشیلا تھا۔ چیخ کر بولا:

"ہرات کو تاراج کرنے کا پروانہ میرے نام لکھا جائے۔ میں ملک معزالدین کو ایسی سزا دوں گا کہ اس کی سات پشتیں یاد رکھیں گی"۔

امیر قزغن نے جواب دیا:

"میں اپنے سرداروں کے جوش اور جذبہ سے بہت خوش ہوں لیکن اب تاتاریوں نے سمرقند میں ایک مستحکم حکومت قائم کرلی ہے۔ اس لیے حکومت کا کام حکومت کی سطح پر ہونا چاہیے تاکہ والیِ ہرات یہ نہ کہہ سکے کہ اس پر اچانک حملہ کیا گیا۔ ہم دشمن کو للکار کر مارنا چاہتے ہیں۔ جنگ ہرات کی سرزمین پر ہونا چاہیے"۔

"ہم امیر قزغن کے حکم کے منتظر ہیں"۔ کئی سرداروں نے یہ جملہ بیک وقت ادا کیا۔

امیر قزغن نے اپنے تیار کردہ منصوبہ سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا:

"کئی سال پہلے ہم نے ہرات سے صلح کا معاہدہ کر لیا تھا ہم اس معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے پہلے والیِ ہرات سے دو سو گھوڑوں اور لوٹے ہوئے سامان کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ جن لوگوں کے گھوڑے اور سامان ہرات والے زبردستی لے گئے ہیں وہ سمرقند میں فریاد لے کر آئے ہیں۔ اگر والیِ ہرات نے گھوڑے اور سامان واپس کر دیا اور لٹیروں کو ہمارے دربار میں گرفتار کر کے بھجوا دیا تو ہم سمجھیں گے کہ والیِ ہرات کو ہماری طاقت کا اندازہ ہے۔ اگر اس نے انکار کیا تو پھر ہرات کا فیصلہ تلوار سے ہوگا"۔

امیر قزغن کی اس رائے سے ہر سردار نے اتفاق کیا۔ امیر نے سرداروں کو اپنے علاقوں میں واپس جانے کی اجازت دی تاکہ وہ جنگ کی تیاری کر سکیں۔ پھر امیر قزغن نے تیمور سے دو معتبر آدمی طلب کیے جو ان کا پیغام لے کر ہرات جانے کے اہل ہوں۔ تیمور نے اپنے وفادار غلام عبداللہ اور دوسرے جوان کو جس کا نام بھی عبداللہ تھا، اس خدمت کے لیے پیش کیا۔ امیر قزغن نے ان دونوں کے ذریعے والیِ ہرات کو زبانی پیغام بھجوایا۔ دونوں قاصد یا سفیر ہرات جانے لگے تو امیر قزغن نے تیمور سے کہا:

"والیِ ہرات ہمارے پیغام کا جو جواب دے گا اس کا ہمیں علم ہے تم کوچ کی تیاری کرو۔ ہرات کا معرکہ بھی تم کو سر کرنا ہے"۔

اور تیمور جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

○

ہرات سے ابھی جواب نہ آیا تھا کہ امیر قزغن نے تیمور کے ایک ہزاری دستے کو تاتاری لشکر کا مقدمۃ الجیش بنا دیا۔

مقدمۃ الجیش یا ہراول دستہ لشکر کے آگے آگے چلتا تھا اس دستہ کی سرداری بھی تیمور کے سپرد کی گئی تھی۔ تیمور کے دستہ میں جو سوار شامل تھے وہ تمام کے تمام نوعمر جوان تھے۔ تیمور خود بھی جوان تھا اس لیے اس نے اپنے دستہ میں چھانٹ چھانٹ کر جوانوں کو شامل کیا تھا۔ وہ نئے خون پر زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر سازشوں سے بچنا چاہتے ہو تو فوج میں نوجوانوں کو بھرتی کرو۔ وہ اپنے ایک ہزار جوانوں کے ناموں کی فہرست اپنے ساتھ رکھتا۔ یہ جوان بھی اس پر جان نچھاور کرنے پر آمادہ رہتے۔ تیمور کھانے پر بیٹھتا تو دو چار

سواروں کو مزید اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھاتا۔ کبھی کبھی وہ اپنے جوانوں کی ضیافت بھی کرتا۔ قصرِ سفید
شاندار ضیافتیں دینا اسے بہت پسند تھا۔

امیر قزغن کے پیغام کے جواب میں تیمور کا خانہ زاد غلام عبداللہ گھوڑوں کا تحفہ لے کر سمرقند
امیر قزغن کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ چراغ پا ہو گیا۔

قزغن نے کہا:

"ملک معزالدین نے ہماری توہین کی ہے۔ کیا ہم فقیر ہیں جو گھوڑوں کا تحفہ قبول کریں۔"

تیمور نے جواب دیا:

"میں پوری طرح تیار ہوں۔ بس آپ کا حکم چاہیے۔"

امیر قزغن سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر سر اٹھا کر پوچھا:

"گھوڑے لے کر ان کا کوئی سردار آیا ہے تو اسے بلاؤ۔ شاید اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو"

"ہرات سے کوئی سردار نہیں آیا امیر۔"

تیمور نے بتایا:

"ہم نے دو قاصد بھیجے تھے۔ والیِ ہرات نے ایک کو روک لیا ہے اور دوسرے کے ساتھ
بھیج دیا ہے۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والے مزدور اور سائیس ساتھ آئے ہیں۔"

"یہ تو اور زیادہ توہین ہے تیمور۔"

امیر غصے سے لال پیلا ہو گیا:

"کسی دربار میں تحفہ بھیجا جاتا ہے تو کوئی معزز سردار تحفہ پیش کرنے کے لیے ساتھ جاتا
نے صرف گھوڑے بھیجے ہیں۔ ہم اس کے گھوڑوں کے بھوکے نہیں۔ ہم نے اپنے گھوڑے منگوا"

تیمور خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

امیر قزغن نے فیصلہ کیا۔ بولا:

"پانچ ہزار سواروں کے ساتھ ہرات کا رخ کرو۔ ضرورت پڑنے پر مزید کمک روانہ کر دی
ہم لشکر لے کر تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔ ملک معزالدین اگر ہتھیار ڈال دے تو اسے گرفتار کر
ہرات میں لوٹ مار ہرگز نہ کی جائے۔"

تیمور نے امیر قزغن کے حکم کا ایک ایک لفظ غور سے سنا۔ اپنے ساتھ لے جانے والے پانچ ہزار
سواروں کی تفصیل پوچھی اور مطمئن ہونے کے بعد اپنے رسالہ کا رخ کیا۔

○

عبداللہ کو ہرات سے سمرقند گئے جب ایک ماہ سے زیادہ گزر گیا تو والیِ ہرات کو کچھ فکر ہوئی۔ اسے
علوم تھا کہ امیر قزغن بڑا ضدی سردار ہے۔ اگر وہ پکڑے ہوئے گھوڑوں کی واپسی کے مطالبہ سے دستبردار
ہوا تو یقینی جنگ ہو گی۔ خوف ناک جنگ۔ اس نے بھی چپکے چپکے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ سرحدی راستوں
محافظوں کی نفری میں اضافہ کر دیا اور سرحد کے قریب تازہ دم فوج تعینات کر دی۔ اسے اب اپنی اس غلطی کا
ساس ہوا کہ اس نے گھوڑوں کے تحفہ کے ساتھ اپنے ایک دو سرداروں کو کیوں نہ بھیجا۔ جو سمرقند میں ہونے
لے واقعات سے اسے آگاہ کر سکتے۔ بہرحال اس نے خود کو کیل کانٹے سے پوری طرح لیس کر لیا اور متوقع
کے پیشِ نظر قلعۂ ہرات سے نکل کر مع لشکر کے، سرحد کے قریب اس سڑک کے کنارے خیمہ زن ہو گیا
مرقند اور ہرات کو ملاتی تھی۔ نقل و حرکت کے لیے دونوں شہروں میں یہی واحد راستہ تھا۔

ایک ماہ کی مسلسل رفاقت نے ملکوتی اور عبداللہ کو ایک دوسرے کے بے حد قریب کر دیا۔ ملکوتی کی
اور عبداللہ ایک ہی تاتاری قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے اس کا جھکاؤ بھی فطرتاً عبداللہ کی طرف ہو
بڑی بی جہاندیدہ اور زمانے کے گرم و سرد سے گزر چکی تھیں۔ انہوں نے ملک معزالدین حسین کے بیٹوں کی
بھی دیکھی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ہرات کا کوئی شہزادہ ملکوتی کو پسند نہیں کرتا۔ محض باپ کی خاطر وہ ملکوتی کو
ت کرتے تھے۔ ان کا اختیار ہوتا تو وہ ان ماں بیٹیوں کو ہرات سے نکال باہر کرتے۔ انہیں تاتاریوں سے
تھی اور ملکوتی کی ماں تاتاری تھی۔

عبداللہ میں تمام خوبیاں موجود تھیں جو ہر عورت اپنے داماد میں ڈھونڈتی ہے۔ عبداللہ تمام دن اور
کا زیادہ وقت بھی انہی کے محل میں گزارتا تھا۔ ملکوتی بہت شوخ و شنگ لڑکی تھی لیکن یہ شوخی محض دکھاوا
اس کا دل بھی اندر سے دکھا ہوا تھا۔

ایک دن اس نے آہستہ سے عبداللہ سے کہا:

"عبداللہ! میں نے مسکراہٹ اور شوخی کا یہ لبادہ اپنی ماں کی وجہ سے اوڑھ رکھا ہے ورنہ میں را
تنہائیوں میں اکثر اپنی قسمت پر روتی ہوں۔"

عبداللہ پریشان ہوگیا۔ پوچھا،

"ملکوتی! تمہیں کس بات کی کمی ہے۔ یہ محل، نوکر چاکر۔ والیِ ہرات تم سے محبت کرتا ہے۔
ہر جگہ عزت ہے۔"

"نہیں عبداللہ!"

ملکوتی افسردگی سے بولی:

"سوتیلے والیِ ہرات کے اور تمام لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور وہ اس لیے کہ میری ماں تاتار
تاتاری ہونا یہاں ایک گالی ہے۔ میری ماں حد سے برداشت کرتے کرتے موت کے قریب پہنچ گئی
اسے سب سے زیادہ میرا غم کھائے جا رہا ہے۔ میں خود جانتی ہوں کہ میرا مستقبل تاریک ہے۔ والیِ ہرا
آنکھ بند ہوتے ہی میں یہاں سے نکال دی جاؤں گی۔ میں یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مسکراتی اور قہقہ
ہوں۔ اگر میں بھی ماں کے ساتھ بیٹھ کے قسمت پر آنسو بہانے لگوں تو اس طرح حالات نہیں بدل سکیں
ماں کا خاتمہ جلد ہو جائے گا۔"

عبداللہ نے کہا:

"تو کیا تمہیں ہرات کا باشندہ نہیں سمجھا جاتا؟"

"باشندہ کیسا۔ ہمیں تو یہ کتے سے زیادہ بدتر سمجھتے ہیں۔"

"لیکن تمہارا باپ تو ملک حسین کا سگا بھائی تھا۔ نام تو باپ کی طرف سے چلتا ہے۔"

"تمام شہزادے میرے باپ کو بھی برا کہتے ہیں۔"

ملکوتی کی آنکھیں بھر آئیں:

"امی کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ اپنے وطن واپس چلی جائیں لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ والی
تاتاریوں کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔"

"اللہ نے چاہا تو میں چچی جان کو ایک دن ضرور بلخ لے جاؤں گا۔" عبداللہ نے بڑے عزم سے
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "اور اگر تم پسند کرو ملکوتی! تو میں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جا

"میں چاہوں بھی تو یہ کیسے ممکن ہے عبداللہ...." ملکوتی بے چارگی سے بولی۔ "خوشی سے یہاں کوئی
جانے نہ دے گا اور زبردستی کرنے کی ہم میں ہمت نہیں۔"

عبداللہ جذباتی ہوگیا:

"ملکوتی تم از کم مجھ سے یہ وعدہ تو کر لو کہ اگر قدرت نے بہتر حالات پیدا کر دیے تو تم بھی چچی
کے ساتھ میرے وطن چلو گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔"

ملکوتی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"لیکن ایک ناممکن بات کا وعدہ کس کام کا؟"

یہ عبداللہ کی محبت کا کھلا ہوا اعلان تھا۔ عبداللہ نے چاہا کہ اس خوشی میں وہ ملکوتی کو گلے لگا لے لیکن
ملکوتی کی کنیز فراجی گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

فراجی نے ہانپتے ہوئے کہا:

"غضب ہوگیا شہزادی غضب۔ ظالم تاتاری فوج لے کر ہرات پر چڑھ آئے ہیں۔ خبر آئی ہے سرحد
پر جنگ شروع ہو گئی ہے۔ تمام فوجی ادھر بھاگے جا رہے ہیں۔"

عبداللہ کے لیے یہ دوسری خوشی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ امیر قزعن نے والیِ ہرات کا تحفہ قبول نہیں کیا۔
اور چڑھائی کر دی ہے۔ فراجی اتنا بتا کر ملکوتی کی ماں کو خبر دینے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ملکوتی نے پریشان نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ عبداللہ کے لبوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ
رینگ رہی تھی۔

ملکوتی نے ناگوار انداز میں کہا:

"عبداللہ۔ تم مسکرا رہے ہو۔ کیا یہ خوشی کا موقع ہے؟"

"ہاں ملکوتی!"

عبداللہ اطمینان سے بولا:

"یہ خوشی کا موقع نہیں بلکہ خوشی ہرات کی سرحدوں تک پہنچ گئی ہے۔ اب میں چچی جان کو لے کر
بلخ جاؤں گا!"

"کیا کہہ رہے ہو عبداللہ۔ کس طرح لے جاؤ گے انہیں؟" ملکوتی نے حیرت سے پوچھا۔
"سرحد پر لڑنے والی تاتاری فوج کے سردار میرے آقا تیمور ہوں گے"۔

عبداللہ نے ملکوتی کو بتایا:

"تمام اہم لڑائیوں کی سرداری انہی کو دی جاتی ہے۔ جب وہ لڑتے ہوئے اس قلعے تک پہنچ
گے تو تم بھی جان آزاد ہوں گی۔ انہیں یہاں جانے سے کوئی نہ روک سکے گا"۔

ملکوتی کو اطمینان نہ ہوا۔ بولی:

"تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ تاتاری فتح یاب ہوں گے، والیِ ہرات خود اپنے لشکر کی کمان کر رہے
ہیں۔ ہرات کی فوج کو شکست دینا بڑا مشکل ہے"۔

یہ ملکوتی کا اندازہ اور خیال تھا۔ اس میں شک نہیں کہ والیِ ہرات بہادر اور تجربہ کار تھا۔ اسے ہر
سے تا دمِ دم تک مل سکتی تھی لیکن اس کے مقابلے پر تاتاریوں کی کمان امیر تیمور کر رہا تھا۔ جوان عمر تھا
اس کی عمر کم تھی لیکن فوجی حکمتِ عملی میں وہ اپنی نظیر آپ تھا۔

تیمور کو امیر قزعن نے صرف پانچ ہزار بہادروں کا لشکر دیا تھا۔ اس کا ذاتی دستہ ایک ہز
جانبازوں پر مشتمل تھا۔ اس طرح ہرات جیسی مضبوط طاقت کو زیر کرنے کے لیے اس کے ساتھ
چھ ہزار سوار تھے۔ امیر قزعن نے مزید کمک بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا اور دو ہزار کا لشکر تیمور کے
کمک کی صورت میں آ رہا تھا۔

امیر قزعن کو تیمور پر اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ وہ جس مہم پہ تیمور کو بھیجتا اس کی فتح کی خوش
لوگوں کو پہلے ہی سنا دیتا۔ اب تک ہوا بھی ایسا ہی تھا۔

تیمور سمرقند سے فوج لے کر چلا تو اس نے وہ گھوڑے بھی ساتھ لے لیے جو ملک معزالدین
تحفے کے طور پر امیر قزعن کو بھیجے تھے۔ اس کے جاسوس پہلے ہی ہرات میں داخل ہو چکے تھے۔ جاسو
تیمور کو خبر بھیج دی تھی کہ سرحد کے ساتھ والیِ ہرات اپنا لشکر لیے شاہراہِ سمرقند پر نظریں جم
تیمور نے ہرات آنے کے لیے وہی راستہ اختیار کیا جو سیدھا ہرات کو آتا تھا لیکن ہرات
کے پاس پہنچ کے اس نے پانچ پانچ سو سواروں کے بارہ دستے بنائے اور انہیں دائیں بائیں
میل تک پھیلا دیا۔ اس نے اپنے ساتھ صرف دو ہزار سوار رکھے۔ ان میں ایک ہزار سوار تو ا

خاص دستے کے تھے اور ایک ہزار دوسرے بہادروں کا دستہ تھا۔
اب جو اس نے لشکر کو آگے بڑھایا تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بیس میل تک ایک عظیم الشان
لشکر ہرات کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔

والیِ ہرات کے جاسوس تیمور کی اس حکمتِ عملی کو نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے بھاگ کر والیِ ہرات کو خبر دی
کہ بیس بیس میل تک سمرقندی لشکر پھیلا ہوا ہے جس کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ہر طرف لشکر
ہی لشکر دکھائی دیتا ہے۔

والیِ ہرات اس اطلاع سے بہت پریشان ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ تاتاری لشکر سیدھی سڑک سے
آئے گا اور ایک ہی میدان میں جنگ کا فیصلہ ہو گا لیکن اب میدانِ جنگ بیس میل وسیع ہو گیا تھا۔

تیمور نے اپنی رفتار آہستہ رکھی تاکہ دشمن پر اعصابی دباؤ پڑتا رہے۔ آخری حربہ اس نے یہ استعمال
کیا کہ سر پر پہنچ کر اس نے ساتھ لائے ہوئے گھوڑوں کا رُخ ہرات کی طرف کر دیا اور پھر انہیں چابک
مار مار کر بھگا دیا۔

دو سو گھوڑوں کا یہ غول ایک بلائے ناگہانی کی طرح ملک معزالدین کے لشکر میں گھس گیا اور خیموں اور
لشکریوں کو روندتا ہوا گزر گیا۔ اس سے ایک طرف تو سامان برباد ہوا۔ دوسری طرف کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں
ہرات کے لشکریوں نے بڑی مشکل سے ان گھوڑوں پر قابو پایا۔

تیمور بڑھتا ہوا آخر ہرات کے لشکر کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ تیمور نے لشکر کو
رک کر خیمے لگانے کا حکم دیا۔ ملک معزالدین کا خیال تھا کہ تاتاری فوراً حملہ کر دیں گے لیکن تیمور نے حملے سے
گریز کیا۔ اور اطمینان سے دشمن کے سامنے خیمے ڈیرے لگا دیے۔

ملک معزالدین گھبرایا ہوا تھا۔ تاتاریوں کو خیمے لگاتے دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا اور امید بندھی کہ شاید
تاتاری صلح کی بات چیت کریں گے۔ اس نے بھی حملہ کرنے میں پہل نہ کی بلکہ اسے حملہ کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔
دراصل ملک معزالدین تاتاری لشکر کی آن بان دیکھ کر ہی ذہنی طور پر شکست کھا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ لڑائی
کے بجائے اگر صلح ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

رات کو تیمور نے ایک اور غضب ڈھایا۔
اس نے اپنے دستے کے پانچ سو سواروں کو ہرات کے لشکر پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔ تیمور نے

خود شب خوں کی قیادت نہیں کی بلکہ باقی ڈیڑھ ہزار سواروں کو تیار کر کے رات بھر جاگتا رہا تاکہ اگر جوا
کاروائی ہو تو اس کی پوری مدافعت کی جا سکے۔

تاتاریوں کے شب خوں نے ہرات کے لشکر پر قیامت ڈھا دی۔ انہیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ تھکا
لشکر شب خوں کی جرأت کر سکتا ہے۔ شب خوں میں بے شمار ہراتی مارے گئے اور صدہا خیموں میں آگ
بھڑک اٹھی۔

تیمور نے ملک معزالدین کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ وہ رات کے نقصان کا اندازہ لگا رہا تھا کہ تیمور نے
صف بندی کر کے عام حملے کا حکم دے دیا۔ نقاروں پر چوٹ پڑی اور تاتاری سواروں نے بیس میل کے لمبے
محاذ پر حملہ شروع کر دیا۔ تیمور کے لشکر کے برق رفتار سوار مارتے کاٹتے تیزی سے صفوں کو درہم برہم کر کے
اندر گھس جاتے۔ پھر دائرہ بنا کر ہراتیوں کو گھیر لیتے۔ جو اُن کے دائرے میں آ جاتا وہ بچ کر نہ نکل پاتا۔

ملک معزالدین اس قسم کی جنگ کے لیے تیار نہ تھا۔ بیس میل لمبے محاذ پر کمک پہنچانا اس کے لیے
ناممکن ہو گیا۔ تیمور کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ بیس میل کے پورے محاذ پہ ایک گھنٹہ میں دو چکر لگاتا اور
اپنے سواروں کے حوصلے بلند کرتا۔ ہر جگہ کے سپاہی یہی سمجھتے کہ تیمور ان کے ساتھ ہی لڑ رہا ہے۔

دوپہر سے پہلے ہی ملک معزالدین نے پسپائی اختیار کر لی۔ اس کوشش میں اس کی فوج کا بیشتر حصہ
کام آیا۔ جب وہ اپنی جان بچا کر ہرات کے قلعے میں پہنچا تو اس کے ساتھ صرف چوتھائی فوج رہ گئی تھی۔ باقی یا تو
میدانِ جنگ میں ماری گئی تھی یا اِدھر اُدھر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

والیِ ہرات کو بڑی عظیم شکست اٹھا کر قلعہ بند ہونا پڑا۔ پہلے تو قلعہ میں واویلا مچا۔ سب نے اپنے طور
پر شکست پر آنسو بہائے اور افسوس کیا۔ پھر ہر ایک کو اپنی جان کی فکر پڑ گئی۔ ظاہر تھا کہ تاتاری قلعہ فتح کیے
بغیر تو واپس نہ جا سکتے تھے اور قلعہ بچتا نظر نہ آتا تھا۔

شام ہوتے ہوتے تیمور اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ ہرات کے سامنے نمودار ہوا اور آتے ہی قلعہ کا
محاصرہ کر لیا۔

ملک معزالدین صلح پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ سب کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ کسی
میں مقابلے کی طاقت نہ تھی۔ سب نے ملک کی رائے سے اتفاق کیا مگر مشکل یہ تھی کہ صلح کی گفتگو کس طرح اور
کس کے ذریعے شروع کی جائے۔ ملک کو قلعہ ہرات میں کوئی ایسا شخص نظر نہ آتا تھا جو اس کام کے لیے موزوں

ہو صرف ایک قاضی سیف الملک تھے جن پہ اعتماد کیا جا سکتا تھا لیکن وہ سیدھے سادے مسلمان تھے فوجی
قسم کے جھگڑوں کو نپٹانا ان کے بس کے روگ نہ تھا۔

سوچتے سوچتے ملک کو اس سمرقندی کا خیال آیا جسے اس نے ایک طرح سے یرغمال کے طور پر قلعہ ہرات
میں روک لیا تھا۔ ملک کو امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی۔ اس نے قاصد کو بلا کے گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا
لیکن ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے۔ ملک نے بجائے عبداللہ کو اپنے پاس بلانے کے، خود اس کے پاس
جا کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح وہ عبداللہ پر اخلاقی دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔

دریافت کرنے پہ ملک کو بتایا گیا کہ سمرقند کا قاصد ملکوتی کے محل میں ہے۔ عبداللہ کا زیادہ وقت ملکوتی
اور اس کی ماں کے پاس ہی گزرتا تھا۔ جب سے لڑائی کا غلغلہ اٹھا تھا وہ رات کو بھی وہیں رہنے لگا تھا۔ ملکوتی
اور اس کی ماں نے خود اسے وہیں رکنے کو کہا تھا۔ ان کی امیدوں کا واحد سہارا اب عبداللہ ہی تھا۔

ملک معزالدین حسین والیِ ہرات، تمام آدابِ امارت اور ریاست بالائے طاق رکھ کر بغیر اطلاع
ملکوتی کے محل میں پہنچ گیا۔

سب سے پہلے اس کی ملاقات ملکوتی کی ماں سے ہوئی۔ وہ والیِ ہرات کو اپنے محل میں دیکھ کر سخت خوفزدہ
ہوئی۔ وہ سمجھی کہ کسی نے اس کی شکایت کی ہے اور اب اس پر اور اس کی بیٹی پہ کوئی بڑی بلا نازل ہونے
والی ہے۔

ملک اس سے انتہائی خلوص و مروت سے ملا۔ ملکوتی کی ماں کو اس پر بڑی حیرت ہوئی اور اس کا خوف
دور ہو گیا۔ ملک نے سب سے پہلے ملکوتی کی خیریت دریافت کی پھر عبداللہ کے بارے میں پوچھا۔ اُسی
وقت عبداللہ اور ملکوتی لرزاں و ترساں سلام کو حاضر ہو گئے۔

ملک نے بڑے پیار سے عبداللہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ عبداللہ پھٹی پھٹی نظروں سے ملک کو دیکھ
کر حیران رہ گیا۔

ملک نے بات شروع کی:

"ہم بڑے خلوص کے ساتھ تاتاری قاصد کو تاتاریوں کی فتح کی مبارک باد دیتے ہیں۔"

عبداللہ کو پسینہ آ گیا۔ وہ سمجھا کہ ملک معزالدین اس پر طنز کر رہا ہے۔ اسے اپنی موت سامنے
نظر آنے لگی۔

ملک نے ذرا رک کر کہا :

"تم تاتاری ہو۔ ہماری بھاوج بھی تاتاری ہے۔ امید ہے کہ ہماری بھاوج نے تمہاری خاطر مدارات
کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو گی"۔

"میں بڑے آرام سے ہوں اور آپ کا شکر گزار ہوں والیِ ہرات"۔ عبداللہ نے ڈرتے ڈرتے

ملک بولا :

"عبداللہ۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمہارا آقا امیر تیمور ہے"۔

"کسی نے ٹھیک بتایا ہے والیِ ہرات!" عبداللہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ملک آخر کہنا کیا چاہتا ہے۔

"کیا تمہیں علم ہے کہ امیر تیمور اس وقت کہاں ہے؟" ملک نے پوچھا۔

عبداللہ کو کچھ علم نہ تھا۔ اس نے سادگی سے جواب دیا :

"مجھے ان کے متعلق کوئی خبر نہیں"۔

ملک بولا :

"اگر میں یہ کہوں کہ تمہارا آقا اس وقت قلعہ ہرات کے سامنے موجود ہے تو کیا تم یقین کرو گے"

"ضرور یقین کروں گا۔ انہیں اس وقت ہرات ہی میں ہونا چاہیے"۔ عبداللہ نے جرأت سے جواب

ملک کو اس جواب پر کچھ حیرت ہوئی۔ اس نے کہا :

"تم یہ کیسے کہتے ہو کہ اسے اس وقت ہرات ہی میں ہونا چاہیے"۔

امیر تیمور کی ہرات کے قلعہ کے باہر موجودگی نے عبداللہ کو اور زیادہ بے خوف کر دیا تھا۔ بولا :

"اے والیِ ہرات! مجھے اس بات کا پہلے ہی خیال تھا۔ امیر سمرقند، ہر اہم مہم پر میرے آقا تیمور ہی
بھیجتے ہیں۔ کیونکہ تیمور اور فتح ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ہرات کا معرکہ بھی اہم ہے اس کی سرداری پر
امیر تیمور کو مامور ہونا چاہیے"۔

ملک کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے کہا :

"عبداللہ۔ تمہارا آقا کامیاب ہوا اور ہمیں شکست ہوئی۔ ہم امیر تیمور سے باعزت صلح کے خواہشمند ہیں
کیا تم اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہو"۔

اصل بات اب سامنے آئی تھی۔ ملکوتی اور اس کی ماں کو بھی والیِ ہرات کی حالت پر بڑا افسوس ہوا۔

بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ سچ ہے غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ والیِ ہرات کچھ ہی دن پہلے امیر سمرقند
کو ذلیل و خوار کر رہا تھا اور اب وہ سمرقند کے ایک معمولی قاصد کے تعاون کے لیے خوشامد کر رہا تھا۔

عبداللہ بولا :

"والیِ ہرات مجھے جو خدمت بجا لانے کا حکم دیں گے میں اس میں عذر نہ کروں گا۔ اگر وہ چاہتے
ہیں کہ میں اپنے آقا سے ان کے لیے مراعات کی درخواست کروں تو میں آمادہ ہوں۔ میں اپنے آقا کی خوشامد
کروں گا۔ مجھے امید ہے میرا آقا میری بات نہ ٹالے گا"۔

ملک معزالدین شکست کے صدمہ سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے کہا :

"عبداللہ! ہمیں کچھ زیادہ مراعات نہیں چاہییں۔ ہماری اور ہمارے اہلِ خاندان کی جان بخشی، قلعہ
میں قتل و غارت گری کی ممانعت کے علاوہ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ اس کے بدلے ہم قلعہ امیر تیمور کے حوالے
کر دیں گے اور حسبِ طلب ذرِ تاوان ادا کریں گے"۔

عبداللہ اپنے آقا سے ملنے پر تیار ہو گیا۔ فوراً سفارت ترتیب دی گئی۔ ملک معزالدین نے اس سفارت
میں قاضی سیف الملک کو اپنی طرف سے شامل کیا اور شہزادی ملکوتی، ملک سے ضد کر کے خود اپنے طور پر شامل
ہو گئی۔ تین گھوڑوں پر سفید پھریرے آویزاں کیے گئے۔ قلعہ ہرات کا دروازہ کھولا گیا۔ عبداللہ، قاضی ہرات
اور ملکوتی سفید پھریرے اڑاتے لشکر کی طرف چلے۔ قلعہ ہرات کا دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔

○

تیمور خود بھی خونریزی کے بغیر قلعہ پر قبضہ کا خواہشمند تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ صلح کے پیغامبر آ رہے
ہیں تو خیمہ سے نکل کر اس نے سفارت کا خود استقبال کیا۔ عبداللہ نے اپنے آقا کو استقبال کے لیے موجود دیکھا تو
دور ہی سے گھوڑا چھوڑ کر پا پیادہ ہو گیا۔ اسے پیدل دیکھ کر قاضی اور ملکوتی بھی گھوڑوں سے اتر پڑے۔

امیر تیمور، عبداللہ کو سفارت کے ساتھ دیکھ کر مسکرایا۔ عبداللہ نے قریب پہنچ کر تیمور کو سلام کیا اور
سر جھکا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ قاضی ہرات اور شہزادی نے تیمور کی تعظیم پیش کی۔

تیمور نے کہا: "عبداللہ! ہمیں تمہاری بہت فکر تھی۔ تمہارا ہم نام عبداللہ بھی تمہارے لیے پریشان تھا۔

قلعہ والوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی۔"

"بالکل نہیں میرے آقا!"

عبداللہ ادب سے بولا:

"اس وقت میں والیِ ہرات کی طرف سے آپ کی خدمت میں صلح کا پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں۔ ساتھ ہرات کے قاضی صاحب اور شہزادی ملکوتی ہیں۔"

"شہزادی!" تیمور نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ والیِ ہرات کی بیٹی ہیں؟"

"نہیں آقا!"

عبداللہ نے بتایا:

"یہ والیِ ہرات کے مرحوم بھائی کی بیٹی ہیں۔ میں یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ شہزادی کی ماں ایک تاتاری خاتون ہیں اور اس وقت قلعہ میں موجود ہیں۔"

"بہت خوب!"

تیمور نے شہزادی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"تو پھر اس رشتے سے یہ ہماری بھی بیٹی ہوئی۔"

ملکوتی کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اسے ایک فاتح سردار سے اتنے محبت بھرے سلوک کی امید نہ تھی۔

عبداللہ نے کہا:

"اے آقا! والیِ ہرات اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں۔ وہ قلعۂ ہرات آپ کے حوالے کرتے ہیں لیکن ان کی درخواست ہے کہ والیِ ہرات اور ان کے خاندان کے تمام لوگوں کی جان بخشی کی جائے یہ کہ قلعہ والوں کو عام معافی دی جائے۔ ان کا سامان نہ لوٹا جائے۔ اس کے صلہ میں جس قدر زرِ تاوان کیا جائے گا وہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

صلح کی شرائط سامنے آ گئی تھیں۔ ذرا دیر سوچنے کے بعد تیمور نے اعلان کیا:

"قلعہ والوں کو امان دی جائے گی۔ قتل و غارت یا لوٹ مار قطعی نہ ہو گی۔ ملک کے تمام خاندان والوں کی جان بخشی کا اعلان کیا جاتا ہے سوائے ملک معزالدین حسین کے۔ ملک معزالدین حسین کی جان بخشی کا نہیں۔ میں اپنی طرف سے ان کی جان بخشی کرتا ہوں لیکن اس کی تصدیق امیر فرغن حاکمِ سمرقند کریں گے۔ ملک معزالدین کو ہمارے ساتھ سمرقند چلنا ہو گا۔ انہیں باعزت طریقے سے سمرقند لے جایا جائے گا۔"

قاضیِ ہرات اور ملکوتی اس حسنِ سلوک سے بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے امیر تیمور کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ سفارت اسی وقت قلعہ واپس گئی۔ ملک معزالدین ان کی واپسی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ قاضیِ ہرات نے امیر تیمور کے اعلان کے الفاظ اس کے سامنے دہرائے۔ ملک کی تمام باتیں تیمور نے تسلیم کر لی تھیں سوائے اس کی جان بخشی کے۔ تیمور نے اپنی طرف سے اس کی جان بخشی کر دی تھی اس لیے اس نے فوراً قلعہ کا دروازہ کھلوا دیا۔ اور اپنے سرداروں کے ساتھ قلعہ سے نکل کر امیر تیمور اور تاتاری لشکر کا استقبال کیا۔

چار دن تک قلعہ میں جشن منایا گیا۔ اس دوران عبداللہ نے اپنے دوست عبداللہ (لالہ تری کا شوہر) سے اپنے اور ملکوتی کے تعلقات کی تفصیل بیان کی اور اس نے امیر تیمور سے سفارش کی درخواست کی۔ امیر تیمور خود ملکوتی کی والدہ سے ملاقات کر چکا تھا۔ ملکوتی کی ماں کی بھی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی کسی تاتاری جوان سے کی جائے چنانچہ سمرقند واپسی سے قبل ملک معزالدین کی اجازت حاصل کر کے ملکوتی اور عبداللہ کا عقد کر دیا گیا۔

شمال کا خانِ اعظم

"ہرات فتح ہو گیا۔"

یہ تھے وہ الفاظ، جو تیمور کے قاصد نے حاکمِ سمرقند امیر قزغن کے سامنے بڑے جوش سے ادا کیے۔ امیر قزغن، حاکمِ سمرقند نے اپنا بڑا سا سر اور واحد چندھی آنکھ اس طرح گھمائی جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ یا پھر وہ قاصد کو پاگل سمجھ رہا ہو۔

تیمور کی روانگی کے وقت امیر قزغن نے اس کے کان میں کہا تھا:

"اے گورگانی سپوت! حوصلے سے کام لینا۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے ہرات پہنچ رہا ہوں۔"

امیر قزغن نے صرف چھ ہزار سواروں کے ساتھ تیمور کو ہرات بھیجا تھا تاکہ وہ والیِ ہرات کو اس وقت تک الجھائے رکھے جب تک وہ خود اس کی کمک کو نہیں پہنچتا۔ لیکن ہرات کی قسمت کا فیصلہ امیر قزغن کی کمک پہنچنے سے پہلے ہی ہو گیا۔ تیمور نے والیِ ہرات ملک معز الدین کو ایک خونریز لڑائی میں شکست دے کر قلعہ ہرات پر سمرقند کا جھنڈا لہرا دیا۔ والیِ ہرات نے جان بخشی کے وعدے پر خود کو تیمور کے حوالے کر دیا تھا۔

تیمور کا قاصد فتحِ ہرات کا مژدہ امیر قزغن کو سنا رہا تھا، امیر قزغن نے تین چار بار تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔ یہ امیر کے غصے کی علامت تھی۔ جب وہ غصے میں ہوتا تو کوئی حکم صادر کرنے سے پہلے اسی طرح جلدی جلدی پلکیں جھپکاتا تھا۔ قاصد پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"اے امیر! میں فاتح سردار تیمور گورگانی کا خاص قاصد ہوں۔ مجھے سردار نے آپ تک یہ خوشخبری پہنچانے کے لیے مقرر کیا ہے۔"

امیر قزغن کی پلکیں جھپکنا بند ہو گئیں اور اس کے خوفناک چہرے پر مسکراہٹ کی لکیریں ابھر آئیں:

"کیا تو سچ کہہ رہا ہے قاصد؟"

"بالکل سچ امیر۔ تیمور گورگانی کا قاصد آپ کے سامنے کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔" قاصد نے امیر کے رویے میں تبدیلی دیکھی تو اسے حوصلہ ہوا۔

"تو ایک بار پھر وہی الفاظ دہرا، جو تو نے پہلے آتے ہی کہے تھے۔" امیر قزغن نے بڑی محبت کے ساتھ کہا۔

قاصد نے بلند آواز سے الفاظ دہرائے:

"ہرات فتح ہو گیا۔"

امیر قزغن اتنا خوش ہوا کہ اس نے قاصد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھا لیا اور پوچھا:

"تیرا نام کیا ہے؟"

"عبداللہ۔"

قاصد نے کہا:

"میں خاتون آغا (تیمور کی بیوی) کی کنیز لال نزی کا شوہر ہوں۔"

"خدا تیرا بھلا کرے عبداللہ۔"

امیر قزغن نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا:

"میرے چھوٹے بیٹے کا نام بھی عبداللہ ہے لیکن مجھے اس سے کسی خیر کی امید نہیں۔"

عبداللہ خاموش رہا تو کچھ دیر بعد امیر نے خود پوچھا:

"تیرا لشکر میں عہدہ کیا ہے؟"

"دس سواروں کا رسالدار ہوں۔"

"ہم تیمور سے سفارش کریں گے کہ تجھے سو سواروں کا رسالدار بنا دیا جائے۔"

امیر قزغن کی سفارش اس بات کا اظہار تھی کہ اسے اس مژدہ سے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ پھر اس نے

عبداللہ سے پوچھا:

"تو ہرات کی جنگ میں شریک تھا۔ بتا کہ میرا تیمور کیسے لڑا؟"

"اے امیر! میرے آقا تیمور دشمن پر اس طرح جھپٹ کر حملے کرتے تھے کہ جیسے شیر ہرن (پر حملہ) کرتا ہے۔"

عبداللہ نے کہا اور دیر تک جنگ کی تفصیل بتاتا رہا۔ امیر قزغن اتنے ہی انہماک سے سنتا رہا جس طرح عام تاتاری اپنے آباؤ اجداد کی داستانیں پیشہ ور داستان گو سے سنا کرتے تھے۔

عبداللہ خاموش ہوا تو امیر نے چونک کر پوچھا:

"تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ والیٔ ہرات کس طرح مارا گیا؟"

عبداللہ مسکرا کر بولا:

"اے امیرِ سمرقند! تاتاریوں کا دشمن والیٔ ہرات سردار تیمور کے ہاتھوں گرفتار ہوا ہے اور اپنی جاں بخشی کے لیے سردار تیمور کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔"

امیر قزغن نے اتنے زور کا قہقہہ بلند کیا کہ عبداللہ سہم گیا۔ اس قہقہے کی آواز دور دور تک پہنچی۔ جس سردار نے یہ آواز سنی، اس نے اس کی تقلید میں خود بھی پوری طاقت سے قہقہہ بلند کیا۔

"تاتاریوں میں رواج تھا کہ جب حاکم وقت خوش ہو کر قہقہہ بلند کرے تو تمام لوگ اس کی آواز میں آواز ملائیں۔ اس طرح دیر تک قہقہوں کا ایک تار سا بندھا رہتا تھا البتہ غصے میں لگائے جانے والے قہقہے میں آواز نہیں ملائی جاتی تھی۔ وہ تو ایک قسم کا اعلانِ جنگ ہوا کرتا تھا۔ تمام سردار اسے سن کر تلواریں سونتتے اور حاکم کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

"فاتحِ ہرات تیمور ہے اس لیے والیٔ ہرات کی قسمت کا فیصلہ بھی اسی کو کرنا چاہیے تھا۔ چاہے تو اسے قتل کر دیتا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔" امیر قزغن نے کہا۔

"اے امیر! یہ سوال وہاں بھی اٹھا تھا۔"

عبداللہ نے بتانا شروع کیا:

"والیٔ ہرات نے قلعہ حوالے کرنے کی یہ شرط رکھی تھی کہ اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا جائے گا۔ تیمور نے جواب دیا کہ وہ سوائے والیٔ ہرات کے باقی تمام لوگوں کی جاں بخشی کر سکتے ہیں اور اسے

امیر قزغن کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اس لیے وہ والیٔ ہرات کو گرفتار کر کے آپ کے پاس لا رہے ہیں۔"

"شاباش ہے تیمور . . . . . تو واقعی گورگانِ اعظم کی اولاد ہے۔" امیر قزغن نے کہا۔

وہ اس خبر سے اس قدر خوش ہوا کہ اسی وقت اعلان کرا دیا کہ فاتح تیمور کا شایانِ شان استقبال کیا جائے۔

○

امیر قزغن اپنے لشکر کے ساتھ سمرقند سے سرائے سالی پہنچ چکا تھا۔ سرائے سالی کچی فصیلوں کا ایک پرانا شہر تھا جسے چنگیزی شہزادے، چغتائی نے اپنے دورِ حکومت میں تعمیر کیا تھا۔ مغلوں نے ایشیا اور مشرقی یورپ میں جو شہر خود آباد کیے انہیں سرائے کا نام دیا جیسے روس میں باتو خان نے سرائے باتو اور برقائی خان نے سرائے برقائی تعمیر کی تھی۔

مغل خیمہ نشین تھے۔ ان کا زیادہ وقت گھوڑے کی پیٹھ پر گزرتا تھا۔ ان کے مفتوحہ علاقوں میں بڑے بڑے محل تھے لیکن وہ ان میں اس لیے قیام نہ کرتے تھے کہ محلوں میں رہنے سے سپاہی کاہل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے کچے قلعے بناتے تھے۔

سرائے سالی پہنچ کر امیر قزغن نے اپنے تمام ماتحت سرداروں کو آگاہ کر دیا کہ وہ اپنے اپنے لشکر کے ساتھ سرائے سالی پہنچیں تا کہ اس متحدہ لشکر سے ہرات پر بھرپور وار کر کے اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اب صورت حال تبدیل ہو چکی تھی۔ آگے بڑھنا بیکار تھا۔ تیمور نے ہرات کا معرکہ تنہا سر کر لیا تھا۔ اس نے فوری طور پر علاقائی سرداروں کو فتح کی خوشخبری کے ساتھ سرائے سالی آنے سے روک دیا کیونکہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

تمام سرداروں کو امیر قزغن کا دوسرا حکم نامہ مل گیا۔ فتحِ ہرات ان کے لیے انتہائی حیرت انگیز خبر تھی۔ تیمور کو فاتحِ ہرات کی حیثیت سے قبول کرنا ان کو سخت ناگوار گزرا۔ حیرت اور ناگواری کے ساتھ وہ تیمور کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بھی خائف ہو گئے۔

امیر قزغن کا بڑا بیٹا مسلم مر چکا تھا۔ چھوٹا بیٹا عبداللہ کمسن ہونے کے ساتھ ساتھ راگ رنگ اور حسین

عورتوں کا رسیا تھا۔ اس نے اب تک میدانِ جنگ کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ ان حالات میں ہر قبائلی سردار امیر قزغن کے بعد خود کو حاکمِ سمرقند ہونے کا حقدار سمجھتا تھا۔ اب تیمور کے اس طرح طاقتور بننے سے ان کا اور ید مقابل پیدا ہو گیا تھا۔ امیر قزغن کے منع کرنے کے باوجود کئی سردار شکر لے کر سرائے سالی کو چل پڑے تاکہ سمرقند کے قریب رہ کر حالات کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اور تیمور کو راستے سے ہٹانے کی کوئی تدبیر کر سکیں۔ تیمور کے دونوں بڑے دشمن یعنی اس کا چچا حاجی برلاس اور خجند کا سردار بایزید ان میں پیش پیش تھے۔ یہ سردار تیمور کے واپس آنے سے پہلے ہی سرائے سالی پہنچ گئے۔

امیر قزغن کو ان سرداروں کا آنا بہت ناگوار گزرا لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہا۔ امیر قزغن، فاتحِ ہرات کا پُرجوش انداز میں استقبال کرنا چاہتا تھا جو ان سرداروں کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سردار، تیمور کے خلاف دل میں کدورت رکھتے ہیں۔ امیر قزغن، تیمور کو بعض اعلیٰ اعزازات سے نوازنا چاہتا تھا لیکن اسے اب یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

ہرات سے تیمور کی واپسی کی خبر سرائے سالی پہنچی تو لوگوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ وہ تیمور کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئے۔ تیمور کی چہیتی بیوی الجائی خاتون، ننھے جہانگیر کو لے کر سرائے سالی آ گئی۔ اس کے ساتھ قصرِ سفید کے بہت سے لوگ، شہرِ سبز کے شہزادے کو خوش آمدید کہنے وہاں پہنچ گئے۔ تیمور کا انتظار ہونے لگا۔ انتظار کی گھڑیاں بڑی سخت ہوتی ہیں۔ لوگوں کو ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو گیا۔

اُدھر تیمور نے اپنے پانچ سو جانبازوں کا دستہ ہرات کی حفاظت کے لیے چھوڑا۔ ملک معزالدین والیِ ہرات کے تمام خاندان والوں کو ایک محل میں پہنچایا گیا تاکہ ان کی طرف سے کوئی فتنہ نہ اٹھے۔ بقیہ فوج تیمور اپنے ساتھ لے کر سرائے سالی کی طرف چل دیا۔

تیمور نے ملک معزالدین کو حسبِ مرضی لباس زیب تن کرنے کی اجازت دی۔ اسے جسم پر اسلحہ سجانے سے بھی نہیں روکا گیا اور تیمور نے اس کا گھوڑا اپنے گھوڑے کے برابر رکھا تاکہ اس کی توہین نہ ہو اور نہ دیکھنے والے یہ محسوس کر سکیں کہ ان کا حاکم قیدی کی حیثیت سے جا رہا ہے۔

تمام راستے تیمور، ملک معزالدین کی دلجوئی کرتا رہا اور اسے یقین دلاتا رہا کہ امیر قزغن مزید اس کی جاں بخشی کر دے گا۔

لشکر کے درمیان کچھ بند گاڑیاں بھی تھیں جن میں سے ایک میں ملکوتی اور اس کی والدہ سوار تھیں۔

باقی گاڑیوں میں ملک معزالدین کی وہ بیگمات اور کنیزیں تھیں جنہوں نے اپنے والی کو اس مصیبت کے وقت تنہا چھوڑنا پسند نہیں کیا تھا اور ضد کر کے اس کے ساتھ ہو لیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ملک کے کسی بیٹے نے سرائے سالی جانے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ انہوں نے ہرات میں ٹھہرنے کو ترجیح دی اور باپ کو تنہا تیمور کے ساتھ بھیج دیا۔

امیر قزغن نے اپنے سرداروں کے ساتھ سرائے سالی سے ایک میل آگے بڑھ کر تیمور کا استقبال کیا۔ جہاں تک نظر جاتی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ استقبال کرنے والوں میں حاجی برلاس اور بایزید جلائر بھی تھے لیکن انہیں تیمور کا یہ عروج ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

تیمور اور ملک معزالدین کے گھوڑے، لشکر کے آگے آگے تھے۔ ملک معزالدین کے ساتھ ہرات سے آنے والا واحد مرد، ہرات کا قاضی سیف الملک تھا۔ اس نے تیمور سے ملک کے ساتھ جانے کی اجازت لے لی تھی۔

امیر قزغن کے قریب پہنچ کر تیمور اور ملک معزالدین گھوڑوں سے اتر پڑے۔ امیر قزغن نے آگے بڑھ کر فرطِ محبت سے تیمور کو گلے لگایا اور اس کی پیشانی کے کئی بوسے لیے۔

والیِ ہرات ملک معزالدین سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس وقت قاضی سیف الملک آگے آئے۔ انہوں نے والیِ ہرات کی کمر میں لگی ہوئی تلوار اتار کر اسے بوسہ دیتے ہوئے امیر قزغن کے قدموں میں رکھ دی۔ یہ اطاعت اور فرمانبرداری کے اظہار کا روایتی طریقہ تھا۔

امیر نے معنی خیز انداز میں تیمور کی طرف دیکھا۔ تیمور نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا جس کا مطلب تھا کہ امیر قزغن چاہے تو والیِ ہرات کو معاف کر دے ورنہ اس کی تلوار سے اسے قتل کر دے۔ امیر قزغن کچھ دیر اپنی اکلوتی آنکھ بند کیے سوچتا رہا۔ پھر اس نے تیمور کو تلوار اٹھانے کا اشارہ کیا۔

تیمور کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ امیر قزغن نے دشمن کی تلوار کو ہاتھ نہیں لگایا تھا یعنی اس نے ملک معزالدین کو تلوار واپس کر کے اسے معاف کر دیا تھا۔ تیمور نے فوراً وہ تلوار زمین سے اٹھائی اور امیر قزغن کے سامنے کر دی۔ امیر قزغن نے تلوار کو چھو لیا۔ یہ قبولِ اطاعت کی مزید تصدیق تھی۔ تیمور نے تلوار قاضی صاحب کے حوالے کر دی۔ قاضی نے تلوار کو اس جگہ سے چوما جہاں امیر قزغن کا ہاتھ لگا تھا۔ یہی عمل ملک معزالدین حسین نے دہرایا۔ قاضی نے تلوار ملک معزالدین کی کمر میں دوبارہ لگا دی۔ اس طرح سمرقند اور ہرات کی دشمنی ختم ہو گئی اور ملک کو شاہی مہمان کا درجہ حاصل ہو گیا۔

اس رسم کی ادائیگی کے بعد سب لوگ جلوس کی شکل میں سرائے سالی کی طرف چل دیے۔ اس موقع پر
شمال کے کوہستانی قبائل نے تیمور کی شان میں نغمے اور گیت موزوں کیے تھے جنہیں وہ جھانجھ اور تاشے کی
آواز کے ساتھ لہک لہک کر گانے لگے۔

عوام کا یہ خلوص اور محبت دیکھ کر تیمور کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ لوگ اس سے ملنے اور اس کے ہاتھ چومنے
کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے۔ مجبور ہو کر اس نے سواری چھوڑ دی اور اپنے شیدائیوں کے ساتھ پیدل چلتا ہوا
سرائے سالی تک آیا۔

امیر قزغن نے والیِ ہرات کو معاف کر کے جس فراخدلی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا تھا اس سے سب ہی خوش
تھے، سوائے چند اُن امیروں کے، جو تیمور کے ساتھ ہراتیوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ عام تاتاریوں کے نزدیک
لڑائی کا مقصد لوٹ مار اور دولت اکٹھا کرنا ہوتا تھا۔ ایسے خیالات رکھنے والے بعض امیر تیمور کے لشکر میں
بھی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہرات کے خلاف بڑی جانبازی اور بے جگری سے لڑے تھے لیکن جنگ کے
بعد صلح ہو جائے تو اس کی پابندی فرض ہو جاتی ہے۔ امیر تیمور نے ہرات میں لوٹ مار کی ممانعت کر دی تھی۔ اس
لیے ان امیروں کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا اور اب امیر قزغن نے والیِ ہرات کو معافی دے دی تھی۔ اس کا مطلب یہ
تھا کہ ہرات کی حکومت سے تاوانِ جنگ بھی نہیں لیا جائے گا۔

بدظن امیروں نے رات کی ضیافت پر اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ کھانے کے بعد ان میں سے ایک امیر
نے امیر قزغن سے کہا:

"اے امیر! ہرات پر فوج کشی کرنے سے ہمیں کیا حاصل ہوا۔ میدان میں ہمارے کتنے ہی آدمی کام آئے
لیکن آپ نے والیِ ہرات کو معاف کر کے اس سے تاوانِ جنگ کا بھی مطالبہ نہیں کیا۔"

دوسرے امیر کا لہجہ تلخ تھا:

"والیِ ہرات کا سر قلم کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرنا چاہیے۔"

بولنے والوں کا حوصلہ بڑھ گیا:

"ہرات سے زیادہ کوئی ریاست دولت مند نہیں۔ ہرات کی تمام دولت لشکر میں تقسیم ہونی چاہیے"
تیسرے نے کہا۔

والیِ ہرات ملک معز الدین حسین اور اس کا قاضی بھی اس دعوت میں شریک تھے۔ انہوں نے امیر

بگڑے دیکھے تو سمجھے کہ اب جان کی خیر نہیں۔

تیمور معزز مہمانوں میں موجود اپنے لالچی امیروں کی اس بچھوری حرکت سے مارے شرم کے، پانی
ہوا جا رہا تھا۔ اسے غصہ بھی بہت آ رہا تھا۔ اگر امیر قزغن موجود نہ ہوتا تو تیمور بے دھڑک ایسے تمام
وں کی گردنیں اڑا دیتا۔

امیر قزغن بھی بڑی ندامت مگر تحمل سے امیروں کی باتیں سن رہا تھا۔ کچھ اور امیروں نے بھی ان کی ہاں
ہاں ملائی۔ والیِ ہرات کا سر قلم کرنے کا مطالبہ کیا اور ہرات کی دولت پر اپنا حق جتایا۔

جب سب اپنی اپنی بولیاں بول کر چپ ہوئے، تو امیر قزغن نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور شیر کی
گرج کر بولا:

"کسی کو کچھ اور بھی کہنا ہے؟"

امیر کا لہجہ اتنا تند و تیز تھا کہ لالچی امیر لرز گئے۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کسی نے مزید بولنے کی
نہ کی۔ اس قدر گہری خاموشی طاری ہوئی جیسے وہاں کوئی متنفس سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ لوگوں نے جیسے
تک روک لی تھیں۔ امیر قزغن اسی کڑک دار لہجے میں بولا:

"تم لوگ لالچی اور احسان فراموش ہو۔ تم وہ دن بھول گئے جب تم بلادِ شمال کے چنگیزی خانِ اعظم کے غلام
تم اس کے تلوے چاٹتے تھے اور وہ تمہیں کتوں کی طرح دھتکارتا تھا۔ میں نے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تمہیں
جھنڈے کے نیچے اکٹھا کیا اور تمہارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر خانِ اعظم سے ٹکرا گیا۔ میرے جسم
زخموں کے ستر نشان ہیں۔ میری آنکھ جنگِ آزادی میں ضائع ہو گئی۔ میں نے تمہیں آزادی دلائی۔ تمہارا وقار
یا۔ اور اس کا صلہ تم یہ دے رہے ہو کہ دشمن کے سامنے مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ تم نے مجھے سمرقند اور تمام
کا سردار تسلیم کیا ہے۔ پھر مجھ سے اختلاف کیوں! میرے فیصلے کے خلاف تم نے آواز بلند کرنے کی کیسے
ی؟ یاد رکھو، ہر جنگ دولت کے لیے نہیں لڑی جاتی۔ بعض لڑائیاں عزت اور وقار کے لیے بھی لڑنا
پڑتی ہیں۔ میں نے والیِ ہرات کو معاف کر کے دشمنی کا وہ ناسور بند کیا ہے جو ہماری جنوبی اور مشرقی سرحدوں
باشندوں کو کھائے جا رہا تھا۔ دشمن اگر دوستی کا خواہاں ہو تو اس سے انکار کرنا مصلحت کے سراسر
ہے۔"

فتنہ بظاہر دب گیا۔ کسی نے امیر قزغن کو جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ امیر قزغن دل میں خوش تھا کہ

اس بڑھاپے میں بھی تاتاری امیروں اور سرداروں پر اس کا رعب و دبدبہ اب تک طاری ہے لیکن تیمور کا حس تیزی سے کام کر رہی تھی۔ اس نے امیروں کے تیور دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ آج کی یہ چنگاری وقت بھڑک کر شعلہ بھی بن سکتی ہے۔

اس نے موقع پا کر امیر قزغن سے کہا:

"اے امیر۔ مجھے بکھرے ہوئے برلاس قبائل کی قیادت سنبھالنے کی اجازت دی جائے۔"

"ابھی کیا جلدی ہے۔"

امیر قزغن نے قدرے ناگواری سے جواب دیا:

"ایک نہ ایک دن تم ہی ان کے سردار بنو گے۔"

○

تاتاریوں میں عبداللہ اور تموز یا تیمور نام بہت عام تھے۔ ہر قبیلے میں یہ نام کئی کئی آدمی ہوتے۔ بلادِ شمال کے چغتائی خانِ اعظم کا نام تغلق تمور خان تھا۔ تیمور کے دو چھوٹے سرداروں کے تھے۔ امیر قزغن کے چھوٹے بیٹے کا نام بھی عبداللہ ہی تھا۔ عبداللہ امیر قزغن کی بڑھاپے کی اولاد بڑی شکیل و جمیل صورت پائی تھی۔ عورتیں اسے یوسفِ ثانی کہتیں اور کنواریاں اسے دیکھ کر آہیں عبداللہ کے رنگ ڈھنگ بچپن ہی سے نرالے تھے۔ اسے تلوار کے بجائے ساز پسند تھے۔ گھوڑے پر بیٹھنا اس کے لیے ایک تکلیف دہ بات تھی۔

امیر قزغن نے اس کے بچپن کی شوخیاں تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیں لیکن جب اس میں قدم رکھا اور اس کے طور طریقوں میں تاتاری شان نہ پیدا ہوئی تو امیر قزغن کے کان کھڑے عبداللہ ہی اس کی امیدوں کا چراغ تھا۔ امیر کا بڑا بیٹا عرصہ ہوا مر چکا تھا اور پوتا یعنی الجائی خاتون علی حسین دور کابل میں ایک چھوٹے سے علاقے کا حاکم تھا۔ امیر قزغن عبداللہ کو اپنا ولی عہد بنا تھا لیکن عبداللہ کو شراب و کباب اور شاہدانِ بازاری کی صحبتیں پسند تھیں۔ اس کی نظر میں حسین لبنیں اور اسے رموزِ مملکت یا امورِ سلطنت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ایک روز امیر قزغن نے اپنے بیٹے کو سمجھایا:

"عبداللہ! وہی ہاتھ عنانِ حکومت سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔"

"ابھی میری عمر ہی کیا ہے..... صرف اٹھارہ سال۔"

عبداللہ نے ہنس کر جواب دیا:

"اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ میں ابھی سے حکومت کی فکر کیوں کروں؟"

امیر قزغن دل مسوس کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ عبداللہ سے کہے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں تو طراغائی خان کے بیٹے تیمور نے فاتحِ ہرات کا خطاب حاصل کر لیا ہے مگر وہ یہ نہ کہہ سکا بلکہ اس نے اسے بڑی نرمی سے سمجھایا:

"تو جوان ہو گیا ہے۔ چھوٹی موٹی جنگوں میں حصہ لیا کر۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ۔ قبر میں پیر ہیں۔ آج مرا کل دوسرا دن۔"

اسی وقت ایک چنچل اور شوخ ادا کنیز اٹھلاتی ہوئی شہزادے کے پاس آ کر بولی:

"شہزادے بہادر محفل تیار ہے۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

شہزادہ باپ کو جواب دیے بغیر کنیز کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑا ہوا! اور یونہی ہاتھ پکڑے ہوئے اس فتنۂ قیامت کے ساتھ چلا گیا۔ امیر قزغن اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر وہ غصے میں پیر پٹختا ہوا اٹھ گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ آئندہ وہ شہزادے کے محل میں کبھی نہیں آئے گا۔

سرائے سالی ایک کچا قلعہ تھا لیکن شہزادے نے اس کے ایک حصے میں اپنے لیے ایک عالی شان محل بنوایا تھا۔ آخر عبداللہ، حاکمِ سمرقند کا بیٹا تھا۔ اس کا حکم ہر جگہ چلتا تھا۔ اس کے کہنے پر اس محل کو نادر اور نایاب چیزوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ قالینوں کا فرش، ریشمی پردے، گنگا جمنی ظروف۔ غرض یہ کہ آرائش کا ہر سامان موجود تھا۔ سب سے بڑھ کر اس محل کے حسن کو چار چاند لگانے والا ان ماہ لقا اور دل ربا کنیزوں کا طائفہ تھا جو اس کے حواریوں اور خوشامدیوں نے اس محل میں جمع کر دیا تھا۔ ہر شہر اور ہر قبیلے کی حسین ترین کنیز اس طائفے میں موجود تھی۔ یہ کنیزیں ہنستی اور اٹھکیلیاں کرتی جس سمت سے گزرتیں، یوں معلوم ہوتا جیسے پریاں محوِ پرواز ہیں۔ کنیزیں پریاں تھیں اور عبداللہ راجہ اندر..... رات دن رقص و سرود کی محفلیں جمتیں۔ نقرئی قہقہوں سے فضا گونجتی رہتی۔ قزغن شراب نہیں پیتا تھا اور نہ ہی اس کے دربار میں کسی کو

شراب پینے کی اجازت تھی لیکن عبداللہ کو کون روکتا اور اس کا ہاتھ کون پکڑتا۔ وہ تو مستقبل کا متوقع حاکم تھا۔

عبداللہ کے اطوار بگاڑنے میں تاتاری قبائل کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ ہر قبیلے کا سردار ا
کے بعد خود کو وارث سمجھتا تھا۔ انہیں اگر کچھ خطرہ تھا تو صرف عبداللہ سے۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے ان کی اجتماعی
تھی کہ کمسن شہزادے کو امورِ سلطنت اور میدانِ جنگ سے جس قدر دور رکھا جائے اتنا ہی بہتر
عبداللہ کو رنگ رلیاں منانے کی کھلی چھٹی ایک گہری سازش کے تحت دی گئی تھی۔ عبداللہ کے کارندے
سے جنوب اور مشرق سے مغرب، تمام تاتاری علاقوں میں گھومتے پھرتے اور جہاں بھی انہیں کوئی حسین دو
دکھائی دیتی وہ اسے زبردستی اٹھا لیتے۔ اس قسم کے واقعے جب مختلف علاقوں میں پیش آتے اور غریب
قبیلے کے سردار کے پاس شکایت لے کر جاتے تو متعلقہ سردار اس کا تدارک کرنے یا امیر قزغن کو اس ظل
زیادتی کی خبر پہنچانے کے بجائے کچھ لے دے کے مغویہ کے والدین کو خاموش کر دیتے۔

امیر قزغن کو بیٹے کی بے راہ روی اور عیاشیوں کا تو علم تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ عبداللہ
کنواری لڑکیوں کو ان کے گھروں سے اٹھوانے کا انتظام بھی کر رکھا ہے۔

ظلم اور زیادتی زیادہ دنوں تک نہیں چلا کرتی اور اس کا پردہ ایک نہ ایک دن فاش ہو کر رہتا
اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف امیر کو عبداللہ کی طرف سے بالکل مایوس کر دیا بلکہ
وقار کو بھی زبردست دھچکا پہنچایا۔

والیِ ہرات کے ساتھ ملکوتی اور اس کی والدہ بھی سرائے سالی آئی تھیں۔ عبداللہ نے اس کی ما
وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اس کا وطن بلخ دکھائے گا اور اگر ممکن ہو سکا تو قبیلہ اوجائی بوغائی کے سردار سلوز
بھی اس کی ملاقات کرائے گا۔ سلوز ملکوتی کی والدہ کا دیور تھا۔ ہر چند کہ سلوز نے ملکوتی کی ماں پر بڑا
کیا تھا اور سرداری کے لالچ میں آ کر اسے بلخ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اس بات کو اب
زمانہ گزر چکا تھا اور نفرت کے جذبات ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔

عبداللہ نے ملکوتی کی ماں کو یہ بھی بتایا تھا کہ سلوز اپنے کیے پر نادم ہے اور اب گوشہ نشینی
زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس لیے بھی ملکوتی کی ماں کے دل میں سلوز سے ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔
عبداللہ ملکوتی کا طلبگار تھا اس نے سردار تیمور کو ملکوتی اور اس کی والدہ کے بارے میں تمام حالات

کر دیا تھا اور ایک دن موقع پا کر یہ بات تیمور کے کان میں بھی ڈال دی۔

تیمور کے دل میں اس بزرگ تاتاری خاتون کا بڑا احترام تھا۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ دیور اور بھاوج
کو جلد از جلد ملکہ ان کے درمیان صلح و صفائی کرا دی جائے لیکن والیِ ہرات ابھی تک امیر قزغن کا مہمان تھا اور
بعض امیروں کے منہ اب تک ٹیڑھے تھے لہٰذا اس نے عبداللہ کی بات فوراً مان لی اور وعدہ کیا کہ والیِ ہرات
کے واپس جاتے ہی نہ صرف ان دونوں کی ملاقات کا بندوبست کر دے گا بلکہ خود ان کے ساتھ بلخ جائے گا۔

والیِ ہرات ملک معز الدین حسین کی مہمانداری کچھ زیادہ ہی طویل ہو گئی اور تیمور نے دیکھا کہ والیِ ہرات
کی واپسی کا مسئلہ ابھی کھٹائی میں پڑا ہے تو اس نے عبداللہ کو بلخ جانے کی اجازت دے دی۔ ملکوتی
اپنی بیمار ماں کو تنہا کیسے سفر کرنے دیتی۔ وہ بھی ساتھ چلنے پہ آمادہ ہو گئی۔ عبداللہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا
وہ تو دل سے یہی چاہتا تھا۔

ملکوتی شہسواری اور شمشیر زنی سے واقف تھی۔ ملکوتی کی ماں کو ایک گاڑی میں بٹھایا گیا۔ عبداللہ نے
ملکوتی کو بھی گاڑی میں بیٹھ کر سفر کرنے پر آمادہ کرنا چاہا مگر وہ نہ مانی اور الگ گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ سفر
شروع ہوا۔ عبداللہ اور ملکوتی گھوڑے سے گھوڑا ملائے آگے آگے چل رہے تھے۔ یہ لوگ دوپہر کو چلے تھے۔

رات ہوئی تو ایک سرائے میں قیام کیا۔

تیمور نے عبداللہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو اپنے ساتھ دو سواروں کو بھی لے جائے۔
مگر عبداللہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اپنا ملک اور دیکھے بھالے راستے تھے پھر ڈر کس بات کا؟
اور وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی تنہائی میں کوئی مخل ہو۔ عبداللہ کی اس غلط سوچ نے بالآخر اسے ایک
ناگہانی میں مبتلا کر دیا۔

رات خیریت سے گزر گئی۔

صبح کو گاڑی تیار کی گئی۔ ملکوتی کی ماں کو اس میں سوار کیا گیا۔ عبداللہ اور ملکوتی اپنے گھوڑوں پر سوار
ہو کر گاڑی کے آگے آگے چلنے لگے۔

یہ لوگ ابھی سرائے سے سو گز بھی دور نہیں گئے تھے کہ پندرہ سوار گھوڑے اڑاتے سامنے سے آتے
دکھائی دیے۔ وہ سب کے سب مسلح اور پلے ہوئے سانڈوں کی طرح موٹے تازے تھے۔ انہوں نے آتے ہی
اللہ اور ملکوتی کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ خطرہ محسوس کرتے ہی عبداللہ اور ملکوتی نے تلواریں نکال لیں۔ سواروں

کا سردار گھوڑا بڑھا کر عبداللہ کے پاس آیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا:

"یہ لڑکی کون ہے؟"

اس کا اشارہ ملکوتی کی طرف تھا۔

"تُو پوچھنے والا کون ہوتا ہے؟" عبداللہ نے بھی اسی سختی سے کہا۔

سردار ایک مکروہ قہقہہ لگا کر بولا:

"میں شہزادہ عبداللہ ولی عہد سمرقند کے محافظ دستے کا سردار ہوں۔ اگر مجھے نہیں جانتا تو تُو
تاتاری نہیں تو کوئی کافر بچہ ہے۔"

عبداللہ کو غصہ آگیا کڑک کر جواب دیا:

"منہ سنبھال کر بول۔ ورنہ تیری زبان کھینچ لوں گا۔ تو عبداللہ کے محافظ دستے کا سردار ہے
بھی فاتح ہرات، امیر تیمور کی فوج کا رسالدار ہوں۔"

تیمور کے نام پر سردار چونک پڑا۔ وہ کچھ دیر عبداللہ کو گھورتا رہا۔ پھر بولا:

"لیکن یہ لڑکی کون ہے اور تُو اسے کہاں سے بھگا کر لایا ہے؟"

ملکوتی کو سردار کی بات بہت ناگوار گزری۔ اس نے چیخ کر کہا:

"تو کیوں بکواس کر رہا ہے۔ مجھ سے پوچھ۔ میں اس کی بیوی ہوں۔"

"میں کیسے یقین کر لوں کہ تو اس کی بیوی ہے؟"

اس وقت ملکوتی کی ماں نے دخل دیا۔ گاڑی سے گردن نکال کر بولی:

"بھائی کیوں الجھ رہا ہے۔ میں بلخ کے سردار کی بیاوج ہوں۔ سردار یلوز سے ملنے جا رہی ہوں۔ یہ
بیٹی ملکوتی ہے۔"

سردار نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا:

"اتنی حسین لڑکی کی جگہ تو ہمارے شہزادے کی حرم سرا ہے۔ یہ ایک معمولی رسالدار کی بیوی کیسے
ہو سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ملکوتی کی طرف بڑھا۔

ملکوتی کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے سردار پر بھرپور وار کیا۔ وار جلدی میں کیا گیا تھا۔ ملکوتی کا

سردار پر پڑنے کے بجائے اس کے گھوڑے پر پڑی اور زخمی گھوڑا سردار کو دور بھگا لے گیا۔

شہزادے کے یہ محافظ دراصل اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جنہیں شہزادے نے لڑکیاں پکڑنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ یہ لوگ دھوکے بھیڑیوں کی طرح شہر شہر منڈلاتے رہتے اور جو غریب اور بے کس لڑکی ہتھے چڑھ جاتی اسے اٹھا لاتے تھے۔

سردار نے اپنے سواروں کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ سوار ان دونوں پر پل پڑے۔ شمشیر چلانا صرف عبداللہ جانتا تھا۔ چلتے وقت اس نے اپنی کمان بھی ساتھ نہیں لی تھی۔ ملکوتی کو تلوار چلانا بس واجبی سی آتی تھی۔

دس پندرہ منٹ کی لڑائی میں عبداللہ کو کئی زخم آگئے اور ملکوتی کو پکڑ لیا گیا۔

ملکوتی کی ماں چیختی چلاتی ہی رہ گئی۔ سوار ملکوتی کو لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ عبداللہ نے ان کا پیچھا کرنا چاہا مگر وہ زخموں سے چور تھا اس لیے غش کھا گیا۔

ایک سرائے سامنے ہی تھی۔ اگر سرائے والے ہمت کرتے تو وہاں پندرہ بیس آدمی موجود تھے جو عبداللہ کی مدد کو آ سکتے تھے لیکن ان درندہ صفت شکاریوں سے سب ہی واقف تھے۔ سب لوگ سرائے میں دبکے بیٹھے رہے۔ کسی نے باہر آنے کی ہمت نہ کی۔

عبداللہ بے ہوش ہو کر کاٹھی سے لٹک گیا۔ چیختے چیختے ملکوتی کی ماں کا گلا دکھ گیا۔ سوار ملکوتی کو لے کر دور نکل گئے تو سرائے والوں کو کچھ رحم آیا اور وہ ایک ایک کر کے گاڑی کے پاس آئے۔ عبداللہ کو کاٹھی سے جدا کر کے اس پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ اسے ہوش آیا تو اس نے ملکوتی کے بارے میں پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ ملکوتی کو شہزادے عبداللہ کے سوار لے گئے ہیں۔ ان درندوں سے اسے بچانا یا واپس لانا ممکن نہیں ہے۔ عبداللہ اور ملکوتی کی ماں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یکایک عبداللہ کو کچھ خیال آیا۔ اس نے سرائے والوں سے کہا:

"بھائیو۔ میں جانتا ہوں تم شہزادے عبداللہ سے ڈرتے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس کی مخالفت مول لو لیکن اگر تمہارے دلوں میں ذرا بھی انسانی ہمدردی ہے تو میرا ایک کام کر دو۔"

"ان سے لڑنے کے علاوہ اور کوئی خدمت ہو تو کہو۔ میں آمادہ ہوں۔" ایک آدمی ہمت کر کے بولا۔

عبداللہ نے کہا:

"بھائی صرف اتنا کرو کہ ایک آدمی سرائے سالی چلا جائے۔ وہاں میرا آقا امیر تیمور موجود ہے۔ اسے

جاکر صرف یہ کہہ دے کہ اس کے رسالدار عبداللہ پر راستے میں قیامت ٹوٹی ہے۔ ہرات کی شہزادی کو شہزادے کے آدمی زبردستی لے گئے ہیں۔ اس کی جان اور عزت کی حفاظت کی جائے۔"

تیمور کا نام سن کر کئی آدمی سرائے سالی جانے پر آمادہ ہو گئے۔ تیمور فاتح ہرات تھا۔ اس کا نام دور تک مشہور ہو گیا تھا اور لوگ اس سے غائبانہ طور پر محبت کرنے لگے تھے۔ ان میں سے دو آدمی سرائے گھوڑے لے کر آ گئے۔ اور سرائے سالی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

عبداللہ نے ان سے کہا:

"بھائیو۔ اگر ممکن ہو تو کسی ایسے راستے سے جاؤ کہ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میرے آ خبر پہنچ جائے تاکہ وہ شہزادی کی حفاظت کر سکیں۔"

"میں ایسا راستہ جانتا ہوں۔"

ایک سوار نے کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ دوسرا سوار بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں سوار سالی کی طرف روانہ ہو گئے۔ باقی لوگوں نے عبداللہ اور بڑی بی کو سنبھالا۔ انہیں سرائے میں لائے اور ا کی مرہم پٹی کرائی گئی۔ ملکوتی کی ماں غموں سے پہلے ہی نڈھال تھی۔ اس تازہ غم نے اس کی حالت بالکل کر دی۔

عبداللہ خدا سے دعا کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر تیمور کو بروقت خبر ہو گئی تو کوئی ملکوتی کا کچھ نہیں ب سکے گا۔ تیمور، ملکوتی کو ظالموں کے پنجے سے ضرور چھڑا لے گا خواہ اسے اس سلسلے میں امیر قزغن سے کیوں نہ جنگ کرنی پڑے۔

جس وقت تیمور کو عبداللہ کے حادثے کی خبر ملی وہ اپنی بیوی الجائی خاتون کو سرائے سالی سے شہر واپس بھیج رہا تھا۔ تیمور کو بہت کم غصہ آتا تھا اور جب آتا تھا تو وہ خود بھی اس پر قابو نہ رکھ پاتا تھا۔ اس کا سرخ ہو گیا۔ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ وہ جلدی سے خیمے میں گیا۔ ڈھال بازو پر چڑھائی۔ کمان کندھے پر لٹکائی لٹکائی، نیام خیمے ہی میں پھینک دی۔

الجائی خاتون کلپنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ تیمور کی یہ حالت، قیامت کا شاخسانہ ہے۔ نہ معلوم آج ک قتل ہوں گے اور کتنا خون بہے گا۔

تیمور نے بیوی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ بڑھ کر گھوڑے پر بیٹھا قاصدوں کو ساتھ آنے کا

کیا۔ الجائی خاتون نے سفر ملتوی کر دیا۔

تیمور دونوں قاصدوں کے ساتھ سرائے سالی کے اس حصے کی طرف بڑھا جہاں امیر قزغن کے رنگین مزاج بیٹے شہزادے عبداللہ نے اپنی عشرت گاہ تعمیر کی تھی۔

تیمور سرائے سالی کے حالات سے زیادہ واقف نہ تھا اور نہ ہی اس نے عبداللہ کو اب تک دیکھا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ عبداللہ کمسن ہے۔ کمسن کی عمر اس کے ذہن میں دس گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن قاصدوں نے اسے سب کچھ بتا دیا اس کے عشرت کدوں میں چھپی ہوئی تمام داستانیں بے نقاب کر دیں۔

تیمور، عبداللہ کے محل پہنچ کر، اندر جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہ سوار دور سے آتے دکھائی دیے جو ملکوتی کو لا رہے تھے۔ ایک سوار نے زبردستی ملکوتی کو اپنے آگے بٹھا رکھا تھا۔ ملکوتی کو اس حالت میں دیکھ کر تیمور کی جو کیفیت ہوئی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ملکوتی نے تیمور کو دیکھا تو اس کے آنسو نکل آئے۔ تیمور نے کمان کاندھے سے کھینچی اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے تیر خود بخود اس میں آ کر جڑ گیا ہے۔ شائیں کی آواز پیدا ہوئی اور تیر اس سوار کی پیشانی میں پیوست ہو گیا جو ملکوتی کو پکڑے ہوئے تھا۔

تیمور کی تیر اندازی کا کمال تھا کہ ملکوتی سوار کے آگے بیٹھی تھی۔ اس کا سر سوار کے سر سے صرف چھ انچ نیچے تھا اور سوار کی پیشانی صرف تین انچ اوپر تھی لیکن تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور سوار لڑکھڑا کر جھول گیا۔

باقی سواروں نے تیمور کو گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ تو چھلاوا اور شعلہ تھا جو کبھی ادھر بھڑکتا تو کبھی ادھر۔ عبداللہ کے سواروں کو تیمور کی طاقت اور مہارت کا اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے صرف اس کا نام ہی سنا تھا۔ ان کے لیے تو جو کچھ بھی تھا وہ شہزادہ عبداللہ تھا جو ان کا ان داتا اور مالک تھا۔ اسی کے اشارے پر وہ اودھم مچاتے تھے اور دندناتے پھرتے تھے۔ تیمور کے پاس نیام نہیں تھی۔ تیر چلاتے وقت اس نے تلوار دانتوں میں دبا لی تھی۔ سوار اس کے قریب پہنچ گئے تو تیمور نے کمان کاندھے پر ڈالی اور تلوار لے کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ چند ہی لمحوں میں سات سوار اس کی تلوار کا لقمہ بن گئے۔ پانچ گھوڑے گنوا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور تین گھوڑے چھوڑ کر محل میں گھس گئے۔

تیمور خون آلود تلوار لیے ان کے تعاقب میں محل میں داخل ہو گیا۔ کنیزوں اور غلاموں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک کمرے میں محفل عیش جمی ہوئی تھی۔ ساز چھڑے ہوئے تھے اور نازک اندام لونڈیاں ساقی گری

کر رہی تھیں اور رقاصائیں محوِ رقص تھیں۔ شہزادہ عبداللہ ساغر ہاتھ میں لیے ان کے درمیان راجہ اندر
بنا بیٹھا تھا۔ اس نے جو شور و غل سنا تو گھبرا کر کمرے سے نکل آیا۔

سامنے، تیمور بھاگنے والے تینوں سواروں کو گھیرے ہوئے تھا۔ سوار اپنی جانیں بچانے کے
لیے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ جدھر وہ جاتے تیمور کو سدّ راہ پاتے۔ ان میں سے ایک مارا گیا، پھر دوسرا
اور پھر آخری سوار کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

شہزادہ عبداللہ نے یہ منظر دیکھا تو حواس باختہ ہو گیا۔ سواروں کو ختم کرنے کے بعد تیمور نے اس
کا رخ کیا تو اس کا جسم اور ہاتھ کانپنے لگے۔ ساغر فرش پر گر کر چور چور ہو گیا اور اس کا رنگ ہلدی کی طرح
زرد نظر آنے لگا۔ تیمور، خون آلود تلوار لیے عبداللہ کے قریب پہنچ گیا۔ لباس اور وضع قطع سے اس
کو شہزادہ کے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

تیمور اسے گھورتے ہوئے بولا:

"تم ہو عبداللہ۔ امیر قزغن کے بیٹے"۔

دہشت کی وجہ سے عبداللہ کی آواز نہ نکلی۔ وہ صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

تیمور گرجا:

"ڈوب مرو چلو بھر پانی میں۔ جس کے باپ کی تلوار، تمام تاتاری سرداروں کو دبائے ہوئے ہے، اس
کے بیٹے کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ۔ لعنت ہے تمہاری بدکاریوں پر"۔

عبداللہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ محل کی کنیزیں کمروں کے دروازوں سے
باہر جھانک رہی تھیں۔ سرخی اور غازہ میں لتھڑے ہوئے رقاصاؤں کے چہرے پسینے سے تر ہو کر
رنگ گڈمڈ ہو گئے تھے۔ سب کو اپنی اپنی جان کی فکر تھی۔

"اگر تم میرے آقا امیر قزغن کے بیٹے نہ ہوتے تو میں تمہارا سر بھی اسی طرح قلم کر دیتا جیسے میں نے
تمہارے پندرہ سواروں کے کیے ہیں۔ افسوس وہ شہزادہ جسے تیروں کی بارش میں مسکرانا چاہیے تھا
چنگ و رباب کے تاروں میں ڈھل رہا ہے۔ عبداللہ تم امیر قزغن کے ماتھے کا کلنک ہو۔ تاتاریوں کی
بہادری اور شجاعت پر ایک بدنما دھبہ ہو"۔

تیمور گرج رہا تھا۔

شہزادہ عبداللہ، تیمور سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اُس نے اس بہادر سردار کے قصے ضرور سُنے تھے
تھے۔ تیمور جس وقت تلوار سونتے محل میں داخل ہوا تھا اس وقت ہر طرف "تیمور۔ تیمور" کا شور بلند ہوا تھا۔
عبداللہ نے تیمور کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ شخص سوائے تیمور کے اور کوئی نہیں ہو سکتا ورنہ اس محل میں
داخل ہونا تو کجا، لوگ وہاں سے کترا کے نکلا کرتے تھے۔

عبداللہ نے بڑی عاجزی سے کہا:

"بہادر تیمور! مجھے معاف کر دو۔ میں واقعی بہت بُرا ہوں"۔

"اگر تم اپنے کیے پر نادم ہو تو ان تمام لڑکیوں کو آزاد کر دو جنہیں تمہارے آدمیوں نے زبردستی حاصل
کر کے اس محل میں قید کر رکھا ہے۔ وہ غریب رعیت کی بیٹیاں ہیں لیکن وہ بھی اسی طرح عزت دار اور شریف
ہیں جس طرح ہماری اور تمہاری بہنیں اور بیٹیاں"۔

عبداللہ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سر جھکا کر بولا:

"تمہارے حکم کی تعمیل ہو گی۔ شام ہونے تک تمام لڑکیاں آزاد کر کے ان کے گھروں کو بھیج دی
جائیں گی"۔

عبداللہ نے اس پر عمل بھی کیا۔ اس نے تمام لڑکیوں کو بلا کر ان کے گھروں کے پتے پوچھے اور پھر
غروبِ آفتاب سے قبل ہی تمام لڑکیاں، عبداللہ کے محل کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گئیں۔

تیمور وہاں سے نکل کر باہر آیا تو دو قاصد اور ملکوتی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تیمور انہیں ساتھ لے کر
اپنے خیمے پر آیا۔ الجائی خاتون ڈری سہمی، اب تک اسی جگہ موجود تھی جہاں تیمور اسے چھوڑ گیا تھا۔ الجائی خاتون
کو دیکھ کر تیمور کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تو الجائی کا دل بھی کھل اٹھا۔

تیمور نے اپنے سوار ملکوتی اور قاصدوں کے ساتھ کر دیے اور عبداللہ کو پیغام دیا کہ وہ سفر جاری
رکھے اور ملکوتی کی ماں کو بلخ تک ضرور لے کر جائے۔ ملکوتی، تیمور کا شکریہ ادا کر کے واپس چلی گئی تو تیمور نے
الجائی خاتون کو اس حادثے کی تفصیل بتائی جو ملکوتی اور عبداللہ پہ گزرا تھا۔ پھر وہ دونوں دیر تک شہزادے
کی بے راہ روی پر افسوس کرتے رہے۔

الجائی خاتون شہر سبز واپس چلی گئی۔

کئی دن گزر گئے لیکن تیمور نے امیر قزغن سے اس واقعے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ پھر اس

بات کو ایک زمانہ گزر گیا۔ امیر قزغن نے نہ تو کبھی تیمور سے پوچھا اور نہ ہی تیمور نے اسے شہزاد[ی]
ناشائستہ حرکتوں سے آگاہ کیا۔

○

امیر قزغن کا خیال تھا کہ اس کے مخالف امیروں کے جذبات وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے پڑ
گئے اور والیِ ہرات کے خلاف بھڑکے ہوئے جذبات ختم ہو جائیں گے۔ اسی لیے اس نے والیِ ہرات کو
پاس ٹھہرا رکھا تھا لیکن اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔
باغی امیروں میں آہستہ آہستہ کھچڑی پکتی رہی اور نفرت کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی۔ امیر
نے ہرات جانے والے امیروں کو اپنی طرف سے کافی مال و زر سے نوازا مگر جو نفرت ان کے دل میں بیٹھ
وہ نکل نہ سکی۔ اب تو اسے یہاں تک محسوس ہونے لگا کہ یہ لوگ والیِ ہرات کی تاک میں ہیں اور موقع ملتے
ختم کر دیں گے۔ اسے مجبوراً والیِ ہرات کی حفاظت کے انتظامات سخت کرنے پڑے۔ والیِ ہرات کی
کے وقار کا مسئلہ بن گئی تھی اور اس کی ذرا سی کوتاہی کوئی نیا فتنہ کھڑا کر سکتی تھی۔
امیر قزغن اپنے ایام سیر و شکار میں گزارا کرتا تھا۔ ہرات کے حملے کے وقت اس کا خیال تھا کہ وہ
لشکر کے ساتھ تیمور کے قریب رہے گا تاکہ بوقتِ ضرورت اس کی مدد کر سکے۔ پھر ہرات کا جھگڑا ختم ہو
بعد وہ شکار پر چلا جائے گا لیکن حالات نے کچھ اور ہی رخ اختیار کر لیا۔ تیمور نے اس کی امید سے بڑھ
ہرات کا قصہ پاک کر دیا۔ اس فکر سے تو امیر قزغن کو چھٹکارا مل گیا لیکن شکار کا شوق پورا نہ ہو سکا جس کے
وہ اب پہلے سے زیادہ بے چین تھا۔
ایک رات امیر قزغن نے تیمور کو اپنے پاس بلوایا اور رازدارانہ انداز میں بولا:
"تیمور۔ تم ان سر پھرے امیروں کی حالت دیکھ رہے ہو؟"
"جی امیر۔ مجھے تو یہ سب کچھ ایک عظیم خطرے کا پیش خیمہ نظر آتا ہے۔" تیمور نے متانت
اس وقت امیر قزغن حالات سے بے حد پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا پورا رعب و دبدبہ
دھوکے کی ٹٹی یا ریت کی دیوار ہے۔ جوانی کے عالم میں تلوار کے زور پر جو عظمت حاصل کی تھی وہ

کام آ رہی تھی ورنہ تو اب اس کے ہاتھ پیر شل ہو گئے تھے اور اس میں تاتاریوں کی کسی بغاوت کو کچلنے کی
طاقت باقی نہیں تھی۔ ہر تاتاری سردار، امیر قزغن کو ایک آڑ یا بزرگ کی حیثیت سے عزت دیتا تھا۔ انہیں بھی علم
تھا کہ امیر قزغن اب پہلے جیسا طاقتور نہیں تھا لیکن وہ اسے ایک ایسی آڑ سمجھتے تھے جس کے باعث وہ قبائلی
جھگڑوں اور عصبیتوں سے محفوظ تھے۔ کہیں دو قبیلوں میں جھگڑا ہوتا تو امیر قزغن فوراً دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ
کر ٹھنڈا کر دیتا۔ اس کا حکم مانا جاتا اور اس کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا لیکن عمر کے ساتھ ساتھ یہ رسی کمزور پڑتی
جا رہی تھی۔
"مجھے سارا دکھ اس بات کا ہے کہ یہ کم بخت میرے دیے ہوئے قول کو جھٹلانا چاہتے ہیں۔ اگر
والیِ ہرات ان کے ہاتھوں مارا گیا تو میں کسی تاتاری سردار کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ اہلِ ہرات
ہمیں کبھی معاف نہ کریں گے اور ہماری سرحد جنگ کا مستقل اکھاڑا بن جائے گی۔"
تیمور نے امیر قزغن کی پریشانی محسوس کر لی اور ادب سے بولا:
"اے حاکمِ سمرقند۔ آپ بالکل دل برداشتہ نہ ہوں۔ کسی کی مجال نہیں کہ آپ کے حکم کی سرتابی کرے۔
اگر کسی نے والیِ ہرات پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو اسے میں ایسی سزا دوں گا کہ تمام تاتاریوں کی آنکھیں
کھل جائیں گی۔"
"شاباش تیمور۔"
امیر قزغن نے خوش ہوتے ہوئے کہا:
"سچ تو یہ ہے کہ اب میں تیرے ہی بھروسے پر سلطنت کا کام چلائے جا رہا ہوں۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ
سردار دل سے نہ تو میری عزت کرتے ہیں اور نہ ہی مجھے پہلے جیسا طاقتور سمجھتے ہیں۔"
وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا:
"تیمور۔ تو نے کبھی مجھ سے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا؟"
تیمور فوراً ہی اس کی بات نہ سمجھ سکا اور بولا:
"اے امیر! آپ کی نوازش سے مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔ اب مجھے آپ کی زندگی سے زیادہ کوئی طلب
نہیں ہے۔"
امیر قزغن کی شفقت اور محبت چھلک پڑی:

"تیمور۔ تُو میرا سردار نہیں بلکہ دست و بازو ہے۔ میرا بیٹا ہے۔ الجائی کا باپ مسلّا میرا بڑا
اس کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ جوانی ہی میں چل بسا۔ چھوٹا بیٹا عبداللہ، اٹھارہ سال کا ہونے کے باوجو
بچہ ہی تصور کرتا ہے۔ اس سے مجھے کوئی امید نہیں۔ میں اس کے بارے میں جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی
ہو جاتا ہوں۔ پتہ نہیں میرے بعد اس پر کیا گزرے گی۔ تُو تاتاریوں کے اس مقولے سے واقف ہے کہ
حکومت وہی سنبھال سکتا ہے جو تلوار پکڑنا جانتا ہو۔ تلوار پکڑنا تو الگ رہا اس کے ہاتھوں میں تو قلم
کی طاقت بھی معلوم نہیں ہوتی۔"

امیر قزغن اپنے بیٹے کا حال بیان کرتے وقت بے حد جذباتی ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس کے
نکل آئے۔

تیمور نے اسے پہلی بار آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ اس کے دل پر بہت اثر ہوا۔

"اے امیر۔ آپ عبداللہ کی طرف سے بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں بڑا بھائی بن کر ہر موقع
حفاظت کروں گا۔ وہ جیسا بھی ہے آپ کا بیٹا ہے اور آپ میرے آقا ہیں۔"

امیر قزغن کو تیمور کی باتوں سے بڑی تسلی ہوئی:

"تیمور! تو نے ایک بار خواہش کی تھی کہ بکھرے ہوئے قبائل کی شیرازہ بندی کی قیادت
کر دوں۔ میں نے اس وقت تجھے ٹال دیا تھا لیکن اب وقت آگیا ہے کہ میں یہ اعزاز تیرے سپرد
میں نے تجھ میں وہ خوبیاں محسوس کی ہیں جو ایک قائد اور حاکم میں ہونی چاہییں۔"

"اے امیر۔ میں نے خواہش ضرور کی تھی لیکن میں کسی کا حق نہیں مارنا چاہتا۔ آپ کا پوتا علی
الجائی خاتون کا بھائی کابل میں موجود ہے اور بیٹا عبداللہ سرائے سالی میں۔۔۔۔"

امیر تیمور نے اس کی بات کاٹ دی:

"میں نے ابھی کہا تھا کہ عنانِ حکومت وہی سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔ ا
تیرے ہاتھ میں ہے لہٰذا عنانِ حکومت پر بھی تیرا ہی حق ہے۔"

تیمور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا دل خوشی سے لبریز ہو رہا تھا۔

"تیمور۔ میں سب سے پہلے والیِ ہرات کے عذاب سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔ یہ عزت
ملک پہنچ جائے تو میں سمجھوں گا کہ میرا وقار برقرار ہے۔"

"یہ خدمت آپ میرے سپرد کیجیے۔ میں ایک ایک امیر کو سمجھ لوں گا۔"

"اس طرح نہیں تیمور۔"

امیر قزغن نے نرمی سے کہا:

"یہ جوش کی باتیں نہیں۔ بعض اوقات جوش کو ہوش کے تحت رکھا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سانپ
مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"جس طرح آپ مناسب سمجھیں حکم فرمائیے۔ میں تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔"

"اس سلسلے میں میں کئی دنوں سے غور کر رہا ہوں۔"

امیر قزغن نے اپنے منصوبے کا انکشاف کیا:

"میں جنوب میں شکار پر جانے کا اعلان کرتا ہوں۔ تم اپنے پچاس جانبازوں کو تیار رکھو۔ جس
صبح کو ہماری روانگی ہونے والی ہوگی، اس شب کو تم والیِ ہرات کو اپنے ساتھ لے کر خاموشی سے سرائے
سالی سے نکل جاؤ۔ تمام لوگ شکار کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ والیِ ہرات کی طرف کسی کی توجہ نہ ہوگی۔ اگر
ہرات بخیریت سفر کر گئے تو والیِ ہرات خطرے سے باہر ہو جائے گا اور کوئی تمہاری گرد کو بھی نہ پہنچ
سکے گا۔ باغی امیر چیخ چلا کر رہ جائیں گے۔ پھر یہ بات رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔"

تیمور کو یہ بات پسند آئی اور اس نے دل میں امیر قزغن کی فراست کی داد دی اور بولا:

"میں تو آپ کے حکم کا بندہ ہوں۔ جس طرح آپ نے فرمایا ہے ان شاء اللہ اسی طرح ہوگا۔"

○

امیر قزغن نے سرائے سالی سے جنوب کی طرف روانگی کا اعلان کر دیا۔ بہانہ شکار کا تھا۔ تاتاری خوش
ہو گئے۔ وہ جنگ و جدل کے عادی تھے۔ فطرتاً جنگجو تھے۔ کچھ دن لڑائی نہ ہوتی تو ان کی طبیعت مکدر ہونے
لگتی۔ شکار میں انہیں مصروف ہونے کا موقع ملتا تھا اور لاشعور کی تسکین ہوتی تھی۔

خیمے اور سامانِ خورد و نوش گاڑیوں پر بار کر دیا گیا۔ صبح کو روانگی تھی۔ ساتھ لے جانے والے لشکر کی
تعداد دو ہزار کی ہو گئی تھی۔ وہ پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔ جو تیاری باقی تھی وہ رات بھر ہوتی رہی۔

خیمہ گاہ میں لوگ تمام رات جاگتے رہے اور خوب چہل پہل رہی۔ تیمور کے پچاس جوان اس جگہ
گئے جس کی نشاندہی تیمور نے پہلے ہی کر دی تھی۔ ہر طرف گھوڑے بھاگتے پھرتے تھے۔ کسی نے توجہ
یہ پچاس سوار ایک جگہ کیوں جمع ہوئے ہیں۔

نصف شب کے بعد امیر قزغن نے والیِ ہرات کو فی امان اللہ کہا اور اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔
والیِ ہرات کو خیموں کے پیچھے سے اس جگہ لے آیا جہاں اس کے سوار موجود تھے، تیمور اور والیِ ہرات کے
گھوڑے تیار تھے۔ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور باگیں ہرات کی طرف موڑ دیں۔ پچاس
سوار ایک ایک کر کے ان کے پیچھے آ گئے۔

تیمور رات بھر برق رفتاری سے سفر کرتا رہا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ تیمور کو باغی امیروں کا کوئی ڈر
اس کے ساتھ پچاس چیدہ چیدہ محافظ تھے۔ اسے امید تھی کہ اگر پانچ سو باغی امیروں نے بھی اسے گھیر
کوشش کی، تو وہ بچ کر نکل جائے گا، مگر تیمور کو والیِ ہرات کی فکر تھی۔ وہ چاہتا تھا والیِ ہرات کو خراش
آئے۔ اسی میں اس کی کامیابی اور عظمت تھی۔ لڑائی کی صورت میں والیِ ہرات کے زخمی ہونے کا خطرہ تھا
وجہ سے تیمور لڑائی سے بچنا چاہتا تھا۔

صبح ہوتے ہی سرائے سالی میں کہرام مچ گیا۔

"والیِ ہرات بھاگ گیا!"

ہر ایک کی زبان پر یہی جملہ تھا۔ باغی بپھر گئے۔ انہیں امیر قزغن پر سخت غصہ آیا۔ کئی سو
امیر قزغن کے دروازے پر آ گئے۔ امیر قزغن کو اس کا پہلے سے اندازہ تھا اور اس نے اس کا بندوبست
کر رکھا تھا۔

امیر قزغن کے باہر نکلنے سے پہلے ہی اس کا ایک ہزار سواروں کا خاص محافظ دستہ دروازے
کھڑا ہو گیا۔ امیر قزغن آنکھیں ملتا یوں باہر آیا جیسے اسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔ اسے دیکھتے ہی
باغی امیر آگے بڑھ کر بولا:

"والیِ ہرات کہاں ہے امیر قزغن؟"

امیر قزغن نے نظر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کا محافظ دستہ تلواروں کے قبضے پر ہاتھ رکھے
منتظر تھا۔ اس نے پرسکون لہجے میں کہا:

"والیِ ہرات میرا مہمان تھا۔ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"تم نے اسے بھگا دیا ہے امیر۔" باغی امیر نے تند لہجہ اختیار کیا۔

امیر قزغن نے ہونٹ سکوڑے۔ آنکھ دبائی اور شیر کی طرح دھاڑا:

"تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال کرنے والے۔ ملک معزالدین حسین اپنی مرضی سے سرائے سالی آیا
تھا اپنی مرضی سے واپس چلا گیا۔ وہ تمہارا قیدی نہیں تھا اور نہ ہی میں تمہارا غلام ہوں۔ مہمان کو رخصت کرنے کے
لیے مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔"

باغی امیر بڑا ڈھیٹ تھا۔ امیر کے سخت لہجے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا:

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا امیر قزغن۔ اس وقت وہ ہمارے ہاتھ سے بچ گیا ہے لیکن ہم اسے زندہ نہ
چھوڑیں گے۔"

امیر قزغن کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے بات کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ نرمی اختیار کرتے ہوئے بولا:

"تم تاتاریوں کو آخر یہ کیا ہو گیا ہے۔ تم اپنی روایات اور قبائلی قوانین کو کیوں بھول گئے ہو۔ والیِ ہرات
ہرات سے چل کر سرائے سالی آیا تھا۔ چل کے آنے والا مہمان ہوا کرتا ہے۔ تاتاری اپنے مہمانوں کو سر آنکھوں پر
بٹھاتے ہیں۔ اس نے اپنی جان ہمارے ہاتھوں میں دے دی۔ اگر ہم اسے قتل کر دیتے تو دنیا کیا کہتی۔
تاتاری بدنام نہ ہو جاتے۔ سب یہی کہتے کہ مہمان کو گھر بلا کر قتل کر دیا۔"

امیر قزغن کی تقریر پُراثر تھی۔

باغی امیر لاجواب ہو گیا۔ اٹھتا ہوا طوفان تھم گیا۔ تلواریں نیاموں سے باہر نہ آئیں اور تیر ترکش میں ہی
رہ گئے۔

امیر قزغن نے موقع غنیمت جان کر فوراً روانگی کا نقارہ بجوا دیا۔ لوگوں کی توجہ سفر اور شکار کی طرف ہو
گئی۔ تاہم بعض امرائے دربار والیِ ہرات کی رہائی کے معاملے میں امیر قزغن کے خلاف ہو گئے اور اس فتنے
نے آگے چل کر کچھ ایسی صورت اختیار کر لی جس سے تاتاریوں کو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچا۔ نہ صرف فتوحات
کا سلسلہ رک گیا بلکہ موجودہ حکومت کے تانے بانے میں ایسا جھول پیدا ہو گیا جس نے سمرقند کی مستحکم حکومت کو
کمزور کر کے رکھ دیا۔

امیر قزغن بے حد عقل مند حکمران تھا۔ اس نے اپنے درباری امراء کے بگڑے ہوئے تیوروں کے پیچھے

چھپے ہوئے فتنے کی جھلک دیکھ لی تھی۔ دریائے آمو عبور کر کے جب وہ شکارگاہ میں داخل ہوا تو اس نے
ذاتی حفاظت کی تمام تدابیر پیشِ نظر رکھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو شکار کھیلتے کھیلتے وہ خود ہی کسی کا شکار ہو جا
لیکن تاتاریوں کی قسمت کھڑی مسکرا رہی تھی۔

O

تیمور والیِ ہرات معزالدین حسین کو لے کر خیریت سے ہرات پہنچ گیا۔ اس کا جسم تو ہرات میں
دل، سرائے سالی میں لگا تھا۔ باغی امیروں کی طرف سے اسے اطمینان نہ تھا۔ اگر والیِ ہرات کو پہنچانے کی
نہ ہوتی تو وہ امیر قزغن کو کبھی تنہا نہ چھوڑتا۔ امیر قزغن چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا اور اسے تو
وفادار رفیق کی ضرورت تھی۔

ہرات پہنچتے ہی اس نے سرائے سالی واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن والیِ ہرات اتنا بے مروت ا
فراموش نہ تھا کہ وہ تیمور کو واپس جانے کی اجازت دے دیتا۔ ہرات کی رعایا اور امرا اپنے والی
دعائیں مانگ مانگ کر اس کی واپسی کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ والیِ ہرات یوں اچانک ہرات پہنچا تو ان
کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے اظہارِ تشکر کے لیے ایک جشن ترتیب دے ڈالا۔

ایک ہفتے کے اس جشن میں اظہارِ مسرت کے جتنے بھی طریقے ممکن تھے، شامل کر لیے گئے۔ تیمو
والیِ ہرات کی خاطر تمام چیزوں میں شرکت کی مگر بجھے بجھے دل سے۔ اسے کوئی چیز اچھی نہ لگتی تھی۔ اسے
خیال آتا کہ اس نے امیر قزغن کو تنہا چھوڑ کر سخت غلطی کی ہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جشن کے اختتام
بہرصورت ہرات میں ٹھہرنا تھا۔

والیِ ہرات اس کی خاطر مدارات میں دل اور آنکھیں فرشِ راہ کر رہا تھا۔ تیمور اس کا محسن تھا۔ اس
ذریعے والیِ ہرات کو دوسری زندگی ملی تھی ورنہ اہلِ ہرات تو اس کی واپسی سے ناامید ہونے لگے تھے
کے تیسرے روز وہ والیِ ہرات کے ساتھ اپنے شہرِ سبز اور سرائے سالی کے بارے میں گفتگو کر رہا
سرائے سالی سے آنے والے ایک سوار کی اطلاع دی گئی۔

تیمور اتنا پریشان ہوا کہ اسے اندر بلانے کے بجائے خود بھاگ کر باہر چلا گیا۔ والیِ ہرات ا

دوڑا۔ باہر نکل کر تیمور نے دیکھا کہ اس کا خانہ زاد غلام عبداللہ اندر آنے کے لیے پہرے داروں سے جھگڑ
رہا ہے۔ تیمور نے اسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ عبداللہ کے چہرے پر گرد و غبار کے علاوہ غم کے سائے
بھی لہرا رہے ہیں۔

تیمور نے دور ہی سے سوال کیا:

"عبداللہ۔ خیریت تو ہے؟"

عبداللہ نے نظریں اٹھا کر تیمور کو دیکھا۔ پھر پژمردہ لہجے میں بولا:

"شکارگاہ میں امیر قزغن کو قتل کر دیا گیا۔"

عبداللہ کا یہ جملہ تیمور کے کانوں سے گزر کر دل میں اترتا چلا گیا۔ پھر بھی اس نے خود کو ہمت کر کے
سنبھالا اور پوچھا:

"قاتل پکڑے گئے؟"

"نہیں آقا۔ وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"کسی نے انہیں پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔" تیمور تقریباً چیخ کر بولا۔

"تعاقب جاری ہے آقا۔"

عبداللہ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"کچھ سردار ان کے پیچھے شمالی کوہستان کی طرف گئے ہیں۔"

تیمور نے والیِ ہرات کو مخاطب کیا:

"اب مجھے مت روکنا برادر۔"

والیِ ہرات یہ خبر سن کر خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ امیر قزغن اس کا حلیف بن گیا تھا۔ اس کے
مرنے کے بعد تاتاری پھر ہرات پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اسے اپنی اور ہرات کی فکر پڑ گئی تھی۔ تیمور نے اس کے
چہرے سے اس کے خیالات کا اندازہ لگا لیا اور کہا:

"پریشان نہ ہو ملک۔ تاتاری اب ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں تمہارا ساتھ
دوں گا۔"

والیِ ہرات نے متشکر نظروں سے تیمور کو دیکھا۔ پھر ایک غلام کو تیمور کا گھوڑا لانے کے لیے اشارہ

کیا۔ تیمور کا گھوڑا تھم گیا تو اس نے ہرات میں مقیم تاتاری سواروں کو سرائے سالی چلنے کا حکم دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کے شکارگاہ کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ صرف اس کا وفادار غلام عبداللہ تھا۔ اس نے جشن کی باقی تقریبات منسوخ کر کے امیر قزعن کا سوگ منانے کا اعلان کر دیا۔

٥

دریائے آمو کے جنوب میں ایک عظیم شکارگاہ تھی۔ امیر قزعن سال میں دو بار وہاں شکار کے لیے آیا کرتا تھا۔ اس سال وہ اپنے ساتھ موت بھی لایا تھا۔

باغی امیر بظاہر خاموش ہو گئے تھے لیکن موقعے کی تاک میں تھے۔ شکار میں ایسے مواقع خود بخود ہو جاتے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے طور پر شکار کھیلنے دور دور تک نکل جاتے۔ کبھی گروہ کی شکل میں تو کبھی اکیلے ہی کسی شکار کے پیچھے گھوڑا ڈال دیتے۔

ایسا ہی واقعہ امیر قزعن کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہ شکار کا پیچھا کرتا ہوا اپنے محافظوں سے دور نکل گیا۔ دشمن اس پر نظر رکھے آس پاس ہی موجود تھے۔ ایک جگہ انہیں موقع مل گیا اور انہوں نے تیر برسا کر امیر قزعن کا سینہ چھلنی کر دیا۔ امیر قزعن سانس تک نہ لے سکا۔

یہ کام دو باغی امیروں نے انجام دیا جنہیں غالباً بعض قبائلی سرداروں کا تعاون بھی حاصل تھا۔

تیمور نے شکارگاہ میں پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا اور معلومات حاصل کیں جس سے اس کا شبہ یقین میں بدل گیا کہ یہ کام صرف دو امیروں کا نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں گہری سازش موجود ہے۔ تیمور کو وہاں امیر قزعن کے وفادار محافظوں کے اور کوئی نہ ملا۔ سب ہی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کر اپنے اپنے مقام واپس جا چکے تھے۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ چار محافظ قاتلوں کے تعاقب میں بھی روانہ ہو چکے ہیں۔ تیمور ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ امیر قزعن کا سب سے بوڑھا محافظ اس کے پاس آ کر بولا:

"اے گورگان کی اولاد۔ تو تاتاریوں کی مشہور روایت سے واقف ہو گا۔"

تیمور کے ذہن میں کسی ایسے موقعے کی روایت محفوظ نہیں تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے بوڑھے

دیکھا تو محافظ نے مزید کہا:

"روایت یہ ہے کہ مرد وہ ہے جو اپنے ہم قوم کے قاتل کے ساتھ آسمان تلے نہ سوئے۔"

تیمور کو فوراً یاد آ گیا کہ اس کے باپ طراغائی نے یہ روایت اس کے سامنے کئی بار دہرائی تھی۔ اس وقت تو وہ صحیح مفہوم نہ سمجھ سکا البتہ اس واقعے نے اسے مفہوم سے آشنا کر دیا۔ اس کی نیند حرام ہو گئی۔ اسے جلد از جلد قاتلوں سے انتقام لینا تھا۔ ان کے ساتھ ایک آسمان تلے زندہ رہنا اس پر حرام ہو گیا تھا۔

تیمور نے اپنے محسن اور آقا کی لاش جنگل سے اٹھوائی۔ سرائے سالی آیا اور اسے پورے احترام سے دفن کیا۔ وہ چاہتا تو پہلے اپنی جائداد کا انتظام کرتا۔ مال و دولت کو محفوظ مقام پر پہنچاتا۔ بیوی بچے کے لیے کوئی معقول بندوبست کرتا لیکن روایت کے الفاظ ہتھوڑا بن کر اس کے دماغ سے ٹکرا رہے تھے۔ تیمور نے کسی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ کفن دفن کے بعد وہ پھر دریائے آمو عبور کر کے جنگل میں آ گیا۔

اب وہ تنہا تھا۔

بالکل تنہا!!

تیمور نے اپنا گھوڑا اس رخ پر ڈال دیا جدھر قاتلوں اور تعاقب کرنے والوں کو جاتے دیکھا گیا تھا جنگل، دریا، پہاڑ پار کرتا وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ تاتاری سرداروں نے قاتلوں کی حمایت ضرور کی ہو گی مگر اب ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی جان بچاتے آگے ہی آگے بھاگتے جا رہے تھے۔ وہ ہر گاؤں سے تازہ دم گھوڑے حاصل کرتے۔ سامانِ خورد و نوش اکٹھا کرتے اور بلا توقف آگے بڑھتے رہے۔

تعاقب کرنے والے بھی بلا کے جیالے تھے۔ انہوں نے نہ تو قدم روکے اور نہ ہی قاتلوں کا پیچھا چھوڑا وہ بھی پوچھتے پاچھتے قاتلوں کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

تیمور کی برق رفتاری کا یہ عالم کہ وہ دوسرے ہی دن تعاقب کرنے والوں کے پاس پہنچ گیا۔ تیمور کو دیکھ کر انہیں حوصلہ ہوا۔ تعاقب جاری رہا۔ حتیٰ کہ انہیں ختالی کوہستان کی ڈھلانوں پر قاتلوں کے گھوڑے بھاگتے نظر آ گئے۔

تیمور نے اپنے ساتھیوں کو دائیں بائیں سے گھیرا ڈالنے کو کہا اور خود گھوڑے کو ایڑ لگا کر پوری رفتار سے ڈھلان اترنے لگا۔

ڈھلان پر تیز گھوڑا دوڑانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن موت تو جیسے خود تیمور سے بھاگتی

تھی۔ وہ ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ وہ دو تھے اور یہ اکیلا۔

انہوں نے پلٹ کر حملہ کیا۔ تلواریں چمکیں۔ چنگاریاں پیدا ہوئیں۔ پھر دو سر بریدہ لاشیں تیمور کے قدموں میں پڑی تھیں۔

تیمور کے ساتھی بھی پہنچ گئے لیکن لڑائی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

○

تیمور نے امیر قزغن کے قاتلوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد شہر سبز کا رخ کیا۔ اس کے گھر والے وہیں موجود تھے لیکن جب تیمور شہر سبز میں داخل ہوا تو وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

تاتاری دستور کے مطابق حاکم وقت کی موت کے بعد اس کا بیٹا اس کا جانشین ہوتا تھا لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب مختلف قبائلی سرداروں کو ایک دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہو۔ سب کی طاقت برابر ہو اور سب ایک مرکزی حکومت کے سائے میں رہ کر اپنے اپنے آزاد علاقوں میں حکومت کر سکیں۔ امیر قزغن اپنا جانشین مقرر کرنے سے پہلے ہی قتل ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہر قبیلے کا سردار خود کو امیر قزغن کا جانشین سمجھتا تھا۔

اگر امیر قزغن کا بیٹا اس قدر طاقتور ہوتا کہ وہ ان سب کو قبضے میں رکھ سکتا تو شاید حالات درست رہتے لیکن شہزادہ عبداللہ تو قالین کا شیر تھا۔ رموزِ مملکت اور میدانِ جنگ سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ اگر امیر قزغن نے اپنی حیات میں عبداللہ یا تیمور کو اپنا جانشین نامزد کر دیا ہوتا تو بھی حالات میں کچھ بہتری کی توقع کی جا سکتی تھی۔

حکومت سمرقند کی یہ حالت تھی کہ نہ تو قبائلی سرداروں میں اتحاد تھا اور نہ ہی مرنے والے کے بیٹے میں عنانِ حکومت سنبھالنے کی اہلیت تھی۔

ان حالات میں یہی ممکن تھا کہ تمام سردار سر جوڑ کر بیٹھتے اور کسی ایک کو اپنا سردار مقرر کر لیتے۔ تاتاریوں میں یہ بڑی خوبی تھی کہ جب وہ کسی کو اپنا سردار مان لیتے تو پھر اس کی اطاعت سے باہر نہ ہوتے مگر مشکل یہ تھی کہ سب سرداروں کو ایک جگہ جمع کون کرے؟ وہ تو سب کے سب حاکم سمرقند بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

تیمور نے اس وقت بھی دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ اس کے پاس اس وقت بہادروں کا ایک گروہ موجود تھا۔ وہ چاہتا تو آسانی سے سمرقند پر قبضہ کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنے کہے کی لاج رکھی اور شہزادہ عبداللہ سے ملنے جا پہنچا۔

عبداللہ کو تیمور کے آنے کی اطلاع ملی تو ننگے پیر بھاگتا ہوا اس کے استقبال کو آیا۔ جھک کر ادب سے سلام کیا۔ شہزادے کے محل کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ نہ کہیں سے پائل کی جھنکار بلند ہوتی تھی اور نہ ہی تاروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی۔ شہزادے نے اپنے آپ کو تبدیل کر لیا تھا۔ عبداللہ نے تیمور کو لے جا کر اپنی مسند پر بٹھا دیا اور خود سر جھکا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

تیمور نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا:

"شہزادے! تمہارے والد دشمنوں کی سازش کا شکار ہو گئے۔ قاتلوں سے انتقام لیا جا چکا ہے لیکن قاتل صرف دو نہیں تھے۔ ان کی پشت پر دو زبردست سردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ امیر قزغن کو راستے سے ہٹا کر تختِ سمرقند پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔"

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے بہادر سردار؟" عبداللہ نے پہلی بار ملکی معاملات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہم اپنی روایت اور دستور پر عمل کریں گے۔" تیمور نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

عبداللہ سہم گیا۔ وہ تیمور کی بات نہ سمجھ سکا۔

"ہماری روایت کیا ہے سردار؟"

"کیا تم امیر قزغن کے بیٹے نہیں ہو؟" تیمور نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے سردار۔"

عبداللہ بے بس لہجے میں بولا:

"مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کی کیا حیثیت۔ پھر بھی میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں تو مجھے حکم دیجیے۔ ضرور تعمیل ہو گی۔"

"ہاں۔ میں تمہیں حکم دوں گا۔"

تیمور بارعب انداز میں بولا:

"میں نے اپنے آقا امیر قزغن سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔"

عبداللہ کی سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا۔ اس نے الجھ کر پوچھا:

"لیکن یہ تو بتلایئے کہ مجھے کرنا کیا ہوگا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ سمرقند کی حکومت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ حکومت سنبھالیں۔"

"میں نہیں۔ عبداللہ! سمرقند کی حکومت تمہیں سنبھالنا ہوگی۔"

تیمور نے فیصلہ کن لہجے میں کہا:

"تم حکومت کے حق دار ہو۔ تمہارا حق کوئی نہیں چھین سکتا۔"

عبداللہ حیرت سے تیمور کا منہ دیکھنے لگا۔

تیمور نے اس کے دونوں شانے پکڑ لیے اور جھنجھوڑتے ہوئے بولا:

"تم تاتاری ہو عبداللہ۔ تاتاری اپنا حق نہیں چھوڑا کرتے۔ جسم پر اسلحہ سجاؤ۔ تمہیں سمرقند چلنا ہے۔"

"لیکن سردار۔"

عبداللہ گھبرا گیا:

"سرکش تاتاری مجھ جیسے نااہل کو اپنا حاکم کیسے تسلیم کریں گے۔"

"حاکم تسلیم نہیں کیا جاتا عبداللہ۔ حاکم خود کو تسلیم کراتا ہے۔"

تیمور نے اسے بہادری کا پہلا سبق پڑھایا۔

○

امیر قزغن کے قتل ہوتے ہی سرداروں نے سمجھ لیا کہ اب ایک طویل خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ قزغن کا کوئی جانشین نہیں تھا اور سوائے تیمور کے تاتاریوں میں کوئی ایسا سردار نظر نہیں آتا تھا جو تاتاریوں کو زیر کر کے سمرقند کی حکومت سنبھالے۔

کچھ سرداروں نے اس سلسلے میں تیمور سے رابطہ بھی قائم کیا لیکن تیمور جانتا تھا کہ ہوا کا رخ

مخالف ہے۔ حاجی برلاس اور بایزید جلائر اس کے دشمن ہیں۔ اس نے فی الحال حکومت سمرقند کا سودا اپنے سر سے نکال دیا۔

انہی دنوں اسے خبر ملی کہ تاتاری سردار اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ کے جانبازوں اور بہادروں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ قدم حفاظتِ خود اختیاری کے لیے اٹھایا تھا لیکن پس پردہ یہ خیال بھی تھا کہ طاقت حاصل ہوتے ہی وہ دوسروں کے علاقے تاراج کریں گے جیسا کہ تاتاریوں میں عام حالات میں ہوا کرتا تھا۔

تیمور نے حالات کو اس نہج پر دیکھا تو اپنے طور پر ایک نہایت دانش مندانہ قدم اٹھایا۔ وہ شہزادے کو لے کر سمرقند پہنچا اور عبداللہ کو حاکمِ سمرقند بنانے کا اعلان کر دیا۔

اس خبر کو سن کر تمام تاتاری سردار حیران رہ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ تیمور خود سمرقند پر قبضے کی کوشش کرے گا۔ دانشوروں کے مطابق تیمور کا یہ قدم قومی جذبے کا ترجمان تھا اور ذاتی مفاد کی ایک زبردست قربانی تھی۔ سب جانتے تھے عبداللہ ایک انتہائی کمزور حکمران ثابت ہوگا جسے وہ بڑی آسانی سے ہٹا سکتے تھے۔

لیکن اسی وقت ممکن تھا جب تمام سردار اپنے میں سے کسی ایک کو سردارِ اعلیٰ تسلیم کرنے پر رضامند ہو جاتے۔ یہ اعزاز صرف تیمور کو دیا جا سکتا تھا لیکن حاجی برلاس اور بایزید جلائر کی موجودگی میں یہ بات ناممکن تھی۔ سب سے پہلے تیمور نے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعلان کیا۔ پھر علاقہ ارہنگ کا سردار کیخسرو اپنے دستوں کے ساتھ سمرقند پہنچ کر عبداللہ کی حاکمیت کا مطیع ہوا۔ علاقہ شبرغان کے سردار محمد خواجہ نے بھی عبداللہ کی اطاعت میں دیر نہ کی اور اپنے دستوں کے ساتھ سمرقند پہنچ گیا۔ بدخشاں کے سردار ختلان اور سرپول کے سردار خضر کیسوری نے بھی عبداللہ کو سردارِ اعلیٰ اور حاکمِ سمرقند تسلیم کر لیا۔ بلخ کا حاکم سلوز الجانی بوغائی تھا۔ اس کی بھاوج، لڑکی ملکوتی اور عبداللہ بھی بلخ پہنچ گئے تھے۔ سلوز بڑی حد تک گوشہ نشین ہو چکا تھا۔ گم شدہ بھاوج کو پا کر اس نے اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ ملکوتی کی ماں نے دیور کو خلوصِ دل سے معاف کر دیا۔ عبداللہ اور ملکوتی اس کا سہارا بن گئے۔ وہ ان دونوں کی شادی کی فکر ہی کر رہا تھا کہ امیر قزغن کے قتل کی خبر پھیل گئی۔

اگر امیر قزغن کا واقعہ نہ پیش آیا ہوتا تو اب تک ملکوتی اور عبداللہ کی شادی دھوم دھام سے ہو چکی ہوتی۔ سلوز کی صحت بھی بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ سفر کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کے سرداروں کو

اکٹھا کر کے حالات سے آگاہ کیا اور اپنی جگہ عبداللہ کو نامزد کر دیا۔

قبیلہ اوجانی بوغانی ایک صلح پسند قبیلہ تھا۔ اس نے بلا عذر عبداللہ کو سردار تسلیم کر لیا۔
عبداللہ نے دربارِ سمرقند میں پہنچ کر بلخ کی نمائندگی کی۔

عبداللہ، تیمور کے ماتحت رہ چکا تھا اور اس کے دل میں تیمور کا بے حد احترام تھا لہٰذا اس ن
اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ جب پانچ تاتاری قبیلوں نے سمرقند کے نئے حاکم کو تسلیم کر لیا تو بای
اور حاجی برلاس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ وہ بھی شہزادے عبداللہ کے سا
خم کر دیں۔ انہوں نے مصلحتاً حالات سے سمجھوتہ کیا اور اظہارِ اطاعت کے لیے سمرقند پہنچ گئے۔

تاتاری قبائل لاشعوری طور پر چنگیز خان یا اس کی اولاد کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے
ان میں بھی چنگیزیوں کی تمام ہی روایتوں پر عمل کیا جاتا تھا۔

چنگیزی دور میں خاقان کے مرنے کے بعد قرولتائی (مجلسِ مشاورت) منعقد ہوتی جس میں نئے
کا انتخاب کیا جاتا۔ تاتاریوں میں بھی کچھ اسی طرح کا رواج تھا اور جو کچھ سمرقند میں ہو رہا تھا وہ اس رواج
حصہ تھا۔

جب تمام قبائلی سردار اپنے اپنے دستوں کے ساتھ سمرقند پہنچ کر اظہارِ اطاعت کر چکے تو حسب
جشن منایا گیا۔ یہ جشن ایک ہفتے تک جاری رہا اور تمام سرداروں نے ایک تھال میں کھانا کھا کر اپنی ایک
اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ جشن کے اختتام پر تاتاری سردار اپنے اپنے علاقوں میں چلے گئے۔

عبداللہ کے پاس صرف تیمور رہ گیا یا خود عبداللہ نے اسے سمرقند رہنے پر مجبور کیا۔ تیم
حکمتِ عملی سے سمرقند کا گرتا ہوا ایوانِ حکومت ایک بار پھر سنبھل گیا۔ لیکن بایزید جلائر اور حاجی برلا
اس انتظام سے خوش نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عبداللہ کا تو بس نام ہی نام ہے۔ اصل حکومت تو تیمو
ہاتھ میں آ گئی ہے۔ پس وہ تیمور کی طاقت ختم کرنے کے لیے موقعے اور وقت کا انتظار کرنے لگے۔

اسی دوران سمرقند میں یہ افواہ اڑی کہ بلادِ شمال کا چنگیزی خانِ اعظم، تغلق تمور خاں سمرقند پر حملہ
والا ہے۔ اس افواہ سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ تیمور کو اس کے باپ طراغائی اور امیر قزغن
یہ باور کرا دیا تھا کہ تغلق تمور خاں سمرقند پر کبھی حملہ نہیں کرے گا اس لیے تیمور نے اس افواہ پر کان
دھرے۔ عبداللہ سب سے زیادہ پریشان تھا۔ تیمور نے اسے مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی مگر

تو مغلوں کا خوف سوار ہو گیا۔ اسے ہر وقت اپنی جان سولی پر لٹکی نظر آتی۔ ممکن تھا کہ عبداللہ کے دل کی دہشت
دور ہو جاتی لیکن شہرِ سبز میں تیمور کے باپ طراغائی کا انتقال ہو گیا اور تیمور نے وہاں جانے کا قصد کر لیا۔ عبداللہ
تیمور کے پیروں سے لپٹ گیا۔

"سردار! مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ خانِ اعظم مجھے مار ڈالے گا۔"

تیمور کو اس کی بزدلی پر بہت افسوس ہوا۔ اس نے کہا:

"عبداللہ ہوش میں آؤ۔ تم ایک بہادر باپ کے بیٹے ہو۔ ان افواہوں پر یقین کرو گے تو حکومت کس
طرح کر سکو گے؟"

عبداللہ کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"اگر خانِ اعظم نے حملہ کر دیا تو میں اکیلے اس کا مقابلہ کیسے کر سکوں گا؟"

"حوصلہ رکھو عبداللہ۔"

تیمور نے اسے تسلی دی:

"اگر خانِ اعظم نے سمرقند پر حملہ کرنے کی غلطی کی تو تمام تاتاری قبائل مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ وہ ہماری
متحدہ طاقت کو شکست نہیں دے سکتا۔"

عبداللہ کو پھر بھی اطمینان نہ ہوا:

"حملے کے وقت اگر کسی سردار نے ساتھ نہ دیا تو میں کیا کروں گا؟"

"ایسا نہیں ہوگا عبداللہ۔"

تیمور نے اسے بڑی محبت سے سمجھایا۔

"خانِ اعظم سے تمام تاتاری سردار خائف ہیں۔ اگر انہوں نے تمہیں تنہا چھوڑ دیا تو وہ بھی ایک ایک کر
کے ختم ہو جائیں گے یا مغلوں کے غلام بن جائیں گے۔"

عبداللہ، تیمور کو شہرِ سبز جانے سے روک تو نہیں سکتا تھا کیونکہ باپ کے جنازے میں شریک ہونا تیمور
کے لیے لازم تھا۔ پھر اس نے تیمور سے درخواست کی:

"سردار۔ میں تمہیں جانے سے روک تو نہیں سکتا لیکن یہ التجا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے،
سمرقند واپس آ جانا۔"

"ہاں، میں اس کا وعدہ کرتا ہوں۔" تیمور نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا اور شہر
گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔

تیمور کے سمرقند سے جاتے ہی عبداللہ کے پیٹ میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے اپنے حوار
کیا۔ تیمور کے علاوہ اس کی مصاحبت میں اور کوئی بہادر نہ تھا۔ ہر ایک خانِ اعظم کے حملے سے
عبداللہ کے حواریوں نے اسے الٹی پٹی پڑھائی۔ انہوں نے عبداللہ کے دل میں یہ بات ڈال دی
باپ کی موت کی آڑ لے کر سمرقند سے بھاگ گیا ہے اور اسے خانِ اعظم کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا ہے۔

یہ بات عبداللہ کے دل میں بیٹھ گئی اور ایسی بیٹھی کہ اس نے راتوں رات خزانے کے تمام
جواہرات جمع کیے اور صبح ہونے سے پہلے ہی سمرقند کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گیا۔

عبداللہ سمرقند سے ایسا بھاگا کہ پھر اس کی کوئی خبر نہ مل سکی۔ ممکن ہے اس کے حواریوں نے اسے
قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کر لیا ہو۔

حاکمِ سمرقند کے غائب ہو جانے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ تیمور نے
بیٹھ گیا۔ اس کے تمام کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ اسے عبداللہ پر اتنا غصہ آیا کہ اگر وہ مل جاتا تو
اڑا دیتا۔ اسے شہرِ سبز میں آئے دوسرا ہی دن تھا اور ابھی طراغائی کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی
برلاس قبیلے کا سردار تھا۔ اس کی رسومات شاہانہ انداز میں ہونا تھیں۔ اس کے قبیلے کو خبر ہو
میں حصہ لینے کے لیے آنا شروع ہو گئے تھے۔ تیمور کے لیے اس وقت شہرِ سبز چھوڑنا کم

امیر طراغائی کی موت کی خبر کے ساتھ ہی حاکمِ سمرقند عبداللہ کے سمرقند سے بھاگ جانے
سرداروں تک پہنچی۔ اصولی طور پر انہیں امیر طراغائی کی میت میں شریک ہونا چاہیے تھا لیکن
دیکھ کر سب کے منہ میں پانی آ گیا۔ اب تو عبداللہ کا جھگڑا بھی ختم ہو گیا تھا۔ حکومت کا کوئی دعویدار
موجود نہ تھا۔ حکومت کا فیصلہ تلوار سے ہوتا تھا۔ تاتاری سرداروں میں یہ روایت گردش کرنے

"عنانِ حکومت وہی ہاتھ سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔"

ان سب کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ سب کو تلوار پکڑنے کا سلیقہ تھا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ
مضبوط ہیں۔

تاتاریوں میں دو ہی سردار زیادہ با اقتدار تھے اور دونوں ہی تیمور کے بدترین دشمن تھے

طراغائی کے مرتے ہی قبیلہ برلاس کی سرداری کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ طراغائی کا بیٹا تیمور موجود تھا اور طراغائی
اپنی حیات میں اسے نامزد بھی کر دیا تھا۔ تیمور، باپ کی رسومات ختم کرنے سے پہلے کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا
اس لیے وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

پھر تو یہ ہوا کہ حاجی برلاس، سمرقند کی حکومت کا بھی دعویٰ کر بیٹھا۔ بایزید جلائر بھلا کیسے پیچھے رہتا
اس وقت سمرقند کے قریب تھا۔ عبداللہ کے غائب ہونے کی خبر پاتے ہی وہ اپنے دستوں کے ساتھ سمرقند
قبضہ کرنے کی فکر میں لگ گیا۔

تیمور کی مخالفت میں حاجی برلاس اور بایزید جلائر آپس میں دوست بن گئے تھے لیکن جب سمرقند کی حکومت
سوال اٹھا تو اُن کی دوستی، دشمنی میں بدل گئی۔ دونوں ہی سمرقند کے دعوے دار تھے۔ حاجی برلاس نے شہرِ سبز
اپنے مضافات اور قرشی کے علاقے سے دھڑا دھڑ فوجی بھرتی شروع کر دی۔ بایزید جلائر بھی تیاریاں کرنے لگا مگر
ابھی ان کی تیاریاں مکمل نہ ہوئی تھیں کہ بادِ شمال کے خانِ اعظم کے حملے کی افواہ حقیقت میں تبدیل ہو گئی۔ امیر قزغن کے
مرتے ہی خانِ اعظم کی نظریں سمرقند پر پڑیں۔ امیر قزغن کی زندگی میں اسے سمرقند کی طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی
تھی۔ وہ تو بس اسی بات پر خوش تھا کہ امیر قزغن اس کی طرف سے سمرقند کا حاکم ہے لیکن اب حالات بدل گئے تھے۔
امیر قزغن کی موت نے تاتاریوں کا شیرازہ بکھیر دیا۔ ان کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ ہر قبیلے کا سردار خود مختار ہو گیا۔ تیمور
نے کوشش کر کے عبداللہ کو حاکمِ سمرقند بنا دیا تھا۔ اس نے گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا تھا لیکن عبداللہ اپنی
فطری بزدلی کی وجہ سے حکومت نہ سنبھال سکا اور سمرقند سے بھاگ نکلا۔

خانِ اعظم کے لیے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا تھا۔ اسے تاتاریوں کی بغاوت یاد تھی اس لیے دل
میں تاتاریوں کے لیے پرانی دشمنی موجود تھی۔ پھر وہ اسلام دشمن تھا جبکہ تاتاریوں کے تمام قبائل اسلام قبول کر چکے
تھے۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کے محکوم مسلمان اس کی برابری کا دعویٰ کریں۔ خانِ اعظم نے جنوب کی طرف
بڑھنے کا حکم دے دیا۔

کہاں تو حاجی برلاس اور بایزید جلائر سمرقند پر قبضے کے لیے پر تول رہے تھے اور کہاں اُن کا یہ عالم ہوا کہ
وہ اس طرح دبک گئے جیسے بلی کو دیکھ کر چوہے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔

خانِ اعظم کے لشکر نے سمرقند کا یوں رخ کیا جیسے ٹڈی دل کھیتوں پر گرتا ہے۔ آگے آگے اس کے
مقدمۃ الجیش کے دستے، گھوڑوں پر سوار، لمبے چمکدار نیزے سنبھالے نمودار ہوئے۔ انہوں نے تاتاری علاقے میں

داخل ہوتے ہی لوٹ مار شروع کر دی۔

مغل اپنے ساتھ بار برداری کے جانور بھی رکھتے تھے تاکہ لوٹ کا مال آسانی سے لاد اور
ان کے پیچھے سوار دستے تھے جو کھڑی فصلوں کو روندتے ہوئے آندھی کی طرح وادی پر چھا گئے۔

پورے تاتاری علاقے میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس مصیبت کے وقت بھی تاتاریوں کو ہوش
یہ تھا کہ سب سردار مل کر مغلوں کا مقابلہ کرتے لیکن ہر ایک کو صرف اپنی اور اپنے علاقے کی فکر تھی۔
بایزید جلائر کا علاقہ سمرقند کے راستے میں تھا۔ مغلوں کو اسی راستے سے گزرنا تھا۔ بایزید
قلعہ بند ہونے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ دوسرے سردار اپنے اپنے علاقوں میں قلعہ بند ہو گئے تھے۔
نے خانِ اعظم کی اطاعت قبول کر لی اور قیمتی تحائف لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

تیمور کے دوسرے دشمن حاجی برلاس کا مغلوں کے خوف سے ایسا پتہ پانی ہوا کہ وہ اپنا
اس نے تیمور کو لکھا:

"میں اپنا علاقہ چھوڑ رہا ہوں اور اپنے قبیلے کے ساتھ جنوب میں جا رہا ہوں۔
ممکن ہوا تو ہرات میں پناہ حاصل کروں گا۔"

تیمور کو یہ خط شہرِ سبز میں ملا۔ وہ مغلوں کی یلغار سے پوری طرح واقف تھا اور جانتا تھا کہ
نفاق اور انتشار نے مغلوں کو سمرقند پر قبضہ کی دعوت دی ہے۔ اس نے فوراً حاجی برلاس کو جواب

"چچا جان۔ آپ جہاں جانا چاہیں چلے جائیں۔ خطرات سے بھاگنے والے کا پیچھا
خطرہ ہی کیا کرتا ہے۔"

خط بھیج کر تیمور نے اپنے باپ کی تجہیز و تکفین بڑے شاہانہ انداز میں کی۔ یوں معلوم ہوتا
مطمئن ہو اور اسے مغلوں کی کوئی پروا نہ ہو۔ لوگ شہرِ سبز سے بھی بھاگ رہے تھے۔ بعض اپنی مجبوریوں
شہر نہ چھوڑ سکے۔ تیمور کو مطمئن دیکھ کر وہ اس کے پاس آ گئے۔ انہیں اب بھی تیمور کی شجاعت پر
جانتا تھا کہ وہ غرض کے بندے ہیں۔ ایسے لوگ بجائے فائدہ پہنچانے کے مسائل ہی پیدا
اس نے ایسے لوگوں کو منہ نہیں لگایا۔

تیمور کو اپنے سے زیادہ ننھے جہانگیر اور الجائی خاتون کی فکر تھی۔ اس نے ان دونوں کو
رخصت کیا۔ کابل میں الجائی کا بھائی امیر حسین تھا۔ تیمور کو اس وقت کابل سے زیادہ کوئی

رہ آئی۔

تیمور چاہتا تو خود بھی کابل جا سکتا تھا لیکن وہ شہرِ سبز کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ تیمور
لین بھی اس کی اس خوبی کے قائل تھے کہ تیمور مصیبت کے وقت ہراساں نہیں ہوتا۔ اس نے شہرِ سبز
نے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مولانا زین الدین بھی وہیں تھے۔ تیمور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے پہنچا تو مولانا نے تیمور کو گلے
لگایا اور مسکرا کر کہا:

"تیمور۔ تمہارا چچا حاجی برلاس تو شہرِ سبز کا دعوے دار تھا۔ مصیبت پڑی تو جنوب کی طرف بھاگ گیا۔"

تیمور افسوس سے بولا:

"اگر حاجی برلاس اور دوسرے سردار متحد ہو کر مغلوں کا مقابلہ کرتے تو سمرقند بچ سکتا تھا۔ ان کی طمع اور
نااتفاقی نے انہیں لے ڈوبی۔"

زین الدین نے رازدارانہ انداز میں پوچھا:

"تمہارے پاس کتنا لشکر ہے؟"

"صرف چند سو سوار ہیں۔" اس نے حقیقت بیان کر دی۔

"اور جتہ مغل نے کتنے لشکر سے یلغار کی ہے؟"

"بارہ ہزار سے زیادہ سواروں کے ساتھ۔"

مولانا نے فوراً کہا:

"تیمور۔ میں تمہیں مغلوں سے ٹکرانے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ پہاڑ سے ٹکرانا بہادری نہیں ہوا کرتی۔
میں نے بھی انہی خطوط پر غور کیا ہے۔"

تیمور نے بتایا:

"میرا خیال ہے کہ خانِ اعظم سمرقند پر ہمیشہ کے لیے قبضہ نہیں کرے گا۔ وہ سمرقند پر اپنا حق جتانا چاہتا
تھی اسے حاصل بھی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے ان کی حکومت تسلیم کی تھی اور اطاعت کا وعدہ کیا تھا۔"

مولانا زین الدین خالص مذہبی آدمی تھے لیکن حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فوراً بولے:

"میرا بھی یہ خیال ہے لیکن جو لشکر اتنی دور سے چل کر آیا ہے وہ خالی ہاتھ تو واپس نہیں جائے گا۔ مغل مرا

شہروں کو لوٹیں گے۔ لوٹ مار سے تو انہیں خانِ اعظم بھی نہیں روک سکے گا۔ تیمور! میں شہرِ سبز کی
دیکھ سکتا۔ تمہیں اس شہر کو بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہوگا"۔

تیمور نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا:

"آپ دیکھتے جایئے مولانا۔ جو آپ چاہتے ہیں انشاءاللہ ویسا ہی ہوگا۔ مغل آپ کے شہر
سکیں گے"۔

مولانا زین الدین کی زبان سے "آمین" نکلا۔ لیکن وہ حیرت سے تیمور کو تکنے لگے۔ ان کی سمجھ
مغل سرداروں کو شہرِ سبز لوٹنے سے تیمور کس طرح روک سکے گا۔

تیمور نے مولانا زین الدین سے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔

مغل شہرِ سبز تک پہنچ گئے لیکن تیمور نے ایسی تدبیر کی کہ مغل شہرِ سبز کی کسی چیز کو ہاتھ
نہ لوٹ مار ہوئی اور نہ ہی آگ لگائی گئی۔ تلواریں نیاموں سے باہر بھی نہ آئیں۔ کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی

شہزوری

مغل خانِ اعظم کے ہراول دستے شہرِ سبز میں داخل ہو گئے۔

آگے آگے گھڑسوار لمبے لمبے چمکدار نیزے سنبھالے، کاندھوں پر چھوٹی کمانیں، بائیں جانب ترکش، کے ساتھ لٹکتی ہوئی تلواریں۔

تیمور نے پہلی بار مغلوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ اسے ان مغلوں میں اپنی شباہت نظر آئی۔ وہی کھنچی ہوئی تیز ترچھی آنکھیں۔ بھاری جسم اور . . . . . اور سب کچھ تاتاریوں ہی جیسا تھا۔ صرف نام ہی کا فرق تھا۔ دونوں قوموں۔ تاتاری اسلام لے آئے تھے۔ چغتائی مغل ابھی اس نعمت سے محروم تھے۔

خانِ اعظم تغلق تیمور نے شمالی پہاڑوں سے اتر کر سمرقند کے ذرا اوپر اپنا ڈیرہ لگایا تھا۔ اس کے دستے مار دھاڑ میں مصروف تھے۔ مزاحمت نام کو بھی نہ ہوئی۔ تاتاری سوار قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ خانِ اعظم کو اگر کچھ خطرہ تھا تو پورے قبیلے سے تھا۔ اس نے اپنے ہراول دستے شہرِ سبز کی طرف بھیجتے وقت اپنے سرداروں کو نصیحت کی:

برلاس قبیلے کے نوجوان سردار تیمور سے ہوشیار رہنا۔ لڑائی میں پہل نہ کرنا۔ جنگ ہو تو یلغار کر کے دور کو ختم کر دینا"۔

لیکن شہرِ سبز میں کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ مقابلہ پر کوئی نہ نکلا۔ ہراول کا سردار بیک جک اپنے دستوں کے ساتھ قصرِ سفید کے سامنے پہنچا۔ اسے بتایا گیا کہ تیمور کا مسکن قصرِ سفید ہے۔ بیک جک کو خیال گزرا کہ تیمور شاید اس کی آمد کی خبر سن کر قصرِ سفید چھوڑ کر بھاگ گیا ہے لیکن تیمور قصر میں موجود تھا۔ اسے مغل سردار کے

دروازے تک پہنچنے کا انتظار تھا۔

بیگ جک شش و پنج میں تھا کہ قصر کا بڑا دروازہ کھل گیا۔ تیمور اپنے پانچ سرداروں کے ساتھ بڑھا کر مغل سردار کے پاس پہنچا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ مغل اسلحہ سے لیس تھے۔ تیمور اور اس کے ساتھ جسم پر کوئی اسلحہ نہ تھا۔

بیگ جک کو قدرے تعجب ہوا۔

تیمور مسکراتے ہوئے بولا:

"قبیلہ برلاس کا سردار تیمور، اپنے معزز مغل سردار کو خوش آمدید کہتا ہے۔"

بیگ جک کا منہ کھل گیا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔

تیمور پھر بولا:

"معزز مہمان۔ اندر تشریف لے چلیے۔ سفر کی تھکان دور کیجیے۔ کھانا تیار ہے۔"

بیگ جک حیرت میں ڈوبا گم سم کھڑا تھا۔ اس کے خون خوار دستے بھی دریائے حیرت میں غرق تھے۔ سرداروں کا اس انداز سے پہلی بار استقبال کیا جا رہا تھا۔

تیمور کے اشارے پر ایک غلام سر پر ایک خوان اٹھائے باہر آیا۔ تیمور نے خوان پوش ہٹایا۔ ہیرا چمک دمک سے مغلوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

تیمور نے اپنے ایک سردار کو اشارہ کیا۔ سردار نے غلام کے سر سے خوان لے لیا اور تمام جواہر مغل سردار کے اوپر نچھاور کر دیے۔ چھوٹے بڑے جواہر ریزے زمین پر گر کر جھلمل جھلمل کرنے لگے۔ کی حیرت اور بڑھ گئی۔

تیمور نے کہا:

"اس صدقہ کو قبول فرمائیے اور اندر تشریف لے چلیے۔"

بیگ جک نے خواب آلود نظروں سے تیمور کو دیکھا اور سحر زدہ انسان کی طرح گھوڑا بڑھا کر قصر میں داخل ہوا۔

قصرِ سفید کے سبزہ زار میں حدِ نظر تک قالینوں کا فرش بچھا تھا۔ درمیان میں سفید نمدے کی گدی تھی۔ نمدے کی مسند مغلوں کو بہت پسند تھی۔ تیمور نے اسی لیے یہ انتظام کیا تھا۔ چار ہزار مغل سوار

بیٹھ گئے۔ بیگ جک نے بلا تکلف مسند سنبھال لی۔ مغلوں کے بیٹھتے ہی سرپوش ڈھکی سینیاں آنے لگیں۔ سینیوں میں منہ بند تھیلیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ غلاموں نے ہر مغل کے سامنے ایک ایک تھیلی رکھ دی۔ ایک بے صبر مغل نے تھیلی کھول کر فرش پر الٹ دی۔ اس میں دینار بھرے تھے۔ سونے کی چمک دیکھ کر مغل نے جلدی سے دینار سمیٹ کر پھر تھیلی میں بھر لیے۔

بیگ جک کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ مغلوں میں تھیلیاں تقسیم ہو چکیں تو بیگ جک نے کن انکھیوں سے تیمور کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو: "میرا حصہ"۔

تیمور نے غلاموں کو اشارہ کیا۔ غلاموں نے چار خوان لا کے بیگ جک کے سامنے رکھ دیے۔۔۔

بیگ جک نے بے صبری سے ایک کا خوان پوش الٹ دیا۔ خوان میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی اینٹیں سجا کے رکھی گئی تھیں۔ اس نے دوسرا خوان پوش الٹا۔ یہ خوان سونے کی اینٹوں سے بھرا تھا۔ تیسرے میں دینار بھرے تھے اور چوتھے میں جواہرات کے چار ہار تھے۔

بیگ جک کی آنکھیں اتنی دولت دیکھ کر پھٹی رہ گئیں۔ وہ تمام شہرِ سبز کو تہ و بالا کر دیتا تو بھی اسے اتنی دولت حاصل نہ ہوتی۔

تیمور، بیگ جک کی حریص نظروں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بیگ جک کی نظریں دولت کے اس ڈھیر سے نہ ہٹتی تھیں۔ شہرِ سبز آنے کا صلہ اسے اس کی امیدوں سے بھی زیادہ مل گیا تھا۔

آخر بیگ جک نے نظریں اٹھا کر تیمور کو دیکھا۔ اس نے کہا:

"کیا تاتاری، حملہ آوروں کی اسی طرح آؤ بھگت کیا کرتے ہیں۔"

تیمور مسکرا کر بولا:

"سردارِ محترم! کوئی حاکم اپنی ریاست میں حملہ آور نہیں ہوا کرتا۔ ہمارے باپ داداؤں نے آپ کے باپ داداؤں سے معاہدہ کیا تھا کہ بادشاہ چغتہ مغل ہوں گے اور تاتاری سرداری کریں گے۔ سمرقند کی حکومت خانِ اعظم کی ہے۔ ہم توران کی طرف سے اس کے امیر اور سردار ہیں۔ پھر آپ حملہ آور کیسے ہوئے۔ آپ کی خاطر کرنا ہمارا فرض ہے۔"

بیگ جک کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے بولا:

"اس کا فیصلہ تو خانِ اعظم کرے گا کہ بادشاہ کون ہے اور سردار کون؟"

تیمور سمجھ گیا کہ مغل سردار کے موٹے دماغ میں اس کی بات نہیں آئی۔ تیمور نے کھانا لانے کا اشارہ
بھاپ اٹھتے ہوئے بھنے گوشت کے تھال آنا شروع ہو گئے۔ پرندوں کا گوشت، بکروں اور بھیڑوں
گھوڑوں کے گوشت کے کباب، جو کی موٹی موٹی شہد میں ڈوبی ہوئی روٹیاں۔ مغل بھوک اور تھکن
ہو رہے تھے۔ انہوں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا اور تھیلیاں خورجیوں میں رکھ کر وہیں قالینوں پر دراز
گئے۔

تیمور، بیک جک کے پاس آ بیٹھا اور بولا:

"آپ ہراول دستوں کے سردار ہیں لیکن مجھے آپ کا نام ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔"

"بیک جک!"

اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا:

"مغل مقدمۃ الجیش کے ہراول دستوں کے تین سردار ہیں۔ دو سردار میرے پیچھے آ رہے

تیمور نے کہا:

"میں نے آپ کے آرام کے لیے اندر انتظام کرا دیا ہے۔ لیکن آپ تو وہاں تشریف لے چلیے

بیک جک سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا:

"تیمور۔ کیا تم خانِ اعظم کو بادشاہ سمجھتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔"

تیمور نے فوراً جواب دیا:

"یہ بات تو ہمارے اور آپ کے باپ داداؤں میں صدیوں پہلے طے ہو چکی ہے۔ ہم نے خوا
ہے اس پر قائم ہیں۔"

بیک جک صرف "ہوں" کر کے رہ گیا۔

تیمور بولا:

"میں آپ لوگوں کی آمد کی خوشی میں ایک جشن کر رہا ہوں۔"

"کیا کہا۔ جشن؟"

بیک جک چونک پڑا:

"اے تاتاری سردار۔ کہیں تو ہمیں فریب تو نہیں دے رہا ہے۔ تُو نے ہمارا استقبال کیا۔ حالانکہ ہمیں شہرِ سبز میں زبردست مقابلے کی امید تھی۔ تم نے ہمارے جانبازوں کو بغیر کہے دعوت دی۔ ہمیں اتنا کچھ دیا کہ جتنا ہم مانگنے کا خیال بھی نہ کر سکتے تھے۔ تم ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو۔ کیا ہمارے سپاہیوں نے لوٹ مار نہیں کی۔ کیا تمہاری کھیتیاں برباد نہیں ہوئیں! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم ہمیں دھوکا دے کر کسی جال میں پھانسنا چاہتے ہو۔"

"محترم سردار۔"

تیمور دھیمے لہجے میں بولا:

"آپ نے یا خانِ اعظم نے جو کچھ کیا یا جو قدم اٹھایا وہ سب ایک غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔ میرا باپ طراغائی اچانک انتقال کر گیا۔ مجھے سمرقند چھوڑ کر شہرِ سبز آنا پڑا۔ اگر میں سمرقند میں موجود ہوتا تو خانِ اعظم کو اس یلغار کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"اچھا اچھا۔ تم جشن کرو لیکن ہمیں غافل نہ سمجھنا۔ سوتے میں بھی ہمارا ہاتھ تلوار پر رہتا ہے۔" بیک جک نے تیمور کو تنبیہ کی۔

"اے مغل سردار۔"

تیمور نے وضاحت کی:

"شب خون یا غفلت میں حملہ کرنا صرف جنگ کے دنوں میں جائز ہے۔ مجھے اگر آپ سے مقابلہ کرنا ہوتا تو آپ شہرِ سبز کی حدود میں داخل نہ ہو سکتے۔ ہم نے آپ کو مہمان بنایا ہے۔ غلط فہمیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ جشن سے فارغ ہونے کے بعد میں خانِ اعظم کے پاس خود جاؤں گا۔"

"بس اب میرا دل صاف ہو گیا۔"

بیک جک نے کہا:

"تم فوراً خانِ اعظم کے پاس جا کر اپنی صفائی پیش کرو۔ تمہارا شہر ہماری حفاظت میں رہے گا۔ کسی مغل سردار نے تلوار نکالنے کی کوشش کی تو میں اس کا خاتمہ کر دوں گا۔"

"آپ اپنے سرداروں کو ناراض نہ کریں۔"

تیمور نے ان کے چھوٹے سرداروں کی حمایت و ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کہا:

"اگر انہیں اور دولت کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہیں۔ میں انہیں اور دوں گا لیکن میں چاہتا ہوں میرے پاس جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ خانِ اعظم کی خدمت میں پیش کر دوں۔"

"تیمور۔ تم تو مغلوں کے دوست معلوم ہوتے ہو۔"

بیک جک مسند کا سہارا لیتے ہوئے بولا:

"ہم خانِ اعظم کا حق چھینا نہیں چاہتے۔ تم ان کا حصہ سمرقند لے جا سکتے ہو۔"

دوسرے دن سے جشن شروع ہو گیا۔

صبح سے شام تک جانور ذبح ہوتے رہتے اور کھانے پکتے رہتے۔ تاتاری ساز، نغمے اور رقص ان مغلوں ہی جیسے تھے۔ شمالی کوہستان کے قبائلی طائفے مغلوں کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے اور جب انہیں جنوب میں بلایا جاتا تو تاتاریوں کا دل بہلانے بھی آ جاتے۔ تیمور نے مغلوں کی دل بستگی کے لیے ایسے ہی ناچ گانے کے طائفے شمال سے بلوائے تھے۔

تیمور نے کھانے کے تمام لوازمات مہیا کیے لیکن اس نے کسی دعوت میں بھی مغلوں کو شراب نہ بھجوائی۔ یہ بات نہیں کہ تاتاری شراب نہ پیتے تھے لیکن یہ مسلمان ہو چکے تھے۔ اس لیے شراب کو حرام سمجھتے اور کھلے پینے سے گریز کرتے۔ مولانا زین الدین نے تیمور سے کہہ دیا تھا کہ مغلوں کو شراب نہ پیش کی جائے۔ خود بھی شراب سے پرہیز کرتا تھا لیکن مغلوں میں یہ وبا عام تھی اور وہ خاص قسم کی شراب استعمال کرتے تھے۔ گھوڑی کے دودھ میں تربوز کی شراب ملا کر وہ ایک محلول بناتے۔ اس قسم کی شراب کے مٹکے ان کے ساتھ ہوتے تھے۔

اس جشن میں تیمور نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ تیمور کی خاطر و مدارات کو دیکھ کر مغل پانی پانی ہو گئے۔ بیک جک تیمور کے اخلاق اور مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے حکم دے دیا کہ شہرِ سبز کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ ہاتھ لگانے کی انہیں یوں بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتے تیمور کے غلام فوراً لے آتے۔ شراب اور عورت کے لیے تیمور نے بیک جک سے معذرت کر لی تھی مغلوں کو سب سے زیادہ دولت عزیز تھی اور دولت کے تو تیمور نے انبار لگا دیے تھے۔

جشن کے بعد تیمور نے بیک جک سے کہا:

"اے مغل سردار۔ اب مجھے خانِ اعظم کے پاس جانے کی اجازت دے دیجیے۔ مجھے افسوس ہے میں اپنے مہمانوں کی شایانِ شان خدمت نہ کر سکا۔"

بیک جک نے قہقہہ لگایا اور بولا:

"نوجوان تاتار۔ تو کتنا دل والا ہے۔ اتنا کچھ دینے اور خاطر مدارات کے بعد بھی معذرت کر رہا ہے۔ میں نے تیرے جیسا فیاض آدمی نہیں دیکھا۔"

تیمور نے بڑبڑا کر کہا:

"مغل سردار۔ میں نے شہرِ سبز اور اپنے قبائل کی دولت آپ کے یہاں پہنچنے سے پہلے اکٹھا کر لی تھی۔ یہاں تک کہ مذہبی اوقاف کا بیت المال بھی میں نے یہاں منگوا لیا تھا۔ اب میرے علاقے میں آپ کو کسی کے پاس جواہر کا ایک ریزہ یا سونے کا ایک چھلا بھی نہ ملے گا۔ جو کچھ ہے وہ میرے پاس ہے۔ اس تمام دولت میں سے میں نے خانِ اعظم کا حصہ نکال کر سب کچھ آپ لوگوں میں بانٹ دیا ہے۔ اگر خانِ اعظم کی خدمت میں نذرانہ نہ دینا ہوتا تو یہ بچا کھچا مال بھی میں آپ لوگوں کے حوالے کر دیتا۔"

مغل ہر چند کہ اجڈ اور جاہل جنگجو تھے مگر عقل سے عاری نہ تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں سوجھ بوجھ بھی آ گئی تھی۔ بیک جک تیمور کا مطلب فوراً سمجھ گیا۔ بولا:

"تیمور۔ تو مطمئن ہو کر خانِ اعظم کے پاس جا۔ تیری عدم موجودگی میں تیرا علاقہ ہماری حفاظت میں رہے گا ہمیں نہ تو اور زیادہ دولت کی تمنا ہے اور نہ ہی ہم تیرے جیسے بہادر نوجوان کی دوستی چھوڑنا چاہتے ہیں۔ تو خانِ اعظم کا مال ساتھ لے جا۔ کوئی مغل کسی تاتاری گھر کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا جب تک تو واپس نہیں آتا ہم قصرِ سفید کی حدود سے قدم نہ نکالیں گے۔"

بیک جک کی باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ ان کی طمع کی آگ بجھ چکی ہے اور اب وہ تیمور کے جانے کے بعد اس کے علاقہ میں کسی قسم کی گڑبڑ نہ کریں گے۔

تیمور نے ادھر سے مطمئن ہو کر خانِ اعظم تغلق تیمور کے دربار میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔ تیمور کو جس طرح اپنا وقار عزیز تھا اسی طرح وہ خانِ اعظم کا وقار بھی برقرار رکھنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ دربار میں اس شان سے حاضر ہو کہ دونوں کی عظمت میں کوئی فرق نہ آئے۔

تیمور نے اپنے ساتھ جانے والے تمام لوگوں کو درباری لباس پہنایا۔ پھر باقی دولت اور بیش بہا تحائف لے کر سمرقند کی طرف چلا۔ بیک جک نے اسے خوشی خوشی رخصت کیا اور مولانا زین الدین نے فی امان اللہ کہا۔

تیمور نے بیگ جک سے کہا تھا کہ اس نے شہرِ سبز کی تمام دولت اکٹھا کر لی ہے۔ یہ تیمور کی
کا اظہار تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی جس کا اس نے برملا اظہار کر دیا۔ مغلوں کی یلغار کا سن کر اس نے مولانا
سے صلاح مشورہ کیا تھا۔ اس نے مولانا سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

"بارہ ہزار مغلوں کا مقابلہ کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ شہرِ سبز کو اگر بچایا جا سکتا ہے تو
حکمتِ عملی سے"۔

چنانچہ اس نے مغلوں کو دولت کی چمک سے زیر کر لیا اور اب وہ اطمینان سے سمرقند جا رہا تھا۔

تیمور نے جتنی دولت بیگ جک اور اس کے سواروں میں تقسیم کی تھی اس سے کئی گنا زیادہ وہ
لے کر جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خانِ اعظم صرف چاندی کے جوتے ہی سے سیدھا ہو سکتا ہے۔ سمرقند اور
کو اگر بچانا ہے تو دولت کے دریا بہا دو لیکن سمرقند کے راستہ میں دو اور لٹیرے اس کے پیچھے لگ
خانِ اعظم نے تین ہزار کے دستے شہرِ سبز آگے پیچھے روانہ کیے تھے۔ ایک دستے کا سردار بیگ جک
شہرِ سبز میں آرام کر رہا تھا۔ اس کے بعد آنے والے دستوں کے سردار جانی بیگ اور ارکنت تھے۔ یہ
سردار بیگ جک سے زیادہ لالچی نکلے۔

تیمور صرف پچاس مسلح سواروں کے ساتھ خانِ اعظم سے ملنے جا رہا تھا۔ دولت اور تحائف کئی چھکڑ
لدے تھے۔ جانی بیگ اور ارکنت نے تیمور کو گھیر لیا۔ اتنی بہت سی دولت دیکھ کر ان کی آنکھیں چک
اور منہ میں پانی آ گیا۔

تیمور نے انہیں بتایا کہ یہ تمام دولت اور مال و اسباب خانِ اعظم کی خدمت میں پیش کرنے
لیے لے جا رہا ہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنا حصہ طلب کیا۔ تیمور کو غصہ آ گیا۔ اس نے چھکڑے ا
حوالے کر دیے اور خالی ہاتھ سمرقند جانے کا قصد کیا۔

مغل سردار ڈر گئے کہ خانِ اعظم کو معلوم ہو گا تو وہ ضرور ناراض ہو گا۔ پھر بھی انہوں نے تیمور کی خ
اور دھونس سے کچھ نہ کچھ سونا چاندی اور تحائف ہتھیا لیے۔ تیمور نے ان کی خواہش کے مطابق انہیں
دلا کر اپنا پیچھا چھڑایا اور آگے بڑھا۔

قاسم نے شہزوری کے چہرے سے ریشمی زلفیں ہٹاتے ہوئے کہا:

"شہزوری۔ کچھ سوچو۔ کچھ سمجھو۔ ہم آخر کب تک انتظار کرتے رہیں گے"۔

شہزوری نے نرگسی آنکھیں اٹھائیں۔ مسکرائی اور بولی:

"قاسم۔ اتنے بے صبر کیوں ہوتے ہو۔ ہم روز ملتے ہیں۔ اباجان نے ہم پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی"۔

"شہزوری!"

قاسم بے بسی سے بولا:

"تم سمجھتی کیوں نہیں۔ ماموں جان تمہاری شادی مجھ سے نہیں......"

شہزوری نے جلدی سے اپنا سیمیں ہاتھ قاسم کے منہ پر رکھ دیا۔ شرارت سے بولی:

"بری بات منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ اباجان نے سارے قبیلے کے سامنے ہماری منگنی کا اعلان
کر دیا ہے۔ وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں"۔

"وہ مجھے ہرگز نہیں چاہتے"۔

قاسم جھلا گیا۔

"انہیں میری ضرورت ہے۔ وہ تمہاری آڑ میں مجھے روکے ہوئے ہیں۔ اگر انہوں نے تمہاری شادی میرے
ساتھ کر دی تو میں انہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا"۔

شہزوری کو اس کے غصے پر بڑا پیار آیا۔ اس کا دل چاہا کہ قاسم سے لپٹ کے کہے:

"پیارے قاسم۔ یوں غصہ نہ کیا کرو۔ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے"۔

لیکن وہ یہ کہنے کے بجائے کھل کھلا کے ہنس پڑی جیسے بہت سے غنچے ایک ساتھ کھل جائیں۔ قاسم
نے دریائے آمو کی لہروں میں تھرتھراتے سورج پر نظر جماتے ہوئے کہا:

"سورج نکلتا ہے۔ ڈوبتا ہے۔ دن ہوتا ہے۔ گزر جاتا ہے۔ ماموں جان وقت کے ساتھ اسی طرح بہے
چلے جا رہے ہیں۔ تمہاری محبت کی زنجیریں میرے پیر پکڑے ہوئے ہیں ورنہ میں اب تک یہاں سے
چلا گیا ہوتا"۔

"مجھے چھوڑ کے؟"

شہزوری کی شوخی میں ذرا بھی کمی نہ آئی۔ چودہ سال کی شہزوری سنجیدہ ہونا جانتی ہی نہ تھی۔ وہ تو اڑتی تتلی

تھی۔ جنگلی ہرنی۔ قلانچیں بھرتی ہوئی۔ انہی اداؤں نے قاسم کو اس کا گرویدہ کر رکھا تھا۔

قاسم نے کہا:

"تم حالات کی سنگینی پر غور نہیں کرتیں شہزوری۔ کبھی سنجیدہ ہو کر بھی سوچو۔"

شہزوری نے اس کے دھڑکتے سینہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولی:

"مردوں کا دل بڑا ہوتا ہے۔ میں عورت ہو کر ٹسوے نہیں بہاتی۔ تم تو مرد ہو۔ میرے لیے اس سے بڑا اور کیا سکون ہو سکتا ہے تم میرے سامنے ہو۔ دریائے آمو کا کنارہ ہے۔ اس کی سبک لہریں محبت کے ترانے گاتی ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں نغمے بکھیرتی ہیں۔ ہم ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، سیر کرتے، شکار کھیلتے ہیں۔ مجھے کیا چاہیے؟"

"یہ ایک پُرفریب خواب ہے شہزوری۔" قاسم نے اٹھتے ہوئے کہا:

شہزوری فوراً بولی:

"اگر یہ خواب ہے تو بھی مجھے پسند ہے۔ میں اس خواب میں ڈوب جانا چاہتی ہوں۔" شہزوری نے قاسم کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اسے بٹھا لیا۔

"میں جا رہا ہوں شہزوری!" قاسم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کہاں؟" شہزوری پر پہلی بار گھبراہٹ طاری ہوئی۔

"سردار تیمور کے پاس۔"

قاسم نے انکشاف کیا۔

"تمام تاتاری سردار مغلوں کے ڈر سے اپنے اپنے قلعوں میں منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ تیمور ہی ایک مرد ہے جس نے شہرِ سبز نہیں چھوڑا۔ تمہارے ابا جان صرف حاجی برلاس ہیں وہ تاتاری نہیں۔"

شہزوری آگ بگولہ ہو گئی۔ تڑپ کے کھڑی ہوئی۔ بولی:

"قاسم۔ تمہیں ابا جان کے دشمن کا نام لیتے شرم آنی چاہیے۔ ابا جان بزرگ ہیں۔ تیمور کے چچا ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے تیمور نے قبیلہ کی سرداری کا دعوا کیوں کیا۔ وہ تاتاریوں کا باغی ہے۔"

قاسم نرم پڑتے ہوئے بولا:

"شہزوری! میں اپنی محبت کے درمیان ان باتوں کو نہیں لانا چاہتا تھا لیکن ماموں جان کی حیلت

مجھے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں جانتا ہوں تم اپنے باپ کے خلاف ایک لفظ سننا پسند نہیں کرو گی لیکن میں تمہاری محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں شہزوری۔ سردار تیمور بہت عظیم ہے۔ وہ تاتاریوں کی ناک ہے۔ ان کی عظمت کا نشان ہے۔ تمہیں حالات کا علم نہیں۔ تم نہیں جانتیں کہ مغلوں نے ہم پر یلغار کیوں کی ہے۔ اس تباہی کا ذمے دار کون ہے؟"

قاسم بہت جذباتی ہو گیا اور اس کا جسم کانپنے لگا۔

شہزوری کو قاسم سے بے انتہا محبت تھی۔ قاسم اس کا پھوپھی زاد تھا۔ دونوں بچپن سے ایک ساتھ کھیلتے ہوئے جوان ہوئے تھے۔ ہمہ وقت قربت، انسیت اور محبت میں تبدیل ہو ہی جاتی ہے۔ پھر دو سال پہلے ان کی منگنی کا باقاعدہ اعلان بھی ہو چکا تھا لیکن شہزوری کا باپ شادی کے لیے ٹال مٹول کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حاجی برلاس کو قاسم پسند نہ تھا۔ قاسم کی وجاہت اور شجاعت کا حاجی گرویدہ تھا۔ تیمور کے بعد اگر تاتاریوں میں حاجی کو کوئی جوان نظر آتا تھا تو وہ قاسم ہی تھا۔ شہزوری اور قاسم کی شادی میں رکاوٹ کی اصل وجہ یہ تھی کہ قاسم کا جھکاؤ تیمور کی طرف تھا۔ بہادر ہمیشہ بہادر کو پسند کرتا ہے۔ تیمور اور قاسم کئی سال تک ایک ساتھ رہے تھے۔ قاسم نے اپنی جوان اور ناتجربہ کار آنکھوں سے تیمور میں وہ جوہرِ قابل دیکھ لیا تھا جو برلاس کی تجربہ کار اور باراں دیدہ نظریں نہ دیکھ سکی تھیں۔ حاجی برلاس کو یقین تھا کہ شادی ہوتے ہی قاسم شہزوری کو لے کر تیمور کے پاس چلا جائے گا اور یہ بات اسے کسی طرح گوارا نہ تھی۔

شہزوری نے ہاتھ بڑھا کر قاسم کی کمر سے خنجر کھینچ لیا۔ بگڑ کر بولی:

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے باپ نے مغلوں کو بلایا ہے؟"

"شہزوری!"

قاسم نے پیار سے کہا:

"تم میری زبان پکڑ سکتی ہو۔ چاہو تو کاٹ بھی سکتی ہو لیکن دنیا کو کیا کہو گی۔ تمام بوڑھے تاتاری یہی کہہ رہے ہیں کہ اگر حاجی برلاس اور بایزید جلائر ہمت کر کے دوسرے سرداروں کو ملا کر مقابلے پر آ جاتے تو آج مغلوں کے قدم سمرقند تک نہ آتے۔ کیا یہ بزدلی نہیں کہ ماموں جان مغلوں کے ڈر سے ہرات بھاگے جا رہے ہیں۔"

شہزوری بہت تیز طرار تھی لیکن قاسم کی باتوں میں اتنا وزن تھا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

شہزوری نے کہا:

"قاسم۔ کیا ابا جان مغلوں سے ڈر کر بھاگ رہے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ اگر دشمن طاقتور ہو تو اس کے سامنے سے ہٹ جانا چاہیے"۔

"نہیں شہزوری۔ حملہ آور ہمیشہ زبردست ہی ہوا کرتا ہے"۔

قاسم نے اسے سمجھایا:

"لیکن تاتاری ان سے کم نہیں۔ مقابلہ کیا جاتا تو کامیابی کی زیادہ امید تھی"۔

"پھر سب تاتاری اکٹھا کیوں نہیں ہوتے"۔ شہزوری نے پوچھا۔

"اکٹھا کیسے ہوتے؟"

قاسم بے دلی سے بولا:

"متحد ہونے کے لیے ایک سردار کو حاکم سمجھنا پڑتا ہے۔ وہ حاکم صرف تیمور ہو سکتا ہے۔ وہ تاتاریوں کی سرداری کا اہل ہے"۔

"کیا تیمور بہت بہادر ہے"۔ شہزوری نے بے خیالی میں سوال کیا۔

قاسم نے کہا:

"صرف بہادر نہیں۔ وہ عقلمند بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس وقت کیا کام کرنا چاہیے"۔ پھر وہ دونوں خاموش ہو گئے اور دیر تک اپنے اپنے خیالوں میں گم رہے۔

سورج غروب ہو گیا لیکن رات کی سیاہی پھیلنے سے پہلے ہی دور پیڑوں کی شاخوں سے چاند نکلا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگے۔ اور فضا میں کیف رچ گیا۔ ایسی فضا محبت بھرے دلوں کے لیے بڑی سازگار ہوتی ہے۔

شہزوری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا:

"قاسم۔ تم نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک ہے لیکن میں بھی تو مجبور ہوں۔ مجھے ابا جان کا حکم ماننا ہے۔"

"ٹھیک ہے شہزوری۔ تم اپنے باپ کا حکم مانتی رہو اور میں یونہی جل جل کر مرجاؤں"۔ قاسم پر اداسی چھا گئی۔

شہزوری نے دریا میں پیر لٹکا دیے اور پانی اچھالتے ہوئے بولی:

"ہم کتنے بے بس ہیں قاسم۔ لہروں میں بہتے ہوئے تنکوں کی طرح۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک دن ہم اپنی منزل پر ضرور پہنچیں گے"۔

شہزوری نے آج قاسم کی باتیں غور سے سنی تھیں اور ان سے اتفاق بھی کیا تھا۔ وہ واقعی مجبور تھی۔ اس کا احساس قاسم کو بھی تھا۔

قاسم دریا کے کنارے سبزے پر لیٹ گیا۔ شہزوری نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔۔۔ جیسے قاسم کے دل کی دھڑکن سن رہی ہو۔ قاسم کو شہزوری کے اس طرح سینے پر سر رکھنے سے ایک خاص قسم کا کیف محسوس ہونے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

شہزوری نے جلدی سے اپنا سر ہٹا لیا۔ بولی:

"تمہارا دل زور زور سے کیوں دھڑک رہا ہے قاسم؟"

قاسم کو شہزوری کی معصومیت بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ آہ بھرتے ہوئے کہا:

"شہزوری! میرا دل اس خوف سے دھڑک رہا ہے کہ کہیں تم مجھ سے جدا نہ کر دی جاؤ"۔

شہزوری تن کر بولی:

"واہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تمہاری ہوں۔ عورت ایک بار کسی کی ہو جائے تو پھر وہ کسی اور کی بیوی نہیں ہو سکتی"۔

شہزوری کا سر پھر قاسم کے سینے پر آ گیا۔

قاسم اس کی زلفوں کو چھیڑتے ہوئے بولا:

"وہ دن میری زندگی کا سب سے حسین دن ہوگا جب حاجی برلاس تمہیں ہمیشہ کے لیے میرے حوالے کر دیں گے"۔

شہزوری نے اپنا چہرہ چاند کی طرف کیا۔ چاند اب بلند ہو چکا تھا اور چاندنی ہر طرف بکھر گئی تھی۔ قاسم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی چاند کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور چاند کے دلکش نظارے سے شہزوری کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ وہ قاسم کے سہارے بیٹھ گئی۔

قاسم نے محبت بھرے لہجے میں کہا:

"شہزوری۔ کیا واپس نہیں چلو گی۔ تمہارے ابا جان پریشان ہو رہے ہوں گے"۔

شہزوری نے جیسے سنا ہی نہیں۔ بولی :

"قاسم۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم یہاں بیٹھ کے تمام رات چاندنی کا لطف اٹھاتے رہیں؟"

"ممکن ہے"۔

قاسم مسکرایا :

"بشرطیکہ تمہارے ابا جان چاہیں۔ پھر دن بھی ہمارے ہوں گے اور راتیں بھی"۔

محبت کے متوالے بڑی رات تک دریا کے کنارے بیٹھے چاند اور چاندنی اور جھلملاتی نہروں کا [لطف اٹھاتے] رہے۔ شہزوری کا سر کبھی قاسم کے شانے سے لگ جاتا تو کبھی لڑھک کر سینے پر آجاتا۔

معاً گھوڑوں کے بھاگنے کی آواز آئی۔ رات بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ قاسم اور شہزوری ٹہلتے ہوئے خیموں کے پاس آ گئے۔

یہ حاجی برلاس کی خیمہ گاہ تھی۔

حاجی برلاس نے پہلے بڑے زور شور سے اپنے قبیلہ کی سرداری کا اعلان کیا۔ پھر سمرقند کا بھی دعویدار بن گیا لیکن تاتاریوں کی یلغار ہوتے ہی ایسا خوفزدہ ہوا کہ ماوراالنہر سے نکل بھاگا، آمو پار کر کے خیمہ زن ہوا۔

یہاں آ کر اسے کچھ سکون ملا تو اس نے قبیلہ کے باقی لوگوں کو پیغامات بھیج کر اپنے پاس بلایا۔ کردار [...] پاس آ گئے اور باقی نے انکار کر دیا۔ حاجی برلاس، تیمور کے سخت خلاف تھا لیکن دل ہی دل میں اس [کی] شجاعت کا بھی قائل تھا۔ اب سے کچھ سال پہلے اس نے ارادہ کیا تھا کہ اپنی بیٹی شہزوری کی شا[دی تیمور] سے کر دے گا ...... وہ دراصل ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ اگر تیمور اس کا داماد ہو جا[تا تو اس] کے بعد اس کی سرداری کی مخالفت کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ پھر تیمور کی صورت میں اسے ایک بہا[در داماد بھی] مل جاتا لیکن جب تیمور، امیر قزغن کے دربار میں پہنچ کر ایک ہزار سواروں کا سردار ہو گیا تو ا[س] کو اس سے خطرہ محسوس ہوا۔ اور اس نے تیمور کی کھلے عام مخالفت شروع کر دی۔

اس مخالفت کے باوجود حاجی برلاس نے جب ہرات جانے کا فیصلہ کیا تو اس نے تیمور کو خط [لکھا] تیمور کو بلانے کا مقصد یہ تھا کہ تیمور نے والیِ ہرات ملک معزالدین پر بڑے احسانات کیے تھے [...] کے ساتھ ہرات جاتا تو حاجی برلاس کو وہاں پناہ بھی مل جاتی اور تیمور کا چچا ہونے کی حیثیت سے اس [...]

[...] جگت ہوتی لیکن تیمور نے چچا کو سخت جواب دیا اور ہرات جانے کے بجائے اس نے خانِ اعظم کے پاس [جا]نے کو ترجیح دی۔

حاجی برلاس کو تیمور کا جواب ملا تو وہ پڑھ کر بڑا متعجب ہوا۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تیمور [...] ڈینگ ماری ہے اور رعب ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ بھلا مغل بھی کسی کے دوست ہوتے ہیں۔ اگر تیمور [خا]نِ اعظم کے پاس گیا تو وہ اس کا سر اڑا دے گا۔ شاید حاجی برلاس کے دل کی بھی یہی آرزو تھی۔ اسے تیمور [کی] حماقت پر ہنسی آ گئی۔

حاجی برلاس نے دریائے آمو پار تو کر لیا لیکن دوسری طرف جا کے خیمے لگوا دیے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ [جب] تک وہ تیمور کی تباہی نہ دیکھ لے گا اس وقت تک یہیں ٹھہرا رہے گا۔ اس کی نظر میں تیمور کی تباہی یقینی تھی۔ [ص]رف چند دنوں کی بات تھی۔ مغل شہر سبز کا رخ کر چکے تھے۔ حاجی برلاس نے اپنے آدمی شہر سبز میں مقرر [کر ر]کھے تھے جو اسے دم دم کی خبریں پہنچا رہے تھے۔

حاجی برلاس کو پہلے خبر ملی کہ مغل شہر سبز میں داخل ہو گئے ہیں۔ تیمور نے ان کا استقبال کیا اور دعوت [دی] ہے۔ اس خبر پر اسے تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ لیکن ابھی ابھی اسے ایک سوار نے آ کر خبر دی کہ تیمور نے [...] سے دوستی کر لی ہے اور انہیں دولت دے کر شہر سبز کو بچا لیا ہے۔ سوار نے یہ بھی خبر دی کہ تیمور [...] جلد خانِ اعظم سے ملاقات کرنے شمال کی طرف جانے والا ہے۔

حاجی برلاس کے لیے یہ خبر بڑی مایوس کن تھی۔ وہ تو ہر لحظہ تیمور کی بربادی کی خبر سننا چاہتا تھا۔ [...] علوں نے نہ تو تیمور سے جنگ کی اور نہ شہرِ سبز کو برباد کیا۔

حاجی برلاس کو اپنے بھتیجے کی عقل و فراست کی داد دینی چاہیے تھی جس نے اپنی عقلمندی سے اس سرسبز و [شاداب] شہر کو بچا لیا تھا جس کا حاجی برلاس خود بھی دعوے دار تھا لیکن وہ اس خبر کو سن کر اور زیادہ جل [بھن] لیا۔

حاجی برلاس تاؤ کھایا ہوا اور جلا بھنا بیٹھا تھا کہ قاسم اور شہزوری سیر کر کے واپس آ گئے۔ قاسم کو [دیکھتے] ہی حاجی برلاس نے برا سا منہ بنا کر کہا :

"قاسم! تم نے کچھ اور سنا۔ طراغائی کے بیٹے نے زر و جواہر سے شہرِ سبز کا سودا کیا ہے"۔

بات کچھ الجھی ہوئی تھی۔ قاسم فوراً نہ سمجھ سکا۔ اس نے پوچھا :

"ماموں جان۔ میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔"

"تمہارے دوست تیمور نے شہر سبز کی تمام دولت اکٹھا کر کے مغلوں کے حوالے کر دی ہے"

لہجے میں بڑی نفرت اور گہرا طنز تھا۔

قاسم کی سمجھ میں بات آ گئی۔ وہ حاجی برلاس سے پہلے ہی جلا ہوا تھا۔ بولا:

"ماموں جان۔ اگر تیمور نے زر و جواہر دے کر مغلوں کے ہاتھوں شہر سبز کو برباد ہونے ر

تو میں اس کی عقل کی داد دیتا ہوں۔ دولت تو پھر اکٹھا ہو سکتی ہے۔ اگر شہر سبز کا حسن لٹ جاتا تو اس

بہار آنا ناممکن تھا۔"

حاجی برلاس کو قاسم کی بات ناگوار گزری۔ اس نے ناگواری کا اظہار کیا:

"تم نے تو تیمور کی حمایت پر کمر باندھ رکھی ہے۔ نہ جانے اس نے تمہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے"

"معاف کیجیے ماموں جان۔"

قاسم جرأت سے بولا:

"اگر تیمور دولت دے کر شہر سبز کو بچا سکتا ہے تو آپ بھی مال و دولت دے کر پورے

بچا سکتے تھے۔ اب شہر جو لوٹ مار ہو رہی ہے اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ ان طمع کے بندوں کا

سے بھر دیا جاتا۔"

"چپ ہو جاؤ قاسم۔"

حاجی برلاس بگڑ گیا:

"تم سیاست کے داؤں پیچ نہیں جانتے۔"

قاسم بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے کڑک کر کہا:

"ماموں جان۔ اسی داؤں پیچ کے نتیجہ میں آج برلاس قبیلے کے لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر ا

کنارے خیمے لگائے پڑے ہیں۔ خوش قسمت ہیں شہر سبز کے لوگ جو اپنے گھروں میں آرام س

بیٹھے ہیں۔ تیمور نے انہیں بچا لیا ہے۔"

"تم سخت گستاخ ہو گئے ہو قاسم۔" حاجی برلاس تلملا کر بولا:

"تمہیں تیمور پسند ہے تو اس کے پاس چلے جاؤ۔"

قاسم بھی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ بولا:

"ماموں جان۔ تیمور مجھے آج نہیں بچپن سے پسند ہے۔ وہ سرداری کے قابل ہے۔ آج نہیں تو کل وہ

تاتاریوں کا سردار اعلیٰ بنے گا۔"

"جاؤ، جاؤ چلے جاؤ اسی کے پاس۔" حاجی برلاس غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے بولا۔

قاسم اور شہزوری کے گھوڑے جن پر سوار ہو کر وہ واپس آئے تھے، قریب ہی کھڑے تھے۔ قاسم نے ایک

چلتی نظر شہزوری پر ڈالی اور پھر نظریں جھکا کر آہستہ آہستہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

قاسم اپنے گھوڑے کے پاس پہنچ گیا۔ شہزوری سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ زور سے چیخی:

"قاسم۔ قاسم مت جاؤ۔"

قاسم پر شہزوری کی آواز کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ رکاب میں پیر رکھ کر سوار ہو گیا۔ شہزوری تیزی سے اس کی

ف بھاگی۔ قاسم نے گھوڑے کو ایڑ دی۔ گھوڑا اُسے لے اڑا۔

شہزوری قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے لگام پر ہاتھ ڈالا لیکن اس کے ہاتھ لگام کے بجائے گھوڑے

کے ایال سے الجھ گئے۔ وہ ایال مضبوطی سے پکڑ کر لٹک گئی۔ قاسم نے گھبرا کر گھوڑا روکا مگر رکتے رکتے شہزوری

دور تک گھوڑے کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔ اس کے پیر اور پنڈلیاں زخمی ہو گئیں۔

گھوڑا رک گیا۔ قاسم نے جلدی سے اتر کر شہزوری کو ایال سے الگ کیا۔ شہزوری، قاسم کے ہاتھوں میں

ملا گئی۔ جیسے پھول، گود میں آگرے۔

حاجی برلاس اور اس کے سردار دوڑ کر وہاں پہنچ گئے۔

قاسم افسردگی سے بولا:

"معاف کیجیے ماموں جان۔"

اور حاجی برلاس جواب دینے کے بجائے شہزوری کے پیروں سے رستے ہوئے خون کو دیکھنے لگا۔

○

تیمور اپنے ساتھیوں کو لے کر بڑی تیزی سے مغل خانِ اعظم سے ملنے شمال کی طرف جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ

خانِ اعظم کو تحائف پیش کر کے اپنی اطاعت کا یقین دلائے تاکہ تاتاری علاقوں میں مزید لوٹ مار نہ ہو۔ سمرقند کے راستے میں اسے مغل ہراول دستوں کے دو اور سرداروں نے گھیر لیا۔ ان میں ایک کا نام جانی بیگ اور دوسرے کا الغتق تیمور کریت تھا۔

تیمور نے محسوس کیا کہ یہ دونوں سردار شہرِ سبز میں پڑے ہوئے مغل سردار بیک جک سے بہتر ہیں۔ بیک جک میں انسانیت، سمجھ بوجھ اور دوستی کا مادہ تھا لیکن ارکنت اور الغتق ان جذبوں سے عاری ہیں۔ ان کی خونخوار اور حریص نظریں ان کی سیاہ قلبی کی آئینہ دار تھیں۔ تیمور نے انہیں ان کے حسب منشا مال دے کر اپنا پیچھا تو چھڑا لیا لیکن اسے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ دونوں شہرِ سبز پہنچ کر لوٹ مار نہ شروع کر دیں لیکن یہ باتیں سوچنے کا نہ تو وقت تھا اور نہ تیمور اس کا تدارک کر سکتا تھا۔

تیمور نے اپنا سفر جاری رکھا۔

سمرقند کے شمالی نشیب میں اسے مغل خانِ اعظم کا اردوئے معلّٰی (لشکر) نظر آیا۔ پوری وادی قطاروں، گھوڑوں کے دستوں اور سفید نمدے کے خیموں سے پٹی پڑی تھی۔ شاہی لشکر کی فرودگاہ کو معلوم ہوتا تھا جیسے خیموں کا پورا شہر آباد ہے۔ جگہ جگہ آگ روشن تھی۔ زرق برق لباس میں ملبوس غلام بھاگتے پھر رہے تھے۔ مغل سوار لمبے نیزے اور صحرائی کمانیں لیے گھومتے نظر آتے تھے۔ ان نیزوں اور کمانوں پر مغلوں کو بڑا ناز تھا۔ ان کمانوں کا چلّہ کھینچنے میں بڑی طاقت استعمال کرنا پڑتی تھی۔ تاتاریوں کی بہ نسبت کمانیں وزنی اور مضبوط تھیں لیکن وہ تیزی سے حرکت میں نہ آ سکتی تھیں۔ تاتاری اپنی ہلکی ہلکی کمانوں کو اتنی تیز حرکت دیتے تھے کہ ان کے تیر بندوق کی گولیوں کی طرح کمانوں سے نکلتے تھے۔

چغتائی خاندان کا بادشاہ، شمال کا خانِ اعظم تغلق تیمور خان، اپنے سرداروں کے ساتھ سفید نمدے پر بڑی شان سے بیٹھا تھا۔

اس کے سردار نصف دائرے کی شکل میں اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ تغلق کا دبلا پتلا چہرہ۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بے قرار پتلیاں۔ چہرے پر چھوٹی بکھری داڑھی۔

تیمور کا گھوڑا آہستہ آہستہ خانِ اعظم کے فرشی دربار کے سامنے پہنچا۔ تغلق تیمور کی پتلیاں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ تیمور کی نظر بھی تغلق تیمور پر تھی۔

تیمور نے پہلی نظر میں یوں محسوس کیا جیسے تغلق تیمور کی شکل میں اس کا باپ طراغائی بیٹھا ہے۔

شکلوں میں اس قدر مشابہت پر تیمور کو تعجب سا ہوا۔ تیمور کے سردار درباری لباس پہنے اس کے عقب میں تھے۔ تیمور پوری تاتاری تمکنت سے فرش کے سرے پر پہنچ کر گھوڑے سے اترا۔ اس نے ایک سرسری نظر دربار پر ڈالی اور بڑے ادب سے تعظیم بجا لایا۔

تغلق تیمور، تیمور کی فولادی کڑیوں کی زرہ کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی زرہ پر سونے کا خوبصورت کام کیا ہوا تھا۔

کورنش پیش کرنے کے بعد تیمور نے بڑے وقار سے کہا:

"اے عالی نسب خانِ اعظم! اے اردوئے معلّٰی کے امیر! میں قبیلہ برلاس اور شہرِ سبز کا سردار تیمور ہوں۔"

تیمور کی بے باکی اور باوقار گفتگو سے خانِ اعظم بڑا متاثر ہوا۔ تیمور کو دیکھ کر اسے یقین کرنا پڑا کہ بیس سال سے کم عمر کا جوان بھی ایک سرکش تاتاری قبیلے کا سردار ہو سکتا ہے۔

تیمور نے پورے قبیلہ برلاس کے سردار ہونے کا اعلان کیا تھا حالانکہ برلاس قبیلہ کے زیادہ لوگ اس وقت اس کے چچا حاجی برلاس کے ساتھ دریائے آمو کے جنوب میں خیمے ڈالے پڑے تھے۔ تیمور نے ان کا ذکر جان بوجھ کر نہ کیا۔

تیمور نے اپنے سرداروں کو جو اس کے ساتھ ہی کورنش پیش کر چکے تھے، چھکڑوں سے تحائف اور سیم و زر لانے کا حکم دیا۔ چاندی اور سونے کی اینٹیں، جواہرات کے ہار، انگوٹھیاں، نگینے، آویزے، بڑے بڑے سچے موتی، چھوٹے چھوٹے ہیرے ٹکے ہوئے تاج۔

ہیروں کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ فرش پر دولت کا اتنا اونچا ڈھیر لگ گیا کہ تیمور کو ایڑیوں پر کھڑے ہو کر تغلق تیمور کو دیکھنا پڑ رہا تھا۔

تغلق تیمور خان نے تیمور کو بلا کر اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

اب تحائف آنا شروع ہوئے۔ چاندی کی چوکیاں۔ جواہر ریزوں کے جڑاؤ آئینے۔ سونے چاندی کے ظروف۔ زربفت۔ کمخواب کے تھان۔ حریری پردے۔

تغلق تیمور خان اور اس کے درباریوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ اس قدر دولت تو وہ عمر بھر لوٹ مار کرنے کے بعد بھی اکٹھی نہ کر سکتے تھے۔ تیمور نے ایک شاہی خزانے کے برابر مال و دولت ان کے سامنے ڈھیر کر دی تھی۔ تیمور کو یہ تمام تحائف اور دولت، چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں حاصل

ہوئی تھیں یا پھر امیر قزغن کے خزانے سے ملی تھی۔

تمام چھکڑے خالی ہو گئے۔ تحائف اور دولت کا دربار میں پہاڑ سا بن گیا۔

تیمور نے مسکرا کر تغلق تیمور کو دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس طرح جھاڑے جیسے کہہ رہا ہو:

"میرے پاس جو کچھ تھا وہ سب کا سب آپ کی نذر کر دیا۔ میں تو اب خالی ہاتھ ہوں۔"

تغلق تیمور نرا جنگجو ہی نہ تھا۔ تجربے نے اسے عقل بھی عطا کر دی تھی۔ وہ تیمور کے اشارے کو سمجھ گیا اور خود بھی مسکرانے لگا۔

خانِ اعظم تغلق تیمور خان کو جواں عمر تیمور کی تین ادائیں بہت بھائیں:

تیمور کی بے باکی

تیمور کی نقرئی زرہ

اور تیمور کا ہاتھ جھاڑنے کا انداز۔

تیمور کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے بے باک لہجہ میں کہا:

"خانِ اعظم! میں نے تمام سمرقند کی دولت آپ کے نذرانے کے لیے اکٹھا کر لی تھی۔ میں نے اس دولت میں سے کچھ آپ کو نذر کیا وہ اس دولت کا ایک حصہ ہے جو میں آپ کو پیش کرنا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ تین کتوں نے جو خود کو آپ کا امیر ظاہر کرتے ہیں اس دولت کے حصے بخرے کر لیے اور میں آپ کو پورا نذرانہ پیش نہ کر سکا۔"

خان تغلق تیمور کا خیال فوراً اپنے ہراول دستوں کے تینوں سرداروں کی طرف گیا۔ اسے ان پر بہت غصہ آیا۔ اس نے سوچا جب تیمور نے اتنی دولت مجھے پیش کی ہے تو پتہ نہیں اس کے سرداروں نے کیا کچھ مال جمع کر لیا ہو گا لیکن چالاک خانِ اعظم نے اس خدشہ کا اظہار دربار میں نہ کیا۔ تغلق تیمور کو یہ بھی ناگوار گزرا کہ تیمور نے اس کے سرداروں کو کتوں سے تشبیہ دی ہے۔

تغلق تیمور پُر رعب آواز میں بولا:

"شہر سبز کے سردار تیمور۔ اگرچہ تمہاری بے باکی گستاخی کی حد تک پہنچتی ہے لیکن ہم خوش ہیں کہ تم ہمارے امیروں کے خوف سے لاپروا ہو کر ان کی حرص و طمع کا ہمارے سامنے صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ تاہم خیال رہے کہ وہ امیر اسی دربار کے کتے ہیں۔ یہ ہمارا اور اُن کا معاملہ ہے۔ اس کا تدارک ہم خود کریں گے۔"

خانِ اعظم نے ایک لحظہ بھی ضائع نہ کیا۔ اس نے سوچا کہ اگر امیروں کو موقع اور وقت مل گیا تو وہ دولت تیا پانچہ کر دیں گے۔ دولت کے حصول کے سلسلے میں مغل اپنے بھائی سے بھی رعایت نہ کرتے تھے۔

خانِ اعظم نے ایک سردار سے کہا:

"طراشو خان۔ فوراً شہر سبز پہنچو اور ہمارے تینوں سرداروں کو پیغام دو کہ انہوں نے جتنی دولت سردار تیمور سے حاصل کی ہے وہ سب برلاس قبیلہ کے سردار حاجی برلاس کو واپس کر دیں اور دیکھو۔ اگر وہ انکار کریں تو ہمیں فوراً خبر کرو۔ ہم ان کے جبڑوں میں ہاتھ ڈال کر تمام دولت نکال لیں گے۔"

طراشو خان اسی وقت گھوڑے پر بیٹھ کر شہر سبز روانہ ہو گیا۔

تیمور کو خانِ اعظم کے اس حکم نامے پر کچھ تعجب سا ہوا۔ خانِ اعظم نے اس کی دولت حاجی برلاس کو واپس کرنے کا حکم دیا تھا حالانکہ حاجی برلاس، خانِ اعظم کے خوف سے دریائے آمو عبور کر گیا تھا۔

دراصل جب حاجی برلاس کو علم ہوا کہ خجند کے سردار بایزید جلائر نے خانِ اعظم کی اطاعت قبول کر لی ہے تو حاجی برلاس نے بھی اپنا ایک آدمی خانِ اعظم کے پاس بھیجا اور اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ خانِ اعظم نے حاجی برلاس کو اطاعت کے اظہار کے لیے اپنے پاس بلوایا۔ حاجی برلاس ڈر گیا اور اپنے قبیلہ کے آدمیوں کے ساتھ ماوراء النہر سے نکل بھاگا۔ اس کا علم خانِ اعظم کو نہ تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ حاجی برلاس اس کے پاس آنے والا ہے۔

خانِ اعظم کا حاجی برلاس کو دولت واپس کرنے کا حکم بھی مصلحت سے خالی نہ تھا۔ خانِ اعظم جانتا تھا کہ تیمور اب خالی ہاتھ ہو گیا ہے۔ اگر دولت اس کو واپس کی گئی تو یہ کچھ نہ کچھ اپنے لیے بھی رکھے گا۔ اس لیے اس نے تیمور کے بجائے حاجی برلاس کو دولت واپس کرنے کا حکم دیا۔ حاجی برلاس سے خانِ اعظم بغیر کسی پریشانی کے تمام دولت طلب کر سکتا تھا۔

تیمور کو یہ نہ معلوم تھا کہ اس کے چچا نے بھی خانِ اعظم کی اطاعت کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس لیے وہ خانِ اعظم کے حکم پر حیران سا ہوا۔

خانِ اعظم نے کہا:

"تیمور۔ ہمارے امیروں نے تم سے دولت چھین کر اچھا نہ کیا۔ اس کا ہمیں بھی افسوس ہوا۔ لیکن ہمارے افسوس کی مقدار صرف اس قدر ہے جیسے ہمارے جسم میں پھانس چبھ جائے یا آنکھ میں پلک ٹوٹ کر گر پڑے۔"

تیمور کو دولت چھن جانے کا تو کوئی افسوس نہ تھا لیکن تغلق تیمور کی یہ بات سن کر ضرور افسوس ہوا۔ تیمور

نے خانِ اعظم کے امیروں پر بھرپور طنز کیا تھا تاکہ اس کے اور امیروں کے درمیان اختلاف پیدا ہو
لیکن تغلق نے پھانس کے چبھنے اور پلک ٹوٹ کر گرنے کی مثال دے کر اس واقعہ کی اہمیت کو بالکل
کر دیا۔

تیمور کو یہ خیال کر کے اور زیادہ افسوس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ تین مغل سرداروں کی مخالفت مول لے کر
تیمور کی اس حکمتِ عملی کا آگے چل کر تاتاریوں اور خود تیمور کو فائدہ پہنچا۔

○

خانِ اعظم تغلق تیمور نے قاصد سردار کو تاکید کی تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے شہرِ سبز پہنچ کر ہراول
دستوں کے سرداروں کو اس کا پیغام پہنچائے اور اپنے سامنے ان سے تمام دولت حاجی برلاس کو دلا
قاصد سردار گھوڑا بھگاتا، رات دن ایک کرتا شہرِ سبز پہنچ گیا۔ مغل سردار بیک جک پہلے سے وہاں موجود
باقی دونوں سردار خان ارکنت اور خان کریت بھی دو دن پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔

قاصد نے گھوڑے سے اترتے ہی خانِ اعظم کا حکم سنایا:

"خانِ اعظم تغلق تیمور خان نے ہراول دستوں کے سرداروں خان بیک جک، خان ارکنت اور
خان کریت کو حکم دیا ہے کہ انہوں نے شہرِ سبز کے سردار تیمور سے جس قدر دولت اور
تحائف حاصل کیے ہیں وہ سب ماوراء النہر کے سردار حاجی برلاس کو واپس کر دیے جائیں۔
دولت کی واپسی کی نگرانی خانِ اعظم نے میرے سپرد کی ہے"

خانِ اعظم کے اس حکم سے مغل سرداروں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔
ہاتھ آئی ہوئی دولت کی واپسی کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ دولت ہی کے لیے تو وہ یہ ساری بھاگ دوڑ کرتے
اپنا خون بہاتے تھے، جانیں قربان کرتے تھے۔

بیک جک ان تینوں سے عقلمند تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ خانِ اعظم نے جو حکم دے دیا ہے اس سے
کسی طرح ممکن نہیں، حکم عدولی کرنا جان سے ہاتھ دھونا ہے۔

بیک جک نے کہا:

"اے خانِ اعظم کے قاصد! خانِ اعظم کا حکم بجا ہے۔ سر آنکھوں پر۔ میں ابھی حاجی برلاس کو تلاش
کر کے تمام دولت اور تحائف اس کے سپرد کیے دیتا ہوں۔ تو اس بات کا گواہ رہنا کہ میں نے خانِ اعظم کا حکم
ماننے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کی۔"

خان ارکنت، خانِ اعظم کا حکم سن کر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ غرا کر بولا:

"سمرقند کی دولت میں ہمارا بھی حق ہے۔ ہم نے تیمور سے اپنا حصہ وصول کیا ہے۔ ہمارا حصہ
واپس لینے کا خانِ اعظم کو کوئی حق نہیں۔"

خان کریت نے اس کی ہمنوائی کی۔ بولا:

"ہاتھ آئی ہوئی دولت کو ہم سے کوئی واپس نہیں لے سکتا۔ ہم خانِ اعظم کو ایک درہم بھی واپس نہ
کریں گے۔"

بیک جک نے سمجھایا:

"ایسی نادانی نہ کرو مغل سردارو۔ خانِ اعظم ہمارا بادشاہ ہے۔ غلط یا صحیح جو بھی حکم دے ہمارا فرض ہے
کہ ہم اسے بخوشی بجا لائیں۔"

"ہرگز نہیں۔" خان ارکنت چیخ کر بولا۔

بیک جک کی آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں اس نے کہا:

"تم خانِ اعظم سے بغاوت کر رہے ہو۔ اس کا انجام تمہارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔"

"ہم خانِ اعظم کا یہ حکم نہیں مانیں گے۔" خان ارکنت نے صاف انکار کر دیا۔

بیک جک نے دیکھا کہ دونوں سردار بغاوت پر آمادہ ہیں۔ اس کے پاس صرف ساڑھے چار ہزار
سوار تھے۔ ان دونوں کے زیرِ کمان دس ہزار کا لشکر تھا۔ بیک جک کے لیے ان پر قابو پانا ناممکن تھا۔
بیک جک نے مصالحت ہی میں اپنی بہتری دیکھی۔

بیک جک نے کہا:

"تم لوگ اپنی مرضی کے مالک ہو۔ جو چاہو کرو۔ مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں۔ میں خانِ اعظم کے حکم
کے تحت دولت واپس کرنے پر آمادہ ہوں۔"

خان کریت کھڑا ہو گیا اور قاصد کو گھورتے ہوئے بولا:

"جا۔ اور اپنے خان سے کہہ دے ہم اس کا حکم نہیں مانتے اور اسے بیک جک تو خانِ اعظم کا
ہے تو مقابلہ پر آ اور ہم سے دولت چھین سکتا ہو تو چھین لے"۔

بیک جک جھگڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا:

"مجھے خانِ اعظم نے تمہارے مقابلہ کا حکم نہیں دیا ہے۔ میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا لیکن
میں شہرِ سبز کا محافظ ہوں۔ اگر تم نے شہرِ سبز میں لوٹ مار شروع کی تو میں خاموش تماشائی نہ
رہوں گا"۔

خان ارکنت اور خان کریت نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ دونوں قریب کر
پہلے دونوں میں کچھ اشارے ہوئے پھر خان ارکنت نے خان کریت کے کان میں کہا:

"ٹھیک ہے۔ ہم اس سے لڑ کر اپنی طاقت کیوں ضائع کریں۔ شہرِ سبز سے باہر نکل کر اور
کریں گے"۔

خان کریت نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

خان ارکنت نے بیک جک سے کہا:

"خان بیک جک۔ ہمارا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں۔ ہم تمہارے شہر کو ہاتھ نہ لگائیں گے لیکن شہر
باہر نکل کر شہروں اور دیہاتوں کا وہ حشر کریں گے کہ تمہارا خان بھی یاد رکھے گا"۔

یہ کہہ کر دونوں باغی سردار اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے لشکر کو فوراً تیار ہو
حکم دیا اور پھر تمام مال و اسباب گاڑیوں اور چھکڑوں پر لاد کر چل پڑے۔ بیک جک نے بھی اپنے
کو تیار کر لیا تھا۔ وہ اپنا لشکر لے کر ان کے پیچھے پیچھے چلا تاکہ اگر وہ شہرِ سبز میں کوئی گڑبڑ کریں تو اس
تدارک کیا جا سکے۔

باغی سرداروں نے اپنے پیچھے بیک جک کو آتے دیکھا تو اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ وہ بیک جک
اس وقت الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ بیک جک نے شہرِ سبز کی سرحدوں تک ان کا تعاقب کیا۔ جب وہ شہر
نکل گئے تو اس نے اپنے سواروں کو رکنے کا حکم دیا۔

بیک جک نے قاصد سردار سے کہا:

"اے خانِ اعظم کے قاصد۔ بتا اب میں کیا کروں۔ وہ دونوں باغی ہو چکے ہیں۔ ان کے ارادے

نہیں معلوم ہوتے۔ ان کا رخ اردوئے معلّٰی کی طرف نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ شمال میں جائیں گے
اور وہاں خانِ اعظم کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر علمِ بغاوت بلند کریں گے"۔

قاصد سردار بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے کہا:

"عقل مند سردار۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم جو بہتر خیال کرو وہ کرو۔ لیکن اس حکم عدولی اور بغاوت
کی خبر خانِ اعظم کو فوراً پہنچنا چاہیے"۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں"۔

بیک جک نے کہا:

"اس وقت خانِ اعظم سے دور رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ ہمیں خانِ اعظم کے پاس فوراً چلنا چاہیے"۔

بات طے ہو گئی۔

بیک جک نے اپنا گھوڑا سمرقند کی سڑک پر ڈال دیا۔ اس نے اپنے حصہ کی دولت ساتھ لینے کی بھی
پروا نہ کی۔ بیک جک نے دونوں باغیوں کے رویّے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ضرور طوفان برپا کریں گے۔
ان کے پاس لشکر بھی کافی تھا اور اس وقت شمال خالی تھا۔

○

بیک جک اپنا لشکر لیے ہوئے سمرقند پہنچا مگر وہاں بغیر قیام کیے شمال کی طرف چل پڑا۔ مغلوں کا
اردوئے معلّٰی سمرقند سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔

بیک جک اردوئے معلّٰی میں پہنچا تو خانِ اعظم بدستور نمدے کے فرش پر بیٹھا شراب پی رہا تھا۔
بیک جک کے اس طرح اچانک آ جانے سے وہ بڑا حیران ہوا۔ اس کی پتلیاں تیزی سے گھومنے لگیں۔ تیمور
بھی دربار میں موجود تھا۔ اس نے اس وقت تک مغل دربار میں بہت سے دوست بنا لیے تھے۔ بیک جک کو
اکیلا دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔

بیک جک نے گھوڑے سے اتر کر خانِ اعظم کے دونوں ہاتھ چومے۔ پھر ادب و احترام سے سر
جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

خانِ اعظم نے دلی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا:

"خوش آمدید بیک جک۔ لیکن تم اکیلے کیوں آئے ہو۔ خان ارکنت اور خان کربت کہاں ہیں؟"

"وہ بدبخت باغی ہو گئے ہیں خانِ اعظم"۔ بیک جک نے لگی لپٹی کے بجائے صاف صاف بات کہہ دی۔

خانِ اعظم کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور شیر کی طرح گرجا:

"کہاں ہیں، وہ کتے؟"

"شمال کی طرف گئے ہیں"۔ بیک جک نے جواب دیا۔

"ہوں!"

یہ کہہ کر خانِ اعظم تیز تیز قدموں سے فرش پر ٹہلنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور وہ ناگ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ تمام دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

تیمور دل ہی دل میں خوب ہنس رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ خانِ اعظم سے کہے کہ جیسے آپ پھانس اور ... میں گرا ہوا ایک بال گنتے تھے وہ آپ کے لیے وبالِ جان بن گئے ہیں۔

خانِ اعظم ٹہلتے ٹہلتے رکا۔ اس نے درباریوں پر نظر ڈالی۔ پھر سب کو رخصت کر دیا۔ بیک جک اور ... کو اس نے روک لیا۔

تنہائی ہوئی تو خانِ اعظم نے بیک جک سے پوچھا:

"بیک جک۔ کیا تجھے یقین ہے وہ دونوں باغی ہو گئے ہیں؟"

بیک جک نے جواب دیا:

"خانِ اعظم۔ انہوں نے آپ کی شان میں جو گستاخ الفاظ استعمال کیے ہیں وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ تو شہرِ سبز بھی لوٹنے پر آمادہ تھے۔ میں بڑی مشکل سے اس شہر کو بچا سکا ہوں"۔

"ہوں!" اس بار خانِ اعظم کی ہوں کافی طویل تھی۔

تیمور نے آہستہ سے کہا:

"خانِ اعظم۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں!"

خانِ اعظم کو جیسے سہارا مل گیا۔ بولا:

"ہاں جوان سردار۔ ہم تیرا مشورہ ضرور سنیں گے"۔

تیمور بولا:

"خانِ اعظم۔ مجھے باغی سرداروں اور ان کے اثر و رسوخ کا پورا اندازہ ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ ان کے خلاف بہت سوچ سمجھ کے قدم اٹھائیں"۔

"تاتاری جوان!"

خانِ اعظم نے تجسس آمیز نظروں سے تیمور کو دیکھتے ہوئے کہا:

"تو واقعی عقلمند ہے۔ کتنی عجیب بات ہے جو مشورہ تو نے اس وقت مجھے دیا وہی بات میں خود ہی سوچ رہا تھا۔ باغی سرداروں کے پاس اس وقت کچھ زیادہ فوج نہیں البتہ شمال میں ان کے ہمدرد موجود ہیں۔ وہاں وہ زیادہ لشکر اکٹھا کر سکتے ہیں۔ اب تیرا کیا مشورہ ہے۔ مجھے اس وقت کیا قدم اٹھانا چاہیے"۔

تیمور نے کمالِ جرأت اور بے باکی سے کہا:

"خانِ اعظم۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ فوراً شمال میں واپس چلے جائیے۔ اگر آپ یہاں رہیں گے تو آپ کو دو خطروں کا سامنا رہے گا۔ آپ کے سامنے تاتاری ہوں گے جو اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ بند ہو کر بیٹھے ہیں۔ اور پشت پر آپ کے اپنے باغی سردار ہوں گے۔ اگر آپ شمال میں چلے گئے تو وہاں آپ کو صرف ایک خطرے کا سامنا ہوگا"۔

"تیمور۔ میں تیرے مشورے کی داد دیتا ہوں"۔

خانِ اعظم خوش ہو کر بولا:

"تو نے میری پریشانیاں آدھی کر دیں۔ میں تجھے تومان باشی (دس ہزار سواروں کا کمانڈر) کا درجہ دیتا ہوں۔ تو میری طرف سے سمرقند کا حاکم ہوگا"۔

خانِ اعظم نے تیمور کو تومان باشی کا عہدہ دے کر سمرقند کا حاکم بنا دیا اور خود خیمے ڈیرے اکھاڑ کر اسی شمال کی طرف کوچ کر گیا۔

خیموں کا شہر اجڑ گیا۔ وادی ویران ہو گئی اور تیمور کے حاکمِ سمرقند ہونے کی خبر ملک تاتار کے ایک سرے سے دوسرے کونے تک پہنچ گئی۔

حاجی برلاس کو تیمور کا خط دریائے آمو کے جنوب میں ملا۔ وہ اب تک وہیں مقیم
مطلع کیا:

"بلادِ شمال کا خانِ اعظم واپس جا چکا ہے۔ بزرگ تاتاریوں اور میری کوشش سے تاتاری علاقے تباہی اور بربادی سے محفوظ ہو گئے۔ خانِ اعظم نے مجھے سمرقند کا حاکم مقرر کیا ہے۔ اس کی مُہر میرے پاس ہے۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور میری طرف تعاون کا ہاتھ بڑھانا چاہیے۔ خانگی جھگڑے اور قبائلی رنجش ختم کر کے میرے ساتھ مل کر تاتاری حکومت کو مضبوط کیجیے۔"

یہ ایک قسم کا اطلاعی فرمان تھا۔ جو تیمور نے حکومتِ سمرقند سنبھالنے کے بعد بدخشاں، سرپول اور خجند کے قبائلی سرداروں کے نام بھیجا۔ بلخ میں بھی تیمور کا شاگرد اور ملکوتی کا شوہر عبدا... اس نے سب سے پہلے تیمور کی اطاعت کا اعلان کیا۔ دوسرے سرداروں کی طرف سے بھی رسمی ... تیمور کو تحائف بھیجے گئے۔ بایزید جلائر، خجند میں تھا۔ اسے سمرقند کا تخت ہاتھ سے نکل جانے ... ہوا۔ سب سے زیادہ صدمہ حاجی برلاس کو ہوا۔ وہ خود کو برلاس قبیلہ کا سربراہ اور سردار سمجھتا تھا ... برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا بھتیجا سمرقند کا حاکم بن جائے اور اسے ایک نوجوان لڑکے کے ما... پڑے لیکن مصلحتاً خاموش ہو رہا۔ اس نے تیمور کو کوئی جواب نہ دیا۔

تیمور حالات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا اور چپکے چپکے فوجی تیاریاں بھی کر رہا تھا۔ اسے ... حاجی برلاس کی طرف سے خطرہ تھا۔ حاجی برلاس دریا پار کر کے پھر شمال میں آ گیا تھا اور شہرِ سبز کے قریب ... پاس خیمے لگا دیے تھے۔ تیمور کو حاجی برلاس کے شہرِ سبز کے قریب خیمہ زن ہونے کی اطلاع ملی تو ... تھوڑا شہرِ سبز پہنچ گیا۔

تیمور حاکم تھا اور حاجی برلاس سے شہرِ سبز کے قریب خیمے لگانے کی وجہ پوچھ سکتا تھا ... اور حاجی برلاس کی طرف سے دوسرا قدم اٹھانے کا انتظار کرنے لگا۔

حاجی برلاس کو تیمور کے شہرِ سبز واپس آنے کی خبر مل چکی تھی۔ اس کا دماغ تیزی سے کام ... تیمور کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس نے بایزید جلائر کو پیغام بھیجا کہ فوراً اس کے پاس پہنچ جائے ... کا دعویدار تھا۔ اس نے تیمور کی اطاعت کا اعلان تو کر دیا تھا لیکن حاجی برلاس کے بلانے پر ...

پاس پہنچ گیا۔
سمرقند کے دونوں دعوے دار ایک دوسرے سے بڑے جوش و خروش سے ملے۔ دونوں کئی دن تک تنہائی میں گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ پتہ نہیں ان میں اندرونِ خانہ کیا معاملہ ہوا لیکن وہ کسی نتیجہ پر ضرور پہنچ گئے۔

حاجی برلاس نے ایک غلام کے ذریعے قاسم کو بلوایا۔

قاسم، شہزوری کے ساتھ دریائے آمو کی سیر کر رہا تھا۔ آجکل وہ دونوں بہت خوش تھے۔ مغلوں کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اور انہیں امید تھی کہ حاجی برلاس ان دونوں کی جلدی شادی کر دے گا۔ حاجی برلاس نے امن و امان بحال ہونے تک ان کی شادی ملتوی کر رکھی تھی۔ اب نہ صرف امن بحال ہو گیا تھا بلکہ حکومتِ سمرقند پھر تاتاریوں کو واپس مل گئی تھی۔

قاسم اس لیے بھی خوش تھا کہ سمرقند کا حاکم تیمور کو بنایا گیا تھا۔ اس کی نظر میں اس منصب کے لیے تیمور سے زیادہ کوئی اور موزوں تاتاری نہ تھا۔

غلام، قاسم کو ڈھونڈتا ہوا دریائے آمو تک پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ عاشق و معشوق دریائے آمو کے کنارے پانی میں پیر ڈالے بیٹھے ہیں۔ شہزوری اپنی سریلی آواز میں ایک کوہستانی گیت گا رہی ہے۔ قاسم دنیا سے بے خبر شہزوری کے گیت میں کھویا ہوا ہے۔ شہزوری گیت کی تان اٹھاتی تو قاسم بے چین ہو کر اس کی زلفوں سے کھیلنے لگتا۔ اور شہزوری جب جذبات سے مغلوب ہوتی تو اپنا سر قاسم کے دھڑکتے دل کے قریب کر دیتی۔

غلام دور کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ غلام کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ وہ بھی کسی کنیز کی محبت میں گرفتار تھا۔ قاسم اور شہزوری کو اس عالم میں دیکھ کر اسے اپنی محبوبہ یاد آ گئی۔ وہ بھی اسے اس طرح ناز و غمزے دکھاتی اور مسکراتی تھی۔

گیت ختم ہوا تو غلام کو اپنا فرض یاد آیا۔ اس نے قاسم کی طرف قدم بڑھائے لیکن اسی وقت شہزوری نے دوسرا گیت شروع کر دیا۔ غلام کے قدم جہاں تک پہنچے تھے وہیں رک گئے۔

شہزوری کا یہ گیت پہلے سے بھی زیادہ پُرسوز تھا۔ اس گیت کا مرکزی خیال فرقت اور جدائی تھا۔ ایک تو دردبھرا گیت اس پر شہزوری کی تانیں۔ اس کی آواز دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ جتنی دیر شہزوری گاتی رہی قاسم

مستی کے عالم میں اس کے زلف و رخسار سے اٹھکیلیاں کرتا رہا اور غلام دور کھڑا ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا
جیسے ہی ختم ہوا غلام تیزی سے قاسم کی طرف چلا۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر شہزوری نے تیسرا گیت شروع کر دیا تو
اسے مزید انتظار کرنا پڑے گا۔

پیروں کی چاپ سے پہلے قاسم ہوشیار ہوا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ غلام اس کے قریب ہی
شہزوری گیت ختم کرنے کے بعد قاسم کے شانے کے سہارے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ قاسم نے
سے ہلایا۔ شہزوری نے آنکھیں کھول دیں۔

مسکراتے ہوئے بولی:

"قاسم۔ تم نے مجھے ناحق جگایا۔ میں بڑا اچھا خواب دیکھ رہی تھی۔"

قاسم نے ہنس کر پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ شہزوری نے ادھر نظر کی تو شرم سے پانی پانی ہو گئی
جلدی اپنی بکھری زلفیں سنوارنے لگی۔

قاسم نے ہنس کر غلام سے پوچھا:

"کیا بات ہے خان۔ ماموں جان نے بلایا ہے؟"

"جی ہاں" یہ کہہ کر غلام نے نظریں نیچی کر لیں۔

شہزوری اب تک خود کو نہ سنبھال سکی تھی۔ اس کے بکھرے بال درست ہونے کو نہ آ
سے بیٹھے بیٹھے اس کے کپڑے بھی بے ترتیب ہو گئے تھے۔

قاسم نے پوچھا:

"کچھ علم ہے ماموں جان نے کیوں بلایا ہے؟"

"ابا جان مسکرا رہے تھے یا غصے میں تھے؟" شہزوری نے ایک اور سوال کر دیا۔

غلام نے سوچتے ہوئے کہا:

"میرا خیال ہے وہ غصہ میں نہیں تھے۔"

"پھر کوئی بات نہیں۔" قاسم کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شہزوری نے کہا:

"قاسم میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج ابا جان کوئی خوشخبری سنائیں گے!"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" قاسم نے شہزوری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دونوں آہستہ آہستہ چلنے
لگے۔ غلام ان کے عقب میں چل رہا تھا۔

حاجی برلاس کی شاہی خیمہ گاہ دریا سے کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ حاجی نے صرف دریا عبور کیا تھا۔ تھوڑی
دیر میں یہ لوگ حاجی برلاس کے پاس پہنچ گئے۔

حاجی نے مسکرا کر ان کو دیکھا۔ قاسم اور شہزوری کے دل میں اگر کوئی وسوسہ تھا تو وہ بھی دور ہو گیا
حاجی کے پاس اس وقت خجند کا سردار بایزید جلائر بھی بیٹھا تھا۔

حاجی برلاس نے جلائر سے کہا:

"یہ میری بیٹی شہزوری ہے اور یہ قاسم ہے۔ میرا ہونے والا داماد۔"

"ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔"

جلائر مسکرا کر بولا:

"بڑی خوبصورت جوڑی ہے۔ کب شادی ہو گی ان کی؟"

"بس بہت جلد۔"

حاجی نے کہا:

"میری یہی اولاد ہے۔ میں اس کی شادی دھوم دھام سے کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا سکون ہو جائے
اس کام سے بھی فارغ ہو جاؤں۔ شہزوری کی رخصتی کے بعد میں گوشہ نشین ہو جاؤں گا یا پھر
بیت کعبہ کو جاؤں گا۔"

"بہت نیک خیال ہے۔ اللہ مبارک کرے۔" جلائر نے ٹکڑا لگایا۔

حاجی برلاس نے قاسم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ قاسم کے ساتھ شہزوری بھی بیٹھ گئی۔

حاجی برلاس بولا:

"قاسم۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ ملک میں سکون ہو۔ تبھی میں شہزوری کو رخصت کر دوں
گا۔ سو اب اس کا وقت آ گیا ہے۔ ظالم مغل واپس جا چکے ہیں اور اپنا عزیز بھتیجا تیمور سمرقند کا حاکم
مان لیا گیا ہے۔ تیمور نے تمام تاتاری سرداروں کو فرمان روانہ کیا ہے کہ اس کی اطاعت قبول کر کے ملک کو
مستحکم کریں۔ تمام سرداروں نے تیمور کو سمرقند کا حاکم مان لیا ہے۔ . . . بہت غور کرنے کے بعد میں

اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان حالات میں میں بھی تیمور کی بادشاہت کو تسلیم کر لوں۔ میں نے تمہیں بلوایا ہے۔"

قاسم اور شہزادی بڑی حیرت سے حاجی برلاس کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ قاسم کو یہ تو معلوم تھا کہ حاجی برلاس میں قوتِ فیصلہ کی کمی ہے اور وہ جلد جلد اپنی رائے تبدیل کرتا رہتا ہے لیکن اس وقت تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے حاجی برلاس نے تیمور کی دیرینہ مخالفت ہمیشہ کے لیے دفن کر دی ہے۔

قاسم نے کہا:

"قابلِ احترام ماموں جان۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ آخر کار تیمور کی صلاحیتوں کے قائل ہو گئے۔ آپ نے مجھے کس سلسلہ میں طلب کیا ہے؟"

"تم میرے قریب ترین عزیز ہو قاسم۔"

حاجی برلاس نے اپنی شفقت کا اظہار کیا:

"پھر اب تو وہ موقع بھی آ گیا ہے کہ تم میرے جسم کا ایک حصہ بننے والے ہو۔ اگر میں اس اہم معاملے میں تم سے مشورہ نہ لوں تو شاید تمہیں ناگوار گزرے۔"

قاسم کا دماغ پیچ در پیچ باتوں کو سننے اور سمجھنے سے قاصر تھا۔ الجھتے ہوئے بولا:

"ماموں جان یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ سیاسی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ ہاں اگر کوئی خدمت ہو تو ضرور فرمایئے۔ میں بخوشی بجا لاؤں گا۔"

"میرے بیٹے قاسم!"

حاجی برلاس نے اور زیادہ محبت کا اظہار کیا:

"اس وقت میری اور خجند کے سردار بایزید جلائر کی مشکل تم ہی آسان کر سکتے ہو۔ تم تیمور کے عزیز ہو اور تیمور تم پر اعتماد کرتا ہے۔"

"ماموں جان! خدا کے لیے کچھ فرمایئے تو۔" قاسم نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے ہو۔ ہمارے اور تیمور کے درمیان اختلاف کی گہری خلیج موجود ہے۔" حاجی برلاس نے قاسم سے کہا۔

قاسم نے جواب دیا:

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ اس سے تو سارا زمانہ واقف ہے۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے بیٹے!"

حاجی برلاس نے قاسم کو خواہ مخواہ دعا دی:

"ہم دونوں سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تیمور اور ہمارے درمیان صلح و صفائی صرف تم ہی کرا سکتے ہو۔ اس کے دل میں ہماری طرف سے میل ہے۔ اگر تم چاہو تو یہ میل دور ہو سکتا ہے۔ تیمور بھی آخر میرا بھتیجا ہے۔ تم ذرا کوشش کرو تو معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتا ہے۔"

قاسم جلدی سے بولا:

"ماموں جان۔ اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہوگی۔ اگر میری کوشش سے آپ دونوں کی باہمی رنجشیں دور ہو سکتی ہیں تو میری خدمات حاضر ہیں۔ آپ فرمایئے۔ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"قاسم!"

حاجی برلاس نے پھر بات کو گھمایا:

"جو کام میں تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں، میں اور بایزید بھی کر سکتے ہیں لیکن بیٹے! جان کس کو عزیز نہیں ہوتی۔ پہلے ہمارا ارادہ تھا کہ ہم دونوں خود اس کے پاس جا کر اپنی وفاداری اور اطاعت کا اظہار کریں لیکن تیمور ہم سے سخت ناراض ہے۔ اگر اس نے غصہ میں آ کر ہمیں قتل کر دیا تو اس کا ہاتھ کون پکڑے گا؟"

"ماموں جان یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

قاسم تیمور کی طرف داری میں بولا:

"اگر آپ اس کے پاس خود چل کر جائیں تو مجھے یقین ہے وہ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔ وہ ایک خوددار انسان ہے۔ اپنے عزیزوں کی عزت کرنا جانتا ہے۔"

حاجی برلاس نے قاسم کو سمجھایا:

"ممکن ہے تیمور ایسا ہی ہو جیسا تم کہہ رہے ہو لیکن عقلمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ جب تک اس کا دل ہماری طرف سے بالکل صاف نہ ہو جائے اس کے سامنے جانا کسی طرح خطرہ سے خالی نہیں۔"

قاسم نے پوچھا:

"پھر یہ مسئلہ کس طرح حل ہوگا ماموں جان؟"

حاجی برلاس نے مدعا بیان کیا:

"قاسم۔ ہم اپنی طرف سے تمہیں تیمور کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔"

قاسم جلدی سے بولا:

"میں ابھی جاتا ہوں ان کے پاس۔"

"اس طرح نہیں قاسم۔"

حاجی برلاس نے اس کو روکا:

"وہ حاکمِ سمرقند ہے۔ ہمیں اس کے وقار کا بھی خیال ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تیمور کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کریں۔ اس بہانے تیمور کی حاکمیت کا جشن بھی ہو جائے گا اور ہمارے (گلے شکوے) بھی دور ہو جائیں گے۔"

"بڑا نیک خیال ہے ماموں جان۔"

قاسم خوش ہو کر بولا:

"اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں گے۔ جشن کا جشن اور میل کا میل۔ بڑی اچھی تدبیر سوچی ہے آپ نے۔"

"ہاں بیٹا۔"

حاجی برلاس نے آخری تیر پھینکا،

"میں عمر کے اس حصہ میں ہوں کہ پتہ نہیں کل کیا ہو جائے۔ چاہتا ہوں آنکھ بند ہونے سے پہلے اس فرض سے بھی فارغ ہو جاؤں اور خاندانی رنجشیں بھی دور ہو جائیں۔"

شہزوری کے نام پر قاسم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ شہزوری کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس سے بولا:

"پھر کب ضیافت کر رہے ہیں آپ تیمور کی؟"

قاسم کے انداز میں التجا تھی۔

"جب تم کہو گے ضیافت کا انتظام ہو جائے گا۔" حاجی برلاس نے ہنس کر کہا: "کیا پتہ تیمور اس ضیافت سے انکار کر دے۔"

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

قاسم نے تردید کی:

"آپ محبت سے بلائیں گے تو تیمور کیوں نہ آئے گا؟"

حاجی برلاس نے قاسم کو ٹٹولا:

"ممکن ہے جس طرح ہم اس کے پاس جانے سے ڈرتے ہیں تیمور بھی ہماری ضیافت میں آنے سے گریز محسوس کرے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے تم اس کا عندیہ معلوم کر لو۔"

اس تمام گفتگو کا لب لباب اور مقصد، حاجی برلاس کا آخری جملہ تھا جس کے لیے اُس نے قاسم کے سامنے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھی تھی۔ حاجی برلاس، قاسم سے کہہ سکتا تھا کہ تیمور کو دعوت میں مدعو کر دے لیکن اس نے قاسم کے دماغ سے شک وشبہ کے تمام سائے دور کرنے کے لیے بات کو اتنا طول دیا تھا۔ قاسم سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ اس کی سمجھ میں سوائے اس کے اور کچھ نہ آیا کہ حاجی برلاس سچے دل سے تیمور کی دلداری اور اطاعت کا اظہار کرنے کے لیے اس کی شاندار ضیافت کرنا چاہتا ہے۔

قاسم نے حاجی برلاس کی رائے سے پوری طرح اتفاق کیا اور تیمور کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے شہرِ سبز روانہ ہو گیا۔

○

حاجی برلاس نے شہرِ سبز سے آدھی منزل دور پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ قاسم کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ منزل اس کے سامنے تھی۔ حاجی برلاس اور تیمور کا میل اس کی منزل تھی۔ پھر شہزوری اس کی ہو گی ہمیشہ کے لیے اس کی۔ اس کے گھوڑے کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ قاسم چھ گھنٹے کا فاصلہ تین گھنٹے میں طے کر کے شہرِ سبز میں داخل ہوا۔ قاسم، حاجی برلاس کا فوجی تھا لیکن سرحدی محافظ جانتے تھے کہ قاسم اور تیمور میں دوستی ہے۔ انہوں نے اس کو نہیں روکا اور دو محافظ قاسم کو ساتھ لے کر قصرِ سفید پہنچ گئے۔

تیمور اس سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ بچپن کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ بڑی دیر تک پچھلی باتیں دہرائی

گئیں اور خوب قہقہے لگے۔

پھر تیمور نے مسکرا کر پوچھا:

"قاسم۔ تمہارا اچانک آنا کسی علت سے خالی نہیں۔ ہمارے چچا جان خیریت سے تو ہیں
شہر سبز کے قریب کیوں ڈیرے ڈال رکھے ہیں؟"

قاسم نے بتایا:

"سردار محترم۔ ماموں جان اپنے کیے پر نادم ہیں مگر بزرگانہ وضعداری ان کا دامن پکڑے ہو

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

تیمور نے سوال کیا:

"انہیں غلطی کا احساس ہوا ہے تو اب تک اپنی وفاداری کا اظہار کیوں نہیں کیا؟"

"وہ آپ سے ڈرتے ہیں سردارِ محترم!"

قاسم نے ہنس کر کہا:

"کہتے ہیں کہ اگر میں تیمور کے سامنے گیا تو کہیں آپ انہیں قتل نہ کرا دیں"

تیمور مسکرایا۔ بولا:

"کیا احمقانہ خیال ہے۔ حاجی برلاس میرے باپ کی جگہ ہیں۔ میں ان کے ساتھ کیسے گستاخ
یہ ان کا گھر ہے۔ جب جی چاہے چلے آئیں۔ میں کھلے دل سے ان کا استقبال کروں گا"

قاسم نے کہا:

"وہ آپ سے ملنا تو چاہتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ جب تک تیمور کا دل صاف نہ ہو جائے ملنا
نہیں ہو گا"

"قاسم یقین کرو میرے دل میں ان کی طرف سے کوئی کدورت نہیں" تیمور نے بات پہ زو
تیمور کے پاس اس وقت دو تین اور سردار موجود تھے۔ قاسم نے ان کی طرف دیکھا۔ تیمور ا
گیا۔ اس نے سرداروں کو رخصت کر دیا۔

قاسم نے رازدارانہ لہجے میں کہا:

"ماموں جان آپ سے سخت شرمندہ ہیں۔ خجند کے سردار بایزید بھی ان کے پاس آئے

ں نے آپ کی سرداری دل سے قبول کر لی ہے۔ انہوں نے طے کیا ہے کہ وہ آپ کی ایک شاندار ضیافت کریں۔
پ کا شایانِ شان استقبال کیا جائے۔ پھر وہ اپنے پورے لشکر کے سامنے اپنی اطاعت کا اعلان کریں۔ میں
پ کی رضامندی حاصل کرنے بھیجا گیا ہوں"

تیمور سوچ میں پڑ گیا۔

بات ہی سوچنے والی تھی۔ دشمنوں کے لشکر میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ قاسم نے اسے سوچ میں گم
ھا تو اسے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں تیمور انکار نہ کر دے۔ اور اس کی شادی کا مسئلہ پھر دور جا پڑے۔ اس نے
را لقمہ دیا:

"انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر تیمور کو کوئی خطرہ ہو تو یہ ملاقات سرحد پر بھی ہو سکتی ہے۔ سرحد پر
وں کی ملاقات ہو گی تو نہ آپ کو خطرہ ہو گا نہ ان کو۔"

یہ بات قاسم نے اپنی طرف سے کہی اور یہی بات تیمور جیسے صاحبِ عقل کو فریب دے گئی۔

تیمور نے بڑے وقار سے جواب دیا:

"قاسم۔ ہمارے بزرگوں کا قول ہے کہ عنانِ حکومت وہی ہاتھ سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔
حکومت کرنے کے لیے خطرات سے کھیلنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ میں ان کے لشکر میں جانے سے نہیں ڈرتا۔ اگر
خطرہ ہو بھی تو میں ایسے خطروں سے نپٹنا جانتا ہوں۔ مجھے دعوت منظور ہے۔ قبیلہ برلاس کو انتشار سے بچانے
کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں"

قاسم نے بڑھ کر تیمور کے دونوں ہاتھ چوم لیے۔ بولا:

"سردارِ محترم۔ آپ نے میری بڑی مشکل آسان کر دی"

تیمور چونک پڑا۔ پوچھا:

"تمہیں کیا مشکل آ پڑی تھی قاسم؟"

قاسم نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا:

"سردارِ محترم۔ آپ شہزوری کو تو جانتے ہی ہیں؟"

"شہزوری" تیمور نے سوچتے ہوئے کہا:

"چچا جان کی وہ شریر اور شوخ لڑکی۔ وہ تو تمہاری منگیتر تھی۔ کیا اب تک شادی نہیں ہوئی؟"

"نہیں سردارِ محترم!"

قاسم نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا:

"جھگڑے۔ لڑائیاں۔ ملک میں سکون نہیں۔ شادی کیسے ہو۔ اب حالات پُرسکون ہوئے ہیں تو میرے والد نے وعدہ کیا ہے کہ تیمور سے تعلقات استوار ہوتے ہی شہزوری کو رخصت کر دیں گے۔"

"ہوں۔ تو اب تک تم ہجر و فراق کے لمحات میں مبتلا ہو۔"

تیمور مسکرایا اور قاسم جھینپ گیا۔

تیمور نے کہا:

"قاسم۔ اگر تمہاری شادی ہمارے تعلقات پر مبنی ہے تو پھر فکر نہ کرو۔ میں چچا جان کی دعوت پر آؤں گا اور اس دعوت میں تمہاری شادی کی تاریخ بھی مقرر کرا دوں گا۔"

"مجھے آپ سے ایسی ہی امید ہے سردارِ محترم۔" قاسم نے اظہارِ تشکر کیا۔

تیمور نے دریافت کیا:

"چچا جان کب دعوت کرنا چاہتے ہیں؟"

قاسم نے بتایا:

"بس آپ کی رضامندی کا انتظار ہے۔ وہ تو بالکل تیار ہیں۔ میں ابھی جا کر انہیں آگاہ کر دوں گا۔"

تیمور نے اسے روکا:

"اتنی جلدی بھی کیا ہے جانے کی۔ دو چار دن میرے ساتھ رہو۔"

"مجھے نہ روکیے سردارِ محترم۔" قاسم نے التجا کی۔

"بڑے بے چین ہو شہزوری کے لیے۔"

قاسم کیا جواب دیتا۔ وہ انکار تو کر نہ سکتا تھا۔

حاجی برلاس نے شہرِ سبز کی سرحد پہ تیمور کا شاندار استقبال کیا۔ برلاس خاندان کے پندرہ سردار حاجی برلاس کے ساتھ تھے۔ تیمور بھی خلوصِ دل سے ملا۔ وہ چچا سے بغل گیر ہوا۔ تیمور کے ساتھ پچاس مسلح سوار تھے۔ حاجی برلاس صرف اپنے پندرہ سرداروں کے ساتھ تیمور کو لینے سرحد پر آیا تھا۔ خجند کا سردار بایزید جلائر بھی تیمور کو خوش آمدید کہنے حاجی برلاس کے ساتھ آ گیا تھا۔ نوجوان قاسم دونوں کے درمیان رابطے کا کام کر رہا تھا۔

تیمور کو اپنے خاندان کے بچھڑے ہوئے لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ حکومت کی طمع نے برلاس قبیلہ کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اب دونوں حصے پھر اکٹھے ہو رہے تھے۔

شہرِ سبز کی سرحد سے یہ مختصر قافلہ ہنستا، باتیں کرتا حاجی برلاس کی خیمہ گاہ کی طرف چلا۔ رفتار کم تھی۔ خیمہ گاہ پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ حاجی برلاس کی خیمہ گاہ میں چراغ روشن ہو گئے۔ ہزاروں شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ کہکشاں جیسا منظر تھا۔ تیمور کا اتنا شاندار استقبال ہوا کہ وہ اپنے دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، ایسے مہربان چچا سے جھگڑا کر کے اس نے اچھا نہ کیا۔

حاجی برلاس کا بڑا خیمہ شمعوں کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ خیمہ پر پہنچ کر سب گھوڑوں سے اتر گئے۔ تیمور نے اپنے سواروں کو باہر چھوڑا اور چچا کے ساتھ خیمہ میں داخل ہوا۔ حاجی برلاس اس کے آگے آگے تھا۔

حاجی برلاس کے خیمہ میں پہلا قدم رکھتے ہی تیمور کے کانوں میں جیسے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کی چھٹی حس تیزی سے کام کر رہی تھی۔ شاید اس نے خیمہ میں چھپے ہوئے مسلح آدمیوں کو دیکھ لیا تھا۔ خیمہ خوب سجایا گیا تھا۔ قیمتی قالینوں کا فرش تھا۔ تیمور کو خطرے کا احساس ہو جانے کے باوجود دوسرا قدم اٹھانا پڑا۔ اسے لگا ہر اگلا قدم اسے خطرے کے اور قریب کر رہا تھا۔ تیمور کے لیے خیمے کے بیچ مسند لگائی گئی تھی۔ تیمور قدم بڑھا رہا تھا اور خطرے کی گھنٹیاں تیزی سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔

تیمور اس مسند کے قریب پہنچ گیا جو اس کے لیے بچھائی گئی تھی۔ تیمور بیٹھنے کے لیے جھکا کہ اسے زور کی چھینک آئی۔ تیمور نے اپنا دامن ناک پر رکھ کر زور سے دبایا۔ خون کی ایک پچکاری سی اس کی ناک سے نکل پڑی۔ تیمور بیٹھنے کے بجائے سیدھا کھڑا ہو گیا اور "نکسیر نکسیر" کہتا خیمہ کے دروازے کی طرف بھاگا۔ پھر پلک جھپکتے ہی وہ خیمہ سے باہر تھا۔

یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ لوگ کچھ سمجھ ہی نہ سکے اور سمجھے تو اس وقت جب خیمے کے باہر
کے بھاگنے کی آواز آئی۔ تیمور سازش کا جال توڑ کر صاف نکل گیا۔ حاجی برلاس منہ تکتا رہ گیا۔
قتل پر مامور مسلح دستہ کمین گاہ سے نکل کر باہر کی طرف دوڑا لیکن وہاں اب کچھ نہ تھا۔

تیمور اپنے پچاس سواروں کے ساتھ شہرِ سبز کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔

تیمور کے جانے کے بعد حاجی برلاس کے طویل و عریض خیمے میں اودھم مچ گیا۔ بایزید جلائر
پر بڑا غصہ تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر خیمہ سر پر اٹھا لیا:

"حاجی برلاس، تم ذلیل ہو۔ کمینے ہو۔ تم نے میرے منہ پر کالک لگوا دی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل
نہیں رہا۔ میں نے تمہاری سازش میں شریک ہو کر اپنا بیڑہ غرق کر لیا۔ تیمور مجھے معاف نہ کرے گا۔ میری اینٹ
سے اینٹ بجا دے گا۔ اب میں کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔"

قاسم کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ اس نے حاجی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا:

"ماموں، میں نہ جانتا تھا تم اس قدر سازشی ہو۔ تیمور کیا سوچتا ہوگا۔ تم نے اس کے پاس
میرا اعتبار اٹھ گیا۔ میں زندگی بھر اس کے سامنے نظریں نہ اٹھا سکوں گا۔ میں ذلیل ہو گیا۔"

حاجی برلاس بہرہ بنا بیٹھا تھا۔ اس میں جواب دینے کی ہمت نہ تھی۔ اس نے سوچا کیا تھا
پانسہ بالکل ہی پلٹ گیا۔

بایزید جلائر نے بڑھ کر حاجی برلاس کا گریبان پکڑ لیا:

"تم نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ میں تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

حاجی کے آدمیوں نے بڑی مشکل سے حاجی کا گریبان چھڑایا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا:

"سمرقند کی حکومت چاہتے ہیں۔ سازش کرنا بھی نہیں آتی۔ تم تیمور کے پاسنگ بھی نہیں ہو۔
چالاک ہے۔ عقل مند ہے۔ وہی حکومت کا اہل ہے۔"

بایزید جلائر اور قاسم، حاجی برلاس پر پلے پڑ رہے تھے۔ حاجی کے سپاہی بار بار درمیان
حاجی اب تک خاموش تھا۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ جھگڑا بڑھتا جا رہا تھا۔ حاجی برلاس
اور سپاہیوں کی کوشش تھی کہ قاسم اور بایزید کو دھکیل کر باہر نکال دیں مگر وہ نکلنے پر آمادہ
دنگا فساد اور ہاتھا پائی ہوتی رہی۔

یکایک حاجی برلاس نے زبان کھولی:

"بایزید! تم مجھے آنکھیں کیوں دکھا رہے ہو۔ تم میرے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ اگر حکومت پر قبضہ
ہو جاتا تو آدھی سلطنت کے تم مالک بن جاتے۔ فائدے میں شریک تھے تو نقصان میں بھی شریک ہو جاؤ۔
بچ کر نہیں جا سکتا۔ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلا تو اب میں ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالوں
گا۔ میں تیمور کے خلاف لڑوں گا۔ شہرِ سبز میں آگ لگا دوں گا۔"

پھر حاجی برلاس نے تلوار نکالی۔ تلوار کو ہوا میں گردش دی اور چیخا:

"خبردار جو کسی نے مجھے الزام دیا۔ میں ایک ایک کی گردن اڑا دوں گا۔"

بایزید جلائر ڈر گیا۔ وہ اپنے ساتھ صرف پانچ سو سوار لایا تھا۔ حاجی برلاس کے پاس برلاس قبیلہ کے
سے زیادہ سواروں کے علاوہ کوہستانی سوار بھی تھے۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی اور وہاں سے
کی فکر کرنے لگا۔

حاجی برلاس نے خود اسے موقع فراہم کر دیا۔ بولا:

"جنہیں میرا ساتھ نہیں دینا ہے وہ یہاں سے چلے جائیں۔"

بایزید جلائر جھٹ سے خیمہ سے نکل گیا۔

قاسم نے کہا:

"میں بھی آپ کا ساتھ نہ دوں گا ماموں جان۔"

یہ کہتے وقت اس کا ہاتھ شمشیر کے قبضے پر تھا۔ اسے حاجی برلاس پر ذرا بھی اعتبار نہ رہا تھا۔ اس سے
کی حرکت ممکن تھی۔ قاسم اب مزید کوئی فریب نہ کھانا چاہتا تھا۔

حاجی برلاس گرج کر بولا:

"جا۔ تو بھی چلا جا اس طرغائی کے بیٹے کے پاس لیکن یہ سوچ لے کہ تیمور تجھے دیکھتے ہی قتل کرا دے
گا۔ تو اسے دھوکہ دے کر یہاں لایا تھا۔"

قاسم ایک لمحہ کے لیے تو پریشان ہو گیا۔ لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ بولا:

"میں تیمور کا مجرم ہوں۔ میں نے اسے دھوکہ دیا ہے۔ اگر وہ قتل کر دے گا تو میرا گناہ دھل جائے
گا۔ میرے لیے وہ موت، آپ کے ساتھ زندگی گزارنے سے کہیں بہتر ہے۔"

قاسم خیمہ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ حاجی گرجا:

"تجھے شہزوری سے بھی ہاتھ دھونا ہوں گے۔ تیمور کے پاس جائے گا تو میرا دشمن ہوگا۔ میں تیرے ساتھ بیٹی کو رخصت نہ کروں گا۔"

شہزوری کے نام پر قاسم کا پورا وجود ہل گیا۔ شہزوری کا سراپا اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ برلاس سے اسے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اپنا ارادہ نہ بدل سکا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا خیمہ سے نکل گیا۔ تلوار اس کے ہاتھ میں جھول گئی۔ اسے اپنا جسم گرتا ہوا محسوس ہوا۔ تھکا تھکا۔ جیسے اس نے کیا ہو اور اب جسم ٹوٹ رہا ہو۔ قاسم اس کا بازو تھا۔ بازو ٹوٹ جائے تو اذیت ہونا لازمی ہے۔

قاسم باہر آیا تو دیکھا بایزید جلائر اپنے سواروں کے ساتھ کوچ کے لیے تیار تھا۔

قاسم نے پوچھا:

"اے حاکمِ خجند۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

بایزید جلائر بھنا گیا۔ ناگواری سے بولا:

"تو کیوں پوچھ رہا ہے جدھر چاہوں جاؤں۔ میری مرضی!"

قاسم نے نرمی سے کہا:

"اے سردار! میں اس لیے پوچھتا ہوں کہ میں بھی حاجی برلاس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔ دغاباز کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ خواہ وہ میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔"

بایزید نرم پڑ گیا۔ بولا:

"قاسم۔ میں نے ایک گناہ کیا ہے اس کی سزا بھگتنے جا رہا ہوں۔"

"مجرم تو میں بھی ہوں سردار۔"

قاسم دل گرفتگی سے بولا:

"میں کدھر جاؤں؟"

"تو کس کا مجرم ہے؟" بایزید نے پوچھا۔

"امیر تیمور۔ حاکمِ سمرقند کا۔" قاسم نے کہا۔

"حاجی برلاس نے میرے ذریعے تیمور کو بلایا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ یہ سازش ہے تو میں

بایزید نے مشورہ دیا:

"تو تیمور کا مجرم ہے پھر تیمور کے پاس جا۔ اگر وہ قتل کر دے تو جرم ختم ہو جائے گا۔ اگر بخش دے تو تیری خوش نصیبی۔"

"ٹھیک ہے سردار۔ میں آپ کے مشورہ پر عمل کروں گا۔"

قاسم نے کہا۔

"مگر آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"جہاں تو جا رہا ہے قاسم۔" بایزید نے بتایا۔

"تیمور کے پاس۔"

قاسم نے حیرانی سے پوچھا:

"مگر وہ آپ کو....."

بایزید نے قاسم کی بات کاٹ دی۔ بولا:

"قاسم جس کشتی میں تو سوار ہے اس میں میں بھی سوار ہوں۔ ہم دونوں کا تقریباً ایک سا جرم ہے پھر سزا بھی ایک ساتھ ہی کیوں نہ بھگتیں۔ تو میرے ساتھ ہی چل۔"

قاسم اس پیش کش پر بہت خوش ہوا۔ وہ دوڑ کر اپنا گھوڑا لینے چلا گیا اور بایزید سے کہتا گیا کہ وہ جب تک واپس نہ آ جائے کوچ ملتوی رکھا جائے۔ بایزید نے وعدہ کر لیا۔

قاسم نے اپنا گھوڑا حاجی برلاس کے بڑے خیمے سے کچھ دور چھوڑا تھا لیکن اب گھوڑے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ اندھیرے میں ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ حاجی برلاس نے روشنیاں گل کرا دی تھیں۔ اسے تیمور کے شب خون مارنے کا خطرہ تھا۔

قاسم پریشانی کے عالم میں گھوڑا تلاش کر رہا تھا کہ کسی نے اسے پیچھے سے آواز دی:

"قاسم!"

قاسم کے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اندھیرے میں ایک سایہ سا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"شہزوری نے تمہیں بلایا ہے۔" سائے نے کہا۔

"کہاں ہے شہزوری؟" قاسم کا دل بے چین ہو گیا۔

"اپنے خیمے میں۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

سایہ آگے ہو گیا۔ اور قاسم چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لیا۔ تمام خیموں میں اندھیرا پھیلا ہوا

ایک خیمے کے سامنے رک گیا اور بولا:

"اندر چلے جاؤ۔"

قاسم ہچکچایا۔ اسے خطرہ محسوس ہوا۔

خیمہ کے اندر سے آواز آئی:

"جلدی اندر آ جاؤ قاسم۔"

یہ قاسم کی جانِ آفرین شہزوری کی آواز تھی۔ قاسم کے قدم یکدم اٹھ گئے۔ خیمہ کا پردہ اٹھا ہوا

اندر داخل ہونے لگا تو ایک مرمریں ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا۔

"شہزوری!"

"قاسم!"

دونوں کی آوازیں گھٹی گھٹی تھیں مگر سانسیں جلد جلد چل رہی تھیں۔ شہزوری کی زلفوں کی مہک

مدہوش کرنے لگی۔ اس کا سر قاسم کے سینے سے لگ گیا اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

قاسم نے شہزوری کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے۔ شہزوری کی سسکیاں گرم سانسوں

لگیں۔ قاسم کچھ کہنے والا تھا کہ اسے خیمہ سے کچھ دور کئی مشعلیں جھلملاتی دکھائی دیں۔ وہ سنبھلا۔ بولا:

"شہزوری۔ میں جا رہا ہوں۔"

شہزوری اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس نے قاسم کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتی

اسے چھوڑ کر جائے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وہ قاسم کی گرفت سے تڑپ کر نکلی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں

"قاسم بھاگ جاؤ۔ خدا کے لیے اپنی جان بچاؤ۔ ہم گھیرے میں آ گئے ہیں۔"

قاسم نے بھی خطرہ محسوس کر لیا تھا لیکن اس نے اطمینان سے کہا:

"شہزوری۔ بھاگنے کا وقت نکل چکا ہے۔ میں حاجی برلاس کا قیدی نہیں بننا چاہتا۔"

قاسم تلوار کھینچ کر خیمہ کے باہر آ گیا۔ شہزوری کا خیمہ چاروں طرف سے شمع بردار شمشیر زنوں

، تھا۔ حاجی برلاس گھوڑے پر سوار سامنے موجود تھا۔

حاجی برلاس نے کہا:

"قاسم۔ پھر نہ کہنا کہ حاجی برلاس بزدل تھا جس نے اکیلے پر ہاتھ اٹھایا۔ ہم تمہاری جان بخشتے ہیں لیکن

اتنی دیر کے لیے جب تک تم ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہو جاؤ۔ ہم دوبارہ تمہیں جہاں دیکھیں گے قتل

کر دیں گے۔ خواہ تیمور کا خیمہ ہو یا ہمارا خیمہ۔ جاؤ دُور ہو جاؤ ہماری نظروں سے۔"

شہزوری دوڑ کر خیمہ سے نکل آئی۔ وہ سمجھی حاجی برلاس نے قاسم کے قتل یا گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ وہ

تے ہوئے بولی:

"ابا جان! خدا کے لیے قاسم کو معاف کر دیجیے۔ خطاوار میں ہوں۔ میں نے قاسم کو بلوایا تھا!"

"شہزوری۔ ہم نے تمہارے صدقے میں اسے بخش دیا ہے۔"

حاجی برلاس نے بڑی تمکنت سے کہا:

"قاسم ہمارا دشمن ہے۔ اسے بھولنے کی کوشش کرو۔"

قاسم کو ایک گھوڑا مہیا کر دیا گیا۔ ننگی تلوار اب تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ قاسم جست لگا کر گھوڑے پر

اور اس تیزی سے گھوڑے کو گھمایا کہ اس کے گھوڑے کی کنوتیاں حاجی برلاس کے گھوڑے کی کنوتیوں سے

ٹیں۔

اب قاسم کی تلوار کی نوک حاجی برلاس کے دل کو چھو رہی تھی۔ حاجی برلاس کے جسم میں تھرتھری پیدا ہو

، قاسم نے چیخ کر کہا:

"حاجی برلاس۔ خبردار جسم کو ذرا بھی حرکت نہ ہو۔ ورنہ۔۔۔۔؟"

حاجی برلاس کے چار پانچ سواروں نے قاسم کی طرف قدم بڑھائے۔ قاسم نے انہیں ڈانٹ دیا:

"رک جاؤ۔ ہمارے درمیان آنے کی کوشش کی تو میری تلوار حاجی برلاس کے دل میں اتر جائے گی۔"

سواروں نے گھوڑے روک لیے۔ قاسم نے تلوار کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ حاجی برلاس کی ہلکی زرہ کی دو کڑیاں

گئیں۔ تلوار کی نوک دل کی دھڑکن کے اور قریب ہو گئی۔ ہر شخص دم بخود تھا۔

قاسم نے پوچھا:

"اب بتاؤ حاجی برلاس۔ کس کی جان کس کے نشانے پر ہے۔"

شہزوری سے ضبط نہ ہوا۔ وہ چیخ پڑی:

"خدا کے لیے قاسم۔"

"گھبراؤ مت شہزوری۔"

قاسم نے شہزوری کو روک دیا۔

"حاجی برلاس نے بہت بڑی سازش کی تھی۔ اس کا جرم ناقابلِ معافی ہے لیکن یہ تیمور کا جرم ہے اسے سزا دے گا۔"

پھر وہ حاجی برلاس سے مخاطب ہوا:

"حاجی برلاس۔ تم نے شہزوری کے صدقے یہ مجھے بخشا تھا۔ اب میں بھی شہزوری کے صدقے جان بخش رہا ہوں۔ تم نے شہزوری کو خوشی سے رخصت نہیں کیا لیکن میں اسے رخصت کرانے آؤں گا۔ میدانِ جنگ میں ہوگی۔ حاجی برلاس! میں تیمور کے پاس جا رہا ہوں۔ اگر اس نے مجھے معاف کر دیا تو تم مجھے تیمور سے پہلو بہ پہلو لڑتے ہوئے پاؤ گے۔"

قاسم نے گھوڑے کو ایڑ دی اور ہوا کی طرح ان کے درمیان سے نکل گیا۔ شہزوری چکرا کر رہ گئی۔ باہر یزید چلا گیا۔ قاسم کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو اس نے اپنے دستوں کو کوچ کا حکم دیا۔ دیر میں کافی دور نکل چکا تھا لیکن قاسم گھوڑا اڑاتا ہوا بہت جلد اس سے جا ملا۔

○

دستِ قضا

میاں بیوی میں اس وقت بڑا ہنگامہ خیز جھگڑا شروع ہوا جب حاجی برلاس نے شہزوری کی ماں سے کہا: "سنتی ہو نیک بخت۔ تم سے ایک مشورہ کرنا ہے۔"

حاجی برلاس کی بیوی خالص گھر گرہست اور قدامت پرست تاتاری عورت تھی۔ سادگی سے بولی:

"حاجی! تم مالک اور مختار ہو۔ جو چاہے کرو مجھے باہر کی دنیا سے کوئی مطلب نہیں۔"

"لیکن بات باہر کی نہیں۔ گھر کی ہے۔" حاجی نے وضاحت کی۔

بیوی نے حیرت سے شوہر کو دیکھا۔ پوچھا:

"گھر کی کون سی بات مجھ سے ڈھکی چھپی ہے۔ گھر کی بات ہے تو مجھ پر چھوڑ دو۔ میں خود ہی نپٹ لوں گی۔"

"یہ معاملہ تم اکیلے نہیں نپٹا سکتیں شہزوری کی ماں۔"

حاجی برلاس نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا:

"اسے ہم تم مل کر ہی سلجھائیں گے۔"

شہزوری کی ماں کو میاں کا سخت لہجہ ناگوار گزرا۔ وہ بھی برلاس قبیلے کے ایک بڑے سردار کی بیٹی تھی۔ تنک کر بولی:

"کان کھول کر سن لو حاجی۔ یہ گھر میرا ہے۔ یہاں میرا حکم چلے گا۔ تم اپنا زور باہر دکھایا کرو۔"

حاجی برلاس جز بز تو بہت ہوا لیکن معاملہ ایسا تھا جو بیوی کی مدد کے بغیر حل نہ ہو سکتا تھا۔ نرم پڑ گیا۔ بولا:

"تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ میں گھر کے معاملہ میں کب دخل دیتا ہوں۔ ہو گا وہی جو تم چاہو گی۔ پہلے میری بات تو سن لو۔"

"کہو"۔ شہزوری کی ماں کا منہ پھول گیا لیکن دل میں اپنی فتح پر خوش ہوئی۔

"شہزوری کا رشتہ آیا ہے"۔ حاجی نے بات چھیڑی۔

شہزوری کی ماں چونک پڑی۔ اس نے تیز نظروں سے حاجی برلاس کو یوں گھورا جیسے اسے ڈرا دی ہو لیکن بولی کچھ نہیں۔

حاجی نے جواب کا انتظار کیا۔ بیوی خاموش رہی۔ اس کا حوصلہ بڑھا۔ جھجکتے ہوئے بولا:

"امیر خطر نے اپنے بیٹے کے لیے شہزوری کا رشتہ مانگا ہے"۔

شہزوری کی ماں کی تیز نظروں میں اور سختی آ گئی۔ بولی پھر بھی نہیں۔ گھورتی رہ گئی۔

حاجی برلاس نے اگلا قدم اٹھایا۔ تفصیل بتائی:

"امیر خطر کا قاصد آیا ہوا ہے میں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی ہے"۔

شہزوری کی ماں جوالا مکھی بن کر پھٹ پڑی:

"کہاں کا رشتہ، کس کا رشتہ۔ شہزوری کی شادی تو ہو چکی ہے۔ اس کی شادی دوبارہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ مقابلہ کے لیے بالکل تیار تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید بیوی کی اس تلخ کلامی کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا لیکن یہ موقع نازک تھا۔ حاجی کو تیمور کے مقابلے کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔ پھر وہ بیوی کو ناراض کیسے کرتا؟ بیوی کے گیارہ بھائیوں کے عزیز و اقارب۔ اتنی بڑی فوجی طاقت کو وہ کیسے نظر انداز کر دیتا۔

حاجی برلاس نرم پڑ گیا۔ بولا:

"شہزوری کی ماں، تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ شادی تو تمہارے ہی ہاتھوں سے ہو گی۔ میں تو تم سے

ظاہر کر رہا تھا۔ دیکھو نا۔ تیمور ہمارا دشمن ہو رہا ہے۔ اس سے آج کل میں لڑائی تو ہونا ہی ہے۔ میں چاہتا تھا اگر امیر خطر اس بہانے ہماری مدد پر آمادہ ہو جائے تو ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے۔ شہزوری بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی اور تیمور کے مقابلے کے لیے ایک مضبوط حلیف مل جائے گا۔"

"شرم کرو شرم حاجی برلاس۔"

شہزوری کی ماں شیرنی کی طرح گرجی:

"اپنی طاقت بڑھانے کے لیے بیٹی کا نیلام کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے حاجی۔ غیر قبیلہ میں شادی کرنے کا تمہیں خیال کیسے آ گیا؟"

حاجی نے اپنے بچاؤ میں کہا:

"امیر خطر کا یسوری خاندان ہمارے قبیلہ سے کمتر تو نہیں۔ ہماری عزت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

شہزوری کی ماں بولی:

"حاجی۔ تمہارا حافظہ بھی اب بہت کمزور ہو گیا ہے۔ تین سال پہلے اسی یسوری قبیلہ کا رشتہ شہزوری کے لیے آیا تھا۔ لڑکے کی ماں میری بہن بنی ہوئی تھی۔ میں نے کتنے جتن کیے۔ کتنی خوشامد کی تھی تمہاری مگر تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تم قبیلہ کی ناک لے کر بیٹھ گئے۔ دوسرے قبیلے میں لڑکی دینے سے تمہاری اور تمہارے قبیلہ والوں کی ناک کٹ رہی تھی۔ اب تمہیں کیا ہوا۔ کہاں گئی تمہاری ناک۔ میں یہ ہرگز نہ ہونے دوں گی۔ لڑکی کا رشتہ ایک ہی بار کیا جاتا ہے۔ شہزوری جس کی ہو چکی اسی کے گھر جائے گی۔"

شہزوری کی ماں آپے سے باہر ہو گئی۔ وہ خاموش طبیعت تھی لیکن ایسے لوگوں کا غصہ بڑا قیامت کا اور خوفناک ہوتا ہے۔

حاجی برلاس نے دیکھا گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکل رہا تو خود بھی اکڑ گیا۔ اس نے دھونس دی۔

"شہزوری کی ماں! تم بھی گرہ میں باندھ لو۔ چاہے شہزوری زندگی بھر کنواری بیٹھی رہے میں اسے قاسم کے ساتھ رخصت نہیں کروں گا۔ نہ نکاح نہ رخصتی۔ شہزوری پر ابھی ہمارا زور ہے۔"

"ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی"۔

شہزوری کی ماں بھلا کب دبنے والی تھی:

"میں بھی دیکھتی ہوں شہزوری کسی اور کے گھر بیاہ کے کیسے جاتی ہے۔ غضب خدا کا رشتہ کا اعلان خود کیا

تمام قبیلہ والوں میں بات پھیل گئی۔ میں تاتاری عورتوں میں نکو نہیں بن سکتی۔ تاہم کے ساتھ نکاح نہ ہوا تو ہماری زبان نکاح سے کچھ کم ہے۔ اسی زبان کی خاطر تو تاتاری گلا کٹا دیتے ہیں۔"

حاجی برلاس پیر پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آج میں آپا جانی سے بات کروں۔ وہاں گئیں تو میں دیکھوں گا تم مجھے کیسے روکتی ہو۔"

شہزوری کی ماں نے فوراً کہہ دیا:

"ہاں ہاں کرو بات۔ میں تمہاری آپا جانی سے ڈرتی ہوں؟"

کہنے کو تو شہزوری کی ماں کہہ گئی لیکن آپا جانی کا نام سنتے ہی وہ کانپ گئی تھی۔ آپا جانی سے وہ ہی [illegible] قبیلہ برلاس کا کون بشر تھا جو نہ ڈرتا ہو۔ وہ حاجی برلاس کی پھوپھی تھی۔ عمر سو سے بھی اوپر۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ بوڑھی کھوسٹ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی مگر رعب داب کا یہ عالم کہ کوئی اس کے سامنے بات بھی نہ کر سکے۔ چونڈا سفید، بھویں سفید۔ کمر جھکی ہوئی۔ مگر بڑھیا لکڑی ٹیکتی میلوں پیدل چلی جاتی۔ اس کی آنکھوں کانوں پر تو جیسے بڑھاپا آیا ہی نہ تھا۔ آواز ایسی کراری کہ پردے کے پیچھے سے بولے تو سولہ سال کی لڑکی معلوم [illegible]

آپا جانی برلاس قبیلہ کی معمر ترین خاتون تھیں۔ اس وقت کے تمام بزرگ تاتاری سرداران کی گود میں کھیلے [illegible] حاجی برلاس کو تو آپا جانی نے بیٹے کی طرح پالا تھا۔ جس دن حاجی برلاس کی ماں اسے جنم دے کر اللہ کو پیاری ہوئی اسی دن آپا جانی بیوہ ہوئی۔ آپا جانی نے حاجی برلاس کو گود لیا تھا۔ دراصل آپا جانی کے زور پر ہی حاجی گودتا تھا۔

جب تیمور اور حاجی برلاس کا جھگڑا چلا تو قبیلہ کے سب ہی سردار تیمور کو اپنا حاکم بنانا چاہتے تھے لیکن دیوار بن کر تیمور کے سامنے آ گئی۔ اس نے اعلان کرا دیا کہ چچا کے ہوتے ہوئے بھتیجے کا سرداری پر کوئی حق نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمر رسیدہ تمام سردار حاجی برلاس کے طرف دار ہو گئے اور جوان سرداروں نے تیمور کے جھنڈے [illegible] دم لیا۔ اس کھینچا تانی میں کئی باپ بیٹے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ بھائی بھائی کا دشمن بن گیا۔

رات کو آپا جانی کے دربار میں مقدمہ پیش ہوا۔ حاجی برلاس مدعی اور اس کی بیوی مدعا علیہ تھی۔

آپا جانی کا خیمہ بڑی خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ دوہرے قالینوں کا فرش اور ریشمی پردے، گاؤ [illegible] بڑی بی کی مسند پر زرنگار جھالریں لگی تھیں۔

آپا جانی مسند کے سہارے کمر جھکائے اس طرح بیٹھی تھیں جیسے کوئی شہنشاہ بیٹھتا ہے۔ قبیلہ کی [illegible]

دو شیزائیں اس کے پیر اور شانے داب رہی تھیں۔ ان میں ایک شہزوری تھی۔

شہزوری کو پتہ چل گیا تھا کہ آج اس کا مقدمہ آپا جانی کے سامنے پیش ہوگا۔ وہ شام ہی سے آپا جانی کے خیمہ میں پہنچ گئی۔

حاجی برلاس نے تیمور کے خلاف قتل کی جو سازش کی تھی اس کی خبر آپا جانی کو نہ ہونے دی تھی۔ شہزوری نے آج پیر دبانے کے دوران بھانڈا پھوڑ دیا۔ اور بڑی بی کو الف سے ی تک ساری بات بتا دی۔

حاجی برلاس اور اس کی بیوی آپا جانی کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ قبیلہ کے کچھ اور بزرگ بھی خیمہ میں موجود تھے۔ آپا جانی کے خیمہ میں کسی کو اس وقت تک زبان کھولنے کی اجازت نہ تھی جب تک وہ خود کسی کو بولنے کا حکم نہ دے۔

آپا جانی نے حاجی برلاس اور اس کی بیوی کے ایک ساتھ اس کے پاس آنے سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے اور وہ جھگڑا اس قدر بڑھ گیا ہے کہ فیصلے کے لیے وہ اس کے پاس آئے ہیں۔

بڑی دیر خاموشی کے بعد بڑی بی بولیں:

"حاجی برلاس۔ بیوی سے نہ لڑا کرو۔ شہزوری کی ماں بڑی نیک بخت ہے۔"

حاجی برلاس گھبرا گیا۔ آپا جانی نے پہلے ہی جملہ میں شہزوری کی ماں کی طرف داری کر دی تھی۔ اس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

"آپا جانی۔ جھگڑا وگڑا کچھ نہیں۔ میں آجکل پریشان ہوں۔ تیمور نافرمانی پر کمر بستہ ہے۔ اس نے ایک بڑی فوج اکٹھا کر لی ہے۔ آپ کے حکم کے خلاف وہ میری سرداری سے اب تک انکار کر رہا ہے۔ اسے سزا دینے کے لیے میں دوسرے قبیلوں کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہوں ....."

"حاجی برلاس۔ بات مختصر کرو۔"

آپا جانی بڑے کرارے لہجے میں بولیں:

"مجھے رام کہانی سننے کی ضرورت نہیں۔"

حاجی برلاس کو پسینہ آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا:

"بات میرے گھر کی ہے اگر تنہائی میں عرض کرنے کی اجازت ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

آپا جانی نے خیمے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ وہ ایک ایک کر کے خاموشی سے

خیمہ کے باہر چلے گئے۔

شہزوری بھی باہر نکل گئی۔

"کہو۔" آپا جانی نے حاجی برلاس کو سختی سے حکم دیا۔

حاجی نے کہنا شروع کیا:

"یسوری قبیلہ کا سردار امیر خطر میرا دوست ہے۔ بہادر سواروں کا ایک مضبوط جتھا اس کے ساتھ ہے۔ امیر خطر کی فوجی طاقت تاتاری قبیلوں میں۔ ۔ ۔ ۔"

"مطلب کی بات کرو حاجی۔" آپا جانی نے اسے پھر ٹوکا۔

حاجی برلاس پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا۔ اب اور زیادہ گھبرا گیا۔ جلدی جلدی خود کو سنبھالا۔ بولا۔

"امیر خطر نے شہزوری کا رشتہ اپنے لڑکے کے لیے مانگا ہے۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟" آپا جانی نے تیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

حاجی نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"میں نے منظور کر لیا ہے آپا جانی۔"

آپا جانی نے تیزی سے پہلو بدلا اور کڑک کر بولیں:

"پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟ حاجی برلاس تم حد سے بڑھ گئے ہو۔ میں نے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا۔ تیمور کے مقابلے میں تمہاری حمایت کی۔ حالانکہ تیمور میں ایک سردار کی حیثیت سے تم سے کہیں زیادہ خوبیاں موجود ہیں لیکن تم نے میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ تم نے تیمور کو اپنی دعوت میں بلا کر قتل کرنے کی کوشش کی۔ اگر تیمور ہلاک ہو جاتا تو برلاس قبیلہ ہمیشہ کے لیے بدنام ہو جاتا۔"

حاجی برلاس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کے پاس جواب ہی کیا تھا۔ بھیگی بلی بنا بیٹھا رہا۔

آپا جانی بولتے بولتے تھک گئی تھیں۔ انہوں نے دو تین لمبی سانسیں لے کر خود کو سنبھالا۔ ایک دو بار کھانسیں۔ پہلو بدلنے میں ایک بار مسند سے لڑھک بھی گئیں مگر تعجب بڑی جی دار۔ خود ہی سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"کیا تم نے شہزوری اور قاسم کے رشتے کا اعلان نہیں کیا؟" آپا جانی نے جرح شروع کی۔

"جی ہاں اعلان کیا تھا لیکن۔ ۔ ۔ ۔"

حاجی برلاس نے وضاحت کرنا چاہی مگر آپا جانی نے ڈانٹ دیا:

"صرف اس بات کا جواب دو جو میں پوچھ رہی ہوں۔"

حاجی برلاس میں ہمت نہ تھی کہ آپا جانی کو ٹوکتا یا ان کی مخالفت کرتا۔ اس کی طاقت آپا جانی کی وجہ سے تھی۔ قبیلہ کے تمام سرداروں کو انہوں نے حاجی کا طرفدار بنایا تھا۔

"حاجی برلاس۔"

آپا جانی نے اسے مخاطب کیا۔

"رشتہ کا اعلان تم نے کیا۔ پھر غضب یہ کہ اس کی تصدیق مجھ سے کرائی۔"

"وہ میری غلطی تھی آپا جانی۔"

حاجی برلاس ہکلاتے ہوئے بولا:

"قاسم باغی ہو گیا۔ وہ قبیلہ کا دشمن ہے۔"

آپا جانی نے فوراً گرفت کی:

"قاسم دشمن تھا تو اسے بچ کے تیمور کے پاس کیوں جانے دیا۔ قتل کر دیا ہوتا۔"

"یہ بھی میری غلطی تھی آپا جانی۔" برلاس کا سر مجرم کی طرح جھک گیا۔

"اور میری غلطی یہ ہے کہ میں نے تمہیں تیمور پر فوقیت دی۔"

آپا جانی بڑے غصے سے بولیں:

"حاجی۔ یہ رشتہ اس وقت تک نہیں ٹوٹ سکتا جب تک دونوں میں سے ایک مر نہیں جاتا یا ان میں سے ایک انکار نہیں کر دیتا۔ قبیلہ کا یہی دستور ہے اور یہی رہے گا۔"

مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔

حاجی برلاس کی بیوی کو ایک لفظ بولنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اس کا مقدمہ تو خود آپا جانی لڑ رہی تھیں۔ حاجی نے شکست کے باوجود ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اسے امید کی ہلکی سی کرن دکھائی دی۔ بولا:

"آپا جانی۔ آپ نے فرمایا ہے کہ دو میں سے ایک انکار کر دے تو رشتہ ختم ہو سکتا ہے۔"

آپا جانی نے حیرت سے حاجی برلاس کو دیکھا۔ ان کے خیال میں اب اس بارے میں کسی مزید گفتگو کی ضرورت نہ تھی لیکن حاجی نے پھر بات چھیڑ دی۔ آپا جانی نے کہا:

"ہاں کہا تھا۔ اگر لڑکی یا لڑکا کسی خاص وجہ سے رشتہ سے انکار کر دیں تو یہ ممکن ہے لیکن انکار کی

کوئی دلیل اور ثبوت ہونا بھی ضروری ہے۔"

حاجی برلاس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ آپا جانی کی بات بھی پوری طرح نہ سن سکا۔ وہ اپنی ہی
میں گم تھا کہ آپا جانی خاموش بھی ہو گئیں اور اسے خبر نہ ہوئی۔

آپا جانی خود ہی بولیں:

حاجی برلاس! تم سوچ رہے ہو قاسم اس رشتہ سے انکار کر دے گا۔ یہ غلط ہے۔ قاسم کو شہزوری سے
بہتر دلہن نہیں مل سکتی۔ وہ کبھی انکار نہیں کرے گا۔"

حاجی برلاس ہوش میں آ گیا اور بولا۔

"میں قاسم پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میرا خیال۔۔۔۔"

حاجی نے چپ ہو کر کن انکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ شہزوری کی ماں اب تک خاموش تھی۔ اس نے
اب بھی خاموشی ہی اختیار کیے رکھی۔

حاجی برلاس کو جواب آپا جانی نے دیا۔

"تمہارا اشارہ شہزوری کی طرف ہے۔ اس سے بھی پوچھ دیکھو۔۔۔۔ لیکن ٹھہرو، اس سے میں خود پوچھ
گی۔ تمہارے پھسلانے اور ورغلانے سے وہ غلط فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔"

آپا جانی نے حاجی برلاس اور اس کی بیوی کو خیمہ سے باہر بھیج دیا۔ شہزوری کو بلوایا گیا۔ شہزوری ڈرتی
آئی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اس کے خیال میں فیصلہ آپا جانی کو کرنا تھا۔ اسے کیوں بلایا گیا۔ یہی سوچ سوچ کر اسے
ہول ہو رہا تھا۔

شہزوری سر جھکائے آپا جانی کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ آپا جانی نے اپنا لرزتا ہاتھ شہزوری کے سر پر
ان کے چہرے کی جھریاں سمٹتی اور پھیلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ شاید وہ مسکرا رہی تھیں۔

آپا جانی نے محبت سے پوچھا:

"شہزوری۔ تیرے باپ نے قاسم اور تیرے رشتے کا اعلان کیا۔ میں نے بھی اسے پسند کیا۔ اس
میں نے تیری مرضی معلوم نہیں کی تھی لیکن اب اس کی ضرورت آن پڑی ہے۔ نہ تو میری ناراضگی کا خیال کر اور نہ
برلاس سے خوف کھا۔ مجھے صاف صاف بتا اگر تجھے یہ رشتہ پسند نہیں تو میں اسے خود ختم کرا دوں گی۔ تیرے
اوپر کوئی انگلی نہ اٹھائے گا۔"

شہزوری کو اس بات کا تو خیال ہی نہ تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں پڑ گئی۔ قاسم سے رشتہ توڑنے کا وہ
تصور بھی نہ کر سکتی تھی لیکن باپ کی مخالفت ایک بھیانک دیو بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اگر وہ اپنی پسند
کے مطابق رشتہ برقرار رکھتی ہے تو حاجی برلاس اس کا جینا اجیرن کر دے گا اور اگر رشتہ توڑتی ہے تو
اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا محل ریزہ ریزہ ہوتا ہے۔

آپا جانی بولتے بولتے تھک گئی تھیں۔ آج انہیں بے تکان بولنا پڑا تھا۔ شہزوری سے باتیں کرتے
وقت ان پر کچھ زیادہ ہی تھکن غالب آ گئی تھی۔ انہوں نے اٹک اٹک اور ٹھہر ٹھہر کر اپنا مقصد بیان کیا تھا۔
شہزوری کو اس سے سوچنے کا موقع مل گیا۔

وہ ابھی سوچ رہی تھی۔ اپنے متعلق، قاسم کے متعلق اور حاجی برلاس کی اس ضد کے لیے۔ آخر اس
کی سوچ ایک نکتہ پر آ کر جم گئی۔

شہزوری کو یہ یقین تھا کہ آپا جانی ایک بار جس بات کا اعلان کر دیں اس کو کسی صورت میں بدل نہیں
سکتی تھیں۔ یہ ان کی آن اور انا کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ انہوں نے تیمور کے مقابلے میں حاجی برلاس کی حمایت کا
اعلان کیا۔ انہیں اس اعلان پر افسوس تھا۔ اس کا اظہار بھی وہ برملا کرتی تھیں لیکن وہ اپنی کہی ہوئی بات سے منہ
نہیں موڑتی تھیں۔ جو کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ہو گیا۔ اسی نکتہ میں شہزوری کو اپنی کامیابی دکھائی دی۔

شہزوری نے ادب سے کہا:

"آپا جانی۔ شادی بیاہ کے معاملات میں تاتاری لڑکیاں اپنے بزرگوں کے فیصلے کو تسلیم کرتی ہیں۔ قاسم
کے لیے میرے باپ نے اعلان کر دیا۔ آپ نے اس کی منظوری دیدی۔ یہ اعلان اور منظوری میرے لیے آسمانی حکم
کا درجہ رکھتا ہے۔ میں باپ کی مخالفت اور آپ کے حکم سے سرتابی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ہاں اگر آپ اور
میرے ابا جان کسی مصلحت کی بنا پر یہ چاہتے ہیں کہ میں اس رشتہ سے انکار کر دوں تو بھی مجھے آپ لوگوں کے
حکم سے انکار نہ ہو گا۔ میں اسے بھی چپ چاپ تسلیم کر کے انکار کر دوں گی لیکن میرا یہ انکار زبان سے نہیں خنجر
سے ہو گا۔ میں اپنا خنجر اپنے دل میں اتار کر ہمیشہ کے لیے اپنی زبان بند کر لوں گی تاکہ نہ میں اپنی ہمجولیوں میں شرمندہ
ہوں اور نہ دوسرے تاتاری قبائل ہمارے برلاس قبیلہ کو یہ طعنہ دے سکیں کہ برلاس زبان کے جھوٹے اور
قول کے پھر جانے والے ہیں۔"

شہزوری کی باتوں کا ایک ایک لفظ تیر بن کر آپا جانی کے دل میں اتر گیا انہیں شہزوری کا دل دکھانے کا

بڑا غم ہوا۔

انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شہزوری کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں:

"شہزوری۔ مجھے معاف کر دے۔ میں نے ناحق تیرا دل دکھایا۔ مجھے کیا معلوم تھا برلاس میں ایسی لڑکیاں بھی موجود ہیں جو بزرگوں کی بات پہ اپنی جان تک گنوا سکتی ہیں۔ . . . . تو اطمینان رکھ۔ قاسم کے سوا کوئی تیرا دولہا نہیں بن سکتا۔"

شہزوری کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو جگمگا اٹھے۔

آپا جانی نے حاجی برلاس کو بلا کر اپنا آخری فیصلہ سنا دیا:

"حاجی۔ تیری بیٹی کا حقدار قاسم ہے۔ تجھے یہ رشتہ توڑنا ہے تو جا کر میدان جنگ میں قاسم کو قتل کر دے۔"

حاجی برلاس کو یہی خدشہ تھا۔ اگر اسے شہزوری کو سمجھانے کا موقع مل جاتا تو شاید وہ مان جاتی لیکن آپا جانی نے اسے یہ موقع ہی نہ دیا۔ حاجی شکست خوردہ سپاہی کی طرح منہ لٹکائے خیمہ سے نکلنے لگا تو اس کے کانوں میں آپا جانی کی آواز آئی۔

"بدبخت اور بے غیرت ہے وہ باپ جو اپنی سرداری کے لیے بیٹی کا سودا کرے۔"

حاجی برلاس خون کے گھونٹ پیتا ہوا خیمہ سے باہر نکل گیا۔

○

بایزید جلائر جس وقت قاسم اور اپنے پانچسو سواروں کے ساتھ شہر سبز کی سرحد پر پہنچا تو اس نے تیمور کے سرحدی دستوں کو مقابلہ کے لیے تیار پایا۔ تیمور کے سواروں نے ترکش سے تیر نکالے اور کمانیں سیدھی کر لیں۔ قاسم نے فوراً سفید کپڑا تلوار پہ باندھ کر فضا میں بلند کر دیا۔ بایزید نے بھی یہی عمل کیا۔ تیمور کے سواروں کی کمانیں نیچی ہو گئیں۔ تیر، ترکش میں واپس چلے گئے۔

بایزید جلائر نے اپنے سواروں کو وہیں چھوڑا اور قاسم کے ساتھ سرحد پر پہنچا۔ قاسم کو تیمور کے سوار جانتے تھے۔ قاسم اور بایزید نے اپنی تلواریں محافظوں کے حوالے کر دیں اور تیمور سے ملنے کی خواہش کی۔ محافظ انہیں

اپنی حفاظت میں لے کر قصرِ سفید کی طرف چلے۔ قصرِ سفید کے ایک حصہ میں تیمور نے اپنی رہائش کے لیے ایک خوبصورت حویلی تعمیر کرائی تھی۔

تیمور اپنی حویلی میں بیٹھا سرداروں سے صلاح و مشورہ میں مصروف تھا۔ اسی وقت اسے اطلاع دی گئی کہ قاسم اور خجند کا سردار بایزید جلائر ملاقات کے لیے آئے ہیں۔

تیمور ایک فریب کھا چکا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ قاسم کا آنا تو اس کی سمجھ میں آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قاسم ایک بھولا بھالا جوان ہے۔ اس کا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے دھوکے سے بلانے کو بھیجا گیا تھا لیکن بایزید جلائر کا آنا اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ تیمور کو یقین تھا کہ بایزید جلائر اس سازش میں برابر کا شریک ہے۔ پھر وہ شہر سبز کیوں آیا۔ اس کے ارادے کیا ہیں؟

انسان میں مہمان نوازی کا جذبہ ہو تو وہ دروازے پر آئے ہوئے دشمن کو بھی خوش آمدید کہنے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ تیمور بڑا مہمان نواز تھا۔ اس کے دل نے گوارا نہ کیا کہ بایزید جلائر سے ملنے سے انکار کر دے۔ تیمور نے اطلاع دینے والے کو حکم دیا کہ مہمانوں کو عزت سے اندر لایا جائے۔

بایزید جلائر اور قاسم لائے گئے۔ دونوں کی نظریں ندامت سے جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے جسم پر کوئی اسلحہ نہ تھا۔ تیمور نے ان کے چہروں سے دلوں کی کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پھر مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

"معزز سردار۔ نظریں اٹھائیے"۔ تیمور نے بایزید کو مخاطب کیا۔

بایزید جلائر نے سر اوپر اٹھایا اور تیمور سے نظریں ملائیں۔ تیمور نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ بایزید بھی ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ دونوں گلے مل گئے۔

قاسم اب تک سر جھکائے کھڑا تھا۔ تیمور بولا:

"قاسم۔ تم قابلِ رحم ہو۔ میں بغیر کچھ پوچھے تمہیں معاف کرتا ہوں"۔

قاسم نے حیران حیران نظروں سے تیمور کو دیکھا۔ تیمور اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"سردار تیمور۔ آپ کتنے عظیم ہیں"۔ قاسم کے جسم میں مسرت کی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔

تیمور نے اسے کوئی جواب نہ دیا صرف ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ قاسم ساتھ ہو لیا۔ تیمور بایزید جلائر کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنی مسند کے پاس پہنچا اور اسے اپنے برابر بٹھا لیا۔ قاسم اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ تیمور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا:

"اے حاکمِ خجند۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ بھی اس سازش میں شریک تھے۔"

بایزید جلائر کی آنکھیں شرم سے اوپر نہ اٹھتی تھیں۔ وہ بڑے کرب سے بولا:

"سردار تیمور۔ یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے کہ تم اپنے دشمن کی غلطی پر پردہ ڈال رہے ہو۔ تاتاریوں میں کبھی نہیں ہوا کہ کسی کو مہمان بنا کر قتل کیا جائے۔ میں حاجی برلاس کی نفرت انگیز سازش میں برابر کا شریک ہوں۔ میرا ضمیر مجھے کچوکے دے رہا ہے۔ میں اقبالِ جرم کر کے سزا کا منتظر ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی ہے۔"

تیمور نے بایزید کے کاندھے پر ہاتھ رکھا:

"معزز سردار۔ اعترافِ گناہ کے بعد آدھا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو معاف کرتا ہوں۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ کی افسردگی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

بایزید جلائر جذبات سے بے قابو ہو گیا۔ وہ دوبارہ تیمور کے گلے لگ کر بولا:

"قاسم نے سچ کہا۔ تم بہت عظیم ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہارے اور حاجی کے جھگڑے میں آئندہ نہیں پڑوں گا۔ میں نے تمہارے جھگڑے میں پڑ کر سخت غلطی کی۔ مجھے ذلت اٹھانا پڑی۔"

"ایسی باتیں نہ کیجیے سردار!" تیمور نے اسے تسلی دی۔

بایزید جلائر، تیمور سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ تیمور کو اس کی بزرگی کا احترام تھا۔ وہ بڑی تہذیب سے گفتگو کر رہا تھا۔ تیمور نے غلام کو مشروب لانے کا حکم دیا۔

تیمور نے پوچھا:

"سردار۔ آپ کے سوار کہاں ہیں؟"

بایزید جلائر کی ندامت اور شرمندگی تیمور کے حسنِ سلوک کی وجہ سے دور ہو گئی۔ اس نے کہا:

"جرم میں نے کیا تھا۔ میں اکیلا ہی معافی مانگنے تمہارے پاس چلا آیا۔ میرے سوار شہر سبز کے باہر موجود ہیں۔ میں ان سے کہہ آیا ہوں کہ میرے مرنے کی خبر ملے تو خوشی خوشی خجند واپس چلے جائیں اور وہاں اعلان کر دیں کہ بایزید نے جو گناہ کیا تھا اس کی اسے سزا مل گئی۔"

تیمور بہت متاثر ہوا۔ اس نے حکم دیا:

"بایزید جلائر کے سواروں کو شہر میں بلا یا جائے۔ وہ ہمارے مہمان ہیں۔"

بایزید جلائر کو بڑی عزت سے حویلی میں ٹھہرایا گیا۔ شام کو شاندار ضیافت ہوئی۔ تاتاریوں کا خاص کھانا گھوڑوں کے پٹھوں کے کباب اور شہد چپڑی جو کی روٹی تھی۔ اسی سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔

قصرِ سفید کی اس حویلی میں رات بھر جشن جیسا سماں رہا۔ صبح دم تیمور نے بایزید جلائر کو رخصت کیا۔ دونوں کے دل صاف ہو گئے۔ آئندہ کے لیے تعاون کے عہد و پیمان ہوئے۔ بایزید نے وعدہ کیا کہ وہ نہ تو خود تیمور کے اور حاجی برلاس کے جھگڑے میں دخل دے گا اور نہ دوسرے تاتاری سرداروں کو اس میں فریق بننے دے گا۔

حاکمِ خجند کے جانے کے بعد تیمور نے قاسم کی خوب خبر لی لیکن ہنس ہنس کر۔ اسے قاسم کی سادہ لوحی پر ہنسی آتی تھی۔ تیمور نے کہا:

"قاسم! محبت نے تمہاری عقل پر پردہ ڈال دیا ہے۔ تمہیں دوست دشمن کی بھی تمیز نہیں رہی۔"

قاسم نے آہ بھری۔ بولا:

"سردار۔ میری محبت کا تو جنازہ نکل گیا ہے۔ حاجی نے شہزوری کو رخصت کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے:"

"پھر صبر کرو۔ کوئی اور شہزوری ڈھونڈ لو۔" تیمور نے ہنس کر کہا۔

تیمور کے متعلق مورخوں کا بیان ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی کسی مسخرے کی بات پر نہیں ہنسا اور نہ کبھی لطیفے پر مسکرایا۔ قاسم شاید وہ پہلا شخص تھا جسے تیمور چھیڑتا تھا۔ دراصل اسے قاسم سے محبت تھی۔ اس کی محبت کی وجہ ایک تو قاسم کی سادہ لوحی اور دوسرے اس کی شجاعت تھی۔ قاسم میدانِ جنگ میں صرف جوش سے کام لیتا تھا۔ عقل کو وہ بالائے طاق رکھ دیتا تھا۔ تیمور کو اس کی یہ ادا بھی پسند تھی۔

قاسم نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ بولا:

"شہزوری کو تو خیر میں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے اعلان کر دیا ہے کہ شہزوری کو میدانِ جنگ میں لڑ کر حاصل کروں گا۔"

"یہ اعلان کس کے سامنے کیا تھا قاسم؟" تیمور نے دلچسپی سے پوچھا۔

"حاجی برلاس اور اس کے لشکریوں کے سامنے۔" قاسم نے سینہ تان کر جواب دیا۔

تیمور سنجیدہ ہو گیا۔ بولا:

"قاسم ۔ خدا پر بھروسہ رکھو ۔ دل سے نکلی ہوئی بات خدا ضرور پوری کرتا ہے ۔ میدانِ جنگ ... وقت بھی لڑائی چھڑ سکتی ہے ۔ لیکن ایک بات کا خطرہ ضرور ہے"۔

"کس بات کا خطرہ ؟" قاسم پریشان ہو گیا۔

"یہی کہ اگر حاجی نے شہزوری کی کہیں اور شادی کر دی تو تم کیا کرو گے ؟" تیمور نے پوچھا۔

"یہ ہرگز نہیں ہو سکتا سردار ....."

"کیوں ۔ کوئی خاص وجہ ؟"

"آپا جانی میری طرف ہیں"۔

قاسم نے بتانا شروع کیا :

"انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ شہزوری تیری ہے ۔ تجھی کو ملے گی"۔

آپا جانی کے نام پر تیمور کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہو گئے ۔ بے دلی سے بولا :

"قاسم ۔ آپا جانی کی میں بھی بہت عزت کرتا تھا لیکن انہوں نے میرے ساتھ ناانصافی کی"۔

"آپ ٹھیک فرما رہے ہیں سردار"۔

قاسم کو آپا جانی کا ذکر چھیڑ کر افسوس ہوا ۔ اس نے وضاحت کی :

"آپا جانی نے آپ کے ساتھ ناانصافی کی ہے اس کا احساس انہیں خود بھی ہے ۔ وہ اعلانیہ ... کہ انہوں نے تیمور کا حق مار کر حاجی برلاس کو دیا ہے"۔

"اس سے کیا فائدہ ؟"

تیمور چڑ سا گیا ۔ بولا :

"آپا جانی، حاجی کی طرف داری سے ہاتھ کیوں نہیں اٹھا لیتیں"۔

"یہی تو ان میں سب سے بڑا عیب ہے"۔

قاسم نے یوں کہا جیسے اسے خود بھی آپا جانی پر غصہ ہو :

"ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات پتھر کی لکیر بن جاتی ہے ۔ وہ کہتی ہیں جس کی میں نے حمایت کی ... ہاتھ نہیں اٹھاؤں گی"۔

تیمور کو جوش آ گیا ۔ اس نے کہا :

"قاسم ۔ میں اس پتھر ہی کو توڑ کر چکنا چور کر دوں گا جس پر آپا جانی کی باتوں کی لکیر بن پڑتی ہیں"۔ تیمور نے ... غصے سے اپنی دونوں مٹھیاں بند کر لیں ۔

ⵔ

قاسم کے آنے سے شہر کی دوشیزاؤں میں کھلبلی مچ گئی تھی ۔ شہزوری اور قاسم کی داستانِ محبت شہرِ سبز کی حسیناؤں کا موضوع بن گیا ۔ انہیں معلوم تھا کہ تیمور اور حاجی برلاس کے جھگڑے نے دو محبت بھرے دلوں کو جدا کر دیا ہے ۔ ایک شہرِ سبز میں اور دوسرا خیمہ گاہ میں آتشِ فراق میں جل رہا ہے ۔ کنواری لڑکیوں میں تجسس کا مادہ یوں بھی زیادہ ہوتا ہے ۔ ہر لڑکی اس فکر میں رہتی تھی کہ قاسم سے ملے اور دیکھے کہ ایک عاشق اپنے محبوب سے جدا ہونے کے بعد اپنے دن رات کیسے بسر کرتا ہے ۔ اس کا دن کن مشاغل میں گزرتا ہے اور رات کا کرب ناک سناٹا اس پر کیا قیامت ڈھاتا ہے ؟

قاسم، تیمور کی حویلی کے باہر قصرِ سفید کے ایک شکستہ کمرے میں مقیم تھا ۔ قصرِ سفید ایرانیوں کا ایک مشہور محل تھا اور امتدادِ زمانہ سے بہت شکستہ ہو گیا تھا ۔ پھر بھی اس کے وسیع و عریض کمروں اور راہداریوں سے ایرانی شہنشاہوں کا شکوہ ٹپکتا تھا ۔

تیمور کی حویلی میں جانے والی خواتین اس کمرے کے سامنے سے گزرتی تھیں ۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی دوشیزہ بھول کر سے یا جان بوجھ کر قاسم کے کمرے میں داخل ہو جاتی اور پھر معذرت کر کے واپس چلی جاتی ۔ قاسم پہلے تو اسے محض ایک اتفاق ہی سمجھتا رہا ۔ پھر اسے احساس ہوا کہ یہ اتفاق نہیں ہے ۔ لڑکیاں قصداً اس کے کمرے میں آتی ہیں ۔ اس نے بعض لڑکیوں کے لبوں پر ابھرتے ہوئے سوال بھی دیکھے تھے جیسے وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھیں ۔ ایک لڑکی تو دن میں ایک بار ضرور اس کے کمرے میں داخل ہوتی ۔ کچھ دیر اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہتی اور پھر بغیر معذرت کیے واپس چلی جاتی ۔

ان لڑکیوں کے اس طرح آنے جانے اور اس کے آرام میں خلل انداز ہونے کا وہ بُرا تو نہ مناتا لیکن انہیں دیکھ کر اسے فوراً اپنی شہزوری یاد آ جاتی اور اسے اپنی محرومی کا بری طرح احساس ہوتا ۔

قاسم کو شہرِ سبز میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا ۔ اسے شہزوری کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوتا تھا ۔

اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے قاسم کا دل ہر وقت بے چین رہتا۔ حاجی برلاس کے
آدمی تیمور کے پاس آتے تھے لیکن قاسم نے ان سے کوئی گفتگو نہ کی۔ وہ ان سے گفتگو کرتا
کے بارے میں تو وہ ان سے پوچھ نہ سکتا تھا۔

قاسم کا دل ایک دن بہت بے چین ہوا۔ اس نے اپنی خدمت پہ مامور ملازم سے پوچھا:

"تمہارا کوئی عزیز حاجی برلاس کی خیمہ گاہ میں بھی رہتا ہے؟"

"کیوں نہیں صاحب۔"

ملازم نے خوش اخلاقی سے جواب دیا:

"میرا سگا بھائی حاجی برلاس کے باورچی خانے میں کام کرتا ہے۔"

قاسم نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن بات زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ اسے اپنی عزت کا
تھا۔ اپنی عزت سے زیادہ اسے شہرزوری کا خیال تھا۔

ملازم نے قاسم کو خاموش دیکھ کر کہا:

"صاحب جی۔ کسی کو پیغام بھیجنا ہو تو مجھے بتا دیجیے۔ ہمارے آنے جانے پر کوئی پابندی

"پیغام تو ضرور بھیجنا ہے لیکن . . . ." قاسم کہتے کہتے رک گیا۔

ملازم جلدی سے بولا:

"صاحب۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ کا پیغام لے کر میں خود جاؤں گا اور جواب بھی لاؤں گا
خدمت کا موقع دیں۔"

قاسم نے افسردگی سے کہا:

"تمہارا شکریہ۔ میں جسے پیغام بھیجنا چاہتا ہوں وہاں تک تم پہنچ نہیں سکتے۔"

قاسم ملازم کو کوئی تفصیل نہ بتا سکا۔ پھر دروازہ پہ آہٹ سی ہوئی۔ وہ بولا:

"دیکھنا دروازے پر کون ہے؟"

ملازم دروازے تک گیا۔ واپس آ کر منہ بناتے ہوئے کہا:

"ان لڑکیوں کو اتنی بڑی حویلی نہیں دکھائی دیتی۔ روز ایک نہ ایک آپ کے کمرے میں گھس
اس وقت بھی کوئی لڑکی بھولے سے ادھر آ گئی تھی۔"

قاسم بہت افسردہ تھا لیکن اسے ملازم کے بھولے پن پر ہنسی آ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ ملازم کو بتائے
لڑکیاں بھول کر نہیں قصداً ادھر آتی ہیں۔

قاسم بڑا خوبصورت جوان تھا۔ اسے اپنی وجاہت کا خود بھی اندازہ تھا۔ ملازم اسے ذرا دیر گھورتا
کمرے سے نکل گیا۔

قاسم آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور تصور میں شہرزوری سے باتیں کرنے لگا۔ قاسم کا تصور جلد ہی
گیا۔ دروازہ کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ قاسم نے آنکھیں کھول دیں۔ ملازم جا چکا تھا۔
اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک لڑکی لجاتی مگر احتیاط سے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ قاسم
نیم وا تھیں۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

لڑکی گھبرا گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت اور تجسس سے دیکھا۔ لڑکی بڑی جرأت مند تھی۔
بولی:

"قاسم! مجھ پہ اعتبار کر سکو تو میں تمہارا پیغام شہرزوری تک لے جا سکتی ہوں۔"

قاسم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں:

کون ہے یہ؟

شہرزوری کو کیسے جانتی ہے؟

پیغام کیوں لے جائے گی؟

بہت سے سوالات کا قاسم کے دماغ میں ایک دم ہجوم ہو گیا۔

"تم کون ہو؟" قاسم نے ہمت کر کے پوچھا۔

"میں اسی شہر میں رہتی ہوں۔ سردار تیمور کی ادنیٰ کنیز ہوں۔" لڑکی نے اتنی تیزی سے جواب دیا جیسے
یہ جواب رٹ رکھا تھا۔

قاسم کی دلچسپی بڑھی۔ پوچھا:

"کیا نام ہے؟"

"مہرو شیبا!" لڑکی بے جھجک بولی۔

"شہرزوری کو کیسے جانتی ہو۔ کبھی دیکھا ہے اسے؟" قاسم نے سوال کیا۔

پرونشیا مسکرائی۔ جواب دیا:

"حاجی برلاس کی بیٹی کو کون نہیں جانتا۔ آجکل تمہارے اور شہزوری کے قصے ہر لڑکی کی زبان پر ہیں۔ وہ تمہاری منگیتر ہے نا؟"

قاسم کی حیرت میں اضافہ ہوگیا۔ پروشیا کو ہر بات کی خبر تھی۔ قاسم نے کریدا:

"تمہارا لباس اور گفتگو کنیزوں جیسی نہیں۔ پھر تم خود کو کنیز کیوں کہتی ہو؟"

پروشیا کے چہرے پر جوانی اور حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ وہ بڑے دلفریب انداز میں مسکرا دی۔ دلفریب انداز کہ اگر قاسم نے شہزوری کو نہ دیکھا ہوتا تو اس مسکراہٹ پر بھی لوٹ ہو جاتا۔ پروشیا میں بلا کی محبوبیت تھی۔ لانبا گھر سڈول سراپا، گہری چمکتی آنکھیں، جوانی کی ابھری ہوئی... پروشیا اگرچہ حسن کی مکمل پیکر نہ تھی تب بھی اس میں اتنی جاذبیت ضرور موجود تھی کہ وہ اپنے مخاطب کو سحر زدہ کر دے۔

پروشیا سحر انگیز لہجہ میں بولی:

"قاسم۔ عقلمند آدمی آم کھاتے ہیں۔ پیڑ نہیں گنا کرتے۔ اگر شہزوری کو پیغام بھیجنا چاہتے ہوں۔ مجھے فخر ہوگا کہ میں آپ کے کسی کام آسکی"۔

قاسم ذرا دیر کے لیے تو پروشیا کے سحر سے واقعی متاثر ہوگیا۔ پروشیا کی شخصیت ...

قاسم نے ایک اور سوال کیا:

"ٹھیک ہے۔ میں نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ تم مجھ سے کیا ... کرنا چاہتی ہو جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ میں شہزوری کے سوا۔۔۔۔"

"قاسم!"

پروشیا سخت لہجہ میں بولی:

"آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ میں کیا، سب ہی جانتے ہیں آپ شہزوری کے ہیں۔ آپ کی شادی اسی کے ساتھ ہوگی۔ پھر آپ مجھ پر شبہ کیوں کر رہے ہیں"۔

قاسم گھبرا گیا۔ شرمندہ ہوگیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا:

"پروشیا۔ مجھے معاف کرنا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ تم جو احسان کر رہی ہو تو کیا اس کے بدلہ میں، میں تمہاری کوئی خدمت کر سکوں گا"۔

پروشیا کا موڈ ٹھیک ہوگیا۔ بولی:

"میں نہ احسان کر رہی ہوں نہ اس کا معاوضہ چاہتی ہوں۔ بعض کام بغیر معاوضے کے بھی کیے جاتے ہیں۔ کوئی کام خود کرنے کو دل چاہے تو اسے احسان کیسے کہہ سکتے ہیں۔ بس یہ بھی ایک ویسا ہی کام ہوگا"۔

...نے قاسم کو بری طرح زچ کر دیا۔

قاسم بے بسی سے بولا:

"پروشیا تم اس قدر عقلمند ہو کہ میرے پاس تمہاری باتوں کا کوئی جواب نہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تمہیں کسی قدردان گھر میں پہنچائے"۔

پروشیا کی شوخی، سنجیدگی میں بدل گئی۔ اس کی آنکھیں چھلک آئیں لیکن اس نے کمال ضبط سے کام لیا۔ پھر بولی:

"آپ میری فکر نہ کریں۔ گھر کوئی برا نہیں ہوتا۔ یہ تو رہنے والے پر منحصر ہے چاہے جنّت بنائے یا جہنّم"۔

پروشیا نے اپنے دل سے اٹھتی ہوئی ہوک کو بڑے بوڑھوں کی عام گفتگو میں ڈھال دیا۔

قاسم کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ بات کس طرح آگے بڑھائے۔ شہزوری کا خیال اس پر یوں مسلّط رہتا تھا اور اب بھی اسی کا ہو رہا تھا اور ایک بے غرض ہستی اس کی مدد پر آمادہ تھی۔

پروشیا خود ہی بولی:

"میرا زیادہ ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ اگر مجھ پر اعتبار کر سکتے ہو تو شہزوری کو پیغام دو۔ میں رازداری کی قسم کھاتی ہوں"۔

قاسم نے اٹکتے ہوئے کہا:

"تم جانتی ہو پروشیا۔ مجھے ایک ہفتہ سے زیادہ ہوگیا شہزوری کی کوئی خبر نہیں ملی۔ میں جس حال میں اسے چھوڑ کر چلا تھا ممکن ہے حاجی برلاس نے اس پر سختی کی ہو۔ یہی باتیں معلوم کرنا تھیں۔ میں جس حال میں ہوں تم دیکھ رہی ہو۔ میں نے شہزوری کو حاصل کرنے کا مردوں کی طرح اعلان کیا ہے۔ زندگی ہے تو اسے ضرور حاصل کر کے رہوں گا۔ میری زندگی صرف اس کے لیے ہے۔ میرا دل اسی کے گیت گاتا ہے"۔

قاسم ایک بار شروع ہوا تو پھر اس نے داستانِ محبت کے دفتر کھول دیے۔ دل میں لگی ہوئی آگ کو

الفاظ کا روپ دینے لگا۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ یہ باتیں ایک حسین دوشیزہ کے سامنے کہہ رہا ہے
حسینہ کے سامنے جو نہ معلوم کب سے اس کی خاموش پرستش کر رہی ہے۔

قاسم جب پہلے یہاں آیا تھا تو اس وقت بھی پروشیا اس کے گرد پروانے کی طرح منڈلاتی رہی
لیکن نہ اس نے کبھی قاسم سے اپنے دل کی بات کی اور نہ قاسم کو اس کا احساس ہی ہونے دیا۔ اس کی
محبت آہستہ آہستہ پروان چڑھنے لگی۔

پروشیا کو معلوم تھا کہ قاسم اور شہزوری ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی منگنی ہو
قاسم صرف شہزوری کا ہے۔ اس کے باوجود وہ قاسم سے محبت کرتی تھی۔ بے لوث اور بے غرض محبت
محبت آج اسے قاسم کے کمرے تک کھینچ لائی تھی۔

پروشیا نے قاسم کی تمام باتیں بڑے صبر و تحمل سے سنیں۔ قاسم اپنی رَو میں کتنی ہی بے
کہہ گیا تھا اور ایسی باتیں بھی اس کی زبان سے نکل گئی تھیں کہ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ پروشیا
طرف مائل ہے تو ہرگز نہ کہتا۔

قاسم نے داستان محبت ختم کی تو پروشیا بولی:

"پیغام دو باتوں پر مشتمل ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ تمہارے آنے کے بعد شہزوری پر کیا گزری،
یہ کہ تم شہزوری کو یقین دلانا چاہتے ہو کہ تمہارے دل میں صرف اسی کی محبت ہے۔"

قاسم پروشیا کی بے باکی پر ششدر رہ گیا۔ اس نے بے خودی کے عالم میں بھی احتیاط کا
چھوڑا تھا لیکن پروشیا نے بڑی بے باکی اور صفائی سے اس کی تمام بڑ کو دو جملوں میں بیان کر دیا۔

قاسم نے کہا:

"بالکل ٹھیک ہے پروشیا۔ میرا یہی پیغام ہے۔"

"قاسم!"

پروشیا نے اسے مخاطب کیا:

"خیمہ گاہ سے بچ کے نکل آنے کے بعد شہزوری کی ماں اور حاجی برلاس میں بڑی زبردست
حاجی برلاس کو اس وقت فوجی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ اس نے یسوری قبیلے کی مدد حاصل کرنے
کے بیٹے سے شہزوری کا رشتہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن شہزوری کی ماں نے صاف انکار کر دیا

مقدمہ آپا جانی کے حضور پیش ہوا۔ آپا جانی نے پورا مقدمہ سنا۔ پھر شہزوری کو بلا کر اس سے تنہائی میں گفتگو
ی اور فیصلہ تمہارے حق میں کر دیا۔"

قاسم پھٹی پھٹی نظروں سے پروشیا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ قاسم کو حیرانی ہوئی کہ اگر
روشیا کی باتیں صحیح ہیں تو اسے ان باتوں کا علم کیسے ہوا۔ وہ تو اپنے آپ کو شہر سبز کی رہنے والی بتاتی ہے
مر یہ باتیں برلاس خاندان کی عزت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی خبر پروشیا کو کیسے ہوئی؟

قاسم نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا:

"پروشیا۔ تم نے جو باتیں بتائیں وہ یقیناً درست ہوں گی لیکن خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟
ہیں میرے اور شہزوری کے معاملات سے اس قدر دلچسپی کیوں ہے؟"

پروشیا نے ہنسی کے پھول بکھیرتے ہوئے کہا:

"اس کا جواب بھی وہی ہے۔ آم کھاؤ پیڑ مت گنو۔ اگر مجھ پر اعتبار نہیں تو میں جاتی ہوں۔" پروشیا
نے کے لیے تیار ہو گئی۔

"ٹھہرو پروشیا۔"

قاسم نے اسے روکا:

"مجھے تم سے بہتر پیغامبر نہیں مل سکتا۔ تم میرے اور شہزوری کے حالات سے پوری طرح واقف ہو
خود بھی شہزوری سے وہ کچھ نہ کہہ سکوں گا جو تم بیان کرو گی۔ پروشیا! ایک بات کا ضرور خیال رکھنا
زوری سے ملاقات میں کوئی دقت ہو تو خود کو خطرہ میں ہرگز نہ ڈالنا۔"

"بے فکر رہو قاسم۔ اتنی سمجھ مجھ میں ہے۔"

پروشیا ایک بھرپور نظر قاسم پر ڈالتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"اب کب ملاقات ہو گی پروشیا؟"

قاسم کہتے کہتے رکا۔ اسے خیال ہوا کہ شاید اس نے غلط جملہ استعمال کیا ہے:

"میرا مطلب ہے تم کب جا رہی ہو اور کب تک واپسی ہو گی؟"

پروشیا کو قاسم کی بوکھلاہٹ کا احساس تو ضرور ہوا لیکن اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ دروازہ کے پاس
ہ کر بولی: "کچھ عورتیں آج خیمہ گاہ جا رہی ہیں۔ میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اور انشاء اللہ واپسی پر

جلد ملاقات ہو گی۔"

پروشیا برلاس قبیلہ ہی کی دوشیزہ تھی۔ اس کا قیام بھی قصرِ سفید کے اندر تھا۔ برلاس تو
برلاس اور تیمور کے اختلاف کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ جو لوگ تیمور کے طرف دا
شہرِ سبز سے باہر رہتے تھے وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شہرِ سبز میں آ گئے تھے۔ ان سب کی
بار تیمور پر تھا۔

پروشیا کی قاسم اور تیمور سے دور کی عزیز داری تھی۔ یہی عزیز داری اس کی حاجی برلاس سے
بڑی سمجھدار تھی۔ تاتاری دوشیزاؤں کی طرح اس نے بھی تیر اندازی اور شمشیر زنی میں مہارت حاصل کی
ابھی تک اسے ان فنون کے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملا تھا۔

خیمہ گاہ میں صرف شہزوری کے خیمہ پر پہرہ تھا۔ حاجی برلاس کو قاسم کی طرف سے خطرہ تھا۔ قا
جوان تھا۔ جب اسے غصہ آتا تو پچاس پچاس جوانوں کے مقابلے پر اکیلا نکل کھڑا ہوتا۔ دو چار جوان تو ا
مقابل آنے سے کتراتے تھے۔ حاجی برلاس نے اسی خطرہ کے پیش نظر شہزوری کے خیمے کے گرد م
تھا۔ پہرہ صرف قاسم کے لیے تھا ورنہ شہزوری خیمہ گاہ میں ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ میں آزادی
عورتیں اس سے ملنے جلنے بھی آیا کرتی تھیں۔

پروشیا کو شہزوری سے ملنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ وہ شہزوری کے خیمے میں داخل ہ
سر جھکائے کسی خیال میں غرق تھی۔

پروشیا، شہزوری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی:

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس بے وقت آئی ہوں۔"

شہزوری کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک اجنبی لڑکی کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ کچھ پر

پروشیا، شہزوری کے قریب پہنچ کر بولی:

"مجھے اس بات کا اور زیادہ افسوس ہے کہ میرے آنے سے آپ کے سنہرے خواب کا تانا بانا

شہزوری نے اخلاق کا مظاہرہ کیا:

"تشریف رکھیے۔ آپ کے آنے کی مجھے خوشی ہوئی۔ ہم اس سے پہلے شاید نہیں ملے لیکن آپ کی بے تکلفی
م دونوں کو جلد ہی قریب لا سکتی ہے۔"

پروشیا بیٹھ گئی۔ اسی شوخی سے بولی:

"اس وقت تو میں بہت دور سے آ رہی ہوں لیکن میں جہاں سے آ رہی ہوں وہ مقام آپ کے تصور سے
یادہ دور نہیں۔"

شہزوری کو یہ لڑکی بہت اچھی لگی لیکن وہ پروشیا کے لطیف اشارے کو نہ سمجھ سکی۔ بولی:

"اپنا نام بتائیے اور یہ بھی بتائیے کہ آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

پروشیا نے ادھر اُدھر دیکھا۔ خیمہ بالکل خالی تھا پھر بھی آہستہ سے بولی:

"اچھا ہوا آپ نے نام اور مقام ہی پوچھا۔ اگر آپ اس کے ساتھ کام بھی پوچھ بیٹھتیں تو ضرور پریشانی
رجاتی۔"

"آپ کی باتیں بہت دلچسپ ہیں۔" شہزوری کو کوئی جواب نہ سُوجھا تو بس یونہی کہہ بیٹھی۔

"میرا نام پروشیا ہے۔"

اس نے بتایا:

"اس وقت اس مقام سے آ رہی ہوں جس کا خواب آپ کھلی آنکھوں سے میرے آنے سے پہلے دیکھ رہی
تھیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!" شہزوری نے حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ شہزوری ہیں نا؟" پروشیا نے ہنس کر پوچھا۔

"اس میں کیا شک ہے؟"

شہزوری نے اقرار کیا: "حاجی برلاس میرے والد ہیں۔"

پروشیا نے کہا:

"شہزوری۔ آپ نہ حیران ہوں نہ پریشان۔ میں اسی شہرِ سبز اور قصرِ سفید سے آ رہی ہوں جس کا تصور آپ
یہاں آنے کے وقت اپنی آنکھوں میں لیے بیٹھی تھیں۔ قصرِ سفید میں بھی آپ جیسی ایک بے چین روح ہے جو دن کو

خواب دیکھتی ہے اور رات کو تارے گنتی ہے۔ اس کا ایک اہم پیغام میرے پاس ہے جو آپ کے لیے ہے۔ آپ سننا گوارا کریں۔"

پروشیا نے ایک ہی دفعہ پوری داستان بیان کر دی۔

شہزوری اتنی نادان نہ تھی کہ پروشیا کی باتیں نہ سمجھتی۔ کچھ سوچتے ہوئے بولی:

"پروشیا۔ میں نہیں جانتی تم کون ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ تم قاسم کی ہمدرد ہو۔ قاسم نے تم پر اعتماد کیا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں بھی تم پر اعتماد کروں۔ اب ہمیں غیریت کا پردہ درمیان سے اٹھا کے دوستوں کی طرح گفتگو کرنا چاہیے۔ میں نے آپ کو تم میں بدل دیا ہے۔ اس تکلف کو تم بھی ختم کر دو۔"

"ٹھیک ہے شہزوری۔"

پروشیا نے کہا:

"ہمیں اپنی باتیں جلد ختم کرنا چاہییں۔ ابھی خیمہ خالی ہے ممکن ہے کہ کوئی آ جائے اور ہمیں گفتگو کا موقع نہ مل سکے۔ قاسم تمہارے لیے بہت بے چین ہے۔ اسے پتہ نہیں کہ اس کے خیمہ گاہ سے چلے جانے کے بعد تم پر کیا گزری۔ یہ بات تو میں نے اسے بتا دی ہے۔ اب قاسم کا یہ پیغام ہے کہ وہ تمہارا ہے اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ تمہارا جواب چاہتا ہے۔ اگر تم بھی ثابت قدم رہو تو مشکل خود بخود آسان ہو سکتی ہے۔"

شہزوری نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:

"عورت، عورت کے دل سے واقف ہوتی ہے۔ بس اس کے سوال کا جواب تم جو مناسب سمجھنا دے دینا۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ وہ جہاں رہے خوش رہے۔ محبت ایک جگہ رہنے ہی کا تو نام نہیں۔ ہم دور رہ کر بھی محبت کر سکتے ہیں۔ جب آپا جائی میری طرف دار ہیں تو میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

پروشیا کو جس بات کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ شہزوری کی دو بے تکلف سہیلیاں ہنستی بولتی خیمہ میں آ گئیں۔ پروشیا کا اب وہاں بیٹھنا بے کار تھا۔ اس نے شہزوری سے اجازت لی اور خاموشی سے خیمہ سے باہر آ گئی۔

○

پروشیا دوسرے دن شام کو قصرِ سفید پہنچ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ قاسم بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ موقع پاتے ہی قاسم کے کمرے میں پہنچ گئی لیکن قاسم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تیمور نے اپنے تمام سرداروں کو حویلی میں صلاح و مشورے کے لیے بلایا تھا۔ قاسم وہیں گیا تھا۔

تیسرے دن قاسم کی ملاقات ہوئی۔ قاسم نے پروشیا کو دیکھا تو کچھ پوچھنے کے بجائے مجسم سوال بن گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پروشیا نے اس کی بے چینی محسوس کر لی، بولی:

"خوش قسمت ہے وہ مرد جس سے کوئی عورت اتنی ہی محبت کرے جتنی مرد کو اس سے ہو۔ شہزوری خیمہ گاہ میں اسی حال میں ہے جس حال میں تم یہاں ہو۔ اس کی زبان پر تمہارے نام کے سوا کسی اور کا نام نہ آیا ہے اور نہ آئے گا۔ تمہارے پیغام کا یہی جواب ہے۔"

قاسم نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولا:

"پروشیا تم کس قدر نیک دل ہو۔ میں تمہارا احسان عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔"

کاش، قاسم، پروشیا کے دل کا حال جان سکتا۔ پروشیا نے اپنے ہونٹ دباتے ہوئے کہا:

"قاسم! بار بار احسان کا نام لے کر مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔"

پروشیا تھوڑی دیر قاسم کے پاس بیٹھنے کے بعد واپس چلی گئی۔ اگلے تین دن پروشیا بالکل غائب رہی۔ قاسم نے پہلے تو اس کا انتظار کیا پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ پروشیا کسی کام سے شہرِ سبز سے باہر گئی ہو گی۔

قاسم کا یہ خیال درست ہی نکلا۔ پروشیا، حاجی برلاس کی خیمہ گاہ میں گئی تھی۔ واپس آئی تو اپنے ساتھ ایسی اہم خبر لائی جسے سن کر قاسم گھبرا گیا۔

"آپا جائی، تیمور سے ملنے شہرِ سبز تشریف لا رہی ہیں۔"

اس خبر سے قاسم کو تو گھبراہٹ ہونی ہی تھی سامنے نے جب یہ خبر تیمور کو پہنچائی تو اس کو بھی ذرا دیر کے لیے پسینہ آ گیا۔

تاتاریوں اور خصوصیت سے برلاس قبیلہ پر آپا جائی کا جو اثر تھا اس سے تیمور پوری طرح واقف تھا۔ آپا جائی کے آنے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ وہ تیمور کو حاجی برلاس کے ساتھ صلح صفائی پہ آمادہ کریں اور اگر تیمور انکار کرے تو شہرِ سبز کے لوگوں کو تیمور کے خلاف بھڑکا دیں۔

تیمور نہ تو آپا جائی کا داخلہ شہرِ سبز میں بند کر سکتا تھا اور نہ ان کی زبان پر پہرہ بٹھا سکتا تھا۔ تیمور کو اس

تو مصیبت نے سخت الجھن میں مبتلا کر دیا۔

○

کہتے ہیں کہ تیمور کو شطرنج کھیلنے کا شوق تھا۔ جنگ بھی اس کی نظر میں شطرنج ہی کا ایک کھیل تھا۔ وہ
فوجی حکمتِ عملی کی بنیاد شطرنج کے مہروں پر رکھتا۔ دفاع اور پیش قدمی پر غور کرتا اور حسبِ ضرورت فوج کو
ترتیب دیتا۔ آپا جانی کی آمد نے اسے مات سے دوچار کر دیا۔

اس نے اپنے بچاؤ کی تدبیروں پر غور کیا۔ تیمور کے مشیرِ خاص اور رہبر مولانا زین الدین شہرِ سبز
میں موجود تھے۔ تیمور ہر اہم موقع پر ان سے مشورہ کیا کرتا۔ آپا جانی کا توڑ کرنے کے لیے بھی وہ ان کے پاس
گیا۔ تمام رات ان سے گفتگو ہوتی رہی۔

مولانا دین دار آدمی تھے لیکن دنیاداری سے اتنے دور بھی نہ تھے کہ اچھے برے کی تمیز نہ کر سکتے۔
تاتاریوں پر آپا جانی کے اثر و رسوخ سے وہ بھی واقف تھے۔

تیمور نے وہ رات مولانا کے پاس گزاری۔ صبح نمازِ فجر کے بعد جب حویلی واپس آیا تو بہت مطمئن تھا
وہ رات کو جو حکمتِ عملی ترتیب دی گئی اس سے تیمور کو سو فیصد کامیابی کی امید تھی۔ اس نے
شاندار خیمہ شہرِ سبز کی سرحد پر بھجوا دیا اور شام ہوتے ہوتے خود بھی حویلی چھوڑ کر مع سرداروں کے سرحد
پہنچ گیا۔

تیمور کا بھیجا ہوا شاندار خیمہ سرحد سے کچھ اور آگے ایک بلند مقام پر نصب کیا گیا۔ اسے بڑے
سے سجایا گیا۔ یہ خیمہ اس نے آپا جانی کے لیے لگایا تھا۔ آپا جانی کی آمد کو وہ روک تو نہ سکتا تھا لیکن اس
اپنی حکمتِ عملی سے ان کو شہرِ سبز میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ اس نے آپا جانی کے شاندار استقبال
تیاری کی۔ وہ آپا جانی کی آمد سے ان کے ساتھ آنے والوں پر یہ ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ آپا جانی کی آمد
خائف ہے یا اسے ان کی آمد ناگوار گزری ہے۔ اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہوا۔

آپا جانی شہرِ سبز آئیں اور بڑی شان سے آئیں۔
حاجی برلاس کے علاوہ اس کے گروہ کے تمام سردار آپا جانی کے ساتھ تھے۔ حاجی برلاس کی خیمہ گا

شہرِ سبز تک آپا جانی کے عقیدت مندوں کا ہجوم رہا۔ کوئی ان کے ہاتھ پیر چومتا کوئی زر و جواہر نچھاور کرتا۔ آپا جانی
ایک کھلی گھوڑا گاڑی میں سفر کر رہی تھیں۔ دھوپ سے بچاؤ کے لیے ان کے سر پر زرنگار چھتر لگا تھا۔ گاڑی
کے چاروں طرف تاتاری سوار چل رہے تھے۔ آپا جانی ہاتھ کے اشارے سے عقیدت مندوں کے نعروں کا جواب
دے رہی تھیں۔ یہ شاہانہ سواری آہستہ آہستہ شہرِ سبز کی طرف بڑھتی رہی۔

تیمور نے شہرِ سبز سے حاجی برلاس کی خیمہ گاہ تک جاسوس سواروں کا جال بچھا دیا تھا۔ اسے لمحہ لمحہ کی
خبریں مل رہی تھیں۔

جب آپا جانی کا جلوس سرحد سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر رہ گیا تو تیمور نے اپنے گھوڑے کو ایڑ دی۔
تمام اور اس کے تمام سردار تیمور کے جلو میں چلے آئے۔ ایک فرسنگ آگے پہنچ کر تیمور نے آپا جانی کا استقبال
کیا۔ ہوا میں تیر چھوڑے گئے۔

تیمور گھوڑے سے اترا۔ آپا جانی کی گاڑی کے پاس پہنچا اور بڑی عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔
آپا جانی نے مسکرا کر تیمور کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔ تیمور گھوڑے پر سوار ہو کر جلوس کے آگے آگے چلنے لگا
جیسے وہ ایک رہبر کے فرائض ادا کر رہا تھا۔

اس نے سواری کا رخ اس طرف موڑ دیا جہاں آپا جانی کے لیے شاندار خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ
آنے والوں کے لیے چھوٹے خیمے قریب ہی لگائے گئے تھے۔

خیمے کے سامنے بڑے احترام سے آپا جانی کو اتارا گیا۔ بڑی بی کمر جھکائے لکڑی ٹیکتی گاڑی سے اتریں۔
لکڑی تو ان کے ہاتھ میں لکڑی تھی لیکن اس پر چاندی کا پتر چڑھا تھا اور گنگا جمنی کا کام کیا ہوا تھا۔ خیمہ کی
شان و شوکت دیکھ کر آپا جانی بہت خوش ہوئیں۔ شہرِ سبز کی ایک درجن سے زیادہ معزز تاتاری خواتین نے ان
کا استقبال کیا۔ اس استقبال کا انتظام پروشیا کے ہاتھ میں تھا۔

تیمور آپا جانی کو خیمہ کے دروازے تک پہنچا کر واپس ہو گیا۔ مہمانوں کو ان کے خیموں میں پہنچا دیا گیا۔ آپا جانی
کے ساتھ آنے والے تاتاری سردار دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شہرِ سبز میں اپنے
دوستوں اور عزیزوں سے مل سکیں گے اور انہیں اپنا طرف دار بنانے کی کوشش کریں گے۔ حاجی برلاس نے اسی
غرض سے اپنے تمام سرداروں کو آپا جانی کے ہمراہ بھیج دیا تھا لیکن تیمور نے انہیں بڑی چالاکی سے شہرِ سبز کی سرحد
پر ہی روک لیا تھا۔ حاجی برلاس کے سرداروں کو غصہ تو بہت آیا لیکن انہیں تیمور کی ذہانت اور عقلمندی کی داد

دینی پڑی۔

مہمانوں کے لیے کھانا پہلے ہی تیار تھا۔ تیمور، آپا جانیؒ کے خیمے میں کئی بار آیا لیکن کھانا ختم ہونے سے پہلے اس نے ان سے گفتگو نہ کی۔

جب کھانا ختم ہوا اور آپا جانیؒ کے ساتھ آنے والے تمام سردار ان کے خیمہ میں جمع ہو گئے تو تیمور سرداروں کے ساتھ وہاں پہنچا۔

یہ بڑی اہم محفل تھی۔ اس میں تیمور کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ تیمور کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس وقت ذرا بھی غلطی ہو گئی تو پورا قبیلہ اس کے خلاف ہو جائے گا۔ حاجی برلاس کے آدمیوں کو امید تھی کہ تیمور آپا جانیؒ کے سامنے زبان نہ کھول سکے گا لیکن ان کی امیدوں کے برعکس تیمور نے گفتگو میں خود پہل کی۔

تیمور آپا جانیؒ کے برابر بیٹھا تھا۔ اس نے آپا جانیؒ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور بولا:

"محترم آپا جانیؒ! آپ نے مجھے مہمانی کا شرف بخشا۔ اس کے لیے میں جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ اگر مجھے خیمہ گاہ میں طلب کرتیں تو بھی میں سر کے بل چل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ چچا برلاس میرے باپ کی جگہ ہیں۔ میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں لیکن انہوں نے مجھے دعوت میں بلا کر قتل کرنے کی کوشش۔۔۔"

تیمور نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ آپا جانیؒ کے چہرے پر نظر جما کر اور متانت سے بولا:

"آپا جانیؒ۔ ذرا غور کیجیے۔ آپ کے ساتھ آنے والے تمام سردار میرے مخالف ہیں لیکن اگر میں انہیں قتل کرا دوں تو کیا آپ مجھے معاف کر دیں گی؟"

"ہرگز نہیں بیٹے!"

آپا جانیؒ کو بولنا پڑا۔

"یہ مہمان نوازی کے اصولوں کے خلاف ہے۔"

تیمور نے آغاز ہی میں آپا جانیؒ کو متاثر کر لیا۔ اس نے فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا۔ بولا:

"آپا جانیؒ۔ آپ کو علم ہو گا کہ مغلوں نے ہم پر حملہ کیا۔ تمام تاتاری سردار اپنے قلعوں میں چھپ گئے۔ بعض سردار مغلوں کے دوست بن گئے۔ ہمارے چچا حاجی برلاس بھی جنوب میں بھاگ گئے۔ آپ ان سرداروں سے پوچھیے۔ یہ آپ کو بتائیں گے کہ صرف میں ہی وہ واحد سردار ہوں جس نے اپنا ملک چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ مغل شہرِ سبز تک پہنچ گئے تھے لیکن میں نے شہرِ سبز سے قدم نہ نکالا اور اپنی تمام دولت مغلوں کے حوالے کر کے اپنی سرزمین کو بچا لیا۔۔۔۔۔ آپا جانیؒ! کیا میرے اس کارنامے سے میری قوم کو میرا احسان مند نہیں ہونا چاہیے؟"

"بے شک۔ بے شک۔" آپا جانیؒ اس کے سوا اور کیا جواب دے سکتی تھیں۔

تیمور نے خود کو الفاظ کے نیزوں سے مسلح کر لیا تھا۔ اس نے کہا:

"آپا جانیؒ۔ میں نے شہرِ سبز کو بچا لیا۔ میں نے تاتاری مملکت کو بچا لیا۔ میں اس وقت تن تنہا مغلوں کے خانِ اعظم سے ملنے گیا جب تمام سردار قلعوں میں منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ میں نے خانِ اعظم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور اسے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ آپا جانیؒ۔ کیا میں نے مغلوں سے تاتاری مملکت بچا کر کچھ برا کیا؟"

"شاباش تیمور۔ تو نے بہت بڑا کام کیا۔" آپا جانیؒ اس کی باتوں سے پگھل گئیں۔

تیمور نے مہمان سرداروں کو باری باری دیکھا پھر آپا جانیؒ سے کہا:

"آپا جانیؒ۔ اگر میں نے ملک اور قوم کی اتنی خدمت کی ہے تو کیا میرا یہ حق نہیں کہ میں ان سرداروں سے اپنی خدمت کا صلہ مانگوں؟"

آپا جانیؒ کمر سیدھی کرتے ہوئے بولیں:

"تو صلہ کا حق دار ہے تیمور۔"

تیمور نے جھٹ سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ مہرِ حکومت نکال کر آپا جانیؒ کے قدموں میں رکھ دی جو اسے بادِ شمال کا خانِ اعظم سمرقند سے واپس جاتے وقت دے گیا تھا۔

تیمور نے بڑے کرسناک لہجے میں کہا:

"آپا جانیؒ۔ میں نے اپنی تمام دولت، زر و جواہر، قیمتی اشیاء مغلوں کے حوالے کر کے مملکتِ تاتار کو بچایا۔ تاتاریوں کی عزت کو محفوظ رکھا۔ میں نے اس کا کوئی صلہ نہ مانگا۔ میں نے اپنی دولت کے جانے کا غم نہ کیا۔ میں نے ان سے کوئی علاقہ بھی طلب نہ کیا۔ یہ مہرِ حکومت سمرقند کی سرداری کی، مجھے خانِ اعظم نے دی ہے۔ اس خانِ اعظم نے جسے ہمارے باپ دادا اپنا بادشاہ تسلیم کرتے آئے ہیں۔ اس مہرِ حکومت پر میرا حق ہے۔ سمرقند کی سرداری پر میرا حق ہے۔ آپا جانیؒ۔ کیا آپ یہ مہرِ حکومت مجھے اپنے قدموں سے اٹھانے کی اجازت نہ دیں گی۔"

آپا جانیؒ فوراً بول پڑیں:

"کیوں نہیں۔ تیمور! یہ مہرِ حکومت تجھے خانِ اعظم نے دی ہے۔ اس پر تیرا حق ہے۔"

تیمور نے فوراً ہاتھ بڑھا کر مہرِ حکومت اٹھالی اور بولا:

"بس آپا جانی۔ مجھے آپ کی رضامندی حاصل ہو گئی ہے۔ اب میں اس مہرِ حکومت اور سمرقند کی
حفاظت کروں گا۔ مجھ سے یہ کوئی نہیں چھین سکتا۔ جو بھی میرے مقابلے پر آئے گا میں اس سے لڑ
وہ میرا چچا ہو یا قبیلے کا کوئی اور سردار۔"

حاجی برلاس کے تمام سردار دم بخود رہ گئے۔ آپا جانی کی جیسے زبان بند ہو گئی۔ وہ کیا سوچ کے
کیا ہو گیا؟ تیمور نے اپنی باتوں سے سب کو قائل کر لیا۔ آپا جانی کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ انہوں نے یوں
وہ تیمور سے شرمندہ ہوں۔

تیمور نے آپا جانی کے بولنے کا آخری گھر بھی بند کر دیا۔ اس نے کہا:

"آپا جانی۔ آپ واپس جا کر چچا برلاس سے کہہ دیں کہ انہوں نے میرے قتل کرنے کی جو ذلیل
اُسے میں معاف کرتا ہوں۔ میرا دل ان کی طرف سے صاف ہے اور یہ بھی کہہ دیں کہ وہ تاتاری روایات کا
انہوں نے قاسم اور شہزوری کے رشتے کا عام اعلان کر دیا تھا۔ وہ شہزوری کو رسم کے مطابق رخصت کر
شہزوری کو بزورِ شمشیر رخصت کرالاؤں گا۔"

آپا جانی یا برلاس سرداروں کے پاس اس کا بھی کوئی جواب نہ تھا۔

تیمور نے اٹھتے ہوئے قاسم کو حکم دیا:

"قاسم۔ مہمانوں کی ہر ضرورت کو پورا کیا جائے۔ آپا جانی پورے قبیلے کی ماں ہیں۔ ان کی خاطر
خبردار، کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے۔"

تیمور فوراً آپا جانی کے خیمے سے نکل آیا۔ اس نے ان کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ آپا جانی
لیے آئی تھیں اس کا خاتمہ تیمور نے خود اُن کے ہاتھوں کرا دیا۔ انہوں نے وہاں زیادہ دن ٹھہرنا منا
دوسرے دن ہی واپسی کا فیصلہ کر لیا۔

O

حاجی برلاس کو اس محاذ پر زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ آپا جانی واپس چلی گئیں۔ وہ جا

بے قدر ناراض ہو گئیں کہ انہوں نے اس سے بات تک نہ کی۔ حاجی برلاس اس ناکامی پر دانت پیس کر رہ گیا۔

آپا جانی نے ایک اور غضب ڈھایا۔

خیمہ گاہ پہنچتے ہی انہوں نے شہزوری اور اس کی ماں کو اپنے حضور طلب کر لیا۔ ماں بیٹی کو آپا جانی اور تیمور
کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ابھی پتہ نہ تھا۔ آپا جانی کے بلاوے پر وہ بہت پریشان ہوئیں۔

آپا جانی جب شہرِ سبز جا رہی تھیں تو انہیں یہ خیال تھا کہ حاجی برلاس نے آپا جانی کو قاسم کے پاس بھیجا ہے۔
تاکہ قاسم خود اس رشتے سے دستبردار ہو جائے۔ حالانکہ آپا جانی کے جانے سے شہزوری کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کو تو
حاجی برلاس نے اس لیے بھیجا تھا کہ وہ تیمور کو جنگ سے باز رکھیں۔ حاجی برلاس نے پیش کش کی تھی کہ تیمور کو برلاس
قبیلے کا سردار تسلیم کر لیا جائے گا بشرطیکہ سمرقند کی سرداری حاجی برلاس کو دیدے۔

حاجی برلاس نے صلح کی دوسری صورت یہ بتائی تھی کہ سمرقند پر ایک ساتھ حاجی برلاس اور تیمور حکومت کریں۔
حاجی کو معلوم تھا کہ تیمور ان میں سے کوئی شرط بھی تسلیم نہ کرے گا۔ اس صورت میں آپا جانی ناراض ہو کر واپس آ بیٹھیں گی اور
حاجی کو اُس کے خلاف باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔

ماں بیٹی، آپا جانی کو سلام کر کے سہمی سہمی سی سامنے بیٹھ گئیں۔

آپا جانی نے شہزوری کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا اور بولیں:

"بیٹی تاتاری قبیلوں میں سرداری کے لیے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن تیرے
چچا نے تیمور کی مخالفت میں تیری شادی بھی روک دی ہے۔ تیمور اور حاجی برلاس میں لڑائی ہو کے رہے گی میں
چاہتی ہوں اس لڑائی میں تیرا نام نہ آئے۔ خاندانی بات خاندان ہی میں طے ہونا چاہیے۔"

آپا جانی کی بات شہزوری کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ ان کا منہ دیکھنے لگی۔ شہزوری کی سمجھ میں نہ آیا تو اس کی
ماں کیا خاک سمجھتی۔ وہ یوں بیٹھی تھی جیسے اُس کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

آپا جانی نے دونوں کو خاموش دیکھا تو خود ہی بولیں مگر اب اُن کا رخ شہزوری کی ماں کی طرف تھا:

"بیٹی پر سب سے زیادہ حق باپ اور ماں کا ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے اگر تم دونوں کو حاجی کا فیصلہ پسند ہے
تو میں بیچ میں سے ہٹ جاتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی، بعد میں کہا جائے کہ آپا جانی نے باپ بیٹی یا میاں بیوی کے
بیچ جھگڑا کرا دیا۔"

شہزوری نے سوچا کہیں اس کی سادہ لوح ماں کوئی غلط بات نہ کہہ دے اس لیے خود ہی بول پڑی:

"آپا جانی۔ ماں باپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔ لیکن قبیلہ کی آپ بڑی بوڑھی ہیں۔ قبیلہ کی عزت
آپ جو فیصلہ کریں گی وہی بہتر ہوگا کیونکہ آپ کی عقل میرے ماں باپ سے کہیں زیادہ ہے۔" شہزوری
کی ماں کو امداد طلب نظروں سے دیکھا۔

شہزوری کی ماں نے فوراً کہا:

"ہو رکیا آپا جانی۔ خاندانی باتیں آج تک آپ طے کرتی آئی ہیں۔ میں ماں ضرور ہوں لیکن
تھوڑی رکھتی ہوں۔"

آپا جانی، شہزوری اور قاسم کے حق میں تو پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھیں۔ اب نئے حالات
کی تائید حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ تیمور نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ شمشیر کی نوک پر شہزوری
گا۔ اس کی ذمہ داری بڑی بی اپنے سر نہیں لینا چاہتی تھیں۔ انہیں ان دونوں کی حمایت حاصل ہوئی
اطمینان کا احساس لیا۔

آپا جانی نے کہا:

"مجھے خوشی ہے کہ تم لوگ بزرگوں کی اب بھی عزت کرتی ہو۔ میرا فیصلہ وہی ہے جو میں
اگر حاجی نے شہزوری کو زبردستی رخصت کرنے کا ارادہ کیا تو اسے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔"

شہزوری اور اس کی ماں کے تمام خدشات دُور ہو گئے۔ شہزوری نے خود کو اپنی تمنا اور
محسوس کیا۔

وہ دونوں دیر تک آپا جانی کے پیر اور شانے دباتی رہیں۔

⊙

پروشیا نے گھوڑا روک کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہی مقام، وہی پیڑ، وہی سبزہ
ٹیلہ جس کے قریب شہزوری کا خیمہ تھا لیکن اب وہاں ویرانی برس رہی تھی۔ نہ خیمہ گاہ تھی نہ حاجی
پروشیا سخت حیران تھی۔ یہ لوگ کہاں چلے گئے۔ کب چلے گئے اور کیوں چلے گئے؟ اس کی
تھا۔ چار روز پہلے تک تو سب یہاں موجود تھے۔

پروشیا سوچتی رہی اور اپنا گھوڑا آگے بڑھاتی رہی۔

قاسم اور شہزوری کا رابطہ پروشیا کے ذریعے قائم تھا۔ وہ ہر دوسرے روز شہر سبز سے حاجی برلاس
کی خیمہ گاہ میں آتی اور ایک کو دوسرے کا پیغام پہنچاتی تھی۔ پروشیا کی بے لوث خدمت نے قاسم اور شہزوری
کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

آپا جانی اور تیمور کی گفتگو کے بعد دونوں طرف بظاہر خاموشی تھی لیکن دونوں اپنی جگہ خائف تھے۔ تیمور
نوجوانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ تیمور کو جنگ پر اکساتے اور حاجی برلاس پر حملہ کرنے کی درخواست کرتے۔
چاہتا تھا کہ ایک بھرپور حملہ کر کے حاجی کا جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے لیکن اسے برلاس قبیلہ
سرداروں کا تعاون حاصل نہ تھا۔ اسی لیے وہ حاجی برلاس کے مقابلہ پر نکلنے سے گریز کر رہا تھا۔

پروشیا خیالات میں گم آگے بڑھتی رہی۔ یہ شاہراہ سمرقند تھی۔ اس سڑک پر مملکت تاتار کے بڑے
شہر اور قصبے آباد تھے۔ تجارتی راستہ بھی یہی تھا۔ دن کے وقت اس شاہراہ پر تجارتی قافلے شمال سے
اور جنوب سے شمال کی طرف آتے جاتے دکھائی دیتے۔

پروشیا کو ایک قافلہ سمرقند کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اسے اس سڑک پر چلتے ہوئے کئی گھنٹے ہو
اس نے گھوڑا روک لیا۔ قافلے کے ساتھ کچھ سوار تھے۔ پروشیا نے آگے بڑھ کر ایک سوار سے

"مہربان بھائی! کوئی لشکر سمرقند جاتے تو نہیں دیکھا۔"

سوار نے خوبصورت پروشیا کو سر سے پیر تک دیکھا۔ وہ پروشیا کے حسن سے کچھ زیادہ مرعوب ہو گیا۔ اس
نے کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اس کے ایک ساتھی نے اس کی
حالت کا اندازہ لگا لیا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر پروشیا کے قریب آ کر بولا:

"بیٹی۔ میرا ساتھی چلتے چلتے تھک گیا ہے۔ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ تمہیں جو پوچھنا ہے
پوچھو۔"

پروشیا دل میں مسکرائی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ پہلا سوار اس کی صورت دیکھ کر گھبرا گیا ہے اور اس کا
ساتھی اس کے آڑے آیا ہے۔ وہ مسکرا کر بولی:

"چار دن پہلے یہاں حاجی برلاس کا لشکر موجود تھا۔ اب وہ کسی اور طرف چلا گیا ہے۔ میں اس کے بارے

میں پوچھ رہی تھی۔"

ادھیڑ عمر سوار نے بتایا:

"یہاں سے کچھ دور شمال میں جہاں یہ سڑک دائیں جانب گھومتی ہے بہت سے خیمے لگے ہیں۔ وہی لشکر ہو جس کی تمہیں تلاش ہے۔"

پروشیا نے "شکریہ" کہا اور گھوڑا شمال کی طرف موڑا۔

سوار نے اسے روکا اور بولا:

"میری اچھی بیٹی۔ لڑکیوں کو کسی لشکر میں تنہا نہ جانا چاہیے۔ لشکریوں کا کیا اعتبار۔ تاتا بڑے اجڈ ہوتے ہیں۔"

"بزرگِ محترم۔ آپ کا ایک بار اور شکریہ۔"

پروشیا نے ہنس کر کہا:

"میں بھی تاتاری لڑکی ہوں اور اپنی حفاظت کرنا بھی جانتی ہوں۔"

پروشیا نے گھوڑے کو ایڑ دی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ قافلہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

پروشیا کے جانے کے بعد جوان سوار کو بھی ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے ادھیڑ عمر ساتھی سے

"چلی گئی۔ کون تھی یہ لڑکی؟"

ادھیڑ عمر کو غصہ آ گیا۔ بولا:

"عجیب گدھا ہے تو۔ لڑکی کو بار بار دیکھا جو اس ہی کو بیٹھا۔"

جوان کھسیانہ ہو گیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ قافلہ پھر جنوب کی طرف چل پڑا۔

○

پروشیا سوچتی ہوئی گھوڑا بھگاتی چلی جا رہی تھی۔ وہ موڑ پر پہنچی لیکن جیسے ہی اس نے اب موڑا۔ چار سواروں نے اس کا راستہ روک لیا۔

"کون ہو تم؟" ایک سوار نے اکڑ کر سوال کیا۔

"پروشیا۔" اس نے بے باکی سے جواب دیا۔ سامنے ترائی میں حاجی برلاس کے خیمے نظر آ رہے تھے۔

"کہاں سے آئی ہو؟" سوال ہوا۔

"شہر سبز سے۔" جواب ملا۔

سوار چونک پڑا۔ پوچھا:

"تیمور کو جانتی ہو۔"

پروشیا جھلا گئی:

"ہر تاتاری کو تیمور کا نام معلوم ہونا چاہیے۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔" پروشیا نے سوار کو ڈانٹ پلائی۔

سوار بڑا ڈھیٹ تھا۔ اس نے پوچھا:

"کہاں جانا ہے؟" اور اس نے اپنا گھوڑا پروشیا کے گھوڑے سے بھڑا دیا۔

پروشیا کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ چیخ کر بولی:

"سامنے حاجی برلاس کی خیمہ گاہ میں جانا ہے۔"

ساتھ ہی پروشیا نے بڑی تیزی سے تلوار بھی میان سے نکالی۔

سوار نے جلدی سے گھوڑا پیچھے کر لیا۔ اکڑ کر بولا:

"تلوار کیوں نکالی؟"

"اس لیے کہ بدتمیز کی زبان صرف تلوار سے بند کی جا سکتی ہے۔" پروشیا نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا اور ہوا میں لہرائی۔

"سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ مجھے اپنا راستہ خود بنانا پڑے گا۔"

سوار نے پروشیا کو لڑنے مرنے پر آمادہ دیکھا تو نرم پڑ گیا۔ اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف

ایک ساتھی بولا:

"جھگڑنے سے کیا فائدہ۔ یہ ہمارے سردار کے پاس جا رہی ہے۔ ہم ساتھ چلتے ہیں۔ سردار خود فیصلہ کرے گا۔"

دو سوار پروشیا کے آگے اور دو پیچھے ہو گئے۔

یہ لوگ ترائی میں اترے تو حاجی برلاس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ حاجی خیمہ گاہ سے ادھر ہی آ رہا تھا۔ ہم پاس پہنچ کر انہوں نے گھوڑے روک لیے۔ پروشیا نے ادب سے سلام کیا۔

حاجی نے حیرت سے پروشیا کو دیکھا:

"کون ہو تم؟"

"پروشیا۔" اس نے رٹا رٹایا جواب دیا۔

"کہاں سے آئی ہو؟"

"شہرِ سبز سے۔"

حاجی کی حیرت شبہ میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تیمور کا پیغام لائی ہو؟"

"نہیں۔ میں شہزوری سے ملنے آئی ہوں۔" پروشیا نے جرأت سے جواب دیا۔

حاجی کا غصہ بڑھ گیا۔ بولا:

"کیوں ملنا ہے شہزوری سے؟"

پروشیا نے اطمینان سے جواب دیا:

"ایک سہیلی دوسری سہیلی سے کیوں ملا کرتی ہے سردارِ محترم۔"

"واپس جاؤ۔" حاجی برلاس چیخ کر بولا:

"میں شہرِ سبز کے کسی آدمی کو اپنے خیموں کے قریب نہیں دیکھنا چاہتا۔"

پروشیا کو شوخی سوجھی۔ اس نے کہا:

"میں مرد نہیں عورت ہوں سردار۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ شہزوری گھوڑا بھگاتے چلی آ رہی ہے۔ شہزوری کا خیمہ اونچی جگہ تھا۔ پروشیا کو دیکھ لیا تھا۔ شہزوری قریب پہنچی۔ گھوڑا روکا۔ باپ سے کہا:

"ابا جان۔ یہ میری سہیلی پروشیا ہے۔"

"معلوم ہے۔" حاجی نے کڑک کر جواب دیا۔

"شہرِ سبز والے ہمارے دشمن ہیں۔ تم کسی سے نہیں مل سکتیں۔"

شہزوری تاؤ کھا کر رہ گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا کہ پروشیا نے اپنا گھوڑا موڑ لیا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی:

"خدا حافظ شہزوری۔ پھر ملیں گے۔"

پروشیا کا گھوڑا اڑتی گرد میں دب گیا۔ شہزوری کا منہ اتر گیا۔ وہ اپنے خیمے کی طرف واپس چلی گئی۔ اس کا جا رہا تھا۔ قاسم کا خیال اسے بار بار پریشان کر رہا تھا۔ کیا پتہ قاسم نے کوئی اہم پیغام بھیجا ہو؟ یہ سوال اس کے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔

پروشیا شہرِ سبز پہنچی۔ تمام شہر میں خبر پھیل گئی کہ حاجی برلاس اپنا لشکر لے کر بھاگ گیا لیکن تیمور بے چین برلاس کیوں پیچھے ہٹ گیا؟ وہ مقابلہ نہیں کرنا چاہتا یا اس میں کوئی فوجی چال پوشیدہ ہے۔ تمام دن شہر باتیں ہوتی رہیں۔ نافہموں نے خوشیاں منائیں۔ عقلمند سوچ میں ڈوبے رہے۔ رات کو تیمور نے مجلسِ مشاورت مولانا زین الدین بھی تشریف لائے۔ اس وقت تک پروشیا کی باتوں کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی تھی۔

مسئلہ پیش ہوا۔

ہر ایک نے اپنی اپنی رائے دی۔ بڑی تفصیلی بحث ہوئی۔ رات کا کھانا وہیں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد پھر شروع ہوئی۔ سوائے تیمور اور مولانا زین الدین کے ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ حاجی برلاس خوف کھا کر پیچھے گفتگو طول کھینچتی گئی۔ رات کا پچھلا پہر ہو گیا لیکن کسی بات پر اتفاق نہ ہو سکا۔ پھر اس ملے سب ہی ایک متفق ہو گئے جب سرحد سے ایک سوار گھوڑا سرپٹ دوڑاتا آیا اور اس نے اعلان کیا:

"حاجی برلاس کا لشکر آہستہ آہستہ شہرِ سبز کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

دوسرے ہی لمحے تیمور مسلح ہو کر سرحد کی طرف جا رہا تھا۔ تیمور نے اپنے تمام سوار سرحد پر پہلے ہی بھیج دیے اس کے ساتھ ہو گئے۔

قاسم عجب شان سے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں عشق کے نشہ سے مخمور ہو رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا میدانِ جنگ کے بجائے وہ اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہا ہے۔ جس طرح شہزوری اس کی محبوبہ تھی اسی طرح وہ بھی محبوب تھا۔ اور وہ تھی پروشیا!

پروشیا جسم پر پورا اسلحہ سجائے اس کے پہلو میں چل رہی تھی۔

تیمور اور اس کے ساتھیوں کے گھوڑے پوری رفتار سے سرحد کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن... پر پہنچے تو میدانِ کارزار گرم تھا۔ دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ تاتاری تاتاری سے ٹکرا رہا تھا اور ایک ہی قبیلہ... اپنے ہی بھائیوں کے گلے کاٹنے پر تلے ہوئے تھے۔ حاجی برلاس نے سخت حملہ کیا تھا اس کے سواروں... زیادہ تھی۔ تیمور کے جوانوں نے حملہ روکنے کی پوری کوشش کی لیکن انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔

تیمور کے پہنچتے ہی لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔

اسے دیکھتے ہی اس کے سواروں میں جیسے جان پڑ گئی۔ انہوں نے حملہ روک لیا۔ پھر جوابی حملہ... برلاس کو شہرِ سبز کی سرحدوں سے پیچھے دھکیل دیا۔ برلاس اپنے حملے میں تقریباً ایک فرسنگ... کے اندر گھس آیا تھا۔ قاسم مست ہاتھی کی طرح بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا۔ حاجی برلاس کے کئی... ہاتھوں مارے گئے۔ تیمور نے حاجی کے لشکر پر اتنا دباؤ ڈالا کہ اس کے قدم اکھڑ گئے اور اس نے... شروع کر دیا۔

تیمور کا حوصلہ بڑھا اس نے حملہ میں مزید شدت پیدا کر دی۔ حاجی برلاس اس صورتِ حال... پریشان ہوا۔ اب تک وہ دور کھڑا سواروں کو لڑا رہا تھا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر لشکر کے درمیان آ گیا اور... کے حوصلے بڑھانے لگا۔

میدان میں ایک بار فوج کے قدم اکھڑ جائیں تو جمنا مشکل ہوتا ہے۔ حاجی برلاس کے آ... ہوا کہ لشکر کے پسپا ہونے کی رفتار سست ہو گئی۔ حاجی کا لشکر بار بار جم کر لڑنے کی کوشش کرتا... جوان سال سوار پھر اس کے قدم اکھیڑ دیتے۔

دوپہر، شام پھر رات ہونے لگی۔ بھوکے پیاسے سوار دن بھر جنگ کرتے رہے... کے خون سے نکھار رہے تھے۔ تیمور کا لشکر شاہراہِ سمرقند پر حاجی برلاس کے لشکر کو بہت دور دھکیل... گیا تھا لیکن حاجی کو شکست نہ ہوئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح مقابلہ کرتا رہا۔ پھر اندھیرا ہو گیا کہ دشمن... مشکل ہو گئی۔ لڑائی بند کرنا پڑی۔

تیمور کا پلہ بھاری رہا لیکن اس کی فتح میں رات حائل ہو گئی۔ کاش رات نہ ہوتی کیونکہ اس را... ساتھ بڑی دشمنی کی۔ اس رات نے تیمور کی فتح کو شکست اور ایک زبردست شکست میں تبدیل... دونوں لشکر الگ ہو گئے۔

حاجی برلاس پسپا ہوتا ہوا اپنی لشکر گاہ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنے سواروں کے ساتھ لشکر گاہ... میں چلا گیا۔

تیمور نے الاؤ روشن کرا کر میدان میں پڑاؤ ڈالا۔ قرب و جوار کی آبادیوں میں سوار دوڑائے گئے جو کچھ... سادہ کھانے پینے کے لیے لایا گیا۔ کھا پی کر لشکر آرام کرنے لگا۔ پتھریلی زمین کے بستر پر یا پیڑوں کے... سہارے سوار بیٹھ گئے۔

تیمور ایک بڑے پتھر کے سہارے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں وہ سو رہا تھا یا آج کی کامیابی پر... مسرور ہو کر صبح کی لڑائی کے لیے نئے انداز سے حملہ کرنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ اس کے خادمِ خاص نے اسے جھنجوڑ کر... جگا دیا۔

"مالک۔ غضب ہو گیا۔" خادم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

تیمور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ الاؤ کے بھڑکتے شعلوں میں خادم کے چہرے پر نظر ڈالی۔ خوف سے اس کے... ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"ڈرو مت۔ بتاؤ کیا ہوا۔" تیمور نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

تیمور اسے دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنا خوف خادم پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

"مالک!"

خادم نے لرزتے لہجے میں کہا:

"تمام سردار آپ کو دھوکا دے گئے۔ وہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر حاجی برلاس کی خیمہ گاہ میں چلے گئے۔"

تیمور کو شاید زندگی میں پہلی بار خطرہ اپنے بالکل قریب محسوس ہوا۔

"ایسا کیوں ہوا؟"

اس کی نظریں چاروں طرف تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ الاؤ جگہ جگہ روشن تھے لیکن ان کے گرد صرف ایک ایک... دو آدمی اونگھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ جس وقت الاؤ جلائے گئے تھے تو ہر الاؤ کے پاس سو سو دو دو... سوار اکٹھا ہو گئے تھے۔ اب الاؤ کے پاس سناٹا تھا۔

خادم نے بتانا شروع کیا:

"ہم نے تو بس یہ سنا کہ آپ کا چاچا کا کوئی آدمی ہمارے لشکر میں آیا تھا۔ اس آدمی نے آپ کا چاچا کا یہ حکم سنایا ہے

کہ جو سردار تیمور کی طرف سے لڑے گا وہ تاتاری جہنم میں جلے گا۔ آپا جانی اس کے لیے بد دعا کریں گی آپا جا
یہ بھی حکم دیا کہ تیمور کا لشکر چھوڑ کر حاجی کی خیمہ گاہ میں آجاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مالک! سب سردار آپ کو چھوڑ گئے
چالیس پچاس سوار رہ گئے ہیں۔"

تیمور کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ پچاس سواروں کے ساتھ ہزا
سے مقابلہ خودکشی کے برابر تھا۔

تیمور نے فوراً اپنے سواروں کو اکٹھا کیا اور گھوڑوں کی باگیں شہر سبز کی طرف موڑ دیں۔ ایک گھنٹہ
ہوا اور ہر طرف روشنی پھیل گئی۔

یکایک تیمور نے گھوڑا روک کر اپنے سواروں کو دیکھا۔ سوار ٹولیاں بنائے آگے پیچھے چل رہے تھے
تیمور کے پاس پہنچ کر رک گئے۔

"قاسم!"

تیمور نے بڑے کرب سے کہا:

"آخر تم بھی مجھے دھوکا دے گئے"۔

تیمور کے سوار بھی حیران رہ گئے۔ جب یہ لوگ چلے تھے تو قاسم اور پروشیا سب کے ساتھ ہی
کی طرف چلے تھے لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد قاسم نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔ پروشیا کو
کم کرنا پڑی۔ ان کے گھوڑوں کی رفتار ہی نہ رہی۔ گھوڑے رک گئے۔ اندھیری رات میں تیمور کے سوار
ہی نہ ہو سکا کہ ان کے دو ساتھی پیچھے رہ گئے ہیں۔

گھوڑے رکے تو پروشیا نے کہا:

"قاسم! تم نے سردار تیمور کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔ یہ تو غداری ہے"۔

قاسم نے جواب دیا:

"پروشیا۔ اگر یہ غداری ہے تو تم نے سردار کو کیوں چھوڑا۔ تم میرے ساتھ کیوں رک گئیں!"

پروشیا کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد بولی:

"قاسم۔ میں نے تیمور کو تمہاری وجہ سے چھوڑا ہے"۔

قاسم اندھیرے کی وجہ سے پروشیا کا چہرہ صاف طور سے نہ دیکھ سکا ورنہ اسے معلوم ہو جاتا کہ جو

تت پروشیا کے دل کی دھڑکن الفاظ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

قاسم نے کہا:

"پروشیا تم نے میرے لیے تیمور کو چھوڑا۔ اسی طرح میں نے شہزوری کے لیے سردار سے منہ موڑا!
ہے۔ شہزوری مجھے صرف آج مل سکتی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے اگر میں اسے حاصل نہ کر سکا تو پھر مجھے
ہزوری کبھی نہ مل سکے گی"۔

پروشیا کانپ اٹھی۔ گھبرا کے بولی:

"تو کیا تم شہزوری کو لینے جاؤ گے۔ ۔ ۔ ۔ اکیلے۔ ۔ ۔ ۔ خیمہ گاہ میں۔ ۔ ۔ ۔ ہزاروں سواروں کے
بیان۔ ۔ ۔ ۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں پروشیا"۔ قاسم کی آواز میں درد پیدا ہو گیا۔

پروشیا نے تیزی سے اپنا گھوڑا قاسم کے گھوڑے کے سامنے کر دیا۔ بولی۔

"خدا کے لیے نہ جاؤ قاسم۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی"۔

"پروشیا!"

قاسم افسردہ لہجے میں بولا:

"تمہارے بہت احسانات ہیں مجھ پر۔ لیکن پہلا حق شہزوری کا ہے۔ راستہ نہ روکو۔ میں شہزوری
ی آواز سن رہا ہوں۔ مجھے بلا رہی ہے وہ"۔

پروشیا کے آنسو نکل آئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

"میرا کوئی حق نہیں۔ میں کچھ نہیں مانگتی قاسم۔ مجھے تمہاری زندگی چاہیے"۔

قاسم کا گھوڑا آگے بڑھ گیا۔

پروشیا اسے روک تو نہ سکی لیکن اس نے اپنا گھوڑا بھی اس کے پیچھے لگا دیا۔ قاسم اور پروشیا
ہا کے دھندلکے میں حاجی برلاس کی خیمہ گاہ پہ پہنچ گئے۔ سامنے خیمے ہی خیمے نظر آرہے تھے۔ خیمہ گاہ کے
محافظوں نے دو سواروں کو اندر آتے دیکھا تو ان کی طرف بڑھے۔ نیم تاریکی کی وجہ سے چہرے صاف نظر نہ آ
رہے تھے۔

قاسم کو شہزوری کا خیمہ معلوم نہ تھا لیکن اس کا جذبۂ صادق یا لوٹے دوست اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ اس کے

گھوڑے کا رخ سیدھا شہزوری کے خیمہ کی طرف تھا اور حاجی برلاس کے محافظ سوار لمحہ بہ لمحہ قاسم اور پروشیلکے
کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

یکایک قاسم نے نعرہ لگایا:

"شہزوری۔ میں آ گیا۔ تمہارا قاسم"

اس کے ساتھ ہی محافظوں کی کمانوں نے تیر اگلنا شروع کر دیے۔ قاسم اور پروشیلکے کئی تیر لگے
ان کی رفتار میں کمی نہ آئی۔

محبت کی ماری شہزوری خواب دیکھ رہی تھی۔ قاسم سامنے کھڑا تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ اسی وقت قاسم کی
اس کے کانوں میں گونجی۔ شہزوری تڑپ کر اٹھی اور ننگے سر ننگے پیر خیمہ سے نکل گئی۔ قاسم کی آواز اسے
سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ بے تحاشا آواز کی سمت بھاگ اٹھی۔

قاسم کا جسم تیروں سے چھلنی ہو گیا لیکن گھوڑا شہزوری کے خیمے کی طرف بڑھتا رہا۔ شہزوری اس کی آوا
بھاگتی چلی آ رہی تھی۔ قاسم کا گھوڑا شہزوری کے پاس پہنچ گیا۔ قاسم نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے شہزوری کی طرف
بڑھانے لیکن اس کے ہاتھ جھول گئے۔ پھر پورا جسم زین سے لٹک گیا۔

تیروں کی بارش اور تیز ہو گئی۔

شہزوری نے زین سے لٹکتی ہوئی قاسم کی گردن کو اپنے ساتھ لگا لیا لیکن ایک ساتھ کئی تیر اس کی پشت
داخل ہو گئے۔ شہزوری کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے اور وہ زمین پر گر گئی۔

حاجی برلاس دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ محافظوں نے دونوں کی لاشیں برابر زمین پر رکھ دیں۔ قاسم اور
شہزوری کو حاجی نے زندگی میں نہ ملنے دیا لیکن اب ان کی روحیں ایک ساتھ عالمِ بالا کی طرف پرواز کر رہی تھیں

دخترِ تاتار

مولانا نے تیزی سے آگے بڑھ کر تیمور کا گریبان پکڑ لیا۔

تیمور کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ دل سے مولانا زین الدین کی عزت کرتا تھا۔ کہی گیا شہر سبز سے سمرقند
تاتاری ان کا مرید تھا لیکن تیمور کو مولانا کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ اب وہ سمرقند کا حاکم نہ تھا بلکہ اس ک
مرقند کے محض ایک مقامی ناظم جیسی تھی پھر بھی اس نے ماضی میں تاتاریوں کی جو خدمات انجام دی تھیں
پیش نظر مولانا کا یہ تحقیر آمیز رویہ کچھ مناسب نہ تھا۔

تیمور نے بہت ضبط کیا پھر بھی غصہ سے اس کی تیوریاں چڑھ گئیں اور اس نے مولانا کی دونوں کلائیاں
سے پکڑ لیں۔

"یہ کیا حرکت ہے مولانا!"

نے جھٹکا دے کر اپنا گریبان چھڑا لیا۔

مولانا بڑے طیش میں تھے۔ چیخ کر بولے:

"میرا ہاتھ تیرے گریبان تک گیا تو تو بھڑک اٹھا لیکن تیرے شمالی مغل آقاؤں کے ہاتھ تاتاری عورتوں
تک پہنچ رہے ہیں۔ اس پر تیری رگِ حمیت نہیں پھڑکتی۔ تیرے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔"

کچھ سمجھا۔ کچھ نہ سمجھا۔ بولا:

"آپ کا میں نے ہمیشہ احترام کیا ہے مولانا۔ مجھ سے کوئی شکایت ہے تو سلیقے سے بیٹھ کر کہیۓ۔ میں تاتاریوں کی خدمت کے لیے ہمیشہ تیار ہوں لیکن مجھے ہم چشموں میں اس طرح ذلیل کرنے کی اجازت نہ تو شریعت دیتی ہے اور نہ میں خوددلے سے برداشت کر سکتا ہوں۔"

"اچھا تو بیٹھ جا۔" مولانا شریعت کے نام پر نرم پڑ گئے۔

"پہلے آپ تشریف رکھیے۔" تیمور نے بھی غصے پر قابو پالیا۔

مولانا زین الدین بیٹھ گئے۔ مولانا کے ساتھ چار آدمی آئے تھے۔ مولانا کا اشارہ پا کر وہ بھی بیٹھ گئے۔ تیمور مولانا کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل میں اب بھی مولانا کا پہلے جیسا احترام تھا۔

"فرمائیے مولانا۔"

تیمور ادب سے بولا:

"آپ کو میری کس گستاخی نے اس قدر چراغ پا کر دیا ہے؟"

"حاکم اور رعیت کا کیا رشتہ ہے تیمور؟" مولانا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

مولانا کی دینی بصیرت اور سیاسی شعور کا تیمور کو پوری طرح اندازہ تھا۔ جب تک وہ شہر سبز میں رہا ہر معاملے میں مولانا سے مشورہ کرتا تھا۔

ذرا دیر غور کرنے کے بعد الفاظ تولتے ہوئے بولا:

"مولانا۔ جب تک رعیت اطاعت و فرمانبرداری کرتی رہے حاکمِ وقت کا فرض ہے کہ وہ رعیت کے جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔"

"اگر تجھے یہ بات تسلیم ہے تو پھر بتا کہ تاتاریوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کی تو حفاظت کیوں نہیں کرتا؟" مولانا ویسے ہی غصے سے بولے۔ وہ تیمور کو دلیلوں سے قائل کرنا چاہتے تھے۔

"لیکن میں نہ اب سمرقند کا حاکم ہوں نہ تاتاریوں کا سردار۔"

تیمور نے فوراً جواب دیا:

"پچھلے نو سال میں میرے چچا حاجی برلاس اور دوسرے تاتاری سرداروں نے میرے ساتھ کیا کیا اس سے آپ واقف ہیں۔ مجھے انہوں نے اس قابل کب چھوڑا ہے کہ میں تاتاریوں کی کوئی مدد کر سکوں۔

تیمور سمرقند کا حاکم تھا لیکن اس کے چچا نے اس کی مخالفت کی۔ تاتاری سردار بھی اس کے چچا کے ساتھ مل گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیمور کو بھاگ کر اپنے سالے امیر حسین کے پاس کابل میں پناہ لینی پڑی۔ تیمور نے افغان دلیروں کی مدد سے پھر سمرقند پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر چار سال کی طویل خانہ جنگی کے باوجود کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر بادشاہِ کاشغر کا خانِ اعظم تغلق تیمور دوبارہ تاتاری علاقے میں گھس آیا۔ اب کے اس نے تمام بڑے بڑے تاتاری سرداروں کو قتل کر دیا۔ حاجی برلاس نے راہِ فرار اختیار کی لیکن ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا۔ تیمور نے خانِ اعظم کے مقابلے کی کوشش نہ کی۔ خانِ اعظم نے خوش ہو کر تیمور کو سمرقند کا ایک مقامی افسر مقرر کر دیا لیکن سمرقند کی حکومت کی باگ ڈور اپنے بیٹے شہزادہ الیاس خواجہ اور چند سردار بیک جک کے حوالے کر کے واپس چلا گیا۔

مولانا زین الدین کو ان واقعات کا علم تھا۔ انہوں نے کوشش بھی کی کہ تمام تاتاری تیمور کے جھنڈے تلے اکٹھا ہوں لیکن خودغرض اور لالچی حاجی برلاس نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔

مولانا تیمور کے جواب سے لاجواب ہو گئے۔ بڑی افسردگی سے بولے:

"تیمور تو کیا تاتاریوں کے گھر بار یونہی لٹتے رہیں گے۔ ان کی عزت و آبرو سے شمالی مغل یونہی کھیلتے رہیں گے!"

تیمور کا غصہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ بھی نرمی سے بولا:

"مولانا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ الیاس خواجہ اور بیک جک کے دستوں نے ایک دو جگہ لوٹ مار کی تھی میں نے اسی وقت ایک شکایتی خط خانِ اعظم کو بھیجا تھا۔ میں نے الیاس خواجہ اور بیک جک کے پاس بھی قاصد بھیجے تھے کہ وہ اپنے دستوں کو جنوب میں نہ آنے دیں۔"

"اس کا نتیجہ کیا نکلا تیمور؟" مولانا زین الدین کی آواز پھر سخت ہو گئی جیسے انہیں غصہ آ گیا ہو۔

"میری اطلاع اور رخد کا خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا مولانا۔" تیمور نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تاکہ مولانا کے بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں۔

مولانا کے جذبات ٹھنڈے ہونے کے بجائے اور بھڑک اٹھے۔ وہ تقریباً چیختے ہوئے بولے:

"خاطر خواہ نتیجہ نکلا ہے اور خوب نکلا ہے۔ نادان تیمور تو مغلوں کو ایمان دار سمجھے بیٹھا ہے۔ الیاس خواجہ اور بیک جک سرحد پر ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ ان لٹیروں کے حکم پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ بستیوں کی بستیاں تباہ ہو گئی ہیں۔ سادات گھرانے کے معززافراد گرفتار ہو رہے ہیں۔ تاتاری لڑکیاں کنیزیں بنا کر شمال کو بھیجی جا رہی

ہیں اور تیرے شہر سبز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مولانا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک فرد کو مخاطب کیا:

"ظفر یاب! ادھر آؤ۔"

ظفر کچھ دور بیٹھا تھا۔ وہ سر جھکائے مولانا کے پاس آ گیا۔

"ذرا نکالو تو وہ جیب سے۔"

مولانا کے کہنے پر ظفر یاب نے جیب سے مڑا تڑا پھولوں کا ایک ہار نکالا جس کے پھول کمُلا کر مُرجھا

ظفر یاب نے ہار مولانا کی طرف بڑھا دیا۔

"لو دیکھو۔"

مولانا نے ظفر یاب کے ہاتھ سے ہار لے کر تیمور کے ہاتھ میں زبردستی تھما دیا۔

"یہ ہار ہے اور یہ مرجھائے ہوئے پھول ہیں اس سہرے کے جو ظفر یاب کے سر پر باندھا گیا۔ پھر جا

کیا ہوا؟"

مولانا تیمور کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولے ۔ ۔ ۔ ۔ گمر آواز ڈوبی ڈوبی تھی:

"اور پھر تاتاریوں کی عزت، ظفر یاب کی دلہن، جس کا ابھی اس نے منہ بھی نہ دیکھا تھا، مغل لٹیرے ز

اٹھا کر لے گئے۔"

"مولانا ۔ ۔ ۔ ۔!" تیمور دھاڑا جیسے کوئی سوتے سے شیر کو جگا دے۔

"قسم ہے خالقِ کائنات کی۔"

تیمور نے دیوار سے کمان اور ترکش اتارا، ڈھال کو بائیں بازو پر چڑھایا۔ کمان شانے سے لٹکا

تلوار کو بے نیام کرتے ہوئے بولا:

"انتقام ۔ ۔ ۔ ۔ انتقام ۔ ۔ ۔ ۔ انتقام ۔ ۔ ۔ ۔ میں جا رہا ہوں مولانا۔"

مولانا اور دوسرے لوگ بھی گھبرا کے تیمور کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ مولانا نے تیمور کو ایسے

جلال میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ دل میں خوش تھے کہ شیر جاگ پڑا ہے۔ تاتاری غیرت بیدار ہو گ

مولانا نرمی سے بولے:

"کہاں جا رہے ہو تیمور؟"

"شمال میں مولانا۔ جہاں میری تاتاری بہنیں قید ہیں۔"

پھر تیمور نے ظفر یاب کی طرف رخ کر کے کہا:

"جہاں ایک بے کس و بے بس دلہن اپنے دولہا کا انتظار کر رہی ہے۔"

"شاباش تیمور۔"

مولانا نے اس کی حوصلہ افزائی کی:

"تمہیں شمال میں ضرور جانا ہے۔ تمہیں اپنی بہنوں کو آزاد کرانا ہے۔ بچھڑی دلہن کو دولہا سے ملانا ہے مگر

نہیں اور اس حال میں بھی نہیں۔"

"مولانا!"

تیمور بگڑ گیا، بپھر پڑا:

"فرض یاد دلا کر آپ مجھے فرض سے روک رہے ہیں یا آپ مجھے بزدل سمجھتے ہیں۔"

"تم فرض شناس ہو اور شجاع بھی۔"

مولانا نے تیمور کے بازو پر چڑھی ڈھال پر ہاتھ رکھا:

"پہلے تمہیں تاتاریوں کو اکٹھا کرنا ہو گا۔ ان میں جوش و خروش پیدا کرنا ہو گا۔ پوشیدہ طریقے سے لشکر

پھر تم جاؤ گے۔ بلادِ شمال کے خانِ اعظم سے ٹکراؤ گے۔ فتح تمہارے قدم چومے گی۔"

ذرا دیر تک مولانا زین الدین کو گھورتا رہا۔ اس نے تلوار بھی نیام میں کر لی۔ پھر پُرسکون ہوتے ہوئے بولا:

"مولانا۔ میں نے اب تک آپ کی کوئی بات رد نہیں کی لیکن یہ مسئلہ نہ تو شرعی ہے اور نہ سیاسی یہ تو

انی مسئلہ ہے۔ وہ قوم جو غلامی قبول کر لیتی ہے اس کے اعضا شل ہو جاتے ہیں۔ حوصلے پست پڑ جاتے

ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ تاتاری غلام ہو چکے ہیں

کے خلاف تلوار سا اٹھانے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ وہ یکجا نہیں ہو سکتے۔ میں لشکر تیار نہیں کر

تاتاریوں کو مغلوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ مگر میں پھر بھی جاؤں گا اور مغلوں کے پہاڑ

"تمہارا ایک فرض اور بھی تو ہے اور وہ فرض اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔" مولانا نے تیمور کو اس کے اس

سے روکنے کے لیے اپنی کوشش کو ایک اور رُخ دیا۔

تیمور تو اس وقت بالکل باغی ہو چکا تھا۔ سختی سے بولا:

"اس سے بڑا اور کوئی فرض نہیں ہے مولانا۔ آپ نے مجھے غفلت سے بیدار کیا ہے اب میرے آنے کی کوشش نہ کیجیے۔ مجھے گستاخی کا موقع نہ دیجیے۔"

"مجھے گستاخی کی پروا نہیں۔" مولانا استقلال سے بولے۔

"لیکن میں تمہیں فرض یاد دلانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ تمہیں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اپنے انتظام کرنا ہوگا۔"

"میں انہیں آپ کے ساتھ شہر سبز بھیج دوں گا۔" تیمور نے جواب دیا جیسے وہ پہلے ہی اس کا فیصلہ

"یہ کس طرح ممکن ہے تیمور۔"

مولانا اسے سمجھانے لگے:

"شہر سبز کسی طرح محفوظ نہیں۔ آئے دن مغل حملے کرتے رہتے ہیں...... خدا نخواستہ کچھ ہو کمزور ہاتھ مغلوں کے پہلے ہی وار میں قتل ہو جائیں گے۔ میں تمہارے اور خدا کے سامنے شرمندہ نہیں الجائی اور جہانگیر کو کسی طرح بھی شہر سبز نہ لے جاؤں گا۔"

تیمور فکر میں پڑ گیا۔

اس نے الجائی خاتون اور جہانگیر کو شہر سبز بھیجنے کا فیصلہ فوری طور پر کیا تھا لیکن مولانا سے یکسر بدل گئی تھی۔ جہانگیر کی عمر پانچ سال کی تھی۔ وہ اس قابل نہ تھا کہ میدان جنگ کی صعوبتیں برداشت جب وہ چچا کے خلاف جنگ میں مصروف تھا۔ الجائی خاتون اور جہانگیر اپنے ماموں امیر حسین کے پاس سے رہے تھے لیکن اب امیر حسین، مغلوں سے شکست کھا کر نہ معلوم کہاں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اس کی جگہ جتہ سردار حکومت کر رہا تھا۔

تیمور جس وقت زور سے چیخا تھا تو اس کی آواز مردانے سے گزر کر زنانخانے میں پہنچی تھی۔ تو چھوٹی کمان کا چلہ کھینچے کسی چڑیا کا نشانہ لے رہا تھا۔ باپ کے چیخنے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو گیا۔ وہ سہما سہما ماں کے پاس پہنچا۔ الجائی خاتون بھی گھبرا گئی تھی۔ وہ جہانگیر کو لیے مردانے اور زنا والی دیوار کے پاس پہنچی اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر کان باہر کی طرف لگا دیے۔

تیمور اور مولانا کی گفتگو اس کے کان تک صاف پہنچ رہی تھی۔ الجائی خاتون نے ایک کنیز کو بلا

تیمور اسی کش مکش میں تھا کہ الجائی خاتون کی کنیز امور کے پاس پہنچی اور ادب سے بولی:

"آقائے محترم! خاتون آغا آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔"

خاتون آغا، تیمور کی بیوی الجائی خاتون کا خطاب تھا۔ تیمور نے گہری سوچ سے سر اٹھا کر الجائی خاتون کنیز کو دیکھا۔ پھر اچانک اس کی نظر اس جوان پر پڑ گئی جس کی دلہن کو مغل اٹھا کر لے گئے تھے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"ظفریاب۔" ظفریاب کا لہجہ بڑا اداس تھا۔

"اور میری بدقسمت بہن کا کیا نام ہے؟"

"گل عذار۔"

"گل عذار۔"

تیمور زیر لب بولا:

"ظفریاب۔ جاؤ اور شہر سبز میں اس خبر کا انتظار کرو کہ تیمور تمہاری گل عذار کو واپس لا رہا ہے یا مغلوں نے مارا گیا ہے۔"

"معزز سردار۔"

ظفریاب بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

"آپ میری گل عذار کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں اور میں شہر سبز میں بیٹھ کر خبر کا انتظار کروں میرا اتنا مرد نہیں ہے سردار۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ مجھے تو گھر والوں نے پکڑ کر کمرے میں بند کر تھا ورنہ مغل میرے جیتے جی گل عذار کو نہیں لے جا سکتے تھے۔"

تیمور کے ہونٹ ہلکے سے ہلے۔ شاید وہ مسکرایا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کو لوگ ترستے تھے۔ تیمور نے قہقہہ بلند نہیں کیا۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اس کی محفل یا دربار میں کبھی کسی مسخرے کو باریابی نصیب ہوا۔

"ہم تمہیں اپنے ساتھ لے چلیں گے ظفریاب۔"

ظفریاب کے چہرے پر شکر گزاری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ تیمور مولانا سے اجازت لے کر اندر کی طرف چلا۔

الجائی خاتون دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ تیمور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ الجائی
دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ الجائی اپنے بیٹے جہانگیر کے سر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ جہانگیر نے تیمور کو آتے دیکھا
لی اور سر جھکا لیا۔ وہ تیمور سے بہت ڈرتا تھا۔

"الجائی خاتون آغا ۔ ۔ ۔ ۔ تم یہاں ؟"

تیمور نے ماں بیٹے کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور شاید پدرانہ محبت سے مجبور ہو کر اس کا ہاتھ
سر پر پہنچ گیا۔ الجائی خاتون کا ہاتھ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ تیمور کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑا تو الجائی خاتون
کر تیمور کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

"خاتون آغا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ؟"

الجائی خاتون سسکی بھر کے رہ گئی۔ شاید الفاظ اس کا ساتھ نہ دے سکے۔

تیمور کی نظریں جہانگیر کے ہاتھ میں دبی کمان پر پڑیں۔

"او ہو۔ ہمارا بیٹا جہانگیر تیر اندازی کر رہا تھا۔ کتنے شکار مارے ؟"

جہانگیر نے تیمور کو مہربان دیکھا تو معصومیت سے کہا :

"بابا۔ میں نے نشانہ باندھا تھا لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جہانگیر نے رک کر سر اوپر اٹھایا اور ماں کو دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ آگے کچھ کہوں یا نہ کہ

"ہاں بیٹے۔ تم نے نشانہ باندھا لیکن تمہارا شکار تیر چلانے سے پہلے ہی نشانے سے ہٹ گیا۔"

اندازے کے مطابق اس کا جملہ خود پورا کر دیا۔

"نہیں بابا۔ شکار نہیں ہٹا۔" جہانگیر نے اسی معصومیت سے کہا۔

"پھر کیا ہوا بیٹے۔" تیمور کا تجسس بڑھ گیا۔

"پھر میں ڈر گیا بابا۔"

"ڈر گئے۔ تم ڈر گئے جہانگیر ۔ ۔ ۔ ۔ کس نے ڈرایا تمہیں۔"

"آپ کی آواز نے بابا ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کسی کو ڈانٹ رہے تھے۔ میں تیر چلا ہی نہیں سکا۔"

تیمور کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ جہانگیر کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا :

"ہم تو تمہارے بابا ہیں جہانگیر۔ ہم سے کیوں ڈرتے ہو ؟"

سب ہی تو آپ سے ڈرتے ہیں۔ امی بھی ڈرتی ہیں۔"

جہانگیر کا ایک ایک لفظ تیر کی طرح تیمور کے دل میں آویزاں ہوتا چلا گیا۔

"امی کہتی ہیں۔ آپ ہمیں چھوڑ کر پھر چلے جائیں گے۔"

جہانگیر کے اس جملے نے تیمور کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے دل میں پدرانہ شفقت اور
محبت کا سمندر موجزن ہو گیا۔ الجائی خاتون کی خاموش محبت نے بھی جوش مارا۔

"خاتون آغا۔" تیمور نے بڑے پیار سے بیوی کو دیکھا۔

الجائی خاتون کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے تیمور کو دیکھنے لگی۔

"ہم تمہیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے خاتون۔" تیمور نے کہا۔

خاتون آغا کا دل خوشی سے کھل گیا۔

"تو آپ نہیں جائیں گے بابا۔" جہانگیر نے فوراً تصدیق کرانا چاہی۔

"ہم جائیں گے جہانگیر ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن تم دونوں ہمارے ساتھ ہو گے۔"

الجائی خاتون کی خشک آنکھوں میں ایک دم خوشی کے آنسو تیر گئے۔ جہانگیر باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

شہر سبز میں ظفریاب اور گل عذار کے مکانات ایک ہی محلے میں تھے۔ چنانچہ بارات ایک گھر سے چڑھی اور
دوسرے گھر اسی رات دلہن رخصت ہو کر آ گئی۔

ظفریاب دوستوں میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ اس پر مغلوں کی قیامت ٹوٹ پڑی۔ مغل بڑے منظم
طریقے سے تاتاری آبادیوں کو لوٹتے اور لڑکیوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے۔ انہوں نے پہلے بڑی خاموشی سے گھر کے
دروازے کو گھیرا۔ پھر پانچ مغل تلواریں کھینچتے ہوئے زنانے حصے میں گھس گئے۔ مردوں کو اس وقت خبر ہوئی جب
اندر سے عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں۔ وہ زنان خانے کی طرف دوڑے لیکن مغل سواروں کی چمکتی تلواروں
نے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔

گھر والے ابھی حالات کا پوری طرح اندازہ بھی نہ کر پائے تھے کہ مغل سوار گھوڑے سے موڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مغل سوار گل عذار اور اس کی پانچ سہیلیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔

یہ ڈاکو آندھی کی طرح آئے اور بگولوں کی طرح نکل گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ ظہیر کا سب سے خراب تھا۔ وہ ابھی دلہن کا تصور لیے دوستوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور اب اس کی خوشیو پڑ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ تلوار کھینچ کر گھوڑے کی طرف بڑھا۔ دوستوں نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا کتنی تعداد میں آئے تھے کسی کو اندازہ نہ تھا۔ پھر رات میں ان کا تعاقب کرنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ نتیجہ سب رو دھو کر بیٹھ گئے۔ غلامی کا دوسرا نام کم ہمتی ہے۔ تاتاریوں پر مغلوں کا اتنا رعب بیٹھا ہوا تھا کہ وہ سائے سے بھی ڈرتے تھے۔

مغل ڈاکو لڑکیوں کو اپنے آگے بٹھائے گھوڑے بھگاتے چلے جا رہے تھے۔ لوٹ کا قیمتی سامان خا پر بار کر رکھا تھا۔ یہ جب لوٹ مار کرنے نکلتے تو اتنی ہی تعداد میں گھوڑے ساتھ رکھتے تھے تاکہ ہر ایک اپنا گھوڑے پر لاد لے۔ مغلوں کو اس ڈکیتی میں کافی سامان ہاتھ لگا تھا۔ انہوں نے شادی کے گھر کو تاراج کیا تھا۔ پورا جہیز اور مہمان خواتین کے زیورات وہ اٹھا لائے تھے۔ گل عذار اور اس کے ساتھ گرفتار ہونے والی سہیلیاں نے ابھی تک اپنا قیمتی زیور نہ اتارا تھا اور وہ اسی حالت میں گرفتار ہو گئی تھیں۔

مغل سواروں کی تعداد صرف بیس تھی۔ وہ رات بھر بغیر دم لیے گھوڑے بھگاتے رہے۔ صبح کو جب نمودار ہوا تو انہوں نے گھوڑے روکے۔ انہیں اپنے تعاقب کا خدشہ تو نہ تھا۔ پھر بھی وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ ان کا مقصد لڑائی جھگڑا یا جنگ کرنا نہ تھا۔ وہ مال و دولت حاصل کرنے آتے تھے اور ان کا مقصد حاصل ہو گیا تھا۔

اغوا ہونے والی لڑکیاں ان کے لیے دولت کا بہت بڑا ذریعہ تھیں۔ ان لڑکیوں کو پکڑ کر وہ مغل (لشکر) میں لے جاتے اور بھاری رقم کے عوض فروخت کر دیتے تھے۔

مغلوں میں یہ دستور تھا کہ جنگ یا امن کے زمانے میں وہ ایک سے دوسری جگہ جاتے تو پورے گھر اہل و عیال کے ساتھ جاتے تھے۔ بلادِ شمال سے خانِ اعظم کے ساتھ جو لشکر تاتاریوں پر حملہ آور ہوا تھا وہ بھی تاتاری علاقوں میں آیا تھا۔ خانِ اعظم تو واپس جا چکا تھا لیکن اس کا بیٹا شہزادہ الیاس اور ایک جتہ سردار بیگ لشکر کے ساتھ سمرقند سے پندرہ میل اوپر ٹھہرا ہوا تھا۔

یہ ان کی عارضی مستقر یا خیمہ گاہ تھی۔

مغلوں کی یہ خیمہ گاہ ایک پورا شہر تھا۔ خیموں کا یہ شہر تین میل کے رقبے میں بالکل اس طرح پھیلا تھا جیسے کہ ہمارے ملک میں افغان مہاجرین کی خیمہ بستیاں ہیں۔ مغلوں کے خیمے آجکل کی طرح کے نہ ہوتے تھے۔ مغل خیموں کے بجائے گھر کہتے تھے۔ وہ بانس کی شاخوں کا گنبد سا بناتے، بالکل اس طرح کا جیسا قائداعظمؒ کے مزار کا گنبد ہے۔ بانس کے اس ڈھانچے پر وہ نمدہ چڑھاتے تھے۔ جب وہ کسی جگہ جاتے تو ان مکانوں کو بیس فٹ کی بیل گاڑیوں پر لاد دیتے تھے۔ ان گاڑیوں میں بائیس بائیس بیل جوتے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ مغلوں کے بائیس خاندان تھے جنہیں مغلوب کر کے چنگیز خان نے ایک بڑی حکومت قائم کی تھی۔

شہزادہ الیاس خواجہ اور سردار بیگ جک اسی خیمہ گاہ میں رہتے تھے۔ ان کے خاندان والے اور فوجی دستے دوسرے سے کچھ فاصلے پر مقیم تھے۔ خیمہ گاہ میں بڑے بڑے بازار تھے جہاں خرید و فروخت کے سامان سے دکانیں بھری رہتی تھیں۔ کھیل کود اور تماشے والے بھی یہاں آ بسے تھے۔ کوہستانی گانے بجانے اور رقص کرنے والے بھی ان میں گھومتے اور مغلوں کا دل خوش کر کے پیسے بٹورتے تھے۔ مغل فاتح تھے ان کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ مال و دولت کی انہیں کمی نہ تھی۔ تاتاری علاقوں میں مغلوں کو لوٹ مار کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔

خانِ اعظم نے شمال میں جاتے وقت الیاس خواجہ اور بیگ جک کو تاکید کی تھی کہ اب وہ تاتاری علاقوں کے مالک ہیں۔ تاتاریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ان کا فرض ہے۔ سوائے عاید شدہ خراج کے ان سے اور رقم وصول نہ کی جائے لیکن اس کے واپس جاتے ہی الیاس خواجہ اور بیگ جک نے ہاتھ پاؤں نکال لیے۔ انہوں نے بڑے بڑے شہروں میں فوجی چوکیاں قائم کر دی تھیں لیکن لشکر کو خیمہ گاہ میں رکھا تھا تاکہ اگر تاتاری بغاوت کریں تو پوری طاقت سے یلغار کر دی جائے۔ تاتاریوں سے انہیں کوئی ہمدردی نہ تھی۔ انہیں تو صرف دولت چاہیے تھی اور وہ لوٹ مار سے حاصل ہو سکتی تھی۔ ہر لوٹ مار میں ان کا حصہ ہوتا تھا۔ لڑکیوں کی فروخت سے جو رقم حاصل ہوتی اس میں سے نصف الیاس خواجہ اور بیگ جک کو پہنچا دی جاتی۔

دوسرے دن مغل سوار گل عذار، اس کی سہیلیوں اور لوٹے ہوئے سامان کے ساتھ خیمہ گاہ میں پہنچ گئے۔

الیاس خواجہ نے حکم دے رکھا تھا کہ جب مغل سوار اس قسم کی کوئی واردات کر کے واپس آئیں تو سمرقند میں ہرگز داخل نہ ہوں کیونکہ خانِ اعظم نے تیمور کو سمرقند کا مقامی ناظم مقرر کیا تھا اور الیاس خواجہ اور بیگ جک کو تاکید کی گئی تھی کہ تیمور کی دل آزاری نہ کی جائے۔

مغلوں کو سمرقند کے اندر بھی کسی قسم کی لوٹ مار کی اجازت نہ تھی۔ اسی وجہ سے گل عذار کو لانے والے سمرقند سے

کترا کر دوسرے راستے سے مغلوں کی خیمہ گاہ پہنچ گئے۔

گل عذار یا اس کی سہیلیوں کو راستے میں کوئی تکلیف نہ دی گئی۔ انہیں اچھا کھانا اور پھل مہیا کیے گئے کیونکہ یہ لڑکیاں فروخت کا مال تھیں۔ اگر وہ بیمار ہو جاتیں تو پھر ان کی اچھی قیمت نہ ملتی۔

خیمہ گاہ میں جو تاتاری تھے وہ غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ دکان لگا کر یا پھیری میں سودا بیچتے تھے۔ ان میں نہ تو حوصلہ تھا کہ وہ تاتاری لڑکیوں کو فروخت سے روک سکتے۔ ۔ ۔ ۔ اور نہ ان کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ مظلوم لڑکیوں کو خرید کر آزاد کر سکتے۔

وہ منظر بڑا دردناک ہوتا جب کسی تاتاری دکاندار کے خاندان کی کوئی لڑکی گرفتار ہو کر آتی اور خیمہ گاہ کے بازار میں فروخت کے لیے کھڑی کر دی جاتی۔ لڑکی اور دکاندار ایک دوسرے کو پہچان لیتے۔ لڑکی حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتی لیکن دکاندار کا سر شرمساری سے جھک جاتا اور بے بسی کے آنسو آنکھوں سے نکل پڑتے۔

مغل سوار خیمہ گاہ میں پہنچے تو انہیں سب سے پہلے فوجی چوکی پر حاضری دینا پڑی۔ یہ چوکی اس لیے بنائی گئی تھی کہ خیمہ گاہ کے بازاروں میں فروخت کے لیے جو سامان آئے اس پر سرکاری ٹیکس وصول کیا جا سکے۔ خیمہ گاہ کے چاروں طرف تمام راستوں پر اس طرح کی متعدد چوکیاں قائم تھیں۔ لوٹ کے مال کا آدھا حصہ حتمی طور پر ان چوکیوں پر وصول کیا جاتا اور شام کو ایاس خواجہ اور بیک جک کو آدھا آدھا پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس لیے آنے والی لڑکیوں کی تعداد یہاں درج کر لی جاتی تھی تاکہ فروخت کرنے والے لڑکیوں کو بیچ کر آدھی رقم پہنچا دیں۔

شہرِ سبز سے آنے والے مغلوں نے بھی نصف مال چوکی والوں کے حوالے کر دیا۔ لڑکیوں کی تعداد درج ہو گئی۔ اب مغل اپنا پتہ درج کرا رہے تھے۔ تاکہ اگر وہ لڑکیوں کی فروخت کی رقم کا مطلوبہ حصہ چوکی میں نہ آئیں تو انہیں تلاش کر کے گرفتار کیا جا سکے۔

گل عذار اور اس کی سہیلیاں چوکی کے سامنے ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھی تھیں۔ ان کے آتار کر ٹیکس کے کھاتے میں جمع کرا دیے گئے تھے۔ ان مظلوم اور بے کس لڑکیوں نے گھوڑوں پر آگے بیٹھ کر سفر کیا تھا لیکن انہیں بھوک پیاس کی کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اور انہیں پکڑنے والوں نے ان کی کسی قسم کی دل آزاری نہ کی تھی۔ اس لیے ذہنی فکر اور پریشانی کے باوجود ان کے چہرے قدرتی حسن سے شگفتہ تھے۔

یہ سب کی سب شہرِ سبز کی شریف زادیاں اور اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ صورت، شکل میں

شہرِ سبز کی گنی چنی لڑکیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ ان کے نقوش مغل لڑکیوں ہی جیسے تھے کیونکہ مغل اور تاتاروں کے خاندانوں کی شاخیں آگے جا کر مل جاتی تھیں۔ مغل، ترک، تاتار، ترکمان سب ایک ہی قوم کی مختلف شاخیں تھیں جو مختلف زمانوں میں مختلف علاقوں میں آ کر آباد ہو گئی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ تاتاری مسلمان ہو گئے تھے اور شہروں میں مہذب زندگی گزار رہے تھے اور شمال کے مغل اب تک قدیم، وحشیانہ اور خانہ بدوش زندگی کے عادی چلے آ رہے تھے۔

شہر میں رہنے کی وجہ سے تاتاری لڑکیوں کے تیکھے نقوش میں رعنائی اور جاذبیت پیدا ہو گئی جبکہ مغل لڑکیوں کے چہرے کرخت اور وحشت زدہ تھے۔ گل عذار تو شہرِ سبز کی حسین ترین لڑکی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنے خیالوں میں گم تھی کہ ایک مغل اس سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تو گل عذار کو بغور اور دلچسپی سے دیکھتا رہا پھر اس کے قریب آ گیا۔

گل عذار نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ ایک خوفناک چہرے والے کو اپنے سے اتنا قریب دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو گئی۔ وہ جوان تھا لیکن اس کا چہرہ بڑا وحشیانہ تھا۔ اس نے گل عذار کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو ہنسنے لگا۔ اس کی ترچھی آنکھیں اور ترچھی ہو گئیں۔

گل عذار اس کی آنکھوں میں خوفناک پرچھائیاں دیکھ کر لرز اٹھی۔

"کھڑی ہو۔ چل میرے ساتھ۔" مغل نے جیسے حکم دیا۔

"نہیں۔" گل عذار کے منہ سے اک دم نکل گیا۔ پھر سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

گل عذار کی سہیلیوں کا خوف کی وجہ سے رنگ پیلا پڑ گیا۔ راستے میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی اس وجہ سے وہ تقدیر پر صابر و شاکر بیٹھی تھیں مگر اس نئی صورتحال نے ان کے جسم میں کپکپی پیدا کر دی۔

مغل کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ پھر سخت لہجے میں بولا۔

"اٹھ گھوڑی کی اولاد، تاتاری۔ ۔ ۔ ۔"

گل عذار نے کوئی جواب نہ دیا تو مغل جوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ گل عذار کی زور سے چیخ نکل گئی۔ گل عذار کو لانے والے سر جھکائے اپنے نام اور پتے لکھانے میں مصروف تھے۔ گل عذار کی آواز پر انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ایک لمحہ میں وہ سارا معاملہ سمجھ گئے۔ ان میں سے ایک تیزی سے اٹھا اور اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا لڑکیوں کے پاس پہنچ گیا۔

بدصورت مغل جوان، گل عذار کو کھینچ کر اپنی طرف لانے کی کوشش کر رہا تھا گل عذار بھی
۔ وہ پوری مدافعت کر رہی تھی۔ اس نے اپنی دونوں کہنیاں مغل جوان کے سینے میں اڑا دی تھیں

"چھوڑ دو اوغلو خان۔ یہ میری قیدی ہے"۔

یہ اس مغل کی آواز تھی جو چنگی والوں کے پاس سے سب سے پہلے لڑکیوں کے پاس پہنچا تھا۔
اوغلو خان کی گرفت نرم پڑ گئی۔ گل عذار تڑپ کر دور جا کھڑی ہوئی۔ اوغلو خان کی آنکھیں غصے
سے بنی تھیں۔

"تو کون ہوتا ہے مجھے حکم دینے والا۔ جانتا ہے میں کون ہوں"۔

"جانتا ہوں اوغلو خان"۔

مغل نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

"تم شہزادے ہو اور شہزادے الیاس خواجہ خان کے سالے بھی ہو لیکن یہ میری قیدی ہے
میں لے جا سکتے"۔

اوغلو خان کا ہاتھ تیزی سے کمر میں لگے برچھے پر پہنچ گیا:

"تم ایک شہزادے سے بدتمیزی کر رہے ہو۔ اس کی سزا جانتے ہو"۔

"یہ کوئی بدتمیزی نہیں"۔

مغل نے بھی ہاتھ تلوار کے قبضے پر جما لیا:

"میں اور میرے ساتھی ان لڑکیوں کو پکڑ کر لائے ہیں۔ میں نے آدھا مال چنگی خانے میں جمع کرا
لڑکیاں میری ملکیت ہیں۔ ان پر کوئی قبضہ نہیں کر سکتا"۔

اس تکرار کے دوران، مغل کے باقی ساتھی اور چنگی کا منشی مع اپنے دس مسلح سپاہیوں کے
، کے کہ اوغلو خان کا برچھا نکلے یا مغل تلوار بلند کرے، منشی ان کے درمیان حائل ہو گیا۔

"اوغلو خان یہ کیا کر رہے ہو؟"

منشی سختی سے بولا:

"یہ لڑکیاں مغل سرکار اور ان لوگوں کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ انہیں فروخت کر کے آدھی رقم
سردار بیک جک کو ادا کی جائے گی"۔

"میں بھی مغل شہزادہ ہوں"۔

اوغلو چیخ کر بولا:

"قیدیوں پر میرا بھی حق ہے۔ میں بھی تاتاریوں کا آقا ہوں"۔

"بحث مت کرو اوغلو خان"۔

منشی نے اوغلو خان کی مطلق پروا نہ کی:

"تمہارا ملک تاتار پر کوئی حق نہیں۔ تم کسی علاقے کے حاکم نہیں۔ تمہارا حق الیاس خواجہ خان پر ہے۔
اس سے اپنا حق طلب کرو۔ یہ لڑکیاں فروخت کی جائیں گی۔ جو ان کی قیمت ادا کرے گا وہ اپنے ساتھ
لے جائے گا"۔

اوغلو خان اتنے آدمیوں میں گھر گیا تھا۔ اس نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سونے
کا کڑا تھا۔ وہ ہاتھ سے اتارا۔ پھر اس پر تھوک کر مغل کی طرف پھینکتے ہوئے بولا:

"لے۔ میں نے اس کی قیمت ادا کر دی"۔

پھر پیٹھ گھما کر گل عذار کی طرف بڑھا۔

مغل کا ہاتھ پہلے ہی شمشیر کے قبضے پر تھا اس نے بڑی پھرتی سے تلوار کھینچ لی اور گل عذار کے سامنے
کھڑا ہو گیا:

"اوغلو خان خبردار۔ قدم آگے نہ بڑھانا"۔

اوغلو خان رک گیا۔

"کیوں؟ میں نے قیمت ادا کر دی ہے۔ اب یہ میری ملکیت ہے"۔

"نہیں"۔

مغل بھی ضد پر اڑ گیا تھا۔ اس نے تلوار ہوا میں لہرائی اور اوغلو خان کو گھورنے لگا جیسے وہ اسے
دعوتِ مبارزت دے رہا ہو۔

مغل کو معلوم تھا کہ اوغلو خان، حاکمِ سمرقند الیاس خواجہ کا سالا ہے اور اس سے جنگ کا نتیجہ اس کے حق
میں اچھا نہ ہو گا لیکن ہر مغل فطری طور پر سرکش اور ضدی ہوتا ہے۔ جب اسے ضد چڑھ جائے تو پھر کسی کا لحاظ نہیں
کرتا۔ اوغلو خان نے پہلے برچھے پر ہاتھ ڈالا۔ پھر کچھ سوچ کر تلوار نکالی۔ چنگی کا منشی اس موقع پر بھی ان کے

درمیان میں آ گیا۔

اوغلوخان نے منشی سے شکایت بھرے لہجے میں کہا:

"دیکھو۔ اس کی شرارت۔ میں نے قیمت ادا کر دی پھر بھی یہ مغل شہزادے پر تلوار اٹھا رہا ہے!"

منشی نے سوالیہ نظروں سے مغل کی طرف دیکھا۔ اس کے خیال میں بھی معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ شہزادے نے قیمت دے دی تھی۔ اب مغل کی سراسر زیادتی تھی۔

مغل نے اسی طرح تلوار لہراتے ہوئے اطمینان سے کہا:

"مجھے یہ سودا منظور نہیں۔ ممکن ہے بازار میں مجھے اس سے دوگنا قیمت ملے۔ پھر میں نقصان کیوں اٹھاؤں؟"

"مجھ سے زیادہ قیمت کون دے سکتا ہے؟"

اوغلوخان دھاڑا:

"اتنا وزنی کڑا کسی کے پاس نہیں۔"

"اس کا فیصلہ تو بازار ہی میں ہو گا۔" مغل نے صاف جواب دیدیا۔

منشی کو بولنا پڑا:

"اوغلوخان۔ تم اسے مجبور نہیں کر سکتے۔ تمہیں لڑکی کو حاصل کرنا ہے تو بازار میں بولی لگا کر خرید لو۔"

اوغلوخان پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس نے تلوار نیام میں کر لی۔ بولا:

"اچھا لے چل بازار میں۔ دیکھتا ہوں مجھ سے زیادہ قیمت کون دیتا ہے۔"

مغل کا دماغ جیسے بالکل ہی پھر گیا تھا:

"لڑکیاں ابھی بازار نہیں جائیں گی۔"

"کیوں نہیں جائیں گی؟" اوغلوخان کے بجائے یہ سوال چنگی کے منشی نے کیا جسے اب مغل پر غصہ آ رہا تھا۔

"لڑکیوں کو بازار میں لے جانا ہو گا۔ ان کی آدھی قیمت مجھے وصول کرنا ہے۔"

مغل لاپروائی سے بولا:

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ لڑکیاں ابھی تھکی ہوئی ہیں۔ طویل سفر نے انہیں مضمحل کر دیا ہے۔ حسن ماند پڑ گیا ہے۔ آج یہ آرام کریں گی۔ تاکہ کل جب میں انہیں بازار میں لے جاؤں تو ان کا حسن نکھرا ہوا ہو۔ مجھے ان کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول ہو گی۔"

مغل نے بڑا معقول جواب دیا تھا۔ چنگی کا منشی اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے اوغلوخان کو مخاطب کیا:

"شہزادے! اپنے گھر جا کر آرام کرو۔ کل لڑکیوں کی بولی ہو گی۔ خرید سکتے ہو تو قیمت دے کر حاصل کر لینا۔"

اوغلوخان بزدل نہ تھا۔ اگر منشی موجود نہ ہوتا تو شاید وہ مغل سے لڑ پڑتا۔ لیکن منشی سے الجھنا مناسب نہ تھا۔ منشی، الیاس خان کا ملازم تھا اور الیاس خان اپنے ملازموں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ پھر منشی اس کے اعتماد کا آدمی تھا۔ اس کے ذریعے لوٹ کے مال کا پورا حصہ اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔

پہلے اوغلوخان نے تلوار نیام میں کی۔ پھر مغل نے بھی تلوار نیام میں ڈال لی۔ منشی کی وجہ سے بات رفع دفع ہو گئی۔

چنگیز خان اور ہلاکو خان کی سفاکی اور ہلاکت خیزی سے قطع نظر، تاریخ عالم انہیں دنیا کے عظیم فاتحوں میں شمار کرنے میں حق بجانب ہے۔ چین کا شہنشاہ قبلائی خان بھی اسی نسل سے تھا۔ یہ سب مغل تھے۔ مغلوں کی قومیت ہر دور میں زیر بحث رہی ہے۔ شروع میں یہ الفاظ "منگ کو" تھا جس کے معنی "بہادر لوگ" یا "سنہری لوگ" ہوتے ہیں۔ یہ قوم سائبیریا کی قدیم قوم تنگوسی اور قدیم ترک دونوں کی نسل سے تھی۔ اونچے قد اور مشقت پسند یہ لوگ صحرائے گوبی اور شمال کے ہموار میدان میں رہتے تھے۔ منچین، ہن اور ہیونگ نو بھی مغل قومیت رکھتے تھے۔

چنگیز اور ہلاکو کے بعد اس قوم پر زوال آیا۔ دو سو سال کے مختصر عرصے میں مغلوں کی حکومت پارہ پارہ ہو گئی تیمور کے زمانے میں ان کی وسط ایشیا اور مغربی ایشیا میں صرف دو حکومتیں باقی رہ گئی تھیں۔ وسط ایشیا کی مغل حکومت سمرقند کے اوپر اوپر دریائے سائبیر سے بحیرہ ارال تک پھیلی تھی۔ اس کا صدر مقام حصار المالیق تھا اور یہاں چنگیز خان کے منجھلے بیٹے چغتائی خان کی نسل حکمران تھی۔ بلادِ شمال کا خانِ اعظم تغلق تیمور جس نے تیمور کو سمرقند کی نظامت سونپی تھی، اسی نسل کا حکمران تھا۔ شہزادہ الیاس خواجہ خان اسی کا بیٹا تھا جو ان دنوں سمرقند سے

کچھ دور مغل خیمہ گاہ میں بیٹھا محکوم تاتاریوں کی دولت لوٹ رہا تھا۔

اس دن خیمہ گاہ کے بڑے بازار میں بڑی رونق تھی۔ کل جنگی پر شہزادہ اوغلوخان کا جو
تھا اس کا چرچا پورے لشکر میں ہو گیا تھا۔ اوغلوخان، ایاس خواجہ کی پہلی بیوی کا بھائی تھا۔ ایک تو مغل
بیوی کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اوغلوخان کا باپ بڑا دولت مند اور بااثر مغل تھا۔ اس نے
اکلوتے بیٹے اوغلوخان کے لیے سونے چاندی کے علاوہ بہت سے قیمتی جواہرات بھی چھوڑے تھے۔ اوغلو
دولت بڑی بے دردی سے خرچ کر رہا تھا۔ وہ بلا کا عیاش تھا۔

مغل بستیوں کے قریب باقاعدہ قحبہ خانے قائم کیے جاتے تھے جہاں طوائفیں مغل جوانوں کا دل بہ
تھیں۔ جب مغل لشکر کسی طرف کوچ کرتا تو طوائفیں بھی لشکر کے ساتھ چلتی تھیں۔ اوغلوخان کا بیشتر وقت
طوائفوں کے خیموں میں گزرتا تھا۔ اوغلوخان کے پاس ان فضول خرچیوں کے باوجود کافی دولت تھی اور پور
میں اس سے زیادہ کوئی امیر نہ تھا۔

بازار لگا تو سب کا یہی خیال تھا کہ تاتاری لڑکی گل عذار کو اوغلوخان بڑی سے بڑی بولی دے کر خرید
لشکریوں میں کوئی اتنا امیر نہ تھا۔ اگر ہوتا بھی تو اوغلوخان جیسے خودسر اور بدقماش شہزادے کے مقابلے
خواہ مخواہ کا جھگڑا کیوں مول لیتا۔ دوسرا کوئی شہزادہ لشکر گاہ میں موجود نہ تھا۔ خانِ اعظم کے ساتھ آنے
شہزادے اس کے ساتھ ہی حصار المالیق واپس چلے گئے تھے۔ اس طرح اوغلوخان کی کامیابی یقینی تھی۔

تاتاری لڑکیوں کو خوب بناؤ سنگھار کرا کے بازار میں لایا گیا۔ ان کا دل بجھا ہوا تھا لیکن گہنایا ہوا
بھی خوبصورت لگتا ہے۔ ان کے اداس چہرے قدرتی حسن کو چھپانے سے قاصر تھے۔

تاتاری لڑکیاں خوبصورت ہونے کے علاوہ صحت مند بھی ہوتی تھیں۔ جو لڑکی زیادہ صحت مند
قیمت زیادہ لگتی خواہ وہ خوبصورت زیادہ نہ بھی ہو۔ اس لیے کہ یہ لڑکیاں گھر کے کام کاج کے لیے خرید
دل بہلانا وہ ایک ثانوی چیز تھی۔ امیر سرداروں کی بیویاں اپنے شوہروں کو تاکید کرتی تھیں کہ ان کے لیے
لڑکی خرید کر لائیں تاکہ وہ گھر کے کام کاج کے علاوہ مغل بیگمات کی بھی اچھی طرح خدمت کر سکیں۔ مغل عورتیں
جفاکشی و مشقت کی عادی نہ رہی تھیں۔ دولت کی فراوانی نے انہیں تساہل پسند اور آرام طلب بنا دیا تھا۔
لڑکیاں خوبصورت اور صحت مند تھیں۔ ان کی اچھی قیمت لگی۔ گل عذار کی سہیلیاں ایک ایک کر کے معقول
پر فروخت ہوئیں۔

جب کوئی لڑکی فروخت ہو کر خریدار کے حوالے کی جاتی تو وہ باقی لڑکیوں پر حسرت بھری نظر ڈالتی۔ یہ بھی اُسے
رتے دیکھتیں۔ دونوں طرف حسرت ہی حسرت تھی۔ یہ سب ایک ہی کشتی میں سوار تھیں اور سب کا انجام ایک سا
نا تھا۔

گل عذار کو یہ تو معلوم تھا کہ اسے بھی فروخت کیا جائے گا لیکن وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ اوغلو
ن کے علاوہ کوئی اور اسے خرید لے۔ اوغلوخان بڑے بھیانک چہرے والا مغل تھا۔ گل عذار یہ بھی جانتی تھی کہ کل
ں کی وجہ سے اوغلوخان کا دوسروں سے جھگڑا ہوا تھا اوغلوخان کی توہین ہوئی تھی۔ اگر اوغلوخان نے اسے خرید لیا تو
، توہین کا بدلہ وہ گل عذار سے لے گا۔

اوغلوخان کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اسے دیکھ دیکھ کر سہمی جا رہی تھی۔ اوغلوخان نے کسی اور لڑکی
ن توجہ دی تھی نہ کسی کی قیمت لگائی تھی۔ وہ تو بس اُسی پر دانت لگائے ہوئے تھا اور دانت کٹکٹا بھی رہا تھا۔
ے دونوں ہاتھوں میں سونے کے پانچ پانچ کڑے پڑے تھے اور ہاتھوں میں سونے کی ایک ایک اینٹ دبی
لی تھی۔ اس کا مقابلہ بھلا کون کر سکتا تھا۔

آخری لڑکی گل عذار تھی۔

اسے نیلام کی چوکی پر کھڑا کیا گیا تو اوغلوخان نے ایک جھرجھری لی اور جیسے کسی طویل خواب سے بیدار ہو
ا۔ سب کی نظریں اوغلوخان کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا سر غرور سے تن گیا۔ لیکن اسی وقت بھرے بازار میں کچھ شور
ہوا۔ لوگ گھبرا گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اسی وقت "ہٹو۔ بچو۔ راستہ دو" کی آوازیں آنے لگیں
کائی کی طرح پھٹ گئے۔ راستہ بن گیا اور رتھ نما ایک گاڑی آتی دکھائی دی جس کے آگے بیلوں کے بجائے دو
وڑے جتے ہوئے تھے۔ رتھ کے پہیوں پر چاندی کے پتر چڑھے تھے۔

اوغلوخان کے علاوہ تمام مغلوں نے تعظیم سے سر جھکا لیے اور نظریں نیچی کر لیں۔ مغل، رتھ نشین معزز ہستی
پہچان گئے تھے۔

مغل تعظیم کیوں نہ بجا لاتے۔ وہ ہستی قابلِ احترام تھی ہی۔ اس کا نام خانی طورہ تھا لیکن وہ لشکر اور پوری
حکومت میں "بڑی ماں" کے نام سے مشہور تھیں۔

خانی طورہ، بلادِ شمال کے خانِ اعظم خاقان تغلق تیمور کی بڑی بہن تھیں۔ سفید براق بال جن کی دو چوٹیاں گوندھی ہوئی
شانوں پر لٹک رہی تھیں۔ عمر ساٹھ سال سے اوپر لیکن بغیر سہارے کے رتھ سے خود اترتیں۔ لوگوں کے سر

کچھ اور جھک گئے۔

ان کے ہاتھ میں خالص سونے کی ایک چھڑی تھی جس پر چاندی کا کام کیا ہوا تھا۔ مٹھ کے اوپر بڑا جواہرات جڑے ہوئے تھے۔

مغلوں کے لیے وہ اجنبی نہ تھیں لیکن گل عذار ان کی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ خانی طورہ مجمع سے گزر کر اس جگہ جا رکیں جہاں گل عذار کو نیلامی کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ لوگ بھاگ کر ایک آبنوسی کرسی اٹھا لائے۔ خانی طورہ بڑی شان سے کرسی پر بیٹھ کر گل عذار کو دیکھنے لگیں۔

خانی طورہ کا احترام و عزت اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ مغل خاندان کی معمر ترین عورت تھیں بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے مغل ولی عہد شہزادہ الیاس کو دودھ پلایا تھا۔ جس دن شام کو الیاس خواجہ پیدا ہوا اسی دن صبح کو خانی طورہ کے چھ ماہ کے بچے کا انتقال ہوا تھا۔ خانی طورہ صدمے سے نڈھال منہ لپیٹے اپنے گھر میں پڑی تھی۔ وہ ولی عہد کی پیدائش پر اپنے بھائی خانِ اعظم کو مبارکباد دینے بھی نہ گئی لیکن جب اگلے دن اسے پتہ چلا کہ الیاس کی ماں بچے کی پیدائش کے بعد سخت بیمار ہو گئی ہے۔ . . . . اس کا دودھ خشک ہے اور بچہ اب تک بھوک سے بلک رہا ہے تو وہ بھاگی بھاگی بھائی کے گھر گئی اور بچے کو دودھ پلایا۔ حالانکہ بچے کی خالہ نے اپنا دودھ اسے پلانے کی کوشش کی تھی لیکن بچے نے منہ نہ لگایا اور روتا چیختا رہا۔

اس دوران خانی طورہ کے شوہر کا انتقال ہو گیا لیکن اس نے الیاس خواجہ کی وجہ سے دوسری شادی نہ کی۔ جب سے اب تک وہ بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ پھر بھلا خانِ اعظم اس کا احترام کیوں نہ کرتا۔ الیاس اس کی عزت اپنی ماں سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ جس ہستی کی بادشاہِ وقت اور ولی عہد سلطنت عزت کریں وہ عوام میں بلاشبہ احترام کیوں نہ ہوتی۔

خانِ اعظم، خانی طورہ کو ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا لیکن جب الیاس خواجہ کو تاتاری حکومت سنبھالنے کو بھیجا گیا تو وہ واپس نہ گئیں اور الیاس خواجہ کے ساتھ خیمہ گاہ میں رہنے لگیں۔ خانی طورہ اس عمر میں بھی سیر سپاٹے اور تقریب میں بھرپور حصہ لیتی تھیں۔ دن میں ایک بار بڑے بازار کا چکر لگانا تو ان کا معمول تھا۔ اس دن بھی وہ شاندار اور خوبصورت رتھ میں بازار سے گزر رہی تھیں کہ ایک جگہ زیادہ مجمع دیکھ کر ٹھہر گئیں۔ لوگوں سے پتہ چلا کہ تاتاری کنیزوں کا نیلام ہو رہا ہے۔

اس قسم کا نیلام تو تقریباً اب روز ہی ہوا کرتا تھا۔ خانی طورہ کو اطمینان نہ ہوا تو انہوں نے اد

کسی نے اوغلو خان کا چنگی والا واقعہ حرف بہ حرف دہرا دیا۔

اوغلو خان کچھ بد سرشت تھا۔ وہ خانی طورہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ حالانکہ خانی طورہ تو وہ شخصیت تھیں کہ سب سے محبت کرتیں اور سب انہیں چاہتے۔ اوغلو خان کا قصہ سننے کے بعد وہ ذرا دیر کچھ سوچتی رہیں پھر رتھ کا رخ مجمع کی طرف کر دیا۔

خانی طورہ اور نیلام کی چوکی میں چار فٹ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ گل عذار نے خانی طورہ کو اپنی طرف مخاطب دیکھا تو جھٹ سے سر جھکا کر سلام کر دیا۔

"میرے ساتھ چلے گی؟" خانی طورہ نے آہستہ سے پوچھا۔

گل عذار نے اثبات میں سر ہلا کر نظریں نیچی کر لیں اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

خانی طورہ کو پتہ نہیں گل عذار کا سلام کرنا یا اس طرح آنسو بہانا، کون سی ادا پسند آ گئی کہ نیلام کرنے والے کو حکم دیا:

"اُتارا سے چوکی سے۔"

نیلام کرنے والا گھبرا کے پہلے خود چوکی سے کودا۔ پھر ہاتھ کے سہارے سے گل عذار کو اتارا۔ وہ مغل جو کل اوغلو خان کے سامنے تلوار کھینچ کے کھڑا ہو گیا تھا، خانی طورہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر بولا:

"نہے نصیب کہ خانی ماں نے میری کنیز پسند کر لی۔"

مغل کا سر ادب سے اور جھک گیا۔

"قیمت گھر آ کے لے لینا۔" خانی طورہ بڑے رعب سے بولیں۔

"کیا فرما رہی ہیں خانی ماں۔" اور مغل خانی ماں کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ "مجھ پر آسمانی روحوں کی مار پڑے اگر میں اس کی قیمت لوں۔ آپ کی ہی کنیز ہے۔"

خانی طورہ کرسی سے کھڑی ہو گئیں جس کا مطلب تھا کہ خانی طورہ نے اس کا تحفہ قبول کر لیا۔ وہ کسی کا تحفہ قبول کرتیں تو دوسرے دن اسے اپنے گھر بلاتیں اور گرانقدر انعام و اکرام سے نوازتیں۔ ان کا گھر اسے گھر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

خیمہ گاہ میں بڑے گھر صرف تین تھے۔ ایک گھر الیاس خواجہ کا۔ دوسرا اس کی پہلی بیوی کا اور تیسرا خانی طورہ کا۔ مغلوں میں پہلی بیوی کا درجہ بہت بلند سمجھا جاتا تھا اور اس کا گھر یا خیمہ شوہر کے خیمہ کے مغرب میں

ہوتا تھا۔ دوسری بیویوں اور داشتاؤں کے خیمے، مشرق کی جانب لگتے تھے اور ان کی اونچائی کم ہوتی تھی۔ اس قسم کے گنبد نما، متحرک گھروں کا مغلوں میں عام رواج تھا لیکن جب سے یہ منگولیا چھوڑ کر جنوب یا مغرب میں جا کر آباد ہوئے، اس قسم کے متحرک گھروں کا رواج کم ہو گیا۔ پہاڑی علاقوں میں سوائے شاہی خاندان کے لوگ خیموں میں رہتے تھے۔

خانی طورہ نے واپسی کا ارادہ کیا۔ گل عذار جس کا چہرہ چاند کی طرح کھل اٹھا تھا، خانی طورہ کا اشارہ پا کر پاس آ گئی۔

خانی نے پہلا قدم اٹھایا تھا کہ اوغلو کی آواز آئی:

"کنیز کی بولی ہو گی"۔

مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے خانی طورہ کی بات رد کرنے کی جرأت کی تھی۔ خانی نے پلٹ کر اوغلو خان پر حقارت بھری نظریں ڈالیں۔ ان نظروں میں حقارت سے زیادہ قہر بھرا ہوا تھا۔

"کنیز کا مالک میں اور میرے ساتھی ہیں"۔

مغل نے اوغلو خان کا وار جیسے خود پر روک لیا:

"میں جسے چاہوں کنیز بخش دوں یا تحفہ میں دیدوں۔ کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں"۔

"یہ نہیں ہو سکتا"۔

اوغلو خان ایک بار پھر تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔

"قانون سب کے لیے ایک جیسا ہے۔ میں بغیر نیلامی کے کنیز کو نہیں جانے دوں گا"۔

مغل نے بھی تلوار کھینچنا چاہی لیکن خانی طورہ نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ لوگ پریشان تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اوغلو خان بازار میں اکیلا نہ تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بدقماش دوستوں کا پورا گروہ تھا جن کے ہاتھ تلواروں پر پہنچ چکے تھے اور وہ اوغلو کے اشارے کے منتظر تھے۔

دوسری طرف خانی طورہ کے وہ عقیدت مند آنکھیں لال پیلی کر رہے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اوغلو خان نے ملکہ کے مقابلے پر آ کر اُن کی توہین کی ہے۔

خانی طورہ بلا وجہ کا خون خرابہ پسند نہ کرتی تھیں۔ انہوں نے بگڑی ہوئی صورتحال کو خود ہی سلجھانا چاہا۔ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"لڑکی کو نیلام کیا جائے"۔ خانی نے حکم دیا۔

نیلام کرنے والے نے بادلِ نخواستہ گل عذار کا ہاتھ پکڑ کر پھر سے چوکی پر کھڑا کر دیا۔ گل عذار کا چہرہ مرجھا چکا تھا اور آنسو دوبارہ جاری ہو چکے تھے۔ لوگ بہت جز بز ہو رہے تھے لیکن خانی طورہ کے پاس ادب سے خاموش تھے۔

نیلامی بولنے والے کی آواز آئی:

"پہلی بولی"۔

اوغلو خان اپنی جگہ سے دو قدم آگے بڑھ کر بولا:

"پہلی بولی میری ہے"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے تلوار نیام میں کر لی اور سونے کی اینٹیں جنہیں تلوار کھینچتے وقت اس نے ایک تھیلی میں ڈال لیا تھا۔ وہ تھیلا اس نے نیلام کی چوکی کے پاس الٹ دیا۔ تھیلے میں دو اینٹیں اور تھیں پھر اس نے ہاتھوں سے سونے کے کڑے اتار دیے۔ اوغلو خان شاید پہلی اور آخری بولی لگانا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنے ہیرے کی انگوٹھی بھی اتار کے اس ڈھیر میں شامل کر دی۔

"یہ میری پہلی بولی ہے"۔ اوغلو نے سینہ تان کر کہا۔

مجمع پریشان ہو گیا۔ ظاہر ہے خانی طورہ کے پاس اس وقت اتنا سونا موجود نہ تھا اور بولی بیچ بازار ہو رہی تھی۔ خانی طورہ کو گھر جانے یا گھر سے کچھ منگوانے کا بھی موقع نہ تھا۔ مجمع کو اوغلو خان کی کامیابی نظر آنے لگی۔ گل عذار کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔

"موت کیوں آ گئی ہے۔ آواز دے"۔

اوغلو خان نے نیلام کرنے والے کو ڈانٹا:

"کون ہے مقابلے پر بولی دینے والا"۔

نیلامی والا، اوغلو خان کی ڈانٹ پی گیا۔ اس نے نظر گھما کر خانی طورہ کی طرف دیکھا۔ سب کی نظریں خانی پر لگی ہوئی تھیں۔

خانی طورہ کے لب ہلے:

"میں اس سونے اور انگوٹھی سے دوگنی بولی دیتی ہوں"۔

مجمع میں جان پڑ گئی۔ گل عذار کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔ نظریں گھوم کر اوغلو خان پر جا پڑ

"بولی ادھار نہیں ہوا کرتی خانی ماں"۔

اوغلو خان نے بڑے تمسخر سے قہقہہ لگایا:

"مال نکال کر سامنے رکھیے ورنہ کنیز میری ہو گئی"۔

اوغلو خان بڑے فخر سے قدم اٹھاتا ہوا نیلامی کی چوکی کے پاس آ گیا:

"کیا بولی ادھار ہو سکتی ہے؟" اس نے بولی بولنے والے سے سوال کیا۔

وہ گھبرا گیا۔

"دیکھیے خان۔ خانی ماں کی بات۔ ۔ ۔ ۔"

"میرے سوال کا جواب دے"۔

اوغلو خان نے اسے ڈپٹا:

"ادھار بولی ہو سکتی ہے تو میں بھی بولوں گا"۔

"دیکھیے نا خان۔ میں۔ ۔ ۔ ۔" نیلام کنندہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ بات کیسے بنائے۔ ادھار بو

کسی نے نہ دی تھی لیکن خانی طورہ کی بات اور تھی۔ ان کی بات ہی نقد رقم تھی۔

خانی طورہ نے نیلام کرنے والے کو بدحواس دیکھا تو اپنی سونے کی چھڑی چوکی کے پاس ڈال دی

کا وزن تو زیادہ نہ تھا لیکن اس میں جڑے ہوئے ہیرے جواہرات کی قیمت، اوغلو خان کے سونے

زیادہ تھی۔

"یہ میرا مال ہے اور یہ میری بولی ہے"۔ خانی طورہ ذرا اونچی آواز میں بولیں۔

نیلام کرنے والے کی مشکل آسان ہوئی۔ اس نے اوغلو خان کی طرف دیکھا:

"خان۔ اب کیا کہتے ہیں آپ؟"

"میرا سونا زیادہ ہے۔ میری بولی بڑی ہے"۔ اوغلو خان اڑ گیا۔

"سونا کم ہے مگر چھڑی جڑاؤ ہے"۔

خانی طورہ کے بجائے نیلام کرنے والے نے جواب دیا:

"چھڑی کے جواہرات بہت قیمتی ہیں"۔

"تو فیصلہ کرنے والا کون ہے؟"

اوغلو خان گرجا۔ پھر اس نے بڑھ کر چھڑی اٹھالی۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ہتھیلی پر رکھ کر وزن کا اندازہ کیا۔

کے بعد بولا:

"اس میں سونا بہت کم ہے۔ صرف چار ہیرے جڑے ہیں۔ ایک ہیرا میری انگوٹھی میں بھی ہے۔ میرا مال

ہے۔ میری بولی اونچی ہے۔ میرا سونا ان چار ہیروں سے زیادہ قیمت کا ہے۔ دس بارہ ہیرے ہوتے تو

ں بھی لیتا"۔

نیلام کرنے والا عجب مخمصے میں پھنس گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اوغلو خان کو کس طرح سے

رے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ چھڑی کی قیمت اوغلو خان کے مال سے کہیں زیادہ ہے۔

خانی طورہ کو غصہ تو بہت آیا۔ ان کے اختیارات اتنے تھے کہ اگر چاہتیں تو سواروں کو بلا کر اوغلو خان کو ابھی

ار ڈلوا دیتیں۔ وہ کئی آدمیوں کی تغلق تمور اور الیاس خواجہ سے کہہ کر جان بخشی کرا چکی تھیں لیکن انہوں نے

ن کے منہ نہ لگنا چاہا۔

خانی طورہ نے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی کو اشارے سے بلایا۔ وہ بڑھ کے آیا اور ہاتھ باندھ کر حکم کا

ہنے لگا۔

"میری گاڑی کے پاس جا"۔

خانی طورہ اطمینان سے بولیں:

"میری کنیز سے کہنا کہ بچوں کے کھلونے لے کے آ جائے"۔

"کھلونے؟" وہ آدمی حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

"جا تو۔ ۔ ۔ میں نے کہہ تو دیا"۔ خانی طورہ کے چہرے کی جھریاں جیسے مسکرانے لگیں۔

آدمی چلا گیا تو اوغلو خان ہنس کر بولا:

"خانی ماں۔ میں کھلونوں سے نہیں بہل سکتا۔ بولی دیجیے یا ہار مان جائیے"۔

خانی طورہ نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔ رتھ تک آدمیوں کے درمیان

ستہ بنا ہوا تھا۔ ان کی کنیز تیز تیز قدموں سے آ رہی تھی۔ چھوٹے قد اور چپٹی ناک والی کنیز تبتی معلوم ہوتی تھی۔

ز نے قریب آ کر ایک تھیلی خانی طورہ کے ہاتھ میں تھما دی، جس کے منہ پر ڈوری بندھی تھی۔

خانی طورہ نے تھیلی کھولتے ہوئے کنیز سے کہا:

"لنکا، میری چھڑی اٹھا لے"۔

لنکا نے جھک کر زمین سے چھڑی اٹھائی۔

خانی طورہ نے کھلی تھیلی چوکی کی طرف اچھال دی۔ تھیلی زمین پر گری تو اس میں بھرے ہوئے

جواہرات دور تک بکھر گئے۔

"دیکھ بے اوغلو۔۔۔۔۔ یہ شہزادوں اور شہزادیوں کے کھلونے ہیں"۔

خانی طورہ کے ہونٹ غصے سے پھڑک رہے تھے:

"جا۔۔۔۔ باپ کی قبر پہ جا۔ مانگ جا کے اس سے اس طرح کے کھلونے"۔

ہیرے زمین پر پڑے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ لوگ حیرت سے کبھی ہیروں کو اور کبھی

دیکھتے۔ اوغلو خان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"چل لڑکی میرے ساتھ"۔ خانی طورہ کھڑی ہو گئیں۔

گل عذار کو ایک بار پھر زندگی مل گئی۔ وہ چوکی سے اتر پڑی۔ خانی طورہ رتھ کی طرف جا رہی تھ

ان کے پیچھے ہولی۔

نیلام کرنے والا جلدی جلدی ہیرے بٹورنے لگا۔ اوغلو خان خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

انگوٹھی اور سونے کی اینٹیں اٹھا کے تھیلے میں بھر لیں۔ سامنے گل عذار رتھ میں بیٹھ رہی تھی

○

خانی طورہ کا گنبد نما گھر بھی الیاس خواجہ کے گھر کے مغرب کی جانب تھا۔ ان کی حیثیت الیاس

سے کمتر نہ تھی۔ خانی طورہ کو پانچ سوار ذاتی حفاظت کے لیے ملے ہوئے تھے لیکن وہ ان سے کوئی

محافظوں کے باہر جاتیں۔ شام کو الیاس خواجہ خود ان سے ملنے آیا۔ اسے کل اور آج کے واقع

چکی تھی۔ اس نے اوغلو خان کو بلا کر بڑی پھٹکار لگائی تھی اور یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اپنی ذ

باز نہ آیا تو اسے خیمہ گاہ سے نکال دیا جائے گا۔ الیاس خواجہ اب خانی ماں سے معذرت کرنے آیا تھ

خانی طورہ کا گنبد نما مکان اندر سے خوب سجا ہوا تھا۔ اس میں کئی کمرے تھے۔ بانس کی کھپچیوں پہ کپڑا چڑھا

کے کمرے کو دوسرے کمرے سے الگ کیا گیا تھا۔ زمین پہ بیش قیمت قالینوں کا فرش تھا۔ دروازوں پہ

پردے پڑے تھے۔ مغل، چارپائیوں کے بجائے نمدوں کے بستر استعمال کرتے تھے۔ میز، کرسیوں کی

جگہ آبنوسی چوکیاں ہوتی تھیں۔ اندر آنے کے لیے صرف ایک دروازہ ہوتا پھر گیلری جیسا راستہ جس کے

دونوں طرف کمرے ہوتے۔

الیاس خواجہ سر جھکائے آیا اور ادب سے سلام کر کے خانی طورہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ کمرے میں دونوں

کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

ذرا دیر تک خاموشی رہی۔ الیاس خواجہ معذرت کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا اور خانی طورہ غصے میں

بیٹھی تھیں۔

"میں بہت شرمندہ ہوں خانی ماں"۔ آخر الیاس خواجہ نے خاموشی کا قفل توڑا۔

"ہوں!"

خانی طورہ نے نظر اٹھا کر الیاس خواجہ کو دیکھا:

"الیاس! تو شرمندہ ہو یا نہ ہو، میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ تو نے اور تیری بیوی نے سانڈ چھوڑ رکھا ہے

جو ہر ایک کو سینگ مارنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ بڑوں کا تو ادب ہی اٹھ گیا ہے اب۔ ذلت کی سی ذلت ہے

اس نے بھرے بازار میں جواب دیے ہیں"۔

الیاس خواجہ دم سادھے بیٹھا رہا۔ پھر خانی طورہ کے پیر پکڑ کر بولا:

"معاف کر دو خانی ماں۔ تم خانی ماں نہیں، میری ماں ہو۔ تم نے مجھے زندگی دی ہے۔ تم دودھ نہ پلاتیں تو

میں مر جاتا"۔

الیاس خواجہ کی آنکھیں جیسے بھر آئیں۔

خانی طورہ اسے گھور رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔ ان کی ممتا جاگ اٹھی۔

انہوں نے الیاس کو بیٹے کی طرح پالا تھا۔ بولیں:

"اچھا۔ پریشان مت ہو۔ میں نہیں جاؤں گی لیکن اسے منع کر دے میرے منہ نہ لگا کرے ورنہ اچھا نہ

ہوگا اس کے حق میں"۔

"اس کا بندوبست کر دیا ہے میں نے خانی ماں"۔

الیاس فوراً سنبھل کر بولا۔

"اگر اس نے اب ایسی حرکت کی تو میں اسے خیمہ گاہ سے نکال باہر کروں گا"۔

الیاس خواجہ تو خانی طورہ کو مطمئن کر کے چلا گیا لیکن اوغلوخان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ گل عذار بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور وہ سینکڑوں آدمیوں کے مجمع میں خوار بھی ہوا تھا۔

ایک دن اوغلوخان گھوڑا دوڑاتا ہوا خانی طورہ کے گھر کی طرف آ ہی گیا۔ خیمہ گاہ کے اس حصے میں کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں الیاس خواجہ اور اس کی بیگمات کے خیمے تھے یا پھر خانی طورہ کا گھر۔ یہ ایک طرح کا محلسرا تھی۔

خانی طورہ کے پانچوں محافظ خیمہ سے کچھ دور بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک سوار ادھر آتا دکھائی دیا۔ محافظ اچک کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خانی طورہ کے گھر سے بہت پہلے ہی اسے جا کر روک لیا۔

"اوغلوخان۔ کدھر کا رخ ہے؟"

محافظ نے اس کے گھوڑے سے اپنا گھوڑا بھڑا دیا۔

"ادھر نہ کوئی بازار ہے اور نہ قحبہ خانے"۔

محافظ کا یہ طنز اوغلوخان کی بدکرداری کا مظہر تھا۔

"میں۔ میں خانی ماں کے دیدار کو جا رہا ہوں"۔ اوغلوخان نے بات بنائی۔

محافظ نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کے تیور کچھ اچھے نہ دکھائی دے رہے تھے۔

"خانی ماں نے تمہیں بلایا ہے؟" محافظ کا لہجہ اکھڑ اور سخت ہو گیا۔

اوغلوخان جھلا گیا۔ اکڑ کے بولا:

"تم محض محافظ ہو۔ شہزادوں سے گفتگو کرنے کا سلیقہ ہونا چاہیے۔ میں خانی ماں سے ملنے جاؤں یا نہ بلانے نہ بلانے کا اس سے کوئی تعلق نہیں"۔

"اوغلوخان!"

محافظ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے:

"اپنی شہزادگی الیاس خواجہ کو دکھاؤ۔ ہم جس کے محافظ ہیں اس کے سامنے تو تغلق تیمور بھی گردن جھکا دیتا ہے"۔

اوغلوخان نے دیکھا کہ محافظ تو اکڑتا ہی چلا جا رہا ہے تو وہ نرم پڑ گیا۔

"محافظ۔ دراصل تم میرا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ خانی ماں کی جو عزت بڑے خان اور چھوٹے خان کی نظروں میں ہے اس سے کون ناواقف نہیں۔ کچھ دن پہلے مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ ایک تاتاری لڑکی کی وجہ سے میں ان سے خواہ مخواہ الجھ پڑا تھا۔ چھوٹے خان (الیاس خواجہ) نے میری صلح صفائی کرا دی ہے۔ میں اس لیے چاہتا ہوں کہ خود خانی ماں سے اپنی غلطی کی معافی مانگوں۔ تم جانتے ہو کہ اگر خانی ماں نے مجھے معاف نہ کیا تو آسمانی روحیں مجھے معاف نہیں کریں گی"۔

مغلوں میں اب تک توہم پرستی موجود تھی۔ جنوب میں آباد ہونے کی وجہ سے ان کی عادات و اطوار میں کچھ فرق آگیا تھا لیکن وہ چنگیزی قوانین کے اب تک پابند تھے۔ تاتاری مسلمان ہو چکے تھے لیکن چغتائی مغل اب بھی کافر تھے۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے وہ بہت ڈرتے تھے۔ سوائے میدانِ جنگ کے۔ اگر کہیں بجلی چمکنے لگتی تو خوفزدہ ہو کر خیموں میں گھس جاتے اور منہ پر کپڑا لپیٹ کر اوندھے پڑ جاتے تھے۔

آسمانی روحوں کے ذکر سے محافظ بھی خوفزدہ ہو گیا اور سرگوشی میں بولا:

"اوغلوخان۔ آسمانی روحوں کے عذاب سے بچنا ہے تو تم خانی ماں سے ضرور معافی مانگ لو۔ خانی ماں کے قبضے میں آسمانی طاقت ہے۔ میں نے کئی بار رات کے وقت آسمانی روحوں کو ان کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہے"۔

"جبھی تو میں معافی مانگنا چاہتا ہوں"۔

اوغلوخان کو بات کرنے کا موقع مل گیا:

"چلو۔ مجھے خانی ماں کے سامنے پیش کر دو"۔

"نہیں نہیں اوغلوخان۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے"۔

محافظ جیسے خواب سے چونک پڑا:

"چھوٹے خان کے سوا کوئی مرد ان کی اجازت کے بغیر ان کے خیمے کے قریب بھی نہیں آسکتا"۔

"تو پھر تم کیا چاہتے ہو۔ میں اسی طرح گنہ گار پھرتا رہوں"۔ معافی نہ مانگوں"۔ اوغلوخان نے اس کے کمزور پہلو کو چھیڑا۔

"معافی تو تمہیں ضرور مانگنا چاہیے۔ کوئی تمہیں معافی مانگنے سے کیسے روک سکتا ہے"۔ اس کے خیال میں یہ

بھی گناہ تھا۔

"اچھا ٹھہرو۔ میں کوئی انتظام کرتا ہوں۔"

محافظ نے اوغلوخان کو تسلی دی اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اپنے ایک ساتھی کو بلایا۔ ساتھی گھوڑوں پر سوار۔ ۔ ۔ ۔ خانی ماں کے خیمے سے کچھ دور مستعد کھڑے تھے۔

ایک سوار گھوڑا بڑھا کر آگیا۔ پہلے محافظ نے کہا:

"یہ اوغلوخان ہیں۔ چھوٹے خان الیاس خواجہ کے۔ ۔ ۔ ۔"

"میں جانتا ہوں انہیں۔"

سوار مسکرایا:

"انہیں سب ہی جانتے ہیں۔ طوائف کے ہر خیمے پر ان کا ذکر ہوا کرتا ہے۔ بڑے فیاض ہ
یہ۔ ڈیرے والیاں تو ان پر جان دیتی ہیں۔"

اوغلوخان خفیف ہو گیا لیکن مصلحتاً خاموش رہا۔

"اوہ۔ تم نے تو کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔"

پہلا محافظ چڑ گیا:

"شہزادے ایسا ہی کرتے ہیں۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے وہی ڈیروں پر جاتا
لوگ تو نہیں جا سکتے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم خانی ماں سے جا کے دریافت کرو کہ اوغلوخان حاضر ہونا چاہتے ہیں۔"

سوار نے گھوڑا موڑا۔

"ذرا جلدی جواب لانا۔" محافظ نے اسے تاکید کی۔

سوار گھوڑا بھگاتا خانی ماں کے خیمے پر پہنچ گیا۔ اس کی آواز پر ایک کنیز باہر نکلی۔ سوار کی خواہش اس کے ذریعے خانی ماں تک پہنچا دی۔

خانی ماں سنتے ہی بھڑک اٹھی۔

"ذرا دیکھو تو اس کی جرأت۔ مجھ سے معافی مانگنے آیا ہے۔ مجمع میں ذلیل کر کے اب چلا ہے آنسو پونچھنے۔ میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

خانی ماں کی تیز تیز آواز سن کر گل عذار دوسرے کمرے سے بھاگ کر ان کے پاس آ گئی۔

"کیا ہوا ماں؟" اس نے آتے ہی پریشانی سے پوچھا۔

وہ خانی ماں کو صرف "ماں" کہتی تھی۔ خانی ماں نے گل عذار کو بیٹی بنا لیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے
یتے جی اسے کسی مغل کے ہاتھ میں نہ پڑنے دیں گی۔

خانی ماں نے گل عذار کو ایک خنجر دیا تھا کہ اگر ان کی عدم موجودگی میں گل عذار کسی مصیبت میں پھنس
ائے تو وہ اس خنجر سے اپنی اور اپنی عصمت کی حفاظت کر سکتی ہے۔ یہ خنجر گل عذار ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی
سوتے وقت غالین کے نیچے چھپا دیتی۔

خانی ماں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا:

"وہ کمینہ یہاں تک آ پہنچا گل۔ مجھ سے معافی مانگنے آیا ہے۔ وہ بڑا مکار ہے۔ اس کا باپ بھی ایسا ہی
ار تھا۔ ۔ ۔ ۔ ضرور اس میں کوئی چال ہے۔ میں اسے اپنے گھر میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔
ھی نہیں۔"

خانی ماں بولتے بولتے تھک گئیں۔ ان کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ گل عذار نے ان کے گلے میں اپنی
یں ڈال دیں۔

"آپ اپنا جی ہلکان نہ کریں۔"

پھر گل عذار، کنیز کی طرف دیکھ کر بولی:

"جاؤ کہہ دو کہ خانی ماں کے سر میں درد ہے۔ وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتیں۔ جب ٹھیک ہوں گی
و خود بلا لیں گی۔"

کنیز چلنے لگی تو خانی ماں نے اسے روکا۔ سانس درست کرتے ہوئے بولیں:

"محافظوں سے کہنا کہ کسی کے آنے جانے کی خبر مجھ تک پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ خبردار جو آئندہ
سے اس حکم میں کوتاہی ہوئی۔"

کنیز نے جو کچھ سنا تھا یاد کر کے اور ٹھہر ٹھہر کے سوار سے کہہ دیا۔ سوار نے وہ باتیں اور حکم محافظ
تک پہنچا دیے۔

اوغلوخان نے بھی جواب اور احکامات سن لیے اور چپ چاپ گھوڑا لگا کر واپس ہوا۔

اوغلوخان کو شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ ہر شکست کے بعد اس کے انتقامی جذبے میں شدت ہوتی جا رہی تھی۔

یہاں سے اوغلو خان سیدھا اپنے بہنوئی الیاس خواجہ کے پاس گیا۔ الیاس خواجہ اسے دیکھ کر متعجب ہوا۔ کچھ ہی دیر پہلے اوغلو خان اس سے مل کر گیا تھا۔

الیاس خواجہ نے منہ بنا کر پوچھا:

"اب کیوں آئے ہو اوغلو خان۔ تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ کیا پھر کوئی نیا جھگڑا لے کر آئے ہو؟"

"نہیں چھوٹے خان۔"

اوغلو خان نے چہرے پر معصومیت پیدا کر لی۔

"میں خانی ماں کے پاس گیا تھا۔"

"خانی ماں کے پاس؟"

الیاس خواجہ چیخ پڑا:

"تم ان کے پاس کیوں گئے تھے۔ کس نے کہا تھا وہاں جانے کے لیے۔ میں نے ان سے معذرت کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا تھا۔ پھر تمہیں جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں تو معافی مانگنے گیا تھا چھوٹے خان۔"

اوغلو خان نے صفائی پیش کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے خانی ماں کے گھر جانے کی خبر الیاس خواجہ کو پہنچے گی۔ اس خیال کے تحت وہ پہلے ہی بتانے آ گیا تا کہ بعد میں اس پر پھٹکار نہ پڑے۔

"اوغلو خان۔ تم نے میری جان مصیبت میں ڈال رکھی ہے۔"

الیاس خواجہ کو غصہ آ گیا:

"خاقان (تغلق تیمور) کو معلوم ہوا کہ تم نے خانی ماں کو پریشان کیا ہے تو تمہارا جو حشر ہو گا وہ الگ میرے متعلق معلوم نہیں وہ کیا سوچیں گے؟ تم تاتاری حکومت میرے ہاتھ سے نکلوا کر رہو گے۔"

"میں ان سے مل نہیں سکا چھوٹے خان۔"

اوغلو خان نے اپنی صفائی میں مزید کہا:

"انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔"

"بہت اچھا ہوا اوغلو۔"

الیاس خواجہ کو کچھ اطمینان ہوا:

"وہ تمہیں دیکھتے ہی قتل کرا دیتیں۔ کون انہیں روک سکتا ہے۔ خانی ماں کے پانچوں محافظ بڑے خان کے ملازم ہیں۔ میرا اُن پر کوئی زور نہیں۔ تم قسمت والے تھے کہ بچ کر آ گئے۔"

"چھوٹے خان۔ خانم مجھ سے ناراض ہیں۔"

اوغلو خان نے پھر بات چھیڑی:

"جب تک وہ ناراض ہیں آسمانی روحیں بھی مجھ سے ناراض رہیں گی۔ مجھے ان سے معافی دلوا دیجیے چھوٹے خان۔۔۔۔!"

اوغلو خان نے کچھ ایسی مکارانہ اداکاری کی کہ الیاس خواجہ کو اس کی بات کا یقین آ گیا۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا:

"اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ کل مجھے شربت پینا ہے۔ خانی ماں مبارک دینے آئیں گی میں ان سے تمہاری سفارش کروں گا۔"

اوغلو خان خوشی خوشی اٹھ کے وہاں سے چلا آیا۔ اسے خانی ماں کی ناراضگی کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ وہ ان کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔ اسے الیاس خواجہ کا ڈر تھا۔ وہ ڈرتا بھی صرف اسی سے تھا۔ وہ تو کسی آئندہ مرحلے کی منصوبہ بندی کرنے آیا تھا۔ خانی ماں سے ملنے بھی وہ اسی غرض سے گیا تھا۔ ان سے معافی مانگنے کے بہانے وہ گھر کے حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

خانی ماں کا گھر اس نے اندر سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گل عذار اسی گھر میں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر اسے اس گھر میں داخل ہونے کا کبھی موقع ملے تو گل عذار تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہو گی لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا اور خانم ماں کی ناراضگی اور بڑھ گئی۔

دوسرے دن الیاس خواجہ کی شربت کی رسم ادا ہونی تھی۔

یہ رسم مغل بادشاہ یعنی خانِ اعظم سے مخصوص تھی۔ جب خانِ اعظم کے گھر اولاد پیدا ہوتی تو وہ اس بیوی سے جس نے بچے کو جنم دیا ہے، بات چیت بند کر دیتا۔ خانِ اعظم کا گھر الگ ہوتا اور اس کی بیویاں الگ الگ گھروں میں رہتیں۔ بچے کی پیدائش کے بعد نہ تو اس بیوی کے پاس خود جاتا اور نہ اسے اپنے گھر میں طلب

کرتا۔ یہ کیفیت اس وقت تک قائم رہتی جب تک بچہ ماں کا دودھ پینا چھوڑ نہ دیتا۔ اس کے بعد
ایک ساتھ دودھ پیتے جو اس بات کا اعلان ہوتا کہ اب شوہر اپنی بیوی سے پھر رجوع کر رہا ہے۔

الیاس بادشاہ اب تک خودمختار بادشاہ نہ ہوا تھا لیکن وہ ولی عہد تھا اور تغلق تمور اسے
کرتا تھا۔ تغلق تمور بوڑھا ہو چکا تھا۔ وہ اپنی زیادہ سے زیادہ ذمے داریاں الیاس خواجہ کو سونپ
کا اعلان تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ تغلق تمور نے بعض شاہانہ مراعات بھی الیاس خواجہ کو عطا کر دی تھیں، شر
بھی انہی مراعات اور رسومات میں سے ایک تھی جو بادشاہِ وقت سے تعلق رکھتی تھیں۔

الیاس خواجہ کی "شربت نوشی" کے لیے بڑا اہتمام کیا گیا۔ اسے سرکاری طور پر منانے کا حکم
سے کوچہ و بازار کو سجا کر دلہن بنا دیا گیا۔ خیمہ گاہ میں جشن منانے کا حکم تھا چنانچہ جگہ جگہ کھیل تماشے والا
جا رہے تھے۔ جگہ جگہ میلہ لگ گیا۔ شراب خانوں پر بھیڑ بڑھ گئی اور طوائفوں کی قیمت چڑھ گئی۔ ہر شخص
خوشی منانے میں مصروف ہو گیا۔

لیکن یہ تمام ہنگامے الیاس خواجہ کے گھر سے دُور ہی دُور رہے۔ الیاس خواجہ کی بیگمات کے
میں کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس رسم کا تعلق صرف بادشاہ کی ذاتِ خاص سے تھا اس لیے الیاس خوا
کسی کو مدعو نہیں کیا گیا۔ مہمانوں میں صرف الیاس خواجہ کی بیگمات اور داشتائیں تھیں۔ صرف خانی ما
بلوا لیا گیا تھا۔ وہ بھی صرف برکت اور دعا کے لیے۔

خانی ماں اس سے پہلے بھی الیاس خواجہ کے باپ تغلق تمور کی اس رسم میں کئی بار شرکت کر چکی
خانی ماں کی زیادہ سے زیادہ ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے سوائے پہلی بیگم کے تم
بیگمات کو خانی ماں کے گھر بھیجا تاکہ وہ انہیں مدعو کریں۔ خانی ماں کے سر میں واقعی درد شروع ہو گیا
نے دعوت قبول کر لی۔

الیاس خواجہ کی بڑی بیگم یعنی پہلی بیوی کو اس کے مکان میں دلہن کی طرح سجایا گیا۔ اسے دلہن
الیاس خواجہ کی تمام بیگمات موجود تھیں اور الیاس خواجہ کی خوشنودی کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی
ہوتے ہوتے دلہن تیار ہو گئی۔

دلہن کی جوانی ڈھل رہی تھی لیکن بناؤ سنگار نے اس کا روپ نکھار دیا تھا۔ پھر اسے جلوس کی شک
خواجہ کے گھر لے جایا گیا۔ بادشاہ اور ملکہ کے گھر کے دروازے شمال کی جانب ہوتے تھے۔ باقی تمام

دروازے جنوب کی طرف کھلتے تھے۔

خانی ماں پہلے ہی الیاس خواجہ کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ شربت کی رسم انہی کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔
یاس خواجہ کے گھر کے سامنے ساز بجانے والی عورتیں، ہاتھوں میں ساز لیے ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ دلہن
دلہن کے گھر سے دولہا یعنی الیاس خواجہ کے گھر لایا گیا۔ دروازے پر خانی ماں نے دلہن کا استقبال کیا۔ اسے
دعائیں دیں اور سر پہ ہاتھ پھیرا۔

دلہن مغلوں کے روایتی لباس میں تھی۔ چہرے پر نقاب تھا۔ یہ نقاب گھوڑے کے بالوں سے بنایا گیا
تھا۔ الیاس خواجہ نمدے کی مسند پہ بیٹھا تھا۔ مسند قالینوں کے فرش کے اوپر لگی تھی۔ یہی اس کا بستر تھا۔
بستر دروازے کے بالکل سامنے تھا۔ مغلوں میں گھر کے مالک کا بستر ہمیشہ دروازے کے سامنے لگایا جاتا تھا
دلہن کے داخل ہونے پہ الیاس خواجہ نے مسند پر کھڑے ہو کر دلہن کا استقبال کیا لیکن نہ اس کا نقاب اٹھایا اور نہ
اس کے جسم کو ہاتھ لگنے دیا۔

خانی ماں نے شربت کا پیالہ طلب کیا۔

ایک بہت بڑا پیالہ لایا گیا جسے خانی ماں کے بوڑھے ہاتھ سنبھال نہ سکتے تھے۔ کنیز نے بھرا ہوا پیالہ
الیاس خواجہ کی بیگم نمبر ۲ کو دیا۔ یہ پیالہ پہاڑی بکروں کے سینگوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ پیالے میں گھوڑی کا
دودھ بھرا تھا۔ یہ گرمی کا زمانہ تھا۔ مغل گرمیوں میں گھوڑی کا دودھ بڑے شوق سے پیتے تھے۔

الیاس خواجہ کے سرہانے، بالوں کی رسی سے بندھا ہوا نمدے کا ایک گڈا لٹکا تھا۔ یہ گڈا بڑا متبرک
سمجھا جاتا تھا اور بادشاہ بھائی یعنی بادشاہ کا بھائی سمجھا جاتا تھا۔

خانی ماں نے دودھ میں اپنی پانچوں انگلیاں بھگوئیں۔ پھر یہ انگلیاں اس گڈے پر چھڑک دیں۔ اب
الیاس خواجہ کے ملازمِ خاص کو گھر کے دروازے پر بلایا گیا۔ یہ ملازم بادشاہ کا باڈی گارڈ ہوتا اور رات بھر ننگی
تلوار لیے بادشاہ کے گھر کے چاروں طرف پہرہ دیتا۔

پیالہ اس ملازم کے حوالے کر دیا گیا۔ ملازم پیالہ لے کر دروازے سے کچھ دُور گیا۔ پھر ایک جگہ کھڑے
ہو کر اس نے جنوب کا رخ کیا۔ اس نے پیالے میں دایاں ہاتھ بھگویا۔ پھر دودھ کو جنوب کی جانب چھڑک دیا۔ یہ
عمل اس نے تین بار کیا۔

مغلوں کے خیال میں جنوب میں آگ کی دیوی رہتی تھی یہ عمل اس کی خوشنودی کے لیے کیا جاتا۔ اسی طرح

خادم نے تین بار مشرق میں دودھ چھڑکا۔ یہ ہوا کی خوشنودی کے لیے تھا۔

شمال میں ملازم نے دودھ اس لیے چھڑکا کہ وہاں مغلوں کے آباواجداد کا قبرستان تھا۔ مغرب اس رسم سے محروم رکھتے تھے کیونکہ مغرب میں چنگیز خاں کے ناجائز بیٹے جوجی خاں کی اولاد حکمرانی کرتی تھی کے دوسرے تمام بیٹے اس سے نفرت کرتے تھے۔

شربت کا پیالہ اندر واپس گیا۔

خانی ماں نے برکت کے لیے پیالے کو ہاتھ سے چھوا۔ پھر دوسری بیگم نے پیالہ الیاس خواجہ کو د اس نے پیالے کو منہ لگایا تھا کہ باہر سازوں کے بجنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ ساز اس وقت تک بجے جب تک الیاس خواجہ اور اس کے بعد دلہن نے دودھ نہ پی لیا۔ اس وقت دلہن کا نقاب الٹ دیا گیا اور سی گئیں۔

الیاس خواجہ کی تمام بیگمات نے اپنی انگلیوں سے ہیرے کی ایک ایک انگوٹھی اتار کر دلہن کی گود یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ دلہن کی گود ہمیشہ ہری دیکھنا چاہتی ہیں۔

نذر کے دوران الیاس خواجہ نے اوغلو خان کی پھر سفارش کی اور اسے معاف کر دینے کی خواہش خانی ماں نے اسے فوراً ڈانٹ دیا:

"الیاس۔ پاگل ہوا ہے۔ اس پاک اور روحوں کی محفل میں تو شیطان کا نام لے رہا ہے۔ کہیں رو ناراض نہ ہو جائیں"۔

الیاس خواجہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ پھر تمام مہمان چلے گئے اور دولہا دلہن گھر میں اکیلے رہ گئے۔

○

اچانک خانی ماں بیمار ہو گئیں۔

سر درد کی انہیں پہلے ہی شکایت تھی۔ پھر ضعیفی خود ہی ایک بیماری ہے۔ انہیں ہلکا ہلکا بخار ر ٹانگیں کمزور ہو گئیں اور انہیں چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ گنٹھیا کا مرض مغل مرد اور عورتوں میں عام تھا۔ ممکن ہے گ دودھ پینے سے ہوتا ہو۔ کئی مغل خاقان اسی موذی مرض میں مبتلا ہو کے مرے تھے۔ مغل بادشاہ اور شاہی

زندگی تو بڑی عیش و عشرت سے گزارتے تھے لیکن بیماری کا زمانہ ان پر بڑا سخت گزرتا تھا۔ کوئی بڑا ہو یا مرد ہو یا عورت، بیمار پڑتے ہی اسے اچھوت سمجھ کر الگ کر دیا جاتا تھا۔ بیمار اگر غریب ہوتا تو اسے دور کسی جگہ ایک خیمے میں ڈال دیا جاتا۔ کھانے پینے کا سامان اس کے پاس رکھا جاتا۔ پھر اسے تنہا چھوڑ دیتے۔ بیماری بڑھ جاتی تو اسی تنہائی میں تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔ زندگی ہوتی تو لوٹ پوٹ کے خود ہی اچھا ہو جاتا۔ اسے کسی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ کوئی اس کے پاس آ سکتا تھا۔

مغلوں کا عقیدہ تھا کہ اگر بیمار کے عزیز و اقارب اس سے ملنے جائیں گے تو ان کے ساتھ بد روحیں بھی بیمار کے پاس چلی جائیں گی اور بیمار کو مار ڈالیں گی۔ یہ بات مغلوں کے جادوگر پیشواؤں نے مشہور کر رکھی تھی۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔ مغلوں میں مشہور تھا کہ جب کسی کے جسم میں بد روح حلول کر جاتی ہے تو وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر کوئی بیمار کے پاس جائے گا تو بیماری کی بد روح اس پر سوار ہو جائے گی۔ اس طرح وہ ہر بیماری کو چھوت کی بیماری سمجھتے تھے۔

خاقان چین شہنشاہ قبلائی خان نے بھی اپنے طویل محل میں اسی طرح تڑپ تڑپ کر جان دی تھی۔ جب وہ مرا تو اس کے پاس کوئی موجود نہ تھا۔ اس کی لاش دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ اس کی موت کس وقت ہوئی ہے۔ مغل اپنی چھوٹی موٹی بیماریوں کو چھپاتے تھے کہ کہیں انہیں آبادی سے نکال نہ دیا جائے۔

خانی ماں کی بیماری آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ ان کے گھر میں کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ بیماری کا علم گل عذار، تبتی کنیز اور پانچ محافظوں کے سوا کسی اور کو نہ تھا۔ پھر بھی یہ بات زیادہ عرصے تک چھپائی نہ جا سکی۔ خانی ماں کا رنگ میں آنا جانا بند ہو گیا۔ کئی اہم تقریبوں میں بھی انہوں نے شرکت سے معذوری ظاہر کر دی۔ اس سے لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ خانی ماں کی حیثیت اس قدر بلند تھی کہ کسی کو کھل کر کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ شبہ سب کو تھا بلکہ بعض کو تو یقین تھا کہ خانی ماں کی موت کی خبر بس اب کوئی دم میں پھیلنے والی ہے۔

گل عذار سب سے زیادہ پریشان تھی۔ اس کی زندگی اور عزت تو خانی ماں کی حیات سے وابستہ تھیں۔ جب وہ سوچتی کہ اگر خدانخواستہ خانی ماں اس دنیا میں نہ رہیں تو کیا ہو گا؛ وہ کہاں جائے گی؟ اوغلو خان اس سے بھرپور انتقام لے گا اور نہ معلوم کیا کیا کرے گا!

اصل حقیقت سے وہ اور تبتی کنیز ہی واقف تھیں۔ محافظ سواروں کو ابھی تک صرف شبہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ خانی ماں ضعیف ہیں اس لیے انہوں نے گھر سے نکلنا بند کر دیا ہے۔ گل عذار اور تبتی کنیز کی تمام احتیاطوں کے باوجود

آخر خانی ماں کی بیماری کا راز طشت ازبام ہو گیا۔

خانی ماں کا سب سے بڑا دشمن اوغلو خان تھا۔ مغل، خانی ماں کے معتقد تھے اور ان کا دیدار باعث سعادت سمجھتے تھے۔ خانی ماں کا رتھ اب بازار میں نہیں آ رہا تھا۔ لوگوں کو فطرتاً تشویش ہوئی۔ خیمہ گاہ میں بات پھیلی اوغلو خان کے کانوں میں بھنک پڑ گئی۔ وہ اس خبر کو لے اڑا۔ اس نے یہ بات مختلف ذرائع سے مغل سرداروں تک پہنچا دی۔ عجیب بات تھی کہ مغل موت سے تو نہ ڈرتے تھے لیکن بیماری سے بہت خوفزدہ رہتے تھے۔ بیمار خواہ ان کا قریبی عزیز کیوں نہ ہو، اس سے وہ دور بھاگتے اور فوراً الگ خیمے ڈلوا لیتے۔

اوغلو خان نے یہ خبر مذہبی پیشواؤں کے کانوں تک بھی پہنچا دی۔ یہ پیشوا جن کے قبضے میں بدروحیں سمجھی جاتی تھیں، خانی ماں کی بیماری کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے۔ انہیں خانی ماں سے شکوہ تھا کہ انہوں نے اوغلو خان سے کہہ کر ان کے ایک ساتھی کو قتل کرا دیا تھا جس نے خانی ماں سے گستاخی کی تھی۔ اس بات کا بدلہ لینے کا موقع آ گیا تھا۔

ایاس خواجہ کو ہفتوں سے خانی ماں کی خبر نہ ملی تھی۔ "شربت نوشی" کی تقریب میں خانی ماں نے اسے بتایا تھا کہ ان کے سر میں اکثر درد رہنے لگا ہے۔ اس وقت ایاس خواجہ نے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی لیکن جب اوغلو خان نے دبی زبان میں خانی ماں کی بیماری کا خدشہ ظاہر کیا تو اسے بھی فکر ہوئی۔ پھر ایک دن چار پانچ مذہبی پیشوا اس کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے خانی ماں کی بیماری کی تحقیقات کا فوری مطالبہ کیا بلکہ انہوں نے صاف الفاظ میں کہا کہ اگر خانی ماں واقعی بیمار ہیں اور انہیں بستی سے دور خیمے میں نہ پہنچایا گیا تو آسمانی روحیں ناراض ہو جائیں گی اور سب پر عذاب نازل ہو گا۔

اوغلو خان کی لگائی ہوئی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ مذہبی پیشواؤں کی باتوں نے اس پر تیل چھڑک دیا۔ بیماری کے معاملے میں وہ عام مغلوں سے زیادہ وہمی تھا۔ اس نے فوراً خانی ماں کی ننھی کنیز کو بلا بھیجا۔ خانی ماں صرف گنٹھیا کی وجہ سے معذور ہو گئی تھیں۔ یوں ان کے حواس بھی درست تھے اور بخار بھی اتر گیا تھا کہ ایک پیشوا ہی آیا تھا کیونکہ دوسرے لوگ بیمار کے گھر میں جاتے ڈرتے تھے۔ خانی ماں کی بیماری سے لوگ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ جو مغل جتنا زیادہ صاحبِ اقتدار ہوتا ہے اتنی ہی زبردست بدروح اس کے پیٹ میں گھس جاتی ہے۔

خانی ماں نے پیشوا کو اپنے پاس بلا لیا۔

پیشوا اندر آیا اور خانی ماں کے بستر کے پاس پڑی ہوئی لکڑی کی چوکی پر خود ہی بیٹھ گیا۔ اس نے نہ تو سلام کیا اور نہ بیٹھنے کی اجازت مانگی۔ سوائے بادشاہ کے مذہبی پیشوا کسی کو سلام نہ کرتے تھے اور بعض تو بادشاہ کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔

خانی طورہ نے ہاتھ اٹھا کر خود ہی سلام کیا اور اس کا مزاج پوچھا۔

"تم کیسی ہو خانی طورہ؟" پیشوا نے بغیر جھجک سپاٹ لہجے میں الٹا ان سے سوال کر دیا۔

"میں بالکل اچھی ہوں"۔

خانی ماں نے صحت مندوں کی طرح جواب دیا۔

"صرف پیروں میں تکلیف ہے"۔

"چلنے پھرنے سے معذور ہو تم؟" پیشوا کے لہجے میں ذرا بھی لوچ پیدا نہ ہوا۔

"ہاں محترم پیشوا۔ میں مغلوں کی عام بیماری گنٹھیا میں مبتلا ہوں"۔ خانی ماں نے اعتراف کر لیا۔

"عام بیماری نہیں خانی طورہ"۔

پیشوا کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"یہ موت کی بیماری ہے۔ تم کسی وقت بھی مر سکتی ہو۔ تمہیں بستی سے دور رکھنا ہو گا"۔

"میں جانتی ہوں پیشوائے محترم"۔

خانی ماں کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی۔

"میں بستی سے باہر جانے کو تیار ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ میری لڑکی اور ملازمہ کو رہنے کی اجازت دی جائے"۔

"بیمار کے پاس کوئی ملازم نہیں رہ سکتا خانی طورہ"۔ پیشوا نے صاف انکار کر دیا۔

"میں بیٹی کو تو ساتھ رکھ سکتی ہوں"۔ خانی ماں کے لہجے میں ہزاروں التجائیں بھر گئیں۔

"ہاں بیٹی رہ سکتی ہے۔ مگر......"

پیشوا رک کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا:

"خانی طورہ تمہاری تو کوئی اولاد نہیں"۔

"میں نے ایک تاتاری لڑکی کو گود لے لیا ہے پیشوائے محترم"۔ خانی ماں کی آواز خفیف ہو گئی۔

"تاتاری لڑکی"۔

پیشوا سوچنے لگا۔ پھر فیصلہ کن انداز میں بولا:

"ٹھیک ہے۔ لڑکی تاتاری ہے تو تمہارے ساتھ رہ سکتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ مر جائے گی تو
کوئی افسوس نہیں ہوگا اور اگر زندہ بچی تو تمہارے ساتھ ہی اسے بھی دفن کر دیں گے"۔

ان میں دستور تھا کہ جب بادشاہ مرتا تو اس کے دفن کرنے کے لیے بڑا سا گڑھا کھودتے پ
چند گھوڑے ذبح کر کے ان کا خون چھڑکتے۔ کھانے پینے کا سامان رکھتے اور ساتھ ہی بادشاہ کی چند
کنیزوں یا داشتاؤں کو نئے کپڑے پہنا کر لاش کے ساتھ . . . . . زندہ دفن کر دیتے۔

گل عذار پردے کے پیچھے کھڑی خانی ماں اور پیشوا کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے جانے کے بع
کر خانی ماں کے پاس آئی۔ خانی ماں کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو چمک رہے تھے۔

"رو کیوں رہی ہو خانی ماں"۔

گل عذار بستر کے قریب بیٹھ گئی:

"میں تمہاری خدمت کروں گی۔ میرا ایک خدا تمہارے تمام خداؤں سے بڑا ہے۔ وہ تمہیں ضرور
دے گا"۔

"میں مر گئی تو کیا ہوگا گل عذار"۔ خانم ماں نے ٹھنڈی سانس لی اور اُن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ
گرنے لگے۔

گل عذار نے ان کی آنکھوں میں پہلی بار آنسو دیکھے تھے۔ وہ بھی رونے لگی۔ ذرا دیر بعد د
استقلال سے بولی:

"خانی ماں۔ تم نے مجھے درندوں سے بچایا۔ زندگی دی ہے۔ میں تمہارے بعد زندہ نہ رہ سکوں
میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی"۔

خانی ماں نے ہاتھ بڑھا کر گل عذار کو اپنی طرف کھینچا۔ گل عذار ان کے سینے سے لگ کر سسکیاں
شام تک خانی ماں کا خیمہ دور ایک وادی میں لگا دیا گیا۔ یہ وادی بالکل ویران تھی۔ لوگوں کا
بہت کم گزر ہوتا تھا۔ خیمے پر سفید پردہ لٹکایا گیا جس پر کراس کا نشان بنایا گیا اور پھر مردے کی کھو
لکیروں سے بنا دی گئی۔ یہ امتناعی نشان تھا جس کا مطلب تھا کہ اس طرف آنا منع ہے کیونکہ بیمار ابھی

...ر میں یہاں پڑا ہے۔

خانی ماں کی وفادار کنیز کو ان سے جدا کر دیا گیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ پھر چار پیشوا خانی
...لکڑی کے ایک تختے پر ڈال کر اس خیمے میں لے آئے۔ گل عذار اُن کے پیچھے آنسو بہاتی آ رہی تھی۔ ایسے
...مرض پیشوا ہی ہاتھ لگا سکتے تھے اور بیمار کو امتناعی خیمے تک لانا ان کا کام تھا۔

خانی ماں کی تبتی کنیز تو روتی دھوتی ان سے الگ ہو گئی لیکن ان کے محافظ سواروں نے جھگڑا ڈال دیا۔
...نے صاف کہہ دیا کہ بڑے خان نے انہیں خانی ماں کا تاحیات ملازم بنا کے ساتھ کیا ہے اس لیے وہ خانی ماں
...قریب اس وقت تک رہیں گے جب تک وہ زندہ ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو گیا تو لاش لے کر مغلوں کے صدر
...حصار المالیق جائیں گے کیونکہ شاہی خاندان کے تمام لوگ وہاں دفن ہیں۔ یہ محافظ الیاس خواجہ کے ماتحت نہ
...اس لیے وہ انہیں حکم نہ دے سکتا تھا۔

آخر بڑے بحث و مباحثے کے بعد طے پایا کہ محافظ اپنا خیمہ خانی ماں کے خیمے سے دو سو گز دور لگائیں گے
...نہ تو وہ بیمار کے خیمے میں جائیں گے اور نہ اس سے کوئی رابطہ رکھیں گے۔ اس طرح محافظوں کا خیمہ اس
...نے میں خانی ماں کے خیمے سے دو سو گز دور نصب کر دیا گیا۔

خانی ماں کے محافظ بڑے وفادار ثابت ہوئے۔ انہیں یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ خانی ماں کا یہ آخری وقت ہے
...امتناعی خیموں میں صرف ایسے مریضوں کو رکھا جاتا تھا جن کے بچنے کی کوئی امید نہ ہو۔ ننانوے فیصد مریضوں
...لاشیں ہی ان خیموں سے اٹھائی جاتی تھیں۔

خانی ماں کے محافظ دراصل بڑے خان کے سامنے سرخرو ہونا چاہتے تھے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ
...نے اپنی جان کی پروا نہ کی اور مرتے دم تک خانی ماں کی حفاظت کا فرض ادا کرتے رہے۔ اس سلسلے میں محافظ
...کے کسی حصے میں خانی ماں کے خیمے سے دور دور رہ کر ایک چکر لگایا کرتے تھے تاکہ خانی ماں اگر زندہ بچ
...تو وہ ان کی وفاداری کی گواہی دیں۔

پتہ نہیں یہ اس جگہ کی آب و ہوا کا اثر تھا یا گل عذار کی دعاؤں کی تاثیر کہ یہاں آتے ہی خانی ماں کی طبیعت
...لگی۔ پہلے ان کے پیروں میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر وہ پیر سمیٹنے اور کھولنے کے قابل ہو گئیں۔ زندگی کی
...لہر ان کے دل میں پیدا ہو گئی۔ اور پژمردہ چہرے کی رونقیں پھر لوٹ آئیں۔ گل عذار تو خوشی کے مارے
...رہی تھی۔ وہ خانی ماں کے گلے میں باہیں ڈال کے کہتی:

"دیکھا خانی ماں۔ میرا خدا سب سے بڑا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم بہت جلد چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گی۔" اور خانی ماں اسے سینے سے چمٹا کر پیار کر لیتیں۔

خانی ماں کو دوبارہ زندگی مل گئی۔

پہلے وہ گل عذار کے سہارے چلیں۔ پھر چھڑی کا سہارا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا کہ وہ بغیر کسی سہارے کے کمرے میں گھومنے لگیں۔ گل عذار خوشی کے مارے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

"ماں۔ اب ہم اپنے گھر چلیں گے۔ گنبد والے گھر۔ اب تم بیمار تھوڑی ہو۔" گل عذار نے لہکا
"نہیں گل۔ ابھی نہیں۔"

خانی ماں نے اس کے گال تھپتھپائے:

"ابھی کچھ دن اور یہاں ٹھہرنا ہوگا۔"

"کیوں ماں؟"

گل اٹھلائی:

"میرے اللہ نے تمہارے پیر اچھے کر دیے۔ اب ہم اس ویرانے میں کیوں پڑے رہیں۔"

"گل۔ تجھے یہاں کا دستور نہیں معلوم۔"

خانی ماں اسے بتانے لگیں:

"جب بیمار اچھا ہو جاتا ہے تو اپنے پیروں سے چل کر اپنے گھر جاتا ہے۔ اس وقت ہمارے بستی کے تمام خاص و عام جمع ہوتے ہیں۔ وہ مریض کو اپنی آنکھوں سے چلتے دیکھتے ہیں۔ اگر مریض راسے جائے تو اسے پھر امتناعی خیمے میں بھیج دیتے ہیں۔"

"عجیب دستور ہے مغلوں کا۔"

گل نے منہ بنایا:

"تو پھر آپ کب تک گھر جانے کے قابل ہو جائیں گی۔"

خانی ماں اس کی معصومیت پر مسکرا دیں:

"کل سے میں خیمے کے باہر سیر کرنے نکلوں گی۔ مجھے اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔"

آخر خانی ماں سیر کے لیے باہر نکلیں۔ محافظوں کی جو اُن پر نظر پڑی تو "خانی ماں۔ خانی ماں" کہتے ہوئے

ان کے پاس آ گئے۔ ان کی عقیدت خانی ماں سے اور بڑھ گئی۔

صحت یاب ہونے والے مریض کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس نے بدروح سے لڑ کر اسے اپنے پیٹ سے نکال پھینکا ہے۔ اس طرح اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

اسی دن ایاس خواجہ کو خبر دی گئی کہ خانی ماں اچھی ہو گئی ہیں۔ وہ وادی میں سیر کرتے دیکھی گئی ہیں۔ ایاس خواہر نہیں بہت چاہتا تھا۔ اس نے فوراً اپنے خاص ملازم کے ذریعے خانی ماں سے دریافت کیا کہ وہ کب واپسی کی رسم ادا کرنے کو تیار ہیں۔ خانی ماں نے کچھ سوچ کر دو دن بعد واپسی کا اعلان کر دیا۔ خیمہ گاہ میں یہ خبر پھیلی تو ہر شخص خانی ماں کی دوسری زندگی دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

اس رات گل عذار نے پہلی بار اپنے شک کا اظہار کیا:

"ماں! مجھے کئی راتوں سے نیچے وادی میں ایک سایہ سا گھومتا دکھائی دیتا ہے۔"

"پگلی کہیں کی!"

خانی ماں نے پیار بھرے لہجے میں کہا:

"تیرا وہم ہے۔ یہاں تو دور دور تک آبادی کا نشان نہیں۔"

"نہیں خانی ماں۔"

گل عذار اعتماد سے بولی:

"میں نے اسے آواز دے کر پوچھا بھی کہ وہ کون ہے لیکن وہ فوراً غائب ہو گیا۔ مجھے یقین ہے ماں۔ وہ ضرور ہمارا کوئی دشمن ہے۔ جبھی تو میرے پکارنے پر بھاگ جاتا ہے۔"

"تو نے کب دیکھا تھا سایہ؟" خانی ماں بھی کچھ فکر مند ہو گئیں۔

"کب کیسی ماں۔ میں تو اسے روز دیکھتی ہوں۔"

گل عذار نے انکشاف کیا:

"ایک دفعہ تو وہ سیدھا اس خیمہ کی طرف آ رہا تھا مگر آواز دیتے ہی چٹانیں پھلانگتا بھاگ گیا۔"

"تو نے محافظوں سے پوچھا؟"

خانی ماں نے مزید تصدیق کرنا چاہی:

"ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ہماری خیریت معلوم کرنا چاہتا ہو اور خود کو ظاہر بھی نہ کرنا چاہتا ہو"

خانی ماں کی بات کچھ معقول تھی لیکن گل عذار نے فوراً تردید کر دی:

"یہ بات نہیں ماں۔ جب سایہ بھاگ جاتا ہے تو میں تمہیں جگانے کے بجائے شمع لے کر دروازے

باہر نکلتی ہوں اور محافظوں کے خیمہ کی طرف رُخ کر کے اسے گردش دیتی ہوں۔ اس کے جواب میں وہ بھی

کر کے ہلاتے ہیں۔ کبھی تو محافظ آواز بھی لگاتے ہیں کہ ہم جاگ رہے ہیں۔"

"اچھا تو سو جا۔"

خانی ماں نے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی:

"یہ سایہ اصل میں میرے پیٹ سے نکلی ہوئی بد روح ہے۔ بد روحیں مریض کو تو چھوڑ جاتی ہیں

کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہیں۔"

گل عذار نے یہ تو بزرگوں سے سنا تھا کہ دنیا میں نیک اور بد روحیں ہوتی ہیں لیکن یہ بات اس

کسی طرح نہ آتی تھی کہ بد روح کے پیٹ میں گھس جانے سے کوئی بیمار ہو سکتا تھا۔ بیماری تو اللہ کی طرف

ہوتی ہے۔ کبھی وہ کسی کو سزا دینے کے لیے بیمار کر دیتا ہے تو کبھی بیماری کو موت کا بہانہ بنا کر بھیجتا

یہ باتیں وہ خانی ماں کو کیسے سمجھاتی۔ خانی ماں تو توہم پرست اور بے دین تھیں۔

گل عذار نے کوئی جواب نہ دیا تو خانی ماں نے سمجھا کہ لڑکی کا خوف دور ہو گیا۔

"جا گل! اب سو جا۔"

گل اٹھ کے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن نیند

اس سے خفا ہو گئی تھی۔ وہ بار بار کروٹ بدلتی۔ آنکھیں بند کرتی۔ منہ پر کپڑا ڈال لیتی یا پھر چہرہ ہاتھوں

لیتی لیکن نیند کو نہ آنا تھا نہ آئی۔

آخر وہ جھلا کے اٹھ بیٹھی۔ آج وہ دل میں خانی ماں سے بھی خفا تھی۔ انہوں نے اس کی بات کا اعتبار

اور گل کو یقین تھا کہ وہ سایہ کتنا ہی پُراسرار کیوں نہ ہو بد رُوح نہیں ہو سکتی۔ روح تو ہوا کے جھونکے کی

ہے۔ ادھر سے آیا اُدھر سے نکل گیا۔ یہ نہیں کہ جب اسے پکارا جائے یا ٹوکا جائے تو وہ نیچے اونچے راستے

بھاگتا ہوا کسی چٹان کے پیچھے چھپ جائے۔

گل عذار نے سر پر ایک سیاہ کپڑا ڈالا اور خنجر لیے ہوئے خیمے کے دروازے پر آ گئی۔ خانی ماں اپنے

کمرے میں محوِ خواب تھیں۔ ان کے کمرے میں ایک شمع ٹمٹما رہی تھی۔ گل عذار نے اپنے کمرے کی شمع روشن

کی ہوئی تھی۔ خانی ماں اور اس کے کمرے کے درمیان جو پردہ پڑا تھا وہ اس قدر باریک تھا کہ خانی ماں کے

کمرے کی روشنی کے ساتھ ان کی صورت بھی اس کے کمرے میں جیسے در آتی تھی۔ وہ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے ان کو

سوتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔

تاریک رات تھی اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گل عذار کا اس سائے کے لیے تجسس بہت بڑھ گیا تھا۔

خانی ماں کی باتوں سے وہ کچھ اور چڑ گئی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ خود سائے کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرے۔

وہ تاتاری لڑکی تھی۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ بھوت پریت سے نہ ڈرتی تھی۔ بھوت پریت تو صرف "لاحول"

پڑھنے سے بھاگ جاتے تھے۔ وہ جی کڑا کر کے خیمے سے کچھ آگے بڑھی۔ قریب ہی ایک چھوٹی چٹان تھی۔ گل عذار

بے پرواہ چٹان کے پاس پہنچ گئی۔ چٹان کے قریب کھڑے ہو کر اس نے ادھر دیکھنا شروع کیا جہاں اس

نے دو بار سائے کو دیکھا تھا۔

اندھیرا اتنا تھا کہ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ دس گز دور خیمہ مشکل سے نظر آ رہا تھا پھر بھلا سو گز دور وہ جگہ یا

وہاں پر سایہ کیا نظر آتا۔

گل عذار خود کو کوستی ہوئی واپس ہوئی۔ ناحق وہ رات کے وقت خیمے سے نکلی۔ خانم ماں کی آنکھ کھل گئی

اور مجھے خیمے میں نہ پا کر کیا سوچیں گی۔ اس نے واپسی کے لیے پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ ٹھٹک کر کھڑی ہو

گئی۔ خوف کے مارے اس کے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے جلدی جلدی درود شریف پڑھا۔

آنکھیں ملیں۔ پھر خیمے کی طرف دیکھا۔

وہی۔ ہاں وہی سایہ دبے قدموں خیمے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک ہی لمحے کے دوران اس

کے دماغ میں سینکڑوں خیالات بجلی کی سی سرعت سے گھوم گئے۔

کون ہے یہ؟

کہیں خانی ماں کا دشمن نہ ہو؟

خانی ماں کو مارنے نہ آیا ہو؟

پھر۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔ اس کا سر چکرانے لگا لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔ خطرہ سر پر منڈلا
مدافعت کی قوت خود کر آتی ہے۔ اسے اپنے سے زیادہ خانی ماں کی فکر تھی۔ پھر ایک دم اس کے
"خانی ماں ہوشیار۔ خانی ماں ہوشیار۔"

اور وہ اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی سے خیمے کی طرف دوڑ پڑی۔

گل عذار کی آواز اس قدر تیز اور بھیانک تھی کہ پوری وادی گونج اٹھی۔ رات کے سناٹے م
آواز تیز معلوم ہوتی ہے۔ گل تو گلا پھاڑ کے چلائی تھی۔

سایہ خیمے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ گل عذار کی بھیانک آواز یا چیخ سے وہ گھبرا گیا۔
پلٹ کر آواز کی سمت دیکھنے کی بھی کوشش نہ کی اور بے تحاشا خیمے کی دوسری طرف بھاگ نکلا۔ گل عذا
خیمے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کی آواز سے خانی ماں جاگ اٹھی تھیں۔ وہ دروازے کی طرف آ رہ
دروازے پر دونوں باہم ٹکراتے ٹکراتے بچیں۔

گل عذار خانی ماں سے لپٹ گئی:

"ماں، ماں۔ خانی ماں۔ وہ۔ وہی۔"

"ہوش میں آ بیٹی۔ وہ کون ہے۔ کہاں ہے؟" خانی ماں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

"خانی ماں۔ وہی سایہ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے۔" گل کی سانس ابھی تک پھولا

"گل۔ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ سایہ تجھے۔۔۔۔؟"

"سایہ نہیں خانی ماں۔ وہ ایک آدمی تھا۔"

"آدمی۔ کہاں تھا آدمی؟"

"خیمے کے دروازے پر۔"

گل سنبھل کر کھڑی ہو گئی:

"وہ خیمے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں آپ کو آواز نہ دیتی تو وہ خیمے میں داخل ہو جاتا۔"

"میری بچی۔ تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

خانی ماں کو قطعی یقین نہ آیا:

"کہاں نکلا۔ کدھر گیا۔" اور خانی ماں جھٹ سے خیمے سے باہر نکل گئیں۔

"...باہر نہ جائے۔ وہ خیمے کے پیچھے ہو گا۔" گل عذار بھی ان کے پیچھے باہر آ گئی۔ خنجر اس کے ہاتھ میں
...ا تھا۔

خانی ماں نے خیمے کا پورا چکر لگا لیا۔ دو چار قدم ادھر ادھر بڑھ کر جب دیکھا تو انہیں کچھ نظر نہ آیا۔
"گل عذار یہ وہم دل سے نکال دے ورنہ میں تو اچھی ہو جاؤں گی اور تو بیمار پڑ جائے گی۔"

گل عذار شرمندہ ہو گئی۔

وہ ایک حقیقت سے آشنا تھی لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ وہ کس طرح خانی ماں کو یقین
...کہ اس کا خیمہ خطرے میں ہے۔

گل عذار کی آواز دو سو گز دور محافظوں کے خیمے تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ شمعیں پکڑے، نیزے
...لیے ان کے پاس پہنچ گئے۔

"خانی ماں۔ ان سے کچھ نہ کہیے گا۔" گل نے ... سرگوشی کی۔

اسی وقت ایک محافظ بولا:

"خانی ماں۔ آپ باہر کھڑی ہیں۔ یہ چیخ کی آواز کس کی تھی؟"

"فکر کی کوئی بات نہیں۔"

خانی ماں نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا:

"بچی کو شبہ ہوا تھا کہ کوئی خیمے کے باہر آیا ہے۔ بس چیخ پڑی۔"

"ہاں خانی ماں۔"

ایک محافظ نے کہا:

"جوان لڑکیاں نہ جانے کیا کیا خواب دیکھتی ہیں اور سوتے میں کبھی ہنستی ہیں تو کبھی چیخیں مارنے
...ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ یہ خواب ہی سے ڈری ہے۔"

خانی ماں نے بات مختصر کی:

"مگر دیکھو خیمے سے دور دور تک ایک چکر لگاؤ۔ ہو سکتا ہے کوئی جنگلی جانور ادھر آ نکلا ہو۔"

"بہتر ہے خانی ماں۔ آپ آرام کریں۔ ہم ابھی جا کے دیکھتے ہیں۔"

محافظ سلام کر کے مشعلیں لیے چلے گئے۔ خانی ماں گل عذار کو اپنے کمرے میں لے آئیں۔ انہوں
اس کے سینے پر ہاتھ رکھا تو گل کا دل دھڑ دھڑ ہو رہا تھا۔

"تو بڑی ڈرپوک ہے گل"۔ خانی ماں مسکرائیں۔

گل عذار بھنا اٹھی:

"میں تاتاری لڑکی ہوں ماں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ مجھے اپنی فکر نہیں۔ میں تو۔ میں تو.....!

"کہہ ڈالو جو منہ میں آیا ہے"۔

خانی ماں نے اس کے رخسار پر آئے بال ہٹا دیے:

"تجھے اپنی فکر نہیں ہے تو پھر کس بات کا ڈر ہے۔ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہے۔ بیٹیاں ماں سے
نہیں چھپایا کرتیں۔ لڑکی بڑی ہو جائے تو ماں اس کی سہیلی بن جاتی ہے۔ اب مجھے صاف صاف بتا دے تو
ڈرتی ہے۔ کیوں ڈرتی ہے؟"

خانی ماں کسی اور ہی راستے پر چل پڑیں۔ گل نے انہیں حیرت سے دیکھا:

"مجھے غلط نہ سمجھو ماں۔ میں بتاتی ہوں لیکن تم اس بات کا بھی یقین نہ کرو گی"۔

"تو بات بتا۔ مجھے بڑا اعتبار ہے"۔

"وہ تمہارا کوئی دشمن تھا خانی ماں"۔

"میرا دشمن۔ میرا کوئی دشمن نہیں"۔

خانی ماں بڑے وثوق سے بولیں:

"میری مخالفت کی جا سکتی ہے لیکن کوئی دشمنی کی حماقت نہیں کر سکتا۔ میری دشمنی موت کو آواز دینا ہے
کسی نے مارنے کی کوشش کی تو خانِ اعظم تغلق تمور اس کے گھر بار، خاندان بلکہ محلہ اور شہر والوں کو بھی
خاکستر کر دے گا۔ میری دشمنی تو ایاس خواجہ بھی مول نہیں لے سکتا۔ اس کی حکومت میرے ایک اشارے
الٹ سکتی ہے"۔

خانی ماں تھک کر زور زور سے سانس لینے لگیں۔ گل عذار کو یقین کرنا پڑا کہ واقعی کوئی ان کا دشمن نہیں ہو
سکتا۔ لیکن پھر وہ کون تھا۔ کس لیے خیمے کے پاس گیا تھا۔ مجھ سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟

ایک دم سے اسے اوغلو خان کا خیال آیا مگر اس خیال کو اسے خود ہی رد کرنا پڑا۔ اوغلو خان تو بے

ہوشمند ہے۔ اس دن وہ معافی مانگنے آیا تھا۔

گل ان خیالات میں الجھتی ہی چلی گئی۔ اب تو اسے اپنے اوپر بھی شبہ ہونے لگا۔ کہیں وہ وہم کا شکار تو
نہیں ہو گئی۔ ممکن ہے کہ وہ سایہ نہ ہو بلکہ اس کے وہم نے اسے ہیولا بنا دیا ہو۔ کہتے ہیں وہم کے مریض کو
ہر چیز اپنے تصور کے مطابق نظر آتی ہے۔

"ہاں خانی ماں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ سب میرا وہم ہے"۔ گل نے خیالات کی یورش سے تنگ آ کر اپنی
شکست تسلیم کر لی۔

"بس جاؤ اور اچھی لڑکیوں کی طرح آنکھیں بند کر کے سو جاؤ"۔

خانی ماں نے اس کے اعتراف سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پھر خود ہی بات پلٹ دی:

"نہیں گل۔ میرے ہی کمرے میں سو جا اور آئندہ بھی میرے پاس سویا کر"۔

"نہیں خانی ماں"۔

گل سمجھی کہ خانی ماں اسے بزدل اور ڈرپوک سمجھ رہی ہیں:

"میں اپنے کمرے میں سوؤں گی اور ہمیشہ الگ ہی سویا کروں گی۔ مجھے کسی کا خوف نہیں"۔

گل اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر اس کا وہم پھر مختلف شکلوں میں نمودار ہو گیا۔ وہ سایہ تھا ضرور
کسی کا۔ اس کے دل نے کہا۔ پہلے دور دور دکھائی دیا اور آج خیمے کے دروازے پر۔ اس نے گھبرا کے آنکھیں
کھول دیں۔ شمع کی مدھم روشنی پردے سے چھن چھن کر اس کے کمرے میں آ رہی تھی۔ اس نے آیت الکرسی پڑھی تو
دل کچھ ٹھہرا۔ اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

رات کا نہ معلوم کون سا پہر تھا کہ گل عذار کی آنکھ پھر کھل گئی۔ وہ سوئی نہیں تھی۔ نیند کے غلبے سے اس کی
آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اسی حالت میں ذرا سی آہٹ یا کھٹکے سے آنکھ کا کھل جانا کچھ تعجب خیز نہ تھا۔ پھر یہ آہٹ
کھٹکا نہ تھا۔ یہ تو کسی کے قدموں کی آواز تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں تو دھوکا دے سکتی تھیں لیکن وہ بہری
نہ تھی کہ اتنی صاف آواز بھی اسے سنائی نہ دیتی۔

اس نے آنکھیں ملیں۔ کانوں میں انگلیاں ڈال کر جیسے انہیں صاف کیا لیکن آواز تو قریب سے قریب تر
ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ دبے قدموں احتیاط کے ساتھ خیمے کی طرف بڑھ رہا ہو۔

گل عذار بڑی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ کیا وہ واقعی اتنے بڑے وہم میں مبتلا ہو گئی ہے کہ اس کی آنکھوں کے بعد اب اس کے کان بھی اسے دھوکا دینے لگے۔ یہ وہم یا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ اس کے دل میں یقین ہو گیا۔

گل عذار نے سوچا کہ خطرے سے یوں آنکھیں بند کر لینا بزدلی ہی نہیں بے وقوفی ہے۔ اسے وقت سے پہلے خطرے کی مدافعت کا انتظام کرنا چاہیے۔

گل فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سرہانے سے خنجر نکال کر ہاتھوں میں لے لیا۔

وہ خنجر لے کر پردے کے پاس پہنچی۔ خانی ماں بڑے آرام سے سو رہی تھیں۔ گل نے انہیں جگانے کی کوشش نہ کی کیونکہ کچھ گھنٹے قبل وہ گل کو وہی کہہ چکی تھیں جس نے خود اس کے اپنے اعتماد کو ڈگمگا دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آنے والا جیسے ہی خانی ماں کے کمرے میں داخل ہو گا وہ اس پر حملہ کر دے گی۔ وہ خانی ماں کو دشمن سے بچائے گی خواہ اس کی اپنی جان ہی کیوں نہ جاتی رہے۔

قدموں کی آواز دروازے تک پہنچ گئی۔

گل کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا لیکن وہ خنجر مضبوطی سے پکڑے حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ دو کمروں کے اس خیمے میں دروازے کے بجائے موٹا پردہ پڑا ہوا تھا۔ عام بیماروں کو جو امتناعی خیمہ دیا جاتا تھا اس پر پردہ بھی نہ ہوتا تھا۔ یہ تو خانی ماں کا خاص لحاظ تھا کہ ان کے لیے خیمے پر پردہ لٹکایا گیا تھا۔ گل نے اندازہ لگایا کہ آنے والا دروازے (پردے) پر آ کر رک گیا۔

"خانی ماں!" باہر سے ایک ڈوبی ڈوبی آواز آئی جیسے کوئی خواب میں بول رہا ہو۔

گل کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے خانی ماں کو دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے لیکن اب یہ اطمینان ضرور تھا کہ آنے والا دشمن نہیں۔ دشمن ہوتا اور کسی بری نیت سے آتا تو لے آواز دینے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن آخر یہ ہے کون اور اتنی رات گئے آیا کیوں ہے؟

"خانی ماں!"

اب کے آواز صاف تھی:

"ہم سب نے دور دور تک دیکھ لیا۔ کوئی خطرے کی بات نہیں۔"

گل بے ساختہ مسکرا پڑی۔ یہ تو ان محافظوں میں سے ایک تھا جسے خانی ماں نے چاروں طرف دیکھ بھال کے لیے بھیجا تھا۔ محافظ جواب کا انتظار کرتا رہا۔ جواب کون دیتا۔ خانی ماں تو کسی اور دنیا میں پہنچی ہوئی تھیں۔ اس نے

دیر تک جواب نہ سمجھا۔

محافظ واپس چلا۔ اس کے قدموں کے فاصلے کے ساتھ ساتھ آواز کم ہوتی گئی۔ گل واپس آئی۔ اب اس کا دل مطمئن تھا۔ لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی۔

⊙

گل رات بھر جاگتی رہی تھی۔ صبح دیر تک سوئی۔ خانی ماں اسے دیکھ کر کئی بار واپس ہو گئی تھیں۔ گل بیدار ہوئی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ وہ جلدی سے خانی ماں کے پاس گئی اور رات کا قصہ ہنس ہنس کے انہیں بتایا۔ وہ بھی خوب ہنسیں۔ دیر تک سونے سے اس کی ساری کسلمندی دور ہو گئی تھی۔ وہ خوش بھی بہت تھی۔ آج اس خیمے میں اس کا آخری دن تھا۔ کل صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی وہ اپنے محل نما گھر میں پہنچ جائے گی جہاں نوکر چاکر ہوں گے خانی ماں کی رفاقت ہو گی۔ نہ کسی کے قدموں کی آواز ہو گی اور نہ کوئی "سایہ" دکھائی دے گا۔

دن اسی ہنسی خوشی میں گزر گیا۔

شام ہوئی تو گل عذار کو دور خیمہ گاہ میں چراغ جگمگ کرتے دکھائی دیے۔ وہ خانی ماں کو باہر لے آئی پوری خیمہ گاہ گلستان سی کھلی ہوئی تھی۔ خانی ماں کا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ یہ اہتمام ان کی واپسی کی خوشی میں کیا گیا تھا۔ بیماروں میں سے کوئی خوش قسمت ہی زندہ واپس آتا تھا۔ جو بچ جاتا اس کا استقبال بڑے پُر وقار طریقے سے ہوتا۔ خانی ماں تو شاہی خاندان سے تھیں اور سب کے لیے قابلِ احترام۔ انہیں واپس تو صبح کو جانا تھا لیکن ان کے استقبال کی تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی تھیں۔

وہ دونوں اس پُر لطف نظارے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں کہ ایاس خواجہ کی طرف سے خانی ماں اور گل کے لیے نیا لباس بھیجا گیا۔ لباس لانے والے ملازموں کے ساتھ دو جادوگر بھی تھے۔ ان میں ایک وہ بھی تھا جس نے گل کے لیے سخت لکالی کی تھی۔ خانی ماں نے اسے فوراً پہچان لیا مگر ایسی بن گئیں جیسے اسے پہلی بار دیکھا ہے۔ وہ بے چارہ بہت شرمندہ تھا۔

لباس لانے والے جادوگروں کو خانی ماں کے کمرے میں بٹھایا گیا۔ خانی ماں اور گل عذار نے نئے کپڑے دوسرے کمرے میں پہنے اور پرانے کپڑوں کی پوٹلی بنا کر جادوگروں کے حوالے کر دی۔ جادوگران کپڑوں پر دیر تک کچھ

پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہے۔ پھر باہر لے جا کر کپڑوں میں آگ لگا دی۔ جب تک کپڑے جلتے رہے وہ منہ ہی منہ میں پڑھتے اور پھونکتے رہے۔

جو ملازم ساتھ آئے تھے وہ اس تمام عرصے میں آنکھیں بند کیے سہمے سے خیمے کے اندر ہی بیٹھے رہے۔ جب کپڑے جل کر راکھ ہو گئے تو دونوں جادوگر مسکراتے ہوئے واپس آئے اور خانی ماں کو مبارک باد دی۔

"مبارک ہو خانی ماں۔ بد روح شمال میں بھاگ گئی ہے۔ ہم نے حد بندی کر دی ہے اب وہ واپس نہیں آ سکتی۔"

"تم اگر چاہو تو وہ کبھی واپس نہ آئے۔"

خانی ماں بڑی عقیدت سے بولیں:

"میں نے اس بیماری میں بڑی تکلیف اٹھائی ہے۔ اس بیماری نے ہمارے کتنے بڑے بڑوں کی جان لی ہے۔"

"ہاں خانی ماں۔ گنگھٹیا دیوی آسمانی دیوتاؤں کی خدمت گزار ہے۔ ایک بار بڑے دیوتا نے اس سے پوچھا تھا کہ تجھے کیا انعام دیا جائے تو دیوی نے دنیا کا سب سے اچھا خون پینے کی خواہش کی تھی۔ ہم مغلوں کا خون سب سے زیادہ پاک صاف اور اچھا ہے۔ دیوتا نے اسے ہمارا خون بخش دیا۔ تب سے یہ مغلوں کا خون پینا چاہتی ہے کسی بد روح کو بھیج دیتی ہے جو کسی مغل کے پیٹ میں گھس کر سارا خون کھینچ لیتی ہے۔"

جادوگر نے مغلوں میں پائی جانے والی گنگھٹیا کی عام بیماری کی تفصیل اس طرح بیان کی جیسے یہ باتیں اس کے سامنے ہوئی تھیں۔ خانی ماں سر ہلا ہلا کر اس کی تصدیق کرتی رہیں۔

گل عذار چونکہ مسلمان تھی اسے جادوگر کی ان فضول باتوں پر غصہ آ رہا تھا۔

اب جادوگر نے خانی ماں سے واپسی کی تفصیلات پر گفتگو شروع کی۔ وہ دراصل اس وقت الیاس خواجہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ خانی ماں سوچ سوچ کر جواب دیتی رہیں۔

طے یہ ہوا کہ خانی ماں کو واپس لے جانے کے لیے صبح کو ایک سجی سجائی گاڑی آئے گی جس میں بیل جتے ہوں گے۔ جس وقت گاڑی روانہ ہو گی تو الیاس خواجہ کا غلام خاص، گھوڑے پر سوار ہو کر گاڑی کے آگے چلے گا۔ وہ الیاس خواجہ کا نمائندہ ہو گا۔

یہ گاڑی خانی ماں کو لے کر وادی میں اس جگہ تک جائے گی جہاں الیاس خواجہ مع اپنے تمام سرداروں کے

ان کے استقبال کے لیے موجود ہو گا۔ وہاں گاڑی چھوڑ دی جائے گی اور خانی ماں ایک جلوس کی شکل میں پا پیادہ اپنے گھر جائیں گی۔ اس طرح یہ شاہانہ جلوس خانی ماں کے گھر پر اختتام پذیر ہو گا۔ وہی گھر جس سے انہیں دودھ کی مکھی کی طرح کچھ دن پہلے نکال دیا گیا تھا۔

خانی ماں چاہتی تھیں کہ آج رات وہ پوری نیند سوئیں تاکہ کل تر و تازہ اٹھیں۔ انہیں زندگی کے امتحان سے گزرنا تھا۔ جو راستہ انہیں پیدل طے کرنا تھا وہ ایک میل سے کم نہ تھا۔ راستہ بھی اونچا نیچا اور پتھریلا تھا۔ اس عمر میں اتنا فاصلہ بغیر رکے طے کرنا تھا۔ اگر پیر مڑ گئے اور وہ اپنے گھر پہنچنے سے پہلے گر گئیں تو یہی مغل جو اس وقت ان پر نثار ہونے کو تیار ہیں۔ جو ان کے استقبال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہتے ہیں، یہی لوگ آنکھیں پھیر لیں گے اور چیخ چیخ کر کہیں گے کہ:

"بڑھیا کو واپس لے جاؤ۔ اسے خیمے میں مرنے دو۔"

خانی ماں نے بہت چاہا کہ وہ لیٹ جائیں لیکن وہاں تو آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ جادوگر رخصت ہوئے تو الیاس خواجہ کا نائب آ گیا۔ خانی ماں، بیماری کے کپڑے تبدیل کر چکی تھیں۔ کپڑے خاکستر بھی کیے جا چکے تھے اس لیے ان سے کوئی بھی مل سکتا تھا۔ ان کے خیمے سے امتناعی نشان مٹایا جا چکا تھا۔

الیاس خواجہ کا نائب السلطنت ایک گھنٹے تک خانی ماں کا دماغ چاٹتا رہا۔ اس کے آنے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ وہ ملاقات کے لیے آیا تھا اور خانی ماں پر یہ تاثر چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ ان کی بیماری کی خبر سے سخت پریشان ہوا تھا اور جب سے ان کے صحت یاب ہونے کی خبر ملی ہے وہ بے حد خوش ہے اور اسی کا اظہار کرنے کے لیے وہ آیا ہے۔

خانی ماں نے اس بیماری کے دوران ایک ایک کو پرکھ لیا تھا۔ ان کی محبت اور منافقت دونوں ہی ان کے سامنے تھی۔

نائب السلطنت کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ الیاس خواجہ کا خادم خاص آ گیا۔ خانی ماں سونے کے لیے بستر پر لیٹ چکی تھیں۔ گل عذار ان کا سر دبا رہی تھی۔ اسے خانی ماں کے ساتھ خلوصِ دل سے محبت تھی۔ ایک کے بعد ایک کا آنا اسے خانی ماں سے بھی زیادہ شاق گزر رہا تھا۔ وہ بھی یہ چاہتی تھی کہ یہ رات خانی ماں پورے سکون سے گزاریں تاکہ کل پیدل چلنے میں انہیں کوئی تھکن محسوس نہ ہو۔

الیاس خواجہ کے خادمِ خاص کا مرتبہ نائب السلطنت سے کسی طرح کم نہ تھا بلکہ خادمِ خاص تو خود کو نائب السلطنت

سے بھی بڑا سردار سمجھتا تھا۔ نائب السلطنت کی بات رد کی جا سکتی تھی لیکن الیاس خواجہ نے آج تک خادم خاص کی
کوئی بات رد نہ کی تھی۔ الیاس خواجہ کے گھر کی تمام محافظ عورتیں اور مرد اس کے ماتحت تھے۔ اس کی
"داروغہ محلات" جیسی تھی۔

خانی ماں کو تکلفاً بستر پہ بیٹھ کر اسے خوش آمدید کہنا پڑا۔ الیاس خواجہ نے خانی ماں کے لیے
گھوڑی کا دودھ بھیجا تھا۔ گھوڑی کا دودھ مغل نہ صرف شوق سے پیتے بلکہ اسے متبرک سمجھتے تھے۔ یہ
چنگیز خان کو بہت مرغوب تھا اور جو چیز چنگیز خان کو پسند تھی اسے پسند نہ کرنا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔
خادم خاص نے بڑی مشکل سے خانی ماں کی جان چھوڑی۔ گل عذار اپنے کمرے میں بیٹھی غلام کی
مکارانہ باتوں پر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلا، گل عذار دندناتی ہوئی خانی ماں کے پاس آ گئی۔
"ماں، بس اب تم آرام کرو۔ کوئی اور آئے گا تو میں اسے تم سے نہ ملنے دوں گی۔ کہہ دوں گی خانی ماں
رہی ہیں۔ کل...... کل کا دن آپ کے لیے بہت سخت ہے..... یونہی رات بھر لوگوں سے ملتی رہیں
گی؟"

خانی ماں مسکرائیں:

"کوئی محبت سے ملنے آئے تو اسے دروازے سے نہیں لوٹایا کرتے بیٹی؟"

"محبت!"

گل نے زہرخند کیا:

"میں خوب جانتی ہوں اس محبت کو۔ جب تم گھر سے نکالی جا رہی تھیں اور تبتی کنیز تمہارے پیچھے
رو رہی تھی تو یہی ظالم اس غریب کے بال پکڑ کر تمہارے پاس سے گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا
محبت۔ یہ سب دکھاوا ہے۔ منافقت ہے خانی ماں۔ یہ لوگ اعتبار کے قابل نہیں۔"
گل عذار نے ایک سانس میں دل کی بھڑاس نکال لی۔ پھر نہ جانے کیوں خانی ماں کے پیروں میں
آنسو ملنے لگی۔

خانی ماں اس کی صورت غور سے دیکھتی رہیں۔ پھر محبت سے بولیں:

"ماں! تم مغلوں کی محبت کو دکھاوا کہتی ہو۔ کیا تجھے یقین ہے کہ مغل کسی سے محبت نہیں کرتے!"
"ہرگز نہیں ماں، مغل کے دل میں محبت نام کی کوئی چیز نہیں۔" وہ آنسو پونچھنے لگی۔

"میں بھی تو مغل ہوں گل۔ کیا تجھے میری محبت پر......"
گل نے جلدی سے خانی ماں کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا:
"ایسا نہ کہو خانی ماں۔ میں تو تمہاری محبت کے سہارے زندہ ہوں۔"
گل عذار کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک اٹھے:
"ماں۔ میں اکثر سوچتی ہوں تم مغل نہیں تاتاری ہو۔"
"گل!"

خانی ماں کا لہجہ کھردرا ہو گیا:
"ایسا پھر کبھی نہ کہنا۔ تاتاری مغلوں کے ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یاد رکھو مغل، تاتاریوں سے
بہتر ہیں۔ مجھے اپنے مغل ہونے پر فخر ہے۔ میں تاتاریوں کے بارے میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتی لیکن یہ پتے
کی بات ہے کہ مغلوں کے مزاج میں "شدت" ہوتی ہے۔ وہ محبت کرتے ہیں تو ٹوٹ کے اور نفرت کرنے پر آئیں تو
ان کا خون بہا کے بھی قہقہے لگاتے ہیں۔"
گل عذار کو افسوس ہوا کہ اس نے مغلوں کی توہین کر کے خانی ماں کا دل دکھایا:
"معاف کر دو ماں۔ میں جذبات میں نہ جانے کیا کیا کہہ گئی۔ مجھے تم نے جو محبت دی ہے وہ تو مجھے اپنے
ماں باپ اور بھائی بہنوں سے بھی نہ مل سکی۔ یہ محبت اور محبت کی یہ شدت تو شاید ظفریاب میں بھی موجود......"
گل عذار کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گئی۔
"ظفریاب تمہارا شوہر تھا جس سے تم چھینی گئی تھیں؟" خانی ماں نے دلچسپی سے پوچھا۔
"ہاں ماں۔ ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ پھر ہماری شادی ہو گئی لیکن ہم میاں بیوی نہ ہو سکے۔"
اس نے حجاب سے گردن جھکا لی۔
"یہ کیا کہہ رہی ہو گل؟"
خانی ماں شاید اس کی بات نہ سمجھ سکیں۔
"شادی کے بعد تو میاں بیوی مرد عورت ہو جاتے ہیں۔"
"ہاں ماں۔ لیکن مجھے اس وقت اغوا کیا گیا جب میں دل میں ظفریاب کا تصور اور آنکھوں میں اس کی
راہ لیے حجلہ عروسی میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔"

خانی ماں کو اس کا بہت دکھ ہوا لیکن وہ مغلوں کی برائی نہ سن سکتی تھیں اور نہ اپنی زبان سے انہیں ظالم کہہ سکتی تھیں۔

"جا سو جا گل۔ تُو بہت تھکی ہوئی ہے۔"

خانی ماں نے مزید گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔

گل عذار بستر پر لیٹ گئی لیکن یہ بستر آج اسے کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ ظفر یاب کا نام ایک دم اس کی زبان سے نکل گیا تھا۔ وہ خانی ماں سے اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہ کرنا چاہتی تھی لیکن جب ذکر آ ہی گیا تو دل کی بات چھپا بھی نہ سکی۔

تھکن سے اس کا جسم چُور چُور ہو رہا تھا اور ظفر یاب کی یاد نے بھی اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑی تھی لیکن نیند تو جیسے اس سے روٹھ گئی تھی۔ اس عالم میں نہ معلوم رات کا کتنا حصہ بیت گیا کہ اسے خیمے کے باہر کسی کے پیروں کی چاپ محسوس ہوئی۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔

"کون ہے؟" اس کے منہ سے آہستہ سے نکل گیا۔

پیروں کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ گل عذار کی چھٹی حس زور سے پھڑکی۔ اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے نظر گھما کر خانی ماں کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے سکون سے سو رہی تھیں۔ اس کے دماغ میں کشمکش شروع ہو گئی۔ وہ کیا کرے؟ خانی ماں کو جگائے۔ خود باہر نکل کر دیکھے لیکن خانی ماں تو اسے پہلے ہی وہم کے طعنے دیتی تھیں۔ اگر انہیں جگایا اور باہر کوئی نہ ہوا تو وہ خانی ماں کی نظروں میں کس قدر ذلیل ہو گی۔ لیکن یہ چاپ۔ یہ آواز کس کی ہو سکتی ہے یہ؟ کوئی جانور؟

جانور کے خیال سے اسے اطمینان ہوا۔

خیمہ ویران جگہ پہ ہے..... ضرور کوئی جانور ہو گا۔ وہ دل کو تسلی دے کر لیٹ گئی۔

اسے یہ تو اطمینان تھا کہ اس علاقے میں کوئی جنگلی درندہ موجود نہیں۔ بیس ہزار سواروں کی خیمہ گاہ کے قریب کسی درندے کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو بستی کے قائم ہونے سے پہلے ہی کوسوں کا علاقہ خالی کر کے بھاگ گئے تھے۔ ہاں کتا، بلی یا جنگلی چوہے کا امکان ہو سکتا تھا۔

پھر ظفر یاب کا خیال اسے اچانک آیا تھا۔ وہ اس کے خیالوں میں کھو گئی۔ بچپن سے جوانی تک کے لمحات ایک ایک کر کے اس کے تصور کے کینوس پر پھیلنے لگے۔ پیروں کی چاپ اور خطرے کا احساس

ذہن سے محو ہو گیا۔

"کون ہے؟" دفعتاً اس کی زبان سے نکلا۔

وہ گھبرا کے اٹھی۔ دروازے پر نظر پڑی تو اس کا پردہ ہلتا ہوا معلوم ہوا جیسے کوئی جلدی سے نکل کے باہر گیا ہے۔

خانی ماں بدستور آرام سے سو رہی تھیں۔ گل عذار نے ہاتھ بڑھا کر سرہانے سے خنجر نکال لیا۔ اس نے قدموں کی چاپ نہیں سنی تھی لیکن دروازے کے پردے کا اس طرح ہلنا، گل کو کسی نامعلوم خطرے کی شدت سے احساس دلا رہا تھا۔

وہ دبے پاؤں خانی ماں کے کمرے سے گزر کر دروازے پر پہنچی۔ پردہ اپنی جگہ پر قائم ہو چکا تھا۔ بالکل ساکت و جامد..... گل عذار نے آہستہ سے پردہ ایک طرف سرکایا۔ کمرے میں جلتی ہوئی شمع کی روشنی ایک پتلی لکیر کی صورت باہر کے اندھیرے میں جذب ہو گئی۔

گل نے جھانک کر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا، گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے باہر نکلنے کی کوشش نہ کی۔ یہ غلطی وہ پہلے کر چکی تھی اور اس کی وجہ سے خانی ماں کی نظروں میں خفیف ہو چکی تھی۔ باہر ہوا بالکل بند تھی۔ اس وقت دور پار کہیں بلی کے لڑنے اور کتے بھونکنے کی آواز آئی۔ گل عذار مطمئن ہو کر واپس آ گئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ کسی وہم میں مبتلا نہ ہو گی۔ وہم تو بزدلی کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہ بڑھ جائے تو انسان بزدل ہو جاتا ہے۔ اس کی اصل حیثیتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ گل عذار نے خنجر سرہانے رکھ دیا اور زبردستی آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

کہتے ہیں کہ نیند تو سُولی پر بھی آ جاتی ہے۔ گل عذار کو صرف وہم ہوا تھا اور وہ کسی حد تک دُور بھی ہو گیا تھا۔ اس لیے اسے جلد ہی نیند آ گئی۔ شاید ظفر یاب کے تصور نے اسے لوریاں دے کر سُلا دیا۔ لیکن وہ زیادہ دیر نہ سو سکی۔ اسے اپنے سینے پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

آنکھ کھلتے ہی اس کا سارا جسم خوف سے کانپ اٹھا۔ کوئی بھاری بھرکم آدمی اس سے الجھ رہا تھا۔ وہ بوجھ اس کے سینے پر پڑ رہا تھا۔ اسے دبوچنے والا ایک ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور اس کا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر تھا۔

گل عذار کو ایک لمحے میں خطرے کا پورا احساس ہو گیا۔ وہ بھی تاتاری لڑکی تھی۔ جوان تھی۔ طاقتور تھی۔ آسانی سے

شکست تسلیم نہیں کر سکتی تھی ۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو چھڑانے کی کوشش شروع کر دی ۔ اس کے منہ پر
ہاتھ رکھا ہوا تھا ۔ وہ چیخ بھی نہیں مار سکتی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس صرف چند لمحات ہیں ۔ اگر
وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکی تو وہ اس دباؤ سے بے ہوش ہو جائے گی اور یا پھر اپنا سب کچھ کھو دے گی ۔
گل عذار نے نیچے دبے ہوئے اپنے پورے بدن کو ایک ساتھ حرکت دی ۔ سر کو جھٹکا اور مچل کر
اس کش مکش میں اس کا ایک ہاتھ آزاد ہو گیا ۔
وہ ہاتھ بجلی کی طرح خنجر پر گیا ۔ دوسرے ہی لمحے گل عذار کے خنجر کی نوک اس پراسرار حملہ آور کے
دل میں اتر گئی ۔

گل عذار نے جھٹکا دے کر خنجر کھینچا ۔
پھر دوسرا ، تیسرا وار . . . . . وہ وحشیانہ انداز میں تواتر کے ساتھ خنجر کے وار کرتی رہی اور سینہ
ناہموار رہا ۔
گرم گرم خون ، اچھل اچھل کے اور ٹپک ٹپک کر گل عذار پہ گر رہا تھا لیکن اس کا ہاتھ رُکتا ہی نہ تھا ۔
یہاں تک کہ اس کے منہ پر رکھے ہوئے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس پر سوار ہونے والا لڑھک کر اس کے
جسم کے ساتھ آ لگا ۔
گل کے دونوں ہاتھ آزاد ہو چکے تھے ۔ اس نے پوری قوت لگا کے اس بوجھ کو اپنے اوپر سے دھکیلا ۔
وہ لڑھک کر گل عذار کے بستر کے ایک طرف ہو گیا ۔
گل عذار خنجر لیے کھڑی ہو گئی ۔
اس وقت وہ کسی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی لیکن جب اس کی نظر لڑھکے ہوئے وزنی جسم کے چہرے پر
پڑی تو اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں ۔
وہ بوجھ ، وہ لاش ـــ اوغلو خان کی تھی ۔
اوغلو خان ۔ ایاس خواجہ کا سالا ، اس کی بیوی کا بھائی !

گل عذار اپنے انجام کا سوچ کر کانپ اٹھی۔

اس نے خون کیا ہے۔ خون بھی ایک مغل شہزادے کا۔

ایاس خواجہ اسے تڑپا تڑپا کے مارے گا۔ مغل اسے گھوڑے سے باندھ کے گھسیٹیں گے۔ اس
جسم کو عریاں کر کے سنگینوں سے چھیدا جائے گا۔ اور پھر نہ جانے کب ملک تاتار پر کیا قیامت آجائے۔ شہر
کیا حشر ہو۔ اس کے عزیز و اقارب کی کیا درگت بنے۔ ظفریاب کی تو یہ لوگ تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔

لیکن وہ بھی تو مجبور تھی۔

اس نے ظفریاب کی امانت کی حفاظت کی تھی۔ اس نے تاتاری عصمت کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہو
تھا۔ پھر بیت جائے جو بیتنا ہے تاتار پر ظفریاب پر۔

گل عذار کے مضمحل ہوتے اعضا میں پھر طاقت آگئی۔ اس کے ضمیر نے اسے سہارا دیا۔ گل عذار نے
حقارت بھری نظروں سے لاش کو دیکھا۔

پردے سے چھن کے آنے والی مدھم روشنی میں لاش کا چہرہ بڑا بھیانک دکھائی دے رہا تھا لیکن اب
گل کے تمام وہم دور ہو گئے تھے۔ ڈر اور خوف اس سے دور بھاگ گیا تھا۔ پھر وہ خوفزدہ کیوں ہوتی۔ اس نے
کیا کہ وہ خانی ماں سے صاف صاف کہہ دے گی کہ یہ خون اس نے کیا ہے اور اس کی سزا وہ بھگتنے کے لیے
وقت تیار ہے۔

گل عذار، خانی ماں کے کمرے میں جانے کے لیے پلٹی لیکن گھومتے ہی وہ کسی چیز سے ٹکرائی۔

"خانی ماں۔ تم؟"

گل عذار، خانی ماں سے ٹکرائی تھی جو اس کی پشت پر کھڑی تھیں۔ گل عذار حیرت سے ان کا منہ تک
تھی اور ان کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔

"کہاں جا رہی تھیں گل؟" خانی ماں کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

"تمہارے پاس خانی ماں۔"

"کس لیے؟"

"اقبال جرم کرنے۔"

گل عذار نے خون آلود خنجر خانی ماں کے قدموں میں رکھ دیا۔

"جرم میں نے کیا ہے۔ سزا بھی میں بھگتوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے ایک وار میں ختم کیا جائے۔ میرے
سینے میں تیر مارا جائے یا نیزہ اتارا جائے لیکن میری لاش کی بے حرمتی نہ کی جائے۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں گل۔"

خانی ماں کا لہجہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا:

"اٹھ، سامنے کھڑی ہو اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جواب دے۔"

"تم نے وعدہ کیا ہے خانی ماں۔ تم اس پر قائم رہ سکو گی؟"

گل نے کھڑے ہو کر آنکھیں چار کیں۔

"ہاں۔ میں نے وعدہ کیا ہے اور مغل عورت اپنا وعدہ پورا کر کے رہتی ہے۔"

"مجھے ایک وار میں مارا جائے گا۔"

"تیری خواہش پوری ہوگی۔"

"میری بے عزتی بھی نہیں ہوگی۔"

"تو چاہے گی تو ایسا ہی ہوگا۔"

"لاش کو گھوڑے کے پیر میں باندھ کر گھسیٹا بھی نہ جائے گا۔"

"ایسا کبھی نہ ہوگا گل۔"

خانی ماں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا:

"لیکن پہلے یہ بتا کہ تو نے اسے کیوں قتل کیا؟"

"میں مجبور تھی ماں۔"

گل بے خوف ہو کے بولی:

"میرے لیے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو عورت کی عزت اور شوہر کی امانت کو چپ چاپ اس شیطان کے
حوالے کر دیتی یا اس کی حفاظت میں خود قربان ہو جاتی۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور جدوجہد کے دوران
یہ مارا گیا۔ مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں۔"

"لیکن گل۔ تو نے اس کے علاوہ ایک جرم اور بھی کیا ہے۔" خانی ماں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی

"میں نے صرف اپنی حفاظت کی ہے اور کوئی جرم نہیں کیا"۔ گل کے ذہن میں اور کسی جرم کا تصور ہی نہ تھا۔

"سن گل"۔

خانی ماں نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی گل کے دوسرے شانے پر رکھ دیا:

"تیرا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ تو نے مجھے اپنے جرم میں شریک ہونے کی دعوت نہ دی"۔

"جی۔ کیا کہا آپ نے۔ میں سمجھی نہیں"۔ گل نے حیران ہو کر پوچھا۔

خانی ماں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ اپنی رو میں بولیں:

"تجھے اوغلو خان کا قاتل کوئی نہیں ثابت کر سکتا"۔

"جی خانی ماں"۔

گل بوکھلا گئی۔

"اوغلو خان کو میں نے مارا ہے۔ وہ میرے خنجر سے قتل ہوا ہے۔ میں اس قتل سے انکار نہیں کر رہی۔ کیا آپ یہ الزام اپنے سر لینا چاہتی ہیں۔ میں ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گی"۔

"لیکن گل۔ قتل کا الزام تجھ پر کون لگا سکتا ہے۔ تو نے اوغلو خان کو قتل نہیں کیا۔ تیرے خنجر سے شیطان مارا گیا ہے جس نے تجھ سے وہ ہیرا چھیننا چاہا جو عورت کو آسمانی دیوتا عطا کرتے ہیں۔ وہ ہیرا کھو کر دیوتا عورت سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس کی قیمت دو کوڑی کی رہ جاتی ہے اور پھر وہ سسک سسک کر مرتی ہے۔ اگر تو اس شیطان کی ہوس پوری کر دیتی تو یقین جان کہ میرا خنجر تیرے سینے کے پار ہوتا۔ میں بدروح سمجھ کر تجھے قتل کر دیتی"۔

"خانی ماں۔ تم کس قدر عظیم ہو"۔ گل بڑھ کر خانی ماں سے لپٹ گئی۔

"لیکن میں تجھے معاف نہیں کر سکتی گل"۔ خانی ماں اسے سینے سے لگائے بولیں۔

"جی۔ خانی ماں"۔

گل گھبرا کر ان سے الگ ہو گئی۔ پھر سنبھل کے بولی:

"خانی ماں۔ میں اپنی زندگی کی بھیک نہیں مانگتی لیکن آپ سے یہ امید ضرور رکھتی ہوں کہ آپ میری بے حرمتی نہیں ہونے دیں گی۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ مغل عورت اپنا وعدہ پورا کرتی ہے"۔

"اس موذی کا خون میں نے تجھے معاف کیا"۔

خانی ماں نے اوغلو کی لاش کی طرف اشارہ کیا:

"یہ خون میرے خیمے میں ہوا ہے اور اس کا ذکر بھی میرے ہی خیمے میں دفن ہو جائے گا لیکن تیرا دوسرا جرم اس سے زیادہ سنگین ہے"۔

"دوسرا جرم کونسا خانی ماں"۔ گل نے پریشان ہوتے ہوئے خانی ماں کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ خانی ماں کے چہرے پر مسکراہٹ کی کلیاں کھلی تھیں۔ وہ گل عذار کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"گل تو نے اب تک مغلوں کے مظالم اور سفاکی ہی سنی اور دیکھی ہے"۔

خانی ماں کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا:

"یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے مقتولوں کے سروں کے مینار بنائے۔ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا اور قتل کیا لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر حملہ آور اور فاتح ایسا ہی کرتا ہے۔ میدان جنگ میں بربریت دکھانا ہی بہادری اور شجاعت ہے۔ ایسے وقت میں جو لوگ رحم سے کام لیتے ہیں وہ بزدل ہوتے ہیں۔ تو تاتاری ہے گل۔ یاد رکھ اگر تاتاری کبھی فاتح ہو کر ہمارے علاقے میں داخل ہوئے تو کچھ عجب نہیں کہ تاتاری بھی مغلوں کے سروں کے مینار بنائیں لیکن ہم مغل دل کے خراب نہیں ہوتے۔ رحم کے وقت رحم کرتے ہیں۔ احسان کا بدلہ احسان سے دیتے ہیں۔ اگر تو نے مجھے اپنی مدد کے لیے پکارا ہوتا تو آسمانی دیوتاؤں کی قسم، خانی طورہ کا خنجر بھی اوغلو خان کے دل میں اسی طرح داخل ہوتا جیسے تو نے داخل کیا ہے۔ مجھے اسی بات کا افسوس رہا۔ مجھے یہ دکھانے کا موقع ہی نہیں ملا کہ مغل عورت کسی کے احسان کا بدلہ کس طرح دیتی ہے۔ تو نے بیماری میں جس خلوص سے میری خدمت کی ہے وہ میرے دل پر نقش ہے"۔

گل آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے خانی ماں کی باتیں سن رہی تھی۔

خانی ماں ذرا ٹھہر کے بولیں:

"اب جا اور میرے محافظوں کو بلا کے لے آ"۔

"محافظوں کو۔ یہاں بلا کے لاؤں؟" گل نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

"جلدی کر گل"۔ خانی ماں نے سختی سے کہا۔

"پتہ نہیں رات کتنی باقی رہ گئی ہے۔ اس لاش کو صبح سے پہلے ٹھکانے لگانا ہے"۔

گل عذار دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ٹھہر گل۔ اس طرح نہیں"۔

خانی ماں نے اسے روکا:

"اپنے کپڑے تبدیل کر لے"۔

گل کو اس بات کا خیال ہی نہ تھا۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے چھینٹے اور دھبے پڑے تھے۔ ماں نے ایاس خواجہ کا بھیجا ہوا اپنا دوسرا جوڑا اسے دیا جسے پہن کر وہ محافظوں کو بلانے چلی گئی۔

خانی ماں کے چاروں محافظ اکٹھا بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ انہیں دور سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ ایک محافظ نے ڈپٹ کر پوچھا:

"کون ہے؟" اور نیزہ سنبھالتا ہوا آگے بڑھا۔ باقی محافظ بھی چوکنا ہو کر اس کے پیچھے ہو لیے۔

"میں ہوں گل عذار۔ خانی ماں کی خادمہ"۔ محافظوں کو اپنے قریب آتا دیکھ کر گل نے کہا۔

محافظ قریب آ کر رک گئے۔ ایک بولا:

"گل بانو۔ آپ خادمہ نہیں خانی ماں کی بیٹی ہیں۔ ہماری بہن ہیں۔ خانی ماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ ہمیں آواز دے کر بلا لیا ہوتا"۔

"خانی ماں نے تمہیں فوراً بلایا ہے"۔ گل نے آنے کا مدعا بیان کیا۔

"ہم غلام ہیں ان کے۔ وہ خیریت سے تو ہیں؟" ایک نے پوچھا۔

"فکر کی ضرورت نہیں۔ بالکل خیریت سے ہیں"۔

محافظ تیز تیز قدموں سے خانی ماں کے خیمے کی طرف بڑھے۔ یہ سب آگے پیچھے خیمے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے خانی ماں کو عجیب حال میں دیکھا۔ ان کے کپڑے بے ترتیب اور بال بکھرے ہوئے تھے اور ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔

"خانی ماں کیا ہوا؟" ایک محافظ نے حیرت سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے"۔ خانی ماں نے اطمینان سے کہا۔

"حملہ۔ کس نے جرأت کی حملہ کرنے کی؟" دوسرے محافظ کے منہ سے غصے کے مارے الفاظ نکل رہے تھے۔

"حملہ آور کا نام سن کر گھبرا تو نہ جاؤ گے؟" خانی ماں نے محافظوں کے چہروں پر نظریں دوڑائیں۔

ایک محافظ کچھ زیادہ ہی پُرجوش تھا۔ بولا:

"خانی ماں۔ آپ پر حملہ آسمانی روح پر حملہ ہے۔ اگر حملہ آور شہزادہ ایاس خواجہ ہے تب بھی ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

"شاباش محافظ۔ مجھے تمہاری وفاداری سے ایسی ہی امید تھی"۔

خانی ماں نے خنجر فرش پر پھینک دیا۔

"بزدل اوغلو خان مجھے مارنے آیا تھا لیکن خود میرے ہاتھوں مارا گیا"۔

"اوغلو خان!" سب محافظوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

پھر ان میں سے ہر ایک نے اوغلو خان کو موٹی موٹی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ایک محافظ نے تو اوغلو خان کی حرکتوں کا کچا چٹھا کھول کے رکھ دیا۔

"ہمارے لیے کیا حکم ہے خانی ماں؟" محافظوں کے جذبات ٹھنڈے ہوئے تو ایک نے دریافت کیا۔

"اوغلو خان کی لاش دوسرے کمرے میں پڑی ہے۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ اور ایسی جگہ دبا دو کہ ڈھونڈنے والے تلاش نہ کر سکیں"۔

"ایسا ہی ہو گا"۔ کہتے ہوئے چاروں محافظ دوسرے کمرے میں گھس گئے۔

اوغلو خان کی لاش بھاری تھی۔ گناہ گار کی لاش یوں بھی بھاری ہوتی ہے۔ محافظ بھی کافی تنومند تھے۔ وہ لاش کو گھسیٹ کر خیمے سے باہر لے گئے۔ پھر اس کے ہاتھ پیر پکڑ کر لٹکاتے ہوئے نیچے وادی میں اتر گئے۔

گل عذار کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر خانی ماں یوں مسکرا رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"دیکھا تو نے گل۔ مغل سفاک تو ہوتے ہیں لیکن احسان فراموش نہیں ہوتے"۔

"خانی ماں"۔ گل دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

خانی ماں نے اسے اپنے کمرے میں روک لیا۔ قالین پر گرا ہوا اوغلو خان کا خون اب تک پوری طرح جما نہیں ہوا تھا۔ گل کو خیال آیا۔ بولی:

"خانی ماں۔ میں گیلے کپڑے سے خون صاف کر دوں"۔

"کوئی ضرورت نہیں"۔ خانی ماں نے کہا۔

گل عذار کے دل و دماغ میں الجھنیں پیدا ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر بولی:

"صبح کو کسی کی قالین پر نگاہ پڑ گئی تو دھبے ضرور نظر آ جائیں گے۔"

خانی ماں مسکرائیں:

"تجھے علم نہیں گل۔ اس خیمے کے قریب آنے کی کوئی ہمت نہیں کرے گا۔ صبح کو جب ہم روانہ ہوں گے خیمہ اور اس کا تمام سامان جلا کر راکھ کر دیا جائے گا۔ جس گھر میں ایک بار "بدروح" آ جائے وہ گندہ ہو ہے۔ اسے کوئی استعمال نہیں کر سکتا۔"

گل کے دل کی دھڑکنیں تھم گئیں۔ اس نے خانی ماں کے سینے سے اپنا سر لگا دیا۔ اب آرام نہ رہ گیا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔

خانی ماں کو محافظوں کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ انہیں محافظوں پر پورا اعتماد تھا پھ موقعوں پر دل بے چین سا رہتا ہے۔ وقت گزارنے کے لیے خانی ماں اور گل باتیں بھی کرتی رہیں۔ کام انہیں کوئی خاص نہ تھا۔ صبح کو انہوں نے اپنے گھر واپس جانا تھا۔ گل نے خانی ماں کی توجہ اوغلو کے دھبوں کی طرف دلائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس خدشے کو بھی مٹانے کے لیے گل عذار کے کر لپیٹ دیا۔ یہ کام گل عذار نے کیا۔ خانی ماں بس یونہی اس کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ گل عذار کے جو کپڑے خانی دیے تھے ان کی ایک پوٹلی سی بنا کر خانی ماں نے قالین کے اندر گھسیڑ دی۔ احتیاط کے طور پر خانی ماں نے کا قالین بھی لپٹوا دیا۔

صبح کاذب کے وقت محافظوں کے آنے کی آواز آئی۔ خانی ماں ان سے ملنے باہر چلی گئیں۔ تھیں کہ محافظ لپٹے ہوئے قالین دیکھیں اور کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔

محافظ بڑے مسرور نظر آ رہے تھے۔ ایک نے سینہ تان کر کہا:

"خانی ماں۔ آپ کی دعاؤں سے ہم نے اوغلو خان کی لاش کو ایک گہرے کھڈ میں ڈال کر پتھر اس طرح جمع کر دیے ہیں کہ کھڈ کا منہ بالکل بند ہو گیا ہے۔ اب پورا مغل لشکر بھی اسے ڈھونڈ نہیں کر سکتا۔"

"شاباش۔" خانی ماں نے ان کی تعریف کی:

"ہم حسب الحال پہنچ کر تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔ تم نے ایک شیطان کا نام و نشان تک

یاد رہے۔ آسمانی روحیں تم سے ضرور خوش ہوں گی۔"

"آپ کی خوشی سب سے بڑا انعام ہے خانی ماں۔"

دوسرے محافظ نے کہا:

"آپ نے ہمارے بال بچوں کو اتنا کچھ دے رکھا ہے کہ ہمیں اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ کی خدمت ہماری زندگی کا مقصد ہے۔"

محافظ خوشی خوشی چلے گئے۔ گل اور خانی ماں کا ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ذرا دیر بعد صبح ہو گئی اور دور پرے لوگ چلتے پھرتے نظر آئے۔

خانی ماں نے لباس خواجہ کا بھیجا ہوا لباس خود بھی پہنا اور گل کو بھی پہنا دیا۔ گل عذار نے اپنا خنجر صاف کر کے کپڑوں میں چھپا لیا۔ اس خنجر نے اس کی زندگی کو صرف گھنانے سے ہی نہیں بچایا تھا بلکہ اس سے ایک شیطان صفت شخص کا خاتمہ بھی ہوا تھا۔ کپڑے پہن کر اور تیار ہو کر دونوں خیمے سے باہر آ گئیں۔ خانی ماں آنے والوں کا استقبال خیمے سے باہر کرنا چاہتی تھیں۔

ذرا دن چڑھے آدمیوں کا ایک غول خیمہ کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ تمام کے تمام خیمہ گاہ کے ساحر (جادوگر) تھے۔ خانی ماں کو اس خیمے تک لانے والے چار ساحر تھے لیکن اس وقت اسے واپس لے جانے والے ساحروں کی تعداد بارہ سے بھی اوپر تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ خیمہ گاہ کے تمام ساحر خانی ماں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے آ رہے تھے۔ خانی ماں نے ان ساحروں کا استقبال خیمے سے باہر ہی کیا۔

ساحروں کے علاوہ ان کے ساتھ کوئی اور مغل نہ تھا۔ یہاں تک کہ چاندی کی جو چوکی خانی ماں کے بیٹھنے کیلیے لباس خواجہ نے بھیجی تھی اسے بھی دو ساحر اٹھا کے لائے تھے۔ چاندی کی چوکی خیمے سے دور رکھ دی گئی اور خانی ماں سے اس پر بیٹھنے کی درخواست کی گئی۔ خانی ماں مسکراتے ہوئے چوکی پر بیٹھ گئیں۔ گل عذار ان کی پشت کی طرف کھڑی ہو گئی۔

تمام ساحروں نے ان کے گرد دائرہ سا بنا لیا اور پھر لگے جنتر منتر پڑھنے۔ وہ پڑھتے جاتے اور کبھی خانی ماں اور کبھی گھوم کر شمال کی طرف پھونکیں مارتے۔ منتر جنتر پڑھنے کے بعد انہوں نے خانی ماں کو مبارک باد دی اور خوشخبری سنائی کہ بدروح ان سے ہزار ہزار کوس دور بھاگ گئی ہے۔ خانی ماں اس وقت ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملی تھیں۔ انہوں نے ساحروں کا شکریہ ادا کیا۔

تمام ساحر خانی ماں کو چھوڑ کے خیمے کے چاروں طرف پھیل گئے۔ پھر انہوں نے خیمے پر روغن پھیلا
اس میں آگ لگا دی۔ خیمہ اور اس کا سامان جلنے لگا۔ دھواں اٹھ رہا تھا اور شعلے بلند ہو رہے تھے اور
اس کے گرد چکر لگا کر پڑھ پڑھ کے پھونک رہے تھے۔ جب تک خیمہ اور اس کا تمام سامان جل کر را
گیا وہ اس پر روغن پھینکتے رہے۔

جب تمام سامان جل گیا اور دھواں اٹھنا بھی بند ہو گیا تو ساحروں کے سردار یعنی گرو ساحر نے ایک
نیچے بھیجا۔ نیچے وادی میں ایک جگہ پر لوگ خانی ماں کے استقبال کے لیے پہنچ چکے تھے۔ ساحر وہاں
ایک گھوڑا لے کر آیا۔ تمام ساحروں نے مل کر اس گھوڑے کو ذبح کیا اور اس کا خون خیمے کی راکھ پر چھڑکا۔ یا
خیمے کے بارے میں یہ آخری چیز تھی۔

بڑے ساحر کے اشارے پر خانی ماں کے لیے سجی سجائی گاڑی بھیجی گئی۔ گاڑی کے آگے آگے ا
کا خاص غلام گھوڑے پر سوار، نیزہ تانے بڑی شان سے آ رہا تھا۔ گاڑی خانی ماں کے پاس آ کے رکی۔ بڑ
اور گل عذار نے سہارا دے کر خانی ماں کو گاڑی پر سوار کیا۔ گل عذار نے پلٹ کر راکھ کے ڈھیر پر ایک نظ
جس کے نیچے اوغلوخان کے خون کے علاوہ اس کی عزت حرمت کی داستان بھی چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ گاڑ
میں بیٹھ گئی۔ گاڑی ہچکولے کھاتی نشیب کی طرف چلی۔

خانی ماں کے استقبال کو تو پوری خیمہ گاہ الٹ آئی تھی۔ گاڑی نیچے پہنچی تو لوگ ان کے ہاتھ چو
ٹوٹ پڑے۔ ایاس خواجہ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور انہیں سہارا دے کر گاڑی سے اتارا۔ اس
ساتھ اس کا سپہ سالار بیگ جک جمہ بھی تھا۔ بڑے بڑے سرداروں نے خانی ماں کے ہاتھ چومے اور ا
سونا چاندی نچھاور کیا۔

خانی ماں کی واپسی کا آخری مرحلہ بڑا سخت تھا۔ استقبال کرنے کی جگہ سے خانی ماں کا گھر تقریباً ایک
اور یہ فاصلہ خانی ماں کو بغیر سہارے کے پیدل چل کر طے کرنا تھا۔

گل عذار اب تک تو خانی ماں کے ساتھ سایہ کی طرح لگی ہوئی تھی لیکن اب اسے ان سے دس گز دور کر دیا گ
وہی کیا ایاس خواجہ کو بھی ان کے قریب جانے کی اجازت نہ تھی

خانی ماں نے پہلا قدم اٹھایا تو اس کے ساتھ تمام لوگوں کے قدم اٹھے۔ خانی ماں پیدل چل رہی تھیں
سے دوسرے سواری استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بھی پیدل چل رہے تھے۔ یہ جلوس آہستہ آہستہ منزل

...رن ہوا۔

گل عذار، خانی ماں کی کامیابی کی دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ خانی ماں کی کامیابی اس کی کامیابی
... زندگی گل کی زندگی تھی۔

ساٹھ سالہ خانی ماں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی تھیں۔ ان کے گرد محافظ دستے نے حلقہ بنا لیا تھا۔
... باہر چاروں طرف آدمی ہی آدمی تھے لیکن وہ نہایت خاموشی سے چل رہے تھے۔ ان کے چہروں پر
... ئے جانے لہرا رہے تھے۔ ہر ایک کی دلی تمنا تھی کہ خانی ماں خیریت سے اپنے گھر پہنچ جائیں۔

اس تقریب میں خیمہ گاہ کے تمام بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ اگر کوئی نہیں تھا تو اوغلوخان نہیں تھا۔
... اسے کئی بار پوچھ چکا تھا لیکن اس کی غیر حاضری کا سبب کوئی نہ بتا سکا۔ ایاس خواجہ کا خیال تھا کہ وہ
... گھر پہنچ کے اوغلوخان کو ان کے سامنے پیش کرے گا۔ اسے امید تھی کہ اس خوشی کے موقع پر خانی ماں
... معاف کر دیں گی۔ اس کے اچانک غائب ہو جانے سے ایاس خواجہ سخت برہم تھا۔ اس برہمی کی ایک
... اس کی بیوی نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ آج وہ اوغلوخان کو خانی ماں سے معافی دلا دے گا۔ اس کی
... تھا کہ اگر خانی ماں نے حصار المالیق پہنچ کر خانِ اعظم سے اوغلوخان کی شکایت کر دی تو اس کی تمام
... میں پڑ جائے گی۔

... راستہ خانی ماں نے کسی نہ کسی طرح طے کر لیا لیکن بوڑھی ہڈیاں آرام کی عادی ہو چکی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا
... راستے کے بعد ان کی سانس پھول گئی اور انہوں نے بیٹھنے کی خواہش کی۔

... جو کہ ان کے ساتھ ہی آتی تھی۔ وہ ان کے پاس ڈال دی گئی۔ ان کے معتقدین میں گھبراہٹ پیدا
... کے ہاتھ پیروں کی تو جیسے جان نکل گئی۔ اس نے جھک کر خانی ماں کے کان میں کہا:

"... ماں ...... ہمت کرو۔ منزل قریب ہے۔"

... ماں نے مسکرا کر اس کا سر تھپتھپایا اور پانی طلب کیا۔ خانی ماں کے لیے سفید گھوڑی کا دودھ خاص
... لیا گیا تھا۔ فوراً ان کے سامنے بھرے ہوئے دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا۔

... عذار نے پھر سرگوشی کی:

"... ماں، دودھ مت پیو۔ پانی منگاؤ۔"

... ماں کی سمجھ میں شاید گل عذار کی بات آ گئی۔ انہوں نے دودھ لانے والے سے کہا: "پہلے پانی لاؤ۔"

پھر دودھ پیش کرنا۔

سفید گھوڑی کے دودھ سے انکار گناہ سمجھا جاتا تھا لیکن خانی ماں نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے
دودھ سے انکار بھی نہیں کیا اور پانی منگا لیا۔

پانی کا پیالہ انہیں دیا گیا۔ گل نے تیسری بار سرگوشی کی:

"خانی ماں! پانی رک رک کے اطمینان سے پیجیے۔ کئی سانسوں میں۔"

خانی ماں نے گل عذار کی یہ بات بھی بلا عذر مان لی۔ انہوں نے گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیا…
ان کے جسم میں کچھ ایسی توانائی پیدا ہوئی کہ وہ پانی پیتے ہی کھڑی ہو گئیں اور کھٹا کھٹ قدم بڑھاتی…
گل عذار ان کے پانی پینے کے دوران برابر دعا مانگتی رہی۔ اس نے خانی ماں کو قدم جما جما کے چلتے ہوئے…
دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

اس وقت لوگوں کے تعجب کا عجب حال تھا جب انہوں نے دیکھا کہ خانی ماں نے اکھاڑے…
میں طے کیا تھا اس سے آدھے وقت میں وہ باقی راستہ طے کر کے اکڑتی ہوئی اپنے گھر میں داخل ہو گئیں…
خانی ماں کی عظمتیں لوٹ آئیں۔ ان کا وقار پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ اب وہ مغلوں کی عز…
تھیں۔ بلادِ شمال کا خانِ اعظم ان کا بھائی اور ولی عہد ایاس خواجہ ان کا بیٹا تھا۔ بیماری کے دوران…
کے ساتھ معاندانہ اور مخاصمانہ تھا، اب وہ خانی ماں کے آگے بچھے جا رہے تھے۔ خیمہ گاہ کے ساحر…
کے ساتھ بدتمیزی اور ہتک آمیز سلوک کیا تھا۔ وہ خانی ماں کی سب سے زیادہ خاطر مدارات میں لگ…
جب خانی ماں کے سامنے نذرانے پیش کیے گئے تو ایک ساحر نے انہیں ہیروں کا ایک ایسا ہار…
متعلق اس نے یہ کہا کہ یہ ہار اس کے بزرگوں میں سے کسی کو خود تموجن چنگیز خان نے اپنے دستِ مبارک سے…
میں دیا تھا۔ قیمتی ہونے کے ساتھ ساتھ اس ہار کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ اسے چنگیز خان
نے چھوا تھا۔

یہ ہار اس ساحر نے پیش کیا جو تبتی کنیز کو گھسیٹتا ہوا خانی ماں کے پاس سے لے گیا تھا…
خیمے میں موجود تھی اور قہر آلود نظروں سے ساحر کو دیکھ رہی تھی لیکن جب خانی ماں نے ہار کو بوسہ د…
اپنے گلے میں ڈال لیا تو تبتی کنیز کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔

نذرانوں کا خیمے میں ڈھیر لگ گیا۔ سب سے قیمتی نذرانہ مغل سپہ سالار بیک جک جتہ خان…

…کا ایک ہار خانی ماں کی نذر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دو لڑی کا ہار یہ کہہ کر نذر کیا کہ یہ خانی ماں کی
…عذار کے لیے ہے۔ بیک جک جتہ نے اس محفل میں گل عذار کو اپنی بہن بنانے کا اعلان بھی کیا۔
…ماں نے خوش ہو کر اسے دعا دی:

"بیک جک۔ تیری سرداری ہمیشہ قائم رہے گی۔ زمانے کا انقلاب تجھ پر اثر نہ کرے گا۔"

مرد نذرانے پیش کر چکے تو خواتین کا نمبر آیا۔

ایاس خواجہ کی پہلی بیوی خانی ماں سے بہت جلتی تھی کیونکہ خانی ماں کی موجودگی میں اس کی کوئی عزت…
…لوگ اس کی طرف توجہ نہ دیتے تھے لیکن اپنے شوہر کی خوشنودی کے لیے اس نے بھی بیش قیمت
…نذر کیے۔ ایاس خواجہ کی دوسری بیگمات اور خاص خاص داشتاؤں نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق
…ماں کی خدمت کی۔

خواتین کے نذرانوں کا سلسلہ جاری تھا کہ خانی ماں نے جیسے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر ایاس
سے پوچھا:

"خان بیٹے۔ کیا اوغلوخان کے دل میں میری اتنی بھی عزت نہیں کہ اس اہم موقع پر وہ سلام
…لیے آتا!"

ایاس خواجہ نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ خانی ماں بولیں:

"خان بیٹے، اوغلوخان ایک دن میرے پاس آیا تھا لیکن میں نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا۔ اب
…بہت بدل چکے ہیں۔ میں صدق دل سے اس کی گستاخیوں کو معاف کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ آسمانی…
…اسے معاف کر دیں۔ تم اس سے کہہ دو کہ میرا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا ہے۔ میں نے سب کو
…کر دیا ہے۔ پھر وہ میرے پاس آتے کیوں گھبراتا شرماتا ہے۔ آخر وہ مغل شہزادہ ہے۔ ابھی بچہ ہے۔ بچے
اوغلوخان کیا ہی کہتے ہیں۔"

خانی ماں نے اوغلوخان کے بارے میں کچھ اس خلوص سے گفتگو کی کہ اوغلو کی بہن اپنی جگہ پانی پانی
…سمجھتی تھی کہ خانی ماں اس کے بھائی کی جانی دشمن ہے اور اسے کسی بھی وقت نقصان پہنچا سکتی ہے۔
…باتوں سے اس کا دل بالکل صاف ہو گیا۔

اوغلوخان پر جو گزر رہی تھی اس کا علم تبتی کنیز کو نہ تھا اس لیے اس نے ان باتوں پر زیادہ کان نہ دھرے۔

لیکن گل عذار دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ اسے اس بات پر ضرور تعجب تھا کہ خانی ماں کے ہوش و حواس عقل و ذہانت اتنی شدید بیماری اٹھانے کے بعد بھی ویسے ہی قائم ہے۔

خانی ماں نے اوغلو کا ذکر چھیڑ کر اس بات کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ انہوں نے یہ باتیں شاید اس لیے کی تھیں کہ اگر آئندہ کبھی اوغلوخان کے اغوا یا قتل کے سلسلے میں کوئی فتنہ کھڑا ہو تو ان کا دامن محفوظ رہے۔ خانی ماں واقعی ذہین اور ذکی الحس تھیں۔ انہوں نے آئندہ کے لیے پیش بندی کی تھی لیکن اوغلو کا معاملہ دوسرے ہی دن اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ایسی خطرناک صورت اختیار کر لی کہ اگر الیاس خواجہ عقلمندی سے کام نہ لیتا تو مغلوں میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔

اوغلوخان کے قتل کی تمام نشانیاں، خانی ماں نے اپنے طور پر تو مٹا دی تھیں لیکن ایک چیز کی طرف گل عذار کا دھیان بالکل نہ گیا۔ اوغلوخان گھوڑے پر سوار ہو کے آیا تھا۔ اس کی قیام گاہ سے خانی ماں کے خیمہ کا کافی فاصلہ تھا۔ پھر رات کے وقت اتنی دور تک پیدل جانا بھی مناسب نہ تھا۔ راستے میں اس کی مڈبھیڑ خانی ماں کے ہی آدمیوں سے ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنے اس مذموم ارادے کی خبر تو اپنے خاص ساتھیوں کو بھی نہ ہونے دی تھی۔ اگر وہ دوستوں سے مشورہ کرتا تو وہ اسے خانی ماں کے خیمے میں جانے کی اجازت ہرگز نہ دیتے۔ اس پر تو خانی ماں اور گل سے انتقام لینے کا بھوت سوار تھا۔ وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ پہلے وہ گل عذار کو تباہ کرے گا اور اگر خانی ماں نے اس میں کوئی رکاوٹ پیدا کی تو وہ انہیں بھی قتل کر دے گا۔ جس رات اوغلوخان قتل ہوا وہ اس کی تیسری کوشش تھی۔ پہلے بھی وہ دو بار خیمے تک پہنچ گیا تھا مگر گل عذار کے جاگ پڑنے سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

اوغلوخان نے اس رات اپنا گھوڑا خانی ماں کے خیمے سے تقریباً تین سو گز دور ترائی میں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگام ایک شاخ سے باندھ دی تھی۔ وہ خیمے میں گل عذار کے ہاتھوں مارا گیا اور وفادار گھوڑا وہیں کھڑا رہا۔ صبح کو خانی ماں کی واپسی کا ہنگامہ تھا۔ وہ دن اور پوری رات اسی طرح گزر گئی۔ غریب جانور اسی طرح بھوکا پیاسا کھڑا رہا۔ پھر جب الیاس خواجہ اور اس کی بیوی نذرانے دے کر واپس آ گئے تو الیاس خواجہ نے اوغلو کی تلاش میں دو آدمی روانہ کیے۔

اوغلوخان کے دوستوں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی اور انہیں حکم دیا گیا کہ اوغلوخان کو ڈھونڈ کر لائیں ورنہ مجرم گردانے جائیں گے۔ اوغلو کے دوستوں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے اس کی تلاش میں ادھر ادھر

دوڑایا۔ آخر اوغلوخان کا ایک دوست اسے وادی میں ڈھونڈتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں تین دن کا بھوکا جانور بندھا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی نظر گھوڑے پر نہ پڑتی لیکن بھوکے جانور نے کسی آدمی کی چاپ سن کر کان کھڑے کیے اور زور زور سے ہنہنایا۔ اس طرح اوغلوخان کا دوست گھوڑے تک پہنچ گیا۔ وہ عقل سے کچھ پیدل تھا۔ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا اور سیدھا الیاس خواجہ کے پاس پہنچ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ الیاس خواجہ اسے اس کارنامے پر انعام دے گا لیکن جب الیاس خواجہ نے اس سے پوچھا کہ:

'اوغلوخان کہاں ہے؟'

تو وہ جواب نہ دے سکا۔ الیاس خواجہ نے جھٹ کر اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا اور اسے گرفتار کرا دیا۔ پھر اوغلوخان کے تمام دوست واحباب چن چن کر پکڑ لیے گئے۔ انہیں قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا کیونکہ الیاس خواجہ کی بیوی نے بتایا تھا کہ غائب ہونے سے ایک دن پہلے اوغلوخان اس سے ایک قیمتی ہار لے گیا تھا۔ الیاس خواجہ کا خیال تھا کہ اوغلوخان کے دوستوں نے ہار حاصل کرنے کے لیے اسے قتل کر دیا ہے۔

الیاس خواجہ کی بیوی، بھائی کے مارے جانے سے بہت برافروختہ تھی۔ اوغلوخان اس کا اکیلا بھائی تھا۔ ہار کی چوری اور قتل کے جرم میں اوغلو کے تمام دوستوں کی گردنیں اڑا دی گئیں۔ اس طرح خیمہ گاہ کو اوغلو کے شیطانی گروہ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا۔

اوغلوخان کا گھوڑا جہاں سے ملا تھا اس سے قریب ترین اگر کوئی آبادی تھی تو وہ یا تو خانی ماں کا خیمہ تھا یا ان کے محافظوں کے خیمے تھے لیکن اس طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ اوغلوخان اور اس کے ساتھیوں کے مرنے سے بعض لوگ اور خاص کر ڈیرے والیاں بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے اس گروہ کے خاتمے پر سکھ کا سانس لیا۔

○

تیمور نے مولانا زین الدین کو شہر سبز واپس بھیج دیا لیکن ان دونوں کے درمیان ایک زبردست نظریاتی

اختلاف پیدا ہو گیا۔

مولانا چاہتے تھے کہ تیمور فوری جنگ سے پرہیز کرے اور تاتاریوں کو یکجا کرنے کے بعد مغلوں [illegible]
مورچہ لے۔ لیکن یہ کہہ کر تیمور نے مولانا کو تقریباً لاجواب کر دیا کہ گھر میں آگ لگ جائے تو غور و فکر میں [illegible]
کرنے کے بجائے گھر کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے خواہ اس کوشش میں ہاتھ ہی کیوں نہ جل جائیں۔

تیمور جس وقت سمرقند سے نکلا اس کے پاس صرف تین سو سوار تھے۔ تیمور نے تاتاری دوشیزاؤں
کے چنگل سے چھڑا کے لانے کا اعلان اور عہد کیا تھا۔ وہ ایک بار جو فیصلہ کر لیتا پھر اس سے ہٹتا نہیں
لیکن تیمور بڑا ذہین انسان تھا۔ اس کے سواروں کا رخ شمال کی طرف تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ وہ [illegible]
کی خیمہ گاہ پر پہنچ کے اس سے براہ راست شکایت کرے یا پھر وہ خانِ اعظم کے پاس حصار [illegible]
لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کا رخ شمال سے ایک دم جنوب کی طرف پھیر دیا۔

"سردارِ محترم۔ آپ کا گھوڑا بڑا منہ زور ہے۔ شمال کی طرف بڑھنے سے انکار کر رہا ہے۔"
شوہر ظفریاب کو خیال ہوا کہ تیمور کا گھوڑا بگڑ کر گھوم پڑا ہے۔

"نہیں ظفریاب۔"

تیمور نے اس کی غلط فہمی دور کی۔

"گھوڑا میں نے خود موڑا ہے۔ گھوڑا تو اس کا غلام ہے جس کی رانوں کے نیچے وہ دبا ہوا ہے"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ جنوب کی طرف جا رہے ہیں۔ شاید شہر سبز کی جانب" ظفریاب نے
کی تصدیق کرنا چاہی۔

"ظفریاب"۔

تیمور نے گھوڑے کو ایڑ دیتے ہوئے کہا:

"تم شاید کسی سردار کی کمان میں آج تک نہیں لڑے ورنہ ایسا سوال ہرگز نہ کرتے۔ جو
سردار تسلیم کر لیا پھر اس سے سوال نہیں کیا کرتے صرف اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔"

"معاف کیجیے سردار۔"

ظفریاب شرمندگی سے بولا:

"میں نے تلوار ضرور چلائی ہے لیکن نہ تو کسی بڑی جنگ میں حصہ لیا ہے اور نہ کسی کی کمان میں [illegible]

"افسردہ نہ ہو۔ تم پہلے ہی بہت دکھی ہو ظفریاب۔"

گھوڑے کو ایڑ مل چکی تھی۔ وہ ہولے سے باتیں کرنے لگا۔ تیمور کے سوار بھی گھوڑے دوڑا کر اس کے
پیچھے چلنے لگے۔

تیمور کو معلوم تھا کہ مغلوں نے تاتاری علاقوں میں تین فوجی چھاؤنیاں قائم کر رکھی ہیں جہاں سے وہ پورے
[illegible] پر اپنا کنٹرول قائم رکھتے ہیں۔ یہ چھاؤنیاں مشرق، مغرب اور جنوب میں تھیں۔ شمالی علاقوں میں مغلوں کی
[illegible] جہاں الیاس خواجہ بیس ہزار کا لشکر لیے پڑا تھا۔

تیمور بڑی تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا جنوبی چھاؤنی کے سامنے نمودار ہوا۔ اس نے چھاؤنی کے پاس پہنچنے
کے بعد بھی اپنے گھوڑے کی رفتار کم نہ کی بلکہ اپنے تین سو سواروں کے ساتھ چھاؤنی میں گھستا چلا گیا۔

چھاؤنی کا سردار تیمور کو پہچانتا تھا۔ وہی کیا۔ تیمور کی شخصیت اتنی اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ تقریباً ہر مغل
اسے پہچانتا تھا۔ جس نے اسے نہ دیکھا تھا اسے تیمور کو دیکھنے کی آرزو تھی۔

مغل، تیمور کو اس طرح بے دھڑک چھاؤنی میں گھستے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ مغل سوار خیموں میں مقیم تھے
[illegible] سردار قریب کی ایک حویلی میں رہتا تھا۔ اسے تیمور کے آنے کی خبر ہوئی تو گھوڑے پر سوار ہو کر آ گیا۔ تیمور
[illegible] مغل لشکریوں سے الجھ رہا تھا۔ سردار کو آتے دیکھ کر لشکری چپ ہو گئے۔

"تیمور، تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

سردار کی آنکھیں غصے سے کھنچی ہوئی تھیں۔ مغل فاتح تھے اور تاتاری مفتوح و محکوم۔ وہ تیمور کا اس [illegible]
چھاؤنی میں آنا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

"مغل سردار۔ اگر تم نے مجھے پہچان لیا ہے تو سن لو کہ تاتاری لڑکیاں میری بہنیں ہیں۔ ان کا اغوا میری
[illegible] کا اغوا ہے۔ میں انہیں واپس لینے آیا ہوں۔"

تیمور نے سردار کو اتنے ہی سخت لہجے میں جواب دیا اور ہاتھ تلوار کے قبضے پر رکھ لیا۔ اس کے تمام
[illegible] نے بھی اس کی تقلید کی۔

مغل سردار کو اس کی جرأت اور بے خوفی پر تعجب تھا۔ بولا:

"چھاؤنی میں کوئی اغوا شدہ لڑکی نہیں ہے۔"

تیمور نے اغوا شدہ لڑکیوں کا ذکر محض قیاس کے تحت کیا تھا لیکن جس وقت مغل سردار، تیمور کو جواب دے

دے رہا تھا۔ اسی وقت ایک خیمے سے ایک لڑکی چیختی چلاتی نکلی:

"بچاؤ۔ بچاؤ۔ ہمیں ان ظالموں سے بچاؤ۔"

لڑکی کے پیچھے ایک مغل اسے پکڑنے کے لیے بھاگا آ رہا تھا۔ ایک لمحے میں تیمور کی کمان لیں
تیر نکلا اور پیچھا کرنے والے مغل کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مغل سردار سمجھ ہی نہ سکا۔ پلک جھپکتے میں تیمور کا کمان سنبھالنا تیر
جوڑنا اور نشانہ لگانا۔

یہ سب ایک ساتھ کیسے ہوا؟

اس شور و غل میں دو ہزار مغل سوار تیار ہو کر اپنے سردار کے پاس آ گئے۔ انھوں نے تیمور اور اس
کو گھیرے میں لے لیا۔

"تم کس کے حکم سے مغل چھاؤنی میں مسلح ہو کر آئے ہو؟" سردار نے بڑے رعب سے پوچھا۔

"اور تم نے کس کے حکم سے تاتاری لڑکیوں کو اغوا کر کے قید کر رکھا ہے؟" تیمور کا لہجہ بھی سخت

مغل سردار نے اپنے دو ہزار سروں پر نظر ڈالی۔ بولا:

"ہم فاتح ہیں۔ مفتوح کی ہر چیز فاتح کی ہوتی ہے۔"

"مغل سردار۔"

تیمور شیر کی طرح گرجا:

"میں لڑکیوں کو آزاد کرانے آیا ہوں۔ خالی ہاتھ ہرگز نہ جاؤں گا۔"

"اگر میں انہیں آزاد نہ کروں تو ــــــ" مغل سردار نے دو ٹوک فیصلہ کرنا چاہا۔

"تو میں بلادِ شمال کے خانِ اعظم کے حکم کے تحت تم سے جنگ کروں گا۔" تیمور نے اسی طرح
خانِ اعظم کا نام سن کر مغل سردار پریشان ہو گیا۔ اس کے سواروں کے چہرے بھی دھواں دھوا

سردار نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

"کیا خانِ اعظم نے تمہیں ہم سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا ہے؟"

تیمور نے دیکھا کہ مغل سردار رعب میں آ گیا ہے تو اس نے اور زیادہ چلا کر کہا:

"خانِ اعظم کا ہم سے معاہدہ ہے کہ اگر کوئی مغل، کسی تاتاری لڑکی کو بری نظر سے بھی دیکھ

الے گا۔"

اور اس کے ساتھ ہی تیمور نے تلوار بلند کر لی۔ تین سو مزید تلواریں تیمور کے ساتھ ہی نیاموں سے باہر
مغل سواروں کے ہاتھ بھی تلواروں تک گئے مگر وہ تلواریں نکال نہ سکے۔ انہیں اپنے سردار کے حکم کا
تھا۔

مغل سردار بڑا مضطرب تھا۔ خانِ اعظم کا حکم اس کے کانوں تک پہنچ گیا تھا اگرچہ یہ حکم ایک تاتاری
کے ذریعے پہنچا تھا:

"تیمور اگر ہم یہ لڑکیاں تمہارے حوالے کر دیں تو کیا تم ــــــ"

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے۔

"مغل سردار۔ اطمینان رکھو۔"

تیمور نے فوراً تلوار نیام میں کر لی۔

"ہمارے آباواجداد اور خانِ اعظم کے آباواجداد میں معاہدہ ہوا تھا کہ مغل بادشاہت کریں گے اور تاتاری
رہیں گے۔ خانِ اعظم ہمارا بادشاہ ہے اور ہم اس کے سردار۔ جو شخص بھی خانِ اعظم کے معاہدے سے انکار
گا وہ باغی ہو گا۔ ہم اس سے لڑیں گے۔ مغل خانِ اعظم نے مجھے تاتاری لڑکیوں اور عورتوں کی آبرو کی
دی ہے۔ میں اس کی حفاظت کروں گا۔ اگر شہزادہ الیاس خواجہ بھی اس حکم کی تعمیل نہ کریں تو میں ان سے
کروں گا۔"

مغل سردار اور زیادہ مرعوب ہو گیا اس نے حکم دیا کہ تمام اغوا شدہ لڑکیاں تیمور کے حوالے کر دی جائیں۔
پہلی کامیابی تھی۔ اس کامیابی میں بہادری سے زیادہ عقل و فراست کا دخل تھا۔ تیمور کو یقین تھا کہ تاتاری
لوٹ مار اور اغوا کے واقعات چھاؤنی کے سرداروں کے تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتے اس لیے ان لیڈروں کو
میں ضرور پناہ لینا پڑتی ہو گی۔ اس چھاؤنی میں لڑکیوں کی موجودگی تو صرف ایک قیاس تھا جو یقین میں
لیا۔

مغلوں نے چپ چاپ بارہ لڑکیوں کو تیمور کے حوالے کر دیا۔ تیمور کا کوئی نقصان نہ ہوا۔ ایک مغل
کا شکوہ یا گلہ کرنے کی بھی مغل سردار کو ہمت نہ پڑی۔

تیمور ان بدنصیب لڑکیوں کو لے کر قریبی آبادی میں پہنچا۔ اسے دیکھ کر بستی والوں نے آنکھیں بچھا دیں۔

تیمور نے لڑکیاں ان کے حوالے کیں تاکہ انہیں جلد سے جلد ان کے وارثوں کے حوالے کر دیا جا
طرف سے مطمئن ہو کر تیمور نے مغرب کا رخ کیا۔

مغربی چھاؤنی پہنچنے سے پہلے ہی تیمور کو مغلوں سے ایک معمولی جھڑپ لینا پڑی۔ تیس چالیس
کسی تاتاری بستی کو لوٹ کر آ رہے تھے۔ سامان کے علاوہ وہ چار لڑکیاں بھی پکڑ لائے تھے۔ تیمور
روک لیا۔ مغل اکڑ گئے۔ تلواریں نکل آئیں۔

تیمور نے ڈپٹ کر کہا:

"مغل سوارو جب تم اپنے زخمیوں کو لے کر شہزادہ ایلیاس خواجہ کے پاس پہنچو تو اسے یہ بتا
کہ تیمور نے بلادِ شمال کے خانِ اعظم کے حکم کے تحت تم سے جنگ کی ہے۔"

مغل سردار کے سر کے اوپر اٹھی ہوئی تلوار ذرا سی لرزی:

"کیا خانِ اعظم نے تمہیں ہمارے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا ہے؟"

"ہاں۔ ان کا حکم ہے کہ تاتاریوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے۔" تیمور نے اس پر رعب
کی کوشش کی۔

مغل سردار کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ کیا۔

"ایلیاس خواجہ اور بیک جکجتہ نے ہمیں اجازت دی ہے۔"

مغل سوار نے اصل بات اگل دی۔

"ہم لوٹ مار میں سے انہیں حصہ دیتے ہیں۔ ہم لڑکیاں واپس نہیں کر سکتے۔"

"لڑکیاں واپس کرنا ہوں گی۔"

تیمور نے صرف لڑکیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا اور اب بھی اس کا یہی مطالبہ تھا۔ مغل پہلے ہی
چکا تھا۔ اس نے حملے کا حکم دے دیا۔ تاتاریوں نے چند ہی منٹ میں لٹیروں کے چھکے چھڑا دیے۔ پانچ
چھوڑ کر مغل بھاگ کھڑے ہوئے۔ تیمور کے صرف چند سوار زخمی ہوئے۔ لڑکیوں کو آزاد کرا کے ان
میں بھیج دیا گیا۔

مغربی چھاؤنی سے تیمور کو کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہاں کوئی اغوا شدہ لڑکی موجود نہ تھی۔ مغربی چھاؤنی کی
اور تیمور میں تھوڑی سی تو تو میں میں ہوئی لیکن تلواریں نیام میں ہی رہیں۔

ظفریاب بہت اداس تھا۔ اب تک جتنی تاتاری لڑکیاں آزاد کرائی گئی تھیں ان میں گل عذار موجود نہ تھی
چھاؤنی کی طرف بڑھتے ہوئے تیمور نے تین اور لڑکیوں کو آزاد کرا لیا لیکن گل عذار اب تک ظفریاب کیلیے
بنی ہوئی تھی۔

تیمور کو اس کی افسردگی کا احساس تھا۔ ایک جگہ قیام کے دوران تیمور نے کہا:

"ظفریاب تمہاری بیوی بھی کسی نہ کسی طرح مل ہی جائے گی۔ غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"میں پر امید ہوں سردار محترم۔" ظفریاب نے اپنا غم چھپاتے ہوئے کہا۔

"امید کوئی چیز نہیں ظفریاب۔"

تیمور نے اسے اپنا فلسفہ سمجھایا:

"تاتاری یقین کے ساتھ قدم اٹھاتے ہیں۔ یقین ہمارے جوش کو ابھارتا ہے۔ امید کے سہارے
نہیں رہا کرتیں۔"

"چار مغل ہمارے ہاتھ سے قتل ہو چکے ہیں۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟" ظفریاب نے ایک نئے خدشے

"پھر وہی بزدلی کی باتیں۔" تیمور جھلا گیا۔

"ہم نتیجے کی پروا نہیں کیا کرتے ظفریاب۔ جب ہم سمرقند سے نکلے تو کیا ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم
تلواریں ہاتیس ہزار مغلوں کے سامنے بلند کی ہیں۔ یاد رکھو خون کی سرخی دلوں کو گرماتی ہے۔ ہمارا
دلوں میں حرارت پیدا کرے گا اور آج نہیں تو کل تاتاری غلامی کا جوا گردن سے اتار نے کے لیے
ہوں گے۔ تاتاریوں کی آزادی کا ایوان ہمارے خون کی بنیادوں پر قائم ہوگا۔"

تیمور کی باتوں سے ظفریاب کا دل ایک نئے جذبے سے بھر گیا۔ اس نے اپنے اندر نئی توانائی محسوس
افسردگی کی بھاری چادر اس نے ذہن سے اتار پھینکی۔ اس نے امید کی جگہ یقین کو اپنے دل میں جگہ
کسی قسم کا شکوہ نہ کرنے کی قسم کھائی۔

مغلوں کی مشرقی چھاؤنی میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ تیمور کے چھاؤنیوں میں بے دھڑک
مغلوں کے قتل کی خبریں پورے ملک میں پھیل گئی تھیں۔ مشرقی چھاؤنیوں کے جاسوسوں نے
آنے کی اطلاع اپنے سردار کو پہنچا دی تھی۔ تیمور جب مشرقی چھاؤنی کے سامنے نمودار ہوا تو مغل

فوج اسے صف بستہ دکھائی دی۔ اس نے گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔ اس کے ساتھی بھی رک
تیمور نے اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑا اور خود گھوڑا بڑھا کر مغل لشکر کی طرف چلا۔ اسے
لگا یا کہ ایک ہزار سوار اس کے سامنے صف آرا ہیں۔

تیمور کو اکیلا آتا دیکھ کر مشرقی کمان کا سردار بھی گھوڑا آگے بڑھا کر میدان میں آ گیا۔ دونوں
قریب ہو گئے مگر کنوتیوں سے کنوتیاں مل گئیں۔

دونوں ایک دوسرے کو تیز نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن نہ لب ہلتے تھے اور نہ ہاتھ
طرف جاتے تھے۔

کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔ آخر تنگ آ کر مغل سردار سخت لہجے میں بولا،
"تیمور۔ مسلح سواروں کے ساتھ چھاؤنی کے قریب آنا بغاوت ہے۔ تم مغل حاکموں کے با
"مغل سردار۔ زبان سنبھالو"۔

تیمور نے کڑک کر جواب دیا:
"تم نے خانِ اعظم کے حکم کی توہین کی ہے۔ میں خانِ اعظم کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔
سزا یہ ہے کہ میں تمہارا سر قلم کر دوں"۔

تیمور نے بڑی تیزی سے تلوار نکال۔
مغل سردار گھبرا گیا۔ خانِ اعظم کا حکم۔ حکم کی توہین۔ وہ الجھ سے رہ گیا۔ اس نے بھی تل
اپنا گھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹا لیا۔
"تیمور۔ قبل اس کے کہ میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں۔ مجھے بتاؤ کہ خانِ اعظم کا کیا حکم ہے اور م
حکم کی توہین کی ہے!"

مغل سردار کا لہجہ مصالحانہ تھا۔
"مجھے تمہارا لہجہ پسند آیا"۔
تیمور نے جس پھرتی سے تلوار نکالی تھی اتنی ہی پھرتی سے تلوار نیام میں کر لی:
"مغل سردار تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ملک تاتار ہے اور اس ملک کا بادشاہ بلا دستان
عزت مآب خان تغلق خان تیمور ہے۔ ہم تاتاری اس کی رعیت ہیں۔ تم نے ایک ذمہ دار تاتاری کی

اعظم کی توہین کی ہے۔ خانِ اعظم نے تاتاریوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دی ہے اور تم تاتاری
یتیوں کو پامال کر رہے ہو۔ تاتاری لڑکیوں کو اغوا کر کے انہیں کنیزیں بنا رہے ہو۔ بتاؤ باغی کون ہے۔
بانم! تمہیں خانِ اعظم کو اپنی بدعنوانیوں کا حساب دینا ہو گا۔ جواب دو۔ میں تمہارا جواب لے کر خانِ اعظم
پاس جاؤں گا"۔

مغل سردار تیمور کو باغی کہہ کر افسوس کر رہا تھا۔ اس نے صفائی پیش کی:
"تیمور۔ اگر تم خانِ اعظم کو اپنا بادشاہ سمجھتے ہو تو پھر باغی نہیں ہو سکتے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں"۔
"تمہیں صرف الفاظ واپس نہیں لینا ہیں"۔

تیمور کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ مغل سردار پوری طرح اس کے رعب میں آ گیا ہے۔
"اور تم کیا چاہتے ہو تیمور"۔ مغل سردار نے جان چھڑانے کے لیے جلدی سے پوچھا۔
"تمہاری چھاؤنی میں جتنی اغوا شدہ تاتاری لڑکیاں موجود ہیں انہیں میرے حوالے کر دو"۔ تیمور نے
حکم دیا۔
"لیکن تیمور۔ تیمور یقین کرو اس چھاؤنی میں کوئی تاتاری لڑکی موجود نہیں"۔ مغل سردار کو پسینہ آ گیا۔
"مجھے تمہاری بات کا یقین ہے"۔
تیمور نے جیسے رک کر سانس لی پھر بولا:
"لیکن یہ بات تم شمال کی طرف منہ کر کے ایک بار پھر دہراؤ"۔
مغل آسمان کی طرف دیکھ کر یا شمال کا رخ کر کے کوئی جھوٹی بات کہتے اور نہ کوئی وعدہ کرتے تھے۔ آسمان
ارک روحوں کا قیام تھا اور شمال میں ان کا خاندانی قبرستان تھا جہاں ان کا عظیم ترین پیشوا اور سردار چنگیز خان
ا تھا۔

مغل سردار نے شمال کا رخ کر کے اپنی بات دہرائی۔ تیمور گھوڑے سے اتر پڑا۔ مغل سردار بھی گھوڑے
سے اتر گیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بغل گیر ہو گئے۔
"ہمارا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں"۔ تیمور اس سے الگ ہوتا ہوا بولا۔
"ٹھیک ہے تیمور۔ لوگوں نے خواہ مخواہ افواہیں اڑا رکھی ہیں"۔ مغل سردار نے مزید صفائی کے لیے کہا۔
تیمور اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔

"اچھا رخصت۔ ہمیں ابھی بہت لمبا سفر کرنا ہے۔"

"ٹھہرو تیمور۔ ایک ضیافت تو ہو جائے۔" مغل سردار نے اسے دعوت دی۔

"شہزادہ الیاس خواجہ ہمارا انتظار کر رہا ہو گا۔"

تیمور گھوڑا موڑ کر اپنے ساتھیوں میں جا ملا۔ مغل سردار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

تیمور جس شان سے چھاؤنی کے سامنے نمودار ہوا تھا اسی شان سے واپس ہوا۔ تیمور کے اس رویے نے اس کے ساتھیوں کے حوصلے بلند کر دیے اور انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ اگر تاتاریوں میں کوئی سردار ہے تو وہ صرف تیمور ہے جو جرأت اور وفاداری کے ساتھ مغلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہے۔

⊙

تیمور اپنے تین سو سواروں کے ساتھ مغل چھاؤنیوں میں جس بے باکی سے گھومتا رہا اس کی صدائے بازگشت مغل خیمہ گاہ میں بھی سنائی دی۔ شہزادہ خواجہ الیاس خان نے ان اطلاعات کو بڑی حیرت اور بے چینی سے سنا۔ اسے بڑی مشکل سے یقین آیا کہ تیمور بڑی بے خوفی سے اس کی چھاؤنیوں میں دندناتا پھر رہا ہے اور مغل لشکری اور سردار اسے روکنے سے قاصر ہیں۔

اس نے اس واقعے اور سانحے پر غور کیا تو اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ خود اس کی غلطی اور بد انتظامی تھی۔ خانِ اعظم نے اسے ملک تاتار کا حکمران بنایا تھا لیکن اس نے یہ کب اجازت دی تھی کہ تاتاری بستیوں کو تاراج کیا جائے۔ پُر امن تاتاریوں کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر کے سرِ بازار نیلام کیا جائے۔ اگر اس نے بیک جک کے مشورے سے اس لوٹ مار کی اجازت نہ دی ہوتی تو آج تیمور کو نہ تو اس طرح تلوار بلند کرنا پڑتی اور نہ اس کی ضرورت ہی پیش آتی۔

اسے تاتاریوں کے ہاتھوں مغلوں کے قتل کی بھی خبر ملی تھی۔ عام حالات میں کسی ایک مغل کا قتل بھی قیامت برپا کر دیتا لیکن اس صورت حال میں الیاس خواجہ کو مغلوں کے مارے جانے کو بھی نظر انداز کرنا پڑا۔

الیاس خواجہ کو علم تھا کہ تاتاری بستیوں میں لوٹ مار خیمہ گاہ کی شہ پر ہو رہی ہے۔ فساد پھیلانے والوں اور اغوا کرنے والوں کو کھلی چھٹی بھی تھی اور خیمہ گاہ کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ وہ لوٹ کے مال کا ایک

حصہ چنگی خانے کو ادا کر کے بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ جو سفاکی اور بربادی کریں گے اس کی ان سے کوئی باز پرس نہ ہو گی۔

اس نے جتہ سردار بیک جک کو بلا کر مشورہ کیا۔ الیاس خواجہ چاہتا تھا کہ اگر جتہ سردار جو کہ مغل لشکر کا سردار و سپہ سالار تھا، رضامند ہو جائے تو مغلوں کو لوٹ مار اور اغوا سے منع کر دیا جائے لیکن جتہ نے ایک بھیانک قہقہے کے ساتھ اسے بتایا:

"لوٹ مار اور اغوا کا کاروبار خود بخود کم ہو گیا ہے۔ اب کوئی مغل یہ کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا بیک جک؟"

الیاس خواجہ کو بڑا تعجب ہوا:

"کیا تم نے مغلوں کو منع کر دیا ہے؟"

بیک جک نے دوسرا قہقہہ لگایا:

"چنگی کے منشی نے اپنا کام بند کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مہینے سے نہ کوئی لوٹ کا مال آیا ہے اور نہ اغوا ہو کے آئی ہیں۔ مغل، تاتاری بستیوں میں جاتے ڈرتے ہیں۔"

"کیا مغل اس قدر بزدل ہو گئے ہیں۔" الیاس خواجہ نے پہلو بدل کے پوچھا۔

جتہ سردار بیک جک نے تیسرا قہقہہ بلند کیا۔ جب وہ غصے میں ہوتا تو ہر بات سے پہلے قہقہہ لگاتا۔ ممکن ہے اس طرح اپنے غصے کی شدت کو کم کرنا چاہتا ہو۔

الیاس خواجہ اس کے دو بے محل قہقہے تو برداشت کر گیا لیکن تیسرے قہقہے پر وہ چڑ اٹھا۔

"بیک جک۔ یہ فضول قہقہے بند کرو اور سنجیدگی سے جواب دو۔ کیا مغل، تاتاریوں سے خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ ایسا ہے تو ہمیں کوئی دوسری صورت اختیار کرنا چاہیے۔"

بیک جک نے حسبِ معمول پھر قہقہہ لگانا چاہا لیکن فوراً سنبھل کر منہ بند کر لیا۔ ذرا ٹھہر کر بولا:

"مغل نہ ڈرتے ہیں اور نہ تاتاریوں سے خوفزدہ ہیں۔ مغل ان تین سو تاتاری سواروں سے پریشان ہیں۔ تیمور اپنے ساتھ لیے پورے ملک میں گھوم رہا ہے۔ یہ سوار لوٹ مار کا مال چھین کر لڑکیوں کو آزاد کر دیتے ہیں اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو اسے مار ڈالتے ہیں۔"

"کیا مغلوں کا خون اتنا سستا ہو گیا ہے کہ اسے یوں بیدردی سے بہایا جائے۔" الیاس خواجہ کی

پتلیاں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ اس کے باپ خانِ اعظم کی بھی غصے کے وقت یہی حالت ہو جاتی تھی
"اگر تم خیمہ گاہ میں بیٹھے یونہی شراب اور گھوڑی کا دودھ پیتے رہے تو مغلوں کا خون ارزاں
ہو جائے گا۔"

بیک جک نے جلتی پر تیل ڈال دیا۔

"نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

ایلیاس خواجہ غصے سے کانپتا کھڑا ہو گیا۔

"ہم تاتاریوں سے انتقام لیں گے۔"

"چھوٹے خان۔ تم خون کیوں جلاتے ہو۔ صرف زبان ہلاؤ اور تماشہ دیکھو۔" بیک جک نے اس دفعہ
بجائے اپنی بات کے اختتام پر اپنا بھیانک روایتی قہقہہ بلند کیا۔

"کیا چاہتے ہو بیک جک؟" ایلیاس خواجہ نے اسے ناگواری سے گھورا۔

"صرف ایک اشارہ۔ ویسا ہی اشارہ جیسا ہم نے مغلوں کو لوٹ مار کے لیے دے رکھا ہے۔"

"صاف بات کرو بیک جک۔ میں اب کسی مزید الجھن میں نہیں پھنسنا چاہتا۔"

"مجھے حکم دو چھوٹے خان۔"

بیک جک کا چہرہ خوفناک ہو گیا۔

"میں سپہ سالار ہوں اور تم حاکمِ تاتار۔ تم مجھے حکم دے سکتے ہو کہ میں تیمور اور اس کے ساتھیوں
تمہارے قدموں میں لا کے ڈھیر کر دوں۔"

ایلیاس خواجہ کا غصہ کم ہو گیا اور چہرہ سنجیدہ پڑ گیا۔

"لیکن میں یہ حکم کیسے دے سکتا ہوں۔"

اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں ملکِ تاتار کا حاکم ہوں لیکن خانِ اعظم نے تیمور کو سمرقند کا مقامی حاکم بنایا ہے۔ میں اس
حکم کیسے دے سکتا ہوں۔"

"ایلیاس خواجہ شہزادہ ہے۔ مغل حکومت کا ولی عہد اور ملکِ تاتار کا حاکم۔"

بیک جک چبا کے بولا۔ "شہزادے کو اپنے اختیارات سے کام لینا چاہیے۔ تیمور کی حیثیت کیا

ایک مقامی سردار۔ وہ مغل بھی نہیں ہے۔ ہماری رعیت ہے۔ رعایا غلام ہوا کرتی ہے۔ اگر تم ایک معمولی تاتاری
کے قتل کا حکم نہیں دے سکتے تو پھر تمہارے حاکم ہونے سے کیا فائدہ۔ حاکم احکام چلانے کے لیے ہوتا ہے
لوٹ کے مال کا حصہ لینا اس کا کام نہیں۔"

بیک جک نے ایلیاس خواجہ کا خون گرم کرنے کی بہت کوشش کی مگر اسے ذرا بھی غصہ نہ آیا بلکہ اس میں
سنجیدگی پیدا ہو گئی۔

"میں نے کہا ہے کہ تاتاریوں سے انتقام لیا جائے گا لیکن میں تیمور کے قتل کا حکم نہیں دے سکتا
تیمور کو خانِ اعظم نے مقرر کیا ہے۔ میں تو اسے اس کے عہدے سے بھی معزول نہیں کر سکتا۔"

"لیکن کیوں؟"

بیک جک دھاڑا۔

"تم اتنے مجبور نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں چھوٹے خان۔"

"بیک جک میں تمہاری وفاداری کی قدر کرتا ہوں۔"

ایلیاس خواجہ نے متانت کا دامن نہ چھوڑا۔

"لیکن میں تیمور کے قتل کا حکم دے کر خانِ اعظم کی ناراضگی مول نہیں لے سکتا۔ وہ مجھے ولی عہدی سے
ہٹا سکتے ہیں۔"

"ایلیاس خواجہ خان!"

بیک جک نے اپنی آواز دھیمی کر لی تاکہ دور کھڑا محافظ اس کی بات نہ سن سکے۔

"اگر خانِ اعظم نے تمہیں ولی عہدی سے معزول کرنے کی کوشش کی تو میرا تیس ہزار کا لشکر تمہاری
پشت پر ہو گا۔ میں تمہارے خاقان ہونے کا اعلان کر دوں گا۔ وہ شمال کا خاقان اور تم جنوب کے خانِ اعظم۔
ایلیاس خواجہ خان۔"

یہ اتنا بڑا منصوبہ اور سنہرا انتخاب تھا کہ ایک بار تو ایلیاس خواجہ بھی چکرا کر رہ گیا۔ بیک جک کا تیس ہزار
لشکر۔ اس میں ایلیاس خواجہ کے حواریوں کے لشکری بھی شامل ہو جاتے تو یہ تعداد پچاس ہزار سے بھی بڑھ
جاتی۔ اتنے بڑے لشکر سے تو ایلیاس خواجہ آدھا ایشیا فتح کر سکتا تھا لیکن اس میں شجاعت کے ساتھ
ارادہ بھی موجود تھا۔ مغلوں کی خاقانی اور خانِ اعظمی۔ اس دور کی عظیم ترین نعمت تھی لیکن ایلیاس خواجہ خود کو

باپ کے خلاف بغاوت پر تیار نہ کر سکا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بیک جک کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ زمانۂ حال اور مستقبل میں اسے بیک جک جیسا بہادر اور باأثر سردار کی سخت ضرورت تھی۔

الیاس خواجہ نے ایک پیالہ اٹھا کر اپنے سامنے رکھا۔

اس میں گھوڑی کا دودھ انڈیلا۔ پھر دوسرا پیالہ اس کے برابر رکھ کر اس میں بھی دودھ بھر دیا۔

بیک جک اس کے اس فعل کو بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ الیاس خواجہ نے ایک پیالہ اپنے ہاتھ سے اٹھا کر بیک جک کی طرف بڑھایا۔ بیک جک نے بڑی حیرت سے الیاس خواجہ کے چہرے کو دیکھا۔ الیاس خواجہ مسکرا رہا تھا۔

بیک جک نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے بوسہ دیا۔

مغلوں کے قاعدے کے مطابق یہ شاہِ وقت یا حاکمِ وقت کے انتہائی التفات کا طریقہ تھا۔ بعض اوقات جب کسی سردار سے خوش ہوتا تو شراب یا گھوڑی کے دودھ سے پیالہ بھر کے اسے اٹھانے کا اشارہ کرتا لیکن اگر شاہِ وقت بھرا ہوا پیالہ خود اپنے ہاتھ سے اٹھا کر کسی سردار کو پیش کرے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ شاہ کی نظر میں اس سردار سے زیادہ اہم اور کوئی شخصیت نہیں۔

الیاس خواجہ نے اپنے عمل کی زبان سے بھی تصدیق کر دی۔

'بیک جک۔ تمہاری بات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم پر ہر حال اور ہر موقعے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ تمہاری وفاداری نے میرے دل میں سب سے اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہے۔ تاتاریوں سے انتقام لیا جائے گا۔ تیمور اور اس کے ساتھیوں کا سر بھی اتار دیا جائے گا۔ تم جو چاہتے ہو یا تم نے جو مشورہ مجھے دیا ہے اسے قبول کرتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ اس پر عمل ہو گا اور میرے خیال میں اس کا یہی صحیح حل ہے لیکن گھی سیدھی انگلی سے نکل آئے تو ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مغل لشکریوں کا خون اتنا سستا نہیں کہ خانِ اعظم اسے نظر انداز کر دیں۔'

الیاس خواجہ نے رک کر سانس لی۔

بیک جک نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ آخر اسے اس اعزاز کا شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا۔ بولا:

'چھوٹے خان۔ تم نے مجھے جو اعزاز بخشا ہے میں خود کو اس کا اہل ثابت کروں گا۔ دشمن کا گھوڑا اس وقت تک پہنچ سکتا ہے جب میں اور میرا لشکر ختم ہو گیا ہو۔ میں تمہارا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔'

الیاس خواجہ نے اب تک پیالے کو منہ نہ لگایا تھا۔ اس نے پیالہ منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ بیک جک نے بھی پیالہ منہ سے لگایا اور غٹاغٹ پی لیا۔ وہ پیالہ ہاتھ میں لیے یہی انتظار کر رہا تھا کہ الیاس خواجہ دودھ پیے۔

الیاس خواجہ نے ریشمی آستین سے منہ پونچھتے ہوئے کہا:

'ہاں بیک جک۔ میں آج ہی خانِ اعظم کو تیمور کی بغاوت کی خبر بھیجتا ہوں۔ خان، باغی کو برداشت نہیں کرتے۔ تیمور نے تو بغاوت کر کے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس کے قتل کا فوراً اعلان ہو جائے گا اور پھر ہم تیمور ہی نہیں پورے ملکِ تاتار سے انتقام لیں گے۔ ایسا خوفناک انتقام جسے صدیوں یاد رکھا جائے گا۔'

بیک جک نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں اس کا قہقہہ ضرور بلند ہوا جو اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ بیک جک الیاس خواجہ کی رائے کی تصدیق کر دی ہے۔

الیاس خواجہ نے اسی روز ایک قاصد کو خانِ اعظم کے مستقر حصار المالیق روانہ کیا۔ خانِ اعظم کو زبانی اور تحریری دونوں طرح سے مطلع کیا گیا کہ تیمور نے مغلوں کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ مغل چھاؤنیوں پر حملے کر رہا ہے اور کتنے ہی بے گناہ مغل اب تک اس کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ مغل فوجیں خانِ اعظم کے منتظر ہیں۔

⊙

دوسرے دن دوپہر کو بیک جک کسی کام کے سلسلے میں الیاس خواجہ کے پاس آیا ہوا تھا کہ ایک تیز رفتار سوار نے الیاس خواجہ کے خیمے میں ایک ایسی خبر دی جسے سن کر بیک جک اور الیاس خواجہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

سمرقند کا مقامی حاکم تیمور، تقریباً تین سو سواروں کے ساتھ بڑی تیزی سے خیمہ گاہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

شکار خود جال میں آ رہا ہے۔" ذرا توقف کے بعد بیک جک نے تبصرہ کیا۔ "اس کی موت اسے گھیر کر

یہاں لا رہی ہے۔ مغل خون آج رنگ لائے گا۔"

الیاس خواجہ اس خبر سے سخت متوحش تھا۔ اسے جیسے چپ لگ گئی۔ سوار اب تک خیمے میں کر

اس نے مزید انکشاف کیا:

"تیمور کے ساتھ دو گاڑیوں پر عورتیں بھی ہیں۔"

"کتنا دیدہ دلیر ہے تیمور۔"

الیاس خواجہ کو اعتراف کرنا ہی پڑا۔ پھر اس نے اعلان کیا:

"دربار سجایا جائے۔ تمام سرداروں کو حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔"

"دربار؟" بیک جک نے حیرت سے پوچھا۔

"خانِ اعظم تو نہیں آ رہا ہے الیاس خواجہ۔ دربار لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ہمارا محکوم ہے

معمولی تاتاری، مقامی حاکم۔"

"نہیں بیک جک۔"

الیاس خواجہ نے اسے تقریباً ڈانٹ دیا۔

"تیمور جب پہلی بار سمرقند میں آیا تھا تو اس وقت بھی خانِ اعظم نے اس کے لیے دربار لگایا تھا

خانِ اعظم کا بنایا ہوا ایک حاکم ہے۔ ہم اس کے ساتھ بعد میں جو چاہے سلوک کریں لیکن پہلے اسے

عزت سے بٹھائیں گے۔"

بیک جک کو یہ مدارات کا طریقہ پسند نہ آیا لیکن وہ مصلحتاً خاموش ہو گیا۔ شام ہوتے ہی الیاس

خیمے کے سامنے قالینوں کا فرش بچھ گیا۔ درمیان میں، الیاس خواجہ کے لیے سفید نمدے کی نشست

گئی۔ اس کے تمام سردار اس کے سامنے نیم دائرے کی شکل میں آ کر بیٹھ گئے۔ بیک جک کو الیاس

بالکل قریب جگہ ملی۔ خیمہ سے دور دور تک مغل سواروں کے دو رویہ دستے کھڑے کر دیے گئے۔ وہ

لباس پہنے تھے۔ لانبی کمانیں ان کی پشت پر آویزاں تھیں۔ لانبے اور چھوٹے نیزے زمین

گڑے تھے۔

تیمور اس جگہ پر آ کر رک گیا جہاں سے الیاس خواجہ کے خیمے تک مسلح سواروں نے راستہ

اس نے اس راستے پر نظر دوڑائی۔ کافی دور اسے الیاس خواجہ بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ الیاس

روبرو کرنے کے لیے یہ اہتمام کیا ہے۔

تیمور نے سوار اور خواتین کی گاڑیاں وہیں چھوڑ دیں اور ظفر یاب کو اپنے ساتھ لیے اس راستے میں داخل

موت کے گھیرے سے کم نہ تھا۔ ایک اشارے میں اس کا اور ظفر یاب کا کام تمام کیا جا سکتا تھا۔ تیمور کے

پر فکر و تردد کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ ایک شان بے نیازی کے ساتھ اور پُر وقار انداز میں گھوڑا آگے بڑھا رہا

ظفر یاب کا گھوڑا اس کے پیچھے تھا۔

الیاس خواجہ کے مسلح سوار، اس سردار کی بے خوفی پر عش عش کر رہے تھے۔ تمام لوگوں کو دربار تک آنے کی

جازت نہ تھی۔ جنہیں خبر مل گئی تھی وہ دور سے کھڑے تیمور کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی عجوبہ روزگار چیز ہو۔ تیمور

دزدیدہ نظروں سے الیاس خواجہ کے اس اردوئے معلّٰی کی فرودگاہ کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے حدِ نظر تک

وں کی قطاریں، گھوڑوں کے دستے اور نمدے کے خیمے نظر آ رہے تھے۔

تیمور نے الیاس خواجہ کو مغل علم کے نیچے سفید نمدے پر بیٹھا دیکھا تو اسے بے ساختہ بادِ شمال کا خانِ

یاد آ گیا۔ وہی رنگ روپ، چوڑا چکلا منگول چہرہ، رخساروں کی ہڈیاں تھوڑی تھوڑی ابھری ہوئیں، چگی داڑھی،

رانی چھوٹی کھنچی ہوئی آنکھیں۔ آنکھوں کے اندر بے قرار پتلیاں۔ الیاس خواجہ اور خانِ اعظم میں اگر کوئی فرق تھا

نا عمر کا۔ اس کے رخسار زیادہ بھدّے اور کھردرے تھے۔

تیمور نے قالین کے فرش کے پاس اپنا گھوڑا روکا۔ گھوڑے سے اتر کر وہ دو قدم آگے بڑھا اور

ادب سے کرنش (کورنش) بجا لایا۔ پھر سیدھا ہو کر بولا:

"اے عالی نسب خانِ اعظم تغلق تمور کے عالی مقام ولی عہد شہزادہ الیاس خواجہ خان اور اسے اردوئے معلّٰی

امیر میں قبیلہ برلاس کا سردار اور سمرقند کا حاکم تیمور ہوں۔"

الیاس خواجہ کی نظریں تیمور کی فولادی کڑیوں والی نقرئی کام کی زرہ، چار آئینہ، بازو بند اور شانہ گیر

ہوئی تھیں۔ تیمور کے سر پر جو خود تھا اس کی جھول گردن کو ہر طرف سے محفوظ کیے ہوئے تھی اور خود زریں کام

جگمگا رہا تھا۔

الیاس خواجہ اسے جواب دینے والا تھا کہ بیک جک کا بھیانک قہقہہ بلند ہوا۔ اس نے بڑی حقارت سے کہا:

"تیمور۔ تو سمرقند کا حاکم نہیں وہاں کا مقامی منتظم ہے۔"

پھر اس حقارت کو مزید تقویت دینے کے لیے دو قہقہے اور لگا دیے۔

"شہزادہ الیاس خواجہ!"

تیمور نے کڑک کر کہا۔

"مغل سردار کو تیمور کی توہین سے منع کیا جائے کیونکہ یہ توہین تیمور کی نہیں بلکہ بلادِ شمال کے تغلق تیمور کی ہے جس نے مجھے سمرقند کا حاکم مقرر کیا ہے۔ اگر مغل سردار نے اپنے الفاظ واپس نہ خانِ اعظم کی توہین کے جرم میں اس کا سر قلم کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا!"

بیک جک، تیمور کی اس جرأت پر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ غصے سے بھنایا ہوا اٹھ کھڑا ہوا لیکن الیاس اسے سختی سے ڈانٹا۔

"بیک جک بیٹھ جاؤ۔ تمہیں خانِ اعظم کے مقرر کردہ کسی حاکم کی توہین کرنے کی اجازت نہیں تیمور ہم سے مخاطب ہے۔ جواب ہم دیں گے"۔

بیک جک منہ بناتا اور ہونٹ کاٹتا ہوا بیٹھ گیا۔

تیمور نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی فطری ذہانت کا سہارا لیا:

"عالی نسب باپ کے عالی نسب بیٹے نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی رگوں میں وہی چنگیزی خون جو شاہِ وقت کی توہین برداشت نہیں کر سکتا اور عہد ناموں کی پاسداری میں خانِ اعظم کی طرح اٹل اور ثابت

الیاس خواجہ بھی عقلمند تھا۔ اس نے بھی تیمور پر ذکاوت کا کوڑا استعمال کیا۔ پوچھا:

"تیمور، تمہارے قول کے مطابق خانِ اعظم کی توہین ناقابلِ برداشت ہے۔ اب یہ بھی بتاؤ کہ شخص خانِ اعظم سے بغاوت کرے تو اس کی کم از کم سزا کیا ہے؟"

"شہزادۂ محترم۔ بغاوت کی کم از کم سزا موت ہے"۔

تیمور نے بلا جھجک جواب دیا:

"لیکن خانِ اعظم سے بغاوت کرنے والے کی سزا یہ ہے کہ باغی کا سر کاٹ جائے اور اس کی پوری تشہیر کی جائے۔ پھر اس کے بیوی بچوں کو سولی پر چڑھایا جائے اور اہلِ خاندان کو نیست و نابود

الیاس خواجہ کو اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ نمدے کی مسند پر پہلو بدل کر بولا:

"تیمور۔ کیا تم نے مسلح سواروں کے ساتھ مغل چھاؤنیوں پر چھاپے نہیں مارے۔ کیا تمہا سے کئی بے گناہ مغل نہیں مارے گئے۔ تمہارا یہ فعل بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ تمہارے اس جرم کی با

کیوں نہ ہم تمہارا سر قلم کر کے اس کی نمائش کریں تاکہ ان بیواؤں کے دل کو ٹھنڈک ملے جن کے والیوں کو تم نے قتل کیا ہے"۔

الیاس خواجہ نے نہ صرف تیمور پر بغاوت کا الزام لگایا بلکہ اس کی سزا بھی فوراً ہی تجویز کر دی۔ یہ لمحہ تیمور کے لیے بڑا سخت تھا لیکن وہ جذبات سے بے قابو ہونے کے بجائے متانت سے بولا:

"شہزادۂ محترم۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ مغلوں کے جدِ امجد قبل خان اور تیموریوں کے جدِ امجد قاجولی خان میں معاہدہ ہوا تھا کہ مغل بادشاہت کریں گے اور تاتاری ان کے ماتحت سردار ہوں گے۔ یہ معاہدہ اب تک قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ بلادِ شمال کا خانِ اعظم تغلق تیمور میرا اور تمام تاتاریوں کا بادشاہ ہے اور شہزادہ الیاس خواجہ ان کا ولی عہد ہے۔ پھر بھلا مجھ پر بغاوت کا الزام کون لگا سکتا ہے۔ اگر کسی دشمن نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے تو خانِ اعظم کے دربار میں پہنچ کر اس کی صفائی پیش کروں گا۔ میں اپنی کچھ شکایتیں لے کر حصار المالیق جا رہا ہوں۔ بغاوت کے اس تازہ الزام کی تردید بھی وہیں پہنچ کر کروں گا"۔

"تم حصار المالیق جا رہے ہو!"

الیاس خواجہ کے ہاتھ پیر پھول گئے:

"لیکن ___ لیکن تم وہاں کیوں جا رہے ہو؟"

بغاوت کا الزام تو الگ رہا الیاس خواجہ کو اپنی فکر پڑ گئی۔ اگر تیمور خانِ اعظم تک پہنچ گیا تو نہ معلوم کیا کرے گا۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ تیمور کو کسی نہ کسی تدبیر سے حصار المالیق جانے سے روکے گا۔

تیمور کو اس کی گھبراہٹ سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ ہو گیا سو وہ اکڑ کر بولا:

"شہزادہ الیاس خواجہ . . . . . افسوس کہ میں نے آپ کو مغل لٹیروں اور بردہ فروشوں کی ناشائستہ حرکات سے کئی بار آگاہ کیا مگر آپ نے اس سلسلہ میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں خانِ اعظم کے دربار میں جا کر فریاد کروں اور پوچھوں کہ کیا انہوں نے مجھے اس لیے مغلوں کے ماتحت کر دیا ہے کہ مغل، میرے گھروں میں گھس کر بہو بیٹیاں اٹھاتے رہیں اور تاتاری بستیوں کو لوٹتے رہیں۔ آپ کے باپ دادا نے ہمارے باپ دادا سے ہماری عزت و ناموس کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔ پھر یہ عہد شکنی کیوں ہو رہی ہے؟"

تیمور کی باتوں سے بیک جک کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے تیمور کی توہین کی تھی اور اسی کے مشورے سے

الیاس خواجہ نے مغلوں کو تاتاری بستیاں اجاڑنے اور لڑکیاں اغوا کرنے کی اجازت دی تھی سامد نے الیاس کے کان میں کہا:

"چھوٹے خان۔ تیمور کو یہیں ختم کر دینا چاہیے۔ حصار المالیق پہنچ کر یہ بڑا غضب ڈھائے گا۔ مجھے حکم دو میں ابھی اس کا خاتمہ کیے دیتا ہوں"۔

الیاس خواجہ بھی تیمور کی باتوں سے پریشان تھا۔ اس نے یہ تو سوچ لیا تھا کہ تیمور، خانِ اعظم سے جا کر نہ جانے کیا کہہ دے گا لیکن وہ روکے گا کس طرح؟ اس کے متعلق اس نے ابھی تک کچھ نہ سوچا تھا.... بیک جک کے مشورے نے اسے ایک نئی راہ دکھائی۔ لیکن یہ آخری اقدام ہو گا۔ یہ قدم اٹھانے سے پہلے بہت کچھ سوچنا ہو گا۔

تیمور ابھی تک کھڑے گفتگو کر رہا تھا۔ الیاس خواجہ نے نرمی سے کہا:

"ہمارے درمیان غلط فہمیاں ہو بھی سکتی ہیں۔ تمہارا یوں کھڑے ہو کر گفتگو کرنا مناسب نہیں تم بیٹھ کے اپنی شکایت بیان کرو۔ ہم پوری توجہ سے سنیں گے"۔

الیاس خواجہ نے گفتگو میں پورا شاہانہ انداز اختیار کیا لیکن تیمور نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا اور بڑے اطمینان سے مغل سرداروں کے نیم دائرے سے آگے بڑھ کر الیاس خواجہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ تیمور کی بے خوفی اور بے باکی سے اس کے سردار اور خود الیاس خواجہ ہر لمحہ مرعوب ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"شہزادہ الیاس خواجہ۔ میری شکایت آپ تک پہنچ چکی ہے"۔

تیمور نے اس سے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا:

"یہ شکایت نہیں بلکہ میرا اور تاتاریوں کا حق ہے۔ مغلوں اور تاتاریوں کے معاہدے کے تحت مغل بادشاہ ہیں۔ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ رعیت کی عزت آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرے۔ میں یہی حق طلب کرتا ہوں۔ اسے شکایت نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ہمیں یہ حق آپ سے مل جاتا تو ہمیں حصار المالیق جانے کی ضرورت نہ پڑتی"۔

تیمور نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی اس لیے اس نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

"ہم تمہیں حصار المالیق جانے سے روک بھی سکتے ہیں تیمور"۔

الیاس خواجہ نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہا جس سے یہ قطعی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ دشمنی پر آمادہ ہے یا کوئی

صورت نکالنا چاہتا ہے۔

تیمور کو یہ فیصلہ کرنے میں کئی لمحے لگ گئے۔ آخر وہ بڑی سوچ بچار کے بعد الفاظ تولتے ہوئے بولا:

"عالی مقام شہزادے۔ مجھے حصار المالیق جانے سے روکنے کے لیے دو طریقے ہیں۔ ایک تو طاقت کا ... تین سو سواروں کو جن کے ساتھ خواتین بھی موجود ہیں۔ پچیس ہزار کا مغل لشکر، اگر قتل کر دے تو ... بڑا کارنامہ نہ ہو گا لیکن آپ کا یہ فعل مغلوں اور خصوصاً آپ کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ... اریوں کا ہر فرد تیمور بن کر مغلوں کے سامنے کھڑا ہو جائے جنہیں سنبھالنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور رہے گا۔ آپ ... یہ قدم مناسب نہیں ہو گا کہ اس طرح آپ خانِ اعظم کے ایک وفادار سردار اور اس کے ساتھیوں کو ... کے ان کی نظروں سے گر جائیں گے۔ آپ کی ولی عہدی خطرے میں پڑ جائے گی۔ خانِ اعظم یہ کبھی برداشت ... سکتے کہ مغلوں اور تاتاریوں کے صدیوں پرانے معاہدے کو ان کا ولی عہد توڑ ڈالے"۔

الیاس خواجہ، تیمور کے ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا تھا۔ تیمور کے ہر لفظ سے سچائی جھلکتی تھی۔ اس ... ت نے الیاس خواجہ کو ہلا کے رکھ دیا اور اسے مجبوراً اپنے مستقبل میں جھانکنا پڑا۔ اس نے گھمبیر آواز ... پوچھا:

"تمہارے خیال میں دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے؟"

تیمور، اس کے لہجے کی لرزش محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ دبے دبے لفظوں میں بولا:

"دوسری صورت معاہدے کی تجدید ہے۔ آپ تاتاریوں کا مطالبہ یا شکایت دور کر دیں۔ میں حصار المالیق ... ملتوی کر دوں گا"۔

"تیمور!"

الیاس خواجہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا:

"گزشتہ ایک ماہ سے لوٹ مار یا اغوا کا کوئی واقعہ ہمارے علم میں نہیں آیا۔ ہم نے سختی سے اس کی ... نے روک دی ہے"۔

"شہزادہ الیاس خواجہ"۔

تیمور مسرت سے بولا:

"آپ واقعی خانِ اعظم کے سچے جانشین ہیں۔ آپ نے لوٹ مار اور اغوا کی ممانعت کر کے خود ہی معاہدے

کی تجدید اور توثیق کر دی ہے۔ اب مجھے حصار المالیق جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اغوا شدہ لڑ
کی واپسی کا حکم دے دیجیے۔ میں انہیں لے کر سمرقند واپس چلا جاؤں گا اور مغل بادشاہت کے تحت سر
کے فرائض انجام دوں گا۔"

الیاس خواجہ نے جھوٹ بول کر تیمور کو تو مطمئن کر دیا لیکن اب اپنے ہی جھوٹ میں پھنس گیا تھا۔ اس جھو
سچ ثابت کرنے کے لیے تمام لڑکیوں کو واپس کرنا ضروری ہو گیا تھا لیکن یہ واپسی بہت وقت طلب کام تھا۔ لڑ
نیلام ہو کر کنیزیں بنائی جا چکی تھیں۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر خریدنے والوں نے کنیزیں واپس کرنے سے انکا
تو کہیں کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہو جائے۔

"تیمور۔ بعض باتیں نادانستگی میں ہو جاتی ہیں۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اب اگر کوئی لڑکی اغوا
ہم اغوا کرنے والے کا سر قلم کرا دیں گے۔" الیاس خواجہ نے بڑی چالاکی سے لڑکیوں کی واپسی کے
سے پہلو تہی کی۔

تیمور اس فریب میں کب آنے والا تھا۔ فوراً بولا:

"شہزادے عالی مقام۔ چند تاتاری لڑکیوں کو واپس کر کے آپ ہزاروں تاتاریوں کی دعائیں او
ہمدردیاں حاصل کر لیں گے۔ آپ کے ماتحت اتنے خودسر تو نہیں کہ وہ آپ کے حکم کو ٹال سکیں۔ وہ بھی ا
میں کہ جب آپ ایک قدیم معاہدے کا عملی مظاہرہ کر رہے ہیں۔"

الیاس خواجہ الجھن میں پھنس گیا۔ وہ بیک جک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"کیوں بیک جک۔ لڑکیوں کو واپس کرنے میں کوئی ہرج تو نہیں۔"

بیک جک، تیمور کی باتوں سے پہلے ہی قائل ہو چکا تھا۔ اسے سب سے زیادہ ڈر خانِ اعظم کا تھا۔
دو ساتھیوں کا انجام دیکھ چکا تھا۔ اس نے الیاس خواجہ کی ہاں میں ہاں ملائی:

"یہ کون سی بڑی بات ہے چھوٹے خان۔ کنیزیں خریدنے والوں کو اگر قیمت واپس کر دی جائے
خوشی لڑکیاں واپس کر دیں گے ورنہ میں۔۔۔۔"

"جتہ سردار۔"

تیمور نے بیک جک کو مخاطب کیا:

"آپ قیمت کی فکر نہ کریں۔ میں انہیں منہ مانگی رقم ادا کر دوں گا۔"

بیک جک نے جواب میں اپنا وہی قہقہہ بلند کیا جو خوشی اور غصہ دونوں حالتوں میں خود بخود اس کے
ابل پڑتا تھا۔

"آج تم ہمارے مہمان رہو گے تیمور۔"

الیاس خواجہ نے مسرت سے تیمور سے کہا:

"تمہارے سپاہیوں کے جہاں کہو خیمے لگا دیے جائیں۔ خواتین کو چاہو تو بیگمات کے خیموں میں بھیج
دو۔"

"شہزادے!"

تیمور بڑے رعب سے بولا:

"مغلوں کی طرح تاتاریوں کی چھت آسمان اور بستر گھوڑے کی زین ہوتا ہے۔ میرے سوار خیمہ گاہ سے
رہیں گے۔ میری بیوی الجائی خاتون آپ کی بیگم کو کورنش پیش کرنے ضرور جائے گی۔"

مخاصمت کی فضا صاف ہو گئی۔ دشمنی کے بادل چھٹ گئے۔ الیاس خواجہ اور بیک جک مطمئن تھے کہ
تیمور کی بلا سے نجات ملی۔ تیمور کے ساتھی اس کی فراست کے ایک بار پھر قائل ہو گئے۔ اس نے بڑے
انداز میں مغلوں کو اغوا شدہ لڑکیاں واپس کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

○

پرندوں کا گوشت، گھوڑوں کے پٹھوں اور ران کے کباب، چپڑی ہوئی میٹھی روٹیاں۔ مغلوں کی یہ
ڈشیں الیاس خواجہ کے اس ضیافتی دسترخوان پر موجود تھیں جس کا اہتمام تیمور کے لیے کیا گیا تھا۔
خوان پر الیاس خواجہ کے ساتھ بیٹھا۔ الیاس کے بائیں جانب جتہ سردار بیک جک تھا۔ اب اس کا
رویہ ساتھ بے انتہا دوستانہ تھا اور وہ ہلکے قہقہوں کے ساتھ تیمور سے باتیں کر رہا تھا۔ تیمور نے
گستاخی کو دل سے یا مصلحتاً نظر انداز کر دیا تھا۔

دسترخوان پر یہ تمام کھانے موجود تھے لیکن تیمور نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ اس نے الیاس خواجہ
اس کا مذہب مغلوں سے مختلف ہے اس لیے وہ صرف ان جانوروں کا گوشت کھائے گا جن کو

وہ خود ذبح کرے گا۔ الیاس خواجہ نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ تیمور کے لیے اس کے ہاتھ کی
ہوئی پہاڑی بکریوں کی بھنی ہوئی رانیں اور کباب لائے گئے۔ اس کے ساتھ کے سواروں کے
خیموں کے سامنے قالین کے فرش پر کھانا چنا گیا۔ کھانے کے دوران تیمور نے شراب کے بجا
استعمال کیا جس کا اس کے لیے خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔

تیمور نے الیاس خواجہ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی بیوی الجائی خاتون، الیاس خواجہ کی بیگم
کے لیے آئے گی۔ اس لیے الیاس خواجہ کی بیگم نے الجائی خاتون کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی
اجازت سے الجائی خاتون نے دعوت قبول کی۔ اس زنانہ دعوت کا انتظام الیاس خواجہ کی بیگم کے
کیا گیا۔

الجائی خاتون کے لیے خیمے کا یہ گھر بالکل نیا اور ایک عجوبہ سا تھا۔ وہ مکانوں میں رہنے کی
جب اسے خیمے میں رہنا پڑتا تو وہ بھی عام قسم کے معمولی خیمے ہوتے تھے لیکن یہ گھر تو اندر سے پورا
میں متعدد کمرے تھے۔ گیلریاں تھیں۔ قالینوں کا فرش۔ دیبا اور حریر کے پردے۔ ستونوں پر چاندی
پترے چڑھے ہوئے۔ مغلوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر وہ بڑی حیران ہوئی۔

الیاس خواجہ کی بیوی نے بڑے اصرار سے خانی طورہ کو بھی اس دعوت میں بلایا تھا۔ دراصل
کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ تیمور جیسے خود سر تاتاری سردار کی بیوی اس کی سلامی کو آئے گی۔ خانی طورہ
انکار کیا۔ پھر کچھ سوچ کر رضامند ہو گئیں۔ انہوں نے صرف شرکت کی رضامندی ظاہر کی تھی کھانا کھا
انکار کر دیا تھا۔ انہیں الیاس خواجہ کی بیوی پر اعتبار نہ تھا اور زہر خورانی کی شرمناک وبا مغلوں میں عام
تھی اور وہ خواہ مخواہ میں اپنی جان دینا نہیں چاہتی تھیں۔

گل عذار نے جب سے سنا تھا کہ تاتاریوں کا سردار تیمور مغلوں کی خیمہ گاہ میں تاتاری لڑکیوں
کے لیے آیا ہے اس وقت سے اس کا عجب حال تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ خانی ماں سے اس ملنے پر
کرے لیکن ہر بار اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ خانی ماں کی شفقتوں نے گل عذار کو اس کا غلام بنا دیا
تھی کہ خانی ماں نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا ہے اور وہ اسے کسی حالت میں اپنے سے جدا کرنے پر تیار نہ
تاہم کچھ کچھ امید تھی کہ خانی ماں شاید اس پر رحم کھا کر تیمور کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں لیکن یہ
اس وقت دم توڑ گئی جب خانی ماں نے زنانہ دعوت میں تنہا جانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے تنی کنیز اور گل

تھا سے تاکید کی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلیں اور جب وہ اپنی شاندار گاڑی پر سوار ہو کر چلنے لگیں تو انہوں
نے محافظوں کو بلا کر گھر کی حفاظت کے خاص احکام صادر کیے۔

خانی ماں بہو کے گھر میں کھانے کے بعد پہنچیں۔ یہی ان کا وعدہ تھا۔ خانی ماں کا استقبال الیاس خواجہ
کی تمام بیگمات اور دوسرے معزز سرداروں کی بیویوں نے کچھ اس انداز سے کیا کہ الجائی خاتون کے دل پر
اس بزرگ ہستی کا رعب پڑ گیا۔

"یہ ہیں خانی ماں۔"

الیاس خواجہ کی بیوی نے الجائی خاتون سے ان کا تعارف کرایا:

"خانی ماں مغلوں کی بزرگ ترین اور محبوب ترین خاتون ہیں۔ ان کی دست بوسی پر مغل فخر کرتے ہیں۔"

الجائی خاتون نے اسے ایک اشارہ سمجھا اور بڑھ کر ان کے دونوں ہاتھ چوم لیے:

"میں ہوں الجائی خاتون۔ تاتاریوں کے عظیم قائد امیر قزغن کی پوتی اور شہرِ سبز کے تاتاری سردار تیمور کی
شریکِ زندگی۔"

الجائی خاتون نے خانی ماں سے خود اپنا تعارف کرایا۔

خانی ماں، الجائی خاتون کی سلیقہ مندی سے بہت خوش ہوئیں اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"تم شہرِ سبز سے آئی ہو؟"

خانی ماں نے نہ جانے کیا سوچ کر سوال کیا اور پھر اس طرح آنکھیں بند کیں جیسے وہ کوئی بھولی بسری بات
یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"ہاں، مغلوں کی عظیم ترین خاتون۔"

الجائی نے کمالِ ادب سے کہا:

"سردار تیمور کا گھر شہرِ سبز میں ہے۔ میں جب سے بیاہ کر آئی ہوں شہرِ سبز میں رہتی ہوں۔"

خانی ماں "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

تمام بیگمات اور معزز مہمان خواتین نے خانی ماں کے ہاتھوں کو چوما اور دعائیں حاصل کیں۔ پھر خواتین اپنی
فطرت کے مطابق دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں بٹ کر خوش گپیوں میں لگ گئیں۔ الیاس خواجہ کی بیگم کا مقصد
ظاہر ہو چکا تھا۔ وہ خانی ماں کو دکھانا چاہتی تھی کہ سمرقند کے حاکم کی بیوی خود چل کر اس کے گھر آئی ہے اس لیے وہ

خانی ماں کو چھوڑ کر اپنی سہیلیوں سے گفتگو میں لگ گئی۔ الجائی خاتون کے لیے یہ ماحول اجنبی تھا اس لیے وہ خانی ماں کے پاس بیٹھی رہی۔

"کیا نام بتایا ہے تم نے اپنا؟" خانی ماں نے آہستہ سے پوچھا۔

"خاتونِ آغا، الجائی خاتون"۔ الجائی نے سر جھکا کر کہا۔ "الجائی خاتون میرا نام اور خاتونِ آغا میرا خطاب ہے"۔

"شہرِ سبز میں مغلوں نے ایک بارات کو لوٹا تھا"۔

خانی ماں نے اک دم سوال کر دیا تو الجائی خاتون گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ حالانکہ اسے اس واقعے کی پوری تفصیل معلوم تھی۔ اس نے خاموشی ہی میں بہتری سمجھی۔

"گھبراؤ نہیں خاتونِ آغا۔ میں تاتاریوں کی ہمدرد ہوں"۔ خانی ماں نے اسے تسلی دی۔

"بزرگ مادرِ محترم!"

الجائی کو بولنا ہی پڑا:

"وہ بڑا دردناک واقعہ تھا۔ ہماری ایک دلہن کو حجلۂ عروسی سے اغوا کیا گیا مگر اب چھوڑیے ان باتوں کو۔ مغلوں اور تاتاریوں کے دل صاف ہو گئے ہیں"۔

"اس دلہن کے شوہر کا نام ظفریاب ہے"۔ خانی ماں جیسے خواب میں بڑبڑا اٹھیں۔

خانی ماں کے منہ سے یہ جملہ سن کر الجائی خاتون اچھل پڑی۔

ان بڑی بی کو ظفریاب کا نام کس نے بتایا۔ الجائی کا ذہن الجھنے لگا۔ اس نے خانی ماں کو یوں دیکھا جیسے چاہتی ہو کہ وہ اس کے ذہن کی الجھن دور کریں۔

"ظفریاب کہاں ہے؟" خانی ماں نے جواب کا انتظار کیے بغیر دوسرا سوال کر دیا۔

الجائی خاتون کی الجھن دور کیا ہوتی اس میں اور اضافہ ہو گیا۔

"ظفریاب ہمارے ساتھ آیا ہے بزرگ ماں"۔ الجائی خاتون نے سر جھٹک کے خانی ماں کے سوال کا صحیح جواب دے دیا۔

الجائی خاتون جواب دینے کے بعد خانی ماں کا منہ غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ خانی ماں کچھ اور کہیں تاکہ یہ عقدہ کھلے کہ انہیں ظفریاب کا نام کیسے معلوم ہوا۔ اور انہیں شہرِ سبز کے واقعے سے اتنی دلچسپی

[...]یں خانی ماں نے چپ سادھ لی۔ وہ تو یوں بیٹھی تھیں جیسے انہوں نے الجائی سے کوئی گفتگو ہی نہیں [...]ی خالی خالی نظروں سے دیر تک ان کا چہرہ دیکھتی رہی لیکن خانی ماں اس کی موجودگی سے لاتعلق ایک ٹک [...] کو دیکھے جا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ جیسے گویائی سے محروم ہو گئے تھے۔

[...]ی دیر یہی کیفیت طاری رہی۔ پھر ایاس خواجہ کی بیگم نے آ کر خانی ماں کو اطلاع دی کہ ان کی گاڑی تیار [...]ماں بغیر کچھ کہے اٹھیں اور بیگم کے ساتھ خیمے کے دروازے کی طرف چل پڑیں۔ الجائی خاتون کا الوداعی [...]ے اٹھا ہوا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ خانی ماں نے اس کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا۔ حالانکہ وہ خود بھی انہیں [...]ک رخصت کرنے گئی تھی۔

[...]ائی خاتون دعوت سے فارغ ہو کر تیمور کے ساتھ اپنے خیمے میں آ گئی۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ راستے [...]و خانی ماں والی بات بتائے لیکن تیمور کسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا۔ وہ راستے میں خاموش رہی [...]یں پہنچتے ہی پھٹ پڑی:

[...]نتے ہیں آپ۔ ظفریاب کا نام مغلوں کو معلوم ہو گیا ہے"۔

[...]ھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے خاتونِ آغا؟" تیمور نے الجائی کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ [...]ش کرنے کے لیے کہا۔

[...]لیکن انہیں ظفریاب کا نام کیسے معلوم ہوا؟" الجائی نے اور زیادہ پریشانی اور حیرت کا اظہار کیا۔

[...]ممکن ہے ظفریاب نے کسی مغل کو اپنا نام بتایا ہو"۔

[...]یمور نے چہرے پر گری ہوئی الجائی کے بالوں کی لٹ کو چھیڑتے ہوئے کہا:

[...]ظفریاب کوئی اہم ہستی تو نہیں کہ مغلوں کو اس کی جستجو ہو"۔

[...]انہیں ظفریاب کی جستجو ہے میرے سرتاج"۔

[...]یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو"۔

[...]مجھ سے خانی ماں نے ظفریاب کے بارے میں پوچھا تھا"۔

[...]خانی ماں یہ کون ہیں؟" تیمور کو دلچسپی پیدا ہوئی۔

[...]خانی ماں مغلوں کی بزرگ ترین اور معزز ترین ہستی ہیں"۔ الجائی نے بتایا۔ "انہیں شہرِ سبز میں بارات لوٹے [...]کا علم ہے۔ انہوں نے زور دے کر مجھ سے پوچھا کہ ظفریاب اس وقت کہاں ہے؟"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" تیمور کی دلچسپی نے فکر کی صورت اختیار کر لی۔

"میں اُن کی بزرگی سے اس قدر مرعوب ہو گئی کہ جھوٹ نہ بول سکی۔" الجائی نے نظریں
اس سے غلطی ہو گئی ہو اور اب وہ تیمور سے شرمندہ ہو۔

"تم نے بتا دیا کہ ظفریاب ہمارے ساتھ ہے۔"

"ہاں سرتاج۔ مجھے اپنی غلطی پر افسوس ہے۔"

"کوئی غلطی نہیں الجائی۔"

تیمور نے اس کی لٹ کو پھر چھیڑا۔

"اگر تم جھوٹ بولتیں تو شاید یہ زیادہ بڑی غلطی ہوتی۔"

"لیکن سرتاج . . . ."

"سو جاؤ الجائی۔ کل ہمیں سمرقند واپس جانا ہے۔"

تیمور اس کی پیٹھ تھپتھپاتا ہوا اپنے خیمے میں چلا گیا۔

○

خانی ماں نے جس طرح الجائی خاتون کو الجھن میں ڈال دیا تھا اسی طرح گل عذار بھی ان کی وجہ
میں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ تیمور تاتاری لڑکیوں کی واپسی کے سلسلے میں خیمہ گاہ آیا ہے اور مغل قیمت
ان لڑکیوں کی واپسی پر رضامند ہو گئے ہیں۔ وہ بھی اسیر لڑکی تھی۔ تیمور اسے بھی واپس لے جا سکتا تھا
کون بتلائے گا کہ اسے خانی ماں نے اپنی بیٹی بنا کر اپنی محبت اور شفقت کے پنجرے میں بند کر رکھا
بھی نہیں کر سکتی۔ فریاد سے بھی مجبور ہے۔

خانی ماں کی عدم موجودگی میں گل عذار نے سسکیوں اور آنسوؤں کے درمیان اپنی
کو سنا دی تھی۔ تبتی لڑکی بھی اسی کی طرح قید تھی لیکن ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ تبتی لڑکی مع
قیدی بنا لی گئی تھی۔ اس کے ماں باپ اور دوسرے عزیز و اقارب، مغلوں کے گھریلو ملازم بن گئے
لڑکی کو ان سے مہینے میں صرف ایک بار ملنے کی اجازت تھی۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھتی تھی۔ یہ اجازت

کی سفارش پر حاصل ہوئی تھی۔

گل عذار بالکل ہی مجبور تھی۔ اپنے شہر سے دور۔ ماں باپ بہن بھائیوں سے دور۔ اس کا شوہر حجلۂ عروسی
میں اس کا گھونگھٹ بھی نہ اٹھا سکا تھا کہ وہ ظالموں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر خیمہ گاہ پہنچا دی گئی۔ وہ تو خدا نے کرم کیا کہ
خانی ماں اپنے ساتھ لے آئیں۔ ورنہ معلوم نہیں اس کا کیا حال ہوتا۔

گل عذار کی کہانی اس قدر دردناک تھی کہ تبتی کنیز بھی اس کے ساتھ رونے لگی۔ اس نے گل عذار کی
یہ درخواست بھی منظور کر لی تھی کہ وہ صبح کو کسی بہانے تیمور کے سواروں تک پہنچے گی اور ان سے شہر سبز
کے ظفریاب کے بارے میں معلوم کرے گی۔ یہ کام جان جوکھوں کا تھا مگر تبتی کنیز اس کے لیے بھی تیار ہو گئی۔

پھر گل عذار نے خود ہی یہ ارادہ بدل دیا۔ اسے اس میں سراسر اپنی خود غرضی نظر آئی۔ اگر تبتی کنیز پکڑی گئی
اور اسے قتل کر دیا گیا تو یہ خون اُس کی گردن پر ہو گا۔

گل عذار نے یہ بھی سوچا کہ اگر تبتی لڑکی نہ بھی قتل کی گئی اور یہ راز کسی طرح کھل گیا تو پھر خانی ماں اس
کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گی۔ وہ اسے ضرور احسان فراموش سمجھیں گی۔ ممکن ہے کہ وہ اسے اپنے سے الگ
کر کے کسی اور مغل کے حوالے کر دیں۔ وہ اس خیال سے ہی تھرا اٹھی اور اس نے تبتی لڑکی کو تیمور کی طرف
بھیجنے کا خیال چھوڑ دیا۔

گل عذار اپنی قسمت پر صبر شکر کر کے بیٹھی تھی کہ خانی ماں کی گاڑی خیمے پر آ کر رکی۔ گل عذار بڑی امیدوں کے
ساتھ بھاگ کر دروازے پر گئی۔ خانی ماں گاڑی سے اتر کر دروازے پر آ چکی تھیں۔ گل عذار نے تجسس بھری
نظروں سے انہیں دیکھا لیکن خانی ماں کھوئی کھوئی سی خیمے میں داخل ہو گئیں۔ گل عذار دل مسوس کر رہ گئی۔ اس کی
امیدوں کے تارے ٹوٹ گئے۔ وہ صبر کر کے دل پر جبر کر کے رہ گئی۔ اس نے خانی ماں سے یہ امید کیوں باندھی
کہ وہ اسے رہا کر کے مغویہ لڑکیوں کے ساتھ اس کے گھر بھیج دیں گی۔ خانی ماں کو اس کے گھر اور گھر والوں سے
کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ انہیں تو صرف گل عذار سے محبت تھی۔ اس محبت میں ان کی ضرورت بھی شامل تھی۔ گل
عذار جن نظروں سے ان کی خدمت کرتی تھی وہ کسی کنیز سے ممکن نہ تھی۔ گل عذار تو ایک فرمانبردار بیٹی کی طرح ان کی ہر
ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ اس نے خانی ماں کو "ماں" کا درجہ دیا تھا۔ ان کی شفقت اس کی حقدار بھی تھی۔

گل عذار دیر تک بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ اسے کسی پہلو چین نہ آ رہا تھا۔ ایک بار تو اس کے دل
میں اچانک یہ خیال آیا۔ کیوں نہ وہ بھاگ کر تیمور کے خیمے میں پہنچ جائے۔ تیمور شہر سبز کا رہنے والا ہے۔ وہ اسے

ضرور پہچان لے گا۔ لیکن ـــ لیکن کیا وہ تیمور تک پہنچ سکے گی؟ خانی ماں کے محافظ اسے کیوں جانے دیں گے؟ وہ پکڑی جائے گی۔ پھر ـــ اور پھر ـــ!

وہ آگے نہ سوچ سکی۔

اس کا دماغ الجھ کر رہ گیا۔ اس کی نظریں خیمے کی مخروطی چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ زبردستی آنکھیں بند کر کے اس نے سونے کی کوشش کی لیکن خیالات کا لامتناہی سلسلہ اس کے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے تھا۔ ایسے میں نیند کیسے آتی۔

خانی ماں نے واپسی پر اس سے ایک بات بھی نہ کی۔ کیا وہ ناراض ہیں؟ اس نئے خیال نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ جھپکتی ہوئی پلکیں پھر کھل گئیں۔

پتہ نہیں رات کتنی گزر چکی تھی کہ اس نے خانی ماں کی آواز سنی۔

"گل عذار۔ سو گئی کیا؟"

گل عذار کی آنکھوں سے تو نیند کوسوں دور تھی:

"نہیں خانی ماں"۔ اور وہ دوڑتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"آپ اب تک جاگ رہی ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" گل عذار دو زانو ہو کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

خانی ماں کی آنکھوں کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور وہ بھی خیمے کی چھت کو اس طرح گھور رہی تھیں جیسے گل عذار دیر تک دیکھتی رہی تھی۔

"تو بھی تو نہیں سوئی ابھی؟"

خانی ماں نے پلکیں جھپکائیں:

"تو کیوں جاگ رہی ہے اب تک؟"

گل عذار کا دل رو پڑا۔ جی چاہا کہ خانی ماں سے لپٹ کر خوب روئے اور سینہ چیر کے اپنا دل دکھا دے لیکن اس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگ گئی۔ آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں تک آ گیا تھا۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

"میں آج دعوت میں گئی تھی"۔ خانی ماں کی آواز گھٹی گھٹی تھی۔ "تاتاری سردار تیمور کی بیوی مجھ سے ملی تھی

"خاتونِ آغا"۔ گل عذار کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا اور شہر سبز کا پورا نقشہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ خاتون آغا سے کئی بار مل چکی تھی۔ اس نے پانچ سال پہلے خاتون آغا کو آخری بار دیکھا تھا۔ اس وقت خاتون آغا کے ہاں پہلا بچہ جہانگیر پیدا ہوا تھا۔

"ہاں خاتونِ آغا"۔ خانی ماں کی آواز دور کہیں غاروں سے آتی ہوئی سنائی دی۔

گل عذار کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس نے جھک کر خانی ماں کو دیکھا۔ فانوس کی روشنی ان کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی اور شاید نمی بھی لرز رہی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھیں خاتونِ آغا"۔ گل عذار نے بڑے چاؤ سے پوچھا۔

"جا سو جا گل عذار۔ رات بہت گزر چکی ہے"۔ خانی ماں نے ایک دم آنکھیں بند کر لیں۔ ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ شکنیں گہری ہو گئیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ خانی ماں کسی اندرونی درد یا کرب کو دبانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

گل عذار ہکا بکا انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ خانی ماں نے اسے کیوں بلایا۔ خاتون آغا بانو خاتون کا ذکر کس لیے کیا اور اب سونے کا حکم کیوں دے رہی ہیں۔

گل عذار نے ان سوالوں کا جواب خانی ماں سے پوچھنا چاہا لیکن وہ تو آنکھیں بند کیے چپ چاپ لیٹی تھیں۔ ناچار گل عذار بھاری قدموں سے اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

○

شہزادہ الیاس خواجہ خان کا دربار لگ گیا۔ ایک چھوٹے سے سبزہ زار میں قالینوں کا فرش بچھایا گیا۔ بیچ میں سفید سے کی مسند پر الیاس خواجہ بیٹھا تھا۔ دائیں طرف تیمور اور بائیں جانب بیک خجند سامنے دائرے میں الیاس خواجہ کے دوسرے سردار بیٹھے تھے۔ ظفر یاب مغل سرداروں کے پیچھے ایک کونے میں کھڑا تھا۔

الیاس خواجہ نے گزشتہ شام ہی اعلان کرا دیا تھا کہ مغویہ تاتاری لڑکیوں کو صبح کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ تیمور کا خیال تھا کہ خیمہ گاہ میں زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس تاتاری لڑکیاں ہوں گی لیکن اسے رات

مطلع کی گیا کہ خیمہ گاہ میں تقریباً تین سو لڑکیاں موجود ہیں جو صبح کو تیمور کے حوالے کر دی جائیں گی۔

تیمور کو تعجب بھی ہوا اور اپنی بے بسی پر افسوس بھی ہوا غصے سے اس کا خون کھول گیا۔ اسے مغلوں کے علاوہ تاتاریوں پر غصہ آیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ تاتاری ذہنی طور پر مغلوں کے غلام ہو چکے ہیں اور ان کا خون اس حد تک سرد پڑ گیا ہے کہ اب وہ اپنے ناموس کی حفاظت کی پروا بھی نہیں کرتے۔

ظفریاب پیچھے اس لیے بیٹھ گیا تاکہ وہ مغویہ لڑکیوں کو دیکھ سکے۔ اس کے دل میں امید کے چراغ ایک بار پھر جل اٹھے تھے۔ مغل چھاؤنیوں پر اسے ناکامی ہوئی تھی۔ خیمہ گاہ وہ آخری جگہ تھی جہاں گل عذار کی بازیابی کا زیادہ امکان تھا لیکن جب وہ اس امکان پر غور کرتا تو یہ خیال اس کا راستہ روک لیتا کہ مغلوں کا اصل مرکز حصار المالیق ہے ممکن ہے کچھ لڑکیاں وہاں بھیج دی گئی ہوں۔ انسان امید کے سہارے زندگی گزارتا ہے پھر وہ اللہ کی ذات سے کیوں ناامید ہو جس نے اسے یہاں تک پہنچایا ہے۔ وہ اسے حصار المالیق تک بھی پہنچا سکتا ہے۔ ظفریاب نے اپنے دل کو تسکین دی۔

مغویہ لڑکیاں آنا شروع ہوئیں جن مغلوں نے یہ لڑکیاں خریدی تھیں وہ لڑکیوں کے ساتھ تھے۔ لڑکیاں بہت خوش تھیں۔ ان کے چہرے مسرت سے کھلے ہوئے تھے۔ جب ان کے مالک خشمگیں نظروں سے انہیں دیکھتے تو وہ خوفزدہ ہو کر نظریں نیچی کر لیتی تھیں۔

مغلوں کو اس بات پر غصہ تھا کہ ان کا خریدا ہوا مال ان سے زبردستی چھینا جا رہا ہے۔ لڑکیوں کو انہوں نے رقم دے کر حاصل کیا تھا۔ انہیں اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ تیمور نے لڑکیوں کی قیمت واپس کرنے کا اعلان کیا ہے۔ الیاس خواجہ نے بھی تیمور کے اس اعلان پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ وہ تو یہ سمجھا تھا کہ تیمور نے اپنا وقار بحال اور برقرار رکھنے کے لیے اس قسم کا اعلان کر دیا تھا لیکن تیمور اس معاملے میں سنجیدہ تھا۔ اس کا قول تھا کہ دولت اس لیے ہوتی ہے کہ اسے صحیح وقت پر خرچ کیا جائے۔ اس کے خیال میں دولت کے صرف کا یہ موقع تھا۔ وہ اپنے ساتھ سونے کے سکوں اور جواہرات کی تھیلیاں لایا تھا جو اس کے گھوڑے کی زین سے بندھی ہوئی تھیں۔

بیک جک کو اپنی سپہ سالاری کی فکر تھی۔ اس لوٹ مار میں اس کا سب سے بڑا ہاتھ تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ خانِ اعظم کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ ناراض ہو کر اسے اس عہدے سے ہٹا دے یا بلحصار المالیق واپس بلا لے۔ وہ رات بھر اپنے خاص دستے کے ساتھ خیمہ گاہ میں گھومتا رہا تھا اور ایک ایک

کرا تا رہا تھا کہ اگر کسی مغل نے تاتاری لڑکی کی واپسی سے انکار کیا یا اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تو اسے خانِ اعظم کا باغی تصور کیا جائے گا۔ باغی کی سزا کم از کم موت تھی۔

اس کی اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور صبح ہوتے ہی کنیزیں خریدنے والے اپنی اپنی کنیزوں کو ساتھ لیکر میدان میں جمع ہو گئے۔

الیاس خواجہ نے اعلان کیا:

"تاتاری لڑکیوں کو ایک ایک کر کے حاضر کیا جائے"۔

الیاس خواجہ کا اعلان بیک جک کے ذریعے اعلانچی تک پہنچا اور اعلانچی نے میدان میں جا کر لوگوں کو آگاہ کر دیا۔

ایک تنومند مغل ایک تاتاری لڑکی کو ساتھ لے کر دربار کے فرش تک پہنچا۔ اس نے تیمور کو قہر بھری نظروں اور حقارت بھری آواز میں بولا:

"میں اس کنیز کو چھوٹے خان کے حکم پر قربان کرتا ہوں"۔ اور اس نے ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کی طرف دھکیل دیا۔

"ٹھہرو مغل لشکری"۔ تیمور نے واپس جاتے مغل کو آواز دی۔

اس کے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر تیمور کو دیکھا۔

"کیا چاہیے۔ میں نے صرف یہی ایک لڑکی خریدی تھی"۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"مغل برادر۔ تم نے اس کی کیا قیمت ادا کی تھی؟" تیمور قدم بڑھا کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا تم قیمت واپس کر دو گے"۔ مغل اسے گھورنے لگا

"ہاں برادر"۔

اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا:

"مال واپس لیا جائے تو قیمت بھی واپس کی جاتی ہے"۔

اس نے تیمور کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ رقم بتائی جو اس نے نیلامی کے وقت ادا کی تھی۔ تیمور نے ظفریاب کو اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ ظفریاب تیمور کے گھوڑے کی طرف چلا جو دربار سے ذرا ہٹ کر بندھا ہوا تھا۔

"مغل برادر"۔

تیمور نے اسے رکنے کے لیے کہا:

"تمہارے کہنے کے مطابق میں تمہیں قیمت واپس کر رہا ہوں لیکن اگر تم چاہو تو میں تمہیں وہ رقم دے سکتا ہوں جو تم نے اب تک اس کے کھانے پر خرچ کی ہے"۔

مغل کو پہلے تو تعجب ہوا پھر شاید اس کی رگ پھڑک گئی۔ ترشی سے بولا:

"نہیں۔ مجھے بھیک نہیں چاہیے"۔

ظفر یاب تھیلیاں لے کر واپس آ گیا۔ تیمور کے بتانے پر اس نے مطلوبہ رقم مغل کو گن کر دی۔ آزاد ہونے والی لڑکی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

مغل واپس جانے لگا تو تیمور نے اسے پھر روکا۔

"برادر"۔

تیمور نے ایک جگمگاتا ہیرا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیرا میں تمہاری نذر کرتا ہوں"۔

مغل کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ہیرے کی چمک دمک دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"لے لو برادر۔ یہ بھیک نہیں۔ ایک بھائی کا دوسرے بھائی کو تحفہ ہے"۔

مغل نے تیمور کے ہاتھ سے ہیرا اچک لیا پھر تیز قدموں سے واپس ہوا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں تیمور ہیرے پر اپنا حق جتا کر اس سے لے نہ لے یا پھر حکومت کا حصہ نہ طلب کر لے۔ مغلوں کو لوٹ مار کے مال کا حصہ حکومت کے خزانے میں جمع کرانا پڑتا تھا۔

الیاس خواجہ یہ تماشا دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ہیرے کی چمک نے اس کی آنکھیں بھی خیرہ کر دیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیک جک کے ساتھ تیمور کے پاس آ کھڑا ہوا۔

تاتاری لڑکیاں اپنے آقاؤں کے ساتھ آتی رہیں۔ تیمور ہر مغل سے اس کی ادا شدہ رقم دریافت کرتا اور ظفر یاب اس کی ادائیگی کرتا۔ پھر تیمور جواہرات کی تھیلی میں ہاتھ ڈال کر ایک قیمتی ہیرا یا موتی مغل کے حوالے کر دیتا۔ مغلوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ ہیرے جواہرات بٹ رہے تھے اور لڑکیاں آزاد ہو رہی تھیں۔ الیاس خواجہ اور بیک جک اس تقسیم کو لالچ بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اب انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے یہ دولت خود ہی کیوں نہ وصول کر لی۔

جب کوئی نئی لڑکی آتی تو تیمور کی نظر ظفر یاب کے چہرے پر جاتی لیکن اس کی افسردگی ہر نئی لڑکی کی آمد پر بڑھ جاتی۔

تیمور نے قیمت ادا کر کے تمام لڑکیوں کو آزاد کرا لیا۔ اسے لڑکیوں کی رہائی کی بہت خوشی تھی لیکن جب اس کی نظر ظفر یاب کے چہرے پر پڑتی تو وہ افسردہ ہو جاتا۔

"کوئی اور تاتاری لڑکی باقی تو نہیں رہ گئی؟" تیمور نے ظفر یاب کی خاطر الیاس خواجہ سے سوال کیا۔

الیاس خواجہ نے بیک جک کی طرف دیکھا۔ اس نے جواب دیا:

"نہیں۔ اب کوئی تاتاری لڑکی خیمہ گاہ میں موجود نہیں ہے۔ میں نے حکم دے دیا تھا کہ اگر کسی مغل نے کسی تاتاری لڑکی کو چھپانے کی کوشش کی تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ کس میں ہمت ہے کہ وہ میرے حکم کی تعمیل نہ کرے"۔

تیمور نے ظفر یاب کو دیکھا۔ ظفر یاب کیا کہتا، صرف سرد آہ بھر کے رہ گیا۔

"ظفر یاب ہماری کوششیں جاری رہیں گی"۔

تیمور نے الیاس خواجہ اور بیک جک کی موجودگی کی وجہ سے بند بند الفاظ میں اسے تسلی دی:

"تم ان لڑکیوں کو لے جاؤ اور ان کے لیے سواری کا انتظام کرو"۔

ظفر یاب نے وہ تھیلیاں جو ابھی تک کھلی بھی نہ تھیں، تیمور کے اشارے پر فرش پر رکھ دیں اور سر جھکائے ہوئے لڑکیوں کی طرف چلا گیا۔

تیمور نے وہ تھیلیاں وہیں پڑی رہنے دیں اور الیاس خواجہ کے ساتھ نشست گاہ پر واپس آ گیا مگر وہ چپ چپ تھا۔

"سردار تیمور"۔

الیاس خواجہ نے اسے افسردہ دیکھ کر پوچھا:

"تم کچھ فکرمند ہو۔ کیا تمہیں تاتاری لڑکیوں کی رہائی کی خوشی نہیں ہوئی"۔

"کیوں نہیں شہزادۂ معظم"۔ تیمور نے فکرمند چہرہ اوپر اٹھایا:

"مجھے بہت خوشی ہے لیکن ابھی کچھ تاتاری لڑکیاں مغلوں کی قید میں ہیں۔ ان کی تلاش ضروری ہے اور

"مجھے تلاش جاری رکھنا پڑے گی۔"

ایلیاس خواجہ کو طیش آ گیا:

"تم ہم پر بددیانتی کا الزام لگا رہے ہو۔ ہم نے تمام لڑکیاں واپس کر کے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ تمہیں یہ حق نہیں دے سکتے کہ تم ہماری نیت پر شبہ کرو۔"

"ہرگز نہیں شہزادۂ عالی مقام!"

تیمور نے فوراً بات کو سنبھالا:

"آپ پر شبہ کرنا خود اپنے اوپر شک کرنے کے مترادف ہے۔ ممکن ہے کہ وہ لڑکیاں آپ کے علم ہوں اور آپ کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ اس وقت کہاں اور کس کی قید میں ہیں۔"

"تیمور، معلوم ہوتا ہے تمہیں مجھ پر شبہ ہے۔"

بیک جک نے جھلا کر دخل دیا:

"لڑکیوں کی بازیابی کی ذمہ داری شہزادے نے میرے سپرد کی تھی۔ میں اس الزام کو برداشت نہیں میں تمہارا شک اس طرح دور کر سکتا ہوں کہ تمہیں مغلوں کے ہر خیمے میں لے چلوں اور تم ہر خیمے میں جا کر اطمینان کر لو۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میرے الفاظ سے آپ کے وقار کو صدمہ پہنچا۔ میں اس کے لیے معذرت بھی کرتا"

تیمور نے معاملے کو سنبھالنے کے لیے لچک پیدا کی:

"میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ممکن ہے کچھ لڑکیوں کو اغوا کر کے خیمہ گاہ کے بجائے براہِ راست آپ صدر مقام حصار المالیق پہنچا دیا گیا ہو جس کا آپ کو علم نہ ہو۔"

تیمور کی یہ بات واقعی قابلِ غور تھی۔ حالانکہ اس نے تو یہ بات محض اپنی صفائی میں کہی تھی۔ ایلیاس خواجہ اور بیک جک کے پاس اس کا معقول جواب نہ تھا۔

آخر کچھ سوچ کے ایلیاس خواجہ نے کہا:

"تیمور، بظاہر یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ ملک تاتار میں مقیم کسی مغل کو یہ اجازت نہیں کہ وہ حصار سے براہِ راست کوئی رابطہ قائم کرے۔ وہ تو بغیر اجازت حصار المالیق کا سفر اختیار کر ہی نہیں سکتے۔ پھر بھی ہم یقین دلاتے ہیں کہ اگر کوئی لڑکی یا لڑکیاں حصار المالیق پہنچائی گئی ہیں تو وہ تمہیں واپس کر دی جائیں گی۔"

"ہاں یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔"

بیک جک نے لقمہ دیا:

"یہ ذمہ داری بھی میں قبول کرتا ہوں۔ تیمور تم ہمیں ان لڑکیوں کے نام اور گھر کے پتے لکھ کر دے دو۔ جو اب ہیں میں خود حصار المالیق جا کر واپس لاؤں گا۔"

"ان لڑکیوں کی تعداد اور نام تو فی الحال نہیں بتا سکتا لیکن ان کی مکمل فہرست بہت جلد آپ کو مہیا کر دی"

تیمور نے ٹالنے کے لیے کہا۔

"لیکن ایک لڑکی کے بارے میں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اب تک برآمد نہیں ہو سکی۔ وہ میرے شہر کی رہنے والی ہے۔ اسے عین شادی کے دن اغوا کیا گیا تھا۔ اس کا نام گل عذار ہے اور اس کے شوہر کا ہے۔"

"گل عذار؟"

یہ نام ایلیاس خواجہ اور بیک جک کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ پھر وہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے ان کے لیے نیا نہ تھا۔ اس نام کی تو مغلوں میں داستانیں بن گئی تھیں۔

تیمور کو انہیں حیرت زدہ دیکھ کر پہلے تعجب ہوا۔ پھر غصہ آ گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ گل عذار سے واقف لازم انہوں نے یہ نام پہلے بھی سنا ہے۔ اس نے موقع کی نزاکت کے تحت غصے کو دبایا اور نرمی سے بولا:

"کیا آپ گل عذار کو جانتے ہیں۔ کہاں ہے وہ اس وقت؟"

بیک جک نے نظریں چرا لیں۔

ایلیاس خواجہ نے بڑی افسردگی سے جواب دیا:

"تیمور، ہمیں افسوس ہے کہ گل عذار تمہیں نہیں مل سکتی۔"

"تو زندہ ہے شہزادۂ محترم؟" تیمور کو شبہ ہوا کہ کہیں اسے قتل تو نہیں کر دیا گیا۔

"ہاں۔ زندہ ہے تیمور۔ اس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"یہ بات میرے لیے بڑی طمانیت کا باعث ہے۔"

تیمور نے اطمینان کا سانس لیا:

"اس بات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ گل عذار کسی مضبوط اور محفوظ ہستی کی تحویل میں ہے۔ لیکن شہزادے!"

آپ یہ تو غور فرمائیں کہ اس دلہن کے دل کا کیا حال ہو گا جسے اس کے نقاب اٹھنے سے پہلے اغوا کر لیا گیا ہو کتنے ہی آرام میں رکھا گیا ہو یا اس کی عشرت کا کوئی بھی سامان مہیا کیا گیا ہو، وہ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ اپنے عزیز و اقارب اور وہ شوہر یاد نہ آتا ہو گا جس کی دید کا تصور لیے وہ حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی۔ اس حالِ زار پر بھی آپ نے غور نہیں کیا عظیم بابِ جسے میں نے ابھی لڑکیوں کے ساتھ بھیجا ہے گل عذار ہے۔ وہ اتنے دنوں سے میرے ساتھ یہ امید لیے مارا مارا پھر رہا ہے کہ ایک دن اسے اس کی پیاری بیوی ملے گی۔ اس کی بے چین تنہائیوں اور کربناک زندگی کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر پر چوٹ سی لگتی ہے۔"

"بس کرو تیمور۔"

الیاس خواجہ نے اسے ٹوکا:

"ہمیں تمہاری بات کا یقین بھی ہے اور گل عذار کے شوہر کے ساتھ ہمدردی بھی لیکن ہم مجبور ہیں۔ واپس نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی تحویل میں وہ ہے اس سے واپس لینا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔"

"تو میرا یہ خیال درست ہے کہ گل عذار کو خانِ اعظم کے پاس بھیج دیا گیا ہے۔"

تیمور نے اپنے شبہ کی تصدیق کے لیے کہا:

"اگر ایسا ہوا ہے تو آپ فکر نہ کریں۔ میں خود حصار امالیق جا کر خانِ اعظم سے گل عذار کی واپسی کی درخواست کروں گا۔"

"ایسا بھی نہیں ہے تیمور۔"

الیاس خواجہ نے اس کے شبہ کی تردید کی:

"گل عذار اسی خیمہ گاہ میں موجود ہے لیکن ہم اسے کسی قیمت پر حاصل نہیں کر سکتے۔"

"معزز شہزادے!"

تیمور نے ایک نئی پیش کش کی طرف اشارا کیا:

"دولت وہ طاقت ہے جس کے زور سے پہاڑ بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ اس امیر کو بلوائیے جس نے گل عذار کو خریدا ہے میں اسے منہ مانگی قیمت ادا کر دوں گا۔ سامنے پڑی ہوئی تمام دولت کی تھیلیاں میں اسے پیش کر دوں گا۔ امید ہے وہ انکار نہ کر سکے گا۔"

الیاس خواجہ مسکرایا۔ اس کے ساتھ ہی بیک جک کا بے ڈھنگا قہقہہ بلند ہو گیا:

تیمور تم غلطی پر ہو۔ ہر مغل لالچی یا طمع کا بندہ نہیں ہوتا۔ گل عذار خانِ اعظم کی بہن اور میری پھوپی خانی ماں ہے اور اس گھر میں، میں تو کیا خانِ اعظم بھی ان کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ وہ محترم ترین بزرگ ہستی ہیں۔ انہوں نے مجھے دودھ پلایا ہے اور بچے کی طرح پرورش کی ہے۔ گل عذار کو آنکھ کی پتلی بنا کر رکھا ہے۔ میں پتلی کو آنکھ سے جدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ گل عذار کے بارے میں کوئی بات نہ کرو تیمور۔ ہم بالکل مجبور ہیں۔ اگر تمام دنیا کے لشکر اکٹھا ہو کر گل عذار کو حاصل کرنا چاہیں تو بھی انہیں ناکامی ہو گی۔ مغلوں کا بچہ بچہ خانی ماں کے لیے اپنی جان قربان کر دے گا۔"

"خانی ماں!"

تیمور نے زیرِ لب دہرایا:

"شہزادۂ معظم! جہاں تک میرا خیال ہے۔ بزرگ خاتون خانی ماں کے سینے میں ایک شفیق و مہربان دل ہے۔"

الیاس خواجہ چونک پڑا:

"تم خانی ماں کو جانتے ہو تیمور؟"

پھر اس کی نظریں تیمور سے ہٹ کر بیک جک کے چہرے پر پہنچ گئیں۔ اس نے سوچا شاید اس نے ان کے بارے میں تیمور کو بتایا ہو۔

"ہاں شہزادے الیاس خواجہ۔"

تیمور نے اعتراف کیا:

"میں خانی ماں کو جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے دل میں تاتاریوں کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات ہیں۔"

"لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا۔ کس نے بتایا تم کو؟"

الیاس خواجہ پھر بیک جک کو تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ بیک جک غالباً الیاس خواجہ کی نظروں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ وہ خاموش رہا اور الیاس خواجہ سے نظریں ملانے کے بجائے تیمور کی طرف دیکھنے لگا۔

"کل رات میری بیوی کو خانی ماں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔" تیمور نے انکشاف کیا۔

"میری بیوی کا بیان ہے کہ خانی ماں جس قدر بزرگ اور باعظمت ہیں اسی قدر مہربان اور شفیق ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خانی ماں، گل عذار کے شوہر ظفریاب کو بھی جانتی ہیں۔"

الیاس خواجہ کو تیمور کے پہلے جملے سے کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن آخری بات نے اسے پھر الجھن میں ڈال دیا۔

"تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ خانی ماں گل عذار کے شوہر کو جانتی ہیں۔" الیاس خواجہ نے اس سے پوچھا۔

"یقین کرنے کی یہ وجہ ہے کہ خانی ماں نے میری بیوی سے ظفریاب کا نام لے کر پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟"

"اس کا مطلب ہے کہ خانی ماں یہ بھی جانتی ہیں کہ گل عذار کو تمہارے شہر سے اغوا کیا گیا ہے؟"

"اس بات کا بھی قوی امکان ہے شہزادے۔"

تیمور نے کہنا شروع کیا:

"گل عذار ان کے پاس موجود ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے خانی ماں کو اپنی درد بھری کہانی سنائی ہو۔"

"ہوں!"

الیاس خواجہ نے اپنا بڑا سا سر اور چوڑے شانے ہلاتے ہوئے کئی بار "ہوں" کہا۔

"ہر بات ممکن اور ہر امکان موجود ہے لیکن یہ بات ناممکن ہے کہ خانی ماں گل کو اپنے ... انھوں نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ ... ماں اپنی بیٹی کو کس طرح چھوڑ سکتی ہے۔ ہم تمہاری ... نہیں کر سکتے۔"

الیاس خواجہ نے تیمور کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ لیکن تیمور، مولانا زین الدین کا تربیت یافتہ ... ہر بات میں جرح کرتے تھے۔ تیمور نے بھی وہی وتیرہ اختیار کیا۔ بولا:

"ٹھیک ہے شہزادے بہادر۔ آپ میری مدد نہ کیجیے لیکن آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مجھے خانی ... سامنے پیش کر دیں۔"

"تیمور بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

الیاس خواجہ نے بُرا سا منہ بنایا:

"میں تمہیں اس بیکار کوشش کی بھی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں خانی ماں کی نظروں سے گرنا ...

شہزادے عالی مقام۔"

تیمور نے پھر اپنی بات پہ زور دیا:

"کوشش کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ مجھے اس کی اجازت ہونا چاہیے۔"

الیاس خواجہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا۔ اس آخری وقت پر وہ تیمور سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر اس کے ... تیمور کو ٹالنے کی ایک ترکیب آ گئی۔ اس نے کہا:

"ہم خانی ماں کے پاس تمہاری درخواست بھیجیں گے۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو آج شام یا ... تمہیں ان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔"

تیمور شکریہ ادا کر کے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ جب اپنے خیمے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے سوار گھوڑوں پر زینیں کس رہے ہیں۔ اس نے ... یا:

"زینیں کھول دی جائیں۔ ہم آج رات یا کل اسی وقت کوچ کریں گے۔"

تیمور کے سوار حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے مگر کسی نے پوچھنے کی کوشش نہ کی۔ انہیں پوچھنے کی ... ت بھی نہ تھی۔ انہیں تیمور پر پورا اعتماد تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا سردار جو قدم اٹھاتا ہے اس میں کوئی نہ ... علت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔

الجائی خاتون نے بھی اس سے تاخیر کی وجہ نہ پوچھی۔ وہ تاتاری لڑکیوں کے رہا ہو جانے سے اس قدر ... تی کہ پھولے نہ سماتی۔ لڑکیوں کی سواری کے لیے الیاس خواجہ نے گھوڑے بھجوا دیے تھے۔ الجائی لڑکیوں ... ہلے ان سے شام تک ہنستی بولتی رہی۔ ایک دو بار تیمور کا سامنا بھی ہوا لیکن وہ باہر کے معاملات میں ... دیا کرتی تھی اور جب تک تیمور اس سے خود بات نہ کرتا وہ خواہ مخواہ سے نہ کریدتی تھی۔ اس نے یہ ضرور ... لیا کہ تیمور آج معمول سے کچھ زیادہ ہی خاموش ہے۔ پھر بھی اس نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

○

رات ہو گئی۔ خیموں میں چراغ روشن کر دیے گئے۔ الجائی خاتون لڑکیوں کے پاس سے اٹھ کے اپنے

خیمے میں آ گئی۔ لڑکیوں کی رہائش کے لیے مزید خیمے آ گئے تھے وہ اپنے خیموں میں چلی گئیں۔

رات گزرتی جا رہی تھی لیکن تیمور اب تک اپنے خیمے میں نہیں آیا تھا۔ الجائی کو پریشانی اور خطرے کا احساس ہوا۔ مغلوں نے اگرچہ لڑکیاں آزاد کر دی تھیں لیکن یہ لوگ اب تک مغل خیمہ گاہ میں تھے اور کسی بھی وقت کوئی حادثہ پیش آ سکتا تھا۔

وہ اسی الجھن میں تھی کہ تیمور سر جھکائے ہوئے خیمے میں داخل ہوا۔ اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ الجائی اس کا اسلحہ اتارنے کے لیے آگے بڑھی۔ رات کو الجائی، تیمور کا اسلحہ اتارنے میں مدد دیتی تھی۔

"ابھی رہنے دو خاتون آغا۔"

تیمور نے نظریں اٹھا کر الجائی کو دیکھا۔

"ہو سکتا ہے کہ ہمیں جنگ کرنا پڑے۔"

اتنا سننا تھا کہ الجائی خاتون نے تیزی سے بڑھ کر اپنی چھوٹی تلوار اٹھالی۔ خنجر کمر سے لگایا اور تیمور کے سرہانے جا کر بیٹھ گئی۔

"گھوڑے تیار ہیں ہمارے۔" الجائی نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے سواروں کو بھی تیار رہنے کا حکم دے دیا ہے۔"

تیمور اٹھ کر خیمے کے دروازے تک گیا۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کے سوار اپنی پوری تیاری کے ساتھ اپنے اپنے گھوڑوں کے قریب کھڑے تھے۔ جلتے ہوئے الاؤ کی روشنی میں، اس وقت ان کی صورتیں خوفناک اور پُراسرار دکھائی دے رہی تھیں۔

"گل عذار خیمہ گاہ میں موجود ہے۔" تیمور واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

"ظفر یاب کی دلہن گل عذار۔" الجائی نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں خاتون آغا۔"

تیمور کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا۔

"تم خانی ماں سے ملی تھیں۔ گل عذار ان کے پاس ہے۔ الیاس خواجہ نے اس کی واپسی سے صاف انکار کر دیا ہے۔"

الجائی حیرت سے تیمور کا منہ دیکھنے لگی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی:

"یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ خانی ماں نے مجھ سے ظفر یاب کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے ٹالنا چاہا لیکن ان کے اصرار پر میں نے گل عذار کے اغوا کی تفصیل بیان کر دی مگر وہ ایک دم چپ ہو گئیں۔ آخر تک مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ ان کے جاتے وقت میں سلام کے لیے بھی گئی لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔"

تیمور اپنے خیالات میں گم تھا۔ اس نے شاید الجائی کی باتیں سنی ہی نہیں۔ الجائی نے بھی اس کے خیالات کا سلسلہ نہ توڑا اور چپ ہو رہی۔

وہ رات خانی ماں کے گھر میں بھی کچھ عجب طرح سے گزری۔ خانی ماں نے بھی حکم دے دیا کہ ان کے کمرے میں کوئی نہ آئے۔ گل عذار اپنے کمرے میں منہ لپیٹ کے پڑ رہی۔ اسے امید تھی کہ دعوت سے واپسی پر خانی ماں اسے کچھ بتائیں گی لیکن انہوں نے یہ حکم دے کر گل عذار کا داخلہ بھی بند کر دیا۔

بڑی رات گئے گل عذار پر نیند کا غلبہ ہوا اور اس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ اس وقت اسے باہر کچھ کھٹکا محسوس ہوا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔ اس کی نظر خانی ماں کے کمرے پر پڑی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ان کے پاس امیر الیاس خواجہ خان بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہے۔

خانی ماں اور الیاس خواجہ میں تقریباً ایک گھنٹے تک بڑے رازدارانہ انداز میں گفتگو ہوتی رہی۔ پھر الیاس باہر واپس چلا گیا اور خانی ماں کے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

گل عذار بھی بستر پر لیٹ گئی اور قسمت کی ستم ظریفیوں پر غور کرتے کرتے نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

○

تیمور کے محافظ رات بھر اپنے خیموں کے گرد پہرہ دیتے رہے۔ باقی سوار بھی اسلحہ لگائے جاگتے رہے اور الجائی نے بھی رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

تیمور نے ایک دو بار خیمے سے نکل کر مغل خیمہ گاہ کی طرف نظریں دوڑائیں مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ ایک دو بار محسوس ہوا جیسے خیمہ گاہ میں لوگ چل پھر رہے ہیں حالانکہ گزشتہ رات وہاں مکمل خاموشی تھی۔ یہ غیر معمولی بات نے اسے چوکنا کر دیا لیکن صبح تک کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔

رات تو خیریت سے گزر گئی لیکن تیمور پریشان تھا کہ الیاس خواجہ کی طرف سے اب تک کوئی جواب کیوں نہیں آیا۔ اگر خانی ماں نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا تو یہ خبر اسے رات ہی مل جانی چاہیے تھی لیکن اب تو دن ہو گیا تھا اور سورج نکلنے والا تھا۔

تیمور انہی خیالات میں غرق تھا کہ اسے خیمے کے باہر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا۔ اس کا غلام دروازے پر کھڑا تھا۔ شاید تیمور کو آواز دینے والا تھا۔

"سردار محترم! مغل شہزادہ آرہا ہے۔" اور غلام نے مغل خیمہ گاہ کی طرف اشارا کیا۔

تیمور اس طرف دیکھنے لگا۔ غلام کی آواز اس کے کانوں میں آئی:

"مغل شہزادے نے اطلاع بھیجی ہے کہ وہ آپ سے اسی وقت ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ بہت ضروری گفتگو کرنا ہے۔"

تیمور کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ شہزادے کو کیا ضروری گفتگو کرنا ہے۔ وہ خود یہاں کیوں آرہا ہے۔ اسے دربار میں بلا سکتا تھا۔ وہ شہزادہ ہے، ملکِ تاتار کا حکمران۔ اسے سمرقند کے مقامی حاکم سے ملنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

تیمور کے دماغ میں یہ باتیں گھوم رہی تھیں اور شہزادہ الیاس خواجہ کی شاہانہ سواری آہستہ آہستہ ادھر آرہی تھی۔ الیاس خواجہ بیش قیمت لباس میں ایک ابلق گھوڑے پر سوار تھا۔ جتہ سردار بیک جک اس کے ساتھ پر سوار گھوڑے سے گھوڑا ملائے چل رہا تھا۔ ان کی پشت پر پچاس نیزہ بردار محافظ تھے جن کے نیزوں کے ساتھ ریشمی کپڑے لٹک رہے تھے۔ ان کا لباس بھی قیمتی تھا۔

تیمور اپنے چند سواروں کے ساتھ استقبال کے لیے آگے بڑھا۔

تیمور کے قریب پہنچ کر الیاس خواجہ خان گھوڑے سے اتر پڑا۔ بیک جک اور تمام نیزہ بردار بھی پیادہ ہو لیے۔ الیاس خواجہ مسکراتا ہوا دونوں ہاتھ پھیلا کر تیمور کی طرف بڑھا جیسے وہ اس سے بغل گیر ہونا چاہتا ہو۔ تیمور نے بھی چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی اور ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح لپٹ گئے کہ جیسے دو بچھڑے ہوئے دوست مدتوں بعد ملے ہوں۔

تیمور کے سوار دور کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ خواتین پردوں کی آڑ سے نظارہ کر رہی تھیں لیکن سب حیران و پریشان تھے کہ شہزادے کا یہ التفات اور بے تکلفی کس وجہ سے ہے۔

الیاس خواجہ اور تیمور لپٹے ہوئے تھے اور بیک جک بیٹھ گئے اور وحشیانہ قہقہے تواتر کے ساتھ بلند کر رہا تھا اور وہ اپنے گھوڑے کے گرد اس طرح چکر لگا رہا تھا جیسے رقص کر رہا ہو۔

"تیمور مبارک ہو۔ خانی ماں نے تمہاری بات مان لی۔" الیاس خواجہ نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"الحمد للہ۔"

تیمور کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

"مجھے کب ان کی قدم بوسی کے لیے جانا ہو گا۔"

"قدم بوسی کے لیے نہیں۔ دلہن رخصت کرانے۔" اور الیاس خواجہ ہنسنے لگا۔

"دلہن۔ کس کی دلہن؟"

تیمور نے آگے بھی کچھ کہا لیکن الیاس خواجہ کو کچھ سنائی نہ دیا۔ بیک جک کے بھیانک قہقہوں میں اس قدر شدت اور تسلسل پیدا ہو گیا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور اب تو بیک جک کے قہقہوں میں الیاس خواجہ کے نسبتاً کم خوفناک قہقہے بھی شامل ہو گئے تھے۔

بیک جک یونہی قہقہے لگاتا تیمور کے پاس آیا اور بولا:

"میں نہ کہتا تھا کہ ہماری خانی ماں آسمانی روحوں جیسی مقدس ہیں۔ تم ظفر یابؔ کی برات لے چلو۔ خانی ماں اپنے ہاتھوں سے دلہن رخصت کریں گی۔"

خانی ماں کے خیمے میں الیاس خواجہ اور خانی ماں میں رات بھر یہی خاموش کھچڑی پکتی رہی تھی۔ خانی ماں کے سامنے ایک طرف ان کی گل عذار سے محبت تھی۔ دوسری طرف گل عذار کے مستقبل اور اس کی خوشی کا معاملہ تھا۔ آخر خانی ماں نے گل عذار کے حق میں فیصلہ کیا اور الیاس خواجہ کو حکم دیا کہ مسرت کا یہ پیغام لے کر وہ خود تیمور کے پاس جائے اور اسے ظفر یاب کی برات چڑھانے کے لیے کہے۔

الیاس خواجہ پیغام دے کر واپس چلا گیا۔

ایک گھنٹے کی تیاری کے بعد تیمور نے ظفر یاب کی دھوم دھام سے برات چڑھائی اور اپنے بیس سواروں کے ساتھ مغل خیمہ گاہ کی طرف چلا۔

اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پوری خیمہ گاہ کو ایک رات کے مختصر عرصہ میں آراستہ و پیراستہ کر دیا گیا تھا۔ لوگ دو رویہ برات کے استقبال کے لیے کھڑے پھول بکھیر رہے تھے۔ کئی مقامات پر چاندی بھی نچھاور

کی گئی۔ خانی ماں کے گھر پر تمام معزز مغل سردار الیاس خواجہ کے ساتھ برات کے استقبال کو کھڑے تھے۔ خانی ماں کا خیمہ بھی خوب آراستہ کیا گیا تھا اور کیوں نہ آراستہ کیا جاتا۔ آخر خانی ماں کی بیٹی کی شادی تھی۔

خیمے کے اندر تمام بڑی بڑی بیگمات اور معزز خواتین دلہن کے گرد اکٹھا تھیں۔ دلہن کو اس قدر زیور پہنایا گیا تھا کہ وہ حرکت بھی مشکل ہی سے کر سکتی تھی۔ خانی ماں کی خوشنودی کی خاطر مغل خواتین نے دلہن کے لیے زیورات کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ تیمور اور اس کے ساتھیوں کی سادے مشروب سے خاطر کی گئی۔ اس نے شراب سے انکار کر دیا تھا۔

رخصتی کے وقت خانی ماں، الگ عذر سے لپٹ کر اتنا روئیں کہ بے ہوش ہو گئیں۔ بڑی مشکل سے انہیں ہوش میں لایا گیا اور دلہن کو ایک آراستہ گاڑی میں رخصت کیا گیا۔

تیمور سمرقند تو خیریت سے پہنچ گیا لیکن کچھ ہی عرصے بعد مغل لشکر پھر سمرقند پر چڑھ آیا اور تیمور کو سمرقند ہی نہیں، ملکِ تاتار بھی چھوڑنا پڑا۔

دلشاد آغا بیگم

دلشاد آغا بیگم واقعی حسین و جمیل عورت تھی۔

تیکھے نقوش، کھنچے ابرو، بھاری پلکیں، عمر بائیس سال کے قریب۔ جاذب نظر ایسی کہ دیکھنے والا ...ر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گھر میں شوہر کے سامنے رنگین تتلی کی طرح اڑتی پھرتی لیکن میدانِ جنگ میں ...لہ جوالہ بن جاتی۔ بجلی کی طرح چمکتی۔ بادل کی طرح گرجتی۔ چھوٹی کمان سے اس تیزی سے تیر برساتی جیسے ...سے گولیاں نکلتی ہیں۔ اس کا نشانہ بہت کم خطا ہوتا۔ میدے جیسے مرمریں ہاتھ سے جب نیزہ پھینکتی تو ...ت نیزے سے آگے آگے بھاگتی۔

وہ امیر حسین کی بیوی تھی۔

امیر حسین، امیر قزعن کا پوتا اور الجائی خاتون کا بھائی تھا۔ دبلا پتلا، گٹھیلا مگر بڑا ہٹیلا جوان تھا۔ ...ہمت شخص تھا اور بیوی کا عاشق اور محبوب بھی۔

دلشاد آغا اس کی الٹ تھی۔ بُردبار، سنجیدہ اور دور اندیش۔ ایک طرف ناز و غمزے سے تیر چلاتی تو ...ری طرف مصیبت کے دنوں میں شوہر میں حوصلہ پیدا کرتی۔ دورانِ جنگ اس کے گھوڑے سے گھوڑا ...ر دشمن کا مقابلہ کرتی۔ اسے نیک مشورے دیتی۔

امیر حسین کابل کا حکمران تھا اور دلشاد اس حکومت میں برابر کی شریک تھی۔ امیر حسین اپنے ماں باپ ...بیٹے ہونے کے سبب سے خود بھی واقف تھا۔ وہ اہم معاملات میں دلشاد سے مشورہ کرتا اور اکثر اس کی رائے پر

عمل کرتا تھا۔

۱۲۷۰ء میں بلادِ شمال کے خانِ اعظم نے ایک بار پھر تاتاری علاقوں کا رخ کیا۔ مغلوں اور تاتاریوں میں معاہدہ تھا لیکن خانِ اعظم اس معاہدے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جنوب میں اتر آیا تھا۔

خانِ اعظم نے امیر حسین کو اپنے زیرِ سایہ کابل پر حکومت کرنے کا پروانہ عطا کیا تھا۔ پھر اس وقت اس کا رخ کابل کی طرف بھی نہ تھا۔ امیر حسین چاہتا تو خانِ اعظم کے سامنے اپنی صفائی پیش کر سکتا تھا کیونکہ اس نے مغلوں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا تھا لیکن یہ ضدی تاتاری حکمران ہر معاملہ تلوار کی زبان سے حل کرنے کا عادی تھا۔ مغلوں کی یلغار کی خبر پاتے ہی اس نے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ذہین اور دور اندیش دلشاد کو خطرہ محسوس ہوا۔ اسے کابل کی سلطنت ہاتھ سے نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ امیر حسین کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

"حسین! مغلوں سے ٹکرانا بہت بڑی غلطی ہو گی۔" دلشاد نے محبت سے شوہر کو سمجھایا۔

"جانِ حسین!"

امیر حسین اس کے قریب آتے ہوئے بولا:

"ملکۂ کابل کی زبان سے بزدلی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ کابل کی حکومت امیر حسین نے بزورِ شمشیر حاصل کی ہے۔ مغل اسے شمشیر ہی کے زور سے حاصل کر سکتے ہیں۔"

"لیکن خان نے کابل پر تو فوج کشی نہیں کی۔"

دلشاد جلدی سے اس سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی:

"سانپ کے بل میں خود انگلی ڈالنا کوئی عقلمندی نہیں۔"

"میں مداری نہیں ہوں دلشاد۔"

امیر حسین نے اسے پھر پکڑ لیا:

"پھنکارتے سانپ کے سامنے میں بین نہیں بجا سکتا۔ میں اس کا سر کچل کے رکھ دوں گا۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ عورت جتنی زیادہ حسین ہو گی اتنی ہی بزدل بھی ہو گی۔ تم چاہو تو کابل میں رہ سکتی ہو۔"

دلشاد کے جیسے کسی نے طمانچہ مار دیا۔ تڑپ کے بولی:

"حسین۔ تم میری توہین کر رہے ہو۔ اپنے الفاظ واپس لو ورنہ۔۔۔۔" دلشاد غصے سے بے قابو ہو گئی۔

"ورنہ ملکۂ کابل شہنشاہِ کابل سے روٹھ جائے گی۔" امیر حسین نے زور کا قہقہہ لگایا۔

دلشاد کا چہرہ غصے سے تپ اٹھا تھا۔ شوہر کی چھیڑ چھاڑ نے اس میں حیا کی سرخی بھی شامل کر

"ہرگز نہیں حسین۔"

دلشاد بڑے استقلال سے بولی:

"روٹھنے منانے کی باتیں جنگ کے امڈتے بادلوں میں اچھی نہیں لگتیں۔ مغلوں کے صاعقہ بردار یں کابل کو پھونک کر نہ رکھ دیں۔"

امیر حسین اب تک چھیڑ خانی پر اترا ہوا تھا۔ ہنس کر بولا:

"پھر کونسا جنگی ترانہ منائے گی ملکۂ کابل؟"

"تم بزدلی کا طعنہ واپس لیتے ہو یا نہیں؟"

دلشاد چیخ اٹھی:

"میں۔۔۔۔ میں خون کر ڈالوں گی۔"

"خون۔۔۔۔ خون کس کا کرو گی؟ اپنا یا میرا؟" امیر حسین برابر مسکرا رہا تھا۔

"نہ اپنا نہ تمہارا۔"

دلشاد بل کھاتی ہوئی بولی:

"تم مجھے کھو گے تو میں تم سے پہلے آگے بڑھ کر خانِ اعظم پر حملہ کر دوں گی اور تاتاری آن پر قربان ائے گی۔"

"تم۔۔۔۔!"

امیر حسین سنجیدہ ہو گیا:

"تم واقعی بہادر ہو دلشاد۔۔۔۔ پھر مجھے مقابلے سے کیوں روک رہی ہو؟"

"ذرا سوچو تو امیر حسین۔"

دلشاد بھی نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی:

"خانِ اعظم کی کمان میں تیس چالیس ہزار کا خونخوار لشکر ہو گا۔ ہمارے دس بارہ ہزار سوار کیا کر لیں گے

ہمیں اس سے مصالحت کر لینی چاہیے۔"

"مگر دلشاد۔"

امیر حسین سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

"مغلوں کا کوئی اصول نہیں۔ طاقت اصولوں کی پابند نہیں ہوا کرتی۔"

"ٹھیک ہے حسین۔"

دلشاد نے بات کو دوسرا رخ دیا:

"لیکن ہم معاہدہ کیوں توڑیں۔ کیا معاہدے میں یہ درج نہیں کہ قبلائی خان کی اولاد حکومت کرے گی اور قاچولی خان کا خاندان اس کے ماتحت رہے گا۔ تم قاچولی خان کی نسل سے ہو۔ تمہارے لیے مناسب نہیں کہ تم قبلائی خان کی اولاد سے بغاوت کرو۔"

دلشاد کی دلیل نے امیر حسین کو کچھ کچھ قائل کر دیا۔ سوچتے ہوئے بولا:

"لیکن دلشاد۔ یہ تو غور کرو کہ تاتاری علاقوں کو میں تاراج ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ یہ آ(با) و اجداد کا علاقہ ہے۔ اس پر میرا حق ہے۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا؟"

"مگر تمہارا حق تو خود تاتاریوں نے بھی تسلیم نہیں کیا۔ کس نے تمہیں امیر قزغن کا جانشین تسلیم کیا ہے؟"

دلشاد نے دوسری دلیل دی۔

"سمرقند پہ سب ہی کا اپنا اپنا حق جتا رہے ہیں۔"

امیر حسین کو دلشاد کی دلیلوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اس نے بے بسی سے دلشاد کو دیکھا۔ جنگی تیاریاں بند کر دی گئیں۔ امیر حسین' دلشاد کی جھنکار میں کھو گیا۔ ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔

دوسرے ہفتے اُسے ایک دہشت ناک خبر ملی:

"مغلوں نے سمرقند میں لوٹ مار مچا دی ہے۔" سمرقند سے آنے والے ایک سوار نے اسے بتایا۔

"لیکن سمرقند کا حاکم تو تیمور ہے۔ اس نے نہیں روکا مغلوں کو؟" امیر حسین نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"اے امیر کابل!"

سمرقندی سوار نے بتایا:

"بہادر تیمور نے مغلوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ مغل سوار' تاتاری لڑکیوں کو پکڑ پکڑ کر شمال میں بھیج رہے تھے۔ تیمور نے مغل چھکیوں کو گھیر لیا۔ لڑکیوں کو رہا کروا لیا۔ پھر وہ مغلوں کے لشکر میں بھی گھس گئے اور اس دلیر(ی) سے ان سے کئی سو لڑکیاں آزاد کرا لیں۔"

"لیکن اب وہ ہے کہاں؟ کیا کر رہا ہے وہ؟"

امیر حسین بپھر گیا:

"کیا وہ چوڑیاں پہنے شہر سبز میں پڑا ہے۔"

"نہیں امیر۔"

سمرقندی سوار' تیمور کی توہین برداشت نہ کر سکا:

"سردار تیمور ایسے نہیں ہیں۔ یلغار کے وقت وہ سمرقند میں موجود تھے۔ انہوں نے مقابلے کی تیاری کی لیکن تاتاری سرداران کا ساتھ چھوڑ گئے۔ کسی نے بھی ساتھ نہ دیا ان کا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر روپوش ہو گئے۔ (معلوم) نہیں کدھر گئے وہ۔"

"ممکن ہے وہ کابل آ رہے ہوں امیر۔" دلشاد نے خیال ظاہر کیا۔ وہ اسماگعنت گد کے وقت امیر حسین (کے) ساتھ تھی۔

"ہم نے اس کا ٹھیکہ نہیں لیا۔"

امیر حسین چڑ گیا:

"جب مصیبت پڑتی ہے تو وہ کابل آتا ہے۔"

"تو کیا ہوا حسین۔ وہ الجائی خاتون کے شوہر ہیں۔ تمہارے بہنوئی!"

دلشاد نے امیر حسین کے غصے پہ محبت کا چھینٹا دیا۔ وہ اسی طرح اس کا غصہ ٹھنڈا کیا کرتی تھی۔

"تمہیں تیمور کا انتظار کرنا چاہیے۔ ایک سے دو بھلے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی بہتر ترکیب بتائے۔"

"بہتر ترکیب۔"

امیر حسین منہ بناتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا:

"وہ آئے گا تو ہم پر بار بنے گا۔ مدد مانگے گا۔" امیر حسین بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

تیمور تو کابل نہ آیا۔ لیکن دو ہی دن بعد ایک سوار اس کا خط لے کر امیر حسین کے پاس پہنچا۔ خط مختصر (تھا) لیکن تمام ضروری باتیں تحریر تھیں۔ لکھا تھا:

"امیر حسین!

کابل سے نکلنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔ تاتاری قوم سوگئی ہے۔ تمہارا ساتھ کوئی نہ دے گا۔ خانِ اعظم لالچی ہے۔ دولت کی ہوس اس کا علاج ہے۔ میری گرفتاری اور سر کے لیے انعام کا اعلان ہوا ہے۔ میں جا رہا ہوں کہاں؟ یہ خود مجھے معلوم نہیں۔"

تیمور"

"بزدل!"

امیر حسین نے جھلا کر خط دلشاد کی طرف بڑھا دیا:

"خود ڈر کے بھاگ گیا ہے۔ مجھے بھی یہی حکم دے رہا ہے۔ میں اس کا غلام ہوں کوئی۔ میں مقابلہ ضرور مقابلہ کروں گا۔"

دلشاد اپنے ہونٹ کاٹ کے رہ گئی۔ امیر حسین اپنی ضد کا پکا تھا۔ جو بات دل میں بیٹھ جا[ئے] نکلنا ناممکن تھا۔ یہی ہوا بھی۔ امیر حسین نے فوراً لشکر کی تیاری کا حکم دیا اور آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ [سمر]قند کی طرف چلا۔ چار ہزار سوار کابل کی حفاظت کے لیے چھوڑے۔ دلشاد چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لی۔ اس کوئی جملہ کیا نہ شکوہ۔ نہ حرفِ شکایت زبان پر لائی۔

O

خانِ اعظم اس مرتبہ بڑے اہتمام سے آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پورے تاتاری علاقوں کو اس طرح روند دے کہ پھر کبھی انہیں بغاوت کی جرأت نہ ہو۔

اس کا بیٹا الیاس خواجہ خان اور چند سردار یک جک پہلے ہی سمرقند کے نواح میں موجود تھے۔ الیاس خواجہ نے بظاہر تو تاتاری لڑکیوں کو واپس کر کے تیمور کے فتنے کو دبا دیا تھا لیکن وہ تیمور سے خائف تھا اور چاہتا تھا کہ اس کانٹے کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا جائے۔ اس نے تیمور کی شکایت پہلے ہی خانِ اعظم کو لکھ بھیجی تھی اور اس میں اشارہ کیا تھا کہ تیمور کے تیور ٹھیک نہیں لگتے اور اس کی گفتگو اور عمل سے بغاوت کی بو آتی ہے۔

[لکھ]ا تھا کہ خانِ اعظم اس شکایت پر زیادہ توجہ نہ دیتا لیکن جس وقت الیاس خواجہ کا شکایت نامہ خانِ اعظم [کو ملا اس] وقت ان مغلوں کی بیوائیں جن کے شوہر تیمور کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، خانِ اعظم کے پاس [فریاد لے کر] پہنچ گئیں۔

[اب] خانِ اعظم کو تیمور کی بغاوت کا پورا یقین ہو گیا۔ اس نے نہ صرف تیمور کی گرفتاری اور قتل کا حکم دیا بلکہ خود [لش]کر لے کر جنوب میں آ گیا۔

[ام]یر حسین جس وقت کابل سے نکلا تو اس کے ساتھ کچھ ایسے جنوں کے افغان قبائل، غوری قبائل اور خود پوش [قبائل] کے دستے تھے۔ یہ لوگ بڑے جنگجو تھے اور امیر حسین کو بجا طور پر ان پہ ناز تھا۔ راستے میں اس کے ساتھ کچھ [اور قبائل بھ]ی شامل ہو گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو مغلوں کو پسند نہ کرتے تھے اور امیر حسین کے زیرِ سایہ عافیت کی [زندگی گزار]نے کے خواہش مند تھے۔

[ام]یر حسین بڑی تیزی سے بڑھا تاکہ خانِ اعظم اور الیاس خواجہ کے لشکروں کے درمیان حائل ہو جائے۔ [الیاس] خواجہ کو اس کی خبر مل گئی۔ اس نے فوراً بیک جک کو پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ امیر حسین کو روکنے [کے لیے بھیج] دیا۔ بیک جک ابھی امیر حسین تک نہ پہنچا تھا کہ اسے سمرقند سے پانچ ہزار کی اور کمک بھیج دی گئی۔ خانِ اعظم [بھی پہن]چ چکا تھا۔ اسے امیر حسین کی شورش کی اطلاع ملی تو اس نے بیک جک کو کمک کے ساتھ یہ پیغام بھی بھیجا [کہ امیر حسین ک]و شکست دے کر اسے زندہ یا مردہ سمرقند بھیجا جائے۔

[امی]ر حسین بڑی شان سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ مغل لشکر راستہ کاٹ کر کابل کی طرف گیا ہے [ا]ور کے حواس جاتے رہے۔ وہ لشکر لے کر فوراً پلٹا۔ مغل لشکر کابل کی حدود میں داخل ہو چکا تھا کہ امیر حسین [آ پہنچا۔ بیک] جک نے مورچہ بندی کرنا چاہی لیکن امیر حسین نے بغیر کسی انتظار کے مغلوں پر حملہ کر دیا۔

[امی]ر حسین کا حملہ اس قدر طوفانی تھا کہ بیک جک جیسا تجربہ کار رسالدار بھی گھبرا گیا لیکن مغل بھی ویسے ہی جنگجو [تھے۔ ابتدائی حملہ] ضائع کرنے کے بعد انہوں نے امیر حسین کو گھیرنا شروع کر دیا۔ آٹھ ہزار اور بیس ہزار کا مقابلہ تھا۔ [امیر حس]ین کے افغان اور غوری قبائل اس بے جگری سے لڑے کہ بیک جک حیران رہ گیا۔

[ایک] سخت خوفناک جنگ کے بعد امیر حسین کا لشکر گھیرے میں آ گیا۔ دلشاد آغا بیگم، شوہر کے پہلو بہ پہلو [لڑ رہی تھی۔ وہ] لشکر کے حوصلے بڑھا رہی تھی۔ ایک موقع پر امیر حسین کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ قریب تھا کہ وہ [گرتا کہ د]لشاد فوراً گھوڑا بھگا کر امیر حسین کے برابر پہنچی۔ اسے سہارا دے کر اپنے گھوڑے پر کھینچ لیا۔

ایک گھوڑے پر دو سوار ہوئے تو لڑائی جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ جان بچانے کے بھالے پڑ گئے
سے امیر حسین کو گھیرے ہوئے تھے۔ بیک جک نے انہیں امیر حسین کا سر اتارنے کا حکم دیا تھا۔

افغان اور غوری قبائل نے امیر حسین کو موت کے منہ میں دیکھا تو اس کے گرد دیوار بن کر کھڑ
پھر امیر حسین کو ایک خالی گھوڑا مل گیا۔ لیکن اب جنگ جاری رکھنا ناممکن تھا۔ مغل ہر طرف سے یلغار
کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ غوری اور افغانوں نے اپنی جانیں لڑا دیں اور لڑتے بھڑتے امیر حسین اور دلشاد
سے صاف نکال لے گئے۔

جنگ ختم ہو گئی۔ کابل کا لشکر ادھر ادھر بکھر گیا اور پسپا ہو کر میدان چھوڑ بھاگا۔ مغلوں نے امیر
سورج غروب ہونے تک کیا جب رات کے اندھیرے نے راستوں کو نگل لیا تو مغل واپس ہو گئے
کے راستوں سے واقف نہ تھے اور گم ہو جانے کا خطرہ تھا۔

امیر حسین نے آدھی رات بیت جانے کے بعد جب ایک جگہ قیام کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس
صرف چالیس سوار وفادار ہیں جو خون کا دریا پار کر کے اسے بچا لائے تھے۔

امیر حسین بہت افسردہ اور شرمندہ تھا۔ دلشاد کے سامنے اس کی نظریں نہ اٹھتی تھیں۔ دلشاد
وہ شوہر سے شکوہ کر کے اس کا دل اور نہ دکھانا چاہتی تھی۔ مغلوں سے ٹکرانا سراسر حماقت تھی۔ تیمور نے
منع بھی کیا تھا لیکن وہ تو ضدی اور خود سر تھا۔ وہ بہادر ضرور تھا لیکن دور اندیشی اسے چھو کر نہیں گئی
شکست سے کابل کی طاقتور سلطنت اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ پھر وہ پہاڑوں اور صحراؤں میں پناہ لینے
دلشاد آغا اب بھی اس کا ساتھ دیے جا رہی تھی۔

زندگی میں شاید پہلی بار امیر حسین کو اپنی بے جا ضد کا احساس ہوا۔ اس کا اعلان اس نے دلشاد
کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ دلشاد کے مشورے پر عمل کرے گا۔

○

تیمور اگرچہ امیر حسین کی طرح ضدی نہ تھا لیکن تاتاریوں میں یہ عیب مشترک تھا کہ وہ اکثر اپنی
بے جا اظہار کر کے نقصان اٹھاتے تھے۔ تیمور بھی اسی عیب کا شکار تھا۔ مغل اپنی طاقت کے زور پر تاتا

ے۔ انھوں نے لوٹ مار مچا رکھی تھی اور تاتاری لڑکیوں کو اغوا بھی کر رہے تھے لیکن تیمور نے
ت کا اندازہ کیے بغیر ان کا مقابلہ شروع کر دیا تھا۔ وہ شجاعت کے زور پر مغل لشکرگاہ تک
سے تاتاری لڑکیوں کو چھڑا لایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری علاقے میں متعین مغل لشکری
لاف ہو گئے اور شمال سے خانِ اعظم بھی اسے سزا دینے کے لیے سمرقند پہنچ گیا۔ تیمور
ے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ وہ ملکی سیاست پر لعنت بھیجے اور اپنے خاندان
کرے۔

ر اگر چاہتا تو وہ کچھ دنوں کے لیے کابل جا سکتا تھا لیکن وہ بار بار امیر حسین کا احسان
ہتا تھا۔ اس لیے اس نے امیر حسین کو خط بھیجنے کے بعد بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور سُرخ
ے قزل قم کہتے ہیں، میں اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ اس لق و دق صحرا میں جب وہ داخل ہوا تو اس
رف بیس وفادار سوار تھے۔ کچھ گھوڑوں پر ضروری سامان لاد لیا تھا۔ تیمور نے اپنے ساتھ
جواہرات لے لیے تھے اور وقت بے وقت کے لیے پانی سے بھرے مشکیزے ساتھ
تھے۔

غرب میں دور تک پھیلا ہوا یہ بے آب و گیاہ صحرا..... انسانوں اور جانوروں سے یکسر
یہاں دن بھر سرخ ریت کے بگولے اڑتے رہتے اور دھند سے آسمان تاریک رہتا
دں کا یہاں نام و نشان نہ تھا۔ یہ صحرا دراصل اُن مجرموں کا مسکن تھا جو سزائے موت سے
ہاں آ چھپتے تھے۔ یا پھر کہیں کہیں میٹھے پانی کے کنوؤں کے گرد ان صحرائی ترکمانوں کے
تے تھے جو اپنے ریوڑوں کی رکھوالی کے ساتھ ساتھ اکا دکا قافلوں کو بھی لوٹ لیا کرتے تھے
اس صحرا میں مجرموں اور قزاق ترکمانوں کی حکومت تھی۔ تیمور اس بیابان میں آ گئے ہی آ گئے
ا۔ رات ہوتی تو یہ لوگ اپنے گھوڑوں کو سوکھی گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ یہ گھاس
ریت میں آدھے آدھے دھنسے ہوئے نرسل کے چھوٹے چھوٹے پودے ہوتے۔ رات
ا اپنے گھوڑوں کی حفاظت بھی کرنا پڑتی۔ تیمور چاہتا تھا کہ کسی طرح اس صحرا کو عبور کر کے
وارزم تک پہنچ جائے جہاں سے تجارتی راستے گزرتے تھے۔ ان راستوں پر بڑے بڑے
جہاں سے سامان خورد و نوش حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن منزل ابھی دور تھی۔ بہت دور۔

ایک رات تیمور کے ساتھ جیسے ایک معجزہ ہوگیا۔ تیمور اپنے آدمیوں کے ساتھ بیٹھ
کے ایک کنویں کے پاس پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ گھوڑوں کی حفاظت کے لیے چار آدمیوں
باری باری رات بھر پہرہ دیتی تھی۔ اس رات پہرہ دینے والوں میں خود تیمور شامل تھا۔ تیمور اپنی
الجائی خاتون کو لیے مشرقی سمت پہرے پر تھا۔ رات بڑی تاریک تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ
خیموں کے سامنے جلنے والے الاؤ بجھ چکے تھے۔ صرف ایک الاؤ سے چھوٹی چھوٹی چنگاریاں
تھی۔ ایسے سناٹے اور تاریکی میں تیمور کو دور گھوڑوں کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ یقیناً
ترکمان لٹیرے ہیں۔ تیمور کے دماغ میں فوراً یہ خیال پیدا ہوا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا......
اس کے گھوڑے قریب ہی موجود تھے۔ دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ تیمور نے الجائی کو خیمہ
طرف بھیجا کہ وہ سب کو جگا کر تیار کرائے اور خود کمان سنبھال کر کھڑا ہوگیا۔

ٹاپوں کی آواز سے تیمور نے اندازہ لگایا کہ آنے والوں کی تعداد چالیس پچاس کے قریب
اس سے تیمور کو کچھ اطمینان ہوا۔ اس کے ساتھ بیس سوار تھے لیکن ان میں ہر سوار دس دس
پہ بھاری تھا۔ آنے والوں کی رفتار کم تھی جیسے وہ احتیاط سے قدم بڑھا رہے ہوں۔ ادھر الجائی
نے سب کو جگا کر خطرے سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی الاؤ سے الجھتی ہوئی چنگاریوں کو بھی بجھا دیا تا
والوں کو ان کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے۔ سب سوار تیمور کے پاس آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

آنے والوں کو بھی شاید ان کی بھنک مل گئی۔ انہوں نے رفتار اور کم کر دی اور کچھ دور آ
گئے۔ تیمور نے کچھ دیر انتظار کے بعد پُر رعب آواز میں کہا "کون ہو تم لوگ۔ کس ارادے سے
آئے ہو؟"

"تم کون ہو؟" اُدھر سے بھی ایک بھاری آواز آئی۔

اُلجائی خاتون نے فوراً ہاتھ دبا کر تیمور کے کان میں سرگوشی کی "یہ آواز میرے بھائی امیر حسین
سے ملتی جلتی ہے۔"

تیمور تو یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے اُلجائی کی سرگوشی پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے پھر ڈپٹ کر
کہا "جلدی بتاؤ ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ تم ہمارے تیروں کی زد میں ہو۔"
دوسری طرف کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ شاید آنے والے خوفزدہ ہوگئے تھے یا اپنی گوشش پر

ے تھے۔ پھر وہی پہلی آواز بلند ہوئی "ہم چور، ڈاکو یا لٹیرے نہیں ہیں۔ مسافر ہیں۔ راستہ بھول گئے
ہمارے پاس کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں ہے۔"

"امیر حسین!" الجائی خاتون برداشت نہ کر سکی اور چیخ پڑی۔ یہ واقعی امیر حسین کی آواز تھی۔ خون نے
آواز دی تو امیر حسین بھی چلایا "خاتون آغا تم ہو۔ میں امیر حسین ہوں۔"

الجائی خاتون (خاتون آغا) نے فوراً گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ دونوں طرف کے سواروں میں خوشی کی
لی۔ فوراً الاؤ روشن کر دیے گئے۔ امیر حسین کے ساتھ اس کی خوبصورت اور وفادار بیوی دلشاد
ا بھی تھی۔ تیمور کو یہ ایک معجزہ ہی معلوم ہوا۔ کہاں کابل اور کہاں یہ سرخ ریگستان۔ وہ دونوں بڑے
سے ملے۔ دلشاد آغا نے ٹھیک کہا تھا کہ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ تیمور تو کابل نہ پہنچا لیکن
نے ان دونوں کو دیار غیر میں اس وقت ملا دیا تھا جب انہیں ایک دوسرے کی سخت ضرورت تھی۔
کے ساتھ چالیس سوار تھے۔ تیمور کے بیس سوار ملا کر ان کی تعداد ساٹھ ہوگئی تھی۔ ساٹھ آدمیوں
جمعیت ہوتی تھی اور اس حالت میں کہ ان میں سے ہر سوار کوہ گراں تھا۔

امیر حسین اور اس کے ساتھی بھوک پیاس سے بے حال ہو رہے تھے۔ اُن کا سامان خورد و نوش دو
ختم ہوا تھا اور وہ کھانے پینے کی تلاش میں دو دن سے ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ پانی تو
فراہم کر دیا گیا۔ پھر کھانے کا انتظام شروع ہوا۔ تیمور کا یہ طریقہ تھا کہ وہ راستے میں جہاں بھی
بکریوں کے...... ریوڑ ملتے اُن میں سے حسب ضرورت بھیڑیں خرید لیتا۔ کچھ تو اسی وقت
ڈالی جاتیں باقی کا گوشت، پتھر پر تڑخا کے خورجیوں میں بھر لیا جاتا۔ جب تازہ گوشت نہ ملتا
یوں کے گوشت پر گزارہ ہوتا۔ اس وقت بھی ان کی خورجیوں میں تڑخایا ہوا گوشت بھرا تھا
نکال کے الاؤ پر گرم کیا گیا۔ پھر ان کے سامنے رکھا۔ امیر حسین کے ساتھی دو دن کے بھوکے
...... انہوں نے خوب پیٹ بھر کے کھایا۔ تیمور اور الجائی خاتون انہیں اس طرح کھاتے دیکھ کر
خوش ہوتے رہے۔

کھانے کے بعد امیر حسین، تیمور، اُن کی بیویاں امر جوڑ کے بیٹھے...... ماضی اور مستقبل کی
شروع ہوئی۔ تیمور کو سخت تعجب تھا کہ امیر حسین، کابل سے یہاں کس طرح پہنچا اور اس کا یہ
کیسے ہوا؟ وہ انتظار کرتا رہا کہ امیر حسین اس کے بارے میں خود ہی بتائے گا لیکن امیر حسین

اپنی جگہ شرمندہ تھا۔ اس لیے اس طرف نہ آ رہا تھا۔ آخر تیمور نے مجبور ہو کر پوچھا۔ "امیر احمد تو تمہیں مل گیا ہوگا۔ امیر حسین؟"

امیر حسین کے لیے اب اصل حالات بتانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا لیکن وہ عمر میں ایک د سال بڑا تھا۔ اس لیے عقل و دانش میں خود کو تیمور سے افضل سمجھتا تھا اس نے بہت گھما کر جواب بولا۔ "تیمور، تم جانتے ہو جب دو حریف فوجیں ٹکراتی ہیں تو ایک کو شکست یقینی ہوتی ہے۔"

تیمور بڑا ذہین تھا۔ وہ امیر حسین کا مطلب سمجھ گیا اور کہا۔ "امیر حسین! جنگ کا یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ حریفوں میں صلح بھی ہو سکتی ہے اور ایک حریف دوسرے حریف کے مقابلے میں اگر کم تو پسپا ہو کر قلعہ بند بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سب حالات پر منحصر ہے۔"

"بہرحال! تم یہ سمجھو کہ میں نے مغلوں کا بہادری سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھا گیا۔" امیر حسین نے اتنی بے پروائی سے کہا جیسے اس کی شکست کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

"جنگ کابل میں ہوئی یا کابل سے باہر ہوئی؟" تیمور نے مزید تفصیل معلوم کرنے کی کوشش

"ہم نے کابل سے نکل کر مغلوں کا مقابلہ کیا تھا۔" امیر حسین کے بجائے اس کی خوبصورت ب دلشاد نے تیمور کو جواب دیا۔ "ہمارے افغانی اور غیور سوار یہ گوارا نہ کر سکے کہ ہم کابل میں قلعہ بند ہو مدافعتی جنگ لڑیں۔ ہمارے لشکر نے بڑی شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن مغلوں کا لشکر بیس ہزار بھی زیادہ تھا اس لیے ہمیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔"

دلشاد آغا بیگم نے بڑی عقل مندی سے اپنے ضدی شوہر کو مزید شرمندہ ہونے سے بچا تیمور کو جنگ کی پوری تفصیل سے بھی آگاہ کر دیا۔ دلشاد نے بڑے سلیقے اور متانت سے گفتگو تیمور اس کے طرز گفتگو سے بڑا متاثر ہوا۔ دلشاد آغا واقعی بہت خوب صورت تھی لیکن الجائی خا ایک بچے کی ماں ہونے کے باوجود دلشاد سے کسی طرح کم حسین نہ تھی۔ اس لیے دلشاد نے تیمو متاثر ضرور کیا لیکن یہ تاثر اس کے دماغ پر اس کی ذہانت اور متانت کی وجہ سے قائم ہوا۔

اب مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی شروع ہوئی۔ تیمور نے بتایا کہ وہ قزل قم چاہتا ہے تاکہ وہاں سے کسی بڑے شہر میں جا کر قیام کرے اور مغلوں کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کرے۔ تیمور کو امیر حسین کی حماقت پر بڑا افسوس ہوا لیکن اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ بالآ

ات کافی گزر چکی تھی اور صبح ہونے والی تھی۔ یہ لوگ سونے کے لیے لیٹ گئے کیونکہ صبح ہوتے ہی انہیں روانہ ہونا تھا۔

صبح کو پھر وہی ریت کا سمندر تھا اور ساٹھ آدمیوں کا یہ قافلہ۔ امیر حسین کے آجانے سے تیمور کو بڑی یت ہوئی تھی۔ ایک تو ان کی نفری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسرے الجائی خاتون کو ایک ساتھی مل گئی تھی۔ اد آغا بڑی خوش مزاج عورت تھی۔ الجائی خاتون اس کی باتیں سن کر بہت خوش ہوتی۔ یوں اس سفر دلشاد کی وجہ سے ایک دلچسپ ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ پڑاؤ کے دوران دلشاد اپنی دلچسپ باتوں سے ی خاتون اور اس کے ننھے بیٹے جہانگیر کو خوب ہنساتی رہتی تھی۔

آخر خدا خدا کر کے اس ریگستان میں ایک شہر نظر آیا۔ اس کا نام خیوہ تھا گو کہ یہ شہر چھوٹا تھا لیکن ریگستان ایک عرصہ کے بعد ان لوگوں نے یہ شہر دیکھا تھا۔ شہر کے قریب پہنچ کے ایک آدمی سے اس شہر کی یت دریافت کی۔ تیمور کو جب بتایا گیا کہ خیوہ کا حاکم تکل نام کا ایک صحرائی ہے...... تو وہ بہت ش ہوا۔ تکل کو تیمور بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ تیمور کے شہر سبز میں اکثر آیا کرتا تھا۔ تیمور نے تکل کی کئی بار کلف دعوت بھی کی تھی۔ آخر طے ہوا کہ تکل کے یہاں قیام کیا جائے اور جب اس تکلیف دہ سفر کی تکان ر ہو جائے تو آگے...... بڑھا جائے۔

شہر کے دروازے پر پہنچ کر تیمور نے اپنا گھوڑا روک لیا اور اپنے معتمد سردار "ایلچی بہادر" کو تکل پاس اپنی آمد کی خبر لے جانے کا حکم دیا۔ ایلچی بہادر ان لوگوں کو فصیل شہر کے باہر چھوڑ کر اندر پہنچا کل کو تیمور کے آنے کی خبر دی۔ تکل یہ خبر ملتے ہی گھوڑے پر سوار ہو کے ایلچی بہادر کے ساتھ ہو ۔ وہ تیمور کے پاس پہنچ کے اس سے بڑی گرم جوشی سے ملا اور اسے اپنا مہمان بنانے کی پیشکش کی۔ مور نے اس کی یہ پیشکش قبول کرتے ہوئے کہا۔ "سردار تکل! ہم آپ کی اس پیشکش کے شکر گزار یں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم سب مسلح ہیں اور مسلح سواروں کا کسی غیر کے قلعہ میں داخل ہونا ی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے۔ اگر آپ ہمیں مہمان بنانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے فصیل کے باہر مے لگوا دیجیے۔ یہ آپ کی بہت بڑی مہمان نوازی ہوگی۔"

سردار تکل ذرا دیر حیران نظروں سے تیمور کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "اے ر سبز کے امیر۔ کیا آپ سردار تکل کو اس قدر بیوقوف سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے قلعے میں کسی دشمن

کو لانے کی دعوت دے گا۔"

"دوست دشمن کی بات نہیں سردار۔" تیمور متانت سے بولا "سپاہی کو ہر وقت اور ہر طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ دشمنی کسی کے ماتھے پر نہیں لکھی ہوتی۔ میں نے ایک اصول کی بات کی ہے۔ میں خود اس پر عمل کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہر سردار اس اصول کی پابندی کرے۔"

سردار تغلق نے دوسرا قہقہہ لگایا۔ یہ قہقہہ پہلے سے زیادہ زوردار اور خوف ناک قسم کا تھا "امیر کو علم ہونا چاہیے کہ صحرائی لوگ سیدھے سادے ضرور ہوتے ہیں لیکن وہ تاتاریوں ہی جیسے بہادر ہیں۔ پھر آپ کی تعداد ہی کتنی ہے۔ ہمیں کم از کم آپ سے کوئی خطرہ نہیں۔ ویسے آپ کی مرضی ہے تو ہم آپ کے لیے باہر ہی خیمے لگوا دیں گے۔"

"شکریہ، سردار تغلق۔" شہر سبز کے امیر تیمور نے کمال خندہ پیشانی کا اظہار کیا۔ پھر اس نے تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ہیں میری بیگم اور تمہاری بھابی الجائی خاتون آغا۔" سردار تغلق نے سر کو ذرا سا خم کر کے تعظیم کا اظہار کیا۔ الجائی کی گود میں ننھا جہانگیر تھا۔ نصف چہرے پر ہلکا سا نقاب تھا۔ تاتاری لوگ ان خواتین کی بہت عزت کرتے تھے جو اپنے شوہر کے ساتھ بزم کی عشرتیں اور رزم کی صعوبتیں برداشت کرتی تھیں۔

پھر تیمور نے اپنے سالے سے تعارف کرایا "یہ ہیں امیر حسین والی کابل اور الجائی خاتون کے بھائی اور ان کے ساتھ ان کی بیگم دلشاد آغا بیگم۔"

دلشاد آغا الجائی خاتون کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کا نام لیا گیا تو وہ ایک دم آگے بڑھ آئی تاکہ میزبان کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ مغرور یا غیر شائستہ ہے۔ دلشاد آغا پر نظر پڑتے ہی جیسے سردار تغلق کے خرمن دل پر بجلی سی گری۔ دلشاد کا بے نقاب دمکتا چہرہ، سرخ و سفید رنگت اور امنگ بھری جوانی، سردار تغلق تو ہکا بکا سا رہ گیا۔ اس کی نظر سے ایسا حسن کبھی نہ گزرا تھا۔ سردار تغلق کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ چار بیویوں کے علاوہ اس نے ایک درجن سے زیادہ داشتائیں اور لونڈیاں رکھ چھوڑی تھیں لیکن اس کی بوالہوس نظریں دلشاد کے چہرے پر کچھ اس طرح جم گئیں کہ وہ گھبرا کر الجائی کی آڑ میں ہو گئی۔

سردار تغلق جیسے خواب کے عالم میں بولا "ماشاءاللہ والی کابل اور اُن کی ملکہ لاجواب ہیں۔"

تیمور بڑے غور سے سردار تغلق کی نظروں کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے اپنے طویل سفر کے دوران پہلی مرتبہ معلوم سے خوف کا احساس ہوا۔ تیمور نے تو احتیاط کے طور پر شہر سے باہر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا، [illegible]وقت وہ مغل خانِ اعظم کا باغی تھا اور ترکمان، خانِ اعظم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتے تھے لیکن اس وقت سردار تغلق کی نظریں دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ اُس نے صحیح [illegible]ملہ کیا۔

تیمور کے لیے شہر سے باہر خیمے لگا دیے گئے۔ سردار تغلق دونوں وقت مہمانوں کے لیے بہترین [illegible]پکوا کر لاتا اور تیمور کے ساتھ خود بھی بیٹھ کے کھانا کھاتا۔ کھانے کے اوقات کے علاوہ وہ دن میں ایک [illegible]مزاج پرسی کے بہانے بھی آ جاتا اور خواہ مخواہ کی باتیں کرتا رہتا۔ سردار تغلق دراصل دلشاد آغا کے [illegible]انکار ہو گیا تھا۔ وہ دلشاد سے ملنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا۔ دلشاد نے بھی یہ بات محسوس کر [illegible]وہ زیادہ وقت اپنے خیمے کے اندر ہی رہتی لیکن سردار تغلق امیر حسین سے ملاقات کے بہانے [illegible]کے خیمے میں گھس جاتا۔ یہ بات امیر حسین کو بھی ناگوار گزرتی لیکن میزبان کے لحاظ کی وجہ سے سب [illegible]خاموش رہتے۔

ایک رات جب کھانے کے بعد سردار تغلق ان لوگوں کے پاس دیر تک بیٹھا رہا تو تیمور نے دبی [illegible]سے کہا "سردار تغلق! آپ کی میزبانی کے ہم بہت بہت شکر گزار ہیں۔ یہاں گزارے ہوئے یہ [illegible]دن ہم زندگی بھر نہ بھول سکیں گے۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔ ہم بحیرۂ خوارزم کی طرف جا رہے ہیں [illegible]کی بڑے شہر میں جا کر قسمت آزمائی کریں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شہر سبز کے امیر!" سردار تغلق نے سخت مخالفت کی "ابھی آپ کا یہاں سے [illegible]کسی طرح مناسب نہیں۔ خانِ اعظم آپ کا دشمن ہے۔ اس نے آپ کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر [illegible]کیا ہے۔ میں اپنے ایک عزیز دوست کو کس طرح بے یار و مددگار چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ آپ لوگوں [illegible]کے لیے سب سے زیادہ امن کی جگہ ہے۔ آپ یہاں اُس وقت تک آرام و سکون سے رہیں جب [illegible]تک آپ کو دوبارہ طاقت حاصل نہیں ہو جاتی۔"

تیمور اس کی باتوں سے سناٹے میں آ گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سردار تغلق سمرقند کے حالات سے [illegible]واقف نہیں لیکن سردار تغلق نے انعام کا ذکر کر کے اُسے ایک اور نئے خطرے سے دوچار [illegible]

کر دیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ تغلق کے دل میں کھوٹ ہے اور وہ انعام کے لالچ میں اس کے ساتھ کوئی بھی حرکت کر سکتا ہے۔

تیمور نے اپنے خدشات چھپاتے ہوئے کہا۔ "سردار تغلق آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے مغلوں کا کوئی خوف نہیں۔ میری مختصر سی جماعت کے مقابلے پر مغلوں کو ایک لشکر لانا پڑے گا اور جن راستوں سے گزر کر میں آیا ہوں وہاں سے کسی لشکر کا گزرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ آپ کو پورے حالات کا علم ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری میزبانی کی وجہ سے آپ کی اور خانِ اعظم کی دوستی میں کوئی فرق آئے۔ اس لیے ہم آپ کے پاس زیادہ دن قیام نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے آپ کی جیسی مرضی۔ میں مجبور نہیں کرتا لیکن دو ایک روز تو اور ٹھہر جاتے۔" سردار تغلق نے تیمور کو بالکل پابہ رکاب دیکھا تو ایک دو دن اور ٹھہرانے کی کوشش کی۔

تیمور تو فوراً روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن یہ بات جان اور مہمان نوازی کے اصولوں کے خلاف تھی اس نے سردار تغلق کی بات مان لی۔ سردار تغلق وہاں سے بڑا مضمحل سا اٹھا۔ اس کے جانے کے بعد تیمور نے کہا۔ "امیر حسین اب یہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج ہی رات چپکے سے نکل چلو صبح تک ہم کافی دور نکل چکے ہوں گے۔"

امیر حسین نے حسبِ معمول مخالفت کی۔ "خطرے کی کیا بات ہے۔ ہم کوئی مٹی کے بنے ہیں۔ تغلق کے پاس زیادہ سے زیادہ چار پانچ سو سوار ہوں گے کیا ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میرا تو خیال ہے ہمیں خیوہ پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ یہ شہر ہمارے لیے ایک بہترین پناہ گاہ بن سکتا ہے۔ یوں ادھر ادھر مارے پھرنے سے ایک جگہ ٹھہرنا زیادہ اچھا ہو گا۔"

"میں اس احمقانہ رائے کی تائید نہیں کر سکتا۔" تیمور کو غصہ آ گیا۔ "تغلق اپنے مستقر پر ہے اس کے پاس ایک سو سوار ہوں تو وہ بھی بہت ہیں اسے شہر سے پوری کمک اور مدد مل سکتی ہے۔ ان کا ایک مارا جائے گا تو دو آ جائیں گے۔ ہماری ایک کی کمی بھی پوری نہ ہو سکے گی۔"

ممکن تھا سالے بہنوئی میں تو تو میں میں بڑھ جاتی کہ عقلمند الجائی نے دخل دیا۔ مسکرا کے بولی۔ "دونوں بیکار جھگڑ رہے ہیں۔ مجھے تو کچھ اور ہی خطرہ ہے۔"

"تجھے کیا خطرہ ہے بہن؟" امیر حسین جھلا کے بولا۔

"مجھے...... مجھے دلشاد آغا کا خطرہ ہے۔" اور الجائی ہنسنے لگی......

دلشاد کے نام پر امیر حسین کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے پوچھا۔ "دلشاد کا کیا خطرہ ہے بہن؟"

"امیر حسین!" الجائی اسی طرح مسکراتے ہوئے بولی۔ "دلشاد اتنی خوب صورت ہے۔ دیکھا نہیں سردار تغلق آتا ہے تو اس کی نظریں دلشاد ہی کو تلاش کرتی رہتی ہیں۔"

یہ خطرہ ان چاروں کے دل میں پوشیدہ تھا اور اب پہلی بار الجائی خاتون کی زبان پر آیا تھا اس کا سب پر اثر ہوا۔ دلشاد نے "الجائی باجی" کہہ کر شرم سے سر جھکا لیا اور تیمور اور امیر حسین گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"ٹھیک ہے۔ صبح ہم تغلق سے کہہ دیں گے کہ ہم جا رہے ہیں۔" امیر حسین فکرمند لہجے میں بولا۔

"کل کیوں۔ ابھی کیوں نہیں؟" تیمور نے زور دے کر کہا۔

"بس کل۔ کہہ تو دیا میں نے۔" امیر حسین بڑے ناگوار انداز میں بولا۔

تیمور نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی۔ وہ امیر حسین کی ضدی طبیعت سے واقف تھا۔ اس سے بحث کرنا بیکار تھی۔

صبح کو ان کی مشکل خود ہی آسان ہو گئی۔ انہیں تغلق سے کہنے کی کوئی ضرورت نہ پڑی۔ سردار تغلق بڑا خوش خوش آیا اور بولا۔ "آج آپ لوگوں کی آخری ضیافت ہے۔ شام، میرے پندرھویں بیٹے کی سالگرہ ہے۔ سالگرہ کے کھانے کے بعد آپ لوگ جب چاہیں جا سکتے ہیں۔"

"ہم آج رات ہی روانہ ہو جائیں گے۔" امیر حسین نے فوراً اپنی بے صبری ظاہر کر دی۔

"والیٔ کابل!" سردار تغلق بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں والیٔ کابل اور شہر سبز کے امیر کی شایانِ شان خاطر مدارت نہ کر سکا لیکن میں ان کے منصوبے میں حائل نہیں ہونا چاہتا تاہم شام تک آپ لوگوں کے لیے کھانے پینے اور جانوروں کے لیے خشک چارہ اور ضرورت کے مطابق سامان بھجوا دیا جائے گا۔ سالگرہ کی تقریب کے بعد میں خود آپ کو رخصت کرنے آؤں گا۔"

سردار تغلق تھوڑی دیر بعد ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اسی طرح خوش خوش واپس ہو گیا جس طرح آیا تھا۔ آج اس نے زیادہ دیر بیٹھنے کی کوشش بھی نہ کی۔ زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ آج اس کی نظروں نے دلشاد کو تلاش کرنے کی بھی کوشش نہ کی۔ امیر حسین اور تیمور کو اس سے بڑا اطمینان حاصل ہوا۔

"ہم نے سردار تغلق کے متعلق غلط اندازہ لگایا۔" امیر حسین نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"شاید۔" تیمور مختصر جواب دے کر خاموش ہو رہا۔

"اگر اس کی نیت میں ذرا بھی فتور ہوتا تو وہ ہمیں کسی نہ کسی بہانے روکنے کی ضرور کوشش کرتا۔"
امیر حسین نے خواہ مخواہ بات بڑھانے کی کوشش کی لیکن تیمور خاموش رہا۔ وہ ایسی فضول باتوں کا عادی نہ تھا۔

⭘

خیمہ کے اندر دن بھر سردار تغلق نے پسندیدہ ترین بیٹے کی سالگرہ کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ سردار نے اس خوشی میں پورے شہر کی دعوت کی تھی۔ اس کا حکم تھا کہ آج کسی کے گھر میں چولہا نہیں جلے گا۔ دوپہر اور رات کا کھانا سردار کی طرف سے ہر ایک کے گھر بھیجا جائے گا۔ تیمور کے ذخیرہ کے لیے دوپہر کو جو کھانا بھیجا گیا، وہ معمول سے کہیں بہتر تھا۔ سردار تغلق اپنے مہمانوں کی روزانہ ہی دعوت کرتا تھا اور انواع و اقسام کے کھانے پکوا کے بھیجتا تھا لیکن آج کا کھانا عام دنوں سے عمدہ تھا۔ شام ہوتے ہوتے سردار تغلق نے تیمور کے ساتھ جانے کے لیے بھنا ہوا اور جھیر پر چڑھایا ہوا گوشت بھیجا تاکہ اسے خود خیموں میں بھر لیا جائے گھوڑوں کے لیے خشک چارہ اور پانی سے بھرے ہوئے مشکیزے بھی بھیجے گئے۔ امیر حسین اس مہمان نوازی سے بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

اندھیرا ہونے سے کچھ دیر پہلے شہر سے سردار تغلق کی چاروں بیگمات مع درجن بھر کنیزوں اور سردار کی داشتاؤں کے مہمانوں کے خیمے پر آئیں۔ سردار تغلق کی بڑی بیگم نے بڑے ادب سے تیمور سے درخواست کی کہ ننھے جہانگیر کو الجائی خاتون کے ساتھ سالگرہ میں شریک ہونے کے لیے بھیجا جائے کیونکہ بچے کی تقریب تھی اور اس میں مہمان کے بچے کی شرکت ضروری تھی۔ تیمور کو فوراً خطرے کی بو آئی۔ ایسے موقع پر اس کی چھٹی حس ہمیشہ بھڑک اٹھتی تھی۔ وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ امیر حسین بول پڑا۔ "ضرور ضرور۔ سردار تغلق کا بیٹا ہمارا بیٹا ہے اس کی تقریب میں ننھا جہانگیر ضرور شریک ہوگا۔ یہ موقع تو سال بعد ہی آتا ہے۔" پھر اس نے دلشاد آغا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "دلشاد۔ تم بھی الجائی کے ساتھ جاؤ۔ ایسے

[...]ے ہوتے ہیں۔"

"ایسے موقعے بھلے ہوتے ہیں۔" تیمور زیر لب بولا۔۔۔۔ مگر موقعے کی نزاکت کے تحت اسے اپنی [...]ں بند ہی رکھنا پڑی۔ عورتیں تو ایسے موقعے کی تلاش ہی میں رہتی ہیں اور اب تو دلشاد کو امیر حسین [...]زادی حکم دیا تھا۔ الجائی خاتون اور دلشاد جلدی جلدی تیار ہوئیں اور خیوہ کی عورتوں کے ساتھ [...]ئی بولتی چل پڑیں۔ جب وہ شہر کے دروازے میں داخل ہو رہی تھیں تو تیمور کا دل نہ جانے کیوں [...]زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بوجھ تلے دبتا چلا جا رہا ہے۔

الجائی اور دلشاد خیوہ شہر میں پہنچیں تو وہاں عورتوں کا بڑا ہجوم تھا۔ فصیل کے ساتھ سپاہیوں [...]ہنے کے لیے کوٹھڑیاں بنی تھیں۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کے شہر کا بازار تھا۔ اس کے گرد کچے پکے [...]ئی مکانات تھے۔ بازار اور گلیوں میں سینکڑوں مسلح سپاہی اور سوار گھومتے ہوئے دکھائی دیے۔ [...] بند تھا لیکن جگہ جگہ روشنی کا انتظام تھا۔ یہ روشنی تقریب کے سلسلے میں کی گئی تھی۔ اس کے [...]ے بڑے مکانات اور حویلیاں تھیں۔ پھر انہیں برابر چار حویلیاں دکھائی دیں۔ یہ چاروں حویلیاں [...]روشن تھیں۔ ایک حویلی کو تو خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک ترکمان عورت نے بتایا کہ اسی حویلی [...]قریب کا اہتمام کیا گیا ہے اور یہ چار حویلیاں سردار تغلق کی چار بیگمات کی ہیں۔

تقریب والی حویلی میں عورتوں اور بچوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ راستہ نہ ملتا تھا۔ اس حویلی کے [...]منے پر کچھ سوار دکھائی دیے لیکن اندر کوئی مرد نہ تھا۔ تمام انتظامات عورتوں کے ہاتھوں میں تھا۔ [...]ان مسلمان ہو چکے تھے لیکن ان کی رسموں میں ابھی تک قدیم رسوم کا رنگ موجود تھا۔ بچے کو سجا [...] ایک اونچی جگہ کھڑا کیا گیا۔ پھر چھ بھیڑیں اور چھ گھوڑیاں لائی گئیں۔ گھوڑوں کے چاروں پیروں [...]رسیاں باندھ کر ان کی پیٹھ کی اوپر سے رسیاں گزاری گئیں تھیں بچے کے ہاتھ میں ایک [...]لوار دی گئی اور اس کے سامنے سے ایک ایک کر کے بھیڑیں اور گھوڑیاں گزاری گئیں [...]ی ماں کی ہدایت پر ہر جانور کے سر کو چھری سے چھوتا۔ یہ اس کی چھٹی سالگرہ تھی اس لیے چھ بھیڑوں [...]ر گھوڑوں کا اہتمام تھا۔

جب یہ جانور بچے کی چھری کے نیچے سے گزر گئے تو ان کی قربانی دی گئی۔ جانوروں کو ذبح کرنے [...]کی رسمیں بھی تھیں۔ الجائی اور دلشاد کو یہ تنومند ترکمان عورتیں بڑی بھیانک معلوم ہوئیں پھر وہ [...]

کو آسانی سے ذبح کر لیا گیا لیکن گھوڑوں میں سے کئی ایک کی رسیاں کھل گئیں یا ٹوٹ گئیں لیکن
ان مرد نما عورتوں نے جلد ہی انہیں گرا کر ذبح کر ڈالا۔ قربانی کے دوران بچے خوشی سے تالیاں بجا
رہے اور حویلی کے دروازے پر ڈھول تاشے بجتے رہے۔ ننھا جہانگیر الجائی کی گود میں تھا اس کے
لیے یہ رسم اجنبی تھی لیکن بھیڑوں اور گھوڑیوں کے ذبح ہوتے وقت جب خون کی پچکاریاں اچھلیں
تو اس نے خوش ہو کر خوب خوب تالیاں بجائیں۔

الجائی خاتون کے یہاں تک آتے آتے ہی چراغ جل گئے تھے۔ اب اس تقریب کے اختتام
میں کافی وقت لگ گیا۔ کھانا ابھی باقی تھا۔ الجائی نے سردار تغلق کی بیگم سے اجازت مانگی وہ خیمے پر
پہنچ کر وہیں کھانا کھائیں گی لیکن عورتوں نے ان دونوں کو کھانے تک روکے رکھا۔ پھر کھانے کا آغاز
شروع ہوا۔ یہ انتظام نہیں بدانتظامی تھی بھنے گوشت اور میٹھی روٹیوں کے تھال آتے رہے اور عورتیں
بڑھ بڑھ کے اس میں سے حسب مرضی کھانا لیتی رہیں۔ نہ تو دسترخوان بچھا اور نہ رکابیاں پیالے
رکھے گئے۔ جن خواتین کے ساتھ بچے نہ تھے انہوں نے جھپٹے مار مار کر کھانا حاصل کیا لیکن
کی گود میں ننھے بچے تھے انہیں بڑی دقت پیش آئی۔ ان کے لیے تھال زمین پر رکھ دیے گئے اور
نے اس کے گرد بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا۔ الجائی نے اس بدانتظامی کو بڑی نفرت سے دیکھا۔ دلشاد
کو تو وحشت ہونے لگی اس کا تو وہاں سے بھاگ نکلنے کو دل چاہ رہا تھا۔

بہ ہزار دقت کھانا ختم ہوا اور عورتیں ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں۔ الجائی خاتون
نے پھر بڑی بیگم سے اجازت طلب کی۔ وہ مسکرا کے بولی "واہ بیگم امیر تیمور۔ کیا تم تنہا جاؤ گی۔ ہم
تمہیں رخصت کرنے کے لیے شہر کے دروازے تک چلیں گے"۔

الجائی اس بے ہنگم ہجوم سے پریشان ہو گئی تھی۔ جہانگیر الگ منہ بنا رہا تھا۔ اس نے کہا۔
"آپ کا بہت بہت شکریہ سردار بیگم۔ آپ ہمیں دو گھوڑے منگوا دیں اور یہیں سے رخصت کر دیں"۔

"نہیں، خاتون آغا۔" تغلق کی بیگم کو جیسے الجائی کا نام یاد آگیا۔ "یہ تو مہمان نوازی کے سراسر
خلاف ہے۔ پھر آپ کے ساتھ کابل کے بادشاہ کی ملکہ بھی ہیں۔ وہ کیا سوچیں گی کہ ان کے ساتھ ترکمان
نے کیسا سلوک کیا۔" یہ کہتے ہوئے سردار بیگم نے دلشاد کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ دلشاد
کو اس کا اس طرح دیکھنے کا انداز بڑا ناگوار گزرا۔ اسے ان نظروں میں حقارت اور نفرت کی جھلک

دکھائی دی ہوئی۔

اس عرصے میں سردار تغلق کی باقی بیگمات اور وہ تمام عورتیں اکٹھا ہو گئیں جو الجائی خاتون اور
دلشاد کو لینے کر آئی تھیں اور ایک بار پھر یہ اس جلوس کی صورت میں شہر کے دروازے کی طرف چلیں
جس طرح یہاں تک آئی تھیں۔ راستے میں جگہ جگہ چراغ جل رہے تھے کہیں روشنی زیادہ تھی اور کہیں نہ
ہونے کے برابر۔ ایسی تاریک جگہوں سے گزرتے ہوئے دلشاد کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے آس پاس
بہت سے لوگ موجود ہیں۔ اس کی کمر میں صرف چھوٹا خنجر اڑسا ہوا تھا۔ آتے وقت وہ تلوار یا تیر کمان
ساتھ اس لیے نہ لائی تھی کہ سالگرہ کی تقریب میں مسلح ہو کر جانا کچھ اچھا معلوم نہ ہوتا تھا۔

شہر کا دروازہ دور پرے دکھائی دے رہا تھا۔ دلشاد اور الجائی برابر چل رہی تھیں ان
کے آگے پیچھے عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ دروازے کے پاس کافی روشنی تھی اس لیے انہیں اطمینان
ہو گیا۔ شہر کا بڑا دروازہ بند تھا لیکن اس کے بیچ میں لگا ہوا چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ آگے چلنے والی
عورتیں ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگیں۔ الجائی اور دلشاد دروازے سے صرف چند قدم پیچھے تھیں
کہ ایک دم اندھیرا ہو گیا۔ گھپ اندھیرا۔ اسی وقت دلشاد کی آواز آئی "بڑی باجی"۔ الجائی نے بھی
جواب میں "دلشاد" کہا لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔

یہ حادثہ ایک لمحے میں گزر گیا۔ پھر ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ الجائی خاتون نے گھبرا کر چاروں
طرف نظر دوڑائی۔ دلشاد اسے کہیں نظر نہ آئی۔ چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسی وقت باہر
سے کسی عورت نے کہا "دلشاد یہاں ہے باہر آجاؤ"۔ الجائی جہانگیر کو سنبھالتی ہوئی تیزی
سے باہر نکل آئی۔ الجائی کے باہر نکلتے ہی باہر کی عورتیں بھرا مار کے الجائی کو دھکیلتی دروازے
کے اندر داخل ہو گئیں اور دروازہ بند ہو گیا۔

"دھوکہ" الجائی کے ہونٹ لرزے اور پھر اس نے زور سے چیخ ماری۔ اس کی چیخ کے
جواب میں دروازے کے اوپر کی برجیوں میں سے کئی قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے۔ الجائی گھبرا گئی
اور چیختی ہوئی خیموں کی طرف بھاگنے لگی۔

تیمور اور امیر حسین وغیرہ رات کی ضیافت سے فارغ ہو چکے تھے۔ سردار تغلق ان کا کھانا لے
کر خود ساتھ آیا تھا۔ کھانے کے دوران بھی وہ کچھ دیر بیٹھا ان سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہا

اور واپس جاتے وقت کہہ گیا کہ وہ اپنے شہر کے مہمانوں کو رخصت کر کے، ان لوگوں کو الوداع کہنے آئے گا۔ سردار تغلق اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھا وہ امیر حسین سے بڑی دلچسپ باتیں کرتا رہا۔ امیر حسین اس کی باتوں اور رویے سے بہت خوش ہوا۔

کھانے کے بعد تیمور نے سامان باندھنے کا حکم دیا۔ فالتو سامان خالی گھوڑوں پر بار کر دیا گیا۔ سواری کے گھوڑے بھی تیار کر لیے تھے کہ خواتین کے واپس آتے ہی وہ روانہ ہو جائیں گے ان کا ارادہ تھا کہ وہ رات بھر آہستہ آہستہ سفر کریں گے تاکہ صبح تک کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں وہ گھوڑوں کو کچھ دیر آرام دینے کے بعد پھر سفر کر سکیں۔ سردار تغلق نے ان کے ساتھ ایک راہبر بھیجنے کا بھی وعدہ کیا تھا تاکہ وہ راستہ نہ بھول جائیں۔

انہیں تیار رہتے کافی وقت گزر گیا لیکن الجائی خاتون اور دلشاد آغا اب تک واپس نہ آئی تھیں ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور خطرات جنم لینے لگے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایلچی بہادر کو شہر بھیجا جائے تاکہ وہ فوراً دونوں عورتوں کو واپس لے آئے۔ ابھی وہ یہ فیصلہ کر ہی رہے تھے کہ ان کی نظر شہر کے بڑے دروازے پر پڑی۔ دروازے پر روشن قندیلیں ایک دم بجھ گئیں۔ تیمور اور امیر حسین اس غیر معمولی بات پر چونک اٹھے لیکن جلد ہی پھر روشنی ہو گئی اور انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کی خیمہ گاہ اور دروازے کا درمیانی فاصلہ مشکل سے دو سو گز تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ کچھ عورتیں صدر دروازے سے باہر آ رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی الجائی کی چیخ رات کے سکوت کو توڑتی ہوئی ان کے کانوں تک پہنچی۔ الجائی کی پہلی چیخ پر انہوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا پھر اسی وقت دوسری چیخ بلند ہوئی اور پھر چیخوں کے ساتھ کوئی عورت ان کی طرف بھاگتی ہوئی دکھائی دی۔ تیمور نے الجائی خاتون کی آواز پہچان لی اور تیزی سے دوڑا۔ امیر حسین بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگا۔

الجائی خاتون چیختی چلاتی آ رہی تھی اس کی گود میں جہانگیر تھا لیکن وہ پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ تیمور نے بھاگتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ”الجائی گھبراؤ نہیں میں آ رہا ہوں۔“

”دھوکہ میرے سرتاج دھوکہ۔“ الجائی نے ان کے پاس پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا۔

جہاں پر یہ لوگ ملے تھے وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ قلعے کی روشنی وہاں تک نہ پہنچ رہی تھی۔ امیر حسین نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھا اور چیخ کر بولا۔ ”دلشاد کہاں ہے الجائی؟“

”دھوکہ امیر حسین۔ زبردست دھوکہ۔“ الجائی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ان لوگوں نے دلشاد کو روک لیا ہے اور مجھے دھوکے سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا ہے۔“

”میں خون کی ندیاں بہا دوں گا، تغلق کا۔“ امیر حسین پاگلوں کی طرح چیخا اور پھر تیزی سے خیمے کی طرف چلا۔ تیمور ایک لمحے میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ سالگرہ کا بہانہ۔ پرتکلف دعوت، جہانگیر کو اندر بلانا۔ تمام کڑیاں اس کے ذہن میں جڑتی چلی گئیں۔ اس نے جہانگیر کو الجائی کی گود سے لے لیا اور تیز تیز واپس ہوا..... خیمے کے پاس پہنچا تو خیموں سے آنے والی مدھم روشنی میں اس نے امیر حسین کو گھوڑے پر سوار ہوتے دیکھا وہ جہانگیر کو زمین پر اتار کر امیر حسین کی طرف دوڑا۔ امیر حسین پورا اسلحہ جسم پر سجائے گھوڑے پر سوار ہوا تھا۔ وہ ایڑ دینا چاہتا تھا کہ تیمور نے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام مضبوطی سے پکڑ لی۔

”امیر حسین ہوش میں آؤ۔“ کہتے ہوئے تیمور نے ایک ہاتھ سے امیر حسین کی پیٹی پکڑ کر پوری طاقت سے کھینچا..... امیر حسین بھی طاقتور جوان تھا لیکن اس وقت بدحواس تھا اس لیے توازن قائم نہ رکھ سکا اس کے پیر رکابوں سے نکل گئے۔ امیر حسین گھوڑے سے لڑھکا تو تیمور نے باگ چھوڑ کر اپنے بازوؤں میں اسے جکڑ لیا۔

”میں تمہیں نہیں جانے دوں گا امیر حسین۔“ تیمور نے اس پر اپنی گرفت اور مضبوط کر لی۔

امیر حسین نے بجائے زور کرنے کے اپنا جسم بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس طرح ہانپنے لگا جیسے پہلوان مات کھانے کے بعد ہانپتا ہے۔ ”مجھے جانے دو تیمور۔“ امیر حسین نے بچوں کی طرح بلکتے ہوئے کہا۔ ”میں فصیل سے سر ٹکرا کر مر جاؤں گا۔ میری دنیا اجڑ گئی تیمور۔“ اور امیر حسین جیسا عالی ہمت انسان رو دیا۔

الجائی خاتون جہانگیر کو لیے ان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ تیمور نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ امیر حسین ڈھلک کے بیٹھ گیا لیکن وہ بالکل بے جان ہو رہا تھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے فصیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”کیا ہو گا تیمور؟“ امیر حسین کی آواز میں بڑا اضمحلال تھا۔ ”کوئی تدبیر کرو دلشاد، دلشاد کو واپس لے آؤ۔“ تیمور نے فصیل پر نظر ڈالی۔ فصیل پر جگہ جگہ آگ روشن کر دی گئی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ شہر والے تیار ہیں۔ تیمور نے ہاتھ پکڑ کر امیر حسین کو اٹھایا۔ ”امیر حسین اگر تم ہوش و حواس درست

رکھو تو کوئی نہ کوئی تدبیر نکل آئے گی اس طرح دل چھوڑنے اور غلط قدم اٹھانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارے غلط قدم اٹھانے سے دلشاد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

تیمور اُسے تسلی دیتا ہوا اپنے خیمے میں لے آیا۔ تیمور اور امیر حسین کے تمام سوار پریشانی کے عالم میں کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے لیکن امیر کے خیمے میں جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ خیمے میں پہنچ کر تیمور نے الجائی کو بھاری زرہ لانے کو کہا۔ تیمور ہلکی زرہ پہن کر سفر کرتا تھا۔ بھاری زرہ وہ صرف خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتا تھا۔ تمام سامان گھوڑوں پہ لادا جا چکا تھا الجائی نے باہر نکل کر ایلچی بہادر کو بلایا اور اس کی مدد سے سامان اتار کر تیمور کی زرہ نکالی۔ وہ زرہ لے کر آئی تو اس نے دیکھا کہ امیر حسین کی نظریں خیمے کی چھت پر لگی ہیں اور تیمور بڑی بے چینی کے عالم میں خیمے میں ٹہل رہا تھا۔

الجائی خاتون نے زرہ پہننے میں تیمور کی مدد کی۔ تیمور نے ہلکی زرہ کے اوپر بھاری زرہ پہن لی ہلکے خود کی بجائے بھاری خود سر پر رکھا جس میں گلوبند کے طور پر آہنی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔ دائیں بازو پر جوشن چڑھایا۔ بائیں پر ڈھال چڑھائی۔ تیار ہو کر وہ باہر نکلنے لگا تو امیر حسین کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ دوڑ کر تیمور کے پاس آیا۔

"کہاں جا رہے ہو تیمور؟" امیر حسین نے گھبرا کے پوچھا۔

"میں فصیل کے قریب جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"تم نہیں جاؤ گے امیر حسین۔" تیمور نے امیر حسین کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں جنگ کرنے نہیں جا رہا ہوں بلکہ یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ جیوہ والے جنگ کے لیے کس حد تک تیار ہیں۔ تم تمام سواروں کے ساتھ رہنا اگر جیوہ والے دروازہ کھول کے مجھ پر حملہ کرنے آئیں تو تم بھی بڑھ کے آ جانا۔"

امیر حسین کچھ نہ سمجھ سکا۔ تیمور کی حکمت عملی اُس کی سمجھ سے باہر تھی۔ تیمور نے باہر نکل کر ایلچی بہادر کو بلایا اور حکم دیا کہ کسی درخت کی بھاری شاخ کاٹ کر لائی جائے۔ ایلچی بہادر فوراً بھاگ کے ایک بڑی شاخ کاٹ لایا۔ تیمور نے شاخ کو رسی کے ساتھ اپنی زین سے باندھ دیا۔ پھر اس نے جہانگیر کو پیار کیا۔ الجائی خاتون کو اُس مخصوص نظر سے دیکھا جس نظر سے وہ جنگ پر جاتے ہوئے اُسے دیکھا کرتا تھا۔

"خدا تمہارا حافظ و ناصر ہے ...... سرتاج۔" ...... الجائی نے جہانگیر کو سینے سے بھینچ لیا۔

تیمور سوار ہونے لگا تو امیر حسین بولا۔ "تیمور! تم میری دلشاد کے لیے موت کے منہ میں جا رہے ہو۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"اگر تم نے فصیل سے ٹکرا کر جان دے دی تو میں الجائی کے سامنے ہمیشہ شرمندہ رہوں گا۔"

تیمور گھوڑے پر بیٹھ گیا اور اُسے ایڑ لگائی۔

درخت کی شاخ زمین پر گھسٹ رہی تھی جس سے گرد اڑنا شروع ہو گئی۔ پہلے تو گرد نظر نہ آئی لیکن جب تیمور فصیل سے سو گز کے قریب پہنچا اور قلعے سے آنے والی روشنی اس پر پڑی تو گرد کا ایک طوفان سا اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ تیمور نے اپنے گھوڑے کو قلعے کے سامنے دائیں سے بائیں دوڑانا شروع کر دیا۔ گرد کی وجہ سے تیمور نظر نہ آ رہا تھا بس ایک بگولا سا دکھائی دیتا تھا جو دائیں بائیں تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ اس بگولے پر قلعے سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ کئی تیر تیمور کی خود اور زرہ سے ٹکرائے لیکن دوہری زرہ کی وجہ سے اُسے نقصان نہ پہنچا۔ تیمور کئی بار صدر دروازے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ تیمور یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح قلعے والے باہر نکل کر حملہ کریں۔ صرف اُسی صورت میں قلعے کے اندر داخل ہونے کی کوئی تدبیر ہو سکتی تھی لیکن قلعے والے رات کے وقت باہر آنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نظر نہ آتے تھے۔ تیمور نے ایک بار فصیل کے بالکل قریب پہنچ کر اپنی کمان سے کئی تیر اوپر پھینکے لیکن جیوہ والوں کو دروازہ کھولنے کی پھر بھی جرأت نہ ہوئی۔

نصف گھنٹے تک تیمور گرد اڑاتا اور گھوڑا دوڑاتا رہا۔ جیوہ والوں کے تیر تیمور کو نشانہ بنانے میں ضائع ہو گئے۔ جب دروازہ کسی طرح نہ کھلا تو تیمور واپس آ گیا۔ "جیوہ والے رات کے وقت باہر نکل کر حملہ نہیں کریں گے۔" تیمور نے گھوڑے سے اترتے ہوئے امیر حسین کو بتایا۔

"پھر ہم صبح تک انتظار کریں گے۔" امیر حسین بولا۔

"نہیں امیر حسین۔" تیمور نے نرمی سے کہا۔ "دن کے وقت اور کھلے میدان میں ہم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس صرف ساٹھ سوار ہیں۔ وہ ہمارے مقابلے پر چھ سو سوار لا سکتے ہیں۔ ان سے لڑنا خود کشی ہو گی۔"

"پھر ہم کیا کریں تیمور؟" امیر حسین بیزاری سے بولا۔

"صبح ہونے سے پہلے ہمیں جیوہ سے کم از کم ایک منزل دور نکل جانا چاہیے۔" تیمور نے اپنے

منصوبے کا اعلان کیا۔ یہ منصوبہ وہ گھوڑا دوڑانے کے دوران ہی بنا چکا تھا۔ "صبح کو زنگل پوری تیاری کے ساتھ خیوہ سے نکلے گا اور چاروں طرف ہماری تلاش کرے گا۔ وہ ہماری تلاش میں قلعے سے زیادہ دور نہ جائے گا۔ وہ رات پڑنے سے پہلے قلعے میں واپس چلا جائے گا۔"

"لیکن تیمور!" امیر حسین الجھتے ہوئے بولا۔ "اس طرح تو ہم دلشاد سے اور دور ہو جائیں گے۔ اس سے ہمیں کیا حاصل ہو گا؟"

"اس کا جواب فی الحال میرے پاس موجود نہیں۔ منزل پر پہنچ کر کچھ سوچا جائے گا۔" تیمور نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور فوراً کوچ کا حکم دیا۔ تیمور نے یہ بھی حکم دیا کہ خالی خیموں میں آگ لگا دی جائے۔ یہ خیمے خیوہ والوں نے انہیں بھیجے تھے۔

تیمور جب وہاں سے مغرب کی طرف چلا تو اس کی پشت پر خیمے جل رہے تھے اور دور پرے خیوہ کی فصیل پر بھی آگ روشن تھی۔ خیوہ والوں کو یقین ہو گیا کہ تیمور اور امیر حسین مایوس ہو کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہ لوگ تیزی سے سفر کرتے ہوئے اندازے کے مطابق ایک منزل دور نکل آئے۔ یہاں پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے ایک پہاڑی پر پڑاؤ ڈالا اور پہرے کا انتظام کر کے آرام کرنے لگے۔ تیمور کو ڈر تھا کہ امیر حسین کوئی حرکت نہ کر بیٹھے اس لیے اس نے امیر حسین کو اپنے برابر لٹا لیا تھا۔ انہیں آرام کرتے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ سویرا ہو گیا۔ تیمور نے دیکھا کہ امیر حسین اس سے کچھ دور بیٹھا ہے۔ اس کا منہ خیوہ کی طرف ہے اور وہ خلا میں گھور سے جا رہا ہے۔

"امیر حسین تم بہادر اور عالی ہمت جوان ہو۔" تیمور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ "اپنے ساتھیوں کو موقع نہ دو کہ تمہیں دیکھ کر مسکرائیں۔"

"تیمور۔ میں کیا کروں! کیا کروں؟" امیر حسین کے منہ سے ایک آہ سی نکل گئی۔

"تحمل سے کام لو۔ مجنوں کی طرح خود کو ناکارہ نہ بناؤ۔" تیمور نے بڑی محبت سے سمجھایا۔ "اب ہم خطرے سے باہر ہیں۔ کوئی صورت نکل آئے گی۔" اس وقت تیمور کی نظر ایلچی بہادر پر پڑی جو دور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تیمور نے اسے پاس بلا کے کہا۔ "ایلچی بہادر! تم خیوہ جاؤ گے۔ دلشاد کی خیریت ہمیں فوراً درکار ہے۔"

ایلچی بہادر نے سر جھکا دیا۔ "سردار۔ کاش میرے خون، میری کھال اور ہڈیاں آپ کے کام آ سکیں۔"

"وقت سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا ایلچی بہادر۔" تیمور نے مغرب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مولانا زین الدین کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ راستے کی مشکلات، منزل کو قریب تر کر دیتی ہیں۔"

... پلٹ کر بولا۔ "دیکھو ایلچی...... خود کو ضائع نہ کرنا۔ جاؤ خدا تمہیں خیریت سے واپس لائے۔"

ایلچی بہادر عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا اصلی نام کیا تھا؟ اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ ... قبیلے یا کہاں کا رہنے والا تھا۔ اس کا بھی کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن امیر تیمور کے کارناموں میں اسے ... ل حاصل ہے اور تاریخ نے اس کے ایسے ایسے کارناموں کو بیان کیا ہے کہ جنہیں پڑھ کر تعجب ... ہے۔ تیمور سے اس کی وفاداری اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی زخم آ جاتا تو فوراً کہتا کہ یہ تیمور ... انگی کی وجہ سے ہوا ہے۔ کہیں فتح حاصل ہوتی تو اسے تیمور کی بلند اقبالی سے تعبیر کرتا اور شکست کو ... بنی کہتا۔ تیمور کو ایلچی بہادر پر اس قدر اعتماد تھا کہ ہر اہم مہم پر ایلچی بہادر کو رابطہ افسر مقرر کرتا۔ ... خفیہ احکامات اسی کے ذریعے بھیجتا۔ اس لیے اس کا نام ایلچی بہادر پڑ گیا تھا۔ بہادر اس لیے ... امن کے زمانے میں تو وہ اپنی دلچسپ حرکتوں سے تیمور کے لیے سامان فرحت مہیا کرتا لیکن دوران ... کوہ گراں کی طرح میدان میں جم کر کھڑا ہو جاتا۔ زخم پر زخم کھاتا مگر اس کے قدم پیچھے نہ ہٹتے۔

ایلچی بہادر اپنے ساتھ بہت مختصر سامان رکھتا۔ اسلحے کے علاوہ اس کے پاس چمڑے کی ایک تھیلی تھی ... ن ایک طرے دار اونچی نوک والا خود، جھلملاتا پٹی دار لباس اور کامدار جوتے ہوتے۔ جس وقت وہ ... پڑے، کامدار جوتے اور طرے دار خود پہن کر نکلتا تو ایک جوکر معلوم ہوتا۔ لوگ اسے دیکھ کر مسکراتے ... بڑی بے پروائی سے ادھر ادھر گھومتا رہتا۔ اس ہیئت کذائی سے اس نے کئی معرکے بھی مارے ... کسی مہم پر روانہ ہوتے وقت نہ تو تیمور سے کوئی ہدایت حاصل کرتا اور نہ خود تیمور اسے کوئی ... دیتا۔ ایلچی بہادر خود اپنے طور پر مہم کے لیے لائحہ عمل تیار کرتا اور اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق ... پر عمل کرتا۔

تیمور کا حکم پا کر ایلچی بہادر نے اپنے چمڑے کے تھیلے کی تلاشی لی۔ رنگین کپڑے، جوتے اور ... لگالا اور ایک طرحدار نجومی کا روپ دھار کر خیوہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ تیز رفتاری سے سفر کرتا ... شام کو خیوہ کے نواح میں پہنچا مگر، رات شہر سے باہر ایک بستی میں گزاری اور صبح کو گھوڑے پر سوار ... اور آہستہ آہستہ شہر کے دروازے پر پہنچا۔ شہر پناہ کے بڑے دروازے کا چھوٹا دروازہ

کھلا تھا۔ اندر باہر مسلح سواروں اور پیادوں کا سخت پہرہ تھا اور ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھی جا رہی تھی۔ ایلچی بہادر کو فصیل پر بھی پہرہ نظر آیا۔ وہ یہ تمام انتظامات کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا دروازے پر پہنچ کر رکا اور گھوڑے سے اترا۔ اس کا حلیہ کچھ ایسا مضحکہ خیز اور طرفہ تماشا تھا کہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ بعض اس کا مذاق اڑانے لگے کچھ آوازے کسنے لگے۔

دروازے پر کافی مجمع لگ گیا تو پہریداروں کا حاکم، لوگوں کو ہٹاتا باہر آگیا۔ دروازے کا حاکم بہت بھاری بھرکم آدمی تھا۔ ایلچی بہادر اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے حاکم کو پہچان لیا۔ لیکن حاکم اس وضع قطع میں کیسے پہچانتا۔ اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "تو کون ہے؟ کیوں مجمع لگایا ہے؟"

ایلچی بہادر زور سے ہنسا۔ "تو جتنا موٹا ہے تیری عقل بھی اتنی ہی موٹی ہے"۔

"او خنزیر! تو میرا مذاق اڑاتا ہے"۔ حاکم بگڑ گیا۔ "میں تیری گردن مروڑ دوں گا"

ایلچی بہادر پھر ہنسا۔ "تو ایک نجومی اور رمال کی گردن مروڑے گا تو تیرا سردار تیرا پیٹ پھاڑ دے گا"۔

"تو نجومی، رمال ہے! نجومی ہے؟ غیب کی باتیں بتاتا ہے"۔ حاکم نے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ میں بتا سکتا ہوں کہ تیرے پیٹ میں کتنی آنتیں ہیں۔ تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں"

بہادر نے قہقہہ لگایا اور پھر ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

حاکم نے مجمعے کو ڈانٹ کے بھگا دیا پھر خوشامد سے بولا۔ "نجومی جی تم تو سب کچھ جانتے ہو مجھے بھی بتاؤ۔ میرا درجہ کب بڑھے گا؟"

ایلچی بہادر نے ادھر ادھر دیکھا۔ مجمع تو چھٹ گیا تھا لیکن کچھ محافظ قریب کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایلچی بہادر بولا۔ "میں نے کہا تھا کہ تیری عقل بھی موٹی ہے۔ یہ باتیں سب کے سامنے بتائی جاتی ہیں"۔

حاکم شرمندہ ہو گیا۔ بولا۔ "میرے ساتھ اندر آجاؤ...... نجومی جی"۔

ایلچی بہادر اس کے پیچھے چھوٹے دروازے سے اندر آگیا۔ اندر پہنچتے ہی بولا۔ "گھوڑا باہر کھڑا ہے"۔

"اس کی فکر نہ کرو نجومی جی"۔ حاکم نے ایک محافظ کو آواز دے کر گھوڑا اندر لانے کا حکم دیا۔ صدر دروازہ کھل گیا اور ایلچی بہادر کا گھوڑا قلعے میں لے آیا گیا۔

"اب تو کچھ بتاؤ نجومی جی...."۔ حاکم نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"سب کچھ بتاؤں گا۔ کسی اکیلے کمرے میں چل کے بیٹھ"۔ ایلچی بہادر نے اس کی بے صبری میں اور اضافہ کر دیا۔

حاکم اُسے لے کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپری منزل پر لے آیا۔ یہاں سے پورا شہر اور فصیل کا بیشتر حصہ نظر آ رہا تھا۔ شہر کے اندر مسلح سوار نظر آ رہے تھے۔ اور فصیل پر سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ایلچی بہادر نے کہا۔ "کمرہ بند کر دے۔ جب تک میں تیرا کام کرتا رہوں کوئی اندر نہ آنے پائے"۔

حاکم نے باہر نکل کے کچھ ہدایات دیں پھر واپس آ کر کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ اور دو زانو ہو کے ایلچی بہادر کے سامنے بیٹھ گیا۔

"سیدھا ہاتھ سامنے لا"۔ ایلچی نے حکم دیا اور پھر تھیلی سے ایک پوتھی نکال کر اس کے ورق دیکھنے لگا ایک صفحے پر رک کے اس نے کہا۔ "دیکھو جو میں پوچھوں سچ سچ جواب دینا ورنہ سب حساب گڑبڑ ہو جائے گا"۔

"سچ سچ بتاؤں گا نجومی جی"۔ حاکم گھگیا کے بولا۔

...... ایلچی بہادر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے ہاتھ کی لکیروں کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ کبھی الٹ پلٹتا کبھی انگلیاں کھینچ کے دیکھتا۔ پھر کھلے ہوئے صفحے کو دیکھنے لگتا۔ "ہاں اب پوچھ ...... کیا جاننا چاہتا ہے؟"

"میری ترقی کب ہو گی؟ دولت کب ہاتھ آئے گی؟ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ تین بیویاں ہیں"۔ حاکم اپنا شجرہ خود ہی بیان کرنے لگا۔ ایلچی سر جھکائے بیٹھا تھا لیکن اس کے کان حاکم کی باتوں پر لگے تھے۔

حاکم چپ ہوا تو ایلچی بہادر بولا۔ "تو تیری عمر چالیس سال ہے نا؟"

"چالیس۔ ہاں اتنی ہی ہو گی"۔ حاکم نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ٹھیک بتا۔ حساب گڑبڑ نہ کر"۔

"ہاں جی بالکل چالیس سال ہے"۔ حاکم نے فوراً تائید کر دی۔

"تیری چار شادیاں ہوں گی"۔

"تین تو ہو چکی ہیں۔ چوتھی بھی کرنا چاہتا ہوں لیکن آمدنی کم ہے۔"

"جو بھی کرنا پڑے گی۔ اس کا تعلق تیری قسمت سے ہے۔"

"لیکن میری قسمت میں کیا ہے؟ کب پلٹے گی قسمت؟" حاکم نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔

"تیرے نام کا پہلا اور آخری حرف کیا ہے؟" ایلچی بہادر نے جیسے سنی ان سنی کر دی۔

"میں نہیں جانتا جی۔ میرا نام ترگل ہے۔ تم خود دیکھ لو۔" حاکم نے اپنے ان پڑھ ہونے کا اظہار کر دیا۔ ایلچی بہادر سمجھ گیا کہ حاکم بڑا جاہل ہے۔ اب اس کا دماغ اور تیزی سے کام کرنے لگا۔ پھر وہ چونک کر بولا۔ "تُو نے ایک قتل کیا ہے؟"

"نہیں جی۔ میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔" ترگل نے فوراً انکار کر دیا۔

ایلچی بہادر ذرا بھی پریشان نہ ہوا اور فوراً کہا۔ "اسی لیے تیری قسمت اب تک نہیں پلٹی۔"

"جی میں مطلب نہیں سمجھا، کیا کسی کو قتل کرنے کے بعد میری تقدیر بدلے گی؟" ترگل نے گھبرا کر ہوئے پوچھا۔

"تُو کیسا ترکمان ہے۔ آج تک ایک آدمی بھی نہیں مارا۔ اچھا ٹھہر میں پھر دیکھتا ہوں۔" ایلچی بہادر اپنی پوتھی کے اوراق پھر اُلٹنے لگا۔ ایک جگہ رک کر پوچھا۔ "کیا نام بتایا تُو نے؟"

"ترگل۔ میں بتا چکا ہوں۔"

"ترگل۔" ایلچی بہادر نے یہ نام زیرِ لب دہرایا۔ پھر صفحے پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ بار بار ترگل کہہ کر انگلیاں پھیرتا۔ پھر ایک دم زور سے چیخا۔ "ترگل سردار۔ ترگل حاکم۔ ترکمانوں کا سردار ترگل۔ قابلِ احترام" اور ایلچی بہادر نے بڑی حیرت سے ترگل کے چہرے کا جائزہ لیا۔

ترگل کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ "کیا مطلب ہے اس کا نجومی جی؟" اس نے پریشان ہوتے ہوئے

"مطلب۔" ایلچی بہادر جلدی سے اٹھا اور ترگل کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ "سردار ترگل حاکم ترگل، میں آپ کو اور آپ کی اولاد کو مبارک باد دیتا ہوں اور تعظیم پیش کرتا ہوں۔"

ترگل اس کا منہ تکنے لگا۔ "نجومی جی۔ میں تو ایک معمولی سردار ہوں۔ محافظ دستے کا سردار۔ خیوہ کا حاکم تو سردار تکل ہیں۔ آپ کو دھوکہ ہوا ہے۔"

"قابلِ احترام ترگل۔" ایلچی بہادر نے سر جھکاتے ہوئے ادب سے کہا۔ "اے حاکم خیوہ میرا علم غلط

[illegible] ہو سکتا۔ ترگل اور تکل کی آوازیں یکساں ہیں۔ دونوں ناموں کے شروع میں ت اور آخر میں ل ہے میرا [illegible] لتا ہے کہ تکل کے بعد ترگل کو خیوہ کا حاکم اور ترکمانوں کا سردار ہوتا ہے۔"

"لیکن نجومی جی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ترگل لوکھلا گیا۔ "تم نے کہا کہ میں نے ایک قتل کیا ہے۔ یہ [illegible] ہے تم نے مجھے اور میری اولاد کو مبارک باد دی۔ جب کہ میری تینوں بیویوں سے اب تک کوئی اولاد [illegible] ہوئی۔ پھر تکل کی زندگی میں، میں حاکم خیوہ کیسے بن سکتا ہوں مجھے یہ سب خواب سا معلوم ہوتا ہے۔"

"معزز حاکم خیوہ۔" ایلچی بہادر نے اسی لجاجت اور ادب سے کہا۔ "آپ علم پر شبہ نہ کریں۔ آپ [illegible] ٹھیک آپ کے کوئی اولاد نہیں۔ میں نے آپ کی چوتھی شادی کی پیش گوئی کی ہے۔ ممکن ہے اس کی اولاد [illegible] کی ہونے والی ہو۔ جہاں تک ایک آدمی کے قتل کا معاملہ ہے۔ اس کا اظہار کرتے ہوئے مجھے خوف [illegible] ہوتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ خوف کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے بتاؤ۔ میں کسے قتل کروں گا اور خیوہ کا حاکم کیسے [illegible] گا؟" ترگل اُسے جھٹلانے کے باوجود پھر فریب کھا گیا۔ حاکم خیوہ کا خواب اتنا دلفریب تھا کہ وہ ایلچی [illegible] کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ایلچی بہادر نے ڈرتے ڈرتے بند دروازے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "اے حاکم خیوہ۔ [illegible] قتل کی اطلاع مجھے میرے علم نے دی ہے، ممکن ہے وہ تکل کا قتل ہو کیونکہ آپ قتل کے بعد ہی حاکم [illegible] بنیں گے۔"

ترگل اپنے حاکم کا نام سن کر پہلے تو کانپ اٹھا لیکن حاکم ہونے کا نشہ جیسے اُس پر ابھی سے سوار ہو [illegible] تھا۔ وہ سنبھل کے بولا۔

"نجومی جی۔ اگر تمہاری بات سچ نکلی تو میں تمہارا منہ جواہرات سے بھر دوں گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں [illegible] کب قتل کروں گا؟"

"اے ترکمانوں کے سردار۔" ایلچی نے چہرے پر افسردگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس [illegible] میں یہ نہیں بتا سکتا کہ تکل کب قتل ہو گا۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ میں سردار تکل کا ہاتھ [illegible] اور اس کا زائچہ بناؤں۔ اگر مجھے سردار تکل کا ہاتھ دیکھنے کا موقع مل گیا تو میں آپ کو شاید دن [illegible] تک بتا دوں۔"

ترگل سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "سردار تکل کے پاس میں تمہیں لے جا سکتا ہوں۔"

"اے محترم سردار! آپ کی خاطر مجھے تکل کے پاس جانے میں کوئی عذر نہیں لیکن کہیں ا۔
ہم پر شبہ نہ ہو جائے اور ہم دونوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ آپ اسے ہاتھ دکھاتے پر کیا
کریں گے؟"

"نجومی جی یہ کوئی مشکل بات نہیں۔" ترگل نے فوراً کہا۔ "میں سردار تکل کے پاس جا کر آپ کی
تعریفیں کروں گا۔ تقدیر کا حال کون نہیں جاننا چاہتا۔ وہ ضرور آپ کو بلوائے گا۔"

"معزز سردار۔" ایلچی بہادر بولا۔ "آپ مستقبل میں خیوہ کے حاکم ہونے والے ہیں اور ہم نجو
کے لیے حکم ہے کہ حاکموں کا کہنا مانو۔ اس لیے میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ مجھے تکل نے بلا بھیجا
کی مشکل آسان ہو جائے گی۔ اب میں آپ کے پاس ٹھہروں گا۔ باہر نکلوں گا تو لوگ پھر مجھے گھیر لیں گے
عام آدمیوں کے ہاتھ نہیں دیکھا کرتا۔ آپ محبت سے پیش آئے تھے اس لیے میں نے آپ کا ہاتھ د
مجھے خوشی ہے کہ مجھے آپ کا ہاتھ دیکھ کر معلوم ہو گیا کہ خیوہ کا ہونے والا حاکم اور ترکمانوں کا کماندار
ایلچی بہادر نے اپنی باتوں سے پورا یقین دلایا کہ آئندہ کا حاکم وہی ہوگا۔ ترگل کے دماغ میں
اس قدر بیٹھ گئی کہ وہ اب ہر وقت خیوہ کی حاکمیت کے نشے میں چور رہنے لگا۔ اس نے اس دو
دو ایک سخت غلطیاں کیں لیکن وہ اپنے ماتحتوں میں بہت مقبول و ہر دلعزیز تھا اس لیے بات د
گئی۔ ورنہ اگر تکل کو خبر ہو جاتی تو معلوم نہیں وہ کیا غضب ڈھاتا۔ ایلچی بہادر کی خوب خاطر مدارت
وہ اوپر کے کمرے میں بیٹھے پورے شہر کا تماشا دیکھتے اور معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔

⊙

سردار تکل کو جب تیمور کے خیوہ کے دروازے پر آنے کی خبر ہوئی تو وہ اس خیال سے
خوش ہوا تھا کہ تیمور جیسا شکار اتنا خطرناک ریگستان پار کر کے خود اس کے جال میں آ پھنسا۔
فوراً فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تیمور کو گرفتار کر کے بلادِ شمال کے خانِ اعظم سے ایک بھاری رقم حا
گا۔ اس کے ساتھ ہی اسے تیمور کا وہ اسلحہ بھی حاصل ہو جائے گا جو وہ اور اس کے آدمی ا

لیکن جب تیمور سے ملا اور اس نے دلشاد آغا کو دیکھا تو اس کے دماغ میں دوسرا ہی فتور پیدا ہو
مور کی گرفتاری کا خیال پس پشت پڑ گیا اور اب وہ دلشاد آغا جیسی حسین عورت کو اپنے قابو میں کرنے
بیریں کرنے لگا۔ تیمور کی گرفتاری یوں بھی ذرا مشکل ہو گئی تھی کیونکہ تیمور نے بڑی چالاکی سے تاریخی
جنگی رسم کا سہارا لے کر قلعے کے اندر جانے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے خیمے باہر لگوائے تھے۔

پھر جب تیمور نے آنے والے خطرے کو بھانپ کر فوری روانگی کا اظہار کر دیا تو سردار تکل نے
بیٹے کی سالگرہ کا ڈھونگ رچا کر دلشاد آغا کو گرفتار کر لیا۔ دلشاد آغا کو اس کے آدمیوں نے اندھیرے
میں ڈال کر پکڑا تھا۔ وہ اس کشمکش میں بے ہوش ہو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک آرام دہ
پر پڑے پایا۔ ایک ہی لمحے میں سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے دھوکے سے پکڑا
ہے اور اب اس جگہ سے رہائی مشکل ہے۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بڑی دلیر عورت تھی
کے ساتھ جنگوں میں حصہ لے چکی تھی اور اپنے ضدی شوہر سے کہیں زیادہ عقلمند تھی۔ اس کے کمرے
دروازے پر زبردست پہرہ تھا اور وہاں سے بھاگنے کی کوشش موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی۔ اس لیے
نے خود کو حالات کے سانچے میں ڈھالنے کا فیصلہ کیا اور غصہ کی بجائے نرم رویہ اپنانے کو بہتر سمجھا۔

صبح کے وقت اُسے کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ آرام و آسائش کا پورا سامان بھی پہنچا دیا گیا۔
لے کر اس کے پاس کئی خادمائیں آئیں۔ جب وہ سامان رکھ کر واپس جانے لگیں تو دلشاد نے ان
سے ایک عورت کو روک کر کہا۔ "تم ہمارے پاس رہو گی۔"

دلشاد کا انداز بڑا شاہانہ تھا۔ وہ کابل کی ملکہ رہ چکی تھی۔ خادمہ گھبرا گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
"سردار کا حکم ہے کہ ہم سامان پہنچا کر واپس آ جائیں۔ کسی کو اندر رہنے کی اجازت نہیں۔"

"اگر ہمیں کسی چیز کی ضرورت پڑی تو ہم کسے پکارتے پھریں گے۔" دلشاد نے تیوریوں پر بل
ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں کیا بتاؤں جی۔ یہ تو آپ سردار سے کہیں۔" خادمہ نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

"جاؤ اور اپنے سردار سے کہو کہ ہم ایک خادمہ کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔" دلشاد
نے رعب سے خادمہ کو حکم دیا۔ خادمہ سر جھکا کے چلی گئی۔ دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔
تھوڑی دیر بعد خادمہ واپس آئی۔ مسکراتے ہوئے مگر ادب سے بولی۔ "جی آپ کسی ملک کی

ملکہ ہیں؟

"کل تک ہم ملکہ تھے آج تمہارے سردار کے قیدی ہیں" دلشاد نے جھلا کر جواب دیا۔

"آپ جی۔ وہ آپ کس ملک کی ملکہ ہیں؟" خادمہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "سردار نے بتایا تھا میں نام بھول گئی ملکہ جی۔ آپ بتا دیجیے سردار ناراض نہ ہو جائیں"۔

خادمہ بہت کم عمر تھی۔ دلشاد کو اس کی بھولی باتوں میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ پیار سے بولی "اگر ہم بتائیں کہ ہم ملک کابل کی ملکہ تھے تو تم کیا کرو گی؟"

"ہاں کابل کی ملکہ جی" خادمہ خوش ہو گئی۔ "یہی نام بتایا تھا سردار نے..... اور جی سردار نے کہا ہے کہ کابل کی ملکہ سے کہنا جتنی خادمائیں چاہے وہ اپنے پاس رکھیں جس چیز کی ضرورت ہو منگوا لیں"

دلشاد کی دلچسپی بڑھی۔ اس نے پوچھا "اور کیا کہہ رہے تھے تمہارے سردار؟"

"جی۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ..... ملکہ وہ جی کابل کی ملکہ کو غصہ تو نہیں تھا؟"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"جی میں نے کہہ دیا کہ وہ ناراض تو نہیں لگتیں"۔

"اور کچھ کہا تھا سردار نے؟"

"اور تو کچھ نہیں کہا تھا" خادمہ رک کر سوچنے لگی۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔ بولی "ہاں ملکہ جی سردار کہہ رہے تھے ملکہ اجازت دیں تو وہ ملنے آ جائیں؟"

"نہیں!" دلشاد کو ایک دم غصہ آ گیا۔ خادمہ سہم کر واپس جانے لگی۔ "تم کہاں جا رہی ہو؟" دلشاد نے پوچھا۔

"سردار کے پاس جا رہی ہوں ملکہ جی" خادمہ نے سادگی سے کہا۔

"تم نہیں جاؤ گی۔ یہیں بیٹھو" دلشاد نے اسے بٹھا لیا۔ خادمہ ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی۔ دلشاد کو اس کی بھولی صورت پر ترس آ گیا۔ پوچھا "کیا ہمارے پاس بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ واپس کیوں جانا چاہتی ہو؟"

"بس تو ہم گھبرا گئی۔ آپ کے پیروں میں رہنا چاہتی ہوں ملکہ جی" خادمہ نے خلوص سے کہا۔ "پر سردار کو جواب دینا تھا"

ی جواب دینا تھا سردار کو؟" دلشاد فکر کے دھاروں میں ذرا دیر پہلے کی بات بھول گئی۔

ادمہ نے اسے قدرے تعجب سے دیکھا "ملکہ جی..... آپ نے کہا نہیں تھا کہ آپ سردار سے ں گی"

لشاد اپنی بھول پر مسکرائی۔ "یاد آ گیا۔ اچھا تم بیٹھی رہو۔ ہم سوچ کے جواب دیں گے"۔

ادمہ اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" دلشاد نے اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ساتری۔ ملکہ جی۔ سب تو ساتری ساتری پکارتے ہیں پر وہ" خادمہ کہتے کہتے شرما گئی۔

"وہ کون؟" دلشاد نے دلچسپی سے پوچھا۔ ساتری جواب دینے کے بجائے کچھ اور سمٹ گئی۔

"تمہاری شادی ہو گئی ساتری؟" دلشاد نے دوسرا سوال کیا۔

ی ملکہ جی ہو گئی ہے، پر شادی ابھی نہیں ہوئی ہے"۔ ساتری جلدی جلدی انگلیاں چٹخانے لگی۔

لشاد ہنس پڑی۔ "یہ ہو گئی ہے، نہیں ہوئی۔ کیا کہہ رہی ہے؟ میاں کے گھر نہیں گئی ابھی تک؟"

ال ملکہ جی۔ بالکل یہی بات میں کہہ رہی تھی"۔ سیدھی ساتری کی مشکل دلشاد نے آسان کر دی۔

ں وقت دروازے پر کھٹکا ہوا۔ دلشاد نے کہا "دیکھو دروازے پہ کون ہے" حالانکہ دلشاد نے لم سردار تکل کو دروازے کی آڑ میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔ شاید وہ ساتری کے پیچھے ہی پیچھے آ گیا تھا۔ ے دیکھ کر ہنس ہنس کے باتیں کرنا شروع کر دی تھیں تاکہ سردار تکل پہ اس کا دلی رنج و غم ظاہر سردار تکل نے جب دلشاد کو اس بے فکری سے باتیں کرتے دیکھا تو اس نے جواب کا انتظار کیے نت دلشاد سے ملنے کا ارادہ کر لیا اور دروازے پہ آہستہ سے دستک دی۔

اتری باہر دیکھ کر گھبرائی ہوئی واپس آئی۔ "ملکہ جی۔ ملکہ جی۔ بڑے سردار آئے ہیں"۔

تو گھبرا کیوں رہی ہے؟" دلشاد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "آئے ہیں تو آنے دے"۔

اتری واپس ہوئی تھی کہ سردار تکل خود ہی اندر آ گیا۔ دلشاد نظریں نیچی کیے اسے کن انکھیوں یکھتی رہی۔ تکل اس سے کچھ دور آ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" تکل نے گھبرا کے ا

اجازت اندر آنے سے پہلے مانگنا چاہیے تھی حاکم خیوہ"۔ دلشاد خواہ مخواہ مسکرا دی۔

سردار تکل کو دلشاد کے مسکرانے سے ذرا ہمت ہوئی۔ بولا "غلطی ہوگئی۔ معاف کردو دلشاد

"قیدی سے معافی نہیں مانگا کرتے سردار تکل"۔ دلشاد کا لہجہ شکایت آمیز تھا لیکن وہ بعد میں

مسکرا دی۔

"تم قیدی نہیں دلشاد آغا"۔ تکل نے ہمت کر کے کہا "تم ملکہ کابل ہو۔ میں تمہیں اب بھی

چاہتا ہوں"۔

"ملکہ کابل۔ دیے زخموں کو نہ چھیڑو سردار تکل"۔ دلشاد نے بڑے درد سے کہا۔ "کابل تو

کے لیے چھوٹ چکا ہے۔ کابل والوں نے جو بے وفائی کی ہے۔ اس سے ہمیں نفرت ہوگئی ہے۔ اب

واپس نہیں جانا چاہتے"۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں دلشاد آغا"۔ تکل لگاوٹ سے بولا۔ "میں تمہیں کابل سے زیادہ

عظمت دوں گا۔ تم تو میرے دل کی......" معاً تکل کی نظر ساتری پر پڑی۔ وہ ساتری کو قہر آلو

سے گھورتے ہوئے بولا۔ "تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے۔ جاتی کیوں نہیں باہر"۔

ساتری ڈر کے پیچھے ہٹی۔ دلشاد نے کہا۔ "سردار تکل جو لوگ اپنے ملازموں سے محبت نہ

وہ قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتے۔ ملازم تو اپنے آقا کے دست و بازو ہوتے ہیں"۔

سردار تکل شرمندہ ہو گیا بولا۔ "ٹھیک ہے دلشاد آغا"۔ پھر ساتری سے کہا۔ "مت جا۔

اپنی نئی مالکن کی دل لگا کر خدمت کر۔ تجھے انعام ملے گا"۔

"نئی مالکن"۔ دلشاد نے نظریں اٹھا کر تکل کو کچھ یوں دیکھا کہ وہ جھوم اٹھا۔ "سردار تکل ن

کے یہ طریقے نہیں ہوا کرتے۔ دل کا سودا دل سے ہوتا ہے اور قید کر کے کسی کا دل نہیں جیتا جا

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں دلشاد آغا"۔ سردار تکل نے تاسف سے کہا۔ "تم آزاد ہو

جہاں چاہو گھوم پھر سکتی ہو لیکن یہاں سے فرار کی کوشش بیکار ثابت ہوگی تم اپنا اغنیا رہی کھو

"سردار تکل ہمیں غلط نہ سمجھو۔ تمہارا یہ قلعہ ہمیں پسند آیا تھا لیکن تم نے غلط طریقہ اختیا

نے ذرا کھل کے کہا۔

"دلشاد آغا میں غلطی کی معافی مانگ چکا ہوں......" تکل انکسار سے بولا۔ "مجھے ا

نہ کرو"۔

"ہم نے جس دن تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ اسی وقت تمہاری نظروں کا پیغام سن لیا تھا"۔ دلشاد دبی بولی

ے اس نے تکل کی بات سنی ہی نہیں۔ "پھر انتظار کرتے رہے کہ نظروں کا پیغام زبان پر لاؤ گے مگر تم نے...

نے......" دلشاد نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"ملکہ دلشاد آغا"۔ سردار تکل ذرا انتظار کے بعد بولا۔ "دل کا پیغام زبان پر تو آگیا ہے۔ اب تو

بدلنا چاہیے"۔

"سردار تکل"۔ دلشاد نے مدبرانہ انداز اختیار کیا۔ "ابھی ہمارے درمیان بہت سی دوریاں ہیں۔

ہی مسئلے حل ہونا ہیں۔ اگر تم نے صبر سے کام نہ لیا تو تم ہمیں کھو دو گے"۔ دلشاد نے کپڑوں میں چھپا ہوا ایک

خنجر نکالا۔ سردار تکل گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور حیرت سے دلشاد آغا کو دیکھنے لگا۔

"گھبراؤ نہیں سردار تکل"۔ دلشاد مسکرائی۔ "یہ خنجر کسی دشمن کے لیے نہیں۔ اگر تم نے بے صبری کا

اہرہ کیا تو یہ خنجر خود ہمارے خون سے رنگین ہوگا۔ ہم نے اسے صرف اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہے"۔

"میں صبر کروں گا دلشاد۔ جب تک تم کہو گی صبر کرتا رہوں گا"۔ سردار تکل نے اسے مطمئن کرنے کو

"مجھے صرف یہ یقین ہونا چاہیے کہ ایک دن میں تمہیں اپنا سکوں گا"۔

"سردار تکل تم بھی مسلمان ہو اور جانتے ہو...... کہ شوہر کے مرنے کے بعد بھی عورت کو چار پانچ

ل گوشہ نشین ہونا پڑتا ہے"۔ دلشاد نے مناسب موقع سمجھ کے بات چھیڑ دی۔ "ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم

امیر حبیب مارا گیا یا قید ہے"۔

"اس کا مارا جانا بہتر ہوگا یا قید ہوتا دلشاد آغا کو کس بات سے خوشی ہوگی"۔ سردار تکل نے اس

الٹا سوال کر دیا۔

سردار تکل کے اس سوال سے دلشاد آغا گھبرا گئی۔ اسے قطعی علم نہ تھا کہ امیر حبیب اور تیمور وغیرہ

با گزری۔ اگر وہ قید میں اور دلشاد یہ کہتی ہے کہ اس کا مارا جانا بہتر ہے تو کہیں سردار تکل اسے قتل

روے۔ اسے فوراً جواب دینا تھا۔ اس نے فوراً جواب دیا۔ "سردار تکل۔ یہ تمہارے سوچنے کی بات

۔ ہمیں تو دونوں صورتوں میں چار۔ پانچ ماہ تک گوشہ نشین ہونا پڑے گا۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ

پنے ماضی کو قطعی بھول کے نئی زندگی اپنانے کے لیے خود کو تیار کر لیں گے"۔

دلشاد نے اپنے جواب سے سردار تکل کو مطمئن بھی کر دیا اور بڑی چالاکی سے چار پانچ ماہ تک

خود کو محفوظ بھی کر لیا تھا۔ سردار تگل نے اپنے اطمینان کا زبان سے بھی اقرار کیا۔" دلشاد آغا۔ میں آپ کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔ امیر حسین اور تیمور کو میں نے خود معاف کر دیا۔ وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔ ان کا ارادہ بحیرہ خوارزم جانے کا تھا لیکن بغیر کسی راہنما کے وہاں تک پہنچنا قطعی ناممکن ہے۔ وہ صحرا میں بھٹک بھٹک کر مر جائیں گے۔"

دلشاد نے خدا کا شکر ادا کیا کہ امیر حسین وغیرہ اس ظالم کے ہاتھ سے بچ کے نکل گئے ہیں۔ ایسے ہی فکر تھی کہ امیر حسین اپنی ضدی طبیعت سے مجبور ہو کر کہیں جبوہ والوں سے لڑ بھڑ کر خود کو ختم نہ کر لے۔

سردار تگل مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اب وہ روزانہ تھوڑی دیر کے لیے دلشاد آغا کے پاس آتا اور رسمی گفتگو کر کے چلا جاتا۔ دلشاد کو قلعے کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی لیکن اس نے اس حویلی کے باہر قدم نہیں نکالا جس کے ایک کمرے میں وہ قید تھی۔ پوری حویلی دلشاد کے حوالے کر دی گئی تھی۔ اس کے آرام آسائش کا ہر سامان وہاں موجود تھا۔ اندر باہر بے شمار خادم اور خادمائیں اس کے اشارے کی منتظر رہتیں لیکن وہ سوائے ساتری کے کسی کو منہ نہ لگاتی۔

دلشاد ایک دن بہت اداس بیٹھی تھی۔ سردار تگل تھوڑی دیر پہلے اس سے ملاقات کر کے گیا تھا ساتری کسی کام سے باہر گئی تھی۔ واپس آئی تو دلشاد کو خاموش اور پریشان دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ وہ دلشاد سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "ملکہ جی! کیا آپ بیمار ہیں؟"

"نہیں تو۔" دلشاد نے فوراً اپنے چہرے پر مصنوعی خوشی سجا لی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا غم کسی پر ظاہر ہو۔

"تو پھر سردار نے آپ کا دل دکھایا ہوگا۔" ساتری سادگی سے بولی۔ "وہ سب کو یونہی ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہیں۔"

"اپنی بیویوں کو بھی ڈانٹتے ہیں کیا؟" دلشاد نے اسے ٹٹولا۔

"ملکہ جی۔ سردار کی عورتیں تو اس سے کانپتی ہیں۔" ساتری بھولپن سے بتانے لگی۔ "اگر کوئی جواب دے دے تو پھر اس کو خوب پیٹتے ہیں۔ ڈنڈوں سے مارتے ہیں اور ملکہ جی....." ساتری ادھر ادھر دیکھ کر چپ ہو گئی۔

"کہو ساتری۔ ڈرو مت۔ جب تک میں یہاں ہوں تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" دلشاد نے اسے

لی دی۔ وہ تگل کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ساتری دلشاد کے پیروں کے پاس کھسک آئی اور پیر دباتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ "ملکہ جی اپنے سردار تگل ہیں نا، یہ بڑے ظالم ہیں۔ ہر سال ایک بیوی کو مار ڈالتے ہیں اور نئی شادی کر لیتے ہیں۔ وئی بولے تو اسے بھی قتل کرا دیتے ہیں۔"

دلشاد کو سردار تگل سے اور زیادہ نفرت ہو گئی۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

"ساتری ہم تاتاری ہیں۔" دلشاد بولی۔ "تاتاری عورتیں اپنے دوستوں کو دھوکہ نہیں دیتیں ہم جس سے محبت کرتے ہیں ٹوٹ کے محبت کرتے ہیں۔"

"کیا آپ سردار تگل سے بھی محبت کرتی ہیں ملکہ جی؟" ساتری نے پتہ نہیں کیوں یہ سوال کیا۔

"تجھے شک کیوں ہوا ساتری؟ تو نے سنا نہیں ہم اس سے شادی کرنے والے ہیں۔" دلشاد نے ا کر کہا لیکن اس کی ہنسی میں ہزاروں کرب پوشیدہ تھے۔

"ملکہ جی۔ ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہ مانیں گی؟" ساتری سادگی سے بولی۔

"تو بری بات کہے گی تب بھی ہم ناراض نہ ہوں گے اس لیے کہ تو ہم سے محبت کرتی ہے۔" دلشاد ہنس کر کہا۔

ساتری خاموش رہی۔ شاید وہ کہتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ دلشاد بولی۔ "تجھے ہم پر اعتبار ں ساتری؟"

"ہے ملکہ جی! پر ڈر لگتا ہے۔" ساتری نے کہنا شروع کیا۔ "ملکہ جی میری سمجھ میں یہ بات نہیں ہ کہ آپ تگل سے کیوں محبت کرتی ہیں۔ اس نے آپ کو آپ کے لوگوں سے چھین لیا۔ آپ کو اپنا کوئی ر والا یاد نہیں آتا؟"

دلشاد حیرت سے ساتری کا منہ دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ "ساتری کیا تجھے اپنے شوہر سے بہت محبت ہے؟"

"ہاں ملکہ جی بہت ہے۔" ساتری جذباتی ہو گئی۔ "وہ مجھے نہ ملا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

"تجھے اگر اس سے چھین کر اس طرح قید کر دیا جائے تو تیرا دل کیا کرے گا؟" دلشاد سوال کر کے ں کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔

"میں تڑپ تڑپ کے مر جاؤں گی ملکہ جی۔" ساتری کے جذبات میں جیسے ابال آ گیا۔

"ہمارا بھی یہی حال ہے ساتری۔" دلشاد کی آنکھیں بھر آئیں۔ "ہم نے بھی جان دے دی ہوتی لیکن بس ایک اُمید پر زندہ ہیں۔ شاید یہاں سے چھٹکارے کی کوئی صورت نکل آئے۔"

"ملکہ جی آپ کتنی دکھی ہیں۔" ساتری دلشاد کے پیروں پر سر رکھ کے رونے لگی۔

○

سردار تکل، ادھر کچھ دنوں سے دلشاد کے پاس دونوں وقت آنے لگا تھا۔ وہ پہلے مزاج پرسی کر کے چلا جاتا تھا لیکن اب وہ گھنٹوں بیٹھا دلشاد کا دماغ چاٹتا رہتا۔ کبھی کہتا کہ میں شادی کے بعد تمہارے لیے ایک عالی شان محل بنواؤں گا۔ کبھی اپنے خزانوں کا ذکر کرتا۔ دلشاد ان باتوں سے الجھتی لیکن مجبوراً اسے تکل کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتی۔ سردار تکل میں کچھ زیادہ ہی حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اکثر وہ دلشاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا۔ اس کے بال بکھیر دیتا۔ گدگدانے لگتا۔ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ دلشاد دل میں کڑھتی مگر ہنستی، مسکراتی رہتی اور خود کو کسی نہ کسی طرح اس سے بچاتی رہتی۔ اُسے یہ تو معلوم تھا کہ تیمور اور امیر جیلان بچ کر نکل گئے اور وہ کسی نہ کسی تدبیر میں لگے ہوں گے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ اسے خطرہ پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں سردار تکل طاقت کے زور پر اس پر قابو نہ حاصل کر لے۔ اس نے فرار کی تمام صورتوں پر غور کیا تھا۔ اسے ساتری کی ہمدردیاں اور مدد حاصل تھی۔ ساتری نے اپنے ہونے والے شوہر سے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر دلشاد کسی طرح شہر سے نکل کر باہر آ جائے تو اسے بھاگنے کے لیے ایک تیز رفتار گھوڑا مہیا کر دیا جائے گا۔ ساتری کی یہ ہمدردی اس کے لیے بڑی طمانیت کا باعث تھی لیکن وہ فرار کے لیے آمادہ نہ تھی۔ اُسے اپنے آدمیوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جیوہ سے جانے کے بعد ان پر کیا گزری۔ ہاں اُسے یہ ضرور یقین تھا کہ وہ لوگ جیوہ کے زیادہ دور نہ گئے ہوں گے اور ایک نہ ایک دن اُسے چھڑانے ضرور آئیں گے۔

ایک صبح سردار تکل آیا تو وہ معمول سے کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔ اس کی اس خوشی سے دلشاد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دلشاد نے دل پر جبر کرتے ہوئے مسکرا کے پوچھا۔ "حاکم جیوہ بہت خوش نظر آ رہا ہے؟"

"ہاں دلشاد آغا۔" تکل خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ "جیوہ میں ایک نجومی آیا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ماضی اور مستقبل کی تمام باتیں بتا سکتا ہے۔"

"نجومی۔" کے نام پر دلشاد کے خون کی گردش ایک دم تیز ہو گئی لیکن وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "گمراہ تو خوش ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ نجومی تو بے سر پیر کی اڑاتے ہیں۔ ان کی باتوں پر بیوقوف یقین کرتے ہیں۔"

"نہیں دلشاد۔" تکل سنجیدہ ہو گیا۔ "وہ ملکوں ملکوں گھوما ہے۔ پورا ملک تاتار اس کا چھانا ہوا ہے۔ وہ تمہارے کابل بھی ہو آیا ہے۔"

"سردار تکل۔" دلشاد مصنوعی غصے سے بولی۔ "کابل کا نام ہمارے سامنے نہ لیا جائے۔ چھوٹے دیس کا رشتہ کیا۔ اب جیوہ ہمارا ہے اور ہم جیوہ کے ہیں۔"

سردار تکل خوشی سے پھول گیا۔ "کیوں نہیں، دلشاد آغا۔ اب تو آپ جیوہ کی ملکہ بننے والی ہیں۔"

دلشاد نے سر جھکا لیا۔ پھر حیا آلود نظروں سے تکل کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "سردار تکل! وہ وقت بھی آ جائے گا بشرطیکہ تم نے صبر کا دامن نہ چھوڑا۔"

سردار تکل سنبھل گیا۔ "دلشاد آغا! مطمئن رہیں۔ میں وعدہ خلافی نہیں کروں گا۔"

ابھی اسی قدر گفتگو ہوئی تھی کہ باہر سے اطلاع آئی کہ صدر دروازے کے محافظوں کا سردار سلام کے لیے حاضر ہوا ہے۔ سردار تکل اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "وہ آ گیا، دلشاد آغا۔ میں اس سے مل کے تمہارے پاس آؤں گا۔"

"کون آ گیا ہے؟" دلشاد نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ اس کا دل اچھلنے لگا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہی نجومی آیا ہے جس کا ذکر ابھی تکل نے کیا تھا۔

"ارے بھئی۔ وہی نجومی۔" سردار تکل جلدی جلدی بتانے لگا۔ "وہ ہمارے محافظ سردار کے پاس کئی دن سے پڑا ہوا ہے۔ محافظ سردار نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ دلوں کا حال بتا دیتا ہے۔ پہلے میں اپنا ہاتھ دکھاؤں گا پھر۔" اور سردار تکل ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

سردار کے جانے کے بعد دلشاد نے ساتری سے کہا۔ "ذرا جا کے دیکھ تو نجومی کس صورت و شکل کا آدمی ہے۔ تو بھی اپنا ہاتھ دکھا دیجیو۔"

"واہ، ملکہ جی! میں کیوں غیر مرد کے سامنے اپنا ہاتھ کروں"۔ ساتری شرماتے ہوئے بولی۔ "ہاتھ تو بس اپنے ہی مرد کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اچھا لگتا ہے"۔

ساتری تو یہ سادہ سا جملہ کہہ کے باہر نکل گئی لیکن دلشاد کے دل میں جیسے اس کا جملہ تیر بن کر اٹک گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ساتری نے اپنی سادگی میں کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔ ہاتھ تو اپنے ہی مرد کے ہاتھ میں اچھا لگتا ہے اور میں بدقسمت ہوں کہ اپنوں سے دور اس شہر کے قید خانے میں پڑی ہوں۔ پتہ نہیں امیر حسین کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو میرے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اس کا جی چاہا کہ چیخ کے امیر حسین کو پکارے یا پھر دیواروں سے سر ٹکرا کے جان دے دے۔ وہ بڑی دیر تک انہی خیالوں میں ڈوبی رہی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد ساتری واپس آئی تو اس کی حالت دیکھ کر دلشاد چونک پڑی۔ اُس کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ آنکھوں میں گرد گھسی ہوئی تھی اور کپڑے جگہ جگہ سے مسکے ہوئے تھے۔ ساتری ہانپتی ہوئی آئی اور دلشاد کے پاس بیٹھ کر اپنی سانس درست کرنے لگی۔

"یہ کیا حال بنایا ہے تُو نے ساتری"۔ دلشاد نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بکھرے بال، چہرے پر گرد۔ جگہ جگہ سے مسکے ہوئے کپڑے۔ کسی نے کسی......"

ساتری ٹھٹھا مار کے ہنس پڑی۔ "ملکہ جی! کسی کی کیا مجال کہ میرے ہاتھ بھی لگا سکے۔ میں اس کی بوٹیاں نہ نوچ ڈالوں۔ یہ تو میں نجومی کو دیکھنے گئی تھی جو یہ حال ہوا ہے میرا"۔

"تو کیا نجومی نے تیرے کپڑے پھاڑے ہیں؟" دلشاد نے ہنس کے پوچھا۔

"ملکہ جی! بس نہ پوچھیے کچھ"۔ ساتری نے مزے مزے لے کے بتانا شروع کیا۔ "اتنی بھیڑ تھی، اتنی کہ سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔ اور وہ بیچارہ نجومی ان میں دبا جا رہا تھا"۔

"تو پھر دکھایا تُو نے اپنا ہاتھ؟" دلشاد نے اپنے مطلب کی بات کی۔

"ہاتھ دکھانا کیسا ملکہ جی"۔ ساتری ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ "میں تو اُس کے پاس بھی نہیں پہنچ سکی۔ وہ سب کا ہاتھ بھی تو نہیں دیکھتا۔ بس حاکموں اور بڑے بڑے سرداروں کا ہاتھ دیکھتا ہے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ اس نے بڑے دروازے والے سردار کا ہاتھ دیکھا تھا اور اس کے باپ دادا اور اُن کے بھی باپ دادا تک کا حال بتا دیا۔ بہت بڑا نجومی ہے ملکہ جی"۔

"تُو نے اُس کی شکل و صورت تو دیکھی ہوگی؟" دلشاد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ملکہ جی"۔ ساتری سوچتے ہوئے بولی۔ "شکل تو دور سے اچھی طرح دکھائی نہیں دی۔ ہاں اُس کی اونچی چوپچ دار ٹوپی دکھائی دے رہی تھی۔ کپڑے بڑے بھڑکیلے پہن رکھے تھے۔ ملکہ جی اُس پر پٹیاں سی پڑی تھیں، اوپر سے نیچے تک"۔

"اور اُس کے جوتے کامدار تھے۔ سفید سنہرے تاروں سے بنے ہوئے"۔ دلشاد نے ایک دم گھبرا کر پوچھا۔

ساتری نے بڑی حیرت سے دلشاد کو دیکھا بولی۔ "ملکہ جی! یہ بات آپ سے کس نے کہی۔ میں نے اُس کے جوتے نہیں دیکھے لیکن لوگ کہہ رہے تھے کہ اس کے جوتوں پر سونے چاندی کے تار لگے ہیں"۔

دلشاد کا دل مسرت سے بھر گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ نجومی سوائے ایلچی بہادر کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ایلچی بہادر اپنے طرحدار...... خود اور کامدار جوتوں کے لیے مشہور تھے۔ ان کا یہ لباس اور سامان اس نے بھی دیکھا تھا۔ دوران سفر ایلچی بہادر نے کئی بار طرحدار خود اور کامدار جوتے نکالے تھے لیکن تیمور نے انہیں منع کر دیا کہ ابھی ان کے پہننے کا وقت نہیں آیا کیونکہ اس صورت میں وہ کہیں پہچان نہ لیے جائیں۔ تاتاریوں کا تو بچہ بچہ ایلچی بہادر سے واقف تھا۔

اب دلشاد ایلچی بہادر کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ اس نے پوچھا "نجومی کہاں ہے اس وقت؟"

"سردار اپنے ساتھ لے گئے ہیں اُسے"۔ ساتری نے کہا۔ "وہ اس کے تو بڑے دماغ ہیں ملکہ جی۔ کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا، ملکہ جی"۔ ساتری ذرا قریب ہوتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ "ملکہ جی! آپ اُسے اپنا ہاتھ ضرور دکھائیں۔ کیا پتہ وہ کوئی اچھی بات بتا دے"۔

"ہاں ساتری! ہم ہاتھ دکھائیں گے اُسے"۔ دلشاد نے کہا۔

"میں بھی ہاتھ دکھاؤں گی پھر تو!" ساتری خوش ہو گئی۔ "آپ کہہ دیجئے گا سردار سے"۔

دلشاد اپنے خیالوں میں گم سوچ رہی تھی کہ ایلچی بہادر یہاں تک پہنچے ہیں تو ضرور کوئی پیغام لائے ہوں گے۔

سردار تگل جب دلشاد کے پاس سے اٹھ کے اپنی حویلی پر پہنچا تو وہاں لوگوں کا بڑا اژدہام تھا۔

مرد اور عورتیں، نجومی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ صدر دروازے کے محافظ نے نجومی کا زبردست پرچار کیا تھا۔ چنانچہ جب وہ نجومی کو لے کر سردار تکل کی حویلی کی طرف جا رہا تھا لوگوں نے اُسے گھیرنا شروع کر دیا اور سردار تکل کی حویلی تک پہنچتے پہنچتے کئی سو آدمی اکٹھا ہو گئے۔ تکل نے لوگوں کو سخت سست کہہ کر بھگا دیا اور نجومی کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ نجومی کو ساتھ لانے والا محافظ سردار بھی ان کے پیچھے ہی اندر پہنچ گیا۔

"نجومی جی! تمہارا نام کیا ہے اور کہاں کے رہنے والے ہو؟" سردار تکل ذرا رعب سے بولا۔

نجومی نے سردار کو گھورا اور بے پروائی سے بولا۔ "اے خیوہ کے حاکم! ہم لوگوں کا نہ کوئی نام ہے اور نہ ٹھکانہ۔ ہر ایک ہمارا ایک نیا نام رکھتا ہے۔ جہاں شام ہوئی وہی اپنا ٹھکانہ ہو گیا لیکن حاکم خیوہ کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ نجومی نہ تو کسی کی رعایا ہوتے ہیں اور نہ غلام۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ان کی مرضی پر کوئی اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتا۔ نہ انہیں کسی بات پر مجبور کیا جا سکتا ہے!"

سردار تکل نجومی کے رعب میں آ گیا۔ نرمی سے بولا۔ "نجومی جی! معاف کیجیے۔ میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔ میں آپ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ محافظ سردار نے آپ کی تعریف کی ہے تو ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ میں آج خود ہی آپ سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔"

ایلچی بہادر کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ بولا۔ "حاکم خیوہ! تم اپنی صورت نہیں لیکن دل کے اچھے لگتے ہو۔ مجھے تمہاری خدمت کر کے خوشی ہو گی۔"

سردار تکل نے فوراً اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ "تو میرا ہاتھ دیکھیے نجومی جی۔ میری قسمت کیا کہتی ہے؟"

ایلچی بہادر نے اس کا ہاتھ آہستہ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "سردار بہادر! میں گلیوں پھرنے والا نجومی نہیں کہ جب اور جہاں کہو ہاتھ دیکھنے بیٹھ جاؤں۔ ہاتھ دیکھنے اور زائچہ بنانے کے لیے کچھ ہوتے ہیں۔ آپ کو ان کی پابندی کرنا ہو گی۔"

"میں پابندی کروں گا۔ آپ حکم دیجیے۔" سردار تکل گھبرا گیا۔ "اگر معاوضے کی پیشگی ادائیگی کا ہو تو وہ حاضر کیا جائے!"

ایلچی بہادر نے قریب کھڑے ہوئے محافظ سردار کو تیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "سچ سچ بتا سردار۔ میں نے تجھ سے کتنا معاوضہ طلب کیا ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں لیا آپ نے۔" محافظ سردار نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے میرے بارے میں جو کچھ بتایا اس کے صلے میں تو میں اپنی جان تک دینے پر آمادہ تھا لیکن آپ کو مجھ سے کچھ نہیں ملا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں اس کے لیے۔"

"سن لیا حاکم خیوہ!" ایلچی نے سردار تکل کی طرف رُخ کر کے کہا۔ "قلندر کو دو روٹیوں اور دو گز زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم معاوضہ لے کر کیا کریں گے؟ کہاں خرچ کریں گے؟ اپنا کام تو شہر در شہر سیاحت کرنا ہے۔ ہم صرف ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہاتھ دیکھتے اور مستقبل کا حال بتاتے ہیں۔ یہ ہمارا پیشہ نہیں حاکم خیوہ۔"

"مجھے اپنی باتوں پر بڑا افسوس ہے نجومی جی۔" سردار تکل شرمندگی سے بولا۔ "دراصل میں ان دنوں ایک ایسی الجھن میں گرفتار ہوں جس نے میرا چین آرام چھین لیا ہے۔ اس لیے آپ کو تکلیف دینا چاہتا ہوں۔"

"اچھا تو تخلیہ کرایا جائے۔ ہم تخلیے میں اپنا حساب لگاتے ہیں۔" ایلچی بہادر نے حکمانہ انداز میں کہا۔

"تخلیے سے آپ کا کیا مراد ہے نجومی جی؟ یہاں تو ہمارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔" سردار نے ادب سے پوچھا۔

ایلچی بہادر نے محافظ سردار کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے ادب سے کھڑا تھا۔

"اگر نجومی جی کا اشارہ محافظ سردار کی طرف ہے تو میں اُسے ابھی باہر بھیجے دیتا ہوں۔" اور سردار تکل نے محافظ سردار کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

"تخلیے کا مطلب ہے کہ جس جگہ ہم بیٹھے ہیں یہاں سے بیس بیس گز تک کوئی انسان موجود نہ ہونا چاہیے۔" ایلچی بہادر نے اس پر اپنے فن کا اور رُعب جمایا۔

سردار تکل فوراً اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس نے حویلی کے محافظ کو حکم دیا کہ فوراً حویلی سے تمام لوگوں کو باہر نکال دیا جائے اور کسی کو اندر نہ داخل ہونے دیا جائے۔ جب تک حویلی خالی نہ ہو گئی سردار تکل وہیں کھڑا رہا۔ محافظ نے فوراً تمام لوگوں کو حویلی سے نکال باہر کیا۔ اُدھر سے اطمینان ہونے کے بعد سردار تکل نجومی کے پاس واپس آ گیا۔

ایلچی بہادر نے پوچھا۔ "غالباً تخلیہ ہو گیا ہے۔ ہم اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔"

نجومی جی! میں نے پوری حویلی خالی کرا دی ہے۔ آپ بے خوف اپنا کام شروع کریں۔
ایلچی بہادر نے اپنی پوتھی کھولی اور ورق گردانی شروع کر دی۔ وہ کسی صفحے کو غور سے
پھر سردار تگل کے چہرے کو گھورتے، کبھی کچھ حساب لگاتے۔ کچھ دیر تک اسی قسم کی حرکتیں کر
بعد بولے "ہاں حاکمِ خیوہ! اب میں آپ کا ہاتھ دیکھ کر آپ کے مستقبل کا حال بتاؤں یا آپ
کوئی سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

"پہلے آپ میرا ہاتھ دیکھیے" تگل نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ "سوال میں، آپ سے ا
کروں گا۔"

ایلچی بہادر نے سردار تگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھنا شروع کیا۔ وہ ایک ایک
جھک کر دیکھتے۔ پھر سیدھے ہو کر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگتے۔ کبھی منہ ہی منہ میں کچھ
ایک لکیر کو ——— وہ دیر تک دیکھتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی سردار تگل کا چہرہ بھی ا
نے کئی بار دیکھا۔ پھر پوتھی کے اوراق الٹتے ہوئے ایک صفحے پر رک گئے۔

"حیرت۔ بڑی حیرت" ایلچی بہادر چیختے ہوئے بولے اور نظریں سردار تگل کی پیشانی
دیں۔ "یہ سب کب اور کیسے ہوگا؟ میں نہیں جانتا مگر ہونا ضرور ہے۔" ایلچی بہادر نے جیسے ا
سے کہا۔

"کیا ہوگا نجومی جی؟" سردار تگل نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"قابلِ احترام سردار!" ایلچی بہادر نے آنکھیں بند کر لیں "اگر میرا علم غلط نہیں تو مجھے
پیشانی پر دو تاج نظر آ رہے ہیں۔ ایک تاج شاہِ تاتار کا اور دوسرا تاج سلطنتِ افغان کا۔
قدموں میں شاہِ تاتار اور حاکمِ کابل کے سر جھکے ہوئے صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ سب
ہوگا؟ میں نہیں جانتا لیکن وہ دونوں آپ کے پاس آئیں گے اور آپ کے آگے سر جھکا

سردار تگل کا حیرت سے منہ کھل گیا۔ "آپ عظیم ہیں، نجومی جی! آپ کا علم سچا ہے۔"
کی زبان سے نکلا۔

"مگر میں یہ نہیں بتا سکتا کہ ایسا کب ہوگا۔" ایلچی بہادر نے آنکھیں کھول دیں۔ "ا
اور شاہِ کابل! میں آپ کو تعظیم پیش کرتا ہوں۔ آپ کو دونوں ممالک کی تاجداری مبارک ہو۔"

سردار تگل کچھ سوچتے ہوئے بولا "اے عظیم نجومی اگر وہ دونوں حاکم میرے قدموں میں آ جائیں
ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟"

"اے حاکم!" ایلچی بہادر نے بڑے رعب سے کہا "اس کا جواب ستارے اور ہاتھ کی لکیریں نہیں
عقل کے پاس اس کا جواب موجود ہے۔ تخت و تاج خون کی قربانی مانگتا ہے۔ دشمن کو زندہ نہ
چاہیے۔ موقع ملتے ہی اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔"

سردار تگل سوچ میں پڑ گیا۔ نجومی کی بات اسے سچی معلوم ہوئی۔ ملک تاتار کا سردار تیمور اور حاکم کابل
پاس خود چل کے آئے تھے اس نے انہیں گرفتار کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا لیکن وہ دلشاد کی محبت
ہو گیا اور وہ دونوں جان بچا کر نکل گئے۔ اس نے پوچھا "اے عظیم نجومی! ذرا یہ تو دیکھیے اگر میں انہیں
کر دوں تو بھی کیا مجھے تاتار اور کابل کی حکومتیں مل جائیں گی؟"

"وہ حکومتیں تو حاکمِ خیوہ کی تقدیر کا حصہ ہیں۔ آپ کے سر پر ان حکومتوں کا تاج تو ضرور رکھا جائے
ایلچی بہادر نے اس کے دل کی الجھن محسوس کر لی تھی۔ اس لیے اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے کہا۔
ایک تاجدار کی اعلیٰ ظرفی ہوگی کہ وہ اپنے دشمنوں کو معاف کر دے۔ یا ان کی جان بخشی فرمائے۔"

سردار تگل کو اس سے اطمینان ہو گیا اس نے تیمور اور امیر حسین کو چھوڑ کر غلطی کی تھی لیکن جب اس
مقدر میں دونوں سلطنتوں کی حکمرانی لکھی ہے تو پھر چھوڑنے یا مارنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے
عظیم نجومی! آپ نے بڑی خوشخبری سنائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کوئی خدمت کروں۔"

"اے حاکم! بادشاہوں کی تعظیم اور خدمت ہم نجومیوں کا فرض ہے۔" ایلچی بہادر نے بے نیازی سے
میری خدمت یہی ہے کہ مجھے عزت سے رخصت کر دیا جائے۔" پھر ذرا ٹھہر کر بولا۔ "اگر حاکم کو کوئی اور مشکل
ہو تو میں خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" ایلچی بہادر نے اب سردار تگل کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ایک مشکل ہے۔" سردار تگل ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا "اگر نجومی اس کے حل کی صورت پیدا
تو میں زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔"

"میں اپنی خدمات پہلے ہی پیش کر چکا ہوں حاکمِ خیوہ......" ایلچی بہادر نے کہا "اپنی مشکل بیان کیجیے"
"شرم محسوس ہوتی ہے۔ آپ کے سامنے کہتے ہوئے" سردار تگل سر جھکا کے بولا۔ "عظیم نجومی مجھے
رت سے محبت ہے مجھے وہ کس طرح حاصل ہوگی۔"

ایلچی بہادر نے دوبارہ پوتھی کھولی اور پوتھی کے اوراق اور سردار تکل تخمے ہاتھ کی لکیروں کی مدد سے حساب کتاب کرنے لگے۔ ذرا دیر بعد بولے..... "حاکم خیوہ اپنی محبوبہ کا نام بتائیں؟"

"نام دلشاد ہے عظیم نجومی۔"

"دلشاد۔" ایلچی بہادر نے نام دہرایا اور ورق الٹنے لگے۔ پھر ایک جگہ ٹھہر کے پوچھا۔ "نام غلط تو نہیں بتا رہے ہیں؟"

"نہیں عظیم نجومی! اس دلربا کا نام دلشاد ہی ہے۔" سردار تکل سرمستی کے عالم میں بولا۔

ایلچی بہادر نے سردار کا ہاتھ دیکھا پھر پوتھی، پھر ہاتھ، پھر پوتھی، یہ عمل اس نے کئی بار دہرایا۔ اس کے بعد اس نے بڑے غصے سے سردار تکل کو دیکھا۔ سردار تکل اس کی قہر آلود نظروں سے سہم گیا۔ بولا۔ "کیا ہوا عظیم! کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

ایلچی بہادر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پوتھی بند کرتے ہوئے غصے سے بولا۔ "حاکم خیوہ! مجھے افسوس ہے کہ آپ نے میری بات کا اعتبار نہ کیا۔ آپ مجھے جھوٹا اور مکار سمجھتے ہیں۔ ورنہ آپ مجھے آزمانے کی کوشش نہ کرتے۔"

"نہیں..... میں آپ کو آزما نہیں رہا ہوں عظیم نجومی۔" تکل گھبرا گیا۔ "میں نے اپنی مشکل بیان کی ہے۔"

"جھوٹ، بالکل جھوٹ۔" ایلچی بہادر گرجے۔ "اپنی محبوبہ کا نام دلشاد بتاتے ہیں۔ یہ نام دال سے شروع ہو کر دال ہی پر ختم ہوتا ہے اور دال کے دونوں ستارے آپ کی قسمت کے خانے میں موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی محبوبہ آپ کے پاس ہے۔ آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ مجھے خواہ مخواہ ہی آزما رہے ہیں۔"

سردار تکل کچھ گھبرایا لیکن زیادہ نجومی کے علم کا قائل ہو گیا۔ فوراً التجا سے بولا۔ "عظیم نجومی معاف کر دیجئے۔ سوال کرنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ دلشاد واقعی میرے پاس ہے لیکن اس کی محبت مجھے اب تک حاصل نہیں ہو سکی۔ میری یہی مشکل ہے۔"

ایلچی بہادر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ مسکرا کے بولے۔ "ہم نجومیوں کو کسی کا مذاق پسند نہیں۔ آپ نے پہلے ہی یہ پوچھا ہوتا ہمیں اتنی محنت کیوں کرنا پڑتی۔"

"چلیے اب معاف کر دیجئے۔ بتائیے مجھے اس کی محبت کب حاصل ہو گی؟" سردار تکل نے پوچھا۔

"حاکم خیوہ! جو باتیں آپ سے متعلق تھیں وہ میں نے بتا دیں لیکن اس کا تعلق دوسری ہستی

میں اس کا ہاتھ دیکھ کر زائچہ تیار نہ کروں۔ آپ کو کیا جواب دے سکتا ہوں۔" ایلچی بہادر نے آخر حرف پہلے ہی آنے اور دلشاد سے ملنے کی تدبیر پیدا کی۔

"یہ تو کچھ مشکل نہیں۔ میں آپ کو ابھی وہاں لیے چلتا ہوں۔" حاکم خیوہ نے فوراً پیش کش کر دی۔

"کیا وہ ہاتھ دکھانے پر آمادہ ہو جائے گی؟"

"میں کوشش کروں گا۔ شاید وہ انکار نہ کرے۔"

ایلچی بہادر نے آخر دلشاد سے اپنی ملاقات پکی کر لی۔ اس وقت وہ جس قدر خوش تھے اس کا بیان ہے۔ انہیں اپنی کوشش کامیاب ہوتے دکھائی دے رہی تھی۔

سردار تکل نجومی کو ساتھ لیے ہوئے اپنی حویلی میں داخل ہوا۔ اس نے ایک خادمہ سے دلشاد کو آنے کی اطلاع بھجوائی۔ جب یہ دونوں حویلی کے اس کمرے کے پاس پہنچے جہاں دلشاد موجود تھی تو بھیجی ہوئی خادمہ واپس آتی ہوئی دکھائی دی۔ سردار نے پوچھا۔ "کیا جواب دیا ہے دلشاد نے؟"

"انہوں نے اجازت دی ہے، سردار اور کہا ہے کہ سردار کو اجازت مانگنے کی ضرورت نہیں۔"

جواب دیا۔

"دیکھا عظیم نجومی۔" سردار نے نجومی سے کہا۔ "میں نہ کہتا تھا کہ اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا لیکن عالم مجبوری ہے۔"

نجومی ہوں، کہہ کے سردار کے ساتھ دلشاد کے کمرے میں داخل ہوا۔ دلشاد دروازے کی طرف پشت کیے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے آئینے میں سردار کے ساتھ ایلچی بہادر کو داخل ہوتے دیکھا تو اس کا دل خوشی سے کھل اٹھا۔

سردار اور نجومی اس کے قریب پہنچے تو دلشاد نے پلٹ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "سردار تکل! اس بار کہاں سے پکڑ لائے؟"

"دلشاد آغا! کیا کہہ رہی ہو؟" سردار تکل ترشی سے بولا۔ "یہ عظیم نجومی ہیں۔ ان کی نظریں تمہارے دل تک پہنچ سکتی ہیں۔" اس دوران میں دلشاد اور ایلچی بہادر کی نظریں مل چکی تھیں اور اس خاموش زبان کا تبادلہ بھی ہو گیا تھا۔ دلشاد نے بڑے نخرے سے کہا۔ "ہوں گے نجومی پھر ہم کیا کریں؟"

"آپ انہیں اپنا ہاتھ دکھائیں دلشاد آغا" سردار تکل نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں نجومیوں پہ اعتبار نہیں کرتی یہ ہاتھ نہیں دکھاؤں گی۔" دلشاد نے صاف انکار کر دیا۔

سردار تکل شرمندہ سا ہو گیا۔ اُسے بہت غصہ آیا مگر ضبط کر کے بولا۔ "ہماری خاطر ہاتھ دکھا دیجیے دلشاد آغا۔"

سردار تکل نے اتنی خوشامد اور انکسار سے کہا کہ دلشاد کو ہنسی آ گئی۔ بولی۔ "ہمیں سردار تکل کی خاطر منظور ہے۔" پھر بڑی شوخی سے نجومی کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "لیجیے۔ دیکھیے نجومی جی، امید ہے آپ کوئی سیدھی بات نہ بتا سکیں گے اور پھر ذلیل کر کے یہاں سے نکالے جائیں گے۔"

"ذلت اور عزت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے، لڑکی۔" ایلچی بہادر متانت سے بولے۔ "لیکن میں ہاتھ دیکھ کر اُن تین ستاروں کا حال معلوم کرنا چاہتا ہوں جو تیری پیشانی پہ چمک رہے ہیں۔"

"ستارے، میری پیشانی پر؟" دلشاد نے قہقہہ لگایا۔ پھر دوڑ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا

"نجومی جی آپ کی پہلی بات ہی غلط ثابت ہو گئی میرے ماتھے پر کوئی ستارہ نہیں۔"

"ستارے میری نظر میں دیکھ رہی ہیں تو نہیں دیکھ سکتی لڑکی۔" پھر نجومی نے سردار تکل کی دیکھا۔ "میں جا رہا ہوں حاکم خیوہ لڑکی بہت ضدی معلوم ہوتی ہے۔ میں اس کا ہاتھ نہیں دیکھوں گا"

"واہ دیکھیں گے کیوں نہیں، نجومی جی....." دلشاد نے دوبارہ ہاتھ نجومی کی طرف بڑھاد

"میں سردار کو ناراض نہیں کر سکتی۔"

سردار تکل کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔ اس نے مسکرا کے نجومی کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "اب تو ہاتھ دیکھ لو، عظیم نجومی۔"

"تخلیہ۔" ایلچی بہادر نے اپنی مخصوص آواز میں حکم دیا۔

"کیا میں بھی باہر چلا جاؤں؟" سردار تکل نے پوچھا۔

"حاکم خیوہ میں کہہ چکا ہوں کہ علم نجوم اور دست شناسی کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ان اصو کی پابندی ضروری ہے۔" حاکم خیوہ کی طرف منہ پھیر کے دلشاد کو نیم نظروں سے گھورا۔ "پھر یہ لڑ طرحدار اور شوخ ہے۔"

حاکم خیوہ سر جھکائے چپ چاپ باہر چلا گیا۔ اُس کے حکم سے پوری حویلی خالی کر دی گئی۔ ایلچی

ے اطمینان کے لیے کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھ لیا۔ انہیں دُور دُور تک
نظر نہ آیا تو وہ مسکراتے ہوئے دلشاد کے پاس آ گئے، دلشاد ایلچی بہادر کے آنے سے بہت خوش
اس پر خوف کا بھی غلبہ تھا۔

"ایلچی بہادر مجھے امید تھی کہ آپ لوگ، مجھے بھولے نہ ہوں گے۔" دلشاد نے خود گفتگو کا آغاز کیا۔

"دلشاد آغا وقت بہت کم ہے اور گفتگو بہت ہے۔" ایلچی نے جلدی سے کہا۔ "ہم آپ سے
یک منزل دور ہیں اور جب تک آپ کو آزاد نہ کرا لیں گے آگے قدم نہ بڑھائیں گے۔ آپ اپنا حال
یں آپ کو یہاں سے نکالنے کی سوچ رہا ہوں۔ سردار تکل کو آپ سے بہت محبت ہے یہی چیز
آپ کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔"

دلشاد نے مختصر طور پر ایلچی بہادر کو اپنی داستانِ غم سنائی اور اس سے درخواست کی کہ اُسے
ل کے چنگل سے جلد رہائی دلائی جائے ورنہ شاید وہ زیادہ دن تک خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔
نے اپنے طور پر بہت مختصر باتیں کیں لیکن وقت کافی گزر چکا تھا اور خطرہ تھا کہ کہیں سردار تکل
ر، آخر ایلچی بہادر نے جو ترکیب سوچی۔ وہ دلشاد کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی۔ ایلچی نے
دلشاد آغا میں سردار تکل کو اس بات پر آمادہ کر لوں گا کہ وہ خیوہ شہر سے قریب ترین
پر تنہا جائے۔ آپ کسی طرح اس کے ساتھ آنے کی کوشش کریں، بلکہ ضد کر کے آئیں ہم
ڑی میں چھپے ہوں گے اور سردار تکل کے وہاں پہنچتے ہی اس پر حملہ کر کے آپ کو آزاد کرا
یں۔"

"لیکن ایلچی بہادر تکل اتنا بے وقوف نہیں کہ آپ کے کہنے سے پہاڑی پر اکیلا چلا جائے۔"
نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔ "اگر وہ جانے پر آمادہ بھی ہو گیا تو اس پہاڑی پر کیسے جائے گا جہاں
پ چھپے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس شہر سے کچھ فاصلے پر چھوٹی بڑی کئی پہاڑیاں
ارہ مختلف سمتوں میں ہیں۔"

"یہ آپ کے سوچنے کی چیز نہیں ہے دلشاد آغا۔" ایلچی بہادر نے اسے مطمئن کرنے کے لیے
م ایک پہاڑی منتخب کر کے اس پر آگ جلائیں گے۔ اس کا دھواں جب بلند ہو گا تو سردار تکل
اس کو دیکھ کر اس پہاڑی پر ضرور جائے گا۔"

"مگر کیوں، وہ وہاں کیوں جانے گا؟ مجھے بھی تو بتایئے ایلچی بہادر۔" دلشاد کو کسی طرح اطمینا
نہیں ہو رہا تھا۔

"اچھا تو سنیے دلشاد آغا۔" ایلچی نے تفصیل بتانا شروع کی۔ "نکل آپ سے ملنے کے لیے
بہت بے چین ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ دلشاد آغا کب تک اس سے ملنے کے لیے آمادہ ہو
گی۔ میں اسے جا کر یہ یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ جب پہاڑ دھواں اگلنے لگیں تو وہاں
جو دعا کی جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ امید ہے وہ دھواں دیکھتے ہی پہاڑی کی طرف چل پڑے
آپ کا اس کے ساتھ یا اس کے بعد پہاڑی کے پاس آنا ضروری ہے۔ اگر سردار نکل کسی وجہ
نہ آئے تو آپ دھواں دیکھ کر پہاڑی کے پاس آنے کی کوشش کریں۔ پھر ہم سنبھال لیں گے مگر
ایک ترکیب ہے اگر ہم اس ترکیب میں ناکام ہو گئے تو پھر کام اور مشکل ہو جائے گا۔"

سردار نکل واقعی واپس آ گیا۔ نجومی پر وہ لاکھ اعتبار کرتا تھا لیکن دلشاد کے پاس اس کا
دیر تک رہنا پسند نہ آیا اور وہ بے چین ہو کر آ گیا۔ کسی کے آنے کی آہٹ سن کر نجومی نے زور
سے بولنا شروع کر دیا اور بڑھ کر خود ہی دروازہ کھول دیا۔ سردار نکل نے متجسس نظروں سے

"بلبل نے اپنا کام کر لیا ہے حاکم خیوہ۔" نجومی نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "منزل قریب اور بہ
قریب ہے۔"

"کیا واقعی؟" سردار نکل خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "دلشاد آغا نے تو مجھے چار پانچ مہینے
کرنے کے لیے کہا ہے۔"

"وہ بڑی ضدی لڑکی ہے حاکم خیوہ۔" نجومی نے قدرے غصے سے کہا۔ "لیکن اس کے د
آپ کی محبت موجود ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ بھی دیکھا اور زائچہ بھی بنایا تھا اگر میرا علم اور حسا
وغیرہ درست ہے تو آپ کی آرزو ان دنوں پوری ہو گی جب پہاڑیاں آنسو بہائیں گی ا
آہیں بھریں گی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں عظیم نجومی؟" سردار نکل نے رکتے ہوئے کہا۔ "کہیں پہاڑیاں بھی رو
آہیں بھرتی ہیں۔"

"حاکم خیوہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔" نجومی زور دے کر بولا۔ "میں ابھی سمجھاتا ہوں۔"

ہیں ہوں گی۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے دلشاد کی حویلی سے سردار نکل کی حویلی میں آ گئے تھے۔ دوپہر ہونے کی
جہ سے گرمی میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ سردار نکل نے شربت لانے کا حکم دیا۔ سردار نکل شربت پیتا
لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے نجومی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ نجومی نے بڑے اطمینان
ے شربت کا گلاس خالی کیا پھر بولا۔ "ہاں حاکم خیوہ! کس بات پر تعجب ہے آپ کو؟"

"جی کسی بات پر نہیں عظیم نجومی!" سردار نکل نجومی کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور شبہ بھی
ر کرنے کا خواہش مند تھا۔ آخر بہت سوچ کے پوچھا۔ "عظیم نجومی! یہ پہاڑیوں کے آنسو بہانے
ر آہیں بھرنے کا واقعہ کب تک پیش آنا ہے؟"

"آپ کے دل میں ابھی تک شک ہے، حاکم خیوہ۔" نجومی نے سنجیدگی سے کہا۔ "یاد رکھیے
ر اس پر یقین کیجیے کہ جس طرح ہم زمانے کے گرم و سرد سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ شجر و حجر بھی متاثر
تے ہیں۔ ان میں بھی جان ہے اور ہمارے جیسے جذبات موجود ہیں۔ خوشی ہوتی ہے تو ہنستے ہیں غم
روتے ہیں۔ درخت سے شاخ کو کاٹ دیا جائے تو وہ بے جان ہو جاتی ہے۔ سوکھ جاتی ہے اگر
خت میں جان نہ ہو تو شاخ اس سے الگ ہٹ کے کیوں مرجھائے۔ یہی حال پہاڑوں کا ہے لیکن
کی رفتار اس قدر سست ہوتی ہے کہ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔"

حاکم خیوہ، نجومی کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے پوچھا۔ "آپ سچ کہتے ہیں عظیم نجومی۔
عقل مند ہیں مجھے آپ کی باتوں پر کوئی شبہ نہیں لیکن مجھے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ پہاڑ آنسو
ہے ہیں یا آہیں بھر رہے ہیں؟"

"صبر کیجیے حاکم خیوہ! یہ میں بتاؤں گا۔" نجومی نے کہا۔ "شہر خیوہ سے قریب ترین پہاڑی
تنی دور ہے؟" نجومی یعنی ایلچی بہادر کو معلوم تھا کہ یہاں سے قریب صرف ایک پہاڑی سلسلہ
ے جس سے گزر کر وہ خود آیا تھا لیکن اس نے سردار نکل کو الجھانے کے لیے یہ سوال کیا۔

"قریب ترین پہاڑی سلسلہ چار پانچ فرلانگ ہوگا۔" سردار نکل نے اندازہ لگا کے کہا۔ "یہ
اڑی ہماری حویلی کی چھت سے دکھائی دیتی ہے۔"

"بس مسئلہ حل ہو گیا۔ اب میری بات غور سے سنیے۔" نجومی نے اپنی پوٹلی فوراً کھولی اور ورق

الٹنے لگا۔ ایک جگہ ٹھہر کے بولا

"یہ سال کا مبارک مہینہ ہے ان دنوں سورج برج زحل میں داخل ہو کر عطارد کی طرف جا
ہے۔ عطارد سے شہاب ثاقب پیدا ہوتے ہیں اور یہ ٹھنڈے ہو کر پہاڑوں کے دل گداز کر
دیتے ہیں۔ پہاڑ دنیا والوں کے غم سے بے چین ہو کر آنسو بہاتے ہیں جو شبنم کی شکل میں درختوں
پودوں اور پھولوں پر گرتی ہے۔ پھر پہاڑ آہیں بھرتے ہیں ان کا سینہ شق ہو جاتا ہے اور اس م
سے دھواں نکلتا ہے۔ یہ دھواں ایک لکیر سی بناتا ہوا آسمان کی طرف بلند ہوتا ہے۔ صبح کو یہ دھوا
دھند کی وجہ سے نظر نہیں آتا لیکن بعد دوپہر اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وقت دعا کے قبول ہ
کا ہے۔ ایسے وقت میں اگر کوئی شخص پہاڑ پر جا کر دعا مانگے تو اس کی دعا فوراً قبول ہو جاتی
علم نجوم کا یہ اٹل فیصلہ ہے۔ اس میں آج تک کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔"

نجومی نے سر اٹھا کے سردار نکل کو دیکھا اور پوچھا۔ "آ گیا سمجھ میں؟ آپ کی مراد پور
ہونے والی ہے۔"

سردار نکل حیران حیران نظروں سے نجومی کو تک رہا تھا اس کے سوال پر چونکا اور نیم
کے بولا۔

"عظیم نجومی! میں تو سوائے اس کے اور کچھ نہیں سمجھ سکا کہ پہاڑ سے دھواں اٹھے اور ا
جا کر دعا مانگی جائے تو وہ قبول ہو گی۔"

"آپ کے سمجھنے کی بس یہی بات تھی۔" نجومی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "حاکم خیوہ م
کام ختم ہو گیا۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ آپ کی محبوبہ آپ کو مل جائے گی۔ آپ اپنی مراد کو پہنچیں گ

"لیکن مجھے کیا کرنا ہو گا عظیم نجومی۔" سردار نکل نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ "جانے سے
پہلے مجھے تو کچھ بتاتے جایئے۔"

"حاکم خیوہ، میں نے سب باتیں سمجھا دی ہیں۔" نجومی سنجیدگی سے بولا۔ "آپ دوپہر کے بعد
پہاڑی پر نظر رکھا کیجئے۔ جب دھواں اٹھتا ہوا نظر آئے تو وہاں جایئے اور صدقِ دل سے دعا
مراد فوراً پوری ہو گی۔ دنوں میں بلکہ گھنٹوں میں۔"

"دنوں میں، گھنٹوں میں۔" سردار نکل کا دہانہ خوشی سے پھیل گیا۔ "اے عظیم نجومی! میں کس

شکریہ ادا کروں۔"

"اور اگر تمہارے ساتھ وہ شادی بھی چلی گئی تو۔" نجومی نے بڑی رازداری سے کہا۔

"تو پھر کیا ہو گا؟" سردار نکل نے اسی رازداری سے پوچھا۔

"تو مراد اسی وقت پوری ہو جائے گی۔"

"اسی وقت؟"

"ہاں ہاں۔ اسی وقت۔ جب تم واپس آؤ گے تو وہ تمہاری غلام ہو چکی ہو گی۔" نجومی نے سردار نکل پر کچھ ایسا
انداز ملا کہ اسے پورا یقین ہو گیا۔

نجومی کا کام ختم ہو چکا تھا اور اب وہ یہاں سے جلد بھاگنا چاہتا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا
لے کہا۔

"آپ کہاں جائیں گے۔ میں آپ کو پہنچوا دوں گا۔"

"قلندروں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ میں خود چلا جاؤں گا۔" نجومی نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"پھر کب آئیں گے عظیم نجومی؟" نکل نے چلتے چلتے سوال کیا۔

"تمہاری شادی میں یہ قلندر ضرور شریک ہو گا اور تمہیں آخری منزل پر پہنچائے گا۔" نجومی یہ کہتے ہوئے
سے نکل گیا۔

اب رات پڑ گئی تھی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ نجومی نے احتیاط کے طور پر ایک محافظ ساتھ لے لیا تاکہ
ی پریشانی کے صدر دروازے تک پہنچ جائے۔ صدر دروازے کا محافظ حاکم خیوہ ہونے کے خواب آنکھوں
اسے نجومی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ نجومی کو آتے دیکھا تو دوڑ کے آیا اور بڑی گرمجوشی سے ملا۔ نجومی نے
نے والے محافظ کو واپس بھیج دیا اور محافظ سردار کے ساتھ اوپر کے کمرے میں آ گیا۔

"سردار نکل کا ہاتھ دیکھا آپ نے؟" سردار نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں دیکھا۔" نجومی بیٹھتے ہوئے بولا۔ "منزل بہت قریب ہے۔ سردار نکل اسی ہفتے مارا جائے گا۔"

"لیکن؟" سردار نے گھبرا کے پوچھا۔ "لیکن میں نے ابھی اسے قتل کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔"

"اس میں فکر کی کیا بات ہے۔" نجومی نے اسے ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"سردار نکل اسی ہفتے مارا جائے گا۔ اس کی موت تمہاری سرداری کی دلیل ہے۔ تمہیں خیوہ کا حاکم ہونا ہے۔

تکل کسی کے ہاتھ سے بھی مارا جائے ..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب یہ کہ تم کس طرح حاکم بنوگے اس کا
تو اور پروا جاتا ہے۔ جو کام ہونا ہوتا ہے، اس کے سامان غیب سے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔" سردار خوش ہو کے بولا۔ "یعنی تکل کو قتل کرنے سے بچ گیا۔"

نجومی دل میں بہت ہنسا کہ یہ کتنا احمق انسان ہے۔ حاکم جیوہ ہونے کے خواب دیکھ رہا ہے اور ایک تو
سے گھبرا آتا ہے۔ ذرا دیر بعد نجومی نے کہا۔

"میرا گھوڑا صدر دروازے کے باہر پہنچوا دو، مجھے فوراً جانا ہے۔"

"اس وقت، رات میں۔ صبح چلے جائیے گا نجومی جی۔" سردار نے بڑے خلوص سے درخواست کی۔

"قلندروں سے بحث نہیں کیا کرتے سردار۔" نجومی نے سردار کو گھور کے دیکھا۔ وہ گھبرا کے اٹھا اور
باہر نکل گیا۔

نجومی کے جانے کے تیسرے دن شہر جیوہ سے قریب ترین پہاڑی پر دوپہر کے وقت ہلکا ہلکا دھواں
دکھائی دیا۔ دھواں باریک سی لکیر بناتا ہوا آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ تاتاری اور ترک مسلمان ہونے کے
اکثر توہم پرستی کا شکار رہو جاتے تھے۔ وہ صوفیوں، قلندروں اور نجومیوں کے بے حد معتقد تھے یہی وجہ تھی
حاکم جیوہ ایک اجنبی نجومی کے فریب میں آگیا۔ اسے نجومی کی باتوں پر اس قدر یقین تھا کہ روز بعد دوپہر حویلی
اوپری منزل پر چڑھ جاتا اور شام تک سامنے کی پہاڑی پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا۔ اس دن جب اُسے
پہاڑ پر اٹھتا ہوا دھواں نظر آیا تو وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ فوراً حویلی سے اترا اور گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس
نے اپنے خاص دستوں کو بھی تیاری کا حکم دے دیا۔

دلشاد بھی اُمید و بیم میں مبتلا اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے ساتری کو کہہ رکھا تھا
کہ وہ روز بعد دوپہر حویلی کی بالائی منزل پر جا کر پہاڑی پر نظر رکھے اور جس وقت وہاں سے دھواں اٹھتا دکھائی
دے تو وہ دلشاد کو اطلاع دے۔ ساتری بھی حویلی کی اوپری منزل پر بیٹھی پہاڑی کو دیکھ رہی تھی کہ اُسے دھواں
اٹھتا دکھائی دیا۔ وہ بھاگ کر دلشاد کے پاس پہنچی اور اُسے اطلاع دی۔ دلشاد تصدیق کے لیے اوپر گئی اور خود
آنکھوں سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھا اس کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا اس نے ساتری کو تو کچھ نہ بتایا لیکن
وہاں سے نکلنے کی تدبیریں سوچنے لگی۔

ایلچی بہادر نے اُسے بتایا تھا کہ پہاڑی پر دھواں دیکھ کر سردار تکل وہاں جائے گا اس لیے اس نے فیصلہ

کیا سردار تکل سے اس کے ساتھ جانے کی درخواست کرے گی اور ہر صورت سے باہر نکلنے کی کوشش کرے
گی۔ وہ اسی فکر میں تھی کہ اُسے سردار تکل کے آنے کی خبر ملی۔ وہ بہت خوش ہوئی اُس کی مشکل آپ ہی حل
ہو گئی۔ سردار تکل بغیر اس کے بلائے، اس کے پاس آگیا تھا۔ یہ ایک اچھا شگون تھا۔ دلشاد نے اُسے تائید غیبی
سمجھا اور سردار تکل سے بہت خوش ہو کر ملی۔

سردار تکل، اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے جسم پر پورا اسلحہ موجود تھا۔ دلشاد نے مسکراہٹ کے
بکھیرتے ہوئے پوچھا۔ "خیریت تو ہے سردار تکل کس سے جنگ کرنے جا رہے ہیں؟"

"آج میں ایک خوبصورت حسینہ کو فتح کرنے جا رہا ہوں۔" سردار کی باچھیں خوشی سے کھلی پڑتی تھیں۔ "نجومی
کی پیشین گوئی صحیح ہونے کا وقت آگیا ہے، کامیابی میرے قدم چومے گی۔"

دلشاد نے بڑی محبت سے سردار تکل کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بستر پر بٹھایا اور اس کے سامنے بیٹھ کے
بڑی لگاوٹ سے بولی۔

"سردار تکل یہ تو بڑی بے وفائی ہے اگر تم کسی اور حسینہ کو حاصل کرنا چاہتے تھے تو پھر ہم پر اس
قدر نوازش کر کے اپنا گرویدہ کیوں بنایا ہے؟"

دلشاد کی یہ محبت اور لگاوٹ سردار کے لیے بالکل نئی تھی۔ اب تک دلشاد اس سے عزت و وقار
سے ملتی تھی اور صرف ادھر اُدھر کی باتیں کرتی تھی لیکن آج وہ بڑی مہربان نظر آ رہی تھی۔ دلشاد کے اس
رویے نے سردار کو اور یقین دلا دیا کہ اس کی کامیابی کا وقت آگیا ہے اور یہ سب نجومی کی وجہ سے ہوا
اس لیے کہا۔

"دلشاد یقین کرو میرے دل میں تمہارے سوا اور کسی کا خیال نہیں۔ پہاڑی کا دل میرے غم سے گداز
ہو گیا ہے۔ میں وہاں دعا مانگنے جا رہا ہوں۔"

"سردار تکل۔" دلشاد نے بڑی محبت سے سردار تکل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "اگر تم واقعی میری محبت
میں سچے ہو تو اپنی دعاؤں میں مجھے بھی شریک کرو۔ اب ہم اور تم الگ الگ نہیں ہیں۔ خیریت اور اجنبیت کی دیوار
اب ٹوٹنے والی ہے۔ اب ہم ہر اہم موقع پر تمہارے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔"

سردار تکل تو بالکل ریشہ خطمی ہو گیا۔ "دلشاد! جانِ آفریں! کیا مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں جگہ دینے
کے لیے تیار ہو؟" سردار نے "آپ" کے بجائے "تم" کا لفظ استعمال کر کے اپنی بے تکلفی کا اظہار کیا

"سردار تکل" دلشاد سر جھکاتے اور شرماتے ہوئے بولی "میرے دل کے تمام وسوسے اور خدشات دور ہو چکے ہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ دعا مانگوں گی۔"

"میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے دلشاد۔" سردار تکل خوشی سے پھول گیا۔ "بس چلو جلدی کرو وقت دعا نکل نہ جائے۔"

"اس طرح نہیں، سردار تکل"۔ دلشاد اٹھلا کے بولی۔ "تم نے اپنے جسم پر اسلحہ سجایا ہے۔ میں بھی مسلح ہو کے ساتھ چلوں گی تاکہ خیوہ والوں کو معلوم ہو جائے کہ سردار کا انتخاب غلط نہیں ہے"۔

سردار تکل نے فوراً دلشاد کے لیے ہلکا زرہ بکتر منگوایا۔

سردار تکل اور دلشاد باہر آئے۔ دلشاد کے لیے ایک گھوڑا منگوایا گیا تھا۔ دلشاد نے دونوں گھوڑوں کو دیکھا۔ سردار تکل کا گھوڑا اسے پسند آیا۔ بولی

"میں تمہارے گھوڑے پر بیٹھوں گی۔"

"لیکن......" سردار تکل کچھ ہچکچایا

"لیکن کیا۔ اگر مجھے لوگوں کا خیال نہ ہوتا تو تم سے کہتی کہ تم بھی میرے ساتھ ہی گھوڑے پر بیٹھ جاؤ" دلشاد نے کچھ ایسی وارفتگی سے کہا کہ سردار تکل جھوم کر رہ گیا۔ اسے فضاؤں میں پھلجڑیاں سی چھوٹتی معلوم ہوئیں۔ دلشاد اس کے گھوڑے کے پاس پہنچ کے رکی۔ تکل کو مسکرا کے دیکھا، بولی۔ "کیا گھوڑے پر سوار ہونے میں میری مدد نہ کرو گے؟"

سردار تکل مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا بڑھا اور دلشاد کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے گھوڑے پر سوار کر دیا۔ سردار تکل خود دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

جس وقت یہ لوگ خیوہ سے نکلے تو سردار تکل کے ساتھ کئی سو مسلح سوار تھے۔ دلشاد اتنے سوار دیکھ کر گھبرائی مگر ہنس کے بولی۔ "سردار۔ تم دعا مانگنے جا رہے ہو یا جنگ کرنے۔ اس فوج کو ساتھ لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"دلشاد"، سردار تکل سنجیدگی سے بولا۔ "اس ریگستانی علاقے میں جگہ جگہ دشمن چھپے ہوتے ہیں۔ کیا پتہ کس وقت کیا ہو جائے؟ گھر سے باہر جاتے وقت انسان کو پورے انتظام کے ساتھ نکلنا چاہیئے۔"

"ہم تمہاری دور اندیشی کی داد دیتے ہیں، سردار تکل"۔ یہ کہتے وقت دلشاد کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

معلوم تھا کہ امیر حسین اور تیمور کے ساتھ ساٹھ سوار ہیں۔ حاکم خیوہ کو کوئی نہ کوئی خطرہ ضرور تھا جبھی وہ اتنے بہت سے سوار اپنے ساتھ لایا ہے۔

پہاڑی دم بدم قریب ہوتی جا رہی تھی سردار تکل اور دلشاد باتیں کرتے ہوئے آگے چل رہے تھے۔ دلشاد نے پہلے فیصلہ کیا تھا کہ وہ پہاڑی کے قریب پہنچ کے سردار تکل پر ایک دم حملہ کر کے اسے ختم کرنے کی کوشش کرے گی پھر بھاگ کر اپنے آدمیوں کے پاس پہنچ جائے گی لیکن ایک تو اب تک اسے پہاڑی پر اپنے آدمیوں کی موجودگی کی کوئی علامت نظر نہ آئی تھی۔ دوسرے سردار تکل بھاری زرہ پہنے تھا اس کا ایک وار میں ختم ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا اور اوچھا وار کر کے اپنی موت کو دعوت دینا کوئی عقلمندی نہ تھی۔

یہ لوگ پہاڑی کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ دلشاد کا دل بیٹھنے لگا۔ پہاڑی پر کسی کی موجودگی کا کوئی نشان نہ دکھائی دیا۔ اس کی نظریں پہاڑی کی چوٹی پر لگی تھیں۔ یکایک دلشاد کو چوٹی پر سورج کی آخری کرنوں میں ایک بہادر کی طرح سے دار خود دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھوڑے کی راسیں ایک دم کھینچیں اور دو قدم پیچھے ہو گئی۔ پھر اس نے راسیں کھینچے کھینچے گھوڑے کو ایڑ دی۔ گھوڑے نے زور لگایا اور بے قابو ہونے لگا۔

"سنبھل کے دلشاد! گھوڑا ذرا منہ زور ہے۔" سردار تکل نے اسے آواز دی۔

"تم فکر نہ کرو تکل۔" دلشاد نے گھوڑے کو دو زمین چکر دیے پھر زور سے ایڑ دے کر راسیں ڈھیلی کر دیں۔ گھوڑا دلشاد کو لے کر اڑا اور ہوا کی طرح سن سے تکل کے پاس سے نکل گیا۔ دلشاد نے گھوڑے کا رخ پہاڑی کی چڑھائی کی طرف کر دیا۔

سردار تکل سمجھا کہ گھوڑا بے قابو ہو کر دلشاد کو لے بھاگا ہے۔ اس نے اپنا گھوڑا بھی اس کے پیچھے ڈال دیا لیکن جب سردار تکل کی نظر پہاڑی پر پڑی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے پہاڑی نے سواروں کو اگل دیا ہے۔ اسے پہاڑی کے ہر زاویئے پر سوار ہی سوار اترتے نظر آئے۔ ایک طرف وہ نجومی بھی کمان کھینچے نظر آیا جس نے کامیابی کی نوید دی تھی۔ سردار تکل سمجھ گیا کہ اس سے دھوکا کیا گیا ہے۔ اس نے فوراً اپنا گھوڑا روک لیا اور اپنے پیچھے آنے والے سواروں کا انتظار کرنے لگا۔ دلشاد کا گھوڑا تیزی سے بھاگتا ہوا پہاڑی پر چڑھنے لگا اور وہ جلد ہی اپنے آدمیوں میں پہنچ گئی۔ سردار تکل کو تیمور اور امیر حسین بھی نظر آ گئے جو کمانیں چڑھائے آگے آگے پہاڑی سے اتر رہے تھے۔

حاکم خیوہ کا سوار دستہ اُس کے پاس پہنچ گیا اور اس نے بھی تیمور کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ایلچی بہادر نے تیمور کو یقین دلایا تھا کہ حاکم خیوہ تنہا آئے گا یا اس کے ساتھ پانچ دس محافظ ہوں گے لیکن تیمور ایسے موقعوں پر صرف اپنی عقل اور حکمت عملی پر بھروسہ کرتا تھا۔ اس کے خیال میں جنگ ناگزیر تھی اور اس کے لیے اس نے خود کو تیار کر کے حکمت عملی بھی تیار کر لی تھی۔ دلشاد ان کے ہمراہ پہنچ گئی تھی۔ تیمور نے خیوہ والوں کو اوپر چڑھتے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے اُنہیں رکنے کا حکم دیا۔ پھر دوسرا اشارہ کر کے اپنا گھوڑا موڑ کر اوپر کی طرف چڑھنے لگا۔ تیمور نے اپنی رفتار سُست رکھی۔ خیوہ والے تیزی سے چڑھ کے ان کے پاس پہنچنا چاہتے تھے۔ چوٹی پر پہنچتے پہنچتے خیوہ والے بالکل تیمور کے سر پر پہنچ گئے۔ تیمور ایک دم رکا اُس نے باگیں موڑ دیں۔ اس کے ساتھ ہی تیمور کے تمام ساتھی پلٹ پڑے اور خیوہ والوں پر برق بن کر گرے۔ یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ خیوہ والے سنبھل نہ سکے اور مار کھا کے پیچھے ہٹے اور پسپا ہوتے ہوئے نیچے میدان میں آ گئے۔

اب تاتاری اور ترکمان سواروں میں ایک خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ تیمور کے تمام ساتھی بارہ بارہ کی ٹولیوں میں بٹ گئے۔ وہ گروہ کی شکل میں ترکمانوں کے لشکر میں گھس جاتے۔ پھر وہاں پہنچ کر بکھر کے لڑنے لگتے۔ وہ جتنی تیزی سے اندر داخل ہوتے اتنی ہی تیزی سے لڑتے بھڑتے نکل آتے۔ پھر جمع ہوتے اور اسی طرح گروہ بن کے گھس جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑوں کی کاٹھیاں سواروں سے خالی ہونے لگیں۔ تیمور، امیر حسین اور خیوہ کا حاکم الگ کھڑے اپنے سواروں کی جنگ دیکھ رہے تھے اور ان کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ سب سے زیادہ دلچسپ لڑائی ایلچی بہادر کی تھی۔ وہ کمان کا چلہ کھینچ کر جس طرف کا رُخ کرتا لوگ اُسے حیرت سے دیکھتے لیکن حیرت ان کی موت کا پیغام بن جاتی اور ایلچی کی کمان سے نکلے ہوئے تیر اُن کے زرہ چیر کر جسم میں پیوست ہو جاتے۔ ایک موقع پر ایلچی کے گھوڑے کے تیر لگا۔ گھوڑے نے ٹھوکر بھی کھائی اور ایلچی دور جا گرا۔ بجائے اس کے کہ ایلچی دوسرا گھوڑا پکڑنے کی کوشش کرتا وہ وہیں جم کر کھڑا ہو گیا اور تیر چلانے لگا۔ تیمور کی نظر اس پر پڑی تو گھوڑا دوڑا کر ایلچی کے پاس پہنچا اور اس کی کمان کی تانت کاٹ دی۔ ایلچی کو مجبور ہو کر گھوڑے پر سوار ہونا پڑا اور تلوار بھی نکالنی پڑی۔

اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ امیر حسین کو جوش آ گیا۔ وہ ترکمانوں میں گھس کر حاکم خیوہ تک

لیا لیکن ترکمانوں نے اسے گھیر لیا۔ اس وقت تیمور کو مجبور ہو کر اس کی مدد کو جانا پڑا۔ اس نے بڑھ کر امیر حسین کو تو نکال لیا لیکن خود گھیرے میں آ گیا۔ خوش قسمتی سے اس کے کئی سوار اس کے پاس گئے اور تیمور کو اُن کے نرغے سے نکال لائے۔ خیوہ والوں کی اس جنگ میں دلشاد نے بھی ایک ایسا سرانجام دیا کہ اس کی محبت اور بہادری کا یہ قصہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گیا۔ اس کا شوہر بہت جوشیلا تھا اسے حاکم خیوہ سردار تکل سے نفرت ہو گئی تھی اس لیے وہ بار بار اسے قتل کرنے لیے ترکمان سواروں میں گھس جاتا۔ ایک موقع پر ایسا ہوا کہ امیر حسین کے گھوڑے نے تیر کھا کر اسے پیٹھ سے اچھال دیا۔ زمین پر کھڑے ہو کر لڑنا سخت خطرناک تھا کیونکہ ترکمان اس کی طرف بڑھتے۔ دلشاد یہ دیکھ رہی تھی۔ وہ فوراً اپنا گھوڑا بڑھا کر امیر حسین کے پاس پہنچی اور گھوڑے سے کود کر باگیں امیر حسین کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ امیر حسین سوار ہو کر پھر لڑنے لگا۔ اور دلشاد تلوار چلاتی اپنی جگہ واپس

تیمور نے دیکھا کہ اس کے آدمی ختم ہوتے جا رہے ہیں اور جنگ کا کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تو نے آواز دی اپنے تمام سواروں کو اکٹھا کیا۔ پھر ایک ساتھ ترکمانوں پر حملہ بول دیا۔ تاتاریوں کا یہ اجتماعی فیصلہ کن ہوا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ شکست یا فتح ہوتا تھا۔ ترکمان اس حملے سے دور تک پسپا ہو حاکم خیوہ اس وقت دور کھڑا ہوا اپنے دستوں کو احکامات دے رہا تھا۔ تیمور نے حملہ بولتے ہی خیوہ کو تاکا اور کمان میں تیر جوڑ کر سردار تکل کا نشانہ باندھا۔ تیر چھوٹا اور سیدھا تکل کا جبڑہ توڑتا ہوا نکل گیا۔ تکل نے چیخ ماری لیکن اس وقت تک تیمور اس کے پاس پہنچ چکا تھا اس نے تیزی تکل پر برچھی کا وار کیا تو زرہ کو پھاڑتی ہوئی تکل کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ حاکم خیوہ زین لٹک گیا۔ خیوہ والوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ وہ دہشت زدہ ہو کر ایک جگہ سمٹ گئے۔ تیمور اپنے یوں کو آوازیں دیتا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

ممکن ہے کہ خیوہ والوں نے اُن کا تعاقب کیا ہو لیکن اندھیرا ہو چکا تھا اس لیے وہ تیمور تک سکے۔ تیمور اوپر پہنچ کر بغیر رُکے نیچے اترنے لگا۔ دوسری طرف پہنچ کے جب اس نے اپنے سواروں ار کیا تو ساٹھ سواروں میں سے صرف سات زندہ بچے۔ ان میں سے بھی بیشتر زخمی تھے۔ امیر حسین زور دیا کہ ٹھہر کر آرام کیا جائے لیکن تیمور نے سفر جاری رکھا اور یہ لوگ آدھی رات تک اسی

دشت میں چلتے رہے۔ آخر وہ ایک کنویں پر پہنچے۔ اس کا پانی میٹھا تھا۔ یہاں انہوں نے قیام کیا اس
جگہ انہیں اپنے تین تاتاری سپاہی مل گئے جو بلخ سے پیدل بھاگ کر آئے تھے۔ اب ان کی تعداد کم
ہو گئی۔

سب لوگ آرام کرنے لگے۔ امیر حسین اور تیمور جاگتے رہے اور مشورہ کرتے رہے۔ امیر ح
نے خدشے کا اظہار کیا۔

"ہماری تعداد بہت کم ہو گئی ہے ہم کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔"

تیمور بھی انہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"اب اس دشت میں ہم دونوں کا ایک ساتھ سفر کرنا بہتر نہیں ہے۔ اس طرح ہمارے پ
جانے کا امکان بھی ہے۔"

"پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟" امیر حسین نے پوچھا۔

"ہمیں فوراً الگ ہو جانا چاہیے تاکہ ہم عام مسافر معلوم ہوں۔" تیمور نے بھی فیصلہ کر لیا تھا

"تم کدھر جاؤ گے؟"

"میں بحیرۂ خوارزم پہنچ کر شاہ خراسان تلاش کروں گا اور تم کہاں جاؤ گے؟" تیمور نے پوچھا۔

"میں قندھار پہنچ کر پھر قسمت آزمائی کروں گا۔" امیر حسین نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"ٹھیک ہے۔" تیمور نے کہا۔ "میں بھی لشکر فراہم کر کے قندھار پہنچوں گا۔ انشاء اللہ وہاں
ملاقات ہو گی۔"

امیر حسین اور تیمور نے باہم مشورے سے دوسری ملاقات کے لیے "گرم سیر ہیرمن" کا مقام ط
یہ مقام سستان میں قندھار کے قریب دریائے ہلمند کے کنارے واقع تھا۔ یہ منصوبہ بنانے کے
وہ دونوں بھی آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

صبح اٹھے تو ایک اور مصیبت سامنے آئی۔ بلخی سپاہی رات کے کسی پہر تین گھوڑے چرا
غائب ہو گئے تھے۔ اب صرف چار گھوڑے باقی تھے۔ تیمور نے الجائی کے لیے صرف ایک گھوڑا مانگا
اس کے ساتھیوں نے اسے دو گھوڑے دے دیئے۔ دو گھوڑے امیر حسین کے
آئے۔ تیمور نے اپنے ساتھ صرف ایک آدمی رکھا اور ایلچی بہادر کو حکم دیا کہ وہ شہر سبز جا کے الج

الپی کا انتظار کرے۔ پہلے امیر حسین، دلشاد، ایلچی بہادر وغیرہ روانہ ہوئے۔ یہ منظر بڑا درد ناک
ور دل گداز تھا۔ سب کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ وہ دوبارہ مل بھی سکیں گے
نہیں۔

امیر حسین کے جانے کے بعد تیمور نے ایک گھوڑے پر الجائی اور جہانگیر کو سوار کیا۔ دوسرے
ڑے پر سامان بار کیا اور بسم اللہ کہہ کر گھوڑے کی لگام پکڑ کے پیدل سفر شروع کیا۔

الجائی خاتون کی آنکھیں غم ناک ہو گئیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرے سرتاج!
ش میں آپ کو پیدل چلتے دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہتی۔ میری بدبختی کی یہ انتہا ہے۔"

تیمور نے ایک نظر الجائی خاتون کے تپتے ہوئے چہرے پر ڈالی۔ پھر سر جھکا کے چلنے لگا۔

مردے کی شادی

جنازے کو قبرستان کے باہر ہی روک لیا گیا۔

پچاس ساٹھ کے قریب بوڑھے جوان تاتاری جنازے کے ساتھ تھے۔ جنازہ رکا تو سب گھبرا گئے سب ہی نے گردنیں اٹھا کے آگے کی طرف دیکھا۔ قبرستان کے دروازے پر ایک مغل سوار راستہ روکے کھڑا تھا۔ تاتاری اگرچہ پوری طرح مسلح نہ تھے لیکن تلوار ہر ایک کی کمر سے لٹکی تھی۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا اور ضرورت بھی۔

شہر سبز کے مولانا زین الدین لوگوں کو ہٹاتے آگے بڑھے۔ ہر ایک نے سرگوشی کی۔

"مغل آ گئے کسی نے مخبری کی ہے"

مولانا زین الدین پڑھتے ہوئے جنازے کے آگے پہنچ گئے۔ کاندھا دینے والوں نے جنازہ زمین پر رکھ دیا۔

"یہ جنازہ ہے مغل سوار۔" مولانا نے مغل سوار کو گھور کے دیکھا۔

"معلوم ہے لیکن یہ اندر نہیں جائے گا۔" مغل سوار نے کاندھے سے بھاری کمان اتار کے تیر چڑھا

"کیوں نہیں جائے گا۔ خانِ اعظم نے ہمیں مذہبی تحفظ دیا ہے۔" مولانا بھی اکڑ گئے۔ "بلاد شمال آ خانِ اعظم نے سمرقند پر قبضے کے وقت واقعی یہ اعلان کیا تھا کہ تاتاریوں کے مذہبی معاملات میں کوئی دخل نہ دیا جائے گا۔

مغل سوار نے کوئی جواب تو نہ دیا لیکن کمان کا چلہ اس طرح کھینچا جیسے وہ تیر چلا دے گا۔ صورتحال بڑی مخدوش ہو گئی۔ تاتاریوں کے ہاتھ بھی آہستہ آہستہ تلواروں کی طرف بڑھے مگر ہاتھوں میں لرزش تھی اور چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ مغل حاکم تھے اور تاتاری محکوم۔ پچاس تاتاریوں کے سامنے ایک مغل سوار۔ حاکم و محکوم کی زندہ مثال۔ مولانا نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے تاتاریوں کو روکا۔ ان کے کانپتے ہاتھ جہاں تھے وہاں رک گئے۔ بزدلی کو مصلحت کا سہارا مل گیا۔ شجاعت کی لاج رہ گئی۔

مولانا زین الدین نے کھینچی کمان کے سامنے سینہ کر دیا۔ دو قدم بڑھ کے بولے۔

"مغل سوار تمہارا تعلق حاکم طبقے سے ہے۔ تم ہمارے لیے قابل احترام ہو لیکن یہ تو بتاؤ تم نے جنازہ کیوں روکا ہے؟ یہ تو ہماری رسم ہے تم بھی اپنے مردوں کو دفن کرتے ہو!"

"پہلے تمہاری تلاشی لی جائے گی۔" مغل سوار نے کمان نیچی کر لی۔

"بسم اللہ۔" مولانا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ "ضرور تلاشی لو۔ ہمارے پاس سوائے تلوار کے اور کچھ نہیں ہے۔" مولانا کی کمر کے ساتھ بھی ایک چھوٹی تلوار لٹکی تھی۔

اس وقت ایک طرف گرد اڑتی دکھائی دی۔ پانچ اور مغل سوار آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی جنازے اور تاتاریوں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ تاتاریوں کا خون بالکل ہی خشک ہو گیا۔

"تلاشی ہو چکی؟" آنے والوں میں سے ایک نے پوچھا

"ابھی نہیں۔" پہلے مغل سوار نے جواب دیا۔

"ہم تلاشی کے لیے تیار ہیں۔" مولانا نے لقمہ دیا۔ "ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

مغل سواروں میں سے ایک مولانا کے قریب گھوڑا بڑھا کر آیا۔ بولا۔ "مولانا۔ تلاشی تمہاری نہیں جنازے کی ہو گی۔"

ایک لمحے کے لیے تو مولانا زین الدین کا سر چکرا گیا مگر وہ فوراً سنبھلے۔ انہوں نے پلٹ کر جنازے کو دیکھا۔ پھر تاتاریوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

"کیا تم میت کی تلاشی لو گے؟" مولانا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "جنازے کا کفن اتارو گے تم سردار؟ یہ میت کی بے حرمتی ہے۔ ہم یہ جنازہ لے کر خانِ اعظم کے پاس چلتے ہیں۔ ہمارا فیصلہ خانِ اعظم کے سامنے ہو گا۔"

"یہ حکم بھی خانِ اعظم کا ہے۔" مغل سوار گھوڑے سے اتر پڑے۔ دو مغل آگے بڑھے اور جنازے سے پانچ قدم کے فاصلے پر آکر رک گئے۔ ایک نے کہا۔

"خانِ اعظم کو بتایا گیا ہے کہ تم لوگ جنازے کا ڈھونگ رچا کر قبرستان میں اکٹھے ہوتے ہو اور یہاں بیٹھ کر بغاوت کے منصوبے بناتے ہو۔ ہم دیکھیں گے کہ کفن کے اندر لاش بھی ہے کہ تم نے دھوکا دیا ہے۔"

جنازے کے ساتھ آنے والے تاتاریوں کو خوف سے پسینہ آگیا۔ موت انہیں اپنے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ مولانا زین الدین نے حواس پر قابو رکھا اور جنازے کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

"مغل سوارو۔" مولانا نے بڑے استقلال سے کہا۔ "ہم لوگ میت کو نہلا دھلا کر کفناتے ہیں۔ تم بغیر نہائے میت کو کیسے ہاتھ لگا سکتے ہو؟"

مغل شاید جھگڑے سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ ایک مغل مولانا کے پاس آیا اور نرمی سے بولا "فکر نہ کرو مولانا ہم نہ تمہارے مذہب میں دخل دینا چاہتے ہیں اور نہ لاش کو ہاتھ لگائیں گے۔ صرف اپنا شک دور کرنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" مولانا نے سر ہلایا۔ "تم اپنا شک دور کر لو۔ میں میت کا کفن ہٹا کے تمہیں دکھائے دیتا ہوں پھر تو تمہارا اطمینان ہو جائے گا۔"

مغلوں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ مولانا آہستہ آہستہ جنازے کے پاس جا کے رکے اور جھک کر میت کے سر سے کفن ہٹانے لگے۔ وہ اس قدر جھکے کہ اُن کا سر میت کے سر تک پہنچ گیا۔ مولانا نے کفن ہٹاتے وقت پتہ نہیں کیا پڑھ کر پھونک دیا کیا کچھ آہستہ سے کہا اور کفن آہستہ سے میت کے سر سے ہٹا دیا۔ میت کا سُتا سُتا اور پھیکا پھیکا چہرہ دکھائی دینے لگا۔

مولانا نے گھوم کر کہا "دیکھ لو مغل سوارو۔ چاہو تو ٹٹول کر بھی دیکھ سکتے ہو۔ یہ پوری میت ہے صرف سر نہیں ہے۔ اپنے ساتھیو کو بھی بلا کے دکھا دو۔" لیکن مغلوں کے جواب دینے سے پہلے ہی انہوں نے کفن ڈھکنا شروع کر دیا۔

"دیکھ لیا۔ ٹھیک ہے۔ یہ واقعی ایک میت ہے۔" ایک مغل نے دوسرے سے کہا۔ "ہمارا اطمینان ہو گیا۔" دونوں مغل اپنے ساتھیوں کے پاس واپس چلے گئے۔

"اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں دیکھ لیا۔ جوان آدمی کی لاش ہے۔"

"کیا کسی نے قتل کر دیا تھا اسے؟" کسی نے کہا اور سب مغل سوالیہ نظروں سے مولانا کو دیکھتے

لانا اس وقت تک کفن ڈھک کر اوپر چادر بھی ڈال چکے تھے۔ انہوں نے افسردگی سے کہا۔

"قتل کسی نے نہیں کیا۔ صبح تک اچھا بھلا تھا بس اک بلا چمٹ گئی اسے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ

"بلا چمٹ گئی؟ کیسی بلا؟" توہم پرست مغلوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کیا نہیں۔ اس بلا نے کئی گھرانے تباہ کیے ہیں۔" مولانا نے جیسے سسکی بھری۔ "جس سے چمٹتی ہے ایڑیں کھانے لگتا ہے اور تڑپ تڑپ کے جان دے دیتا ہے۔ دوا تو اُس کے حلق سے اترتی ہی ایک ہفتے میں پندرہ آدمیوں کی جانیں لے لی ہیں اس ظالم بلا نے۔ کسی سے کچھ بتائے نہیں بنتا۔"

مولانا زین الدین نے کچھ اس انداز سے بلا کی تفصیل بیان کی کہ مغل گھبرا اُٹھے۔ ایک نے کہا۔ "لے جاؤ اسے جلدی سے ٹھکانے لگا دو۔"

مولانا نے جنازہ اٹھانے کا اشارہ کیا اور تاتاری جنازہ اٹھا کے کلمہ شہادت پڑھتے قبرستان میں ہتے۔ مولانا نے اطمینان کا سانس لے کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اُن کا خیال تھا کہ مغل مطمئن ہو کر واپس ہوں گے لیکن اُن کی سانس جیسے رک کر رہ گئی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مغل گھوڑوں پر سوار ازے کے پیچھے قبرستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ مولانا آگے آگے تھے اور تاتاری جنازہ اٹھائے ے مسافر کی طرح قبرستان کی کچی اور بل کھاتی پگڈنڈیوں پر لرزاں ترساں آگے بڑھ رہے تھے نظریں بڑی تیزی سے قبرستان میں اِدھر اُدھر کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ معاً ایک جگہ ان کی نظر ان گورکن ایک قبر کھود رہے تھے۔ مولانا نے جنازہ اٹھانے والوں کو ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ خود قبریں پھلانگتے گورکنوں کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے گورکنوں سے جلدی جلدی کچھ باتیں پھر قبر کی مٹی پر کھڑے ہو کر بڑے اطمینان سے جنازے کو ادھر لانے کا اشارہ کیا۔

جنازہ چکر کاٹ کر قبر کے پاس پہنچ گیا۔ بلا کے نام سے مغل سوار خوفزدہ ہو گئے تھے۔ وہ قبر را ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے جنازے کو قبر میں اتارنے کا حکم دیا۔ جنازے سے چادر ہٹائی اسے روایتی انداز میں قبر میں اتار دیا گیا۔ مغل سوار اب تک وہیں کھڑے تھے اب مولانا کی آنکھو

میں بھی آنسو آگئے۔ ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ انھوں نے قبر کو پتھر سے بند کرنے کا اشارہ کیا۔ مگر قبر
لکڑی کے تختوں کے بجائے قبر کو پتھر کی سلوں سے بند کیا جاتا تھا۔ ایک سل قبر پر رکھی گئی۔ دوسری
قبر پر رکھی جانے لگی تو سل اٹھانے والوں کے ہاتھ کانپنے لگے۔ مولانا کی آنکھوں سے اشک بہہ اٹھے۔ اسی
وقت ایک اور جنازہ قبرستان میں داخل ہوا اور مغل سوار فوراً گھوڑے بڑھا کر اُدھر چل پڑے۔

"جلدی نکالو اسے کہیں مر نہ جائے۔" مولانا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے اور جلدی سے خود قبر
میں اتر گئے۔ پتھر کی دونوں سلیں قبر سے ہٹا دی گئیں۔ مولانا نے میت پر سے کفن کھینچ لیا اور کہا۔

"اٹھ جا اللہ کے حکم سے تیری قربانی اللہ کے حضور قبول ہو گئی۔" اور پھر کفن کے اندر سے ایک
جوان "اللہ اکبر" کہتا ہوا نکل آیا۔ اس کے جسم پر عام تاتاریوں کے کپڑے تھے جیسے کفن سے چھپایا گیا تھا۔
مولانا نے تاتاری جوان کو گلے لگا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ دونوں قبر سے باہر آ گئے۔ مصنوعی
لانے والے تاتاریوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ مغل دوسرے جنازے کی پڑتال میں لگے تھے
وہ میت اسی قبر کے لیے آئی تھی جس میں مولانا گورکنوں کے تعاون سے ایک زندہ تاتاری کو دفن
رہے تھے۔

مغل سوار دوسرے جنازے کی تلاشی لے کر واپس چلے گئے۔ دوسرا جنازہ قبر پر آیا تو
طرح شفاف تھی جیسے ابھی ابھی تیار ہوئی ہے۔ مولانا اور ان کے تمام ساتھی اس جنازے میں شامل
ہوئے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد واپس ہوئے۔ مغل سوار پہلے ہی جا چکے تھے۔ مولانا اپنے
کو لے کر قبرستان کے اس تاریک گوشے میں آ بیٹھے جہاں کسی کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ قبرستان
گوشہ واقعی بغاوت اور جنگِ آزادی کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ شہر میں کسی جگہ اتنے آدمی
اکٹھا ہونا ممکن نہ تھا۔ مغل سوار اور جاسوس ہر جگہ ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ انہیں کسی طرح
ہوا کہ تیمور زندہ ہے اور وہ سمرقند آنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

آج کے حادثے نے تمام لوگوں کو پریشان کر دیا تھا۔ اب قبرستان میں جمع ہونا بھی ممکن
تھا۔ مولانا کے پیشِ نظر اب سب سے اہم مسئلہ کسی معقول جگہ کا انتخاب تھا جہاں جمع ہو کر
پسند اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ لیکن اس پریشانی کے باوجود لوگ آج کے واقعہ
ہی دل ہنس رہے تھے۔ ایک تاتاری نے مصنوعی سنجیدگی سے پوچھا۔

"عاصم! مولانا زین الدین نے تمہارا منہ کھولتے وقت تمہارے کان میں کچھ کہا تھا؟"
"ہاں۔ انھوں نے مجھے حریت کا پیغام دیا تھا۔" عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "حریت کا وہ پیغام
ن کے سہارے ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ مولانا نے مجھ پر جھک کر سرگوشی کی تھی کہ اے عاصم اگر جنگِ آزادی
کا پہلا شہید بننا ہے تو خاموشی سے قربانی پیش کر دے۔ اگر تجھے قبر میں دفن بھی کر دیا جائے تو منہ سے اُف
نہ کرنا اور میں نے مولانا کے حکم پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اس اعزاز کو ضرور حاصل کروں گا۔ وہ تو خدا نے میری
جان بچائی ورنہ میں اسی قبر میں دفن ہو جاتا اور حریت پسندوں کا راز نہ کھلنے دیتا۔"

"شاباش عاصم۔" پوچھنے والے نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "ہمیں تمہارے ہی جیسے جوانوں کی ضرورت
ہے۔ آزادی خون مانگتی ہے اور ہمیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

مولانا زین الدین کے کانوں میں یہ بات پڑی تو وہ افسردگی سے بولے
"آزادی خون مانگتی ہے لیکن خون دینے والے کتنے ہیں۔ تاتاریوں کی آبادی اتنی ہے کہ اگر فوج
تیار کی جائے تو کم از کم ایک لاکھ سواروں کا لشکرِ عظیم تیار ہو سکتا ہے لیکن شہر سبز سے سمرقند تک دوڑ
دھوپ کرنے کے باوجود مجاہدین کی تعداد اب تک پچاس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس میں بھی غدار موجود ہیں۔"

"ہم میں کوئی غدار نہیں مولانا۔" ایک تاتاری نے احتجاج کیا۔ "ہم نے اپنی جانیں آزادی کے لیے
وقف کر دی ہیں اگر وقت پڑا تو آپ دیکھیں گے کہ ہم میں سے ہر ایک عاصم جیسا کردار ادا کرے گا۔"

"بہادر اور محبِ وطن تاتاریو۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔" مولانا بولے۔ "افسوس تو ان خبیث
لوگوں پر ہے جو ہمارے سامنے بڑھ بڑھ کے باتیں کرتے ہیں اور درپردہ ہمیں تباہ کرنے کے درپے
ہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ ہمارے اس منصوبے کی خبر بھی کسی ایسے ہی غدار نے
خان اعظم تک پہنچائی ہے ورنہ اُسے کیسے معلوم ہوتا کہ ہم قبرستان کیوں آتے ہیں؟"

"خدا ایسے لوگوں کو غارت کرے۔" ایک تاتاری نے بلند آواز سے بددعا دی۔
"آمین۔" کہہ کر لوگوں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

مولانا گہری سوچ میں ڈوبے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے سمرقند کے قبرستان کا
مرکز اپنی سرگرمیوں کے لیے ڈھونڈا تھا لیکن اب اس جگہ اکٹھا ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ بہت
دیر بعد وہ سر اٹھا کے بولے۔

"میرے ساتھیو! اس قبرستان میں ہمارا یہ آخری اجتماع ہے۔ آئندہ ہم کسی اور جگہ اکٹھے ہوا کریں گے۔" اب تم لوگ ایک ایک کر کے قبرستان سے چلے جاؤ۔"

تاتاری اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی وقت ایک تاتاری مولانا کے پاس پہنچا اور آہستہ سے بولا "مولانا محترم مغرب سے آنے والے ایک مسافر نے مجھے ایک خبر سنائی ہے۔"

مولانا نے فوراً لوگوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لوگ بیٹھ گئے۔

"کیا خبر سنائی مسافر نے؟" مولانا نے بے چینی سے پوچھا۔ یہ اجتماع اسی لیے ہوا کرتا تھا کہ اگر کسی کو کوئی نئی خبر ملی ہے تو وہ سب کو بتلائے یا کوئی نیا مشورہ ہو تو وہ پیش کیا جائے۔

تاتاری نے ذرا خاموشی اختیار کی جیسے وہ خبر کو ذہن میں ترتیب دے رہا ہو۔ پھر بولا۔

"مولانائے محترم۔ مسافر نے سرخ ریگستان میں ایک مرد اور ایک عورت کو دیکھا جن کے پاس ایک مریل گھوڑا اور ایک کمزور سا اونٹ تھا۔ عورت گھوڑے پر سوار تھی اور مرد اونٹ کی نکیل پکڑے پیدل چل رہا تھا۔ میں نے جب اس سے مرد کا حلیہ پوچھا تو اس نے جو بتایا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہمارے سردار تیمور بہادر تھے اور وہ خاتون، خاتون الجائی تھیں۔"

مولانا سوچتے ہوئے بولے "تمہارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ سرخ ریگستان میں تو اس طرح مرد اور عورتیں پانی اور کھانے کی تلاش میں بھٹکتے ہی پھرتے ہیں۔"

"مولانائے محترم!" تاتاری نے ادب سے کہا "آپ صحیح فرماتے ہیں لیکن اس مسافر نے یہ بھی بتایا کہ عورت اپنی گود میں ایک پانچ سال کا بچہ لیے گھوڑے پر بیٹھی تھی۔"

"کیا سچ؟" مولانا خوشی سے چیخ پڑے۔ "ان کا رخ کدھر تھا۔ کیا وہ شہر سبز یا سمرقند کی طرف جا رہے تھے؟"

"نہیں مولانا!" تاتاری مرد نے نسی آواز میں بولا "وہ لوگ شاہراہ خراساں کی تلاش میں تھے۔ مسافر سے انہوں نے اس شاہراہ کے بارے میں پوچھا تھا!"

"اس میں افسردہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔" مولانا نے سب کو یقین دلایا۔ "الچی بہادر نے مجھے یہ بتایا تھا کہ شہر سبز کے امیر تیمور کا ارادہ شاہراہ خراسان پر پہنچنا ہے جہاں سے وہ اپنی سرگرمیوں کا از سر نو آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خبر ہمارے لیے کسی نوید سے کم نہیں۔ ہمارے لیے یہ کیا کم ہے کہ امیر تیمور

اور بہادر الجائی زندہ و سلامت ہیں۔"

○

۱۳۶۰ء اور ۱۳۷۵ء کا درمیانی عرصہ تاتاری قوم کے لیے بڑا دردناک تھا۔ تاتاری علاقہ کابل کے شمالی علاقے، ایران کے شمالی اضلاع، بخارا، ماوراء النہر اور روسی ترکستان کے بیشتر حصوں پر مشتمل تھا۔ ان حصوں میں خجند، بلخ، اشبرخان، بدخشاں، ارجنگ اور سرپول میں تاتاریوں کے مختلف قبائل کی آزاد ریاستیں تھیں جو ہمہ وقت خانہ جنگی کی مبتلا رہتی تھیں۔ تاتاریوں کی اس خانہ جنگی سے مغلوں نے فائدہ اٹھایا اور آخر مغلوں نے اپنے دوسرے حملے میں ان تمام ریاستوں کو ختم کر کے اپنا قبضہ جما لیا۔ تمام قبائل تباہ ہو گئے۔ ان کے سردار یا تو لڑتے ہوئے مارے گئے یا گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ تیمور کو بھی شہر سبز چھوڑنا پڑا اور اس نے قزل قم (سرخ ریگستان) میں دشت نوردی اختیار کی۔

جس وقت تیمور صحرا میں بھٹک رہا تھا اس کے دو جانباز سردار الچی بہادر اور چاکو برلاس پورے ملک تاتار میں حریت اور آزادی کی شمع روشن کر رہے تھے۔ شہر سبز کے مولانا زین الدین یوں تو بظاہر ایک مذہبی پیشوا تھے لیکن اس وقت آزادی کی تحریک کے وہی سب سے بڑے روح رواں تھے۔

مغلوں نے ان کے مذہبی اجتماع پر پابندی لگا دی تھی لیکن جس طرح پانی سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر اپنا راستہ بنا لیتا ہے، اسی طرح آزادی کے یہ متوالے صلاح مشورے کے لیے کسی نہ کسی جگہ جمع ہو جاتے اور مستقبل کے بارے میں منصوبے بناتے رہتے تھے۔ حریت کے اس دور میں تاتاریوں میں بھی جعفر اور صادق جیسے غدار موجود تھے جو اپنے مغل آقاؤں تک چھوٹی سی چھوٹی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ ایک ایسی ہی اطلاع کے تحت مغلوں نے تاتاری جنازوں کی تلاشی کا حکم دے دیا جس سے مجاہدوں کو قبرستان کے اجتماع کو خیرباد کہنا پڑا۔

اس طرف ملک تاتار کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آزادی کے چرچے ہو رہے تھے۔ انہیں امید تھی کہ تیمور کے واپس آتے ہی مغلوں سے بغاوت کر کے آزادی حاصل کر لیں گے لیکن وہ ان دنوں دھندا گو کے ریگستان میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ امیر حسین، دلشاد اور اس کے

تمام ساتھی رخصت ہو چکے تھے اور وہ الجائی خاتون کو گھوڑے پر سوار کیے پیدل سفر کر رہا تھا۔ تیمور کے پاس خوراک ختم ہو چکی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے ایک جگہ بکریاں چرتی نظر آئیں۔ تیمور نے ادھر کا رخ کیا۔ بکریوں کا مالک بڑی مشکل سے دو بکریاں فروخت کرنے پر آمادہ ہوا۔ تیمور نے فوراً ایک بکری ذبح کر کے اس کا گوشت بھونا پہلے اپنے ساتھ والے ملازم کو دیا۔ پھر میاں بیوی نے ننھے جہانگیر کے ساتھ خوش ہو ہو کر مزے سے کھایا۔ دوسری بکری کا گوشت انھوں نے تپتے ہوئے پتھروں پر سینک کر خورجیوں میں بھر لیا۔ اس طرح گوشت عام طور سے طویل سفر کے دوران استعمال کیا جاتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ پھر سفر کے لیے تیار ہوئے تجوہ سے چلے ہوئے انہیں چھٹا دن تھا۔ چار دن بعد کھانا پیٹ بھر کے کھایا تھا اس لیے ملازم پر نیند یا کمزوری کا غلبہ ہوا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تیمور نے الجائی کی طرف دیکھا۔ "کیوں کچھ دیر آرام کر لیا جائے؟"

"نہیں میرے سرتاج ابھی سفر ختم نہیں ہوا" حوصلہ مند الجائی خاتون نے فوراً جواب دیا۔

تیمور نے گھوڑے کی لگام مضبوطی سے پکڑ لی اور ملازم سے کہا "ہمت کرو جوان۔ سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔"

ملازم سر کو ایک جھٹکا دے کر سنبھلا اور معذرت بھری نظروں سے تیمور کو دیکھنے لگا۔ تیمور نے غلام کی خاموش معذرت قبول کر لی اور گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے آگے بڑھا۔ بکریوں کا مالک اب تک دیں بیٹھا انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ تیمور نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے رک کر پوچھا۔ "کیوں بھائی اس ریگستان سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟"

"جب تمہیں نکلنے کا راستہ معلوم نہیں تھا تو اس ریگستان میں داخل کیوں ہوئے تھے؟" گلہ بان نے جواب دینے کے بجائے ہنس کر تیمور سے الٹا سوال کر دیا۔

تیمور کو اس کے اس تمسخر پر غصہ تو بہت آیا لیکن برا نہ مانا اور نرمی سے کہا "بھائی عزت اور ذلت اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ بندے کو جس حال میں رکھے اسے خوش رہنا اور صبر کرنا چاہیے۔"

گلہ بان تیمور کی بات سے بڑا متاثر ہوا۔ "ٹھیک کہتے ہو مسافر اللہ جس حال میں رکھے ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے گلہ بان اٹھا اور تیمور کے پاس آ کر بولا "گھبراؤ نہیں مسافر میرے ساتھ آؤ میں تمہیں راستہ بتاتا ہوں۔"

گلہ بان تیمور کو ایک اونچے ٹیلے پر لے گیا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا

"دیکھو مسافر یہ راستہ سیدھا ترکمانوں کے جھونپڑوں کو جاتا ہے۔ وہاں سے ایک راستہ تمہیں جنوب کی طرف جاتا ہوا ملے گا۔ اس راستے پر ہو لینا۔ اگر راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو ان شاء اللہ تم اس ریگستان سے باہر نکل جاؤ گے۔ راستے سے بالکل ادھر ادھر نہ ہٹنا۔" گلہ بان نے آخری بات پر خصوصیت سے زور دیا۔

تاتاریوں اور ترکمانوں کی بول چال کی زبان قدیم ترکی تھی لیکن تحریر میں جو زبان استعمال ہوتی تھی وہ وسط ایشیا کی منگولی اور اویغور تھی۔ یہ زبان اب مٹ چکی ہے۔ تاتاری اور ترکمان اپنی بول چال میں عربی کے بہت سے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ عربی کو اس دور میں ایشیا میں ایک ہمہ گیر حیثیت حاصل تھی۔ مغل بھی ترکی بولتے اور سمجھتے تھے کیونکہ ترکی اور اویغوری زبانیں آپس میں بہت مشابہت رکھتی تھیں۔ یہی وجہ تھی تیمور اور گلہ بان ترکمان کو آپس میں گفتگو کرتے وقت کسی طرح کی پریشانی نہ ہوئی۔

تیمور نے ٹیلے سے واپس آ کر الجائی کو بتایا

"یہاں سے ایک راستہ ترکمانوں کے جھونپڑوں کو جاتا ہے۔ اگر ہم ترکمان تک پہنچ جائیں تو وہاں سے جو راستہ ملے گا وہ ہمیں ریگستان کے باہر پہنچا دے گا۔"

تیمور نے محسوس کیا کہ ترکمانوں کے نام پر الجائی خاتون اور اس کے ملازم کے چہرے پر قدرے ناگواری اور خوف کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا۔ "الجائی یہ علاقہ ترکمانوں سے بھرا پڑا ہے ہم ان کے تعاون کے بغیر اس ریگستان سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یہ خطرہ تو ہمیں مول لینا ہی پڑے گا پھر خدا نے پانچوں انگلیاں برابر نہیں بنائیں۔"

"ہاں میرے سرتاج۔" الجائی خوش دلی سے بولی "ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو خدا آگے بھی ہماری مدد کرے گا۔"

تیمور نے اپنا رخ ترکمانوں کے جھونپڑوں کی طرف کر دیا۔ سورج ڈھل رہا تھا اس لیے ان کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ تیمور جھونپڑوں تک پہنچ گیا۔ جھونپڑوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تیمور نے پہلے جھونپڑے کے پاس پہنچ کر جھک کے اندر دیکھا۔ جھونپڑا خالی تھا۔ تیمور نے دوسرے جھونپڑے پر نظر ڈالی۔ تمام جھونپڑے خالی معلوم ہوتے تھے۔ تیمور کو کچھ تعجب ہوا۔ وہاں کوئی

متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ تیمور نے الجائی اور جہانگیر کو گھوڑے سے اتار کر اندر بھیج دیا اور ملازم کے ساتھ سامان اتار کر اندر رکھنے لگا۔ ابھی پورا سامان بھی نہ اترا تھا کہ باہر سے لوگوں کے چلنے پھرنے اور بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تیمور نے گھبرا کر باہر دیکھا اس کا جھونپڑا ترکمانوں نے گھیر لیا تھا۔ تیمور اور اس کا ملازم کمانیں کھینچے باہر نکلے اور ترکمانوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی کمانیں تیروں سے خالی تھیں۔ ترکش تو جیوہ والوں سے لڑتے ہوئے خالی ہو گئے تھے۔ ترکمان بھلا دو آدمیوں سے کیوں ڈرتے۔ وہ آہستہ آہستہ جھونپڑے کے اور قریب آ گئے۔

ترکمانوں کا سردار آگے آگے تھا اور تیمور کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ تیمور نے جھنجلا کے کمان پھینک دی اور تلوار کھینچ کر مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔ ترکمان بڑھتے ہوئے تیمور کے بالکل قریب پہنچ گئے اور قریب تھا کہ تلواریں ٹکرا جائیں کہ ترکمان سردار چیخا۔ "خبردار کوئی حملہ نہ کرے"۔

ترکمانوں کے قدم رک گئے۔ اٹھی ہوئی تلواریں ٹھہر گئیں۔ ترکمان سردار نے کمان پھینک دی۔ تلوار نیام میں کر لی اور ہاتھ پھیلا کر تیمور کی طرف بڑھا۔

"خدا کی قسم! میری آنکھیں دھوکا نہیں دے سکتیں۔ آپ تو ماوراء النہر کے امیر ہیں۔ تاتاریوں کے مشہور سردار تیمور۔ ہم آپ کے دوست ہیں"۔

تیمور نے بھی ترکمان سردار کو غور سے دیکھا۔ تلوار نیام میں کر لی۔ "میرا خیال ہے آپ حاجی محمود ہیں"۔

حاجی محمود مسکراتا ہوا تیمور کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دونوں سردار بغلگیر ہو گئے۔ حاجی محمود کے ترکمان حیرت سے منہ کھولے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ تیمور اور حاجی محمود جھونپڑے کے اندر چلے گئے۔ حاجی محمود نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"اے شہر سبز کے امیر۔ یہ ہماری کتنی بڑی بد قسمتی ہوتی کہ آپ کو ہمارے آدمیوں سے کوئی نقصان پہنچتا"۔

"حاجی محمود"۔ تیمور نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ "آپ سے مل کے جس قدر خوشی ہوئی ہے اُسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت جب کہ میرے اپنے آدمی میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں آپ جیسے دوست سے ملاقات میرے لیے باعث طمانیت ہے"۔

"سردار محترم"۔ حاجی محمود لجاجت سے بولا۔ "آپ ہمیں شرمندہ نہ کیجئے۔ آپ تاتاریوں کے بے تاج ہیں۔ ظالم مغلوں نے ہمارے علاقوں پر قبضہ کر کے قتل و غارت کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اُسے روکنے کے لیے ہمیں آپ جیسے کماندار کی ضرورت ہے"۔

اُس وقت حاجی محمود کی نظر جھونپڑے کے ایک کونے میں دبکی ہوئی الجائی خاتون پر پڑی اُس نے پلٹ کر پوچھا۔

"محترم امیر! آپ کے ساتھ یہ خاتون اور بچہ؟"

"یہ خاتون آغا الجائی خاتون ہیں اور یہ میرا بیٹا جہانگیر ہے"۔ تیمور نے جواب دیا۔

"واللہ وہ خاتون جو شوہر کے ساتھ امن و جنگ میں برابر شریک رہے کس قدر قابل احترام ہے"۔ حاجی محمود نے فوراً اٹھ کر الجائی خاتون کو سلام کیا۔ الجائی پشت کر کے بیٹھی تھی۔ حاجی محمود کے سلام پر اس نے پلٹ کر اس کے سلام کا جواب دیا اور منہ گھما کے بیٹھ گئی۔

ایک ترکمان نے اندر آ کر حاجی محمود کو اطلاع دی کہ اُن کے بیٹھنے کے لیے باہر فرش بچھا دیا ہے۔ حاجی محمود اور تیمور اٹھ کر باہر آ گئے۔ پوستین پوش ترکمان جو کچھ دیر پہلے تیمور کو قتل کرنے پر آمادہ تھے اب اُس کے قدموں میں بچھے جا رہے تھے۔ وہ ایک ایک تیمور کے پاس آتے اور اُس کے ہاتھ چوم کر معافی مانگتے۔ تیمور محبت سے اُن کے سر پہ ہاتھ پھیرتا اور انہیں اپنے ساتھ بٹھا لیتا۔ حاجی محمود کے حکم پر مہمانوں کے لیے ایک بھیڑ ذبح کر کے کھانا تیار کیا گیا۔ بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت ایک بڑے تھال میں نکالا گیا اور حاجی محمود کے علاوہ حاجی کے خاص خاص سرداروں نے تیمور کے ساتھ ایک تھال میں کھانا کھایا۔ دستور کے مطابق اگر کوئی ایک ہی برتن میں کھانا کھائے تو وہ ہمیشہ کے لیے دوست ہو جاتا تھا۔ تیمور کے دل میں اگر ترکمانوں کی طرف سے کچھ شک بھی تھا تو وہ اب بالکل دور ہو گیا۔

تیمور نے اگرچہ اب تک کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دیا تھا لیکن اُس نے اپنی حکمت عملی سے جس طرح مغلوں کا سیلاب روکا تھا اور تاتاری دوشیزاؤں کی بازیابی کے سلسلے میں جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا اس نے تیمور کو الف لیلہ کا شہزادہ بنا دیا تھا۔ تمام تاتاری سردار ایک ایک کر کے مغلوں کے حامی ہو گئے تھے لیکن تیمور ہی وہ شخص تھا جس پر مغل قابو نہ حاصل کر سکے تھے اور وہ اُس سے اس

قدر خائف تھے کہ اس کی گرفتاری کے لیے بھاری انعام کا اعلان کیا تھا۔ تاتاری اور ترکمان مغلوں کو پسند نہ کرتے تھے اور اُن کی غلامی کا جوا گردن سے اتارنا چاہتے تھے۔ اُنہیں تیمور میں وہ صلاحیتیں نظر آئی تھیں۔ جو انہیں اس غلامی سے نجات دلا سکتی تھیں۔

کھانے کے بعد جو باتیں شروع ہوئی ہیں تو یہ سلسلہ ختم ہی ہونے کو نہ آتا تھا۔ ترکمان جھونپڑے میں چہل پہل ہو گئی تھی۔ ترکمان عورتیں الجائی کے جھونپڑے میں جمع ہو گئی تھیں۔ جو بھی ترکمان عورت اس کے خیمے میں جاتی وہ گردن گھما کر ایک نظر اس تاتاری سردار کو ضرور دیکھتی جس کے قصے اور کہانیاں اُن علاقوں میں مشہور ہو چکی تھیں۔ ترکمان بچے بھی خوش ہو کر تیمور کے پاس آتے اور اس کا ہاتھ تیمور اُن کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتا اور اُن کے رخسار پر بوسہ دیتا۔ اس دوران باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ حاجی محمود اُس سے سردار سوالات کر رہے تھے اور تیمور انہیں مطمئن کرنے کے لیے تفصیل سے حالات بیان کر رہا تھا۔ رات گزرتی رہی اور باتیں ہوتی رہیں۔ نہ سوالات کا سلسلہ ختم ہوتا تھا اور نہ تیمور جواب دیتے ہوئے تھک رہا تھا اس طرح پوری رات گزر گئی اور سویرا حاجی محمود نہ خود سویا اور نہ تیمور کو سونے دیا۔

صبح کو بڑی مشکل سے باتیں ختم ہوئیں پھر یہ لوگ آرام کرنے کے لیے لیٹے۔ الجائی خاتون جھونپڑے میں بھی رات بھر رت جگا رہا اور ترکمان عورتیں اس سے دنیا جہان کی باتیں پوچھتی رہیں دوپہر کے بعد جب یہ لوگ سو کر اٹھے تو کھانا تیار رکھا تھا کھانے کے بعد پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ تیمور نے اظہار دوستی کے طور پر حاجی محمود کو ایک لعل اور دو موتیوں سے جڑے ہوئے جوڑے د اس رات بھی آدھی رات تک باتیں ہوتی رہیں۔ صبح کو جب تیمور روانہ ہونے لگا تو حاجی محمود کھانے کا سامان اور تین گھوڑے تیمور کو دیے اور تیمور کی آسانی کے لیے ایک رہبر ساتھ کر

تیمور اس صحرا میں بارہ دن مسلسل سفر کرتا رہا اور بخیر و خوبی اسے اس پر خطر صحرا سے نجا ملی۔ ترکمان رہبر، تیمور کو صحرا پار کرا کے واپس ہو گیا۔ تیمور کے پاس کھانے کا سامان تقریباً خ چکا تھا لیکن اُن کے پاس تندرست گھوڑے تھے اس لیے انہیں سفر جاری رکھنے میں کوئی پریشا ہوئی۔ تیمور کو اب خراسان کی سڑک کی تلاش تھی۔ آخر وہ سڑک پر پہنچ گئے اور خدا کا شکر کیا۔ ایک سمت سڑک پر انہیں ایک گاؤں نظر آیا۔ یہ گھوڑے بڑھا کر وہاں پہنچے لیکن گاؤں کی ویرانی

پر انہیں افسوس ہوا۔ اس گاؤں کو پتہ نہیں کیوں اجاڑ دیا گیا تھا۔ گاؤں کے تمام کنوؤں کو بھی بند کر دیا گیا تھا۔ تیمور اور اس کے ملازم کو پانی کے لیے زمین کھودنا پڑی۔ پانی نکلا تو انہوں نے خوب پیا اور جانوروں کو بھی پلایا۔ گھوڑوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور یہ لوگ گاؤں کے کھنڈرات میں آرام کرنے کے لیے ٹھہر گئے۔

کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلے نہیں آتی۔ خیوہ والوں سے جنگ کے دوران اُن کے تمام ساتھی ضائع ہو گئے تھے اور مشکل سے جان بچی تھی کہ اب دوسری مصیبت نے آگھیرا۔ انہیں ان کھنڈرات میں آرام کرتے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ قبائلیوں نے انہیں گھیر لیا۔ تیمور نے انہیں بہت سمجھایا کہ وہ بے ضرر مسافر ہیں اور راستہ بھول گئے ہیں لیکن قبائلیوں نے اُن کی ایک نہ سُنی چالیس پچاس قبائلیوں کا مقابلہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ وہ تیمور کو پکڑ کر اپنے قبیلے میں لے گئے۔ اس قبیلے کا سردار علی بیگ تھا۔ سردار نے تیمور کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور خوش ہو کے بولا

"واللہ! آپ تو شہر سبز کے امیر تیمور ہیں۔"

تیمور نے جواب میں خاموشی اختیار کر لی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور کئی بار مل چکے تھے۔ علی بیگ نے تیمور کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"تیمور تم خاموش رہ کر مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ تم وہی تیمور ہو جس نے بلاد شمال کے خانِ اعظم تغلق تیمور سے بغاوت کی ہے۔ مغلوں نے تمہاری تلاش میں تاتاری علاقوں کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ واللہ تم تو بڑے قیمتی مہمان ہو۔ میں تمہاری خوب خاطر کروں گا۔"

تیمور نے اس کی نیت بدلتی ہوئی دیکھی تو سمجھانے کے لیے کہا۔

"علی بیگ! میں نے جو کچھ کیا اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے کیا۔ مغلوں سے ہم آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اگر تاتار پر مغلوں کا مستقل قبضہ ہو گیا تو تم بھی محفوظ نہیں رہو گے ہمارا ساتھ دو ہم مال و دولت سے تمہارے قبیلے کو مالا مال کر دیں گے۔"

"نادان تیمور" علی بیگ ترشی سے بولا "میں ہاتھ آئے ہوئے خزانے کو ضائع کر دوں۔ یہ کون سی عقلمندی ہے؟ مغلوں نے تمہارے سر کی قیمت مقرر کی ہے۔ میں اُن سے منہ مانگی رقم وصول کروں گا۔ مستقبل کی موہوم اُمید پر میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

تیمور خاموش رہا۔ اس جاہل کو سمجھانا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ تیمور کا تمام سامان چھین لیا
گیا اور اسے ایک ایسے مکان میں قید کر دیا گیا جو شاید ایک زمانے سے بند تھا۔ جس کمرے میں ا
رکھا گیا اُس میں مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے اور کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے ہوا اور رو
کے لیے صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا چند ہی گھنٹوں میں الجائی خاتون اور معص
جہانگیر کا بُرا حال ہو گیا۔ الجائی کو بخار ہونے لگا اور جہانگیر کے جسم پر کیڑوں کے کاٹنے سے آبلے پڑ گئے
تیمور ایک دن ان مصائب سے ایسا پریشان ہوا کہ اس نے فیصلہ کیا کہ آج جب ترکمان غلام کھا
لے کر آئے گا تو وہ اس کا گلا دبا دے گا۔ اور پھر باہر نکل کر ترکمان پہرہ داروں سے مقابلہ کر کے جا
دے دے گا۔

یہ پختہ ارادہ کرنے کے بعد اُس نے الجائی سے کہا

"الجائی اب ہماری جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ زندگی شاید اتنی ہی تھی پھر کیوں نہ ہم بہادر
سے مقابلہ کرتے ہوئے موت کو گلے لگائیں"۔

الجائی تمام دن تیمور کی بے چینی محسوس کرتی رہی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ بولی
"میرے سرتاج مسلمانوں کو اللہ کی ذات سے کبھی ناامید نہ ہونا چاہیئے۔ جب تک سانس
ہے تب تک آس ہے۔ کیا پتہ اللہ تمہارے صبر کا امتحان لے رہا ہو"۔ پھر الجائی نے صبر ایوبؑ کی
مثال دے کر کہا۔

"اللہ نیک بندوں کو صبر میں ڈالا کرتا ہے۔ اگر وہ ہم سے ناراض ہے تب بھی ہمیں اس کا
شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اللہ نے ہمیں سرخ ریگستان سے بچایا ہے تو وہ یہ مصیبت بھی کسی نہ کسی
دن ضرور ختم کر دے گا"۔

تیمور کو بیوی کی باتوں سے کچھ سکون ملا مگر اُسے یہ خیال زیادہ پریشان کر رہا تھا کہ علی
بیگ بدطینت انسان ہے اگر اس نے اُسے خانِ اعظم کے حوالے کر دیا تو وہ اس کے ساتھ اور بُرا
سلوک کرے گا۔ علی بیگ واقعی اسی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تیمور کے بدلے میں
خانِ اعظم سے بھاری معاوضہ حاصل کرے گا۔ اس سلسلے میں اُس نے اپنا ایک آدمی بھی مغلوں
کے پاس بھیج دیا تھا لیکن جس کو اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ قدرت کو ابھی تیمور سے بہت کام لینے تھے

اس نے اُس کی رہائی کا سامان پیدا کر دیا۔
علی بیگ کا قاصد جب مغلوں کے لشکر میں پہنچا تو اس وقت مغلوں کا سردار اعلیٰ تغلق تیمور سمرقند
شہر حصار المالیق واپس جا چکا تھا اور تاتاری علاقے کا نظم و نسق اپنے بیٹے الیاس خواجہ خان
کے سپرد کر گیا تھا۔ الیاس خواجہ خان اور اس کا سپہ سالار بیک چک بہت لالچی آدمی تھے۔ قاصد نے جب
گرفتاری کے سلسلے میں بھاری رقم کا مطالبہ کیا تو وہ رضامند نہ ہوئے۔ انہوں نے ترکمان قاصد
کو قلعہ میں ٹھہرا لیا اور اس پر پہرہ لگا دیا۔ پھر تیمور کو بغیر معاوضے کے حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے
لگے۔ علی بیگ نے اپنے قاصد کو سمجھا دیا تھا کہ وہ مغلوں پر یہ ظاہر نہ کرے کہ تیمور اُس کی قید میں ہے بلکہ انہیں
بتائے کہ تیمور جس جگہ پوشیدہ ہے اس کا علم علی بیگ کو ہے۔ اور معاوضہ ادا ہونے کی صورت میں اُسے
پکڑ کے مغلوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ معاوضہ ادا کرنے کی قاصد نے یہ صورت بتائی تھی کہ چار
سوار معاوضے کی رقم لے کر اُس کے ساتھ بھیجے جائیں پھر رقم اور تیمور کا تبادلہ قزل قم (سرخ ریگستان)
میں پر کیا جائے یہ صورت الیاس خواجہ کو پسند نہ تھی۔ ایک تو اُسے اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں
ترکمان مغلوں سے رقم چھین کر انہیں قتل نہ کر دیں اور ریگستان میں بھاگ جائیں۔ اس خوفناک
ریگستان میں جاتے ہوئے ہر شخص گھبراتا تھا۔ مغل یہ خطرہ لینے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ پھر خود اُن کے دل
میں کھوٹ تھی۔ وہ تو بغیر کچھ دیئے تیمور کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا
الیاس خواجہ نے قاصد پر سختی بھی کی اور اُسے قتل کی دھمکی بھی دی لیکن وہ طوطے کی طرح اسی بات کی رٹ
لگائے رہا جو اُسے سکھا کر بھیجا گیا تھا۔ اس نے مغلوں کو تیمور کی گرفتاری کی ہوا بھی نہیں لگنے دی اُسے
ڈر تھا کہ اگر اس نے یہ بتلا دیا کہ تیمور علی بیگ کی قید میں ہے تو کہیں مغل اپنا لشکر لے کر وہاں نہ پہنچ
جائیں اور تیمور کو حاصل کر کے ترکمانی علاقوں کو بھی پامال کر ڈالیں۔
علی بیگ کا قاصد مغلوں کی قید میں بڑا پریشان ہوا۔ اُسے تو یہ اُمید تھی کہ دشمن کی گرفتاری کے
سلسلے میں مغل خوش ہو کر اُسے انعام دیں گے لیکن وہ تو اُلٹا مصیبت میں پھنس گیا۔ آخر اُس نے
رہائی کی ایک صورت نکالی لی۔ ایک ہفتے کی قید و بند کے بعد جب اُسے الیاس خواجہ کے سامنے
لایا گیا تو اس نے بڑی لجاجت سے کہا:
"اے مغلوں کے بادشاہ ہم ترکمان کسی کو دھوکہ نہیں دیتے اور جو کہتے ہیں وہ پورا کرتے ہیں

اگر آپ کو یہ شبہ ہے کہ تیمور آپ کے حوالے نہیں کیا جائے گا تو میں اپنے سردار کو اس بات پر آما لوں گا کہ تیمور کو گرفتار کر کے آپ کے آدمیوں کے حوالے کر دیا جائے اور جب تیمور آپ کے قب آجائے تو میرے سردار کو مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے۔"

قاصد کی یہ بات الیاس خواجہ کو پسند آئی۔ اُس نے ہنس کر کہا

"ترکمان قاصد۔ تم ایک عقلمند آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ہم کسی کو دھوکہ نہیں دیتے۔ اگر تم تیمور کو گرفتار کر کے ہمارے حوالے کر دو تو ہم مطلوبہ رقم کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تم لوگوں کے طور پر دیں گے۔"

"مغل بادشاہ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" قاصد نے بڑی چالاکی سے کہا۔ "ہم ترکمان بھی نہ کہ تیمور ہمارے علاقے میں قیام کرے۔ ہم خود اُسے قتل بھی نہیں کر سکتے اس لیے کہ تمام تاتار مخالف ہو جائیں گے اور ہم میں اُن کے مقابلے کی طاقت نہیں۔ آپ تیمور کو سمرقند لا کے قتل ک گا تاکہ ہم پر کوئی الزام نہ آئے۔"

"ایسا ہی ہوگا ترکمان قاصد۔" الیاس خواجہ خوش ہو کے بولا۔ "ہم تیمور کو سمرقند میں ہ کریں گے اس کے ساتھ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر تاتاریوں نے تم لوگوں کو پریشان کرنے کی تو ہم اُن کے شہروں اور قصبوں کو تاخت و تاراج کر کے ایسا سبق دیں گے کہ وہ ترکمان کبھی زبان پر نہ لائیں۔"

الیاس خواجہ نے ترکمان قاصد کو رہا کر دیا اور اس پر بختی کے بدلے میں کچھ رقم بھی دی نے پچاس مغل سواروں کا ایک دستہ قاصد کے ساتھ کیا تاکہ وہ تیمور کو گرفتار کر کے سمرقند قاصد مغل سواروں کے ساتھ بڑی تیزی سے سفر کرتا ہوا قزل قم کی سرحد پر پہنچ گیا۔ اُس نے مغلو ہاتھوں جو ذلت اور اذیت برداشت کی تھی اب اُس کا بدلہ لینے کا —— وقت آگیا تھا۔ قا کو لے کر اُس ہیبت ناک ریگستان میں اُس راستے سے داخل ہوا جو سیدھا موت کی وادی کو جا دن کے سفر ہی نے مغلوں کے حوصلے پست کر دیئے۔ یہاں ہر طرف بگولے اٹھتے اور گرد و غبار چلتے تھے۔ دھند اتنی کہ سورج نظر نہ آتا تھا۔ مغلوں کا پانی بھی ختم ہو گیا۔ قاصد نے انہیں تسلی دی پر پانی اور کھانا وغیرہ افراط سے مل جائے گا۔

پھر ایک صبح جب تھکے ماندے مغل سوار نیند سے بیدار ہوئے تو ترکمان قاصد کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ترکمان اپنی جان بچا کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ مغل سوار پہلے تو دیر تک قاصد کا انتظار ہے پھر سمجھ گئے کہ ترکمان قاصد نے اُن کے ساتھ فریب کیا ہے۔ انہیں ریگستان کے راستوں کا کوئی تھا۔ وہ پُرہول ریگستان میں بھٹکنے لگے۔ پتہ نہیں وہ واپس سمرقند پہنچے یا نہیں۔ ترکمان قاصد اپنے سردار کے پاس ضرور پہنچ گیا اور اُس نے اپنے سردار کو مغلوں کی زیادتیوں سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ سے کوئی معاملہ نہ کیا جائے ورنہ اُسے نقصان اٹھانا پڑے گا۔

الچی علی بیگ پر اس کا بڑا اثر ہوا لیکن وہ تیمور کو مفت میں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ تیمور کا اسلحہ سامان چھین لیا گیا تھا لیکن تیمور نے ہیرے جواہرات چھپا لیے تھے اگر علی بیگ اُس سے رقم کا مطالبہ شاید تیمور اب بھی اتنی دولت دے سکتا تھا کہ جو اُسے مغلوں سے بھی نہ مل سکتی تھی لیکن علی بیگ کو یہ نہ ہو سکا کہ اس پھٹے حال میں تیمور کے پاس جواہرات ہو سکتے ہیں۔ قاصد کی واپسی کے کچھ ہی دن بیگ کے بھائی کا بھی جواب اُسے موصول ہوا۔ علی بیگ نے جس وقت مغلوں کے پاس اپنا قاصد بھیجا وقت اپنے بھائی سے تیمور کی گرفتاری اور مغلوں سے معاملہ کرنے کے بارے میں مشورہ مانگا۔ کا بھائی شمالی ایران کا ایک با اثر سردار تھا اُس نے علی بیگ کو صرف جواب ہی نہیں دیا بلکہ کئی بیش قیمت تحائف بھی بھیجے تھے۔ اُس نے علی بیگ کو جو خط لکھا اُس میں تحریر تھا۔

"سردار۔ شہر سبز کے امیر تیمور اور مغلوں کے جھگڑے میں ہرگز دخل نہ دینا۔ تیمور تاتاریوں کا وہ ہے جس پر تاتاری جان دیتے ہیں اگر تم نے تیمور کو مغلوں کے حوالے کیا یا اُسے قتل کرنے کی کوشش اری تمہارے علاقے کو روند ڈالیں گے اور خاندان کے بچے بچے کو چن چن کر مار ڈالیں گے۔"

آخر میں علی بیگ کو مشورہ دیا تھا

"تیمور سے دست بستہ معافی مانگو اور اُسے عزت و احترام کے ساتھ جہاں وہ جانا چاہے رخصت ں سردار تیمور کے لیے تحائف بھیج رہا ہوں یہ تحفے اُس کی خدمت میں پیش کرتا اور معافی کے گار ہونا۔ اُمید ہے کہ وہ تمہیں معاف کر دے گا اور تم مستقبل کے عذاب سے محفوظ ہو جاؤ گے۔"

بھائی کے خط نے علی بیگ کو دہلا دیا۔ اُس نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ سب نے اُس کے رائے سے اتفاق کیا اور تیمور کو فوراً رہا کرنے کی درخواست کی۔ علی بیگ بھی اب تیمور کی گرفتاری

سے پریشان ہو گیا تھا۔ اُس کا قبیلہ بظاہر مویشی چرا کے پیٹ پالتا تھا لیکن اصلی کام قزاقی تھا۔ راہ
میں بھٹکنے والے قافلوں اور اکا دکا آدمیوں کو یہ لوگ لوٹ کر قتل کر دیا کرتے تھے۔ اس وقت ان
کا کام رُک گیا تھا اُس کے آدھے سے زیادہ سوار تیمور کی حفاظت پر مامور تھے۔ مغلوں نے جو آس
لگا رکھی تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ آخر وہ تیمور کو رہا کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

تیمور کو اس تاریک اور کیڑے مکوڑوں سے بھری کوٹھڑی میں قید ہوئے باسٹھ دن ہوئے
کہ ایک شام علی بیگ اپنے چند سرداروں کے ساتھ تیمور کے پاس پہنچا۔ الجائی خاتون اور ننھا جہانگیر سہم گئے،
انہوں نے سمجھ لیا کہ اب اُن کا آخری وقت آ گیا۔ تیمور بھی اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ آسانی
سے جان نہ دے گا اور دو چار کو خالی ہاتھوں سے ختم کر کے مرے گا لیکن علی بیگ کا رویّہ کچھ عجب تھا۔
وہ اور اُس کے سردار تیمور کے قریب آئے اور اس طرح سر جھکا کر کھڑے ہو گئے جیسے تیمور اُن کا قیدی
نہیں بلکہ آقا یا سردار ہے۔

"کیا چاہتے ہو علی بیگ؟" تیمور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"اے شہر سبز کے امیر!" علی بیگ بغیر سر اٹھائے بولا۔ "آپ ہمیں معاف کر دیجئے ہم نے آپ کی
بڑی گستاخی کی ہے۔"

تیمور اُسے بھی ایک بھیانک مذاق سمجھا۔ اُس نے پھر پوچھا۔ "علی بیگ مذاق چھوڑو اور اپنا مطلب
بیان کرو مگر یہ یاد رکھو کہ تاتاری اپنی جان سے زیادہ اپنی عزت و حرمت کو مقدم رکھتے ہیں۔"
جتوہ والوں کی حرکت دیکھ چکا تھا اُسے شبہ ہوا کہ شاید علی بیگ، الجائی خاتون کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

"نہیں امیر! ہم لاکھ بُرے سہی لیکن خواتین کی عزت ضرور کرتے ہیں۔" علی بیگ فوراً بولا۔
"خاتون آغا الجائی خاتون۔ امیر قزغن کی پوتی تمہاری محترم بیوی اور علی بیگ کی بہن ہے۔ مجھے اپنا بھائی
سمجھو امیر تیمور۔ میں اور میرے سردار تم سے بہت شرمندہ ہیں۔ تم معاف کر دو ہم سب کو۔"

تیمور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بولا۔ "اگر تم مجھے اور میرے بیوی بچے کو رہا کر رہے ہو تو
تمہیں معاف کرتا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی گلہ و شکوہ نہیں۔"

علی بیگ نے خوش ہو کے ہاتھ پھیلا دیے اور تیمور نے آگے بڑھ کے اُس کے سینے سے سینہ ملا دیا۔
علی بیگ نے بھائی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تیمور کو رہا کر دیا مگر اُس کے بھائی نے جو تحائف تیمور

۔۔لیے بھیجے تھے وہ بھاگتے چور کی لنگوٹی کے مصداق اپنے ہی پاس رکھ لیے اور تیمور کو اُس کی ہوا بھی نہ
۔۔دی۔ تیمور اب وہاں ایک لمحہ بھی گزارنا نہ چاہتا تھا مبادا کہ اُن کا ارادہ پھر بدل جائے اور وہ کسی اور
۔۔بیبت میں گرفتار ہو جائے۔ اس نے علی بیگ سے اجازت مانگی۔ علی بیگ بھی اُسے رکھنا نہ چاہتا تھا اس
۔۔یال تھا تیمور کو مزید روک کر اس کے قیام و طعام پر مزید خرچ کرنا بھرا سر گھاٹے کا سودا تھا۔ اس نے تیمور کو
۔۔نے کی اجازت دے دی۔

چلتے وقت علی بیگ نے تیمور کو جانے کے لیے صرف ایک گھوڑا اور ایک اونٹ دیا۔ یہ دونوں جانور
۔۔اور لاغر تھے۔ تیمور کے دونوں گھوڑے علی بیگ نے ضبط کر لیے اور نہایت خاموشی سے اور نشہ پر سامان
۔۔یا۔ علی بیگ نے اس کا پورا سامان بھی واپس نہ کیا۔ تیمور نے اس کا کوئی گلہ نہ کیا۔ اس نے الجائی خاتون
۔۔جہانگیر کو گھوڑے پر سوار کیا اور لگام پکڑ کر چلنے لگا۔ اونٹ کی لگام اس کے ملازم کے ہاتھ میں تھی
۔۔تک ترکمانوں کے جھونپڑے نظر آتے رہے یہ لوگ مطمئن نہ ہوئے انہیں بے چینی سی رہی۔ سواری کے
۔۔جانور کمزور تھے اس لیے تیمور کو آدھی منزل پر ہی قیام کرنا پڑا۔ اونٹ اور گھوڑے کو آرام دیے
۔۔ان کے لیے آگے بڑھنا مشکل تھا۔

عالی ہمت الجائی نے دو ماہ سے زیادہ قید کی صعوبتیں برداشت کی تھیں لیکن اُس کے چہرے پر ذرا
۔۔شکن نہ آئی تھی۔ وہ تیمور کو پیدل چلتے دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی لیکن چہرے پر ہر دم شگفتگی طاری
۔۔بد منزل پر جب تیمور نے قیام کیا تو الجائی خاتون نے مسکرا کر کہا۔

"میرے سرتاج ابھی سفر ختم نہیں ہوا۔ دیکھیں تقدیر آگے کیا دکھاتی ہے۔"

تیمور نے نظر اٹھا کر الجائی کے مسکراتے چہرے کو دیکھا تو اُس کی تمام تھکن جیسے دور ہو گئی۔

O

سمرقند میں جنازوں کی تلاشی پر سختیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ میت کو دفن کرنا مشکل ہو گیا۔ شہر کے
۔۔قبرستانوں پر پہرہ لگا دیا گیا اور مغل حاکموں نے پوری سلطنت میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جس شخص کے
۔۔ہاں فوت ہو جائے وہ جنازہ اٹھانے سے پہلے مغلوں کی فوجی چوکی پر اس کی اطلاع درج کرائے اور

جب تک مغل فوجی تحقیقات نہ کر لیں جنازہ نہ اٹھایا جائے۔ مولانا زین الدین نے قبرستان میں اپنی سرگرمیاں ختم کر دی تھیں اور وہ شہر سبز واپس آ گئے تھے۔ اب وہ مجاہدین کے اجتماع کے لیے دوسرے طریقوں پر غور کر رہے تھے۔ غیر ملکی قبضے کے خلاف جب کسی ملک میں ایک بار آزادی کی تحریک شروع ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ذرائع خود بخود پیدا کر لیتی ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ ملک میں مرنے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہو گئی اور اسی لحاظ سے شادیوں کی تعداد میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ شادیوں کا یہ اضافہ شہر سبز میں کچھ زیادہ ہی ہوا۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی گھر میں شادی کا ہنگامہ ہوتا۔ باجے بجتے، کھانے پکتے اور مہمان اکٹھے ہوتے۔ اُدھر مغلوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ تیمور ایک واپس آ گیا ہے اور پوشیدہ طور پر مغلوں کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مغل اور زیادہ محتاط ہو گئے اور جہاں بھی تاتاریوں کے گھر کوئی تقریب ہوتی، وہ آ دھمکتے۔ مفاد پرستوں اور ملک کے غداروں نے مغلوں کے کان میں یہ بات ڈالنا بھی شروع کر دی کہ شادی کے اکثر اجتماع فرضی ہوتے ہیں اور لوگ اس بہانے یکجا ہو کر بغاوت کے منصوبے بناتے ہیں۔ مغلوں کو مولانا زین الدین کی سرگرمیوں کی خصوصیت سے اطلاع دی گئی تھی لیکن مولانا کی مذہبی شخصیت کچھ ایسی بااثر تھی کہ مغل ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے تھے۔ پھر انہیں مولانا کے خلاف ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں ملا تھا جس کی بنا پر اُن کے خلاف کوئی کارروائی کی جا سکتی۔ بہرحال مفاد پرست مولانا کو رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے پوری تگ و دو کر رہے تھے۔

اُن دنوں مغل حاکم الیاس خواجہ خان اپنے سپہ سالار بیک جک کے ساتھ شہر سبز کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ مغلوں نے قصر سفید میں تیمور کی حویلی کو خالی کروا کر اُس میں اپنی چھاؤنی قائم کی تھی۔ مغل حاکم کا دورہ خالی از علت نہ تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ اگر تیمور واقعی واپس آ گیا ہے تو وہ اپنے شہر سبز میں ضرور آئے گا۔ اسی لیے الیاس خواجہ نے اپنا دورہ طویل کر دیا تھا بلکہ شہر سبز کو عارضی طور پر اپنا مستقر بنا کر وہیں ڈیرہ جمانے پڑا تھا۔

الیاس خواجہ اپنے محافظ دستوں کے ساتھ شہر سبز کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ دائیں بائیں مشہور تاتاری غداران وطن جعفر اور صادق چل رہے تھے۔ الیاس خواجہ کو ایک بڑی حویلی میں کافی رونق آئی۔ حویلی کا پھاٹک بند تھا اور چھوٹے دروازے سے لوگ اندر باہر جا رہے تھے۔ پھاٹک کے باہر کھا[illegible] رہا تھا۔ الیاس خواجہ نے پوچھا۔

"اس حویلی میں کیا ہو رہا ہے؟"

غدار جعفر نے جواب دیا۔ "مغل بادشاہ یہاں شادی ہو رہی ہے۔"

"کہیں یہ شادی بھی تو کوئی دھوکہ نہیں؟" الیاس خواجہ نے اپنا شبہ ظاہر کیا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح مرنے والوں کی خبر ہماری چوکیوں پر دے دی جاتی ہے اسی طرح شادیوں کا بھی اندراج کیا جائے تاکہ لوگ بلاوجہ ہی ایک جگہ نہ اکٹھا ہو سکیں۔"

"اس شاہی فرمان کا کل ہی اعلان کر دیا جائے گا شاہ معظم۔" دوسرے غدار صادق نے کہا۔ "اس سلسلے میں ہم وفاداروں نے یہ انتظام اپنے طور پر کیا ہے کہ جب کہیں شادی ہونی ہے تو ہم اُس کی تحقیق کر لیتے ہیں۔"

"تمہیں اس شادی کی خبر تھی؟" الیاس خواجہ نے ایک دم سوال کیا۔

"ہم اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہیں خان اعظم۔" جعفر نے اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ "ہمارے مخبروں نے ہمیں اطلاع دی تھی کہ اس حویلی میں آج شادی کی تقریب منعقد ہو گی۔"

الیاس خواجہ نے مسلمانوں کی شادی کی رسومات کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن اُس نے آج تک شادی کی کسی تقریب میں شرکت نہیں کی تھی۔ اُسے شوق پیدا ہوا کہ اس تقریب میں شریک ہو کر خود رسومات کو ادا ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ بولا۔

"کیا ہم تقریب میں شریک ہو سکتے ہیں؟ ہماری شرکت سے مسلمانوں کے مذہب کو تو کوئی نقصان نہ پہنچے گا؟"

"نہیں مغل بادشاہ۔" صادق نے کہا۔ "شادی میں تو ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔ میں ابھی آپ کے لیے انتظام کرتا ہوں۔"

صادق گھوڑا بڑھا کر حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ گیٹ پر دو مسلح تاتاری پہرہ دے رہے تھے۔ پہریداروں نے صادق کو فوراً پہچان لیا۔ صادق اور جعفر دونوں مشہور غدار تھے اور اُن سے تاتاریوں کا بچہ بچہ واقف تھا۔ مغلوں نے ان دونوں کو اہم عہدے سپرد کر رکھے تھے۔ تاتاری پہریداروں نے جھک کر انہیں سلام کیا۔

"پھاٹک کھول دو، مغل بادشاہ شادی میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔" صادق نے بڑے غرور

سے حکم دیا۔

تاتاری پہریدار اُسے آتا دیکھ کر ہی گھبرا گئے تھے مگر انہوں نے ہمت سے کام۔ ایک بولا۔

"خوش آمدید سردار صادق۔ یہ تو ہماری بڑی عزت افزائی ہوگی کہ شادی میں بادشاہ شریک ہوں اندر چلیے وہ دار خواتین بھی موجود ہیں۔ میں ابھی انہیں پردے میں بھیج کے مغل بادشاہ کے لیے مسند کا انتظام کرتا ہوں۔"

پہرے دار نے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور بھاگ کے اندر چلا گیا۔ اندر جا کر اس نے چھوٹے دروازے کو اندر سے بند کر لیا پھر دوڑتا ہوا اُس کمرے میں پہنچا جہاں سو کے قریب تاتاری جوان اور بوڑھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بدحواس پہرے دار کو دیکھ کر وہ لوگ گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"غضب ہو گیا مولانا!" پہرے دار نے مولانا زین الدین کو مخاطب کیا۔ "مغل بادشاہ غداروں کے ساتھ پھاٹک کے باہر کھڑا ہے۔ وہ شادی میں شریک ہونا چاہتا ہے۔"

تاتاری گھبرا اٹھے۔ انہوں نے بڑی حیرت سے مولانا کو دیکھا۔ مولانا بولے

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ صادق اور جعفر جیسے غداروں کی موجودگی میں یہ وقت تو ایک دن آنا ہی تھا ہم اس دن کے لیے پہلے سے تیار ہیں۔"

مولانا نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ انہیں سامنے عاصم کھڑا دکھائی دیا۔ وہی عاصم جو کفن پہن کے قبر میں دفن ہونے کے لیے تیار ہوا تھا۔ مولانا نے بڑھ کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"عاصم آج کی بارات کے تم دولہا ہو۔"

عاصم نے مولانا پر حیرت بھری ایک نظر ڈالی پھر تعمیل حکم میں سر جھکا لیا۔

"عاصم کو دولہا بنایا جائے۔" مولانا نے قریب کھڑے کسی آدمی سے کہا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہوئے

"آپ حضرات میرے ساتھ مغلوں کے استقبال کے لیے چلیے۔"

مولانا نے کمرے سے قدم نکالا۔ تمام باراتی جو کہ حقیقت میں تاتاری مجاہد اور سرفروش تھے، اُن کے پیچھے ہو لیے حویلی کا گیٹ کھول دیا گیا۔ مولانا زین الدین نے تمام باراتیوں کے ساتھ الیاس خواجہ کا استقبال کیا۔ جعفر اور صادق کو الیاس خواجہ کے ساتھ دیکھ کر مولانا کا خون کھول گیا لیکن ان غداروں پر توجہ دینے کے بجائے مولانا نے آگے بڑھ کر الیاس خواجہ کو خوش آمدید کہا۔

"زہے نصیب۔ مغل بادشاہ ہم غریبوں کی محفل میں تشریف لائے۔ اس عزت افزائی کے لیے ہم لوگ آپ کے بہت بہت شکر گزار ہیں۔" اُسی وقت مولانا کی نظر چند مغل سواروں پر پڑی جو ایلچی بہادر اور جاکو برلاس کو گھیرے کھڑے تھے۔ مولانا کی سمجھ میں فوراً سارا معاملہ آ گیا۔ انہوں نے فوراً کہا

"اے شاہِ تاتار۔ آپ کے سواروں نے ہمارے مہمانوں کو کیوں گھیر رکھا ہے؟"

الیاس خواجہ کے بولنے سے پہلے ہی بیک جک کا بھیانک قہقہہ بلند ہوا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر مولانا کے پاس پہنچا اور بولا۔

"یہ دونوں تیمور کے دوست ہیں اور حکومت کے باغی۔ ہم انہیں سزا دیں گے۔"

مولانا تو سر سے کفن باندھے ہوئے تھے۔ کڑک کے بولے "اے حاکم تاتار یہ تو ہمارے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ تیمور اسی شہر کا رہنے والا تھا اُسے ہم جانتے ہیں لیکن غلطی تیمور نے کی ہے آپ اسے پکڑ کے جو چاہے سزا دیجیے ہم پر امن شہریوں پر زیادتی کرنا کہاں کا انصاف ہے؟"

"ہم تیمور کے دوست کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اگر تم بھی تیمور کے دوست ہو تو تمہیں بھی ابھی قتل کر دیا جائے گا۔" اور بیک جک نے تلوار کھینچ لی۔

تاتاریوں نے مولانا زین الدین کو خطرے میں دیکھا تو ان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور ان کے ہاتھ بھی تلوار تک پہنچ گئے۔ مولانا نے بڑی دانائی سے حالات کو سنبھالا۔ بولے

"اے شاہِ تاتار اگر آپ ایلچی بہادر اور جاکو برلاس کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو کم از کم انہیں اتنی مہلت ضرور دیجیے کہ یہ دونوں اس شادی کی رسم کو مکمل کر لیں۔"

الیاس خواجہ دیکھ رہا تھا کہ بیک جک کی بیہودہ گفتگو نے تاتاریوں کو مشتعل کر دیا ہے اور وہ مارنے مرنے پر تلے نظر آ رہے ہیں اگر اس وقت خون خرابہ ہوا تو اس کی خبر خان اعظم تک ضرور پہنچے گی۔ تاتاری یہی شکایت لے کر جائیں گے کہ مغلوں نے ایک مذہبی فرض کی ادائیگی سے انہیں روکا ہے اور قتل و غارت کرنے لگے۔ بیک جک کا دوسرا قہقہہ بھی اس وقت تک بلند ہو چکا تھا اور اب وہ کوئی اور بے ہودہ بات کہنے والا تھا۔ الیاس خواجہ نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور مولانا سے نرمی سے بولا۔

"اے بزرگ اگر یہ دو تاتاری اس رسم میں شریک نہ ہوں تو کیا یہ شادی نہیں ہوگی؟"

"اے شاہِ تاتار۔ ان دونوں کی شادی میں شرکت اس لیے ضروری ہے کہ نکاح کے گواہ ہیں۔" مولانا

نے بڑی متانت سے وضاحت کی۔ "ہم مسلمان شادی کے وقت دولہا اور دلہن کی رضامندی حاصل کرتے ہیں۔ یہ رضامندی گواہوں کے سامنے حاصل کی جاتی ہے۔ اس نکاح کے لیے ایلچی بہادر اور جاکو برلاس منتخب ہو چکے ہیں۔ ان کی گواہی کے بغیر نکاح نہیں پڑھا جا سکتا۔"

"ان مسلمانوں کی رسمیں بھی کس قدر واہیات ہیں۔" بیک جک نے قہقہہ لگاتے ہوئے پھر دخل دیا۔

"مغل سپہ سالار۔ اپنی زبان بند رکھو۔" مولانا چیخ پڑے۔ پھر وہ الیاس خواجہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "شاہ تاتار۔ سپہ سالار کو ہمارے مذہب کی توہین سے روکا جائے۔ ہم مغلوں کے وفادار ہیں۔ خانِ اعظم نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ تاتاریوں کے مذہب میں کوئی دخل نہ دیا جائے گا۔"

الیاس خواجہ بیک جک کی باتوں سے چڑ گیا تھا اس نے صادق سے پوچھا۔

"تاتاری سردار۔ یہ بزرگ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا شادی میں گواہوں کی شرکت ضروری ہے۔"

"یہ بزرگ ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔" صادق، مولانا سے نظریں چراتے ہوئے بولا "مذہب کے معاملے میں ان کا کہنا حرفِ آخر ہے۔ گواہ کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی۔ مولانا درست فرماتے ہیں۔"

"انہیں چھوڑ دیا جائے۔" الیاس خواجہ نے فوراً حکم صادر کر دیا۔ "اور آئندہ سے کسی تاتاری کو اس وقت تک گرفتار نہ کیا جائے جب تک اس کے خلاف ثبوت نہ حاصل ہو جائے۔"

مولانا کی بروقت فراست نے ایلچی بہادر اور جاکو برلاس کی جان بچائی۔ اگر وہ بیک جک کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ شاید انہیں زندہ نہ چھوڑتا۔ ایلچی بہادر نے بعد میں مولانا کو بتایا کہ وہ دونوں منصوبے کے مطابق اجلاس میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔ انہوں نے مغل سواروں کو حویلی کے باہر کھڑے دیکھا۔ انہیں خطرہ محسوس ہوا تو وہ الٹے پیروں واپس ہوئے۔ مغلوں کو شبہ ہوا اور انہوں نے گھوڑے دوڑا کر پکڑ لیا۔ پھر جعفر اور صادق نے مغلوں کو یہ بتایا کہ ہم دونوں تیمور کے خاص آدمی ہیں بس اسی جرم میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

اندر کمرے میں صاف ستھرا فرش بچھا دیا گیا تھا۔ مولانا، الیاس خواجہ اور چیدہ چیدہ مغل سرداروں کو ساتھ لے کر کمرے میں آ گئے۔ مغل محافظ دستوں نے کمرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور چوکس ہو کر پہرہ دینے لگے۔ عاصم سر پر سہرا باندھے فرش پر ایک طرف بیٹھا تھا۔ الیاس خواجہ اور بیک جک دولہا کے سامنے بیٹھ گئے۔ جعفر اور صادق نے دولہا کے بائیں جانب نشست سنبھال لی۔ مولانا صاحبِ خانہ کو ساتھ لے کر وضو

کرنے کے بہانے کمرے سے نکل گئے۔ مولانا اور صاحبِ خانہ دونوں کے پیر ڈگمگا رہے تھے۔

صاحبِ خانہ نے آہستہ سے پوچھا۔ "اب کیا ہوگا مولانا؟"

"تمہارے کوئی لڑکی ہے؟" مولانا نے صاحبِ خانہ سے دوسرا ہی سوال کیا۔

"نہیں مولانا میرے تو لڑکے ہی لڑکے ہیں۔" صاحبِ خانہ نے حقیقت بیان کر دی۔

"گھر میں کوئی بھی جوان لڑکی موجود ہے؟"

"جی وہ کچھ خواتین مہمان آئی ہیں۔ ان کے ساتھ شاید کوئی لڑکی ہو۔" صاحبِ خانہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"چلو مجھے زنان خانے میں لے چلو۔" مولانا نے صاحبِ خانہ کو حکم دیا۔

مولانا زین الدین کو شہر سبز میں سب ہی جانتے تھے۔ ان کا ہر گھر میں بلا تکلف آنا جانا تھا۔ فاتحہ درود کے لیے مولانا کو گھروں میں جانا پڑتا تھا۔ صاحبِ خانہ اور مولانا زنان خانے میں پہنچے تو تمام خواتین نے انہیں اٹھ کر سلام کیا۔ مولانا نے دعا دے کر پوچھا۔

"تم میں کوئی کنواری لڑکی ہے؟"

خواتین نے مولانا کے اس عجیب سوال پر حیرت سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ مولانا نے پھر اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا۔

"میری بہنو اور بیٹیو۔ اس وقت ایک سو تاتاریوں کی جان خطرے میں ہے۔ یہ تاتاری محبِ وطن اور آزادی کے پروانے ہیں۔ یہ ملکِ تاتار کو مغلوں کی غلامی سے نجات دلانا چاہتے ہیں لیکن وہ مغلوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ان جاں فروشوں کو ہم نہیں بچا سکتے۔ صرف ایک کنواری لڑکی ذرا سی قربانی دے کر انہیں بچا سکتی ہے۔ میری کوئی ایسی بیٹی جو آزادی کے سو پروانوں کو مغلوں کے ہاتھ سے بچا لے۔"

عورتوں میں سے ایک نوخیز لڑکی آگے بڑھی۔ برابر کھڑی ہوئی عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لڑکی نے آہستہ سے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بولی۔

"ماں اگر میں اپنی جان دے کر بھی سو مجاہدوں کو شہید ہونے سے بچا سکوں تو تمہیں فخر ہونا چاہیے۔"

"شاباش بیٹی۔" مولانا کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

ماں نے بیٹی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ لڑکی بڑھ کے مولانا کے پاس آئی۔ "فرمایئے بزرگ مولانا۔ آپ ہماری

جنگِ آزادی کے رہبر ہیں۔ میں آپ کے حکم پر سر کٹانے پر آمادہ ہوں۔"

"خدا ہر تاتاری دوشیزہ کو تم جیسا حوصلہ دے۔" مولانا نے دعا کی اور عورتوں نے "آمین" کہہ کر اس دعا میں شرکت کی۔ مولانا نے لڑکی سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟"

"جمالی۔" لڑکی نے حیا سے نظر جھکا لیں۔

"اور تمہارے خوش نصیب باپ کا نام کیا ہے؟"

"وہ تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں مولانا۔" لڑکی کی ماں نے درد بھرے لہجے میں کہا جو لڑکی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

"سنو بیٹی جمالی۔ ہم سو آدمی شادی کا اعلان کر کے اس جگہ اکٹھے ہوئے تھے لیکن غداروں نے مغلوں سے مخبری کر دی۔ مغل سواروں نے حویلی کو گھیر لیا ہے۔ اگر ہم اس اجتماع کو شادی ثابت نہ کر سکے تو ہم سب کو قتل کر دیا جائے گا۔ میں نے عاصم ولد عبدالرحمٰن کو دولہا بنا کر محفل میں بٹھا دیا ہے۔ تم اس کی دلہن ہو گی۔ گواہوں کے سامنے تمہیں عاصم کو قبول کرنا ہو گا۔"

"جی۔ مولانا۔ مگر۔" لڑکی گھبرا گئی۔

"بیٹی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ تم جو چاہو گی وہی ہو گا لیکن اس وقت تمہیں تاتاریوں کو بچانے کے لیے عاصم کو قبول کرنا ہو گا۔" مولانا لڑکی کو تسلی دیتے ہوئے واپس ہوئے۔ دو قدم چل کے اک دم رکے، لڑکی کی ماں سے پوچھا۔ "مرحوم کا نام کیا تھا؟"

"الغ بیگ۔" لڑکی کی ماں نے جواب دیا

مولانا صاحب خانہ کو لیے بڑی تیزی سے زنان خانے سے باہر آ گئے۔ مولانا نے باہر آ کر پانی سے تین کلیاں کیں۔ پھر محفل میں جا کر بیٹھ گئے۔ جعفر اور صادق اس محفل میں بڑی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ ہر تاتاری انہیں حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ وہاں سے جلد رخصت ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے صادق نے مولانا سے کہا۔

"مولانا محترم۔ بسم اللہ کیجیے۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

مولانا نے ایسی قہر آلود نظروں سے جعفر اور صادق کو دیکھا کہ وہ سٹپٹا گئے۔ ایک طرف ایلچی بہادر اور

پاس دُبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ مولانا نے انہیں قریب بلا کر کہا۔

"جاؤ۔ اندر سے اجازت لے آؤ۔ لڑکے کا نام عاصم ولد عبدالرحمٰن اور ناکتخدا کا نام جمالی بنت الغ بیگ ہے۔" ایلچی اور جاکو چلنے لگے تو مولانا نے روک کر کہا۔ "دو گواہوں کو اور ساتھ لیتے جاؤ۔"

اس وقت صادق جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں گواہ کی حیثیت سے جاؤں گا۔"

صادق کی دیکھا دیکھی جعفر نے بھی خود کو دوسرے گواہ کی حیثیت سے پیش کر دیا۔ مولانا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ چاروں وکیل و گواہ صاحب خانہ کے ساتھ اجازت لینے کے لیے اندر چلے گئے۔ مولانا اس وقت بہت پریشان تھے۔ انہوں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا مگر صادق اور جعفر کے اندر جانے سے اُن کے تمام منصوبے پر پانی پھر گیا۔ تھوڑی دیر بعد گواہ اور وکیل دلہن کی اجازت لے کر واپس آ گئے۔

"مولانا نکاح پڑھیے۔" صادق نے واپس آتے ہی تحکمانہ انداز میں کہا۔

مولانا کے لیے سوائے نکاح پڑھنے کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا۔ دولہا سے پوچھنے کے بعد انہوں نے بلند آواز سے نکاح پڑھا جس کے بعد ہر طرف سے مبارک باد کی آوازیں بلند ہوئیں۔ جعفر اور صادق فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایاس خواجہ بھی اپنے مغل سرداروں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ مولانا نے رسمی طور پر انہیں ضیافت کی پیش کش کی مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ دراصل جعفر اور صادق میں اب بپھرے ہوئے تاتاریوں سے آنکھ ملانے کا حوصلہ باقی نہ رہا تھا۔

عاصم اور جمالی کی شادی کا ڈرامہ مکمل ہو گیا۔ مولانا زین الدین نے ایک سو تاتاریوں کو موت کے چنگل سے نکال لیا لیکن جب مولانا مغلوں کے واپس جانے کے بعد جمالی اور اُس کی والدہ کا تعاون کا شکریہ ادا کرنے اُن کے پاس گئے تو وہاں اس ڈرامے نے ایک دوسری ہی صورت اختیار کر لی۔ مولانا نے جو قدم اٹھایا تھا وہ سراسر قومی مفاد کے تحت تھا۔ اس میں اُن کا کوئی ذاتی مفاد یا خواہش پوشیدہ نہ تھی۔ عاصم اور جمالی نے جو تعاون کیا۔ وہ بھی ایک قومی تقاضا تھا۔

مولانا زین الدین خوش خوش اندر پہنچے اور جمالی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"جمالی بیٹی۔ تم نے اور تمہاری والدہ نے جس تعاون اور قومی ہمدردی کا مظاہرہ کیا اس کے لیے میں اور تمام تاتاری مجاہدین تمہارے شکر گزار ہیں۔ اب تمہارے سامنے ایک شرعی نکتہ بیان کرتا ہوں جو تمہارے شکوک و شبہات دور کر کے تمہیں مطمئن کر دے گا۔ شرع محمدیؐ میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر کسی بے گناہ کی جان بچانے کے لیے تمہیں جھوٹ بولنا پڑے اور اس جھوٹ بولنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد پوشیدہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس جھوٹ کے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ نکاح محض تاتاریوں کی جان بچانے کے لیے پڑھا گیا تھا اس لیے اس کی کوئی شرعی حیثیت یا حقیقت نہیں۔ تم پہلے ہی کی طرح ناکتخدا اور دوشیزہ ہو۔ تم قطعی آزاد ہو جہاں چاہو اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہو۔"

جمالی جیسے خواب سے چونک پڑی۔ اس نے مولانا کو حیران نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"بزرگ مولانا! آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ نے مجھ سے قربانی مانگی میں نے سچے دل سے پیش کر دی اور اسی سچے دل سے میں نے عاصم کو اپنا شوہر قبول کر لیا ہے۔ اب میں شرعی حیثیت سے عاصم کی بیوی ہوں اور کسی اور سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ نہ میں عاصم سے آزادی چاہتی ہوں۔ عاصم جب چاہیں مجھے رخصت کرا کے لے جا سکتے ہیں۔"

مولانا کو پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مولانا کا خیال تھا کہ وہ حقیقت بیان کر کے اس نکاح کو فسخ کرنے کا فتویٰ دے کر عاصم اور جمالی کو مطمئن کر دیں گے لیکن جمالی کا یہ اعلان کہ اس نے عاصم کو خلوصِ دل سے قبول کرتے ہوئے "ہمکاری" کی ٹھہری تھی۔ مولانا کے لیے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ انہوں نے کہا۔

"جمالی بیٹی۔ تمہارے بیان کی روشنی میں، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ کم از کم تمہاری طرف سے اس نکاح کو شرعی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور اسے فسخ نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس سلسلے میں عاصم سے گفتگو کرتا ہوں اگر وہ بھی آمادہ ہے تو میں ابھی تمہاری رخصتی کا بندوبست کروں گا۔ تم بالکل اطمینان رکھو میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تمہاری مرضی بہر صورت مقدم رہے گی۔"

مولانا جمالی کے پاس آنے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے کہہ آئے تھے کہ وہ چاہیں تو اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں کیونکہ نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر انہیں اپنی حکمتِ عملی کو ازسرِ نو ترتیب دینا ہوگا۔ چنانچہ جب مولانا واپس آئے تو تقریباً تمام لوگ واپس جا چکے تھے۔ ایلچی بہادر، جاکو بر اکس اور کچھ تاتاری

[مو]لانا کا انتظار کر رہے تھے۔ مولانا نے واپس آتے ہی بڑی رازداری سے پوچھا

"بیٹے عاصم۔ تمہاری قربانیاں ہمارے لیے قابلِ فخر ہیں۔ آج بھی تم نے جس فرمانبرداری کا ثبوت دیا [ا]سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ہاں یہ بتاؤ اگر میں یہ کہوں کہ تمہارا نکاح جمالی بنت الغی بیگ سے شرعی [حیث]یت سے ہو گیا ہے تو کیا تم جمالی کو رخصت کرا کے اپنے گھر لے جانے پر تیار رہو؟"

عاصم نے بڑی حیرت سے مولانا کو دیکھا۔ بولا۔ "حضور آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ آپ نے حکم دیا کہ [دولہا ب]ن جاؤ۔ میں نے اس کی تعمیل کی۔ میں جانتا تھا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ مغلوں کو مطمئن کرنے کے [لیے مح]ض ایک دکھاوا ہے اس لیے میں نے اسے دل سے قبول نہ کیا تھا۔ جمالی میری طرف سے آزاد ہے۔ اس پر [کو]ئی حق نہیں جتاؤں گا۔ اس کے ساتھ میں یہ ضرور کہوں گا کہ جمالی واقعی بڑی حوصلہ مند لڑکی ہے جس نے [ب]لا اس فرضی عقد میں ہمارے ساتھ تعاون کیا۔"

مولانا کے لیے عاصم کا جواب قطعی غیر متوقع تھا۔ ان کی الجھن میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا [۔ ...]۔ "عاصم۔ شاید تم نے جمالی کو نہیں دیکھا۔ میرے خیال میں اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی خواہش [ہر جو]ان کو ہوتا چاہیے۔ جمالی ایک نیک طینت، سمجھدار اور خوب صورت بچی ہے۔ اگر تم اپنا اطمینان کرنا چاہو [تو] اس سے تمہاری بالمشافہ گفتگو کا انتظام کر سکتا ہوں۔ شرع اس کی ہمیں اجازت دیتی ہے۔"

عاصم بڑے اضطراب اور تذبذب کے عالم میں تھا۔ وہ مولانا جیسے فرشتہ صفت سراپا ایثار ہستی کے [سامنے گ]ستاخی بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اسے مولانا کو بھی مطمئن بھی کرنا تھا۔ اس نے نہایت ادب سے کہا۔

"بزرگ محترم۔ جمالی واقعی قابلِ قدر لڑکی ہے۔ میں اس کی جرأت اور حوصلے کا قائل ہوں لیکن جب [میں نے] جمالی کو نکاح کے وقت دل سے قبول ہی نہیں کیا تو یہ عقد ہوا ہی نہیں۔ میں جمالی سے گفتگو کرنے [کی ضرو]رت محسوس نہیں کرتا۔"

"عاصم بیٹے بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" مولانا نے اسے سمجھایا۔ "بیٹے بات یہ ہے کہ میں نے جمالی کو یہ [بت]ایا تھا کہ تمہارا نکاح عاصم کے ساتھ مصلحتِ وقت کے تحت کیا جا رہا ہے اور بعد میں اسے منسوخ [کر دی]ا جائے گا۔ وہ معصوم اسے سچ مچ کا نکاح سمجھ بیٹھی۔ اب وہ کہتی ہے کہ عاصم میرے شرعی شوہر ہو[چکے ہیں] اور وہ تم سے جدا ہونے کے لیے کسی طرح تیار نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے رخصت کرا کے گھر لے جاؤ [...]بہتر بیوی شاید تمہیں نہ مل سکے۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تم نے جمالی کو نکاح کے وقت دل سے قبول نہ کیا تھا

تو اس کا حل یہ ہے کہ ہم ایجاب و قبول کی رسم دوبارہ ادا کرا لیتے ہیں۔"

"لیکن مولانائے محترم" عاصم بڑی بے بسی سے بولا۔ "میں کسی دوسری لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں جبکہ صرف چھ ماہ پیشتر میرا نکاح ہو چکا ہے۔ میں تو ان ہنگامی حالات میں شادی کرنے کے لیے آمادہ ہی نہیں تھا وہ چچا زاد ۔۔۔۔ اور بچپن کی منگیتر ہے۔ میرے چچا سخت بیمار تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی ان کے سامنے ہی اپنے گھر کی ہو جائے۔ اُن کو مجبور کرنے پر میں نے نکاح تو کر لیا لیکن رخصتی کے لیے یہ شرط لگا دی کہ جب تک میرا ملک مغلوں کی غلامی سے آزاد نہیں ہو جاتا میں بیوی کو رخصت کرا کے گھر نہ لاؤں گا۔ آپ میری مجبوری محسوس کیجیے اور جمالی کو سمجھا بجھا کر اس ارادے سے باز رکھیے۔"

"عاصم تمہاری مجبوریاں اپنی جگہ درست ہیں" مولانا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر ہماری شریعت میں ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ اسلام نے ایک وقت میں چار بیویوں کی اجازت دی ہے۔ تم جمالی سے دوسری شادی کر سکتے ہو۔ شرع اس میں مانع نہیں ہے۔"

عاصم کو دراصل اپنی چچا زاد بہن سے بڑی محبت تھی۔ دونوں بچپن سے ایک ساتھ کھیلتے ہوئے بڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے مزاج سے واقف تھے۔ عاصم کا دل کسی طرح گوارہ نہ کر رہا تھا کہ وہ اپنی محبت کرنے والی لڑکی کا دل دکھائے جو گھر میں اس کی سلامتی کی دعا مانگ رہی ہے۔ پھر نہ تو اس کی مالی حالت ایسی تھی کہ وہ بیک وقت دو عورتوں کی ذمے داری اٹھا سکے اور نہ ہی پہلی بیوی میں کوئی ایسی کمی یا نقص تھا کہ وہ دوسرا نکاح کر لے۔ مولانا سے وہ کھل کر انکار بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس نے ادب سے کہا۔

"حضرت مولانا یہ آپ کا حکم ہے تو مجھے اس کی تعمیل میں کوئی عذر نہیں لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے آپ نے اپنے ہر وعظ میں یہ فرمایا ہے کہ مرد کو اس صورت میں دوسری شادی کرنا چاہیے جب کہ انتہائی مجبوری ہو اور وہ بیویوں کے درمیان مساوات اور برابری قائم رکھ سکے۔ جمالی میری دوسری بیوی ہو گی جو کہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔ اس صورت میں، میں دونوں کے ساتھ یکساں سلوک نہ کر سکوں گا اور میں یقیناً گنہگار ہو جاؤں گا۔"

"میں تمہارے خیالات سے پوری طرح متفق ہوں عاصم" مولانا حقائق سے انکار نہ کر سکے۔ "میرے خیال میں اس مسئلے کا ایک اور حل بھی ہے لیکن میں اُسے ذاتی طور پر پسند نہیں کرتا اور نہ میں تمہیں اس پر عمل کرنے پر مجبور کروں گا۔"

"مولانائے محترم" عاصم بڑی عقیدت سے بولا۔ "میں آپ کے حکم پر سر کٹانے کو تیار ہوں لیکن میں چاہتا ہوں اگر کوئی ایسی ترکیب یا حل موجود ہے جس سے جمالی مطمئن ہو سکے تو میں درخواست کروں گا کہ وہ بتائیں تاکہ یہ مسئلہ کوئی ناخوشگوار سنگین صورت اختیار نہ کر لے۔"

"عاصم بیٹے" مولانا فیصلہ کن انداز میں بولے۔ "میں تم سے طلاق لکھا کر جمالی کو ہمیشہ کے لیے آزاد کرا سکتا ہوں۔ جمالی اس بات پر تم سے شکوہ نہیں کر سکتی لیکن میں اور تم شاید اس قدر خود غرض کبھی نہ ہوں کہ ہم اس لڑکی کا دل دکھائیں جس نے بڑی فراخدلی اور خلوص کے ساتھ ایک سو تاتاریوں کو بچانے کا ہم پر اندھا اور بھرپور اعتماد کیا۔ بتاؤ عاصم کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟"

"ہرگز نہیں حضور" عاصم نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "جمالی تو تاتاریوں کی نجات دہندہ ہے۔ میں اسے دکھ دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارے ساتھیوں کو جب معلوم ہو گا کہ میں نے جمالی کے ساتھ سنگدلانہ سلوک کیا ہے تو وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ یہ تو جمالی کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ اس کی توہین ہو گی۔ مطلقہ ہونے کے بعد وہ اپنی ہم جولیوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جائے گی۔"

"عاصم۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو حالات کے حوالے کر دیا جائے۔" مولانا اٹھتے ہوئے بولے۔ "تم نے اپنی بیوی کے ساتھ یہ شرط رکھی ہے کہ اسے ملک آزاد ہونے سے پہلے رخصت کرا کے نہیں لاؤ گے۔ یہی شرط تم جمالی کے لیے بھی سمجھو۔ میں جمالی کو تمہارے حالات سے آگاہ کر دوں گا۔ وہ بڑی سمجھدار اور حوصلہ مند لڑکی معلوم ہوتی ہے اگر وہ اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ اس کی رخصتی بھی آزادی کے بعد کی جائے تو یہ مسئلہ ایک طویل مدت کے لیے دب جائے گا۔ ہم سب کی نیتیں نیک ہیں اس لیے اس عرصہ میں اللہ خود ہی کوئی بہتر صورت پیدا کر دے گا۔"

عاصم نہایت سعادت مند جوان تھا۔ اُس نے مولانا کو یقین دلایا کہ وہ کسی صورت میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائے گا جو جمالی کی دل آزاری کا سبب بنے۔ مولانا نے حویلی سے جانے سے پہلے جمالی کے پاس یہ پیغام بھجوا دیا کہ وہ اس سلسلے میں جلد ہی جمالی سے دوبارہ ملاقات کریں گے۔ مزید یہ کہ جمالی کی خواہشات کا خیال رکھا جائے گا اور کوئی بات اُس کی مرضی کے خلاف نہ ہو گی۔

جمالی کے باپ کے انتقال کے وقت اس کے چچا نے بھاوج اور بھتیجی کی کفالت کی رسمی طور پر پیشکش

کی تھی لیکن جمالی کی ماں نے یہ پیش کش قبول نہ کی۔ ایک تو اس کی وجہ اُس کے مرحوم کی سخت گیر طبیعت تھی
دوسرے اُس کے دیور کا لڑکا ہیراش ایک اوباش قسم کا جوان تھا۔ جمالی کی عمر اس وقت بارہ سال کی تھی۔ ا
کی ماں نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ نوجوان بیٹی کو لے کر ایسے ماحول میں جائے جہاں کسی وقت بھی کوئی حادثہ
سکتا تھا۔ ان باتوں پر غور کرتے ہوئے اُس نے اپنے بڑے بھائی کی کفالت منظور کر لی۔ اس کا بھائی قلع کراد
نیک دل انسان تھا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جمالی جب ماموں کے گھر پہنچی تو ماموں ممانی نے اُسے
ہاتھ لیا اور اپنی بچّی کی طرح اُس کی پرورش اور نگہداشت پر توجہ دی۔

بارہ سال کی جمالی نے جب سولہویں سال میں قدم رکھا تو اس کا رنگ روپ کچھ ایسا نکھرا کہ
میں ایک گنی جانے لگی۔ جمالی کی ماں کو اُس کی اُمڈتی جوانی دیکھ کر اُس کی شادی کی فکر ہوئی اور کسی ا
رشتے کی تلاش میں لگ گئی۔ جمالی کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہ تھی لیکن اُس کے ماموں اور ممانی ہر
نامنظور کر دیتے کہ جمالی کی عمر ہی ابھی کیا ہے۔ دراصل انہیں جمالی سے اس درجہ محبت ہو گئی تھی
اتنی جلدی اُسے جدا کرنے پر تیار نہ تھے۔ جس وقت جمالی اور عاصم کی شادی حادثاتی طور پر ہوئی
وقت اُس کے ماموں تجارت کے سلسلے میں سمرقند گئے ہوئے تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ شہر میں موجود نہ
الجھنیں کچھ اور بڑھ جاتیں لیکن یہ بات ایسی نہ تھی کہ جمالی کی ماں اپنی بھاوج سے پوشیدہ رکھتی۔ ا
ہی اُس نے جمالی اور عاصم کی شادی کی پوری تفصیل بھاوج سے بیان کر دی۔ اُس کے بھائی اور
دونوں تاتاریوں کی آزادی کے زبردست حامی تھے۔ جمالی کی ممانی کو جب یہ معلوم ہوا کہ جمالی کا شوہر
تحریک آزادی کا سرگرم کارکن ہے تو وہ بہت خوش ہوئی اور اُس نے جمالی کی ماں کو اطمینان دلایا کہ
شوہر کو اس شادی پر رضامند کر لے گی اور اُن کے دل میں کوئی ملال نہ پیدا ہونے دے گی۔

مولانا زین الدین نے تاکید کر دی تھی کہ اس شادی کا چرچا نہ کیا جائے مگر یہ بات ایسی نہ تھی کہ
تک پوشیدہ رہ سکتی۔ بات ایک منہ سے ہوتی ہوئی پورے شہر میں پھیل گئی۔ شہر سبز کوئی بڑا
محلے قریب قریب آباد تھے۔ کوئی عام لڑکی ہوتی تو شاید لوگ اس پر توجہ نہ دیتے لیکن جمالی کا حسن
تو شہر سبز کے ہر نوجوان کے دل میں گھر کیے ہوئے تھا۔ جمالی کا سب سے بڑا عاشق اس کا چچا زاد بھا
تھا جو بزعم خود اپنے دوستوں میں کہتا پھرتا تھا کہ جمالی نے اُس سے شادی کا وعدہ کیا ہے اس لیے
کو نامنظور کر دیتی ہے۔ پس جب اُسے جمالی اور عاصم کے عقد کی خبر ملی تو اُس کے دوستوں نے اُس

غصے سے بے قابو ہو گیا اور سیدھا جمالی کے گھر پہنچ گیا۔
جمالی باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔ اُس کی ماں آنگن میں بیٹھی تھی۔ ہیراش جاتے ہی اُن پر برس پڑا۔
ن۔ آپ نے یہ کیا کیا؟"
جمالی کی ماں نے اُسے حیرت اور غصے سے دیکھا۔ بولیں۔ "ہیراش تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ نہ سلام نہ
اپنے بزرگوں سے اس طرح گفتگو کرتے ہیں۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"
ہیراش شرمندہ تو ہوا مگر بڑا ڈھیٹ تھا۔ اُس نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور کہا۔ "چچی جان۔ آپ کو
نا چاہیے تھا۔ میں بھی تو خاندان میں موجود تھا۔ حیرت ہوتی ہے آپ نے۔"
"پہیلیاں نہ بجھاؤ ہیراش۔" جمالی کی ماں کو بھی غصہ آ گیا۔ "میں نے کیا کیا اور اگر کچھ کیا ہے تو تم میرے
ں دخل دینے والے کون ہو؟ تم مجھے کیا دیتے ہو؟ کس بات کا حق جتا رہے ہو؟"
"میں۔ میں۔ آخر میں آپ کا بھتیجا ہوں۔" ہیراش اور ڈھٹائی سے بولا۔ "جمالی کا نکاح آپ نے کیوں
یں کیا کمی تھی؟ جمالی کا نکاح مجھ سے ہونا تھا۔"
"ہیراش۔ ہوش میں آؤ۔" جمالی کی ماں پہلو بدل کر بولیں۔ "جمالی کا نکاح ہو چکا ہے۔ اُس کے
تمہیں ایک لفظ کہنے کا حق نہیں۔ آخر وہ جوان تھی۔ اُس کا نکاح کہیں تو ہونا تھا۔ تم نے یا تمہارے
بھی آ کر پوچھا کہ ہم لوگ کس حال میں ہیں؟ اب خیال آیا ہے تمہیں۔"
جمالی کے کانوں میں ماں کے تیز تیز بولنے کی آواز پڑی تو وہ گھبرا کے باورچی خانے سے نکل آئی۔
دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ اُس نے ماں سے کوئی گستاخی کی ہوگی۔ ہیراش بھی اپنے باپ کی طرح تند خو
مزاج کا آدمی تھا۔ پھر بھی اُس نے مسکرا کے ہیراش کو سلام کیا۔ "ہیراش بھائی خیریت تو ہے آج
بھول گئے؟"
جمالی کے طنز بھرے لہجے سے ہیراش گھبرا گیا۔ "میں تو آتا ہی رہتا ہوں جمالی۔ آج نیا تو نہیں آیا ہوں۔"
"جی آپ ٹھیک فرما رہے ہیں ہیراش بھائی۔" جمالی نے طنز کا ایک اور تیر چلایا۔ "پچھلے تین سال سے
پہلا پھیرا ہے۔ یہ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ فرمایئے آپ کی کیا خدمت کی جائے۔"
جمالی کی ماں نے دیکھا کہ جمالی ہیراش کو آڑے ہاتھوں لے رہی ہے تو وہ اٹھ کے اندر چلی گئی۔ ہیراش
مت جاتا اور نرم لہجے میں بولا۔ "جمالی۔ میں تو تمہارا عزیز ہوں، دوست ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم

مصیبت میں پھنس جاؤ۔"

"مصیبت بھی تو زندگی کا ایک حصہ ہے ہیراش بھائی۔" جمالی اُسی طرح مسکرا رہی تھی۔ "آپ کسی نئی مصیبت کا ذکر کر رہے ہیں کیا؟"

"ہاں جمالی۔" ہیراش جلدی سے بولا۔ "وہ تم نے جو عاصم سے نکاح کر لیا ہے فوراً ختم کرو۔ تمہیں بڑا نقصان ہوگا اس سے۔"

جمالی کی طبیعت میں شوخی کے ساتھ بڑا تحمل تھا۔ بولی۔ "ہیراش بھائی۔ سانپ نکل جائے تو لکیر پیٹنے سے کیا حاصل؟ جو ہو چکا اُس پر خاک ڈالیے اور کوئی نئی بات سنائیے۔ ہاں وہ آپ کی شادی کا کیا بنا؟ ہمارا تو دعائیں مانگتے مانگتے زبان گھس گئی ہے۔ اللہ لبر، آپ اب شادی کر ہی ڈالیے۔" جمالی نے ہیراش کی بات کو مذاق میں ایسا اُڑایا کہ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

جھنجلا کے بولا۔ "میں تمہارے نکاح کی بات کر رہا ہوں اور تم میری شادی کا جھگڑا لے بیٹھیں۔ میری شادی اب کہاں ہوگی؟"

"توبہ توبہ ہیراش بھائی۔" جمالی ہنسنے لگی۔ "خدا نہ کرے۔ آپ کے لیے کیا لڑکیوں کی کمی ہے۔ ہمارے ہاں ایک سے ایک خوبصورت سہیلی پڑی ہے۔ آپ اشارہ تو کریں۔"

"تم میرا مذاق اُڑا رہی ہو جمالی۔" ہیراش چڑ گیا۔ "میں کہہ رہا ہوں عاصم سے تمہیں نقصان پہنچے گا۔ یہ گاڑی نہیں چل سکتی۔"

"ہیراش بھائی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" جمالی پھر بھی سنجیدہ نہ ہوئی۔ "یہ گاڑی مجھے اور عاصم کو چلانی ہے۔ ہم آپ سے امداد نہیں طلب کریں گے۔"

"سنو جمالی۔" ہیراش ترش لہجے میں بولا۔ "عاصم کے ساتھ تمہارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کی بیوی موجود ہے اُس نے تمہیں دھوکہ دیا ہے۔"

"یہ میرے لیے نئی خبر نہیں ہے۔" جمالی بے پروائی سے بولی۔ "عاصم کا نکاح ہوا ہے۔ ابھی وہ پہلی بیوی کو رخصت کرا کے نہیں لایا۔ دو تلواریں ایک میان میں نہیں رہ سکتیں لیکن دو بیویاں ایک گھر میں گزارہ کر سکتی ہیں۔"

ہیراش کا خیال تھا کہ جمالی کو عاصم کی پہلی شادی کا علم نہیں لیکن جب جمالی پر اس انکشاف کا

کوئی اثر نہ ہوا تو ایک اور پینترا بدلا۔ بولا۔ "عاصم کی بہت کم زندگی ہے جمالی۔ وہ کسی وقت بھی قتل ہو سکتا ہے۔"

"ہیراش بھائی۔ آپ بھی سن لیجیے۔" جمالی بڑے وقار سے بولی۔ "آزادی کی آواز اُٹھانا غداری نہیں۔ اگر وہ اس جرم میں گرفتار ہو کر قتل ہو جائے تو مجھے اُس کی بیوہ ہونے پر فخر ہوگا۔ غدار تو جعفر اور صادق ہیں یا وہ جو آزادی کی تحریک کے مخالف ہیں۔"

ہیراش کو یہاں ناکامی ہوئی تو اُس نے عاصم کی پہلی بیوی صائمہ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ یہ سب لوگ ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور آپس میں دور کے عزیز بھی تھے۔ ہیراش پورے قبیلے میں بدنام تھا۔ اُسے کوئی منہ نہ لگاتا تھا۔ صائمہ تو ہیراش کو گھر میں بلانے کی بھی روادار نہ تھی لیکن اس کی ماں نے کچھ مروت برتی اور وہ معصوم صورت بنائے اُن کے پاس جا کر ادب سے بیٹھ گیا۔

"ہیراش میں نے ملاقات کی تمہیں صرف اس وجہ سے اجازت دی ہے کہ تم ضرور کسی اہم گفتگو کے لیے آئے ہو۔" صائمہ کی ماں نے ہیراش کو خاموش دیکھ کر ذرا تلخی سے کہا۔ "تمہارا تعلق ہمارے قبیلے سے ہے اور تم جانتے ہوگے کہ سلاوز قبیلے کے جوان کسی ایسے گھر میں تنہا نہیں جایا کرتے جہاں لڑکیاں موجود ہوں۔ اگر تم کوئی خاص گفتگو نہیں کرنا ہے تو تم واپس جا سکتے ہو۔"

ہیراش کو یہاں بھی دال گلتی نظر نہ آئی۔ پھر بھی سنبھل کر بولا۔ "آپ کا کہنا بجا ہے لیکن میں کیا کروں میں قبیلے کی ہر لڑکی کو اپنی بہن سمجھتا ہوں اور اگر میری بہن کسی مصیبت میں گرفتار ہونے لگے تو میرا دل دکھنے لگتا ہے۔ صائمہ بھی میری بہن ہے۔ عاصم نے اس کے ساتھ جو زیادتی کی ہے وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے اسی لیے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔"

"عاصم! عاصم نے کیا زیادتی کی صائمہ کے ساتھ؟" صائمہ کی ماں نے چونک کر پوچھا۔ "ابھی تو صائمہ کی رخصتی بھی نہیں ہوئی پھر زیادتی کیسی؟" صائمہ کی ماں کو اُس وقت تک عاصم کے دوسرے نکاح کی خبر نہ ہوئی تھی۔

"جی، میں یہی تو کہنے حاضر ہوا ہوں۔" ہیراش دل میں خوش ہوا کہ صائمہ کی ماں کو اب تک کچھ خبر نہیں۔ "عاصم نے رخصتی سے پہلے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ آپ اور صائمہ کے لیے پریشان کن ہے۔ ایک بھائی کے ناتے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ آپ کو عاصم کی حرکتوں سے آگاہ کروں۔" ہیراش نے کھل کر بات نہ کی۔ وہ چاہتا تھا کہ صائمہ کی ماں کو پہلے خوب غصہ دلا دے تاکہ جب وہ انہیں مشورہ پیش کرے تو اس کے قبول کرنے میں پس و پیش نہ ہو۔

"کچھ پتہ بھی تو چلے کیا کیا ہے عاصم نے؟" صائمہ کی ماں نے بے چینی سے پوچھا۔

"عاصم نے دوسری شادی کر لی ہے۔" ہیراش نے بڑے غصے سے کہا۔ "میرا تو جی چاہتا تھا لیکن۔ پھر آپ جیسا حکم دیں مجھے......"

صائمہ کی ماں پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو ہیراش؟" انہوں نے گھبرا کے پوچھا۔

"عاصم تو بڑا شریف لڑکا ہے۔ اُس کی طرف سے مجھے ایسی اُمید نہیں۔"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" ہیراش بولا۔ "تعجب ہے آپ کو اب تک علم نہ ہو سکا۔ یہ بات تو شہر بھر کے ہر شخص کو معلوم ہو چکی ہے۔ میں اپنی بہن پر یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ یقین کیجئے کہ میرا اس میں کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ میں صائمہ کو اپنی حقیقی بہن سمجھتا ہوں۔ محض انسانی ہمدردی کے تحت میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ آگے آپ کی مرضی جیسا چاہیں کریں۔" یہ کہتے ہوئے ہیراش اٹھ کے کھڑا ہو گیا جیسے اُسے اس معاملے سے مزید کوئی دلچسپی نہ ہو۔

"ذرا ٹھہرو ہیراش۔" صائمہ کی ماں نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ عاصم نے ایسا کیوں کیا۔ ابھی تو صائمہ کی رخصتی بھی نہیں ہوئی۔ اُسے کیا شکایت پیدا ہو گئی ہم لوگوں سے۔ میرا دل کسی طرح نہیں مانتا لیکن تم؟ ہاں تمہیں یہ جھوٹی خبر پہنچانے سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

"دیکھیے میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ مجھے اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔" ہیراش سوگوار منہ بناتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ کو اس سلسلے میں جلد کوئی قدم اٹھانا چاہیے ورنہ پھر صائمہ عمر بھر روتی رہ گی۔"

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟" وہ پریشان ہوتے ہوئے بولیں۔ "عاصم نے شادی کر لی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مرد چار شادیاں کر سکتے ہیں۔ ہم اُس کا کیا بگاڑ لیں گے۔"

"ابھی وقت ہے بشرطیکہ آپ کوشش کریں۔" ہیراش نے انہیں سہارا دیا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ انہوں نے فوراً پوچھا۔ "کیا صورت ہو سکتی ہے اس کی، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"میں تو آپ کو صرف مشورہ دے سکتا ہوں۔ عمل کرنا آپ کا کام ہے۔" ہیراش نے اور زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا۔

"ہاں ہاں بتاؤ نا ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" انہوں نے بے صبری سے پوچھا۔

"عاصم نے ابھی نکاح کیا ہے۔" ہیراش نے اپنے منصوبے کا اظہار کیا۔ "عاصم نے ابھی تک جمالی کو رخصت نہیں کرایا ہے اور رخصتی سے پہلے نکاح آسانی سے توڑا جا سکتا ہے۔ آپ عاصم کو بلا کے سمجھائیں جمالی نے بہکا دیا ہے۔ آپ محبت سے سمجھائیں گی تو وہ ضرور مان جائے گا۔"

"یہ جمالی کس کی بیٹی ہے؟" صائمہ کی ماں نے تحقیق کی۔

"وہ بھی صائمہ کی طرح میری بہن ہے مگر ہے بڑی ضدی۔" ہیراش نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔ "جمالی یتیم ہوئی تو ہم نے اُسے اپنے گھر میں رہنے اور اُس کے اخراجات برداشت کرنے کی پیشکش کی لیکن وہ ماں بیٹی کسی طرح رضامند نہ ہوئیں اور جمالی ماموں کے گھر چلی گئی۔ اگر وہ ہمارے گھر ہوتی میں ایسا ہرگز نہ ہونے دیتے۔"

"تو کیا اُس لڑکی کو علم نہیں تھا کہ عاصم کا نکاح ہو چکا ہے؟" صائمہ کی ماں بوکھلا بوکھلا کر سوال کر رہی تھی۔

"پتہ کیوں نہیں تھا جمالی کو سب کچھ معلوم تھا۔" ہیراش کا تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ "مگر پتہ نہیں کہ ان کو عاصم میں کیا خوبی نظر آئی کہ وہ سب کچھ جانتے ہوئے رضامند ہو گئیں۔"

صائمہ کی ماں فکر میں پڑ گئیں۔ ہیراش نے جس وثوق کے ساتھ یہ بات کی تھی اُس سے انہیں یقین کرنا پڑا لیکن اُن کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ عاصم نے ایسا کیوں کیا۔ وہ صائمہ کو رخصت کرانے پر مصر تھا پھر اُس نے یہ دوسرا نکاح کیسے پڑھا لیا۔ "کہیں عاصم اور جمالی میں کوئی؟" ان کا دماغ اُلجھ کر رہ گیا۔

"اب مجھے اجازت دیجئے۔" ہیراش نے اپنا کام پورا کر دیا تھا۔

"اچھا بیٹے۔" صائمہ کی ماں ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ "دو چار دن بعد چکر لگا لینا۔ میں صائمہ سے بات کر رکھوں گی پھر جیسا تم کہو گے قدم اٹھائیں گے۔"

اُسی وقت دوسرے کمرے سے آواز آئی۔ "امی جان اِن سے کہہ دیجئے کہ اب اِدھر کا رُخ نہ کریں۔" اس کے ساتھ ہی صائمہ کمرے میں آ گئی۔ "یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے اسے ہم خود سلجھائیں گے۔ کسی دوسرے کے مشورے کی ضرورت نہیں۔"

صائمہ کے لہجے میں تلخی کے ساتھ ساتھ بڑا استقلال تھا۔ ہیراش اُس کی جرأت پر حیران رہ گیا۔ ایک

تو صائمہ کا یوں بے دھڑک کمرے میں چلے آنا پھر اس حوصلے سے بات کرنا یقیناً بڑا تعجب خیز تھا۔ میراثن نے صائمہ کو پہلی بار دیکھا تھا اُس کے سلجھتے ہوئے قدم رک گئے اور سوچنے لگا کہ اس وحشی ہرنی کو کس طرح ڈھب پہ لگایا جائے۔

"میراثن بھائی آپ جا سکتے ہیں۔" صائمہ نے کرخت لہجے میں کہا۔ "عاصم میرا شوہر ہے۔ وہ مختار ہے جتنی چاہے شادیاں کرے۔ آپ کو میری ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں مجھے کسی مشورے کی بھی ضرورت نہیں۔ شکریہ آپ تشریف لے جائیں اور خیال رہے کہ یہ عاصم کی بیوی صائمہ کا گھر ہے۔ یہاں کوئی نامحرم داخل نہیں ہو سکتا۔"

میراثن کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکا اور ہارے ہوئے جواری کی طرح تھکے تھکے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

"بیٹی۔ ناحق تم نے اُسے ڈانٹ دیا وہ بے چارہ تو ہمدردی کرنے آیا تھا۔" صائمہ کی ماں نے بیٹی کو سمجھایا۔

"امی آپ نہیں جانتیں۔ میراثن پوری آبادی میں بدنام ہے۔" صائمہ ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے "ہمارے قبیلے کی یہاں آبادی ہی کتنی ہے پورے قبیلے کو بدنام کر رکھا ہے اس نے۔"

"تو کیا یہ غلط کہہ رہا تھا کہ عاصم نے دوسری شادی کی ہے؟" ماں نے بیٹی کو تیز نظروں سے گھور پھر خود ہی جواب دیا۔ "اگر عاصم نے یہ کیا ہے تو اچھا نہیں ہوا۔ اُس نے تم میں کیا عیب دیکھا ہے؟ دیہہ بُرا سہی لیکن عاصم نے دوسری شادی کر کے کون سا اچھا کام کیا ہے؟ وہ تو سلاوز ہے کیا اس سے قبیلہ بدنام نہیں ہوگا؟"

"امی!" صائمہ لاجواب سی ہوگئی۔ "میں عاصم کی طرف داری نہیں کرتی۔ یہ بات میں نے بھی اڑتی اڑتی سنی ہے۔ اگر یہ سچ ہوا تو تم عاصم کو بلا کے پوچھ لینا کہ اُس نے یہ حرکت کیوں کی؟ میں نے صرف میراثن کا راستہ بند کیا ہے ورنہ وہ روز ہمارے گھر کے چکر لگانے لگتا۔"

"اچھا چھوڑو اسے۔ لیکن میں عاصم سے پوچھوں گی ضرور۔" صائمہ کی ماں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

صائمہ کی ماں کو معلوم تھا کہ عاصم اپنے گھر پر کم ہی ملتا ہے۔ اُس کا زیادہ وقت مولانا زین الدین کے حجرے میں گزرتا ہے۔ مولانا شہر سبز کی بڑی مسجد کے ایک حجرے میں رہتے تھے۔ وہ پانچوں وقت کی نمازوں کی باقاعدہ امامت کرتے اور فجر اور عشاء کے بعد مسجد کے اندر ہی درس و وعظ کی محفلیں جماتے تھے۔ مولانا کے زہد و تقویٰ اور تاتاریوں پر اُن کے اثر سے سب ہی واقف تھے۔ اس لیے مغل اور اُن کے حواری مولانا پر خاص نظر رکھتے تھے۔ مولانا زین الدین کو بھی اس بات کا علم تھا۔ وہ بڑی احتیاط برتتے اور درس و وعظ کے دوران کوئی ایسی بات نہ کہتے جس سے اُن پر بغاوت کا الزام لگ جاتا۔ عاصم تمام وقت مولانا ہی کے پاس گزارتا اور صائمہ کی ماں کا پیغام بھی اُسے مسجد ہی میں ملا۔ عاصم نے پیام لانے والے سے کہہ دیا کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد صائمہ کے گھر آئے گا۔

نماز کے بعد عاصم، مولانا کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور آہستہ سے بولا۔ "بزرگ محترم مجھے آج ایک نئے امتحان کا سامنا ہے۔ سخت پریشان ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"عاصم حوصلے سے کام لو۔" مولانا نے پہلے اُسے تسلی دی۔ "ہم نے جو راہ اختیار کی ہے اس میں قدم قدم پہ پریشانیوں کا سامنا ہوگا۔ بہرحال بتاؤ، تمہاری نئی پریشانی کیا ہے؟ اس کے حل کی بھی کوئی تدبیر نکالی جائے گی۔"

"اپنے کام کے بارے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں۔" عاصم نے متانت سے کہا۔ "لیکن ذہنی اور خانگی پریشانی ہے۔ میری پہلی بیوی صائمہ کی ماں نے مجھے بلوایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری دوسری شادی کا مسئلہ اُٹھے گا۔"

"اوہ یہ بات ہے۔" مولانا نے اطمینان کا سانس لیا۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ جو کچھ ہوا ہے وہ صاف صاف بتا دینا۔"

"مجھے صائمہ کا سامنا کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے بزرگ محترم۔" عاصم کی اصل پریشانی یہی تھی۔ "بابا اور چچی کو تو میں مطمئن کر لوں گا لیکن صائمہ۔ اُسے میں کیا جواب دوں گا؟"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو عاصم۔" مولانا نے اُسے سمجھایا۔ "جب کوئی قوم آزادی کی جدوجہد شروع کرتی ہے تو اُسے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ تمہاری بیوی کے سینے میں اگر ایک دردمند دل ہے تو وہ تم سے ناراض ہونے کے بجائے تمہارے اس قدم کو سراہے گی۔ ابھی تو پتہ نہیں کہ اس راستے میں کتنے سہاگ اجڑیں

گے اور کتنے نونہال باپ کی شفقت سے محروم رہ جائیں گے۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا، نہ تم گنہگار ہو، تم ملا کے آنکھیں ملا کے بات کر سکتے ہو۔ میرا خیال ہے وہ تمہارے راستے میں نہیں آئے گی۔"

عاصم میں مولانا کی باتوں سے بڑا حوصلہ پیدا ہو گیا اور وہ نئے عزم اور نئے جذبے کے ساتھ صائمہ کے گھر کی طرف چلا۔ اندھیرا پھیل جانے کی وجہ سے راستے اور گلیاں سنسان ہو گئی تھیں۔ مغلوں کے سخت پہرے کی وجہ سے بستی والے رات ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں میں دبک جاتے تھے۔ عاصم اپنے خیالات میں کھویا ہوا ایک میدان سے گزر رہا تھا۔ میدان کے دوسری طرف صائمہ کا محلہ تھا۔ میدان پار کر کے جب عاصم صائمہ کے مکان میں جانے والی گلی میں داخل ہوا تو ایک دم پندرہ بیس سواروں نے اُسے گھیر لیا۔ عاصم گھبرا گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سوار کدھر سے آ گئے۔ اُس پر اس قدر اچانک حملہ ہوا تھا کہ وہ نہ تو اپنی مدافعت کر سکا اور نہ ہی کسی کو پکار کر اپنی مدد کے لیے بلا سکا۔ اس وقت اگر وہ کسی کو آواز بھی دیتا تو اُس کی مدد کو شاید کوئی نہ پہنچتا۔ میدان سائیں سائیں کر رہا تھا اور گلی ویران پڑی تھی۔ دوسری گلی میں کسی دکان پر ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ دکاندار نے شاید سواروں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ جلدی سے چراغ بجھا کر اندر چلا گیا تھا۔ عاصم پر حملہ کرنے والوں کا مقصد شاید اُسے قتل کرنا نہیں تھا۔ اسی لیے انہوں نے سیاہ چادر ڈال کر اُسے بے بس کر دیا اور گٹھڑی بنا کے گھوڑے پر لاد کر دم کے دم میں غائب ہو گئے۔

صائمہ اور اُس کی ماں، عاصم کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور اُسی رفتار سے صائمہ کی ماں کا غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ گلی میں کھلنے والی کھڑکی کو چوپٹ کھولے اُس سے لگی بیٹھی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد عاصم کو ایک نہ ایک جلی کٹی سناتی جاتی تھی۔ صائمہ آنگن میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ جب اس کی ماں عاصم کو بہت ہی سخت بات کہتی تو اُس کے قدم رک جاتے اور وہ ماں کو گھورنے لگتی لیکن منہ سے کچھ نہ بولتی۔ اُسے بھی عاصم پر غصہ تھا کہ اُس نے وعدہ کرنے کے باوجود آنے میں اتنی دیر کی۔

"شکر ہے کہ وہ آ رہا ہے۔" صائمہ کی ماں کھڑکی سے پوری گردن باہر نکالتی ہوئی بولی۔ "گھوڑے پر آ رہا ہے تمہارا دولہا۔"

"گھوڑے پر؟" صائمہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "عجیب آدمی ہے عاصم بھی۔ دن میں کبھی آئیں تو پیدل اور

...سنسان رات میں گھوڑے پر سوار ہو کے آ رہے ہیں۔ محلے والے کیا سوچیں گے۔"

صائمہ کی ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ متجسس نظروں سے گلی میں گھورے جا رہی تھی۔ گلی میں جلنے والی ...لالٹین اپنا منہ آپ دیکھ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد گردن اندر کرتے ہوئے بولی۔ "کوئی بھی نہیں ہے۔ ...مجھے ...وکھ ہوا ہے۔"

صائمہ کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ رات بھیگتی رہی مگر عاصم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صائمہ کی ماں نے بڑبڑاتے ...نے کھڑکی بند کر دی۔ "لو سو جاؤ اب وہ نہیں آئے گا۔ آتی رات تو ہو گئی۔" کھڑکی بند کر کے صائمہ کی ماں بستر ...پر بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ صائمہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ ماں نے وہیں ...سے آواز دی۔ "تو رہنے دے۔ دروازہ میں کھولوں گی۔" اور وہ بستر سے اٹھ کر لپ جھپ کرتی دروازے ...کے پاس پہنچ گئی۔

"کون ہے؟" صائمہ کی ماں نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا۔

"اور کون ہوگا میرے سوا۔" باہر سے ہنسنے کی آواز آئی۔

صائمہ کی ماں نے دروازہ کھول دیا۔ صائمہ کے والد ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ "کیا بات ہے ...صائمہ بیٹی بھی اب تک جاگ رہی ہے؟"

صائمہ کے والد دوسرے محلے میں مطب کرتے تھے۔ وہ صبح کے نکلے رات ہی کو گھر میں گھستے تھے ...بارہ واپس آتے تو صائمہ عام طور پر انہیں سوئی ہوئی ملتی تھی۔

"آج آپ نے بھی اتنی دیر کر دی۔" صائمہ کی ماں نے بُرا سا منہ بنا کے شوہر سے شکوہ کیا۔

"بھئی تم لوگ میرے لیے پریشان نہ ہوا کرو۔" وہ سادگی سے بولے۔ "مہمان اور مریض کا کوئی وقت ...نہیں ہوتا۔ آج زیادہ مریض آ گئے تھے انہیں نمٹاتے نمٹاتے دیر ہو گئی۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں مریض اور مہمان کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔" صائمہ کی ماں کو ہنسی آ گئی۔ "آپ ...مریضوں کو تو نمٹا آئے لیکن مہمان اب تک نہیں آیا۔"

"مہمان۔ کوئی آنے والا تھا کیا؟"

"ہاں عاصم کو بلوایا تھا میں نے۔"

"لیکن، بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اُسے جب اپنے کاموں سے فرصت ملتی ہے تو خود ہی آ جاتا ہے۔"

"آپ کھانا کھا لیجیے پھر بتاؤں گی کیا ضرورت تھی اُسے بلانے کی۔" صائمہ کی ماں کھانا لینے چلیں۔
صائمہ اُن سے پہلے ہی کھانا نکالنے چلی گئی تھی۔ اُس نے ماں کو آتے دیکھا تو بولی۔ "آپ وہیں بیٹھیں
میں کھانا لا رہی ہوں۔"

صائمہ کی ماں شوہر کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ سوچنے لگیں بات کس طرح شروع کریں۔
"کچھ بولو نا۔ عاصم کو کیوں بلایا تھا؟" شوہر نے پریشانی سے پوچھا۔
"آپ کو اپنے مطلب سے فرصت ہی نہیں۔" بیوی جل کے بولی۔ "پتہ ہے عاصم نے کیا گل کھلایا ہے؟
کچھ کہو گی بھی؟"
صائمہ کھانا لے کے آئی اور باپ کے سامنے رکھ کر چپ چاپ اپنے بستر پہ جا کر لیٹ گئی۔
"عاصم نے دوسرا نکاح پڑھا لیا ہے۔" بیوی نے سرگوشی کی۔
شوہر کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ "کسی نے افواہ تو نہیں اُڑائی؟" انہوں نے آہستہ
سے پوچھا۔
"میں نے یہی پوچھنے کو بلایا تھا اُسے۔" وہ پلو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "اُس کے دل میں چور ہے جبھی
تو نہیں آیا بلانے پر۔"
"عاصم ایسا تو نہیں۔" صائمہ کے باپ کو کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا۔ "وہ مولانا زین الدین کے
پاس بیٹھتا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ کل میں مولانا کے پاس جاؤں گا۔"
"آپ کے جانے سے شاید بات زیادہ بگڑ جائے۔" بیوی نے میاں کو سمجھایا۔ "صبح کو میں خود ان
کے پاس جاؤں گی۔ ابھی عاصم نے صرف نکاح کیا ہے۔ رخصتی نہیں کرائی ہے۔ اللہ شاید کوئی بہتر صورت
نکال دے۔"
صائمہ کے باپ بھی اس خبر سے پریشان ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ عاصم تحریک میں نمایاں حصہ لے
رہا ہے۔ وہ خود بھی تحریک کے ہمدرد تھے لیکن عاصم کی اس حرکت سے اُن کے دل کو جیسا دھچکا لگا۔ اُس
سے ٹھیک طرح کھانا بھی نہ کھایا گیا۔
صائمہ کی ماں کے تو دل کو لگی ہوئی تھی صبح نماز کے بعد وہ چادر اوڑھ کر سیدھی بڑی مسجد پہنچ گئیں
اور مولانا کے حجرے کے پاس جا کر دم لیا۔ مولانا درس کی تیاری کر رہے تھے۔ اُن کی نظر حجرے کے باہر کی طرف گئی

...ے وہاں پہنچے۔
صائمہ کی ماں نے ادب سے سلام کیا۔
مولانا دعا دینے کے بعد بولے۔ "خاتون درس کا وقت ہو رہا ہے۔ اجازت دو کہ میں پہلے اس
...ام سے فارغ ہو لوں۔"
"مولانا میں انتظار کر لوں گی۔" صائمہ کی ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے ایک مسئلے پہ آپ
...ے مشورے کی ضرورت ہے۔"
"اچھا تم حجرے میں بیٹھ جاؤ۔ فکر نہ کرو اللہ مشکل آسان کر دے گا۔" مولانا تسلیاں دیتے ہوئے
...لے گئے اور درس میں مصروف ہو گئے۔ ایک گھنٹے کے درس کے بعد وہ واپس آ گئے۔ بولے۔ "ہاں خاتون
اب بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"
"میں صائمہ کی ماں ہوں مولانا صاحب۔" صائمہ کی ماں نے اپنا تعارف کرایا۔
"صائمہ۔" مولانا ذہن پہ زور دیتے ہوئے بولے۔ "یہ نام سنا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن کچھ یاد نہیں آ
...رہا ہے۔"
"عاصم کو تو آپ جانتے ہیں۔" صائمہ کی ماں نے بات سمجھاتے ہوئے کہا۔ "صائمہ سے عاصم نے پہلا
...نکاح کیا تھا۔ اب سنا ہے کہ اُس نے کسی دوسری لڑکی سے نکاح کر لیا ہے۔"
"بس میں سمجھ گیا۔ آپ حکیم صاحب کی بیگم ہیں۔" مولانا معاملے کی تہہ تک فوراً پہنچ گئے۔ "آپ کو
...جواب دینے کے لیے پہلے میں ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کیا آپ جواب دینا پسند کریں گی؟"
"مولانا صاحب۔" وہ فوراً بولیں۔ "آپ ہمارے روحانی پیشوا ہیں۔ اسی لیے تو میں آپ کے
...پاس حاضر ہوئی ہوں۔ اگر آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ میری بیٹی میں وہ کون سا عیب ہے جس کی وجہ سے
...عاصم نے دوسرا نکاح کیا تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ صائمہ میں ظاہری یا باطنی کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کی
...وجہ سے عاصم نے اُسے ناپسند کیا ہو۔ پھر ابھی تو رخصتی بھی نہیں ہوئی۔"
"خاتون۔" مولانا قطع کلام کرتے ہوئے بولے۔ "صائمہ کے بارے میں عاصم اور خود میں پوری طرح مطمئن
...ہیں۔ دوسرے نکاح کی یہ وجہ ہرگز نہیں۔ میں تو صرف آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ مغلوں کی
...حکومت پسند کرتی ہیں؟"

"اللہ کی مار ہو ان مغلوں پر" صائمہ کی ماں نے حقارت کا اظہار کیا۔ "میں تو اُس دن کا انتظار کر رہی ہوں جب ہم آزاد ہوں گے اور ہماری بہو بیٹیاں سر اٹھا کر گلی کوچوں میں بے خوف نکل سکیں گی۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" مولانا بولے۔ "بس تم یہ سمجھو کہ جو کچھ ہوا بالکل حادثاتی طور پر ہوا اس میں نہ تو عاصم کی مرضی کو دخل تھا اور نہ کوئی دباؤ تھا۔" پھر مولانا نے عاصم اور جمالی کے نکاح کی پوری تفصیل اُس کے سامنے بیان کر دی۔ آخر میں کہا۔

"اگر عاصم اُس وقت ہم سے تعاون نہ کرتا تو تحریک آزادی کے تمام مجاہد قتل کر دیے جاتے اور یہ تحریک ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیتی۔ عاصم نے صرف ایک سو تلاندیوں کو موت کے منہ سے نہیں بچایا بلکہ ایثار و قربانی کی ایک نئی مثال قائم کی ہے۔ صائمہ بیٹی کو اپنے شوہر پہ فخر کرنا چاہیئے۔ جس طرح صائمہ کی رخصتی آزادی سے مشروط ہے اسی طرح جمالی کی رخصتی کا معاملہ بھی آزادی کے بعد اٹھے گا۔ تمہیں وقت کا صبر شکر کے ساتھ انتظار کرنا چاہیئے لیکن صائمہ بیٹی کو میری طرف سے یہ اطمینان دلا دینا کہ کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ ہوگا۔ عاصم اُسے دل سے چاہتا ہے اور خدا نے وہ دن دکھایا تو اُسے رخصت کرا کے میں خود اُس کے گھر پہنچاؤں گا۔"

مولانا نے اپنی باتوں سے صائمہ کی ماں کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ عاصم کی طرف سے اُس کے دل میں جو وسوسے پیدا ہوئے تھے وہ ختم ہو گئے۔ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ "عاصم آپ کے پاس آئے تو اُسے میرے پاس ضرور بھیجئے گا۔ میں اُس سے کوئی گلہ نہیں کروں گی۔ اگر وہ کل شام میرے پاس آ کر یہی باتیں مجھے بتا دیتا تو مجھے آپ کے پاس آنے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"کل رات عاصم تمہارے پاس نہیں گیا؟" مولانا چونک پڑے۔ "یہاں سے تو وہ یہی کہہ کر گیا تھا کہ وہ صائمہ کے گھر جا رہا ہے۔"

"جی نہیں مولانا۔" وہ بولیں۔ "میں تو آدھی رات تک اُس کا انتظار کرتی رہی۔"

"میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ تم سے ملا ہے اور شاید تمہیں مطمئن نہیں کر سکا اور تمہیں یہاں آنا پڑا۔"

مگر مولانا کو کچھ بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ "رات تھا تو یہاں نہیں گیا۔ صبح کی نماز میں بھی نہیں آیا۔" مولانا نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ صائمہ کی ماں اس سے پہلے ہی حجرے سے نکل چکی تھی۔

مولانا نے اسی وقت ایک آدمی عاصم کے گھر بھیجا کہ معلوم کرے عاصم کہاں ہے۔ آدمی نے آ کر بتایا

عاصم رات گھر نہیں پہنچا۔ مولانا کی فکر بڑھ گئی۔ عاصم ایسا نہیں تھا کہ بغیر مولانا کو مطلع کیے کسی دوسرے شہر چلا جاتا۔ عاصم کے گھر والے مطمئن تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ عاصم کو مولانا نے کسی کام میں لگا دیا ہوگا۔ وہ اکثر کئی دن گھر سے غائب رہا کرتا تھا لیکن مولانا کے لیے یہ امر باعث تشویش بن گیا۔ دوپہر تک مولانا اِدھر اُدھر بے چینی سے گھومتے رہے۔ ہر جاننے والے سے وہ عاصم کے بارے میں پوچھتے لیکن کسی کو علم نہ تھا کہ عاصم کہاں گیا۔ جمعہ کا دن تھا اور مولانا کو جمعۃ المبارک کی نماز پڑھانا تھی۔ وہ مسجد واپس آ گئے۔ نمازی آنا شروع ہو گئے تھے۔ مولانا اُن سے بھی عاصم کے بارے میں پوچھتے رہے۔ سب ہی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ نماز کے بعد مولانا نے ایلچی بہادر، جاگو برا کس اور چند دوسرے اعتماد کے آدمیوں کو اپنے حجرے میں بلایا اور عاصم کی ایکایک گمشدگی کی انہیں اطلاع دی۔ ایلچی بہادر اور جاگو برا کس کو عاصم کی تلاش پر لگا دیا گیا۔ وہ دونوں اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔

ایلچی بہادر کو بتایا گیا تھا کہ عاصم مغرب کے بعد صائمہ کے گھر جانے کے لیے نکلا تھا۔ ایلچی نے اس بات کو گرہ میں باندھ کر عاصم کی تلاش شروع کی۔ وہ مسجد سے نکل کر اُس راستے پر چلا جو صائمہ کے گھر کو جاتا تھا۔ راستے میں جتنی دکانیں پڑتی تھیں وہاں سے ایلچی نے عاصم کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ عاصم کو سب محلے کے لوگ جانتے تھے۔ رات کو بھی عاصم کی کئی آدمیوں سے سلام دعا ہوئی تھی۔ ایلچی کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ عاصم صائمہ کے گھر ہی کی طرف گیا تھا۔ اسی طور پر وہ اُس میدان میں پہنچ گیا جس کے ایک طرف صائمہ کے گھر جانے والی گلی تھی۔ اُس گلی کے برابر والی گلی کے نکڑ پر ایک دکان تھی۔ اُس سے جب ایلچی بہادر نے دریافت کیا تو اُس نے رات کا واقعہ ڈرتے ڈرتے بتایا۔ اُس نے عاصم کو تو نہ دیکھا تھا لیکن اُس نے چند سواروں کا واضح تذکرہ کیا جو صائمہ کی گلی سے نکلے تھے۔ ایلچی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اپنی رپورٹ لے کر مولانا کے پاس پہنچے۔

جاگو برا کس مولانا کے پاس پہلے ہی پہنچ چکے تھے انہوں نے یہ خبر دی تھی کہ سردار صادق کی حویلی میں کل رات کسی شخص کو گرفتار کر کے لایا گیا ہے جسے گرفتار کیا گیا تھا وہ چادر میں لپٹا ہوا گھوڑے پر پڑا تھا اس لیے اُس کا منہ نہ دیکھا جا سکا۔ یہ خبر جاگو برا کس کو حویلی کے ایک محافظ سوار نے دی جو تحریک آزادی کا ممبر تھا۔ ایلچی بہادر نے جب اپنی روداد بیان کی تو بات کھل کر سامنے آ گئی۔ گرفتار ہونے والا عاصم ہی تھا جسے سردار صادق کے آدمیوں نے صائمہ کی گلی سے پکڑ کر اُس کی حویلی میں پہنچایا تھا۔

مغلوں نے سردار جعفر اور سردار صادق کو گورنر مقرر کیا تھا لیکن وہ مغل سردار بیک جک کے ماتحت تھا۔ مغل حاکم الیاس خواجہ نے جنوب کا تمام علاقہ بیک جک کے سپرد کر دیا تھا اور خود سمرقند میں رہتا تھا۔ جعفر کو اس نے سمرقند کا گورنر مقرر کر کے اپنے ساتھ رکھا تھا۔

عاصم کی گمشدگی کوشش کے باوجود پوشیدہ نہ رہ سکی۔ لوگوں کو تفصیل تو نہ معلوم ہو سکی لیکن عاصم کی گمشدگی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ ہر تاتاری دوسرے سے کہتا "کیا معلوم ہے کہ عاصم کو مغل نے گرفتار کر لیا ہے۔" بعض جگہ تو یہ افواہ پھیل گئی کہ عاصم کو قتل کر کے اس کی لاش بھی غائب کر دی گئی ہے۔ رات ہوتے ہوتے یہ خبر عاصم کی دونوں بیویوں کے گھر بھی پہنچ گئی اور وہاں صفِ ماتم بھی بچھ گئی۔ جمالی اور صائمہ کے گھر محلے کی عورتوں نے جمع ہو کر یوں رونا شروع کر دیا جیسے واقعی عاصم مر گیا ہو۔

عاصم کی گرفتاری کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شہر سبز میں صرف دو ہی ہستیاں تھیں جو اس راز سے کسی حد تک پردہ اٹھا سکتی تھیں اور وہ تھیں عاصم کی دونوں بیویاں جمالی اور صائمہ۔ جس وقت ان کے کانوں میں عاصم کی گرفتاری کی خبر پہنچی تو بیک وقت ان کا خیال ہیراش کی طرف گیا۔ ہیراش کو انہوں نے نا امید بلکہ ذلیل کیا تھا۔ وہ تھا بھی اسی قابل۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا تھا۔

ہیراش کو جمالی اور صائمہ دونوں کے گھر منہ کی کھانا پڑی تو اس کی بدطینتی عود کر آئی۔ اس نے انتقام کا ایک خطرناک منصوبہ تیار کیا۔ اس کے خیال میں اس تمام جھگڑے کی اصل جڑ عاصم تھا۔ اس نے سب سے پہلے عاصم کو راستے سے ہٹانے کا ارادہ کیا۔ ہیراش سیدھا سردار صادق کے پاس گیا اور اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ سردار صادق کو تو ایسے غداروں کی ضرورت ہی تھی۔ تاتاری کب سے بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے وہ تاتاریوں کو اپنا ہم خیال اور دوست بنانے پر ہر وقت تیار رہتا تھا۔ ہیراش تو شہر سبز کا ایک نامی گرامی بدمعاش اور غنڈہ تھا۔ ایسے شخص کا تعاون تو وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہیراش کی خوب پذیرائی کی اور اسے ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہیراش تو گیا ہی تھا اسی لیے اس نے سردار صادق سے تاتاریوں کے بارے میں خوب الٹی سیدھی لگائیں۔ اس نے عاصم کو تحریک کا روحِ رواں ظاہر کیا اور صادق کو مشورہ دیا کہ اگر عاصم کو گرفتار کر لیا جائے تو اس سے تحریک میں حصہ لینے والوں کے نام بھی معلوم ہو جائیں گے اور تحریک اس کے بغیر بے جان ہو جائے گی۔ سردار صادق، تحریکِ آزادی کے ممبران سے بہت خائف تھا اور چاہتا تھا کہ ان پر بغاوت کا الزام ثابت کر کے قتل کرا دے۔ ہیراش کے

کہنے پر عاصم کے پیچھے اپنے آدمی لگا دیے اور اس کی مخبری پر صادق کے سواروں نے عاصم کو گرفتار کر کے حویلی میں پہنچا دیا۔

عاصم کو رات بھر ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند رکھا گیا۔ صبح ہوئی تو اسے سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔ صادق ایک زرنگار مسند پر ٹیک لگائے بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ یہ مسند قصرِ سفید میں تیمور کی بنوائی ہوئی رہائش گاہ سے اٹھوائی گئی تھی۔ تیمور کی حویلی پر مغلوں کے قبضے کے وقت سردار صادق نے اپنی غداری کے عوض تیمور کے تمام سامان پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ یہ مسند تیمور نے خاص اپنے لیے بنوائی تھی۔ مغلوں نے اس مسند میں لگے ہوئے قیمتی جواہرات نوچ لیے تھے مگر اب بھی اس میں موتیوں کی بیش قیمت جھالر لگی ہوئی تھی۔

عاصم کو صادق کے سامنے لایا گیا تو سردار صادق نے ہنس کر کہا "کہو عاصم۔ رات خیریت سے گزری۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں رات اندھیرے میں گزارنا پڑی لیکن ابھی تو یہ آغاز ہے اگر تم نے ہم سے تعاون نہ کیا پھر تمہاری راتیں اس سے بھی زیادہ بری گزریں گی۔"

"میں نے کیا جرم کیا ہے سردار صادق؟" عاصم آہستہ سے بولا۔ "آپ تاتاری ہیں۔ میں آپ کی عزت کرتا رہا ہوں۔ میں نے آپ کی کہیں برائی نہیں کی۔"

"ہم بھی تمہارے ساتھ کوئی برائی کرنا نہیں چاہتے۔" صادق بولا۔ "پھر ہم تو تمہاری شادی کے گواہ بھی ہیں۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرو۔"

"پھر مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟" عاصم نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم اس عذاب سے رہائی حاصل کر سکتے ہو عاصم۔" صادق نے نرم لہجہ اپنایا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ تم تاتاریوں کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ ہم مغل سپہ سالار سے کہہ کر تمہیں ایک اچھا عہدہ دلا دیں گے۔ کیا یہ تمہارے لیے بہتر نہ ہو گا؟"

"سردار صادق!" عاصم کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ باغیوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کوئی تاتاری باغی نہیں ہے۔"

"بکو مت عاصم۔" صادق بھی تیز ہو گیا۔ "مغل ہمارے حاکم اور بادشاہ ہیں۔ ان کے خلاف ایک لفظ کہنا بھی بغاوت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ مغلوں کے خلاف سازش کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری جوانی پر رحم آتا ہے اگر تم اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو تو ہم یقین دلاتے ہیں تمہیں آزاد کر کے انعام و اکرام سے

بھی تو اڑیں گے۔"

"سردار صادق آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں!" عاصم تلخی سے بولا۔ "اپنے ملک اور قوم سے محبت کرنا نہ تو سازش ہے اور نہ بغاوت۔ کیا آپ کو تاتاریوں سے محبت نہیں؟"

"کون کہتا ہے کہ مجھے تاتاریوں سے محبت نہیں۔" صادق زور دے کر بولا۔ "یہ میری تاتاریوں سے محبت کا نتیجہ ہے کہ ملک میں امن وامان ہے۔ اگر میں اور سردار جعفر مغلوں کو نہ روکیں تو وہ ایک دن میں تاتاریوں کو تباہ کر کے رکھ دیں۔ شہر ویران ہو جائیں اور کسی کی عزت و ناموس برقرار نہ رہے۔"

"میں آپ کی طرح تجربہ کار نہیں سردار صادق!" عاصم اکڑ کے بولا۔ "لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ غیر ملکی آقاؤں کے ہاتھ مضبوط کرنا تاتاریوں سے محبت نہیں بلکہ غداری ہے۔ قوم سے غداری ہے۔"

"کمینے!" صادق نے مسند سے اٹھ کر عاصم کے منہ پہ ایک زوردار طمانچہ جما دیا۔ عاصم کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے تھے وہ خون کے آنسو پی کر رہ گیا۔ "اب تو اس کوٹھڑی میں گھٹ گھٹ کے مر جائے گا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کہ تو کہاں گیا؟"

"جسے خبر ہونا تھی اُسے خبر ہو چکی ہے سردار صادق!" عاصم نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ "عاصم مر جائے گا لیکن تاتاری قوم تو نہیں مرے گی۔ تم کس کس کو پکڑو گے کہاں تک لوگوں کو قتل کرو گے یاد رکھو سردار۔ مغل تمہارا زیادہ دن تک ساتھ نہ دیں گے۔ ہوا کا رخ کسی وقت پلٹ سکتا ہے۔ اس وقت سے ڈرو جب ملک تاتار کی زمین تم پر تنگ ہو جائے اور تاتاری تم پر تھوکنا بھی پسند نہ کریں۔"

"لے جاؤ اس کتے کو۔" صادق دھاڑا۔ "باغیوں کا ٹھکانہ قید خانہ ہے اور انجام موت۔" چنانچہ عاصم کو پھر اسی تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔

○

مولانا زین الدین حسب معمول درس سے فارغ ہو کر اپنے حجرے میں بیٹھے ایلچی بہادر اور جاگو سے گفتگو کر رہے تھے۔ عاصم کی گرفتاری کی وجہ سے تحریک کا کام التواء میں پڑ گیا تھا اور ان کے پیش نظر سب سے اہم مسئلہ عاصم کی رہائی کا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ عاصم کی گرفتاری میں مغلوں کا کوئی ہاتھ نہیں اور یہ

ردار صادق نے اپنے طور پر اٹھایا ہے کیونکہ مغل حاکم الیاس خواجہ نے صاف طور پر اعلان کر دیا تھا کہ کسی اری کو اس وقت تک گرفتار نہ کیا جائے جب تک اس کے خلاف بغاوت کا کوئی ثبوت نہ مل جائے۔

صورت میں اگر الیاس خواجہ کو اس گرفتاری کی اطلاع پہنچائی جائے تو ہو سکتا ہے کہ عاصم کو رہا کر دیا ے لیکن سوال یہ ہے کہ مغل حاکم کے پاس سمرقند کون جائے۔ تحریک کے کسی کارکن کا الیاس خواجہ کے جانا مناسب نہ تھا اس کا الٹا اثر بھی ہو سکتا تھا۔

یہ لوگ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ مولانا کو اطلاع دی گئی کہ کوئی عورت ان سے ملنا چاہتی مولانا نے ایلچی اور جاگو کو رخصت کر دیا اور آنے والی کو اندر بلا لیا۔ عورت نے اندر آ کر چہرے سے ہٹائی اور غمناک لہجے میں بولی۔ "بزرگ پیشوا۔ میں عاصم کی بیوی جمالی ہوں۔"

مولانا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جمالی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کئی راتوں ئی نہیں ہے اور شاید مسلسل روتی رہی ہے۔ مولانا بڑے غم زدہ لہجے میں بولے۔ "بیٹی ہم عاصم ہی بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ عاصم کو سردار صادق نے گرفتار کر کے کسی جگہ رکھا ہے۔ عاصم کے صادق کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اس لیے اس کی گرفتاری کا کوئی جواز نہیں۔ ہم یہ سوچ رہے ر کسی کو سمرقند بھیج کر مغل حاکم کو اطلاع دی جائے ممکن ہے کہ اس صورت میں عاصم کی رہائی کا حکم جاری ئے۔"

جمالی نے مولانا کی باتیں بڑے تحمل سے سنیں۔ اس کی آنکھیں اس وقت آنسو بہا رہی تھیں۔ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بزرگ پیشوا میں جانتی ہوں کہ آپ لوگ بھی عاصم کی گرفتاری سے فکر مند ہوں گے۔ مجھے بھی یقین ہے کہ عاصم، سردار صادق کی قید میں ہے، لیکن اس کی گرفتاری میں چچازاد بھائی ہیراشش کا بھی ہاتھ ہے۔ گرفتاری سے ایک دن پہلے وہ میرے پاس آیا تھا اور م کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ میں نے اسے سخت سست کہہ کے بھگا دیا تھا۔ اس نے مجھ سے لینے کے لیے عاصم کو گرفتار کرا دیا ہوگا۔"

"میں تمہارے خیال سے اتفاق کرتا ہوں بیٹی۔" مولانا سوچتے ہوئے بولے۔ "ہیراشش کی شکایتیں میرے پاس آئی تھیں۔ ضرور اسی نے یہ حرکت کی ہوگی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ہیراشش لوں کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں اس سے بھی محتاط رہنا پڑے گا۔"

جمالی ابھی کچھ کہنے والی تھی کہ جاکو نے حجرے کے دروازے سے پکار کر کہا "مولانا! محترم! ایک اور خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

مولانا اس اطلاع سے کچھ اور پریشان ہوئے۔ وہ جمالی کو پوری طرح مطمئن کر کے واپس کرنا چاہتے تھے تاکہ اس کے غم کا کچھ مداوا ہو جائے۔ مولانا نے جاکو سے پوچھا "تمہیں معلوم ہے کہ میں ایک خاتون سے گفتگو کر رہا ہوں تم ان سے کسی اور وقت آنے کو کہہ دیتے۔"

"میں نے ان سے یہی کہا تھا" جاکو نے جواب دیا "لیکن وہ اسی وقت ملنا چاہتی ہیں، کہتی ہیں وہ کسی اور وقت نہ آسکیں گی۔ انہیں عاصم کے بارے میں کوئی بات کرنا ہے۔"

عاصم کے نام پر مولانا اور جمالی دونوں چونک پڑے۔ مولانا کی سمجھ میں نہ آیا کہ دوسری عورت کون ہو سکتی ہے۔ انہوں نے جمالی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جمالی نے فوراً کہا "بزرگ پیشوا! آپ انہیں بلوا لیں ممکن ہے کہ وہ عاصم کے بارے میں کوئی خاص خبر لائی ہوں۔"

"اچھا جمالی بیٹی تم پیچھے گھوم کے بیٹھ جاؤ۔" مولانا بولے "میرا خیال ہے کہ یہ خاتون صائمہ کی ماں ہوں گی۔ عاصم کی خوش دامن۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کوئی ناخوشگوار صورت پیدا ہو۔ میں تمہارا ان سے تعارف نہیں کراؤں گا۔ تم ہماری باتوں میں ہرگز دخل نہ دینا خواہ وہ تمہارے خلاف ہی کیوں نہ گفتگو کریں۔"

"آپ اطمینان رکھیئے۔" جمالی نے سعادت مندی سے کہا "عاصم پر صائمہ کا حق مجھ سے زیادہ ہے صائمہ کی ماں یا خود صائمہ بھی اگر مجھے برا بھلا کہیں تو مجھے ناگوار نہ ہو گا۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے جمالی۔" مولانا نے اُسے دعا دی جمالی مولانا کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئی۔ مولانا نے عورت کو اندر بلایا۔ وہ اندر آئی، ادب سے سلام کیا۔ پھر چادر ہٹا کے بولی "مولانا! میں عاصم کی بیوی صائمہ ہوں۔"

مولانا نے حیرت سے صائمہ کو دیکھا۔ جمالی کا دل چاہا کہ وہ پلٹ کر صائمہ کو دیکھے۔ اس صائمہ کو جو اس کی سوکن تھی لیکن اس وقت وہ بھی اسی کی طرح پریشان تھی۔

"بیٹھو بیٹی صائمہ۔" مولانا نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ان کے حجرے میں اس وقت دونوں موجود تھیں اور ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کہیں اور کیا کریں۔

"مولانا صاحب" صائمہ نے روتے ہوئے کہا "میرے شوہر کو ہیراشش نے پکڑوا دیا ہے۔ ان

...یا تھا اور عاصم کی برائیاں کر رہا تھا۔ میں نے اُسے ڈانٹ دیا تو وہ بگڑ کے گیا تھا۔ اسی نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ آپ ہیراشش کا کوئی بندوبست کریں ورنہ میں اس کا خون پی لوں گی۔"

مولانا کو اب قطعی یقین ہو گیا کہ یہ سب کیا دھرا ہیراشش ہی کا ہے۔ اس نے جمالی اور صائمہ دونوں کو الگ الگ ورغلانے کی کوشش کی اور جب ناکام رہا تو اس نے یہ قدم اٹھایا لیکن اس وقت جمالی اور صائمہ کی موجودگی سے انہیں ایک اور ہی خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے صائمہ سے پوچھا "بیٹی تمہیں معلوم ہے کہ عاصم نے جمالی نام کی ایک لڑکی سے نکاح کر لیا ہے۔"

"مجھے سب کچھ معلوم ہے مولانا صاحب۔" صائمہ سسکیوں میں بولی۔ "میں عاصم کو بچپن سے جانتی ہوں وہ میرے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا۔ میں تو اس کی دوسری بیوی کے ساتھ بھی رہنے کے لیے تیار ہوں۔"

صائمہ نے آخری جملہ کچھ ایسی فراخدلی اور خلوص سے کہا کہ جمالی کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کر صائمہ کے گلے لگ جائے لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور اسی طرح منہ پھیرے ہوئے مولانا سے کہا "بزرگ پیشوا۔ اگر ان کو اعتراض نہ ہو تو مجھے ان سے مل کے بہت خوشی ہو گی۔"

صائمہ کی نظر اب تک جمالی پر نہ پڑی تھی۔ وہ حجرے کے ایک کونے میں گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ اس نے مولانا سے کہا "مولانا صاحب یہ کون خاتون ہیں؟ مجھے بھی ان سے مل کر خوشی ہو گی۔"

"اور تم دونوں کی ملاقات سے مجھے سب سے زیادہ خوشی ہو گی۔" مولانا مسرت سے بولے "صائمہ بیٹی یہ تم سے ملنا چاہتی ہیں وہ بھی اسی درد میں مبتلا ہیں جو درد تمہیں یہاں لے آیا ہے۔"

"تو کیا یہ بہن جمالی ہیں مولانا صاحب؟" صائمہ نے حیرانگی سے مولانا کو دیکھا اور اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔

جمالی کو صائمہ کی آواز میں اپنائیت اور محبت محسوس ہوئی۔ اس نے بھی منہ گھما کر صائمہ کو دیکھا اور آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ مولانا اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ صائمہ اور جمالی ایک دوسرے کو تکتے ہوئے آگے بڑھیں اور پھر دوڑ کر آپس میں لپٹ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ مولانا چپ چاپ کھڑے رہے جب ان کے دل پر چھائے ہوئے غم کے بادل چھٹ گئے تو پھر وہ سگی بہنوں کی طرح سر جوڑ کر بیٹھ گئیں اور بڑی محبت سے ایک دوسرے کا حال پوچھنے لگیں۔ مولانا انہیں وہیں چھوڑ کر باہر نکل آئے

اسی شام سردار صادق کی حویلی کے سامنے بڑا زبردست ہنگامہ ہوا۔ شہر سبز کی پچاس ساٹھ عورتیں چیختی چلاتی اور نعرے لگاتی صادق کی حویلی پر پہنچ گئیں اور انہوں نے عاصم کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ عورتوں کے اس جلوس کی قیادت صائمہ اور جمالی کر رہی تھیں۔ سردار صادق کی حویلی پر مسلح سواروں کا زبردست پہرہ لگا رہتا تھا۔ انہوں نے عورتوں کو روکا مگر عورتیں بپھری ہوئی شیرنیوں کی طرح اُن پر جھپٹ پڑیں اور جس کے ہاتھ میں جو آیا وہ سواروں پر کھینچ مارا۔ اس کشمکش میں کچھ عورتیں زخمی ہو گئیں۔ اس ہنگامے کو دیکھنے کے لیے بہت سے تاتاری بھی وہاں جمع ہو گئے۔ انہیں بھی غصہ آ گیا اور وہ تلواریں کھینچ کر مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ سردار صادق حویلی کے اندر کھڑا یہ ہنگامہ دیکھ رہا تھا مگر عورتوں اور تاتاریوں کو دیکھ کر اس کی ہمت نہ پڑی کہ باہر نکلے۔ تاتاری اب تک عورتوں کی مدافعت کر رہے تھے مگر کسی لمحے بھی وہ سردار صادق کے سواروں پر حملہ کر سکتے تھے۔

قبل اس کے کہ حالات بے قابو ہو جائیں کسی نے مغل سپہ سالار بیک جک کو اطلاع کر دی۔ وہ فوراً پانچ ہزار سواروں کو لے کر سردار صادق کی حویلی پہنچ گیا۔ اُس کو بتایا گیا تھا کہ شہر سبز کے تاتاریوں نے مغلوں کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور انہوں نے سردار صادق کو گھیر لیا ہے لیکن جب انہوں نے یہاں آ کر دیکھا تو اُسے آگے آگے عورتیں نظر آئیں جنہیں سردار صادق کے سوار پیٹ رہے تھے۔ بیک جک بڑا بد دماغ اور ظالم مغل تھا لیکن جب اس نے کئی ہزار تاتاریوں کا مجمع دیکھا تو اس نے سردار صادق کے سواروں کو ڈانٹ کر الگ کر دیا۔ پھر خود گھوڑا بڑھا کر مجمع کے پاس پہنچا۔ تاتاریوں نے مغلوں کو آتے دیکھ کر اپنی تلواریں نیام میں کر لی تھیں اور بالکل پُرامن ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"تم لوگ کیوں اکٹھے ہوئے ہو۔ کیا چاہتے ہو؟" بیک جک نے بھاری آواز میں مجمع کو مخاطب کیا۔

جمالی اور صائمہ آگے بڑھیں۔ ان کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ جمالی نے بڑی جرأت سے کہا۔ "ہم باغی نہیں ہیں مغل سردار۔ عاصم کو چھوڑ دو ہم اور کچھ نہیں چاہتے"

"عاصم ہمارا شوہر ہے۔" صائمہ نے وضاحت کی۔ "ہم تمہارے وفادار ہیں۔ ہمارا عاصم ہمیں واپس کر دو۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ ہم امن چاہتے ہیں۔ انصاف چاہتے ہیں۔"

"عاصم کہاں ہے۔ کس نے پکڑا ہے اسے؟" بیک جک کے موٹے دماغ میں یہ بات نہ آ سکی کہ یہ سب جھگڑا کسی عاصم کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

"عاصم کو سردار صادق نے اغوا کرایا ہے۔" جمالی نے بڑے جوش سے کہا۔

"عاصم اسی حویلی میں قید ہے۔" صائمہ بھی چیخ کے بولی۔

"کہاں ہے نمک حرام صادق؟" بیک جک نے پلٹ کر اپنے ایک سردار سے کہا۔

مغل سردار نے حویلی کے گیٹ کی طرف گھوڑا بڑھایا۔ اُس وقت اُسے سردار صادق گیٹ سے ادھر آتا دکھائی دیا۔

"بھاگ کے جا نمک حرام سپہ سالار بلا رہے ہیں۔" مغل سردار نے بیک جک کے الفاظ دہرائے۔

صادق دوڑ کے بیک جک کے گھوڑے کے پاس پہنچ گیا۔

"عاصم کون ہے۔ تو نے کیوں پکڑا ہے اسے؟" بیک جک زور سے گرجا۔

"وہ باغی ہے سپہ سالار۔" سردار صادق ڈرتے ڈرتے بولا۔

"کیا یہ سب باغی ہیں۔ یہ تو کہہ رہے ہیں کہ مغلوں کے وفادار ہیں۔" بیک جک کو اور غصہ آ گیا۔

"سب تو باغی نہیں ہیں سپہ سالار لیکن۔"

"چپ رہ گدھے۔" بیک جک نے اُسے ڈانٹ کے خاموش کر دیا۔ "ہم نے تجھے شہر سبز کا ناظم اس بنایا تھا کہ تو یہاں امن و امان رکھ۔ تو ایک آدمی کی وجہ سے سب سے جھگڑا کر رہا ہے۔ ہمیں جھگڑا چاہیے۔ بلا عاصم کو۔ ان کے حوالے کر۔"

"مغل سپہ سالار آپ کا بہت بہت شکریہ۔" جمالی اور صائمہ نے ایک آواز ہو کر کہا۔

عاصم کو اندھیری کوٹھڑی سے نکالا گیا۔ اُس کے ہاتھ پیر کھول دیے گئے۔ اُسے بیک جک کے سامنے لایا گیا۔ بیک جک نے عاصم کو دیکھتے ہی ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ "یہ باغی ہے۔ اس نے بغاوت کی ہے؟"

سردار صادق کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ بیک جک کے قہقہوں کا جیسے پھوٹ پڑا۔ ایک، دو، چار، پھر وہ قہقہے پر قہقہہ لگاتا رہا جیسے دل کا غبار نکال رہا ہو۔ پھر رک کے "جا، جا۔ بھاگ جا۔ اپنے گھر۔" اور پھر قہقہہ۔

صائمہ اور جمالی نے بڑھ کر عاصم کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ ایک نے دایاں اور دوسری نے بایاں پکڑا اور عاصم کو لیے ہوئے مجمع کی طرف واپس ہو گئیں۔ تاتاری عاصم کو زندہ سلامت واپس آتے دیکھ

کر بہت خوش ہوئے انہوں نے اس خوشی میں نعرے بلند کیے اور ربیک جک نے ان نعروں کے جواب
میں قہقہوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ادھر سے ایک نعرہ لگتا اور اُدھر سے دو قہقہے بلند ہوتے ۔ اس
طرح تھوڑی دیر پہلے بپھرے ہوئے تاتاری ہنسی خوشی اپنے گھر واپس چلے گئے۔ صائمہ اور جمالی نے اپنے ساتھ
آنے والی سہیلیوں اور دوسری عورتوں کو بہت بہت شکریہ ادا کر کے انہیں رخصت کر دیا۔

جب صائمہ، جمالی اور عاصم رہ گئے تو عاصم نے جمالی کی طرف دیکھتے ہوئے صائمہ سے کہا۔ "تمہیں اب
تمہاری سہیلی کے سر میں چوٹ آئی ہے۔ تمہیں فوراً گھر واپس جانا چاہیئے۔"

"آپ نے میری سہیلی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا؟" وہ بولی۔

"شاید کبھی نہیں۔" عاصم نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"صائمہ بہن۔ میں نے بھی عاصم کو آج پہلی بار دیکھا ہے۔" جمالی چور نظروں سے عاصم کو دیکھتے
ہوئے بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم عاصم کو بالکل نہیں جانتیں؟" صائمہ نے جمالی کو چھیڑا۔

"نہیں صائمہ بہن۔ یہ بات نہیں۔" جمالی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تو اب عاصم صاحب سے
واقف ہو گئی ہوں لیکن یہ عاصم اب تک مجھے نہیں پہچانتے۔"

"اچھا۔ تو میں تم دونوں کا تعارف کراتی ہوں۔" صائمہ کے چہرے پر نفرت یا جلن کے قطعی تاثرات
نہیں تھے۔ "پہلے تم بڑھاؤ اپنا ہاتھ۔" صائمہ نے جمالی سے کہا۔

جمالی نے نظریں جھکا کر آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا

"عاصم صاحب۔" صائمہ شوخ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ بھی اپنا ہاتھ اُدھر بڑھائیے
تاکہ میں تعارف کرا سکوں۔"

"ہاں عاصم صاحب۔ یہ میری سہیلی ہیں۔" صائمہ نے عاصم کا ہاتھ پکڑ کر جمالی کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ
میری ایسی سہیلی ہیں جن کا ہاتھ آپ کو پکڑنا ہوگا بالکل اسی طرح جس طرح میں نے آپ کا ہاتھ پکڑا ہے
بس اب تکلف نہ کیجئے اور ان کا ہاتھ پکڑ لیجئے۔"

"صائمہ تم پاگل ہو گئی ہو۔" عاصم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "میں اب ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔"

"ان کا ہاتھ پکڑنے میں کوئی حرج نہیں۔" صائمہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میری سہیلی کوئی غیر نہیں۔ تمہاری

بیوی جمالی ہے۔ تم نے بھری محفل میں اسے قبول کیا تھا۔"

عاصم نے گھبرا کر جمالی کی طرف دیکھا۔ جمالی سر جھکائے شرمائی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ دیر تک جمالی کو
چپ سے دیکھتا رہا۔

"عاصم۔" صائمہ نے کہنا شروع کیا۔ "تمہاری رہائی کا منصوبہ جمالی نے بنایا تھا۔ ہم نے اپنے گھر والوں
کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ ہماری سہیلیوں اور شہر سبز کی عورتوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ اللہ نے ہمیں کامیابی
عطا کی ورنہ یہ غدار صادق معلوم نہیں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتا۔"

"مجھے تم دونوں پر فخر ہے۔" عاصم پُرمسرت لہجے میں بولا۔ "جس قوم کی عورتیں اتنی بیدار ہو جائیں وہ
قوم زیادہ دیر تک غلام نہیں رہ سکتی۔"

یہ تینوں باتیں کرتے ہوئے مولانا زین الدین کی مسجد میں پہنچے۔ وہاں جمالی اور صائمہ کے تمام عزیز و
اقارب اکٹھے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ جمالی اور صائمہ نے سردار صادق کی حویلی کو گھیر لیا ہے۔ مولانا
زین الدین بھی اس خبر سے پریشان تھے انہیں دیکھ کر ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ صائمہ اور جمالی نے
رو رو کے کر اس واقعے کی تفصیل بیان کی۔ مولانا نے دونوں لڑکیوں کی بہت تعریف کی اور انہیں
دعا دی۔

مغل سپہ سالار بیک جک نے عاصم کو رہائی دلا کر وقتی طور پر شہر سبز کے تاتاریوں کی ہمدردیاں
حاصل کر لیں لیکن اس کی وجہ تاتاریوں سے محبت نہ تھی بلکہ اس نے اس سلسلے میں جو قدم اٹھایا اس کا حکم
مغل حاکم نے اُسے دیا تھا۔ الیاس خواجہ خان کو جاسوسوں کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ تیمور اپنے ملک
میں خفیہ طور پر داخل ہو گیا ہے اور اب شہر سبز کی طرف آ رہا ہے۔ اس نے بیک جک کو ایک خفیہ پیغام
کے ذریعے حکم دیا تھا کہ شہر سبز کے لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو اور ان کی ہمدردیاں حاصل کر کے
کسی طرح تیمور کو گرفتار کر لو۔ الیاس خواجہ نے شہر سبز کی حفاظت کے لیے سمرقند سے پانچ ہزار سواروں کا
ایک مضبوط دستہ کمک کے طور پر شہر سبز بھیج دیا تھا۔

الیاس خواجہ خان کی یہ احتیاطی تدابیر بروقت تھیں.... تیمور کی واپسی کی اطلاع بھی درست تھی
اور واقعی اپنے ملک وطن واپس آ گیا تھا پہلے اس کا ارادہ بھی شہر سبز ہی جانے کا تھا لیکن دوران سفر اس
نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور بجائے شہر سبز جانے کے وہ مغلوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوا سمرقند

پہنچ گیا۔ سمرقند میں بھی حفاظتی انتظامات سخت کر دیے گئے تھے لیکن ان تمام انتظامات کے باوجود تیمور، سمرقند کی گلیوں میں آزادانہ گھوم رہا تھا۔ وہ کسی مسجد میں جا بیٹھتا اور جتہ سردار الیاس خواجہ خان کو مغل سواروں کے ساتھ مسجد کی گلی سے گزرتا دیکھتا رہتا۔

خطرناک دوست

امیر حسین کی دائیں جانب اس کی خوش جمال بیوی دلشاد آغا گھوڑے سے گھوڑا ملائے کھڑی تھی نیچے (میدان میں) مغلوں کے خیمے دور دور تک پھیلے نظر آرہے تھے۔

"خدا کی قسم! میں ان مغلوں کا پہلے ہی حملہ میں صفایا کر دوں گا۔" امیر حسین نے بغیر کسی کو مخاطب کیے آپ ہی آپ کہا۔

"خدا کی قسم! ہم کامیاب ہوں گے۔" بائیں طرف سے اس کے قابل اعتماد سردار امیر موسیٰ نے اس کی تائید کی۔

"بغیر سوچے سمجھے دشمن پر حملہ کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔"

دلشاد آغا نے بگڑ کر کہا۔

"پہاڑی کے دونوں طرف راستے ہیں۔ ہمیں نہیں پتہ کہ پہاڑی کی پشت پر کیا ہے۔"

"دلشاد۔ تم ان باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔"

امیر حسین نے برا سا منہ بنایا:

"دشمن غفلت میں مارا جاتا ہے۔ اسے مہلت دینا سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔"

"لیکن امیر۔ . . . ہمارے لشکری تھکے ہوئے ہیں۔" دلشاد اپنے شوہر کی ضدی طبیعت سے ٹکرانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بات گھما کر اسے حملے سے روکنے کی کوشش کی۔

"تمہارا کیا خیال ہے موسلی؟" امیر حسین نے بیوی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنے معتمد سے پوچھا۔

امیر موسلی کی نظریں مغل خیموں کے سامنے رکھے ہوئے چرمی تھیلوں پر لگی ہوئی تھیں۔ مغل ان میں شراب بھرا کرتے تھے۔ امیر موسلی شراب کا بڑا رسیا تھا۔ تھیلوں کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا اور دل میں شراب کے تھیلوں کے حصول کی خواہش انگڑائی لینے لگی تھی۔

"میرا خیال ہے......"

موسلی اپنے خیال میں کھویا ہوا بولا:

"ان تھیلوں میں ضرور شراب بھری ہوئی ہے۔"

"موسلی!.....؟"

امیر حسین زور سے چیخا:

"شراب۔ شراب۔ یہ شراب تمہیں پاگل کر کے رہے گی۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں اور تمہاری نظروں میں شراب گھوم رہی ہے۔"

موسلی کھسیانا ہو گیا۔ اس نے امیر حسین کے سوال کو صحیح طرح نہیں سنا تھا:

"سردار۔ آپ کس کے بارے میں حکم دے رہے تھے؟"

امیر حسین کو معلوم تھا کہ موسلی کا دماغ ہر وقت شراب اور عورت کے گرد گھومتا رہتا ہے لیکن اسے ہمیشہ موسلی کی اس کمزوری سے چشم پوشی کرنا پڑتی تھی کیونکہ امیر موسلی بڑا بہادر اور نڈر سردار تھا۔ وہ کئی اہم موقعوں پر اپنی بہادری کی داد وصول کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ امیر موسلی، امیر حسین کا سب سے زیادہ وفادار ساتھی تھا۔

امیر حسین نے نرمی سے کہا:

"موسلی! ہم ان مغلوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کیا ہم انہیں زیر نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں سردار۔"

موسلی تلوار پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"اگر حکم ہو تو یہ مغل کیا، میں سامنے کے پہاڑ کو بھی ریزہ ریزہ کر سکتا ہوں۔"

"شاباش موسلی۔" امیر حسین خوش ہو کر بولا:

"تمہاری بہادری اور وفاداری پہ مجھے ہمیشہ ناز رہا ہے۔"

پھر دلشاد کی طرف دیکھ کے بولا:

"خانم کا خیال ہے کہ ہم تھکے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد حملہ کرنا چاہیے۔ خانم کا یہ بھی خیال پہاڑی کی پشت پر کیا ہے، اس کا بھی ہمیں علم نہیں۔"

"تھکن کی ہمیں کوئی فکر نہیں۔"

موسلی بڑی شان سے بولا:

"ہاں اگر یہ اطمینان کر لیا جائے کہ ان کی پشت پر کوئی کمک تو نہیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"اس طرح مغلوں کے ہوشیار ہو جانے کا بھی تو امکان ہے موسلی!" امیر حسین اپنی ضد سے ہٹنے پر نہ تھا۔

"مغل ابھی غافل ہیں۔ اگر اس وقت ہلہ بولا جائے تو دم کے دم میں ان کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔"

"یہ خیال اور زیادہ بہتر ہے سردار۔"

امیر موسلی کا وتیرہ تھا کہ وہ امیر حسین کی کسی بات کی مخالفت نہ کرتا۔ اسی وجہ سے امیر حسین کی نظروں میں اس کی بڑی عزت اور قدر تھی۔

"دیکھا تم نے دلشاد۔"

امیر حسین نے دلشاد کا مضحکہ اڑایا:

"ہم نہ کہتے تھے کہ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ امیر موسلی نے بھی ہماری بات کی تائید کر دی۔ اب تو اطمینان ہوا۔"

دلشاد خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ جانتی تھی کہ امیر حسین کو اس کے ارادے سے باز رکھنا ناممکن ہے۔

امیر حسین نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ دایاں بازو امیر موسلی کے حوالے کیا اور بائیں طرف سے خود لشکر لے کر بڑھا۔

مغلوں کی پوزیشن بڑی کمزور تھی۔ ان کی پشت پہ اور سامنے پہاڑیاں تھیں۔ یہ وادی دراصل ایک چوڑا درہ تھا۔ جب دائیں بائیں سے امیر حسین کا لشکر نمودار ہوا تو وہ گھیرے میں آ گئے...... وہ بے خبری کے عالم میں تھے۔ اس عرصے میں انہیں اتنا موقع بھی نہ ملا کہ اچھی طرح ہتھیار سنبھال سکیں۔ انہیں گھوڑوں پر بیٹھنا بھی نصیب

نہ ہوا تھا کہ امیر حسین اور امیر موسیٰ نے پوری قوت سے ان پر یلغار کردی۔

مغل اچھے شہسوار ہوتے ہیں۔ بغیر گھوڑے کے ان کی طاقت نصف رہ جاتی ہے۔ امیر حسین نے پیس کر رکھ دیا۔ مغل جان بچانے کے لیے دائیں بائیں بھاگتے اور اس کوشش میں قتل ہوتے رہے، بہت مغل اس درہ سے صحیح سلامت بچ کر نکل سکے۔

مغلوں کے خیمے لوٹ لیے گئے۔ بہت سا سامان ہاتھ آیا۔ امیر موسیٰ نے سامان کے بجائے شراب کے ... پر قبضہ کیا اور جلے ہوئے خیموں میں بیٹھ کر شراب پینا شروع کردی۔ امیر حسین کے غور، ترکی اور سیستانی ... بھی مسلمان ہونے کے باوجود شراب پیتے تھے۔ انہوں نے بھی شراب کی محفل جمالی۔ جانور ذبح کرکے گوشت ... گیا اور ایک عام ضیافت کا سماں پیدا ہوگیا۔

امیر حسین کو مغلوں پر یہ پہلی فتح حاصل ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے ساتھ لشکر بھی کافی اکھڑا ... تھا۔ مغل درے میں پھنس کے بری طرح شکست کھا چکے تھے۔ اس کی کامیابی پر کون شبہ کرسکتا تھا۔ وہ ٹہلتا ہو... کے پاس آیا۔

دلشاد اگرچہ اس فتح پر مسرور تھی لیکن اس کا دل ایک نامعلوم خوف سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں... آ رہا تھا کہ مغلوں نے اس درے میں پڑاؤ کیوں ڈالا۔ مغل بہت چالاک تھے۔ ان سے ایسی غلطی کی امید نہ تھ...

"کیوں دلشاد۔ مانتی ہو ہماری حکمتِ عملی کو۔"

امیر حسین ہنستے ہوئے بولا:

"اگر مغلوں کو مہلت دی جاتی تو ہم اتنی کامیابی سے فتح حاصل نہیں کرسکتے تھے۔"

"چلو۔ جو ہوا اچھا ہوا۔"

دلشاد نے اپنی شرمندگی چھپائی۔

"لیکن مغلوں کی حماقت سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیسی حماقت؟" امیر حسین نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ چالاک مغلوں نے اس درے میں خود کو محصور کیوں کرلیا؟"

دلشاد گہری سنجیدگی سے بولی:

"آج تک کسی لشکر نے درے کے درمیان پڑاؤ ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔"

دلشاد کی بات بہت اہم تھی۔ امیر حسین اس کا مذاق اڑانے آیا تھا لیکن یہ بات سن کر وہ بھی سوچ میں پڑ گیا

"یہ بات ہے تو تعجب خیز!"

امیر حسین سوچتے ہوئے بولا:

"ممکن ہے انہیں یہ امید ہی نہ ہو کہ ہم اتنی جلدی یہاں تک پہنچ سکتے ہیں"۔

"کچھ بھی سہی..... لیکن مغلوں نے یہ شکست اپنی غلطی کی وجہ سے اٹھائی ہے"۔ دلشاد جواب دینے کے بعد مغلوں کے اجڑے اور جلے ہوئے خیموں کی طرف دیکھنے لگی۔

امیر حسین کے نصف سے زیادہ لشکری شراب پینے میں مصروف تھے۔ مغلوں کے لائے ہوئے شراب کے تھیلے انہوں نے تقریباً خالی کردیے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے اور خوشی سے ناچ رہے تھے۔ مغلوں کا تعاقب کرنے والے تھوڑی دور پیچھا کرنے کے بعد جلد ہی واپس آ گئے تھے تاکہ مالِ غنیمت میں اپنا حصہ وصول کرسکیں اور مغلوں کی شراب کے مزے بھی اڑائیں۔

مغل بہت تیز شراب بناتے اور پیتے تھے۔ گھوڑی کے دودھ کا بھی ان کے ہاں رواج تھا۔ امیر حسین کے لشکریوں نے دودھ کے تھیلوں میں شراب ملا کر ایک محلول تیار کرلیا تھا اور خوش ہو ہو کے پی رہے تھے۔ امیر حسین بھی شراب پیتا تھا لیکن وہ اپنی خوبرو بیوی کا بہت لحاظ کرتا تھا۔ دلشاد کے سامنے وہ شراب پینے سے پرہیز کرتا تھا۔ دلشاد کو شراب کی بدبو سے سخت نفرت تھی۔ اس وقت بھی وہ اس ہنگامے کو دور ایک اونچی جگہ بیٹھی دیکھ رہی تھی۔

"شراب انسان کے دماغ اور دل کو مجہول کردیتی ہے امیر حسین"۔ دلشاد نے بدمست شرابیوں کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن شراب پینے کے بعد انسان میں شیروں جیسی طاقت بھی پیدا ہوجاتی ہے"۔ امیر حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب دل اور دماغ ہی قابو میں نہ رہیں تو طاقت سے کیا فائدہ؟"

دلشاد نے اس کے تجزیے کی سختی سے مخالفت کی:

"فرض کرو کہ اس وقت مغل فوج آجائے تو کیا یہ نشے میں ڈوبے ہوئے لشکری اس کا مقابلہ کرسکیں گے"۔

"دلشاد..... ایک تو یہ فرض کرنا ہی غلط ہے"۔ امیر حسین نے دلیل دی:

"مغل شکست کھا کر بھاگے ہیں۔ ان کے تین چوتھائی لشکری مارے گئے ہیں۔ وہ واپس آنے کی جرأت

نہیں کر سکتے۔"

"لیکن فرض کرنے میں حرج ہی کیا ہے"۔

دلشاد جیسے آج امیر حسین کو قائل کرنے پر آمادہ تھی۔ اسے علم تھا کہ امیر حسین شراب پیتا ہے لیکن اس کے سامنے پینے سے گریز کرتا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ امیر حسین شراب پینا بند کر دے اور ایک پرہیز گار مسلمان بن جائے۔

امیر حسین نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے شرابیوں کو دیکھ رہا تھا۔ دلشاد کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اس نے کہا:

"امیر حسین۔ ان شرابیوں کی حالت اس وقت مٹی کے کھلونوں سے زیادہ نہیں۔ ان کی طاقت سلب ہو چکی ہے اور دماغ معطل ہو چکے ہیں۔ انہیں بغیر اسلحے کے مارا جا سکتا ہے"۔

دلشاد اپنی رو میں کہتی رہی لیکن امیر حسین کی نظریں اُدھر سے نہ ہٹیں۔ اس کے کان جیسے بند ہو گئے۔ وہ دلشاد کی کوئی بات نہ سن سکا۔

امیر حسین کے لشکریوں کو شراب کا شغل کرتے چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس نے اپنے اور دلشاد کے لیے بھنا ہوا گوشت منگوا لیا تھا۔ اب اسے شراب کی سخت خواہش ہو رہی تھی لیکن وہ صبر کیے بیٹھا رہا۔ وہ دلشاد کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر پتھروں کے سہارے نیم دراز ہو گئے۔ دلشاد کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی لیکن امیر حسین بار بار چونک کر اپنے سپاہیوں کو دیکھنے لگتا جن میں سے بیشتر مدہوش ہو کر زمین پر آڑے ترچھے پڑے تھے۔

امیر حسین اپنی خواہش پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے دلشاد کی طرف دیکھا۔ دلشاد کا سر ایک پتھر پر ٹکا ہوا تھا اور وہ شاید سو گئی تھی۔ امیر حسین اور دلشاد کے گھوڑے قریب بندھے تھے۔ گھوڑے پر سوار ہو کے جانے سے دلشاد کی آنکھ کھل سکتی تھی۔ اس نے ادھر سے نظر ہٹالی اور آہستہ آہستہ ڈھلان اترنے لگا۔

امیر حسین بار بار پلٹ کر دلشاد کو دیکھتا جاتا تھا کہ کہیں وہ جاگ تو نہیں پڑی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نیچے جا کر شراب کی دو چار چسکیاں بھرے گا۔ پھر اسی طرح خاموشی سے واپس آ جائے گا۔ شراب پینے کے بعد امیر حسین ہمیشہ دلشاد سے دور دور رہتا اور اگر اتفاقیہ اس کا سامنا دلشاد سے ہو جاتا تو وہ بظاہر یوں ہو جاتی جیسے اسے امیر حسین کے شراب پینے کا علم ہی نہیں ہے۔ امیر حسین کی اس احتیاط کو بھی وہ غنیمت جانتی تھی۔ اگر وہ

ی سے الجھ پڑتی تو لحاظ کا یہ کمزور اور باریک پردہ بھی اٹھ جاتا۔ امیر حسین کی ضد کے سامنے اس کی پھر ایک چلتی۔

امیر حسین آدھی ڈھلان طے کر چکا تھا کہ اسے گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے قدم ک گئے۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس وقت اس کی نظر درّے کے دائیں طرف کے راستے ر پڑی۔ گھوڑوں پر سوار مغل بڑی تیزی سے بڑھے چلے آ رہے تھے۔

امیر حسین کا رنگ فق ہو گیا۔

تیر کمان وہ اوپر چھوڑ آیا تھا۔ کمر سے صرف تلوار لٹک رہی تھی۔ گھوڑا بھی اس کے پاس نہ تھا۔ اوپر جا کر گھوڑے پر سوار ہونا تاخیر کا باعث ہو سکتا تھا۔ امیر حسین نے وہیں سے چیخ کر امیر موسیٰ کو آواز دی اور پھر تیزی سے نیچے کو بھاگا۔ ایک طرف اس کے لشکر کے بہت سے گھوڑے بندھے تھے۔ وہ اسی طرف بڑھا تاکہ اپنے لیے گھوڑا حاصل کر سکے۔

امیر حسین کو پتہ نہیں کہ اس کی آواز کا امیر موسیٰ پر کیا اثر ہوا۔ وہ گھوڑوں کی طرف بھاگ رہا تھا کہ درّے کے دوسرے کنارے سے بھی مغل نمودار ہو گئے۔ امیر حسین کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ لیکن وہ بلا کا جری تھا۔ وہ چیختا برابر نیچے کی طرف بھاگتا رہا۔ مغل دونوں طرف سے درّے میں داخل ہو چکے تھے۔ اور یہ ترائی امیر حسین کے لشکر کے لیے پنجرہ بن گئی تھی۔ سات گھنٹے پہلے اس نے جس طرح غائن مغلوں کو گھیرا تھا اس وقت بالکل اسی طرح اس کا مدہوش لشکر مغلوں کے گھیرے میں آ گئے تھے۔ ان میں افراتفری اور بدحواسی پھیل گئی تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی ہتھیار سنبھالے مگر حواسوں پر تو شراب کا گہرا نشہ جما ہوا تھا۔

انہوں نے مقابلہ شروع کیا۔ کچھ گھوڑوں پر سوار ہو سکے تو کچھ پیدل لڑنے لگے۔ لڑنے کیا لگے بس اپنی مدافعت کرنے لگے اور اس کوشش میں گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔

امیر حسین گھوڑے تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے سامنے مغل سوار آ گئے۔ امیر حسین تلوار سونت کر ایک جگہ جم کر کھڑا ہو گیا اور مغلوں سے لڑنے لگا۔

دلشاد کی آنکھ امیر حسین کی پہلی ہی آواز پر کھل گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ ان کا لشکر مغلوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس کی نظر امیر حسین پر پڑی جو بڑی بہادری سے ایک ابھری ہوئی چٹان کو پشت پر کیے مغل سواروں سے لڑ رہا تھا۔ وہ تڑپ اٹھی۔ اس نے دونوں گھوڑے کھولے۔ ایک پر خود سوار ہوئی اور دوسرے

کی راسیں پکڑ کے نیچے اترنے لگی۔

ڈھلان پر وہ گھوڑوں کو سنبھال سنبھال کے اتار رہی تھی۔ اس کی نظریں امیر حسین پر جمی ہوئی تھیں وہ جلد اس تک گھوڑا پہنچانا چاہتی تھی لیکن اپنی رفتار تیز بھی نہ کر سکتی تھی۔

یکایک امیر حسین کے خالی گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ امیر حسین کے گھوڑے کی راسیں دلشاد کے ہاتھ میں تھیں۔ جھٹکا لگنے سے راسیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ اتنا وقت نہ تھا کہ وہ اتر کر گھوڑے کو پکڑتی اس نے بہتر یہی خیال کیا کہ کسی طرح امیر حسین کے پاس پہنچ کر اپنا گھوڑا اس کے حوالے کر دے۔ دلشاد اس طرح کئی بار میدانِ جنگ میں امیر حسین کو گھوڑا پہنچا چکی تھی۔ آخر وہ گھوڑا بڑھا کر امیر حسین کے پاس پہنچ گئی۔ قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے سیٹی بجائی۔ یہ اس کا مخصوص اشارہ تھا اور میدانِ جنگ میں اسی اشارے سے دلشاد اپنے شوہر کو مخاطب اور خبردار کیا کرتی تھی۔

سیٹی سن کر امیر حسین تیزی سے پیچھے ہٹا۔ دلشاد نے فوراً گھوڑے سے کود کر راسیں شوہر کو پکڑا دیں۔ امیر حسین گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ایڑ دی اور مغلوں کے غول میں گھس گیا۔

گھوڑوں کی کاٹھیاں بڑی تیزی سے خالی ہو رہی تھیں اور بغیر سوار کے گھوڑے درے میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے!

دلشاد جس جگہ دبکی کھڑی تھی، وہ جگہ قدرے اونچی تھی اس لیے ادھر کوئی خالی گھوڑا نہ آ رہا تھا۔ پھر دلشاد کو اوپر سے چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھکتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس نے اوپر نظر دوڑائی تو اس کا چہرہ دمک اٹھا امیر حسین کا گھوڑا جو ٹھوکر کھا کر اوپر ہی رہ گیا تھا وہ تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔ دلشاد نے دو قدم آگے بڑھ کر اسے پکارا۔ گھوڑے نے کان کھڑے کیے۔ اس نے دلشاد کی آواز پہچان لی۔ دلشاد اکثر امیر حسین کے گھوڑے پر سواری کیا کرتی تھی۔

دلشاد اچک کر گھوڑے پر بیٹھی اور تلوار کھینچ کر وہ بھی مغلوں پر جا پڑی۔ وہ ان کے درمیان گھس کر امیر حسین کو تلاش کرتی رہی لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔

جنگ تو ختم ہو چکی تھی۔ امیر حسین کا لشکر شکست کھا کر بھاگ رہا تھا اور مغل اپنے آدمیوں کا جی بھر کے انتقام لے رہے تھے۔ انہوں نے دونوں راستے بند کر دیے تھے اور امیر حسین کے لشکریوں کو گھیر گھیر کر ختم کر رہے تھے۔

دلشاد نے اپنے سواروں کا ایک غول دیکھا جو بائیں راستے کی طرف مارتا کاٹتا بڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ گھیرا توڑ کر بائیں راستے سے نکلنا چاہتے تھے۔ مغل ان کے سامنے دیوار بنے کھڑے تھے۔ دونوں طرف سے سخت مقابلہ ہو رہا تھا۔ ایک گروہ جان بچانے کے لیے جان کی بازی لگا رہا تھا تو دوسرا گروہ انتقامی جذبے سے مغلوب تھا اور زیادہ سے زیادہ سواروں کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

دلشاد بھی موقع پا کر اپنے سواروں میں شامل ہو گئی۔ چونکہ ان کی جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے یہ لوگ لڑتے بھڑتے بڑھتے ہی رہے۔ ان کی بے شمار جانیں ضائع ہوئیں مگر انہوں نے مغلوں کا گھیرا توڑ دیا اور جان بچا کر نکل گئے۔

مغلوں نے بھی ان کا تعاقب نہ کیا۔ وہ پورا پورا بدلہ لے چکے تھے۔ امیر حسین کے کچھ آدمی دائیں راستے سے بھاگنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

امیر حسین کے شکست خوردہ لشکر کے سوار آگے پیچھے بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ بس جان بچانے کی فکر تھی۔ جدھر منہ اٹھ گیا تھا ادھر بھاگتے چلے گئے۔ شام ہو گئی اور دشمن کے تعاقب کا خطرہ ختم ہوا تو انہوں نے گھوڑے روکے۔ بھاگنے والوں میں امیر حسین کا معتمد سردار امیر موسیٰ بھی تھا۔ تمام سوار اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سب سے آخر میں دلشاد گھوڑا بھگاتی ان کے پاس پہنچی۔ دلشاد آغا کو دیکھ کر امیر موسیٰ گھوڑے سے اتر پڑا اور تعظیم بجا لایا۔

"ہمارے سپہ سالار، ہمارے بادشاہ کہاں ہیں خانم؟" امیر موسیٰ نے ادب سے پوچھا۔

"اب تمہیں اپنے بادشاہ کا خیال آیا ۔ ۔ ۔ ۔" دلشاد نے جل کے کہا۔

"اپنے بادشاہ کو میدان میں اکیلا چھوڑ کر بھاگتے ہوئے تم لوگوں کو شرم نہ آئی؟"

امیر موسیٰ یا دوسرے سواروں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے شرم سے گردنیں جھکا لیں۔ دلشاد نے غصے میں انہیں پھٹکار تو دیا تھا مگر اس وقت اسے انہی لوگوں کا سہارا لینا تھا اس لیے نرم پڑ گئی۔ بولی:

"امیر حسین بغیر گھوڑے کے مغلوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ میں نے ان تک گھوڑا تو پہنچا دیا تھا اس کے بعد پتہ نہیں ان پر کیا گزری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"آغا خانم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

امیر موسیٰ شرمندگی سے بولا: "آپ نے ٹھیک فرمایا تھا کہ ہمیں سوچ سمجھ کے حملہ کرنا چاہیے تھا۔ اگر ہم

اس وقت گھوم پھر کر دیکھ لیتے تو ہمیں ضرور معلوم ہو جاتا کہ مغلوں کے اس لشکر کے پیچھے ان کا ایک اور بڑا لشکر بھی موجود ہے"۔

امیر موسیٰ کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور اب وہ بڑی سمجھ داری کی باتیں کر رہا تھا۔ امیر حسین نے درّے میں جس مغل لشکر پر حملہ کیا تھا وہ دراصل مغلوں کے ایک بڑے لشکر کا ہراول دستہ تھا۔ مغلوں کے بادشاہ الیاس خواجہ کو اس کے جاسوسوں نے خبر دی تھی کہ امیر حسین اور شہر سبز کا سردار تیمور گرم سیر میں ایک لشکر اکٹھا کر کے شمال کی طرف آ رہے ہیں۔ الیاس خواجہ نے تیمور کو روکنے اور گرفتار کرنے کے لیے ایک بڑا لشکر اس طرف بھیجا جس کی سرداری پر اس نے اپنے سپہ سالار بیک جک کے بیٹے کو مقرر کیا تھا۔ یہ جوان سردار اپنے باپ سے بھی زیادہ وحشی مگر بڑا بہادر جنگجو تھا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے امیر موسیٰ"۔

دلشاد آغا نے انہیں مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے کہا: "رات سر پہ آ رہی ہے۔ پتہ نہیں ہم کہاں بھٹک رہے ہیں"۔

"آغا خانم...."

امیر موسیٰ نے اپنی وفاداری ظاہر کرنے کے لیے کہا:

"ہمیں اپنے بادشاہ کا پتہ نہیں۔ کیوں نہ ہم یہیں ٹھہر کر ان کا انتظار کریں"۔

دلشاد سمجھ گئی کہ امیر موسیٰ نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے یہ بات کہی ہے۔ اس نے فوراً جواب دیا:

"امیر موسیٰ! ابھی تم ایک غلطی کر چکے ہو اور اب دوسری غلطی کر کے ان بچے کھچے سواروں کو بھی ختم کر دینا چاہتے ہو۔ تم یہ کس طرح امید کرتے ہو کہ امیر حسین تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ جائیں گے۔ ان کے بجائے مغلوں کا کوئی دستہ بھی تو ادھر آ سکتا ہے"۔

"آغا خانم آپ ٹھیک فرما رہی ہیں"۔

امیر موسیٰ نے فوراً ہار مان لی:

"آپ حکم دیجیے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے"۔

"ہمیں فوراً کسی بستی کو تلاش کرنا چاہیے"۔ دلشاد پوری تمکنت سے بولی:

"ہمارے سوار تھکے ماندے اور بھوک کے پیاسے ہیں۔ انہیں کھانے اور آرام کرنے کی ضرورت ہے"۔

موسیٰ نے فوراً چار سواروں کو مختلف سمتوں میں بھیجا تاکہ وہ کسی بستی کا پتہ لگائیں۔ باقی لوگ گھوڑوں سے اتر کر بیٹھ گئے۔ اور سواروں کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دلشاد بہت فکر مند تھی۔ اسے سب سے زیادہ فکر مغلوں کی طرف سے تھی۔ وہ ان کی فطرت سے واقف تھی۔ مغل شکست خوردہ لشکر کے ایک سپاہی کو بھی زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔ انہیں بھاگنے والوں کی تلاش ضرور ہو گی۔

○

امیر موسیٰ کے بھیجے ہوئے تمام سوار سوائے ایک کے، ناکام واپس آ گئے۔ انہیں دور دور تک کسی بستی کا پتہ نہ ملا۔ اب صرف ایک سوار باقی تھا اور یہ لوگ اسی سے امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں سوار راستہ نہ بھول گیا ہو کیونکہ وہ شام کے وقت گیا تھا اور اب رات ہو چکی تھی۔ پھر بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق وہ امید باندھے بیٹھے تھے۔

رات کے لمحات تیزی سے گزر رہے تھے اور ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر تیسرے ہفتے کا چاند آہستہ آہستہ بلند ہونا شروع ہوا۔ کچھ روشنی پھیلی تو ان کی جان میں جان آئی۔

چاند اپنے ساتھ چاندنی ہی نہیں لایا بلکہ ان کے لیے خوشی کا پیغام بھی لے کر آیا۔ دور سے گھوڑے کے بھاگنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پہلے تو ان کے چہروں پر مسرت کی لہریں دوڑ گئیں مگر فوراً ہی اس کی جگہ نا امیدی اور خوف نے لے لی۔ ان کا سوار تنہا گیا تھا لیکن آنے والوں کی تعداد ایک سے زیادہ معلوم ہوتی تھی۔

امیر موسیٰ نے اپنے آدمیوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ صرف تلواریں نیام سے نکلنے کی دیر تھی۔

دلشاد چھٹکی ہوئی چاندنی میں اس راستے پر نظریں جمائے ہوئے تھی جدھر سے گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازیں دم بدم بڑھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

پھر کرب انگیز انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور امید نے اپنا چہرہ دکھایا۔ امیر موسیٰ کا سوار سامنے نمودار ہوا۔ اس کے پہلو بہ پہلو دو سوار اور آ رہے تھے۔

امیر موسیٰ کے ساتھ چالیس سوار تھے۔ وہ انہیں لے کر کھلی جگہ میں آ گیا۔ امیر موسیٰ کے سوار نے دور ہی سے آواز لگائی:

"یا امیر، مبارک ہو۔ ہمیں دوست مل گئے ہیں"۔

اس پُر مسرت آواز پر سب کے چہرے کھل اٹھے اور نیاموں سے جھانکتی ہوئی تلواروں نے پھر اپنے چہرے چھپا لیے۔

سوار کے ساتھ آنے والوں میں ایک مرد تھا اور ایک عورت۔ انہوں نے گھوڑوں سے اتر کر بلند آواز میں "السلام علیکم" کہا جو اُن کے مسلمان ہونے کی دلیل تھا۔ جواب میں سب نے وعلیکم السلام کہہ کر انہیں خوش آمدید کہا۔

امیر موسیٰ کے سوار نے دلشاد سے ان دونوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"یہ ہیں شاہِ کابل امیر حسین کی ملکہ دلشاد آغا بیگم"۔

ساتھ آنے والی عورت جس کی آنکھیں غزالوں جیسی کشادہ اور روشن تھیں، آگے بڑھی اور دلشاد کا اپنے ہاتھ میں محبت سے لیتے ہوئے اسے بوسہ دے کر آنکھوں سے لگا لیا۔

اس کے ساتھی مرد نے ادب سے کہا:

"ہماری خوش نصیبی ہوگی اگر ملکۂ کابل ہمیں اپنی مہمان نوازی کا فخر عطا کریں"۔

دلشاد نے عورت کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور درازیٔ عمر کی دعا دی۔

"میرا نام طغر ہے اور یہ میری بیوی غلغورا ہے"۔ مرد نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔

"اگر میں غلطی نہیں کرتی تو تم لوگ ترک معلوم ہوتے ہو"۔ دلشاد نے مسکرا کر کہا۔

آنے والے جوڑے نے دلشاد کو حیرت سے دیکھا۔ پھر وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

"اگر یہ صحیح ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں"۔

دلشاد اسی خوشدلی سے بولی:

"یہ اندازہ میں نے تم لوگوں کے چہروں سے لگایا ہے۔ پھر اجنبیوں سے "السلام علیکم" کہہ کر خود کا متعارف کرانا، ترک قبائل کا دستور ہے"۔

"ملکہ عالیہ کا اندازہ درست ہے"۔ غلغورا نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "کیا ہم امید کریں کہ آپ ہمیں اپنی

ہان نوازی کی نعمت سے سرفراز کریں گی"۔

"کیوں نہیں غلغورا"۔

دلشاد نے کہا:

"اس پریشانی کے عالم میں تمہاری مہمان نوازی ہم پر ایک بڑا احسان ہوگا"۔

"ہمیں شرمندہ نہ کیجیے ملکہ عالیہ"۔

طغر نے دخل دیا:

"آپ کے سوار سے ہم تمام حالات سن چکے ہیں۔ اگرچہ ہم مغلوں کے حلیف ہیں لیکن اپنے مسلمان ائیوں کی مدد اور مہمان نوازی سے انکار کرنا ہماری اور اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ یقین دلاتے ہیں کہ اگر مغل لشکر آپ کی تلاش میں ہمارے دروازے تک پہنچ گیا تو یہ دروازہ صرف وقت کھلے گا جب ہمارے تمام سوار آپ پر قربان ہو چکے ہوں گے"۔

"اس خلوص کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ شکریہ ادا کیا جا سکے"۔

دلشاد نے بھی اسی خلوص سے اظہارِ ممنونیت کیا۔

"ہم لوگ تمہیں زیادہ عرصہ تکلیف نہ دیں گے۔ صرف دو چار دن تمہیں زحمت ہوگی"۔

"ہمیں اس وقت زیادہ خوشی ہوگی جب ملکہ ہمیں مستقل خدمت کا موقع عطا کریں گی"۔

غزالی آنکھوں والی غلغورا نے کہا:

"وہ گھر کتنا خوش نصیب ہوگا جس میں ملکہ عالیہ کے قدم پڑیں گے"۔

دلشاد کو اک دم امیر موسیٰ کا خیال آیا جو اس کے قریب کھڑا غلغورا کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس طغر سے کہا:

"ترک سردار..... ان سے ملو..... یہ ہیں امیر موسیٰ۔ ہمارے لشکر کے سپہ سالار"۔

بدطینت امیر موسیٰ جو آنکھوں کے ذریعے غلغورا کے پیکر کو اپنے نہاں خانۂ دل میں اتارنے میں معروف اپنے نام پر چونکا۔ طغر نے معانقے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بولا:

"میں سپہ سالار کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے غریب خانہ پر قیام کی دعوت دیتا ہوں"۔

"ہاں..... ہاں..... شکریہ"۔ امیر موسیٰ گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا اور کیسے جواب دے۔

دلشاد تیز نظروں سے امیر موسلی کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ اس کی خباثت سے اچھی طرح واقف تھی جو کہ اس نے جس انداز اور جن نظروں سے غلفورا کو دیکھا تھا اس سے دلشاد کے دل میں طرح طرح کے وسوسوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے وہاں کھڑے کھڑے گفتگو میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے سواروں کو لے کر طغز کے ساتھ چل پڑی۔

دلشاد کو امیر موسلی کی بوالہوس نظروں نے اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ راستے بھر اس کا ذہن الجھا رہا اور وہ ٹھیک طرح غلفورا کی دلچسپ اور معصوم باتوں کا جواب بھی نہ دے سکی۔

نوجوان طغز اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ اس کی شادی کو ابھی چھ ماہ گزرے تھے۔ طغز میں مردانہ وجاہت تھی اس کی بیوی غلفورا میں وہ تمام رعنائیاں موجود تھیں جو ایک حسین اور خوبصورت عورت کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ دونوں میاں بیوی میں بے انتہا محبت تھی۔

یہ ترک قبیلہ پہلے خانہ بدوش زندگی بسر کرتا تھا لیکن طغز کے باپ نے خانہ بدوشی چھوڑ کے اس جگہ مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس بستی میں زیادہ تر جھونپڑیاں تھیں۔ کچھ کچے پکے مکانات بھی تعمیر ہو گئے تھے۔ چھ سات کمروں کی ایک وسیع حویلی میں طغز کی رہائش تھی۔

قبیلے میں جوان اور مسلح سواروں کی تعداد چالیس سے زیادہ نہ تھی مگر یہ سب کے سب بڑے بہادر اور جنگجو تھے۔ دوسرے قبیلوں سے محفوظ رہنے کے لیے انہوں نے بستی کے گرد ایک دیوار سی تعمیر کر لی تھی جو ایک شکستہ سی فصیل کا کام دیتی تھی۔ دور اور نزدیک کے بیشتر قبائل سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ اس لیے لڑائی جھگڑے کا موقع کم ہی پیش آتا۔ یہ لوگ آرام اور سکون سے زندگی گزار رہے تھے۔

مہمانوں کے لیے بستی کے میدان میں حویلی کے قریب ہی خیمے لگا دیے گئے۔ امیر موسلی سپہ سالار تھا اس کے واسطے طغز نے ایک بڑا خیمہ نصب کرا دیا اور اس میں ضرورت کی تمام چیزیں پہنچا دی گئیں۔ اس دوران کھانا تیار ہو گیا تھا۔ تھکے ماندے سواروں نے خوب سیر ہو کے کھانا کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

امیر موسلی کھانا کھانے کے بعد اپنے خیمے میں بے چین سا بیٹھا تھا۔ اس کے چار پانچ ہم مشرب بھی اس کے خیمے میں موجود تھے۔ امیر موسلی کا دماغ دو خواہشوں کے درمیان الجھا ہوا تھا۔ ایک خواہش تھی شراب کی اور دوسری خواہش . . . . . اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس کی نظریں پہلے ہی غلفورا کے تراشے ہوئے سراپا کا جائزہ لے چکی تھیں۔

امیر موسلی نے بستی میں پہنچتے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں مسلح سواروں کی تعداد زیادہ نہیں اور اس کے ر بڑی آسانی سے ان پر قابو پا سکتے ہیں۔ پھر بستی ان کے قبضے میں ہو گی اور وہ اپنی ہر خواہش پوری کر سکے گا۔

امیر موسلی کو فکر مند دیکھ کر اس کے ایک راز دار نے سرگوشی کی:

'میرے پاس تھوڑی سی دخترِ رز ہے۔ حکم ہو تو حاضر کروں؟'

دخترِ رز یعنی شراب کے نام پر امیر موسلی اچھل پڑا۔ کھانا کھانے کے بعد اسے شراب پینے کی عادت تھی۔ ے کھانا تو دیا گیا لیکن شراب پیش نہیں کی گئی۔ اس کا مطلب تھا میزبان شراب نہیں پیتا ورنہ شراب پینے والا مہمان کو شراب ضرور پیش کرتا ہے۔

'تیرے پاس ہے تو جلد لے آ . . . . !' امیر موسلی نے خوش ہو کر کہا۔

سرگوشی کرنے والا وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں گیا اور کچھ دیر بعد پانی بھرنے والے تھیلے لٹکائے ہوئے ں آ گیا۔ رستے میں مغلوں کو شکست دینے کے بعد جب یہ لوگ شراب کے تھیلے خالی کر رہے تھے تو اس سوار نے پانی کی تھیلی شراب سے بھر کر گلے میں لٹکا لی تھی۔ وہ تھیلی جنگ اور فرار کے دوران اس کے گلے میں لٹکی ہوئی یہاں آ گئی تھی۔

شراب دیکھ کر امیر موسلی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے تھیلی لے کر منہ سے لگا لی اور آہستہ آہستہ مزے لے لے کر شراب پینے لگا۔

اس کے شرابی احباب اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر اس میں اتنی شراب نہ تھی کہ وہ اس ں دوسروں کو بھی شریک کرتا۔ پھر بھی اس نے دوستوں کی خاطر تھوڑی سی شراب تھیلی میں چھوڑ دی۔ اس کے احباب یلی پر بھوکے گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

طغز اور غلفورا بے انتہا مسرور تھے۔

وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ملکہ ذکائیل کے قدم ان کی حویلی میں آ جائیں گے۔ طغز ملکہ کے سامنے آنکھیں بچھا اٹھا اور غلفورا کنیزوں کی طرح ملکہ کے آگے پیچھے دوڑ رہی تھی۔

طغز نے ملکہ دلشاد کو اپنے خاص کمرے میں اتارا تھا۔ اس میں طغز اور اس کی نئی بیاہی ہوئی بیوی رہتے تھے۔ نفاست پسند غلفورا نے یہ کمرہ صحرائی بود و باش کے مطابق سجایا تھا۔ دلشاد بھی ایسے محبت کرنے والوں کے درمیان پہنچ کر بہت خوش تھی اور بار بار ان دونوں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس نے غلفورا کو اپنے ہی کمرے میں

ٹھہرا لیا تھا۔ ظفر دو کمرے چھوڑ کر تیسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

ظفر، امیر موسیٰ کے خیمے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا تھا۔ جب ان لوگوں نے کھانا شروع کیا تھا تو وہ وہاں سے اٹھ آیا تھا تاکہ وہ کھانے کے بعد فوراً آرام کرنے کے لیے لیٹ جائیں۔ اس نے غلفورا کو بھی تاکید کر دی تھی کہ وہ ملکہ سے زیادہ دیر گفتگو نہ کرے اور انہیں آرام کرنے کا موقع دے لیکن دلشاد کو غلفورا کی بھولی بھالی باتوں میں بڑا لطف آ رہا تھا اس لیے وہ دیر تک جاگتی رہی۔

غلفورا اور دلشاد کو باتیں کرتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ غلفورا نے پشت کی کھڑکی سے جھانک کے دیکھا، صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے اٹھ کے کمرے میں جلنے والی تمام مشعلوں کو گل کر دیا۔ صرف ایک مشعل جلتی رہنے دی۔ پھر وہ دونوں بھی سونے کے لیے لیٹ گئیں۔

ابھی وہ دونوں سونے کی کوشش کر رہی تھیں کہ باہر برآمدے میں کسی کے بولنے اور شور کرنے کی آواز سنائی دی۔ غلفورا گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ دلشاد نے بھی پریشانی کے عالم میں دروازے کی جانب دیکھا۔

غلفورا اٹھ کے دروازے کے پاس پہنچی۔ دلشاد بھی اس کے پیچھے پہنچ گئی۔ دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئیں۔

طویل برآمدے میں کئی مشعلیں روشن تھیں اور خوب اجالا پھیلا ہوا تھا۔ غلفورا اور دلشاد نے ایک ساتھ دیکھا کہ امیر موسیٰ اپنے چند آدمیوں کے ساتھ جھومتا اور اول فول بکتا ادھر آ رہا ہے۔ غلفورا نے گھبرا کر دلشاد کو دیکھا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے برابر کھڑی ہو گئی۔

دلشاد بڑی حیرت سے امیر موسیٰ کو اپنی طرف آتے دیکھ رہی تھی مگر اس کی حیرت جلد ہی دور ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ امیر موسیٰ نے شراب پی رکھی ہے اور اب وہ انسان سے شیطان بن چکا ہے۔

"وہیں ٹھہرو امیر موسیٰ"۔ دلشاد نے ڈپٹ کر کہا۔

امیر موسیٰ نے کوئی پرواہ نہ کی اور بڑھتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔

"یہ کیا حرکت ہے امیر موسیٰ۔۔۔۔" دلشاد نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

اس کے جواب میں امیر موسیٰ کا ہاتھ بڑھا اور اس کا آہنی پنجہ غلفورا کی کلائی پر پڑا۔ غلفورا ابھی ترک عورت تھی۔ اس نے اپنے حواس بحال رکھے اور دایاں ہاتھ اٹھا کر امیر موسیٰ کے منہ پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ موسیٰ جیسا شہ زور بھی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن فوراً ہی سنبھلا اور غلفورا کی طرف بڑھتے ہوئے دھاڑا:

"تو نے۔۔۔۔ تو نے امیر موسیٰ کو طمانچہ مارا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے وہ چاہتا تھا کہ غلفورا کی کلائی پھر سے پکڑ لے کہ دلشاد خنجر کھینچ کر ان دونوں کے درمیان ہو گئی۔

"خبردار جو قدم آگے بڑھایا"۔

دلشاد نے گرج کر کہا:

"تم نے ہمیں ذلیل کر دیا ہے"۔

"ہٹ جاؤ آغا خانم"۔

امیر موسیٰ چیخ کر بولا:

"اس نے مجھے۔۔۔۔ امیر موسیٰ کو طمانچہ مارا ہے"۔

"تم اسی قابل ہو موسیٰ"۔

دلشاد بھی شیرنی کی طرح بپھر گئی تھی:

"تم احسان فراموش ہو جس نے تمہیں سہارا دیا۔ اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے تمہیں شرم نہ آئی"۔

"خانم۔۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں ہٹ جاؤ میرے سامنے سے ورنہ۔۔۔۔" امیر موسیٰ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"موسیٰ۔۔۔۔ میں، امیر حسین والیِ کابل کی ملکہ تمہیں حکم دیتی ہوں کہ تم ہوش میں آ جاؤ ورنہ یہ تمہارے سینے میں اتر جائے گا"۔ دلشاد نے بڑی بے خوفی سے خنجر اونچا کر کے لہرایا۔

امیر موسیٰ کے قدم رک گئے۔ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اس شور و غل سے بستی کے لوگ اور تمام اپنے والے جاگ پڑے تھے۔ وہ تلواریں سنبھالتے ہوئے اسی طرف بھاگے۔ ظفر بھی اپنے کمرے میں جاگ پڑا اور خطرہ محسوس کرتے ہوئے تلوار اٹھا کے برآمدے میں آیا۔ اس کی نظر دلشاد کے پیچھے دبکی ہوئی غلفورا پر پڑی تو وہیں سے چلایا:

"گھبرانا نہیں غلفورا۔ میں آ رہا ہوں"۔

امیر موسیٰ نے ظفر کو آتے دیکھا تو غلفورا اور دلشاد کو چھوڑ کے تلوار کھینچتا ہوا ظفر کی طرف بڑھا:

"اچھا ہوا تو آ گیا۔ میں پہلے تیرا ہی خاتمہ کرتا ہوں"۔ اور امیر موسیٰ نے بڑی پھرتی سے ظفر پر وار کیا۔

طغر بھی اچھا شمشیر زن تھا۔ اس نے موسلی کا وار خالی دیا۔ اور جھکائی دے کر اس نے جوابی حملہ کیا۔ دونوں تلواریں مل گئیں اور دو بدو جنگ شروع ہو گئی۔

بستی والوں نے اپنے سردار کو لڑتے دیکھا تو وہ بھی مغلوں پر ٹوٹ پڑے۔ برآمدے سے میدان تک ہر جگہ لڑائی چھڑ گئی۔ اور چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لڑنے والوں کو قطعی علم نہ تھا کہ معاملے کی اصل نوعیت کیا ہے۔ وہ تو بس یہ سمجھ رہے تھے کہ فریقِ مخالف نے انہیں دھوکا دیا ہے۔

امیر موسلی کے ساتھ فرار ہو کر آنے والوں میں دس سوار امیر حسین کے خاص محافظ دستے کے تھے وہ جب اپنے خیمے سے نکل کر آئے اور میدانِ کارزار گرم دیکھا تو لڑنے کے بجائے سب کے سب دلشاد آغا کے پاس پہنچے اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔

"ہمارے لیے کیا حکم ہے خانم آغا۔" ایک نے ادب سے پوچھا۔

"کیا تم ہمارا ساتھ دو گے؟" دلشاد نے بڑی امیدوں سے کہا۔

"کیوں نہیں خانم ...... ہم والیٔ کابل کے وفادار ہیں۔ ہم صرف آپ کا حکم مانیں گے۔"

دلشاد کو اس جواب سے بڑا سکون ملا۔ وہ ایک لمحہ سوچتی رہی۔ پھر بولی:

"تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔"

دلشاد نے غلفورا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ کمرے میں واپس آ گئی۔ محافظ تلواریں سونتے باہر پہرہ دینے لگے۔

"غلفورا۔ جلدی سے اپنے شوہر کے کپڑے پہن لو۔" دلشاد کے لہجے میں کچھ حکم کی گرمی اور کچھ التجا کی نرمی تھی۔

"مگر کیوں ملکہ ...... شوہر کے کپڑے۔" غلفورا کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

"وقت کم ہے غلفورا ......"

دلشاد نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"میں تمہارے لیے جان دے سکتی ہوں لیکن تمہاری عزت یہاں محفوظ نہ رہ سکے گی۔ تم مردانہ کپڑے پہن کر میرے آدمیوں کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ۔ میرے آدمی تمہیں جنوب میں سردار تیمور کے پاس پہنچا دیں گے۔ وہاں اور صرف وہاں تم محفوظ رہ سکتی ہو۔"

"لیکن میرا شوہر ...... طغر ......" غلفورا ہچکچانے لگی۔

"اس کی حفاظت کی میں ذمے دار ہوں۔"

دلشاد کے لہجے میں بڑی گھبراہٹ تھی:

"غلفورا جلدی کرو۔ اپنی عزت بچاؤ۔"

"مجھے آپ پر بھروسہ ہے ملکہ ......" کہتی ہوئی غلفورا شوہر کے کپڑے تلاش کرنے لگی۔

دلشاد دروازے پر گئی اور محافظوں کو ہدایت دینے لگی:

"تم میں سے پانچ آدمی میرے محسن کی بیوی کو اپنے ساتھ لے کر فوراً جنوب کی طرف روانہ ہو جائیں۔ باقی میرے پاس رہیں ...... تمہارے ساتھ جانے والی عورت ہے جو مردانہ لباس میں سفر کرے گی۔ اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ جس قدر جلد ہو سکے اسے سردار تیمور کے پاس پہنچا دو۔ وہ اب تک گرم سیر کے علاقے میں مقیم ہیں۔"

دلشاد آغا نے اکھڑے اکھڑے اور بے ربط سے جملوں میں اپنا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی مگر محافظوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس سے انہیں معاملات کی سنگینی کا علم ہو گیا تھا۔

غلفورا کپڑے پہن کے آ گئی اور اس نے اپنے بال صافے میں چھپا لیے تھے۔ اب وہ ایک نوعمر ترک بچہ نظر آ رہی تھی۔

"خبردار۔ کوئی کوتاہی نہ ہو ......" دلشاد آغا نے چلتے وقت تاکید کی۔

"خانم آغا ...... آپ بے فکر رہیں۔ ہمارے جیتے جی ان پر کوئی آنچ نہ آ سکے گی۔" محافظوں میں سے ایک نے جواب دیا۔

پانچ محافظ غلفورا کو ساتھ لے کر برآمدے سے ہوتے ہوئے خیموں کی طرف بڑھ گئے۔ دلشاد نے بھی تلوار سنبھال لی اور باقی محافظوں کے ساتھ پھر اس جگہ پر آ گئی جہاں کچھ دیر پہلے طغر اور امیر موسلی ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔

اس وقت تک امیر موسلی کے آدمیوں نے بستی والوں پر قابو پا لیا تھا۔ بستی کے کئی جوان مارے جا چکے تھے۔ بستی والے مجبور تھے۔ تمام لشکری امیر موسلی کے ساتھ تھے۔ دلشاد کے ساتھ اب صرف پانچ محافظ رہ گئے تھے۔ دلشاد میدان میں پہنچی۔ امیر موسلی ایک جگہ بیٹھا اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اب وہ اس بستی کا

مالک تھا۔

سورج نکل رہا تھا۔ امیر موسیٰ کی آنکھوں میں خونی سائے صاف لہراتے نظر آرہے تھے۔ امیر موسیٰ نے دلشاد کو آتے دیکھا لیکن وہ اس کی تعظیم کے لیے نہ اٹھا۔

دلشاد کے شاہانہ وقار کو صدمہ پہنچا۔ وہ امیر موسیٰ جو اس کے شوہر کے سامنے اس کے جوتے اٹھانے پر آمادہ رہتا تھا، اس وقت غرور سے سر اٹھائے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

دلشاد نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دی اور قریب پہنچ کر اس طرح ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے اس نے امیر موسیٰ کو نہ دیکھا ہو اور کسی اور کو تلاش کر رہی ہے۔ پھر اس کی نظر ایک جگہ ٹھہر کے رہ گئی۔ چار آدمی طغر کو پکڑ کے لا رہے تھے۔

طغر کے لباس پر خون کی چھینٹیں تھیں۔ طغر کو بے بسی کے عالم میں دیکھ کر امیر موسیٰ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا لیکن دلشاد کے دل سے ہوک سی اٹھی اور وہ تڑپ کے طغر کے پاس پہنچ گئی۔

"چھوڑ دو اسے"۔۔۔ دلشاد نے پوری آواز سے چیختے ہوئے حکم دیا۔

طغر کے ساتھ آنے والے دو سپاہی گھبرا کے پیچھے ہٹ گئے لیکن باقی دو اسے پکڑ کر کھڑے رہے۔ انہوں نے امیر موسیٰ کی طرف دیکھا جیسے وہ اس کے حکم کے منتظر ہوں۔

"چھوڑ دو میں حکم دیتی ہوں۔"

دلشاد پھر گرجی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تلوار بلند کر لی:

"اگر تم نے اسے نہ چھوڑا تو میں تم دونوں کو قتل کر دوں گی۔"

"اسے نہیں چھوڑا جا سکتا خانم آغا۔" امیر موسیٰ اپنی جگہ سے اٹھ کر دلشاد کی طرف بڑھا۔

"امیر موسیٰ قدم مت بڑھاؤ۔"

دلشاد نے پلٹ کر امیر موسیٰ سے کہا:

"میرے قریب آنا ہے تو تلوار لے کر آؤ۔ میں نہتے پر حملہ نہیں کرنا چاہتی۔"

امیر موسیٰ کے ہاتھ میں تلوار نہ تھی۔ وہ اپنی خون آلود تلوار وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ آیا تھا۔ دلشاد کی یاد دہانی پر وہ بوکھلا گیا۔ اس نے دوڑ کر تلوار اٹھا لی۔ دلشاد کی تلوار پہلے ہی ہوا میں لہرا رہی تھی۔ پانچوں محافظ اس کے گرد دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"میں امیر حسین کا نمک خوار ہوں۔ خانم آغا پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا۔"

امیر موسیٰ نے دلشاد کو مرعوب کرنے کی کوشش کی:

"خانم کی وجہ سے میں نے اس کی بیوی کو چھوڑ دیا لیکن اسے نہیں بخش سکتا۔"

"میں بھی ایک احسان فراموش کے گندے خون سے اپنی تلوار کو آلودہ نہیں کرنا چاہتی۔"

دلشاد نے اپنی تلوار کی نوک طغر کے پکڑنے والوں میں سے ایک کے کاندھے سے لگا دی۔ وہ طغر کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرا بھی گھبرا گیا۔ اس نے بھی طغر کو چھوڑ دیا۔

"طغر، تم میرے قریب آجاؤ۔" دلشاد نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

طغر قدم بڑھا کر محافظوں کے حلقے میں آگیا۔ دلشاد نے سر اٹھا کر حویلی کی طرف دیکھا۔ امیر موسیٰ سمجھ گیا دلشاد حویلی میں جانا چاہتی ہے۔ وہ بڑھ کر دلشاد اور حویلی کے درمیان کھڑا ہو گیا۔

"یہ میرا مجرم ہے خانم۔۔۔۔" امیر موسیٰ نے طغر کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"یہ میرا محسن بھی ہے امیر موسیٰ۔۔۔۔ میں اس کی حفاظت کروں گی۔"

"خانم۔۔۔۔ مجھے گستاخی پر مجبور نہ کریں۔"

"میں احسان فراموشی نہیں کر سکتی امیر موسیٰ۔"

"میں اسے نہیں جانے دوں گا۔ مجرم کو میرے حوالے کر دو۔"

موسیٰ کے لہجے میں گستاخی آگئی۔

"میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی موسیٰ۔"

دلشاد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اگر تم طغر کو مجرم سمجھتے ہو تو اپنا مقدمہ امیر حسین کے سامنے پیش کیا۔ ان کی واپسی کا انتظار کرو۔"

"تم اسے چھوڑ دو گی یا نہیں۔" موسیٰ اور زیادہ گستاخی سے بولا۔

"موسیٰ۔۔۔۔"

دلشاد غصے سے بولی:

"تم پر اب تک نشہ سوار ہے۔ تم مجھ پر حکم چلانے والے کون ہوتے ہو؟ میں جو چاہے کروں گی۔ روک سکتے ہو تو روک لینا۔۔۔۔"

دلشاد نے محافظوں کے حلقے میں حویلی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ موسلی کو مجبوراً راستہ دینا پڑا۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

دلشاد طغر کو حفاظت کے ساتھ کمرے میں لے آئی۔ موسلی بڑبڑاتا اور پیر پٹختا واپس ہوا لیکن واپسی سے پہلے اس نے پندرہ سپاہیوں کو دلشاد کا کمرہ گھیرنے کا حکم دے دیا۔

دلشاد نے اس سے پہلے ہی اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا تھا۔ اس نے تین محافظ دروازے پر مقرر کیے اور دو کو پشت کی کھڑکی پر پہرہ دینے کے لیے بھیج دیا۔

"عظیم ملکہ....."

طغر نے کمالِ ادب سے کہا:

"میں آپ کے احسان کو عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔"

"نہیں طغر....."

دلشاد آہستہ سے بولی:

"میں تم سے شرمندہ ہوں۔ میرے آدمیوں نے انتہائی گھناؤنا قدم اٹھایا ہے۔ احسان فراموشی کی ایسی مثال شاید تاریخ پیش نہ کر سکے۔ امیر موسلی ہمیشہ سے ایک خطرناک دوست ہے لیکن اس کی بہادری کی وجہ سے امیر حسین اسے ساتھ رکھتے ہیں۔"

طغر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی متجسس نظریں کمرے میں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

"شاید تم غلفورا کو تلاش کر رہے ہو؟"

دلشاد نے بیٹھتے ہوئے کہا:

"وہ ہم سے زیادہ محفوظ ہے۔ امیر موسلی کے ہاتھ شاید اس تک کبھی نہ پہنچ سکیں۔"

طغر کی نظریں سوالیہ نشان بن کر دلشاد کے چہرے پر ٹک گئیں۔

"طغر....."

دلشاد نے کہنا شروع کیا:

"مجھے تم سے زیادہ غلفورا کی فکر تھی۔ مرد اگر لڑ کر مر جائے تو اس کی عزت بڑھ جاتی ہے لیکن عورت اگر ایک بار عزت کھو دے تو پھر کبھی دوبارہ حاصل نہیں کر سکتی۔ مجھے معلوم تھا کہ امیر موسلی تمہاری بستی والوں کو شکست دے دے گا..... اس کا بھی امکان تھا کہ شاید اس دار و گیر میں تم بھی مارے جاؤ۔ اس کے باوجود میں نے غلفورا پر پہلے توجہ دی..... اُسے میں نے اپنے پانچ با اعتماد محافظوں کے ساتھ جنوب میں تاتاری سردار تیمور کے پاس علاقہ گرم سیر میں بھیج دیا ہے۔ خدا کرے وہ خیریت سے وہاں پہنچ جائے۔ اس کے لیے اس سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"ملکہ عالیہ....."

طغر بڑی رقت سے بولا:

"آپ کا یہ احسان میری جان بچانے سے بھی بڑا ہے۔ اب نہ مجھے اپنا علاقہ چھننے کا غم ہے اور نہ اپنی جان کی پروا۔ آپ کتنی عظیم ہیں ملکہ....."

امیر حسین نے نشہ کی حالت میں ایک بہت بڑی احسان فراموشی کی تھی لیکن یہ اس کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ جنگ میں ہر بات جائز ہے۔ چنگیز خان کا یہ قول خواہ کتنا ہی درست ہو لیکن اس کا اطلاق ہر جگہ نہیں کیا جا سکتا۔ طغر اور موسلی کے درمیان کوئی جنگ یا حالتِ جنگ نہ تھی۔ طغر نے تو ملکہ کابل کا نام سن کر انہیں سہارا دیا تھا جس کے صلے میں اسے اپنے علاقے سے ہاتھ دھونا پڑے۔ وہ قید ہو گیا اور غلفورا کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

موسلی کو کسی بات کا افسوس نہ تھا۔ اس نے اپنے سوار چاروں طرف پھیلا دیے اور دور دور تک قبضہ کر لیا۔ امیر حسین کے مفرور لشکر کے سوار ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ موسلی نے اپنے سواران کی تلاش میں بھیج رکھے تھے۔ اس طرح روزانہ دو چار مفرور لشکری اس کے پاس پہنچ رہے تھے اور موسلی کی طاقت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔

کچھ دن بعد امیر موسلی کے اہلِ خاندان اور بال بچے بھی اس کے پاس آ گئے۔ امیر حسین نے جس وقت مغلوں پر حملہ کیا، لشکریوں کی خواتین رسد لانے والے دستوں کے ساتھ تھیں۔ انہیں جب امیر حسین کی شکست کی خبر ملی تو وہ پہاڑوں میں روپوش ہو گئیں اور مغلوں کے آگے بڑھ جانے کے بعد اپنے لواحقین کو تلاش کرنے لگیں۔

اس طرح تمام مفرور لشکری ایک ایک کر کے امیر موسیٰ کے پاس پہنچ گئے۔

موسیٰ کو ان مفرور لشکریوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امیر حسین بھی جان بچا کر نکل گیا تھا۔ اس کی تلاش میں موسیٰ نے بہت سے سوار دوڑا دیے۔ امیر حسین بہرحال موسیٰ کا امیر تھا۔ موسیٰ اس کی بہت عزت کرتا تھا اور اس سے ڈرتا بھی تھا لیکن اب اسے دلشاد کی طرف سے بھی ڈر پیدا ہو گیا تھا۔ تمام لشکریوں کو معلوم تھا کہ موسیٰ نے دلشاد کو قید کر رکھا ہے۔

امیر حسین کی واپسی پر کیا ہو گا؟

اس خیال سے موسیٰ بہت پریشان تھا۔ آخر موسیٰ نے بڑی سوچ بچار کے بعد دلشاد کے کمرے پر سے پہرہ اٹھا لیا۔

دلشاد حالات کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ امیر حسین زندہ ہے اور کسی وقت یہاں پہنچ سکتا ہے۔ موسیٰ کی یہ تمام پیش بندیاں اور مہربانیاں اسی وجہ سے ہیں۔

دلشاد کو اپنی زیادہ فکر نہ تھی۔ وہ طغر کی وجہ سے ہر وقت پریشان رہتی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ موسیٰ کی یہ مہربانی کسی وقت بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ دشمنی کے سلسلے میں امیر موسیٰ کمینی سے کمینی حرکت کر سکتا تھا۔ وہ طغر کو کمرے سے ایک لمحے کے لیے بھی نہ نکلنے دیتی تھی اور ہر وقت چوکنا رہتی تھی۔

ایک اندھیری رات میں دلشاد نے طغر کو تیار ہونے کا حکم دیا۔

طغر بھی اس قید سے تنگ آ گیا تھا اور اپنی آزادی کے لیے ہر قسم کا خطرہ مول لینے پر آمادہ تھا۔ دلشاد نے ایک گھوڑا مع ضروری سامان کے بستی سے دور بھجوا دیا تھا۔ طغر کے تیار ہونے کے بعد اسے اپنے ایک محافظ کے ساتھ پچھلی کھڑکی سے باہر نکالا۔

دلشاد نے دھڑکتے دل سے طغر کو خدا حافظ کہا اور اسے بھی گرم سیر کی طرف روانہ کر دیا۔

ایک تو اندھیری رات، پھر امیر موسیٰ بے پروا ہو کر اس طرف سے لاپروا ہو گیا تھا اس لیے طغر کو نہ تو کسی نے دیکھا اور نہ تعاقب کیا۔ وہ بڑی آسانی سے گھوڑے تک پہنچ گیا۔ یہ اس کا علاقہ تھا۔ راستے جانے پہچانے تھے اس نے محافظ کو واپس بھیج دیا اور ایک پُرپیچ مگر محفوظ راستے پر اپنا گھوڑا ڈال دیا۔

اس کا رخ گرم سیر کی طرف تھا۔

○

امیر حسین اور شہر سبز کے سردار تیمور نے مشترکہ لشکر کے ساتھ سیستانیوں کے ساتوں قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ سامانِ رسد کے علاوہ ان کے ہاتھ بے شمار تازہ دم گھوڑے اور سیستانی سوار اور پیادے آ گئے۔

امیر حسین نے اپنے لشکر کے ساتھ فوراً شمال کا رخ کیا تھا مگر تیمور زخموں کی وجہ سے قریب کی پہاڑیوں میں ٹھہر گیا تھا۔ یہ مقام بڑا پُرفضا تھا۔ دور دور تک انگور کی بیلیں تھیں۔ ہوا کے خنک جھونکے مشامِ جان کو معطر کرتے تھے۔

تیمور کی بیوی الجائی خاتون آغا اور ننھا جہانگیر اس کے پاس پہنچ گئے تھے۔ الجائی خاتون اپنے شوہر کی خدمت میں لگی تھی۔ اسے تیمور کی خدمت کا بہت کم موقع ملتا۔ تیمور دو چار دن اس کے ساتھ گزار کر آگے بڑھ جاتا تھا اور جب کوئی سکون کی جگہ میسر آتی تو الجائی کو بلوا لیتا۔

اس بار الجائی خاتون کو تیمور کے زخموں کی وجہ سے ایک اچھا موقع ہاتھ آیا۔ تیمور کے بازو کے زخم بھر گئے تھے لیکن پیر کا زخم بھرنے کا نام نہ لیتا تھا۔ کسی سیستانی کے تیر نے اس کے ایک پیر کو زخمی کر کے اسے ہمیشہ کے لیے لنگڑا کر دیا تھا۔

تیمور تقریباً ایک ماہ تک صاحبِ فراش رہا۔

یہ ایام الجائی کے لیے بڑے خوش گوار تھے۔ ننھا جہانگیر ہر دم ان کے گلے کا ہار بنا رہتا اور الجائی تیمور کے برابر قالین پر بیٹھے ہوئے پہاڑیوں پر چڑھتے چاند کو دیکھتی رہتی۔ اس کا دل مسرتوں سے بھرا ہوا تھا۔ زندگی میں اسے پہلی بار ایک پُرسکون جگہ پر، اتنے طویل عرصے تک تیمور کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچ کر کانپ اٹھتی کہ اب جدائی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ زخم بھرتے ہی تیمور اسے چھوڑ کر آگے چلا جائے گا۔

تیمور لنگڑا لنگڑا کے چلنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ پیر سیدھا پڑنے لگے لیکن زخم بھرنے اور پیر سیدھا ہونے کے باوجود اس کا لنگ ختم نہ ہو سکا۔

ایک دن وہ لنگڑا کے چل رہا تھا کہ ننھے جہانگیر نے تالیاں بجانا شروع کر دیں:

"آہا، بابا لنگڑے ہو گئے۔"

"چپ رہ......" الجائی خاتون نے جہانگیر کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔

"بابا کا مذاق نہیں اڑاتے۔"

تیمور نے پلٹ کر جہانگیر کو دیکھا اور بولا:

"الجائی اسے بولنے دو۔ صرف جہانگیر ہی میرے سامنے سچ بول سکتا ہے۔ میں واقعی لنگڑا ہو گیا ہوں لیکن کوئی بھی مجھے لنگڑا کہنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

اور یہ درست ثابت ہوا۔

تیمور تیزی سے ترقی اور عروج کے مدارج طے کرتا رہا۔ کسی نے اسے لنگڑا کہنے کی جرأت نہیں کی سوائے ایک اندھی بڑھیا کے جو تیمور کے پاس کسی کی شکایت لے کر آئی تھی۔

تیمور نے پوچھا تھا:

"اے نابینا خاتون، تیرا نام کیا ہے؟"

"میرا نام دولت ہے امیر تیمور۔۔۔" بڑھیا نے بڑے وقار سے جواب دیا تھا۔

اس پر تیمور مسکرا دیا۔ بولا:

"عجب اتفاق ہے۔ کیا دولت اندھی ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتی نہیں بلکہ دولت ہمیشہ اندھی ہوتی ہے امیر۔۔۔"

عورت نے سنبھل کر فوراً جواب دیا:

"اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ دولت اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے پاس فریاد لے کے نہ آتی۔"

تیمور دنگ رہ گیا اور اس نے اسی وقت بڑھیا کی داد رسی کی تھی۔ اندھے اور لنگڑے کا یہ لطیفہ آج تک زبان زدِ خاص و عام ہے۔

تیمور کے زخم بھر گئے تھے لیکن پیر کا زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا کہ اسے امیر حسین کی شکستِ فاش کی اطلاع ملی۔ جب امیر حسین شمال کی طرف جا رہا تھا تو تیمور نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ مغلوں کی چال بازیوں سے ہوشیار رہنا۔ ان کا سامنا ہو جائے تو مقابلے میں پہل کبھی نہ کرنا۔ جنگ سے پہلے مغلوں کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنا اور ان کے کمک کے راستوں کو پہلے سے بند کر دینا۔

امیر حسین نے اس کی کسی بات پر کان نہ دھرا تھا اور مغلوں کے ہاتھوں بری طرح پٹ کے پہاڑوں میں منہ چھپاتا پھر رہا تھا۔

تیمور کو امیر حسین کی حماقت پر سخت غصہ آیا لیکن اسے اس کی مدد کو پہنچنا تھا۔ اس نے فوراً روانگی کی تیاری

شروع کر دی۔ پھر ایک صبح اس نے الجائی خاتون کو ہتھیار لانے کو کہا۔ الجائی سمجھ گئی۔۔۔۔ اس کی مسرت کے دن ختم ہو گئے۔ وہ زرہ بکتر اور تلوار لے کر آئی۔ اپنے ہاتھوں سے تیمور کو زرہ پہنائی اور تلوار اس کی کمر سے لگائی۔ تیمور نے الجائی کو بغل میں دبا کر اسے تسلی دی۔ جہانگیر کا منہ چوما اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

الجائی جدائی کے تصور سے لرز رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئی تھیں۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا:

"میرے سرتاج۔ خدا تمہارا حافظ و ناصر۔۔۔۔"

خدا کو حافظ و ناصر بنا کر تیمور کو رخصت کرنا الجائی خاتون کی زندگی کا دستور بن گیا تھا۔ تیمور کو رخصت کرتے وقت الجائی کا کلیجہ شق ہو جاتا کیونکہ جن حالات سے تیمور گزر رہا تھا اس کے پیشِ نظر دوسری ملاقات کی مشکل ہی سے امید کی جا سکتی تھی۔

تیمور اپنی وفادار اور عالی ہمت بیوی کو ساتھ ہی رکھنا چاہتا تھا لیکن جہانگیر کی وجہ سے وہ اسے ہمیشہ پیچھے چھوڑ جاتا تھا۔ جہانگیر اس کا واحد سہارا اور مستقبل کا روشن ستارا تھا۔

کرم سیر سے روانہ ہوتے وقت اس کے ساتھ سواروں کا ایک مختصر دستہ تھا۔ جنگ پیشہ اور جنگ فطرت تاتاری نچلا بیٹھنا نہیں جانتے تھے۔ اسی لیے جب امیر حسین نے شمال پر حملے کا فیصلہ کیا تو تیمور کے بہت سے ساتھی بھی قسمت آزمائی کے لیے امیر حسین کے ساتھ شمال کی طرف چلے گئے۔

تیمور کوہستانِ بلخ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسے ایک جگہ فوج ٹھہری ہوئی دکھائی دی۔ اس نے جاسوس بھیج کر پتا لگایا تو معلوم ہوا کہ فرانچی نامی ایک تاتاری سردار جو مغلوں کا ملازم تھا، ان سے ناراض ہو کر مع اپنے دستے کے ٹھہرا ہوا ہے اور اسے سردار تیمور کی تلاش ہے۔

اس خبر پر تیمور سجدۂ شکر بجا لایا۔ اور فرانچی کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ فرانچی حاضر ہو کر تعظیم بجا لایا اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ تیمور نے خوش ہو کر فرانچی کے سر پر اپنا رومال رکھ دیا۔ تاتاریوں میں اس طرح اپنے ماتحتوں کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔

فرانچی کے سواروں کے شامل ہو جانے سے تیمور کے لشکریوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ تیمور وہاں سے زوارسف کی طرف بڑھا۔ اس نے رات درہ کے باہر گزاری۔ صبح کو نماز سے فارغ ہو کر اس نے دستِ دعا بلند کیے۔ بارگاہِ الٰہی میں اس کی دعا اسی وقت قبول ہو گئی۔

دعا سے فارغ ہوا تو چٹان کی دوسری طرف سے ایک فوج گزرتی دکھائی دی۔ تیمور فوراً گھوڑا منگا کر سوار ہوا اور خود دریافت حال کے لیے اس کی طرف چلا۔ قریب پہنچ کے اس نے سواروں کو گنا تو وہ تعداد میں تیرہ تھے اور تین دستوں میں تقسیم تھے۔ فوج ایک سوار کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر رک گئی۔ ابھی سورج نہ نکلا تھا اور صبح کی ملگجی روشنی پھیل رہی تھی۔

"کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو اور کدھر جانا چاہتے ہو؟" تیمور نے کڑک دار آواز میں للکارا۔

پہلے تو وہ اس تنہا مگر بارعب سوار کو گھورتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے ذرا آگے آ کر کہا:

"ہم شہر سبز کے سردار تیمور کے سوار ہیں۔ انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ گرم سیر سے اس وادی کی طرف آئے ہیں۔"

تیمور نے اپنا نام سن کر انہیں غور سے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے بارے میں صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔ اس نے مزید اطمینان کے لیے کہا:

"سردار تیمور اسی وادی میں موجود ہیں۔ وہ میرے بھی آقا ہیں۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں ان کے پاس لے جا سکتا ہوں۔"

اس آدمی نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں سے پوچھا:

"کیا خیال ہے۔ اس رہبر کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے؟"

تیمور نے ذرا گھوڑا بڑھایا۔ اس نے قریب پہنچ کے ایک بار پھر انہیں شناخت کرنے کی کوشش کی۔ تیمور تو انہیں نہ پہچان سکا۔ لیکن ان لوگوں نے اسے پہچان لیا۔

"امیر تیمور..... یہ آپ ہیں۔"

ان کی زبان سے نکلا اور تینوں دستوں کے سردار گھوڑوں سے کود کے تیمور کے گھوڑے کے پاس آئے اور اس کی رکاب کو بوسہ دیا۔ یہ طریقہ اظہار اطاعت کا تھا۔

تیمور بھی گھوڑے سے اتر آیا اور ان سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔ یہ تمام سوار قبیلہ برلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ تیمور کو ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ وہ انہیں ساتھ لے کر اپنے خیمے پر آیا۔ اپنے آدمیوں سے ان کا تعارف کرایا اور ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔

دعوت کے بعد تیمور نے ان نو وارد سرداروں کو تحائف دیے۔

پہلے دستے کا سردار تغلق خواجہ برلاس تھا۔ تیمور نے اسے اپنا خود تحفے میں دیا۔

دوسرے دستے کا امیر سیف الدین تھا جسے تیمور نے اپنی کمر کا پٹکا پیش کیا۔

تیسرا سردار امیر تو بک بہادر تھا جس نے تحفے میں تیمور کی زرہ پائی۔

تیمور جس وقت شمال کی طرف چلا تھا تو اس کی طبیعت بہت مکدر تھی۔ ایک تو اس کی طویل بیماری نے اسے لی سیاست اور جدوجہد سے دور رکھا تھا۔ دوسرے امیر حسین نے جلد بازی سے کام لے کر اپنی فوج کو تباہ کر یا تھا۔ اس کا ایک بڑا سہارا ٹوٹ گیا تھا لیکن یہ سفر اس کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سے غیبی مدد مل رہی ہے۔ وہ جس منزل پر قیام کرتا نئے اور پرانے دوست آ آ کر اس سے ملتے جلتے۔ ان میں یسے لوگ تھے جو مغلوں کی حکومت سے بددل ہو کر پناہ گزین ہو گئے تھے۔ بعض وہ تاتاری سردار بھی اس سے آ ملے جو اب تک کسی نہ کسی جگہ مغلوں کی ملازمت کر رہے تھے مگر ان کے جور و ستم سے نالاں تھے اور غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے لیے موقعے کی تلاش میں تھے۔ انہیں ایک مضبوط مرکز اور ایک اعلیٰ صلاحیتوں کے سردار کی تلاش تھی۔ یہ صلاحیت نہیں صرف تیمور میں نظر آئی تھی اور اب وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اس تک آ پہنچے تھے۔

جس دن خواجہ برلاس، امیر سیف الدین اور تو بک بہادر اس کے پاس پہنچے، اسی شام تیمور کا ایک پرانا دوست شیر بہرام بھی اسے ڈھونڈتا ہوا اس کے لشکر میں پہنچ گیا۔ شیر بہرام، تیمور کی جوانی کا دوست تھا اور اس زمانے میں یہ دونوں ترقی کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ شیر بہرام کی طبیعت میں بڑا منچلا پن تھا اسے تیمور کی سنجیدگی اور دھیما پن پسند نہ تھا اس لیے وہ تقدیر آزمائی کے لیے ہندوستان چلا گیا تھا۔ وہاں اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو پھر واپس آ گیا۔

کابل کے اطراف میں اسے معلوم ہوا کہ تیمور گرم سیر کے علاقے میں خیمے ڈالے پڑا ہے۔ شیر بہرام گرم سیر پہنچا مگر تیمور وہاں سے روانہ ہو چکا تھا اس لیے اس نے بھی شمال کا رخ کیا۔

شیر بہرام ایک رات ایک ویرانے میں ٹھہرا ہوا تھا کہ اسے ایک سوار آتا ہوا دکھائی دیا۔ شیر بہرام کو اس پر مغل سوار کا دھوکا ہوا۔ اس نے چاہا کہ اس پر حملہ کر کے اسے ختم کر دے۔ وہ ایک طرف چھپ کے کھڑا ہو گیا۔ سوار قریب پہنچا تو ایک گھوڑے کو پیڑ کی شاخ سے بندھا دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔

چاندنی رات تھی۔ سوار نے دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ کوئی نظر نہ آیا تو آواز دی:

"بھائی! میں مسافر ہوں۔ راستہ بھول کے ادھر آ گیا ہوں۔ تم پسند کرو گے تو رات تمہارے ساتھ بسر کروں گا

ورنہ کسی طرف نکل جاؤں گا۔"

شبیر بہرام نے اس کے چہرے مہرے اور زبان سے اندازہ لگایا کہ وہ مغل نہیں ہے۔ وہ آڑ سے نکل کے اس کے سامنے آگیا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آنے والے کا مسلک کیا ہے، مذہب کیا ہے، اس نے زور سے کہا:

"السلام علیکم!"

آنے والے نے "وعلیکم السلام" کہہ کر اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت پیش کیا اور بولا:

"الحمدللہ۔ میں مسلمان ہوں اور اپنے مسلمان بھائی سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

شبیر بہرام بھی اس سے بڑی خوش دلی اور خلوص سے ملا۔ دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ ایک کے پاس صرف پھل تھے دوسرے کی تھیلی میں شہد لگی روٹیاں تھیں۔ کھانا کھا کے دونوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن دونوں نے اب تک ایک دوسرے کا نام یا اس صحرانوردی کا سبب نہ پوچھا تھا۔ وہ بے تکلف ہو جانے کے باوجود ایک دوسرے سے خائف تھے اور دوسرے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے۔ دونوں بڑی دیر تک موسم اور تکلیف دہ سفر کے بارے میں گفتگو کرتے رہے لیکن ایک دوسرے کا نام نہ پوچھ سکے۔

"تم کس طرف جانا چاہتے ہو سوار؟" آخر شبیر بہرام نے اصل مطلب کی طرف قدم بڑھایا۔

"گرم سیر جانے کا ارادہ ہے لیکن راستہ بھول گیا ہوں۔۔۔۔"

آنے والے نے جواب دیا اور ساتھ ہی سوال کر بیٹھا:

"اور تم کس طرف جا رہے ہو دوست؟"

شبیر بہرام کے کان گرم سیر کے نام پر پہلے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے اطمینان سے کہا:

"میں وہاں سے آ رہا ہوں جہاں تم جانا چاہتے ہو۔"

وہ دونوں برابر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شبیر بہرام کا جواب سن کر آنے والا چونک کر بیٹھ گیا:

"تم گرم سیر سے آ رہے ہو دوست؟"

"ہاں۔۔۔۔"

"تم نے دریائے ہلمند کے قریب کوئی لشکر دیکھا تھا؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم شہر سبز کے سردار تیمور کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے ہو؟" شبیر بہرام نے بالآخر کھل کر اس سے بات کر ڈالی۔

"ہاں دوست۔۔۔"

آنے والے نے ایک آہ بھری:

"ہم ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ میری بیوی پناہ حاصل کرنے کے لیے گرم سیر پہنچ چکی ہے میں بھی سردار تیمور کے پاس جا رہا ہوں۔"

شبیر بہرام بھی بیٹھ گیا۔ بولا:

"تو پھر ہم دونوں دوست ہیں کیونکہ ہم دونوں ایک ہی شخص کو ڈھونڈ رہے ہیں۔" دونوں اٹھ کے بڑے پیار سے بغل گیر ہو گئے۔

"میرا نام شبیر بہرام ہے۔"

شبیر بہرام نے اپنا تعارف کرایا:

"تیمور میرے جوانی کے دوست ہیں۔ میں ان سے خفا ہو کے ہندوستان چلا گیا تھا۔ واپس آ کے انہیں گرم سیر میں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بڑی تیزی سے اور تیاری کے ساتھ شمال کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔"

"تو کیا سردار تیمور گرم سیر میں نہیں ہیں؟"

آنے والے نے گھبرا کے سوال کیا۔ حالانکہ شبیر بہرام اسے بتا چکا تھا کہ تیمور شمال کی طرف روانہ ہو چکا ہے آنے والا اور راستہ بھولنے والا یہ سوار طغر تھا جو دلشاد آغا کے حکم کے بموجب گرم سیر جا رہا تھا جہاں اس کی بیوی غلفورا پہلے ہی جا چکی تھی۔

"معاف کرنا شبیر بہرام۔"

طغر نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"دراصل میں اس خبر سے پریشان ہو گیا تھا۔ میرا نام طغر ہے اور مجھے سردار تیمور کے سالے کی بیوی دلشاد آغا خاتون ملکہ کابل نے گرم سیر کی طرف بھیجا ہے۔"

"کیا تیمور نے شادی کر لی؟"

شبیر بہرام کے لیے یہ نئی خبر تھی۔ اسے تیمور کو چھوڑے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا اور اس کے تصور میں تیمور اب تک ایک اکھڑ جوان تھا۔ لڑنے بھڑنے میں بہت تیز لیکن گفتگو میں سنجیدہ متین چہرے والا جس کے لبوں پر مسکراہٹ مشکل سے ہی آتی تھی۔

"ہاں شیر بہرام..." طغر نے کہا۔

"مجھے ملکہ دلشاد نے بتایا تھا کہ تیمور کے ایک بیٹا بھی ہے"۔

شیر بہرام کچھ دیر سوچتا رہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ سابق والیِ کابل امیر حسین، تیمور کا سالا ہے"۔ اس نے دل ہی دل میں رشتے کا حساب لگاتے ہوئے کہا۔

شیر بہرام اور طغر بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ طغر نے اپنے بارے میں صرف موٹی موٹی باتیں بتائیں۔ اس نے شیر بہرام کو یہ نہیں بتایا کہ امیر حسین کے معتمد سردار امیر موسیٰ نے اس کے علاقہ پر قبضہ کر کے اسے دربدر پھرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ان دونوں کو سردار تیمور کی تلاش تھی اس لیے دونوں ساتھ ہو گئے۔ طغر نے گرم سیر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور صبح کو شیر بہرام کے ساتھ تیمور کو ڈھونڈنے چل پڑا۔

○

تیمور اپنے پرانے دوست شیر بہرام سے مل کر بہت خوش ہوا۔ شیر بہرام اس سے شرمندہ تھا لیکن تیمور نے اس سے کوئی شکوہ نہ کیا بلکہ بڑی محبت سے ملا۔ اور اس سے دیر تک ہندوستان کے حالات پوچھتا رہا۔

تیمور نے دوپہر میں تین تاتاری سرداروں کی آمد پر ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ رات کو شیر بہرام کی آمد کی خوشی میں دوسری ضیافت کا اعلان کیا گیا۔

طغر، شیر بہرام کے ساتھ ہی تیمور کے سامنے پیش ہوا تھا لیکن تیمور نے اس پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ شیر بہرام سے گفتگو میں وہ اس قدر منہمک رہا کہ کسی اور طرف توجہ دے ہی نہ سکا۔ طغر نے بھی صرف سلام کرنے پر اکتفا کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا مسیحا اور خضر کی ملاقات سے کم نہیں ہوتا ہے۔ اس نے دونوں کی گفتگو میں نہ تو دخل دیا اور نہ اپنا حالِ دل بیان کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ ملفوظات کے بارے میں پوچھنے کے لیے بہت بے چین تھا۔ تیمور کی طرح شیر بہرام بھی طغر کو بالکل بھولا رہا۔

تیمور کا دربار برخاست ہوا۔ اس نے اپنے دوست کو اپنے خاص دستے میں شامل کر لیا اور اس کے لیے

الگ خیمہ لگانے کا حکم دیا۔

شیر بہرام دربار سے اٹھ کر چلا تو اسے ایک دم طغر کا خیال آیا جو سر جھکائے اس کے پیچھے خاموشی سے چلا آ رہا تھا۔

"طغر..."

شیر بہرام نے رک کر کہا:

"یار تو بھی عجیب آدمی ہے۔ تیمور سے ملنے کے لیے تو اتنا بے چین تھا لیکن دربار میں خاموش بیٹھا رہا۔ اپنے بارے میں سردار کو بتایا ہوتا۔ بیوی کے بارے میں کچھ پوچھا ہوتا"۔

"بہرام دوست..."

طغر افسردگی سے بولا:

"تم اور سردار تیمور پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ میں نے دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ پھر تم تو سردار کے یارِ غار ہو اور میں ٹھہرا ایک معمولی آدمی..."

"اچھا چل میرے ساتھ..."

شیر بہرام نے مڑتے ہوئے کہا:

"میں تجھے سردار کے پاس پیش کروں گا۔ تو معمولی آدمی نہیں۔ میرا دوست ہے۔ تیری اہمیت یہ بھی ہے کہ تو سردار تیمور کی سراج کا فرستادہ ہے۔ تیری بات تو وہ غور سے سنے گا"۔

"اس وقت نہیں دوست"

طغر نے اسے روکتے ہوئے کہا:

"دربار برخاست ہو چکا ہے۔ رات کے کھانے پر اگر موقع ملا تو میں سردار سے بات کروں گا"۔

"موقع ووقع چھوڑ یار..."

شیر بہرام نے بے تکلفی سے کہا:

"رات کو میں خود تجھے سردار سے ملاؤں گا اور اگر تجھے سردار سے کوئی کام ہے تو وہ بھی پورا ہو گا۔ آخر میں تیرا دوست ہوں۔ میں تیرے کام نہ آؤں گا تو اور کون آئے گا"۔

شیر بہرام، طغر کو اپنے ساتھ ہی اس خیمے میں لے گیا جو اس کے لیے لگایا گیا تھا۔ رات کھانے پر جانے

سے پہلے طغر نے شیر بہرام کو اعتماد میں لینے کے لیے کہا:

"شیر بہرام۔ کیا میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں؟"

شیر بہرام نے اسے تعجب سے دیکھا:

"طغر، میں تاتاری ہوں۔ تاتاری جسے دوست کہہ دیتے ہیں اس کا زندگی بھر ساتھ دیتے ہیں۔ اگر تمہارے دل میں کوئی راز ہے تو اسے بیان کرو میں تمہیں اپنے پورے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔"

طغر کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ اسے اس وقت سہارے اور مشورے کی ضرورت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تیمور سے امیر موسیٰ کی شکایت کرے یا نہ کرے۔ امیر موسیٰ کے بارے میں اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ شاہ کابل امیر حسین کا سب سے زیادہ اعتماد کا آدمی تھا اور یہی چیز اسے شکایت کرنے سے روک رہی تھی۔

طغر نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اگر ذہن پر بوجھ ہو تو اسے دیاروں سے کہہ کر بھی ہلکا کیا جا سکتا ہے۔ شیر بہرام تو تاتاری تھا اور اپنے تعاون کا یقین بھی دلا رہا تھا۔

یہ باتیں سوچنے کے بعد طغر نے اپنی پوری داستان بے کم و کاست شیر بہرام کے سامنے اگل دی۔ شیر بہرام بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

طغر اپنی طبیعت کا بوجھ ہلکا کر چکا تو یہ بوجھ اب اس کے دوست شیر بہرام پر پڑ گیا۔ سچ ہے ایک سچا دوست ہی اپنے دوست کا غم خوار ہوتا ہے۔

شیر بہرام نے غور کرنے کے بعد مشورہ دیا:

"طغر، پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ تمہاری بیوی اس لشکر کے ساتھ موجود ہے کہ نہیں۔ اگر وہ سردار کے پاس پہنچ چکی ہے تو اس نے امیر موسیٰ کے بارے میں ضرور بتایا ہوگا۔ اس لیے فی الحال تمہیں خاموشی اختیار کرنا چاہیے۔ تم خود کہتے ہو کہ امیر موسیٰ شاہِ کابل کا دستِ راست ہے۔ یہ بات تیمور کے علم میں بھی ہوگی۔ ممکن ہے کہ تیمور اس وقت تمہاری بات پر دھیان نہ دے۔"

شیر بہرام کی بات طغر کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے سوچا کہ امیر موسیٰ کے مقابلے میں اس کی کیا وقعت ہے۔

"تمہاری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے شیر بہرام!"

طغر نے کہا:

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ملکہ کابل اور امیر موسیٰ میں صلح ہو گئی ہو۔ اگر ان دونوں نے ملاقات کے وقت مجھے

جھٹلا دیا تو میں کیا کروں گا۔ کہاں سے ثبوت ڈھونڈتا پھروں گا۔ میری گواہی کون دے گا۔"

"یہی سب سوچ کے تو میں تمہیں انتظار کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

شیر بہرام نے کہا:

"جہاں تک تمہاری حفاظت کا تعلق ہے اس کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔ امیر موسیٰ کیا اس کا باپ بھی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

⊙

رات کے کھانے پر شیر بہرام طغر کو اپنے ساتھ لے گیا۔ حالانکہ اس ضیافت میں تیمور نے صرف اپنے چیدہ چیدہ سرداروں کو بلایا تھا۔

شیر بہرام نے باتوں باتوں میں تیمور سے اس کی بیوی بچے کی خیریت پوچھی۔ تیمور نے اسے بتایا کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کو احتیاطاً دو چار منزل پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

یہ بات طغر نے بھی سن لی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی بیوی اب تک تیمور کے پاس نہیں پہنچ سکی تھی۔ ایک یہ بھی امکان تھا کہ غلغورا اگر مسیرا اس وقت پہنچی ہو جب تیمور وہاں سے روانہ ہو چکا۔ بہرحال یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ سردار تیمور کو امیر موسیٰ کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

رخصت ہوتے وقت شیر بہرام نے خود ہی طغر کا تیمور سے تعارف کرایا:

"اے شہرِ سبز کے عالی نسب سردار۔ یہ میرا ترک دوست طغر ہے۔ کچھ لوگ اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی پناہ میں آنا چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

تیمور نے کہا:

"اسے ہمارے ترک دستوں میں شامل کرا دو۔"

"سردار تیمور۔۔۔۔"

شیر بہرام نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ "میرا دوست طغر اس علاقے سے آیا ہے جہاں اس وقت

امیر حسین کے لشکر کے شکست خوردہ سپاہی مقیم ہیں"۔

"اچھا، تم وہاں سے آ رہے ہو"۔

تیمور نے براہِ راست طغرل سے سوال کیا:

"امیر حسین کیسا ہے۔ اس کی بیوی اور سپہ سالار سب خیریت سے تو ہیں نا۔۔۔؟"

شیر بہرام نے طغرل کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود جلدی سے بول پڑا:

"دلشاد آغا اور امیر موسیٰ خیریت سے ہیں۔ امیر حسین اب تک وہاں نہیں پہنچ سکے۔ امیر موسیٰ کے آدمی انہیں تلاش کر رہے ہیں"۔

"بے وقوف امیر حسین!"

سردار تیمور نے زور سے ہنکارا بھرا:

"اس کی جلد بازی بنا بنایا کام بگاڑ دیتی ہے"۔

پھر تیمور نے شیر بہرام کو حکم دیا:

"تم اپنے دوست کو رکھو۔ یہاں سے قلعہ الاجو قریب ہے۔ اس کی فتح کے بعد ہم اس کی رہبری میں دلشاد آغا کے پاس پہنچیں گے"۔

پھر سردار تیمور اور شیر بہرام دیر تک قلعہ الاجو کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ گفتگو کے دوران جب تیمور نے بتایا کہ قلعہ الاجو مغلوں کے قبضے میں ہے اور مغل بادشاہ الیاس خواجہ کی طرف سے اس وقت الاجو کا حاکم منگلی بوغا ہے تو شیر بہرام چونک پڑا۔

منگلی بوغا کسی زمانے میں شیر بہرام کا بڑا گہرا دوست تھا۔

"سردار تیمور، منگلی تو میرا پرانا دوست ہے"۔

شیر بہرام نے مسرت سے کہا:

"اگر اجازت ہو تو میں منگلی سے ملنے جاؤں۔ ممکن ہے وہ بغیر لڑائی کے قلعہ ہمارے حوالے کر دے"۔

"اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے شیر بہرام"۔

تیمور خوش ہو کے بولا:

"تم اس سے ملنے جاؤ۔ ہم تمہاری واپسی کا انتظار کریں گے۔ سیدھی انگلیوں سے گھی نکل آئے تو انگلیاں ٹیڑھی

کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔

دوسرے دن صبح کو شیر بہرام قلعہ الاجو کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھ طغرل کو بھی لیتا گیا۔

منگلی بوغا کو تیمور کے لشکر کی پیش قدمی کی خبر مل چکی تھی اور وہ قلعے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں مصروف تھا۔ اس نے قلعہ میں فوج کی تعداد بڑھا لی تھی اور تمام حفاظتی انتظامات کر لیے تھے۔ اس دوران شیر بہرام اور طغرل نیزوں پر سفید پھریرا اڑاتے ہوئے قلعہ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ سفید پرچم کو دیکھ کر معمولی پوچھ گچھ کے بعد ان کو اندر آنے کی اجازت دیدی گئی۔

پہرے داروں نے فوراً منگلی بوغا کو خبر بھجوائی کہ شیر بہرام نام کا ایک سوار ملاقات کا خواہش مند ہے۔ منگلی بوغا اپنے پرانے دوست کا نام اور آنے کی خبر سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے محل سے نکل کر اس کا استقبال کیا۔

منگلی بوغا ایک بہادر اور عالی ہمت سردار تھا۔ اس نے مغلوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ مغل بادشاہ الیاس خواجہ نے بھی اسے خوب نوازا تھا اور اسے دوسرے تاتاری سرداروں سے زیادہ مراعات دے رکھی تھیں۔ منگلی بوغا بہت ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا۔

کھانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر شیر بہرام نے مطلب کی بات شروع کی۔ بولا:

"یار تمہاری شان و شوکت دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔۔۔۔۔ یہ سب تمہیں مغلوں کی مہربانی سے حاصل ہوا ہے لیکن مغل قابلِ اعتماد نہیں۔ کسی وقت بھی وہ تمہارے خلاف ہو سکتے ہیں"۔

"مغلوں نے مجھے بھیک نہیں دی"۔

منگلی بوغا چڑ کر بولا:

"میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی بہادری کے زور پہ حاصل کیا ہے۔ مغل لاکھ برے سہی لیکن وہ بہادری اور وفاداری کا صلہ ضرور دیتے ہیں"۔

"یہ تمہارا خیال ہے بوغا"۔

شیر بہرام نے نرمی سے جواب دیا:

"اگر یہ صحیح بھی ہے تو اب مغلوں کا دور ختم ہو رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کے خاتمے کے ساتھ تمہارا وقار بھی ختم ہو جائے۔ تمہیں اپنے تاتاری بھائیوں کا ساتھ دینا چاہیے"۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو شیر بہرام؟" منگلی بوغا الجھتے ہوئے بولا۔ "تم سردار تیمور کی سفارش لے کر

تو نہیں آئے ہو؟"

"سفارش نہیں، میں سردار تیمور کا پیغام لایا ہوں۔"

شیر بہرام نے اور زیادہ نرمی کا اظہار کیا:

"سردار تیمور نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مغلوں کو ملک تاتار سے نکالنے میں تم ان کا ساتھ دو۔ وہ تمہیں تمہارے مرتبہ کے مطابق جاگیر دیں گے۔ جو علاقہ تم پسند کرو گے اس کا حاکم بنا دیں گے۔"

"نہیں شیر بہرام۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

منگلی بوغا نے صاف انکار کر دیا:

"میں الیاس خواجہ کا وفادار ہوں۔ یہ بات مردانگی کے خلاف ہے کہ میں قلعہ الاجو، تیمور کے حوالے کر دوں۔"

شیر بہرام کو اس کے دو ٹوک جواب پر غصہ آ گیا بولا:

"اچھے دوست بڑی مشکل سے ملتے ہیں منگلی، تیمور کی دوستی سے فائدہ اٹھاؤ۔ مخالفت تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔"

"ہرگز نہیں شیر بہرام۔ میں قلعہ، تیمور کے حوالے نہیں کر سکتا۔"

منگلی بوغا نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔

"قلعہ تو خیر تمہیں دینا ہو گا۔ تم تیمور کی طاقت سے واقف نہیں۔" شیر بہرام نے اسے ایک بار پھر مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

"دیکھا جائے گا۔ میں نے بھی تیاری کر لی ہے۔" منگلی بوغا ویسے ہی اکڑا رہا۔

"جنگ سے باز آ جاؤ بوغا۔"

شیر بہرام نے اٹھتے ہوئے کہا:

"میں جا رہا ہوں۔ تم میرے دوست ہو اس لیے صلح کے دروازے اس وقت تک کھلے رہیں گے جب تک تیمور کا لشکر الاجو کے دروازے تک نہیں پہنچ جاتا۔"

"شیر بہرام۔ تم چاہو تو دوست بن کر قلعہ میں رہ سکتے ہو۔" منگلی بوغا نے بات کا رخ ہی موڑ دیا۔

"تمہارا جواب مل گیا مجھے۔"

شیر بہرام نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا:

"اگلی ملاقات میدانِ جنگ میں ہو گی۔"

منگلی بوغا نے اسے نہیں روکا۔

شیر بہرام اس تلخ و ترش گفتگو کے بعد واپس چل پڑا۔ اس کی سفارت ناکام ہو گئی تھی اب سوائے جنگ کے دوسرا چارہ نہ رہ گیا تھا۔

اس نے واپس جا کر تیمور کو منگلی بوغا کے جواب سے آگاہ کر دیا۔ تیمور نے اسی وقت قلعہ الاجو کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ اور پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ پھر اس مضبوط اور بظاہر ناقابلِ تسخیر قلعہ کو سر کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

قلعہ واقعی ناقابلِ تسخیر دکھائی دیتا تھا لیکن تیمور نے تو پہاڑوں سے ٹکرانے کا عزم باندھا تھا۔ یہ تو قلعہ تھا۔ محض ایک قلعہ!

○

امیر حسین اپنی بیوی دلشاد آغا اور امیر موسیٰ کے پاس پہنچا تو اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اس کے کپڑے تار تار اور پھٹے ہوئے تھے۔ چہرے سے برسوں کا بیمار معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ صرف پانچ سوار تھے۔ ان کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔

برخلاف اس کے امیر موسیٰ نے کافی طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس کے زیرِ کمان تین سو سے زیادہ سوار آ چکے تھے۔ مال و دولت بھی اس نے کافی اکٹھی کر لی تھی۔ اس نے اپنے طور پر دلشاد آغا سے مصالحت کر لی تھی۔

امیر موسیٰ کو معلوم ہو گیا تھا کہ دلشاد نے طغراور غلفورا کو آزاد کر کے فرار کرا دیا ہے۔ اسے ان کی زیادہ پروا نہ تھی۔ وہ دلشاد سے شرمندہ تھا اور اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا اس لیے طغراور غلفورا کے بارے میں اس کا سوال نہ کیا۔ اس نے دلشاد کی تمام شاہانہ مراعات بھی بحال کر دی تھیں۔ وہ روز صبح، دلشاد کے سلام اور اس کی خیریت دریافت کرنے حاضر ہوتا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ تمام رات شراب و شباب کی محفلیں سجایا کرتا اور ادھم

مچاتا رہتا تھا۔

امیر موسیٰ کے معمولات میں یہی فرق پڑ گیا تھا کہ اس کے اہلِ خانہ بھی اس کے پاس پہنچ گئے تھے اس کے بڑے بیٹے کی آمد سے موسیٰ کے رویے میں کافی فرق پڑ گیا اور اس نے میانہ روی اختیار کر لی۔ پھر ایک دن امیر حسین اچانک ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ خلافِ امید امیر موسیٰ نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اپنے تمام سواروں کے ساتھ اس کی پیشوائی کی۔

امیر حسین اپنے معتمد کے اس حسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوا۔ پریشانی اور صحرا نوردی کے ان دنوں میں تو اس کا سایہ بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ دلشاد بھی امیر موسیٰ کے خلاف ہونے کے باوجود اس وقت اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئی۔

امیر موسیٰ نے امیر حسین کی آمد پر شاہانہ ضیافت کا اہتمام کیا۔ امیر حسین نے کھانے کے دوران امیر موسیٰ سے کہا:

"موسیٰ! تمہارے سلسلے میں میرا انتخاب درست تھا۔ تم نے وفاداری کی مثال قائم کی ہے۔ حالات درست ہوتے ہی میں تمہیں اعلیٰ مراتب سے نوازوں گا۔"

موسیٰ کن انکھیوں سے دلشاد کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید دلشاد اس کی مخالفت اور شکایت کرے گی۔۔۔ لیکن وہ ایک سمجھ دار عورت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت موسیٰ کی شکایت کا امیر حسین پر کوئی اثر نہ ہو گا۔ پھر امیر موسیٰ کے ہاتھ میں طاقت تھی۔ اس کی مخالفت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

دلشاد کو خاموش دیکھ کر موسیٰ نے کہا:

"میں امیر اور ملکہ عالیہ کا ہمیشہ غلام رہا ہوں اور عمر بھر اس غلامی پر فخر کرتا رہوں گا۔ میں انسان ہوں۔ مجھ سے غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ خوشی کے اس موقعے پر میں چاہتا ہوں کہ امیر یا ملکہ کے حضور میں مجھ سے جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئی ہیں انہیں معاف کر دیا جائے۔"

"کیا کہہ رہے ہو موسیٰ؟" امیر حسین جلدی سے بولا۔ "تمہاری وفاداری پہ کون شبہ کر سکتا ہے۔ ہم تو تمہارے شکر گزار ہیں۔ تم نے ہماری عدم موجودگی میں ملکہ دلشاد کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔"

پھر اس نے دلشاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"کیوں دلشاد کیا میں غلط کہہ رہا ہوں"۔

مصلحت نے دلشاد کے منہ پر تالے لگا دیے تھے۔ خون کے گھونٹ پیتی ہوئی بولی:

"امیر۔ تمہاری عدم موجودگی نے جو کردار ادا کیا۔ وہ۔۔۔۔۔"

دلشاد نے ایک لمحہ رک کر موسیٰ کی طرف دیکھا۔ موسیٰ کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور خوف سے شاید اسے پسینہ آ گیا تھا۔ دلشاد مسکرائی۔ بولی:

"امیر موسیٰ کا رویہ میرے ساتھ واقعی قابلِ تعریف رہا"

"دیکھا موسیٰ تم نے۔۔۔" امیر حسین خوش ہو کے بولا: "ہم ہی نہیں، دلشاد بھی تمہاری تعریف کر رہی ہے"۔

دلشاد تو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ موسیٰ کی اسی وقت گردن اڑا دیتی مگر وہ مجبور تھی۔ کچھ نہ کر سکی۔ شکایت کے بجائے اسے موسیٰ کی تعریف کرنا پڑی۔

کچھ دن آرام کرنے کے بعد امیر حسین ایک بار پھر نئے جوش اور ولولے کے ساتھ لشکر لے کر چلا۔ اسے تیمور کی فتوحات کی مسلسل خبریں مل رہی تھیں۔ وہ ان میں اپنا حصہ بٹانا چاہتا تھا۔

اسے معلوم ہوا کہ تیمور قلعہ الاجو کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ اس نے ادھر ہی کا رخ کیا۔ اس کے ساتھ چار سو سے کچھ ہی کم سوار تھے لیکن وہ تیمور کے ساتھ جنگ میں شریک ہو کر مالِ غنیمت کا حصہ دار بننا چاہتا تھا۔

○

تیمور نے قلعہ الاجو کے محاصرے کو زیادہ طول نہ دیا۔ منگلی بوغا نے قلعہ بچانے کی بہت کوشش کی لیکن تیمور نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ تیمور کو قلعہ سے کئی ایسے سوار مل گئے جو کبھی اس کے ملازم رہ چکے تھے۔ تیمور وہاں سے تازہ صوف پہنچا۔ اس جگہ اسے دو اور حلیف مل گئے۔ اطلس خان اور تمو کہ بہادر اپنے چار سو سواروں کے ساتھ اس سے آن ملے۔

غرض یہ کہ تیمور آگے بڑھتا رہا اور نئے نئے دوست و حلیف اسے ملتے گئے۔ تاتاری سردار اور سوار مغلوں کے ظلم و ستم سے عاجز آ کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ بعض سرداروں نے مغلوں کی غلامی کا جوا عارضی

طور پر آتار پھینکا۔

تیمور کو اپنے دو پرانے سواروں پر زیادہ اعتماد تھا۔ ایک ضعیف العمر جاکو برلاس، جس کی نظروں میں تیمور کا درجہ ایک رہبر اور ولی سے کم نہ تھا۔ دوسرا ایلچی بہادر۔ کامدار جوتے اور رنگین کپڑے پہننے والا۔ وہ شروع سے اب تک تیمور کا ساتھ دے رہا تھا اور اہم موقعوں پر بہادری اور وفاداری کا ثبوت دے چکا تھا۔ اب تیمور کو دو اور با اعتماد سوار مل گئے تھے۔ ایک شیر بہرام، اس کا پرانا یار جس نے جان پر کھیل کر قلعہ الاجو کے حاکم منگلی بوغا کے سامنے نہ صرف تیمور کی تعریف کی تھی بلکہ اسے ڈرایا اور دھمکایا بھی تھا۔ دوسرا سوار ترک جوان طغر تھا جس نے قلعہ الاجو کے محاصرہ اور فتح کے دوران تیمور کے دل پر اپنی بہادری کا سکہ بٹھا دیا تھا۔

تیمور اکثر شیر بہرام سے طغر کی تعریف کرتا۔ وہ طغر کو کوئی اہم ذمے داری سونپنے یا اعزاز دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس عرصہ میں امیر سلیمان برلاس اور امیر ہندو کا کہ برلاس بھی ایک ہزار کا لشکر لے کر تیمور کے پاس پہنچ گئے تھے۔

تیمور کو اب اتنی طاقت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ مغل لشکر سے براہ راست مقابلہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ جب الیاس خواجہ نے ایک بڑا لشکر تیمور کے مقابلے پر روانہ کیا تو تیمور نے اس سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔

مغل لشکر کا سپہ سالار بیک جک کا بھائی الچون بہادر تھا۔ اس نے بڑی شان سے تیمور کے سامنے اپنا لشکر جمایا مگر حملہ کرنے کی اس کو ہمت نہ ہوئی۔

ایک ماہ تک آمنے سامنے ہونے کے باوجود کسی نے حملے کی کوشش نہ کی۔ الچون بہادر نے پسپائی میں اپنی خیریت سمجھی اور خیمے ڈیرے اٹھا کر واپس چلا گیا۔ تیمور کی یہ پہلی فتح تھی۔ مغل لشکر اس کے مقابلے سے جی چرا کر بھاگ گیا تھا۔

تیمور نے فوراً دریائے جیحوں عبور کر کے بدخشاں کا رخ کیا۔ وہ موضع خلم میں خیمہ زن تھا کہ امیر حسین اپنے لشکر کے ساتھ تیمور کو ڈھونڈتا ہوا پہنچ گیا۔

تیمور کی شان اور لشکر کو دیکھ کر امیر حسین کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ دلشاد نے تیمور کے ساتھ اتنا بڑا لشکر دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔ اسے امید بندھی کہ کابل کی چھنی ہوئی سلطنت اسے واپس مل جائے گی۔

تیمور نے بھی دلشاد کو اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ اسے تعجب ہوا کہ دلشاد کی رعنائی اور شادابی میں اب تک

...ی فرق نہ پڑا تھا۔ وہ حسب عادت بلبل کی طرح چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ الجائی خاتون ...ے ساتھ نہیں آئی ہے تو وہ کچھ افسردہ ہو گئی۔

ترک جوان طغر، تیمور کے لشکر میں موجود تھا اور دلشاد کا سامنا کسی نہ کسی موقعے پر ہونا لازمی تھا۔ ایک دن تیمور کے خیمے کی طرف جا رہی تھی کہ اسے طغر نظر آیا۔ طغر کو معلوم تھا کہ دلشاد یہاں آئی ہوئی ہے۔ اس نے دلشاد ...ایک دو بار دور سے دیکھا بھی تھا لیکن وہ خود دلشاد سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ شیر بہرام نے بھی اسے منع کر دیا تھا ...وہ دلشاد سے خود ملنے کی کوشش نہ کرے اور اگر ملاقات ہو جائے تو امیر موسیٰ کے بارے میں اس سے خاموش ...نے کی درخواست کرے۔

"طغر..." دلشاد نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔

طغر نے کترا کر نکل جانا چاہا لیکن دلشاد کی دوسری آواز پر اسے رکنا پڑا۔ وہ پلٹ کر اس کے پاس آیا۔

"ملکہ کابل کو ایک بدنصیب سلام پیش کرتا ہے"۔ طغر نے دکھے دل سے کہا۔

دلشاد کو محسوس ہوا جیسے طغر اپنے احسان کا طعنہ دے رہا ہے۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔ بولی:

"طغر... مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک تمہارے لیے کچھ نہ کر سکی۔ تمہارے احسان کو میں کبھی نہیں ...سکتی۔ میں موقع کے انتظار میں ہوں۔ موسیٰ نے جس احسان فراموشی کا مظاہرہ کیا ہے اسے ایک دن سب کے ...بے نقاب ہونا ہے۔ اسے سزا ضرور ملے گی"۔

"آپ نے شاہِ کابل سے اب تک اس کا ذکر تو نہیں کیا..." طغر نے سر جھکا کر ادب سے پوچھا۔

"نہیں طغر..." دلشاد نے ٹھنڈی سانس لی۔

"شاہِ کابل بڑی بری حالت میں ہمارے پاس پہنچے تھے۔ امیر موسیٰ نے ان کی بہت خاطر مدارات کی۔ ہمارے ...لشکر آیا ہے یہ سب امیر موسیٰ کا ہے۔ ان حالات میں، میں انہیں موسیٰ کا اصلی چہرہ نہیں دکھا سکی لیکن اب مجھ ...ملا نہیں ہوتا۔ تمہیں دیکھ کر میری گردن شرم سے جھکی جاتی ہے"۔

"ملکہ کابل۔ آپ میری فکر نہ کریں"۔ طغر نے کہا:

"میں بہت آرام سے ہوں۔ سردار تیمور بھی مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ قلعہ الاجو کے محاصرے کے دوران میں ...ی بہت خدمت کی ہے۔ اس کے باوجود میں خاموش ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ بھی فی الحال خاموشی ...رہیں۔ سردار تیمور بھی امیر موسیٰ کے بہت مداح ہیں۔ انہیں مزید فتوحات کے لیے موسیٰ جیسے بہادر سرداروں

کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت کوئی جھگڑا نہیں چاہتا"۔

"تم آرام سے ہو۔ یہ سن کر مجھے بڑی مسرت ہوئی"۔ دلشاد بولی۔

"غلفورا کیا تمہارے ساتھ ہے۔ وہ کیسی ہے۔ میں اس سے فوراً ملنا چاہتی ہوں"۔ دلشاد نے کئی سوالات ایک ساتھ کر ڈالے۔

غلفورا کے ذکر پر طغز اور زیادہ اداس ہو گیا۔ افسردگی سے بولا:

"میں اس سے نہیں مل سکا ملکۂ کابل! مجھے نہیں معلوم وہ غریب اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے!"

"کیا غلفورا سردار تیمور کے پاس نہیں پہنچ سکی"۔ دلشاد نے بے تابی سے پوچھا۔

"اس کا بھی مجھے علم نہیں ملکۂ کابل...."۔ طغز نے مضمحل لہجے میں کہا:

"میں گرم سیر پہنچ ہی نہیں سکا۔ سردار تیمور میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہی چل چکے تھے۔ وہ بہت شمال میں پہنچ چکے تھے جب میں ان سے مل سکا"۔

دلشاد کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی:

"دل چھوٹا نہ کرو طغز۔ جس طرح تم امیر تیمور کے پاس پہنچ گئے۔ اسی طرح مجھے امید ہے کہ غلفورا بھی گرم سیر پہنچ گئی ہوگی۔ وہاں تیمور کے اہل خانہ موجود ہیں۔ تیمور کی بیوی الجائی خاتون ایک نہایت نیک سیرت عورت ہے۔ اس نے بڑا دردمند دل پایا ہے۔ خدا کرے غلفورا اس کے پاس پہنچ گئی ہو!"

طغز نے کوئی جواب نہ دیا۔ غلفورا کے تصور نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ دلشاد کی نظریں اس پر تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ طغز، غلفورا کے لیے پریشان ہے مگر وہ اس معاملے میں مجبور تھی۔

"اچھا طغز....." دلشاد نے اسے چونکا دیا۔

"میں غلفورا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔ جس وقت بھی اس کی کوئی خبر ملی میں تمہیں ضرور مطلع کروں گی"۔

دلشاد چلنے لگی پھر رکی اور پلٹ کر بولی:

"فی الحال تم موسلی کا سامنا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر اتفاقیہ ملاقات ہو جائے اور وہ کچھ کہے تو تم جواب نہ دینا۔ خاموشی ہزار بلائیں ٹال دیتی ہے"۔

اسی طرح ایک دن امیر موسلی اور طغز کا سامنا ہو گیا۔

طغز فوراً کترا کے اس طرح نکل گیا جیسے اس نے امیر موسلی کو دیکھا ہی نہ ہو۔ موسلی اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کافی دور جا کر جب طغز نے پلٹ کر دیکھا تو امیر موسلی اسے اسی جگہ کھڑا دکھائی دیا۔ شاید وہ طغز کو یہاں دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن موسلی نہ اس کے پیچھے آیا اور نہ اس نے طغز کو بلانے کی کوشش کی۔

اس کے بعد کئی بار طغز اور موسلی کا سامنا ہوا لیکن دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے سے لاپروا ہو گئے۔

جتہ سردار الچون بہادر کے اس طرح پسپا ہو جانے سے تیمور اور اس کے لشکر کے حوصلے بڑھ گئے تھے وہ بدخشاں کی طرف بڑھا۔

اس علاقے میں کئی بادشاہ تھے اور وہ مغلوں کے باجگزار تھے۔ تیمور کی آمد کی خبر سن کر انہوں نے مقابلے کی تیاریاں شروع کیں لیکن تیمور منزلیں قطع کرتا ہوا ان کے سر پر پہنچ گیا۔

بدخشاں کے بادشاہ گھبرا گئے اور انہوں نے حاضر ہو کر تیمور کی اطاعت قبول کر لی۔ بدخشاں کی فوج کے بہت سے سوار، تیمور کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ کئی نئے سردار بھی اس کے پاس آ گئے۔ اس طرح اس کے لشکر کی تعداد آٹھ ہزار کے قریب ہو گئی۔

○

تیمور ابھی صحرائے کولک میں جلکاٹے کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ اسے جاسوسوں نے خبر دی کہ جتہ سردار بیک جک (بعض تذکروں کے مطابق بیک جک کا بیٹا کوچ تمور) تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ شہر سبز سے نکل کر آبادیوں کو تہس نہس کرتا دریائے وخش کے کنارے پل سنگین تک پہنچ چکا ہے۔

تیمور نے مغلوں کا پیچھا کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے سرداروں نے اس کی مخالفت کی کہ آٹھ ہزار اور تیس ہزار کا کیا مقابلہ۔ تیمور نے بڑی مشکل سے انہیں اپنا ہم خیال بنایا لیکن اسی وقت اس پر ایک اور افتاد پڑی۔

تیمور کے دو سردار، تغلق سلاز ر اور کیخسرو چھ ہزار مغلوں کا لشکر لے کر اس کی طرف آ رہے تھے۔ یہ دونوں کبھی تیمور کے ملازم رہ چکے تھے لیکن اب وہ مغلوں کے نوکر ہو کر بڑے لشکر کے سالار ہو گئے تھے۔ تیمور نے پہلے انہی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔

تیمور نے امیر حسین اور امیر موسلی کو تو پیچھے چھوڑا اور خود آگے بڑھ کر کیخسرو اور سلاز ر کے ہراول پر حملہ کر دیا۔ مغلوں کا ہراول شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کیخسرو اور سلاز ر بھی میدان چھوڑ گئے اور بیک جک کے پاس پل سنگین پر پہنچ گئے۔

تیمور کی قسمت کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔ کامیابی اور فتح برابر اس کے قدم چوم رہی تھی۔ اس کے لشکر کی تعداد منگولوں کے مقابلے میں ایک چوتھائی تھی لیکن لشکر کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور منگولوں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ تیمور اپنے اس مختصر لشکر کے ساتھ پل سنگین پر پہنچا اور دریا کے دوسری طرف پڑاؤ ڈال دیا۔

اس کے سامنے سب سے زیادہ بڑا اور مضبوط لشکر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لڑائی فیصلہ کن ہو گی۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو وہ منگولوں کو بھگا دے گا ورنہ تاتاریوں کے غلامی کے دنوں میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

تیمور نے دور دور تک اپنے لشکر کے خیمے لگوا دیے تاکہ لشکر کی صحیح تعداد کا اندازہ نہ کر سکیں۔ منگولوں کو دریا پار زیادہ آسانیاں میسر تھیں۔ وہ دریا کے اس طرف آ کر لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ تیمور بھی پل سنگین عبور کر کے حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ بیک جک کی پشت پر پہاڑ تھے جبکہ تیمور کی پشت پر صحرا تھا۔ شکست کی صورت میں بیک جک پسپا ہو کر پہاڑوں میں روپوش ہو سکتا تھا لیکن تیمور کی پشت پر کوئی پناہ گاہ نہ تھی۔ پھر وہ ایسا خطرہ کیوں مول لیتا۔

تیمور زیادہ عرصہ تک لڑائی سے گریز نہ کر سکتا تھا۔ اس کے لشکر میں روز بروز اضافہ تو ہو رہا تھا لیکن اضافہ کی رفتار بہت سست تھی۔ تاتاری اب تک منگولوں سے خوفزدہ تھے اور ڈر ڈر کے تیمور کے پاس آ رہے تھے۔ منگولوں کو برابر کمک پہنچ رہی تھی۔ الیاس خواجہ نے بیک جک کو حکم بھیجا تھا کہ تیمور کو پیس کر رکھ دیا جائے۔ اس کا سر کاٹ کر پورے ملک تاتار میں پھرایا جائے تاکہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

منگولوں نے تیمور کے سر کاٹنے والے کے لیے ایک بار پھر بھاری انعام کا اعلان کیا تھا لیکن تیمور ایسا نہ تھا جس تک کسی کا ہاتھ آسانی سے پہنچتا۔ وہ اپنے سرداروں سے مشورہ ضرور کرتا لیکن جنگی حکمت عملی خود ترتیب دیتا۔ دریائے وخش پر پل سنگین دونوں لشکروں کے درمیان حائل تھا اور اس جنگ میں منگولوں اور تاتاریوں کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ کے لیے ہو جانا تھا۔

پھر تیمور نے وہ جنگی چال چلی جس نے منگولوں کو حیران کر کے رکھ دیا۔

تیمور کے لشکر کے خیمے پل کے اس طرف دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ تیمور نے اپنے تین سرداروں کو پل سنگین کی کمان سپرد کی۔ یہ سردار امیر موئد ارلات "اوچ قرا بہادر اور امیر موسیٰ تھے۔ تیمور نے امیر حسین کے لشکر سے صرف اس کے سپہ سالار امیر موسیٰ کو منتخب کیا تھا تاکہ اسے جنگ سے الگ رکھنے کا شکوہ نہ ہو سکے۔ اس جگہ میں تمام لشکر تیمور کا تھا۔ امیر حسین کے لشکری کھانے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے۔ انہیں بھی تیمور نے ایک جگہ متعین کر کے جنگ سے الگ کر دیا تھا۔

ممکن ہے کہ تیمور اس سے امیر حسین کو یہ تاثر دینا چاہتا ہو کہ اب تک جتنی فتوحات ہوئی ہیں وہ اس کے لشکر نے حاصل کی ہیں اور آئندہ بھی بڑا معرکہ اسی کا لشکر سر کرے گا۔

تیمور نے ان سرداروں کی کمان میں صرف پانچ سو تاتاری سوار چھوڑے اور انہیں حکم دیا کہ خیموں کے گرد اس طرح گشت کریں جیسے پورا لشکر یہاں موجود ہے۔

اس نے لشکر کے تمام خیموں کو اسی طرح رہنے دیا اور اپنے باقی تمام لشکر کے ساتھ رات کے وقت پل سنگین سے پھر دور چرخاوی کی سمت بڑھ کر دریا کو بڑی خاموشی سے عبور کیا لیکن بجائے منگولوں کے سامنے مورچہ لگانے کے چکر کاٹ کے ان پہاڑیوں پر پہنچ گیا جو منگولوں کی پشت پر واقع تھیں۔

صبح بیک جک کو تیمور کے دریا عبور کرنے کی خبر ملی تو وہ فوراً اس جگہ آیا جہاں سے دریا عبور کیا گیا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ تاتاریوں کا ایک بڑا لشکر دریا پار کر آیا ہے۔

بیک جک نے واپس آ کر پل سنگین کو دیکھا تو اسے پل کے پار دور دور تک خیمے استادہ نظر آئے اور چاق و چوبند سوار ادھر ادھر پھرتے دکھائی دیے۔

بیک جک اس صورتحال سے سخت پریشان ہوا۔ وہ ابھی سواروں سے مشورہ کر ہی رہا تھا کہ پشت کی تمام پہاڑیوں سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ تیمور نے پہاڑیوں پر آگ روشن کرا دی تھی تاکہ منگولوں کو معلوم ہو جائے کہ تاتاری لشکر پہاڑیوں پر قابض ہو چکا ہے۔

بیک جک بڑا تجربہ کار سالار تھا۔ سینکڑوں لڑائیوں میں داد شجاعت دے چکا تھا۔ ملک تاتار پر منگولوں کے قبضہ میں اس کی دور اندیشی اور بہادری کا سب سے زیادہ حصہ تھا مگر اب اس کا مقابلہ تیمور جیسے جنگجو شاطر سے تھا جس نے جنگی حکمت عملی سے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ سامنے تاتاری لشکر، پشت پر تاتاری لشکر۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے!

اس نے فوراً دو طرفہ مورچے لگائے۔ اس کا خیال تھا کہ تیمور دونوں طرف سے حملہ کرے گا۔ نصف لشکر اس نے پل سنگین کی طرف لگایا کہ ادھر سے حملہ ہو تو اسے روکا جائے۔ اور باقی نصف لشکر کا منہ اس نے پشت کی پہاڑیوں کی طرف کر دیا۔ اس طرح اس نے دفاعی جنگ کا نقشہ جمایا۔

پورا دن اسی طرح گزر گیا۔

تاتاریوں نے نہ حملہ کیا اور نہ کوئی ایسی حرکت کی جس سے حملے کا شبہ ہو۔ رات کو تیمور نے پہاڑیوں پر اور زیادہ آگ روشن کرا دی۔

بیک جک رات بھر گھوڑے پر سوار لشکر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتا رہا۔ اور کا بھی متوقع حملے سے رات بھر خوفزدہ رہا۔

تیمور کا اپنا بیان ہے کہ :

"میں نے وہ رات پہاڑی پر گزاری اور تمام شب خدائے قدوس کے سامنے سربسجود ہو کر دعا مانگتا رہا اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام بھیجتا رہا۔ رات کے کسی حصے میں مجھ پر جیسے نیند کا غلبہ ہوا۔ میں نہ تو پوری طرح سو رہا تھا اور نہ جاگ رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک غیبی آواز آئی ..... ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہے .....

"اے تیمور۔ خداوندِ کریم نے فتح مندی تیرے ہی حصے میں لکھ دی ہے۔"

پل سنگین کی جنگ تاریخِ تاتار میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس جنگ میں تیمور نے جس جنگی حکمت کا مہارت کا مظاہرہ کیا۔ اس سے تیمور کا کردار بحیثیت ایک سپہ سالار کے کھل کر سامنے آتا ہے۔

تیمور کا حوصلہ غیبی آواز سے بہت بڑھ گیا تھا۔ صبح کو نمازِ باجماعت سے فارغ ہو کر اس نے مغل لشکر پر نظر ڈالی تو اس کے دل میں مسرت اور حیرت کے ملے جلے جذبات اور خیالات پیدا ہوئے۔ بیک جک اپنے لشکر کو صف در صف دستوں میں تقسیم کر کے کوچ کر رہا تھا۔

بظاہر یہ پسپائی تیمور کے لیے حملے کا ایک بہترین موقع تھی۔ اس کے سرداروں نے بھی اسے مشورہ دیا کہ مغلوں پر فوراً حملہ کر کے انہیں منتشر کر دیا جائے لیکن اس نے سرداروں کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

"سردار تیمور ....." شیر بہرام نے بے چین ہو کے کہا:

"مغلوں کو موقع نہ دیجیے۔ بیچ کر نہ جانے پائیں۔"

"شیر بہرام۔ مغل لشکر کا سپہ سالار بیک جک ہے۔" تیمور نے بڑے اطمینان سے کہا:

"جو بات تم سوچ رہے ہو وہ اس کے ذہن میں بھی ہوگی۔"

"مگر سردار۔ پسپا ہوتی ہوئی فوج اپنی مدافعت پوری طرح نہیں کر سکتی۔" شیر بہرام نے اپنی بات پر زور دیا۔

"مجھے علم ہے شیر بہرام۔ مغل پسپائی کے وقت بہت کمزور ہوتے ہیں۔" تیمور نے شیر بہرام کے دل کی بات کہہ دی۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں سردار۔" شیر بہرام نے فوراً بات اچک لی۔

"پھر انتظار کس بات کا ہے؟"

"انتظار ....." تیمور گہری سانس لے کر بولا۔

"ہاں مجھے انتظار ہے۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ یہ واقعی کوچ اور پسپائی ہے یا بیک جک کی جنگی چال۔ کہیں وہ ہمیں پہاڑیاں چھوڑ کر میدان میں تو نہیں لانا چاہتا۔"

شیر بہرام حیران ہو کر تیمور کا منہ دیکھنے لگا۔ اس پہلو پر تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔

طغرا شیر بہرام کے پاس ہی موجود تھا۔ تیمور نے اس سے کہا:

"طغرا! تم چار سواروں کو لے کر مغلوں کے تعاقب میں جاؤ۔ کم از کم چار فرلانگ تک ان کا پیچھا کرو۔ واپس آکر ہمیں اطلاع دو۔"

طغرا حکم پا کر مغلوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ تیمور کو بیک جک کے فریب اور چالبازی کا اتنا یقین تھا کہ طغرا کے جانے کے بعد اس نے اپنے لشکر کو پہاڑیوں سے اتر کر دامنِ کوہ میں مورچہ بند ہونے کا حکم دیا۔ اس کے لشکر نے فوراً دامنِ کوہ میں اس طرح مورچے لگا لیے جیسے ان کے سامنے کوئی بڑا لشکر موجود ہو حالانکہ سامنے کوئی نہ تھا۔

مغل دور جا چکے تھے۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد طغرا اپنے سواروں کے ساتھ بہت تیز گھوڑا بھگاتا واپس آیا۔

"سردار۔ مغل واپس آ رہے ہیں۔" طغرا نے سانس سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کیوں شیر بہرام۔" تیمور نے شیر بہرام کو مخاطب کیا:

"بیک جک لومڑی سے زیادہ چالاک ہے۔"

"آپ عظیم ہیں سردار۔" شیر بہرام نے شرمندگی سے کہا:

"تاتاریوں نے آپ پر صحیح اعتماد کیا ہے۔ مغلوں کو آپ ہی سمجھتے ہیں اور انہیں آپ ہی زیر کر سکتے ہیں۔"

طغرا کے واپس آنے کے تھوڑی دیر بعد مغل دستے آنا شروع ہو گئے۔ تیمور نے اپنے لشکر کو مورچوں میں رہنے کا حکم دیا اور تیر اندازوں سے کہا کہ مغلوں کے دامنِ کوہ میں داخل ہوتے ہی ان پر تیروں کی بارش شروع کر دیں۔

بیک جک نے پورا لشکر جمع کر کے زوردار حملہ کیا۔ تیمور کے تیر اندازوں نے ان پر اس قدر تیر برسائے کہ ان کی پیش قدمی رک گئی۔ اندھیرا ہونے تک مغل آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن تیر اندازوں نے

ان کا راستہ روکے رکھا۔

رات میں بیک جک نے اپنا لشکر پہاڑوں کے گرد دور تک پھیلا دیا۔ اس نے اپنے خیال میں تاتاریوں کو گھیرے میں لے لیا لیکن تیمور اس سے زیادہ چالاک تھا۔ اس نے اپنا لشکر چار حصوں میں تقسیم کیا۔ رات کے آخری حصے میں جب مغل لشکر کے بیشتر سوار سو گئے تھے، چاروں طرف سے مغلوں پر شب خون مارا۔ بیک جک کو اس کی توقع نہ تھی۔ وہ فوراً سوار ہو کے مقابلے کو نکلا مگر اس وقت تک تاتاری ان کے لشکر میں تباہی پھیلا چکے تھے اور ان کی حالت ابتر تھی۔ بیک جک نے انہیں غیرت دلا کر روکا اور جم کر لڑنے لگا۔

تیمور مغلوں کو مہلت نہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے نظریں دوڑا کر بیک جک کو دیکھا اور گھوڑا بڑھا کر اس کی طرف چلا۔

تیمور کے دائیں بائیں شیر بہرام، طغر، ایلچی بہادر، جاکو برلاس اور اپنے وفاداروں کے تمام سردار حلقہ باندھے دوڑ رہے تھے۔ تیمور کو بڑھتے دیکھ کر انہوں نے بھی اپنے گھوڑے ادھر ہی موڑ لیے۔

بیک جک نے تیمور کو آتے دیکھا تو اپنے سرداروں کو اسے روکنے کا حکم دیا۔ بیک جک کو خطرے میں دیکھ کر اس کا بھائی الچون بہادر، بیٹا کوچ تیمور، تغلق خواجہ، نوبکاں، ساریق اور تلکم وغیرہ بیک جک اور تیمور کے درمیان آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ یہ دیوار قائم نہ رہ سکی۔ تیمور کے ساتھیوں نے آگے بڑھ کر ان پر حملہ کر کے منتشر کر دیا۔

تیمور کو راستہ ملا تو وہ بیک جک کے سر پر پہنچ گیا۔ بیک جک نے پوری قوت سے حملہ کیا۔ تیمور نے اس کی تلوار الجھا کر جھٹکا دیا تو بیک جک کی تلوار دور جا گری۔ اور بجلی جیسی تیزی سے تیمور کی تلوار اس کے سینے پر پہنچ گئی۔

"خبردار جو ذرا بھی حرکت کی۔" تیمور نے ڈپٹ کر کہا۔

بیک جک نے اظہار شکست کے طور پر گردن جھکا لی۔ تیمور نے گھوڑے سے اتر کر بیک جک کا ایک ہاتھ پکڑا اور گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا۔ پھر تیمور نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ طغر ایک مغل کو رسی کے ساتھ اپنی کاٹھی سے باندھے اسے گھسیٹتا ہوا آ رہا تھا۔

"طغر... یہ مغل سپہ سالار ہے۔" تیمور نے طغر سے کہا۔

"اسے حفاظت سے رکھو مگر عزت کے ساتھ۔"

طغر نے اسی رسی سے بیک جک کے ہاتھ بھی باندھ دیے، جس سے ایک مغل پہلے ہی بندھا تھا۔ بیک جک کو باندھنے کے بعد طغر نے مسکرا کر کہا:

"سردار۔ عجیب اتفاق ہے۔ اس وقت مغل سپہ سالار اور اس کا بیٹا ایک ہی رسی سے بندھے ہیں۔"

"تو گویا..." تیمور نے زمین پر گھسٹتے ہوئے مغل کو تعجب سے دیکھا۔

"جی ہاں سردار..." طغر مسرت کے عالم میں بولا:

"میں نے اس کے بیٹے کوچ تیمور کو پہلے ہی قابو کر لیا تھا۔"

کوچ تیمور کے نام پر بیک جک گھبرا گیا۔ اور زمین پر پڑے مغل کو دیکھنے لگا۔ کوچ تیمور کا چہرہ گرد و خون سے اٹا ہوا تھا۔ زمین پر گھسٹنے سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ بیک جک کی آنکھوں میں شاید آنسو آ گئے۔ وہ بندھے ہوئے ہاتھوں سے بیٹے کا چہرہ صاف کرنے لگا۔

تیمور یہ منظر دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بولا:

"طغر۔ خیمے میں لے جا کر ان کے ہاتھ کھول دینا۔ کوچ تیمور کے زخم دھلوا کر کپڑے بدلوا دینا۔"

بیک جک نے نظریں اٹھا کر تیمور کو دیکھا۔

پہلی مرتبہ جب اس نے تیمور کو تغلق کے تاج اعظم کے حضور میں سمرقند کی لشکرگاہ میں دیکھا تو اس کی نظروں میں تیمور کے لیے نفرت اور حقارت تھی لیکن اب اس کی نظریں احسان سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

مغلوں کو شکست فاش ہوئی۔

بیک جک اور اس کے بیٹے کے علاوہ مغلوں کے تین اور بڑے سردار، تیمور کی قید میں آ گئے۔ اس فتح عظیم کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔

امیر حسین کو تیمور نے جنگ سے دور رکھا تھا اور پہلے پہل اسے ایک جگہ پابند کر دیا تھا۔ فتح کی خبر پا کر وہ سوار ہوا اور پہلے سنگین پر آیا۔ یہاں اس کا سپہ سالار امیر موسیٰ متعین تھا۔ امیر موسیٰ نے امیر حسین کو فتح کی مبارکباد دی حالانکہ اس فتح میں امیر حسین کا کوئی دخل نہ تھا۔

وہاں سے دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کے تیمور سے ملنے چلے۔ تیمور دامن کوہ میں مغلوں کی بچی کچی فوج کے صفائے میں مصروف تھا۔

یہ دونوں باتیں کرتے اور مستقبل کے منصوبے بناتے جا رہے تھے کہ موسیٰ کو طغر دکھائی دیا۔ طغر اپنے دوست بہرام کے ساتھ بیک جک اور اس کے بیٹے کو خیمے میں پہنچا کر واپس آ رہا تھا۔ طغر کو دیکھتے ہی امیر موسیٰ کو غصہ آ گیا۔ اس نے اپنا گھوڑا اس کی طرف بڑھایا۔ امیر حسین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔

طغر اور شیر بہرام پیدل تھے۔ موسیٰ نے طغر کے پاس گھوڑا روکا اور ڈپٹ کر کہا:

"طغر۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ۔"

طغر گھبرا گیا۔ شیر بہرام تمام حالات سے واقف تھا۔ اس نے اسی سختی سے موسلی کو جواب دیا:

"موسلی! تم فاتح لشکر کے ایک سوار کو حکم دینے والے کون ہوتے ہو! تم نے تو اس جنگ میں ایک چوہا بھی نہیں مارا۔ اور میرے نوجوان دوست نے مغلوں کی صفیں الٹ کے رکھ دیں۔"

"تم دخل نہ دو شیر بہرام......" موسلی، شیر بہرام سے الجھ پڑا:

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اس لشکر میں اس کی موجودگی پسند نہیں کرتا۔"

"موسلی۔ تم بھول رہے ہو۔ طغر تمہارے امیر، امیر حسین کا ذاتی ملازم نہیں ہے" شیر بہرام نے کرختگی سے کہا:

"طغر کو سردار تیمور نے ملازم رکھا ہے صرف وہ ہی اسے نکال سکتے ہیں۔"

امیر حسین کو یہ اپنی توہین محسوس ہوئی۔ چیخ کر بولا:

"شیر بہرام۔ اپنی زبان کو لگام دو۔ میں امیر قزعن کا پوتا اور کابل کا بادشاہ ہوں۔ میں یہ گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"امیر حسین......" شیر بہرام نے لاپرواہی سے کہا:

"اب کابل تمہارے قبضے میں نہیں ہے۔ ممکن ہے سردار تیمور مہربان ہو کر تمہیں کابل کی حکومت واپس دلوا دے۔ میں تمہاری توہین نہیں کر رہا ہوں۔ جس امیر کی تم حمایت کر رہے ہو یہ بہت بڑا احسان فراموش اور بدطینت ہے۔ اس نے طغر کا علاقہ ضبط کر لیا۔ اس کی پاک طینت بیوی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا۔ یہ طغر کا مجرم ہے۔ موسلی صرف طغر کا ہی مجرم نہیں۔ یہ تمہارا بھی مجرم ہے۔ اس نے ملکہ کابل کے ساتھ بھی انتہائی تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا تھا۔"

امیر حسین تو موسلی کا احسان مند تھا۔ وہ بھلا اس کی برائی کیسے برداشت کرتا۔ بولا:

"تم جھوٹے ہو شیر بہرام۔ اگر ملکہ کابل کو موسلی سے کوئی شکایت ہوتی تو وہ مجھ سے ضرور کہتی۔ تم اپنے الفاظ واپس لو......"

شیر بہرام اگرچہ پیدل تھا لیکن اس نے فوراً تلوار کھینچ لی۔ بولا:

"امیر حسین۔ میرے الفاظ نیام سے نکلی ہوئی تلوار ہے اور بغیر فیصلہ کیے نیام میں واپس نہیں ہوتی۔"

موسلی کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شیر بہرام، تیمور کا گہرا دوست ہے۔ اگر وہ مارا گیا تو تیمور آفت کر دے گا۔ اس وقت پورا لشکر تیمور کے ساتھ ہے۔ امیر حسین اور اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس نے فوراً ہی مداخلت میں دخل دیا:

"امیر۔ آپ اس بدزبان کے منہ نہ لگیں۔ میں اس سے خود نپٹ لوں گا۔"

امیر حسین بھی تلوار نکال چکا تھا۔ بولا:

"میں اس کی زبان کاٹ دیتا ہوں۔"

موسلی نے خود ہی جھگڑا شروع کیا تھا اور خود ہی تیمور کے خوف کے پیش نظر اسے ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے امیر حسین کو ٹھنڈا کیا اور اسے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔ امیر حسین پھر بھی چلتے چلتے کہہ ہی گیا:

"شیر بہرام۔ میں تجھے اس گستاخی کی سزا ضرور دوں گا۔"

"میری تلوار بھی تمہارا انتظار کرے گی امیر حسین......"

شیر بہرام بھی جواب دینے سے باز نہ رہا۔

امیر حسین وہاں سے جھلایا ہوا تیمور کے پاس پہنچا تو جاتے ہی اس سے الجھ پڑا۔ تیمور مغلوں کو پسپا کرنے کے بعد ان کے تعاقب میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا گھوڑا قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے راسیں پکڑ کے رکاب میں پیر رکھا ہی تھا کہ امیر حسین، امیر موسلی کو لیے ہوئے اس کے پاس پہنچ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو سردار تیمور!" امیر حسین نے بڑے اکھڑپن سے پوچھا۔

تیمور نے جواب دینے کے بجائے اپنا منہ اس طرف کر دیا جدھر مغل بھاگ رہے تھے۔ تیمور اس سے الجھ کر فتح کی مسرت کو کم نہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے صرف اشارے سے کام لیا تھا۔

امیر حسین تو خواہ مخواہ مشورے دینے پر مصر تھا۔ بولا:

"تیمور۔ شکست خوردہ فوج کا تعاقب کرنا بڑی غلطی ہے۔"

تیمور رنگ گیا۔ ترشی سے بولا:

"امیر حسین۔ اگر میں تمہارے مشوروں پر عمل کرتا تو آج میری بھی وہی حالت ہوتی جو تمہاری ہے۔ تم صرف اپنی بہادری کا دعویٰ کر سکتے ہو ورنہ جنگ کے معاملے میں تم بالکل کورے اور مبتدی ہو۔ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ مغل شکست کھا گئے ہیں۔ جب تک ان کا ایک سوار بھی ہماری سرزمین پر ہے وہ جنگ کرتے رہیں گے۔"

تیمور کا یہ خیال بھی درست نکلا۔ مغلوں کے تمام بڑے بڑے سردار یا تو قتل ہو گئے تھے یا تیمور نے انہیں گرفتار کر لیا تھا۔ اس کے باوجود تعاقب کے دوران وہ پلٹ پلٹ کر جوابی حملے کرتے رہے۔ تیمور نے ان کا تعاقب برابر جاری رکھا۔ وہ تاتاری جو مغلوں کے خوف سے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ گئے تھے، تیمور کو مبارکباد دینے آئے اور اس کے لشکر میں شامل ہوتے رہے۔ تیمور اپنے بچھڑے دوستوں اور بدترین دشمنوں کو بھی گلے لگاتا

اصرار سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتا رہا۔

مغل بادشاہ ایاس خواجہ کو ییک جنگ کی شکست کی اور گرفتاری کی اطلاع ملی تو اس کے بھی ہوش اڑ گئے۔ تیمور مغلوں کو شکست دے کر تاتاری سرحد کے پار تک بھیج گیا۔ ایاس خواجہ بھی پیچھے ہٹ کر شمالی میدانوں میں بھیج گیا۔ تیمور نے مغلوں کو سرزمین تاتار سے نکال کر دم لیا۔ شمالی میدانوں میں آگے بڑھنے کی اس نے اپنے طور پر کوشش ہی نہ کی۔

اب وہ ماوراء النہر کی سب سے اہم شخصیت تھا۔

اس نے اپنے ملک کو مغلوں کے قبضے سے چھڑا لیا تھا۔ صرف شہر سبز، اس کا اپنا شہر ابھی تک مغلوں کے قبضے میں تھا۔

شہر سبز کے مغلوں کا رابطہ ایاس خواجہ سے کٹ گیا تھا اور انہیں باہر والوں کی کوئی خبر نہ تھی۔ بیگ تھوڑا لشکر وہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہی لشکر اس وقت شہر سبز میں محصور تھا۔

تیمور اپنے شہر کے حسن کو اجاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ خوبصورت شہر اسے بغیر خونریزی اور تباہی کے حاصل ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اس کی فتح التوا میں ڈال کر جشن منانے کا حکم دیا۔ وہ سرحد سے ہٹ کر اپنے علاقے میں واپس آ گیا تھا۔ اس نے ایلیاق خاتون اور ننھے جہانگیر کو بھی لانے کے لیے ایک دستہ گرم سیر بھیج دیا تھا۔

تیمور کو ایک طویل عرصے کے بعد سکون حاصل ہوا تھا۔ اس لیے اس نے بڑے پیمانے پر ضیافت کا اہتمام کیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے تمام پرانے سردار اور امیر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ بے شمار حلیف بھی آ ملے تھے۔ وہ تمام ان نئے سردار مقرر کر تا رہا۔ جنگ میں مارے جانے والوں کے ورثاء کو نقد رقوم اور زمین عطا کیں۔ امیروں کے آپس کے اختلافات دور کیے اور انہیں گلے ملا دیا۔

اسے امیروں کے جھگڑے نمٹانے سے اتنی فرصت بھی نہ ملی کہ ٹھیک سے کھانا کھاتا۔ اسی طرح دوپہر سے شام ہو گئی۔ رات کا کھانا بھی وہ مشکل ہی سے کھا سکا۔

جب نئے مہمان رخصت ہو گئے اور اس کے صرف پرانے احباب ہی رہ گئے تو اسے ایک دم شیر بہرام کا خیال آیا۔ وہ اسے صبح سے نظر نہ آیا تھا اور اب بھی موجود نہ تھا۔ شیر بہرام ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا مگر اس وقت وہ دعوت اور دربار سے بھی غائب تھا۔

تیمور نے جاکو برلاس سے شیر بہرام کے بارے میں پوچھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ایلچی بہادر بھی کچھ نہ بتا سکا۔ تیمور کی پریشانی بڑھ گئی۔ اس محفل میں امیر حسین، امیر موسیٰ بھی موجود تھے لیکن کسی کو علم نہ تھا کہ شیر بہرام

کہاں ہے؟

"ترک جوان طغر کہاں ہے؟ اسے ڈھونڈ کے حاضر کیا جائے۔" تیمور نے بڑے غصے سے حکم دیا۔

لوگ طغر کو ڈھونڈنے دوڑ پڑے۔ طغر کے نام پر امیر حسین اور امیر موسیٰ کے کان کھڑے ہوئے۔

تھوڑی دیر بعد طغر حاضر ہوا۔

"شیر بہرام کہاں ہے طغر....؟" تیمور نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"سردار.....وہ.....واپس چلے گئے ہیں۔" طغر نے اٹک اٹک کے کہا۔

"کہاں چلے گئے۔ کب چلے گئے؟" تیمور چیخ پڑا۔ اسے شیر بہرام سے بڑا پیار تھا۔

"آج ہی صبح گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ میرا کام ختم ہو گیا۔ میں اپنے قبیلے میں واپس جا رہا ہوں۔" طغر نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

"ہم سے مل کر کیوں نہیں گئے؟" تیمور کا غصہ ابھی کم نہ ہوا تھا۔

طغر کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموش رہا۔

تیمور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر نرم پڑتے ہوئے بولا:

"دیکھو طغر۔ تم سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔ اس نے اپنے جانے کی وجہ ضرور بتائی ہو گی اور یہ بھی کہا ہو گا کہ اس کی اطلاع مجھے نہ دی جائے مگر وہ مجھے بہت عزیز تھا۔ اس جیسے مخلص دوست کو میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس کی بے لوثی اور بے باکی مجھے پسند ہے۔ مجھے بتاؤ آخر اس قدر خاموشی سے کیوں گیا۔ وہ بڑا حساس اور نازک مزاج تھا۔ یقیناً اسے کوئی بات ناگوار گزری ہو گی۔ ممکن ہے اسے مجھ سے کوئی شکایت ہو یا پھر کسی اور سے اختلاف پیدا ہوا ہو۔ مجھے اس کے جانے کی وجہ معلوم ہونی چاہیے۔"

شیر بہرام کا جس وقت امیر حسین اور موسیٰ سے جھگڑا ہوا تھا اسی وقت سے وہ دل برداشتہ ہو گیا تھا اور واپسی کا ارادہ کر چکا تھا۔ جاتے وقت اس نے طغر کو تاکید کی تھی کہ جہاں تک ہو سکے وہ اس کی روانگی کو تیمور سے پوشیدہ رکھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے تیمور اور اس کے سالے امیر حسین میں کوئی اختلاف پیدا ہو۔

طغر کے لیے اب خاموش رہنا ممکن نہ رہا۔ اگر وہ انکار کرتا تو تیمور کے غصے کا بھی شکار ہو جاتا۔ اس نے سر اٹھایا اور بولا:

"سردار.....شیر بہرام اور....." اور طغر نے اپنی نظریں گھما کر امیر حسین پر جما دیں۔

"امیر حسین سے جھگڑا ہوا تھا.....؟" تیمور نے طغر کی نظریں پڑھ لیں۔

"جی سردار..... " طغر نے نظریں پھر نیچی کر لیں۔

تیمور نے تیز نظروں سے امیر حسین کو دیکھا۔ امیر حسین بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ بگڑ کے بولا:

"اس نے مجھ سے سخت گستاخی کی تھی۔ میں اس کا سر قلم کر دیتا مگر بہن نے اسے معاف کر دیا۔"

تیمور نے امیر حسین کو کوئی جواب نہ دیا مگر اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے امیر حسین پر سخت غصہ آیا۔ وہ کچھ ایسا پژمردہ ہوا کہ دربار برخاست کر کے اسی وقت خیمے میں چلا گیا۔

تیمور، امیر حسین کی احمقانہ حرکتوں سے پہلے ہی نالاں تھا۔ شیر بہرام کے چلے جانے کا اسے بڑا صدمہ ہوا۔ وہ ہر موقع پر اپنی بیوی الجائی خاتون کی وجہ سے امیر حسین کو معاف کر دیا کرتا تھا لیکن اب اس نے امیر حسین سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

○

تیمور ابھی وہیں خیمے میں پڑا تھا کہ الجائی خاتون، جہانگیر کو لے کر آ گئی۔ طغر کی بیوی غلفورا اس کے ساتھ تھی۔

غلفورا پانچ محافظوں کے ساتھ گرم سیر پہنچ گئی تھی مگر اس وقت تیمور وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔ غلفورا نے اپنی داستانِ الم الجائی خاتون سے بیان کر دی۔ الجائی نے اس کی بہت دلداری کی اور وعدہ کیا تھا کہ تیمور سے ملاقات ہونے پر وہ نہ صرف اس کا علاقہ واپس کرا دے گی بلکہ موسیٰ کو بھی قرار واقعی سزا بھی دلائے گی۔ اب اس کا وقت آ گیا تھا۔

غلفورا، الجائی کے ساتھ تیمور کے لشکر میں آ گئی تھی۔ اسے آتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں دلشاد آغا بھی ہیں۔ اور امیر موسیٰ بھی.....

الجائی خاتون کا استقبال کرنے والوں میں دلشاد آغا بھی تھی۔ امیر حسین اس قدر خود سر اور مغرور تھا کہ وہ بہن کے استقبال کے لیے بھی نہ آیا۔ وہ تو تیمور سے ملنے بھی نہ آتا تھا۔ تیمور اپنی بیوی کے لحاظ کی وجہ سے خود اس کے خیمے پر چلا جاتا تھا۔

اس وقت اس کے نہ آ سکنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شیر بہرام کے معاملے نے ان کے اختلاف کو ہوا دی تھی اور اس نے تیمور کے خیمے پر آنا جانا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ کوئی ضروری بات کرنا ہوتی تو وہ قاصد کے ذریعے پیغام بھیجتا تھا۔

الجائی خاتون اور غلفورا گاڑی میں آئی تھیں۔ تین گاڑیوں پر ان کا سامان لدا ہوا تھا۔ الجائی کی گاڑی سب سے

آگے تھی۔

گاڑی رکتے ہی دلشاد اور تیمور بڑھے۔ تیمور لنگڑا کر چل رہا تھا۔ جہانگیر گاڑی سے جھانک رہا تھا۔ اس نے وہیں سے صدا لگائی:

"بابا لنگڑے...... بابا لنگڑے....."

تیمور گاڑی کے پاس پہنچا۔ اس نے ایک نظر الجائی پر ڈالی پھر جہانگیر کو گود میں اٹھا لیا اور اسے پیار کرتا ہوا گاڑی سے کچھ دور چلا گیا۔

دلشاد نے سہارا دے کر الجائی خاتون کو اتارا۔ غلفورا نے دلشاد کو دیکھا مگر منہ گھما کر ایک طرف کو دبک گئی۔

دلشاد، الجائی کو اتار رہی تھی، اس کی توجہ غلفورا کی طرف نہیں گئی۔

الجائی نے اترتے ہی دلشاد کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔

"ایک بات بتاؤ دلشاد!" الجائی نے رازداری سے کہا۔

"کیسی بات باجی.....؟" دلشاد مسکرائی۔

"سو باتیں پوچھو مگر مجھے یہاں کیوں کھینچ لائی ہو؟"

"امیر موسیٰ نے تجھے کبھی قید کیا تھا؟" الجائی نے آہستہ سے پوچھا۔

دلشاد سنجیدہ ہو گئی۔ پچھلے تمام واقعات ایک لمحے میں اس کی نظروں میں گھوم گئے۔

"ہاں باجی!" دلشاد گھٹی گھٹی آواز میں بولی:

"مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ کیا غلفورا تمہارے پاس پہنچ گئی؟"

"پہلے یہ بتا کیا امیر موسیٰ نے غلفورا پر بری نظر ڈالی تھی؟"

الجائی نے پہلے اپنا اطمینان کرنا چاہا۔ غلفورا نے اس سے جو کچھ بیان کیا تھا الجائی نے اس پہ اعتبار تو کر لیا تھا لیکن اب وہ دلشاد سے اس کی تصدیق بھی چاہتی تھی۔

"ہاں باجی۔ یہ سب سچ ہے۔" دلشاد لب کھولتے ہوئے بولی:

"غلفورا نے تمہیں جو بھی بتایا ہو گا وہ ٹھیک ہے۔ وہ کہاں ہے۔ تم اسے ساتھ کیوں نہیں لائیں؟"

"وہ مظلوم میرے ساتھ ہی آئی ہے۔" الجائی خاتون نے درد مند دل پایا تھا۔ دوسروں کے مصائب پر اس کا دل رو پڑتا تھا۔

"کہاں ہے۔ کدھر ہے باجی وہ؟" دلشاد نے گاڑیوں کی طرف دیکھا۔

"میری گاڑی میں ہے۔ بہت مظلوم ہے دلشاد وہ...... اس کا علاقہ چھن گیا..... اس کا شوہر

اس سے۔۔۔۔"

المجانی اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہی لیکن دلشاد نے اس کی کوئی بات نہ سنی اور "غلفورا۔۔۔۔ غلفورا۔۔۔" پکارتی ہوئی بھاگ کر گاڑی کے پاس پہنچ گئی۔

غلفورا گاڑی سے اتری اور دوڑ کر دلشاد سے چمٹ گئی۔ غلفورا سسکیاں بھرنے لگی۔ دلشاد کے بھی آنسو نکل آئے۔ المجانی آہستہ آہستہ ان کے پاس آ گئی۔

"غلفورا، خدا کا شکر ہے کہ تو خیریت سے باجی کے پاس پہنچ گئی۔" دلشاد نے اسے تسلی دیتے ہوئے اپنے سے الگ کیا:

"ہم تو تمہارے لیے سخت پریشان تھے۔"

"خاتون آغا نے جس محبت کا سلوک میرے ساتھ کیا ہے اسے میں زندگی بھر نہ بھلا سکوں گی۔" غلفورا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں المجانی باجی کی طبیعت سے واقف تھی اسی لیے میں نے تمہیں ادھر بھیجا تھا۔" دلشاد نے احسان مند نظروں سے المجانی کو دیکھا۔

"اگر تم اور ظفر اس زمانے میں ہماری مدد نہ کرتے تو ہم جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتے رہتے اور پھر ایک ایک کر کے مغلوں کی تلواروں کا لقمہ بن جاتے مگر۔۔۔۔ مگر امیر موسیٰ نے جس احسان فراموشی کا ثبوت دیا تھا وہ کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی میں تمہارا احسان بھی کبھی نہیں بھول سکتی۔۔۔۔"

"اب ان باتوں اور ان دنوں کا ذکر نہ کیجیے ملکہ کابل۔" غلفورا دلگیر لہجے میں بولی:

"مجھے خاتون آغا جیسی مشفق خاتون اور آپ جیسی قدر دان مل گئی۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ بس کبھی کبھی وقت ظفر کا خیال آتا ہے تو۔۔۔۔"

"ظفر زندہ ہے غلفورا۔۔۔۔" دلشاد کو جیسے یاد آ گیا۔

"ظفر زندہ ہے۔" غلفورا اور المجانی کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں زندہ ہے المجانی باجی۔۔۔۔" دلشاد نے زور دے کر کہا۔

"ظفر نے اپنی بہادری سے سردار تیمور کے دل میں جگہ پیدا کر لی ہے۔ اس نوجوان نے مغلوں کے سپہ سالار کے بیٹے کو میدان جنگ میں زیر کر کے گرفتار کیا تھا۔ سردار تیمور اس پر بہت مہربان ہیں۔ میں ابھی اسے بلواتی ہوں۔"

غلفورا کے باغ جوانی پر جیسے دوبارہ بہار آ گئی۔ وہ ظفر کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ ظفر کی

سلامتی کی خبر سن کر اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔

تیمور اپنے خیمے میں پہنچ چکا تھا۔ یہ تینوں پہنچیں تو پوچھا:

"باہر کیا کر رہی تھیں تم لوگ؟"

"سردار تیمور۔ اطمینان رکھیے ہم آپ کی بیوی کو کہیں بھگا نہیں لے جائیں گے۔" دلشاد نے برجستہ کہا۔

تیمور جھینپ سا گیا۔

المجانی بولی:

"تو خود ہی میرے بھائی کو لیے بھاگی پھرتی ہے کسی اور کو کیا بھگائے گی۔" المجانی خاتون نے اپنے طور پر دلشاد کو منہ توڑ جواب دیا۔

دلشاد تو شوخی اور چنچل پن میں مشہور تھی۔ فوراً بولی:

"تو کیا میں آپ کے پاس آ جاؤں۔ اسی خیمے میں رہا کروں؟"

المجانی اس شوخ جملے سے گھبرا گئی۔ بولی:

"میں۔۔۔۔ میں کب منع کرتی ہوں مگر میرا بھائی تنہا رہ جائے گا۔"

"یہ لڑکی کون ہے المجانی؟" تیمور نے دخل دیا۔

اس کی نظر غلفورا پر پڑ گئی تھی جو دلشاد کے پیچھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ممکن ہے تیمور نے بات کا رخ بدلنے کے لیے یہ سوال کیا ہو۔

دلشاد نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا:

"یہ معصوم اور مظلوم غلفورا ہے۔ امیر موسیٰ کا زخم خوردہ شکار۔۔۔۔"

المجانی خاتون نے دیکھا کہ دلشاد جذباتی ہو گئی ہے اور اگر اس نے اس المناک واقعے کی تفصیل بتائی تو شاید تیمور بھڑک اٹھے اور ممکن ہے کہ خانہ جنگی شروع ہو جائے اس لیے اس نے خود غلفورا اور ظفر کی دردناک داستان مختصر الفاظ میں تیمور کے گوش گزار کی۔

تیمور بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ المجانی خاموش ہوئی تو تیمور نے دلشاد کو گھورتے ہوئے کہا:

"دلشاد۔ تعجب ہے کہ تم نے اتنے اہم واقعے کا مجھ سے ذکر تک نہیں کیا اور ظفر کتنا باہمت جوان ہے کہ غم کا اتنا بڑا داغ سینے میں چھپائے میدان جنگ میں شجاعت دکھاتا رہا۔"

"طغرکو میں نے روک دیا تھا۔" دلشاد نے بتایا:
"جس وقت امیر حسین ہمارے پاس آئے تو ان کے جسم پر چیتھڑے لگے تھے لیکن امیر موسلیٰ نے اس وقت امیر حسین کا شاہانہ استقبال کیا۔ اس سے میں اپنا غم بھول گئی۔ میں نے امیر حسین کو بھی اب تک اس کی خبر نہیں ہونے دی۔ پھر اس وقت منگولوں کا خطرہ بھی ہمارے سر پر تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ اور امیر حسین میں کوئی اختلاف پیدا ہو۔ امیر حسین امیر موسلیٰ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ وہ امیر موسلیٰ کی حمایت کرتے اور بات بگڑ جاتی۔ اب آپ فاتح ہیں۔ آپ کے پاس بے پناہ طاقت ہے جیسا چاہے کر سکتے ہیں۔"
"ہم تمہارے ساتھ پورا انصاف کریں گے خاتون۔" تیمور گمبھیر آواز میں بولا:
"ہم طغر کی شجاعت کی بھی قدر کرتے ہیں۔ تمہیں نہ صرف تمہاری عمل داری واپس ملے گی بلکہ اس کے ساتھ ایک بڑی جاگیر بھی دی جائے گی۔ جہاں تک موسلیٰ کا تعلق ہے وہ تمہارا مجرم ہے۔ ہم موسلیٰ اور طغر کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔ تم دونوں اسے خود سزا دینا۔۔۔۔"
"سردار محترم۔" غلفورا متانت سے بولی:
"خاتون آغا جیسی مہربان ہستی کے مل جانے کے بعد مجھے کسی عملداری اور جاگیر کی ضرورت نہیں۔ میں موسلیٰ کو معاف کرتی ہوں۔ جس مصلحت کی بنا پر ملکہ کابل اور طغر نے اپنی زبان بند رکھی وہی مصلحت اب بھی درپیش ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کا میری محسنہ کے بھائی سے کوئی اختلاف ہو۔ میری کائنات تو میرا شوہر طغر ہے اور آپ لوگوں کا سایہ۔ میں اس چھاؤں کو چھوڑ کر اب کسی اور جگہ نہیں جانا چاہتی۔"
"غلفورا۔"
الجائی خاتون نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا:
"تم میری بہن ہو۔ میں بھی تمہیں اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتی۔"
غلفورا کو ایک خالی کمرے میں بھیج کر طغر کو بلایا گیا۔
"اس سامنے کے خیمے میں چلے جاؤ۔" دلشاد نے اپنی دلی مسرت کو چھپاتے ہوئے کہا۔
طغر نے حیران نظروں سے دلشاد کو دیکھا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔
"یہ ہمارا حکم ہے طغر۔۔۔۔"
طغر تیز قدم اٹھاتا ہوا خیمے کے پاس پہنچا۔ وہ رکا، پلٹ کر دلشاد اور تیمور کو دیکھا پھر پردہ اٹھا کر خیمے میں داخل ہو گیا۔

اس کے بعد دوسرا حصّہ پڑھیں

امیر تیمور گورگان
حصہ دوم
الماس
ایم۔ اے

جادوگرنوں کی بستی

پتھریلے راستے پر آہٹ ہوئی۔ فراتو عنبر نے چونک کر کمان میں تیر جوڑ لیا۔ وہ تاتاری سردار تیمور کا قابل اعتماد پہرے دار تھا۔ اس کا نام فراتو تھا لیکن اسے خوشبویات کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت کوئی خوشبودار پھول اس کے سینے پر مسکراتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے ساتھی، اس کے نام کے ساتھ عنبر کا لفظ لگا دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ پورے لشکر میں فراتو عنبر کے نام سے مشہور ہو گیا۔

تیمور کو بھی اس کے اس شوق کا علم تھا لیکن اس نے عنبر کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ پہرے کے اوقات میں وہ کسی پھول سے اپنا سینہ نہ سجائے کیونکہ اس طرح اس کی پوشیدگی کی خبر دشمن کو بھی ہو سکتی تھی۔

اس وقت فراتو عنبر کا سینہ پھول سے محروم تھا۔ . . . اور وہ کچھ افسردہ سا تھا۔

راستے پر دوبارہ آہٹ ہوئی۔

عنبر آہستہ آہستہ آہٹ کی جانب بڑھا۔ گھپ اندھیرا، چمکتی دمکتی کہکشاں میں بھی ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ اس کے کان آہٹ کی طرف لگے ہوئے تھے مگر اس طرف خاموشی طاری تھی۔

عنبر کا پہرہ، مغلوں اور تاتاریوں کی سرحد کے شمال میں مشہور میدان قبچاق کی مغربی پہاڑیوں پر تھا۔ جس ابھری ہوئی چٹان کے پہلو میں وہ کھڑا تھا وہاں سے مغلوں کے خیموں کے آگے جلتے الاؤ سے اڑتی ہوئی چنگاریاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ تاتاریوں کا لشکر جنوبی حصے میں تھا اور چٹان کی وجہ سے اس کی نظروں سے

ادجل تھا۔ صبح دونوں لشکروں کے ٹکرانے کا امکان تھا۔ رات کو بھی شب خون مارا جاسکتا تھا اس لیے عنبر زیادہ چوکنا تھا۔

راستے پر پھر آہٹ ہوئی۔ کوئی اوپر آرہا تھا۔

عنبر نے چاق ڈھیلا کر کے تیر نکالا۔ کمان کندھے پر اور تیر ترکش میں ڈال کر تلوار کھینچ لی۔ اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ خوشبو کی لپٹیں آئیں اور عنبر کے مشامِ جاں کو معطر کرتی چلی گئیں۔ عنبر ہر پھول کی خوشبو پہچانتا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ یہ خوشبو ان جنگلی پھولوں کی ہے جو اس علاقے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

مگر اس خوشبو کو لانے والا کون ہے؟

عنبر تلوار سیدھی کیے آنے والے کی پشت پر پہنچ گیا۔

"خبردار۔ نہ کوئی قدم آگے بڑھے اور نہ کوئی آواز ہی نکلے۔" عنبر نے تلوار کی نوک اس کی پشت سے لگاتے ہوئے سرگوشی کی۔

چلنے والا رک گیا۔

"تلوار میرے حوالے کر دو۔ اگر خنجر ہے تو وہ بھی۔" عنبر نے حکم دیا۔

"میں خالی ہاتھ ہوں۔" جواب میں ایک نرم و نازک آواز سنائی دی۔

عنبر نے تلوار ہٹالی۔

"کیا تم عورت ہو؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا آواز سے میں مرد معلوم ہوتی ہوں۔"

عنبر اس برجستہ جواب پر شرمندہ سا ہو گیا۔

"کیا تم مغل ہو؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتی ہوں؟" نووارد کی آواز میں ستار کی جھنکار تھی۔

"میں صورت سے تمہیں کیا معلوم ہوتا ہوں؟"

عنبر نے بھی اسی انداز میں جواب دیا لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا..... جب وہ خود عورت کو نہ پہچان سکا تھا تو عورت کو اس کا چہرہ کیا نظر آتا..... پھر وہ بات بنانے کے لیے جلدی سے بولا:

"میرا مطلب ہے کیا تم مغلوں کی ہمدرد ہو۔"

"میرا باپ مغل ہے۔" عورت نے بے دھڑک جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے سر کو جنبش دی اور سر کے بالوں میں سجے گجرے سے خوشبو کا ایک بھپکا اٹھا۔ عنبر جھوم کر رہ گیا۔

"میں تمہیں گرفتار کرنے پر مجبور ہوں اے خوشبودار عورت۔" عنبر نے تلوار کی نوک پھر اس کی پشت سے لگا دی۔

"میں خوشبودار ہوں۔" عورت ہنسی۔

"ہاں تمہارے جسم سے پھولوں کی خوشبو آرہی ہے۔" عنبر نے کہا:

"اور مجھے پھول بہت پسند ہیں۔"

"میں نے بالوں میں گجرا لگا رکھا ہے تاتاری پہرے دار۔" عورت نے کہا:

"تمہیں خوشبو پسند ہے تو میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں پھولوں سے لاد دوں گی۔"

"مجھے بہکانے کی کوشش مت کرو۔" عنبر ذرا سختی سے بولا:

"میں سمجھ گیا۔ تم مغلوں کی جاسوس ہو۔ اب تم میری حراست میں ہو۔ تمہیں میرے ساتھ میرے لشکر میں چلنا ہوگا۔"

"میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ تم نے میری مشکل آسان کر دی..... " عورت نے کہا:

"مجھے اپنے سردار کے پاس لے چلو۔ میں انہیں ایک اہم پیغام پہنچانا چاہتی ہوں۔"

"پیغام؟..... " عنبر نے حیرت سے کہا:

"تم مغلوں کا پیغام لے کر آئی ہو۔"

"تم بہت بھولے ہو پہرے دار۔" عورت نے کہا:

"مغل عورتوں پر بھروسہ نہیں کرتے۔ میں اپنی ماں کا پیغام تاتاری سردار کو پہنچانا چاہتی ہوں..... اگر تمہارے سردار نے میری ماں کے مشورے پر عمل کیا تو شاید بچ جائے ورنہ اسے شکست ہوگی اور بڑی تباہی پھیلے گی۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" عنبر کو غصہ آگیا:

"تو تاتاریوں کی شکست کی پیش گوئی کر رہی ہے۔ کیا پیغام لائی ہے تو؟"

"میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔" عورت نے جواب دیا۔

"اچھا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" عنبر پریشان ہو گیا:

"مگر تجھے چھوڑوں گا نہیں۔" عنبر نے عورت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دو پہرے دار۔ میرے قبیلے میں دستور ہے کہ اگر کوئی مرد کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑ لے تو اسے اسی لڑکی سے شادی کرنا پڑتی ہے۔"

"تمہاری ابھی شادی نہیں ہوئی؟" عنبر نے رک کر پوچھا۔

"نہیں..... ہمارے ہاں شادی شدہ عورتیں گلے میں ہار ڈالتی ہیں اور کنواری لڑکیاں بالوں میں گجرے پہنتی ہیں..... ہم جادوگروں کا یہی دستور ہے۔"

"تم..... تم جادوگرنی ہو؟" عنبر نے گھبرا کر پوچھا۔

لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"میرا باپ جادوگر ہے مگر میری ماں جادو پسند نہیں کرتی....."

لڑکی اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی:

"لیکن میں تمہیں یہ سب کیوں بتا رہی ہوں۔ میں تو تمہارا نام بھی نہیں جانتی۔"

"عنبر....." عنبر نے جلدی سے کہا:

"اور تمہارا نام؟"

"تورکینہ....." لڑکی نے بتایا۔

"تمہاری باتیں بڑی دلچسپ ہیں تورکینہ..... کیا میں تمہارا ہاتھ پکڑ سکتا ہوں؟"

"اب تم میرا ہاتھ پکڑو گے تو مجھے اپنے گجرے اتار کر تمہارے گلے میں ڈالنا ہوں گے اور پھر....."

تورکینہ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر تم میرے شوہر ہو جاؤ گے۔" تورکینہ نے بے جھجک کہا۔

"لیکن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

عنبر کی گرفت بالکل ڈھیلی ہو گئی:

"ہمارے یہاں پہلے نکاح ہوتا ہے پھر دلہن رخصت ہو کر گھر میں آتی ہے۔"

"تو میں کب تمہارے گلے پڑ رہی ہوں۔"

تورکینہ نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا:

"میں تو اپنے قبیلے کا دستور بتا رہی تھی۔ میں صورت شکل کی بھی ایسی بری نہیں ہوں کہ لوگ مجھے پسند نہ کریں۔"

"پھر شادی کیوں نہیں کی؟ کسی مرد کا ہاتھ پکڑ لیا ہوتا۔" عنبر نے اسے چھیڑا۔

"میں کیوں کسی کا ہاتھ پکڑنے لگی۔"

وہ مصنوعی غصے سے بولی:

"ہاتھ تو مرد پکڑتے ہیں۔ سب مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں..... لیکن ماں نہیں مانتی۔"

"ہوں..... وہ تمہیں کسی بڑے مغل سردار کے حوالے کرنا چاہتی ہوگی۔" عنبر نے پھر طنز کیا۔

"اسے مغلوں سے نفرت ہے عنبر! میری ماں ایک خدا کو مانتی ہے۔ میرا باپ اسے اٹھا لایا تھا اور زبردستی اس سے شادی کر لی تھی۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے پہاڑی کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ ادھر تاتاری لشکر خیمہ زن تھا۔ جگہ جگہ پہرے دار سوار عنبر کو روک کر اس کا نام پوچھتے۔ عنبر اپنا نام بتاتا اور تورکینہ کو ساتھ لیے آگے بڑھتا رہا۔ تاتاری لشکر کے خیموں کی قطاریں شروع ہو گئی تھیں۔

ایک خیمے کے آگے بڑا الاؤ روشن تھا۔ اس کی روشنی میں عنبر نے تورکینہ کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ جنگلی دوشیزہ بے حد خوبصورت تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو عنبر؟"

تورکینہ مسکرائی:

"میں نے کہا تھا کہ میں اتنی بری نہیں ہوں۔"

"تم تو شبنم سے دھلی ہوئی پاکیزہ کلی ہو۔"

عنبر نے کہا اور تورکینہ کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ بولا:

"تورکینہ! لشکری تمہیں عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اب میں تمہیں کسی کے حوالے کیے دیتا ہوں۔ وہ تمہیں سردار کے پاس پہنچا دے گا۔"

"تم کیوں نہیں چلتے میرے ساتھ؟"

تورکینہ نے ٹھٹک کر پوچھا:

"کیا میں بری لگتی ہوں؟"

"یہ بات نہیں تورکینہ۔ اگر سردار نے پوچھا کہ میں نے اپنی جگہ کیوں چھوڑی تو میں کیا جواب دوں گا۔"

عنبر نے وضاحت کی۔

"ہاں۔ یہ بات تو ہے..... لیکن وعدہ کرو کہ ایک بار میرے پاس ضرور آؤ گے۔"

"تمہارے پاس؟ مگر کس جگہ؟" عنبر کے دل میں شوقِ ملاقات نے انگڑائی لی۔

"جس جگہ تم نے مجھے پکڑا تھا اس کے نیچے ایک خشک نالہ ہے۔ نالے کے اس پار ایک اور پہاڑی ہے۔ اس کے دونوں جانب پتھریلا راستہ ہے۔ اس پہاڑی کے پیچھے ہماری جھونپڑیاں ہیں۔ کسی سے بھی پوچھ لینا۔ سب مجھے جانتے ہیں۔ کل یا پرسوں ضرور آنا۔"

"کل یا پرسوں۔۔۔۔"

عنبر سوچ میں پڑ گیا۔ جنگ سر پر کھڑی تھی۔ وہ وعدہ کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"عنبر۔۔۔۔"

تورکینہ مسکرائی:

"تم ضرور آؤ گے۔ تمہیں آنا ہی پڑے گا۔ جب تمہارے لشکر کو شکست ہو جائے اور تمہیں کہیں پناہ نہ ملے تو میرے پاس آ جانا۔"

"شکست۔۔۔۔"

عنبر تھرا اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تورکینہ اس قدر اعتماد سے بار بار شکست کا ذکر کیوں کر رہی ہے۔ اس نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا:

"تورکینہ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تاتاریوں کو شکست نہ ہو۔"

"اگر تمہارے سردار نے میری ماں کی بات مان لی تو شاید شکست سے بچ جائے۔"

تورکینہ نے اسی اعتماد سے کہا:

"لیکن بارش تو ضرور ہو گی۔۔۔۔ موسلا دھار بارش۔۔۔۔ اور یہی بارش تاتاریوں کو شکست دے گی۔"

"بارش کیوں ہو گی۔ یہ بارشوں کا موسم تو نہیں۔"

"بارش کو مغلوں کے ساحر اپنے جادو کے زور سے بلا لیں گے۔"

تورکینہ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اور آسمان سے اتنا پانی برسے گا کہ تاتاریوں کے گھوڑے پانی اور خون میں آدھے آدھے ڈوب جائیں گے۔"

تورکینہ اس طرح کہہ رہی تھی جیسے کتابِ تقدیر اس کے سامنے کھلی رکھی ہو اور وہ اس کے اوراق الٹ رہی ہو۔

عنبر پر خوف سا طاری ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا:

"تورکینہ۔ اگر بارش تاتاریوں کو شکست کا باعث ہے تو کیا اس بارش کو روکا نہیں جا سکتا۔ جو بارش

بلائی جا سکتی ہے اسے روکنے کا بھی تو کوئی طریقہ ضرور ہو گا؟"

"ہاں۔ ہے کیوں نہیں۔۔۔۔ ہر سحر اور جادو کا توڑ ہوتا ہے۔"

تورکینہ نے فوراً جواب دیا:

"ہماری بستی کا ہر مرد ساحر ہے۔ وہ سب مل کر جادو جگائیں گے۔ بارش کا طوفان برپا ہو گا۔ اس دوران میں اگر کوئی، ان میں سے کسی ایک ساحر کو بھی قتل کر دے تو سحر ٹوٹ جائے گا۔۔۔۔ اور آسمان بالکل صاف ہو جائے گا۔"

عنبر پھٹی پھٹی آنکھوں سے تورکینہ کو دیکھ رہا تھا۔ تورکینہ کی باتیں اس کی فہم سے بالا تھیں۔ اس نے خود کو سنبھالا اور قریب سے گزرتے ہوئے ایک پہرے دار کو روک کر تورکینہ کو اس کے حوالے کر دیا۔

"اسے فوراً سپہ سالار کے پاس لے جاؤ۔ یہ مغلوں کے بارے میں کوئی پیغام لائی ہے۔"

اس نے پہرے دار کو سمجھا کر تورکینہ اس کے ساتھ کر دیا اور پھر خود اپنی پہرے والی جگہ پر واپس پہنچ گیا۔ یہ سب کچھ اسے ایک خواب سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر اسے موقع ملا تو وہ ایک بار ضرور تورکینہ سے ملنے جائے گا۔

O

یہ مغلوں اور تاتاریوں کی دوسری بڑی جنگ تھی۔

پہلی جنگ میں تاتاریوں کی تعداد صرف آٹھ ہزار تھی لیکن تیمور نے اپنی شجاعت اور حکمتِ عملی سے مغلوں کے تیس ہزار کے عظیم لشکر کو شکست دی تھی۔ مغلوں کا سردار بیکچک اور کچھ مغل سردار اور اس کا بیٹا گرفتار کر لیے گئے تھے۔

تیمور کے سالے امیر حسین نے اس جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن جب گرفتار ہونے والے مغلوں کے فیصلے کا وقت آیا تو وہ تیمور کو مشورہ دینے آ گیا۔

"سردار تیمور۔ ان مغل سرداروں کو فوراً قتل کر دینا چاہیے۔" امیر حسین نے بڑے رعب سے تیمور کو مشورہ دیا۔

"میں نے تم سے کب مشورہ طلب کیا ہے امیر حسین؟" تیمور نے بگڑ کر پوچھا۔ "یہ جنگ میں نے خود

جیتی ہے۔ گرفتار شدگان کا فیصلہ بھی میں خود کروں گا۔"

امیر حسین کو یہ جواب بڑا شاق گزرا مگر تیمور کی طاقت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اسے خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

تیمور نے امیر حسین کے مشورے کی کوئی پروا نہ کی۔ اس نے فوجی امیروں کو طلب کیا۔ تیمور کے حکم سے مغل سرداروں کو دوسرے قیدیوں کی طرح باندھ کر نہیں رکھا گیا تھا۔ انہیں کھانے کو بھی اچھا دیا گیا تھا۔ مغل سپہ سالار بیگ جک دوسرے سرداروں کے ساتھ تیمور کے بڑے خیمے میں داخل ہوا تو اس کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔

"بیگ جک! سر اٹھا کر بات کرو۔"

تیمور نے اسے اپنے سامنے قالین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تم جنگی قیدی ہو کوئی اخلاقی مجرم نہیں۔ ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں بیگ جک۔"

بیگ جک شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا لیکن اس کی نظریں اب بھی نیچی ہی تھیں۔ امیر حسین جلا بھنا جا رہا تھا۔ وہ مغلوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"بیگ جک! تم شکست کھا گئے لیکن تم نے بہادری سے مقابلہ کیا۔"

تیمور نے کہا:

"تم نے بلادِ شمال کے خانِ اعظم اور شاہِ سمرقند الیاس خواجہ کا حقِ نمک بھی ادا کر دیا۔ اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ ہم اس کا فیصلہ تم پر چھوڑتے ہیں۔"

بیگ جک نے قدرے بے اطمینانی اور حیرت سے سر اٹھا کر تیمور کو دیکھا اور بولا:

"فاتح سردار۔ ہم جنگی قیدی ہیں ہم نے آپ کے خلاف تلوار اٹھائی اور دست بدست لڑائی میں شکست کھائی ہے۔ آپ کو حق پہنچتا ہے کہ ہمارے بارے میں جو چاہے فیصلہ کریں۔ ہم آپ سے کسی رعایت کی قطعاً درخواست نہیں کریں گے۔"

"سردار تیمور!"

امیر حسین نے پھر دخل دیا:

"میرا مشورہ ہے کہ....."

"مجھے تمہارا مشورہ نہیں چاہیے امیر حسین۔"

تیمور نے اس کی بات کاٹ دی:

"گفتگو فاتح اور مفتوح کے درمیان ہو رہی ہے۔ مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔"

امیر حسین اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"ہاں بیگ جک!"

تیمور پھر مغل سردار سے مخاطب ہوا:

"فیصلے سے پہلے ہم تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

"فاتح سردار....."

مغل سپہ سالار نے تیمور سے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا:

"آپ ہمیں قتل کر کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کر لیں گے۔ ہمارے قبیلے کے بہت سے لوگ بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اگر آپ ہمیں زندہ چھوڑ دیں گے تو ہمارے اہلِ قبیلہ آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ [illegible] جائیں گے۔ آپ کو نئے حلیف مل جائیں گے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہمارے لیے موت اور زندگی یکساں ہے۔"

تیمور بیگ جک کے جواب سے بہت خوش ہوا:

"تم اور تمہارے ساتھی درحقیقت بہادر انسان ہیں۔"

پھر تیمور نے سردار ایلچی بہادر کو حکم دیا:

"مغل سرداروں کے لیے گھوڑے لائے جائیں..... اور ان کا تمام اسلحہ واپس کر دیا جائے۔"

مغل امیروں کے لیے سجے ہوئے گھوڑے لائے گئے۔ اسلحہ واپس کیا گیا جو انہوں نے اپنے جسموں پر سجا لیا۔ تیمور نے مزید مہربانی کرتے ہوئے انہیں بیش قیمت تحائف دے کر رخصت کیا۔ آیندہ چل کے اس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ اور تیمور کو بہت سے مغل قبائل کا تعاون حاصل ہو گیا۔

O

مغلوں کو شکست دینے کے بعد تیمور اپنی بیوی الجائی خاتون اور بیٹے جہانگیر کو لے کر اپنے شہر، شہر سبز کی طرف بڑھا۔ شہر سبز پر بیگ جک کے دوسرے بیٹے کا قبضہ تھا۔ اسے اپنے باپ کی شکست کا علم نہ تھا۔ اس کے پاس کچھ مغل فوج تھی۔

تیمور کی آمد کی اطلاع پا کر اس نے مقابلے کی تیاری کی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

تیمور اپنے خوبصورت شہر کو تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ شہر سبز، بغیر خون بہائے نقصان اٹھائے اسے حاصل ہو جائے۔ اس کے لیے اس نے تاتاری جنگ کا ایک پرانا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے شہر سبز کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے ساتھ صرف چند دستے تھے۔ وہ پورا لشکر، مغلوں سے مقابلے کے لیے جو آیا تھا۔ مغل اگرچہ شکست کھا کر دریائے اسمو اور دریائے سیر کا پورا علاقہ خالی کر گئے تھے لیکن ان کی واپسی متوقع تھی۔

محاصرہ کرتے وقت تیمور نے فصیل کے چاروں طرف گھوڑے دوڑا کر اس قدر گرد اڑائی کہ گرد کے بادل سے سورج تک چھپ گیا۔

مغلوں نے فصیل پر چڑھ کر دیکھا تو قلعے کے تین اطراف میں گرد ہی گرد دکھائی دی۔ مغلوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ تیمور، بے شمار لشکر کے ساتھ آیا ہے۔ تیمور ان کو یہی باور کرانا چاہتا تھا۔ اس نے ان کے بھاگنے کے لیے ایک راستہ کھلا رکھا تھا۔ مغل رات کے وقت، اسی راستے سے بڑی خاموشی کے ساتھ قلعہ چھوڑ کر نکل گئے اور تیمور کا بغیر کسی خون خرابے کے شہر سبز پر قبضہ ہو گیا۔

مغل بادشاہ الیاس خواجہ خان، تاتاریوں کا علاقہ خالی تو کر گیا لیکن سرحد سے کچھ دور جا کر ٹھہر گیا اور وہاں اپنا لشکر اکٹھا کیا۔ ابھی وہ جوابی حملے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس کے باپ کے مرنے کی اطلاع آ گئی۔ اس کا باپ، بلاد شمال کا خانِ اعظم، تغلق تیمور اپنے مرکز حصار المالیق میں مرا تھا۔

مغلوں کا دستور تھا کہ وہ خانِ اعظم کے مرنے کے بعد دوسرا خان منتخب کرتے تھے۔ اس کے لیے ایک مجلس ترتیب دی جاتی تھی جس میں تمام سردار اور بزرگ شرکت کرتے تھے۔ انتخاب کے اس طریقے کو مغل قورلتائی کہتے تھے۔

الیاس خواجہ ولی عہد سلطنت تھا لیکن قورلتائی سے تصدیق سے پہلے وہ خانِ اعظم کا لقب اختیار نہیں کر سکتا تھا اس لیے اسے مجبوراً حصار المالیق جانا پڑا۔ وہ بڑی تیزی سے حصار المالیق پہنچا اور قورلتائی کی تصدیق کے بعد لشکر سے آن ملا۔ اور پھر پوری رفتار سے تاتاری علاقے کا رخ کیا۔ . . . . لیکن تیمور اس سے بے خبر نہ تھا۔ شہر سبز سے چل کر اپنے لشکر میں آ پہنچا۔

پہلی جنگ کے برخلاف اس وقت فوجی توازن تیمور کے حق میں تھا۔ اب اس کے لشکر کی تعداد مغلوں سے

کہیں زیادہ تھی۔ امیر حسین بھی اپنے غوری قبائل، کابل کے گٹھیلے جوانوں اور ایرانی شہ سواروں کے ساتھ اس سے آ ملا۔ تیمور بہت پُر امید تھا۔

پھر ایک دن مغل لشکر میں ہل چل ہوئی۔ انہوں نے صفیں ترتیب دیں۔ تیمور نے بھی صفوں کو درست کرایا۔ اس کے لشکر کی تعداد زیادہ تھی اس لیے وہ کھلے میدان میں لڑنا چاہتا تھا۔ اس کے دستے آبِ بادام تک پھیلے ہوئے تھے۔ تیمور نے میمنہ (دایاں بازو) امیر حسین کے سپرد کیا اور اس میں زیادہ لشکر رکھا۔ میسرہ (بایاں بازو) خود سنبھالا۔

مغلوں نے لشکر ترتیب دینے کے بعد بھی پیش قدمی شروع نہیں کی۔ یہ امر تیمور کے لیے باعثِ حیرت تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ مغل آگے کیوں نہیں بڑھتے؟ وہ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟! اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ مغل، گھوڑے گھما گھما کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

معاً مطلع ابر آلود ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا آسمان بادلوں میں چھپ گیا۔

ایک لمحے کے لیے تیمور کے چہرے پر خوف کی ایک لکیر سی آ کر گزر گئی۔ اس کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے اور اس کی نگاہوں کے سامنے تورکینہ کا چہرہ گھوم گیا جو گزشتہ رات اس کے پاس اپنی ماں کا پیغام لے کر آئی تھی:

"مغل ساحروں کے جادو سے موسلا دھار بارش ہو گی۔ گھوڑے زمین میں دھنس جائیں گے۔ اپنی لشکر گاہ میں پانی کی نکاسی کے لیے نالیاں کھود لینا۔ گھوڑوں پر چمڑے کی جھولیں ڈال دینا۔ کمانوں کو بھیگنے سے بچانا۔ میدان چھوڑ کر اونچی جگہ پر لشکر جمانا۔"

چھما چھم پانی برسنے لگا۔

تیمور گم صم کھڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے تورکینہ کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور اس کی ماں کا شکریہ ادا کر کے اسے واپس بھیج دیا تھا لیکن اس وقت تورکینہ کی باتیں سچ معلوم ہو رہی تھیں۔

وہ انہی خیالوں میں گم تھا کہ مغلوں کا لشکر حرکت میں آ گیا۔ تیمور کا لشکر بھی حرکت میں آ گیا۔ تیمور اپنے رسالہ سواروں کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کے باقی دستوں نے کمانیں سنبھالیں اور تیر برساتے ہوئے آگے بڑھے مگر کمانیں بارش میں بھیگ کر بے کار ہو گئیں اور سواروں کو تلواروں کا سہارا لینا پڑا۔

تیمور کے دستوں نے بڑا طوفانی حملہ کیا تھا لیکن مغلوں نے روک کر انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ تاتاری دستوں میں افراتفری پھیل گئی۔ اور ان کے قدم اکھڑ گئے۔

تیمور نے فوراً رسالہ دستوں کے ساتھ حملہ کر دیا . . . . . اور مغلوں کو دور تک دھکیلتا چلا گیا . . . . مگر

نرم زمین میں گھوڑوں کے پیر دھنسنے لگے..... تاتاری بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے مگر تیمور نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنے سرداروں کے ساتھ مغل پرچم بردار شنگرم زبان پر حملہ کر دیا۔ وہ ایک بھاری بھرکم مغل تھا۔ اس نے حملہ روک کر تیمور پر تبر سے جوابی حملہ کر دیا۔ تیمور نے گھوڑا موڑ کر خود کو بچایا۔ اسی وقت جاکو برلاس نے نیزہ مار کر شنگرم زبان کو گرا دیا۔ مغلوں کا پرچم سرنگوں ہو گیا اور وہ گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

تیمور نے اپنا گھوڑا ایک پہاڑی پر چڑھا دیا اور میدانِ جنگ پر نظر ڈالی۔ امیر حسین شکست کھا کر پیچھے ہٹ آیا تھا۔ اور مغل اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تیمور نے واپس آ کر اپنے سرداروں کو جمع کیا اور مغلوں پر پشت سے حملہ کر کے ان کی صفوں میں گھس گیا۔ مغل بادشاہ الیاس خواجہ اپنے محفوظ دستوں کے لیے الگ کھڑا مغلوں کو لڑا رہا تھا۔

تیمور نے امیر حسین کو پیغام بھیجا کہ:

"یہ جوابی حملے کا بہترین موقع ہے۔ فوراً سنبھل کر حملہ کر دو۔"

امیر حسین اس پیغام پر جھنجھلا اٹھا اور بولا:

"کیا میں بزدل ہوں جو تیمور ایسا پیغام بھیج کر میرے آدمیوں کے سامنے مجھے ذلیل کر رہا ہے۔"

پیغام لے جانے والے نے واپس آ کر تیمور کو امیر حسین کا جواب سنا دیا۔ تیمور دانت پیس کر رہ گیا۔ تاتاری میں ابتری پیدا ہو گئی تھی۔ امیر حسین نے کوئی پیش رفت نہیں کی۔

تیمور نے ایک بار پھر کوشش کی اور امیر حسین کے پاس دو ایسے سرداروں کو پیغام دے کر بھیجا جو اس کے قریبی عزیز تھے..... مگر امیر حسین کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ اس نے بگڑ کر کہا:

"تیمور بار بار مجھے آگے بڑھنے کا حکم کیوں دے رہا ہے؟ میرے سوار منتشر ہو گئے ہیں۔ مجھے انہیں اکٹھا کرنا ہے۔"

پیغام لانے والے سردار کو غصہ آ گیا۔ اس نے بگڑ کر کہا:

"یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن غور کیجیے کہ اس وقت سردار تیمور اپنے مختصر دستوں کے ساتھ دشمن میں گھر گئے ہیں۔ اگر آپ نے بڑھ کر حملہ نہ کیا تو اس کا نتیجہ بڑا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

امیر حسین نے کوئی معقول جواب نہیں دیا اور نہ ہی آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اس کی اس بے اعتنائی سے لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ امیر حسین نے جان بوجھ کر حملہ نہیں کیا۔ شاید وہ چاہتا ہے کہ تیمور مارا جائے اور اس کے لیے میدان صاف ہو جائے۔

تیمور جس طرح لڑتا بھڑتا مغلوں میں داخل ہوا تھا اسی طرح ان کا گھیرا توڑ کر صاف نکل آیا لیکن اب ا...

تھا نہ جم سکے۔ اور اسے پسپا ہونا پڑا۔ اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے لڑائی رک گئی تھی۔

تیمور کو امیر حسین پر سخت غصہ تھا۔ اس نے رات کے وقت اپنی فوج کو اکٹھا کر کے کھیتوں میں قیام کیا۔ صبح کی جنگ میں اس کے کئی ہزار سوار اور بہت سے سردار کام آ گئے تھے۔

تمام رات تیمور بے چین رہا۔ اس نے کسی سے بات نہ کی۔ امیر حسین نے بھی کئی آدمی بھیجے مگر تیمور نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔

رات بھر اسے ساحروں کا خیال ستاتا رہا اور تورکینہ کی باتیں یاد آتی رہیں۔ تیمور نے لشکر میں علیم کو تلاش کروایا لیکن وہ کہیں نہ مل سکا۔ شاید وہ بھی لڑائی میں کام آ گیا تھا۔

وہ رات تیمور پر بہت بھاری گزری۔ سب سے زیادہ اسے امیر حسین کی بدمزاجی اور بے وفائی کا دکھ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ کبھی امیر حسین کے ساتھ مشترکہ کمان میں جنگ نہیں کرے گا۔

رات بھر بجلی کڑکتی اور بادل گرجتے رہے لیکن صبح ہوتے ہی پھر بارش نے آ گھیرا۔ تیمور کو بہرصورت مقابلہ کرنا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور بچا کھچا لشکر لے کر میدان میں اتر آیا۔ مگر بارش کی وجہ سے میدان جھیل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ گھوڑوں کے پیر نرم زمین میں دھنستے جا رہے تھے۔ بعض گھوڑے تو گھٹنوں گھٹنوں زمین میں دھنس گئے تھے۔ سواروں کو پیدل لڑنا پڑا۔

مغلوں کے مقابلے پر آج صرف تیمور کا لشکر تھا۔ امیر حسین کو نہ تو اس نے بلایا اور نہ ہی وہ خود آگے بڑھ کر جنگ میں شریک ہوا۔ شدید بارش کی وجہ سے اس کی کوئی حکمتِ عملی کام نہ آ رہی تھی۔ مغلوں کے گھوڑوں پر چمڑے کی جھولیں پڑی تھیں یا کمبل ڈھکے ہوئے تھے۔ انہیں بارش کی آدھی کلفت بھی برداشت نہ کرنا پڑی۔ ساری قیامت تیمور کے لشکر پر گزری۔ ہزاروں تاتاری کھیت رہے۔ مغلوں نے چاروں طرف سے یلغار کر دی۔ تیمور کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس نے منظم پسپائی اختیار کی اور اسے شکستِ فاش ہوئی۔

تیمور میدانِ جنگ سے ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ امیر حسین کا ایک سوار گھوڑا اڑاتا ہوا تیمور کے پاس آیا لیکن تیمور نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ خود ہی بولا:

"سردار تیمور۔ شاہ کابل نے پیغام بھیجا ہے کہ آپ سمرقند کے بجائے ہندوستان کی طرف نکل جائیں۔"

تیمور نے کوئی جواب نہ دیا۔ سوار واپس چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد دوسرا پیغام آیا:

"شاہ کابل کا مشورہ ہے کہ آپ سمرقند کا رخ نہ کریں۔ ہندوستان میں آپ کو امن و سکون ملے گا۔ میں بھی ہندوستان جا رہا ہوں۔"

تیمور نے گھوڑا روک کر سوار کو گھورا اور کہا:

"امیر حسین سے کہنا کہ تم ہندوستان جاؤ یا جہنم میں۔ مجھے کیا..... میں جانتا ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا ہے؟"

تیمور نے اتنی گرجدار آواز میں کہا کہ سوار خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

تیمور نے گھوڑا بڑھایا مگر ذرا دور چل کر ٹھٹھک گیا۔ بارش رک گئی تھی اور آسمان بادلوں سے صاف ہوتا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں سورج پوری تمازت سے چمکنے لگا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔

تیمور کو تورکینہ کے الفاظ یاد آ گئے:

"تاتاری سردار۔ اگر تم نے بارش سے بچاؤ کا انتظام نہ کیا تو بارش تمہیں میدان سے بھگا دے گی اور طوفان اس وقت تھمے گا جب تاتاریوں کو شکست ہو جائے گی!"

○

تورکینہ جب اپنی ماں کا پیغام تیمور کو دے کر واپس آئی تو فوراً تو عنبر اسی پہاڑی پر پہرے داری کر رہا تھا۔ عنبر نے قدموں کی چاپ سے تورکینہ کو پہچان لیا اور لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا:

"سردار کو پیغام پہنچا دیا تورکینہ؟" عنبر نے پوچھا۔

"ہاں....." تورکینہ رک کر بولی۔

عنبر کو تورکینہ کی آواز میں تھکن اور روکھا پن محسوس ہوا۔ اندھیرے میں وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس نے پوچھا:

"تورکینہ، کیا سردار نے تمہیں ڈانٹا ہے؟"

تورکینہ خاموش رہی۔

"تورکینہ!"

عنبر نے بڑے پیار سے کہا:

"کوئی خاص بات ضرور ہوئی ہے۔ اگر تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو تو بتا دو۔"

"نہیں عنبر۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔"

تورکینہ دبی دبی آواز میں بولی:

"لیکن مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے سردار کو میری ماں کی بات کا اعتبار نہیں آیا۔ انہوں نے میری باتوں پہ کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حالانکہ ماں نے جو کچھ کہا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ عنبر! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔ میں..... میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ....."

اس کی آواز بھرا گئی تو وہ آگے نہ بول سکی۔

"میں جانتا ہوں تم کیا چاہتی ہو تورکینہ!"

عنبر نے کہا:

"تم چاہتی ہو کہ میں موت سے ڈر کر جنگ سے دور رہوں..... تورکینہ! ملک کو آزاد کرانا سب سے بڑا جہاد ہے۔ ہم مسلمان ہیں..... مغل بے دین۔ میں شہید ہو جاؤں گا لیکن میدان نہیں چھوڑوں گا۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں عنبر!"

تورکینہ الجھتے ہوئے بولی:

"جان سب سے پیاری چیز ہے۔ جان کی حفاظت جانور تک کرتے ہیں..... پھر تم خود کو بچانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے..... بادشاہوں کی لڑائی میں سپاہیوں کو کیا ملتا ہے؟"

"تم سمجھو یا نہ سمجھو مگر میں میدان نہیں چھوڑ سکتا۔"

عنبر نے زور دے کر کہا:

"کچھ بھی ہو جائے میں مغلوں کا مقابلہ کروں گا۔"

"تمہاری مرضی عنبر!"

تورکینہ نے ہار مان لی:

"لیکن اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے تو میری جھونپڑی میں چلے آنا۔ میں تمہاری حفاظت کروں گی۔"

"تمہارا خیال ہے کل جنگ ضرور ہوگی؟"

"کل بارش ضرور ہوگی۔"

تورکینہ بولی:

"تمام جادوگروں نے یقین دلایا ہے۔ ان کی کوئی بات جھوٹی نہیں ہوتی۔ اگر بارش ہوگی تو جنگ بھی ہوگی۔ جب تک بارش نہیں ہوگی مغل جنگ شروع نہیں کریں گے۔"

"تم نے بتایا تھا کہ بارش رک بھی تو سکتی ہے"۔ عنبر کو ایک دم یاد آیا۔

"ہاں.... اگر ایک جادوگر بھی مار ڈالا جائے تو بارش رک جائے گی"۔

"ٹھیک ہے۔ بس اب تم جاؤ"۔

"کیا ٹھیک ہے"۔

تورکینہ نے پوچھا؛

"کیا تم میرے پاس آؤ گے؟"

"میں ایک بار تم سے ملنے کی کوشش ضرور کروں گا"۔ عنبر نے اسے یقین دلایا۔

تورکینہ نے خوش ہو کر عنبر کو پھولوں کا ایک گجرا دیدیا؛

"اسے اپنے پاس رکھ لو۔ یہ تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا"۔

"یہ پھول تو صبح تک مرجھا جائیں گے"۔ عنبر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"پھول مرجھانے کے بعد بھی کسی نہ کسی کام آجاتے ہیں..... اگر مرجھائی ہوئی ایک پتّی بھی تمہارے پاس رہ جائے تو میری یاد دلانے کے لیے کافی ہوگی"۔

عنبر نے گجرے میں سے ایک پھول نکال لیا اور باقی گجرا اسے واپس کرتے ہوئے بولا؛

"بس ایک پھول کافی ہے۔ گجرے میں خوشبو زیادہ ہے جو کسی بھی وقت میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے"۔

تورکینہ واپس چلی گئی۔

تمام رات عنبر رات بھر خیالوں سے الجھتا رہا۔

صبح دم مغلوں کے لشکر میں جنگ کے آثار پیدا ہوئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حملہ کرنے والے ہوں۔ تاتاری بھی تیار ہو گئے۔ عنبر کی پہاڑی پہ تیر اندازوں کا ایک تازہ دم دستہ بھیج دیا گیا..... لیکن دوپہر تک کسی طرف سے پہل نہیں ہوئی۔

عنبر کو تورکینہ کی باتیں خیالی معلوم ہوئیں۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ایک دم بادل گھر آئے..... اور پھر موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مغلوں نے بڑھ کر حملہ کر دیا۔

تاتاری تیر اندازوں نے اپنے ترکش خالی کرنے شروع کر دیے لیکن کمانیں بھیگ کر بے کار ہو گئیں۔ تیر اندازوں کو تلواریں نکال کر آگے بڑھنا پڑا۔ عنبر حیرت سے آسمان سے برستے پانی کو دیکھ رہا تھا اور بار بار اس کی نظر اس پہاڑی کی طرف اٹھ جاتی جس کے دوسری طرف تورکینہ کے قبیلے والے رہتے تھے۔

مغل یلغار کرتے پہاڑی کے چاروں طرف پھیل گئے۔ عنبر کے بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ اسے

مجبور ہو کر ایک چٹان کے پیچھے پناہ لینی پڑی۔

جنگ زوروں پر تھی۔ گھوڑوں کے ہنہنانے، سپاہیوں کی چیخ و پکار اور نقارے بجنے کی آوازیں آرہی تھیں اور عنبر پہاڑی پر محصور ہو کر رہ گیا تھا۔

رات ہونے پر جنگ رک گئی۔

عنبر اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا..... بارش تقریباً رک گئی تھی۔ اس نے اپنے لشکر کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ مغل سوار ہر طرف بھاگتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے خیمے آگے بڑھ کر لگا لیے تھے اور جگہ جگہ الاؤ روشن تھے۔

عنبر کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ تاتاری شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ تورکینہ نے سچ کہا تھا.... بارش ہو گی تو جنگ ہو گی اور تاتاریوں کو شکست ہو گی۔

وہ سوچنے لگا۔ ساحر..... جادو..... یہ سب کیا ہے؟ جادوگر بھی جنگ لڑتے ہیں؛ عنبر رات بھر انہی خیالوں میں کھویا رہا۔

اگلی صبح بھی بارش شروع ہو گئی۔

کچھ دور تاتاریوں کے نقارے بھی بجتے سنائی دیے۔ عنبر خوش ہو گیا۔ تاتاری واپس آ رہے تھے۔ عنبر میں جوش پیدا ہو گیا۔ اس نے سوچا وہ اپنے لشکر میں شامل ہو کر زبردست حملہ کرے گا اور..... داد شجاعت دے کر سردار تیمور کی خوشنودی حاصل کرے گا..... لیکن عنبر کے ارمان دل ہی میں رہے جا رہے تھے۔ کمان تو پہلے ہی بیکار ہو چکی تھی اب اسے تلوار یا خنجر بھی چلانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ چوہے کی طرح بل میں چھپ کر بیٹھنا بزدلی سمجھتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

جنگ شروع ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے لیکن تاتاری ابھی تک پہاڑی کے قریب نہیں پہنچے تھے۔ بارش زور و شور سے جاری تھی۔

"اگر یہ طوفانی بارش رک جائے تو؟....." عنبر نے سوچا۔

"لیکن کیسے رکے؟ ہاں۔ اگر ایک بھی جادوگر کو ہلاک کر دیا جائے تو یہ طوفان رک سکتا ہے"۔ تورکینہ نے یہ بات بڑے وثوق سے کہی تھی..... پھر..... پھر..... میں ایک جادوگر کو ہلاک کر دوں گا اور یہ بارش رک جائے گی۔

عنبر ایک عزم کے ساتھ اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا۔ اس نے جنگ کی طرف کان لگائے۔ تاتاریوں کے نقارے کی آوازیں اور زیادہ دور ہو گئی تھیں۔ "تاتاری شکست کھا کر شاید اور پیچھے ہٹ گئے ہوں"۔ وہ سوچتے ہوئے پہاڑی

کے دوسری طرف اترنے لگا۔ تیز بارش کی وجہ سے اسے اترنے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔

وہ سنبھل سنبھل کر اترتے ہوئے نیچے پہنچ گیا۔ مغل لشکر تاتاریوں سے الجھا ہوا تھا اور مغل لشکرگاہ کے محافظ خیموں میں دبکے بیٹھے تھے۔ اس لیے عنبر کو اترتے کسی نے نہ دیکھا۔

عنبر اس پہاڑی کی طرف چل پڑا جس کے دوسری طرف جادوگروں کی بستی تھی۔ عنبر کے دل و دماغ سے اس وقت نورکینہ اور اس کی محبت کا خیال نکل گیا تھا۔ اس کی جگہ جذبۂ حب الوطنی نے لے لی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایک جادوگر کو ضرور قتل کرے گا۔ خواہ اس میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

عنبر دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ اس وقت دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ عنبر دریا میں اترا۔ دریا کی گہرائی کم تھی لیکن روانی بہت تیز تھی۔ عنبر کے پیر نہ ٹکتے تھے۔ اوپر سے بارش۔ پہاڑیوں کا تمام پانی اسی راستے سے بہ رہا تھا۔ بہر حال وہ دھارے کو کاٹتا ہوا کسی نہ کسی طرح دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اب وہ دوسری پہاڑی کے دامن میں تھا۔

وہ چکر کاٹ کر دوسری طرف پہنچا تو ساحروں کی جھونپڑیاں اس کے سامنے تھیں۔ ہر جھونپڑی ایک ہی وضع قطع کی تھی اور ہر جھونپڑی سے دھواں نکل رہا تھا جیسے اندر آگ جل رہی ہو۔

عنبر کا دل زور سے دھڑکا۔ کہیں نورکینہ سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ اس نے دل مضبوط کیا اور چٹانوں کی آڑ میں بڑھنے لگا۔ بڑھتے بڑھتے وہ ایک جھونپڑی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ تمام جھونپڑیوں کے دروازے سامنے کی طرف تھے۔

عنبر جھونپڑیوں کی پشت پر پہنچا اور ایک جھونپڑی میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن اسے جلتے ہوئے الاؤ کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ عقب سے جھونپڑی میں داخل ہونا مشکل تھا۔ سوائے سامنے کے دروازے کے جھونپڑی کے اندر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

اس نے خنجر نکال کر منہ میں دبایا۔ تلوار ہاتھ میں لی اور جھونپڑی کے دروازے پر لٹکے ہوئے چمڑے کے پردے کو ذرا سا ہٹا کر جھانکا۔

الاؤ سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے اور الاؤ کے دوسری طرف ایک تنومند جادوگر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی جٹائیں شانوں سے گزرتی ہوئی فرش پر آ رہی تھیں۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے۔ اس کے نیم برہنہ جسم پر رنگ برنگی دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے دائیں اور بائیں لکڑی اور پتھر کی کنڈالیاں رکھی تھیں جن میں سے وہ کوئی چیز نکال کر الاؤ میں جھونک رہا تھا اور ساتھ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

عنبر کے جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی اس کی بند آنکھیں کھل گئیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کے بھیانک چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے لیکن پھر فوراً ہی اس نے قریب پڑا برچھا اٹھا کر عنبر پر دے مارا۔ عنبر ایک طرف

ہٹ گیا۔ برچھا دروازے میں اٹک گیا۔ دونوں کے درمیان الاؤ کے علاوہ اور بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ عنبر آگے بڑھا تو ایک بڑا سا برتن اس کی ٹھوکر سے الٹ گیا۔ اس میں شاید کوئی روغن بھرا ہوا تھا۔ روغن بہ کر الاؤ میں گر گیا۔ جس سے ایک زبردست شعلہ بلند ہوا اور گھاس کی چھت نے آگ پکڑ لی۔ پوری جھونپڑی میں دھواں بھر گیا۔

ساحر نے عنبر پر جست لگائی اور اپنے بھاری بدن کے ساتھ عنبر سے ٹکرایا۔ عنبر کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور منہ میں دبا ہوا خنجر بھی گر گیا۔

جھونپڑی نے آگ پکڑ لی تھی اور ساحر اس سے لپٹا ہوا تھا۔ عنبر نے پوری طاقت سے ساحر کو دھکا دے کر خود سے الگ کیا اور لپک کر اپنا خنجر اٹھایا پھر اس نے خنجر سے ساحر پر حملہ کر دیا۔ ساحر نے اس کی کلائی پکڑ لی مگر عنبر نے جھٹکا دے کر کلائی چھڑائی اور خنجر ساحر کے سینے میں پیوست کر دیا۔ ساحر لڑکھڑایا اور پھڑکتے ہوئے الاؤ میں جا گرا۔

عنبر نے اطمینان کی سانس لے کر خنجر کمر میں اڑسا۔ تلوار اٹھائی اور تیزی سے جھونپڑی سے نکل آیا۔ باہر اب تک بارش ہو رہی تھی۔ عنبر نے ایک نظر جلتی ہوئی جھونپڑی پر ڈالی۔ پھر بھاگتا ہوا دریا کے پاس گیا اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

ابھی وہ اپنی پہاڑی کے پاس بھی نہ پہنچا تھا کہ بارش ایک دم رک گئی۔ بادل پھٹ گئے اور سورج نکل آیا۔ عنبر دوڑتا ہوا پہاڑی پر پہنچ گیا۔ اسے خطرہ تھا کہ سورج کی روشنی میں اسے کوئی دیکھ نہ لے۔ پھر اپنی پناہ گاہ میں پہنچ کر وہ اپنے گیلے کپڑے نچوڑنے لگا۔

"بارش رک گئی ہے"۔۔۔۔ وہ سوچنے لگا۔ اب تاتاریوں کو شکست نہیں ہوگی۔ وہ مغلوں کو شکست دیدیں گے۔ اس نے چٹان کی اوٹ سے جھانک کر مغل خیموں کی طرف دیکھا۔ مغل اطمینان سے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اس نے کان اس طرف لگا دیے جدھر جنگ ہو رہی تھی۔ وہ تاتاریوں کے نقاروں کی آواز سننے کے لیے بے چین تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بارش رکتے ہی تاتاریوں نے جوابی حملہ کیا ہوگا اور وہ جلد ہی مغلوں کو پسپا کرتے ہوئے ایک بار پھر اس میدان میں آ جائیں گے کیونکہ اس نے ساحروں کا سحر توڑ دیا ہے۔

عنبر دیر تک نقاروں کی آواز پر کان لگائے رہا مگر کوئی آواز نہ آئی۔

دوپہر ڈھل گئی۔

سہ پہر آ گئی۔

مگر عنبر کے کانوں میں کوئی آواز نہ آئی۔ اس کی پریشانی بڑھ گئی۔ تاتاریوں نے جوابی حملہ کیوں نہیں کیا! اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ پھر اسے میدانِ جنگ کی طرف سے کچھ سوار تیزی سے آتے دکھائی دیے۔ ان کے چہرے پر رونق

آ گئی۔ یقیناً یہ مغل سوار ہیں، جو میدانِ جنگ سے بھاگ کر آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے مغلوں کا شکست خوردہ لشکر بھی آ تا ہو گا۔

ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ مغل سوار خیموں کے پاس پہنچ گئے۔ لشکر گاہ کے مغلوں نے انہیں گھیر لیا۔ آن کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر تمام مغل خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ انہوں نے شراب کے قدح لنڈھانا شروع کر دیے۔ وہ شراب پیتے اور اندر باہر بھاگتے پھر رہے تھے۔

عنبر کا دل بیٹھ گیا۔

مغلوں کو فتح حاصل ہوئی تھی اور تاتاری شکست کھا گئے تھے۔ اسی وقت فاتح مغلوں کا لشکر واپس آنا شروع ہو گیا۔ وہ ڈھول پیٹتے، نقارے بجاتے آ رہے تھے۔ مغل بادشاہ الیاس خواجہ کا گھوڑا آگے آگے تھا۔ کئی مغل سردار اس کے گھوڑے کی لگام پکڑے پیدل چل رہے تھے۔ مغل لشکر، جلوس کی شکل میں، میدانِ جنگ سے شاداں آ رہا تھا۔

عنبر نے ایک پتھر سے ٹیک لگا لی۔ احساسِ شکست سے اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

○

تیمور نے سمرقند کی طرف پسپائی اختیار کی۔ مغل بہت محتاط تھے۔ انہوں نے تیمور کا تعاقب نہیں کیا۔ وہ اس کی شجاعت اور جنگی مہارت سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر انہوں نے تیمور کا تعاقب کیا تو وہ کہیں پہاڑوں اور دروں میں گھیر کر ان پر حملہ نہ کر دے۔

الیاس خواجہ خان اپنی خیمہ گاہ میں واپس آ گیا۔ وہ تازہ دم ہو کر زیادہ عسکری طاقت کے ساتھ سمرقند کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یہ فتح اسے صرف بارش کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اگر ساحر اس کی مدد نہ کرتے تو وہ تیمور کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سمرقند پر حملہ کرتے وقت ان ساحروں سے پھر کام لے گا۔

تیمور کی شکست کی خبر اس سے پہلے سمرقند پہنچ گئی تھی۔ اہلِ سمرقند سخت پریشان تھے۔ مغلوں کا سمرقند کی طرف بڑھنا یقینی تھا۔ اس لیے سمرقند والوں نے تیمور کے پہنچنے سے پہلے ہی سمرقند کے قلعے کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ فصیلوں کو درست کیا گیا۔ سامانِ خورد و نوش کا وافر ذخیرہ کر لیا گیا۔

جب تیمور کا شکستہ دل اور تھکا ہارا لشکر سمرقند میں داخل ہوا تو اہلِ سمرقند نے آنکھیں بچھا دیں اور تیمور کو اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ وہ جانتے تھے کہ سوائے تیمور کے مغلوں کی یلغار کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ان کی تمام امیدیں صرف تیمور سے وابستہ تھیں۔

تیمور کو مغلوں کے ہاتھوں پہلی بار اتنی زبردست شکست اٹھانا پڑی تھی۔ اس کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری۔ مغلوں کا اس کا تعاقب نہ کرنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ فتح کے باوجود وہ تیمور سے خائف تھے اور سمرقند کی طرف بڑھنے سے گھبرا رہے تھے۔

تیمور کچھ دن سمرقند میں ٹھہرا رہا۔ اس نے فصیلوں کا معائنہ کیا۔ فوج کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ آدھی سے زیادہ فوج برسات کی اس جنگ میں ماری جا چکی ہے۔ تیمور کے کئی با اعتماد اور بہادر سردار بھی اس جنگ میں کام آ گئے تھے۔ اسے فوج کی سخت ضرورت تھی۔ سمرقند میں اتنی فوج موجود نہ تھی کہ قلعے سے نکل کر مغلوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اس نے پہلے مدافعتی جنگ کا فیصلہ کیا۔ اس کے جاسوس سوار روز کی خبریں اس تک پہنچا رہے تھے۔

مغلوں نے میدانِ قتیہ ملتن سے اب تک قدم آگے نہ بڑھائے تھے۔ وہ اپنے مستقر حصار المالیق سے مزید کمک کا انتظار کر رہے تھے۔ مغلوں کا جانی نقصان کم ہوا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ سمرقند میں مقابلہ سخت ہو گا اس لیے وہ پوری تیاری سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

ایک ماہ گزر جانے کے باوجود جب مغل سمرقند نہ پہنچے تو تیمور کی رگِ شجاعت نے جوش مارا۔ اسے قلعہ بند ہو کر بیٹھنے سے شرم آنے لگی۔ کچھ ہی دن پہلے وہ مغلوں کو اپنی سرحدوں سے پرے دھکیل چکا تھا اور اب خود اسے ان کے حملے کا انتظار تھا۔

تیمور نے تازہ دم فوج بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مدافعتی نظام کو درست کیا۔ پھر سمرقند کے قاضی کو قلعے کی باگ ڈور سپرد کر کے اپنے شہر شہر سبز کی طرف چل پڑا۔

○

تیمور شہر سبز پہنچا تو اس کے مرشد مولانا زین الدین، شہر کے چند معززین کے ساتھ سرحد پر اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ تیمور نے گھوڑے سے اتر کر مولانا کو سلام کیا۔ مولانا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دینے کے بعد جو پہلا جملہ ان کے منہ سے ادا ہوا، وہ تھا:

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

تیمور نے حیرت سے مولانا کی طرف دیکھا۔

"تیمور . . . . ." مولانا نے گردن نیچی کر کے کہا:

"خدا کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں۔ صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"کیا جہانگیر . . . ." تیمور اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔

"جہانگیر خیریت سے ہے لیکن الجائی خاتون آغا اب ہم میں موجود نہیں۔" مولانا نے دوبارہ تیمور کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

تیمور کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکی نکلی جسے کوئی دوسرا نہ سن سکا۔ الجائی خاتون ایک دم بیمار پڑی اور تیسرے دن بڑی خاموشی سے اس دنیا کو چھوڑ گئی۔ طبیب اس کی بیماری کی تشخیص نہ کر سکا۔ الجائی خاتون کو انتقال کیے پانچ دن ہو گئے تھے۔ مولانا کو معلوم ہو چکا تھا کہ تیمور شہر سبز کی طرف چل پڑا ہے۔ لہٰذا انہوں نے یہ ناخوشگوار فرض خود ادا کرنے کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔

تیمور پہلے ہی خاموش طبیعت اور تنہائی پسند تھا۔ الجائی خاتون کی موت نے اسے حقیقتاً تنہا کر دیا۔ اس کی خاموشی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ وہ دن بھر نئی فوج کی بھرتی کے سلسلے میں خود کو مصروف رکھتا لیکن رات کی تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑتی۔

تیمور شہر سبز میں فوج بھرتی کرنے میں مصروف تھا کہ مغل بڑھ کر سمرقند کے مضافات میں پہنچ گئے۔ امیر حسین اگر چاہتا تو مغلوں کو کچھ دن روک سکتا تھا لیکن اس نے مغلوں کے سامنے آنے کی جرأت نہ کی بلکہ سمرقند سے کچھ اور دور چلا گیا۔

اہل سمرقند مغلوں کی آمد سے بہت پریشان ہوئے۔ قاضی شہر نے بلخ کے مفتی سے امداد طلب کی۔ مفتی فوراً بلخ کے دستوں کے ساتھ سمرقند چل پڑا۔ راستے میں تاتاری بھی اس کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

مفتی نے اپنے قلیل لشکر کے ساتھ مغلوں کا مقابلہ کیا اور انہیں سمرقند کے مضافات ہی میں روک لیا۔ مغل فاتح ہونے کے باوجود خائف تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ تمام تاتاری ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے ہیں۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ ان کے مقابل ایک نیا لشکر ہے جس میں امیر تیمور یا امیر حسین موجود نہیں ہے بلکہ وہ ایک نئے تازہ دم لشکر کے ساتھ سمرقند کے قلعے میں مقیم ہیں۔ اس خبر نے مغلوں کو پریشان کر دیا۔

ادھر مفتی بلخ نے مغلوں کے رسد کے ذخائر پر شب خون مار کر انہیں تباہ کر دیا۔

تیمور کو شہر سبز میں مغلوں کے بارے میں جو پہلی خبر دی گئی وہ بڑی حیرت انگیز تھی۔ تیمور فوج جمع کر کے

سمرقند کی طرف کوچ کا ارادہ کر رہا تھا کہ سمرقند کے عالموں کا ایک وفد اس کے پاس پہنچا۔ تیمور انہیں دیکھ کر سمجھا کہ وہ اس سے کمک حاصل کرنے آئے ہیں۔ اس نے گفتگو میں خود پہل کی۔

"اے سمرقند کے علمائے کرام!" تیمور گمبھیر آواز میں بولا۔

"میں نے یہاں آ کر ایک دن بھی آرام نہیں کیا۔ رات دن تازہ فوج اکٹھا کرنے میں مصروف ہوں۔ خدا کے فضل سے اب میرے پاس اتنی فوج ہو گئی ہے کہ میں قلعہ بند ہونے کے بجائے کھلے میدان میں مغلوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔"

"اے تاتاریوں کے سچے رہنما!" ایک عالم نے اسے بڑی عزت سے مخاطب کیا:

"خدا نے تاتاریوں اور آپ پر اپنا فضل کیا۔ اب مغلوں سے کھلے میدان میں بھی مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔"

"کیوں . . . . ! کیا مغلوں نے سمرقند کے محاصرے کا خیال ترک کر دیا؟" تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

"مغل سمرقند آئے اور منہ کی کھا کر چلے گئے۔" دوسرے عالم نے بتایا۔

"کیا مغل شکست کھا گئے؟" تیمور کو یقین نہیں آیا۔

"ہاں معزز سردار۔ مغل لشکر سمرقند کے مضافات تک پہنچ گیا تھا لیکن بلخ کا مفتی ہماری مدد کو آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا لشکر لایا تھا۔ اس نے مغلوں کو روک لیا اور شب خون مار کر ان کا ناک میں دم کر دیا۔ پھر اللہ کا ایک فضل اور ہوا۔ آسمانی بلاؤں نے مغلوں کو گھیر لیا۔ ان کے گھوڑوں میں کوئی ایسی بیماری پھیلی کہ ایک ایک دن میں کئی کئی سو گھوڑے مرنے لگے۔ چاروں طرف بدبو پھیل گئی اور راستے بند ہو گئے۔ مغل گھبرا کر پسپا ہو گئے۔"

دوسرے دن تیمور کے چند سردار سمرقند سے آ گئے۔ انہوں نے مغلوں کے بارے میں مزید انکشافات کیے۔ ایک سردار نے بتایا:

"اے امیر! اللہ کی بھیجی ہوئی وہ بیماری ایسی تھی کہ مغلوں کا ایک گھوڑا بھی زندہ نہ بچا۔ سب پیدل ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کے بادشاہ الیاس خواجہ خان تک کو گھوڑا نصیب نہیں ہوا۔ ہم نے ان کا تعاقب کیا اور جس قدر مغل مار سکتے تھے مار ڈالے۔ باقی اپنی جانیں بچا کر نکل گئے۔"

تیمور کے لیے یہ مژدہ جانفزا تھا۔ اس نے فوج کو سمرقند کی طرف کوچ کا حکم دیدیا۔

امیر حسین نے عملاً مغلوں کی خلاف دو جنگوں میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن جب اسے مغلوں کی شکست اور مراجعت کی اطلاع ملی تو فوراً اپنے لشکر کے ساتھ سمرقند پہنچ گیا۔ سمرقند والوں کو تیمور اور امیر حسین کے اختلافات کی کوئی خبر نہ تھی۔ انہوں نے امیر حسین کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لوگ خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ انہوں نے محلوں اور بازاروں

کو خوب سجا رکھا تھا۔ انہوں نے امیر حسین کا شاہانہ استقبال کیا۔ امیر حسین کا دادا امیر قزعن سمرقند کا حاکم تھا۔ اس لیے وہ سمرقند کی حکومت پہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ عوام کو بھی اس کی حاکمیت پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

تیمور اب تک سمرقند نہ پہنچا تھا۔ اور دونوں کے اختلافات کھل کر عوام کے سامنے نہیں آئے تھے۔ اس لیے امیر حسین کو سمرقند کا حاکم تسلیم کر لیا گیا۔ امیر حسین نے فوراً چنگیز خان کے خاندان کے ایک شخص کو جس کا نام ادغلن بردورچی تھا، اپنی طرف سے بادشاہ نامزد کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک رنگا رنگ محفل میں اس نام نہاد بادشاہ کی شاہانہ رسومات ادا کی گئیں اور امیر حسین نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کسی وقت مغلوں اور تاتاریوں کے بزرگوں میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ بادشاہت مغل کریں گے اور تاتاری مغلوں کے نام پر اپنے اپنے علاقوں کے حاکم ہوں گے اور سپہ سالار کہلائیں گے۔ امیر حسین کا دادا امیر قزعن بھی اسی معاہدے کے تحت مغلوں کے نام پہ سمرقند کا حاکم تھا جس پر اب اس کا پوتا قابض تھا۔

تیمور جب سمرقند پہنچا تو وہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سمرقند کے لوگوں نے تیمور کی بھی دل کھول کر پذیرائی کی اور اس کا شاہانِ شان استقبال کیا لیکن تیمور کو وہ مقام نہ مل سکا جو امیر حسین اس کی عدم موجودگی میں حاصل کر چکا تھا۔ اس کا درجہ امیر حسین سے کم تھا۔ گو کہ اس کا لشکر زیادہ تھا لیکن امیر حسین نے اسے زمین کی تقسیم، مالیہ کی وصولی اور دیوانی مقدمات کے فیصلے کرنے کا اختیار تفویض کر دیا۔ یہ فرائض تیمور کے مرتبے سے بہت کم تھے اور یہیں سے دونوں کے اختلافات میں شدت پیدا ہوئی۔

امیر حسین کو خطرہ تھا کہ اگر تیمور کی طاقت کو کمزور نہ کیا گیا تو وہ ایک دن سمرقند پہ قابض ہو جائے گا۔ تیمور کے پاس لشکر بھی زیادہ تھا اور وہ جنگی حکمتِ عملی میں بھی امیر حسین سے زیادہ ماہر تھا۔ وہ امیر حسین کی ماتحتی میں کام کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھا۔ امیر حسین نے صرف تیمور ہی کو دھوکا نہیں دیا تھا بلکہ اپنی بہن الجائی خاتون جو کہ تیمور کی بیوی تھی، کے ساتھ بھی اس کا رویہ انتہائی تحقیر آمیز تھا۔ اس نے کئی بار تیمور کے سامنے الجائی خاتون کی توہین کی تھی جسے تیمور رنجیدگی کی وجہ سے برداشت کر گیا تھا۔ لیکن اب اس رشتے کے خاتمے کے بعد تیمور کو سب پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ غرض کہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف بن گئے۔

امیر حسین کا سپہ سالار امیر موسلی، اس کا سب سے بڑا مشیر تھا۔ موسلی، ہر وقت تیمور کے خلاف امیر حسین کے کان بھرتا رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب علاقوں کی تقسیم کا سوال ہوا تو جھگڑے بڑھ گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امیر حسین تیمور کو کچھ بھی نہیں دینا چاہتا تھا لیکن تیمور کو اپنی کارگزاریوں کا صلہ درکار تھا۔ امیر حسین نے بلخ اور شادمان کے علاقوں پہ قبضہ کر لیا تھا۔ یہ ملک تاتار کے بہترین صوبے تھے۔ تیمور نے اس کی مخالفت کی لیکن اس کے امیروں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ تیمور نے بلخ اور شادمان کا مطالبہ ختم کر دیا۔

اسی دن، امیر موسلی کے بہکانے پر امیر حسین نے قرشی کا قلعہ، تیمور سے طلب کیا۔ قلعہ قرشی پورے تاتار میں سب سے زیادہ مستحکم اور مضبوط قلعہ تھا۔ اس قلعے کی ملکیت کے سلسلے میں بہت جھگڑا ہوا۔ اگر بزرگ امرا و سردار بیچ میں نہ پڑتے تو تیمور اور امیر حسین میں جنگ ہو جاتی۔

قلعہ قرشی کو کچھ ہی مہینے قبل تیمور نے زیادہ پختہ اور مستحکم کرایا تھا اور اسے ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا۔ قلعہ ہاتھ سے نکلنے کا اسے بے حد ملال ہوا مگر وہ پھر بھی طرح دے گیا اور اس جھگڑے کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا۔

دراصل تیمور مہلت چاہتا تھا۔ وہ تمام تاتاری سرداروں اور امیروں کے تعاون کا خواہاں تھا۔ اگر اس وقت وہ خانہ جنگی شروع کر دیتا تو ملک تاتار کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔ تاتاریوں کے تمام قبائل اپنے اپنے علاقوں کے خود مختار بن بیٹھتے جبکہ تیمور کی خواہش تھی، کہ وہ تمام امیروں کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کر کے ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھے تاکہ مغل پھر اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

امیر حسین ماوراالنہر کے تخت پر بیٹھ کر تنہا حکومت کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ایک دن میں کئی کئی بار جھگڑے کھڑے کر دیتا تھا۔ تیمور نے اس کی صورت یہ نکالی کہ ایک دن وہ امیر حسین کو خواجہ شمس الدین تبریز کے مزار پہ لے گیا۔ جہاں اس نے پہلے اپنی دوستی کی قسم کھائی۔ پھر امیر حسین سے سچا دوست رہنے کا قول و قرار لیا۔

امیر حسین نے قسم کھائی اور قول و قرار بھی کر لیا لیکن اسے تیمور کا یہ عمل بالکل پسند نہ آیا اور بجائے قول و قسم پر عمل کرنے کے اس نے اور زیادہ مخالفت شروع کر دی۔

عنبر شام تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ شدتِ غم سے اس کا جسم نڈھال ہو رہا تھا۔ دن بھر اس نے کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا۔ اس نے خورجی سے خشک غذا نکال کر کھائی۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ جسم میں ذرا طاقت آئی تو اس نے پناہ گاہ سے نکل کر ادھر اُدھر دیکھا۔

اس نے اتنی محنت کی۔ ساحر کو مارا۔ بارشن روکی مگر تدبیر کند بندہ اور تقدیر کند خندہ کے مصداق، اس کی تقدیر کے سامنے ایک نہ چلی۔ شکست تاتاریوں کی قسمت میں لکھی تھی۔ پیشانی کا لکھا سامنے آیا۔

عنبر کو اب اپنی فکر ہوئی۔ پہاڑی چاروں طرف سے مغلوں میں گھری ہوئی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں مغل پہریدار ادھر اُدھر گھومتے نظر آرہے تھے۔ اسے راستوں کا صحیح اندازہ بھی نہ تھا اس لیے اس نے رات کے وقت وہاں سے نکلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ راستوں کا تعین کیے بغیر مغلوں کے ہاتھوں سے بچ نکلنا ممکن نہ تھا اس لیے وہ صبح کے انتظار میں پھر پناہ گاہ میں جا کر پڑ رہا۔

صبح اٹھ کر دیکھا تو ہر طرف مغل ہی مغل نظر آئے۔ دور دور تک ان کے خیمے پھیلے ہوئے تھے۔ صرف پشت کی طرف مغلوں کے خیمے نہ تھے لیکن وہ راستہ مغلوں کی بستی کی طرف جاتا تھا اور اس طرف جانا خود موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

تورکینہ نے اسے حفاظت کا یقین دلایا تھا لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب اس نے ساحر کو قتل نہ کیا ہوتا۔ تورکینہ کے قبیلے کے ایک ساحر کو قتل کرنے کے بعد اس کی پناہ میں جانا کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ اسے ساحر کو قتل کرتے کسی نے نہیں دیکھا تھا یہ بھی تو ممکن تھا کہ اسے جھونپڑی سے نکلتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا ہو اور تورکینہ کے پاس پہنچتے ہی اسے پہچان لیا جائے۔ اگر پہچانا نہ جاتا تب بھی وہ تاتاری تھا، مغلوں کا دشمن۔ تمام ساحر مغلوں کے حلیف تھے اور مغل عقیدہ رکھتے تھے۔ کوئی صورت اس کے بچنے کی نظر نہ آتی تھی۔ دن میں پکڑے جانے کا خدشہ، رات کو راستوں سے ناواقفیت۔ عنبر سخت پریشانی میں گھر گیا تھا۔ خشک غذا اور پانی بھی اس کے پاس قریب الختم تھا۔ اگر ایک دو دن میں وہ یہاں سے نہ نکل سکا تو بھوک اور پیاس بھی اس کے خلاف ایک نیا محاذ کھول لے گی۔۔۔۔ اور وہ سسک سسک کر مر جائے گا۔

تین دن بعد کھانے کی خورجی اور پانی کی چھاگل بھی ختم ہو گئی۔۔۔۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا کہ اس کے لیے اٹھ کر بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ بھوک اور پیاس نے اسے بالکل لاغر کر دیا تھا۔ آنکھیں بھی مشکل ہی سے کھلتی تھیں۔ دن رات کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ اسے اپنی اس بے بسی کی موت پہ بار بار رونا آتا تھا۔ وہ سوچتا کہ شاید اس نے ساحر کو قتل کر کے گناہ کیا ہے جس کی سزا خدا اسے دے رہا ہے لیکن پھر اس کا دل اسے اطمینان دلاتا کہ میدانِ جنگ میں دشمن کو مارنا قتل نہیں بلکہ فرض کی ادائیگی ہے۔ ساحر مغلوں کے حلیف تھے اُن کے لیے جادو کرتے تھے۔ اگرچہ وہ جنگ میں شریک نہیں تھے لیکن ان کا عمل بھی ایک طرح کی جنگ تھی۔۔۔۔ اس نے جو کچھ کیا ملک و قوم کے لیے کیا۔

پتہ نہیں اسے موت کا انتظار کرتے ہوئے کتنے دن ہو گئے۔۔۔۔ رات کا وقت تھا۔ غنودگی کے عالم میں اسے کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ آواز اس کی پناہ گاہ کے قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر وہ آواز رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہوا کا ایک مہکتا ہوا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا تو اس کے جسم میں جیسے جان آ گئی۔ ہوا کے اس جھونکے

میں مانوس جنگلی پھولوں کی مہک تھی جن کا گجرا، تورکینہ اپنے بالوں میں لگاتی تھی۔

عنبر بے جان پڑا موت کی گھڑیاں گن رہا تھا لیکن اس خوشبو نے اس کے لیے اکسیر کا کام کیا۔ اس نے پوری طاقت لگا کر خود کو چٹان کے عقب سے گھسیٹنا شروع کیا۔ چٹان کے عقب سے نکل کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کی چٹان پہ کوئی بیٹھا دکھائی دیا۔ عنبر کو اندھیرے میں اس کی شکل تو نظر نہیں آئی لیکن اس طرف سے آنے والی خوشبو اسے یقین دلا رہی تھی کہ وہ تورکینہ ہے۔

عنبر کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔

اس نے یہ سوچ کر تورکینہ کو آواز دینے کا فیصلہ کیا کہ اگر وہ تورکینہ کی بجائے کوئی مغل ہوا بھی تو اسے کوئی افسوس نہ ہوگا۔ وہ اس خود ساختہ قید سے تنگ آ چکا تھا اور چاہتا تھا کہ سسک سسک کر مرنے کے بجائے اسے اگر کوئی مغل قتل کر دے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

"تورکینہ۔۔۔۔" اس نے آہستہ سے پکارا۔

چٹان پر بیٹھا ہوا ہیولا اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔۔۔۔

"عنبر۔۔۔۔ کیا تم عنبر ہو۔" یہ تورکینہ کی آواز تھی۔

عنبر نے پہچان کر فوراً جواب دیا:

"ہاں تورکینہ۔ میں عنبر ہوں۔ ادھر میرے پاس آؤ۔"

تورکینہ کے قدم آواز کی سمت اٹھنے لگے۔ وہ اندھیرے میں ٹٹولتی ہوئی اس چٹان تک پہنچ گئی۔ عنبر نے اٹھنے کی کوشش کی تو تورکینہ کا پیر اس سے ٹکرایا۔

وہ بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا تمہیں عنبر۔ کیا تم زخمی ہو؟"

"نہیں تورکینہ" عنبر نحیف آواز میں بولا۔

"میں تین دن سے بھوکا پیاسا ہوں۔"

"میرے پاس کیوں نہیں آ گئے؟"

تورکینہ نے سہارا دے کر اسے بٹھا دیا۔

"میرے ساتھ چلو گے؟"

"ہر طرف مغل پھیلے ہوئے ہیں اور پھر مجھ سے چلا بھی نہیں جائے گا۔"

"مجھے پکڑ کر چلو۔ میں تمہیں سہارا دوں گی۔"

تور کینہ نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

"معاون کی پروانہ کرو۔ میں تمہیں ایسے راستے سے لے چلوں گی کہ کسی کی نظر نہ پڑے گی۔ انہوں نے دیکھ لیا تب بھی میں کوئی بات بنا لوں گی۔ تم بالکل نہ گھبراؤ۔"

عنبر تور کینہ کے سہارے پہاڑی سے اترنے لگا۔ اس کے لیے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے قدم بار بار لڑکھڑا رہے تھے پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ اگر کسی نے اسے پہچان لیا تو کیا ہو گا؟

تور کینہ اسے کیسے بچائے گی؟

اور پھر جب تور کینہ کو معلوم ہو گا کہ اس نے ایک ساحر کو قتل کر دیا ہے تو وہ کیا سوچے گی؟

شرم کے احساس نے اس کے قدم روک دیے:

"تور کینہ! پہلے یہ بتاؤ کہ اگر کسی نے مجھے پہچان لیا تو تم کیا کرو گی؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"چلتے رہو عنبر۔" تور کینہ نے تسلی دی۔

"میں جس راستے سے جا رہی ہوں اس پر کسی کے ملنے کا امکان نہیں۔ ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

"راستے میں نہیں بلکہ تمہاری جھونپڑی میں اگر کسی نے پہچان لیا تو کیا ہو گا؟"

"تم چلو تو سہی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جھونپڑی میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔"

"تمہارے ماں باپ؟"

"کوئی نہیں ہے۔" تور کینہ جھلّا کر بولی۔ "جھونپڑی میں پہنچ کر بتاؤں گی۔"

عنبر خاموش ہو گیا۔ وہ تور کینہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ ساحروں کی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ تور کینہ اسے لیے ہوئے ایک جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ تور کینہ چراغ جلانے کے لیے چقماق ڈھونڈنے لگی۔

عنبر بولا:

"کیا کر رہی ہو تور کینہ؟"

"چراغ جلا رہی ہوں۔"

"چراغ نہ جلاؤ۔ دوسروں کو ہماری موجودگی کا علم ہو جائے گا۔" عنبر نے خوفزدہ سی آواز میں کہا۔

"یہاں کوئی نہیں ہے عنبر۔" تور کینہ نے کہا۔

"تمام جھونپڑیاں خالی ہیں۔ میرے قبیلے والے آگے چلے گئے ہیں۔"

"تم بالکل تنہا ہو یہاں؟" عنبر نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں...... بالکل اکیلی۔"

"اور تمہارے ماں باپ؟" عنبر نے اپنا سوال دہرایا۔

"پہلے کچھ کھا پی لو۔ پھر اطمینان سے بتاؤں گی۔"

"میں اندھیرے ہی میں کھا لوں گا۔" اس نے لجاجت سے کہا:

"روشنی مت کرو۔ روشنی دیکھ کر کوئی مغل ادھر آ سکتا ہے۔"

"اچھا بھئی تم تو خواہ مخواہ ڈر رہے ہو۔"

تور کینہ نے اندھیرے ہی میں تلاش کر کے کھانا نکالا۔ اور لکڑی کی ایک کنڈلی میں رکھ کر کنڈلی عنبر کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

"اس وقت تو کھانے کو یہی کچھ ہے۔ صبح تمہارے لیے کچھ پکاؤں گی۔"

تور کینہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"لیکن تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟" عنبر نے پوچھا۔ اسے اس بات پر تعجب تھا کہ اگر تمام ساحر یہاں سے چلے گئے ہیں تو تور کینہ کیوں یہاں موجود ہے۔

"پہلے پیٹ بھر لو۔ پھر بتاؤں گی۔" تور کینہ نے ٹالا۔

عنبر کنڈلی میں ہاتھ ڈال کر کھانے لگا۔ پتہ نہیں کھانے میں کیا تھا۔ وہ تو بس جلدی جلدی نوالے بنا کر منہ میں ٹھونس رہا تھا اور ہر نوالے کے بعد پانی کا گھونٹ بھر رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے کنڈلی خالی کر دی لیکن اب اس کے ہاتھ پیر سنسنانے لگے تھے۔ خالی پیٹ میں کھانا پہنچی تو اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

"تم کہاں سوؤ گی تور کینہ؟ مجھے نیند آ رہی ہے۔" عنبر نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ میری جھونپڑی ہے میں یہیں سوؤں گی۔" تور کینہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

"تور کینہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں مسلمان ہوں۔"

"مسلمان ہو تو کیا ہوا...... تم جھونپڑی کے ایک کونے میں اس طرف منہ کر کے لیٹ جاؤ۔ میں دوسرے کونے میں اس طرف منہ کر کے لیٹ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" عنبر نے حامی بھر لی اور ہاتھ سے ٹٹول کر کھسکتا ہوا ایک کونے میں چلا گیا...... پھر چند ہی لمحوں میں وہاں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

عنبر صبح دیر تک سوتا رہا۔ کئی روز بعد اطمینان کی نیند سویا تھا۔ شاید اب بھی اس کی آنکھ نہ کھلتی لیکن

جھونپڑی کی پتھر اور لکڑی کی دیواروں سے دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی تھی آنکھ کھلتے ہی اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

اس کے سامنے ایک کچی قبر بنی ہوئی تھی اور عنبر کے پیر قبر تک پہنچے ہوئے تھے۔ اس نے جلدی سے پیر سمیٹ لیے۔ نظر گھما کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات بھر وہ جس تودے سے سر لگا کر اطمینان سے سوتا رہا تھا وہ بھی ایک قبر ہے۔

"کیا یہ قبرستان ہے؟"

عنبر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یہ جھونپڑی بھی بالکل اسی جھونپڑی کی مانند تھی جس میں داخل ہو کر اس نے ساحر کو قتل کیا تھا فرق صرف یہ تھا کہ اس جھونپڑی کی گھاس پھوس کی چھت پرانی تھی اور اس جھونپڑی کی چھت نئی معلوم ہوتی تھی۔ اس میں قبریں بھی نہ تھیں۔

عنبر، دونوں قبروں کے درمیان کھڑا سوچ ہی رہا تھا۔ . . . کہ تورکینہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اچانک عنبر کی نظر، دونوں قبروں کے درمیان ایک جگہ رک گئی۔ اسے ایک گڑھا نظر آیا جس کے گرد پتھر رکھے ہوئے تھے جیسے وہاں کوئی الاؤ موجود رہا ہو۔

"میں جانتی تھی تم قبریں دیکھ کر حیران ہو گے۔" تورکینہ نے کہا۔

وہ اس کے لیے کھانے کے لیے باہر سے کچھ لائی تھی۔

"میں بہت سویرے اٹھ گئی تھی۔ تمہارے کھانے کا انتظام جو کرنا تھا۔" تورکینہ نے لکڑی کی تھالی زمین پر رکھ دی۔ عنبر گم صم کھڑا تھا:

"بیٹھ جاؤ عنبر،" تورکینہ نے اسے پریشان دیکھ کر کہا:

"کیا قبروں کو دیکھ کر ڈر گئے ہو؟"

عنبر نے کوئی جواب نہ دیا لیکن تورکینہ کے کہنے پر بیٹھ گیا۔ اس کی گھبرائی ہوئی نظریں اب بھی جھونپڑی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دو کچی قبریں۔ ٹوٹا ہوا الاؤ اور جھونپڑی کا پردہ . . . . .

"بڑے بزدل ہو۔ قبروں سے ڈرتے ہو؟" تورکینہ نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

"یہ قبریں کن لوگوں کی ہیں؟" عنبر نے چونک کر پوچھا۔

"یہ قبر میری ماں کی ہے۔" تورکینہ نے ایک قبر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ تمہاری ماں زندہ ہے۔ . . . تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ تاتاری ہے اور مسلمان ہے۔"

"میں نے ٹھیک بتایا تھا۔ اس وقت میری ماں زندہ تھی۔"

تورکینہ افسردہ ہو گئی۔

"تمہاری ماں کو کیا ہوا تھا؟" عنبر نے رسمی سی ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرے قبیلے والوں نے اسے قتل کر دیا تھا۔" تورکینہ کے آنسو چھلک پڑے۔

"قبیلے والوں نے"۔ عنبر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں:

"مگر کیوں؟"

"میری ماں تاتاری تھی اس لیے برداشت نہ کر سکی۔ اس نے میرے باپ کو مار ڈالا۔" تورکینہ نے اپنے آنسو پلو سے پونچھتے ہوئے بتایا۔

عنبر کا ذہن اب تک قبروں میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی ماں کے قتل کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی لیکن اس کی ماں نے اپنے شوہر کو کیوں قتل کیا۔ یہ معمہ اب تک حل نہ ہوا تھا۔

"تورکینہ! تم بہت دکھی ہو۔" عنبر نے سلسلۂ کلام پھر شروع کیا۔

"لیکن میں اب تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تمہاری ماں نے اپنے شوہر کو کیوں قتل کیا؟ جبکہ تمہاری پیدائش سے اب تک وہ اسے ہر حالت میں برداشت کرتی آئی تھی۔"

"بس میں کیا بتاؤں . . . . . میری ماں اور باپ میں اکثر لڑائی ہو جاتی تھی لیکن میں بیچ میں پڑ کر میل کرا دیتی تھی۔ مجھے ان دونوں سے بہت محبت تھی اور وہ بھی مجھے بہت چاہتے تھے . . . . . پھر جب مغلوں اور تاتاریوں کی فوجیں لڑائی کے لیے میدان میں اکٹھی ہوئیں تو میری ماں میرے باپ سے خوب لڑی۔ میری ماں کہتی تھی کہ تم مغلوں کے لیے تاتاریوں کے خلاف جادو نہ کرو لیکن میرا باپ مغلوں کا ساتھ دے رہا تھا وہ کسی طرح نہ مانا۔ ماں کا جب کوئی بس نہ چلا تو اس نے مجھے تمہارے سردار کے پاس بھیجا لیکن تمہارے سردار نے میری باتوں پر کان نہ دھرے اور انہیں پہلے ہی دن کی جنگ میں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس رات پھر میری ماں میرے باپ سے خوب لڑی۔ میرے باپ نے مجھے اور میری ماں کو جھونپڑی سے نکال دیا۔ ہم ماں بیٹی دوسری جھونپڑی میں چلی گئیں۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت میری ماں چپکے سے اپنی جھونپڑی میں پہنچ گئی۔ وہاں میرا باپ جادو کر رہا تھا۔ ماں نے وہاں جا کر میرے باپ کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ اس کے مرتے ہی بارش رک گئی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے باپ کو تمہاری ماں نے ہی قتل کیا ہے؟" عنبر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"ہاں عنبر۔ سوائے میری ماں کے، میرے باپ کا اور کوئی دشمن نہ تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ جس وقت میرا باپ مارا گیا

اس وقت تک تاتاری شکست کھا کر میدان چھوڑ چکے تھے ورنہ ساحروں کی شامت آجاتی۔ مغل بادشاہ ان سب کو قتل کرا دیتا۔"

"پھر کیا ہوا تورکینہ؟" عنبر نے مردہ سے لہجے میں پوچھا۔ وہ اس وقت خود کو ایک بھاری بوجھ تلے دبا محسوس کر رہا تھا۔

"پھر جیسے ہی بارش رکی، تمام ساحر اپنی جھونپڑیوں سے نکل آئے۔ انہیں یقین تھا کہ ضرور کوئی ساحر قتل ہوا ہے۔ جب بوڑھے ساحر نے سب کی گنتی کی تو پتہ چلا کہ میرا باپ موجود نہیں ہے۔ سب لوگ میرے باپ کی جھونپڑی پر پہنچ گئے۔ میں اور میری ماں بھی ساتھ تھی۔ ایک ساحر اندر گیا اور میرے باپ کی لاش کھینچ کر باہر لے آیا۔ لاش دیکھ کر بوڑھا ساحر جو سب کا سردار ہے، آگے بڑھا اور میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر اعلان کیا کہ تورکینہ کے باپ کو اس کی ماں نے قتل کیا ہے۔ . . . میری ماں دہائی دیتی رہی۔ چلاتی رہی کہ وہ بے گناہ ہے لیکن انہوں نے میرے سامنے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ سب کو معلوم تھا کہ میری ماں تاتاری ہے اور تاتاریوں کے خلاف جادو کرنے کی مخالفت کرتی تھی۔"

تورکینہ سسکیاں لینے لگی۔ عنبر نے اسے سہارا دیا:

"تمہاری ماں واقعی بے گناہ تھی تورکینہ! اس پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ تمہارے باپ کا قاتل کوئی اور ہے۔ میں اصل قاتل کو تمہارے حوالے کروں گا۔"

"نہیں عنبر!" تورکینہ بولی۔ "میرے باپ کو میری ماں نے ہی مارا ہے۔ مجھے بھی اس بات کا یقین ہے۔"

عنبر نے جھونپڑی کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کو دیکھ کر پوچھا:

"جس دن تمہارا باپ قتل ہوا، کیا یہی پردہ دروازے پر پڑا ہوا تھا؟"

"ہاں۔ یہی پردہ تھا۔ یہی جھونپڑی تھی۔ اس کی چھت جل گئی تھی۔ میں نے دوسری ڈالی ہے۔ میں نے بوڑھے ساحر سے اجازت لے کر اپنے ماں باپ کی قبریں اسی جھونپڑی میں بنالی ہیں۔ اب میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ مغل تمام ساحروں کو ساتھ لے کر تاتاریوں کے پیچھے سمرقند گئے ہیں۔"

عنبر کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ چیخ کر تورکینہ کو بتادے کہ تیرے باپ کو تیری ماں نے نہیں بلکہ میں نے مارا ہے لیکن میں بھی قاتل نہیں ہوں۔ میں نے ساحر کو اس لیے مارا تھا کہ تیرے کہنے کے مطابق بارش رک جائے اور تاتاری فتح حاصل کر لیں مگر میں تقدیر کا لکھا نہ مٹا سکا۔ بارش رکنے سے پہلے ہی تاتاری شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے۔ . . .

لیکن وہ یہ کہہ نہ سکا۔ اس کی زبان کو تالا لگ گیا۔ پتہ نہیں کیوں؟

○

فرات عنبر کو تورکینہ کے ساتھ رہتے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ دونوں دن بھر ایک ساتھ رہتے۔ رات گزارنے کے لیے عنبر دوسری جھونپڑی میں چلا جاتا۔ تمام جھونپڑیاں خالی پڑی تھیں۔

ساحروں کو مغل اپنے ساتھ سمرقند لے گئے تھے تاکہ سمرقند کو بھی وہ جادو کے زور سے فتح کر لیں۔ عنبر نے تورکینہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ جب تک ان کی شادی نہیں ہو جاتی وہ علیحدہ علیحدہ جھونپڑیوں میں سوئیں گے۔ تورکینہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ تو عنبر کے اس وعدے سے خوش تھی کہ حالات درست ہوتے ہی دونوں سمرقند پہنچیں گے اور وہاں شادی کر کے آرام سے زندگی گزاریں گے۔

تورکینہ نے عنبر کو مغلوں کا لباس پہنا دیا تھا تاکہ اگر کوئی پوچھ گچھ ہو تو وہ عنبر کو اپنا رشتہ دار ثابت کر سکے۔

مغلوں نے سمرقند کی طرف کوچ کرتے وقت تمام ساحروں کو مع اہل وعیال لشکر کے ساتھ چلنے کا حکم دیا تو تورکینہ نے مغل سردار سے التجا کی کہ اسے اس کی جھونپڑی ہی میں چھوڑ دیا جائے۔ وہ ماں باپ کی قبروں کے پاس رہ کر اپنا غم ہلکا کرنا چاہتی ہے۔ مغل سردار نے اسے جھونپڑی میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اسے یہ رعایت بھی دی گئی کہ وہ اپنا راشن مغل خیمہ گاہ سے حاصل کر سکتی ہے۔

ساحروں کے جانے کے بعد، اس خالی بستی میں دو تین دن تک تو تورکینہ گھبرائی گھبرائی اور خوفزدہ سی رہی لیکن پھر وہ اس کی عادی ہو گئی۔ پھر جب وہ عنبر کو ساتھ لے کر آئی تو اس کے دن عید اور رات، شب برات ہو گئی۔ عنبر کے لیے تورکینہ کی چاہت بڑھتی رہی۔ عنبر بھی روز بروز اس کے قریب آتا گیا۔ یہاں تک کہ ان میں شادی کے عہد و پیمان ہو گئے لیکن انہوں نے اپنے درمیان فاصلے کی جو حد مقرر کی تھی، اسے دونوں میں سے کسی نے بھی پھلانگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

انہیں اچھے دنوں کا انتظار تھا۔ مگر اچھے دن انہیں صرف سمرقند ہی میں حاصل ہو سکتے تھے اور سمرقند کے راستے میں قدم قدم پر مغل موجود تھے۔ خیمہ گاہ کے مغل، اس کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مغلوں میں جادوگروں کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جادوگر، دنیا والوں اور آسمانی دیوتاؤں کے درمیانی رابطے کا کام کرتے ہیں۔

مغل سواروں اور پہرے داروں کو جادوگروں کی جھونپڑیوں کی طرف آنے کی ممانعت تھی لیکن ایک دن ایک

مغل اتفاقیہ ہی تورکینہ کی جھونپڑی کی طرف آنکلا۔ اس وقت تورکینہ اور عنبر، جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

مغل تورکینہ کے ساتھ ایک جوان کو دیکھ کر چونکا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ ساحر کی بیٹی، تنہا اس بستی میں رہتی ہے۔

ادھر مغل کو اپنے سامنے دیکھ کر عنبر پریشان ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر تورکینہ کو دیکھا۔ تورکینہ نے آنکھوں ہی اشاروں میں اسے تسلی دی اور خود مسکراتی ہوئی مغل کی طرف بڑھی۔

"میں مغل سردار کو خوش آمدید کہتی ہوں"۔ اس نے مغل کو سردار کہہ کر مخاطب کیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ مغل، خیمہ گاہ کا ایک ادنیٰ ملازم ہے۔

مغل مشکوک نظروں سے عنبر کو دیکھ رہا تھا۔ عنبر لباس اور صورت سے مغل ہی لگتا تھا۔ اس کے تاتاری ہونے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا لیکن تورکینہ جیسی خوش شکل اور تنہا لڑکی کے پاس ایک مرد کی موجودگی اسے مشکوک بنا رہی تھی۔

"یہ کون ہے؟" مغل نے کڑک کر پوچھا۔

"تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟" تورکینہ نے اس کے سخت لہجے کی پروا نہ کرتے ہوئے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

"میں نہیں جانتا۔ تم بتاؤ یہ کون ہے؟" مغل نے تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور آہستہ آہستہ عنبر کی طرف بڑھنے لگا۔

عنبر کے پاس صرف ایک خنجر تھا پھر بھی وہ چوکنا ہو گیا۔ تورکینہ لپک کر عنبر اور مغل کے درمیان آ گئی۔

"ٹھہرو مغل سردار"۔ وہ تیوریاں چڑھا کر بولی۔

"یہ میرا شوہر ہے۔ تم اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے"۔

"شوہر۔۔۔۔" مغل کے قدم ایک دم رک گئے۔

"یہ تمہارا شوہر ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔ اس کے علاوہ میرے قریب اور کون آ سکتا ہے؟" تورکینہ نے سختی سے جواب دیا۔

"مگر میں نے تو سنا تھا کہ تم یہاں اکیلی رہتی ہو"۔ مغل نے نرم لہجے میں کہا۔

"مجھے اکیلا سمجھ کر تم یہاں آئے ہو"۔ تورکینہ چیخ پڑی:

"میں بڑے سردار سے تمہاری شکایت کروں گی!"

"نہیں نہیں۔۔۔۔" مغل گھبرا گیا: "میں تو بھولے سے ادھر آ گیا تھا۔ آسمانی دیوتاؤں کی قسم! میں کسی برے ارادے سے یہاں نہیں آیا تھا"۔

"اچھا تو آؤ میرے ساتھ۔۔۔۔" تورکینہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"کہاں؟۔۔۔۔" مغل کا رنگ اڑ گیا۔

"میں تمہاری بات کا اس وقت یقین کروں گی جب تم میری جھونپڑی میں چل کر قسم کھاؤ گے"۔

مغل انکار نہ کر سکا۔ اور اس کی جھونپڑی کی طرف چلنے لگا۔

تورکینہ نے آگے بڑھ کر جھونپڑی کا پردہ الٹ دیا۔ مغل کی نظر اندر قبروں پر پڑی تو وہ خوف سے کانپنے لگا۔ توہم پرست مغلوں کو قبروں سے بہت ڈر آتا تھا۔ میدانِ جنگ میں خون کی ہولی کھیلتے۔ انسانی سروں کے مینار کھڑے کر دیتے لیکن قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کی جان نکلتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ قبروں میں بد روحیں رہتی ہیں جو باہر نکل کر چمٹ جاتی ہیں۔

"یہ میرے باپ اور ماں کی قبریں ہیں"۔ تورکینہ بتانے لگی:

"اگر تم سچے ہو تو قبروں کے درمیان بیٹھ کر قسم کھاؤ۔ جھوٹ بولو گے تو بد روحیں تمہیں چمٹ جائیں گی"۔

تورکینہ بڑی بے تکلفی سے اپنے والدین کی روحوں کو بد روحیں کہہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ مغل صرف بد روحوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ مغل کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ تورکینہ کا مقصد محض مغل کو بری طرح سے خوف زدہ کرنا تھا۔

"جاؤ۔ میں نے تمہیں معاف کیا!" تورکینہ کے چہرے پر فاتحانہ نشان پیدا ہو گئی۔ "اب ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا"۔

مغل نے تشکر آمیز نظروں سے تورکینہ کو دیکھا، پھر پلٹ کر بے تحاشا بھاگا۔ کچھ دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا پھر وہ درختوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"تورکینہ! اب یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں"۔ عنبر نے خدشہ ظاہر کیا: "مغلوں کو میری موجودگی کا علم ہو گیا ہے۔ کہیں مصیبت نہ آ جائے"۔

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں لیکن میں ایک اور بات سے بھی پریشان ہوں عنبر!"

"اور کیا بات ہے تورکینہ؟" عنبر نے چونک کر پوچھا۔ "یہ سب میرے آنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا"۔

تورکینہ، عنبر کا ہاتھ پکڑ کر جھونپڑی میں آ بیٹھی اور محبت سے بولی:

"عنبر! اب تمہاری مصیبت میری مصیبت ہے۔ جو مصیبت بھی آئے گی ہم دونوں اسے مل کر برداشت کریں گے۔ فی الحال تو کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے قبیلے کا کوئی ساحر واپس آجائے۔ اس وقت بھانڈا پھوٹ سکتا ہے۔"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج ہی میں یہاں سے کسی طرف نکل جاؤں گا۔" عنبر نے کہا۔

"تو میرا بھی فیصلہ سن لو۔" تورکینہ ایک عزم سے بولی۔

"مرنا ہے تو ہم ایک ساتھ مریں گے۔ تم مغلوں کے اتنے سخت پہرے سے نکل کر نہیں جا سکتے۔ وہ تمہیں پکڑ لیں گے ..... پھر میں بھی کیوں نہ تمہارے ساتھ چلوں؟"

"تورکینہ!"

عنبر اسے محبت سے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد بولا:

"میں تمہاری بے پناہ محبت کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہوں۔ میں نے تمہیں بہت تکلیف دی ہے۔ میں اتنا اچھا نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھ رہی ہو۔ میں نے ایک ایسا کام کیا ہے جو اگر تمہارے علم میں آجائے تو تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی۔ ہو سکتا ہے تم مجھے قتل کر دینے کے درپے ہو جاؤ۔ میں نے ..... میں نے تمہاری زندگی میں تنہائی بھر دی ہے۔"

"تمہارے ملنے سے پہلے یہ دنیا میرے لیے تاریک تھی ....." تورکینہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم نے تو مجھے روشنی دی ہے ..... میری زندگی دکھوں سے بھری تھی، میرے ماں باپ کے دن رات کے جھگڑوں نے مجھے دنیا سے بیزار کر دیا تھا۔ اب تم ملے ہو تو میری زندگی میں بہار آگئی ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

عنبر بے چین ہو گیا۔ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا:

"میں جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

عنبر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آج کسی وقت تورکینہ کو اصل واقعات سے آگاہ کر دے گا۔ دراصل وہ تورکینہ کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا ..... اگر تورکینہ حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد بھی اس سے محبت کرتی رہی تو پھر اسے بھی تورکینہ کو اپنانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔

سورج غروب ہوا تو تورکینہ کھانا پکانے کے لیے دوسری جھونپڑی میں چلی گئی اور عنبر، تورکینہ کو سب کچھ بتا دینے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد تورکینہ کھانا لے کر آگئی۔

اس نے چراغ روشن کیا اور دونوں قبروں کے درمیان کھانا رکھ کر عنبر کے سامنے بیٹھ گئی ..... لیکن

عنبر کی نظریں کھانے کے بجائے تورکینہ کے چہرے پر جمی تھیں۔

"تم مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟" تورکینہ نے شرماتے ہوئے کہا:

"کیا میں آج زیادہ اچھی لگ رہی ہوں؟"

"ہاں تورکینہ! تم مجھے آج سب دنوں سے زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو۔" عنبر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا اور تمہاری تصویر کو دل میں اتار لینا چاہتا ہوں۔"

"عنبر ....."

تورکینہ پریشان ہو گئی:

"یہ تمہیں بیٹھے بیٹھے کیا ہو جاتا ہے؟ کیا تم مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے جانا چاہتے ہو؟"

"نہیں تورکینہ!" عنبر نے اداسی سے کہا:

"میں تمہیں نہیں چھوڑنا چاہتا مگر ممکن ہے تم خود مجھے چھوڑ دو۔ مجھ سے نفرت کرنے لگو۔"

"ایسا نہ کہو عنبر ....." تورکینہ تڑپ کر بولی:

"میں جیتے جی ....."

اچانک باہر بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ عنبر نے گھبرا کر جھونپڑی کے دروازے کی طرف دیکھا

"کون لوگ ہیں یہ؟"

تورکینہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

"ٹھہرو تورکینہ! میں دیکھتا ہوں۔"

عنبر بھی اس کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے پر دس بارہ مغل تلواریں کھینچے اور مشعلیں لیے کھڑے تھے ان کے بھیانک چہرے نفرت اور قہر کی تفسیر بنے ہوئے تھے۔

"تم دونوں ہمارے ساتھ چلو۔" ایک مغل نے گرجدار آواز میں آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟ ہم نے کیا جرم کیا ہے؟" تورکینہ نے بھی اتنی ہی سختی سے پوچھا۔

"چپ رہو۔" مغل نے کہا۔ اور کئی تلواریں تورکینہ اور عنبر کی طرف اٹھ گئیں۔

"جو کہنا ہے سردار سے کہنا۔"

اسی وقت تورکینہ کی نظر اس مغل پر پڑی جو دوپہر کو ان کے پاس آیا تھا۔ تورکینہ چیخ کر بولی:

"تو، تُو نے شکایت کی ہے سردار سے۔ چل میں بھی سردار سے تیری سب باتیں کہہ دوں گی۔" تورکینہ کا ہاتھ تھام کر بڑی لاپرواہی سے چلنے لگی۔

تورکینہ اور عنبر کو خیمہ گاہ کے سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔ سردار نے تورکینہ کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

"تُو جادوگر کی بیٹی ہے؟"

"میں جادوگر کی بیٹی تھی۔ اب نہیں ہوں۔" تورکینہ نے بے خوفی سے جواب دیا۔

"کیا بک رہی ہے؟" سردار کو غصہ آ گیا۔ "کیا تو جادوگر کی اولاد نہیں ہے؟"

"میرا باپ جادوگر تھا لیکن مغلوں کے لیے جادو کرتے ہوئے وہ قتل کر دیا گیا۔"

"تیرے ساتھ یہ کون ہے؟" سردار نے عنبر کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا شوہر ہے۔" تورکینہ نے بلا جھجک کہا۔

"لیکن نہ تو یہ جادوگر ہے اور نہ جادو جانتا ہے۔ میرے ماں باپ کے قتل ہونے کی خبر سن کر یہ میرے پاس آ گیا ہے۔ میرا باپ مغل تھا۔"

"سب جادوگر مغل تھے۔"

سردار اٹھ کر ٹہلنے لگا:

"لیکن انہوں نے خانِ اعظم کو دھوکہ دیا۔ خانِ اعظم نے سب کو قتل کرا دیا۔ ایک بچے کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ تجھے بھی قتل کیا جائے گا۔"

"کیا کہہ رہے ہو سردار؟" تورکینہ حیرت سے بولی:

"جادوگروں نے تو ہانی بر ما کر تاتاریوں کو شکست دی۔ میرا باپ تمہارے لیے جادو کرتا ہوا مارا گیا۔ پھر تم انہیں دھوکے باز کیوں کہتے ہو؟"

"تجھے خبر نہیں عورت! خانِ اعظم نے جب سمرقند پر حملہ کیا تو تمام جادوگر ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے فتح کے لیے جادو تیار کیا لیکن پھر وہ تاتاریوں سے مل گئے اور جادو الٹا کر دیا۔ ہمارے لشکر کے تمام گھوڑے مر گئے۔ اب ہمارا لشکر سمرقند سے پیدل واپس آ رہا ہے۔"

تورکینہ کے لیے یہ خبر بڑی تشویشناک تھی لیکن عنبر کو اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ مغل سمرقند پر قبضہ نہ کر سکے تھے۔

"ہم نے لشکرگاہ کے تمام گھوڑے ان کے لیے بھیج دیے ہیں۔۔۔۔ لیکن تجھے ابھی قتل نہیں کیا جائے گا۔ تو اور تیرا شوہر قید میں رہیں گے۔ خانِ اعظم ایلیاس خواجہ واپس آ کر تیرے لیے جو فیصلہ کریں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔"

"لیکن سردار۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔"

تورکینہ نے احتجاج کیا:

"اگر جادوگروں نے دھوکہ دیا تو انہیں سزا مل گئی۔ میرا اور میرے شوہر کا کیا قصور ہے۔ ہم دونوں تو سمرقند میں نہیں تھے؟"

سردار نے جواب دینے کے بجائے انہیں لانے والوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بڑھ کر دونوں کو پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے ایک خیمے میں لے گئے۔ وہاں پہنچ کر ان کے خنجر چھین لیے گئے اور خیمے پر پہرہ لگا دیا گیا۔ اس نئی مصیبت سے عنبر اور تورکینہ پریشان ہو گئے۔

رات ذرا گہری ہوئی تو عنبر نے آہستہ سے پوچھا:

"کیا سوچ رہی ہو تورکینہ؟"

"سوچ رہی ہوں کہ اب ان کم بختوں کے ہاتھوں سے بچنا مشکل ہے۔"

"ہاں۔ انہوں نے تمام ساحروں، عورتوں اور بچوں کو مار ڈالا ہے تو پھر ہمیں کیوں بخشیں گے؟" عنبر نے کہا:

"تم موت سے ڈرتی تو نہیں ہو؟"

"موت تو ایک دن آنی ہے عنبر! لیکن تمہارے ساتھ مرنے میں مجھے خوشی ہو گی۔"

"تورکینہ! تم تاتاری عورتوں کی طرح بہادر اور حوصلہ مند ہو۔" عنبر نے اس کی تعریف کی:

"کاش میں تمہیں اپنی ماں اور بیوہ بہن کے پاس لے جاتا۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتیں۔ خیر، جو قسمت میں ہے پورا ہو گا۔ لیکن میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں جو مجھے کھائے جا رہا ہے۔"

"عنبر۔۔۔۔" تورکینہ اضطراب سے بولی۔ "زندگی کے جو لمحے ہیں انہیں ہنس بول کر گزارو۔ کسی بوجھ کا ذکر مت کرو۔"

"نہیں تورکینہ! دل کا بوجھ ہلکا کرنے سے ہی مجھے سکون ملے گا۔ مجھے خوشی حاصل ہو گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری بات سننے کے بعد تم اپنا خیال بدل دو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو عنبر۔ جلد کہو۔" تورکینہ نے پریشانی سے کہا۔

"تم تمہارے ساتھ ہی مرنا چاہتی ہو مگر میرا ارادہ نہیں بدل سکتا۔"

"سنو تورکینہ! اگر میں یہ کہوں کہ تمہارے باپ کو تمہاری ماں نے نہیں مارا تھا تو کیا تم یقین کر لوگی"۔

"اب یہ باتیں بیکار ہیں عنبر!" تورکینہ بے دلی سے بولی۔

"تورکینہ! میں کہتا ہوں کہ تمہاری ماں قاتل نہیں تھی۔ تمہاری ماں تو تمہارے باپ کی جھونپڑی میں ا... نہیں گئی تھی"۔

"تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے اس وقت تم وہاں موجود تھے"۔ تورکینہ چڑ کر بولی۔

"ہاں ...... یہ حقیقت ہے کہ تمہارے باپ کو میں ...... میں ......" عنبر کے حلق میں آواز اٹک گ...

"تم ...... کیا کہہ رہے ہو عنبر!" تورکینہ گھبرا کر بولی۔

"تورکینہ ......" عنبر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا ......" تم نے بتایا تھا نا، کہ اگر ایک ساحر کو ... ڈال جائے تو بارش بند ہو جائے گی ...... اس دن تاتاریوں کو شکست ہو رہی تھی۔ وہ پیچھے ہٹتے جا رہے ... میں پہاڑی پر موجود تھا۔ مجھے تمہاری بات کا یقین تھا اس لیے میں اس طوفانی بارش میں تمہاری بستی میں پہنچا اور جو پہلی جھونپڑی سامنے آئی اس میں گھس گیا اور ساحر کو قتل کر دیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے ہاتھوں ... جانے والا ساحر تمہارا باپ تھا۔ تم نے مجھ پر احسان کیے ...... مجھے کھلایا پلایا اور موت کے منہ سے بچایا۔ میں ... احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں تورکینہ! میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں اپنے ضمیر سے نہیں، صرف تم سے شرمندہ ہوں تورکینہ!"

تورکینہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

عنبر تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا ...... پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"تورکینہ! بولو، تم اپنے مجرم کے لیے کیا سزا تجویز کرتی ہو؟"

تورکینہ کا لرزتا ہوا ہاتھ عنبر کے کندھے سے ٹکرایا۔ پھر اس کا سر عنبر کے شانے سے ٹک گیا اور وہ سسکتی ہوئی بولی:

"میں تمہیں معاف کرتی ہوں عنبر!"

"تورکینہ! تم نے مجھے معاف کر کے میرا بوجھ ہلکا کر دیا"۔ عنبر کے لہجے میں خوشی کا تاثر تھا۔

اسی وقت خیمے کے باہر گھوڑے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے اٹھ کر پردے کی اوٹ سے جھانکا۔ مغل خیمہ گاہ میں مشعلیں روشن تھیں اور بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے خیمہ گاہ خالی ہونا شروع ہو گئی۔

مغل اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے کسی نے ان پر حملہ کر دیا ہو۔ جس وقت انہیں خیمے میں قید کیا گیا تھا اس

خیمہ گاہ میں گھوڑا کوئی موجود نہیں تھا۔ اس سے عنبر نے اندازہ لگایا کہ یہ گھڑسوار اس لشکر کے ہیں جو سمرقند سے ناکام واپس آیا ہے لیکن یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مغل بدحواسی کے عالم میں خیمہ گاہ چھوڑ کر اس طرح بھاگ کیوں رہے ہیں؟

خیمے پر پہرہ دینے والے پہریدار بھی پہرہ چھوڑ کر بھاگنے والوں میں جا ملے تھے ...... پھر دیکھتے ہی دیکھتے لشکرگاہ خالی ہو گئی۔

تورکینہ اور عنبر خیمے سے نکل آئے۔ اب وہ آزاد تھے۔

"اب ہم آزاد ہیں عنبر!" تورکینہ خوشی سے بولی: "آؤ اب بھاگ چلیں"۔

عنبر بھی یہی سوچ رہا تھا۔ وہ تورکینہ کو لیے ہوئے خیمے سے کچھ فاصلے پر جا کر رک گیا:

"اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے تورکینہ!" عنبر مسرت آمیز لہجے میں بولا:

"غیبی مدد اسی کو کہتے ہیں"۔

"ہاں عنبر! اب شاید ہم سمرقند پہنچ سکیں"۔

"ضرور تورکینہ!"

عنبر نے اس کے خیال کی تائید کی:

"میری ماں اور بہن تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی"۔

عنبر اور تورکینہ رات بھر سمرقند کی طرف چلتے رہے۔

صبح دم، انہیں پہاڑیوں کے دامن میں ایک لشکر کا پڑاؤ نظر آیا۔ عنبر کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ یہ تاتاری لشکر تھا جو مغلوں کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔

تاتاری لشکر میں بہت سے سوار عنبر کو پہچانتے تھے اس لیے عنبر کو اپنی شناخت کرانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

جب تاتاری لشکر کو معلوم ہوا کہ مغل قبیلے سے بھی بھاگ نکلے ہیں تو وہ سمرقند کی طرف واپس ہو لیے۔

عنبر کی ماں اور بہن سمرقند ہی میں تھیں۔ تورکینہ کو دیکھ کر وہ دونوں نہال ہو گئیں ...... پھر تورکینہ دلہن بن کر ہمیشہ کے لیے عنبر کی ہو گئی۔

جب سردار تیمور، شہر سبز سے سمرقند پہنچا تو عنبر حسبِ سابق پھر اس کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

○

مرغزاروں کا فریب

اس کے ریشمی بال رخساروں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے، بائیں شانے پر چڑھی ہوئی ہلکی ڈھال، کمر کی ایک طرف لٹکتی تلوار، دوسری طرف اڑسا ہوا خنجر، پشت پر ترکش اور کمان!

وہ بڑی بے نیازی سے گھوڑے پر بیٹھی قافلہ سالار کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس سے قبل دو قافلے چھاؤنی کے سامنے سے گزر چکے تھے۔ وہ تیسرے قافلے کے ساتھ تھی۔ اس کا قافلہ بھی آہستہ آہستہ چھاؤنی کے خیموں کے سامنے سے گزر گیا۔

مسلح سوار، سڑک کے دونوں طرف کھڑے قافلے کو گزرتا دیکھ رہے تھے لیکن ایک خیمے کے سامنے ہلچل سی مچی تھی۔ شاید اس کے حسن بے محابہ کو دیکھ کر خیمے والے حیران تھے اور ایک دوسرے سے گفتگو کرنے لگے۔ قافلہ بغیر کسی روک ٹوک کے چھاؤنی سے نصف فرسنگ آگے بڑھ گیا۔

گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور دھوپ میں تمازت پیدا ہو گئی تھی۔ آفتاب نصف النہار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قافلے والوں کے چہروں پر پسینہ موتی بن کر چمک اٹھا تھا۔ اسی وقت پیچھے سے گھوڑے دوڑنے کی آواز آئی۔ قافلہ سالار نے گھوڑا روکا اور ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا۔ پچاس ساٹھ سوار گھوڑے اڑاتے قافلے کی طرف آ رہے تھے۔

ادھیڑ عمر قافلہ سالار گھبرا گیا۔ آنے والے سوار وہی تھے جنہوں نے قافلے کو بغیر پوچھ گچھ کے گزر جانے دیا تھا۔۔۔۔ پھر اب وہ کیوں آ رہے تھے؟

اس کی پریشانی بجا تھی۔ قافلے میں ستر مرد، دس عورتیں اور بیس محافظ سوار تھے۔ باربردار اونٹ اور گاڑیاں الگ تھیں۔

سوار قریب پہنچے۔ قافلے کو گھیر لیا گیا۔ سواروں کا سردار، گھوڑا بڑھا کر قافلہ سالار کے قریب آ گیا۔ قافلہ سالار پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"قافلہ آگے نہیں جائے گا۔" سردار نے حکم دیا۔

قافلے والے سہم گئے۔ قافلہ سالار نے احتجاج کرنا چاہا لیکن اس کی آواز نہیں نکل سکی۔

حسن کو جلال آ جائے تو اس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ قافلہ سالار کے ساتھ والی لڑکی کی تیوری چڑھ گئی۔ ابرو کھنچ گئے۔ وہ دور ہی سے بولی:

"کیوں نہیں جائے گا؟"

پھر وہ گھوڑا لگا کر سردار کے سامنے آ گئی۔

"بس، نہیں جائے گا۔ چھوٹے امیر کا حکم ہے۔" سردار جواب دے کر لڑکی کو گھورنے لگا۔

"ہم کسی چھوٹے امیر کے پابند نہیں ہیں۔" لڑکی نے قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

قافلہ سالار نے دیکھا کہ بات بگڑ رہی ہے تو اس نے دخل دیا:

"بیٹی تم چپ رہو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ابھی وضاحت کیے دیتا ہوں۔"

"یہ تمہاری بیٹی ہے۔" سردار نے بجائے وضاحت سننے کے دوسرا سوال کر دیا۔

"ہاں۔ میری بیٹی ہی سمجھیے۔" قافلہ سالار نے بڑے مہذب طریقے سے کہا: "قافلے میں شامل خواتین قافلہ سالار کی ماں، بہن اور بیٹیاں ہوا کرتی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ تمہاری بیٹی نہیں۔ اس کے وارث کہاں ہیں؟" سردار کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"تم کون ہوتے ہو میرے وارثوں کو پوچھنے والے؟"

لڑکی جھنجھنا اٹھی:

"ہم نے علاقے کے حاکم سے راہداری کی اجازت حاصل کر لی ہے۔ یہ قافلہ ان کی پناہ میں ہے۔ اگر تم نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تو یہ حاکم علاقہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔ اس کی تمہیں سخت سزا ملے گی۔"

پتہ نہیں، سردار نے لڑکی کی بات سنی یا نہیں۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ لڑکی کے حسن نے شاید اس پر محویت طاری کر دی تھی۔

لڑکی خاموش ہوئی تو قافلہ سالار نے اپنی صفائی پیش کی:

"دیکھیے سردار، دریائے آمو کے اس طرف تک سردار تیمور کی سرحد تھی۔ انہوں نے بحفاظت تمام قافلوں کو دریا تک پہنچوا دیا۔ دریا کے اس پار کا علاقہ حاکم قرشی امیر موسیٰ کا ہے۔ ہم نے اپنا سوار بھیج کر ان سے بھی

اجازت حاصل کر لی تھی۔"

"میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ قافلہ سالار کی بات سنو۔" لڑکی نے سردار کو ڈانٹ پلائی۔

سردار بوکھلا گیا اور ہاں، ہوں کرنے لگا۔

"ہم نے امیر موسیٰ سے بحفاظت گزرنے کی باقاعدہ اجازت حاصل کی ہے۔" لڑکی نے قافلہ سالار کی بات دہرائی۔ "تم ہمیں روکنے کے مجاز نہیں ہو۔"

"دیکھیے سردار۔" قافلہ سالار نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"ہم سے پہلے بھی دو قافلے اس علاقے سے گزر چکے ہیں۔ انہیں نہیں روکا گیا۔ ہم سے کیا خطا ہوئی کہ ہم روکا جا رہا ہے۔ ہم نے اجازت حاصل کی ہے۔ اگر اس طرح قافلے روکے جانے لگے تو تجارتی قافلے جہاں ... تہاں رک جائیں گے۔ تجارت بند ہو جائے گی اور سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکے گا۔ اس ... یہ ہوگا کہ ..."

"یہ سب ٹھیک ہے لیکن قافلہ آگے نہیں جائے گا۔" سردار نے تمام وضاحتیں رد کرتے ہوئے فیصلہ سنا دیا۔

"ہم تمہارے حکم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔" لڑکی چیخ کر بولی۔ "قافلے، حاکم کی پناہ میں چلتے ہیں۔ ہمیں صرف امیر موسیٰ ہی حکم دے سکتے ہیں۔ تمہارا حکم ہم نہیں ... گے۔"

لڑکی نے تلوار کھینچ لی اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئی۔

قافلہ سالار نے اپنے محافظوں کی طرف دیکھا۔ بیسیوں محافظ اگرچہ اس کے قریب آ گئے تھے لیکن کسی کا ہاتھ تلوار تک نہیں پہنچا تھا۔

قافلہ سالار نے بات بنانے کی کوشش کی:

"سردار! کم از کم ہمیں قصور تو بتایا جائے۔"

"اور یہ بھی بتایا جائے کہ امیر موسیٰ کے اجازت نامے کے باوجود قافلے کو روکنے کا حکم کون شخص دے ..." لڑکی نے کڑک کر پوچھا۔

"یہ لڑکی بہت تیز طبیعت ہے۔" سردار نے قافلہ سالار کو مخاطب کیا۔ "اس کو روکو ورنہ ....."

"ورنہ تم اپنے پچاس سواروں کو حکم دو گے کہ قافلے کے بیس محافظوں کو قتل کر کے ہمیں گرفتار کر لیں ..." نے تیز لہجے میں سردار کی بات کاٹ دی۔ "تجارتی قافلوں پر صرف ڈاکو حملہ کیا کرتے ہیں لیکن اب اس علاقے ...

یہ نئی بات ہو گی کہ سرکاری فوج اپنے امیر کے حکم کے خلاف قافلے پر حملہ کرے۔"

"نہیں۔ ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔" سردار چیخ اٹھا:

"ہم امیر کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے لیکن جس حاکم نے تمہیں اجازت دی ہے اب اسی کا حکم ہے کہ قافلے کو آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔"

"امیر موسیٰ ...... کیا یہ ان کا حکم ہے۔" قافلہ سالار نے حیرانی سے سردار کو دیکھا۔

"امیر موسیٰ کا ہی حکم سمجھو۔" سردار نے کہا۔ "دریائے آمو سے قلعہ قرشی تک کا تمام علاقہ امیر موسیٰ نے اپنے بیٹے امیر محمد بیگ کو دے رکھا ہے۔ یہ حکم امیر محمد بیگ کا ہے۔"

"آخر اس غلط حکم کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔" لڑکی نے پھر دخل دیا۔

"وجہ بھی ہے۔" سردار بے دلی سے بولا:

"پوچھنا ہی چاہتے ہو تو سنو۔ ہمارے سپہ سالار محمد بیگ کو مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ اس قافلے کے ساتھ کئی جاسوس مرد اور عورتیں سفر کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں پوری چھان بین کی جائے گی۔ اس کے بعد ہی قافلے کو آگے بڑھنے کی اجازت مل سکے گی۔"

"سردار ....." قافلہ سالار چڑ کر بولا:

"یہ بات آپ نے پہلے ہی بتا دی ہوتی تو اتنی لمبی جھک جھک کیوں ہوتی۔ ہمارے قافلے پر جو الزام لگایا گیا ہے ہم اس کی صفائی پیش کریں گے اور اگر واقعی ہم میں سے کوئی جاسوس گھس آیا ہے تو ہم اسے خود پکڑ کے آپ کے حوالے کر دیں گے۔"

بات معقول تھی۔ قافلہ سالار اپنے سر یہ الزام لینے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا کہ اس کے قافلے میں کوئی جاسوس موجود ہے۔

تاجروں کو تاتاریوں کی خانہ جنگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کا کام تو تجارتی سامان کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچانا اور اس کو فروخت یا تبادلہ کرنا تھا۔

چھ سال پہلے جب یہ خانہ جنگی شروع ہوئی تھی تو تجارتی قافلے بڑے بڑے شہروں میں رک کر رہ گئے تھے۔ اس وجہ سے بازار سرد پڑ گئے تھے اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تاتاریوں کی یہ خانہ جنگی شہر سبز کے سردار تیمور اور اس کے سالے امیر حسین کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی تھی۔ پورا ملک تاتار دو گروہوں میں بٹ گیا تھا۔ کچھ قبائل تیمور کی طرف تھے اور کچھ امیر حسین کی حمایت کر رہے تھے۔

جب گرانی بہت بڑھ گئی اور تاجروں کو منڈیوں میں سامان لانے پر زور دیا گیا تو انہوں نے اپنے تحفظ

کی ضمانت مانگی۔ دونوں متحارب گروپ تجارت کے ٹھپ ہو جانے سے پریشان تھے۔ آخر یہ طے ہوا کہ ہر گروہ اپنے علاقے میں تاجروں کو تحفظ فراہم کرے گا۔ اس ضمانت کے بعد تجارتی قافلے پھر رواں دواں ہو گئے۔

تیمور اور امیر حسین دونوں ہی اپنے اپنے علاقوں میں قافلوں کی حفاظت کے ذمے دار تھے۔ یوں ایک طرف تو جنگ جاری تھی، دوسری طرف تجارت بے روک ٹوک ہو رہی تھی۔

یہ پہلا قافلہ تھا جس میں جاسوسوں کی شمولیت کا شبہ کیا گیا تھا اور اسے امیر حسین کے علاقے میں روک لیا گیا تھا۔ امیر حسین کا معتمد خاص امیر موسیٰ تھا۔ امیر حسین کو اس کی کمزوریاں معلوم تھیں اس کے باوجود وہ اسے برداشت کر رہا تھا۔ قلعہ قرشی پر اس نے امیر موسیٰ کو قلعہ دار مقرر کر دیا تھا۔ قافلے کو روکنے کا یہ واقعہ دریائے آمو کے شمال میں قرشی کی سرحد پر پیش آیا۔

قافلہ سالار اپنے قافلے کو فوجی چھاؤنی پر واپس لے آیا۔ سڑک کے ایک طرف کچھ فاصلے پر قرشی کے فوجیوں کے خیمے نصب تھے۔ قافلہ سالار نے اپنے قافلے کے خیمے، سڑک کے دوسری جانب، درختوں کے سائے میں نصب کرنے کا حکم دیا۔ قرشی کے سواروں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی..... خیموں سے بہت سے لوگ آ کر ان میں شامل ہو گئے تھے۔

قافلہ سالار، لوگوں کو کھانا پکانے، کھانے اور ہر طرح کی تسلی دے کر، قرشی سردار کے پاس آیا۔ قرشی سردار اپنے سواروں کے ساتھ ایک جگہ کھڑا خیمے نصب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں قافلے والوں کے درمیان بھٹک رہی تھیں جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ ممکن ہے وہ اس منہ زور لڑکی کو تلاش کر رہا ہو جس نے اسے منہ توڑ جواب دیے تھے۔

"ہاں تو سردار.....!"

قافلہ سالار نے اسے چونکا دیا:

"فرمائیے۔ جاسوسوں کو تلاش کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟"

"ہاں.....!" سردار اپنی خفت مٹاتے ہوئے بولا:

"چھوٹے بڑے سے پوچھ کر ابھی بتاتا ہوں لیکن یہ خیال رہے کہ اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ جان سے ہاتھ دھوئے گا اور تمہیں بھی اس کی سزا دی جائے گی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

قافلہ سالار نے اسے حیرت سے دیکھا:

"جو بھاگے گا وہ خود مارا جائے گا۔ میرے پاس تو صرف بیس مسلح آدمی ہیں۔ اگر کوئی بھاگ نکلا تو

آپ کی چھاؤنی کے ڈیڑھ دو سو سواروں کا ہوگا، مجھے کیوں سزا ملے گی۔ میں نے تو اپنا قافلہ آپ کے حوالے کر دیا ہے۔"

"اچھا اچھا..... زیادہ باتیں نہ بناؤ!" سردار لاجواب ہو کر بولا۔

"محترم سردار.....!"

قافلہ سالار نے کچھ کہنا چاہا تو سردار نے اسے ڈانٹ دیا:

"چپ چاپ جا کر بیٹھو!"

پھر وہ اپنا گھوڑا موڑ کر خیموں کی طرف چلا گیا۔

قافلہ سالار اسے دیکھتا ہی رہ گیا..... پھر واپس آ کر وہ بھی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب یہ سردار اس قدر اکھڑ اور احمق ہے تو اس کا مالک کس طرح کا ہوگا۔ اگر بدقسمتی سے وہ بھی ایسا ہی نامعقول ہوا تو پھر قافلے کو یہاں سے صحیح سلامت نکال لے جانا مشکل ہو جائے گا۔

○

دوپہر کے بعد قافلے والوں نے رات کا کھانا بھی پکا کر کھا لیا لیکن جاسوسوں کی تلاش کا سلسلہ شروع نہ ہوا۔ رات ہوتے ہی قافلے کے گرد پہرہ سخت کر دیا گیا۔ قافلہ سالار سخت پریشان تھا۔ پورے قافلے میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔

قافلے کے ساتھ والی گھڑ سوار لڑکی، اس وقت قافلہ سالار کے خیمے میں بیٹھی اس سے گفتگو کر رہی تھی۔ لڑکی چونکہ تنہا تھی اس لیے قافلہ سالار اسے اپنے خیمے ہی میں رکھتا تھا۔ لڑکی کا باپ ایک بڑا تاجر اور قافلہ سالار کا گہرا دوست تھا۔ خانہ جنگی کے پیش نظر لڑکی کے باپ نے اسے بہت روکا کہ اس پُرخطر زمانے میں وہ تنہا سفر نہ کرے لیکن لڑکی نے باپ کی بات نہ مانی۔ مانتی بھی کیسے! اس کا شوہر ایک سال سے لاپتہ تھا۔ وہ شمال میں سامانِ تجارت کے ساتھ گیا تھا لیکن واپس نہ آیا۔

لڑکی کو کسی ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ اس کا شوہر قلعہ قرشی میں موجود ہے۔ بس ایک موہوم امید کے سہارے وہ قرشی سے گزرنے والے اس قافلے کے ساتھ ہو لی تھی۔

"بیٹی نوبیہ.....!" قافلہ سالار نے لڑکی کو مخاطب کیا۔ "قرشی کے ان فوجیوں کے ارادے کچھ اچھے نہیں

معلوم ہوتے۔ پتہ نہیں یہ کیا چاہتے ہیں۔ قافلے کے تمام لوگوں کو میں جانتا ہوں ان میں کوئی بھی جاسوس نہیں ہے۔"

"چچا جان! آپ نے ایک بات پہ غور نہیں کیا۔" نوبیہ بولی۔ "دشمن قبیلے کا ہر آدمی جاسوس سمجھا جاتا ہے۔ قرشی والوں کی سردار تیمور سے جنگ ہو رہی ہے۔ تیمور کا تعلق برلاس قبیلے سے ہے اس لیے آپ کے قافلے میں جو لوگ برلاس قبیلے کے ہیں وہ سب قرشی والوں کی نظر میں جاسوس ہیں۔"

"میری بیٹی نے بڑی سمجھ داری کی بات کی ہے۔" قافلہ سالار خوش ہو کر بولا۔ "یہی بات اس وقت بھی ہمارے پیش نظر تھی جب ہم قافلہ ترتیب دے رہے تھے۔ میں نے اور تمہارے باپ نے قبیلہ برلاس کے تمام تاجروں کو قافلے میں شریک ہونے سے روک دیا تھا۔ ہم نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر کوئی برلاس تاجر ہمارے ساتھ گیا تو اس کی جان و مال کے ہم ذمے دار نہ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ہمارے قافلے میں کوئی بھی برلاس قبیلے کا تاجر موجود نہیں ہے۔"

"آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟" نوبیہ مسکرائی۔

"تم تو میری بیٹی ہو۔" قافلہ سالار اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تمہارے بارے میں کوئی سوال ہوگا تو میں کہہ دوں گا کہ نوبیہ میری بھتیجی ہے اور میرے ساتھ تاشقند جا رہی ہے۔"

"چچا جان! میرا خیال ہے کہ ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں۔" نوبیہ نے بڑی متانت سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کو اس بات سے آگاہ کر دوں جو میں نے اب تک آپ سے چھپا رکھی ہے۔"

قافلہ سالار نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کونسی بات ہے جو تم نے مجھ سے چھپائی ہے۔ اگر تمہارا اشارہ اپنے شوہر کی طرف ہے تو میں اس کی تفصیل سے آگاہ ہوں۔ تمہارے باپ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے چچا جان!" نوبیہ اطمینان سے بولی۔ "آپ کو ابا جان نے بتایا ہوگا کہ ایک سال پہلے میری شادی ہوئی تھی اور پھر دو ماہ بعد میرا شوہر قا ساتھ شمال میں چلا گیا۔ اس کے علاوہ تو آپ کو اور کچھ نہ معلوم ہوگا۔"

"مجھے تمہارے اس سفر کا مقصد بھی معلوم ہے۔" قافلہ سالار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم تاشقند میں اپنے شوہر کو ڈھونڈنے جا رہی ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں چچا جان۔ میں تاشقند نہیں جا رہی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تمہارے باپ نے میرے ساتھ غلط بیانی کی ہے۔" قافلہ سالار نے تاسف سے کہا۔

"غلط بیانی نہ کہیے چچا جان۔ انہیں جھوٹ بولنے پر میں نے مجبور کیا تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے علم ہوا ہے کہ میرے شوہر فہید، قرشی کے قلعے میں موجود ہیں۔ وہ بھی برلاس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے برلاس ہونے سے انکار کر دیا اور بڑی مشکل سے جان بچائی۔۔۔۔ اب وہ قلعہ قرشی میں موجود ہیں لیکن ان کی نگرانی ہوتی ہے۔ میں فیصلہ کر کے آئی تھی کہ جب قافلہ قرشی کے قریب سے گزرے گا تو میں آپ کو اصل حالات سے آگاہ کر کے قافلے سے علیحدہ ہو جاؤں گی تاکہ کسی طرح قلعے میں داخل ہو کر اپنے شوہر کی رہائی کی کوئی صورت پیدا کر دوں۔ میں نے ابا جان کو منع کر دیا تھا کہ وہ آپ کو اس وقت حقیقت نہ بتائیں ورنہ آپ مجھے شاید ساتھ لانے پر آمادہ نہ ہوتے۔"

"میری اچھی بیٹی!" قافلہ سالار محبت سے بولا۔ "خدا تیری عمر دراز کرے اور تجھے اپنے شوہر سے ملائے۔ خوش قسمت ہے وہ شوہر جسے تجھ جیسی چاہنے والی بیوی ملی۔"

ان کی گفتگو جاری تھی کہ ایک آدمی نے آ کر اطلاع دی، "قافلہ سالار کو امیرِ قرشی نے اپنے خیمے میں طلب کیا ہے۔"

قافلہ سالار جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ جلد از جلد اس جھگڑے کو نمٹا کر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔

"چچا جان۔" نوبیہ آہستہ سے بولی۔ "آپ پہ پورے قافلے کی ذمہ داری ہے۔ نرم رویہ اختیار کیجیے گا۔"

"بیٹی! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں تو یہاں تک تیار ہوں کہ امیرِ قرشی مجھے یرغمال کے طور پر اپنی قید میں رکھ لے اور قافلے کو آگے جانے کی اجازت دے دے۔"

"چچا جان! آپ واقعی ایک مخلص قافلہ سالار ہیں۔" نوبیہ نے کہا۔ "اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ میں آپ کے ے دعا کرتی رہوں گی۔"

امیرِ قرشی جو دراصل قرشی کے حاکم امیر موسیٰ کا نوجوان بیٹا محمد بیگ تھا، اس کا خیمہ ایک بلند جگہ پر نصب تھا۔ افلہ سالار، محمد بیگ کے ہرکارے کے ساتھ اس کے خیمے پر پہنچا۔ باہر مسلح پہرے دار موجود تھے جو کامدار ردیاں پہنے ہوئے تھے جو رات کے اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔

یہ وردیاں عام طور پر شاہی محلات کے پہرے دار استعمال کرتے تھے۔ حاکمِ قرشی محض ایک امیر تھا اور ن کا بیٹا محمد بیگ تو ابھی کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے باپ کی نسبت سے لوگ اسے "چھوٹا امیر" کہتے تھے۔ اس کے یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر قافلہ سالار بہت حیران ہوا۔

قافلہ سالار کو اندر طلب کیا گیا تو وہ اندر کی شان دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ بہترین قالینوں کا فرش تھا۔ خیمے کی

دیواروں پر غالیچے آویزاں تھے۔ تاتاریوں کے رسم و رواج اور طور طریقے مغلوں سے کچھ مختلف تھے۔۔۔
محمد بیگ نے اپنے خیمے کو مغل امیروں کی طرح آراستہ کروایا تھا۔

قافلہ سالار نے جھک کر ادب سے سلام کیا۔

"تم اس قافلے کے سالار ہو؟" محمد بیگ نے نہایت خشک اور کرخت لہجے میں دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ امیرِ محترم!" قافلہ سالار نے ضبط سے کام لیتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

"تمہیں معلوم ہے قافلے کو کیوں روکا گیا ہے؟"

"جی امیرِ محترم!" قافلہ سالار نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن جو کچھ ہوا ہے وہ حاکم قرشی جو ہ
کے یقیناً دہائی کے خلاف ہوا ہے۔ ہم لوگ تاجر ہیں۔ خانہ جنگی سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔۔۔ دونوں فریقوں
قافلے کے تحفظ کی ذمے داری قبول کی ہے۔ اس کے باوجود۔۔۔"

"قافلہ ہمارے حکم سے روکا گیا ہے۔" محمد بیگ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہارے قافلے میں جاسوس موجود ہیں۔ خانہ جنگی پہلے تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔ ہم سے لا
اٹھایا ہے۔"

"امیرِ محترم! ہمارا قافلہ دوپہر سے یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ اگر اس میں جاسوس موجود ہیں تو ان کی نشان دہ
اگر ہم صفائی پیش نہ کر پاتے تو قصور ہمارا تھا۔"

"دریا کے اس پار تیمور نے تمہارے قافلے کو ایک ماہ تک روکے رکھا اس وقت تم نے کوئی احتجاج
ہم نے ایک دن روکا ہے تو چیخ رہے ہو۔" محمد بیگ نے بڑے تند لہجے میں کہا۔

"احتجاج تو ہم نے اس وقت بھی کیا تھا۔" قافلہ سالار نے جواب دیا۔ "لیکن سردار تیمور نے ہر قافلے
کھانے پینے کا انتظام خود کیا تھا۔۔۔ جبکہ یہاں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔" محمد بیگ گرجا۔ "قافلے کو صرف ایک شرط پر رہائی مل سکتی ہے۔"

"ہم ہر شرط پوری کرنے کے لیے تیار ہیں امیر! آپ حکم دیجیے۔"

"تیمور کے جاسوسوں کو ہمارے حوالے کیا جائے۔" محمد بیگ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "اگر تم
کیا تو پورے قافلے کو قتل کر کے سامان لوٹ لیا جائے گا۔"

"امیرِ محترم! ہم نے کب انکار کیا ہے۔ جن لوگوں پر آپ کو شبہ ہے ان کے نام بتائے جائیں۔ اگر
صفائی پیش نہ کر سکے تو بے شک انہیں گرفتار کر لیا جائے۔"

"وہ لڑکی کون ہے جو قافلے کے ساتھ سفر کر رہی ہے!"

"وہ لڑکی نہیں امیر! میری شادی شدہ بھتیجی نوبیہ ہے۔" قافلہ سالار نے بے جھجک کہا۔ "اس کا شوہر تاشقند میں
ہے۔ وہ اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہے۔"

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ برلاس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔۔۔" محمد بیگ بولا۔ "صرف برلاس قبیلے کی
عورتیں جسم پر اسلحہ سجا کر اتنی بے باکی سے مردوں کے ساتھ سفر کر سکتی ہیں۔"

"امیرِ محترم! گستاخی معاف! میری عمر آپ سے زیادہ ہے۔"

"اس بات کا عمر سے کیا تعلق؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" محمد بیگ نے بڑے ناگوار انداز میں اسے دیکھا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں امیر! عورت خواہ برلاس قبیلے کی ہو یا جلائر قبیلے کی۔۔۔ تاتاری عورتیں ہر دور میں
مردوں کے شانہ بشانہ سفر ہی میں نہیں بلکہ جنگ میں بھی شریک ہوتی رہی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے شاہِ کابل
امیر حسین کی ملکہ دلشاد آغا بیگم کو میدانِ جنگ میں تیر پھینکتے اور تلوار چلاتے دیکھا ہے۔"

"یہ لڑکی ضرور برلاس ہے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔" محمد بیگ غصے سے بولا۔ "جب تیمور نے تمہیں سفر کی
اجازت دی تھی تو اس وقت، اس لڑکی کو جاسوسی کے لیے تمہارے قافلے میں شامل کر دیا گیا تھا۔۔۔ ہمیں پورا یقین
ہے کہ وہ جاسوس ہے۔"

"میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں امیر!" قافلہ سالار فکر مند لہجے میں بولا۔ "نوبیہ پر شبہ کرنے کا مطلب ہے
کہ آپ کو مجھ پر بھی شبہ ہے اور مجھ پر شبہ کرنے سے پورا قافلہ مشکوک ہو جائے گا۔ کیا اس کی بہتر صورت یہ نہیں ہو
سکتی کہ آپ مجھے حاکم علاقہ امیر موسیٰ کے پاس بھیج دیں۔ میں ان کے سامنے خاندانی حوالے دے کر انہیں
مطمئن کر دوں گا۔"

"قرشی قلعے کا بیرونی علاقہ ہمارے سپرد ہے!" محمد بیگ گردن تان کر بولا۔ "فیصلہ ہمیں کرنا ہے اور ہم سمجھتے
ہیں کہ وہ لڑکی جاسوس ہے۔"

قافلہ سالار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محمد بیگ کو وہ کس طرح مطمئن کرے۔

"لڑکی کو حاضر کیا جائے۔" محمد بیگ نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا۔

"دیکھیے امیرِ محترم!" قافلہ سالار گھبرا گیا۔ "بغیر جرم ثابت کیے، کسی خاتون کو رسوا کرنا کسی طرح بھی
مناسب نہیں۔"

محمد بیگ نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور نوبیہ کو بلانے کے لیے ایک آدمی بھیج دیا۔ قافلہ سالار
بہت پریشان تھا۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں قافلے والے بگڑ نہ جائیں اور مزاحمت پر آمادہ ہو جائیں۔ اس سے
خواہ مخواہ خون خرابہ ہو گا۔

"اس کی اور بھی صورت ہو سکتی ہے امیر!" قافلہ سالار بولا۔

"نوبیہ کو یہاں بلانے سے بدمزگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کو اس پر شبہ ہے تو آپ مجھے یرغمال کے طور پر یہاں روک لیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ میں بے لاس ہوں تو مجھے قتل کر دیا جائے۔"

"مجرم کی سزا صرف مجرم کو ملے گی۔" محمد بیگ شرارت سے بولا:

"تمہیں یرغمال بنا کر ہمیں اچار نہیں ڈالنا ہے۔ لڑکی کو آنے دو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔"

قافلہ سالار کو نوبیہ کی عقل و دانش پر اعتبار تھا۔ پھر بھی خدشہ تھا کہ وہ گھبرا نہ جائے اور اس کے منہ سے کہیں ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جس سے وہ گرفت میں آ جائے۔ اس کے پکڑے جانے سے قافلہ بالا پیٹ میں آ جاتا۔ بڑی الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ اب وہ نوبیہ کو ساتھ لا کر پچھتا رہا تھا۔

نوبیہ واقعی بڑی عقلمند تھی۔

جس وقت قافلہ سالار خیمے سے چلا تھا اسی وقت اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی تھی۔ اس کا ذہن کہہ رہا تھا "جاسوس" کا تو محض بہانہ ہے۔ قافلے کو روکنے کی وجہ کچھ اور ہی ہے۔

وہ اٹھی اور اپنے جسم پر اسلحہ سجانے لگی۔ جیسے وہ میدانِ جنگ میں جا رہی ہو۔ پوری طرح مسلح ہونے کے بعد اس نے اپنا گھوڑا منگوایا اور اسے خیمے کے دروازے پر بندھوا دیا۔

وہ ان کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ محمد بیگ کا آدمی آ گیا۔ اس نے اندر پیغام بھجوایا کہ امیر محمد بیگ نے اسے اپنے خیمے میں طلب کیا ہے۔

نوبیہ جواب دینے کے بجائے خود خیمے سے باہر آ گئی۔ محمد بیگ کا آدمی اسے مسلح دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"اپنے امیر سے جا کر کہہ دو کہ نوبیہ ایک "تاتاری عورت" ہے۔۔۔" اس نے بڑے پُر وقار انداز میں کہا:

"تاتاری عورت رات کے وقت سوائے اپنے شوہر کے خیمے کے کسی غیر مرد کے خیمے میں نہیں جایا کرتی اور یہ بھی کہہ دینا کہ اگر نوبیہ کو زبردستی بلوایا گیا تو امیر کے پاس صرف اس کی لاش ہی پہنچے گی۔"

محمد بیگ کا آدمی، نوبیہ کے وقار اور اندازِ گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے جھک کر نوبیہ کو سلام کیا اور واپس چلا گیا۔

"ٹھہرو۔۔۔" نوبیہ نے کچھ سوچتے ہوئے قاصد کو روکا:

"امیر سے کہہ دینا کہ نوبیہ کو ان کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ اس کی عزت و ناموس کے تحفظ کا وعدہ کریں۔"

قاصد، محمد بیگ کے خیمے میں داخل ہوا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"چپ کیوں کھڑا ہے، بولتا کیوں نہیں؟" محمد بیگ نے اسے گھورا۔ "کیا اس نے یہاں آنے سے انکار کر دیا؟"

"ہاں امیر۔ وہ آنے پر آمادہ نہیں۔" قاصد نے جواب دیا۔

"ذلیل کمینے۔ تو اکیلا کیوں آیا؟"

محمد بیگ غصے سے کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا:

"اسے چوٹی سے پکڑ کے گھسیٹتا ہوا کیوں نہیں لایا؟ اس کے انکار پر تو نے اس کی زبان کیوں نہ کھینچ لی؟"

"امیر سردار۔۔۔" قاصد نے سر اٹھائے بغیر کہا:

"لڑکی نے کہا ہے کہ میں تاتاری عورت ہوں اور تاتاری عورت رات کے وقت کسی غیر مرد کے خیمے میں نہیں جایا کرتی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر مجھے لے جانے کی کوشش کی گئی تو تمہارے ہاتھ میری لاش ہی آئے گی۔ وہ تو اپنے سینے میں خنجر گھونپنے پر بھی آمادہ ہو گئی تھی۔" قاصد نے آخری جملہ اپنی بچت کے لیے خود ہی شامل کر لیا۔

نوبیہ کے اس دلیرانہ جواب نے محمد بیگ کو بہت متاثر کیا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ قافلہ سالار دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ نوبیہ نے خود کو بچانے کا بڑا اچھا اور معقول طریقہ اختیار کیا تھا۔

قاصد نے محمد بیگ کو خیالوں میں گم دیکھا تو دوبارہ بولا:

"اس نے کہا ہے کہ اگر اس کی عزت و ناموس کے تحفظ کا وعدہ کیا جائے تو اسے آنے میں کوئی عذر نہ ہو گا۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں۔"

محمد بیگ ایک دم بول پڑا:

"تم جاؤ اور اسے کہو کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ ہم اسے کسی بات پر مجبور نہیں کریں گے۔"

قاصد جانے لگا تو محمد بیگ بولا:

"دیکھو۔ اس لڑکی کو عزت و احترام سے لانا۔"

قافلہ سالار کو نوبیہ کی یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔ اسے کسی شرط پر بھی محمد بیگ کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔۔۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ جو شخص حاکم قرشی کے تحفظ دینے کے باوجود قافلے کو روکنے پر تلا ہوا تھا، وہ نوبیہ کو بھی کسی نہ کسی طرح اپنے خیمے میں بلوا سکتا تھا۔

نوبیہ پوری طرح مسلح تھی۔

محمد بیگ کے خیمے پر پہرے دار نے اسے روک کر اسلحہ اتارنے کا حکم دیا۔ نوبیہ نے انکار کر دیا۔ تکرار بڑھ گئی۔

ایک محافظ نے اندر جا کر محمد بیگ کو اطلاع دی کہ لڑکی مسلح ہے اور اسی طرح اندر آنا چاہتی ہے۔ محمد بیگ نے نوبیہ کو معہ اسلحہ اندر آنے کی اجازت دے دی۔

نوبیہ بڑی شان سے خیمے میں داخل ہوئی۔ محمد بیگ نے اسے قریب سے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

"چھوٹے امیر کے حضور...... نوبیہ سلام پیش کرتی ہے۔" نوبیہ نے بڑے شستہ ادب سے کہا۔

"تیرا نام...... کیا ہے...... لڑکی؟" محمد بیگ نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"میں لڑکی نہیں، شادی شدہ ہوں امیر! مجھے خاتون کہہ کر مخاطب کر سکتے ہیں۔" نوبیہ نے محمد بیگ کو ملائمت سے ٹوکا۔

محمد بیگ شرمندہ سا ہو گیا:

"اچھا خاتون...... تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام نوبیہ ہے اور میرے شوہر کا نام فہید قلی چاپ ہے۔" نوبیہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"ہم تمہارے شوہر کے بارے میں نہیں پوچھ رہے!"

محمد بیگ چڑ گیا:

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم برلاس قبیلے سے تعلق رکھتی ہو...... اور تیمور نے تمہیں جاسوسی کی غرض سے اس قافلے کے ساتھ بھیجا ہے۔ اس سلسلے میں تم کیا صفائی پیش کر سکتی ہو؟"

نوبیہ، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے...... اس کے دل کا حال معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے محمد بیگ کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک سے اندازہ ہو گیا تھا کہ قافلے کو روکنے کی وجہ خود اس کی ذات ہے اور محمد بیگ جاسوسی کا الزام لگا کر اسے روکنا چاہتا ہے۔

نوبیہ جس وقت، باپ کی مرضی کے خلاف، گھر سے اس قافلے کے ساتھ چلی تھی، اسے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ شوہر تک پہنچنے کے لیے اسے صدہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا...... اور لوہے کے چنے چبانے ہوں گے۔

"چھوٹے امیر!" نوبیہ نے سنبھل کر کہا: "اگر گستاخی معاف کی جائے تو میں عرض کروں گی کہ الزام لگانے والے کو پہلے الزام ثابت کرنا ہوتا ہے صفائی کا مسئلہ تو بعد میں آتا ہے۔ اگر میں برلاس ہوں تو اس کے ثبوت میں آپ کے پاس ضرور کوئی شہادت ہوگی۔"

"کیا ہماری زبان کسی شہادت سے کم ہے۔" محمد بیگ بگڑ کر بولا۔ "تم بہت چالاک معلوم ہوتی ہو۔"

"چھوٹے امیر!"...... نوبیہ بے خوفی سے بولی:

"اگر آپ کی زبان ہی سب کچھ ہے تو پھر میرے صفائی پیش کرنے سے کیا ہوگا۔ حکم دیجیے۔ میں سزا کے لیے تیار ہوں۔"

"یوں نہیں......" محمد بیگ نے غصے سے کہا۔ "پہلے تمہیں اپنے جرم کا اقبال کرنا ہوگا!"

"اگر یہ بات ہے تو میں اپنے اوپر لگائے گئے جرم سے صاف انکار کرتی ہوں۔ جب تک مجھ پر جرم ثابت نہ ہو جائے گا، میں خود کو آپ کے فوجی دستے کے حوالے نہیں کروں گی۔"

"اے عورت!" محمد بیگ کے قریب کھڑے اس کے نائب سردار دلوران نے کہا۔ "تو اپنے آپ کو حوالے کرنے کی کیا بات کر رہی ہے۔ تو تو اس وقت بھی ہمارے قبضے میں ہے!"

دلوران کی زبان سے الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ نوبیہ کا ہاتھ بجلی کی طرح اپنے خنجر پر گیا اور اس نے خنجر محمد بیگ کے نائب پر کھینچ مارا۔ خنجر، دلوران کے آہنی خود سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ ہر شخص ہکا بکا رہ گیا۔

دلوران نے فوراً تلوار کھینچ لی اور نوبیہ کی طرف بڑھا۔ نوبیہ بھی اس وقت تک تلوار نکال چکی تھی۔

"خبردار...... دلوران!" محمد بیگ چیخا۔

دلوران کے قدم رک گئے۔ اس نے تلوار نیام میں ڈال لی۔ نوبیہ نے بھی مسکراتے ہوئے اپنی تلوار غلاف میں رکھ لی۔

"نوبیہ! تم نے ہمارے نائب پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ ہم تمہیں پہلے اس جرم کی سزا دیں گے۔" محمد بیگ نے بظاہر غصے سے کہا لیکن اس کے رویے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نوبیہ کی پھرتی اور دلیری سے بے حد متاثر ہوا ہے۔

"یہ قاتلانہ حملہ نہیں تھا چھوٹے امیر!" نوبیہ لاپروائی سے بولی:

"اگر میرا قتل کا ارادہ ہوتا تو یہ خنجر سیدھا اس کے سینے میں پیوست ہو چکا ہوتا۔ میں تو اس ذریعہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ہر تاتاری مرد اور عورت اس وقت تک آزاد ہے جب تک اس کے جسم پر اسلحہ موجود ہے۔ آپ کے نائب کے خود سے ٹکرانے والا یہ خنجر کسی کے بھی سینے میں داخل ہو سکتا تھا۔ آپ کی طرف سے زیادتی کی صورت میں یہ خنجر میرے سینے میں بھی پیوست ہو سکتا ہے۔ کیا آپ اب بھی اسے جرم کہیں گے؟"

"اچھا خیر۔۔۔" محمد بیگ پہلو بدل کر بولا۔
"ہم تمہیں اس جرم سے بری کرتے ہیں اور تمہارا یہ مطالبہ بھی قبول کرتے ہیں کہ تمہیں مجرم ثابت کرنے کے لیے ثبوت فراہم کیا جائے۔"

"میں چھوٹے امیر کے اس منصفانہ انداز کے لیے شکر گزار ہوں۔"
نوبیہ نے اس طرح مسکرا کر کہا کہ محمد بیگ جھوم اٹھا۔

"تمہارے قافلے کو قرشی میں اس وقت تک ٹھہرنا ہوگا جب تک تمہارے بارے میں تحقیقات مکمل نہ ہو جاتی۔ اگر الزام غلط ثابت ہوا تو ہم قافلے کا خسارا پورا کر دیں گے۔"

"مگر دیکھیے امیر!" قافلہ سالار گھبرا کر بولا۔ "قافلے کے رکنے سے ہمارا بھاری نقصان ہوگا اور۔۔۔"

"تم چپ رہو۔" محمد بیگ ترشی سے بولا۔ "نقصان ہوگا تو ہوتا رہے۔ مکمل تحقیقات سے پہلے قافلہ نہیں بڑھ سکے گا۔"

"چھوٹے امیر۔۔۔" نوبیہ نے دخل دیا۔ "الزام مجھ پر لگایا گیا ہے اور سزا قافلے والوں کو دی جا رہی ہے یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

نوبیہ نے کچھ اس طرح اٹھلا کر کہا کہ محمد بیگ کے عیاش ذہن میں گدگدی سی پیدا ہونے لگی۔

"نوبیہ! ہمیں قافلے والوں سے کوئی دشمنی نہیں۔" محمد بیگ عالمِ سرمستی میں بولا۔ "ہمیں تو صرف اور صرف تم سے مطلب ہے۔"

"جی۔۔۔ کیا فرمایا چھوٹے امیر نے؟" نوبیہ نے پھر اس کی گرفت کی۔

"ہمارا مطلب ہے۔" محمد بیگ سنبھل کر بولا۔ "قافلے والے اگر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں لیکن تمہیں تحقیقات کے اختتام تک یہیں ٹھہرنا ہوگا۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو آپ کیا قدم اٹھائیں گے امیر۔۔۔؟" نوبیہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"اگر آپ مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے تو میں خود ہی قیدِ زندگی سے آزادی حاصل کر لوں گی! آپ کو صرف میری لاش ہی مل سکے گی۔"

"ہم تمہاری موت کے خواہاں نہیں ہیں نوبیہ۔" محمد بیگ جلدی سے بولا۔ "ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ جب تک تم قرشی میں رہو گی، تمہاری حفاظت کی جائے گی۔ تمہارے خیمے پر بھی خواتین کا پہرہ لگایا جائے گا۔"

"اگر میں ان شرائط پر قرشی میں قیام پر رضامند ہو جاؤں تو کیا آپ قافلے کو آگے جانے کی اجازت دے

دیں گے؟"

"نہیں نوبیہ!"
قافلہ سالار نے فوراً مخالفت کی:

"تمہاری حفاظت کا ذمہ میں نے اٹھایا ہے۔ میں واپس جا کر تمہارے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟"

"چچا جان۔۔۔" نوبیہ مستقل مزاجی سے بولی۔۔۔ "آپ میری فکر نہ کریں۔ میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ ممکن ہے میں اپنے اوپر لگائے گئے الزام کو غلط ثابت کر کے آپ سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ اس طرح آپ کو میرے باپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔"

"تم دخل مت دو۔"
محمد بیگ نے قافلہ سالار کو روک دیا:

"اگر نوبیہ یہاں ٹھہرنے پر آمادہ ہے تو قافلہ جب چاہے یہاں سے آگے جا سکتا ہے۔"

"قافلے کو جانے کی اجازت دی جائے۔" نوبیہ نے کہا۔ "تحقیقات کے لیے جب تک امیر چاہیں گے میں یہاں مقیم رہوں گی۔"

"قافلے کو جانے کی اجازت ہے۔" محمد بیگ نے خوشی سے کہا۔

"آپ قافلے کو لے کر ابھی آگے بڑھ جائیے چچا جان۔" نوبیہ نے قافلہ سالار سے درخواست کی۔ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔ میں اپنی ایک جان کے لیے پورے قافلے کو مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی۔"
قافلہ سالار کو مجبوراً نوبیہ کی بات ماننا پڑی:

محمد بیگ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب نوبیہ کچھ دن اس کے قریب رہے گی تو آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے گی اور وہ اپنی ہر خواہش پوری کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

نوبیہ اپنی جگہ مطمئن تھی۔ اس کی اصل منزل قرشی ہی تھی۔۔۔۔ اگر اس کا شوہر فہید قرشی میں موجود ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح اس تک رسائی حاصل کر لے گی اور اگر وہ یہاں موجود نہیں ہے تو پھر اس کے لیے محمد بیگ کی قید سے فرار ہونا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔

⊙

قرشی کا قلعہ اس علاقے کا عظیم ترین قلعہ تھا۔ اس قلعے کی پہلی تعمیر نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے

حکیم مقنع نے کی تھی جو اپنی نبوت کے ثبوت میں ایک کنویں سے دھات کا چاند نکالتا تھا۔ اس چاند کی روشنی بارہ میل تک جاتی تھی۔ یہ چاند ایک کنویں سے نکلتا اور رات بھر اصل چاند کی طرح کچھ بلندی پر سفر کرتا ہوا، صبح کے وقت دوسرے کنویں میں داخل ہو جاتا تھا۔ اس جھوٹے نبی کا جھوٹا معجزہ ' ماہِ نخشب کے نام سے مشہور ہے۔ آخر مسلمانوں نے اس جھوٹے نبی کا جنازہ نکال دیا اور مقنع اپنے چھ ہزار پیروکاروں کے ساتھ آگ میں کود گیا۔ قلعے کا بیشتر حصہ آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

تیمور نے جب قرشی کے علاقے پر قبضہ کیا تو اس جگہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے پرانے قلعے کی مرمت کرائی اور اس میں کئی ترامیم اور اضافے کیے۔

تیمور اس قلعے کو بہترین پناہ گاہ سمجھتا تھا۔ خصوصاً موسمِ سرما میں تو یہ قلعہ ناقابلِ تسخیر ہو جاتا تھا لیکن تیمور کی بدقسمتی کہ اس قلعے کو اس کی بیوی الجائی خاتون کے بھائی امیر حسین نے اس سے مانگ لیا۔ . . . پھر الجائی خاتون کا انتقال ہو گیا۔ تیمور اور امیر حسین کی اقتدار کی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اب تیمور کو اپنی غلط بخشش پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بہادری اور جنگی صلاحیت کے زور پر امیر حسین کو پے در پے شکست دے کر اس سے بہت سے علاقے چھین لیے تھے۔ . . . . پھر بھی امیر حسین کے پاس بہت سے اہم علاقے موجود تھے جن کے زور پر وہ تیمور کو لڑائیوں میں الجھا کر پریشان کرتا رہتا تھا۔ قرشی کا قلعہ ان سب میں اہم تھا۔

امیر حسین نے قرشی کے علاقے اور قلعے پر اپنے نائب امیر موسیٰ کو حاکم مقرر کیا تھا جس کے پاس بارہ ہزار فوج ہر دم تیار رہتی تھی۔ تیمور اس قلعے کو ہر طور حاصل کرنے پر تُلا ہوا تھا لیکن کوئی ترکیب نظر نہیں آتی تھی۔

تاتاریوں کی مسلسل خانہ جنگی نے امیر حسین اور تیمور کی فوجی طاقت پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ مغل شکست کھا کر حصار المالیق بھاگ گئے تھے۔ اب ان میں تاتاری علاقوں پر یلغار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ پھر بھی اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکثر وہ لوٹ مار کرنے تاتاری علاقوں میں گھس آتے تھے۔

اس تمام صورت حال کے پیشِ نظر تیمور چاہتا تھا کہ پورے ملکِ تاتار پر ایک شخص کی حاکمیت ہو تاکہ ایک مضبوط ریاست قائم ہو سکے۔

تیمور نے اپنے تمام بڑے سرداروں کو جمع کیا، امیر جاکو، امیر داؤد، موید ارلات اور ایلچی بہادر جیسے سردار اب تک اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

"ساتھیو اور دوستو!"

تیمور نے انہیں مخاطب کیا:

"قرشی کا علاقہ اور قلعہ حاصل کیے بغیر نہ تو امیر حسین کی طاقت کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ خانہ جنگی ہی رک

سکتی ہے۔"

تیمور کے سردار اور امیر گھبرا گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور سر جھکا لیے۔ وہ سمجھ گئے کہ تیمور قرشی پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ قرشی کو فتح کرنے کا تصور ہی عبث ہے۔ تیمور کا لشکر بہادروں اور جانبازوں پر مشتمل اور ناقابلِ شکست تھا مگر اس کی تعداد قرشی میں موجود لشکر کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کم تھی۔ لہٰذا انہوں نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔

تیمور کو سرداروں کی اس خاموشی پر غصہ آ گیا۔ اس نے امیر داؤد سے مخاطب ہو کر کہا:

"داؤد! تم تو خطر پسند اور نڈر مشہور ہو۔ تمہاری خاموشی میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔"

"محترم امیر!" داؤد نے سر اٹھا کر جواب دیا:

"ان دنوں شدید گرمی پڑ رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ موسم، قرشی پر حملے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ پھر ہمارے بیوی بچے بھی ساتھ ہیں۔ ان کی حفاظت ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ اس مہم کو کچھ دنوں کے لیے ملتوی رکھا جائے۔"

"امیر داؤد!" تیمور بڑے رعب سے بولا: "تمہارے اہل و عیال کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ پھر تم کیوں فکر کرتے ہو؟"

"مگر سردار۔ یہ تو غور فرمایئے، ہمارے اہل و عیال لشکر کے ساتھ کھلے میدان میں ہیں۔ اگر شہر پناہ کے اندر ہوتے تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ . . ." امیر داؤد نے شائستگی سے کہا۔

"اسی شہر پناہ کے حصول کے لیے تو میں قلعہ فتح کرنا چاہتا ہوں۔" تیمور مسکرایا:

"قرشی کے گرد بڑی مضبوط فصیل ہے۔ ذرا غور کرو۔ اگر قرشی ہمارے قبضے میں آ جائے تو ہمیں کتنا فائدہ ہو گا تمہارے اہل و عیال کے لیے ایک ناقابلِ شکست اور نہایت محفوظ جگہ حاصل ہو جائے گی۔"

سرداروں اور امیروں کی سمجھ میں یہ بات تو آ گئی لیکن قرشی کی فتح ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ امیر داؤد تو خاموش رہا لیکن امیر جاکو نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"سردار۔ میرے خیال میں ہمیں پہلے کافی طاقت جمع کر لینی چاہیے۔ اس کے بعد قرشی کے بارے میں سوچیں۔ امیر حسین بچہ نہیں ہے۔ اس کی پوری زندگی انہی معرکوں میں گزری ہے۔ وہ کوئی محل نشین عورت تو نہیں ہے جس پر ہم قابو پا لیں گے۔"

امیر جاکو کے الفاظ کی ترشی صاف ظاہر کر رہی تھی کہ وہ قرشی پر حملے کے خلاف ہے۔ تیمور بھی اسے بھانپ گیا ہوا تھا۔ بولا:

"اچھا، تو پھر تم عورتوں کے پاس جاکر پہلے سبق پڑھو پھر واپس آنا۔ میں اپنے ساتھ ان لوگوں کو
لوں گا جو پل کی لڑائی میں شامل تھے۔"

یہ اشارا مویدارلات اور ایلچی بہادر کی طرف تھا جو مغلوں سے پہلی جنگ کے موقع پر سنگین پل کی حفاظت
پر مامور تھے۔ ۔ ۔ ۔ سنگین پل کے دوسری جانب مغل سپہ سالار بیک جک پڑاؤ ڈالے پڑا تھا اور اس کا حملہ کسی
وقت بھی متوقع تھا۔ ایسے موقعے پر تیمور نے اس کی حفاظت کے لیے مویدارلات، ایلچی بہادر اور امیر موسیٰ کو متعین
کیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ وہی امیر موسیٰ جو اس وقت قرشی پر قابض تھا۔

سنگین پل کا نام آیا تو تیمور کے کچھ دوسرے سردار بھی ہم زبان ہو کر بولے:

"سردار۔ اس جنگ میں تو ہم بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ہم نے بھی دریا پار کر کے مغلوں کو مار بھگایا تھا۔"

"مگر اب تم وہیں جاؤ۔ جہاں تمہارے اہل و عیال ہیں۔" تیمور بگڑ کر بولا:

"جاؤ اور جو تمہارا جی چاہے کرو۔ میں نے قرشی پر قبضے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ میری منزل
قرشی ہے۔"

"ذرا ٹھہریے سردار۔" امیروں میں سے ایک بولا: "ہمیں چند منٹ سوچنے کا موقع دیجیے۔"

سب سردار اٹھ کر دوسرے خیمے میں چلے گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ تیمور کا فیصلہ اٹل ہوا کرتا ہے۔ وہ اس کا ساتھ
دیں یا نہ دیں، اس نے جو طے کر لیا ہے اس سے وہ باز نہیں آئے گا۔

امیر اور سردار اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے، آخر فیصلہ یہی ہوا کہ تیمور کا ساتھ ضرور دیا جائے گا۔ خواہ اس کا
نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

جب وہ باہم مشورہ کر کے واپس آئے تو امیر جاکو کے ایک ہاتھ میں کلام اللہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار۔
امیر جاکو نے واضح الفاظ میں کہا،

"اے سردار! ہم نے قرآن حکیم پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ہے کہ ہم سب آپ کا ساتھ دیں گے اور اگر نافرمانی کریں
تو ہم پر خدا کا عذاب نازل ہو اور اس تلوار سے آپ ہمارے سر قلم کر دیں۔"

تیمور مسکرایا اور اس نے اٹھ کر سب سرداروں کو باری باری گلے لگایا۔ ۔ ۔ ۔ پھر وہ سب سر جوڑ کر بیٹھ
گئے۔ تمام امیر کسی ایسی تدبیر پر غور کر رہے تھے جس کے ذریعے امیر موسیٰ کو قلعے سے باہر نکالا جائے۔ تیمور
بڑی خاموشی سے ان کی گفتگو سنتا اور مسکراتا رہا۔

"آپ بھی تو کچھ بولیے سردار۔" امیر داؤد نے اس سے کہا۔

"بالفرض تم نے امیر موسیٰ کو کسی تدبیر سے قلعے سے باہر نکلنے پر مجبور بھی کر دیا تو اس کے پاس دس ہزار کا

لشکر ہوگا۔ تم اس کا کیا بگاڑ لو گے؟" تیمور نے مسکرا کر کہا:

"تمہاری بہادری اپنی جگہ لیکن جنگ کا انجام کسے معلوم ہوتا ہے۔ خدانخواستہ ہمیں شکست ہو گئی تو ہماری یہ
طاقت بھی ختم ہو جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ پھر امیر موسیٰ اور امیر حسین دریائے آمو پار کر کے پورے ملک پر قابض ہو
جائیں گے اور ہمیں کہیں پناہ بھی نہ مل سکے گی۔"

تیمور کے جواب سے سب لاجواب ہو گئے۔

جس وقت قلعہ قرشی پر حملے کی تیاری ہو رہی تھی اس وقت امیر حسین اور امیر موسیٰ کے پاس دریائے آمو کے
شمال کا علاقہ تھا اور تیمور دریا کے جنوب میں خیمہ زن تھا۔ امیر حسین باوجود ایک بڑا لشکر رکھنے کے دریا عبور کرتے
ہوئے ڈرتا تھا۔ اس نے امیر موسیٰ کو تاکید کر رکھی تھی کہ وہ قلعہ قرشی پر مدافعتی جنگ لڑے۔ دریا عبور کرنے کی چنداں
ضرورت نہیں۔

تیمور بھی اپنی جگہ محتاط تھا اور دریا عبور کر کے کھلے میدان میں جنگ کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تیمور پرخیال انداز میں بولا:

"اگر میں، امیر موسیٰ کو یہ پیغام بھیجوں کہ اس سخت گرمی کے زمانے میں قلعہ بند ہو کر حبس کا شکار ہونا کہاں کی
عقلمندی ہے۔ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ قلعے سے نکل کر دریا کے کنارے آؤ اور درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں
میں بیٹھ کر بزم عشرت برپا کرو تو کیا امیر موسیٰ قلعہ چھوڑ کر باہر آ جائے گا؟"

جب امیروں اور سرداروں نے یہ سنا تو سب اس کا جواب سوچنے لگے۔ تیمور نے قلعہ قرشی کو موسم سرما کی
ضروریات کو سامنے رکھ کر بنوایا تھا۔ گرمی کے موسم کے لیے یہ قلعہ بالکل موزوں نہ تھا۔ امیر موسیٰ باہر نکلنے کے لیے واقعی
بے چین تھا لیکن ایک طرف امیر حسین کا حکم تھا کہ وہ قلعے سے باہر نہ آئے۔ دوسرے تیمور سے کھلے میدان میں مقابلہ
کرنے کی خود اسے ہمت نہیں پڑتی تھی۔

انہی باتوں کو سوچتے ہوئے امیر داؤد نے کہا،

"گرمی تو اس قیامت کی پڑ رہی ہے کہ امیر موسیٰ آنے کا قصد کرے گا لیکن آئے گا نہیں۔"

تیمور نے یہ بات مذاق میں کہی تھی لیکن مذاق کی اس بات سے اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کے دل میں یک
خیال آیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کی تصدیق امیر داؤد نے کر دی تھی۔

جس وقت تیمور نے قرشی پر حملے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بس دو چار روز ہی
میں حملے کے لیے آگے بڑھے گا لیکن پھر اس نے کچھ ایسی خاموشی اختیار کی کہ اس کے سردار اور امیر حملے کی بات ہی
بھول گئے۔ انہیں اطمینان ہو گیا کہ تیمور نے خود ہی اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔

ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد، تیمور اپنے لشکر کو شاہراہِ خراسان پر اس جگہ لے آیا جہاں سے ہرات کو راستہ جاتا تھا۔ اس نے چاہِ اسحاق کے پاس اپنے خیمے نصب کرائے اور قاصد کو تحفے تحائف دے کر والیِ ہرات کے پاس روانہ کیا۔ اب سرداروں کو یقین ہو گیا کہ تیمور قرشی پر حملہ کرنے کی بجائے ہرات کی طرف پیش قدمی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ قاصد کو ہرات بھیجنے کے بعد تیمور نے شمال کی طرف جانے والے قافلوں کو روکنا شروع کر دیا۔ اس نے اعلان کرا دیا کہ فی الحال شمال کا راستہ محفوظ نہیں ہے اس لیے قافلے اس وقت تک یہیں پڑاؤ ڈالیں جب تک محفوظ سفر کی ضمانت حاصل نہیں کر لی جاتی۔ قافلوں والے خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے وہیں پڑاؤ ڈال دیے کر دیے۔

اس طرح ایک ماہ گزر گیا۔

دریا پار قرشی کے دستے محمد بیگ کی سرکردگی میں موجود تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ قافلوں کا راستہ بند کر دیا ہے تو انہیں فکر لاحق ہوئی۔ محمد بیگ نے اپنے جاسوسوں کو شمال میں بھیجا۔ جاسوسوں نے آ کر اطلاع دی کہ تیمور نے دریا کے دوسری طرف قافلوں کو روک لیا ہے اور خود چاہِ اسحاق کے قریب خیمہ زن ہے۔

اسی دوران، تیمور کا والیِ ہرات کے پاس بھیجا ہوا پیامبر واپس آ گیا۔ والیِ ہرات نے بھی تیمور کو تحفے بھیجے اور اسے ہرات آنے کی دعوت دی تھی۔ تیمور نے فوراً ہرات جانے کی تیاری شروع کر دی۔

تیمور نے جن قافلوں کو روک رکھا تھا ان کے سالار بہت پریشان تھے۔ وہ اکٹھا ہو کر تیمور کے پاس آئے۔ تیمور نے انہیں بڑی عزت سے بٹھایا اور ان کی تواضع کی۔ وہ ان کے آنے کا مقصد جانتا تھا لیکن اسے انتظار تھا کہ ان کی طرف سے بات شروع ہو۔

"شہرِ سبز کے سردارِ محترم!"

ایک قافلہ سالار نے بات شروع کی:

"ہم نے سنا ہے آپ ہرات جانے کی تیاری کر رہے ہیں؟"

"ٹھیک ہی سنا ہے۔" تیمور لاپروائی سے بولا:

"والیِ ہرات نے ہمیں اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی ہے۔ ہم کچھ عرصے کے لیے اس کے پاس جا رہے ہیں۔"

"پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے امیرِ محترم!"

دوسرے قافلہ سالار نے پوچھا:

"ایک ماہ سے یہاں پڑے پڑے ہم تنگ آ گئے ہیں۔"

"آپ لوگوں کی جو خدمت ہو سکتی تھی وہ ہم نے کی۔"

تیمور نے جواب دیا:

"کیا ہم نے آپ کے راشن کی کمی کو پورا نہیں کیا؟ کھانے پانی کی ہم نے آپ لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔"

"ہم اس مہربانی کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں۔"

کسی اور سالار نے کہا:

"لیکن آپ کے ہرات جانے کے بعد تو ہم بالکل غیر محفوظ ہو جائیں گے۔ آپ ہماری حفاظت کا بھی تو کوئی بندوبست کیجیے۔"

"دیکھیے، یہ تو ناممکن ہے کہ میں ہرات جانے کا ارادہ ملتوی کر دوں۔ آپ لوگوں کے محفوظ سفر کے لیے میں نے قرشی والوں سے ضمانت طلب کی تھی۔ انہوں نے حفاظت کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ لوگوں کے ساتھ اپنے کچھ فوجی دستے بھیجوں گا جو آپ کو قرشی کی سرحد تک پہنچا دیں گے۔ . . . لیکن اب میں خود ہرات جا رہا ہوں اس لیے آپ کی حفاظت کا مزید کوئی بندوبست نہیں کر سکتا۔ آپ لوگ چاہیں تو سفر کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قرشی والے وعدہ کرنے کے بعد کوئی بدعہدی نہیں کریں گے۔"

"تو پھر آپ کی طرف سے ہمیں آگے جانے کی اجازت ہے؟"

"بالکل . . . ."

تیمور نے فوراً کہا:

"مجھے افسوس ہے کہ میں اب یہاں اپنا ایک سپاہی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

دوسرے روز صبح ہی صبح تیمور نے اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا. . . . اور دوپہر سے پہلے پہلے تیمور کا لشکر ہرات کی سڑک پر رواں دواں ہو گیا۔

قافلے والوں نے بھی اپنے خیمے ڈیرے اکھاڑے اور ایک ایک کر کے شمال کی طرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے دریا پار کیا اور قرشی کے علاقے میں داخل ہو گئے۔

پورے قرشی میں یہ بات پھیل گئی کہ تیمور والیِ ہرات کے بلاوے پر ہرات چلا گیا ہے۔ یہ خبر اس لیے مصدقہ تھی کہ اس کے راوی آنے والے قافلوں کے لوگ تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے تیموری لشکر کو ہرات کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

تمام قافلے، محمد بیگ کی چوکی سے کسی پریشانی کے بغیر گزر گئے سوائے اس قافلے کے جس میں نو سو چوبیس

تھی۔۔۔۔ پھر جب نوبیہ نے خود کو رضاکارانہ طور پر محمد بیگ کے لشکر کے حوالے کر دیا تو اس کے قافلے کو بھی آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

○

نوبیہ کو ایک عالی شان آراستہ خیمے میں رکھا گیا تھا۔ اسے اچھے سے اچھا کھانا دیا جاتا۔ اس کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا۔ خدمت کے لیے ایک کنیز دی گئی تھی جو چوبیس گھنٹے اس کی خدمت میں حاضر رہتی اور ہر حکم بے چون و چرا بجا لاتی۔ لیکن وہ نوبیہ سے بہت کم گفتگو کرتی تھی۔ نوبیہ خود بھی اس سے بلا ضرورت بات نہ کرتی تھی۔ اس کے قافلے کو روانہ ہوئے تین دن ہو چکے تھے لیکن ابھی تک اس سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔

نوبیہ نے دیکھا کہ کنیز اس سے کچھ کھنچی کھنچی رہتی ہے تو۔۔۔۔ ایک دن وہ خود بولی:

"سربالی! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟ میں نے محسوس کیا ہے کہ ضرورت کے وقت بھی تم اکثر گفتگو سے گریز کرتی ہو۔"

"محترم خاتون۔۔۔۔" سربالی نے بڑے مہذب طریقے سے کہا:

"کنیز کا فرض ہے کہ وہ اپنے مالک کے مزاج کے مطابق خدمت انجام دے۔ جب میں نے دیکھا کہ آپ زیادہ گفتگو کرنا پسند نہیں کرتیں تو میں بھی محتاط ہو گئی ورنہ آپ سے بہت سی باتیں پوچھنے کو دل چاہتا ہے۔"

"سربالی۔۔۔۔"

نوبیہ نے ذرا ڈھیل دی:

"مجھے تمہاری عادتیں بہت پسند ہیں۔۔۔۔ چونکہ میری حیثیت یہاں ایک قیدی کی ہے اس لیے میں گفتگو میں احتیاط کرتی ہوں۔ مبادا میرے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو میری قید کی مدت میں اضافہ کر دے۔ میں جلد از جلد اس عذاب سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔"

"محترم خاتون۔۔۔۔"

سربالی نے کچھ کہنا چاہا۔۔۔۔ تو نوبیہ نے اسے ٹوک دیا:

"ٹھہرو سربالی۔۔۔۔ میرا نام نوبیہ ہے۔ تم مجھے اسی نام سے مخاطب کرو۔"

"نوبیہ خاتون۔۔۔۔"

سربالی نے اسے نئے انداز سے مخاطب کیا:

"آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ مجھے آپ کی جاسوسی پہ مقرر کیا گیا ہے۔ میرا کام صرف آپ کی خدمت اور آپ کے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔۔۔۔ جہاں تک آپ کی قید کا تعلق ہے تو یہ قید نہیں ہے اور نہ کوئی اس کی مدت مقرر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک آپ سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے۔ آپ کو تو بس آپ کے قافلے سے جدا کرنا مقصود تھا۔ یہ کام ذرا مشکل تھا لیکن آپ کی رضاکارانہ سپردگی نے اسے آسان بنا دیا۔ اب تو نوجوان محمد بیگ اس بات کے منتظر ہیں کہ آپ اس تنہائی سے گھبرا کر کب ان کی رفاقت قبول کرتی ہیں۔"

"لیکن یہ نہیں ہو سکتا سربالی!"

نوبیہ کو طیش آ گیا:

"تمہارے سردار نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں قید میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی لیکن۔۔۔۔"

"نوبیہ خاتون۔۔۔۔"

سربالی نے بزرگانہ انداز اختیار کیا:

"غصہ انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ آج آپ نے محبت سے مخاطب کیا تو میں وہ باتیں کہہ گئی جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھیں۔ میں محمد بیگ کی با اعتماد کنیز ہوں۔ اس بات کا آپ کو بھی علم ہے۔ ظاہر ہے آپ میری کسی بات کا اعتبار نہیں کریں گی اور نہ ہی میرے کسی مشورے پہ کان دھریں گی۔"

"نہیں سربالی! مجھے تمہاری باتوں سے اپنائیت اور خلوص کی خوشبو آتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم میرے دشمن کی با اعتماد کنیز ہو لیکن تم جو بات کہو گی میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کروں گی اور اگر میرے دل کو لگی تو اس پر عمل بھی کروں گی۔"

"اگر یہ بات ہے نوبیہ خاتون اور آپ کو یقین ہے کہ میں آپ کی ہمدرد ہوں تو آپ کو اس کا ثبوت دینا ہو گا تاکہ میں آپ سے صاف بات کر سکوں اور کوئی بہتر راہ پیدا کرنے کی کوشش کروں۔"

"کس قسم کا ثبوت چاہیے تمہیں؟"

نوبیہ الجھتے ہوئے بولی:

"بس میرا دل کہتا ہے کہ تم میری ہمدرد ہو اور مجھے تمہاری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

"نوبیہ خاتون۔۔۔۔"

سربالی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں:

"آپ اس کا ثبوت یوں دے سکتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آپ میرے سامنے اعتراف کریں کہ آپ تاتاریوں کے برلاس قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔"

"مہربانی ۔ ۔ ۔ ۔!"

نوبیہ کا منہ حیرت سے کھل گیا:

"کیا کہہ رہی ہو تم! مجھ سے اعتراف کرا کے مجھے سزا دلوانا چاہتی ہو! میں تمہارے سردار محمد بیگ کو بتا چکی ہوں کہ برلاس قبیلے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ افسوس! میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔"

"میں جانتی تھی آپ یہی کہیں گی۔"

مہربانی نے اطمینان سے کہا:

"لیکن یقین کیجیے جب تک آپ برلاس ہونے کا اقرار نہیں کریں گی، میں اور میرے ساتھی آپ کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔"

"ایک طرف تو تم میری محبت کا دم بھرتی ہو مہربانی۔ اور دوسری طرف مجھے برلاس ثابت کر کے قتل کرانا چاہتی ہو! کیا یہ غلط ہے کہ محمد بیگ اور اس کے باپ امیر موسیٰ نے اپنے لشکر کے تمام برلاس سپاہیوں کو قتل کرا دیا ہے! انہیں قید میں ڈال رکھا ہے۔"

"یہ بالکل درست ہے نوبیہ خاتون! سردار محمد بیگ اور امیر موسیٰ کے خیال میں اس وقت قرشی اور اس کے نواح میں برلاس قبیلے کا ایک شخص بھی موجود نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ غلط ہے۔"

"غلط ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟" نوبیہ نے چونک کر سوال کیا۔

"مجھے اور میرے شوہر کو یقین ہے نوبیہ خاتون کہ آپ برلاس ہیں اور آپ کا یہ نام بھی اصلی نہیں ہے!"

نوبیہ کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ مہربانی نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ نوبیہ اس کا نام تھا جو اس نے قافلے والوں میں مشہور کرا دیا تھا۔

"تم چاہتی ہو مہربانی! کہ میں برلاس ہونے کا اقبال کر لوں تب تم میری مدد کرو گی؟"

نوبیہ قدرے توقف سے بولی:

"لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر تم برلاس قبیلے کی ایک عورت کی مدد کیوں کرنا چاہتی ہو!"

"اس لیے کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

مہربانی ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے بولی:

"میں خود برلاس ہوں۔"

نوبیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دونوں چند لمحوں تک ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں پھر نوبیہ نے آہستہ سے کہا:

"میری بزرگ بہن! جب تم دشمنوں میں رہ کر خود کو برلاس کہنے میں فخر محسوس کرتی ہو تو میں تم سے کس طرح جھوٹ بول سکتی ہوں۔ میں بھی برلاس ہوں۔"

نوبیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مہربانی کو گلے لگا لیا۔

مہربانی کی ہم جلیسی نے نوبیہ کی قید تنہائی کی کوفت ختم کر دی۔ اب وہ دونوں دن بھر مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتی رہتیں۔ نوبیہ نے مہربانی کو اپنا ہمراز بنا لیا تھا۔

مہربانی نے نوبیہ کے شوہر فہید کی تلاش میں بڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ مہربانی کا شوہر قرشی کے قلعے میں ملازم تھا۔ مہربانی نے فہید کو وہاں بھی تلاش کرایا لیکن وہاں بھی فہید نام کا کوئی آدمی موجود نہ تھا۔

نوبیہ کو اپنے شوہر کا کوئی اتہ پتہ نہ مل سکا تو وہ بہت اداس ہو گئی۔ اس نے خود کو گرفتار ہی اس وجہ سے کرایا تھا کہ قرشی میں ٹھہر کر فہید کو تلاش کرے گی لیکن اب وہ فہید کو کہاں ڈھونڈتی؟

چنانچہ اب نوبیہ کو واپسی کی فکر ہوئی۔ مہربانی کا شوہر ہر ہفتے اس سے ملنے قرشی کے قلعے سے آیا کرتا تھا۔ اس دفعہ آیا تو اس نے ایک طرح وحشت ناک خبر سنائی۔

"مہربانی ۔ ۔ ۔ ۔!"

اس نے آہستہ سے کہا:

"برلاس لڑکی کی گرفتاری کی خبر امیر موسیٰ کو ہو چکی ہے۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور محمد بیگ نے اسے اپنے لشکر میں چھپا رکھا ہے۔"

مہربانی نے گھبرا کر خیمے کی طرف دیکھا۔ نوبیہ پردے سے لگی کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ مہربانی کچھ سوچ کر بولی:

"تمہارا کیا خیال ہے نوبیہ خاتون اس جگہ زیادہ محفوظ ہیں یا قرشی کے قلعے میں محفوظ رہیں گی؟"

"دونوں جگہ خطرے ہیں۔"

مہربانی کے شوہر نے کہا:

"اگر محمد بیگ کو امیر موسیٰ کا ڈر نہ ہوتا تو معلوم نہیں اب تک اس معصوم پر کیا گزر چکی ہوتی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ نوبیہ فی الحال اس جگہ زیادہ محفوظ ہے کیونکہ جب تک محمد بیگ پر امیر موسیٰ کا خوف غالب رہے گا نوبیہ کی

طرف ہاتھ نہیں بڑھائے گا۔ ۔ ۔ لیکن اگر یہ گرفتار کر کے قلعے میں پہنچا دی گئی تو پھر سوائے خدا کے اس کا اور کوئی محافظ نہ ہوگا۔"

"نوبیہ خاتون کی حفاظت کی ذمہ داری اب ہم پر ہے۔ انہیں ان ظالموں کے ہاتھوں سے کسی نہ کسی صورت بچانا ہے۔ کیا نوبیہ خاتون کو دریا پار نہیں پہنچایا جاسکتا؟"

"یہ بالکل ناممکن ہے سربالی!"

اس کے شوہر نے کہا:

"اب تک برلاس قبیلے کے تقریباً پچاس افراد، دریا پار کرنے کی کوشش میں جان گنوا بیٹھے ہیں۔ امیر موسیٰ کے ظالم رسالدار دہف کو تو جانتی ہی ہو۔ امیر موسیٰ نے اسے حکم دے رکھا ہے کہ وہ برلاس قبیلے والوں کے جتنے سر پیش کرے گا اسے اتنے ہزار انعام دیا جائے گا۔ سردار دہف ہر روز ایک دو سر پیش کر کے انعام حاصل کرتا ہے۔ قرشی کے چپے چپے پر پہرہ لگا ہوا ہے۔ اس وقت فرار کے بارے میں سوچنا بھی غلطی ہے!"

"پھر تمہارا کیا خیال ہے، نوبیہ خاتون کی حفاظت تو بہر حال کرنی ہے"۔

"میں نے کہا تو ہے کہ نوبیہ خاتون یہاں زیادہ محفوظ ہیں"۔

"تمہیں چاہیے کہ محمد بیگ تک یہ خبر پہنچا دو کہ امیر موسیٰ برلاس لڑکی کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر دیکھو۔ ۔ ۔ ۔ اس سلسلے میں وہ کیا فیصلہ کرتا ہے!"

سربالی اور نوبیہ دونوں ہی پریشان ہو گئی تھیں۔

نوبیہ کو اب تک تو محمد بیگ کی فکر تھی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ امیر موسیٰ اس سے بھی بڑا بھوکا بھیڑیا ہے تو وہ گھبرا گئی۔

محمد بیگ نے اسے اب تک اس لیے نہیں چھیڑا تھا کہ وہ اپنے باپ امیر موسیٰ کی طرف سے اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نوبیہ کی گرفتاری کی خبر کو امیر موسیٰ سے پوشیدہ رکھا تھا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن امیر موسیٰ کے جاسوس محمد بیگ کے لشکر میں موجود تھے۔ انہوں نے نوبیہ کی گرفتاری کی خبر کو نمک مرچ لگا کر امیر موسیٰ تک پہنچا دیا۔ ساتھ ہی نوبیہ کے حسن و جمال کی تعریف بھی کی گئی جس نے امیر موسیٰ جیسے عیاش طبع شخص کو بے چین کر دیا لیکن مسئلہ باپ بیٹے کا تھا اس لیے امیر موسیٰ بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ کوئی ایسی چال چلنا چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ محمد بیگ بہر حال اس کا بیٹا تھا اور قرشی کے مضافات اس کے قبضے میں تھے۔

محمد بیگ اور امیر موسیٰ کی اس کشمکش اور احتیاط نے نوبیہ کو کئی ہفتوں تک ان دونوں موذیوں سے دور رکھا۔ پھر جب امیر موسیٰ کو قلعہ قرشی میں یہ اطلاع ملی کہ سردار تیمور اپنے لشکر کے ساتھ ہرات کی طرف چلا گیا ہے

اب جنوب کی طرف سے اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں تو اس کی بُری فطرت عود کر آئی۔ امیر موسیٰ گرمی کی وجہ سے سخت پریشان تھا لیکن اب تک دریائے آموکے جنوب میں سردار تیمور کی وجہ سے سخت تکلیفیں برداشت کر رہا تھا۔ تیمور کی واپسی نے اس کی امنگوں کو پھر مہمیز دی اور وہ رنگین محفلیں سجانے کے بارے میں فکر کرنے لگا۔ اور دریائے آمو کے کنارے سایہ دار درخت اور سرسبز و شاداب مرغزار اس کی آنکھوں میں لہرانے لگے گزشتہ کئی ماہ سے وہ قلعے میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ قلعے سے نکل کر دریا کے کنارے چلا جائے اور وہاں سبزہ زار پر بزمِ انبساط برپا کرے۔ شرابِ ناب کے علاوہ امیر موسیٰ کو رقص و موسیقی کا بھی شوق تھا۔ اس طرح وہ رزم و بزم، دونوں کا بادشاہ تھا۔ اس کی بہادری بے مثل تھی تو عیاشی کا بھی جواب نہ تھا۔ اس نے فوراً لشکر کو بیرونِ قلعہ منتقل ہونے کا حکم دے دیا۔

امیر موسیٰ کے محافظ دستے کا رسالدار بڑا خود سر اور بد دماغ نوجوان تھا اس کے ظلم و ستم کے قصے پورے قرشی میں مشہور تھے۔ برلاس قبیلے کا تو وہ جانی دشمن تھا۔ امیر موسیٰ اسے بہت پسند کرتا تھا اور اپنے تمام اہم کام اسی کے سپرد کرتا تھا۔ قلعے سے دریا کے کنارے منتقلی بھی اسی کے حوالے کی گئی۔

یہ سلسلہ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ برلاس لڑکی کا مسئلہ درمیان میں آگیا۔ امیر موسیٰ، لڑکی کے جمال کا حال سن کر بے چین ہو گیا۔ اس نے رسالدار دہف کو حکم دیا کہ برلاس لڑکی کو محمد بیگ کے پنجے سے چھڑا کر دریا کے کنارے پہنچایا جائے تاکہ وہ اپنی محفلوں کو اس کے چہرے سے اور زیادہ تابندہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رسالدار کو تاکید کر دی کہ برلاس لڑکی کو اس طرح حاصل کیا جائے کہ محمد بیگ سے جھگڑا نہ ہو۔

ادھر سربالی نے امیر موسیٰ کے ارادے سے واقف ہوتے ہی فوراً محمد بیگ کو باخبر کر دیا۔ محمد بیگ کو پہلے تو باپ پر بہت غصہ آیا اور اس نے بغاوت کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر مصلحت کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے بڑی خاموشی سے نوبیہ کو سربالی کے خیمے میں منتقل کر دیا اور خود نوبیہ کے خیمے میں آگیا۔

محمد بیگ نے سربالی کو تاکید کر دی کہ وہ نوبیہ کو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھے۔ سربالی تو خود نوبیہ کی حفاظت کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے خیمے میں نوبیہ کی رہائش کا اس طرح انتظام کیا کہ اگر باہر سے کوئی آدمی اچانک اس کے خیمے میں آ بھی جائے تو اسے نوبیہ نظر نہ آسکے۔

ان تمام احتیاطی تدبیروں کے باوجود محمد بیگ کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ سے زیادہ رسالدار دہف سے خوفزدہ تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نوبیہ کی بازیابی کا کام دہف ہی کے سپرد کیا جائے گا اور وہ نوبیہ کو ڈھونڈنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کرے گا۔

آخر جس بات کا ڈر تھا وہ محمد بیگ کے سامنے آ ہی گئی۔

ابھی سورج بھی نہ نکلا تھا اور ہر طرف ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا کہ محمد بیگ کو گھوڑے دوڑنے کی آواز آئی۔ چونکہ اس کے دل میں خوف بیٹھا ہوا تھا اس لیے بستر سے اتر کر خیمے کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا تو خوف کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ . . . . . رسالدار وصف کے سوار اس کے خیمے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رہے تھے . . . . . اور وصف انہیں آہستہ آہستہ ہدایات دے رہا تھا۔

محمد بیگ کو تعجب اس بات پر تھا کہ اس کے جاسوس یہاں سے قلعہ قریشی تک پھیلے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے وہ کون سا راستہ اختیار کیا تھا کہ انہیں قلعے سے یہاں تک آتے ہوئے کوئی نہ دیکھ سکا۔

خیمے کو پوری طرح گھیرنے کے بعد رسالدار وصف نے اپنا گھوڑا خیمے کے دروازے کی طرف بڑھایا تو محمد بیگ واپس جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ اپنے آپ کو سوتا ہوا ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ خیمے کا پہرےدار رسالدار وصف کو دیکھ کر کانپ رہا تھا۔

"خیمے کے اندر کون ہے؟" وصف نے گرج کر پہرےدار سے پوچھا۔

پہرےدار پہلے تو گھبرا کر تعظیم کے لیے جھکا، پھر مردہ آواز میں بولا:

"اندر چھوٹے امیر محمد بیگ آرام کر رہے ہیں۔"

"چھوٹے امیر . . . . .!"

رسالدار وصف کا منہ حیرت سے کھل گیا:

"چھوٹے امیر . . . . . اور اس خیمے میں؟"

محمد بیگ بستر پر لیٹا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ پہرےدار کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو اس کے خلاف جاتی ہو، اس لیے فوراً اندر سے لیٹے لیٹے بولا:

"یہ صبح صبح کون ہمیں پریشان کرنے آیا ہے؟"

پہرےدار نے جواب دینے کے بجائے رسالدار وصف کی طرف دیکھا۔ رسالدار نے اسے اشارہ کیا کہ اندر جا کر خبر کرے۔ پہرےدار گھبرایا ہوا خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔

رسالدار وصف کچھ پریشان سا ہو گیا۔ وہ بار بار خیمے، اس کے جائے وقوع اور تنہائی پر غور کرتا، پھر سوچ میں پڑ جاتا۔ شاید وہ غلط خیمے پر آ گیا ہے؟ یا پھر نشاندہی کرنے والے نے اسے غلط بتایا ہے۔

پہرےدار باہر آ گیا۔

"چھوٹے امیر اندر آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

"اندر اور کون ہے پہرےدار؟" وصف نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"اور کوئی نہیں ہے رسالدار صاحب!"

رسالدار نے پہرےدار کو تیز نظروں سے گھورا:

"اگر تم جھوٹ بول رہے ہو تو چھوٹے امیر بھی تمہیں میرے عتاب سے نہ بچا سکیں گے۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں رسالدار صاحب!" پہرےدار نے دروازے سے ایک طرف ہوتے ہوئے جواب میں کہا۔

رسالدار وصف نے خیمے کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس کے سوار پوری طرح خیمے کو گھیرے ہوئے تھے اور کسی کے چھپ کر نکل جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔

وصف گھوڑے سے اترا۔ پہرےدار نے اس کے اشارے پر خیمے کا پردہ الٹ دیا۔ اندر سامنے ہی محمد بیگ بستر پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

رسالدار وصف نے اندر داخل ہو کر محمد بیگ کو سلام کیا۔

محمد بیگ نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا:

"وصف! خیریت تو ہے، کیسے آنا ہوا؟ قلعے میں تو سب خیر ہے؟"

محمد بیگ نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بے تکلفی سے باتیں کرتے ہوئے وصف کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب ہی بستر پر بٹھا لیا۔

وصف کی نظریں تیزی سے خیمے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے بظاہر کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں کسی کو فوری طور پر چھپایا جا سکے۔

خیمے کے اندر مخمل کا فرش تھا اور اسی فرش پر ایک طرف محمد بیگ کا بستر لگا ہوا تھا۔ سرہانے ایک گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ بستر کے ایک طرف تپائی پر جام دھرا تھا۔ رکھی تھی۔ اپنے باپ کی طرح محمد بیگ بھی بلا نوش تھا۔

"وصف! تم نے کچھ بتایا نہیں . . . . . بابا جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ بڑے سردار امیر حسین کی طرف سے تو کوئی اطلاع نہیں آئی؟"

وصف عجیب کشمکش میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ خیمے کی تلاشی لینا بھی بیکار تھا۔ سب سے زیادہ محمد بیگ کا اطمینان اور سکون تھا جس نے وصف جیسے چالاک شخص کو حیران کر دیا تھا۔

"امیر محمد بیگ!"

وصف نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:

"آپ کو اس خیمے میں دیکھ کر مجھے تعجب ہوا ہے!"

"تعجب . . . . !"

محمد بیگ نے حیرانی کا اظہار کیا:

"دن کے وقت میں سرحد پر گشت کرتا ہوں لیکن رات ہمیشہ اپنے خیمے ہی میں گزارتا ہوں۔ اس میں تو کیا بات ہے !"

رسالدار دہف نے محمد بیگ کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ ایک بار پھر . . . . . خیمے کا جائزہ لیے اس جگہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے جہاں برلاس لڑکی کو چھپایا جا سکتا تھا۔ جب وہ ناکام ہو گیا تو تند سخت لہجے میں بولا:

"امیر محمد بیگ! کیا میں اس خیمے کی تلاشی لے سکتا ہوں ؟"

"تلاشی! . . . . اور میرے خیمے کی . . . . تم ہوش میں تو ہو؟"

محمد بیگ کو غصہ آ گیا:

"رسالدار دہف! یہ میری توہین ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ قرشی قلعے کے باہر کا تمام علاقہ علاقہ میری عملداری میں ہے۔ میں اس میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"یہ دخل اندازی نہیں۔ حاکمِ قرشی امیر موسیٰ کا حکم ہے۔"

دہف نے بڑے رعب سے کہا:

"میں تعمیلِ حکم کے لیے مجبور ہوں۔"

"کیا ابا جان نے تلاشی کا حکم دیا ہے ؟ لیکن کیوں؟ . . . . . انہوں نے یہ حکم کیوں دیا ہے ؟" محمد نے جرح کا انداز اختیار کیا۔

"میں اپنے امیر کے کسی حکم کی تشریح کرنے یا اس کی وجہ بیان کرنے سے معذور ہوں۔"

رسالدار دہف نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا:

"خیمے کو چاروں طرف سے میرے سواروں نے گھیر رکھا ہے۔ مجھے آپ کے وقار کا پاس ہے۔ مجھے تلاشی کی اجازت دی جائے ورنہ . . . ."

"ٹھہرو دہف!"

محمد بیگ نے اسے بیچ ہی میں ٹوک دیا:

"میں اپنے سر اسر کشی کا الزام نہیں لینا چاہتا۔ تم اپنے آدمیوں کو اندر بلا لو۔ وہ تلاشی لے سکتے ہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے !"

"میں شکریہ ادا کرتا ہوں چھوٹے امیر!"

رسالدار دہف نے سر کو ذرا سا خم دیا:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کسی وقت آپ کی وفاداری پر شبہ کیا گیا تو میں، آپ کی طرف سے بطور گواہ پیش ہوں گا۔ چونکہ مجھے آپ کی عزت و وقار کا بھی خیال ہے اس لیے میں اپنے کسی آدمی کو اندر نہیں بلاؤں گا بلکہ اپنے طور پر مطمئن ہونے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے خوشی ہوئی کہ تم امیر کے حکم کی تعمیل کے موقعے پر بھی دوسرے کے وقار کو پیشِ نظر رکھتے ہو۔"

رسالدار دہف، محمد بیگ کے ساتھ ساتھ خیمے میں ٹہلتا اور قدم قدم رک کر قالین اور خیمے کے پردوں کو دیکھتا رہا۔

خیمے کے پردے اکہرے تھے اور خیمے میں کوئی صندوق یا بھاری چیز نہ تھی۔ دہف کو یقین ہو گیا کہ کبھی برلاس عورت کی گرفتاری محض ایک افسانہ تھی یا پھر مخبروں نے غلط خیمے کی نشاندہی کی ہے۔ دہف پوری طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد محمد بیگ کے بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔

"چھوٹے امیر!"

اس نے مجبور ہو کر باتوں کا سہارا لیا:

"سنا ہے کہ دریائے آمو کی طرف سے آنے والے قافلوں میں سردار تیمور کے کچھ جاسوس تھے جنہیں آپ نے تحقیقات کے لیے گرفتار کیا تھا؟"

"تم نے صحیح سنا ہے دہف!"

محمد بیگ فوراً بولا:

"جس طرح ہمارے جاسوس جنوب میں جا کر تیمور کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں، اسی طرح دشمن بھی اپنے جاسوسوں کو قرشی بھیجتا رہتا ہے۔ ان پر ہمارے آدمی کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ اگر ہمیں کسی پر شبہ ہوتا ہے تو ہم اسے تحقیقات کے لیے روک لیتے ہیں اور اطمینان ہو جانے پر رہا کر دیتے ہیں۔ اس طرح کئی آدمی گرفتار ہوئے لیکن بعد میں چھوڑ دیے گئے۔"

"اس دوران میں کیا کوئی عورت بھی گرفتار ہوئی تھی جس پر برلاس ہونے کا شبہ کیا گیا تھا۔" دہف نے محمد بیگ کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ہمارے آدمیوں نے ایک عورت کی حرکات و سکنات پر شبہ کیا تھا۔" محمد بیگ لاپروائی سے بولا۔ "وہ سالارِ قافلہ کو اپنا عزیز بتاتی تھی اور اسی کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔"

"وہ عورت اس وقت کہاں ہے؟"

رسالدار دحف نے بڑے رعب سے پوچھا:

"اس کے بارے میں امیر موسیٰ کو بھی اطلاع دی گئی ہے۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ وہ برتاس قبیلے سے متعلق ہے اور بہت خطرناک ہے۔ امیر موسیٰ اس سے خود پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے دحف!"

محمد بیگ نے نہایت اطمینان سے کہا:

"اس عورت کو دو دن بعد اس کے قافلے میں جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کی تلاش میں تاشقند جانا چاہتی تھی۔ ایک قافلہ اس طرف جا رہا تھا۔ ہم نے اسے اس قافلے کے ساتھ روانہ کر دیا۔"

محمد بیگ کے اس جواب سے رسالدار دحف کا چہرہ جانے کیوں پھیکا پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا:

"کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ اس وقت قرشی کے گرد و نواح میں موجود نہیں ہے؟"

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے دحف! اسے گئے ہوئے دو ہفتے سے بھی زیادہ ہو گئے۔ ہاں اگر حسد سے اباجان کا یہ خیال ہے کہ میں نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے تو میں اس کی سختی سے تردید کرتا ہوں۔"

"رسالدار دحف.....! تمہاری وفاداری شک و شبے سے بالاتر ہے۔ میں چاہتا ہوں تم مجھے ان لوگوں سے باخبر رکھو جو اس قسم کی اطلاعات پہنچا کر میرے اور اباجان کے درمیان اختلاف پیدا کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ مطمئن رہیے چھوٹے امیر!"

دحف نے کہا:

"آپ میرے امیر کے بیٹے ہیں۔ میں آپ کے مفاد کو کبھی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا بشرطیکہ آپ اعتماد کریں۔ جب تک میری شخصیت آپ کی نظروں میں مشکوک ہے میں آپ کے لیے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکوں گا۔"

"ہمیں تم پر پورا اعتماد ہے دحف!"

محمد بیگ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا:

"آؤ ہم مصافحہ کر کے اس اعتماد کی تجدید کریں۔"

دحف نے بھی بے تکلفی سے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

رسالدار دحف نے امیر موسیٰ کو یقین دلا دیا کہ برتاس لڑکی کی محمد بیگ کی قید میں ہونے کی خبر غلط ہے۔ دحف نے امیر موسیٰ کو وہی کچھ بتایا جو محمد بیگ نے اس سے کہا تھا۔

امیر موسیٰ کو دحف پر پورا اعتماد تھا۔ اس لیے اسے اس کی بات پر یقین کرنا پڑا..... مگر عجیب بات یہ تھی کہ امیر موسیٰ کو یقین دلانے کے باوجود دحف خود مطمئن نہ تھا۔ اس کے دل کے کسی گوشے سے آواز آتی تھی کہ محمد بیگ نے اسے فریب دیا ہے..... وہ برتاس لڑکی اب تک اس کی قید میں ہے۔

دحف نے اس سلسلے میں ان لوگوں سے معلومات حاصل کیں جن کے ذریعے خبر امیر موسیٰ تک پہنچی تھی۔ وہ امیر موسیٰ کے دو خاص غلام تھے جو محمد بیگ کے لشکر کے ساتھ رہ کر امیر موسیٰ کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

امیر موسیٰ کے یہ جاسوس باری باری، ایک ایک دن قلعے میں آتے اور محمد بیگ کی خبریں پہنچا کر چلے جاتے تھے۔ دحف کو ان کے معمول کا علم تھا۔ چنانچہ ایک دن جب ایک غلام قلعے میں آیا تو دحف نے اسے صدر دروازے کے پاس ہی روک لیا۔ اور اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

غلام، رسالدار دحف کے مرتبے اور اس کے اثر و رسوخ سے واقف تھا۔ اس لیے بے جھجک اس کے ساتھ ہو لیا۔

اپنی جائے قیام پر پہنچ کر دحف نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا اور بڑے رعب سے پوچھا:

"تمہیں معلوم ہے میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں لایا ہوں؟"

"نہیں رسالدار! مجھے کچھ معلوم نہیں۔" غلام نے گھبرا کر کہا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا تو کیا تم یقین کر لو گے؟" یہ کہتے ہوئے دحف نے اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ لیا۔

غلام کا رنگ خوف سے سفید پڑ گیا۔

"آپ قتل کر سکتے ہیں رسالدار۔ مجھے یقین ہے۔"

"لیکن میں تمہیں قتل نہیں کروں گا کیونکہ تم میرے امیر کے وفادار جاسوس ہو۔"

غلام کی جان میں جان آئی۔ اس نے شکر گزار نظروں سے رسالدار کی طرف دیکھا۔

"میں تمہیں تمہارے کام سے نہیں روکوں گا۔"

رسالدار دہف نے کہا:

"تم بدستور محمد بیگ کے لشکر میں رہو گے اور وہاں کی خبریں امیر موسیٰ کو پہنچاتے رہو گے لیکن تمہیں اس کے علاوہ ایک اور کام بھی کرنا ہوگا۔ بتاؤ۔ کیا تم وہ کام کرو گے؟"

"کیوں نہیں رسالدار۔ آپ کے حکم سے تو میں انکار کر ہی نہیں سکتا۔"

"میں تمہارے سپرد بہت معمولی کام کر رہا ہوں۔"

دہف نے کہا:

"تمہیں شاید علم نہیں کہ قرشی پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ان حالات میں قرشی کے گرد و نوا کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔"

"مگر مجھے کیا کرنا ہوگا رسالدار صاحب؟" غلام نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے ایک بر لاس لڑکی کی وجہ سے امیر موسیٰ اور محمد بیگ میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ لڑکی کی بازیابی میرے سپرد کی گئی لیکن جب میں اس نشان زدہ خیمے پر پہنچا تو وہاں لڑکی کے بجائے موجود نہ تھا۔ . . . ظاہر ہے کہ اطلاع غلط تھی ورنہ وہاں محمد بیگ کے بجائے لڑکی کو ہونا چاہیے تھا۔ محمد بیگ نے بتایا کہ تفتیش کے بعد لڑکی کو اس کے قافلے کی طرف بھیج دیا گیا تھا لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ اس قسم کی جھوٹی خبر امیر موسیٰ کو پہنچائی جائیں جن سے باپ بیٹے میں اختلاف پیدا ہونے کا امکان ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ خبر یا تمہارے ساتھی نے پہنچائی ہے۔ اب اس چیز سے بحث نہیں لیکن آئندہ ایسی بات نہیں ہونی چاہیے۔"

"رسالدار صاحب!"

غلام نے سنبھلتے ہوئے کہا:

"آپ مجھے قتل کر دیجیے مگر یہ الزام نہ لگائیے کہ میں نے جھوٹی خبر پہنچا کر باپ بیٹے میں لڑائی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ برلاس لڑکی اس خیمے میں پندرہ دن تک رہی تھی جس پر آپ نے چھاپہ مارا۔"

"مگر محمد بیگ کا بیان ہے کہ لڑکی کو میرے چھاپہ مارنے سے دو ہفتے پہلے ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ اسکا مطلب ہے محمد بیگ نے مجھ سے غلط بیانی کی۔"

"صد فی صد غلط بیانی رسالدار صاحب!"

غلام جوش سے بولا:

"آپ کے چھاپے سے صرف تین دن پہلے تک لڑکی اس خیمے میں موجود تھی۔ ہو سکتا ہے محمد بیگ کو آپ کے چھاپہ مارنے کا علم ہو گیا ہو اور اس نے لڑکی کو کہیں چھپا دیا ہو۔"

یہی شبہ رسالدار دہف کے دل میں موجود تھا:

"اس کا مطلب ہے کہ وہ لڑکی اب بھی محمد بیگ کے لشکر میں موجود ہے۔"

"جی ہاں. . . ."

غلام نے بڑے وثوق سے کہا:

"ہم اس لڑکی کو تلاش کر رہے ہیں اور جیسے ہی ہمیں اس کا علم ہوا ہم اس کی خبر امیر موسیٰ تک پہنچا دیں گے تاکہ ہمارا سچ ثابت ہو سکے۔"

"نہیں۔ اب تم ایسا نہیں کرو گے۔"

دہف نے سخت لہجے میں کہا:

"اگر تم لڑکی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کی اطلاع امیر موسیٰ کی بجائے ہمیں پہنچانا ہوگی۔ تم نہیں جانتے، اگر اب برلاس لڑکی کی محمد بیگ کے کیمپ میں موجودگی کی تصدیق ہو گئی تو باپ بیٹے میں جنگ شروع ہو جائے گی اور اس کا فائدہ ہمارے دشمنوں کو پہنچے گا۔ شاید میری بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی۔"

"جی ہاں رسالدار صاحب۔" غلام نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور یہ خیال رہے کہ میں اس برلاس لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم جس وقت اسکی نشاندہی کرو گے میں اسی وقت اسے گرفتار کر کے کسی ایسی جگہ لے جا کر قتل کروں گا کہ اسکی لاش کا بھی پتہ نہ چلے یہ جھگڑا صرف اسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے رسالدار صاحب! کیا اب میں. . . ."

"ہاں۔ اب تم جا سکتے ہو مگر خبردار، امیر موسیٰ سے اس لڑکی کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کرنا ورنہ. . . ." دہف نے ایک بار پھر تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا۔

غلام نے جلدی سے اٹھ کر اسے سلام کیا اور پھر سر جھکا کر رخصت ہو گیا۔

○

امیر موسیٰ نے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ قرشی کے قلعے سے نکل کر دریائے آمو کے کنارے مرغزار دں

میں ڈیرے ڈال دیے ..... اور سابق روایات دہرانا شروع کر دیں۔

موسیٰ نے اپنے بیٹے محمد بیگ کو قلعے میں واپس جانے کا حکم دیا۔ قلعے کی حفاظت کے لیے کچھ دستے بھی دیے گئے۔ بقیہ تمام لشکر امیر موسیٰ کی دیہاتی لشکرگاہ پر پہنچ گیا..... چونکہ ایک عرصے سے اس کا لشکر [illegible] کی صعوبتیں برداشت کر رہا تھا اس لیے امیر موسیٰ نے جشنِ عام منانے کا حکم دے دیا اور لشکری اپنے [illegible] دنیا سے بے خبر ہو کر ناؤ نوش میں مصروف ہو گیا۔

امیر موسیٰ کو شاید اب بھی شبہ تھا کہ وہ برلاس لڑکی محمد بیگ ہی کے قبضے میں ہے لہٰذا اس نے [illegible] کو حکم دیا کہ وہ قلعے ہی میں مقیم رہے اور پوشیدہ طریقے سے لڑکی کا پتہ لگاتا رہے۔ جب امیر موسیٰ قلعہ [illegible] سے گیا اور محمد بیگ نے قلعے میں واپسی کا ارادہ کیا۔ اس وقت رسالدار دہیف نے اپنے تمام آدمیوں کو قلعے [illegible] راستے میں جگہ جگہ مقرر کر دیا کہ وہ محمد بیگ کے ساتھ آنے والوں پر نظر رکھیں۔ اگر کوئی غیر لڑکی نظر آئے تو فوراً مطلع کریں لیکن دہیف کی تمام کوششوں کے باوجود برلاس لڑکی کا پتہ نہ چل سکا..... تاہم دہیف [illegible] سرگرمیاں جاری رکھیں۔

کچھ تو امیر موسیٰ کا حکم اور کچھ رسالدار دہیف اپنے طور پر برلاس لڑکی کی تلاش میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کے آدمی قلعے کے اندر اور باہر سرگرمِ عمل تھے..... اور ہر وقت محمد بیگ اور اس کے آدمیوں پر نظر رکھے [illegible] اس محل میں امیر موسیٰ کے اہلِ خانہ بھی رہتے تھے جنہیں وہ یہیں چھوڑ گیا تھا تاکہ ان کی بزمِ عشرت [illegible] نہ پڑے۔

ایک شام دہیف کے آدمیوں نے قلعے کے ایک آدمی کو پکڑ کر اس کے سامنے پیش کیا۔ اس پر یہ الزام [illegible] وہ محل کی ایک ملازمہ سے کسی برلاس لڑکی کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔

دہیف کے لیے یہ بڑی اہم خبر تھی۔ اس نے تمام آدمیوں کو باہر بھیج دیا اور خود اس شخص سے گفتگو شروع کر دی۔

"تم محل میں کس عورت سے بات کر رہے تھے؟" دہیف نے گرجدار آواز میں سوال کیا۔

"وہ میری بیوی ہے رسالدار صاحب!"

اس شخص نے اطمینان سے جواب دیا:

"اس کا نام سربالی ہے اور وہ ایک عرصے سے چھوٹے امیر محمد بیگ کی خدمت پر مامور ہے۔"

رسالدار دہیف کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے کچھ اور سخت لہجے میں پوچھا:

"تمہاری بیوی اس وقت کہاں تھی..... جب محمد بیگ اپنے لشکر کے ساتھ قلعے سے باہر تھا؟"

"وہ ان کے ساتھ ہی تھی رسالدار صاحب!"

سربالی کے شوہر نے سادگی سے کہا:

"چھوٹے امیر میری بیوی کی خدمات سے بہت خوش ہیں۔ جب تک وہ باہر رہے وہ بھی باہر تھی۔ اب وہ ان کے ساتھ ہی محل میں آ گئی ہے۔ میں پہلے ہی سے قلعے میں ہوں۔ میں بیوی سے باتیں کر رہا تھا کہ آپ کے آدمی مجھے یہاں پکڑ لائے۔"

رسالدار اور زیادہ مشکوک ہو گیا۔ اس نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا:

"تمہیں اپنی جان عزیز ہے؟"

"جی ہاں رسالدار صاحب!" سربالی کا شوہر سہم کر بولا۔

"تمہیں بتانا ہو گا کہ برلاس لڑکی کو محمد بیگ نے کہاں چھپا رکھا ہے؟" یہ کہتے ہوئے دہیف نے تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

اس سوال پر سربالی کے شوہر کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ اس نے غصے سے چیخ کر کہا:

"نہیں بتاؤں گا۔ بے شک مجھے مار دو۔ ہرگز نہیں بتاؤں گا!"

دہیف نے حیرت سے اسے دیکھا۔

ادھیڑ عمر کا یہ لاغر سا شخص جو چند لمحے قبل بری طرح سہما ہوا تھا اچانک اس میں اتنی جرأت آ گئی تھی کہ وہ سینہ تان کر موت سے آنکھیں ملا رہا تھا۔

"آخر کیوں.....؟

برلاس لڑکی اور اس میں کیا رشتہ ہے؟

دہیف نے آہستہ سے تلوار اس کے سینے سے ہٹا کر نیام میں ڈال لی۔

"دشمن قبیلے کی لڑکی کو بچانے کے لیے تم کیوں جان دے رہے ہو؟" دہیف نے نرمی سے پوچھا۔

"رسالدار دہیف!"

سربالی کا شوہر کڑک کر بولا:

"تم نے اب تک بہت سے برلاس قبیلے کے لوگوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں لیکن تم اس معصوم اور بے گناہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ تم مجھے مار سکتے ہو۔ میری بیوی کو قتل کر سکتے ہو لیکن وہ برلاس لڑکی تمہارے یا امیر موسیٰ کے ہاتھ نہیں آ سکتی..... وہ برلاس قبیلے کی لڑکی ہے۔ میں اسے امیر موسیٰ کی ہوس کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔"

"نادان شخص!"

دہف نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا:

"تم اس لڑکی کو امیر موسیٰ سے بچانا چاہتے ہو لیکن اس کے بیٹے محمد بیگ کے حوالے کر رکھا ہے، اب تم

بات کا دعویٰ کر رہے ہو؟"

"رسالدار...."

سربالی کا شوہر بے خوفی سے بولا:

"وہ لڑکی جس طرح تمہاری پہنچ سے دور ہے اسی طرح محمد بیگ کے ہاتھ بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے

ہماری موت کے بعد اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لیے کہ جس جگہ اسے پوشیدہ کیا گیا ہے وہاں تک

میں اور میری بیوی سربالی ہی پہنچ سکتی ہے۔"

"تمہارا تعلق بھی شاید برلاس قبیلے سے ہے۔" دہف کی آواز میں اب پہلے جیسی گھن گرج نہیں تھی۔

"شاید نہیں رسالدار! مجھے اپنے برلاس ہونے پر فخر ہے۔ یاد رکھو رسالدار! وہ دن بہت قریب ہے

پورے ملک تاتار پہ برلاس سردار تیمور کا قبضہ ہوگا۔"

رسالدار دہف بولا:

"میں تمہاری بے باکی اور صاف گوئی کی وجہ سے تم کو معاف کرتا ہوں۔ میں کل صبح تم سے کچھ اہم گفتگو کروں گا

مگر خبردار۔ اس ملاقات کا ذکر کسی سے ذکر نہ کرنا۔"

"تم.... تم مجھے معاف کر رہے ہو رسالدار۔" سربالی کے شوہر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں.... تم ایک بہادر انسان ہو۔"

دہف نے پژمردگی سے کہا:

"ہمیں قبیلے میں تم جیسے ایثار کرنے والے لوگ ہوں۔ اس قبیلے کو واقعی حق پہنچتا ہے کہ وہ پورے

تاتار پر حکومت کرے۔ تم جا سکتے ہو۔ صبح ہم پھر ملیں گے۔"

"شب بخیر...." سربالی کے شوہر نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

○

تیمور کے ذہین دماغ نے جو حکمت عملی تیار کی تھی وہ بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ اس نے اپنے آدمیوں

یہی تاثر دیا تھا کہ وہ ہرات جا رہا ہے۔ اس نے قرشی جانے والے قافلوں کے ذریعے بھی اس بات کی کافی تشہیر کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرشی پہنچنے والے قافلوں نے سب کو بتا دیا کہ سردار تیمور والیِ ہرات کی دعوت پہ ہرات کی جانب روانہ ہو چکا ہے..... حالانکہ تیمور صرف ایک منزل ہرات کی طرف جا کر ٹھہر گیا تھا اور اپنے منصوبے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

جونہی اسے اطلاع ملی کہ امیر موسیٰ قلعہ چھوڑ کر دریائے آمو کے کنارے مخلیس جا رہا ہے تو اس نے اپنے لشکر سے صرف دو سو چالیس سوار ساتھ لیے اور بڑی تیزی سے منزل طے کر کے دریا پہ پہنچ گیا جہاں دوسری طرف موسیٰ پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔

تیمور نے نہایت خاموشی سے رات کے وقت اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا اور دوسرے کنارے پہ پہنچ گیا۔ صرف چالیس سوار اس کا ساتھ دے سکے۔ باقی لوگوں کے لیے کشتیوں کا انتظام کیا گیا۔ تمام بڑے بڑے سردار تیمور کے ساتھ تھے۔ ان کی رائے تھی کہ کشتیوں میں سوار لوگ بھی اس پار پہنچ جائیں تو آگے بڑھا جائے لیکن تیمور نے جلدی کی اور سب کو وہیں چھوڑ کر صرف دو خاص غلاموں کے ساتھ قلعے کی طرف بڑھا۔

نصف شب کے قریب تیمور قلعے کی فصیل کے پاس پہنچ گیا..... قلعے کے برجوں میں مدھم روشنی ہو رہی تھی اور فصیل پر بالکل خاموشی طاری تھی۔

فصیل کے گرد خندق تھی۔ تیمور خندق کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں قلعے کے اندر پانی کی نہر خندق پر سے گزرتی تھی۔

تیمور ایک غلام کو ساتھ لے کر نہر میں اترا اور دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اب وہ فصیل کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ایک جگہ فصیل کا بالائی حصہ ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ اس جگہ سے فصیل پر چڑھنا آسان تھا۔ تیمور اس جگہ کو ذہن نشین کر کے اپنے غلام کے ساتھ پھر خندق کے اس پار پہنچ گیا۔

اس وقت تک اس کے بیشتر آدمی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اوپر چڑھنے کے لیے رسیاں اور کمندیں پہلے ہی تیار کر لی گئی تھیں۔ تیمور نے ٹکڑیاں بنا کر اپنے آدمیوں کو خندق پار کرنے کا حکم دیا اور خود آگے آگے چلا۔ جب پہلی ٹکڑی خندق پار کر کے اس جگہ پہنچی جہاں فصیل ٹوٹی ہوئی تھی..... تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ تیمور فصیل کے اوپر بیٹھا ہوا ہے۔ اس طرح ایک سو کے قریب آدمی کمندیں لگا کر فصیل پر پہنچ گئے۔

تیمور نے کچھ آدمی قلعے کے دروازے کی طرف بھیجے تاکہ وہ سنتریوں کو قتل کر کے دروازہ کھول دیں۔ باقی آدمیوں کو اس نے فصیل پر پھیلا دیا۔

سنتری اور پہرے دار سو رہے تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی کسی حملے کا امکان نہ تھا۔ تیمور کے آدمیوں نے

ایک ایک کو ڈبو دینا شروع کر دیا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی معمولی مزاحمت کے بعد پوری فصیل پر تیمور کا قبضہ ہو گیا
اب صبح ہو چکی تھی۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ تیمور نے فتح کا بگل بجوا دیا۔ سنتری پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ تیمور کے ا
ہر طرف نعرے لگا نے اور تلواریں لہراتے پھر رہے تھے۔

قرشی والوں کو تیمور کے لشکر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا۔ انہوں نے امان مانگی۔ تیمور نے امان دیدی، ہوئے
وہ ہتھیار پھینک کر اس کے مطیع ہو گئے ...... دن چڑھے تک پورے قلعے پر تیمور کا قبضہ ہو گیا۔

صرف امیر موسیٰ کا محل محمد بیگ کے قبضے میں تھا اور محمد بیگ کسی صورت محل تیمور کے حوالے کرنے
آمادہ نہ تھا۔ اس محل کو تیمور نے اپنے لیے بنایا تھا ...... وہ اسے تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے لڑائی
کرنے کا حکم دے دیا تاکہ محل کو تباہ کیے بغیر حاصل کرنے کی کوئی تدبیر کی جائے۔

تیمور نے جس وقت بگل بجوایا اور قرشی والوں کو علم ہوا کہ تیمور کا لشکر قلعے میں داخل ہو گیا ہے تو برلاس
کے وہ لوگ جو امیر موسیٰ کے خوف سے اپنی شخصیت چھپائے ہوئے تھے، سردار تیمور کے پاس پہنچ گئے اور ا
آدمیوں کے ساتھ مل کر قرشی والوں پر حملہ کر دیا۔ ان میں سربالی کا شوہر پیش پیش تھا۔

تیمور نے اپنے سرداروں کو ایک جگہ طلب کیا تاکہ محل کو بغیر لڑائی بھڑائی کے حاصل کرنے کے لیے
کرے۔ تیمور کے سردار لڑائی بند کر کے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ سربالی کا شوہر کوئی سردار تو نہ تھا لیکن تیمور
اس کی وفاداری کی وجہ سے اسے بھی مشورے کے لیے بلایا تھا۔

سربالی رات کو محل میں تھی لیکن لڑائی کا شور سن کر وہ باہر آ گئی۔ پھر اسی وقت محل کا پھاٹک بند ہو گیا اور وہ
اندر نہ جا سکی۔

ادھر سے مایوس ہو کر وہ اپنے شوہر کو تلاش کرنے لگی مگر لڑائی کے ہنگامے میں وہ اسے نظر نہیں آیا۔ پھر
سربالی نے ایک جگہ پناہ لے لی اور لڑائی ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

سربالی کا شوہر جب اس جگہ پہنچا جہاں تیمور اپنے سرداروں کے ساتھ بیٹھا تھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا
امیر موسیٰ کا رسالدار دہف، سردار تیمور کے قریب کھڑا ہے۔ یہ دیکھ کر سربالی کے شوہر کو طیش آ گیا۔ اس نے
سے پکار کر تیمور کو خبردار کیا:

"سردارِ محترم! اس غدار سے بچیے۔ یہ امیر موسیٰ کا خاص آدمی ہے۔"

سردار تیمور نے سر اٹھا کر سربالی کے شوہر کو دیکھا اور اسے قریب آنے کا اشارہ کیا:

"تم کس کے بارے میں کہہ رہے ہو؟" تیمور نے نرمی سے پوچھا۔

"رسالدار دہف کے بارے میں سردارِ محترم!"

سربالی کے شوہر نے دہف کی طرف اشارہ کیا:

"اس نے کل میری جان بخشی کی تھی لیکن یہ بہت سے برلاس قبیلے والوں کا قاتل ہے۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ برلاس قبیلے والوں کا قاتل ہے؟" تیمور نے مسکرا کر دہف کی طرف دیکھتے
ہوئے سربالی کے شوہر سے پوچھا:

"تم نے اسے کبھی کسی برلاس کو قتل کرتے دیکھا ہے؟"

"سردار! میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ برلاس قبیلے کا دشمن ہے۔"

"میرے جوشیلے دوست!"

تیمور نے سربالی کے شوہر کو مخاطب کیا:

"جس طرح تم نے برلاس ہو کر اپنے قبیلے کے لوگوں کو بچانے کی کوشش کی ہے اسی طرح یہ شخص بھی برلاس
ہے ...... اور یہ بظاہر اپنے قبیلے کے لوگوں کو گرفتار کرتا تھا لیکن پھر اپنے آدمیوں کے ذریعے انہیں سرحد پار
بھجوا دیتا تھا تاکہ وہ امیر موسیٰ کے ظلم و ستم سے محفوظ رہ سکیں۔ اس نے بھی تمہاری طرح خود کو چھپانے کے لیے
رسالدار دہف کا روپ دھار لیا تھا۔"

سربالی کے شوہر کے لیے یہ انکشاف بڑا حیرت انگیز تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ رسالدار نے کل اس کی
جان بخشی کیوں کی تھی اور آج وہ اس سے کون سی اہم بات کرنا چاہتا تھا۔

اسی وقت تیمور کے نائب سردار جاکو برلاس نے آ کر تیمور کو مطلع کیا کہ محمد بیگ نے اس کی جان بخشی کی
پیش کش ٹھکرا دی ہے اور محل حوالے کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

تیمور کو سخت غصہ آیا۔ اس نے محمد بیگ کو بڑی فراخدلی سے پیش کش کی تھی کہ اگر وہ اطاعت قبول کر
لے تو محل میں موجود باقی تمام لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی اور وہ جہاں جانا چاہیں گے انہیں
عزت کے ساتھ بھیج دیا جائے گا۔

تیمور نے حکم دیا کہ آتش گیر مادے سے محل میں آگ لگا کر اسے خاکستر کر دیا جائے۔ تیمور کے حکم
سے آتش گیر مادے کی دو ہنڈیاں، محل کے روشن دانوں کے ذریعے اندر پھینکی گئیں۔ اس سے محل کے
ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔

تیمور اور اس کے سردار دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ آگ لگنے سے محل والوں میں کھلبلی مچ گئی اور
کسی نے سفید کپڑا نیزے پر چڑھا کر محل کی چھت پر بلند کر دیا لیکن محل کا دروازہ بند تھا اس لیے کچھ نہ کیا

جاسکتا تھا۔

اسی دوران کسی طرف سے ایک عورت بھاگتی ہوئی آئی اور تیمور کے پیروں میں گر کر گڑگڑانے لگی
"سردار! خدا کے لیے محل میں آگ نہ لگوایے۔ گناہ گاروں کے ساتھ بے گناہ بھی مارے جائیں گے"
تیمور نے اسے تسلی دی اور حواس درست کر کے بات کرنے کا حکم دیا۔ عورت نے قدموں سے سر اٹھایا تو
ایک طرف سے سربالی کے شوہر کی آواز آئی۔ یہ بڑھ کر بیوی کے پاس پہنچ گیا۔

"نوبیہ کہاں ہے سربالی؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"نوبیہ تہ خانے میں ہے۔"

سربالی نے ڈرتے ہوئے بتایا:

"سردار تیمور کو کسی طرح روکو۔ اگر محل جل گیا تو نوبیہ بھی ختم ہو جائے گی۔"

تیمور یہ باتیں سن رہا تھا اس نے پوچھا:

"نوبیہ کون ہے؟ تم لوگ اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"محترم سردار!"

سربالی کے شوہر نے کہا:

"یہ میری بیوی ہے۔ ہم دونوں نے اپنی کوششوں سے ایک برلاس لڑکی کو محمد بیگ اور امیر موسیٰ سے
بچا کر محل کے تہ خانے میں چھپا رکھا ہے۔ محل جل گیا تو وہ لڑکی بھی مر جائے گی۔"

تیمور نے حکم دیا کہ محل میں مزید کوئی آتش گیر مادہ نہ پھینکا جائے۔

محل کے ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ محمد بیگ جو اب تک بڑی بہادری سے تیمور کے مقابلے پر
ہوا تھا، گھبرا گیا۔ محل کی تمام خواتین اسے گھیرے ہوئے تھیں اور اسے اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر رہی تھیں۔
تنگ آ کر محمد بیگ نے محل کا دروازہ کھول دینے کا حکم دیا اور تلوار گلے میں ڈال کر اپنے بچے کھچے آدمیوں کے ساتھ
سے نکل کر تیمور کے پاس پیش ہو گیا۔

تیمور نے ایک بار پھر فراخدلی کا ثبوت دیا۔ محل کی تمام خواتین اور دیگر لوگوں کو امیر موسیٰ کے پاس جانے
کی اجازت دے دی۔ صرف محمد بیگ کو کچھ دنوں کے لیے قلعے میں رکھنے کا حکم دیا۔

تیمور نے سربالی اور اس کے شوہر کو حکم دیا کہ محل میں جا کر برلاس لڑکی کو تہ خانے سے نکال کر
سامنے پیش کریں۔ ان کی مدد کے لیے اس نے رسالدار دہیف کو ان کے ساتھ کر دیا۔

سربالی اور اس کا شوہر، دہیف کو ساتھ لیے تیزی سے محل میں داخل ہوئے۔ محل میں لگی ہوئی آگ

تیمور کے حکم سے بجھانا شروع کر دیا گیا تھا۔ سربالی نے اندر پہنچ کر تہ خانے کا دروازہ کھولا اور نوبیہ کو آواز دی۔
نوبیہ تہ خانے کا زینہ چڑھ کر بھاگتی ہوئی اوپر آ گئی۔

جب اس کی نظر رسالدار دہیف پر پڑی تو اس کا منہ حیرت سے کھل گیا:

"فہید..... تم.....؟" نوبیہ کی زبان سے بمشکل نکلا۔

"اور تم..... ارابینہ ہو.....؟" جواب میں دہیف نے کہا۔

چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر دوڑ کر ایک دوسرے سے مل گئے۔ سربالی اور اس کے
شوہر کے لیے یہ منظر بڑا دلچسپ اور حیرت انگیز تھا۔ حیرت انگیز اس لیے کہ دو اجنبی ہستیاں ان کے سامنے
یک جان دو قالب بنی کھڑی تھیں اور دلچسپ اس لیے کہ نوبیہ نے دہیف سے الگ ہو کر حیا سے نظریں جھکاتے
ہوئے کہا تھا:

"سربالی! یہ میرے شوہر فہید ہیں جن کی تلاش میں میں یہاں آئی تھی..... میرا اصل نام ارابینہ ہے۔"

دیوتا کی چوری

یہ شاہ شوش کی خیمہ گاہ تھی۔ سو سے زیادہ خیمے، پہاڑی ڈھلوان پر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ کا خیمہ ذرا بلندی پر نصب تھا۔ رات کا آخری پہر تھا لیکن چودھویں کے چاند کی آخری کرنیں ہر طرف منتشر کیے ہوئے تھیں۔

داراب چہرے کو کپڑے سے پوشیدہ کیے ہوئے گھنے درختوں کی آڑ لیے آہستہ آہستہ شاہ کے خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خیمہ گاہ میں رات دیر تک دورِ شراب چلتا رہا تھا اس لیے ہر سپاہی اور سردار خیمے کے اندر یا باہر بے سدھ پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

داراب سپاہیوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر شاہ کے خیمے کی پشت پر پہنچ گیا۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر چہرے سے کپڑا اٹھایا۔ کمر سے خنجر نکالا اور خیمے کا پردہ چاک کر کے اندر جانے کا راستہ بنایا۔ داراب نے اپنے خیال میں بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیا تھا لیکن شاہ کے خیمے میں ایک ہستی اس سے زیادہ ہوشیار موجود تھی۔ یہ تھی شاہ شوش کی جوان عمر اور خوبصورت بہن ششبین!

شاہ بڑے شکی دماغ کا تھا۔ اس لیے وہ اپنی بہن کو الگ خیمے میں سلانے کے بجائے اپنے ہی خیمے میں رکھتا تھا۔ شاہ کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اپنی بہن کی اچھی طرح حفاظت کر سکے گا لیکن وہ ہر رات اس کثرت سے شراب پیتا تھا کہ اسے بے ہوشی کی حالت میں خیمے تک پہنچایا جاتا اور اس کی بہن ششبین کو اپنی حفاظت کے ساتھ اپنے بھائی کی بھی حفاظت کرنا پڑتی تھی۔

وہ تمام رات جاگ کر سویا کرتی تھی!

ششبین اس وقت بھی جاگ رہی تھی۔ اس نے خیمے کی پشت پر کھٹکا محسوس کیا تو فوراً سر اٹھا کر دیکھا۔ خیمے میں صرف ایک شمع روشن تھی۔ اس کی ملگجی روشنی میں ششبین کو کچھ نظر نہ آیا۔ اس وقت اسے پھر باہر کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے فوراً پاس رکھی ہوئی تلوار اٹھائی اور لڑھکتی ہوئی خیمے کے ایک کونے کے قریب پہنچ گئی۔ اس جگہ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ایک پردہ پڑا تھا۔ ششبین اس پردے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اس نے تلوار نیام سے نکال لی۔ اب وہ خطرے سے نپٹنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

ششبین کا خدشہ درست ثابت ہوا۔

خیمے کی پشت میں ایک چاک پیدا ہوا اور اس میں سے ایک گردن نے اندر آ کر خیمے کا جائزہ لیا۔ گردن گھومتی ہوئی جب اس پردے کی طرف ہوئی جس کے پیچھے ششبین چھپی ہوئی تھی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ چہرہ نہیں بلکہ چودھویں کا چاند ہے جو پردے کے بادل کو ہٹا کر اندر جھانک رہا ہے۔

ششبین کے لیے یہ صورت قطعی غیر مانوس تھی لیکن چہرے کا مردانہ حسن و وجاہت کچھ اس قدر پُر تاثیر تھا کہ ششبین اسے دیکھنے میں محو ہو گئی۔

ششبین پر محویت کا ایسا عالم طاری ہوا کہ داراب خیمے کے چاک سے اندر داخل ہو کر زمین پر بیٹھے بیٹھے شاہ شوش کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

یکایک ششبین کو خطرے کا احساس ہوا۔ وہ پردے سے نکلی اور دبے پاؤں آنے والے کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی تلوار بلند تھی اور وہ انتظار کر رہی تھی کہ اگر آنے والے نے اس کے بھائی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ ایک ہی وار میں اس کا سر قلم کر دے گی لیکن وہ سخت تعجب میں تھی کہ آنے والے کے پاس کوئی اسلحہ نہ تھا۔ نہ نیزہ نہ تلوار۔ اس نے اپنا خنجر بھی غلاف کر کے اندر کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہ شاہ شوش کے سرہانے بیٹھا دائیں بائیں نظریں دوڑا کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ آخر داراب کی نظر شاہ شوش کے دائیں بائیں رکھے دو سونے کے پیالوں پر پڑی۔ یہ پیالے زمین پر اوندھے رکھے ہوئے تھے۔

داراب نے ہاتھ بڑھا کر ایک پیالے کو سیدھا کیا تو اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ سونے کے اس پیالے کے نیچے شاہ شوش کا پتھر کا خدا "ربِّ شوش" پڑا تھا۔ پتھر کی ٹیڑھی میڑھی مورت کو ترکمانوں کا یہ قبیلہ اپنا رب مانتا تھا۔ اس رب کے ساتھ دوسرے پیالے کے نیچے ایک اور مورتی تھی جو ربّیہ کہلاتی تھی۔

ترک، ترکمان، مغل اور تاتاری، یہ سب کے سب ایک ہی نسل کی مختلف قومیں تھیں۔ ان کا اصل وطن منگولیا کے اوپری صحرا اور جھیلیں تھیں جہاں سے مختلف زمانوں میں یہ لوگ جنوب اور جنوب مغرب میں آ کر آباد ہوتے رہے تھے۔ عام طور سے یہ لوگ بت پرست تھے۔ بعض قبائل چاند، سورج، دریا، بجلی اور بادل وغیرہ

کو بھی سجدہ کرتے تھے۔

تیمور کے زمانے میں ان میں سے اکثر قبائل نورِ اسلام سے منور ہو چکے تھے لیکن سمرقند کے شمال میں سینکڑوں ایسے قبیلے موجود تھے جن کا مذہب بت پرستی تھا۔

داراب نے سونے کے پیالوں کو الگ رکھ دیا اور شوش کے ربّ اور ربّیہ کی مورتیوں کو اٹھا کر احتیاط سے اپنے ملبے کوٹ نما کرتے کے اندر کی جیبوں میں رکھ لیا۔

ششبیل کو یہ اندازہ ہو گیا کہ آنے والا چوری کی نیت سے نہیں آیا ورنہ وہ پہلے سونے کے پیالوں پر ہاتھ صاف کرتا۔ اس کے بجائے اس نے پتھر کی مورتیاں اٹھائی تھیں لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ان کو چرانے سے اس خوبرو نوجوان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

داراب اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد بیٹھے ہی بیٹھے پیچھے کی طرف کھسکنے لگا لیکن فوراً ہی اسے اپنے پہلو میں کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ ششبیل فرشتۂ اجل بن کر اس کے سر پہ کھڑی تھی اور اس کی تلوار کی نوک اس کے پہلو تک پہنچی ہوئی تھی۔

داراب کا خون خشک ہو گیا اور منہ حیرت سے کھل گیا۔

"تمہاری سزا موت ہے۔ تم نے چوری کی ہے"۔ ششبیل نے انتہائی کوشش کی کہ اپنی آواز میں کرختگی پیدا کرے مگر ناکام رہی۔

"نہیں۔ میں چور نہیں ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے داراب نے خوفزدہ نظروں سے شاہ شوش کی طرف دیکھا جو فرش پر چیت پڑا ہوا تھا۔

"شاہ کی فکر نہ کرو"۔

ششبیل نے لہجے کو کرخت بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"یہ کل دوپہر تک اسی طرح پڑے رہیں گے۔ میں تمہیں چوری کی سزا دوں گی۔ تمہیں قتل کر دوں گی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں شاہ شوش کی بہن ششبیل ہوں اور رات کو ان کی حفاظت کرتی ہوں"۔

اس گفتگو کے دوران داراب کی نظریں ششبیل کے سراپا کا جائزہ لیتی رہیں۔ ششبیل خاموش ہوئی تو داراب نے اس کے سامنے بڑے ادب سے سر خم کر دیا۔ بولا:

"اے حور ارضی! میں چور نہیں ہوں"۔

"لیکن تم خیمے کا پردہ چاک کر کے اندر آئے ہو۔ کسی خیمے میں داخل ہونے کا یہ طریقہ تو صرف وہ لوگ

کرتے ہیں جن کی نیت صاف نہ ہو اور جس کی نیت صاف نہ ہو اسے فوراً قتل کر دینا چاہیے"۔

"بے شک!"

داراب اطمینان سے بولا:

"میں واجب القتل ہوں لیکن اگر تم مجھے صفائی کا موقع دے کر ایک بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں کرنا چاہتیں تو خیمے سے باہر چلو۔ یہاں شاہ کے ہوش میں آنے کا خطرہ ہے۔ اگر میں نے اسی جگہ خود کو بے قصور ثابت کر دیا اور اس دوران میں شاہ کی آنکھ کھل گئی تو وہ مجھے ضرور قتل کر دیں گے اس صورت میں بھی قتل کی ذمے دار تم ہی ہو گی"۔

ششبیل تذبذب میں مبتلا ہو گئی۔ پھر خیمے کے دروازے پر گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ شاہ کے چاروں محافظ نشے میں چور بے سدھ پڑے تھے۔

"تم نے خیمے کا پردہ کس چیز سے چاک کیا تھا؟" ششبیل نے واپس آ کر سوال کیا۔

"خنجر سے!" داراب نے کرتے کے اندر ہاتھ ڈالا۔

"وہ میرے حوالے کر دو"۔

داراب نے خنجر ششبیل کی طرف بڑھا دیا۔

"آؤ میرے ساتھ"۔

ششبیل نے خنجر لے کر دروازے کی طرف اشارہ کیا اور داراب کو ساتھ لے کر خیمے سے باہر آ گئی۔ اس نے باہر آنے کے لیے خیمے کے دروازے کے بجائے پردے کے اس چاک کا راستہ اختیار کیا جو داراب نے خنجر سے بنایا تھا۔

باہر نکلتے وقت وہ بڑی احتیاط کے ساتھ پہلے خود نکلی۔ پھر داراب کو باہر آنے کا حکم دیا۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ششبیل اسے لیے درخت کے نیچے پہنچی۔ درخت کے پتوں اور شاخوں سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی اور وہ ایک دوسرے کے چہرے بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

ششبیل نے اپنی تلوار نیام میں کر لی۔ داراب ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"اب بتاؤ تم نے ربّ شوش اور ربّیہ کی مورتیاں کیوں چرائی ہیں؟" ششبیل نے ایک بڑا تحکمانہ انداز اختیار کیا۔

"اے خوبصورت ششبیل! میں نے تمہارے ربّ اور ربّیہ کی مورتیاں ضرور اٹھائی ہیں لیکن میری نیت صاف ہے اور میرے اس عمل میں نیکی اور خیر کا ایک پہلو پوشیدہ ہے"۔ داراب نے بڑے مہذب انداز میں

اپنی صفائی پیش کی۔

"مگر تم ہمارے رب اور ربیہ کو کہاں لے جانا چاہتے ہو"۔

"خوبصورت لڑکی! میں دونوں قبیلوں کی جنگ روکنا چاہتا ہوں"۔

داراب نے کہنا شروع کیا:

"میرا خیال ہے کہ اگر تم نے مجھے ان خداؤں کو لے جانے کی اجازت دے دی، تو میں انہیں درمیان

ڈال کر، ان کے واسطے سے جنگ رکوا سکوں گا"۔

"میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکی"۔

ششبیل الجھتے ہوئے بولی:

"ایک تو اس وقت کوئی جنگ نہیں ہو رہی۔ دوسرے یہ کہ جنگ کا خداؤں سے کیا تعلق ہے؟ یہ

رب ہیں۔ ان کی برکتوں سے ہم نے اب تک تمام لڑائیوں میں فتح حاصل کی ہے"۔

"میرا مطلب صاف ہے ششبیل!"

داراب بولا:

"شاہ شوش یہ لشکر لے کر قبیلہ چوغان کو تباہ کرنے جا رہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ان دونوں

میں جنگ ہو"۔

"شاید تمہارا تعلق چوغان قبیلے سے ہے اور تم اپنے قبیلے کو تباہی سے بچانا چاہتے ہو"۔ ششبیل

میں طنز پیدا ہو گیا۔

"میں چوغان نہیں ہوں"۔

داراب نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا،

"اگر تم شاہ شوش کی واقعی بہن ہو تو تمہیں علم ہو گا کہ کچھ دن پہلے شاہ شوش نے سرائیل قبیلے کو نکال

دے کر ان کے خیمے لوٹ لیے تھے۔ اس لڑائی میں جو سرائیلی بچ گئے تھے انہوں نے چوغان والوں کے پاس پناہ

لی ہے۔ اب شاہ شوش چوغان پر محض اس وجہ سے حملہ کرنے جا رہا ہے کہ چوغان والوں نے ہمیں پناہ دی

ہے۔ یہ جنگ ہماری وجہ سے ہو رہی ہے"۔

"تو تم سرائیلی ہو؟" ششبیل کے لہجے میں اب گہرا طنز پیدا ہو گیا تھا۔

"ہاں۔ مجھے اپنے سرائیلی ہونے پر فخر ہے"۔ داراب نے سر بلند کر کے کہا۔

"مجھے آج معلوم ہوا کہ سرائیلی نہ صرف بزدل ہوتے ہیں بلکہ چور بھی ہوتے ہیں"۔ ششبیل نے

نفرت سے کہا:

"مجھے تم کو قتل کر کے ضرور افسوس ہو گا لیکن اب میں تمہیں کسی صورت زندہ نہیں چھوڑ سکتی۔ تم نے رب

اور ربیہ کو چوری کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے"۔

ششبیل نے بڑی تیزی سے دوبارہ تلوار نکالی۔

"ذرا ٹھہرو ششبیل!"

داراب نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا:

"بے شک تم مجھے قتل کر دو لیکن پہلے مجھے یہ ثابت کرنے دو کہ سرائیلی نہ تو بزدل ہوتے ہیں اور نہ

ہی چور ہوتے ہیں"۔

"تم بڑے دیدہ دلیر معلوم ہوتے ہو"۔

ششبیل نے تلوار کو لہراتے ہوئے کہا:

"میرے منہ پر جھوٹ بول رہے ہو۔ سنو! تم نے ہم سے شکست کھائی اس لیے بزدل ہو۔ تم نے خیمے میں

داخل ہو کر ہمارے رب کو اٹھایا اس لیے چور ہو۔ تم اپنی صفائی میں کیا کہہ سکتے ہو؟"

"ششبیل! میں تمہیں ایک عام لڑکی نہیں سمجھتا اس لیے بتاتا ہوں کہ اگر میں بزدل ہوتا تو تمہارے

بھائی شاہ شوش کو سوتے میں قتل کر کے اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا"۔

داراب نے بڑے جوش سے کہا:

"لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر میں ایسا کرتا تو میرا قبیلہ ہمیشہ کے لیے بدنام ہو جاتا۔ میں چور بھی نہیں

ہوں ششبیل! چوری کی نیت ہوتی تو سونے کے پیالے اٹھاتا۔ اب بھی اگر تم مجھے مجرم سمجھتی ہو تو آگے بڑھو اور

مجھے قتل کر دو"۔

ششبیل سوچ میں پڑ گئی:

"مگر ہمارے خداؤں کو چرانے سے تمہارا کیا مقصد ہے؟"

"سنو ششبیل!"

داراب پرسکون لہجے میں بولا:

"صبح کو جب شاہ شوش کو ہوش آئے گا اور اسے معلوم ہو گا کہ اس کے خدا چوری ہو گئے ہیں تو اسے یقیناً

شبہ ہو گا کہ یہ کام چوغان والوں نے کیا ہے۔ وہ فوراً چوغان والوں سے دریافت کرے گا۔ میں اس وقت چوغان والوں

کی طرف سے شرط پیش کروں گا کہ اگر شاہ شوش جنگ سے باز آ جائے تو رب اور ربیہ اسے واپس کیے جا

سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا شبنم! کیا شاہ شورش اپنے خداؤں کو واپس لینے کے لیے جنگ ملتوی نہیں کرے گا؟"

"ہاں۔ شاہ بھائی اپنے خداؤں کی واپسی کے لیے جنگ سے باز آجائیں گے لیکن اے سرائیلی! یہ تو بتاؤ کہ اگر میں تمہیں گرفتار کرا دوں تو کیا ہوگا؟"

"نادان لڑکی!"

داراب کو جیسے طیش آگیا:

"میں تمہارے نرم و نازک ہاتھوں سے قتل تو ہو سکتا ہوں لیکن تمہارے آدمی مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں فیصلہ کر کے چلا تھا کہ اگر میں خداؤں کو حاصل کرنے میں ناکام ہوا اور تمہارے آدمیوں نے مجھے گھیر لیا تو میں دو چار کو مار کر خود بھی اپنا خاتمہ کر لوں گا۔ شاہ شورش جیسے ظالم کی غلامی سے موت کہیں زیادہ بہتر ہے۔"

"دیکھو سرائیلی! تم میرے بھائی کی توہین کر رہے ہو۔"

شبنم برا مناتے ہوئے بولی:

"میرا بھائی جیسا بھی ہے۔ ہے تو میرا بھائی۔ میں اس کی برائی نہیں سن سکتی۔"

"شبنم!"

داراب نے صاف آواز میں کہا:

"تم خوبصورت ہو۔ میں نے تمہاری تعریف کی۔ شاہ شورش ظالم ہے۔ اسے ہر ایک ظالم ہی کہے گا۔ تم خود ہی انصاف سے کہو کہ اس نے ہمارے سرائیلی قبیلے کو تباہ کر کے کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ تمام سرائیلی خانماں برباد ہوئے اور دوسرے قبائل سے پناہ کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے سرائیلی۔"

شبنم نرمی سے بولی:

"لیکن تمہارے قبیلے کے سردار کی بھی تو غلطی ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ میرے بھائی نے جس رباب بجانے والے کو بلایا تھا اسے ہمارے آدمیوں کے حوالے کر دیتا۔ ایک آدمی کو بچانے کے لیے تمہارے قبیلے کے سردار نے پورا قبیلہ تباہ کروا دیا۔"

"شبنم! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

داراب نے فوراً جواب دیا:

"میں نے سنا ہے کہ جس کی صورت اچھی ہوتی ہے اس کا دل بھی خوبصورت ہوتا ہے۔ کیا قبیلہ سردار کا

فرض نہیں کہ وہ اپنے آدمیوں کی حفاظت کرے۔ اگر کوئی اور قبیلے والا تمہارے بھائی سے کہے کہ شبنم کو اس کے حوالے کر دے تو کیا وہ مان جائے گا؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں مانے گا۔" شبنم نے اس کی بات کی تائید کی۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میرے قبیلے کے سردار نے اگر داراب کو تمہارے بھائی کے آدمیوں کے حوالے نہیں کیا تو کونسی غلطی کی ہے؟"

شبنم سوچ میں پڑ گئی۔

داراب پھر بولا:

"داراب قبیلہ سرائل کا سب سے اچھا رباب بجانے والا ہے۔ . . . ترکستان کے تمام قبائل میں اس جیسا رباب بجانے والا اور کوئی نہیں ہے۔"

"کیا اس کا نام داراب ہے؟"

شبنم نے دلچسپی سے پوچھا:

"تم نے اسے دیکھا ہوگا؟ اس کے رباب بجانے کی تعریف میں نے بھی سنی ہے۔ صورت شکل کیسی ہے اس کی؟ لوگ کہتے ہیں کہ اچھے گانے والے صورت کے اچھے نہیں ہوا کرتے۔"

"خوبصورت شہزادی!"

داراب بولا:

"تم نے شاید قبیلہ سرائل کے لوگوں کو نہیں دیکھا۔ اس قبیلے کے لوگ بڑے وجیہ اور خوبصورت ہوتے ہیں۔"

"کیا وہ تم سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

"ہاں شبنم!"

داراب مسکرایا:

"اگر تم مجھے خوبصورت سمجھتی ہو تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ قبیلہ سرائل کا رباب بجانے والا داراب واقعی خوبصورت انسان ہے اور اب میں یہ بات بھی دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے ان خداؤں کو لے جانے دیا تو دونوں قبیلوں میں جنگ ہرگز نہ ہوگی۔"

"اور اگر شاہ بھائی نے پہلے ہی کی طرح خداؤں کے ساتھ داراب کو بھی مانگا تو کیا ہوگا؟" شبنم نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"تو میرا خیال ہے کہ داراب خود ہی اس قبیلے میں چلا آئے گا۔" داراب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
شتبیل یہ سن کر شرما گئی۔ بولی:
"مجھے داراب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ دونوں قبیلوں میں ملاپ ہو جائے اور جنگ کے بادل ہمیشہ کے لیے چھٹ جائیں۔"
داراب محسوس کر رہا تھا کہ سویرا قریب ہے اور گفتگو میں کافی وقت صرف ہو چکا ہے لیکن شتبیل کی میٹھی میٹھی باتیں اسے الجھائے ہوئے تھیں۔ اس وقت دور کسی خیمے سے کوئی آدمی نکلا۔ دونوں نے پریشان ہو کر ادھر دیکھا۔
"اچھا سرائی۔ اب تم جاؤ لیکن جانے سے پہلے ایک وعدہ کرو۔"
"یہ جان حاضر ہے۔"
داراب نے سر جھکا کر کہا:
"میں ہر طرح کا وعدہ کرنے کو تیار ہوں۔"
"اچھا تو وعدہ کرو کہ تم مجھ سے پھر ملو گے خواہ دونوں قبیلوں میں جنگ ہو یا صلح ہو جائے۔" شتبیل نے آہستہ سے کہا۔
"وعدہ نہیں کرتا بلکہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں شتبیل۔"
داراب پورے وثوق سے بولا:
"میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔"
سویرا قریب تھا اور وہ سپاہی جنہوں نے کم شراب پی تھی بیدار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لوگ کئی خیموں سے نکلنے لگے تھے۔
"اچھا سرائی۔ جاؤ تمہیں رب شوش کے حوالے کیا لیکن دیکھو اپنا وعدہ نہ بھولنا۔" شتبیل بولی اور داراب ہاتھ سے رخصتی اشارہ کرتے ہوئے صبح کے دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

⊙

طوائف الملوکی کے اس دور میں دو طاقتیں ایک دوسرے کو زیر کرنے میں مصروف تھیں۔ ایک

شہر سبز کے سردار تیمور کی تھی جو اپنی ہمت اور دور اندیشی کے زور پہ علاقے فتح کر رہا تھا اور دوسری طرف اپنے سالے امیر حسین کو برابر پیچھے دھکیل رہا تھا۔
تیمور نے اپنی چالاکی سے قرشی کے قلعے پر قبضہ تو کر لیا تھا لیکن ایک مختصر لشکر کے ساتھ قلعے پر قبضہ برقرار رکھنے میں اسے بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ اس کے ہمدرد قبائلی سرداروں کا لشکر قلعہ سے باہر تھا اور امیر موسیٰ جو اپنی غلطی سے قلعے کا قبضہ کھو چکا تھا اب اس فکر میں تھا کہ تیمور کو باہر سے کوئی مدد نہ مل سکے۔ اس نے قرشی کے قلعے کو گھیر لیا تھا اور اس کی بازیابی کے لیے مسلسل حملے کر رہا تھا۔
تیمور نے قلعے کا دفاع اس قدر مضبوط بنا دیا تھا کہ امیر موسیٰ کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور آخر اسے قلعے کا محاصرہ چھوڑ کر اپنے سردار اعلیٰ امیر حسین کے پاس جانا پڑا۔
امیر حسین، قلعہ قرشی کے ہاتھ سے نکل جانے پر بڑا دلبرداشتہ تھا اور اب اس کوشش میں تھا قرب و جوار کے خانہ بدوش ترکمان سرداروں کا تعاون حاصل کر کے تیمور پر ایک بھرپور حملہ کرے۔
سرائیل، چوغان اور شوش ایسے ہی خانہ بدوش قبائل تھے جنہوں نے خانہ بدوش زندگی کو خیر باد کہہ کے اب بڑے بڑے علاقوں پر قبضہ کر کے خود کو امیر، سردار یا بادشاہ کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ یہ قبائل آپس میں لڑتے رہتے اور کمزور کو زیر کر کے اس کے علاقے پر قبضہ کر لیتے۔ یہ تمام قبائل اصنام پرست تھے اور ان سب کا الگ الگ خدا تھا۔ انہوں نے اپنے اپنے خدا کا نام قبیلے کے نام پر رکھ چھوڑا تھا۔ ان خود تراشیدہ خداؤں کی یہ لوگ پرستش کرتے اور ان کے سامنے قربانی پیش کرتے۔ سب سے اہم قربانی انسانی خون کی ہوا کرتی تھی۔
یہ وحشی قبائل امیر حسین اور تیمور کی جنگوں سے ناواقف نہ تھے لیکن اپنی خودسری کی وجہ سے ان پر توجہ نہ دیتے۔ وہ روایتی جنگ و جدل میں مصروف تھے۔
سرائل قبیلے نے جب شاہ شوش کے ہاتھوں شکست کھائی تو اس کے بچے کھچے لوگوں نے جن کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی، قبیلہ چوغان میں پناہ حاصل کر لی۔ قبیلہ چوغان بھی کچھ زیادہ طاقتور نہ تھا لیکن جب اس نے سرائیلیوں کو پناہ دی اور شاہ شوش، اس جرم میں ان پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا تو یہ ان کے قبیلے کی انا کا مسئلہ بن گیا اور وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔
داراب ایک ذی شعور جوان تھا۔ اسے جنگ سے زیادہ رباب بجانے سے دلچسپی تھی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ شاہ شوش اس کے محسنوں پہ حملہ کرنے آ رہا ہے تو اس کی حمیت نے جوش مارا اور وہ اپنے محسنوں کو بچانے کے لیے میدان میں آ گیا۔
شاہ شوش نے چوغان پر فوج کشی کا یہ بہانہ تراشا کہ چوغان والوں کے پاس داراب نام کا ایک رباب بجانے والا

ہے۔ اسے شاہ شوش کے پاس بھیج دیا جائے کیونکہ داراب کا تعلق سرائل قبیلے سے ہے جو شاہ شوش سے ٹکرا کھا چکا ہے اور اس کے بچے ہوئے لوگ فاتح شاہ شوش کے غلام ہیں۔

اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ مفتوح کی ہر چیز کا مالک فاتح ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ شکست کھانے والے یا بادشاہ کی بیوی بھی جنگی قانون کے تحت فاتح کی بیوی ہو جاتی تھی۔

شاہ شوش کو اب داراب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو داراب کا بہانہ بنا کر چوغان قبیلے کو ختم کر کے ان کا علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چوغان والے داراب کو ہرگز واپس نہ کریں گے کیونکہ اسے وہ پناہ دے چکے ہیں اور پناہ میں آئے ہوؤں کی حفاظت کرنے میں وہ اپنی جان تک قربان کر دیں گے۔

داراب نے جب دیکھا کہ محض اس کی وجہ سے دو قبیلوں میں جنگ ہوگی تو اس نے شاہ چوغان سے درخواست کی کہ اسے شاہ شوش کے حوالے کر دیا جائے۔

داراب یہ قربانی دے کر جنگ کو روکنا چاہتا تھا لیکن چوغان کے بادشاہ نے اس کی یہ درخواست رد کر دی کیونکہ اس کے خیال کے مطابق داراب کو حوالے کرنے سے چوغان قبیلے کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی جس کے لیے چوغان کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ داراب نے اپنے محسن بادشاہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد رب شوش اور ... کو چرانے کا منصوبہ بنایا اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا۔ اس کے لیے تو یہ چوری ایک پنتھ دو کاج بن گئی۔ شوش کے خداؤں کی چوری کے دوران اس کی ملاقات ششبیل سے ہوئی جس کے حسن نے داراب کو اس قدر گرویدہ کر لیا کہ وہ خود ہی شاہ شوش کے پاس جانے کو تیار ہو گیا۔

○

دوسرے دن شاہ شوش حسب دستور دوپہر کے وقت بیدار ہوا۔ اس کی بہن ششبیل پہلے ہی جاگ چکی تھی اور بستر پر پڑی ان خطرات پر غور کر رہی تھی جو خداؤں کی چوری کا راز کھلنے پر پیش آنے والے تھے۔ بڑی آسانی سے داراب کو قتل کر سکتی تھی یا گرفتار کرا سکتی تھی لیکن وہ تو پہلی ہی نظر میں اسے دل دے بیٹھی تھی۔ اب اس سے دوبارہ ملاقات کی آرزو دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔

رات کی تیز اور تلخ شراب کا نشہ دور ہو چکا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کے ششبیل کو دیکھا جس کی آنکھیں خیالات کے ہجوم اور شب بیداری کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ بھائی کو بیدار ہوتے دیکھ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

"ششبیل!"

شاہ شوش نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا:

"میں جانتا ہوں کہ تو صبح ہی سے جاگ رہی ہے اور میرے آرام میں خلل نہ پڑنے کے خیال سے آنکھیں بند کیے پڑی ہے۔ میں تجھ پر بڑا ظلم کرتا ہوں ششبیل۔ تجھے پتہ نہیں کہ مجھے تجھ سے کس قدر محبت ہے۔ تو مجھے دنیا میں سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اسی لیے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال۔۔۔"

شاہ شوش کو اک دم کچھ خیال آیا۔ اس نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ پھر فوراً بات بناتے ہوئے بولا:

"اس سال قربانی کے موقع پر تجھے دلہن بناؤں گا۔ تیری شادی کر دوں گا۔"

شاہ شوش نے ششبیل کو خوش کرنے کے لیے یہ سفید جھوٹ بولا تھا۔ پروہتوں اور مذہبی پیشواؤں کے کہنے پر وہ اس بات پر آمادہ ہو گیا تھا کہ اس سال قربانی کے موقع پر وہ اپنی عزیز بہن کے خون کی بھینٹ دے گا تاکہ اس کے خود ساختہ خدا اس سے خوش ہو کر اس کی دولت اور سلطنت میں اضافہ کر دیں۔ اس کی خبر ششبیل کو اپنی ایک وفادار کنیز کے ذریعے ہو گئی تھی لیکن اس نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی جب شاہ شوش نے بات پلٹ کر اس کی شادی کا ذکر کیا تو وہ غریب میں آگئی اور دل ہی دل میں خبر دینے والی کنیز کو برا بھلا کہنے لگی۔

شاہ شوش سرہانے کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔ سونے کے دونوں بڑے پیالے جن کے نیچے وہ رب اور ربہ شوش کو رکھا کرتا تھا۔ معمول کے مطابق اوندھے رکھے تھے۔ شاہ شوش صبح بیدار ہونے کے بعد پہلے ان دونوں مورتیوں کو سجدہ کرتا تھا۔ اس کے بعد دنیاوی کاموں میں مصروف ہوتا تھا۔

شاہ شوش نے پہلے اس پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا جس کے نیچے ربہ شوش کی مورتی رکھی تھی۔ ششبیل بھی بستر پر بیٹھی کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ شاہ شوش نے پیالے کا کنارہ پکڑ کر اسے اٹھایا مگر وہ اس قدر حیرت زدہ اور خوفزدہ ہوا کہ پیالہ اس کے ہاتھوں میں لرز کر زمین پہ گر گیا۔

شاہ شوش نے پھٹی پھٹی نظروں سے ششبیل کی طرف دیکھا لیکن وہ دل کو سنبھالے آنکھیں بند کیے دوزانو بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے آگے کی طرف اس طرح اٹھے ہوئے تھے جیسے وہ عبادت میں ہی مصروف ہو حالانکہ وہ آنکھوں کے پردوں کی جھری سے شاہ شوش کی بوکھلاہٹ کو دیکھ رہی تھی۔

شاہ شوش نے ششبیل کو عبادت میں مصروف دیکھ کر ہاتھ بڑھا کر دوسرے پیالے کو اٹھایا مگر اس کے

نیچے بھی کچھ نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے رب اور ربیعہ شوش مٹی بن کر مٹی میں مل گئے ہیں یا زمین
نگل لیا ہے۔

"شمشبیل!"

شاہ شوش اس قدر خوف ناک آواز میں دھاڑا کہ شمشبیل سب کچھ جانتے ہوئے بھی آواز کی
اچھل پڑی۔ اس کی غزالی آنکھیں پھیل گئیں۔

"شاہ بھائی! کیا ہوا؟" اس نے پیالوں کی طرف توجہ دیے بغیر بھائی سے پوچھا اور اس کی
میں جھانکنے لگی۔

"دیکھتی نہیں، ہمارے ربِ شوش اور ربیعہ کہیں گم ہو گئے ہیں؟"

شاہ شوش بوکھلا کر خیمے کی ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ معاً اس کی نظر خیمے کے

"چوری، چوری۔ خداؤں کی چوری۔"

شاہ شوش چاک میں سر ڈال کر باہر جھانکتے ہوئے چیخا:

"ضرور، ضرور یہ چوغان والوں کی حرکت ہے۔ انہوں نے ربِ شوش اور ربیعہ شوش کو چرایا ہے۔ میں
ایک کے ٹکڑے کر دوں گا اگر۔۔۔"

شاہ شوش نے مشکوک نظروں سے شمشبیل کو دیکھا:

"کیا تو بھی شراب پی کے رات بھر سوتی رہی۔"

"نہیں شاہ بھائی۔"

شمشبیل لرز گئی:

"میں رات میں کئی بار جاگی تھی۔ پتہ نہیں کب چور آیا؟ لیکن شاہ بھائی! یہ کیسا چور تھا کہ سونے کے
چھوڑ گیا اور پتھر۔۔۔"

"بکواس نہ کر۔"

شاہ شوش نے اسے زور سے ڈانٹا:

"تو کیا جانے۔ یہ ہمارے خلاف سازش ہے۔ ہم چوغان والوں سے اس کا بدلہ لیں گے۔"

"شاہ بھائی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے رب اور ربیعہ خود ہی کہیں چلے گئے ہوں۔" ت
نے بڑی معصومیت سے کہا اور جواب کے لیے بھائی کو دیکھنے لگی۔

شاہ شوش گھبرا گیا:

"ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن کیوں؟ وہ کیوں چلے گئے؟ کیا ہم نے کوئی بات ان کی مرضی و منشا کے خلاف
کی ہے؟"

"مجھے کیا پتہ شاہ بھائی!"

شمشبیل نے سادگی سے جواب دیا:

"یہ تو جب وہ واپس آئیں گے تو معلوم ہو گا۔ آپ نے بھی تو ان کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا۔
آپ شراب پی کے ایسے پڑتے ہیں کہ کسی بات کی خبر ہی نہیں رہتی۔"

شاہ شوش غصے میں بھنایا ہوا باہر نکلا۔ باہر پہرے دار موجود تھا۔ اس کے کانوں میں چوری کی خبر پڑ
چکی تھی اور وہ خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔

شاہ شوش نے اس کی گردن پکڑی اور کھینچتا ہوا اندر لے آیا:

"تو سو رہا تھا؟ خیمے میں چوری کیسے ہو گئی؟"

پہریدار کی گردن پہلے ہی دبی ہوئی تھی وہ جواب کیسے دیتا۔ پھر اس کے پاس جواب بھی تو نہ تھا۔ اسے یہ
اپنی ہی غلطی معلوم ہوئی کیونکہ وہ خود بھی رات بھر نشے میں دھت رہا تھا۔

شمشبیل کو اس پر رحم آ گیا۔ بولی:

"شاہ بھائی! اس غریب کی کیا خطا؟ رب اور ربیعہ تو پردہ چاک کر کے گئے ہیں۔ یہ دروازے پہ پہرہ
دے رہا تھا۔ اسے کیسے خبر ہوتی؟"

شاہ شوش نے پہرے دار کی گردن چھوڑ دی:

"مگر شمشبیل! سوال یہ ہے کہ وہ پردہ چاک کر کے کیوں گئے؟"

شاہ شوش نے ایک نیا سوال اٹھایا:

"انہیں جانا تھا تو دروازے سے بھی جا سکتے تھے؟"

"شاہ بھائی! یہ تو ان کی مرضی ہے۔"

شمشبیل نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا:

"دروازے کی طرف سے جاتے تو پہریدار انہیں ضرور دیکھتا۔ ممکن ہے ربِ شوش پہریدار پہ اپنی روانگی
نہ ظاہر کرنا چاہتے ہوں۔ ان کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے؟"

بت پرست قبائل میں خداؤں کی یہ پہلی چوری تھی۔ اس پر طرح طرح کی باتیں اور حاشیہ آرائیاں ہو رہی تھیں
کچھ لوگ اسے ایک چوری کی واردات قرار دے رہے تھے لیکن زیادہ کا خیال تھا کہ ربِ شوش کو کوئی چوری نہیں

کر سکتا تھا۔ اگر چہ انہیں ہاتھ لگاتا تو اس کے ہاتھ جل جاتے۔ پروہتوں اور جھنتوں نے لوگوں کو یہی باور کرانے کی کوشش کی اور اسی خیال کا بھی اظہار کیا کہ دب اور رہیہ کا اس طرح غائب ہو جانا قبیلے کے لیے ایک بڑی نحوست ہے۔ اگر رب جلدی واپس نہ آئے تو قبیلے پر کوئی بڑی مصیبت آ سکتی ہے۔

اسی شام کو ایک اور ایسا واقعہ پیش آیا جس نے شاہ شوش کو حواس باختہ کر دیا اور اسے یقین ہو گیا کہ رب شوش واقعی اس سے ناراض ہو کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔

شاہ شوش ابھی اسی الجھن میں گرفتار تھا کہ ایک سوار نے اسے آ کر خبر دی کہ سو ڈیڑھ سو مسلح سوار تیزی سے اس طرف آ رہے ہیں۔

شاہ شوش کو پہلے گمان ہوا کہ چوغان والے حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد شاہ شوش کا ایک اور سوار ہانپتا کانپتا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ یہاں سے نصف منزل کے فاصلے پر تاتاریوں کا ایک بڑا لشکر خیمہ زن ہے۔ اس لشکر کے کچھ سوار سامانِ رسد کی تلاش میں ادھر آ رہے ہیں۔ تاتاری لشکر کا نام سن کر شاہ شوش کے اور بھی حواس جاتے رہے۔ وہ چوغان پر حملہ کرنا تو ایک طرف رہا، اپنے رب اور رہیہ کی گمشدگی کو بھی بھول گیا۔ اسے اپنے قبیلے اور ریاست کی فکر پڑ گئی۔ دم کے دم میں تمام خیموں میں یہ خبر پھیل گئی کہ تاتاری سوار حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ شاہ شوش کے وہ سوار جو چوغان والوں کے مقابلے کے لیے تیار تھے تاتاریوں کا نام سن کر ان کے ہوش جاتے رہے۔

شاہ شوش نے اپنے بڑے بڑے سرداروں کو خیمے میں بلایا اور ان سے صلاح مشورے میں مصروف ہو گیا۔ تاتاریوں کی خانہ جنگی کی خبریں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ شاہ شوش بھی اس سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سردار تیمور اور امیر حسین کے جھگڑے سے دور دور رہے گا لیکن اب تاتاری لشکر کی نصف منزل پر موجودگی اور اس کے سواروں کی اس طرف آمد اس کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔ اسے اب احساس ہوا کہ اس نے چوغان والوں پر حملہ کرنے کا غلط فیصلہ کیا ہے کیونکہ وہ اپنے علاقے سے دور اس ویرانے میں پڑا تھا اور اسے اپنے علاقے سے کسی فوری کمک کی توقع بھی نہ تھی۔

ان حالات میں اس نے اپنے سرداروں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ تاتاری دستہ اگر کسی چیز کا مطالبہ کرے تو جھگڑا کرنے کے بجائے کچھ لے دے کے انہیں رخصت کر دیا جائے تاکہ وہ تاتاریوں کی آویزش سے دور رہیں اور چوغان پر حملہ کرنے کے بجائے چپ چاپ اپنے علاقے میں واپس چلے جائیں۔

شاہ شوش اور اس کے سردار ابھی کسی فیصلے پر نہ پہنچے تھے کہ ڈیڑھ سو تاتاری سوار اس کی خیمہ گاہ میں دھمکے۔ تاتاریوں نے شاہ شوش کے دو جاسوسوں کو ایک گھوڑے پر باندھ رکھا تھا اور ان کی رہنمائی میں وہ یہاں

پہنچے تھے۔

شاہ شوش کے سوار مسلح ہو چکے تھے اور تاتاریوں کی اس قلیل تعداد پر آسانی سے قابو پا سکتے تھے لیکن شاہ کو ڈر تھا کہ اگر اس نے مقابلے کی کوشش کی تو کہیں پورا تاتاری لشکر یہاں نہ آ پہنچے۔ اس لیے اس نے مصالحت کا فیصلہ کیا اور تاتاری سوار بغیر کسی روک ٹوک کے اس کے خیمے تک پہنچ گئے۔

شاہ شوش انتہائی بد دماغ اور متکبر تھا لیکن تاتاریوں کا کچھ ایسا رعب تھا کہ اس نے اپنے خیمے سے نکل کر تاتاری سردار کا استقبال کیا۔

"شاہ شوش اپنے تاتاری دوستوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔" شاہ نے آگے بڑھ کر تاتاری سردار سے نہایت خندہ پیشانی سے کہا۔

تاتاری سردار، شاہ شوش کا نام سن کر گھبرا گیا۔ وہ کوئی بڑا سردار نہ تھا۔ فوراً گھوڑے سے اترا اور شاہ کے سامنے قدرے خم ہو کر کہا:

"تاتاریوں کا ایک ادنیٰ سردار، شاہ شوش کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے اور شاہ افغانستان، سردارِ اعظم امیر حسین کی طرف سے دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔"

سردار نے اپنا ہاتھ آگے کی طرف کر دیا۔ شاہ شوش نے مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اپنے خیمے کی طرف چلا۔

خیمے کے دروازے پر پہنچ کر شاہ نے پلٹ کر اپنے ایک سردار کو حکم دیا:

"مہمانوں کے لیے کھانا تیار کیا جائے اور تمام تاتاری سواروں کے قیام کا بندوبست کیا جائے۔ آج شب تمام تاتاری سوار ہمارے مہمان رہیں گے۔"

"نہیں شاہ!"

تاتاری سردار نے دخل دیا:

"ہم آپ کے شکر گزار ہیں لیکن ہم شب کو قیام نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے شاہ امیر حسین کی طرف سے آپ کے پاس دوستی اور تعاون کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ ہمیں اپنا کام پورا کر کے لشکر میں واپس جانا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سردار۔"

شاہ شوش نے تکلف بھرا لہجہ اختیار کیا:

"آپ کے شاہ کیا سوچیں گے کہ شاہ شوش نے ان کے سواروں کی ایک شب بھی مہمان داری نہ کی۔ نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہ تو صحیح ہے شاہ محترم!"

تاتاری سردار بولا:

"لیکن ہماری واپسی اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارے لشکر میں اس وقت گھوڑوں کی کمی ہے اور کچھ کھانے پینے کے سامان کی بھی ضرورت ہے۔ اگر آپ شاہ امیر حسین سے دوستی اور تعاون کے لیے تیار ہیں تو ہمیں ضروری سامان مہیا کر دیجیے تاکہ ہم واپس جا کر اپنے شاہ کو آپ کی دوستی اور تعاون کا عملی ثبوت پیش کر سکیں۔" یہ کہتے ہوئے تاتاری سردار نے کنکھیوں سے شاہ شوش کو دیکھا۔

شاہ شوش کو تاتاری سردار کی یہ بات بڑی ناگوار گزری۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا لیکن اس نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا:

"ہم تاتاری بادشاہ سے دوستی پر فخر کرتا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کے ساتھ ممکن حد تک تعاون بھی کروں۔"

"تو پھر آپ یوں کیجیے شاہ محترم!"

تاتاری سردار لاپروائی سے بولا:

"ہمارے لیے دو سو گھوڑوں اور چار سو بھیڑوں کا انتظام کر دیجیے۔ فی الحال آپ سے اسی قدر تعاون درکار ہے۔ ہاں جنگ کے دنوں میں آپ کو فوجی تعاون بھی کرنا ہو گا۔ غالباً دو سو سواروں کا ایک دستہ آپ آسانی سے مہیا کر سکیں گے۔ شاہ امیر حسین آپ کے اس تعاون سے مزید خوش ہوں گے۔"

تاتاری سردار نے محسوس کر لیا تھا کہ شاہ شوش رعب میں آ گیا ہے اور اس سے جو کچھ طلب کیا جائے گا، وہ بلا پس و پیش دے دے گا اس لیے اس کا انداز تحکمانہ ہو گیا۔ اس نے یہ مطالبہ اس طرح پیش کیا جیسے اس نے شاہ شوش کو محصور کر لیا ہے اور اب اپنی شرائط پر صلح چاہتا ہے۔

تاتاری سردار نے اس گفتگو کے دوران اپنی نظریں شاہ شوش پر جمائے رکھیں تاکہ وہ اس کے تاثرات اور ردِ عمل سے واقف ہوتا رہے۔

"اچھا اندر تو چلیے۔"

شاہ شوش نے مضمحل آواز میں کہا:

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہم بیٹھ کے باتیں کریں گے۔ اس دوران کھانا تیار ہو جائے گا اور جہاں تک ہم سے تعاون ہو سکے گا ہم ضرور کریں گے۔"

شاہ شوش اسے خیمے میں لے گیا۔ اس وقت وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے خاص خاص

ردیوں کو بھی بلا لیا تاکہ جو فیصلہ ہو اس میں سرداروں کا مشورہ بھی شامل رہے۔

شاہ کے سردار جمع ہو گئے تو اس نے سلسلۂ کلام شروع کیا:

"دیکھو تاتاری سردار! ہم شاہ امیر حسین سے تعاون کرنا چاہتے ہیں لیکن جو مطالبہ ہم سے کیا گیا ہے، وہ ہمارے امکان سے باہر ہے۔ ہم لوگ خود اس وقت حالتِ جنگ میں ہیں۔ پچوغان قبیلہ ہمارا دشمن ہے۔ ہم ان سے لڑنے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں خود ہمیں مشکلات درپیش ہیں۔ آپ شاہ امیر حسین سے ہماری مشکلات بیان کر دیں۔ اگر آپ خواہش کریں تو ہم اپنا سردار آپ کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ وہ شاہ کے دربار میں ہماری نمائندگی اور ترجمانی کرے گا!"

تاتاری سردار شاہ شوش کے اس غیر متوقع جواب سے کچھ پریشان ہوا۔ شاہ شوش کا رویہ خیمے کے باہر تعاون مالکانہ تھا لیکن اندر آ کے اس نے جیسے چولا بدل لیا تھا۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد تاتاری سردار بولا:

"اس کا مطلب ہے کہ شاہ شوش، ہمارے امیر سے تعاون کے لیے آمادہ نہیں۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہے۔"

شاہ شوش نے فوراً تردید کی:

"ہم کب کہتے ہیں کہ ہم تعاون نہیں کریں گے لیکن اس وقت ہماری بھی مجبوریاں ہیں اور ہمیں خود شاہ امیر حسین کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

تاتاری سردار کے لیے یہ جواب پہلے سے بھی زیادہ غیر متوقع تھا۔ وہ جھلا کے بولا:

"شاہ شوش! آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ تعاون کرنے سے انکار نہیں کرتے لیکن ایک چھوٹے سے مطالبے سے انکار کر رہے ہیں۔"

"ہم نے مطالبے سے بھی انکار نہیں کیا!"

شاہ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا:

"آپ نے جو مطالبہ کیا ہے ہم اس سے زیادہ جانور پیش کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ آپ بھی ہم سے تعاون کریں۔"

"ہم تعاون کریں؟"

تاتاری سردار نے حیرانی سے پوچھا:

"شاہ شوش تاتاریوں سے کیا تعاون چاہتے ہیں؟"

"ہم شاہ امیر حسین کے لشکر کو کوئی زحمت نہیں دینا چاہتے۔"

شاہ شوش نے تدبر کا بڑا کامیاب مظاہرہ کیا:

"آپ کے ساتھ ڈیڑھ دو سو سوار ہیں۔ اس مختصر جماعت سے آپ ہمارا ساتھ دیں اور ہمارے ساتھ چوغان سے جنگ میں شریک ہوں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہمیں چوغان سے جو مالِ غنیمت حاصل ہو گا وہ سب آپ کے حوالے کر دیں گے۔ اگر کچھ کمی بیشی ہوئی تو اپنے پاس سے پورا کریں گے۔"

تاتاری سردار بھونچکا رہ گیا۔

وہ شاہ شوش کو محض ایک اجڈ اور جاہل سردار سمجھ رہا تھا لیکن اس نے ایسی صورت سامنے رکھی کہ سردار کے لیے اس کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔ اسے بہرصورت اپنا وقار بھی برقرار رکھنا تھا۔ بولا:

"شاہ نے جو بات کہی ہے وہ قابلِ غور ہے لیکن اس کا جواب میں تنہا نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے اس سلسلے میں امیر کے پاس خود جا کر گفتگو کرنی پڑے۔"

"تاتاری سردار کا کہنا بالکل درست ہے۔"

شاہ نے اس کی تائید کر دی:

"میں نے بھی اس اہم گفتگو کے لیے اپنے سرداروں کو اکٹھا کیا ہے۔ آپ بھی اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ مسئلہ فوجی تعاون کا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو شاہ امیر حسین کا عندیہ بھی معلوم کر لیں۔ اس صورت میں میرا قبیلہ ہمیشہ کے لیے آپ کا حلیف ہو جائے گا اور میں اپنے تمام سرداروں کے ساتھ دوش بدوش آپ کے دشمن کا مقابلہ کروں گا۔"

بات یہاں پر آ کر رک گئی۔

شاہ شوش چاہتا تھا کہ تاتاری سردار اس کے ساتھ ہی کھانا کھائے لیکن تاتاری سردار اپنی جگہ پر جلد سے جلد اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شاہ شوش سے مشورے کا بہانہ کیا اور اسے چھوڑ کر سیدھا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔

تاتاری سردار نے جب شاہ شوش کے مشروط تعاون کی تفصیل بتائی تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شاہ شوش کو مرعوب کر کے گھوڑے اور بھیڑیں حاصل کرے گا لیکن شاہ نے تعاون کی شرط رکھی تھی اس میں فائدے سے زیادہ نقصان کا امکان تھا۔ اسے قبیلہ چوغان کی طاقت کا بھی اندازہ نہ تھا۔ لڑائی ہوتی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اگر شاہ نے تاتاریوں کی مدد سے چوغان کو شکست دے بھی دی تو کیا پتہ اس جنگ میں کس قدر تاتاریوں کی جانیں ضائع ہو جائیں جبکہ اس وقت سردار

ان کے سر پر منڈلا رہا تھا۔

ایسی صورت میں محض ایک امیدِ موہوم پر پرائی آگ میں کود پڑنا کوئی عقلمندی نہ تھی۔ تاتاری سردار نے شاہ شوش کی خیمہ گاہ میں آتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ شاہ کے پاس جتنے سوار ہیں ان پر آسانی سے قابو پانا مشکل ہے۔

آخر یہ طے ہوا کہ کسی باعزت طریقے سے ان وحشیوں سے جان چھڑائی جائے اور خواہ مخواہ ایک اور دشمن نہ پیدا کیا جائے۔

تاتاری سردار کے شاہ شوش کے خیمے سے اٹھ جانے کے بعد شاہ کے سرداروں نے شاہ کی بہت تعریف کی۔ وہ اپنے شاہ کو بہادر تو سمجھتے ہی تھے لیکن اس نے تاتاریوں کے ساتھ جو جنگی چال چلی تھی اس نے سرداروں کے دل میں شاہ کی عزت دوبالا کر دی۔

شاہ شوش بہت مسرور تھا۔ اس کی ہم نشینیں جو دوسرے خیمے سے کان لگائے تمام گفتگو سن چکی تھیں، بڑی بے چینی سے بھائی کا انتظار کر رہی تھیں تاکہ اسے اس کامیاب جنگی چال پر مبارک باد دے لیکن شاہ شوش اپنے ساتھیوں پر رعب ڈال رہا تھا اور بڑی دور کی ہانک رہا تھا۔

"دشمن کے ہاتھ سے سانپ کو مارنا اسے کہتے ہیں۔"

شاہ شوش نے بڑے غرور سے کہا:

"اگر تاتاری سواروں کی مدد سے ہم نے چوغان کو شکست دے دی تو ہمارے پاس سے کچھ نہ جائے گا سوائے اس کے کہ ہمیں مالِ غنیمت حاصل نہ ہو۔ میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ میں تاتاریوں کو آگے رکھوں گا۔ وہ مالِ غنیمت کے لالچ میں جان توڑ کر لڑیں گے۔ انہی کی جانوں کا زیادہ نقصان ہو گا۔"

"شاہ پر دیوتاؤں کا سایہ ہے۔"

یہ بات قبیلے کے بڑے مذہبی پیشوا نے کہی جسے شاہ نے خصوصیت کے ساتھ اس مجلس میں شرکت کی دعوت دی تھی:

"یہ بات صرف دیوتا ہی شاہ کے دل میں ڈال سکتے تھے۔"

"پروہت نے بالکل درست فرمایا۔"

شاہ کے ایک نائب نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی:

"شاہ پر صرف دیوتاؤں کا سایہ ہی نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے جیسے دیوتا آسمان سے ہماری مدد کے لیے اتر کر آ گئے ہوں۔ تاتاری سردار تو شاہ کے سامنے کچھ بول ہی نہیں سکا۔ اس کی تو زبان بند ہو گئی۔"

"ہمارے دیوتا!"

شاہ شوش نے ایک ٹھنڈی سانس بھری:

"کاش اس وقت رب اور ربیہ شوش میرے خیمے میں موجود ہوتے۔ پھر تم لوگ دیکھتے کہ یہ ہمارے سامنے کیسے ہاتھ جوڑتے۔ افسوس! وہ ہم سے ناراض ہو کر چلے گئے۔"

"شاہ اطمینان رکھیں۔"

پروہت نے فوراً ٹکڑا لگایا:

"جب دیوتا مہربان ہو کر آسمان سے اتر آئے ہیں تو رب اور ربیہ کی ناراضگی بھی دور ہو جائے گی۔ پوجا کرتے ہیں۔ وہ زیادہ دن ہم سے ناراض نہیں رہ سکتے۔"

شاہ شوش جب محفل برخاست کر کے اپنے خیمے میں گیا تو شستبیل دوڑ کر بھائی کے گلے میں لٹک گئی اور فرطِ مسرت سے بولی:

"شاہ بھائی مبارک ہو۔ ہمارے خداؤں کی ناراضگی دور ہو گئی۔ وہ واپس آجائیں گے۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔" شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کاش نہیں۔ وہ ضرور واپس آئیں گے شاہ بھائی۔۔۔۔"

شستبیل نے پورے وثوق سے کہا کیونکہ سراٹی نوجوان اسے یقین دلا گیا تھا کہ وہ رب اور ربیہ کو واپس لائے گا۔

"میرا دل بھی یہی کہتا ہے شستبیل!"

شاہ شوش خوش ہونے کے باوجود خداؤں کے ناراض ہو کر چلے جانے سے پریشان تھا:

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ رب اور ربیہ کے واپس آتے ہی میں ان کے سامنے ایک زبردست قربانی کروں گا۔ ایسی قربانی جو آج تک کسی نے پیش نہ کی ہو۔"

شستبیل نے بھائی کی بات کو اس کی پریشانی پر محمول کیا۔ فوراً بولی:

"ضرور شاہ بھائی! خداؤں کی واپسی ہمارے لیے بڑی برکت کا باعث ہوگی۔ آپ دل کھول کر قربانی کریں۔ میں تو کہتی ہوں آپ قربانی کی تیاریاں ابھی سے شروع کر دیجیے۔ کیا خبر رب اور ربیہ شوش کل ہی واپس آجائیں۔"

"یہ تو کیسے کہہ سکتی ہے شستبیل؟"

شاہ نے اسے تعجب سے دیکھا:

"خدا جب ناراض ہوتے ہیں تو اپنے پجاریوں کو جلدی معاف نہیں کرتے۔"

"میرے اس یقین کی ایک وجہ ہے شاہ بھائی۔"

شستبیل نے مسکرا کر کہا:

"آپ سنیں گے تو آپ کو بھی ان کی واپسی کا یقین ہو جائے گا۔"

"کیا۔ کیا وجہ ہے تیرے یقین کی؟"

شاہ بے چین ہو گیا:

"جلدی بتا مجھے!"

"شاہ بھائی! جب آپ برابر کے خیمے میں باتیں کر رہے تھے تو میں بہت پریشان تھی۔"

شستبیل نے سنجیدہ سا منہ بنا کر کہنا شروع کیا:

"اسی پریشانی میں میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے دیکھا کہ رب شوش اور ربیہ شوش میرے خیمے میں آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔۔۔۔ شستبیل خوش ہو جا۔ ہم نے تیرے بھائی کی خطائیں معاف کر دیں۔ اسے خوش خبری سنا دے کہ ہم بہت جلد واپس آرہے ہیں لیکن اسے بھی ایک قربانی دینا ہوگی تو اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی کیونکہ ہم نے تیرے لیے ایک نیا گھر منتخب کیا ہے۔ اس گھر میں تو زیادہ خوش رہے گی۔"

شاہ شوش اس کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ شستبیل چپ ہوئی تو بولا:

"اور کیا کہا رب شوش نے؟"

"اور تو کچھ نہیں کہا۔" شستبیل بولی جیسے کچھ یاد کر رہی ہو:

"کچھ دیر دونوں مسکراتے رہے پھر جانے کہاں غائب ہو گئے۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ جو وہ چاہتے ہیں وہی ہوگا لیکن۔۔۔۔"

شاہ شوش نے رک کر شستبیل کو دیکھا:

"لیکن کیا شاہ بھائی؟" شستبیل نے گھبرا کر پوچھا۔

"لیکن یہ کہ تجھے میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

شاہ نے متانت سے کہا:

"خداؤں کی مرضی اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب تو بے چون و چرا میرا کہنا مان لے۔"

"شاہ بھائی!"

شستبیل نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں:

"بھلا میں آپ کی بات سے انکار کر سکتی ہوں۔ آپ کے کہنے سے تو میں جان بھی دے سکتی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تو مجھ سے جدا ہونے پر راضی ہو جائے گی؟"

شاہ شوش اس سلسلے میں ستشبیل کی رضامندی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پروہتوں نے اس کے دماغ میں
بات ڈال دی تھی کہ اسے اپنی پیاری بہن کی قربانی دے کر خداؤں کو خوش کرنا چاہیے۔ ستشبیل کے خواب میں
قربانی کا ذکر تھا..... مزید یہ کہ اسے ستشبیل کو ہمیشہ کے لیے اپنے سے جدا کرنا ہوگا۔ ان تمام باتوں
اس نتیجے پر پہنچا کہ رب شوش نے بھی ستشبیل کی قربانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ستشبیل نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ کچھ توقف کے بعد بولی:

"شاہ بھائی! تم سے جدائی کے تصور ہی سے میں لرز جاتی ہوں لیکن رب شوش مجھے کسی نئے گھر
چاہتے ہیں اور آپ بھی اس کے لیے آمادہ ہیں تو میں دل پہ پتھر رکھ لوں گی۔ رب شوش اور آپ کے حکم
مجھے سر جھکانا ہی پڑے گا۔"

"شاباش ستشبیل شاباش!"

شاہ شوش مسرت سے بھرپور لہجے میں بولا:

"تو نے میرا دل خوش کر دیا۔ اب میں قربانی دے کر خداؤں کی خوشنودی حاصل کروں گا۔" شاہ شوش
واپس چلا گیا۔

بہن بھائی کے درمیان قربانی کے مسئلہ پر بڑی واضح اور تفصیلی گفتگو ہوئی تھی لیکن کتنی عجیب بات
دونوں ہی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ شاہ شوش نے ستشبیل کی باتوں سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ خداؤں کی خوشنو
اپنے بھائی کی ترقی کے لیے اپنی جان کی قربانی دینے پر آمادہ ہو گئی ہے اور اسے قربانی کے وقت ستشبیل
سختی نہیں کرنی پڑے گی۔

ادھر ستشبیل اس لیے خوش تھی کہ اس نے جو فرضی خواب بھائی کے سامنے بیان کیا تھا اس میں بھائی
جدائی کا ذکر تھا۔ ستشبیل چاہتی تھی کہ رب شوش کے حوالے سے وہ شاہ شوش کو اس بات پر آمادہ کر
اپنے سے جدا کر کے نئے گھر میں جانے کی اجازت دے دے۔ نئے گھر سے اس کی مراد مرائلی جوان کا گھر
سوچا تھا کہ مرائلی جوان کے آنے پر وہ کسی ذریعے سے مرائلی سے اپنی شادی کا مسئلہ چھیڑے گی
مجبور کرے گی کہ وہ رب شوش کے کہنے کے مطابق قربانی دے اور اسے اپنے سے جدا کر کے مرائلی جوان
کر دے۔

بہرحال!

اس غلط فہمی نے دونوں کے لیے مشکلات پیدا کر دیں۔

تاتاری سردار کھانا کھانے کے بعد دیر تک صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ آخر یہ طے کر کے سو گئے کہ صبح کو
کسی نہ کسی طرح ان وحشیوں سے جان چھڑا کر واپس چلے جائیں گے۔ چنانچہ اپنے منصوبے کے مطابق
تاتاری سردار نے شاہ شوش سے ملاقات کی۔

شاہ دوپہر تک سویا کرتا تھا لیکن رات کو اس کی بہن ستشبیل نے اسے یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ اگر اس نے زیادہ
شراب پی تو ممکن ہے رب اور رب پھر ناراض ہو جائیں اور یہاں آنے کے بجائے کسی اور طرف نکل جائیں۔ شاہ
اب نہ تو اپنے خداؤں کو ناراض کرنا چاہتا تھا اور نہ ستشبیل کو۔ اس لیے اس نے کم شراب پی اور صبح کو جلدی بیدار ہو گیا
جب اسے تاتاری سردار کے آنے کی اطلاع دی گئی تو وہ ملاقات کے لیے تیار تھا۔

اس نے اپنے سرداروں کو بھی بلا لیا تاکہ مسئلے کا فیصلہ ان کے سامنے ہو۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی
رہیں پھر تاتاری سردار نے کہا:

"شاہ شوش! یہ بتائیے کہ اگر آپ کا کوئی سردار بغیر آپ کی اجازت کے کسی جنگ میں شریک ہو تو آپ اسے
سزا دیں گے یا معاف کر دیں گے؟"

"تاتاری سردار! میرے سردار ایسی جرأت کر ہی نہیں سکتے۔"

شاہ نے بلا توقف جواب دیا:

"اور اگر کسی نے ایسی حماقت کر ڈالی تو خواہ وہ فتح حاصل کر کے ہی کیوں نہ آئے میں اسے حکم عدولی کے جرم
میں گرفتار کر کے اسے قتل کرا دوں گا۔"

"بے شک ایک بادشاہ اور حاکم کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

تاتاری سردار نے اس کی تائید کی:

"اگر ماتحت سردار اپنی مرضی سے کام کرنے لگیں گے تو اس سے شاہی وقار کو نقصان پہنچتا ہے اور قانون
شکنی کی راہیں کھل جاتی ہیں۔"

"لیکن تاتاری سردار! تم نے یہ سوال مجھ سے کیوں کیا؟"

شاہ شوش نے الجھتے ہوئے پوچھا:

"کیا تمہارے خیال میں میرے کسی سردار نے اس قسم کی قانون شکنی کی ہے؟"

"جی نہیں شاہ شوش!"

تاتاری سردار نے ملائمت سے کہا:

"دراصل یہی قانون اور یہی حکم ہمارے شاہ امیر حسین والیِ افغانستان کا ہے۔ ہم دل سے آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن اپنے بادشاہ کی اجازت کے بغیر ہم کسی سے خود جنگ نہیں کر سکتے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تاتاری خیمہ گاہ میں واپس جا کر اپنے شاہ امیر حسین سے آپ کے حالات بیان کریں گے۔ ہمیں امید ہے وہ ضرور تعاون کریں گے۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو ہم کم از کم تین سو سواروں کے ساتھ واپس آئیں گے تاکہ آپ کو اپنے دشمن کو شکست دینے میں پریشانی نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم آپ کو مجبور نہیں کرتے۔"

شاہ شوش بہت خوش ہوا اور اس نے ایک فاتحانہ نظر اپنے سرداروں پر ڈالی:

"آپ واپس جائیں اور اجازت حاصل کر کے جلد لوٹ آئیں۔ جب تک آپ نہیں آئیں گے ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔"

تاتاری سردار نے کہا:

"دراصل میں شاہ شوش سے درخواست کرنا چاہتا ہوں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کہیں یہ اصول کے خلاف نہ ہو۔"

"نہیں تاتاری سردار۔ آپ اپنی خواہش بیان کریں۔ ہمیں ناگوار نہیں ہوگا۔"

شاہ شوش خود ان کے یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے سے پریشان تھا اور چاہتا تھا کہ انہیں کچھ دے کر رخصت کر دیا جائے۔

"شاہ شوش! آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ سامانِ رسد کے لیے نکلے ہیں۔"

تاتاری سردار نے رک کر شاہ کے چہرے کو غور سے دیکھا:

"اگر ہم خالی ہاتھ خیمہ گاہ میں واپس گئے تو شاید امیر حسین ہم پر ناراض ہوں اس لیے ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے مطالبے سے قطع نظر از راہِ دوستی ہمیں کچھ گھوڑے اور بھیڑیں عنایت کر دیں تاکہ ہم اپنے امیر کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔"

"ہم اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات دل کھول کر کرتے ہیں۔"

شاہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا:

"آپ چلنے کی تیاری کریں۔ ہم پچاس گھوڑے اور ایک سو بھیڑیں آپ کے ساتھ کر دیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ شاہ شوش کا۔" تاتاری سردار خوش ہو کر بولا اور پھر فوراً ہی اٹھ کے اپنے ساتھیوں میں واپس آ گیا۔

"کیوں! ہم نے کیسا سودا کیا سردارو؟" شاہ شوش نے بڑی تمکنت سے سرداروں سے پوچھا۔

"یہ سب آسمانی دیوتاؤں کی مہربانی ہے۔"

ایک پروہت نے کہا۔

"ورنہ یہ تاتاری جان کا جنجال ہیں۔ جس سے چمٹ جائیں اس کا خون تک چوس لیتے ہیں۔"

تاتاریوں نے فوراً اپنے گھوڑوں پر کاٹھیاں چڑھائیں اور سوار ہو کر شاہ شوش کو سلام کرنے کے لیے آئے۔ شاہ شوش نے حسبِ وعدہ گھوڑوں اور بھیڑوں کا انتظام کرا دیا تھا۔ یہ جانور تاتاریوں کے حوالے کر دیے گئے۔ اور وہ خوشی خوشی واپس ہو گئے۔

شاہ شوش اور اس کے سردار اپنی جگہ خوش تھے کہ پچاس گھوڑوں اور سو بھیڑوں پر سودا ہو گیا ورنہ تاتاری نہ جانے کیا غضب ڈھاتے۔

شاہ شوش نے اسی جگہ خیمے لگائے رکھے۔ اسے امید تھی کہ اس کا رب اور ربیہ واپس آئیں گے لیکن جب وہ واپس نہ آئے تو وہ بڑا دل شکستہ ہوا۔ سب سے زیادہ افسوس اور صدمہ ششبیل کو تھا۔ سرائی جوان اپنے وعدے کے مطابق اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ ششبیل جب سوچتی تو اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ اس نے بھائی کے سامنے جو دعوا کیا تھا۔ وہ جھوٹا پڑ رہا تھا۔ دن گزرتے جا رہے تھے اور دیوتاؤں کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔

شاہ شوش نے اب تک جتنی لڑائیاں جیتی تھیں رب اور ربیہ کے بت اس کے ساتھ رہے تھے۔ اس کے خیال میں ان تمام لڑائیوں میں اسے بتوں کی برکت کی وجہ سے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ آخر خداؤں کی واپسی سے ناامید ہو کر شاہ شوش نے چوغان پر حملے کا ارادہ ترک کر دیا اور لشکر کو حکم دیا کہ خیمے ڈیرے اکھاڑ کر اپنے علاقے شوش جانے کی تیاری کریں۔

قاعدے کے مطابق نصف سے زیادہ خیمے اکھاڑ کر منزل کی طرف روانہ کر دیے گئے تاکہ جب لشکر وہاں پہنچے تو اسے خیمے تیار ملیں۔ نصف خیموں کے ساتھ شاہ شوش نے اپنے لشکر کے ساتھ وہ رات اسی جگہ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی۔ خیموں کے باہر الاؤ اور اندر مشعلیں روشن ہو گئیں۔

شاہ شوش اس رات بہت مضمحل، اداس اور دل برداشتہ تھا۔ اس نے شام ہی سے شراب پینا شروع کر دی حالانکہ اس نے ششبیل سے وعدہ کیا تھا کہ اب زیادہ شراب نہیں پیے گا۔

ابھی رات کا پہلا ہی پہر تھا کہ خیمے کے باہر گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آئی۔ شاہ شوش نشے میں تھا
اسے تاتاریوں کے واپس آنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا اس لیے چوکنا ہو گیا اور بڑھ کر تلوار اٹھا لی۔ شتشبیل نے
سنبھال لی۔ قبائلی لڑکیاں اور خواتین اہم موقعوں پر مردانہ وار جنگ میں حصہ لیتی تھیں۔

شاہ شوش باہر نکلنے والا تھا کہ اس کے کان میں پہرے دار کی آواز آئی جو اندر آنے کی اجازت طلب
رہا تھا۔ شاہ شوش کے اشارے پر شتشبیل ایک پردے کے پیچھے چھپ گئی۔ شاہ نے پہرے دار کو
دی تو اس کے ساتھ ہی شاہ کا نائب بھی اندر آ گیا۔

"شاہ شوش کو مبارک ہو"۔

پہرے دار کے بجائے شاہ کے نائب نے گفتگو کا آغاز کیا:

"ایک جوان کسی دور علاقے سے آیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ رب اور ربیہ شوش کے بارے
مبارک خبر لے کر آیا ہے"۔

"فوراً بلاؤ اسے۔ تم نے اسے باہر کیوں چھوڑا ہے؟"

شاہ شوش نے شراب کے برتن ایک طرف کر دیے اور آنے والے کا بے چینی سے انتظار کرنے
پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی شتشبیل کے دل میں پنکھے سے لگے تھے۔ وہ امید و بیم کے دوراہے
کھڑی تھی۔ ایک دل کہتا کہ سرائکی جوان نے وعدہ وفا کیا اور آنے والا شوش کے خداؤں کو واپس لایا
پھر وہ اس خیال کی خود ہی تردید کر دیتی کیونکہ نائب نے صرف یہ اطلاع دی تھی کہ آنے والے کے پاس
خداؤں کی کوئی اہم خبر ہے۔ بہرحال مخبر یا قاصد کے آنے تک کے یہ چند لمحے ایک بوجھ بن کے شتشبیل کے ذہن
اور مسلتے رہے۔

آخر خیمے کا پردہ اٹھا۔

آگے پہرے دار تھا۔ اس کے پیچھے شاہ کا نائب اور ان دونوں کے عقب میں وہ تھا جسے دیکھ کر شت
دل سینے میں اس زور سے اچھلا کہ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ عقب میں آنے والا شوش کے خدا
سرائکی جوان تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے خیمے میں داخل ہوا تھا اور نظریں نیچی کیے شاہ شوش کی طرف آہستہ آہستہ
تھا۔

سرائکی جوان اس وقت اپنے قبائلی کپڑوں میں تھا اور ایک بیش قیمت ہیرا اس کی پگڑی میں ٹکا ہوا تھا۔
ایک ہاتھ میں ریشم کا ایک تھیلا تھا اور پشت پر ایک لمبا سا تھیلا تھا جس میں سامان بھرا تھا۔

"تم کون ہو اور کیا خبر لائے ہو؟" شاہ شوش نے سرائکی جوان کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"اے شاہ عالی مقام! میں قبیلہ چوغان کے سردارِ اعلیٰ کی طرف سے امن، دوستی اور باہمی تعاون کا پیغام لایا
ہوں۔ میں قبیلہ چوغان کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم ہمارے خداؤں کے بارے میں کیا خبر لائے ہو؟"

شاہ شوش نے اسے درمیان ہی میں ٹوک دیا:

"سب سے پہلے ہمیں یہ بتایا جائے کہ تم یا تمہارا قبیلہ رب اور ربیہ شوش کے بارے میں کیا خبر
رکھتے ہیں؟"

"شاہِ محترم!"

سرائکی نے نظریں ملائے بغیر کہا:

"آسمانی رب اور ربیہ شوش کے بارے میں ہمارے سردارِ اعلیٰ نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ آپ کے رب اور
ربیہ ناراض ہو کر چوغان قبیلے میں تشریف لے گئے ہیں"۔

"چوغان قبیلے میں؟"

شاہ شوش نے حیران ہو کر پوچھا:

"تم لوگوں نے ہمارے خداؤں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"اے شاہ شوش!"

سرائکی نے اطمینان سے جواب دیا:

"دیوتا یا خدا آپ کے ہوں یا ہمارے۔ وہ ہم سب کے لیے قابلِ احترام اور لائقِ پرستش ہیں۔ ہمارے
قبیلے نے ان کو قربانیاں پیش کیں۔ ان کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کیا اور آپ کی طرف سے معذرت کر کے ان سے
معافی مانگی!"

"پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر کیا ہوا؟" شاہ شوش نے بے چینی سے پوچھا۔

"رب اور ربیہ شوش نے آپ کو معاف کر دیا ہے شاہ شوش!" سرائکی نے جواب دیا اور نظریں اٹھا کر شاہ شوش
کو دیکھا۔

"ہم چوغان کے سردارِ اعلیٰ کے شکر گزار ہیں!"

شاہ نے بڑی نرمی سے کہا:

"ہم چوغان سردار کے امن اور دوستی کے پیغام کو قبول کرتے ہیں اور ایسی ہی خواہشات کا ان کے لیے اظہار
کرتے ہیں لیکن اب ہمارے خدا کہاں ہیں اور کیا انہوں نے واپسی کے لیے کسی قسم کی قربانی کا مطالبہ کیا ہے؟ ہم

ان کی خوشنودی کے لیے اپنی عزیز ترین چیز بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"اے شاہِ شوش!"

سرائی نے اب ذرا ادب سے کہا،

"رب اور ربیہ شوش کو معلوم ہو گیا ہے کہ آپ اور آپ کے قبیلے والے اپنی غلطیوں پر نادم ہیں اور جنگ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہ بغیر کسی شرط اور قربانی کے واپس آ گئے ہیں۔"

"کہاں ہیں ہمارے خدا؟" شاہ نے خیمے میں نظریں دوڑاتے ہوئے دریافت کیا۔

"اے شاہِ شوش!"

سرائی نے شاہ شوش کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:

"آپ کی ایک دیرینہ خواہش یہ تھی کہ چوغان قبیلے میں پناہ لینے والا رباب بجانے کا ماہر داراب دربار میں آ جائے اور اسی لیے آپ نے قبیلہ چوغان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آپ کی اس خواہش کے آپ کے خداؤں نے چوغان سردار کو حکم دیا ہے کہ وہ داراب کو آپ کے دربار میں بھیج دے تاکہ دونوں امن اور دوستی کے رشتے مضبوط اور استوار ہو جائیں۔"

"پھر کیا تمہارے سردار نے ہمارے خداؤں کے حکم کی تعمیل کی؟" شاہ نے پوچھا۔

"خداؤں کی نافرمانی کون کر سکتا ہے اے شاہ؟"

سرائی نے فوراً جواب دیا:

"چوغان کے سردار نے رب اور ربیہ شوش کے حکم کی تعمیل میں نہ صرف آپ کے خداؤں کو عزت کے ساتھ آپ کی طرف واپس کر دیا بلکہ رباب کے ماہر داراب کو بھی ان کے ساتھ کر دیا۔"

"لیکن۔۔۔۔ لیکن وہ تو اب تک یہاں نہیں پہنچے؟"

شاہ شوش کو گھبراہٹ پیدا ہوئی؛

"وہ چوغان سے کب روانہ ہوئے تھے؟"

"اے شاہ شوش۔ آپ فکر نہ کریں۔"

یہ کہتے ہوئے سرائی نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ریشم میں بندھا ہوا ایک بنڈل نکالا اور دوسرے لوگوں کی نظریں ریشمی بنڈل پر مرکوز ہو گئیں۔

سرائی نے بڑی احتیاط سے بنڈل کھولا۔ ریشم میں رب اور ربیہ کی مورتیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ سرائی نے ان مورتیوں کو آنکھوں سے لگا کر بوسہ دیا پھر وہ شاہ کی طرف بڑھا دیں۔

"لیجیے شاہ شوش۔ سنبھالیے اپنے خداؤں کو۔"

سرائی نے مورتیاں شاہ شوش کے ہاتھ میں دے دیں۔ شاہ نے بھی مورتیوں کو بوسہ دیا۔ پھر انہیں فرش پہ رکھ کر ان کے سامنے سجدے میں گر گیا۔ شاہ شوش کے نائب اور پہرے دار نے اسے سجدے میں دیکھا تو وہ بھی فوراً سجدے میں چلے گئے۔

سرائی جوان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی اور وہ بڑی دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت سرائی کی نظر شاہ کی پشت کی جانب لٹکے ہوئے پردے پر پڑی جس میں آہستہ آہستہ لہریں سی پیدا ہو رہی تھیں۔ اس نے پردے کو غور سے دیکھا۔ خیمے میں ہوا نہ تھی اور شمع کی لو بھی سیدھی تھی۔ سرائی کی نظریں پردے پہ لگی تھیں۔ پردہ ذرا سا ایک طرف سرک گیا۔ سرائی کا دل خوشی سے کھِل اٹھا۔ اسے شبنم کا چاند سا مکھڑا مسکراتا ہوا نظر آ گیا تھا مگر پھر اسے فوراً ہی نظریں نیچی کرنی پڑیں۔ شاہ شوش سجدے سے سر اٹھا رہا تھا۔

"اے جوان! تو نے ہمارے خداؤں کا جو احترام کیا ہے اس کے لیے ہم تیرے شکر گزار ہیں۔"

شاہ شوش نے دو زانو بیٹھتے ہوئے کہا،

"چوغان سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں رہا۔ ہم اپنے علاقے کی طرف واپس جا رہے تھے لیکن اب ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ ہمارے رب اور ربیہ واپس آ گئے ہیں۔ ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اگر تاتاریوں نے اس طرف کا رخ کیا تو رب شوش کی قسم! ہم انہیں عبرت ناک قسم کی شکست دیں گے۔ ہمارے خدا دور کا سفر کر کے آئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کچھ دن آرام کر لیں۔ پھر واپسی کا فیصلہ کریں گے۔"

"شاہِ عالی مقام!"

شاہ کے نائب نے لقمہ دیا:

"ہمارے محسن سرائی جوان نے خداؤں کی واپسی کے علاوہ کچھ اور بھی کہا تھا۔"

"اور کیا کہا تھا؟" شاہ شوش سوچتے ہوئے بولا۔

"میں بتاتا ہوں شاہ محترم!"

داراب مسکرایا۔

"میں نے عرض کیا تھا کہ چوغان سردار نے آپ کی پہلی شرط بھی قبول کر لی ہے اور قبیلے میں پناہ لینے والے سرائی قبیلے کے داراب کو بھی خداؤں شوش کے ساتھ ہی آپ کے پاس بھیجا ہے۔ یہ وہی داراب ہے جس کے رباب بجانے کی آج کل تمام قبائل میں دھوم مچی ہوئی ہے اور آپ نے اس کا مطالبہ کیا تھا۔"

"داراب!" شاہ شوش خوشی سے چلایا۔

"ہاں۔ ہم نے یہ نام سنا تھا۔ اس کے رباب بجانے کا ذکر تو آج کل ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔ داراب ہے اب تک کیوں نہیں پہنچا؟ ایسے ماہر فنکار سے ہمارے قبیلے کو چار چاند لگ جائیں گے، ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے جوان! تم فوراً جاؤ اور اسے لے کر آؤ۔ اگر وہ ہمارے پاس آنے سے خوف زدہ ہو تو اسے یقین دلاؤ کہ ہم اسے چوغان قبیلے سے زیادہ عزت دیں گے۔ اس کی ہر خواہش پوری کریں گے۔"

سرائیکی جوان نے پشت پر لٹکا ہوا لمبا سا تھیلا اتارا اور شاہ کے سامنے رکھ دیا۔

"شاہِ عالی مقام! داراب کی یہ خواہش تھی کہ اسے آپ کے بڑے دربار میں جگہ ملے۔"

اس نے تھیلا کھولا اور اس میں سے ایک رباب نکالا۔ سارنگی کی مانند بنے ہوئے اس ساز کا ترکستان میں بڑا رواج تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو رباب ہے۔ کیا یہ اسی ماہر فن کا رباب ہے؟" شاہ نے بے چینی سے پوچھا۔

شاہ شوش نے صحیح اندازہ لگایا۔

یہ کہتے ہوئے سرائیکی جوان نے پشت کے پردے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور سر جھکا کر ادب سے بولا:

"یہ رباب داراب کا ہے اور داراب اس وقت شاہ شوش کے سامنے کھڑا ہے۔"

"تم۔۔۔۔۔ تم داراب ہو۔۔۔۔۔ وہی مشہور فنکار؟" شاہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

شاہ شوش کا نائب اور خیمہ کا پہریدار بھی حیرت بھری نظروں سے داراب کو دیکھنے لگا۔ انہوں نے اس کے فن کی بہت تعریف سنی تھی لیکن وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اتنا عظیم فنکار خود ہی اس کے آجائے گا۔

داراب نے شاہ کو جواب دینے سے پہلے ایک اچٹتی نظر پردے پر ڈالی۔ اسے محسوس ہوا کہ دو ہنستی ہوئی آنکھیں اس کی طرف بڑی بے تابی سے دیکھ رہی ہیں۔ داراب بولا:

"داراب آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اب یہ شاہ کی مرضی ہے کہ چاہے اسے ہمیشہ کے لیے دربار میں قبول کریں یا ایک بیکار آدمی سمجھ کر ٹھکرا دیں۔"

"تم بیکار آدمی نہیں ہو داراب!"

شاہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا:

"تمہیں ہم وہ عزت و توقیر دیں گے جس کا تم تصور بھی نہ کر سکو گے۔"

پھر شاہ نے اپنے نائب کو مخاطب کیا:

"ایک عظیم الشان جشن کا انتظام کرو۔ ہمارے رب واپس آ گئے ہیں اور داراب اپنے فن سے ہمیں خوش کرے گا اور ہم اسے انعام و اکرام سے مالا مال کریں گے۔"

شاہ نے نائب کو کچھ اور ضروری ہدایات دے کر داراب کو اس کے ساتھ رخصت کر دیا۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ لوگوں کے جاتے ہی اس نے پہلے تو رب اور پھر شوش کو سونے کے پیالوں میں ڈھانپ دیا۔ پھر شراب کا پیالہ منگا کر مے نوشی شروع کر دی۔

شتشبیں پردے کے پیچھے سے نکل کر اس کے پاس آ گئی تھی۔ وہ بھی اس قدر خوش تھی کہ اس نے بھائی کو شراب پینے سے نہیں روکا اور شاہ شوش نے بہن کی طرف سے ڈھیل پا کر پیالے بھر بھر کر پینا شروع کر دی اور اس وقت تک پیتا رہا جب تک پیالہ اس کے ہاتھ سے گر نہیں گیا۔

اب شاہ شوش نشے میں دھت بستر پر اوندھا پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ شتشبیں اس کے قریب ہی بیٹھی تھی لیکن شاہ کی طرف توجہ دینے کے بجائے وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔

○

شتشبیں کو جب یقین ہو گیا کہ شاہ شوش نے اس قدر شراب پی لی ہے کہ کل دوپہر سے پہلے اسے ہوش آنا ممکن نہیں تو وہ خیمے کے دروازے کے پاس گئی اور پہرے دار کو حکم دیا کہ اس کی خاص کنیز کو فوراً بلا کر لائے۔

اس نے پہریدار سے بہانہ کیا کہ اس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے اور وہ کنیز سے اپنے لیے دوا منگوانا چاہتی ہے۔

خیمے کا پہریدار شتشبیں کی کنیز کو آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا اور کسی قدر اس کی طرف مائل بھی تھا اس لیے وہ خوشی خوشی کنیز کو بلانے چلا گیا۔

شتشبیں کی کنیز کو اس وقت بلاوے پر تعجب سا ہوا جب یہ دونوں خیمے پر پہنچے تو شتشبیں خیمے کے دروازے کے باہر کھڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ کنیز شہزادی کو دیکھ کر خوش ہو گئی اور اس کے وسوسے ختم ہو گئے کیونکہ راستے بھر پہرے دار اس سے الٹی سیدھی باتیں کر کے اس کے کان کھاتا رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔

ششبیں، کنیز کو ساتھ لے کر خیمے کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی اور دیر تک دونوں کھسر پھسر کرتی رہیں۔ پھر کنیز خیمے سے باہر نکلی۔

"کیا تم واپس جا رہی ہو؟" پہریدار نے محبت سے پوچھا۔

"شہزادی کی طبیعت اچھی نہیں۔ میں دوا لے کر ابھی واپس آتی ہوں۔" کنیز نے کچھ اتنی نرمی سے کہا کہ پہریدار کا دل باغ باغ ہو گیا۔

"اس کا مطلب ہے ساجی ایک بار اور تمہارا دیدار ہو گا۔"

کنیز قدم بڑھا چکی تھی لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ بولی:

"ایک بار نہیں۔ کئی بار۔"

وہ مسکرا دی تو پہریدار رلشیہ خطمی ہو کر رہ گیا۔

"یعنی آج رات تم خیمے ہی میں رہو گی؟"

"اور کیا تم چاہتے ہو کہ میں شہزادی کو اس حال میں اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤں؟" کنیز نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

"نہیں نہیں!"

پہریدار نے دانت نکال دیے:

"میں چاہتا ہوں کہ تم روز اس خیمے میں رہا کرو تا کہ . . . . ."

کنیز ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ پہریدار نہ معلوم کس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کنیز واپس آئی مشکتی بل کھاتی اندر چلی گئی۔

ذرا دیر بعد کنیز پھر واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں پیالہ اور دوسرے میں لکڑی کا ایک بڑا گول سا برتن تھا۔ اس طرح کے لکڑی کے برتن شراب رکھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

"اسے سنبھالو۔"

کنیز نے شراب اور پیالہ پہریدار کے حوالے کر دیا:

"چپ چاپ اسے پیتے رہو۔"

"بڑی مہربانی تمہاری!" پہریدار نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ کیا رہے ہو!" کنیز تنک کر بولی:

"خبردار۔ کوئی آواز نہ ہو۔ شہزادی بیمار ہیں۔"

"اطمینان رکھو۔ میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔" پہرے دار سہم گیا۔ اسے ڈر ہوا کہ کنیز کہیں اس سے ناراض نہ ہو جائے۔

"ایک بات کا اور خیال رکھنا۔"

کنیز خیمے میں جاتے جاتے پلٹ کے بولی:

"مجھے ابھی کئی بار باہر جانا پڑے گا۔ شہزادی بیمار ہیں نا۔ تم آتے جاتے مجھے مت ٹوکنا۔ چپ چاپ بیٹھے رہنا۔"

کنیز اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلی گئی۔

پہرے دار شراب پا کر خوش ہو گیا تھا۔ کنیز کے جاتے ہی اس نے پیالہ بھرا اور غٹ غٹ پی گیا۔ یہ شراب شاہ شوش کے لیے آئی تھی جو اس کے پینے سے بچ رہی تھی۔ شاہ اعلیٰ درجے کی شراب پیتا تھا جو بہت زیادہ تیز ہوتی تھی۔ پہرے دار ایک ہی پیالے سے مست ہو گیا۔ دوسرا پیالہ بھرا تھا کہ کنیز پھر خیمے سے نکلی اور تیز قدم اٹھاتی ایک طرف چلی گئی۔ پہرے دار شراب پینے میں معروف ہو گیا۔ کنیز تیز مگر احتیاط سے قدم اٹھاتی، خیمے کی قطاروں کے پاس سے گزر رہی تھی۔

شاہ شوش نے پہلے روانگی کا اعلان کیا تھا اس لیے لوگ صبح کو روانہ ہونے کے لیے تیاریاں کرنے لگے تھے مگر پھر شاہ نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور دوسرے دن جشن کا اعلان کرا دیا۔ جشن کے نام سے لوگ خوش ہو گئے کیونکہ ایسے موقعوں پر انہیں شراب پینے کے علاوہ دوسری بھی تمام بے ہودگیوں کی اجازت ہوتی تھی۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے خیموں میں آرام کر رہے تھے۔ جو جاگ رہے تھے وہ الاؤ کے گرد بیٹھے خوش گپیوں میں معروف تھے۔ ششبیں کی کنیز کو سب ہی پہچانتے تھے اس لیے کسی نے اسے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

کنیز خیمے کی قطاریں گنتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ ایک خیمے کے پاس وہ ٹھہری۔ باہر اندھیرا تھا۔ اندر ایک شمع جل رہی تھی۔ کنیز نے دروازے کے پاس پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا جیسے کچھ ٹٹول رہی ہو۔ اس کا پیر ایک چھوٹے پتھر سے ٹکرایا۔ کنیز نے بیٹھ کر پتھر پہ ہاتھ رکھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو اس نے آہستہ سے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔

ایک شخص بستر پر چت لیٹا تھا۔ کنیز نے غور کیا۔ شمع کی مدھم روشنی میں اس نے داراب کو پہچان لیا۔ وہ داراب ہی تھا۔ اس کا داراب۔

"داراب!" اس نے اندر داخل ہو کر آہستہ سے آواز دی۔

داراب چونک کر بیٹھ گیا۔

"تم ..... ششبنیل تم!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں۔ میں ہی ہوں!" ششبنیل مسکراتی ہوئی بولی۔

"لیکن اس وقت۔ کسی نے دیکھا تو نہیں تمہیں؟" داراب نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"دیکھا کیوں نہیں؟"

ششبنیل کے لبوں پہ دلفریب تبسم تھا:

"بہتوں نے مجھے اس طرف آتے دیکھا ہے۔"

"پھر۔ پھر ٹوکا تو نہیں کسی نے؟" داراب کے خوف میں اب تعجب بھی شامل ہو گیا۔

"کوئی ٹوکتا کیسے؟"

ششبنیل کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو گیا:

"یہ کپڑے میری کنیز کے ہیں اور وہ میرا لباس پہنے شاہ شوش کے خیمے میں موجود ہے۔"

داراب نے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"شاہ شوش جاگ پڑے تو کیا ہوگا۔ کنیز یقیناً قتل کر دی جائے گی۔ پھر تم اور میں..... "

کہتے کہتے رک گیا۔

"ہم دونوں بھی قتل کر دیے جائیں گے۔"

ششبنیل نے مسکرا کر اس کی بات پوری کر دی:

"دیکھو داراب! میں بے وقوف نہیں ہوں جو اتنا بڑا خطرہ مول لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔"

"وجہ کچھ بھی ہو ششبنیل!"

داراب نے بھی مستقل مزاجی سے کہا:

"لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ میری سچی محبت کی کشش ہے جو تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔"

"کیا تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے؟"

ششبنیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں:

"اور کیا مجھے حاصل بھی کرنا چاہتے ہو؟"

"ششبنیل۔ اگر محبت نہ ہوتی تو میں یہاں آنے کا خطرہ کیوں مول لیتا؟" داراب بڑے جذباتی ...

"میں جانتا ہوں کہ میں تمہیں حاصل نہیں کر سکتا لیکن تمہارے قبیلے میں رہ کر کم از کم میں رو...

تو کر سکوں گا۔ تمہیں دیکھنے سے پہلے میں نے منصوبہ بنایا تھا کہ رب اور ربیہ شوش کے بدلے میں دونوں قبیلوں میں صلح صفائی کرا دوں گا لیکن تمہیں دیکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب میری زندگی تمہارے بغیر ادھوری ہے اسی لیے میں تمہارے خداؤں کو لے کر خود آ گیا تاکہ تمہارے قریب رہ کر اپنے دل کو تسکین دیتا رہوں۔"

"داراب۔ یقین کرو کہ میرا بھی یہی حال ہے۔"

ششبنیل کہتے کہتے شرمائی پھر سنبھل کر بولی:

"میں بھی جانتی ہوں کہ شاہ شوش سے تم مجھے حاصل نہیں کر سکتے لیکن اگر تم ہمت کرو اور میرے کہنے کے مطابق کام کرو تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو سکتی ہوں۔"

"کیا ایسا ممکن ہے ششبنیل؟"

داراب بے چین ہو کر بولا:

"تمہیں حاصل کرنے کے لیے تو میں جان کی بازی لگا دوں گا ششبنیل! بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ جہاں تک ہمت کا تعلق ہے تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں جس طرح میری انگلیاں رباب کے تاروں پر گردش کرتی ہیں۔ اس طرح میرے ہاتھ قبضۂ شمشیر کو حرکت دے سکتے ہیں۔ میں ایک اچھا تیر انداز بھی ہوں ششبنیل!"

"تمہیں نہ تلوار کی ضرورت پڑے گی اور نہ ترکش سنبھالنا پڑے گا۔"

ششبنیل اطمینان سے بولی:

"غور سے سنو۔ کل جشن ہوگا۔ تم رباب بجاؤ گے۔ شراب کے دور چلیں گے۔ شاہ شوش کا یہ طریقہ ہے کہ جشن کے موقع پر وہ جس سے خوش ہوتا ہے اسے منہ مانگا انعام دیتا ہے۔ تم سے تو وہ پہلے ہی خوش ہے۔ تمہارے رباب سے اور زیادہ خوش ہوگا۔ وہ تم سے پوچھے گا کہ تم انعام میں کیا چاہتے ہو؟ تم کوئی جواب نہ دینا اور رباب کے راگ راگنیوں سے اسے مست کرتے رہنا۔ وہ تم سے بار بار سوال کرے گا۔ جب تم محسوس کرو کہ شاہ بالکل مدہوش ہو گیا ہے اس وقت تم اپنے انعام میں مجھے مانگ لینا۔ میرا خیال ہے وہ انکار نہ کرے گا۔ اگر وہ منظوری دے دے تو اپنے سرداروں کو گواہ بنا لینا۔ پھر میں سدا کے لیے تمہاری ہو جاؤں گی۔"

"لیکن ششبنیل....."

"انکار نہ کرو داراب!"

ششبنیل نے اس کی بات کاٹ دی:

"شاید تمہیں یہ خیال ہو کہ شاہ شوش کے سردار یہ گوارا نہ کریں کہ ان کے قبیلے کی لڑکی دوسرے قبیلے میں بیاہی جائے۔ تم اس طرف سے مطمئن رہو۔ یہ اعتراض مذہبی پیشوا اٹھاتے ہیں لیکن جس وقت شراب کا دور چلے گا

تو تمام پروہت اٹھ کے چلے جائیں گے۔ کوئی اعتراض کرنے والا نہ ہوگا۔"

"لیکن ششبیل!"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں داراب۔۔۔"

ششبیل نے اس کی بات پھر کاٹی:

"میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ میں جا رہی ہوں۔ رب اور ربیہ شوش تم پر مہربان ہوں۔ کل اپنا دل خوب مضبوط رکھنا۔"

ششبیل تیزی سے باہر نکل گئی۔

داراب حیران نظروں سے خیمے کے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتا رہ گیا!

○

جشن کی تیاریاں علی الصبح ہی شروع ہو گئیں۔

میدان میں ایک بڑا سا پنڈال بنایا گیا۔ جانوروں اور پرندوں کا گوشت بریاں کیا گیا۔ اس جشن میں تمام شا... شرکت کی اجازت تھی سب کے لیے کھانا تیار کیا گیا۔ فرش کے کنارے کنارے مٹی کے مٹکے اور پیالے سجا... گئے۔ دوپہر کو دعوتِ عام تھی۔

کھانے کے بعد رب اور ربیہ شوش کی مورتیاں پنڈال میں لائی گئیں۔ مورتیاں قالین کے فرش پر رکھ... تمام حاضرین نے انہیں سجدہ کیا۔ پھر مذہبی پیشوا مورتیوں کو لے کر ایک خاص خیمے میں چلے گئے جسے عارضی طور پر عبا... بنایا گیا تھا۔

پروہتوں کے جانے کے بعد شراب کا دور شروع ہوا۔ شاہ شوش نے مستی کے عالم میں داراب کو طلب کیا اسے رباب چھیڑنے کا حکم دیا۔

داراب کو معلوم تھا کہ جشن کی اصل محفل تو رات کو جمے گی۔ اس نے بڑی خوبی سے شاہ کو یہ باور کرایا کہ ربا... دھنیں تو رات کو اپنا رنگ دکھاتی ہیں اس لیے "محفلِ شب" کا انتظار کیا جائے۔ ششبیل اسے یہ بات سمجھا چکی... لیکن داراب نے خود ہی رباب کا مسئلہ رات پر ملتوی کر دیا۔

شاہ شوش اور اس کے لشکریوں نے دوپہر کا کھانا تو رات تک ہضم کر لیا لیکن ابھی ان کا نشہ پوری طرح...

کہ محفلِ شب آراستہ ہو گئی۔ پہلے دعوت، پھر رب اور ربیہ شوش کی پوجا اور سب سے آخر میں نوشی کا ہنگامہ برپا ہوا۔ داراب حسبِ وعدہ اپنا رباب سنبھالے پنڈال میں پہنچ گیا۔

جس وقت وہ پنڈال میں داخل ہو رہا تھا تو شہزادی ششبیل کی کنیز نے اس کے پاس پہنچ کر آہستہ سے سرگوشی کی:

داراب کی نظر فوراً ایک طرف اٹھ گئی۔ اس طرف ایک خیمہ استادہ تھا۔ یہ خیمہ دوپہر کے وقت وہاں نہیں تھا۔ داراب کی نظر خیمے سے ٹکرائی۔ ششبیل پردے سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے خود یہ خیمہ وہاں لگوایا تھا تاکہ وہ محفلِ نشاط کا منظر بھی دیکھتی رہے اور داراب کو بھی اس کی موجودگی سے تقویت رہے۔

داراب، رباب کا بادشاہ تھا۔ اسے اس ساز پر پورا عبور حاصل تھا۔ پھر آج تو وہ ایک خاص جذبے کے تحت رباب بجانے آیا تھا۔ اس نے رباب چھیڑا تو پوری محفل اس کی دھنوں میں ڈوب گئی۔

کچھ ایسا سماں بندھا کہ لوگوں کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ رقاصاؤں کے طائفے بار بار آتے۔ ناچتے اور تھک کے چلے جاتے لیکن رباب کی دھنیں بند ہونے کا نام نہ لیتیں۔

داراب خیمے پر نظریں جمائے رباب بجا رہا تھا۔ شہزادی ششبیل بھی رباب کی دھن پر مست ہو کر از خود تھرکنے لگی تھی۔

رات ڈھلنے لگی لیکن نہ داراب کا ہاتھ رکتا تھا اور نہ سننے والوں میں اکتاہٹ یا بیزاری کے آثار پیدا ہونے ...تھے۔ شاہ شوش سر دھن رہا تھا اور تعریف کے ڈونگرے برسا رہا تھا۔ نشے سے اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے آواز بھاری ہو گئی تھی لیکن وہ رباب بند کرنے کا حکم نہیں دے رہا تھا اور داراب اس طرح رباب بجا رہا تھا کہ جیسے اس کے بعد وہ کبھی رباب نہ بجائے گا۔

"داراب!"

آخر شاہ شوش کی نشے میں ڈوبی ہوئی بھاری آواز ابھری۔ رباب کے تار ایک دم رک گئے۔ داراب نے شاہ کی طرف دیکھا۔

"تم نے ہمیں خوش کیا ہے۔ مانگو ہم سے کیا مانگتے ہو؟" شاہ شوش لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

"شاہِ عالی مقام!"

داراب نے نظریں اونچی کر کے شاہ کو دیکھا پھر اہلِ محفل کو مخاطب کیا:

"حاضرینِ مجلس! شاہ شوش میرے فن سے خوش ہو کر مجھے انعام دینا چاہتے ہیں۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں اپنا انعام طلب کروں؟"

"ہاں داراب!"

شاہ کا نائب جھومتے ہوئے بولا:

"مانگو۔ تم شاہ سے کیا مانگتے ہو۔ جو مانگو گے ملے گا۔ ربِ شوش کی قسم! اگر تم اس وقت میرا سر بھی مانگو گے تو شاہ انکار نہ کریں گے"۔

"اے شاہِ عالی مقام!"

داراب نے رباب ایک طرف رکھتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا:

"آپ بادشاہ ہیں اور میں آپ کے دربار میں سوالی ہوں لیکن سوال کرنے سے پہلے میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ میں شاہ سے جس چیز کا سوال کروں گا وہ مجھے عنایت کی جائے گی"۔

"تو احمق ہے داراب!"

شاہ نے شراب کا پیالہ دُور پھینکتے ہوئے کہا:

"ہمارے وعدے پر اعتبار نہیں کرتا۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ تیرا سوال خالی نہیں جائے گا"۔

"میں تمام معزز سرداروں کو گواہ بناتا ہوں"۔ داراب نے اہلِ مجلس کی طرف منہ کر کے کہا۔

"ہم تیرے گواہ ہیں داراب"۔ کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

داراب نے خیمے کی طرف دیکھا۔ پھر دل مضبوط کیا اور سر جھکا کے بولا:

"شاہِ عالی مقام! چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لیکن آپ نے وعدہ پورا کرنے کا یقین دلایا ہے اور اہلِ مجلس اس کے گواہ ہیں۔ میں اپنے انعام میں شہزادی شبنم کے ساتھ اپنی شادی کی اجازت طلب کرتا ہوں۔ امید ہے کہ شاہ میرا سوال پورا کریں گے"۔

"شہزادی ..... شبنم ..... شادی"۔ شاہ شوش کے حلق سے یہ تینوں الفاظ ہچکیوں کے درمیان رک رک کر نکلے۔

داراب سہم گیا۔ اور اسے خطرہ ہوا کہ بس اب آگے اس کے قتل کا حکم ہوگا۔ شاہ شوش سنبھل کے بیٹھ گیا۔ اس نے شراب کا پیالہ منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں پی کر بولا:

"داراب۔ جا ہم نے شہزادی کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دیا"۔

سہما ہوا داراب خوش ہو گیا۔

اس کا جی چاہا کہ دوڑ کے شہزادی کے پاس پہنچ جائے۔ اس نے خیمے کی طرف دیکھا۔ شبنم، حیا کے جذبے چہرے پر سجائے پردے سے لگی کھڑی تھی۔

"کیا میں یقین کر لوں کہ شاہ نے مجھے شہزادی شبنم کے ساتھ شادی کی ان گواہوں کے سامنے اجازت دے دی ہے!" داراب نے خوشی کے جذبات دباتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ چاہتا تھا کہ بات بالکل صاف اور واضح ہو تا کہ شاہ شوش نشہ اترنے کے بعد انکار نہ کر سکے۔

"ہاں۔ اجازت دی۔ اجازت دی"۔ شاہ شوش شراب کے نشے میں بار بار یہ جملہ دہرانے لگا۔

اب کوئی شک و شبہ نہ رہ گیا تھا۔ داراب بڑی بے خوفی سے شہزادی کے خیمے پر پہنچا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ان قبائل میں رواج تھا کہ اگر لڑکی کا وارث شادی کی اجازت دے دے تو شادی ہو جاتی تھی۔ کسی مزید تصدیق یا رسم کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

"ٹھہرو داراب!"

شہزادی شبنم نے کہا:

"پہلے مجھے دلہن تو بننے دو۔ چلو تم بھی دُلہا بنو"۔

شہزادی کی کنیزِ خاص اس کے ساتھ ہی اس خیمے میں موجود تھی۔ اس نے بڑھ کر داراب کا ہاتھ پکڑ لیا:

"چلیے شہزادے! میں آپ کو دلہا بناتی ہوں"۔

کنیز داراب کو دوسرے خیمے میں لے گئی اور چند کنیزوں کو حکم دیا کہ داراب کو فوراً دولہا بنا کر تیار کر دیا جائے اور وہ خود دوسری کنیزوں کو لے کر واپس آئی اور شہزادی کو دلہن بنانے لگی۔ دم کے دم میں دونوں دلہن، دلہا سے روپ میں آ گئے۔

کنیز داراب کے پاس گئی اور اسے لے کر شہزادی کے خیمے میں آ گئی۔ شہزادی کے اسی خیمے کو حجلۂ عروسی میں تبدیل کر دیا گیا۔

جب کنیز دلہن، دلہا کو تنہا چھوڑ کر واپس ہوئی تو پنڈال میں اب بھی شراب کا دور چل رہا تھا اور آسمان پر صبح کا تارا نمودار ہو گیا تھا۔

داراب اور شبنم کی شبِ عروسی کا بھی اختتام ہوا لیکن مسرت کے بجائے ان کے چہروں پر خوف کے سائے

لرز رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ شاہ شوش نے رات نشے کی حالت میں انہیں شادی کی اجازت دی تھی۔ اب ا
ہوش کرے گا تو معلوم نہیں ان کا کیا حشر کرے۔

ششبیل کی کنیزِ خاص جب ان کے پاس آئی تو ان کی حالت دیکھ کے وہ بھی پریشان ہوگئی۔ ا
انہیں تسلی دی کہ شاہ نے کسی بھی حالت میں اجازت دی ہو وہ اب اس سے انکار نہیں کریں گے لیکن دلوں
کی کسی طرح تسلی نہ ہوئی۔

صبح سے دوپہر ہوگئی لیکن ان دونوں نے خیمے سے قدم نہ نکالا۔ کنیز کو بھی انہوں نے اپنے پاس
روک لیا۔

دوپہر کو جب شاہ کا نشہ ٹوٹا اور اس کے سردار اکٹھے ہوئے تو رات کی محفل کی باتیں شروع ہوئیں۔ ا
سب ہی مدہوش تھے۔ پھر بھی کچھ لوگوں کو ششبیل کی شادی کا ایک ہلکا سا خیال تھا لیکن انہوں نے اپنی طرف سے
بارے میں کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی۔

شاہ نے داراب کو محفل میں موجود نہ پایا تو اس کی طلبی کا حکم دیا۔ اب بھی کسی نے زبان نہ کھولی اور دار
انتظار کرنے لگے۔

داراب لرزتا کانپتا شاہ کے سامنے آیا۔ جھک کے سلام کیا اور ایک طرف چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ شاہ
اس کے لباس پہ پڑی تو وہ چونکا۔ داراب کے ریشمی کپڑوں سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

"داراب!"

شاہ نے اسے مخاطب کیا تو داراب کانپ اٹھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر شاہ کو دیکھا:

"داراب تیری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ کیا تو رات بھر جاگتا رہا ہے؟"

"جی شاہِ عالی مقام!"

داراب نے سنبھل کے کہا:

"میں تمام رات بیدار رہا ہوں!"

"کیوں۔ تو کیوں بیدار رہا؟ تیرے کپڑوں سے خوشبو بھی آرہی ہے۔"

"شاہِ عالی مقام۔ کیا آپ کو میری شادی کی خبر نہیں۔" داراب نے جی کڑا کرکے کہا۔

"تیری شادی۔ تو نے ہم سے اجازت کیوں نہیں لی؟ ہمیں کیوں شریک نہیں کیا شادی میں؟" شا
حیران نظروں سے داراب کو دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"شاہِ محترم! میری شادی کل رات ہوئی۔" داراب دانستہ لہجے میں بولا۔ "آپ نے خود ہی

سے شادی کی اجازت دی تھی۔"

"کیا بک رہا ہے نابکار۔"

شاہ شوش چیخ کے بولا:

"تجھے یہ الفاظ منہ سے نکالنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ کہاں تو ایک معمولی سازندہ اور کہاں شہزادی ششبیل!
شاہ شوش کی بہن۔ تو ہم پر الزام لگا رہا ہے۔ ہم تیری زبان کٹوا دیں گے۔"

"سنیے شاہ محترم!"

موت سامنے ہو تو انسان بے خوف ہو جاتا ہے۔ اس وقت داراب کا بھی یہی عالم تھا:

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے شہزادی سے شادی آپ کی اجازت کے تحت کی ہے۔ آپ کے تمام سردار
اس کے گواہ ہیں۔"

داراب نے امید بھری نظروں سے اہلِ دربار کو دیکھا۔

"سن رہے ہو تم لوگ۔ یہ کمینہ تم پر بھی الزام لگا رہا ہے۔" شاہ شوش نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اے شاہِ شوش! میں گواہی دیتا ہوں کہ داراب سچ کہہ رہا ہے۔"

شاہ کے نائب نے سر جھکا کر کہا:

"آپ نے خوش ہو کر اس سے انعام مانگنے کو کہا۔ اس نے شہزادی کو مانگا۔ آپ نے شادی کی اجازت دیدی۔
ہم سب اس کے گواہ ہیں۔ ہم جھوٹ بولیں تو ہم پہ ربِ شوش کا عذاب نازل ہو۔"

پھر تو ایک ایک کرکے سب سرداروں نے شوش کے نائب کی تائید کی۔ شاہ شوش کی آنکھیں حیرت سے
کھلی رہ گئیں۔ پھر وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔

"یہ واقعہ کب پیش آیا میرے سردارو؟" شاہ نے سر اٹھا کر مضمحل آواز میں پوچھا۔

"کل شب اے شاہِ شوش۔"

نائب نے جواب دیا:

"داراب نے ہم سب کو گواہ بنا کر شہزادی سے شادی کی ہے۔ ہم گواہی سے انکار نہیں کر سکتے۔"

شاہ شوش کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ اپنے تمام سرداروں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے داراب کو کوئی
سزا نہ دی اور سرداروں کو فوراً رخصت کر دیا۔

پھر اس نے پروہتوں کو اپنے خیمے میں بلایا اور انہیں بتایا کہ کس طرح کل رات اس نے نشے کی حالت میں
داراب کو ششبیل کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی تھی۔ مذہبی پیشوا یہ سن کر بہت بگڑے۔ اس دور میں

اگر لڑکی غیر قبیلے میں بیاہی جاتی تو یہ قبیلے کی توہین کے مترادف سمجھا جاتا تھا لیکن شادی منسوخ کرنا بھی ممکن
کیونکہ اس شادی کے تمام سردار گواہ تھے اور شادی کی منسوخی ان کی توہین تھی۔ وہ بغاوت کر سکتے تھے۔ اسلئے
وقت کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

پروہتوں نے شاہ کو یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اس کا حل تلاش کر لیں گے جس سے سردار ان ناراض
بھی نہ ہوں اور شادی منسوخ بھی ہو جائے۔

پروہتوں کو اپنی روایات برقرار رکھنا تھیں۔ وہ بھلا غیر قبیلے میں شہزادی کی شادی کیسے برداشت کر
انہوں نے اس کا یہ حل نکالا کہ آج رات داراب کو خیمے میں گھس کر قتل کر دیا جائے۔ داراب کے قتل ہونے
کا قصہ ختم ہو جائے گا۔ سردار بھی مخالفت نہ کریں گے اور چپ ہو کر بیٹھ جائیں گے۔

شام تک مذہبی پیشواؤں نے داراب کے قتل کے منصوبے کو آخری شکل دے دی اور رات ہونے
پیشوا شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

شاہ اپنی بہن کی اس طرح شادی ہو جانے سے سخت پریشان تھا۔ اس نے دن میں شراب بھی نہیں
منہ لپیٹے اپنے خیمے میں اکیلا پڑا تھا۔

ششبیل اپنے نئے خیمے میں تھی اور داراب اس کے پاس سہما ہوا بیٹھا تھا۔ بڑے پیشوا نے جب شاہ
سامنے داراب کے قتل کا منصوبہ رکھا تو جیسے اس کے دل کی مراد بر آئی۔ وہ داراب سے سخت ناراض تھا کیونکہ
خیال میں داراب نے اسے فریب دے کر یہ شادی کی تھی۔

اب مشکل یہ پیش آئی کہ داراب کے قتل پر کسے متعین کیا جائے۔ اگر کسی سردار کا تعاون حاصل کیا
راز کھل جانے کا امکان تھا اور بغاوت کا بھی امکان تھا۔ اس لیے یہ ذمے داری شاہ نے پروہتوں پر
اپنے آدمیوں کو شہزادی کے خیمے میں بھیج کر داراب کو قتل کرا دیں۔ بعد کے معاملات شاہ خود سنبھالے
شاہ نے پیشوا کے رخصت ہوتے وقت اسے تاکید کر دی کہ صرف داراب کو قتل کیا جائے۔ شہزادی
کو کوئی نقصان نہ پہنچے کیونکہ وہ شہزادی کی قربانی دے کر اپنا عہد پورا کرنا چاہتا ہے۔

○

یہ داراب اور ششبیل کی شادی کی دوسری رات تھی لیکن دونوں اداس بیٹھے تھے۔ خیمے میں

جاری تھی اور ایک نہ معلوم خوف سے وہ بار بار چونک پڑتے تھے۔

ان کا خوف غلط نہ تھا۔ داراب کے قتل کے لیے چار پروہت خنجر اور تلواروں سے مسلح ہو رہے تھے۔
اسی عالم میں شہزادی ششبیل کی کنیزِ خاص ہانپتی کانپتی خیمے میں داخل ہوئی۔ اسے اس ہیئت میں دیکھ کر ان
دونوں کا رنگ اڑ گیا:

"داراب کا قتل...... شہزادی کی قربانی...... فیصلہ ہو گیا۔"

کنیز نے سانس سنبھالتے ہوئے کہا:

"جلدی کرو۔ قاتل آ رہے ہیں۔ جنوب کی طرف بڑے پیڑ کے نیچے دو گھوڑے پہنچا دیے گئے ہیں۔
جلدی...... فوراً...... جان بچاؤ داراب!"

داراب اور ششبیل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر داراب جلدی سے ششبیل کا ہاتھ پکڑ کے خیمے سے
نکلا۔ کنیز بھی ان کے پیچھے باہر آ گئی۔

سامنے سے چھ آدمی تیزی سے خیمے کی طرف آ رہے تھے۔ داراب اور ششبیل نے جنوب کی طرف بھاگنا شروع کر
دیا۔ داراب نے اپنا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ششبیل کا ہاتھ اس نے چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ آزادی سے دوڑ سکے۔
داراب ششبیل سے دو قدم آگے تھا۔ تعاقب کرنے والے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ خیموں کی رسیاں
اور زمین میں گڑی ہوئی کھونٹیاں راستے میں حائل تھیں۔

معاً ششبیل کی قمیض کا دامن کسی چیز سے الجھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹھوکر کھائی اور زمین پر گر گئی۔ داراب
چار قدم آگے نکل گیا تھا۔ ششبیل کو گرتے دیکھ کر وہ پلٹا۔ ششبیل چیخی:

"داراب، تم نکل جاؤ۔"

داراب ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس کا دل نہ چاہا کہ ششبیل کو اکیلا چھوڑ کر نکل جائے۔

"داراب! تمہیں میری قسم! اپنی جان بچاؤ۔"

ششبیل کے لہجے میں ہزاروں التجائیں تھیں۔

داراب نے مجبور ہو کر اس کی طرف پیٹھ کی اور بڑے پیڑ کی طرف بھاگنے لگا جو اب زیادہ دور نہ تھا۔ جس
وقت چھ پروہت شہزادی ششبیل کو زمین سے اٹھا رہے تھے اس وقت شہزادی کے کانوں میں ایک گھوڑے کے
بھاگنے کی آواز آئی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور خود کو بلا عذر پروہتوں کے حوالے کر دیا۔

داراب کے فرار ہونے سے مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔ شاہ نے تمام لشکر میں یہ خبر پھیلا دی کہ داراب نے
شہزادی کے ساتھ بے وفائی کی۔ یہی نہیں بلکہ شہزادی نے دلبرداشتہ ہو کر دنیا کو تیاگ دینے کا ارادہ کیا ہے اور

وہ رب شوش کی خوشنودی کے لیے آگ میں جل کر قربانی دے گی۔

شاہ کے سرداروں کو داراب کی بے وفائی پہ بڑا افسوس ہوا۔ انہوں نے داراب کو بہت لعنت ملامت کی۔ شاہ نے وہاں سے خیمے اٹھانے کا حکم دے دیا۔ کیونکہ اسے اطلاع ملی تھی کہ تاتاریوں کے دو بڑے لشکر قریب ہی جنگ میں مصروف ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ادھر نکل آئے اور خواہ مخواہ کی مصیبت پڑ جائے۔

⊙

شاہ نے اگلی منزل پہ قیام کیا تو اس نے قربانی کے انتظام کا حکم دیا۔ وہ اپنے علاقے میں واپسی سے پہلے خداؤں کا یہ قرض بھی اتارنا چاہتا تھا۔

خیموں کے سامنے میدان میں دائرے کی شکل میں لکڑیاں چن کر بارہ فٹ اونچی گول دیوار اٹھا دی گئی۔ اندر جانے کے لیے ایک چھوٹا سا راستہ رکھا گیا۔ رات ہوتے ہی لکڑیوں میں آگ لگا دی گئی۔

شاہ شوش نے دربار لگایا۔ رب اور ربہ شوش کی مورتیاں سامنے رکھی گئیں۔ پروہتوں نے جنتر منتر پڑھنا شروع کیے۔ لوگوں میں شراب تقسیم کی گئی اور خداؤں کے سامنے وحشیانہ رقص شروع ہوا۔ ڈھول تاشوں کی آوازوں سے صحرا گونج اٹھا۔

اس دوران قبیلے کی چار کنواریوں کے ساتھ شہزادی کو لایا گیا۔ سب کو دلہنوں کا لباس پہنایا گیا تھا اور وہ روایتی زیورات پہنے ہوئے تھیں۔

پروہتوں نے ان کی مانگ میں کسی رنگین لعاب کی لکیریں بنائیں اور انہیں قربان کرنے کا حکم دے دیا۔ لڑکیاں لپکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔

شہزادی شستبیل کا دل جیسے دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ بھائی کے ظالمانہ رویے نے اسے دلبرداشتہ کر دیا تھا۔ وہ خود کو مرنے کے لیے تیار کر چکی تھی اس لیے بالکل پُرسکون تھی۔

آگ کے اندر جانے کے لیے جو چھوٹا سا راستہ بنایا گیا تھا، شہزادی سب سے پہلے اس میں داخل ہو گئی۔ دوسری لڑکیوں کو پروہتوں نے دھکے دے کر اندر دھکیل دیا۔ پھر اس راستے کو بھی آگ دکھا دی گئی۔

اب شہزادی اور چاروں لڑکیاں جلتے ہوئے شعلوں کے درمیان سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ ان کی نظریں لکڑی کی دیوار پہ تھیں۔ جو کسی وقت بھی گر سکتی تھی۔

شہزادی نے آنکھیں بند کر لیں کیونکہ جلتی ہوئی لکڑیاں گرنا شروع ہو گئی تھیں اور معصوم لڑکیاں بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں مگر کہاں جاتیں۔ چاروں طرف آگ کی دیوار تھی۔

جنگلی رقص اپنے عروج پر تھا۔ شراب لنڈھائی جا رہی تھی۔ قربان گاہ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے کہ ہزاروں کی تعداد میں گھڑسوار شاہ شوش کی خیمہ گاہ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے خیموں کو آگ لگا دی اور شوش قبیلے والوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔

شوش قبیلے والے ابھی سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ان کے نصف سے زیادہ آدمی قتل ہو گئے۔ شاہ شوش بھی مارا گیا۔ . . کچھ مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ باقی گرفتار کر کے قیدی بنا لیے گئے۔

یہ حادثہ "آناً فاناً" ہو گیا۔

یہ امیر حسین کا شکست خوردہ تاتاری لشکر تھا جو سردار تیمور کے ہاتھوں مار کھا کے بلخ کی طرف پسپا ہو رہا تھا امیر حسین نے پسپائی کے وقت حکم دے دیا تھا کہ راستے کی تمام بستیوں کو تباہ کر دیا جائے اور آدمیوں کو قیدی بنا لیا جائے تاکہ تیمور کو رسد مل سکے اور نہ کام کے آدمی میسر ہوں۔

امیر حسین کا لشکر شاہ شوش کی خیمہ گاہ کو برباد کر کے بلخ کی طرف چل پڑا۔ قربان گاہ سے اب تک شعلے بلند ہو رہے تھے۔ لڑکیوں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں اور ان کے جسم خاکستر بن چکے تھے۔

دوسرے دن سردار تیمور کا لشکر امیر حسین کا تعاقب کرتا ہوا اس جگہ پہنچا۔ تیمور کو جلے ہوئے خیمے اور میدان میں بھری ہوئی لاشیں دیکھ کر دکھ ہوا۔ میدان میں ایک جگہ راکھ کا ڈھیر تھا اور چار جلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ لاشوں کے چہرے مسخ ہو چکے تھے لیکن انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوا کہ یہ عورتوں کی لاشیں ہیں۔

تیمور نے وہیں خیمے لگانے کا حکم دیا اور چند سوار ادھر ادھر دوڑائے تاکہ وہ قریب کی کسی آبادی سے کسی ایسے شخص کو پکڑ لائیں جو یہ بتا سکے کہ یہ کون بدنصیب لوگ ہیں اور ان پہ کیا افتاد پڑی؟

تیمور کے لشکر کے ساتھ قیدیوں کی ایک بڑی تعداد تھی جن میں زیادہ امیر حسین کے لشکری تھے جو جنگ میں شکست کھانے کے بعد گرفتار کر لیے گئے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنہیں تیمور کے لشکر نے جاسوس سمجھ کے پکڑ لیا تھا۔ انہی قیدیوں میں شہزادی شستبیل کا شوہر، رباب بجانے کا ماہر داراب بھی تھا۔

داراب شاہ شوش کی خیمہ گاہ سے گھوڑے پہ سوار ہو کر بھاگ نکلا تھا۔ وہ رات بھر گھوڑا دوڑاتا جنوب کی سمت بھاگتا رہا۔ صبح کو اس نے ایک لشکر کو آتے ہوئے دیکھا تو پیڑوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ یہ لشکر امیر حسین کا تھا جو تیمور سے شکست کھا کر بے تحاشا بھاگتا چلا آ رہا تھا۔

لشکر کے نکل جانے کے بعد داراب نے پھر اپنا سفر شروع کیا لیکن شام کے وقت تیمور کے ہراول دستے

سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ تیمور کے سپاہیوں نے اسے جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ داراب بہت چیخا چلایا اور اپنی صفائی پیش کی لیکن سپاہیوں نے اس کی ایک نہ سنی۔

جب تیمور نے پڑاؤ کا حکم دیا تو قیدیوں کو اس جگہ کے قریب رکھا گیا جہاں سے جلے ہوئے خیمے نظر آ رہے تھے۔ پورے لشکر میں یہ بات پھیل گئی کہ تیمور نے اس وجہ سے یہاں پڑاؤ کیا ہے کہ یہاں کسی قبیلے کی خیمہ گاہ کو امیر حسین نے تہس نہس کر دیا ہے اور سردار یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کون سا قبیلہ تھا اور اس کے کتنے آدمی مارے گئے؟

داراب کو جلے ہوئے خیمے صاف نظر آ رہے تھے اور وہ انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ بعض خیمے آدھے آدھے جلے تھے اور کچھ خیمے جلنے سے بچ گئے تھے۔

ایک خیمے پر داراب کی نظر پڑی تو وہ زور سے چیخا:

"میرا خیمہ، یہ میرا خیمہ ہے۔"

قیدیوں کا ایک محافظ داراب کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے داراب کی آواز سنی تو چونک کر بولا:

"بڑا آیا خیمے والا۔ تیرے باپ کا خیمہ ہے یہاں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں محافظ۔"

داراب نے جواب دیا:

"تم مجھے سردار کے پاس لے چلو۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ یہ خیمہ گاہ کس کی ہے۔ میں اس قبیلے کو جانتا ہوں۔"

محافظ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر داراب کا ہاتھ پکڑ کر تیمور کے پاس لے گیا۔ تیمور جلی ہوئی لاشوں کی لاشوں کے پاس کھڑا افسوس کر رہا تھا۔

داراب نے تیمور کے پاس پہنچتے ہی کہا:

"سردار محترم! یہ خیمہ گاہ قبیلہ شوش کی ہے۔ میں اس خیمہ گاہ میں رہ چکا ہوں۔"

"قبیلہ شوش!"

تیمور سوچتے ہوئے بولا:

"اس قبیلے کا نام تو ہم نے پہلے کبھی نہیں سنا۔"

"یہ جوان ٹھیک کہہ رہا ہے سردار محترم۔"

ایک بوڑھا آدمی تیمور کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ اس بوڑھے کو تیمور کے آدمی کہیں سے پکڑ لائے تھے۔ تیمور نے قریب پہنچ کر ادب سے سلام کیا۔ پھر بولا:

"اے شہر سبز کے امیر تیمور۔ یہ خیمہ گاہ واقعی شاہ شوش کی ہے۔ یہ لاشیں جو آپ دیکھ رہے ہیں، ان کنواری دوشیزاؤں کی ہیں جنہیں شاہ شوش نے اپنے خداؤں کی خوشنودی کے لیے زندہ آگ میں جھونک دیا مگر وہ ظالم خود بھی نہ بچ سکا اور امیر حسین کے شکست خوردہ لشکر نے ادھر سے گزرتے ہوئے پورے قبیلے کو تہ و بالا کر ڈالا۔"

"ظالم..... کتنا ظالم تھا وہ شخص؟" تیمور نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"امیر محترم! شاہ شوش تو اتنا ظالم تھا کہ اس نے اپنی سگی بہن کو بھی آگ میں جھونک دیا تھا۔"

بوڑھے کی زبان سے یہ الفاظ سن کر داراب تڑپ اٹھا۔

"بابا! کیا شہزادی شستبیل بھی آگ میں جل مری؟"

یہ کہتے ہوئے داراب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ بوڑھا داراب کے رونے سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے سردار تیمور سے پوچھا:

"اے امیر! یہ جوان کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟"

تیمور داراب کا نام نہ جانتا تھا۔ اسے تو صرف یہ بتایا گیا تھا کہ یہ قیدی جاسوسی کے شبے میں گرفتار ہوا ہے۔ تیمور نے داراب کی طرف دیکھا جس کا مطلب تھا کہ وہ خود اس کا جواب دے۔

داراب افسردگی سے بولا:

"اے امیر! آگ میں جلنے والی شہزادی شستبیل میری بیوی تھی اور شاہ شوش کی بہن۔ میرا نام داراب ہے اور میرا تعلق سرائیکی قبیلے سے ہے۔"

"داراب!"

بوڑھا زیر لب بڑبڑایا پھر تیز آواز میں بولا:

"سردار محترم! اگر یہ جوان داراب ہے تو بلاشبہ یہ شہزادی شستبیل کا شوہر ہے۔ یہ غم نہ کرے کیونکہ شہزادی زندہ ہے اور اس وقت میری پناہ میں ہے۔"

یہ نوید سن کر داراب کی سوکھی کھیتی پر جیسے بارش کے چھینٹے پڑ گئے۔ خوشی سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ پھر بوڑھے نے واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا:

"سردار تیمور! جب سے امیر حسین نے قلعہ قرشی کے باہر آپ کے ہاتھوں شکست کھا کر پسپائی اختیار کی ہے۔ اس وقت سے اس مقام تک اس پسپائی کے دوران جتنے مسلم اور غیر مسلم قبائل اس کی راہ میں آئے ان تمام قبائل کو اس نے تباہ کر کے ان کا سامان چھین لیا اور ان کے جوانوں کو قیدی بنا لیا کیونکہ ان قبائل نے تاتاریوں کی خانہ جنگی میں یا تو غیر جانبداری کا اعلان کیا تھا یا امیر حسین کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں بھی اسی طرح کے ایک مسلم

قبیلہ کا فرد ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کے ساتھ ان پہاڑیوں میں پناہ لے رکھی تھی۔ قبیلہ ستونش کو تباہ کرنے کے
جب امیر حسین چلا گیا تو میں پناہ گاہ سے نکل کر اس خیمہ گاہ میں آیا۔ یہاں میری ملاقات شہزادی شستبیل سے ہوئی
معجزاتی طور پر آگ سے بچ گئی تھی۔ اس کے جسم کے کچھ حصے آگ سے جل گئے ہیں۔"

سردار تیمور نے داراب کو آزاد کر دیا اور اس کی بیوی کو پناہ گاہ سے منگوا کر اس کے حوالے کر دیا۔ شہزادی
شستبیل اپنے مسلم محسن کے اخلاق سے متاثر ہو کر پہلے ہی مسلمان ہو چکی تھی۔ داراب بھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا
اور رباب کو بالائے طاق رکھ کر تیمور کے سپاہیوں میں شامل ہو گیا۔

○

سرائے خانم

تیمور اپنا خواب بیان کر رہا تھا۔ وہ بڑے صبر و تحمل کا مالک تھا۔ بڑی سے بڑی پریشانی بھی اپنے چہرے
سے ظاہر نہ ہونے دیتا تھا مگر آج خلافِ معمول اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا دل
اندر ہی اندر رو رہا ہو۔

مرحوم بیوی الجائی خاتون کے تصور سے اس کی آنکھیں اکثر بھر آتی تھیں۔ پھر جب کبھی یہ تصور خواب کے
پردے پر ابھرتا تو اس کے دل سے ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔

ادھر کئی دن سے الجائی خاتون مسلسل اس کے خوابوں میں یادیں بھر رہی تھیں۔ رات تو اس نے تیمور
سے باتیں بھی کی تھیں۔ اس نے محسوس کیا تھا جیسے سیستانیوں کو شکست دینے کے بعد وہ ایک پہاڑی مقام پر
ٹھہر گیا ہے۔ اس کا خیمہ ایک بلند مقام پر نصب ہے۔ الجائی خاتون قالین کے فرش پر اس کے سامنے بیٹھی ہے۔
صبا کے سبک جھونکے پہاڑی پھولوں کی خوشبو ہر طرف بکھیر رہے ہیں۔ سامنے کی پہاڑیوں سے ماہتاب سر ابھار
رہا ہے۔ دھلے ہوئے آسمان پر بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ تیمور اور الجائی فضا
کی رنگینیوں اور سحر انگیزیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

"میرے سرتاج!"

یکایک جیسے الجائی خاتون نے خواب سے چونک کر کہا۔ اس کا انداز وہی پرانا اور والہانہ تھا لیکن آواز کرب میں
ڈوبی ہوئی تھی۔

تیمور نے آسمان میں کھیت کرتے ماہتاب سے نظریں ہٹا کر الجائی خاتون کو دیکھا۔ اسے الجائی کی روشن
آنکھوں میں اشکوں کے موتی چھلکتے دکھائی دیے۔

"تم رو رہی ہو الجائی! فرصت کے ان لمحات میں آنسوؤں کا ظاہر ہونا بہت بڑی بدشگونی ہے!"

"نہیں میرے سرتاج!"

الجائی نے منہ گھما کر آنسو پونچھ ڈالے:

"میری روح پر ایک بوجھ ہے۔ ایک دُکھ ہے۔ مجھے نجات دلادو اس سے میرے سرتاج!"

"جلد بتاؤ الجائی!"

تیمور بے چین ہو گیا:

"تم میرے گرم و سرد کی شریک ہو۔ جہانگیر کی ماں ہو۔ تمہارے لیے میں ہفت خواں کی منزلیں طے کر سکتا ہوں۔ پہاڑوں سے ٹکرا سکتا ہوں۔ تم تو بے آب و گیاہ صحراؤں اور تپتے ہوئے ریگستانوں میں مسکراتی رہی ہو، قیمتی موتیوں کو کیوں ضائع کر رہی ہو؟"

"تم نے مجھے سب کچھ دیا۔ اپنا پیار۔ اپنی رفاقت۔"

الجائی خاتون جذباتی ہو گئی:

"یہ آرزو بھی پوری کر دو۔ میرا بھائی امیر حسین خود سر ہے۔ ضدی ہے مگر میرا بھائی ہے۔ اس کی خطا درگذر کرو۔ اسے معاف کر دو میرے سرتاج۔ میری روح کو آزاد کر دو۔ اس کرب سے مجھے نجات دلا دو۔"

الجائی نے آسمان کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی:

"یہ لکا لے ابر، بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، درخشاں ماہتاب کو اپنی آغوش میں لینا چاہتے ہیں۔ اس کی تابانی کو سیاہ چادر میں سمیٹنا چاہتے ہیں۔ تم روشن ماہتاب ہو میرے سرتاج! امیر حسین تم پر قابو نہیں پا سکتا۔ تم اس پر قابو پاؤ گے۔ اسے اسیر کرو گے۔ وعدہ کرو کہ تم اسے قتل نہیں کرو گے؟"

الجائی خاتون کی آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے۔

"الجائی!"

تیمور نے الجائی کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا:

"میں نے اسے قتل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے بلخ و درخشاں مانگا۔ میں نے اعتراض نہیں کیا۔ قرشی جیسے مضبوط قلعہ کے لیے ضد کی۔ میں نے انکار نہیں کیا۔ وہ غزنی کا حاکم تھا، چاہے تو غزنی بھی اسے دے سکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے سرتاج!"

الجائی اب بھی چمکتے چاند کو دیکھ رہی تھی:

"میں دیکھتی رہی ہوں اور اب بھی دیکھ رہی ہوں۔ امیر حسین برابر غلطیاں کر رہا ہے۔ پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ ...رے ہاتھ سے قتل نہ ہو اور نہ تمہارے حکم سے قتل کیا جائے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ قول دیتا ہوں۔" تیمور نے وعدہ کر لیا۔

تیمور نے رات جو خواب دیکھا تھا، اپنے سرداروں اور ساتھیوں کے سامنے بیان کر دیا۔

ہر شخص دم بخود بیٹھا بڑی توجہ اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اس وقت اس کے خیمے میں خواب سننے کے لیے ...نے سب ہی سردار بیٹھے تھے۔ پرانے وفاداروں میں جاکو برلاس، امیر الات، طرخان ایلچی بہادر اور شیر بہرام ...نے امیر جن کی وفاداریاں اور تعاون تیمور کو پچھلے چھ سال میں حاصل ہوتی تھیں ان میں ...بتہ سیبہ سالار بلک ...ئمر بیٹا بیان اور دوسرا ملک خطا کا امیر جغطائی بہادر تھا۔ جغطائی بہادر ہر وقت چمڑے کا کوٹ پہنے رہتا تھا، ...ا کی پشت پر گھوڑے کی ایال لٹکتی رہتی تھی۔ یہ دونوں مغل شہزادے تھے جنہوں نے مغلوں کی شکست کے ...بعد سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

ایک اور مغل سردار منگلی بوغا بھی تیمور کا حلیف بن گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر اسے چھ ہزار کا ...دے دیا جائے تو وہ تیمور کو زندہ گرفتار کر سکتا ہے لیکن جب مغل خاقان الیاس خواجہ خان شکست کھا کر شمال ...ب بھاگ گیا تو ایک دن یہی خانہ بدوش مغل سردار، تیمور کے خیمے پر پہنچا۔ تیمور اسی طرح دربار لگائے بیٹھا ...لی بوغا گھوڑے سے اترا۔ اور بغیر اپنا تعارف کرائے تیمور کے سرداروں میں بیٹھ گیا۔ اب وہ یہ کہتا تھا کہ ...ا نمک کھا چکا ہوں کسی اور طرف کا رخ نہ کروں گا۔

سرداروں نے تیمور کی بھرائی ہوئی آواز سے یہ اندازہ لگا لیا کہ تیمور پر اس خواب کا بڑا گہرا اثر ہوا ہے۔ تمام امیر حسین کے سخت مخالف تھے اور اس کے خاتمے کے درپے تھے۔ امیر حسین شکست پر شکست کھاتا، پسپا ...ہا جا رہا تھا۔ اس کے بہت سے امیر اور سردار اس کا ساتھ چھوڑ کے تیمور کے پاس آ گئے تھے لیکن عقل کا دشمن امیر ...ب تک اسی طرح اکڑا ہوا تھا اور سمرقند کی حکومت کو اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔

تیمور نے خواب بیان کر کے سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر عمر رسیدہ امیر جاکو برلاس نے سکوت کو توڑا:

"اے تاتاری قوم کے عظیم رہنما! خاتون آغا الجائی خاتون وہ عظیم خاتون تھیں جن کی تمام زندگی آپ کے ساتھ جنگ میں گزری۔ وہ ہمارے لیے قابلِ احترام تھیں۔ انہوں نے آپ سے کوئی وعدہ لیا ہے تو آپ اسے ضرور ...دیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

جاکو برلاس نے تیمور کی خوشنودی کے لیے یہ کہہ تو دیا لیکن وہ جانتا تھا کہ تیمور کے تمام سردار اور امیر—

امیر حسین کے خون کے پیاسے ہیں اور ان میں سے جس کے ہاتھ بھی امیر حسین پڑ گیا، وہ اس کے ہا
گا۔ خود تیمور کو بھی اس بات کا علم تھا۔ اُس وقت بھی اسے سرداروں کے تیور سے اندازہ ہو گیا تھا کہ
برلاس کی بات پسند نہیں آئی۔

"اے تاتاری قوم کے بہادر سپوتو!"

تیمور نے سرداروں کا غصہ کم کرنے کے لیے کہا:

"بے شک تم نے میری جدوجہد آزادی میں بھرپور تعاون کیا ہے اور اب بھی تم وفاداری کا
میں نے الجائی خاتون سے عالم رویا میں جو وعدہ کیا ہے اس وعدے اور عہد کی میں تمہارے سامنے تجد
اور اعلان کرتا ہوں کہ اگر امیر حسین گرفتار ہو کے میرے سامنے پیش کیا گیا تو میں نہ تو اسے اپنے ہاتھ
گا اور نہ اس کے قتل کا حکم دوں گا۔ تم لوگ گواہ رہو اور دعا کرو کہ الجائی خاتون کی روح کو میرے اس
سکون اور اطمینان حاصل ہو۔"

"ہم سب دعا کرتے ہیں سردار۔" جاکو برلاس نے بات ختم کرنے کے لیے سب کی طرف سے کہا۔

"اس تجدید عہد کے بعد میں چاہتا ہوں کہ امیر حسین کو صلح کا پیغام بھیجوں۔"

تیمور کی زبان سے یہ نکلنا تھا کہ سرداروں کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے۔

"سردار یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

منگلی بوغا بگڑ کر بولا:

"آپ اسے صلح کا پیغام کیوں بھیجیں۔ شکست امیر حسین کھا رہا ہے۔ اسے چاہیے کہ گلے میں ہا
کے سامنے پیش ہو اور آپ سے جان بخشی کی درخواست کرے۔"

"اور کیا سردار!"

امیر خطا خطائی بہادر اپنی بیٹھو پر گھوڑے کی ایال ٹٹولتے ہوئے بولا:

"اگر وہ آنے میں لیس و پیش کرے تو ہمیں حکم دیجیے ہم اسے گھوڑے کی دم سے باندھ کے لا
"سردار! آپ نے اسے بہت معافیاں دی ہیں!"

شیخ علی بہادر نے اپنا غصہ دکھایا:

"جب تک امیر حسین زندہ ہے ملکِ تاتار میں امن و امان نہیں ہو سکتا۔ میں تو اس کی گردن ا
دوں گا سردار!"

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا علی بہادر۔" تیمور نے اسے ٹھنڈا کیا: "ہمیں الجائی خاتون سے کیا ہوا

پہلے کوشش کرنا ہو گی جس سے امیر حسین مطیع ہو کر راہِ راست پر آ جائے۔ میں اسے غزنی کی حکومت پیش کرتا
ہوں۔"

"سردار!"

بیک جلک کے بیٹے بیان کا خون کھول اٹھا:

"غزنی اور قندھار آپ نے بزورِ شمشیر فتح کیا ہے۔ امیر حسین کا اب اس پر کوئی حق نہیں۔ اس کی بادشاہت
تو پہلے ہی مغلوں نے الٹ دیا تھا۔"

"تحمل سے کام لو بیان۔"

تیمور نے کہا:

"میں نہیں چاہتا کہ تاتاری، تاتاری سے لڑتا رہے۔ اس لیے مزید خانہ جنگی سے بچنے اور ملک میں امن و امان کی
ہمیں غزنی کی حکومت امیر حسین کو واپس کرنا پڑے تو یہ سودا مہنگا نہ پڑے گا۔"

پھر ذرا رک کر تیمور نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا:

"میں شیر بہرام کو امیر حسین کے پاس بھیج رہا ہوں۔ شیر بہرام پہلے بھی امیر حسین سے مل چکے ہیں۔"

تیمور نے فیصلہ کر دیا تھا اس لیے کسی کو دخل دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ تیمور اپنے سرداروں سے مشورہ ضرور کرتا مگر
وہ کوئی فیصلہ کر دیتا تو پھر کسی کو بولنے کی اجازت نہ تھی۔

تیمور کے ساتھ پرانا قاصد ایلچی بہادر بھی تھا جو کئی بار سفارتی فرائض انجام دے چکا تھا لیکن شیر بہرام کو اس نے
منتخب کیا کہ اس میں ایلچی بہادر کی بہ نسبت زیادہ بردباری پائی جاتی تھی۔

تیمور نے شیر بہرام کو اپنا قاصد بنا کے امیر حسین کی طرف روانہ کیا۔ امیر حسین نے دریائے آمو کی طرف پسپائی
کی تھی اس لیے شیر بہرام نے ادھر ہی کا رخ کیا۔ شیر بہرام کے ساتھ چار سوار تھے۔ ان سب نے نیزوں پر سفید
پٹیاں باندھ لیے تھے تاکہ امیر حسین کے چھپے ہوئے آدمی ان پر حملہ نہ کر دیں۔

تیمور نے لشکر کو ایک ہفتہ آرام کرنے کا حکم دیا تھا۔ ہفتہ کے اختتام پر اس نے بھی کوچ کیا اور آہستہ
دریائے آمو کی طرف چل دیا۔

تیمور اور امیر حسین کی خانہ جنگی نے تاتاریوں کو بہت نقصان پہنچایا لیکن ملکِ تاتار میں اس ابتری کے باوجود
منگول کے خانِ اعظم کی ہمت نہ ہوئی کہ تاتاری علاقوں کی طرف نظر اٹھائے۔ انہیں تیمور کے پیکر میں ایک ایسا تاتاری
نظر آیا تھا جس سے مقابلہ اب ان کے لیے ممکن نہ رہ گیا تھا۔ انہیں تو اپنے علاقوں کی فکر پڑ گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے
اور امیر حسین کی خانہ جنگی طویل ہوتی رہے تاکہ تیمور اُن کی طرف رخ نہ کر سکے۔

تیمور کو صرف امیر حسین ہی سے نہیں نمٹنا تھا بلکہ اسے ازبکوں کی بھی فکر تھی جو الیاس خواجہ کے
ساتھ ہی اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار بن بیٹھے تھے۔ یہ سب ماوراالنہر کے بڑے بڑے قلعوں
تیمور کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ ان لوگوں سے قلعے کس طرح خالی کرائے جائیں۔ اگر ان پر فوج کشی کی گئی تو
سکتا تھا اور زیادہ جانی نقصان کا بھی امکان تھا۔ چنانچہ تیمور نے ان قلعوں پر قبضے کے لیے ایک
چال چلی۔

اس نے تمام قلعہ داروں کو الیاس خواجہ خان کی طرف سے ایک حکم نامہ لکھا جس میں انہیں تاکید
بلادِ شمال میں مغلوں کے مستقر حصار المالیق میں حاضر ہو کر الیاس خواجہ خان سے تازہ ہدایات حاصل کر
یہ خطوط تیمور نے الگ الگ سب قلعداروں کو بھجوائے۔ پھر چند لشکر ان قلعوں کی طرف روانہ
دیا کہ ہر قلعے کے سامنے پہنچ کر خوب گرد اڑائے اور قلعے والوں کو ہراساں کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
کے حملے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ بلادِ شمال سے طلبی کا پروانہ ان کو پہنچ چکا تھا اس لیے انہوں نے بہتر
تیمور سے الجھنے کے وہ الیاس خواجہ خان کے پاس چلے جائیں۔

ان ازبکوں نے فوراً قلعے خالی کر دیے اور شمال کی طرف چلے گئے۔ تیمور نے اپنی حکمتِ عملی
ماوراالنہر کے تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

تیمور جب دریائے آمو کے کنارے اس مقام پر پہنچا جہاں امیر حسین کے لشکر کی موجودگی
دی گئی تھی تو اسے معلوم ہوا کہ امیر حسین اپنے لشکر کے ساتھ کئی ہفتے پہلے بلخ کی طرف چلا گیا ہے۔
شیر بہرام اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

یہ سوچ کر تیمور نے دریائے آمو کے کنارے خیمے لگا دیے اور شیر بہرام کی واپسی کا انتظار
یہ خیال ٹھیک تھا۔ شیر بہرام بھی اس مقام تک پہنچا تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ امیر حسین یہاں
قریب پہاڑیوں میں خیمہ زن ہے تو وہ بغیر رکے اس طرف روانہ ہو گیا۔

○

شیر بہرام پہاڑی علاقے میں ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہا تھا کہ اسے امیر حسین کے آدمی
نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ ان گھاٹیوں اور پہاڑیوں کو امیر حسین کا لشکر گھیرے ہوئے ہے اور

خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

شیر بہرام کو امیر حسین کا کوئی آدمی نہ پہچانتا تھا لیکن جب شیر بہرام نے یہ بتایا کہ وہ تیمور کی طرف سے صلح
کا پیغام لایا ہے اور اسی سلسلے میں امیر حسین سے گفتگو کرنے جا رہا ہے تو امیر حسین کے آدمیوں نے اس کی
رہنمائی کی اور انہیں امیر حسین کی طرف لے چلے۔

شیر بہرام پورا ایک دن پہاڑ کی مختلف گھاٹیوں میں سفر کرتا رہا۔ پھر پہاڑی سلسلہ ختم ہوا اور دوسرے
دن شام کو وہ میدانی سفر کر کے امیر حسین کے لشکر میں پہنچ گیا۔

امیر حسین کو شیر بہرام کی آمد کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ گھاٹی کے محافظ دستوں کے سردار نے ایک تیز رفتار
قاصد کے ذریعے امیر حسین کو یہ خبر بھجوا دی تھی۔

امیر حسین کو اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی تھی اور اس نے اپنے سرداروں میں ڈینگیں مارنا شروع کر دی تھیں کہ تیمور اس سے
دب کر صلح کرنا چاہتا ہے۔

○

امیر حسین کی حسین و جمیل بیوی دلشاد آغا کو شوہر سے بڑی محبت تھی۔ اس نے جوانی کے چند سال بڑی شان
سے گزارے تھے۔ امیر حسین غزنی کا حکمران تھا اور دلشاد آغا ملکۂ غزنی۔ پھر جب مغلوں نے شمال سے یلغار کی تو غزنی کی
چھوٹی سی ریاست خس و خاشاک کی طرح بکھر کے رہ گئی۔ اس میں کچھ امیر حسین کی جلد بازی کو بھی دخل تھا۔ امیر حسین
جتنا بہادر تھا اتنا ہی جلد باز اور ضدی بھی تھا۔ اس نے مغلوں کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا اور ان پر حملہ کر دیا۔ جب سے
وہ در بدر پھر رہا تھا۔ اس صحرا نوردی اور غریب الوطنی میں دلشاد کا حسن کچھ کملا گیا تھا۔ امیر حسین اگر تیمور کے ساتھ قدم
ملا کر چلتا تو بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا کیونکہ اس کی سگی بہن الجائی خاتون تیمور کی بیوی تھی لیکن اس پر سمرقند کی
وشاہت کا بھوت سوار ہو گیا اور اس نے تیمور کے ساتھ جنگ شروع کر دی۔

دلشاد آغا اس خانہ جنگی کی شروع ہی سے مخالف تھی لیکن امیر حسین نے اسے کم عقل کہہ کے خاموش کر دیا تھا۔
حالانکہ دلشاد بڑی سمجھدار عورت تھی۔ اس نے تیمور کی اہلیت اور طاقت کا بالکل صحیح اندازہ کیا تھا۔ اسے یہ محسوس ہو رہا
تھا کہ تیمور ایک دن ضرور ملکستاتار کا امیر بنے گا اور جب سے مغل شکست کھا کر شمال کی طرف پسپا ہو گئے تھے اس کا
یہ احساس یقین میں تبدیل ہو گیا تھا۔ امیر حسین شکست پر شکست کھا رہا تھا لیکن ہٹ دھرمی نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ

اب بھی خود کو سمرقند کا بادشاہ سمجھتا تھا۔

شیر بہرام کی خبر پاتے ہی وہ بھاگا بھاگا دلشاد آغا کے پاس گیا اور بڑے تبختر سے بولا:

"دلشاد۔ دیکھا تم نے۔ تیمور نے آخر گھٹنے ٹیک دیے۔ اب وہ صلح پر آمادہ ہے"۔

"تیمور اور تم سے صلح؟"

دلشاد جل کر بولی:

"کہیں خواب تو نہیں دیکھا تم نے؟"

"دلشاد۔ مجھے تم سے یہی شکایت ہے"۔

امیر حسین بگڑ گیا:

"تم نے میری عظمت کا کبھی اعتراف نہیں کیا۔ کیا میں بہادر نہیں۔ میں امیر قزغن کا بیٹا نہیں۔ مرز کیا میرا حق نہیں؟"

"امیر حسین! تم بہادر ہو اور مجھے ایک بہادر کی بیوی ہونے پر فخر ہے"۔

دلشاد نے سچے دل سے اعتراف کیا:

"یہ بھی صحیح ہے کہ تم امیر قزغن کے بیٹے ہو لیکن سمرقند کے تخت کا وہ حقدار ہے جس کے پاس طاقت جس کی تلوار میں زور ہے اور جس کے ساتھ تاتاری سرداروں کی اکثریت ہے۔ طاقت کا توازن تیمور کے حق وہ ہم پر فتح پا رہا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم خود دوستی کا ہاتھ اس کی طرف بڑھائیں۔ تیمور دل کا برا نہیں۔ وہ بہادروں کا قدر دان ہے"۔

"تم مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہو دلشاد"۔

امیر حسین کے تن بدن میں آگ لگ گئی:

"طاقت میرے پاس بھی ہے۔ اب بھی چھ ہزار سوار میرے ساتھ ہیں۔ بلخ میں اس سے زیادہ سوار برا رہے ہیں۔ تیمور کی طاقت اب ختم ہو چکی ہے۔ وہ اس طویل جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا اسی لیے اب وہ مجھ سے صلح چاہتا ہے"۔

"تو پھر مجھ سے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ صلح کر لو"۔

دلشاد نے زہرخند کیا:

"میں تو شروع ہی سے خانہ جنگی کے خلاف ہوں۔ ہم نے ایک دوسرے کا خون بہا کے کیا پایا؟ ملک لٹ گیا۔ آخر نقصان کس کا ہوا؟ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں؟"

"مجھے کوئی افسوس نہیں!"

امیر حسین نے منہ بنایا:

"تخت و تاج کے لیے تو جنگ ہوا ہی کرتی ہے۔ اگر تلواریں نیام میں ڈال لی جائیں تو زنگ آلود ہو جاتی ہیں سپاہی خون بہتا ہوا نہ دیکھیں تو بزدل ہو جاتے ہیں۔ تیمور نے میری شرط مان لی تو میں ضرور صلح کر لوں گا ورنہ یہ جنگ یونہی جاری رہے گی"۔

"تم نے صلح کی کیا شرط پیش کی ہے؟" دلشاد آغا مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں اب بھی دل کشی تھی۔

"میں سمرقند کا بادشاہ اور تاتاریوں کا امیر ہوں گا اور تیمور میرا سپہ سالار"۔

امیر حسین گردن اکڑا کر بولا:

"میری یہی شرط ہوگی۔ صلح صرف اسی شرط پر ہو سکتی ہے"۔

"سردار تیمور نے تمہاری شرط کا کیا جواب دیا ہے؟" دلشاد نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ابھی سوال جواب کا وقت نہیں آیا"۔

امیر حسین نے وضاحت کی:

"ہمارے محافظوں نے صرف اتنی خبر دی ہے کہ شیر بہرام صلح کا پیغام لے کر میرے پاس پہنچ رہا ہے۔ شیر بہرام ابھی راستے میں ہے اور تم نے شرطیں بھی طے کر لیں"۔

دلشاد ناگواری سے بولی:

"امیر حسین! تیمور اس قدر بے وقوف نہیں کہ تمہیں سمرقند کا حاکم تسلیم کر لے۔ پھر ایسی صورت میں جبکہ وہ فاتحانہ بلخ کی طرف بڑھ رہا ہے اور ہمارا لشکر مسلسل پسپا ہونے پر مجبور ہے"۔

"تمہارے وسوسوں اور اندیشوں ہی نے مجھے تباہ کیا ہے"۔

امیر حسین کو غصہ آ گیا:

"تم اپنے شوہر کی طرفداری کرنے کی بجائے ہمیشہ تیمور کی حمایت کرتی ہو"۔

"امیر حسین!"

دلشاد کو بھی غصہ آ گیا:

"تم میری وفاداری پر شک کرتے ہو۔ کیا میں نے قدم قدم پر تمہارا ساتھ نہیں دیا۔ میدانِ جنگ میں تمہارے گھوڑے سے گھوڑا ملا کر نہیں لڑی۔ میں نے حقیقت بیان کی ہے۔ یہ کوئی وسوسہ یا اندیشہ نہیں۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ شیر بہرام واقعی صلح کا پیغام لے کر آ رہا ہے"۔

لیکن جب اسی شام شیر بہرام اپنے چار سواروں کے ساتھ نیزوں پر سفید کپڑا چڑھائے اٹھا رکھی
پاس پہنچ گیا تو دلشاد کو اپنے اندازے پر افسوس ہوا۔ وہ سخت متعجب تھی کہ تیمور نے یہ کمزوری کیوں
ایک فاتح نے شکست خوردہ دشمن کے پاس صلح کا پیغام کیوں بھیجا؟ تیمور کو کیا مجبوری تھی کہ جس نے
امیر حسین سے صلح پہ آمادہ کر دیا؟

امیر حسین نے شیر بہرام کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا اسے گلے سے لگایا اور بڑی عزت سے
اسے ایک خیمے میں ٹھہرایا۔

پھر وہ ہنستا ہوا دلشاد آغا کو خبر دینے یا اسے جھٹلانے آیا:

"شیر بہرام آ گیا ہے دلشاد!" امیر حسین کے لہجے میں طنز کے نشتر بھرے تھے۔

"مجھے معلوم ہے"۔ دلشاد آغا نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"اس کے نیزے پر سفید کپڑا چڑھا ہوا ہے"۔ امیر حسین نے طنز کا ایک اور تیر چلایا۔

"خدا کا شکر ادا کرو امیر حسین"۔

دلشاد آغا بڑے خلوص سے بولی:

"صلح کا ایک سنہرا موقع ہاتھ آیا ہے اسے ضائع مت کر دینا"۔

"اب تم دیکھتی جاؤ۔ میں کیا کرتا ہوں"۔

امیر حسین آپے ہی آپ اکڑ گیا:

"میں تیمور سے اپنی شرط منوا کے رہوں گا۔ شیر بہرام مجھ سے بہت حد تک جھک کے ملا ہے۔ یہ
کمزوری کا اظہار ہے"۔

"اس قدر پر امید نہ ہو امیر حسین"۔

دلشاد نے ناصحانہ انداز میں کہا:

"بہت سنبھل کے گفتگو کرنا شیر بہرام سے۔ شیر بہرام تاتاری سردار ہی نہیں وہ تیمور کا گہرا دوست
وہ بڑا جہاندیدہ ہے اور ہماری کمزوریاں بھی اس سے پوشیدہ نہیں"۔

"تمہارا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہو گا"۔

امیر حسین نے تمسخر سے کہا:

"ہماری کمزوریاں اپنی جگہ لیکن تیمور کا صلح کے لیے اس قدر بے چین ہونا، اس کی کمزوری ظاہر کرتا
امیر حسین نے چار دن تک شیر بہرام سے کوئی گفتگو نہ کی البتہ اس کی خاطر مدارات میں کوئی

شیر بہرام خیمے میں پڑے پڑے تنگ آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ امیر حسین بات چیت سے کیوں
گریز کر رہا تھا؟

دلشاد آغا بھی امیر حسین کے رویے سے خوش نہ تھی، . . . . اسے امید کی ایک جھلک دکھائی دی تھی، مگر امیر حسین پتہ نہیں گفتگو سے کیوں کترا رہا ہے؟

اس سے نہ رہا گیا تو ایک دن پوچھ بیٹھی:

"شیر بہرام کو خیمے میں کیوں قید کر رکھا ہے؟ اس سے گفتگو کیوں نہیں کرتے؟"

"تم نہیں سمجھو گی اس حکمت عملی کو"۔

امیر حسین نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا:

"شیر بہرام کو جتنا انتظار کرایا جائے گا اتنا ہی اس پہ ہمارا رعب پڑے گا"۔

"تمہاری اس بے التفاتی نے پتہ نہیں اس پہ کیا اثر کیا ہو گا؟ تم آج اس سے ضرور ملاقات کرو"۔

"دیکھو دلشاد۔ میں نے تمہیں کئی بار منع کیا ہے کہ تم میرے معاملات میں دخل نہ دیا کرو"۔

امیر حسین چڑ کے بولا:

"تم ان باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ میں اپنی طرف سے کیوں ظاہر کروں کہ میں صلح کے لیے بے چین ہوں۔
اس کا مطلب ہے کہ شیر بہرام یہیں پڑا رہے"۔

دلشاد نے الجھتے ہوئے کہا:

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے سلوک سے بد دل ہو کر واپس چلا جائے"۔

"واپس چلا جائے اور میرے پاس رہے؟"

امیر حسین کی تیوریوں پر بل پڑ گئے:

"ہاتھ آئے ہوئے دشمن کو چھوڑا نہیں جاتا"۔

"کیا کہا . . . . کیا کہا تم نے؟"

دلشاد چونک پڑی:

"کیا تم اسے قید کر دو گے؟ مجھے تم سے اتنی بڑی غلطی کی امید نہیں"۔

"صرف قید ہی نہیں دلشاد آغا"۔

امیر حسین نے اسے گھورتے ہوئے کہا: "اگر شیر بہرام نے میری اطاعت قبول نہ کی تو اسے قتل بھی

کیا جاسکتا ہے"۔

"امیر حسین!"

دلشاد آغا کمر پر ہاتھ رکھ کے اس کے سامنے کھڑی ہوگئی:

"ہم نے اب تک بہادروں کی طرح مصائب برداشت کیے ہیں۔ میں بزدلی کا داغ چہرے پر نہیں لا
تم ایسا نہیں کرسکتے"۔

امیر حسین نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا:

"یہ جنگ ہے دلشاد آغا۔ اس کے معاملات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتے۔ مجھے تمہارے مشورے
ضرورت نہیں"۔

امیر حسین چلا گیا۔

دلشاد آغا پیچ و تاب کھاتی رہ گئی۔

آج پہلی مرتبہ امیر حسین کے خلاف نفرت کا ہلکا سا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔ امیر حسین کے جانے
نے اپنی کنیزِ خاص کے ذریعے شیر بہرام کے پاس کہلا بھیجا کہ وہ امیر حسین سے محتاط رہے اور گفتگو
فوراً کسی بہانے یہاں سے نکل جائے۔

شیر بہرام کے دل میں پہلے ہی بدگمانی پیدا ہوگئی تھی۔ دلشاد آغا کے پیغام نے اس بدگمانی میں اضا
کردیا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ تیمور کا پیغام دیے بغیر واپس بھی نہ جاسکتا تھا۔

شیر بہرام کو اپنی زیادہ فکر نہ تھی لیکن وہ امیر حسین سے جلد از جلد گفتگو کرکے سردار تیمور کو اس کے
سے آگاہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ امیر حسین کے جواب کی روشنی میں آئندہ قدم اٹھائے۔ اس نے مزید انتظار کے بجا
پہریدار کے ذریعے امیر حسین کو اطلاع دی کہ اگر شیر بہرام سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا تو اسے واپسی
کی اجازت دی جائے۔

امیر حسین، شیر بہرام کا پیغام ملتے ہی ملاقات پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے شیر بہرام کو اپنے خیمے میں

"امیر محترم! یہ کون سی مہمان نوازی ہے۔ میں ایک ہفتے سے آیا پڑا ہوں اور آپ نے مجھ سے بات

شیر بہرام خیمے میں داخل ہوتے ہی بغیر دعا سلام کے شروع ہوگیا:

"میں کوئی ایسا گرا پڑا نہیں ہوں۔ میں نہ اپنی ضرورت سے آیا ہوں اور نہ مجھے آپ سے کچھ لی
سردار تیمور کا پیغام لایا ہوں۔ وہ تاتاریوں کے بہت بڑے سردار ہیں۔ آپ کو ان کا پیغام فوراً
چاہیے تھا"۔

امیر حسین نے کئی بار بولنے کی کوشش کی لیکن شیر بہرام نے دل کی بھڑاس نکالنے سے پہلے اسے بولنے کا موقع
نہیں دیا۔

شیر بہرام خاموش ہوا تو امیر حسین مسکرا کے بولا:

"شیر بہرام۔ تیمور بڑا ہو یا نہ ہو لیکن تم بڑے سردار ضرور ہو"۔

امیر حسین نے اپنے منصوبے کے تحت جال بچھانا شروع کیا:

"میں نے تم سے اس لیے ملاقات نہیں کی کہ میں چاہتا تھا کہ تم اچھی طرح آرام کرلو۔ آخر اتنی دور کا سفر
کرکے آئے ہو"۔

"میرے آرام کو چھوڑیے امیر"۔

شیر بہرام بات کاٹ کر بولا:

"میں سردار تیمور کا پیغام لایا ہوں۔ اسے سنیے اور مجھے رخصت کیجیے۔ میں کاہل بننا نہیں چاہتا"۔

"پیغام بھی سن لیا جائے گا اور گفتگو بھی ہوگی مگر اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

امیر حسین نے ٹالنے کے انداز میں کہا:

"پہلے یہ بتاؤ شیر بہرام! تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"آپ کا شکریہ امیر!"

بہرام اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا:

"تاتاری کو گھوڑے کی پیٹھ سے زیادہ کہیں آرام نہیں ملتا۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ . . . آپ بھی
تو تاتاری ہیں"۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو شیر بہرام"۔

امیر حسین سوچتے ہوئے بولا:

"لیکن تم ایک معزز مہمان ہو۔ تاتاریوں میں تمہیں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ دراصل مجھے تیمور کی یہ
حرکت پسند نہیں آئی"۔

"حرکت۔ کیسی حرکت؟"

شیر بہرام نے اسے چونک کر دیکھا:

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"دیکھو شیر بہرام! میرے دل میں تمہاری بڑی عزت ہے"۔ امیر حسین نے بظاہر بڑی سادگی سے کہا:

"تم تاتاریوں کے ایک بڑے سردار ہو۔ تیمور کو کیا ضرورت تھی کہ وہ تمہیں اپنا قاصد بنا کر بھیجتا۔ میں چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ تم میرے سردار ہوتے تو میں یہ معمولی کام تمہارے سپرد نہ کرتا"۔

"اے امیر! آپ تو اجنبیوں جیسی باتیں کرتے ہیں"۔

شیر بہرام نے اسے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا:

"کیا آپ تاتاری نہیں۔ ہم تاتاریوں کا طریقہ ہے کہ جب ہم کسی کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں تو اپنے اختیارات اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ تیمور ہمارے سردار ہیں۔ انہیں اختیار ہے خواہ وہ ہمیں میدان میں لڑائیں یا سفیر و قاصد بنا کر بھیجیں۔ پتہ نہیں آپ قاصد کو کمتر کیوں سمجھتے ہیں؟ قاصد تو اپنے سردار کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے سردار کی زبان سے بولتا ہے۔ اگر وہ غلطی سے بھی کوئی فیصلہ کر لے تو سردار اسے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے"۔

"میرا یہ مقصد نہیں، شیر بہرام"!

امیر حسین نے دیکھا کہ اس پر تو الٹا اثر ہوا ہے تو فوراً بات بدل دی:

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ کام تم سے کسی کم تر درجے کے سردار کو بھی تو دیا جا سکتا تھا۔ خیر چھوڑو کو۔ یہ بتاؤ کہ تم خیریت سے رہے۔ تمہارے قبیلے والے تو ٹھیک ٹھاک ہیں"؟

"واہ امیر! آپ نے تو کمال کر دیا"۔

شیر بہرام کو اور زیادہ حیرت ہوئی:

"آپ تو یوں پوچھ رہے ہیں جیسے آپ میدان جنگ کے بجائے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور میں یہاں مہمان آیا ہوں۔ میں سردار تیمور کی طرف سے صلح کا پیغام لایا ہوں، اس کے بارے میں آپ مجھ سے کچھ نہیں پوچھتے؟"

"وہ اہم بات نہیں"۔

امیر حسین نے لاپرواہی دکھائی:

"کیا صلح ضروری ہے؟ آخر تیمور صلح کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہے؟"

"یہ تو میں نہیں کہتا کہ وہ بے چین ہیں؟"

شیر بہرام ناگوار لہجے میں بولا:

"لیکن اس خانہ جنگی اور تاتاریوں کا بلاوجہ خون بہنے سے کم از کم میں بے چین ضرور ہوں اور اگر امیر! آپ پرخلوص دل سے غور کریں گے تو آپ بھی بے چین ہو جائیں گے"۔

امیر حسین نے دیکھا کہ یہ تو الٹا ہی گلے پڑ رہا ہے تو اکھڑتے ہوئے پُرغرور انداز میں پوچھا:

"اچھا بیان کرو۔ تیمور کیا چاہتا ہے؟ کن شرائط پر صلح کرتا ہے؟ مگر بات کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لو کہ سمرقند کی حکومت میری ہے، اس پر میرا حق ہے۔ میں امیر قزغن کا بیٹا ہوں"۔

"بیٹے نہیں۔ آپ امیر قزغن کے پوتے ہیں"۔

شیر بہرام نے فوراً اصلاح کی:

"یہ ضرور ہے کہ امیر قزغن نے الجائی خاتون آغا کو ہمیشہ اپنی ہی اولاد سمجھا۔ اب اگر آپ پوتا ہونے کی حیثیت سے سمرقند پہ اپنا حق رکھتے ہیں تو پھر یہ خیال رکھیے کہ سردار تیمور، امیر قزغن کے داماد ہیں اور امیر قزغن کی پوتی الجائی خاتون، ان کی بیوی تھیں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں گے تو میں یہ کہوں گا کہ تخت و تاج کے لیے رشتہ داری کا سہارا لینا بے کار ہے۔ اس کے لیے تو ہمیں اپنی روایات پر عمل کرنا چاہیے"۔

"شیر بہرام! ہماری روایت بھی خون کے رشتوں کو تسلیم کرتی ہے"۔

امیر حسین نے بحث شروع کر دی:

"باپ کے بعد بیٹا اور بیٹے کے بعد پوتا۔ یہی سب سے قریبی رشتہ ہے!"

"امیر! آپ نے تاتاریوں کی مثل نہیں سنی؟"

شیر بہرام نے بے خوف ہو کر کہا:

"آپ زیادہ عرصہ غزنی میں رہے ہیں، ممکن ہے کہ یہ مثل وہاں مشہور نہ ہو لیکن ملک تاتار کا ہر مرد تسلیم کرتا ہے کہ وہی ہاتھ عنان حکومت سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں . . . . تخت کا فیصلہ تو تلوار ہی سے ہوتا ہے"۔

"کیا میں بزدل ہوں؟"

امیر حسین ایک دم بھڑک اٹھا:

"کیا میں تلوار پکڑنا نہیں جانتا؟ میں غزنی کا خود مختار بادشاہ رہ چکا ہوں۔ میں تیمور سے زیادہ حکومت چلانا جانتا ہوں"۔

"امیر! آپ کی بہادری شبہ سے بالاتر ہے"۔

شیر بہرام نے نرمی سے کہا:

"میں نے خود سردار تیمور کی زبان سے سنا ہے کہ آپ جیسے بہادر، تاتاریوں میں کم موجود ہیں۔ میں نے تو صرف آپ کی بات کا جواب دیا تھا۔ آپ کسی اور شبہ میں مبتلا ہو گئے"۔

امیر حسین کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ اس نے پوچھا:

"اچھا تم صلح کی شرط بتاؤ۔"

"شرط نہیں امیر۔ سردار تیمور نے بڑے خلوص سے آپ کو ایک پیش کش کی ہے۔"

شیر بہرام نے یہ کہہ کر اس کا غصہ اور بھی ٹھنڈا کر دیا۔ امیر حسین کے چہرے کی شکنیں دور ہو

اس نے کہا:

"سردار تیمور نے آپ کو آپ کی پرانی بادشاہت یعنی غزنی کی حکومت پیش کی ہے اور اعلان کیا ہے

آپ غزنی واپس چلے جائیں تو وہ آپ کو وہاں کا خود مختار بادشاہ تسلیم کر لیں گے۔ اس طرح خانہ جنگی ختم ہو

گی اور ہر دو حاکم اپنے اپنے علاقوں میں آزادی سے حکومت کریں گے۔"

امیر حسین نے یہ سنا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ تیمور اس سے

صلح نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس پیش کش کے پردے میں وہ اسے ملکِ تاتار سے بالکل بے دخل

حکم دے رہا تھا۔

امیر حسین بڑا متلون مزاج اور جلد باز تھا لیکن اس موقع پر خلافِ امید اس نے خود کو سنبھالا اور اپ

سے کسی قسم کا تاثر نہ ظاہر ہونے دیا۔

"تیمور کی شرط قابلِ غور ہے۔"

امیر حسین نے بڑے تحمل سے کہا:

"لیکن میری بھی کچھ شرطیں ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر معا

کریں۔ اگر تیمور پسند کرے تو میں اس سے ملاقات کے لیے تیار ہوں۔ یہ ملاقات کسی جگہ ہو سکت

"امیر! آپ جو فرماتے ہیں وہ اپنی جگہ درست ہے۔"

شیر بہرام متانت سے بولا:

"لیکن سردار تیمور نے مجھے اس سلسلے میں ہر قسم کی گفتگو سے منع کر دیا ہے۔ انہوں نے دا

کی ہے اور اس کا جواب بھی دو ٹوک "ہاں یا نہیں" میں مانگا ہے۔ . . . . آپ مجھے جواب دیجیے تاکہ

جواب سردار تیمور کو پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں مگر یہ جواب صرف ہاں یا نہیں میں ہو"

"جواب بھی مل جائے گا مگر تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔"

امیر حسین نے بڑی مکاری سے کہا:

"میں تیمور کی پیش کش اپنے سرداروں کے سامنے رکھوں گا اور جو فیصلہ وہ کریں گے اس سے تم

دیا جائے گا۔ اس فیصلے تک تم یہیں ٹھہرو گے۔ ہمارے مہمان رہو گے۔"

شیر بہرام کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن امیر حسین تیزی سے اٹھا اور بولا:

"تم جا کر آرام کرو۔ میں اپنے سرداروں کو مشورے کے لیے بلا رہا ہوں۔"

شیر بہرام کے بولنے کے لیے کوئی گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر خیمے میں آ گیا۔

امیر حسین کے خیمے کے ساتھ ہی دلشاد آغا کا خیمہ تھا۔ اس نے شیر بہرام سے امیر حسین کی پوری گفتگو

سن لی تھی۔ امیر حسین نے شیر بہرام کو تو کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا لیکن دلشاد آغا سمجھ گئی تھی کہ امیر حسین کے اس

غیر متوقع تحمل کے پیچھے ضرور کوئی طوفان چھپا ہوا ہے۔ شیر بہرام کے جانے کے بعد امیر حسین نے اپنے کسی سردار

کو نہیں بلوایا بلکہ تھوڑی دیر کے بعد وہ کسی اور خیمے میں چلا گیا۔ ممکن ہے یہ اس نے احتیاط کے طور پر کیا ہو

اور وہ نہ چاہتا ہو کہ دلشاد اس کے ارادے یا منصوبے سے واقف ہو سکے۔

امیر حسین رات تک واپس نہ آیا تو دلشاد کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔ اسے سب سے زیادہ

شیر بہرام کی فکر تھی۔ وہ اس لیے زیادہ فکرمند تھی کہ اگر امیر حسین نے شیر بہرام کو قتل کرنے کی غلطی کی تو پھر

تیمور، امیر حسین کو کسی صورت نہیں بخشے گا اور شیر بہرام کے خون کا بدلہ لے کر رہے گا۔

دلشاد نے اپنی خاص کنیز کو شیر بہرام کے خیمے پر بھیجا تاکہ معلوم ہو سکے کہ امیر حسین نے اب تک اس کے

خلاف کوئی قدم اٹھایا ہے یا نہیں؟

کنیز تھوڑی دیر بعد پریشان صورت بنائے واپس آئی اور بتایا کہ شیر بہرام کے خیمے پر پہرہ

لگا دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ آنے والے سواروں کو بھی اسی خیمے میں پہنچا دیا گیا ہے۔

دلشاد کو اسی بات کا دھڑکا تھا۔ اسے امیر حسین پر سخت غصہ آیا لیکن وہ مجبور تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس

نے اس سلسلے میں امیر حسین سے گفتگو کی تو بلاوجہ کی ناچاقی ہو گی اور نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ امیر حسین نے جو فیصلہ

کر لیا ہے وہ اس سے کسی طرح باز نہ آئے گا۔ چنانچہ جب رات گئے امیر حسین اپنے خیمے میں واپس آیا تو دلشاد

نے اس سے کوئی بات نہ کی اور یہی ظاہر کیا کہ جیسے وہ اس معاملے سے بالکل بے تعلق ہے۔

⊙

شیر بہرام کو قید ہوئے تین روز ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے۔ شیر بہرام کو

یقین ہو گیا کہ شیر بہرام کی گرفتاری سے امیر حسین فائدہ اٹھا کر کوئی زبردست چال چلنا چاہتا ہے، ممکن ہے اس سے تیمور کو نقصان پہنچ جائے۔ اس لیے وہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح تیمور کو امیر حسین کے ارادوں سے آگاہ کر دے۔

خیمے کے گرد سخت پہرہ لگا ہوا تھا اور وہاں سے رہائی یا فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اس قید سے بھاگنے کی کوشش کرے گا خواہ اس میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

اس نے جب اپنے ساتھیوں سے گفتگو کی تو انہوں نے مخالفت کی اور کہا۔ اگر یہاں سے فرار ہی ہونا ہے پھر شیر بہرام کے بجائے ان کے ساتھیوں میں سے کوئی فرار ہو تا کہ پکڑے جانے کی صورت میں شیر بہرام بچ جائے۔

شیر بہرام اپنے ساتھیوں کی وفاداری سے بہت خوش ہوا لیکن اس کا دل نہ مانتا تھا کہ اپنے کسی ساتھی کی قربانی دے۔

اس طرح دو دن گزر گئے اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

شیر بہرام خود جانے پر بضد تھا لیکن اس کے ساتھی اسے بھیجنے پر کسی طور راضی نہ ہوتے۔ آخر شیر بہرام کو مجبور ہونا پڑا۔ وہ ہر حالت میں تیمور کو امیر حسین کے ارادے سے باخبر کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک شب شیر بہرام نے پیٹ میں سخت درد کا بہانہ کیا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ پہرے دار گھبرا کر اس کے خیمے میں آ گئے۔ شیر بہرام کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس نے پہرے داروں کو باتوں میں لگا لیا۔ درد کا واویلا کرنے لگا۔ اسی وقت اس کا ایک ساتھی نظر بچا کر خیمے سے باہر نکلا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد شیر بہرام کا پیٹ درد ختم ہو گیا۔ اس نے پہرے داروں کا شکریہ ادا کیا۔ پہرے دار اپنی جگہ واپس چلے گئے۔ انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ خیمے کا ایک آدمی غائب ہو گیا ہے اور اب وہ امیر حسین کی لشکر گاہ کے آخری سرے پر پہنچ چکا ہے۔

○

امیر حسین کا مصالحتی وفد تیمور کے خیمے میں داخل ہوا۔ یہ وفد چار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ایک آدمی آگے، تین اس کے پیچھے تھے۔

آگے آنے والے کے سر پر کلامِ پاک رکھا ہوا تھا۔ مصحفِ آسمانی کو دیکھ کر تیمور کے جسم میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ اس کا آہنی بدن جیسے پگھل کر موم بن گیا۔ احترامِ قرآن کے لیے تیمور اور اس کے سردار کھڑے ہو گئے۔ تیمور نے آگے بڑھ کر کلامِ پاک لیا، آنکھوں سے لگا کر چوما۔ پھر ایک اونچی جگہ رکھ دیا۔

تیمور کے پاس شیر بہرام کا بھیجا ہوا سوار گزشتہ رات پہنچ گیا تھا۔ اس نے تیمور کو بتایا تھا کہ امیر حسین نے شیر بہرام کو قید کر لیا ہے اور اب وہ کوئی چال چلنا چاہتا ہے۔ اس لیے تیمور بھرا بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ اپنے سرداروں سے شیر بہرام کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔

شیر بہرام کی گرفتاری سے اس کے سردار بھڑک اٹھے تھے اور تیمور پر زور دے رہے تھے کہ فوراً امیر حسین کے مقابلے پر روانہ ہوا جائے اور اگر شیر بہرام کو قتل کر دیا گیا ہے تو اس کا سخت انتقام لیا جائے۔

تیمور کا خود بھی یہی ارادہ تھا کہ اسی دوران اسے امیر حسین کے مصالحتی وفد کے آنے کی اطلاع ملی۔ اسے امیر حسین پر غصہ بھی آیا اور اس کی دیدہ دلیری پر تعجب بھی ہوا لیکن وہ فوراً سمجھ گیا کہ امیر حسین نے ایک طرف تو شیر بہرام کو گرفتار کیا ہے اور دوسری طرف وہ اس وفد کے ذریعے کوئی جال بچھانا چاہتا ہے۔

شیخ علی بہادر اور امیر جغتائی بہادر نے پُر زور الفاظ میں مطالبہ کیا کہ وفد کے ارکان کو فوراً قتل کر دیا جائے لیکن جب امیر حسین کا وفد قرآن پاک ان کے سامنے لے کر آیا تو سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔

سردار تیمور نے وفد کے ارکان کو عزت سے بٹھایا اور اپنے تمام سرداروں کو باہر بھیج دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ اس کے سردار گفتگو کے دوران کہیں غصے میں آ کر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جس کے لیے اسے بعد میں پچھتانا پڑے۔

"میں نے امیر حسین کے پاس شیر بہرام کو صلح کا پیغام دے کر بھیجا تھا؟" تیمور نے بالکل انجان بن کر پوچھا اور وفد کے ارکان پر اپنے الفاظ کا تاثر تلاش کرنے لگا۔

وفد کے ارکان نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ان میں سے ایک بولا:

"اے سردار تیمور۔ شیر بہرام آپ کا پیغام لے کر ہمارے امیر کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ آپ کے اسی پیغام کا جواب لے کر ہم حاضر ہوئے ہیں۔"

"مگر شیر بہرام کہاں ہے؟ وہ واپس کیوں نہیں آیا؟" تیمور نے بڑے ضبط سے کام لیا لیکن پھر بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"شیر بہرام ہم تاتاریوں کے بڑے قابلِ احترام سردار ہیں۔" وفد کے دوسرے رکن نے سنبھل کر کہنا شروع کیا:

"ہمارے امیر بھی ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ دورانِ سفر شیر بہرام کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی تھی اس لیے امیر نے انہیں علاج کے لیے روک لیا ہے۔ آپ ان کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ وہ ہمارے امیر کے مہمان ہیں۔"

تیمور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا:

"امیر حسین نے ہماری پیش کش کا کیا جواب دیا ہے۔ اسے منظور ہے یا انکار کیا ہے؟"

"اے سردار تیمور۔ ہمارے امیر نے آپ کی پیش کش شکریے کے ساتھ منظور کر لی ہے۔" ایک رکن نے جواب دیا۔

تیمور نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے اس جواب کی قطعی امید نہ تھی۔ اس نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا:

"امیر حسین کب غزنی واپس جا رہے ہیں؟"

"ہمارے امیر اپنی واپسی کی تفصیلات طے کرنے کے لیے آپ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔"

وفد کے رکن نے کہا:

"انہوں نے کہا ہے کہ وہ آپ کی طرف دوستی اور وفاداری کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور کلام اللہ کو درمیان رکھ کر اعلان کرتے ہیں کہ اگر میں قول و قرار کو توڑ دوں تو اس مصحف کی مجھ پر مار پڑے اور جو سزا چاہے دی جائے۔ لہٰذا اگر ہو سکے اور آپ مناسب سمجھیں تو ان سے تفصیلات طے کرنے کے لیے چک چکن کے مقام پر تنہا ملاقات کریں تا کہ ہم نئے سرے سے نئے حالات میں قول و اقرار کر سکیں۔"

یہ امیر حسین کا کھلا ہوا فریب تھا۔

تیمور سمجھ گیا کہ امیر حسین اسے اس حیلے سے گرفتار کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ امیر حسین نے کلام اللہ کو درمیان میں ڈالا تھا اس لیے تیمور نے سب کچھ جانتے ہوئے مصحفِ قرآنی کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھا اور انتہائی دو ٹوک لہجے میں کہا:

"امیر حسین نے کلام اللہ کے واسطے سے گفتگو کی ہے اس لیے میں انکار نہیں کر سکتا۔ اس نے چک چکن کے مقام پر تنہا ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ میں اس کی خواہش ضرور پوری کر دوں گا۔ تم واپس جاؤ اور اطلاع دو کہ وہ چک چکن پر میرا انتظار کرے۔ میں وہاں تنہا پہنچ رہا ہوں۔"

امیر حسین کے وفد کے ارکان کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ وہ دل ہی دل میں تیمور کے حوصلے کے قائل ہو گئے۔ انہیں یہ قطعی امید نہ تھی کہ تیمور اتنی جلدی امیر حسین سے ملاقات پر آمادہ ہو جائے گا۔ وفد کے ارکان تیمور سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان میں سے ایک نے کھلے الفاظ میں اس کا اعتراف کیا:

"اے سردار تیمور! ہماری نظر سے آپ جیسا حوصلہ مند انسان اب تک نہیں گزرا۔ آپ واقعی عظیم ہیں۔"

تیمور جواب دینے کے بعد گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا اور بولا:

"عظیم صرف خدائے بزرگ و برتر ہے۔ میں ایک ناچیز بندہ ہوں۔ میرا باپ سردار طرغائی برلاس جب مجھے نصیحت کرتا تو عام طور پر اپنی بات ان الفاظ پر ختم کرتا کہ اے تیمور! میری خواہش ہے کہ تم خدائے تعالیٰ کے احکام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شریعت پر رہ کر درویشوں اور بزرگوں کی دعائیں لیتے رہو اور ہمیشہ اسلام کے چار ارکان کے پابند رہو . . . . . میں اپنے باپ کی نصیحت پر ہمیشہ عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بلادِ شمال کے خانِ اعظم نے مجھے سمرقند میں اپنا نائب بنایا تھا لیکن تاتاریوں کی حالتِ زار دیکھ کر میں نے مغلوں کے خلاف تلوار اٹھائی اور انہیں ملکِ تاتار سے مار بھگایا۔ اب میں تاتاریوں کی ایک مضبوط حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں لیکن جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اسی طرح ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں ہو سکتے۔ میں نے امیر حسین کو اس کے لیے غزنی کی حکومت پیش کی ہے۔ اگر وہ مان لے گا تو خوش رہے گا اور اگر اس نے فریب دینے کی کوشش کی تو وہ اس سے بھی زیادہ خوار ہو گا۔ میں اسے تاتار سے ہی نہیں دنیا سے بھی بے دخل کر دوں گا۔"

"بے شک بے شک۔ سردار صحیح فرماتے ہیں۔" ایک نے تیمور کی تائید کی۔

"تم لوگ تھکے ہوئے ہو جتنے دن چاہو آرام کر سکتے ہو۔"

تیمور نے کہا:

"ہم تمہیں اپنا مہمان بنا کر روکنا نہیں چاہتے۔ تم جب چاہو ہمیں بغیر اطلاع دیے واپس جا سکتے ہو۔ تمہارا صحیفۂ بابرکت ہمارے پاس برکت کے لیے محفوظ رہے گا۔"

"آپ کا شکریہ سردار۔"

ایک رکن نے کہا:

"ہم صرف ایک دن آرام کرنے کے بعد واپس جائیں گے لیکن جانے سے پہلے آپ کو سلام کرنے ضرور حاضر ہوں گے۔"

تیمور نے وفد کے ارکان کو ایک کمرے میں بھیج دیا اور ان کی خاطر و مدارات کی خاص ہدایت کی۔ تیمور نے یہ بھی حکم دیا کہ وفد جس وقت بھی واپس جانا چاہے اسے قطعی نہ روکا جائے۔

تیمور کے سردار امیر حسین کے بھیجے ہوئے پیغام کو سننے کے لیے بہت بے چین تھے۔ انہیں خیال تھا کہ تیمور وفد سے گفتگو کرنے کے بعد انہیں بلا کر تمام باتوں سے آگاہ کرے گا لیکن تیمور نے انہیں شام تک

انتظار کے کرب میں مبتلا رکھا۔ پھر شام کو ہر سردار کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ سردار تیمور نے تمام سرداروں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔

اس نوید سے سرداروں کی تمام کلفت دور ہو گئی اور رات کے کھانے پر تیمور کے خیمے میں وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ تیمور بہت ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سردار بھی خوش ہو گئے۔ انہیں خیال ہوا شاید امیر حسین راہِ راست پر آ گیا ہے اور اس نے غزنی جانے کی اطلاع تیمور کو بھیجی ہے۔

کھانے کے دوران تیمور نے ایلچی اور ارکانِ وفد کے درمیان ہونے والی گفتگو کا بالکل ذکر نہ کیا۔ سردار بار بار اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے مگر تیمور نے انہیں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رکھا۔ جب سب نے اطمینان سے کھانا کھا لیا تو تیمور نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"میرے سردارو! تم تاتاریوں کی آن اور عظمت ہو۔ تمہارے سردار نے جتنی فتوحات حاصل کی ہیں ان میں تم تیمور کے برابر کے شریک ہو۔ تم یقیناً امیر حسین کا پیغام سننے کے لیے بے چین ہو گے۔ میں تمہیں اسی وقت بلوا لیتا لیکن تم اس وقت جوش میں تھے اور امیر حسین کا پیغام ہم سے ہوش کا تقاضا کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ افسوسناک خبر سناتا ہوں کہ شیر بہرام واقعی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وفد کے ایک رکن نے بتایا ہے کہ شیر بہرام کو امیر حسین نے اپنا خاص مہمان بنا کر روک لیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت امیر کے ہاتھوں شیر بہرام پر کیا گزر رہی ہو گی لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر شیر بہرام قتل کر دیا گیا تو اس کا افسوس زندگی بھر رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی میں اعلان کرتا ہوں کہ اب میں اپنے کسی سردار کو سفیر یا قاصد بنا کر اس کے پاس نہیں بھیجوں گا۔"

"کیا مجھے بھی نہیں سردار؟" ایلچی بہادر فوراً بول پڑا۔

ایلچی بہادر ہزاروں کے مجمعے میں سب سے الگ نظر آتا تھا۔ جسم پر قاقم کی پوستین، اس کی کلاہ زری کا پٹکا اور کامدار جوتے۔ دیکھنے والوں کی نظریں اس پر جم کے رہ جاتی تھیں۔ تیمور اسے کئی سفارتوں پر بھیج چکا تھا اسی لیے وہ ایلچی بہادر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

"تمہیں بھی نہیں ایلچی بہادر۔"

تیمور نے نفی میں سر ہلایا:

"شیر بہرام کی گرفتاری نے میرے دل میں ایک داغ ڈالا ہے۔ میں دوسرا داغ نہیں پڑنے دوں گا۔"

"میں شیر بہرام کا انتقام ضرور لوں گا۔" ایک سردار بولا۔

"شیر بہرام کو گرفتار کر کے اس نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔" کسی دوسرے سردار نے

"امیر حسین کا سر میں اتاروں گا۔" یہ امیر جغتائی بہادر کی آواز تھی۔ اس کی آنکھیں خون کبوتر ہو رہی تھیں۔

"تم سر کیسے اتارو گے امیر جغتائی بہادر۔ اس کے تن پر تو سر ہی نہیں ہو گا۔" یہ عجیب بات شیخ علی بہادر نے کہی۔

"ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے شیخ علی؟" امیر جغتائی نے شیخ کو گھورا۔

"یہی ہو گا امیر۔"

شیخ علی بہادر نے اطمینان سے کہا:

"جب تم گھوڑا بڑھا کر امیر حسین کے سر پہ پہنچو گے تو دیکھو گے کہ میں اس کا سر پہلے ہی اتار چکا ہوں گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اسے ابھی جا کے قتل کیے دیتا ہوں۔" امیر جغتائی غصے سے تملا کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا گھوڑا تمہارے گھوڑے سے تیز دوڑتا ہے۔"

شیخ علی بہادر بھی کھڑا ہو گیا:

"میں تم سے پہلے اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس کا سر میرے پاس ہو گا۔"

"چلو دیکھتے ہیں۔" امیر جغتائی نے قدم اٹھایا۔

"ضرور چلو۔" شیخ علی بہادر کا قدم بھی اٹھ گیا۔

اسی وقت تیمور کی گرجدار آواز سنائی دی:

"کہاں جا رہے ہو تم؟"

شیخ علی بہادر اور امیر جغتائی نے پلٹ کر ایک ساتھ تیمور کو دیکھا۔ پھر جیسے خواب سے چونک پڑے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے چہرے پر نظر ڈالی اور شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

یہ دونوں آپس میں گہرے دوست تھے لیکن جب بہادری دکھانے کا موقع آتا تو ایک دوسرے پہ سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ اس وقت بھی وہ جوشِ شجاعت میں بالکل بھول گئے کہ وہ کہاں ہیں اور کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے؟

"امیر جغتائی بہادر اور شیخ علی بہادر۔"

تیمور نے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے کہا:

"تیمور کو تم جیسے بہادروں پر فخر ہے۔ اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور میری بات سنو۔"

دونوں سردار اپنی اپنی جگہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

"امیر حسین نے مجھے ملاقات کی دعوت دی ہے۔"

تیمور نے کہا:

"وہ مجھ سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہے۔ ملاقات کے لیے چپ چک کا پُر فضا مقام مقرر کیا گیا ہے۔"

"لیکن سردار، چپ چک تو ایک تنگ گھاٹی ہے۔"

امیر جغتائی نے بتایا:

"میں اکثر اُدھر سے گزرا ہوں۔ ایک درّے سے گزر کر گھاٹی میں داخل ہوتے ہیں۔ راستہ اتنا [illegible] کہ چار سوار مشکل سے برابر برابر چل سکتے ہیں۔"

"گھاٹی کے دوسری طرف کیا ہے؟ کوئی میدان ہے یا؟" تیمور نے دلچسپی سے پوچھا۔

"سردار، وہ گھاٹی تو ایک بنجر ہے۔ ادھر درّہ اُدھر درّہ۔ بیچ میں تنگ پتھریلا راستہ۔"

امیر جغتائی نے منہ بنا کر کہا:

"چور لٹیروں کے لیے ایک بہترین پناہ گاہ ہے لیکن امیر حسین اس گھاٹی میں آپ سے کیوں [illegible] چاہتا ہے؟"

"امیر حسین کے خیال میں وہ بہترین جگہ ہے۔"

تیمور نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"اس گھاٹی میں ہم دونوں اکیلے ملیں گے۔ اس نے کہلوایا ہے کہ چپ چک کی وادی میں میں تنہا [illegible] وہ بھی اکیلا آئے گا۔ ملاقات کے وقت ہمارے ساتھ کوئی نہیں ہوگا۔"

"دھوکہ، دھوکہ، فریب۔" ہر طرف سے آوازیں اٹھنے لگیں۔

"ملاقات کی آڑ لے کر وہ آپ کو گرفتار کرنا چاہتا ہے سردار۔" ایلچی بہادر نے بڑے رازدارا[illegible] تیمور سے کہا۔

"سردار آپ کہہ دیجیے کہ یہ ملاقات نہیں ہو سکتی۔" شیخ علی بہادر نے اپنے خیال میں بڑا [illegible] دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں شیخ علی! ہم نے وفد سے کہا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

تیمور کہتے کہتے رکا اور دلچسپی سے اپنے سرداروں کے چہرے دیکھے۔ سب ہمہ تن گوش تھ[illegible] چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ بولا:

"ہم نے وفد کو جواب دیا ہے کہ ہم امیر حسین سے ضرور ملاقات کریں گے۔ چپ چک [illegible]

میں ہم اکیلے جائیں گے۔"

تیمور کے سردار گھبرا گئے۔ ان کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ ایلچی بہادر نے تلوار کھینچ لی:

"میں اپنے ہاتھوں سے گلا کاٹ لوں گا اگر سردار نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔"

"ایلچی بہادر ٹھیک کہہ رہا ہے سردار۔"

امیر جغتائی بے چینی سے بولا:

"اس تنگ وادی میں اکیلے جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ اگر جانا ہی ہے تو ہمیں ساتھ لے کے چلیے۔"

"مگر کیوں، تم پریشان کیوں ہو؟"

تیمور بالکل پُرسکون تھا:

"امیر حسین مجھے کھا تو نہیں جائے گا۔"

"وہ آپ کو کھلا دھوکا دے رہا ہے۔"

شیخ علی نے کہا:

"وہ مکار ہے۔ جھوٹا ہے۔ اس کی بات کا آپ اعتبار نہ کیجیے۔"

"وہ مجھے دھوکا دے سکتا ہے شیخ علی۔"

تیمور نے گردن گھما کر قرآن کی طرف دیکھا:

"مگر وہ اس کلام کو تو فریب نہیں دے سکتا۔ اس نے مجھے کلام اللہ کا واسطہ دے کر بلایا ہے۔ میں اس واسطے سے انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے جانا ہوگا۔"

تیمور کے جواب نے سرداروں کی زبانیں بند کر دیں مگر ان کے چہرے لٹک گئے۔

دوسرے دن امیر حسین کے آدمی واپسی کی اجازت لینے تیمور کے پاس آئے۔

تیمور نے ان سے ملاقات کی تاریخ مقرر کی اور خوشی خوشی رخصت کیا۔ تیمور نے انہیں یقین دلایا کہ تاریخ مقررہ پر وہ امیر حسین کا چپ چک کی گھاٹی میں انتظار کرے گا۔

وفد کے رخصت ہوتے ہی تیمور نے فوراً دو سو سواروں کا ایک رسالہ ترتیب دیا۔ اس میں اس نے اپنے تمام بڑے بڑے سرداروں کو شامل کیا اور وفد کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلہ دے کر چلنے لگا۔

تیمور چاہتا تھا کہ وفد کے امیر حسین تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ گھاٹی تک پہنچ جائے اور وہاں کے حالات اور راستوں سے واقفیت حاصل کر لے۔

یہ بھی امکان تھا کہ امیر حسین وہاں موجود ہو اور اس نے تمام راستے بند کر رکھے ہوں۔ اس لیے وہ چپ چک

کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اور چار سواروں کو دریافتِ حال کے لیے گھاٹی میں بھیجا۔

ان سواروں نے صرف گھاٹی کے اندر ہی نہیں بلکہ ارد گرد کی تمام پہاڑیوں پر چڑھ کر یہ اطمینان کر لیا کہ دشمن کا کوئی آدمی اب تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔

تیمور کو اس سے بڑا اطمینان ہوا۔ وہ اپنے سوار لے کر گھاٹی میں داخل ہوا۔

تیمور نے گھاٹی کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور پھر اس نے پچاس سواروں کو اس درے کے مقرر کر دیا جدھر سے امیر حسین کے داخل ہونے کا امکان تھا۔ ان سواروں کو حکم دیا گیا کہ جب امیر حسین آدمیوں کے ساتھ گھاٹی میں داخل ہو جائے تو درے کا راستہ روک کر واپسی ناممکن بنا دی جائے۔

باقی سواروں کو تیمور نے گھاٹی میں مناسب جگہ پر چھپا دیا لیکن انہیں حکم دیا کہ اگر امیر حسین اکیلا آ جائے تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ تیمور یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی امیر حسین کی طرح اسے دھوکے سے گرفتار کرے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگر امیر حسین واقعی مخلص ہے اور وہ اس سے اکیلا ملاقات کرنے آ رہا ہے تو وہ بھی پورے خلوص سے گفتگو کرے گا۔

O

مقررہ دن کو شام کے وقت تیمور کے پہاڑی پر متعین آدمیوں نے اطلاع دی کہ ایک لشکر گھاٹی کی طرف آ رہا ہے۔

تیمور گھوڑے پر سوار ہو کر گھاٹی کے ایک سرے پر نمودار ہوا۔ دوسری طرف سے امیر حسین کا لشکر اندر آنا شروع ہوا۔ تیمور اپنا گھوڑا ذرا اونچی جگہ لے آیا تھا تاکہ سامنے سے آنے والے اسے دیکھ سکیں۔ امیر حسین کا لشکر گھاٹی میں داخل ہو گیا تو تیمور گھوڑا بڑھا کر چند قدم آگے آیا۔

"ٹھہرو!" تیمور کی آواز پہاڑیوں میں گونجی۔

امیر حسین کے سوار ایک لمحے کے لیے رکے۔

"امیر حسین کو آگے بھیجو!" تیمور نے انہیں چیخ کر حکم دیا۔

امیر حسین کے سواروں نے جواب دینے کے بجائے اپنے گھوڑے تیز کر دیے۔ تیمور سمجھ گیا کہ امیر حسین موجود نہیں ہے یا پھر وہ بغیر سامنے آئے تیمور کو گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو

سے جوابی کارروائی کا حکم دیا۔

اشارے کے ساتھ ہی گھاٹی کے دائیں بائیں سے سوار نکلنا شروع ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑیاں سواروں کو اگل رہی ہیں۔ ان سواروں نے امیر حسین کے لشکر پر دو طرف سے حملہ کر دیا۔

امیر حسین کا لشکر تعداد میں دو ہزار تھا لیکن اس دو طرفہ حملے سے گھبرا گیا۔ اسے تیمور کی طرف سے منہ موڑ کر تیمور کے سواروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

تیمور کے سوار دس دس پانچ پانچ کر کے گھاٹی سے باہر نکل کر آ رہے تھے۔ اس لیے ان کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ امیر حسین کا لشکر یہ سمجھا تھا کہ گھاٹی میں تیمور کا پورا لشکر موجود ہے۔ انہوں نے راہِ فرار اختیار کی اور جس راستے سے آئے تھے ادھر بھاگنے لگے۔ اس راستے کو تیمور کے سواروں نے پہلے ہی بند کر دیا تھا۔ امیر حسین کا جو سوار جان بچا کر درے سے نکلتا وہ بڑی آسانی سے تیمور کے آدمیوں کے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ آدھے سے زیادہ سوار مارے گئے۔ باقی یا تو گرفتار ہوئے یا جان بچا کر بھاگ گئے۔

امیر حسین نے بڑی عقلمندی کی تھی کہ وہ خود گھاٹی میں نہیں آیا تھا ورنہ اس کا بھی یہی انجام ہوتا۔ وہ چک چک سے کچھ دور ٹھہر گیا تھا اور اپنا لشکر تیمور کی گرفتاری کے لیے گھاٹی میں بھیج دیا تھا۔ اس نے اپنے سواروں کو بھاری انعام و اکرام کا لالچ دیا تھا اور تیمور کو زندہ یا مردہ لانے والے کو اپنا نائب مقرر کرنے کا اعلان کیا تھا۔

وہ تصور ہی تصور میں تیمور کو اپنے سامنے پابہ زنجیر کھڑا دیکھ کر مسکرا رہا تھا کہ اس کے شکست خوردہ سوار اس کے پاس سے گزرنا شروع ہو گئے۔ وہ اس قدر گھبرائے ہوئے تھے اور بے تحاشہ یوں بھاگ رہے تھے کہ امیر حسین کو دیکھ کر وہ گھوڑا روکتے روکتے دور نکل جاتے۔

امیر حسین نے یہ حال دیکھا تو خود بھی گھوڑے پر سوار ہوا اور ان سے زیادہ تیز رفتاری سے اپنے مستقر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

امیر حسین اپنی خیمہ گاہ میں پہنچ کر وہاں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہرا اور خیمے اکھڑوا کر بلخ کی طرف بھاگا۔ بلخ اس کا آخری سہارا اور پناہ گاہ تھی۔ اسے تیمور سے تعاقب کا خطرہ تھا اس لیے وہ دو دو منزلیں طے کرتا ہوا بلخ پہنچ گیا۔

تیمور نے امیر حسین کا تعاقب نہ کیا۔ وہ چک چک کی وادی سے قلعہ قرشی آ گیا اور یہاں پہنچ کر اس نے امیر حسین سے آخری معرکے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے مرحوم بیوی کی خاطر امیر حسین کو صلح کا پیغام بھیجا تھا لیکن امیر حسین نے اسے اس کا الٹا ہی صلہ دیا اور اسے فریب سے قتل کرنے کی کوشش کی۔ تیمور کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ امیر حسین کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے کچل کر رکھ دے۔

پھر اس وقت تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی جب اس نے سنا کہ امیر حسین نے بلخ پہنچتے ہی شیر بہرام کو
قتل کرا دیا۔ تیمور کو اپنے بچپن کے دوست کے بہیمانہ قتل سے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ کئی دن کھانا
نہ کھا سکا۔

○

تیمور آندھی اور طوفان کی طرح قلعہ قرشی سے نکلا۔ اس کے پاس کچھ زیادہ بڑی فوج نہ تھی لیکن
کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کے گرد ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا۔

امیر حسین بھی پوری طرح تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگ فیصلہ کن ہے۔ اس نے اس دوران میں
دوڑ دھوپ کر کے بڑا لشکر اکٹھا کر لیا تھا لیکن اس کی جلد بازی اور بد دماغی سے اس کے سردار پریشان تھے
نے صوبہ ختلان کے حاکم کو مشورے کے لیے بلایا۔ جب وہ اس کے پاس آ گیا تو امیر حسین نے اسے
قتل کرا دیا۔ حاکمِ ختلان بڑا با اثر سردار تھا۔ ختلان کے قتل سے اس کا بھائی کیخسرو جو امیر حسین
زبردست حلیف تھا، اس سے باغی ہو گیا اور تیمور کے پاس چلا آیا۔

امیر حسین بڑی شان سے تیمور کے مقابلے پر نکلا۔ تیمور چاہتا تھا کہ بلخ کا شہر تباہ نہ ہو۔
اس شہر کو کبھی عروس البلاد کہتے تھے۔ خراسان سے ہندوستان جانے والے قافلے اسی شہر سے
تھے۔ یہاں کے بکھرے بکھرے پتھروں کے کھنڈرات میں دنیا کے قدیم ترین آتش کدہ کے آثار
اس شہر کی گلیوں میں مہاتما بدھ کے مجسمے کے ریزے بھی بکھرے ہوئے تھے۔۔۔۔ سکندر اعظم جب
سے گزرا تو اس نے اس کو باکتریہ کے نام سے پکارا تھا لیکن چنگیزی لشکر نے اس کے تمام حسن کو
کر دیا تھا۔ اب یہ مٹی اور پتھر کا ڈھیر بن چکا تھا جس کے گرد مسجدیں اور مقبرے تعمیر ہو گئے تھے
نہیں چاہتا تھا کہ اس کی تباہی میں اور اضافہ ہو۔ چنانچہ اس نے شہر سے ذرا ہٹ کر صف آرائی کی۔

امیر حسین بلاشبہ بہادر اور جری تھا لیکن اس کا لشکر پہلے ہی حملے میں جی چھوڑ گیا۔ اس کے
سرداروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور تیمور کے لشکر میں شامل ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ کسی
کی نوبت نہ آئی۔ امیر حسین کا لشکر پیٹھ دکھا گیا اور وہ بھاگ کر کھنڈرات میں چھپ گیا۔

شہر بڑی آسانی سے فتح ہو گیا۔

تیمور نے قتلِ عام کی ممانعت کر دی۔ بوڑھے، بچوں اور عورتوں کو عام معافی دے دی گئی۔ جن سپاہیوں
نے ہتھیار ڈال دیے انہیں معاف کر دیا گیا۔

شام ہو گئی تھی لیکن امیر خطائی بہادر اور شیخ علی بہادر پورے شہر اور قرب و جوار میں گھوڑے دوڑاتے
پھر رہے تھے۔ انہیں امیر حسین کی تلاش تھی۔ وہ شیر بہرام کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ امیر حسین
کی گرفتاری سے پہلے ہی اسے ختم کر دیں کیونکہ سردار تیمور اسے نہ قتل کر سکتا تھا اور نہ ہی قتل کا حکم دے
سکتا تھا لیکن امیر حسین ہزار کوشش کے باوجود ان کے ہاتھ نہ آیا۔

تیمور نے شہر کے باہر ہی اپنے خیمے لگوائے۔ اسے فتح حاصل ہوئی تھی لیکن امیر حسین کے گرفتار
نہ ہونے سے وہ کچھ پریشان تھا۔ اس نے امیر حسین کی طاقت کا بالکل خاتمہ کر دیا تھا۔ وہ اسے قتل کرنا بھی نہیں
چاہتا تھا لیکن اس کا گرفتار ہونا ضروری تھا۔ اس کے بچ کر نکل جانے سے کسی وقت بھی کوئی فتنہ کھڑا ہو
سکتا تھا۔

رات ہوئی تو اس کی یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ امیر حسین کی گرفتاری کی امید پیدا ہو گئی۔
امیر حسین کے ایک لشکری کو تیمور کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ تیمور سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔
اس لیے اسے پہلے غیر مسلح کر دیا گیا۔

تیمور نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور پوچھا:

"تم کون ہو اور کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہو؟"

"اے تاتاریوں کے عظیم قائد!"

لشکری نے پوری تہذیب کا مظاہرہ کیا:

"دو فریقوں میں جنگ ہوتی ہے تو ایک غالب اور دوسرا مغلوب ہوتا ہے۔ اللہ نے آپ کو غالب بنایا
آپ کو چاہیے کہ مغلوب پر رحم فرمائیں۔"

"اے شخص! تیمور کو تیری نصیحت سننے کی فرصت نہیں۔ مقصد بیان کر"۔ تیمور نے اسے ڈانٹا۔

"میں۔۔۔۔ میں مغلوب کا پیامبر ہوں۔"

وہ شخص گھبرا گیا:

"میرے آقا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان کی درخواست آپ کے سامنے تنہائی میں پیش کروں۔ تاکہ
غیروں کے سامنے ان کی شرم رہ جائے"۔

"تم میرے دشمن کی درخواست لائے ہو اور میرے دوستوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے

شرماتے ہو۔"

تیمور کو غصہ آ گیا:

"جاؤ اور امیر حسین کو کہہ دو کہ جب اسے شیر بہرام کو قتل کرتے ہوئے شرم نہ آئی تو معافی مانگتے ہوئے کیوں شرماتا ہے؟"

"سردارِ اعظم!"

امیر حسین کا قاصد گڑگڑایا:

"میرے آقا نے حج پر جانے کی درخواست کی ہے۔ وہ وعدہ کرتے ہیں کہ وطن کبھی واپس نہیں آئیں گے۔"

"حج پر کوئی شخص اس وقت جا سکتا ہے جب تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بلاوا آئے۔"

تیمور نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"یہ فیصلہ میرے اختیار میں نہیں۔ اس سے کہو کہ وہ خود پیش ہو کر عذر داری کرے۔ اگر بلاوا آیا ہے تو وہ ضرور حج پر جائے گا۔"

"شکریہ سردارِ اعظم۔"

قاصد نے جھک کر سلام کیا:

"میں ابھی اپنے آقا کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

قاصد واپس ہونے لگا تو تیمور نے اسے روک لیا۔

"سردارِ محترم!"

تیمور نے بزرگ سردار جاکو برلاس کو مخاطب کیا:

"تم ہمارے محافظ دستے کو ساتھ لے کر جاؤ۔ امیر حسین ہمارا قرابت دار ہے۔ اسے نہایت عزت و احترام سے لے کر آؤ۔ اسے اپنے قید ہونے کا احساس نہ ہونا چاہیے۔"

جاکو برلاس محافظ دستے کے ساتھ بلخ کے کھنڈرات میں گیا۔ اس نے خود امیر حسین سے ملاقات کر کے اسے تیمور کا حکم سنایا۔ امیر حسین نے کوئی عذر نہ کیا اور دلشاد آغا کو لے کر جاکو برلاس کے ساتھ ہو لیا۔

جاکو نے واپس آ کر تیمور کو اطلاع دی۔ تیمور نے حکم دیا کہ امیر حسین کو الگ خیمے میں رکھا جائے۔ جب تک اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا اس کی بیوی دلشاد آغا کو اس کے پاس نہ جانے دیا جائے۔

تیمور کے حکم کے مطابق امیر حسین اور دلشاد آغا کو الگ الگ خیموں میں رکھا گیا اور دونوں خیموں پر پہرہ لگا دیا گیا۔

اب امیر حسین کا معاملہ تمام سرداروں کے سامنے فیصلے کے لیے پیش ہوا۔ امیر حسین کی حیثیت اگر صرف ایک مغلوب اور مفتوح دشمن کی ہوتی تو تیمور خود ہی اس کا فیصلہ کر دیتا لیکن امیر حسین نے شیر بہرام کو قتل کر کے اپنے جرم میں اضافہ کر لیا تھا۔ اس کے سرداروں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اس لیے تیمور ان سرداروں کو اپنے اعتماد میں لے کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

اسے جو فیصلہ کرنا تھا وہ تو اس کے دل میں تھا لیکن اس نے بارہا یہی کہا تھا کہ وہ امیر حسین کو قتل نہیں کرنا چاہتا...... اس نے اپنے سرداروں کو اس سلسلے میں دل کھول کر گفتگو کرنے کا موقع دیا اور خود اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیا۔

امیر حسین کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا کہ دلشاد آغا کی ایک کنیز نے تیمور کو اپنی مالکہ کا پیغام پہنچایا۔ دلشاد آغا نے تیمور سے درخواست کی تھی کہ امیر حسین کی تقدیر کا فیصلہ کرنے سے پہلے اسے اپنے شوہر کی صفائی پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔

تیمور دلشاد آغا کی درخواست رد نہ کر سکا۔ وہ جانتا تھا کہ دلشاد آغا اپنے شوہر کو معاف کرنے کی سفارش کرے گی۔ تیمور کا خود بھی یہی ارادہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے سرداروں کے جذبات کو ٹھنڈا کر کے امیر حسین کے بچاؤ کی کوئی صورت نکال لے۔

تیمور محل سے اٹھا اور چلتے چلتے کہتا گیا:

"امیر حسین میرا رشتے دار ہے۔ میرے اس کے درمیان دوستی کا بھی عہد و پیمان ہے۔ اس نے جو کچھ کیا بہت برا کیا لیکن میرے ہاتھوں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

تیمور کے الفاظ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ امیر حسین کو معاف کرنا چاہتا ہے۔ سرداروں کے سامنے کہنے کا یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ وہ بھی امیر حسین کو اگر دل سے نہیں تو کم از کم اپنے سردار کی خاطر معاف کر دیں۔

تیمور فکر میں ڈوبا ہوا دلشاد آغا کے خیمے میں داخل ہوا۔ دلشاد فوراً کھڑی ہو گئی۔ تیمور نے جھجکتے ہوئے اس پر نظر ڈالی۔ دلشاد کا گلاب جیسا شگفتہ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ تیمور سے اس کی آخری ملاقات خیوہ کی جنگ کے موقع پر ہوئی تھی۔ اسے چھ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ یہ عرصہ اتنا طویل تو نہ تھا کہ دلشاد آغا جوانی کی سرحدوں سے نکل جاتی۔ لیکن تفکر اور مسلسل پریشانیوں نے اس کی صحت کو برباد کر دیا تھا اور فکر کی لکیریں رخساروں پر ابھر آئی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ دلشاد آغا" تیمور نے کہا۔

"نہیں سردار"۔

دلشاد نے دلی کرب دباتے ہوئے کہا:

"آپ فاتح ہیں اور قسمت نے ہمیں مغلوب کیا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں ایک مجرم کی طرح سامنے کھڑی رہوں"۔

"دلشاد آغا"۔

تیمور نے سنجیدگی سے کہا:

"دو فریقوں میں جنگ ہوتی ہے تو ایک ہی فریق فاتح ہو سکتا ہے۔ امیر حسین نے جو کچھ کیا میں افسوس ہی کر سکتا ہوں۔ مجھے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اس نے بعض حرکتیں ایسی کیں جنہوں نے اس کی شجاعت اور جوانمردی کو داغدار کر دیا"۔

"مجھے معلوم ہے سردار تیمور"۔

دلشاد آغا نے قطع کلام کیا:

"آپ اس کی غلطیوں کی تفصیل بیان نہ کیجیے۔ اس لیے کہ میں اس کی بیوی ہوں۔ اس کی کمزوریوں سے زیادہ آپ واقف نہیں۔ امیر حسین نے سمرقند کے تخت کو حاصل کرنے کے لیے بعض ایسی باتیں کیں جن کا آپ کو علم نہیں لیکن ان تمام غلطیوں اور کمزوریوں کے باوجود میں یہی امید کروں گی کہ آپ۔۔۔۔"

"دلشاد آغا"۔

اب کی تیمور نے اس کی بات کاٹی:

"میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو لیکن تم میری جگہ کھڑی ہو کر دیکھو۔ ذرا یہ بتاؤ کہ اگر میں مغلوب ہو کر بعد اسی طرح امیر حسین کے سامنے کھڑا ہوتا تو تم کیا کرتیں؟"

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ خدا نہ کرے ایسا وقت آتا تو۔۔۔۔ تو۔۔۔۔"

دلشاد کی آواز بھرا گئی:

"میں آپ کی بھی اسی طرح سفارش کرتی جس طرح اس وقت امیر حسین کی زندگی کی خواہاں ہوں۔ خواہ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن میں سچے دل سے کہتی ہوں کہ مجھے امیر حسین اس لیے عزیز ہے کہ زندگی کے کتنے ہی بہترین سال میں نے اس کے ساتھ گزارے ہیں لیکن سچ جانیے کہ آپ سے کسی طرح کم عزیز نہیں۔ میں آپ کی اس لیے قدر کرتی ہوں کہ آپ ایک سچے اور کھرے تاتاری اور بہادری اور جنگی حکمت عملی کی گرد کو بھی امیر حسین نہیں پہنچ سکتا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ حق پر ہیں۔ سمرقند پر آپ کا امیر حسین سے زیادہ حق اس لیے ہے کہ آپ امیر قزغن کے ہم قبیلہ نہ ہونے کے باوجود امیر حسین سے زیادہ سمرقند پر حکومت کے اہل ہیں۔ آپ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک جہانگیر اور جہاندار میں ہونی چاہییں"۔

"دلشاد آغا تم نے اس وقت مجھے ایک اور افسوس سے دوچار کر دیا ہے"۔

تیمور نے اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی:

"میں نے تمہارے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ تم ایک جانباز اور عقلمند تاتاری خاتون ہو لیکن تمہاری باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ تم بہت حقیقت پسند اور صاف گو بھی ہو۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو ایک عورت میں جمع ہو جائیں تو وہ صحیح معنوں میں کسی تاجدار کی ملکہ بن سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ امیر حسین نے تمہاری قدر نہیں کی۔ تمہیں وہ مقام نہیں دیا جس کی تم مستحق تھیں"۔

"نہیں امیر تیمور"۔

دلشاد فخریہ انداز میں بولی:

"امیر حسین میرا قدر دان ہے۔ اسے مجھ سے بے پناہ محبت ہے۔ صرف اس کی فطری کمزوریاں کبھی کبھی اس محبت اور قدر دانی میں حائل ہوتی رہی ہیں۔ اس کی جلد بازی اور تلون مزاجی اسے دنیا سے لاپرواہ بنا دیتی ہے۔ اگر اس نے شیر بہرام کے معاملے میں میرے مشورے پر عمل کیا ہوتا تو شاید اسے آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا"۔

"شیر بہرام"۔

تیمور نے چونک کر دلشاد آغا کو دیکھا:

"دلشاد آغا! کیا تمہیں شیر بہرام کے قتل کی پہلے سے خبر تھی؟"

"اگر میں یہ کہوں کہ مجھے شیر بہرام کے انجام کی خبر تھی تو آپ کے دل میں ضرور یہ سوال پیدا ہوگا کہ میں نے اسے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی"۔

دلشاد آغا نے گلوگیر آواز میں کہا:

"سردار تیمور۔ آپ کو علم نہیں کہ میں نے شیر بہرام کو بچانے کی کتنی کوشش کی۔ جس وقت مجھے معلوم ہوا کہ امیر حسین نے شیر بہرام کو قید کر دیا ہے تو میں نے اس کی سخت مخالفت کی اور امیر حسین سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ اس کی بزدلی کا اتنا بڑا داغ ہے جسے وہ عمر بھر اپنے دامن سے نہیں دھو سکے گا۔ امیر حسین جب اپنی ضد سے نہ باز آیا تو میں نے اپنی ایک کنیز کے ذریعے شیر بہرام کو امیر حسین کے ارادے سے باخبر کر دیا۔ آپ اسے شاید

شوہر سے غداری یا بے وفائی کا نام دیں لیکن میں خود کو قصوروار نہیں سمجھتی۔ میری طبیعت یہ بات گوارا نہ کر
سامنے ایک بے گناہ قتل کر دیا جائے اور میں خاموش بیٹھی رہوں لیکن موت تو شیر بہرام کا مقدر بن چکی
نے خود فرار ہونے کے بجائے اپنے ایک ساتھی کو فرار کرا دیا جس کا علم دوسرے دن امیر حسین کو ہو گیا اور
پاداش میں اس نے شیر بہرام کو قتل کرا دیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ قتل رنگ لایا اور آج امیر حسین
زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔ اس بھیک میں اس کے ساتھ میں بھی شریک ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے دلشاد آغا نے چادر کا دامن تیمور کے سامنے کر دیا:

"اس دامن کو امیر حسین کی زندگی سے بھر دیجیے امیر تیمور۔ مجھے ناامید نہ کیجیے۔ میرا امیر مجھے
کر دیجیے"۔

کئی موتی دلشاد آغا کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

تیمور اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ بولا:

"دلشاد آغا۔ قسمت والا ہے وہ شوہر جسے تم جیسی بیوی ملی۔ جو شوہر کی ہر کمزوری کو اپنی لا
ہے اور اس کی زندگی کے لیے دشمن کے سامنے دامن پھیلا رہی ہے۔ آنسو پونچھ ڈالو دلشاد آغا میرے
شیر بہرام کے قتل سے بہت ناراض ہیں۔ میں نے انہیں ہموار کرنے کی کوشش کی ہے اور ان پر یہ بھی ظاہر کر
کہ امیر حسین سے میری دوستی اور قرابت داری ہے۔ امیر حسین کو نہ تو میں قتل کر سکتا ہوں اور نہ اس کے
حکم دے سکتا ہوں"۔

"سردار تیمور۔ میں آپ کے اس احسان کو عمر بھر نہ بھول سکوں گی"۔

دلشاد کے مغموم چہرے پر خوشی کی چمک پیدا ہو گئی:

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ امیر حسین کو آئندہ کبھی آپ کے خلاف تلوار بلند نہیں کرنے دوں گی"۔

تیمور اسے تسلی دے کر اٹھا:

"دلشاد آغا۔ تم کو اس خیمے میں کوئی تکلیف تو نہیں"؟

"نہیں سردار"۔

دلشاد جلدی سے بولی:

"اگر کوئی تکلیف تھی تو وہ آپ کی باتوں سے ختم ہو گئی"۔

"میں تمہیں امیر حسین کے خیمے میں پہنچانے کا حکم دے رہا ہوں"۔ تیمور نے خوش ہی کہا:

"تم امیر حسین کو مناسب الفاظ میں تسلی دے دینا"۔

تیمور چلا گیا۔ دلشاد آغا کو امیر حسین کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

یہ بات شام کے وقت ہوئی تھی۔ تیمور اپنے سرداروں کے پاس پہنچا اور اعلان کیا کہ امیر حسین کی قسمت کا
فیصلہ کل صبح کیا جائے گا۔

تیمور کا خیال تھا کہ رات کا یہ وقفہ اس کے سرداروں کو آپس میں صلاح مشورے کا موقع فراہم کرے گا۔
اور وہ امیر حسین کی جان بخشی کے معاملے پر متفق ہو جائیں گے لیکن رات کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی قسمت
کا فیصلہ ہو گیا۔

تیمور کے خیمے سے نکلنے کے بعد اس کے سرداروں نے اس معاملے پر غور کیا۔ انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ
دلشاد آغا نے اپنی باتوں سے تیمور کو رام کر لیا ہے اور وہ امیر حسین کو ضرور آزاد کر دے گا۔ تیمور کے سردار امیر حسین
کو زندہ چھوڑنے پر کسی صورت میں آمادہ نہ تھے۔ ان کے خیال میں امیر حسین کی رہائی سے ایک غلط رسم کا آغاز ہو جائے گا
اور لشکر کے سرداروں کی جان کی کوئی ضمانت نہ دی جا سکے گی۔

رات کو تیمور کے سرداروں نے اپنے طور پر ایک منصوبہ تیار کیا اور اس پر عملدرآمد کے لیے سردار موڈارلات
کو منتخب کیا۔ یہ وہی سردار تھا جس نے امیر موسیٰ کے ساتھ مل کر صرف پانچ سو سواروں کی قلیل تعداد سے "منگی پل"
کا منگولوں سے کامیاب دفاع کیا تھا۔

موڈارلات منصوبے کے مطابق ایک اور سردار کو ساتھ لے کر امیر حسین کے خیمے پر پہنچا۔ دلشاد آغا
اس وقت امیر حسین کے پاس پہنچ چکی تھی اور اس نے امیر حسین کا خوف بڑی حد تک دور کر دیا تھا لیکن موڈارلات
کی آمد سے وہ کانپ اٹھا اور سمجھ گیا کہ اس کی موت آ گئی ہے۔

موڈارلات خلاف امید امیر حسین سے بڑی محبت سے ملا اور تسلی دیتے ہوئے بولا:

"آپ کو خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سردار تیمور کے تقریباً تمام سردار آپ کے
قتل کے خواہاں ہیں لیکن چند سردار آپ کو بچانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو اپنی جان عزیز ہے تو ان کے کہنے پر
عمل کیجیے"۔

"وہ کیا چاہتے ہیں؟ مجھے کیا کرنا ہو گا؟" امیر حسین نے امید و بیم کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کے ہمدرد سرداروں نے آپ کے لیے ایک تیز رفتار گھوڑے کا انتظام کر دیا ہے"۔

موڈارلات سنجیدگی سے بولا:

"یہ گھوڑا آپ کو صبح ہونے تک یہاں سے بہت دور پہنچا دے گا اور آپ دشمنوں سے ہمیشہ کے لیے
محفوظ ہو جائیں گے"۔

"میں۔ میں۔۔۔۔"

امیر حسین کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دلشاد آغا دوڑ کر اس سے لپٹ گئی:

"نہیں نہیں امیر حسین"۔

دلشاد روتے ہوئے بولی:

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تمہارا فرار سردار تیمور کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے گا۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہارے قتل کا حکم نہیں دیں گے"۔

"سردار تیمور کا وعدہ اپنی جگہ درست ہے"۔

موئڈارلات بولا:

"لیکن سردار تیمور نے انہی سرداروں کے زور پر فتوحات حاصل کی ہیں۔ وہ ان وفادار اور بہادروں کی مخالفت نہ مول لے سکے گا۔ دلشاد آغا ایک سمجھدار خاتون ہیں۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ تیمور نے آپ کے لیے یہ بات کہی ہے۔ کوئی سردار اپنے ساتھیوں کی خواہش سے انکار نہیں کر سکتا پھر اس صورت میں جبکہ جائز ہو۔ امیر حسین قاتل ہیں۔ سردار تیمور ان پر اپنے سرداروں کو قربان نہیں کر سکتا"۔

"سردار ارلات!"

دلشاد اشکوں کے درمیان بولی:

"سردار تیمور اپنے وعدے سے نہیں پھر سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ امیر حسین کی جان ضرور بخش دیں گے"۔

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا"۔

موئڈارلات نے واپسی کا ارادہ کیا:

"آپ کو اس پیش کش سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ میں واپس جا رہا ہوں اور یہ واضح کیے دیتا ہوں کہ صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوگا"۔

امیر حسین نے دلشاد آغا کو دھکا دے کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کیا۔ دلشاد خیمے کے ہیں جا گری۔

امیر حسین نے موئڈارلات کو روکتے ہوئے کہا:

"سردار موئڈ! مجھے آپ کی تجویز منظور ہے لیکن آپ وعدہ کریں کہ میرے بعد دلشاد آغا کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی"۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی"۔

دلشاد فوراً اٹھ کھڑی ہوگئی:

"امیر حسین! جب تم سردار تیمور کے اعتماد کو ٹھکرا کر موت کے منہ میں جانا چاہتے ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی جان دوں گی"۔

"مجھے افسوس ہے دلشاد آغا!"

موئڈارلات دکھ سے بولا:

"اوّل تو یہ کہ امیر حسین کے لیے صرف ایک گھوڑے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اگر آپ نے ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تو گرفتاری کے امکانات بڑھ جائیں گے نیز آپ ان کی ہلاکت کا سبب بھی بن سکتی ہیں"۔

دلشاد آغا لاجواب ہو کر موئڈارلات کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"میں تیار ہوں سردار ارلات"۔

امیر حسین جلدی سے بولا:

"آپ دلشاد کی حفاظت کا وعدہ کیجیے"۔

"آپ مطمئن رہیں امیر حسین!"

موئڈارلات نے سپاٹ لہجے میں کہا:

"وہ تاتاری خواتین جو اپنے شوہروں کے ساتھ میدانِ جنگ میں شانہ بشانہ لڑتی ہیں وہ قابلِ احترام ہوتی ہیں۔ دلشاد آغا کی عزت و وقار میں کوئی فرق نہیں آنے دیا جائے گا"۔

امیر حسین موئڈارلات کے ساتھ خیمے سے باہر آیا۔ اسے جانے کے لیے گھوڑا تیار تھا۔ اس نے محبت سے دلشاد آغا کا ہاتھ دبایا اور جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے گھوڑا مہمیز پا کر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

امیر حسین ایک نامعلوم منزل کو رواں تھا اور دلشاد آغا اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔

"آپ جا کے آرام کیجیے دلشاد آغا"۔ یہ کہتا ہوا موئڈارلات واپس ہو گیا۔

⊙

کہا جاتا ہے کہ رات بڑی پردہ پوش ہوتی ہے۔ دنیا کے تمام گھناؤنے کام اس کی تاریک چادر کے دامن

ہی میں انجام دیے جاتے ہیں۔

وہ رات بھی بظاہر پُرسکون تھی۔

تیمور تمام رات کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک طرف اس کے تمام بااثر سردار تھے جو شیر بہرام کے قاتل کو
ملیں بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف اس کی اکیلی ذات، جس میں الجائی خاتون کی یاد
اب دلشاد آغا کی باتیں شامل ہو گئی تھیں۔

اسے امیر حسین کے مقدمے کا صبح کو فیصلہ کرنا تھا۔ تاخیر کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اپنے طور پر تو وہ فیصلہ
چکا تھا۔ وہ امیر حسین کو غزنی کی حکومت سونپنے پر اب بھی آمادہ تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ امیر حسین کے
دو صورتیں رکھے گا:

۱۔ وہ چاہے تو غزنی واپس چلا جائے۔ یہ تیمور کی پیش کش تھی۔

۲۔ ورنہ پھر حج پر روانہ ہو جائے، جس کی امیر حسین نے خود خواہش کی تھی۔

دلشاد آغا بھی رات بھر جاگتی رہی تھی۔ وہ اس بات سے خوش تھی کہ امیر حسین اس وقت تک بہت
چکا ہو گا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک نامعلوم خوف اس کے دل میں کسی طرف سے در آنا اور وہ سوچنے لگی کیا موٹدار
واقعی امیر حسین کا ہمدرد ہے؟

امیر موٹدار لات اور تیمور کے دوسرے سردار بھی اس رات چین سے نہ سو سکے۔ انہیں فکرِ فردا ستا رہی
وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے جو قدم اٹھایا ہے اگرچہ وہ متفقہ تھا پھر بھی کہیں ان کا یہ قدم تیمور کے غضب
سبب نہ بن جائے۔

چنانچہ جب بلخ کی مسجدوں میں فجر کی اذان گونجی تو وہ سہم گئے۔ چند لمحوں بعد اس خیمہ گاہ میں ایک
انکشاف ہونے والا تھا جس سے ایک عظیم فتنہ بھی جنم لے سکتا تھا۔

نماز ختم ہوتے ہی لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

"امیر حسین مارا گیا۔ قید سے بھاگ نکلا تھا۔"

"محافظوں نے اسے ایک میل دور جا کے پکڑا۔ اس نے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔"

"سردار تیمور نے دلشاد آغا کی سفارش پر اسے معاف کر دیا تھا لیکن اس کے سر پر موت کھیل رہی تھی۔"

"ہاں۔ جبھی تو بھاگا اور محافظوں نے پکڑ کر قتل کر دیا۔"

جتنے منہ اتنی باتیں!

نمازیوں کے ساتھ یہ خبر شہر میں پہنچی۔ تیمور کے لشکری بھی مسجد میں تھے۔ وہ اپنے ساتھ یہ خبر خیمہ گاہ

میں لے آئے۔

تیمور نے اپنے خیمے میں نماز پڑھی تھی۔

"امیر حسین مارا گیا!"

سب سے پہلے ایلچی بہادر نے اس خبر کی تصدیق کی۔

"مگر کب؟ کیسے؟ کہاں؟" تیمور نے گھبرا کر پوچھا۔

"سردار!"

امیر جعاکو داخل ہوتے ہوئے بولا:

"امیر حسین فرار کے دوران مارا گیا۔ اس کی موت یونہی لکھی تھی۔"

"اس کا وقت آ گیا تھا سردار!"

موٹدار لات بھی آ گیا:

"موت برحق ہے۔ پھر وہ تھا بھی اسی قابل۔"

"امیر حسین محافظوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔"

بوڑھے جاکو برلاس نے اندر آ کر کہا:

"مگر افسوس کس بات کا؟ اس نے بھی تو ہمارے ساتھی شیر بہرام کو قتل کر دیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ ہمیں کوئی افسوس نہیں۔ مر گیا۔ اچھا ہی ہوا۔"

تیمور کے کانوں میں اس طرح کی مسلسل آوازیں پڑتی رہیں۔ آوازیں مختلف، الگ الگ لوگوں کے
منہ سے نکلی ہوئی! لیکن مقصد و مفہوم سب کا ایک تھا۔ تیمور کو اندازہ ہو گیا کہ امیر حسین کے مارے جانے کا
کسی کو افسوس نہیں بلکہ وہ سب خوش ہیں۔ پتہ نہیں تیمور کو امیر حسین کا افسوس ہوا کہ نہیں لیکن وہ اس بات سے
مطمئن تھا کہ امیر حسین لشکر گاہ کے باہر فرار کے دوران مارا گیا۔ اس لیے تیمور کی طرف کوئی انگلی نہ اٹھا سکتا تھا۔
اس نے اس سلسلے میں کچھ زیادہ تحقیقات کی بھی ضرورت نہ محسوس کی۔ اس کے تمام سردار یک زبان ہو کر کہہ رہے تھے کہ
امیر حسین فرار کے دوران مارا گیا۔ پھر وہ ان کی بات پر اعتبار کیوں نہ کرتا۔

تیمور نے اپنے محافظ سواروں کو حکم دیا کہ امیر حسین کی لاش لے آئیں اور اسے دلشاد آغا کے سپرد کر دیں۔ اس
نے امیر حسین کے کفن دفن کا بھی حکم دیا۔

دلشاد آغا امیر حسین کی لاش دیکھ کر رونے کے بجائے دہشت زدہ ہو گئی۔ اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔
اس کی کنیزیں رو رہی تھیں لیکن وہ دم بخود کھڑی ان کا منہ تک رہی تھی۔

امیر حسین کی موت کے متعلق مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ تیمور کے جان بخشی کے وعدے کے باوجود امیر حسین نے راہِ فرار اختیار کی اور بھیس بدل کر مسجد میں جا چھپا۔ اگلی صبح کو مؤذن نے اسے پہچان لیا اور گرفتار کرا دیا۔

ایک روایت کے مطابق امیر حسین ایک مسجد کے مینار میں جا کر چھپ گیا۔ اس کی تلاش جاری تھی کہ ایک آدمی مسجد کے مینار پر چڑھا تاکہ اپنے گم شدہ گھوڑے کو دور دور تک دیکھ سکے۔ اسے گھوڑا تو دکھائی نہ دیا البتہ امیر حسین نظر آ گیا۔ اس نے امیر حسین کو گرفتار کرا دیا اور تیمور کو اطلاع ہونے سے پہلے ہی اس کے سرداروں نے امیر حسین کو ختم کر دیا۔

بہر حال اس پر سب کو اعتقاد تھا کہ امیر حسین خیمے سے نکل بھاگا تھا۔ کسی مؤرخ نے بھی امیر حسین کے قتل پر تیمور کو ملوث نہیں کیا۔ جو کچھ ہوا اس کا علم تیمور کو نہ تھا۔

امیر حسین کو پورے شاہانہ طریقے سے دفن کیا گیا جس میں تیمور اور اس کے تمام سرداروں نے شرکت کی۔ تیمور نے بعد میں امیر حسین کا مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا تھا۔

امیر حسین کے کفن دفن کے دوران تیمور اور دلشاد آغا کا کئی بار سامنا ہوا لیکن دونوں ایک دوسرے سے نظر بچا گئے۔ تیمور کو اپنی جگہ یہ شرمندگی تھی کہ اس نے دلشاد آغا سے امیر حسین کی جان بخشی کا وعدہ کیا تھا لیکن امیر حسین قتل ہو گیا۔ دوسری طرف دلشاد آغا بھی شرمندگی کی وجہ سے تیمور کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر شرمندہ تھی کہ اگر تیمور نے اس سے پوچھا کہ امیر حسین کی معافی کے باوجود دلشاد آغا نے اسے کیوں فرار ہونے دیا تو وہ کیا جواب دے گی؟

اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ تیمور اس سے اس معاملے میں سخت باز پرس کرے گا لیکن کچھ دن گزرنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ تیمور کا رویہ اس کے ساتھ نہ صرف معالمانہ ہے بلکہ دوستانہ بھی ہے۔ تیمور نے حکم دیا کہ دلشاد آغا کو وہ تمام مراعات حاصل رہیں گی جو اسے بحیثیت ملکہ غزنی حاصل تھیں۔ اس کا خیمہ تبدیل کر دیا گیا اور اس کے ملازمین کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔

امیر حسین کی موت کے ساتھ تاتاریوں کی خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا۔ امیر حسین کے قبضے میں غزنی، کابل او

ماوراء النہر کا کچھ علاقہ تھا۔ وہ سب تیمور کے قبضے میں آ گیا۔ اب پورے تاتار میں اس کا کوئی مدِمقابل نہ تھا۔ سمرقند کی حکومت کا جھگڑا ابھی نمٹ گیا تھا۔

تاتاری مسلمان ہو جانے کے باوجود اب بھی چنگیز خانی قانون کو بعض حصوں کو تسلیم کرتے تھے۔ مغلوں میں خاقان کے مرنے کے بعد دوسرا خاقان مقرر کیا جاتا تھا۔ امیر قزغن کے بعد سمرقند کا تخت خالی ہو گیا تھا۔ امیر حسین نے اس کا دعویٰ کیا تھا لیکن وہ تیمور کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہو چکا تھا۔ دوسری طرف بلادِ شمال کے مغلوں کا اقتدار بھی ختم ہو گیا تھا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ تاتاریوں کا حاکم اعلیٰ منتخب کیا جائے۔

نئے امیر یا حاکم کے انتخاب کے لیے ضروری تھا کہ پرانے مغل دستور کے مطابق قورلتائی (مجلسِ مشاورت) منعقد ہو اور تمام بڑے بڑے سردار، اتفاق رائے سے اپنا حاکم چن لیں۔ چنانچہ ہندوستان کے دروں سے لے کر شمال کے مرغزاروں تک تمام قبائل کے سرداروں کو قورلتائی میں شرکت کے لیے پیغامات بھیجے گئے۔

یہ ایک بڑا اہم مسئلہ تھا اس لیے خبر ملتے ہی قبائلی سردار جوق در جوق بلخ میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ قورلتائی کا اجتماع بھی دیدنی تھا۔ اس میں عمامہ پوش ایرانی شہزادے، آئمہ کرام، بخارا کے علما، درس گاہوں کے شیوخ، خادمانِ دین شرکت کے لیے بلائے گئے۔ تیمور نے اپنے مرشد ہادیٔ زمان مولانا زین الدین اور ان کے مصاحبین کو خصوصی دعوت نامہ بھیجا۔ ماوراء النہر کے ہادی و مرشد خواجہ بہاء الدین کو بھی مدعو کیا گیا۔ غرض یہ کہ پورے ملکِ تاتار میں کوئی فوجی افسر، عالم، صوفی اور سردارِ قبیلہ نہ تھا جس کے پاس تیمور کا قاصد نہ پہنچا ہو اور اسے فوراً قورلتائی میں پہنچنے کا پیغام نہ دیا گیا ہو۔ یہ تمام انتظامی امور تیمور کی طرف سے کیے جا رہے تھے لیکن تیمور کا یہ عالم تھا کہ وہ اس سے بالکل لاپروا نظر آتا اور اپنے آپ کو ملکی انتظام میں مصروف ظاہر کرتا۔

ملکِ تاتار کے تمام سرداروں کو علم تھا کہ قورلتائی میں کسی نئے امیر کا انتخاب نہ ہو گا بلکہ تیمور کے حق میں ان سے رائے مانگی جائے گی کیونکہ سوائے تیمور کے اور کوئی اس منصب کا اہل نظر نہ آتا تھا۔

قورلتائی میں، دور دراز علاقوں سے بھی سرداروں کو شرکت کے لیے آنا تھا اس لیے اس کی تاریخ دو ماہ بعد مقرر کی گئی تھی تاکہ تمام مدعوئین آسانی سے بلخ پہنچ جائیں لیکن ابھی ان کی آمد کا سلسلہ شروع بھی نہ ہوا تھا کہ تیمور کو ایک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔

تیمور کا ایک جانثار شیر بہرام تو امیر حسین کے ہاتھوں قتل ہوا تھا جس کا غم ابھی دور نہ ہوا تھا کہ تیمور کو اپنے ایک اور عزیز دوست اور ساتھی کا غم برداشت کرنا پڑا۔

تیمور قورلتائی کے انتظامات میں منہمک تھا کہ اسے ختلان کے حاکم کیخسرو کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ کیخسرو پہلے امیر حسین کا حلیف تھا لیکن جب اس کے بھائی کو امیر حسین نے بلاوجہ قتل کرا دیا تو وہ امیر حسین سے خفا ہو کر تیمور کے

پاس آ گیا لیکن امیر حسین کے قتل ہوتے ہی اس نے تیمور کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ وہ پہلے شمال کے مغلوں کا ہمدرد اور ان کا باجگذار تھا۔ اس نے فوراً مغلوں سے امداد طلب کی۔ مغل تک تاتار ہو چکے تھے لیکن کیخسرو کی مدد کو انہوں نے کچھ فوج بھیج دی۔ کیخسرو کا حوصلہ اس وجہ سے بھی بڑھ گیا تھا۔

تیمور کو علم تھا کہ ابھی اسے بہت سے سرکش سرداروں کو زیر کرنا ہے۔ اس نے فوراً کیخسرو کا فیصلہ کیا اور ایک فوج ترتیب دی۔ قورلتائی کا دن قریب آ رہا تھا اس لیے تیمور کے سرداروں نے مشورہ دیا کہ اس وقت تیمور کی بلخ میں موجودگی ضروری ہے۔ اس لیے اپنے بجائے وہ کسی سردار کو کیخسرو کے مقابلے پر بھیجے۔ تیمور نے اس مشورے کو پسند کیا اور تین سرداروں کو اس مہم کے لیے منتخب کیا۔ یہ امیر جغتائی، عرب سردار شیخ علی بہادر اور مشہور طرحدار ایلچی بہادر تھے۔

ان میں صرف ایلچی بہادر سمجھدار تھے اور حکمتِ عملی سے کام لیتے تھے۔ باقی دونوں سردار نہایت تند اور جلالی فطرت کے مالک تھے۔ بات بات پر تلوار کھینچتے اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ تیمور نے ضروری ہدایات دے کر بھیجا تھا لیکن بلخ سے روانہ ہوتے ہی ان کی تندخوئی عود کر آئی۔ وہ اس قدر تیزی کے ساتھ کیخسرو کی طرف بڑھے کہ باقی فوج ان سے پیچھے رہ گئی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ اس قدر آگے نکل گئے کہ انہیں کسی جگہ ٹھہر کر کئی کئی گھنٹے فوج کا انتظار کرنا پڑا۔

ایک دن یہ تینوں فوج سے بہت آگے ایک دریا کے کنارے گھوڑے اڑائے چلے جا رہے تھے کہ ان کی نظر دریا کے دوسری طرف پڑی تو وہاں ایک فوج نظر آئی۔ انہوں نے گھوڑوں کی راسیں کھینچیں اور پیڑ کی آڑ میں چھپ گئے۔ انہیں شبہ تھا کہ یہ مغلوں یا کیخسرو کی فوج ہے۔

ذرا دیر بعد انہیں دریا پار کیخسرو گھوڑے پر سوار نظر آیا۔ اس کے ساتھ کئی مغل سردار بھی تھے۔ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ یہ وہی فوج ہے جس کی تلاش میں وہ آئے ہیں، ان تینوں نے آپس میں صلاح مشورے شروع کر دیے۔

"ہمیں پہلے اپنی فوج کا انتظار کرنا چاہیے"۔

ایلچی بہادر نے نہایت صائب مشورہ دیا:

"فوج کی آمد سے پہلے حملے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا"۔

"ہوں....."

امیر جغتائی غرایا:

"تمہارا مطلب ہے کہ جب تک فوج نہ آئے ہم چوروں کی طرح یہاں چھپے بیٹھے رہیں اور دشمن امیر جغتائی بہادر"۔

ایلچی بہادر نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی:

"ہم صرف تین ہیں۔ بیچ میں دریا۔ اُس طرف دشمن کی پوری فوج۔ سوائے انتظار کے ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

"دیکھتے رہو کہ کیا ہو سکتا ہے؟"

ایلچی بہادر نے اسے حیرت سے دیکھا۔ امیر جغتائی بہادر دراصل مغل سردار تھا اور اب تیمور کا وفادار ہو گیا تھا۔ اس کی طبیعت میں مغلوں جیسی سختی اور تندی موجود تھی۔ ایلچی بہادر نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر امیر جغتائی بہادر سے زیادہ بحث کی تو وہ تلوار کھینچ لے گا اور دو میں سے ایک مارا جائے گا۔

امیر جغتائی بہادر کو ایلچی بہادر کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے شیخ علی بہادر کو دیکھا۔ لطف یہ کہ وہ دونوں اپنی تندی اور بد دماغی کی وجہ سے پورے تاتاری لشکر میں مشہور تھے لیکن دونوں میں خوب گہری دوستی بھی تھی۔

شیخ علی بہادر نے گھور کر امیر جغتائی کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا:

"خوب، بہت خوب۔ کیا مغل اسی طرح لڑتے ہیں؟"

بھلا امیر جغتائی بہادر یہ طنز کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ تڑپ کے اٹھا۔ اچک کے گھوڑے پہ بیٹھا اور بولا:

"شیخ علی! میں دکھاتا ہوں کہ مغل کیسے لڑتے ہیں؟"

اس کے ساتھ ہی اس نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔

شیخ علی بہادر اور ایلچی بہادر حیرت زدہ رہ گئے۔ انہیں امیر جغتائی بہادر سے ایسی حماقت کی امید نہ تھی۔ پھر ان کی حیرت کی اُس وقت تو انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ امیر جغتائی نے دریا پار کیا اور دوسری طرف پہنچتے ہی کیخسرو کے سواروں پر حملہ کر دیا۔

یہ شیخ علی بہادر کی بہادری پر بہت بڑا تازیانہ تھا۔ وہ بجلی جیسی سرعت سے اٹھا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور دریا کا تیز دھارا کاٹنے لگا۔

ایلچی بہادر کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ اس نے بھی اپنا گھوڑا دریا میں اتار دیا۔ شیخ علی بہادر جس وقت دریا پار پہنچا تو اس وقت تک امیر جغتائی، دشمن کے دو سواروں کو ختم کر چکا تھا لیکن اب وہ دشمنوں کے نرغے میں آ گیا تھا۔

شیخ علی بہادر نے ایک نعرہ لگایا اور دشمنوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے سامنے جو آیا وہ یا تو مارا گیا یا پیچھے ہٹ گیا۔ شیخ علی نے جلد ہی امیر حطائی کا گھیرا توڑ دیا اور مارتا کاٹتا اس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر امیر حطائی سے کہا:

"امیر اس طرح لڑنا حماقت ہے۔ پاگل نہ بنو۔ واپس چلو۔"

"مغل حملہ کر کے واپس نہیں جایا کرتا۔ تمہیں واپس جانا ہے تو چلے جاؤ۔" امیر حطائی نے بھی اسی طرح جواب دیا اور اس کے حملے میں شدت پیدا ہو گئی۔

"لاحول ولا قوۃ۔" شیخ علی کے منہ سے نکلا۔

اب دونوں دوست شانہ بشانہ دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران بھی ان کی زبان کے ساتھ ساتھ تلواریں بھی چلتی رہی تھیں۔ اس دن ان دونوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ . . . . لیکن عین وقت پر ان کا لشکر دریا عبور کر کے ان کی مدد کو پہنچ گیا۔

پھر زبردست لڑائی ہوئی۔ تیمور کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی اور کیخسرو گرفتار ہوا۔ اس کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں اس فتح پر خوش ہو رہے تھے کہ چند سواروں نے بتایا کہ ایلچی بہادر مع گھوڑے کے دریا پار کرتے ہوئے غرق ہو گیا ہے۔ اس خبر سے ان کے چہرے اتر گئے۔

جب تیموری لشکر کیخسرو کو گرفتار کر کے تیمور کے پاس پہنچا تو اسے جہاں اس فتح کی خوشی ہوئی وہاں ایلچی کی غرقابی سے اسے سخت صدمہ ہوا۔ تیمور نے اپنے دوست کا کئی دن سوگ منایا۔ دو ماہ کے عرصے میں تیمور کے دو دوست اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے تھے۔

O

قرولتائی کا اجلاس شروع ہوا۔ تیمور نے قصداً اس میں شرکت نہ کی۔ مجلس میں بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ سرداروں کی اکثریت تیمور کے حق میں تھی لیکن وہ قبائلی سردار جو زیادہ طاقتور تھے اور جن کے قبائل تعداد میں زیادہ تھے تیمور کو اپنا حاکم ماننے پر تیار نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ کسی کی ماتحتی برداشت کرنے پر کسی صورت بھی آمادہ نہ تھے۔

"ہمارا ملک مغلوں کی غلامی سے آزاد ہو چکا ہے۔" ایک بدخشانی سردار نے کہا۔ . . . "خانہ جنگی ہو

چکی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ملک کو آپس میں تقسیم کرلیں اور اپنے علاقوں میں آزاد امیر کی طرح حکومت کریں اگر خدانخواستہ ہم پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو ہم سب متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں۔ بھائیوں کی طرح خلوص اور محبت سے رہنے کا یہی طریقہ ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں بھائیوں کی طرح رہنا چاہیے۔"

بوڑھا جاکو برلاس سنجیدگی سے بولا:

"لیکن بھائیوں میں اتحاد اور میل ملاپ اسی وقت برقرار رہتا ہے جب ان کے سر پر ایک بڑا بھائی ہو جو انہیں اونچ نیچ سمجھاتا رہے۔ ملک کو تقسیم کرنے کا مطلب اپنی طاقت کو تقسیم کر دینا ہے۔ تمہارے الگ الگ ہوتے ہی شمال کے مغل پھر پلٹ آئیں گے اور فرداً فرداً ہر حاکم کو شکست دے دیں گے۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔ کوئی کسی کا ساتھ نہ دے گا اس لیے ایک امیر بادشاہ کا انتخاب ضروری ہے۔"

جاکو برلاس نے معقول دلیل دی تھی لیکن طاقتور سرداروں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ ایک سردار نے سخت لہجے میں کہا:

"امیر یا بادشاہ کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے پرانے دستور میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہمیں امیر قزغن کے طریقے پر چلنا چاہیے اور چنگیز خان کی اولاد میں سے کسی کو بادشاہ مقرر کرنا چاہیے۔ ایسی صورت میں سردار تیمور کو اس کا نائب مقرر کیا جا سکتا ہے۔"

علماء اور درویش یہ سنتے ہی بگڑ کر کھڑے ہو گئے۔ خواجہ ابوالبرکات نے مخالفت کرتے ہوئے کہا:

"الحمدللہ ہم مسلمان ہیں اور مغل اب تک کافر ہیں۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم مسلمان اور طاقتور ہوتے ہوئے اپنے آپ ایک غیر مسلم کو اپنے سر پر مسلط کریں۔ سردار تیمور کی طاقت چنگیز خان سے کسی طور کم نہیں۔ پھر ہم مغلوں کی محکومی کیوں قبول کریں۔ تم وہ وقت کیوں بھولتے ہو جب بلادِ شمال کے زیر ظلم کے خوف سے صحراؤں اور پہاڑوں میں منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ ان کے مقابلے پر تیمور کی تلوار بلند ہوئی۔ مغلوں کے خلاف اٹھنے والی یہ پہلی تلوار تھی۔ تم میں بھی ہمت پیدا ہوئی اور سب نے مل کر مغلوں کو مار بھگایا لیکن خیال رہے کہ سردار تیمور نے تم سے نہ اس وقت مدد مانگی تھی اور نہ آج وہ تمہاری مدد کا خواہاں ہے۔ اس کے بازوؤں میں طاقت موجود ہے اور عنانِ حکومت وہی ہاتھ سنبھال سکتے ہیں جو تلوار چلانا جانتے ہوں۔ ہم تمام درویش، علماء اور شیوخ کا واضح اعلان ہے کہ ہم نے سردار تیمور کو ملکِ تاتار کا امیر اور بادشاہ تسلیم کر لیا ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ اس وجہ سے نہیں کیا کہ سردار تیمور کوئی بڑا دیندار آدمی ہے بلکہ تیمور نے اپنی اہلیت، جاں بازی اور فوجی تدبر سے مغلوں کو شکست دے کر ہمیں سر بلند کر کے چلنے کا موقع

فراہم کیا

"سردار تیمور ہمارا امیر ہے"۔ امیر حفظائی بہادر نے چیخ کر کہا۔

"وہ ہمارا بادشاہ ہے"۔ شیخ علی بہادر نے اس کی آواز میں آواز ملائی۔

مخالفت کا طوفان دب گیا۔ اب کس میں ہمت تھی کہ سردار تیمور کو "امیر" تسلیم کرنے سے انکار کرتا جبکہ تیمور کو تاتاری سرداروں کے علاوہ بعض مغل سرداروں کا بھی تعاون حاصل تھا جو مغلوں کی شکست کے بعد تیمور کے سایہ عافیت میں پناہ لے چکے تھے۔

تیمور کو امیر منتخب کر لیا گیا اور خود پوشش قبائلی سرداروں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ دوسرے دن تمام قبائلی سردار اور حاکم، تیمور کے خیمے میں اظہارِ اطاعت کے لیے حاضر ہوئے۔ تیمور حسبِ معمول زرہ بکتر پہنے ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھا تھا۔

تمام سردار اس کے سامنے قالین کے فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر ایک سردار نے سفید نمدے کا مسند اور تیمور کے تخت کے پاس آ کر اس سے تخت پر مسند بچھانے کی اجازت چاہی۔ تیمور تخت سے اتر گیا، سفید مسند تخت پر لگا دی گئی۔ پھر سب نے یک زبان ہو کر تیمور سے مسند پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ تیمور مسند پر بیٹھ گیا۔

مغلوں کے دستور کے مطابق سفید مسند پر صرف شاہِ وقت یا حاکمِ اعلیٰ بیٹھتا تھا۔ اب تیمور کا لقب "امیر تیمور گورگاں" ہو گیا۔

آخری رسم "حلفِ وفاداری" کی تھی۔

امیر تیمور کے پیر و مرشد مولانا زین الدین نے قرآن منگوا کر درمیان میں رکھا۔ پھر ایک ایک سردار کو بلایا۔ سردار آتے۔ قرآن پر ہاتھ رکھتے اور امیر تیمور سے وفاداری کا اقرار کرتے۔

تاتاریوں میں اس رسم کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ آج سے تاتاری تیمور کے مطیع اور فرمانبردار ہو گئے۔ اس کے صلے میں تیمور رعیت کی املاک کا محافظ ہو گا اور ان کے تمام جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔

آخر میں مولانا نے کھڑے ہو کر دعا پڑھی اور امیر تیمور کو مخاطب کر کے کہا:

"اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی تھی کہ آپ سپہ سالار، فاتح اور تاتاریوں کے امیر بنیں اور آپ کی عظیم طاقت اسلام کی تقویت کا باعث بنے"۔

امیر تیمور اس وقت چار آئینہ سجائے، بازو بند اور شانہ گیر لگائے اور سر پر زریں کام کا جگمگاتا خود سجائے بڑا پُروقار اور بارعب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اس خوشی کے موقع پر دل کھول کر تحائف تقسیم کیے۔ قیمتی خلعتیں،

مرصع زینیں اور گھوڑے جو کچھ اس کے پاس تھا، اس نے سرداروں میں تقسیم کر دیا۔ ہر سردار کے خیمے پر میووں اور کھانے کی کشتیاں بھجوائیں۔ قرولتائی میں آنے والے عالموں اور درویشوں کو یہ فضول خرچی پسند نہ آئی۔ ایک درویش سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے سردار تیمور سے کہا:

"انعام و اکرام امیر پر واجب ہے لیکن سب کچھ لٹا دینا آئین اور اصولِ سلطانی کے خلاف ہے"۔

امیر تیمور نے درویش کو مسکرا کر دیکھا اور بڑی سادگی سے جواب دیا:

"اے درویشِ محترم! میں سب کچھ بخش دینے کے بعد بھی غریب نہیں ہوں کیونکہ اگر میں "امیر" ہوں تو ان سب کی دولت میری دولت ہے اور میں حاکمِ وقت اور امیرِ تاتار نہیں تو میرے پاس جو دولت ہے وہ کس کام کی؟"

درویش اس جواب سے خوش بھی ہوئے اور مطمئن بھی۔ پھر کبھی کسی نے تیمور کی داد و دہش اور دریا دلی پر اعتراض نہ کیا۔

تیمور کے تمام لواحقین اور عزیز و اقارب قرولتائی کی خبر سن کر بلخ پہنچ گئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ قرولتائی میں سردار تیمور کو ہی "امیرِ تاتار" چنا جائے گا۔ ان میں شہرِ سبز کے بہت لوگ تھے۔ سمرقند سے اس کی بہن اور بہن کے تمام عزیز بھی اسے مبارک باد دینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

دربار کے بعد جب تیمور خواتین کے خیمے میں پہنچا تو اس کے قبیلے کی عورتوں اور سرداروں کی بیگمات نے اسے گھیر لیا۔ کسی نے بلائیں لیں۔ کسی نے صدقہ اتارا۔ ہر طرف مبارک باد کا غلغلہ اٹھا۔ تیمور نے بزرگ خواتین کی دعاؤں کے جواب میں انہیں ادب سے سلام کیا۔ بچیوں اور نوعمر لڑکیوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور انہیں تحائف دیے۔ یکایک تیمور کی نظر خیمے کے ایک طرف پڑی جہاں دلشاد آغا سب سے الگ کھڑی بڑی مسرت اور دلچسپی سے امیر تیمور کو دیکھ رہی تھی۔

"امیر کی نوازشوں کے لیے شکر گزار ہوں"۔

دلشاد نے بغیر نظر ملائے جواب دیا:

"آپ نے مجھ بدنصیب کو سہارا دے کر سخاوت اور احسان کی ایک مثال قائم کی ہے ورنہ مفتوح کے حرم کا فاتح کے ہاتھوں جو حال ہوتا ہے اس سے کون واقف نہیں"۔

خواتین تیمور کو گھیرے ہوئے تھیں لیکن تیمور کو دلشاد آغا سے گفتگو کرتے دیکھ کر پاس ادب سے ذرا پیچھے ہٹ گئی تھیں۔

تیمور نے پھر بھی کنکھیوں سے اپنے اردگرد دیکھا۔ پھر سرگوشی کی: "دلشاد آغا! تم ملکہ تھیں اور ملکہ ہی

دلشاد آغا نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں لیکن تیمور کے قدم آگے بڑھ چکے تھے اور عورتوں نے پھر اسے اپنے
حلقے میں لے لیا تھا۔

تیمور بہت دیر تک خواتین کے درمیان رہا لیکن نہ تو اس نے دوبارہ دلشاد آغا سے گفتگو کرنے
کی کوشش کی اور نہ دلشاد آغا اس کے قریب گئی۔

دلشاد آغا تذبذب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ بار بار تیمور کے آخری جملے کا کوئی واضح مطلب نکالنے کی کوشش
کرتی لیکن الجھ کر رہ جاتی۔ اس کی سمجھ میں یہ تو آ گیا تھا کہ تیمور اس کے شاہانہ وقار کو برقرار رکھنا چاہتا ہے لیکن
اس کی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ تیمور چلا گیا لیکن دلشاد آغا کی
پُرسکون دنیا میں تلاطم پیدا کر گیا۔

اسی شام تیمور نے مولانا زین الدین سے تنہائی میں ملاقات کی۔ مولانا کے گھر کی خواتین بھی اس وقت
خیمے میں موجود تھیں جس وقت تیمور اور دلشاد آغا کے درمیان سرگوشیوں میں باتیں ہوئی تھیں۔ ان خواتین نے
یہ بات مولانا کے کان میں ڈال دی تھی۔ مولانا خود بھی امیر تیمور کی تنہائی کی طرف سے پریشان تھے۔ الجائی خاتون کو
کے چھ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور تیمور نے اب تک دوسری شادی کا ارادہ نہیں کیا تھا۔

"مولانائے محترم! میں ایک ذاتی معاملے میں آپ کا مشورہ چاہتا ہوں۔"

تیمور نے بڑے ادب سے کہا:

"لیکن یہ خیال دامن گیر ہے کہ کہیں آپ میری خواہش کو طاقت کے غلط استعمال کا نام نہ دیں۔"

مولانا زین الدین سمجھ گئے کہ تیمور دلشاد آغا کے سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتا ہے لیکن شاید اس خیال
سے جھجک رہا ہے کہ اس کی عمر اب پینتیس سال سے تجاوز کر چکی ہے اس لیے مولانا نے اس کی الجھن دور کرنے کا کام
اپنے اوپر لے لیا۔ وہ بولے:

"اے امیر! اب آپ اپنے ذاتی اور ملکی معاملات میں خود مختار ہیں۔ آپ کو کسی سے صلاح و مشورے کی ضرورت
نہیں۔ بہرحال، یہ امیر کی سعادت مندی ہے کہ وہ اب بھی مجھے کسی مشورے کے قابل سمجھتے ہیں لیکن قبل اس کے
کہ آپ اپنا مسئلہ بیان کریں، پہلے میری ایک پریشانی پر توجہ فرمائیے۔ یہ پریشانی صرف میری ہی نہیں بلکہ اس الجھن
میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو شروع سے اب تک آپ کی ذات اور جدوجہد آزادی میں آپ کے شریک ہیں۔"

"آپ کو کیا پریشانی ہے مولانا؟"

تیمور الجھ گیا:

"میں اپنے تمام دیرینہ دمسازوں اور دوستوں کو انعام و اکرام سے نوازنا چاہتا ہوں۔ اگر انہیں کوئی پریشانی

تو آپ نے مجھے پہلے آگاہ کر دیا ہوتا۔"

"آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں امیر!"

مولانا نے سنجیدگی سے کہا:

"ہم لوگ دراصل آپ کی تنہائی اور اس بے سکون زندگی سے پریشان ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ الجائی خاتون کا
پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی درست ہے کہ آپ کو ان سے بے پناہ محبت تھی اور اب بھی ہے لیکن انسان،
ت ایزدی کے آگے بے بس ہے۔ جس کو جتنی عمر عطا ہوئی ہے وہ اس سے ایک سانس آگے نہیں جا سکتا۔
شہزادہ جہانگیر پر نظر ڈالیے۔ وہ جوانی میں قدم رکھ رہا ہے۔ وہ ممتا سے محروم کنیزوں کے ہاتھوں پرورش پا
ہے۔ اس عمر میں شہزادے کو ماں کی نصیحتوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ دوسری شادی کر لیں تو آپ کی تنہائی دور
جائے گی اور شہزادے کو صحیح راستہ دکھانے والا بھی میسر آ جائے گا۔"

تیمور دل میں بہت خوش ہوا۔ وہ اسی معاملے میں گفتگو کے لیے آیا تھا۔ وہ اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے
خوش دلی سے بولا:

"مولانا! اگر آپ اور میرے احباب کا یہ مشورہ ہے تو میں اس پر خوشی کے ساتھ عمل کرنے پر تیار ہوں۔ میں
بھی کچھ دنوں سے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔"

"اے امیر! آپ نے ہم سب کا بوجھ ہلکا کر دیا۔"

مولانا فوراً بولے اور بات آگے بڑھائی:

"اگر آپ نے اب تک کسی ہستی کا انتخاب نہیں کیا ہے تو میں ایک خاتون کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ میرے خیال
والدہ مرحومہ الجائی خاتون آغا کی کمی کچھ نہ کچھ ضرور پوری کر سکتی ہیں۔"

تیمور گھبرا گیا۔

وہ تو پہلے سے کسی کو منتخب کر چکا تھا۔ اسے ڈر پیدا ہوا کہ مولانا کسی ایسی خاتون کا نام نہ تجویز کر دیں جس
کے لیے انکار کرنا پڑے اور مولانا کی خواہ مخواہ دل آزاری ہو لیکن بات مولانا کے منہ سے نکل چکی تھی اس لیے اس
نے احتیاطاً کہا:

"مولانائے محترم! میرے ذہن میں کچھ نام ہیں۔ آپ اپنی تجویز بتائیے۔ میں فیصلہ کرتے وقت اس نام کو بھی
پیش نظر رکھوں گا۔"

مولانا نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا:

"آپ اپنے فیصلے میں مختار ہیں اور ہم آپ کے فیصلے کو ہر صورت قبول کریں گے۔ پھر بھی یہ میری خواہش ہے،

کہ اگر آپ اس اہم منصب کے لیے سابق ملکہ دلشاد آغا کو پسند کریں تو نہایت مناسب رہے گا۔ ملکہ ایک بہادر اور سمجھدار خاتون ہیں۔ وہ ایک غمزدہ بیوہ بھی ہیں۔ اس منصب پر فائز ہونے سے وہ اپنے غم بھلائیں گی۔ ان کی دلجوئی ہوگی اور ان سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ وفاداری اور جاں نثاری کی امید کی... لیکن یہ میرا محض مشورہ ہے۔"

تیمور کا دل مسرتوں سے لبریز ہو گیا۔ وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور فوراً بولا:

"مجھے آپ کی تجویز سے اتفاق ہے۔ . . . . دلشاد آغا کا نام میرے ذہن میں بھی تھا۔ آپ نے تجویز کر کے مجھے بہت سی الجھنوں سے بچا لیا۔"

"اے امیر! خدا آپ کی عمر میں برکت دے۔"

مولانا نے خوش ہو کر کہا:

"دلشاد آغا یقیناً ایک بہترین ملکہ ثابت ہوں گی۔ میرا مسئلہ تو آپ نے حل کر دیا۔ اب آپ اپنی... آپ کو کس سلسلے میں مشورہ درکار ہے؟"

"میرا مسئلہ بھی آپ کے مسئلے میں شامل ہو گیا۔"

تیمور مسکرا کر کھڑا ہو گیا:

"اب کسی مزید مشورے کی ضرورت نہیں۔"

تیمور واپس چلا گیا۔ مولانا نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ درست نکلا۔

○

ابھی رات نہ بھیگی تھی کہ دلشاد آغا کی ایک کنیز بھاگتی ہوئی باہر سے آئی اور ہانپتے ہوئے بولی:

"امیر۔ امیر تیمور تشریف لا رہے ہیں۔ آپ سے ملنے۔ ابھی۔ ابھی۔ وہ آ رہے ہیں۔"

دلشاد آغا گھبرا گئی۔ بوکھلا گئی۔

امیر اور اس کے خیمے میں؟ . . . . آخر کیوں آ رہے ہیں وہ؟

ابھی وہ اسی ادھیڑبن میں تھی کہ دوسری کنیز خیمے میں آئی اور اطلاع دی کہ امیر خیمے کے پاس ہیں۔ دلشاد آغا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسی وقت تیسری کنیز نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور تیمور مسکراتا ہوا داخل...

"کنیز آداب پیش کرتی ہے امیرِ محترم!"

دلشاد آغا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا:

"زہے نصیب کہ امیر مجھ بدنصیب کے خیمے میں تشریف لائے لیکن کنیز یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ والیٔ تاتار یہاں آنے کی زحمت کیوں کی؟ مجھے طلب کیا ہوتا۔ میں خود حاضر ہو جاتی۔"

"دلشاد آغا! ہمیں تم سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا ہے۔"

تیمور نے خیمے میں موجود کنیزوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا:

"مسئلے کا تقاضا تھا کہ ہم خود چل کر تمہارے پاس آئیں۔"

"تشریف رکھیے امیر۔" دلشاد آغا نے کہا اور کنیزوں کو اشارہ کیا۔ تمام کنیزیں خیمے سے باہر چلی گئیں۔

"دلشاد آغا!"

تیمور نے بیٹھتے ہوئے کہا:

"ہم تمہاری اہمیت اور اہلیت کے ہمیشہ معترف رہے ہیں لیکن حالات پر کسی کا اختیار نہیں۔ ہم پرانی باتیں کر کے تمہارے دل کو تکلیف دینا نہیں چاہتے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری خواہش ہے کہ تم گزشتہ زندگی کو بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔ ہم تمہارا جواب سننے آئے ہیں۔ اطمینان رکھو کہ تمہاری مرضی کے خلاف قدم نہیں اٹھائیں گے۔"

دلشاد آغا فوراً سمجھ گئی کہ تیمور کا مقصد کیا ہے؟

یہ بات اس کے لیے بڑی باعثِ مسرت تھی۔ تیمور اس کے شوہر امیر حسین کا بدل ہی نہ تھا بلکہ اس سے ہر لحاظ سے بالا اور ارفع تھا مگر دلشاد کے دل میں ابھی کچھ شبہ تھا۔ اس نے بات صاف کرنے کے لیے کہا:

"میں امیر کی نوازشوں کی دل سے شکرگزار ہوں۔ ایک مفتوح اور مقتول کی بیوہ کے ساتھ آپ نے جو سلوک کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ نے تو مجھے نئی زندگی پہلے ہی عطا کر دی ہے۔ مجھے دنیا کی ہر نعمت سے سرفراز کیا ہے۔"

دلشاد آغا نے دراصل تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا تھا۔ تیمور نے اس کی وضاحت ضروری سمجھی اور پھر صاف صاف کہا بولا:

"دلشاد آغا! ہم نے جو سلوک تمہارے ساتھ کیا تم اس کی حقدار تھیں لیکن یہ سب کچھ تمہارے مرتبے سے کم ہے۔ ہم تمہیں اپنے حرم میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔"

بات بالکل صاف ہو گئی تھی۔ تیمور نے دلشاد کو جواب کا موقع بھی دیا تھا۔

دلشاد ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی:

"امیرِ محترم! اگر آپ تاتاریوں کے پرانے دستور کے مطابق مفتوح اور مقتول دشمن کی بیوی کی حیثیت سے اپنے حرم میں داخل کرنا چاہتے ہیں تو میرے جواب کی ضرورت نہیں۔ آپ آقا ہیں۔ کنیز کا فرض اپنے آقا کے حکم کی بجا آوری ہے۔ میرے لیے سوائے تعمیلِ حکم کے اور کوئی چارہ نہیں۔ آپ سے شکوہ ہوگا اور نہ اپنی قسمت سے"۔

مغل اور تاتاری قبلِ اسلام مفتوح بادشاہ یا سردار کی بیوی کو زبردستی اپنے حرم میں داخل کر لیتے تھے اور یہ ایک مصدقہ دستور بن گیا تھا۔

دلشاد بہت ذہین تھی۔ وہ کنیز کی حیثیت سے تیمور کے حرم میں داخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یوں بھی جہاد کے دوران یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا لیکن امیر تیمور اور امیر حسین، دونوں مسلمان تھے اور اسے جہاد کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ دلشاد نے اپنی فراست سے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"دلشاد آغا!"

تیمور اس سے زیادہ ذہین تھا:

"تم نے ہماری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ تاتاریوں کے پرانے رسم و رواج کے اب ہم... ہم نے اس سلسلے میں مولانا زین الدین سے گفتگو کی ہے۔ اگر تم اپنی رضامندی ظاہر کر دو تو شرعی عقد ہوگا۔ تمہارے انکار کی صورت میں ہم کوئی جبر نہیں کریں گے"۔

دلشاد آغا کا چہرہ مسرت اور شرم سے تمتما اٹھا۔

اسے جواب تو بہرحال دینا تھا۔ نظریں جھکا کر بولی:

"اس سے بڑا اعزاز میرے لیے اور کونسا ہو سکتا ہے امیرِ محترم!"

"ہم تمہارے شکر گزار ہیں دلشاد آغا"۔

تیمور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا:

"ہم اپنی تنہائی سے تنگ آ گئے تھے۔ تمہاری رفاقت سے ہمیں مسرت حاصل ہوگی"۔

دوسرے دن ایک بڑی ضیافت کا اہتمام ہوا جس میں چھوٹے بڑے تمام تاتاری سردار... مولانا زین الدین نے دلشاد آغا اور تیمور کا نکاح پڑھایا۔

نکاح کے بعد تیمور نے بخشش کا ایسا بازار گرم کیا کہ اہلِ بلخ حیران رہ گئے۔

دلشاد آغا رخصت ہو کر تیمور کے خیمے میں آئی تو تیمور نے اسے سرائے خانم کا خطاب دیا۔ سرائے خانم نے اپنے رویے سے تیمور کو بھی اس قدر خوش کیا کہ وہ خاتون آغا الجائی خاتون کے غم کو بڑی حد تک بھول گیا۔

خوارزم کی کلی

خوبرو شہزادہ جہانگیر شکار کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے آمو تک پہنچ گیا۔

دریائے آمو ملکِ تاتار اور سلطنتِ خوارزم کے درمیان قدرتی سرحد تھی۔ خوارزم کا حاکم حسین تاتاری تھا اور اس کا تعلق تاتاریوں کے سب سے مضبوط قبیلہ جلائر سے تھا لیکن اب تک خود کو خانِ اعظم کا حلیف اور باجگذار سمجھتا تھا جبکہ تاتار کے امیر تیمور نے خانِ اعظم کو شکستِ فاش دے کر ملک سے نکال دیا تھا۔ اور اب ماوراء النہر کا خود مختار حاکم تھا۔

تیمور اور حسین صوفی میں اختلاف کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی اور شہزادہ جہانگیر اسی امیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔

جہانگیر کا شکار نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر جب دریا پار نگاہ کی تو نظر بس وہیں جم کے رہ گئی۔ اس طرف نکہت و نور کا ایک گلستاں کھلا ہوا تھا۔ دس بارہ لڑکیاں جھلملاتے کپڑوں میں گھوڑوں پر سوار تھیں۔ ان کا رخ جہانگیر کی طرف تھا اور وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

ان کے چہروں کے نقش و نگار تو واضح نظر نہ آ رہے تھے لیکن وہ حسن ہی کیا جو دریا کے منجدھار کو عبور کر کے اپنی جلوہ نمائی نہ کر سکے۔

سب سے آگے والی لڑکی کے شہابی رخساروں سے پھوٹنے والی کرنیں تو جہانگیر کے دل میں اتر رہی تھیں۔ شہزادہ جہانگیر اس حسنِ بے محابہ سے کچھ ایسا مسحور ہوا کہ دریا کے بالکل کنارے آ گیا۔ یہاں تک کہ اس کے گھوڑے کے اگلے پیر پانی میں پہنچ گئے۔

لڑکیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ سب سے آگے والی شوخ و شنگ حسینہ نے ساتھ کی لڑکیوں کو کوئی بات سمجھائی۔ ان میں ایک لڑکی بڑھ کے آگے آ گئی اور دریا میں گھوڑا ڈال کے تقریباً چیختی ہوئی بولی:

"وہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟ ہمت ہے تو ادھر آ جاؤ۔"

شہزادہ جہانگیر کی شجاعت پر جیسے چوٹ پڑی۔ اس کا دل چاہا کہ گھوڑا تیرا کر اس پار چلا جائے اور انہیں بتائے کہ تیمور کا بیٹا دریا کی ان حقیر موجوں سے تو کیا، ضرورت پڑے تو چٹانوں سے بھی ٹکرا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھی جو اب اس کے قریب پہنچ چکے تھے، ان میں سے ایک گھوڑا بڑھا کر جہانگیر کے پاس آیا اور آہستہ سے کہا:

"شہزادے بہادر۔ ادھر ہرگز نہ جائیے گا۔ دشمن کا علاقہ ہے۔ خدا معلوم کیا افتاد پڑے؟"

شہزادہ تذبذب میں پڑ گیا۔

دوسری طرف سے ایک اور آواز بلند ہوئی:

"جوان ہو، اچھے ہو مگر بزدل ہو۔"

اس کے ساتھ ہی تمام لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

جہانگیر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ پلٹ کر اپنے ساتھی سے کہا:

"سنا تم نے؟ ہم پر طنز ہو رہا ہے۔ بزدل ہونے کا طعنہ دیا جا رہا ہے۔ یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ ہم ادھر جا رہے ہیں۔"

"مگر شہزادے....."

"تم یہیں انتظار کرو۔" شہزادے نے ساتھی کی بات کاٹ دی۔

گھوڑا اپنے سوار کو لے کر موجوں سے برد آزما ہو گیا۔ سوار بھی کون؟ امیر تیمور کا بیٹا شہزادہ جہانگیر — سلطنتِ تاتار کا ولی عہد۔

تیمور نے شہزادے جہانگیر کو پندرہ سال کی عمر ہی میں حرب و ضرب کے جملہ فنون میں ماہر کر دیا تھا۔ شہزادہ جری اور نڈر تھا۔ میدانِ جنگ میں شیر کی طرح جھپٹ کر حملہ کرتا اور دشمن کی صفیں الٹ کر رکھ دیتا لیکن مجلسی زندگی میں بڑا شرمیلا اور نیک مشہور تھا۔ ولی عہدِ سلطنت ہونے کی وجہ سے خاندان اور دوسرے قبیلوں کی دوشیزائیں اس کے قریب آنے کی کوشش کرتیں، تو کچھ اپنے وقار اور کچھ شرم کی وجہ سے ان سے کتراتا لیکن دریائے آمو کے پار حسن و جوانی کے اس منظر نے اسے مسحور کر دیا اور اب تو اس کے وقار پر ضرب پڑی تھی۔ اس کا امتحان لیا جا رہا تھا پھر وہ دریا پار کیوں نہ کرتا۔

گھوڑے نے اسے دم کے دم میں دوسرے کنارے پر پہنچا دیا.... لڑکیوں نے اسے گھیر لیا

گرد نور کا ہالہ سا بن گیا۔

"کون ہو تم؟"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"ادھر کیوں دیکھ رہے تھے؟"

"کیسے بے شرم ہو، ایک آواز پر بھاگے چلے آئے۔"

کچھ چٹکیاں، کچھ چہلیں، کچھ طنز۔ ہر لڑکی نے اپنے اپنے طور پر آوازے کسے۔ مزاج کے تیز

جہانگیر میدان کا مرد تھا۔ لڑکیوں سے وہ یونہی گھبراتا تھا لیکن اس نے سوچا کہ اس وقت شرم و لحاظ کا

اور خواری کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہوگا۔

اس نے لڑکیوں کو گھور کر دیکھا۔ مذاق اڑانے والی لڑکیاں اس کی تیز نظروں کا سامنا نہ کر سکیں۔ ا

پُر جلال چہرے نے لڑکیوں کو مرعوب کر دیا۔ وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

"ہم خود نہیں آئے، بلکہ بلائے گئے ہیں۔" جہانگیر شاہانہ انداز میں بولا۔

لڑکیاں جہانگیر کے پُر جلال چہرے سے پہلے ہی مرعوب تھیں، لہجے کے وقار نے انہیں ششدر ا

گلے خشک اور زبانیں گنگ ہو گئیں۔ کسی کو جواب نہ سوجھا۔ سب کی نظریں جھک گئیں اور ایک خجالت سی ان

پر ابھر آئی۔

"ہمارا مقصد آپ کی توہین ہرگز نہیں۔"

جہانگیر نے فوراً اپنا لہجہ شگفتہ کر لیا:

"کچھ بولیے۔ بلبلوں کا چپ رہنا کسے اچھا نہیں لگتا۔"

لڑکیوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بولتا کون؟ جہانگیر نے تو ان کی زبانیں پکڑ کر رکھ دی تھیں۔

"تم کون ہو اجنبی؟" یہ اس شعلہ جوالا کی آواز تھی جو سب سے الگ کھڑی جہانگیر کو بغور دیکھ

"یہی سوال آپ سے کیا جا سکتا ہے؟"

جہانگیر نے بڑے مہذب طریقے سے بات بنائی:

"جس طرح ہم آپ کے لیے اجنبی ہیں اسی طرح آپ بھی اب تک ہمارے لیے اجنبی کی حیثیت رکھتی

بات ہے کہ ہمیں اس اجنبی ماحول میں ایک اپنائیت سی محسوس ہو رہی ہے۔"

"جی ہاں۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ!" اس شعلہ جوالا کے جواب دینے سے پہلے ہی لڑکیوں

ایک بول اٹھی:

"آپ غیر کیسے ہوئے! ہاں مہمان ہیں ہمارا مہمان۔ چلیے ہمارے ساتھ۔ ہم آپ کو کھانا کھلائیں گے۔ آپ کو

آرام دیں گے اور....."

"چپ رہو شریر۔"

جہانگیر کی مخاطب وہ شیریں دہنے بولنے والی لڑکی کو زور سے ڈانٹا:

"آدمی کو دیکھ کر بات کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے شہزادی صاحبہ۔ آدمی کو تو آپ پہچانتی ہیں۔"

شہزادی کی شوخ سہیلی چہل کر بولی:

"مگر یہ خیال رہے کہ یہ صرف آدمی نہیں بلکہ دریا پار کا آدمی ہے اور اُدھر جو تاتاری قبیلہ حکمران ہے اسے آپ

طرح جانتی ہیں۔ ذرا سنبھل کے بات کیجیے۔"

جہانگیر "شہزادی" کے لفظ پر چونک اٹھا اور ادھیڑ بن میں لگ گیا تھا۔ اس نے شہزادی کی سہیلی کی گفتگو پر

توجہ نہ دی۔ جب وہ خاموش ہوئی تو نہایت ادب سے پوچھا:

"آپ شہزادی ہیں۔ یعنی....." جہانگیر کہتے کہتے رکا۔

"یعنی وانی کچھ نہیں۔"

اسی سہیلی نے پھر لقمہ دیا:

"یہ واقعی شہزادی ہیں۔ اب کورنش پیش کرو۔ تعظیم بجا لاؤ شہزادی صاحبہ کی۔"

"ہم شہزادی کے حضور میں تعظیم پیش کرتے ہیں۔"

جہانگیر نے شوخ نظروں سے شہزادی کو دیکھتے ہوئے اپنے سر کو ذرا سا خم کیا:

"آپ شہزادی نہ بھی ہوتیں تو بھی ہم آپ کو کورنش پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے۔"

"ہمارے بارے میں تمہیں معلوم ہو گیا۔"

شہزادی نے دلنواز نظروں سے جہانگیر کو دیکھا:

"تم کون ہو؟ کچھ اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔"

"یہ سوال تو ازرم حسین صوفی کی قابلِ احترام بیٹی!"

"ٹھہرو اجنبی! تم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا۔"

شہزادی نے اپنا دستِ حنائی اٹھا کر جہانگیر کو روکا:

"والیِ خوارزم حسین صوفی ہمارے تایا جان ہیں۔ ہمارے والد کا نام آق صوفی ہے۔"

"ایک ہی بات ہے شہزادی صاحبہ۔"

سہیلی نے دخل دیا:

"آپ اجنبی کو کیوں الجھا رہی ہیں۔"

پھر اس نے جہانگیر سے کہا:

"سنو دریا پار کے اجنبی! میں تمہیں بتاتی ہوں۔ یہ شہزادی سوینہ بیگ ہیں لیکن پورے خوارزم میں بہ عرفیت "شہزادی خان زادہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ ہیں تو یہ آق صوفی کی بیٹی لیکن ان کے تایا شاہِ خوارزم حسین اور دوسرے تایا یوسف صوفی کے کوئی اولاد نہیں۔ اس لیے یہ تینوں بھائیوں کی بیٹی اور سلطنتِ خوارزم کی ولی عہد ہیں۔"

"ایک اجنبی سے یہ تفصیل بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" شہزادی خانزادہ بظاہر چڑ کر بولی۔

سہیلی بھلا کب خاموش رہنے والی تھی۔ فوراً چہک کر کہا:

"شہزادی صاحبہ! جس اجنبی کو دریا پار سے بلا کر ایسی گھاوٹ سے گفتگو کی جائے وہ اجنبی نا اجنبی نہیں رہتا۔"

شہزادی اس برجستہ جواب پر سٹپٹا گئی۔ حیا کی سرخی اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ اس نے کم سہیلی کو ڈانٹا:

"بس اب خاموش ہو جاؤ۔ دوسرے کی گفتگو میں دخل نہیں دیا کرتے۔"

"ہمیں اپنا تعارف کرانے میں کوئی عذر نہیں۔"

جہانگیر مسکرایا:

"لیکن ہمیں ڈر ہے کہ....."

"نہ۔ نہ۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اجنبی۔"

پہلی سہیلی تو ڈانٹ کھا کر خاموش ہو گئی لیکن فوراً ہی اس کی جگہ دوسری سہیلی نے لے لی۔ اٹھلا کر بولی:

"ماشاءاللہ۔ چھ فٹ کے لمبے چوڑے، خوبصورت، میرا مطلب ہے اچھے خاصے قوی ہیکل جوان۔ ڈر کا لفظ زبان سے سن کر ہمیں شرم آنے لگی ہے۔"

"ہمیں اپنی جان کی کوئی فکر نہیں خاتون!"

شہزادے نے متانت سے کہا: "کاندھے پر کمان اور کمر میں تلوار لٹکانے والے اپنی حفاظت کرنا خوب جانتے

ہیں۔ خوف صرف اس بات کا ہے کہ اپنا تعارف کرانے کے بعد کہیں ہم آپ کی اس دلچسپ گفت گو سے محروم نہ ہو جائیں۔ آپ کی نظریں نہ بدل جائیں۔"

"باتیں تمہاری بھی دلچسپ ہیں اجنبی۔"

شہزادی خانزادہ تبسم بکھیرتے ہوئے بولی:

"تم خواہ کوئی بھی ہو اب ہمارے مہمان ہو اور ہمارا جلائر قبیلہ مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اگر دشمن بھی ہمارے قبیلے میں مہمان بن کر آ جائے تو ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور وہ ہماری نوازشوں کا اعتراف کرتے ہوئے جاتا ہے۔"

شہزادہ جہانگیر اب تک خود کو تعارف کرانے پر آمادہ نہ کر سکا تھا۔ اسے بار بار اپنے اس ساتھی کے الفاظ یاد آ رہے تھے جس نے کہا تھا کہ دریا پار دشمنوں کا علاقہ ہے۔ خدا معلوم کیا افتاد پڑے۔ شہزادی کی من موہنی باتوں نے اسے کچھ اطمینان دلایا تھا لیکن یہ حکومت کے جھگڑے تھے۔ شاہِ خوارزم نے اب تک امیر تیمور کی برتری تسلیم نہ کی تھی اور ایک اطلاع کے مطابق وہ جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ امیر تیمور نے اس بات کی ٹوہ لگانے کے لیے شہزادہ جہانگیر کو ایک لشکر کے ساتھ اس طرف بھیجا تھا۔

شہزادی کو اس کے جواب کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اجنبی کے باوقار لہجے اور رعب دار اندازِ گفتگو سے اس نے یہ تو اندازہ لگایا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی جوان ہے جو شجاع اور بہادر ہونے کے باوجود بڑی احتیاط سے گفتگو کر رہا ہے۔

شہزادی کو اس کی شخصیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا تھا لیکن اس کی سہیلیاں اس خاموشی سے اکتا گئی تھیں۔ ان سے ضبط نہ ہو سکا اور ایک بول پڑی:

"اجنبی! اس خاموشی سے تمہاری شخصیت میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ تم جو ہو وہی رہو گے۔ شہزادی نے تمہیں گفتگو کی عزت بخشی ہے اس لیے اگر تم غریب اور معمولی بھی ہو تو اس عزت افزائی سے تمہارے مرتبے میں اضافہ ہو گیا ہے۔ تمہیں اس بات کا خیال ہونا چاہیے کہ تم اس وقت سلطنتِ خوارزم کی ولی عہد کے حضور میں ہو اور ان کا جواب نہ دینا ان کی توہین ہے۔"

"قابلِ احترام شہزادی خانزادہ۔"

شہزادے نے سنبھل کر کہا:

"ہم چاہتے تھے کہ اس دوستانہ گفتگو کو طول دے کر اپنی زندگی کے یادگار اور مسرت آگیں لمحات میں شامل کر لیں لیکن آپ اور آپ کی سہیلیاں ان لمحوں کو افسوس اور افسردگی میں بدلنے پر بضد ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ شہزادی

ہونے کے ناتے اس خوشگوار ملاقات کو ایک زریں اور حسین خواب سمجھ کر بھول جائیں اور اپنی سہیلیوں کو تا
کید کریں کہ وہ اس کا ذکر کسی سے نہ کریں۔"

ذرا رک کر اس نے پھر کہا:

"ہماری اس ملاقات کا حال اگر خوارزم شاہ کو معلوم ہو گیا تو آپ کو شاید ان کے سامنے شرمندگی ا
کیونکہ آپ جس اجنبی سے مخاطب ہیں وہ امیر تیمور گورگان والیٔ ملک تاتار کا بیٹا جہانگیر ہے جسے خوا
لوگ دشمن کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

"شہزادہ جہانگیر۔ تخت سمرقند کا وارث؟"

شہزادی خانزادہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے گھبراہٹ سے پسینہ آ گیا۔

شہزادی کی سہیلیوں کا برا حال تھا۔ وہ شرمندہ ہی نہیں خوفزدہ بھی تھیں۔ انہوں نے شہزادہ جہانگیر کو ا
آدمی سمجھ کر نہایت بے تکلفی سے گفتگو کی تھی۔ اس پر طنز و مزاح کے تیر پھینک کر اس کی توہین کی تھی۔ ا
اپنے علاقے میں تھیں لیکن امیر تیمور نے جب سے اپنے سالے امیر حسین کو شکست دے کر سمرقند کی حکو
تھی، دور و نزدیک کے تمام امیر اور والی لرز اٹھے تھے یہاں تک کہ آزاد وحشی قبائل نے بھی امیر تیمور ا
اور بالادستی تسلیم کر لی تھی۔ سہیلیوں نے اس جلیل القدر امیر کے ولی عہد کا مضحکہ اڑایا تھا۔ ان کا خوف اپنی جگہ

"اے خوارزم کی پری پیکر شہزادی!"

جہانگیر نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا:

"ہم نہ کہتے تھے کہ تعارف ہوتے ہی آپ کی نظریں بدل جائیں گی اور اجنبیت کے یہ لمحات مختصر ہ
خیر اب ہمیں اجازت دیجیے لیکن یہ یاد رکھیے کہ اس ملاقات کو ہم زندگی بھر نہ بھلا سکیں گے اور آپ
ملنے کی آرزو ہمیں بے چین رکھے گی۔"

شہزادہ جہانگیر نے اپنے گھوڑے کا رخ دریا کی طرف کر لیا لیکن اس کی نظریں اب تک شہزادی خانزا
چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"ٹھہریے شہزادے!"

شہزادی جیسے خواب سے چونک پڑی:

"آپ اس طرح واپس چلے گئے اور خوارزم والوں کو معلوم ہوا کہ سمرقند کا شہزادہ ہماری سرزمین پر آ
ہم نے اس کی مہمان نوازی میں کوتاہی کی تو وہ ہمیں کیا کہیں گے۔ ہم ان کی نظروں میں کس قدر حقیر ہو جائیں
حکومتوں کے جھگڑے الگ چیز ہیں لیکن ہم اپنے قبیلے کی قدیم روایات سے تو منہ نہیں موڑ سکتے۔ آپ

مہمان ہیں اور مہمان نوازی کے فرائض ادا کیے بغیر ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ ہم شہزادہ جہانگیر سے درخواست
کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنی مہمان نوازی کا شرف عطا کریں۔ ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔"

شہزادی خانزادہ نے کچھ ایسی ادا سے درخواست کی کہ شہزادہ جہانگیر کا جوان دل سینے میں دھڑک اٹھا۔
حسن سوال بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ عشق شوریدہ سر بے خوف ہو کر جاں نثاری پر آمادہ ہو گیا۔ شہزادے نے
عقل کے تازیانے سے منہ موڑتے ہوئے جذبات انگیز لہجے میں کہا:

"شہزادی حکم دیں۔ جہانگیر سر دینے سے بھی انکار نہ کرے گا۔"

شہزادی ایک نامعلوم کیفیت سے جھوم اٹھی اور بولی:

"اگر شہزادے ہماری لشکر گاہ میں چل کر گھڑی دو گھڑی کی مہمان داری کا فخر عطا کریں تو عین نوازش اور
احسان ہو گا۔"

شہزادہ جہانگیر تو تن من دھن نچھاور کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔ مسرت کے کچھ اور لمحات کے حصول کے تصور سے
اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔

ابھی وہ تعمیل حکم کے اقرار کے لیے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ دور گرد کا ایک بادل سا اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ جہانگیر
کے گھوڑے نے کان کھڑے کر لیے۔ خود شہزادے کو بھی خطرے کا احساس ہوا اور اس نے بڑی سرعت
سے کمان کاندھے سے اتار لی۔

دریا کے دوسری طرف جہانگیر کے پانچوں سوار اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے لیکن جب
ان کی نظر اٹھتی گرد پر پڑی تو انہوں نے شہزادے کے حکم سے بے پروا ہو کر گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور بہت
جلد دریا پار اتر کر شہزادے کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے کچھ کہے بغیر شہزادے کو اپنے حلقے میں لے لیا اور
کمانوں میں تیر جوڑ لیے۔

گرد چھٹی تو چالیس پچاس سوار تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ سب کی نظریں ادھر لگی ہوئی تھیں۔
شہزادی اور اس کی سہیلیاں بھی پریشان تھیں۔

جب سوار قریب آئے تو شہزادی کے چہرے پر فکر کی بجائے مسرت دوڑ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے
جہانگیر سے کہا:

"شہزادے! فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے بابا آمن صوفی تشریف لا رہے ہیں۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔
آپ تمام لوگوں کی حفاظت کے ہم ذمے دار ہیں۔ جب تک ہم زندہ ہیں آپ لوگوں کی طرف کوئی انگلی تک نہیں
اٹھا سکتا۔"

شہزادے جہانگیر کو پتہ نہیں کیوں شہزادی کی بات کا اعتبار آ گیا۔ اس نے کمان کاندھے پر ڈال احتیاط کے طور پر شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر آنے والوں کو دیکھنے لگا۔

سوار ان کے پاس پہنچ گئے۔ ادھیڑ عمر آق صوفی شہزادی کے قریب گھوڑا لاتے ہوئے پیار بھری کے ساتھ بولا:

"بیٹی! تم نے تو پریشان کر دیا۔ ہم تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے۔"

پھر اس نے جہانگیر اور اس کے ساتھیوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا:

"یہ لوگ کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟"

"محترم آق صوفی کی خدمت میں ہم سلام نیاز پیش کرتے ہیں۔" شہزادے جہانگیر نے باوقار گفتگو کا آغاز کیا۔

آق صوفی نے تیز نظروں سے جہانگیر کو دیکھا۔ پھر سر گھما کر نظروں ہی نظروں میں شہزادی سے سوال کیا۔ کا چہرہ گلنار بنا ہوا تھا۔ اس نے ادب سے کہا:

"آق بابا! ان کا سلام قبول کیجیے۔ یہ ہمارے معزز مہمان، سمرقند کے امیر تیمور کے ولی عہد جہانگیر ہیں!"

"شہزادہ جہانگیر؟" آق صوفی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

آق صوفی فوراً گھوڑے سے اتر پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ جہانگیر کے گھوڑے کے پاس گیا اور باگ پر ہاتھ رکھ کر بڑے ادب سے بولا:

"خوش نصیب کہ شہزادے یہاں تشریف لائے۔ میں امیر تیمور کے بہادر ولی عہد کو سرزمین خوارزم میں خوش آمدید کہتا ہوں اور تشریف آوری پر شکر گزار ہوں۔"

"محترم آق بابا!"

شہزادے نے شہزادی خانزادہ کے الفاظ دہرائے:

"ہمارا خیال تھا کہ آپ ہمیں اپنی سرزمین پر دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کریں گے لیکن آپ نے ہمیں ... کہا۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کے دل میں بابا تیمور کی طرف سے کوئی کدورت نہیں۔"

"بالکل نہیں شہزادے!"

آق صوفی فوراً بولا:

"ہم تو امیر تیمور کو قابل احترام سمجھتے ہیں۔ انہوں نے تاتاریوں کو مغلوں کی غلامی سے نجات دلائی ہے

پھر یہ دوری اور دشمنی کیوں؟"

شہزادے نے جیسے خود سے سوال کیا:

"آپ لشکر کے ساتھ دریا کے اس پار خیمہ زن ہیں اور دوسری طرف ہمارا لشکر موجود ہے۔"

شہزادے نے کنکھیوں سے شہزادی کو دیکھتے ہوئے کہا:

"کیا یہ دونوں لشکر شیر و شکر نہیں ہو سکتے۔ کیا ہم ایک دوسرے کے گلے نہیں لگ سکتے؟"

"ہر چیز ممکن ہے شہزادے!"

آق صوفی نے جواب دیا:

"لیکن مسئلہ ہماری اور آپ کی حد تک نہیں۔ اگر شاہ خوارزم اور امیر تیمور کے درمیان غلط فہمیاں دور ہو جائیں تو کیا نہیں ہو سکتا!"

"غلط فہمی تو کوئی نہیں ہے آق بابا!"

جہانگیر نے وضاحت کی:

"بابا تیمور کو شاہ خوارزم سے یہ شکوہ ہے کہ انہوں نے اب تک مبارک باد کا پیغام نہیں بھیجا۔ وہ تو تمام تاتاریوں کی ایک عظیم الشان حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ . . . . شاہ خوارزم ہی شاید وہ واحد حکمران ہیں جنہوں نے اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا جبکہ تمام تاتاری امیر ان کے جھنڈے تلے اکٹھے ہونے کو تیار ہیں۔"

"شہزادے بہادر۔"

آق صوفی نے ذرا توقف سے کہا:

"جہاں تک مجھے علم ہے شاہ خوارزم نے مبارک باد کی سفارت بھیجنے کا ارادہ کیا تھا لیکن انہیں یہ شبہ ہے کہ کہیں ان کی سفارت کو امیر تیمور ذلیل نہ کرے۔ اس خیال کے تحت وہ اپنا ارادہ اب تک ملتوی کرتے چلے آ رہے ہیں۔"

"آق بابا!"

شہزادہ جہانگیر نے بڑے جذبے سے کہا:

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک ذرا سی غلط فہمی کی بنا پر تاتاریوں کے دو لشکر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہیں۔ ہم آپ سے التماس کرتے ہیں کہ آپ شاہ خوارزم کی غلط فہمی دور کریں اور انہیں سفارت بھیجنے پر آمادہ کریں۔ ہم دو دن بعد سمرقند جا رہے ہیں۔ ہماری موجودگی میں شاہ خوارزم کی سفارت پہنچے گی تو آپ دیکھیں گے کہ اس کی کتنی شاندار پذیرائی ہوتی ہے!"

"میں آپ کے خیال سے متفق ہوں شہزادے۔"

آق صوفی نے بڑی صاف دلی سے کہا:

"میں ایک قاصد کے ذریعے آپ کے خیالات سے شاہِ خوارزم کو آگاہ کروں گا اور ان سے درخواست کروں گا کہ وہ بلاتاخیر امیر تیمور کے دربار میں مبارکباد کا پیغام بھیجیں۔"

"آپ اس سلسلے میں پوری کوشش کریں۔"

شہزادہ رکا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا:

"محترم آق بابا! آپ ہماری اس اتفاقیہ ملاقات کی خبر شاہِ خوارزم کو نہ ہونے دیں ورنہ ممکن ہے غلط فہمی پیدا ہو جائے اور بنتی ہوئی بات بگڑ جائے۔ آپ انہیں محض زبانی الفاظ میں مشورہ دیجیے۔"

"میں شہزادے کی دور اندیشی کی داد دیتا ہوں۔"

آق صوفی خوش ہو کر بولا:

"میں آپ کو خوارزم کے علاقے میں دیکھ کر آپ کی بہادری کا قائل ہوا تھا لیکن اس ملاقات کو راز رکھنے کا جو مشورہ آپ نے دیا ہے یہ آپ کی فراست اور عقلمندی کی دلیل ہے۔"

شہزادے جہانگیر نے خانزادہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"شہزادی نے ہمیں اپنی لشکرگاہ میں چلنے کی دعوت دی تھی۔ اب آپ سے یہیں ملاقات ہو گئی ہم دعوت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ آپ ہمیں واپسی کی اجازت دیں خود بھی اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہتے۔ آپ بھی شہزادی اور دوسرے لوگوں کو رازداری کر دیجیے۔"

شہزادہ مسکرایا۔ اس نے شہزادی اور اس کی سہیلیوں پر نظر ڈالی اور خدا حافظ کہہ کر گھوڑا دریا موڑ دیا۔

شہزادی کھوئی کھوئی نظروں سے شہزادے کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ دریا کے نہیں پہنچ گیا۔

دوسری طرف پہنچ کے شہزادے نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا اپنے ساتھیوں کے شہزادی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شہزادی کا چہرہ اتر گیا۔

○

امیر تیمور گورگان ۱۳۳۶ء میں ملک تاتار کے ایک چھوٹے سے شہر شہر سبز میں پیدا ہوا۔ وہ ایک معمولی سردار کا بیٹا تھا لیکن قدرت نے اسے جو صلاحیتیں بخشی تھیں انہیں بروئے کار لاتے ہوئے امیر تیمور نے ۲۵ سال کی عمر میں نہ صرف اپنے ملک کو چغتائی مغلوں کے قبضے سے آزاد کرا لیا بلکہ تاتاریوں کی ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھ دی تھی۔

مغلوں کے بعد اسے اپنے عزیزوں سے جنگ کرنا پڑی اور ایک طویل خانہ جنگی کے بعد اس نے تاتار کے مختلف قبائل کو اپنے زیر نگیں کر لیا لیکن اب بھی بعض خود سر قبیلے تھے جو امیر تیمور کو تاتار کا حاکم اعلیٰ سمجھنے کے بجائے اپنے رشتے چغتائی مغلوں سے جوڑے ہوئے تھے۔ ان تاتاریوں میں سب سے بڑا قبیلہ جلائر سرفہرست تھا اور ان کے سردار حسین صوفی حاکم خوارزم نے امیر تیمور کی حاکمیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کی خواہش تھی کہ اسے خوارزم کا آزاد حکمران تسلیم کیا جائے۔ اسی وجہ سے اس نے اب تک امیر تیمور کو مبارکباد کا پیغام نہیں بھیجا تھا۔

امیر تیمور اب مزید کسی خانہ جنگی میں نہیں الجھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حسین صوفی بات چیت اور صلح صفائی سے راہ راست پر آ جائے گا اور اسے خوارزم پر فوج کشی نہ کرنی پڑے گی۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ حسین صوفی نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دی ہیں اور ایک لشکر اپنے چھوٹے بھائی آق صوفی کی سرکردگی میں دریائے آمو کے اس پار امیر تیمور کی سرحد کے قریب بھیج دیا ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی امیر تیمور نے شہزادہ جہانگیر کے ساتھ ایک فوج جنوب کی طرف بھیجی تاکہ اگر خوارزمی لشکر دریا پار کرنے کی کوشش کرے تو اسے روکا جائے۔ اس کے ساتھ ہی تیمور نے شہزادے کو تاکید کر دی کہ وہ خود جنگ میں پہل نہ کرے اور جہاں تک ہو سکے آق صوفی سے نہ الجھے۔

شہزادہ جہانگیر گزشتہ کئی ماہ سے دریائے آمو کے قریب پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ شہزادہ شکار کا پیچھا کرتے ہوئے کنارِ دریا پہنچا اور آق صوفی کی حسین و جمیل بیٹی خانزادہ کا خود شکار ہو گیا۔

شہزادہ اس حادثے سے دوچار ہو کر اپنے پڑاؤ پر آیا اور سمرقند جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسے امیر تیمور نے کسی ضرورت سے فوری طور پر سمرقند طلب کیا تھا۔

شہزادہ جہانگیر کو سمرقند جانے کی خوشی اس وجہ سے زیادہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ خوارزم کی سفارت کے آنے پر وہ باپ کے دربار میں موجود ہو اور کوشش کرے کہ دونوں قبیلوں میں جنگ کے بجائے کوئی باعزت سمجھوتہ ہو جائے کیونکہ اسی صورت میں خانزادہ سے ملاقات کی کوئی صورت نکل سکتی تھی۔

شہزادہ جہانگیر کو سمرقند آئے ہوئے تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن خوارزم کی سفارت کا کوئی پتہ نہ

تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آق صوفی یا تو اپنا وعدہ بھول گیا ہے یا اس کے بجائے حسین صوفی والی خوارزم نے
بھیجنے سے انکار کر دیا ہے۔

ایک غضب یہ اور ہوا تھا کہ امیر تیمور نے شہزادہ جہانگیر کو سمرقند میں روک لیا تھا اور اس کی
دریائے آمو کی کمان سپرد کر دی تھی۔ اس طرح شہزادہ جہانگیر کے لیے شہزادی خانزادہ سے ملاقات
بعید ہو گیا تھا۔

○

دن گزر رہے تھے اور جہانگیر کے دل میں خانزادہ کی محبت کی چنگاری آہستہ آہستہ شعلے کی شکل
تھی۔ وہ سست اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ امیر تیمور کو جہانگیر سے بے پناہ محبت تھی۔ جہا
کے دل میں اٹھنے والے طوفان کی غمازی کر رہا تھا لیکن اس کے دل میں کون جھانکتا۔ اس کی افسردگی
جسمانی بیماری سمجھا جا رہا تھا اور امیر تیمور کے حکم سے شہر کے تمام بڑے بڑے طبیب جہانگیر کے علاج
لیکن وہ سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اب تک مرض کی تشخیص کرنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے شہزاد
والے تمام امکانی مرضوں کی دوا دی لیکن اسے کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ مرض روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ ان
کہ مرض عشق کا علاج دواؤں سے نہیں ہوا کرتا۔

شہزادہ جہانگیر فطرتاً کم گو اور شرمیلا تھا۔ سوائے میدانِ جنگ کے وہ ذاتی معاملات میں ہر وقت
میں چپ چاپ رہتا تھا، پھر بھلا وہ کیسے کہتا کہ اس مرض کا علاج سوائے شربتِ دیدار کے اور کوئی نہیں۔ وہ خا
گھلتا چلا جا رہا تھا مگر زبان پر تالے لگا رکھے تھے۔ اپنے سے زیادہ اسے خانزادہ کی بدنامی کا خیال تھا۔
آق صوفی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی ملاقات کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا۔

شہزادے نے ساتھ کے پانچ سواروں پر کھلے الفاظ میں یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر خانزادہ
ذکر کسی کی زبان پر آیا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

یہ حکم صرف شہزادہ جہانگیر کا نہیں بلکہ ولی عہدِ سلطنت کا تھا جس نے تیمور کے بعد اس عظیم سل
سنبھالنی تھی۔ پھر کوئی اس کی دشمنی کیوں مول لیتا۔ سواروں نے تو دریائے آمو کا نام لینا بھی ترک کر
شہزادہ جہانگیر کی بیماری نے امیر تیمور کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑا

ار بار طبیبوں پر برستا جنہوں نے اب تک اس کے مرض کو معلوم نہ کیا تھا۔

جہانگیر کی سوتیلی ماں سرائے ملک خانم جو اس کی سگی ممانی بھی تھی ہر دم شہزادے کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھی۔ اسے
بے حد پیار تھا لیکن ممتا کی تیمار داری اور خدمت بھی جہانگیر کے مرض میں کمی نہ کر سکی۔

امیر تیمور نے شہر سبز سے مولانا زین الدین اور اس دور کے تمام بزرگوں کو سمرقند بلا لیا۔ ایک طرف طبیب
میں مصروف تھے دوسری طرف شب بیداری ہوتی۔ قرآن ختم کیے جاتے اور شہزادے کی تندرستی کی دعا مانگی جاتی۔
یہ مرض اوپر سے تو نہیں آیا تھا۔ شہزادے نے خود یہ مرض خریدا تھا۔ اس کا علاج تو صرف اسی صورت میں
تا جب شہزادہ اپنی زبان پر پڑے ہوئے تالوں کو کھولتا اور کچھ بتاتا مگر شہزادے نے قسم کھا رکھی تھی کہ
وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گا لیکن ایک باحیا لڑکی کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔

امیر تیمور نے پورے ملک میں اعلان کرا دیا کہ جو شہزادے کو اس مرض سے نجات دلائے گا اسے منہ مانگا
ا دیا جائے گا۔

اس اعلان کی وجہ سے تمام طالع آزما اور لالچی طبیب سمرقند میں اکٹھے ہو گئے اور اپنی قابلیت کے جوہر
نے لگے لیکن کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

تیمور کا دل دنیا سے اس درجہ مکدر ہوا کہ اس نے دربار میں آنا چھوڑ دیا۔ وہ اپنے عالی شان محل میں جسے اس
ہی دن پیشتر تعمیر کرایا تھا اکیلا پڑا رہتا اور جہانگیر کی شفا کی دعائیں مانگتا رہتا۔ اس کے سردار اپنی جگہ
تھے۔ انہیں یہ فکر لاحق تھی کہ اگر امیر تیمور امورِ سلطنت سے اسی طرح بیگانگی برتتا رہا تو اس نئی نئی
ت کو گھن لگ جائے گا اور دشمنوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔

عام تاتاری بھی اس صورت حال سے فکرمند تھے۔ ملک کے کونے کونے میں شہزادے کی بیماری کا چرچا
ہر جگہ اس کی سلامتی اور تندرستی کے لیے دعائیں مانگی جا رہی تھیں

سمرقند کے مضافات میں طبیب نام کے ایک گوشہ نشین حکیم رہتے تھے۔ نہایت دیندار، زاہد، پرہیزگار۔ ے
ات میں لوگوں کا مفت علاج کیا کرتے تھے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ قرب و جوار کے لوگوں
پر بڑا اعتقاد تھا۔

ایک روز ان کے مطب میں شہزادے کی بیماری کا ذکر چھڑ گیا۔ حکیم صاحب خاموشی سے سب کی باتیں سنتے رہے
جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ وہ کسی سے کہے سنے بغیر ایک دن سمرقند روانہ ہو گئے۔ سمرقند میں ان کا کوئی
نہ تھا اس لیے وہ سیدھے امیر تیمور کے دربار میں پہنچ گئے۔

دربار میں حسب معمول سردار اور امیر روزانہ جمع ہوتے اور شام تک امیر تیمور کا انتظار کر کے واپس چلے

چلے جاتے تھے۔

حکیم طبیب سادہ لباس میں تھے اور صورت شکل بھی ایسی نہ تھی کہ لوگ ان کی طرف توجہ کرتے۔ دربان سے گفتگو کی اور پُراعتماد لہجے میں کہا کہ وہ شہزادے کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔

دربان ان کی پُراعتمادی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے بھاگ کر امیر کے سرداروں کو خبر دی۔ دربان کے ساتھ حکیم صاحب کے پاس آیا۔ حکیم موصوف نے موڈارلات کو یقین دلایا کہ اگر انہیں نبض دیکھنے کا موقع دیا جائے تو انہیں اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ شہزادے کا خاطر خواہ علاج کر سکیں گے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ موڈارلات کو ڈھارس ہوئی تو اس نے فوراً شہزادے کی خبر کیا۔ امیر تیمور کو بھی اطلاع دی گئی ایک حکیم بڑے اعتماد کے ساتھ شہزادے کا علاج کرنا چاہتا ہے لیکن امیر نے کوئی توجہ نہ دی کیونکہ شہزادے کے علاج کے لیے آنے والا ہر حکیم اسی طرح کا دعویٰ کرتا تھا۔

حکیم طبیب کو شہزادے کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سردار موڈارلات ان کے ساتھ تھا۔ شہزادہ بستر پر لیٹے پڑا تھا۔ اس کا چہرہ پژمردہ اور رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

حکیم صاحب کچھ دیر تک شہزادے کا چہرہ غور سے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی وہ چونک پڑے۔ اور سردار موڈارلات کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ "میں نے شہزادے کا مرض معلوم کر لیا ہے۔" دوسرے کمرے میں پہنچ کر حکیم صاحب نے وثوق کے ساتھ سردار ارلات کو بتایا۔

"یعنی، یعنی آپ جانتے ہیں کہ شہزادے کو کیا بیماری ہے؟" موڈارلات نے بے یقینی سے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"سردار۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن مجھے اپنی تشخیص پر اعتماد ہے۔"

حکیم صاحب بے جھجک بولے:

"اور یہ مرض ایسا نہیں کہ اس کا علاج نہ ہو سکے۔"

"بڑی حیرت کی بات ہے۔ شہر کے بڑے بڑے طبیب شہزادے کا مرض معلوم نہ کر سکے" سردار ارلات کو حکیم کی بات کا اعتبار نہ آ رہا تھا کیونکہ ان کے چہرے مہرے میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے سردار موڈارلات متاثر ہوتا۔ پھر وہ اس کے اتنے بڑے دعوے پر کیسے یقین کر لیتا۔ "قبلہ حکیم صاحب! ذرا یہ تو فرمائیے کہ شہزادے کو وہ کون سا مرض لاحق ہوا ہے کہ جسے بڑے بڑے حکیم نہیں کر سکے اور آپ نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہی معلوم کر لیا؟" موڈارلات کا لہجہ بڑا طنزیہ تھا۔

حکیم کو یہ انداز بہت شاق گزرا۔ انہیں غصہ آ گیا اور جھلا کر بولے:

"سردار۔ شمشیر زنی اور تیر اندازی کا فن نہیں یہ حکمت ہے۔ نبض حکمت کی بنیاد ہے۔ جو شخص نبض کی مختلف اور اس کے زیر و بم سے واقف نہیں وہ حکمت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں تو میں جا رہا ہوں یاد رہے کہ شہزادے کو جس چیز کی خواہش ہے اگر وہ اسے مہیا نہ کی گئی تو وہ یونہی گھل گھل کر مر جائے گا!"

سردار موڈ گھبرا گیا۔ نرمی سے پوچھا:

"محترم! مجھے آپ کی توہین اور دل آزاری مقصود نہیں۔ میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شہزادے کو کون سا مرض ہے اور آپ کے خیال میں اس کا علاج کس طرح ممکن ہے؟"

"سردار۔"

حکیم صاحب بھی نرم پڑ گئے:

"یہ بات مجھے امیر تیمور کو بتانا چاہیے تھی لیکن آپ مجبور کر رہے ہیں تو بتا دیتا ہوں کہ شہزادہ کسی جسمانی مرض کے بجائے "محبت" کے مرض میں گرفتار ہے۔"

"میرا ارجمند اور ہمارا ہے۔"

سردار موڈ بگڑ اٹھا:

"شہزادہ جہانگیر بے انتہا کم گو اور شرمیلا ہے۔ وہ تو دوستوں کی محفل میں بھی نظریں نیچی کر کے بیٹھتا ہے، بھلا محبت میں وہ کیسے پھنس سکتا ہے؟"

"سردار۔ آپ نے میری بات کی تصدیق کر دی۔"

حکیم صاحب مسکرائے:

"شہزادہ اگر کم گو اور شرمیلا نہ ہوتا تو اب تک اپنا حال دل کھول کر بیان کر چکا ہوتا۔ اب مجھے پورا یقین ہے کہ میری تشخیص صحیح اور درست ہے۔"

سردار موڈارلات سوچ میں پڑ گیا۔ حکیم نے جس مستقل مزاجی سے گفتگو کی تھی اس نے سردار موڈ کو فکر میں ڈال دیا تھا۔ سردار نے کہا:

"حکیم صاحب! میں آپ کی بات رد نہیں کرتا لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ اگر آپ کی تشخیص غلط ثابت ہوئی تو امیر تیمور

آپ کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

"سردار۔ آپ بھی ایک بات ذہن نشین کر لیں۔"

حکیم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

"مجھے نہ تو انعام واکرام کی پرواہ ہے اور نہ ہی میں موت سے ڈرتا ہوں۔ بس تو شہزادے کا علاج کرنا چاہتا ہوں کہ امیر تیمور اس فکر سے آزاد ہو کر اپنی سلطنت کے کام میں مصروف ہو جائیں۔"

"حکیم صاحب!"

موٹد لرات کو کچھ کچھ اس کی باتوں کا یقین ہو چلا تھا:

"فرض کیجیے کہ شہزادے کو کسی سے محبت ہو گئی ہے تو کیا وہ اس بات کا اقبال کرے گا جبکہ اس نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔"

"یہی بات مجھے بھی پریشان کر رہی ہے۔"

حکیم صاحب نے اعتراف کیا:

"لیکن جب میں نے مرض معلوم کیا ہے تو اس کا علاج بھی کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ شہزادہ زبان نہیں کھولے گا لیکن انسان کی بے زبانی میں بھی ایک طرح کی زبان ہوتی ہے۔ میں اس راز تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" سردار موٹد نے بے چینی سے پوچھا۔

"ممکن بھی ہے اور مجھے اپنی کامیابی کی امید بھی ہے۔" حکیم طبیب میں بلا کا اعتماد تھا اور وہ یوں لگتا جیسے یہ کام کوئی مشکل نہیں۔

"پھر آپ اپنی کوشش کیجیے۔"

سردار موٹد نے اطمینان کا سانس لیا:

"میں امیر تیمور کو ان باتوں کی اطلاع اسی وقت دوں گا جب آپ کامیاب ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

حکیم دروازے کی طرف بڑھا:

"آپ یہیں تشریف رکھیں۔ میں اپنا کام تنہائی میں کروں گا۔"

حکیم طبیب شہزادے کے کمرے میں واپس آ گئے۔ شہزادہ اسی طرح آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ وہ اس کے بستر کے قریب بیٹھ گئے اور اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بولے:

"شہزادے جہانگیر! آپ بہت شرمیلے اور کم گو ہیں۔ انسان کی یہ خوبی تعریف کے قابل ہے لیکن بعض اوقات بڑھی ہوئی شرم بہت مضر ثابت ہوتی ہے۔"

حکیم نے رک کر شہزادے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ شہزادے کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا لیکن حکیم کو یہ اندازہ ہوا کہ شہزادہ ہوش میں ہے اور اس کی بات غور سے سن رہا ہے۔

حکیم طبیب نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہنا شروع کیا:

"آپ کو امیر تیمور سے بڑی محبت ہے۔ ملکہ سرائے خانم کو بھی آپ بہت چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ کے والدین آپ کو کچھ سخت وسست بھی کہہ دیں تو آپ پروا نہیں کرتے مگر ہو سکتا ہے کہ آپ کے خاندان میں اور ایسی ہستی ہو جس نے آپ سے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جس سے آپ کے خیالات منتشر اور دل پریشان ہوں۔"

شہزادے کا چہرہ اب بھی کسی تاثر سے خالی تھا۔ نبض کی رفتار میں بھی کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ حکیم نے پھر کہنا شروع کیا:

"شہزادے بہادر۔ آپ اس وقت سمرقند میں ہیں۔ آپ کے والدین کے علاوہ سمرقند میں کوئی اور ایسی ہستی ہے جس میں آپ دلچسپی لیتے ہیں۔ اس سے گفتگو کرنا، اس سے قریب رہنا یا اسے اپنے قریب رکھنا آپ کو پسند ہوگا؟"

شہزادے کا چہرہ اب بھی بے تاثر تھا۔ نبض پہلے کی طرح چل رہی تھی۔ حکیم طبیب نے بات آگے بڑھائی۔ بولے:

"شہزادے بہادر۔ تعجب ہے کہ سمرقند کی کوئی ہستی آپ کو متاثر نہ کر سکی۔ خیر۔۔۔۔ اب ہم سمرقند سے باہر چلتے ہیں۔"

حکیم طبیب نے ایک لمحہ انتظار کیا، پھر کہا:

"اگر سمرقند سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں تو تبریز آپ کو ضرور پسند ہوگا۔"

حکیم ذرا دیر انتظار کرنے کے بعد بولے:

"عجیب ہے۔ تبریز جانے کی بھی آپ کو خواہش نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو بخارا ضرور پسند ہوگا۔ وہاں کے نظارے اور رنگ آپ کو ضرور یاد آتے ہوں گے۔"

بخارا کے نام پر بھی شہزادے کی طرف سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہوا۔ نبض بدستور ایک ہی رفتار پر قائم تھی۔ اب تو حکیم صاحب بھی پریشان تھے۔ انہیں علم تھا کہ وہ اس کے زور پر سردار موٹد لرات کے سامنے اس قسم کا دعویٰ کر چکے تھے۔ انہوں نے ماوراء النہر (ملک تاتار) کے تمام بڑے بڑے شہروں میں جہانگیر کے مطلوب کو تلاش کرنے

کی کوشش کی لیکن شہزادے کے چہرے یا نبض نے ان کی کوئی مدد نہ کی۔ موشگافات نے انہیں دھکیل
یہ مرض غلط ثابت ہوا تو حکیم صاحب کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ حکیم صاحب کو جھرجھری سی آ گئی۔

کہتے ہیں کہ حکیم و ڈاکٹر اپنے مریض سے کبھی نا امید نہیں ہوتے اور آخری وقت تک کوشش کر
ہیں۔ پھر حکیم طبیب کس طرح ہار مان لیتا جبکہ ان کی ناکامی انہیں موت سے بھی ہمکنار کر سکتی تھی۔ انہوں نے د
خوف کو ذہن سے جھٹک دیا اور پھر کوشش میں لگ گئے۔

حکیم طبیب شہزادے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بولے:

"یوں لگتا ہے کہ شہزادے کو اپنے ملک کا کوئی منظر یا صورت پسند نہیں آئی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے
نے ملک کی سیر کی ہے۔ کیا پتہ کسی غیر ملک میں شہزادے کا دل اٹک گیا ہو اور وہاں کوئی ایسی ہستی
کی یاد ان کے دل میں چٹکیاں لے رہی ہو۔"

حکیم صاحب ایک دم خاموش ہو گئے۔ انہیں پہلی بار نبض کی رفتار میں قدرے تبدیلی محسوس ہوئی۔ ا
کے چہرے پر گئی تو وہاں بھی اک کرب اور بے چینی کی شکنیں دکھائی دیں۔ حکیم صاحب کا دل مسرت سے بھرا
ہوئی منزل جیسے پلٹ کر آ گئی ہو۔

"شہزادے بہادر۔"

حکیم طبیب بڑے اطمینان سے بولے:

"مثل مشہور ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر۔ اس مثل کی حقیقت کا ثبوت نہ ملا تھا لیکن آپ نے یہ کر
ثبوت بھی مہیا کر دیا۔ اس میں آپ کا بھی قصور نہیں۔ دل تو آخر دل ہی ہے جسے چاہے پسند کر لے۔ لیلیٰ م
لیکن مجنوں کی نظروں نے اسے اس قدر حسین بنا دیا کہ دنیا والے لیلیٰ کی سیاہ رنگت کو بھول کر اسے د
سمجھ بیٹھے۔ آپ نے بھی اچھا ہی کیا۔ گلوں سے خار بہتر ہوتے ہیں جو کم از کم دامن تو تھام لیتے ہیں لیکن
خوش نصیب سرزمین ہے جس کی رنگینی نے سمرقند و بخارا کو نیچا دکھا دیا۔"

شہزادے کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ نبض نے بھی پلٹے کھائے لیکن شہزادے کی آنکھ کم
حکیم صاحب پڑھے لکھے آدمی تھے اور قرب و جوار کی تمام ممالک سے واقف بھی تھے۔ انہیں اپنی منزل بہ
تھی۔ انہوں نے شہزادے کی خاموشی کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور ملکوں کی گردان خود ہی شروع کر دی۔ خود ا
انداز میں بولے:

"کوہستان کا بھی اپنا ایک حسن ہوتا ہے مثلاً غزنی اور قندھار کا علاقہ قدرتی مناظر سے پُر
چیز میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے۔"

شہزادے کا چہرہ پھر سے سپاٹ ہو گیا۔ نبض کی حرکت پہلے مقام پر آ گئی۔

حکیم طبیب غزنی و قندھار سے نکل کر ہرات پہنچ گئے۔ بولے:

"ہرات کا ملک تو لاجواب ہے۔ سبزوار کے مقام کو ملک ہرات میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس جگہ کئی زندگ
ستیاں پیدا ہوئیں۔"

ہرات کا نام بھی شہزادے میں کوئی بے چینی پیدا نہ کر سکا۔

حکیم طبیب اور آگے بڑھے۔ بولے:

"آپ کی سرحدوں کے قریب ریگستان ہے لیکن یہ ریگستان قلعہ کی فصیل سے کسی طرح کم نہیں۔ یہاں کا حاکم
شاہ خوارزم بڑا خود سر ہے۔"

شہزادہ جہانگیر کی نبض اس گھڑی اس زور سے پھڑکی کہ حکیم طبیب کو نبض پر اپنی گرفت مضبوط کرنا پڑی۔ شہزادے
چہرے کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔

حکیم طبیب مسکرائے۔ بولے:

"یقین ہے کہ اپنے شہزادے جہانگیر کو ملک خوارزم کا کوئی پھول پسند آ گیا ہے۔ خوارزم کی یاد نے شہزادے
بے چین کر رکھا ہے۔"

شہزادے نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ نحیف آواز میں بولا:

"حکیم صاحب۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کیجیے۔ بس آپ خاموش رہیے۔"

"شہزادے!"

حکیم صاحب اکڑ گئے:

"میں اس منزل تک جان کی بازی لگا کر پہنچا ہوں۔ آپ کو بتانا ہو گا کہ آپ نے یہ ڈھونگ کیوں رچایا اور
رزم کی وہ کون ماہ پیکر ہے جو موت بن کر آپ کے دل پر سوار ہے۔"

"حکیم صاحب!"

شہزادے نے لجاجت سے کہا:

"یہ ڈھونگ نہیں۔ حقیقت ہے۔"

"پھر آپ نے اس حقیقت کو امیر سے کیوں نہیں بیان کیا؟"

حکیم طبیب کا لہجہ بتدریج تلخ ہوتا جا رہا تھا:

"مجھے آپ کی بیماری کی کوئی پروا نہیں۔ میں تو صرف امیر تیمور کی وجہ سے آپ کے علاج پر تیار ہوا تھا۔

وہ ایک مستقل کرب میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے دربار تک لگانا چھوڑ دیا ہے"۔

شہزادے نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کش مکش م

"شہزادے جہانگیر!"

حکیم نہایت تلخ لہجے میں بولا:

"اگر آپ کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو امیر تیمور اس غم سے پاگل ہو جائیں گے اور یہ ملک پھر ٹکڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ بلادِ شمال کا خانِ اعظم ایک بار پھر تاتاریوں کو غلام بنانے کے لیے سمرقند پر چڑھائی

شہزادے کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔ حکیم صاحب گھبرا گئے۔ چہرے جا کر بولے:

"شہزادے! آپ کا راز میرے سینے میں رہے گا۔ کم از کم یہ تو بتا دیجیے یہ حادثہ کس جگہ کے دارالسلطنت اور گنج، خیوہ یا قلعہ کرت میں؟"

شہزادے کے ہونٹ لرزے۔ وہ بہت نحیف آواز میں بولا:

"دریائے آمو کے کنارے"۔ پھر شہزادے پر غشی طاری ہو گئی۔

حکیم صاحب کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا۔ اس نے شہزادے کو زیادہ پریشان کرنا مناسب حکیم نے شہزادے کو سرگوشیوں میں یقین دلایا:

"شہزادے بہادر۔ آپ اپنی طبیعت سنبھالیے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا مطلوب اور خوارزم کی دختر بھی ہے تو وہ آپ کے لیے حاصل کی جائے گی۔ خواہ اس کے لیے خون کی ندیاں ہی کی

شہزادے کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق سی آ گئی۔

حکیم طبیب شہزادے کے پاس سے اٹھ کر مونڈارلات کے پاس آئے۔ مونڈارلات ان کے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ حکیم نے دروازے میں قدم رکھا تو وہ دوڑ کر ان کے پاس آ گیا۔

"کہیے حکیم صاحب۔ کچھ کامیابی ہوئی؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"مبارک ہو سردار۔ شہزادے نے آنکھیں کھول دی ہیں"۔ حکیم طبیب خوشی سے مسکرا

"سچ؟"

مونڈارلات اور بے چین ہو گیا:

"شہزادے نے تو تین دن سے کھانا پینا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ ان پر ہر وقت غشی سی طاری تو کمال کر دیا حکیم صاحب!"

"سردار کو یہ سن کر اور خوشی ہو گی کہ شہزادے نے اپنے مرض کا اقرار کر لیا ہے"۔

حکیم طبیب ہنستے ہوئے بولے:

"آپ چاہیں تو اب میری گردن اڑا سکتے ہیں"۔

سردار ارلات بڑے خلوص سے حکیم صاحب سے لپٹ گیا:

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ جی چاہتا ہے آپ کا منہ موتیوں سے بھر دوں۔ شہزادے نے کس طرح اقرار کر لیا؟ کسی کا نام بتایا انہوں نے؟"

"نہیں سردار"۔

حکیم طبیب نے نفی میں سر ہلایا:

"نام بتانے سے گریز کر رہے ہیں۔ شاید شرم مانع ہے لیکن انہوں نے جو اشارہ دیا ہے اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے"۔

"اچھا تو چلیے"۔

مونڈارلات ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا:

"ہم اسی وقت امیر سے ملتے ہیں۔ وہاں آپ تفصیل سے گفتگو کیجیے گا"۔

سردار ارلات حکیم طبیب کو ساتھ لے کر باہر آیا۔ اسے معلوم تھا کہ امیر تیمور اسے ملاقات کی اجازت نہ دیں گے۔ امیر کے پاس سوائے سرائے خانم کے اور کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ حکیم صاحب کے آنے پر وہ شہزادے کے پاس سے اٹھ کر محل کے دوسرے حصے میں چلی گئی تھیں۔

مونڈارلات ان کے پاس پہنچا اور ایک کنیز کے ذریعے ملکہ سرائے خانم کو اطلاع بھجوائی کہ شہزادہ جہانگیر ہوش میں آ گئے ہیں اور انہوں نے حکیم صاحب سے بعض اہم باتیں کی ہیں۔ وہ باتیں امیر کے گوش گزار کرنا ضروری ہیں۔

ملکہ سرائے خانم کے لیے یہ بات نویدِ مسرت تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی امیر تیمور کے کمرے میں داخل ہوئی اور پھولی پھولی سانسوں کے درمیان بولی:

"امیر کو مبارک ہو۔ ایک حکیم شہزادے کو ہوش میں لے آیا ہے۔ شہزادے نے حکیم سے باتیں کی ہیں۔ حکیم شرفِ ملاقات کے لیے حاضر ہے"۔

امیر تیمور اس صدمے سے نڈھال پڑا ہوا تھا۔ اس خبر نے اس میں جان ڈال دی:

"کیا یہ خبر درست ہے سرائے خانم یا تم ہمیں خوش کرنے کے لیے کہہ رہی ہو؟" تیمور نے امید بھری

نظروں سے سرائے خانم کو دیکھا۔

"امیر محترم!"

سرائے خانم اپنی سانس درست کرتے ہوئے بولی:

"سردار موئڈارلات اور حکیم باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔ وہ پوری وضاحت سے بتائیں گے"۔

امیر تیمور نے فوراً پانی طلب کیا، منہ ہاتھ دھویا۔ لباس بدلا۔ پھر سردار موئڈارلات کو اندر بلا بھیجا۔ سرائے خانم دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ حکیم طبیب اور موئڈارلات کمرے میں داخل ہو کر آداب بجا لائے۔

"موئڈارلات!"

امیر تیمور نے گداز لہجے میں کہا:

"کیا تمہارے ساتھ یہ وہی حکیم ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ شہزادے کو ہوش میں لائے ہیں؟ انہوں نے شہزادے سے باتیں بھی کی ہیں؟"

"اے تاتاریوں کے نجات دہندہ!"

حکیم صاحب نے بغیر یہ پروا کیے کہ تیمور نے موئڈارلات کو مخاطب کیا ہے، خود بولنا شروع کر دیا:

"اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت اس حقیر بندے کو عطا کی کہ یہ حقیر بندہ شہزادے کا مرض معلوم کرنے میں کامیاب ہوا"۔

"خدا تمہیں جزائے خیر دے حکیم!"

امیر تیمور بڑی رقت سے بولا:

"تم نے ایک باپ کے مغموم دل کو جو سکون بخشا ہے اس کا احسان ہم عمر بھر نہیں بھول سکیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ جب تم نے مرض معلوم کر لیا ہے تو تم شہزادے کو اچھا کرنے میں بھی ضرور کامیاب ہو جاؤ گے"۔

"امیر محترم!"

حکیم نے مستقل مزاجی سے کہا:

"یہ ٹھیک ہے کہ میں مرض کی تہہ تک پہنچ گیا ہوں اور شہزادے نے بڑی حد تک اس کی تصدیق بھی کر دی ہے لیکن افسوس کہ شہزادے کا علاج میرے پاس نہیں"۔

"کیا کہہ رہے ہو حکیم؟"

امیر تیمور بڑے اضطراب سے بولا:

"اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اس نے ہر مرض کا علاج اس کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ پھر تم کیسے حکیم ہو کہ

مرض معلوم کرنے کے بعد علاج نہیں کر سکتے۔ محترم بزرگ! تم نے ہمیں امید کی کرن دکھا کر پھر اندھیرے میں دھکیل دیا"۔

"امیر محترم!"

حکیم طبیب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"اللہ کے فرمان سے کون انکار کر سکتا ہے؟ میں نے یہ کب کہا ہے کہ شہزادے کے مرض کا علاج نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شہزادے کا علاج میرے اختیار میں نہیں۔ ان کی تکلیف اور درد کا درماں صرف آپ کر سکتے ہیں"۔

"ہم۔۔۔۔ ہم اس کا مرض دور کر سکتے ہیں؟"

تیمور نے حیران ہو کر پوچھا:

"جلد بتاؤ حکیم! ہم شہزادے کے لیے تو آسمان سے تارے بھی توڑ کر لا سکتے ہیں۔ ہم اس کے بدلے میں اپنی جان دے سکتے ہیں"۔

"اے شاہ عالی شان!"

حکیم نے تیمور سے نظریں ملا کر کہا:

"اس سلسلے میں ابھی وقت کچھ عرض کر سکتا ہوں کہ جب امیر میری بات پوری توجہ سے سماعت فرمانے کا اعلان کریں اور جب تک میں پوری تفصیل نہ بیان کر لوں، صبر و تحمل سے کام لیں"۔

"حکیم!"

تیمور بے چینی سے بولا:

"ہم ہر طرح کا اعلان اور وعدہ کرنے پر تیار ہیں مگر خدا کے لیے ہمارے بچے کا علاج کر کے اسے اچھا کرنے کی کوشش کرو"۔

"توجہ سے سنیے شاہ محترم!"

حکیم کی بات پر سب متوجہ ہو گئے۔ دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی سرائے خانم نے بھی پردے سے کان لگا دیے۔ حکیم نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہنا شروع کیا:

"شہزادے جہانگیر کو کسی طرح کی جسمانی بیماری نہیں ہے بلکہ وہ محبت کے موذی مرض میں مبتلا ہیں اور ان کی یہ محبت عشق کی حدوں میں پہنچ چکی ہے"۔

"نادان حکیم!" امیر تیمور کو اک دم جلال آ گیا۔ "اتنا معصوم اور لڑکیوں سے نظریں چرانے والا شہزادہ

کس طرح محبت کر سکتا ہے؟"

"امیرِ محترم!"

حکیم کو بھی غصہ آ گیا:

"یہ سوال آپ شہزادے سے کیجیے۔ انہوں نے اپنی محبت کا اقبال کر لیا ہے۔"

امیر تیمور کا جلال ابال کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھک گیا۔ پھر جیسے اس نے اتھور میں شہزادے جہانگیر سے کہا:

"جہانگیر! تم نے باپ کی محبت کا اندازہ ہی نہیں کیا۔ ایسی بات تھی تو تم نے پہلے ہی دن کہہ دیا ہوتا کیا ہم تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تمہاری پسند کو ہم نے ہمیشہ مقدم رکھا۔ خوش قسمت ہے وہ لڑکی جو امیر تیمور گورگاں کی بہو بنے گی۔"

پھر وہ اک دم چونکا اور حکیم سے مخاطب ہوا:

"کون ہے وہ خوش نصیب؟ کیا نام ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟"

"امیر محترم! تحمل سے کام لیجیے۔ یہ معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔"

حکیم نے ناصحانہ انداز میں کہا:

"شہزادے جہانگیر نے اس کا نام نہیں بتایا اور نہ اس پر نام معلوم کرنے کے لیے زور دیا جائے ورنہ ان کی دل شکستگی اور بڑھ جانے کا خطرہ ہے۔ انہوں نے کچھ اشارے ضرور کیے ہیں جن سے منزلِ مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے۔"

"تم درست کہتے ہو حکیم۔"

تیمور کی آواز میں تھکن پیدا ہو گئی:

"تم سچے ہو۔ ہم نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔ ان اشاروں کی وضاحت کرو تاکہ کوئی صورت نکالی جائے۔"

"مجھے وضاحت کا موقع تو دیا جائے شاہِ عالی مقام!" حکیم نے بڑے مہذب طریقے سے امیر تیمور کو تنبیہ کی۔

"اگر امیر نے پدرانہ محبت سے مجبور ہو کر میری گفتگو کے دوران پھر بے چینی کا اظہار کیا تو اس سے بات بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔"

"تم بات پوری کرو حکیم!" تیمور نے حکیم طبیب کو اطمینان دلایا۔

"ہم اپنے جذبات پر قابو رکھیں گے اور گفتگو میں قطعی دخل نہ دیں گے۔"

"امیرِ محترم!"

حکیم نے اطمینان سے کہنا شروع کیا:

"میں نے بسم اللہ کہہ کر شہزادے کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ان کے چہرے پر نظر کی تو چہرے کی افسردگی اور نبض نے فوراً اعلان کیا کہ شہزادے کو کوئی جسمانی بیماری نہیں بلکہ ان کے دل پر کسی کے فراق اور حرماں نصیبی کا شدید دباؤ ہے۔ میں جانتا تھا شہزادہ اپنی فطری شرم کی وجہ سے محبت کا اعتراف ہرگز نہ کرے گا۔ اس لیے میں نے نفسیات کا سہارا لیا اور شاہی محلات اور خانوادۂ تیمور کی عالی مقام خواتین کی تعریف و توصیف کا ذکر چھیڑا۔ تاکہ اس ستمگر کا کچھ اتہ پتہ پا سکوں جس کی جدائی نے شہزادے کا یہ حال بنا رکھا ہے لیکن شہزادے کی نبض یا چہرے نے خواتینِ تیموریہ کے تذکرے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرا کام قدرے مشکل ہو گیا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ شہزادے کے تصور کو سمرقند کے محلوں اور گلی کوچوں میں لے گیا۔ وہاں بھی ناکامی ہوئی تو اپنی خود کلامی کو وسعت دے کر شہزادے کے ذہن کو بلخ اور بخارا اور ملک تاتار کے تمام بڑے بڑے شہروں تک لے گیا مگر مجھے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اب میرے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ گوہرِ مقصود کو آس پاس کی سلطنتوں میں تلاش کروں۔ میں نے ہرات کا ذکر کیا۔ شہزادے کی نبض و چہرے نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا لیکن جب میں شہزادے کے خیال کو بہاتا ہوا سلطنتِ خوارزم میں داخل ہوا تو شہزادے کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا اور نبض نے پھڑک پھڑک کر اعلان کیا کہ بس آگے نہ بڑھنا جو کچھ ہے بس خوارزم میں ہے۔ اس یقین کے ساتھ ہی میں نے شہزادے پر ظاہر کر دیا کہ اس کا مسیحا خوارزم ہے اور اگر اس نے اب بھی زبان نہ کھولی تو خاکم بدہن شہزادہ اپنی جان کھو دے گا اور امیر تیمور نے جس سلطنت کی بنیاد رکھی ہے اس کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ شہزادے نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے درخواست کی کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے اور نہ اس سلسلے میں مزید گفتگو ہو۔ میں نے بہت کوشش کی کہ شہزادے سے کچھ اور معلوم کر سکوں لیکن سوائے اس کے کہ یہ واقعہ یا حادثہ دریائے آمو کے کنارے پیش آیا ہے اور کچھ معلوم نہ ہو سکا۔"

حکیم طبیب یہ حقیقی افسانہ ایک منجھے ہوئے داستان گو کی طرح بیان کر رہا تھا۔ امیر تیمور اور سردار موڈارلات انتہائی توجہ اور دلچسپی سے سحر زدہ بیٹھے سن رہے تھے۔

"حکیم محترم!"

امیر تیمور نے پہلی بار حکیم طبیب کو عزت سے مخاطب کیا،

"تمہارا بیان اگرچہ داستان گوئی کا سا ہے لیکن ہمیں اس کے لفظ لفظ کا یقین ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس لڑکی کا نام کس طرح معلوم کیا جائے۔ تمہارا یہ بھی مشورہ ہے کہ اس سلسلے میں شہزادے پر زور نہ ڈالا جائے لیکن

دریائے آمو کوہ ہندوکش سے نکل کر بحیرۂ ارال میں گرتا ہے۔ ہم اس کے کناروں کا کس طرح ا

اس وقت غلام نے حاضر ہو کر اطلاع دی کہ شہزادہ جہانگیر نے حکیم صاحب کو فوراً بلایا ہے۔ ا

اس اطلاع سے بڑی مسرت ہوئی۔ اسے یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ شہزادہ کم از کم اس قابل تو ہوا کہ

کر سکے۔

حکیم طبیب شہزادے سے ملنے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آ گئے۔ وہ کچھ گھبرائے گھبرائے ت

نے انہیں پریشان دیکھ کر پوچھا:

"کیا ہوا حکیم محترم! شہزادہ خیریت سے تو ہے؟"

"الحمد للہ۔ شہزادہ بالکل خیریت سے ہے۔"

حکیم طبیب نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا:

"امیر عالی مقام! میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں۔ مرض کی تشخیص ہو گئی ہے۔ علاج آپ کیجیے اور

جانے کی اجازت دیجیے۔"

"حکیم محترم!"

امیر تیمور بھی پریشان ہو گیا:

"آخر ہوا کیا؟ کیا شہزادے نے آپ کو واپس جانے کا حکم دے دیا ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے امیر محترم!"

حکیم طبیب نے سنبھل کر کہا:

"لیکن شہزادے جہانگیر نے مجھ سے قسم لی ہے کہ میں ان کے سلسلے میں آپ کو کوئی مشورہ د

اپنی زبان بند رکھوں۔ میں مسلمان ہوں امیر۔ قسم کی پابندی مجھ پر فرض ہے۔"

"حکیم محترم! ہم قسم توڑنے کو ہرگز نہیں کہیں گے۔"

امیر نے نرمی سے سمجھایا:

"لیکن ہماری خواہش ہے کہ آپ شہزادے کی صحت یابی تک سمرقند میں قیام کریں۔"

○

بعض مسائل دیکھنے میں بہت الجھے نظر آتے ہیں لیکن جب ان پر یکسوئی سے غور کیا جائے تو وہ

سلجھتے چلے جاتے ہیں۔

امیر تیمور، شہزادہ جہانگیر کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ جہانگیر کسی لڑکی کی

محبت میں گرفتار ہے، یہ مسئلہ اب تیمور کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ اس کی سب سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ شہزادہ

اپنی محبوب کا نام بتانے پر رضامند نہ تھا اور اس سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے سے اس کے مزاج برہم ہو جانے

کا بھی اندیشہ تھا۔

اسی فکر میں ڈوبا ہوا جب امیر تیمور، سردار موسیٰ، ارسلات اور حکیم طبیب کو رخصت کر کے زنان خانے میں پہنچا

تو اس کی طبیعت سخت پریشان تھی۔

سرائے خانم جو دوسرے کمرے میں ہونے والی گفتگو کے دوران پردے کے ساتھ لگی بیٹھی تھی وہ وہاں

سے ہٹ کر زنان خانے کے ایک دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ امیر تیمور کو دیکھ کر وہ کمرے سے باہر

آئی اور تیمور کو ساتھ لے کر اندر پہنچی۔

"سرائے خانم!"

تیمور نے مسہری پر بیٹھتے ہوئے فکرمند لہجے میں کہا:

"تم اگرچہ شہزادہ جہانگیر کی سوتیلی ماں ہو لیکن تمہارے خلوص کی بنا پر ہم تمہیں شہزادے کی سگی ماں ہی تصور

کرتے ہیں۔ شہزادہ جہانگیر کا مسئلہ بہت الجھ گیا ہے۔ تم عورت ہو اور جہانگیر کے معاملے کا تعلق بھی ایک عورت

سے ہے اس لیے ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت ہے۔"

"امیر ارشاد فرمائیں!"

سرائے خانم بالکل تیار ہو گئی:

"میں شہزادے کی سلامتی کے لیے ہر قدم اٹھانے پر تیار رہوں۔"

"سرائے خانم!"

تیمور غم سے چور چور تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا:

"ایک حکیم دانا نے یہ بتایا ہے کہ خود شہزادے نے اس کی تصدیق کی ہے کہ جہانگیر کسی لڑکی کے عشق

میں مبتلا ہے لیکن وہ اپنی نادانی کی وجہ سے اس کا نام بتانے سے گریز کر رہا ہے۔ صرف ایک مبہم سا اشارہ ملا ہے

جس سے یہ مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔

کہو امیر!"

سرائے خانم جو تمام باتیں سن کر خود بھی ان پر غور کر چکی تھی، سنجیدگی سے بولی:

"جس بات کو آپ نادانی کہہ رہے ہیں وہ شہزادے کی شرافت اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ اوّل از
سعادت مند بیٹے کا اپنے باپ کے سامنے کسی لڑکی سے محبت کرنے کا اقرار کرنا ہی تہذیب کے خلاف ہے
دوم یہ کہ اگر شہزادے نے کسی انداز میں محبت کا اعتراف کر ہی لیا تو پھر اس کی شرافت کس طرح گوارا کر
گی کہ دوشیزہ کا نام اپنی زبان پہ لا کر اس کی بدنامی کا سبب بنے۔"

"تم نے سچ کہا سرائے خانم"۔

تیمور نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

"ہم نے اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔ ہمارا شہزادہ ایک باحیا جوان ہونے کے علاوہ شرافت کا
پتلا بھی ہے مگر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"اب اس کے سوا اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ امیر اس "اشارے" کی روشنی میں منزل تلاش کریں"

سرائے خانم یہ بات پہلے ہی سوچ چکی تھی:

"آپ وہ "اشارہ" ارشاد فرمائیں جو شہزادے کی گفتگو سے حاصل کیا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ میرا
سلسلے میں کوئی مفید رائے دے سکوں"۔

"شہزادے کی گفتگو سے اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ اس لڑکی کا تعلق خوارزم سے ہے"۔

امیر تیمور نے تشریح کی:

"شہزادے نے دبی زبان سے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ یہ واقعہ دریائے آمو کے کنارے پیش آیا"

"یہ تو بڑے واضح اشارے ہیں امیر"۔

سرائے خانم نے ہنستے ہوئے کہا:

"اس راستے پر چلتے ہوئے تو ہم بڑی آسانی سے شہزادہ جہانگیر کی سسرال تک پہنچ سکتے ہیں۔ صاف ظاہر
کہ دونوں کی ملاقات دریائے آمو کے کنارے ہوئی اور دریائے آمو ہماری اور سلطنتِ خوارزم کی قدرتی سرحد
اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ شہزادے کی محبوبہ خوارزم سے تعلق رکھتی ہے تو پھر اس بات میں کوئی شبہ نہیں
کہ شہزادہ دریا پار کر کے اس سے ملاقات کے لیے جاتا ہوگا"۔

"سرائے خانم! بات اس کے برعکس بھی تو ہو سکتی ہے"۔

امیر تیمور نے بیٹے کی شرافت پر داغ آتے دیکھ کر فوراً مدافعت کی:

"یہ ضروری تو نہیں کہ شہزادہ دریا پار کر کے اس طرف گیا ہو۔ کیا پتہ وہ لڑکی دریا پار کر کے خود
شہزادے سے ملنے آتی ہو"۔

"نہیں امیر۔ یہ بات ایک لڑکی کے کردار اور وقار کے خلاف ہے"۔

سرائے خانم نے بڑے فخر سے کہا:

"کیا یہ غلط ہے کہ شاہِ تاتار امیر تیمور خود چل کر سرائے خانم کے خیمے میں شادی کی درخواست لے کر آئے
حالانکہ سرائے خانم اُس وقت محض ایک بے حیثیت جنگی قیدی تھی"۔

امیر تیمور اس برجستہ اور برمحل جواب پر چونک اٹھا۔

"سرائے خانم! تم واقعی عقلمند ہو۔ ہم نے تمہارے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی"۔

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ جب سرائے خانم کا پہلا شوہر امیر حسین جو تیمور کا سالا بھی تھا، خانہ جنگی میں ...
اور سرائے خانم قید ہو کر آئی تو تیمور نے سرائے خانم کے خیمے میں جا کر اسے شادی کا پیغام دیا تھا۔

تیمور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا:

"سرائے خانم۔ دراصل ہم نے کبھی ان باتوں پر غور نہیں کیا ورنہ ہم اس قدر پریشان نہ ہوتے اور اس
پر پہنچ جاتے جس طرف کہ تم نے اشارہ کیا ہے"۔

"امیر اس سلسلے میں قصوروار نہیں"۔

سرائے خانم نے بڑے تیکھے پن سے کہا:

"امیر کو تو امورِ سلطنت سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ اپنے گرد و حالہ کی ہوتی محبتوں پر غور کر سکیں"۔

"تم ہم پر طنز کر رہی ہو سرائے خانم"۔

امیر تیمور نے اس کی بات کا مفہوم فوراً بھانپ لیا:

"ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ اب ہم تم پہ پہلے سے زیادہ توجہ دیں گے۔ ہم اس بات پر بھی تمہارے
... ہیں کہ تم نے ہمیں ایک نئی راہ سجھائی ہے۔ اب یہ معلوم کرنا چنداں مشکل نہیں کہ شہزادے جہانگیر نے
دریائے آمو کب عبور کیا اور خوارزم کی وہ کون سی لڑکی ہے جس سے شہزادے نے ملاقات کی تھی"۔

سرائے خانم نے جو گہرا طنز کیا تھا اس کا صلہ اسے مل گیا تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے سر جھکا کر اسے
... پیش کیا۔

امیر تیمور پر اب دوسری ہی دھن سوار ہو چکی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک اس کے پاس نہ بیٹھا اور کچھ دیر بعد
... میں واپس چلا گیا۔ امیر تیمور نے مونڈارلات اور حکیم طبیب کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ شہزادے
... کا حال کسی پر ظاہر نہ کیا جائے لیکن شہزادے کے ہوش میں آنے کی خبر کو نہ چھپایا جا سکا۔ سب سے
... کی اطلاع سرائے خانم کی کنیزوں کو ملی۔ سرائے خانم جب شہزادے کو دیکھ کر آئی تو اس کا چہرہ ہشاش بشاش تھا۔

مزاج شناس کنیزوں نے اسے خوش دیکھا تو ملکہ کے سر ہو گئیں۔ آخر سرائے خانم کو بتانا پڑا کہ شہزادہ
آ گیا ہے۔ پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام محلات میں پھیل گئی۔ . . . . .

سرائے خانم نے صرف شہزادے کے ہوش میں آنے کا ذکر بڑے محتاط طریقے سے کیا تھا لیکن
کر جب یہ خبر سمرقند کے کوچہ و بازار میں پہنچی تو اس میں یہ اضافہ بھی ہو گیا کہ شہزادے جہانگیر
علاج سے اچھے ہو گئے ہیں۔ اور اب وہ محل کے اندر چہل قدمی بھی کر سکتے ہیں۔

پھر کیا تھا، امرا اور وزرا مبارکباد دینے کے لیے امیر تیمور کے محل پر جمع ہونے لگے۔ امیر
پریشان ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ شہزادے کے صحت یاب ہو کر چہل قدمی کرنے کی افواہ کہاں
اب یہ اس کے لیے مشکل تھا کہ وہ نصف خبر کی تصدیق اور نصف کی تردید کرتا۔ اس کے امرا اور اراکین سلطنت
باریابی کی اجازت دی اور ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ بعض بہی خواہوں نے صدقہ خیرات اور جشن
تیمور کو مجبوراً یہ حکم بھی جاری کرنا پڑا۔ حالانکہ شہزادہ اب تک صاحب فراش تھا۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ اب امیر
سرائے خانم اس کی مزاج پرسی کے لیے آتے تو وہ ان کے شکریے کے رسمی الفاظ ادا کر دیا کرتا تھا۔

امیر تیمور نے شہزادے کی پوشیدہ بیماری کے سلسلے میں مولانا زین الدین کو بھی اپنے اعتماد میں لیا
تیمور نے شہر سبز سے بلوایا تھا اور وہ اب تک سمرقند میں ہی مقیم تھے۔ امیر تیمور ہر اہم معاملے میں ان سے
رہنمائی حاصل کرنے کا عادی تھا۔ غرض یہ کہ امیر تیمور نے مولانا زین الدین اور سردار موید ارلات کے مشورے
خوارزم کی سرحد کے قریب متعین سردار فوج کو ایک خفیہ خط لکھا۔ فوج کا یہ سردار شہزادہ جہانگیر کے سمرقند
آنے پر اس کی جگہ مقرر کیا گیا تھا۔

اس خط کا متن بڑے غور و فکر اور صلاح مشورے کے بعد طے ہوا تھا۔ امیر تیمور نے دریائے آمو کے
سپہ سالار کو حکم دیا تھا کہ وہ نہایت خفیہ طور پر یہ بات معلوم کرے کہ شہزادہ جہانگیر دریائے آمو عبور کر کے خوارزم
حدود میں کب داخل ہوا اور نیز یہ کہ خوارزم کے علاقے میں جب شہزادہ جاتا تھا تو اس کے ساتھ کون
تھا؟ شہزادے کے ساتھ جانے والے ایسے تمام لوگوں کو حراست میں لے کر انہیں سخت پہرے اور حفاظت کے
ساتھ دارالسلطنت روانہ کیا جائے۔

دریائے آمو کے لشکر کا سپہ سالار امیر تیمور کا یہ خط پا کر بہت گھبرایا۔ وہ اس لشکر میں نیا
لشکریوں کے حالات سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ امیر نے اسے خفیہ تحقیقات کا حکم دیا تھا۔ اس
کھل کر کسی سے بات بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر شہزادہ جہانگیر کے ان سواروں کو
مل گیا کہ انہیں تلاش کیا جا رہا ہے تو عین ممکن ہے کہ وہ خوف کھا کر بھاگ نہ کھڑے ہوں۔ اسے

تھا اور امیر کو جواب دینا تھا۔
اس نے تحقیقات کا آغاز اپنے نائب سے کیا۔ ایک دن باتوں باتوں میں پوچھا:
"دریا کے اس پار خوارزم کا لشکر پڑا ہوا ہے۔ انہوں نے دریا پار کرنے کی کوئی کوشش کی؟"
"نہیں سردار!"
نائب نے اس کے خیال کی سختی سے تردید کی:
"ایسی کوئی بات نہیں۔ نہ وہ دریا کے اس طرف آئے اور نہ کبھی ہم نے ادھر جانے کی کوشش کی۔
زادہ جہانگیر نے لشکر کو دریا پار کرنے کی سخت ممانعت کر دی تھی۔"
سردار لشکر کو پہلے ہی قدم پر ناکامی ہوئی۔ نائب کے جھوٹ بولنے کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی
طرف امیر تیمور کے خط سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ شہزادے جہانگیر نے دریا عبور کیا ہے۔ بہت غور کرنے
بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ شہزادے نے خفیہ طور پر اپنے معتمد سواروں کے ساتھ دریا عبور
دا اور اس نے اس کی اطلاع اپنے نائب کو نہ دی ہو۔
اس نے اپنے اس خیال کو تقویت دینے کے لیے نائب کو ایک بار پھر ٹٹولا۔ سالار نے لاپروائی سے نائب
پوچھا:
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شہزادہ جہانگیر دشمن کا حال معلوم کرنے کے لیے پوشیدہ طور پر دریا پار جاتے ہوں
لانے کسی مصلحت کی بنا پر یہ بات نہ بتائی ہو۔"
"ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے سردار۔"
نائب نے شاید اپنے سردار کو خوش کرنے کے لیے کہا:
"اس کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ شہزادے بہادر نے اپنے بجائے اپنے کسی خاص سوار کو دریا پار دشمن
کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہو۔"
اس نے تعریف کہا نائب!"
سردار نے اس کی حوصلہ افزائی کی:
"سردار فوج کا دشمن کے لشکر میں تنہا جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ شہزادہ جہانگیر نے یہ کام ضرور اپنے
خاص سرداروں کے سپرد کیا ہو گا۔"
"سردار، آپ بڑے اعلیٰ ظرف ہیں۔"
نائب خوش ہو کر بولا: "آپ نے اپنے نائب کے خیال سے اتفاق کر کے میری عزت افزائی کی ہے۔"

شہزادہ جہانگیر ولی عہد سلطنت ہیں۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہنا لیکن یہ ضرور ہے کہ انہوں
میں شریک نہیں کیا۔ ان کے تو بس پانچ یار تھے۔ انہیں کے ساتھ وہ مگن رہتے تھے"۔ نائب
حاصل کرنے کے لیے شہزادے کی بے التفاتی کا شکوہ کر بیٹھا۔

سردار فوج اپنے نائب کی اس بات پر اچھل پڑا۔ اپنی خوشی ضبط کرتے ہوئے بولا:
"شہزادے کے وہ دوست کون ہیں۔ کیا شہزادہ انہیں اپنے ساتھ سمرقند لے گیا ہے؟"
"نہیں سردار۔ وہ تو اسی لشکر میں دندناتے پھرتے ہیں"۔
نائب کو شہ ملی تو اور کھل گیا:
"میں شہزادے بہادر کے لحاظ سے انہیں کچھ نہیں کہتا"۔
"کیا وہ خودسر ہو گئے ہیں؟" سردار نے اس انداز سے کہا جیسے وہ شہزادے کے
ناراض ہو گیا ہو۔
"ایسی ویسی خودسری سردار"۔
نائب کو حوصلہ ملا تو وہ پھٹ پڑا:
"وہ تو کسی کو منہ ہی نہیں لگاتے۔ کسی کام سے بلواؤ۔ سو سو بہانے بناتے ہیں۔
ایک بار آتے ہیں"۔
"ایسے بدقماش اور خودسر لوگوں پر ہمیں نظر رکھنی ہو گی نائب!"
سردار مصنوعی غصے سے بولا:
"ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ان پانچوں کو اسی وقت غیر مسلح کر کے الگ الگ خیمو
نائب کی تو مراد بر آئی۔ اسے جہانگیر کے ان منہ چڑھے لوگوں سے سخت پرخاش تھی
انہیں ان کی پلٹنوں سے الگ کر کے اپنے محافظ دستے میں شامل کر لیا تھا۔ ان کے قدم زمین
جب شہزادہ سمرقند چلا گیا اور اس کی جگہ نیا سردار آیا تو نائب نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا
کی پرانی پلٹنوں میں بھیجنے کا حکم دے دیا۔ اس پر ان پانچوں نے بڑا واویلا مچایا اور سخت احتج
احتجاج خار بن کر نائب کے دل میں کھٹکتا تھا اور وہ انہیں مزید ایذا پہنچانے کی تدبیروں
گرفتاری کے حکم سے اسے دلی مسرت ہوئی۔
نائب تعمیل حکم کے لیے سردار کو سلام کر کے جانے لگا تو سردار نے اسے روک کر کہا:
"مجرموں کو اسی وقت گرفتار ہونا چاہیے۔ خبردار کوئی فرار نہ ہونے پائے۔ الگ

ہماری خیر نہیں۔ وہ سب امیر تیمور کے مجرم ہیں۔ ہم انہیں آج ہی سمرقند بھیج دیں گے"۔
"سردار اطمینان رکھیں"۔
نائب بڑے فخر سے بولا:
"میرے ہاتھ سے تو انہیں صرف موت ہی بچا سکتی ہے"۔
"نہیں۔ انہیں کوئی گزند نہ پہنچے"۔
"بہتر ہے سردار۔ ایسا ہی ہو گا"۔
نائب سردار نے باہر آ کر سواروں کے ایک دستے کو شہزادے کے دوستوں کو گرفتار کرنے کے لیے
بھیجا۔ شہزادے کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ دوستوں کو سب ہی جانتے تھے۔ ان کی تلاش اور گرفتاری میں کوئی
دقت نہ پیش آئی۔ نائب کا بھیجا ہوا دستہ ایک گھنٹے کے اندر اندر مطلوبہ اشخاص کو گرفتار کر کے نائب کے پاس
آیا۔ ان کے ہتھیار پہلے ہی چھین لیے گئے تھے۔
نائب کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ انہیں دشمنی کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ انہوں نے احتجاج کرنا بے کار سمجھا اور
کے انجام کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔
نائب سردار نے ان سے کوئی بات نہ کی اور انہیں لیے ہوئے سردار لشکر کے خیمے پر پہنچا۔ اندر پہنچ کر اس نے
سردار کو اطلاع دی۔
سردار بڑی بے تابی سے ان کی گرفتاری کا منتظر تھا۔ اس نے انہیں فوراً پیش کرنے کا حکم دیا۔ نائب ان
قیدیوں کو اندر لایا۔ ان کے ہاتھ رسیوں سے بندھے تھے۔
"تم نے ان سے کچھ پوچھا تو نہیں۔ کوئی سختی تو نہیں کی"۔ سردار نے نائب سے دریافت کیا۔
"نہیں سردار"۔
نائب نے جواب دیا:
"میں نے نہ کچھ پوچھا ہے اور نہ سختی کی ہے۔ آپ کے حکم کے مطابق گرفتار کر کے حاضر کر دیا ہے۔ جو
سزا دیں"۔
"تم جا سکتے ہو"۔ سردار نے حکم دیا۔
"میں۔۔۔۔ میں چلا جاؤں؟" نائب نے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ دراصل دیکھنا چاہتا تھا کہ شہزادے
کے ان منہ چڑھے لوگوں کو سردار کیا سزا دیتا ہے۔
"کہہ دیا کہ جاؤ۔ تمہارا کام ختم ہو گیا"۔ سردار نے اسے ڈانٹ پلائی۔

نائب چپ چاپ باہر نکل گیا۔

"تم شہزادے جہانگیر کے دوست ہو گیا؟" سردار نے انہیں نرمی سے مخاطب کیا۔

انہوں نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔

"جواب دو۔"

سردار غصے سے بولا:

"جان کی خیر چاہتے ہو تو سچ سچ جواب دو۔"

"ہاں سردار۔"

ایک نے مریل آواز میں جواب دیا:

"شہزادے بہادر ہم پر مہربان تھے۔"

"شہزادہ جہانگیر کتنی بار دریا پار گئے تھے؟"

انہوں نے پھر خاموشی اختیار کر لی۔

ذرا دیر کے بعد سردار دہاڑا:

"کمبختو۔ امیر تیمور کو معلوم ہو چکا ہے کہ شہزادہ جہانگیر دریا پار کر کے خوارزم کے علاقے میں گئے۔ جھوٹ بولو گے تو امیر تمہاری گردنیں اڑا دیں گے۔"

ان کے بدن لرز اٹھے۔

انہیں یقین ہو گیا کہ شہزادے کا معاملہ امیر تیمور کے سامنے کھل گیا ہے۔ اب جھوٹ بولنا بیکار ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے کہا:

"شہزادہ جہانگیر صرف ایک بار پار گئے تھے۔ ہم نے بہت روکا مگر وہ نہیں مانے۔"

سردار نے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر آنکھیں کھول کر بولا:

"شہزادہ تمہیں بھی ساتھ لے گیا ہو گا؟"

"جی ہاں سردار لیکن ......"

"بس بس۔ اب جو کہنا ہے امیر تیمور کے گوش گزار کرنا۔"

سردار اپنی کامیابی پر بڑا خوش تھا:

"ہم تمہیں اسی وقت امیر کے دربار میں بھیج رہے ہیں۔ خبردار جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

سردار نے ان کے جواب کا انتظار نہ کیا اور غلام کو بلا کر حکم دیا کہ نائب سردار کو پھر حاضر کیا جائے۔ غلام چلا گیا۔

سردار کاغذ اور قلمدان لے کر کچھ لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے امیر تیمور کو مختصر سا جواب لکھا جس میں تحریر کیا کہ شہزادہ جہانگیر نے صرف ایک بار دریا عبور کیا تھا۔ وہ پانچ دوست جو شہزادے کے ساتھ گئے تھے انہیں گرفتار کر کے آپ کے دربار میں بھیجا جا رہا ہے۔ ان قیدیوں نے اس بات کا اعتراف کر لیا ہے۔ مزید تفصیلات ان کی زبانی معلوم کی جا سکتی ہیں۔"

سردار خط لکھ کر فارغ ہوا تو اس کا نائب آ گیا۔ سردار نے حکم دیا:

"ان پانچوں کو دو سو سواروں کی حفاظت میں امیر تیمور کے دربار میں بھیج دو۔ ابھی اور اسی وقت!"

"کیا مجھے ساتھ جانا ہو گا؟" نائب نے دبی آواز میں پوچھا۔

"تم نہیں جاؤ گے۔"

سردار نے اسے گھور کر دیکھا:

"جواب لے کر ہمارا غلام ساتھ جائے گا۔"

"جواب؟"

نائب نے حیرت سے سردار کو دیکھا،

"کس بات کا جواب؟"

"کچھ نہیں۔ تم جاؤ اور ان کے بھیجنے کا انتظام کرو۔ ہر بات میں دخل نہیں دیا کرتے۔" سردار نے بڑے ... یوں کہا۔

نائب جانے لگا تو سردار نے کہا:

"ان کے ہاتھ کھول دو۔ دو سو سوار ان کی حفاظت کے لیے کافی ہیں۔"

نائب نے بڑی بے دلی سے ان کے ہاتھ میں بندھی ہوئی رسیاں کھول دیں۔

○

شہزادے کے محل میں چہل پہل ہو گئی تھی۔ امیر تیمور دن میں دو ایک بار اسے دیکھنے کے لیے آنے لگا۔ امراء

اور وزراء نے بھی عیادت کے لیے آنا جانا شروع کر دیا تھا۔

سرائے خانم کے سامنے تو شہزادہ شرمایا شرمایا رہتا تھا لیکن حکیم طبیب سے وہ کافی بے تکلف ہو گیا تھا، اس کے ہمراز تھے۔ دونوں خوب گھل مل کے باتیں کرتے تھے۔

شہزادے نے حکیم طبیب کو بتایا تھا کہ شاہ خوارزم کی طرف سے ایک وفد دوستی کا پیغام لے کر آنے والا ہے۔ حکیم طبیب نے اندازہ لگایا تھا کہ شہزادہ شاید شاہِ خوارزم کی بیٹی کے عشق میں گرفتار ہے لیکن جب اس نے طور پر معلومات کیں تو اسے بتایا گیا کہ شاہ خوارزم کی کوئی اولاد نہیں۔ حکیم صاحب کا یہ اندازہ غلط ہوا تو انہوں نے شہزادے کو کریدنا شروع کیا لیکن شہزادہ اپنے عہد پہ قائم تھا۔ اس نے حکیم صاحب کو کچھ اور بتانے سے صاف انکار کر دیا۔

امیر تیمور کو شہزادے کی بحالیٔ صحت کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ خود بھی جب شہزادے کو دیکھنے جاتا، شہزادہ بڑی تیزی سے تندرست ہوتا محسوس ہوتا۔ حکیم کی صحبت نے شہزادے پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اب دریائے آمو کے سردار کے جواب کا انتظار تھا۔ اس کے جواب کی روشنی میں ہی وہ کوئی قدم اٹھا سکتا تھا تاکہ شہزادے کے درد کا مستقل درماں ہو سکے۔

پھر ایک دن امیر کو اطلاع ملی کہ دریائے آمو کے سردار کا معتمد غلام پانچ قیدیوں کو لے کر آیا ہے اور قدم بوسی کا آرزومند ہے۔

تیمور کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اپنی خوشی پر قابو رکھا۔ درباریوں کو رخصت کیا اور معتمد کو طلب کیا۔ احتیاط کے طور پر اس نے اپنے دربار کے چاروں طرف سخت پہرہ لگوا دیا اور تاکید کر دی کہ گفتگو میں کوئی مخل نہ ہونے پائے۔

دریائے آمو کے سردار کا معتمد غلام ڈرا ڈرا امیر تیمور کے دربارِ خاص میں داخل ہوا۔ پانچوں قیدی وہ سواروں کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ امیر نے محسوس کیا کہ معتمد دربار کی شان و شوکت سے مرعوب ہو گیا ہے۔

غلام نے جھک کر تعظیم پیش کی اور جب سیدھے ہو کر اس نے بولنے کی کوشش کی تو رعبِ شاہی سے زبان گنگ ہو گئی۔

"گھبراؤ نہیں قاصد"۔

تیمور نے اسے تسلی دی:

"کیا پیغام دیا ہے سردار نے اور تمہارے ساتھ یہ قیدی کون ہیں؟"

معتمد کو کچھ حوصلہ ہوا۔

"اے تاتاریوں کے شہنشاہ!"

غلام نے بڑی کوشش کے بعد کہا:

"میرے سردار نے کوئی زبانی پیغام نہیں دیا اور نہ میں ان قیدیوں کے بارے میں کچھ جانتا ہوں"۔

پھر وہ جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا:

"سردار نے ایک خط شہنشاہِ عادل کے حضور میں پیش کرنے کا حکم دیا ہے"۔ غلام نے خط نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ہمارے قریب آؤ۔ ہم اجازت دیتے ہیں"۔

تیمور اپنی گنگا جمنی چوکی پر بیٹھا تھا جس پر حاکمِ وقت کے نشان کے طور پر ایک سفید نمدہ پڑا تھا۔

غلام لرزاں و ترساں تیمور کے قریب پہنچا اور خط امیر کی طرف بڑھایا۔

"تم نے یہ خط پڑھا ہے؟" تیمور نے بند خط اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"اے شہنشاہ! خط بند ہے"۔

غلام نے سنبھل کر جواب دیا:

"اگر خط کھلا بھی ہوتا تو میں شہنشاہِ تاتار کے نامے کو پڑھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا"۔

امیر تیمور نے خط پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

"مجرموں کو فوراً ہمارے حضور پیش کرو"۔

تیمور خط پڑھتے ہی بولا:

"تم اپنے محافظ دستے کے ساتھ کچھ دن آرام کر کے واپس چلے جانا۔ تمہارے سردار کو کسی جواب کی ضرورت نہیں ہے"۔

امیر تیمور نے سردار کے قاصد کو ایک ہی حکم میں نمٹا دیا۔ شہزادے کے یارِ غار اس تک پہنچ چکے تھے۔ تیمور کا ہی اتنے دنوں سے انتظار کر رہا تھا۔

غلام باہر آیا اور داروغۂ محل کو امیر کے حکم سے آگاہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ داروغہ نے مجرموں کو اپنی حفاظت میں لیا اور دربار میں پہنچا۔

شہزادے کے یار اپنے انجام سے لرز رہے تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ شہزادے کی دوستی انہیں موت سے دوچار کرے گی۔ جب وہ امیر کے سلام کے لیے جھکے تو ان میں سے ایک خوف سے اس قدر نڈھال ہوا کہ سیدھا ہونے کے بجائے زمین پر گر پڑا۔ اس کے ساتھی سمجھے کہ وہ معافی کے لیے امیر کے قدموں میں گرا ہے۔ وہ بھی فوراً

زمین پر گرے اور گڑگڑانے لگے۔

ایک نے قدموں میں پڑے پڑے کہا،

"اے شاہِ عادل! ہم خطاوار ہیں۔ ہم نے تیرے حکم کے خلاف دریائے آمو پار کیا۔ اس وقت ہماری زندگی تیرے اشارے کی محتاج ہے۔ تو چاہے تو ہمیں بخش سکتا ہے۔ ہمیں دوبارہ زندگی دے سکتا ہے"۔

امیر تیمور اس کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔ اس نے پر رعب لہجے میں حکم دیا:

"زمین سے اٹھو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ ہم تمہاری جان بخشی کا وعدہ کرتے ہیں"۔

پانچوں کی جان میں جان آئی اور وہ امیر کو دعائیں دیتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

امیر تیمور نے پھر کہنا شروع کیا:

"ہم نے تمہاری جان بخشی کا وعدہ کیا ہے لیکن اس شرط پر کہ تم ہمارے تمام سوالوں کا جواب سچ سچ دو گے کوئی بات ہم سے پوشیدہ نہیں رکھو گے۔ اگر تم نے ہمیں مطمئن کر دیا تو ہم تمہاری خطا بھی معاف کر دیں گے ہو سکتا ہے کہ تمہیں پہلے سے زیادہ عظمت حاصل ہو جائے"۔

"اے امیرِ ذی مقام:"

پانچ میں سے ایک نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا،

"ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اپنے غلط اقدام کی پوری تشریح کریں گے اور غلط بیانی سے قطعی نہیں لیں گے"۔

"پہلی بات تو تم یہ بتاؤ کہ تم نے یا شہزادے نے دریا پار کرنے کی غلطی کتنی بار کی تھی؟" امیر تیمور نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"اے شاہ! ہم سچ کہتے ہیں کہ دریا پار ہم صرف ایک مرتبہ گئے تھے"۔

شہزادے کے ایک دوست نے کہا:

"جہاں تک شہزادے بہادر کا تعلق ہے ان کے لیے بھی ہمیں یقین ہے وہ بھی صرف ایک ہی بار دریا پار گئے تھے ہم لوگ رات دن ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے اور سیر و شکار کو ساتھ ہی لے جاتے تھے۔ اگر شہزادے نے کبھی دوسری بار دریا پار کیا ہوتا تو وہ ہمیں ضرور بتاتے۔ اس لیے کہ ہم ان کے رازدار تھے۔ وہ کوئی بات نہ چھپاتے تھے"۔

"ہمیں تمہاری بات کا یقین آ گیا" امیر نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا:

"اب یہ بتاؤ کہ خلاف ورزی کا یہ واقعہ کب اور کس طرح پیش آیا؟"

اے امیرِ تاتار"۔

ان میں سے کسی دوسرے نے بتانا شروع کیا:

"ہمیں معلوم تھا کہ دریا کے اس پار دشمن کا علاقہ ہے۔ کبھی کبھی خوارزم کے دو چار سوار بھی ہمیں دوسری طرف گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے اس لیے ہم دریا سے دور ہی رہا کرتے تھے۔ لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ شہزادے بہادر کسی شکار کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے آمو کے کنارے پہنچ گئے۔ ہم ان سے پیچھے تھے۔ جب ہم قریب پہنچے تو شہزادے بہادر اپنا گھوڑا دریا میں ڈالے کھڑے تھے اور دوسری طرف خوارزم کے سپہ سالار آق صوفی کی بیٹی خانزادہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھڑی ان کا مذاق اڑا رہی تھی"۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ آق صوفی کی بیٹی تھی؟" تیمور سے ضبط نہ ہو سکا اور بات کاٹ کر سوال کیا۔

"جی ہاں امیر تیمور"۔

اس نے وثوق کے ساتھ کہا:

"یہ بات ہمیں اس وقت معلوم ہوئی جب خانزادہ نے خود اپنا تعارف شہزادے سے کرایا"۔

"ہوں"۔

تیمور نے زور سے ہنکارا بھرا:

"پھر کیا ہوا؟"

"اے شاہِ تاتار، ہم نے شہزادے کو بہت روکا کہ وہ دشمن کے علاقے میں نہ جائیں لیکن لڑکیوں نے انہیں غیرت کا طعنہ دیا اور شہزادے ہمیں وہیں ٹھہرنے کی تاکید کر کے دریا پار چلے گئے اور دیر تک ان سے دریا پار جا کر باتیں کرتے رہے"۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ دریا پار نہیں گئے؟"

"ہم بھی گئے تھے اے شاہِ تاتار! لیکن مجبور ہو کر"۔

ایک نے کہنا شروع کیا:

"شہزادے اور لڑکیوں کی گفتگو جاری تھی کہ ہمیں دریا پار دور سے گرد اڑتی دکھائی دی۔ چند لمحوں بعد چالیس پچاس سوار گھوڑے دوڑاتے آتے دکھائی دیے۔ اب ہم نے شہزادے کے حکم کی تعمیل نہ کی اور خطرہ سر پر دیکھ کر دریا پار کر کے شہزادے کے پاس پہنچ گئے۔ ان آنے والوں میں خانزادہ کا باپ آق صوفی بھی تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ شہزادہ مگر اس کی بیٹی سے ہم کلام ہے تو شہزادے کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ وہ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ ہم ان کی گفتگو نہ سن سکے کیونکہ شہزادے نے ہمیں دور ہٹ کر کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا"۔

بات صاف ہو گئی تھی۔ امیر تیمور کو یقین ہو گیا کہ شہزادہ جہانگیر خوارزمی سپہ سالار کی بیٹی خانزادہ کی محبت میں گرفتار ہے۔ پھر اس نے پوچھا:

"کیا آق صوفی کی بیٹی بہت خوبصورت ہے؟"

تیمور کے اس سوال پر وہ سب گھبرا گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

"گھبراؤ نہیں۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

تیمور نے انہیں پھر یقین دلایا:

"کیا شہزادہ جہانگیر، سپہ سالار کی بیٹی کی گفتگو میں دلچسپی لے رہا تھا؟"

"جی ہاں!"

ایک نے نظریں نیچی کر کے کہا:

"صرف شہزادے اور خانزادہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ سہیلیاں الگ کھڑی تھیں۔ شہزادے بہادر ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔"

"تم نے ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیا ہے۔"

امیر تیمور نے ان کے جرم کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا:

"ہم تمہیں معاف کرتے ہیں اور تمہیں اپنے عہدوں پر بحال کیا جاتا ہے۔"

پانچوں دوستوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ تیمور کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کریں۔

"تم لوگ فی الحال ہمارے محافظ دستے میں رہو گے۔"

تیمور کی آواز ابھری:

"شہزادے کی طبیعت ابھی ناساز ہے۔ ان کے اچھا ہوتے ہی تمہیں ان کے ساتھ حسب سابق منسلک کر دیا جائے گا مگر یہ خیال رہے کہ تم اپنی زبانیں بند رکھو گے اور کسی کو نہ بتاؤ گے کہ شہزادے سے دشمن کے علاقے میں کیا غلطی ہوئی تھی۔ اس سے تمہارے شہزادے پر نااہلی کا دھبہ لگ جائے گا جو شاید تم بھی پسند نہ کرو کیونکہ تم شہزادے کے بہی خواہ اور سچے دوست معلوم ہوتے ہو۔"

ایک نے سر نیچا کر کے ادب سے کہا:

"اے شاہ! خواہ ہماری گردنیں کٹ جائیں لیکن ہم اس واقعہ کا ذکر زبان پر نہ لائیں گے۔ شہزادے کی عزت اور عظمت ہماری جان سے زیادہ قیمتی شے ہے۔"

امیر تیمور نے شہزادے کی بدنامی اور نااہلی کا ذکر کر کے دراصل انہیں بہلاوے میں ڈالا تھا تاکہ وہ شہزادے اور خانزادہ کی ملاقات کو کوئی اہمیت نہ دیں اور ان کی سوچ شہزادے کے خندق پار کرنے کی غلطی سے آگے نہ بڑھے۔ اور امیر تیمور اس معاملے میں پوری طرح کامیاب ہوا کیونکہ جب ان لوگوں نے آپس میں اس مسئلے پر گفتگو کی تو ان میں سے کسی کا دھیان خانزادہ کی طرف نہیں گیا۔

امیر تیمور نے سردار موئڈارلات اور حکیم طیب کو بتایا کہ شہزادے کے درد کا درماں خوارزم کے سپہ سالار آق صوفی کی بیٹی خانزادہ کے پاس ہے بلکہ وہ خود اس مرض کی دوا اور مسیحا ہے۔

امیر تیمور نے جب اس سلسلے میں اپنی کوشش اور حکمتِ عملی کی تفصیل بتائی تو حکیم طیب اور سردار ارلات اس کی عقل و فراست کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔

شہزادے نے خانزادہ کا نام لبوں میں ہی رکھا تھا لیکن تیمور کی نظریں شہزادے کے دل تک پہنچ گئیں اور خانزادہ کو ڈھونڈ نکالا۔

امیر تیمور نے دونوں رازداروں کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ وہ شہزادہ جہانگیر کا رشتہ خانزادہ کے لیے خوارزم کے پاس بھیجے گا تاکہ اسے شان و شوکت سے اپنی بہو بنا کر لائے۔ بظاہر اس میں اس کی سبکی تھی۔ والیٔ خوارزم حسین صوفی اب تک خودسری اور سرکشی پر آمادہ تھا۔ اس نے مبارکباد کا رسمی پیغام تک نہ بھیجا تھا، اب اسے اپنے پیارے بیٹے کے لیے اسی خودسر سے درخواست کرنی پڑ رہی تھی۔

موئڈارلات نے اس خیال و فیصلے کی مخالفت بھی کی لیکن حکیم طیب نے سمجھا بجھا کر اسے رام کر لیا بلکہ شہزادے کا رشتہ لے کر جانے والے وفد کے قائد کے لیے اسی کا نام تجویز کیا۔ امیر تیمور نے بھی اسے پسند کیا۔

امیر تیمور نے اس سلسلے میں سرائے خانم کو بھی اعتماد میں لینا ضروری سمجھا کیونکہ وہ سوتیلی ہی سہی لیکن تھی تو جہانگیر کی ماں۔ اولاد کی شادی بیاہ کے معاملات میں ماں کی رائے نہ لینا یوں بھی خلافِ مصلحت تھا۔ اس سے سرائے خانم کی دل آزاری ہوتی۔

"سرائے خانم۔ ایک خانگی معاملے میں تمہاری رائے مطلوب ہے۔" تیمور نے اس کے پاس پہنچ کر محبت سے کہا۔

"شکر ہے کہ امیر کو میرا خیال تو آیا۔"

سرائے خانم تلخ لہجے کو دباتے ہوئے بولی:

"اگر رائے شہزادے کی شادی کے بارے میں ہے تو میں امیر سے اتفاق کرتی ہوں۔ یہ قدم انہیں پہلے اٹھا لینا چاہیے تھا۔"

امیر تیمور بھونچکا رہ گیا۔

"سرائے خانم تمہیں کس نے اطلاع دی؟" تیمور نے تعجب سے پوچھا۔

"اندازے بھی کوئی چیز ہوا کرتے ہیں امیر"۔

سرائے خانم سنجیدگی سے بولی:

"جوان بچوں کی بیماری، ماں کی نظروں سے نہیں چھپ رہتی"۔

"اگر جانتی تھیں تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

امیر تیمور بگڑ گیا:

"تمہیں کیا پتہ، ہمیں یہاں تک پہنچنے میں کن کن راہوں سے گزرنا پڑا، تم خاموشی سے ہمارا کودیکھتی رہیں"۔

"گستاخی معاف امیر"۔

سرائے خانم نے اس کے غصے کی کوئی پروا نہ کی:

"آپ نے خود جوان اولاد کی طرف سے تغافل برتا۔ میں اس خیال سے خاموش تھی کہ اگر میں شہزا بتاتی تو آپ کو جلال آجاتا کیونکہ آپ امیر تاتار پہلے ہیں اور باپ بعد میں۔ پھر یہ بھی خدشہ تھا کہ آپ سمجھ بیٹھیں کہ میں باپ کو بیٹے سے جدا کرنا چاہتی ہوں"۔

سرائے خانم کے لہجے میں کچھ تلخی تھی لیکن اس کی ہر بات حقیقت پر مبنی تھی۔

تیمور نرم ہو گیا۔ بولا:

"تو کیا تمہاری بھی یہی رائے ہے کہ خانزادہ کے لیے شہزادے کا پیغام بھیجا جائے؟"

"خانزادہ؟"

سرائے خانم نے تیمور کو حیران نظروں سے دیکھا۔

"یہ کون ہے اور شہزادے کا اس سے کیا تعلق ہے؟"

سرائے خانم کو اپنی جاسوس کنیزوں کے ذریعے یہ تو معلوم ہو گیا کہ شہزادہ کسی لڑکی کو دیکھ کر ریشہ اس کے خیال میں اس کا بہترین علاج یہ تھا کہ شہزادے کی فوراً شادی کر دی جائے تاکہ اس کا خیال بٹ جا کسی اور طرف توجہ دے سکے۔ خانزادہ کے بارے میں ابھی اسے اطلاع نہ ملی تھی۔ سرائے خانم کو تیمور نے کو پوری داستان اس کے سامنے دہرانا پڑی۔ سرائے خانم کی بھی سمجھ میں آ گیا کہ اب پانی سر سے اونچا اور شہزادہ سوائے خانزادہ کے کسی اور کی طرف توجہ نہ دے گا۔ اس لیے اس نے امیر تیمور ا پوری طرح اتفاق کیا۔

اکثر قدرت اس قدر مہربان ہوتی ہے اور اتنا کچھ دیتی ہے کہ پانے والے کو کوتاہ دامنی کا شکوہ ہو جاتا ہے تیمور کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا تھا۔ عزت، شہرت اور مال و دولت۔ لیکن انسان کی خواہشیں پھر بھی پوری نہیں ہوتیں۔

امیر تیمور ابھی خانزادہ کا پیغام بھیجنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ قدرت نے چھپر پھاڑ کر اس کی یہ مراد بھی پوری کر دی۔ ایک شام اسے اطلاع دی گئی کہ خوارزم کا وفد شاہِ خوارزم کا مبارک باد کا پیغام لے کر آ رہا ہے اور ساتھ بیش بہا تحائف بھی لایا ہے۔

تیمور کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سب سے زیادہ خوشی شہزادہ جہانگیر کو ہوئی۔ اس نے ابھی تک اپنے محل سے قدم نہیں نکالا تھا لیکن خوارزم کے وفد کی خبر سن کر اس میں اتنی توانائی آگئی کہ وہ نہا دھو کر لباسِ فاخرہ پہن کر دربار میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

شہزادے نے حکیم طبیب کو بلا کر کہا:

"دیکھا آپ نے محترم حکیم۔ میں نہ کہتا تھا کہ خوارزم سے وفد ضرور آئے گا"۔

شہزادے کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ کوئی نہ اندازہ کر سکتا تھا کہ شہزادہ کیسی سخت بیماری سے گزر رہا ہے۔

حکیم صاحب مسکرا کر بولے:

"مجھے آپ کی بات پر یقین تھا لیکن اس وفد کے آنے سے آپ کو کیا فائدہ ہو گا۔ اس کے آنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

شہزادہ گھبرا گیا۔ وہ کس طرح کہتا کہ اس نے وفد بھیجنے کے لیے خانزادہ کے باپ آق صوفی سے درخواست کی تھی۔ بات بنانے کے لیے کہا:

"فائدہ کیا ہو گا؟ دونوں سلطنتوں میں دوستی کے رشتے استوار ہو جائیں گے اور..." وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا اور ادھر ادھر دیکھ کر رہ گیا۔

"جی ہاں شہزادے۔ آپ نے صحیح فرمایا"۔

حکیم طبیب اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولے:

"اس سے یہ بھی فائدہ تو ہو سکتا ہے کہ خوارزم جانے کی راہیں آپ پر کھل جائیں اور پھر کسی دن دریائے جیحوں کے کنارے کسی کی انتظار بھری آنکھوں کو دیکھ سکیں"۔

شہزادے کو پسینہ آ گیا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا:

"آپ بابا تیمور سے کہہ کر مجھے دربار میں جانے کی اجازت دلا دیجیے۔ میں خود بھی وفد کے ارکان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ کی آرزو بھری درخواست امیر کے حضور میں پیش کروں گا۔"

حکیم طبیب نے مسکراتے ہوئے کہا:

"امید ہے کہ درخواست منظور ہو جائے گی۔"

لیکن جب حکیم نے امیر تیمور سے شہزادے کے دربار میں جانے کی اجازت چاہی تو اس نے یہ درخواست سختی سے رد کر دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہزادے کے سامنے کوئی ایسی گفتگو ہو جس سے وفد والوں کو کوئی غلط فہمی ہو جائے۔ حکیم کو امیر کا انکار پسند نہ آیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ امیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

"محترم حکیم! شہزادہ جواں عمر اور نادان ہے۔ بسرِ دربار اس کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو پورے منصوبے پر پانی پھر جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ شہزادے کو ہمارا انکار ناگوار گزرے گا۔ ہماری طرف سے اس کو یہ کہہ دیا جائے کہ خوارزم کا وفد دور سے سفر کر کے آیا ہے۔ اسے فی الحال مہمان خانے میں رکھا جائے۔ دو دن بعد جب وفد آرام کر لے گا تو اسے دربار میں حاضری کا حکم ہوگا۔ اس وقت شہزادے کو بھی بلوا لیا جائے گا۔"

امیر تیمور نے شہزادے کو حکیم کے ذریعے اس طرح مطمئن کر دیا۔ دوسری طرف اس نے رات کو خفیہ طور پر اپنے محل میں طلب کر لیا۔

شاہ خوارزم حسین صوفی نے تیمور کے لیے ریشمی پارچہ جات، مرصع زیورات، خنجر، تلواریں جن کے قبضوں اور دستوں پر جواہرات جڑے تھے اور نادر قسم کے ظروف تحفے میں بھیجے تھے۔ وفد نے مبارکباد دینے کے بعد تحائف امیر تیمور کے ملاحظے کے لیے پیش کیے۔

تیمور تحائف دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے وفد کے ہر رکن کو جواہرات کا ایک ایک ہار دیا جس کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ وفد کو تیمور سے اس حسنِ سلوک کی امید نہ تھی۔ انہوں نے اس کی شان میں قصیدے شروع کر دیے۔

تیمور نے شاہ خوارزم اور اس کے امراء کی خیریت دریافت کی، پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ان الفاظ میں کہا:

"ہم شاہِ خوارزم کے خلوص سے بہت متاثر ہوئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سمرقند اور خوارزم کی دوستی میں استحکام پیدا ہو۔ اس کا بہترین طریقہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ہم شہزادہ جہانگیر ولی عہد سلطنت کا رشتہ حسین صوفی کے خاندان میں کریں۔"

نہایت نیک خیال ہے امیر عالی مقام کا۔"

ایک رکن بولا:

"اس رشتے سے دونوں ملک اور قریب آ جائیں گے۔"

"شاہ تاتار کی دور اندیشی پورے ملک تاتار میں مشہور ہے۔"

دوسرے رکن نے سنبھل کر کہا:

"خوارزم کی یہ خوش نصیبی ہوگی کہ ولی عہدِ سمرقند کا رشتہ وہاں کیا جائے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ہماری رائے سے اتفاق ہے۔" امیر تیمور نے انہیں اپنا ہمنوا بنانے کے لیے کہا۔

"اس میں اتفاق رائے کا کیا سوال۔ ہم تو دل سے چاہتے ہیں کہ آپ اس مسئلے میں قدم اٹھائیں۔" ایک اور نے کہا۔

"تم لوگ سفر کی تھکان سے چور ہو گے۔"

تیمور نے ان کی دلجوئی کی:

"سمرقند میں خوب آرام کرو۔ چلتے وقت ہم شاہ خوارزم کے نام ایک خط دیں گے اور اس میں یہ تجویز پیش کریں گے۔"

وفد مہمان خانے میں واپس چلا گیا۔

تیمور نے اسی وقت سرائے خانم کو بلوا لیا اور اس کے ذریعے شہزادہ جہانگیر کو اطلاع بھجوائی کہ خوارزم کے ذریعے خانزادہ کا رشتہ شہزادے کے لیے مانگا جا رہا ہے۔ سرائے خانم خوشی خوشی شہزادے کے پاس پہنچی اور یہ مسرت انگیز خبر اسے سنائی۔

شہزادہ اس اطلاع پر سخت حیران ہوا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ سرائے خانم نے ایک بار پھر اپنی بات دہرا کر اسے یقین دلایا کہ یہ حقیقت ہے اور اس سلسلے میں امیر تیمور مجوزہ خط کا مسودہ تیار کر رہے ہیں۔ ... شہزادے کی رہی سہی بیماری بھی دور ہو گئی۔ اب اسے وفد سے ملاقات کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور سرائے خانم کو بھی اس سے آگاہ کر دیا۔

○

ایک ہفتے کے بعد جب خوارزم کا وفد جانے لگا تو امیر تیمور نے شاہ خوارزم کے لیے اس کے ہمراہ بھیجے ہوئے

مخالف سے زیادہ قیمتی تحفے وفد کے ساتھ کیے۔ تیمور نے وفد کو وہ خط بھی دیا جس میں خانزادہ کا رشتہ
تھا۔ وفد خوشی خوشی واپس ہوا اور قطعِ منازل کرتا ہوا جس وقت خوارزم کے صدر مقام اور گنج میں داخل ہوا
اس وقت شاہ خوارزم اپنے سرداروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تیمور کی بڑھتی ہوئی طاقت کے بارے میں غور
کر رہا تھا۔

اس نے وفد کو فوراً بلوا لیا۔ وفد کے ارکان نے تیمور کے تحائف کو خوانوں اور کشتیوں میں
دربار میں بھیجے۔ شاہ خوارزم اور اس کے درباری ان قیمتی تحفوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔
ملاحظہ کے بعد شاہ خوارزم نے امیر تیمور اور اس کے اہل وعیال کی خیریت دریافت کی۔ وفد کے
رکن نے جواب میں امیر تیمور کا خط شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

شاہ نے خط پڑھا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ درباری شاہ کے چہرے کے اس
فوری تغیر کا سبب نہ سمجھ سکے مگر وہ خاموش رہے اور شاہ خوارزم کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔ شاہ
نے درباریوں پر نظر ڈالی اور سوائے چند اہم سرداروں کے باقی سب کو رخصت کر دیا۔

دربار میں شاہ خوارزم کے دونوں چھوٹے بھائی یوسف صوفی اور آق صوفی بھی موجود تھے۔ یوسف
خوارزم کا ناظم تھا۔ یہ عہدہ وزیراعظم کے برابر ہوتا تھا۔ چھوٹا بھائی آق صوفی سپہ سالارِ لشکر تھا۔
آمو کی جنوبی کمان سپرد کی گئی تھی۔ ان دنوں اسے شاہ خوارزم نے مشورے کے لیے اور گنج بلوایا تھا۔

شاہ خوارزم نے جلد ہی اپنے غصے پر قابو پا لیا اور سنجیدگی سے بولا:

"تیمور نے خانزادہ کا رشتہ اپنے بیٹے جہانگیر کے لیے مانگا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے یوسف؟"

یوسف کو اس رشتے میں کوئی عیب نظر نہ آیا۔ اس نے فوراً تائید کی:

"اے شاہ خوارزم! اگر یہ رشتہ منظور کر لیا جائے تو اس سے دونوں سلطنتوں میں دوستی
پیدا ہو جائے گی اور حالتِ جنگ ختم ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ شہزادہ جہانگیر ولی عہدِ سلطنت بھی ہے۔
رد کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔"

"تم تو ضرور خوش ہو گے آق صوفی۔"

شاہ خوارزم نے بڑے طنزیہ انداز میں اسے مخاطب کیا:

"تمہاری بیٹی شاہِ تاتار کی بہو بن جائے گی اور تیمور کے بعد اسے ملکہ کا درجہ حاصل ہو گا۔"

آق صوفی کو یہ تلخ انداز کچھ برا لگا۔ وہ ایک لمحہ کو شاہ کو حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا:

"اے شاہ میری خوش قسمتی اور رضامندی آپ کے فیصلہ کی تابع ہے۔ خانزادہ کو آپ کی بیٹی
ہے۔ آپ کا ہر فیصلہ اس کے لیے قابلِ قبول ہو گا۔ یوں شہزادہ جہانگیر..."

آق صوفی کہتے کہتے اک دم رک گیا۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ شہزادہ جہانگیر سے مل چکا ہے اور اس
کی بہادری اور شجاعت سے متاثر ہے لیکن اس نے شاہ سے جہانگیر سے اپنی ملاقات کا ذکر نہ کیا تھا اور اس وقت
اظہار کسی طرح مناسب نہ تھا۔

"سنو یوسف اور آق صوفی!"

شاہ خوارزم بڑے جوش سے بولا:

"بے شک ہم نے مغلوں کی اطاعت قبول کی تھی لیکن وہ بلادِ شمال کے عظیم الشان بادشاہ تھے اور تیمور...
تیمور ایک چالاک لومڑی ہے۔ وہ جہانگیر کا خانزادہ سے رشتہ جوڑ کر خوارزم پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے
لیکن ہم اس کو اس کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ وہ خوارزم کو مغلوں کا مقبوضہ علاقہ سمجھتا ہے اور
اس کا دست دے کر خوارزم کو اپنا علاقہ سمجھ بیٹھا ہے مگر خوارزم پہلے بھی آزاد تھا اور اب بھی خود مختار ہے۔ ہم برابری
کی سطح پر اس سے دوستی تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی حاکمیت قبول نہیں کر سکتے۔"

یوسف صوفی اور آق صوفی کو سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔
شاہ نے پھر بولنا شروع کر دیا:

"تیمور کے بیٹے کا رشتہ ہمارے قبیلے میں نہیں ہو سکتا۔ ہم جلائر ہیں اور ملکِ تاتار میں ہمارا قبیلہ سب سے
برتر ہے۔ آق صوفی چاہے تو اپنی بیٹی بیاہ دے لیکن یہ شادی ہماری مرضی کے خلاف ہو گی۔"

آق صوفی دل سے تو یہی چاہتا تھا کہ خانزادہ کی شادی شہزادہ جہانگیر سے ہو جائے لیکن خوارزم شاہ کی مخالفت
مول لینا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی کہنا پڑا:

"شاہ خوارزم کی مرضی کے خلاف قدم اٹھانے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ خانزادہ ہمیشہ کنواری بیٹھی رہے میں
ایسا کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں جس سے ملک خوارزم کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا ذرا بھی امکان ہو۔
لہٰذا آپ وہ اس رشتے کے لیے سختی سے انکار کر دیں۔"

آق صوفی کے دل میں چور رہتا تھا۔ اس نے تیمور اور امیر حسین کی جنگ کے دوران اس علاقے میں کئی مرتبہ
تیمور کی مدد کی۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر تیمور سے دوستی ہو گئی تو تیمور اس سے ضرور راز پرسی کرے گا۔ اس نے اپنے بعض
سرداروں کے بہت زور دینے پر انہیں خوش کرنے کے لیے تیمور کے دربار میں وفد بھیجا تھا ورنہ وہ تیمور کو ہر لحاظ سے
ایک معمولی سردار سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہ تھا۔

خوارزم کے سردار جنہوں نے شاہ خوارزم کو تیمور کے پاس وفد بھیجنے پر مجبور کیا تھا، جب ان کے دماغ میں

یہ بات بٹھائی گئی کہ امیر تیمور اس رشتے کی آڑ میں خوارزم پر قبضے کا خواہش مند ہے تو وہ بھڑک ا
بھی شاہ خوارزم پر زور دیا کہ اس رشتے سے انکار کر دیا جائے۔

شاہ خوارزم کو اپنے سرداروں کا تائید حاصل ہوا تو اس نے امیر تیمور کو جواب میں ایک نا
گستاخانہ خط لکھا جس کے آخری جملے سے پورے خط کی تلخی، گستاخی اور سختی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔
تیمور کو خط میں لکھا:

"میں نے خوارزم کا ملک تلوار سے فتح کیا ہے۔ اسے تلوار ہی سے
چھینا جا سکتا ہے۔"

اس جملے سے صرف خط کی تلخی کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے تیمور کے اس ہیجانا
کیا جا سکتا ہے جس میں وہ یہ خط پا کر مبتلا ہوا ہوگا۔ امیر تیمور دربار میں تلوار بلند کر کے پکارا

"جنگ۔ جنگ۔ جنگ!"

اس واضح اعلان کے بعد سمرقند میں جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ امیر تیمور نے اپنے
فوج لے کر فوراً سمرقند پہنچنے کا حکم دیا۔ عوام و خواص دونوں کو جنگی بخار ہو گیا۔ صرف علمائے دین او
ایک ایسی جماعت تھی جو اس جنگ کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتی تھی۔ ملک تاتار مسلسل خانہ جنگی
ملک کی معیشت تباہ ہو گئی تھی۔ ان کے خیال میں اب ملک کسی مزید خانہ جنگی کا بوجھ برداشت
باہر سے کوئی حملہ ہوا ہوتا تو یہ جماعت اعتراض کے بجائے حمایت کا اعلان کرتی لیکن یہ تو تاتاریوں
مقابلہ تھا۔ سب ہی تو تاتاری تھے۔

علما اور صوفیا کو مولانا زین الدین کے شہرِ سبز جانے کا بڑا افسوس تھا۔ وہ کچھ ہی دن پہلے
علما اور صوفیا نے غور و فکر سے ایک مجلس کا اہتمام کیا۔ ان سب کی ایک ہی رائے تھی:

"جنگ سے گریز کیا جائے اور صلح کی گفت گو کی جائے۔"

بحث و مباحثہ ہوا اور چند منٹوں کی گفت گو کے بعد طے ہوا کہ دو عالموں اور دو صوفیوں پر
تیمور سے ملاقات کرے اور اسے جنگ کی بجائے گفت و شنید کی ترغیب دے۔

دوسرے دن اس وفد نے امیر تیمور سے ملاقات کی اور بڑے تحمل اور بردباری سے اعلائ
کا حوالہ دے کر اسے جنگ سے قبل افہام و تفہیم پر آمادہ کرنا چاہا۔

امیر تیمور نے پہلے تو صاف انکار کر دیا لیکن جب وفد نے مولانا زین الدین کا نام لے کر
سے اس بات کا وعدہ لیا تھا۔ وہ ہر اہم معاملے میں علما اور صوفیائے کرام کا مشورہ بھی حاصل کر

پڑ گیا۔ اس نے جز بز ہو کر وفد سے پوچھا:

"آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

"ہم تاتاری کے ہاتھوں تاتاری کا خون بہانا نہیں چاہتے۔"

وفد کے ایک رکن صوفی جلال الدین نے کہا:

"ہم امیر کو جنگ سے نہیں روکتے لیکن شاہ خوارزم سے سمجھوتے کی بات کی جائے۔ اگر وہ سمجھانے بجھانے
سے کسی بات سمجھوتے پر رضا مند ہو جائے تو خانہ جنگی نہ کی جائے اور اگر وہ ضد پہ اڑا رہے تو پھر اسے سزا دی جائے۔"

امیر تیمور کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا:

"ہم مولانا زین الدین سے کیے ہوئے وعدے سے انحراف نہیں کریں گے۔ آپ لوگ یہ کوشش بھی کر
دیکھیں!"

"ہم امیر کے شکر گزار ہیں۔"

جلال الدین نے کہا:

"میں خود خوارزم جا کر حسین صوفی کو سمجھاؤں گا۔ امید ہے کہ وہ راہِ راست پر آ جائے گا۔"

لیکن صوفیا اور علما اپنی کوششوں میں ناکام ہو گئے۔

صوفی جلال الدین نے رختِ سفر باندھا اور خوارزم پہنچ گئے۔ شاہ خوارزم ان سے بڑی عزت سے پیش آیا
لیکن جب جلال الدین حرفِ مدعا زبان پر لائے اور حسین صوفی کو اونچ نیچ سمجھا کر اسے صلح پر آمادہ کرنا چاہا تو شاہ کو
طیش آ گیا۔ اس نے امیر تیمور کو خوب گالیاں دیں اور صوفی جلال الدین کو قید خانے بھیج دیا۔

صوفی جلال الدین کی گرفتاری کی خبر بہت جلد تیمور کو ہو گئی۔ اس نے لشکر کو فوراً کوچ کا حکم دیا۔ شہزادہ جہانگیر
امید و بیم کے درمیان لٹک رہا تھا۔ جب اس کا پیغام خوارزم شاہ کو بھیجا گیا تھا تو وہ بہت خوش تھا لیکن شاہ کے
انکار سے اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ پھر جب صوفی جلال الدین خوارزم روانہ ہوئے تو اس کی امید دوبارہ بندھی۔
لیکن صوفی جلال الدین کی گرفتاری نے اس کی امید نے پھر دم توڑ دیا۔ اب جنگ کا اعلان ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی
تمام امیدیں خوارزم کی فتح سے وابستہ کر لیں۔

شہزادہ جہانگیر نے بھی اس جنگ میں حصہ لینے کی پوری تیاریاں کی تھیں۔ اس کے پانچوں یار بحال ہو
کر اس کے محافظ دستے میں پھر سے شامل ہو گئے تھے۔

امیر تیمور نے شہزادہ جہانگیر کو کوچ کے وقت اپنے پاس بلایا اور بڑے پیار سے سمجھایا:

"جنگ کے ایام میں شاہِ وقت اور ولی عہدِ سلطنت ایک ساتھ دارالسلطنت سے دور نہیں رہ سکتے۔ ہم

خوارزم جا رہے ہیں۔ تمہاری دارالسلطنت میں موجودگی ضروری ہے۔ یوں بھی شاہ اور شہزادے دلہن کو بیاہ کر لینے جایا کرتے۔ دلہن خود رخصت ہو کر ان کے پاس آتی ہے۔ تم اطمینان سے سمرقند میں قیام کرو اور امورِ سلطنت دو۔ ہم تمہاری دلہن کو رخصت کرا کے بہت جلد واپس آ جائیں گے۔"

شہزادے کو خوارزم نہ جانے کا افسوس تو ہوا لیکن اس نے نہایت سعادت مندی سے باپ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

○

شاہِ خوارزم حسین صوفی نے تیمور کو جواب بھجوانے کے بعد اپنی منتشر فوجوں کو حکم بھیج دیا تھا کہ وہ قلعوں میں پہنچ کر قلعہ بند ہو جائیں۔

حسین صوفی کا بھائی آق صوفی اپنی بیٹی خانزادہ کے ساتھ دارالسلطنت اورگنج آیا ہوا تھا۔ شاہ خوارزم نے انہیں وہیں روک لیا تھا اور اس کا تمام لشکر قلعہ کرت، قلعہ خیوہ اور زاورگنج میں جمع ہو کر دفاعی جنگ کی تیاری میں مصروف تھا۔

امیر تیمور نے جب اورگنج کی طرف یلغار شروع کی تو وہ اس قدر تیز رفتاری سے بڑھا کہ اس کا لشکر پیچھے رہ گیا اور وہ اپنی کچھ فوج کے ساتھ کرت کے قلعے پر پہنچ گیا۔

امیر تیمور جنگ کے معاملے میں اکثر و بیشتر عجلت پسندی سے کام لینے کا عادی تھا۔ کرت کے قلعے پر پہنچ کر اس نے لشکر کے آنے کا بھی انتظار نہ کیا اور فوراً حملے کا حکم دے دیا۔

قلعے کے گرد ایک گہری خندق تھی۔ تیمور کے فوجیوں نے درخت کاٹ کر اس کی لکڑی اور شاخوں سے خندق پاٹ کر فصیل تک راستہ بنایا اور فصیل پر سیڑھیاں لگا کر چڑھنے لگے۔ قلعے کے اوپر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن تیموری فوجی جان پر کھیل کر اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس قلعے پر حملے کے دوران تیمور کے جانباز سردار شیخ علی بہادر نے بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ جس سیڑھی سے فصیل پر چڑھ رہا تھا اس سیڑھی پر اس کا افسر مبارک خان بھی تھا۔ کہتے ہیں فصیل کی منڈیر پر سب سے پہلے شیخ علی بہادر کا ہاتھ پڑا۔ اس کا افسر مبارک خان اپنے ماتحت کی یہ سبقت برداشت نہ کر سکا۔ اس نے شیخ علی کا گھٹنا پکڑا اور اسے نیچے کھینچ لیا۔ شیخ علی بہادر اس سے نیچے آ گیا اس طرح سب سے پہلے مبارک خان فصیل پر

پہنچا۔ شیخ علی بہادر اور دوسرے ساتھی بعد میں پہنچ گئے۔ کرت کے محافظ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

تیمور قلعہ فتح کر کے خیوہ کی طرف بڑھا۔ خیوہ سرخ ریگستان میں واقع تھا۔ اس بے آب و گیاہ میدان کو امیر تیمور اپنے سرگردانی کے دنوں میں پہلے بھی عبور کر چکا تھا۔ اب تو وہ ہر قسم کے سامان سے لیس تھا۔ اسے ریگستان پار کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔

خیوہ والے امیر تیمور کو اپنے سر پر دیکھ کر اس قدر گھبرائے کہ ایک معمولی جھڑپ کے بعد انہوں نے قلعے کے دروازے کھول دیے۔ تیمور نے تھوڑی سی فوج وہاں بٹھا دی اور اورگنج کا رخ کیا۔

○

خوارزم کا دارالسلطنت اورگنج، سمرقند سے شمال مغرب میں تقریباً چھ سو میل دور بحیرۂ ارال کے کنارے واقع ہے۔ اس جگہ دریائے آمو اس بحیرہ میں گرتا ہے۔ امیر تیمور جب یہ طویل سفر کر کے جس میں کرت اور خیوہ کی فتح بھی شامل تھی، اورگنج پہنچا تھا، اس نے شاہ خوارزم کو حیران کر دیا تھا۔ خوارزم کے دونوں مضبوط قلعے اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور تیمور نے قلعے کا محاصرہ کر کے حملے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

ان تمام باتوں سے شاہ خوارزم حسین صوفی اس قدر پریشان ہوا کہ اس نے اپنے تمام سرداروں سے تیمور کے ساتھ صلح کرنے کا مشورہ کیا۔ اس کے سرداروں کو اپنی کھلی شکست نظر آ رہی تھی وہ فوراً صلح پر آمادہ ہو گئے لیکن ان کے امیر کیخسرو نے یہ صلح نہ ہونے دی۔

امیر کیخسرو ختلانی پہلے امیر تیمور کا حلیف اور ساتھی تھا لیکن اس نے خوارزم پہنچ کر خوارزم کے شاہ کو تیمور کے خلاف اور زیادہ بھڑکایا۔

ادھر تو صلح کی بات چیت میں کیخسرو ختلانی سائل ہو گیا۔ ادھر امیر تیمور قلعہ شکن آلات اور منجنیقوں کی تیاری میں مصروف تھا۔ اورگنج کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور اسے ان آلات کے بغیر قبضے میں لانا ممکن نہ تھا۔ اس محاصرے کے دوران ہی حسین صوفی کا انتقال ہو گیا اور یوسف صوفی خوارزم کا بادشاہ بن گیا۔ حسین صوفی کو اپنی بہادری پر بڑا ناز تھا اور وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسے اپنی شجاعت پر اس قدر گھمنڈ تھا کہ اس نے امیر تیمور کو دعوتِ مبارزت دی تھی۔

اور گنج کے قلعہ کا دروازہ کھلا۔ ایک خوارزمی سوار نیزے پر سفید جھنڈا باندھے قلعہ سے نکلا اور
لشکر کی طرف بڑھا۔ صلح کے اس پیامبر کو فوراً امیر تیمور کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

پیامبر نے امیر کو سلام کرنے کے بعد کہا:

"اے امیرِ تاتار۔ میں اپنے بادشاہ، شاہ خوارزم یوسف صوفی کی طرف سے پیغام لایا ہوں۔
خوارزم کا امیر، حسین صوفی ہے۔"

امیر تیمور نے اس کی بات کاٹ دی:

"یہ صوفی کون ہے اور اس نے ہمیں پیغام بھیجنے کی جرأت کیسے کی؟
اے امیرِ تاتار۔"

پیامبر نے سنبھل کر فوراً وضاحت کی:

"شاہ حسین صوفی، مرحوم ہو چکے ہیں اور اب ہمارے بادشاہ یوسف صوفی ہیں
ہیں۔"

تیمور ایک لمحہ خاموشی کے بعد بولا:

"کیا پیغام لائے ہو؟"

"شاہ خوارزم یوسف صوفی نے امیر تیمور کو پیغام دیا ہے۔"

پیامبر نے ذرا رک کر خیمے میں موجود سرداروں کو دیکھا پھر طنز یہ انداز میں کہنا شروع کیا:

"شاہ نے فرمایا ہے کہ اپنے فوجیوں اور سرداروں کا بلاوجہ خون بہانے کے بجائے امیر تیمور قلعے
والے میدان میں تنہا تشریف لائیں۔ ہمارے شاہ بھی قلعہ سے تنہا آئیں گے۔ دونوں میں دست بدست
جس کی شمشیر دوسرے کے خون سے رنگین ہو جائے وہی فاتح قرار پائے گا۔"

"اس مبارزت کے لیے کون سا وقت مقرر ہوا ہے؟" امیر تیمور نے سوال کیا۔

"آج دوپہر ڈھلے۔" پیامبر نے جواب دیا۔

"اچھا۔ تم واپس جا کر شاہ خوارزم سے کہہ دو۔۔۔۔"

اسی وقت تیمور کے ایک امیر بیان نے دوڑ کر امیر تیمور کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑا کر التجا کی:

"اے امیر۔ آپ کی جگہ تختِ شاہی کے اوپر اور شاہی چتر کے نیچے ہے۔ جنگ کرنا ہم امیروں کا کام ہے۔
مقابلے کے لیے ہم میدان میں جائیں گے۔"

امیر تیمور کے دوسرے سرداروں نے بھی امیر بیان کی ہاں میں ہاں ملائی اور اپنی خدمات پیش کیں

بیان کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور امیروں کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"اس پیامبر کے الفاظ پر غور کرو۔ شاہ خوارزم نے ہمارے کسی امیر کے بجائے ہمیں مبارزت کی دعوت
دی ہے۔"

پھر اس نے پیامبر سے کہا:

"جاؤ اور شاہ خوارزم سے کہہ دو کہ ہم وقتِ مقررہ پر تنہا مقابلے کے لیے پہنچیں گے۔"

پیامبر نے ایک حیرت بھری نظر تیمور پر ڈالی اور پھر اس کے امیروں کو دیکھتا ہوا خیمہ سے نکل گیا۔

امیر کے سرداروں میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ ان کے چہرے فق تھے۔ وہ ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں
میں دیکھتے تھے مگر بات کرنے کا کسی میں یارا نہ تھا۔ امیر تیمور کا یہ فیصلہ اس کی بہادری اور شجاعت کا کھلا ہوا ثبوت
تھا۔

دوپہر کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا اسلحہ منگوایا۔ تمام امیر اور سردار اس کے خیمے میں جمع ہو گئے تھے۔ دوپہر
ڈھلتے ہی امیر تیمور نے امیروں اور سرداروں کی موجودگی میں مسلح ہونا شروع کر دیا۔ اس نے ہلکی کڑیوں والی زرہ
پہنی۔ تیغ بردار نے اس کے بائیں بازو پر ڈھال اونچی کر کے باندھی۔ تلوار پٹکے میں لگا دی۔ وہ سیاہ رنگ کا
خود لے کر آیا۔ تیمور نے تیغ بردار سے خود لے کر اپنے ہاتھ سے سر پر جمایا۔ خود کی آہنی جھالر تیمور کی گردن اور
شانوں پر شور کرتی ہوئی لٹک آئی۔

جب امیر تیمور مسلح ہو کر لنگڑاتا ہوا اور مسکراتا ہوا گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے بڑھا تو بوڑھا امیر
سیف الدین برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بڑھ کر رکاب تھام لی اور رگلوگیر آواز میں بولا:

"اے امیر۔ آپ ایک معمولی سپاہی کی طرح میدان میں لڑنے کے لیے نہ جائیے۔"

تیمور نے جواب دینے کے بجائے پٹکے پر ہاتھ مار کر تلوار کھینچی اور الٹی طرف سے سیف الدین پہ وار کیا۔
سیف الدین گھبرا کر پیچھے ہٹا اور تیمور مسکراتا ہوا گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اس کا گھوڑا ہزاروں تاتاری لشکریوں اور منجنیقوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اور سوار و سپاہی سحر زدہ
کھڑے اسے قلعہ کے میدان کی طرف جاتے دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ قلعہ اور گنج کے صدر دروازے کے
سامنے پہنچ گیا۔

امیر تیمور نے قلعہ اور گنج پر نظر ڈالی۔ صدر دروازے اور برجوں کے اوپر ہزاروں تیر انداز کمانیں سنبھالے
کھڑے تھے۔ ان کے جسم جیسے غیر متحرک ہو گئے تھے اور وہ پتھر کی مورتیاں معلوم ہوتے تھے۔ تیمور کی جرأت اور
شجاعت نے انہیں ششدر کر دیا تھا۔ فولادی جسم اور آہنی عزم رکھنے والے تیمور نے رکابوں پہ زور دے کر اپنے

جسم کو گھوڑے کی پیٹھ پر ذرا بلند کیا اور چیخ کر پکارا:

"کہہ دو اپنے بادشاہ سے، تیمور اس کا انتظار کر رہا ہے!"

اس کی آواز فصیل سے ٹکرائی، قلعہ والوں کے کانوں تک پہنچی۔ یوسف صوفی نے بھی اس کی آواز ضرور سنی ہوگی لیکن قلعہ والوں کے جسم میں خون جم کر رہ گیا۔ کسی میں اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ اپنی زد میں آنے ہوئے تیمور کو تیر کا نشانہ بنائے۔ اسے چھلنی کر دے۔

تیمور دیر تک دروازے کے سامنے کھڑا یوسف صوفی کو للکارتا اور اسے مبارزت کے لیے پکارتا رہا مگر اسے کوئی جواب نہ ملا اور کوئی بھی قلعے سے باہر نہ آیا۔

تیمور کو سخت غصہ تھا۔ اس نے آخری بار آواز دی:

"ایسا بادشاہ جو عہد شکنی کرے۔ جسے اپنے وعدے کا پاس نہ رہے اس کے لیے اس ذلیل زندگی سے موت بہتر ہے۔"

پھر تیمور نے اپنا گھوڑا موڑا اور دل برداشتہ ہو کر اپنے لشکر میں واپس آ گیا۔ اس کے لشکریوں نے اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے اور فوج نے نعرے لگا لگا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

منجنیقیں اور قلعہ شکن آلات تیار ہو گئے۔ تیمور نے آلات کو مناسب جگہ پر نصب کرا کے حملے کا حکم دے دیا۔ نقاروں پر چوٹ پڑی۔ زمین و آسمان دہل اٹھے لیکن نقاروں کی پہلی بازگشت ختم نہ ہوئی تھی کہ اورگنج کے قلعے کا دروازہ کھل گیا۔ آق صوفی اپنے سرداروں کے ساتھ امن کا پرچم بلند کیے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ تیموری لشکر میں پہنچ گیا۔

تیمور نے آق صوفی کو گھوڑے سے اترتے دیکھا تو خود بھی گھوڑے سے اترا۔ آق صوفی اور اس کے سرداروں نے شکست کے اظہار کے طور پر تلواریں گلے میں لٹکا رکھی تھیں۔ تیمور آق صوفی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے خیمے میں لے آیا اور اسے عزت سے بٹھایا۔

جنگ کے بادل چھٹ گئے تھے۔ آق صوفی نے قلعہ کی چابیاں تیمور کو پیش کر دیں۔ تیمور نے شاہ خوارزم یوسف صوفی کو موت کا طعنہ دیا تھا۔ شاید یہ اسی کا اثر تھا کہ یوسف صوفی آج مر گیا تھا اور اس کا چھوٹا بھائی، خانزادہ کا باپ آق صوفی اسے دفن کر کے قلعہ کی چابیاں لیے تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

تیمور قلعہ میں داخل ہوا۔ صوفی سیف الدین جنہیں حسین صوفی نے قید کر دیا تھا، تیمور کے حضور میں

پہنچے۔ خانزادہ کو محل میں دلہن بنایا گیا۔ سردار شیخ علی بہادر نے شہزادہ جہانگیر کی قائم مقامی کی اور صوفی سیف الدین نے خانزادہ اور جہانگیر کا عقد پڑھایا۔

اس طرح اورگنج والوں کو جنگ سے نجات ملی اور تیمور اور اس کے لشکریوں کو اورگنج کی فتح کے ساتھ ولی عہد سلطنت شہزادہ جہانگیر کی خوبصورت دلہن خانزادہ کی رخصتی کی خوشی بھی حاصل ہوئی۔

امیر تیمور کی بہو اور جہانگیر کی تسکینِ دل جس وقت سمرقند میں داخل ہوئی، وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ تیمور پرانے سمرقند کے بجائے ایک خوبصورت سمرقند کی تعمیر پہلے ہی کر چکا تھا۔ خانزادہ کے استقبال کے لیے پورے شہر کو نہایت نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا۔ راستے میں اطلس و کمخواب کا فرش بچھا تھا۔ مغربی دروازے کے خیابان کو قالینوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ امیروں، وزیروں اور تمام ارکینِ سلطنت نے دروازے سے باہر نکل کر خانزادہ کے جلوس کو خوش آمدید کہا۔

شہزادی خانزادہ ایک سفید اونٹ پر شغدف میں بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ایک باریک نقاب میں پوشیدہ تھا جس سے پھوٹنے والی کرنیں، استقبال کرنے والوں کے درمیان کھڑے ہوئے شہزادہ جہانگیر کے دل میں اتر رہی تھیں۔ شہزادی کی سواری کے گرد شہسوار دستے تھے اور عقب میں باربرداری کے وہ اونٹ اور گھوڑے تھے جن پر اس کا جہیز لدا ہوا تھا۔

اور پھر اسی شب شہزادہ جہانگیر نے جب حجلہ عروسی میں خانزادہ کے چہرے سے نقاب اٹھایا تو شہزادی کے حسن کی تابش سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

چھوٹی بیگم

نقارے پر چوٹ پڑی۔ طبل اور قرنے کے شور سے سمرقند گونج اٹھا۔ امیر تیمور نے فکر سے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ دربار میں بیٹھے ہوئے تمام سردار یوں جیسے خواب سے چونک پڑے۔ نقارے کی آواز اور طبل کی گونج یہ تو ظاہر کرتی تھی کہ ملکہ سرائے خانم کے بطن سے تیمور کا پہلا بچہ پیدا ہوا ہے اور زچہ و بچہ دونوں خیریت سے ہیں لیکن بچے کی جنس سے لوگ اب تک بے خبر تھے۔

یوں تو امیر تیمور کے پہلے ہی تین بیٹے شہزادہ جہانگیر، شہزادہ شیخ عمر اور شہزادہ میراں شاہ پل بڑھ کر جوانی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے لیکن تیمور کو اب بھی بیٹے ہی کی خواہش تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سرائے خانم کے بطن سے پیدا ہونے والا یہ بچہ بھی اولادِ نرینہ ہو۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ دلچسپ مگر جاہلانہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمان شہنشاہوں اور بادشاہوں نے سوائے بیٹوں کے بیٹی کی پیدائش کے لیے کبھی دستِ دعا دراز نہیں کیا اور نہ بچی کی پیدائش پر کبھی جشن کا اہتمام کیا۔ دراصل شاہوں کی اس خواہش میں ان کی رعونت اور تکبر کہیں زیادہ دخل تھا۔ وہ کسی کو داماد بنانا پسند نہ کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ شہزادیاں اکثر و بیشتر محلات اور قلعوں کی طلائی دیواروں کے پیچھے بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جاتیں۔ ان کے سر کے پھول نہ کھلتے اور وہ کنواری ہی انتقال کر جاتیں۔

شاید یہی فکر تیمور کو بھی بے چین کر رہی تھی۔

طبل اور قرنوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ درباری امرا اور وزرا تیمور کو مبارک باد دینے کے لیے مضطرب تھے لیکن تیمور کے چہرے کا تفکر ان کی زبانیں بند کیے ہوئے تھا۔ تیمور کا چہرہ امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ کبھی

خوشی کی کرن پھوٹتی نظر آتی مگر فوراً ہی مایوسی کی سیاہی دوڑ کر اس کرن کو دبا دیتی اور درباریوں کے ہونٹ تھرتھرا کر رہ جاتے۔

آخر بوڑھے امیر سیف الدین سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے ہمت کر کے زبان کھولی:

"اے امیر عالی مقام!"

"ٹھہرو سیف الدین۔"

تیمور نے فوراً اس کی بات کاٹ دی:

"ابھی مبارکباد کا وقت نہیں آیا۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں چوتھا ولی عہد دیا ہے یا۔۔۔"

تیمور رک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ حرم سرا سے اب تک کوئی نہیں آیا تھا۔ حالانکہ حرم سرا کے دروازے پر رکھی ہوئی نوبت بج رہی تھی۔ قرنے اور نقارے چیخ چیخ کر کسی نومولود کے آنے کی خبر دے رہے تھے۔

تیمور نے چوتھے ولی عہد کا نام یوں لیا تھا کہ تاتاری دستور کے مطابق پہلے چار بیٹے اپنے باپ کی وراثت کے حق دار ہوتے تھے۔ عام طور پر باپ کے مرنے پر پہلے چار بیٹوں میں اس کا اثاثہ تقسیم کر دیا جاتا لیکن بادشاہت تقسیم نہ ہوتی۔ بلکہ چاروں بیٹے ولی عہد سلطنت ہوتے اور ایک کے بعد ایک تخت پر بیٹھتا۔ اگر چاروں ولی عہد مر جاتے یا مارے جاتے تو پانچواں بیٹا تخت پر دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت سرداروں کو اختیار ہوتا کہ جسے چاہیں اپنا بادشاہ منتخب کر لیں۔

محل سے اطلاع آنے میں دیر ہوئی تو امیر تیمور کا تردّد بڑھا۔ وہ نہایت خاموشی سے اٹھا اور پچھلے دروازے سے بھاری بھاری قدموں کے ساتھ اندر کی طرف چل دیا۔ کنیزوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ امیر کی آمد کا غلغلہ اٹھا۔ محل سرا کی تمام کنیزیں امیر کی پیشوائی کے لیے راہداریوں میں قطار باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔

تیمور کے قدم محل سرا کے اس کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے جسے زچہ خانہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ تیمور کمرے کے دروازے کے قریب پہنچا تو بوڑھی دائی جسے تیمور کے دادا اور بیٹوں کی دایہ گیری کا فخر حاصل تھا، مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل کر تیمور کی طرف بڑھی۔

تیمور نے نظر اٹھا کر دائی کو دیکھا تو اس کے مسکراتے چہرے نے تیمور کی دھڑکنوں کو سکون بخشا۔ دائی نے تعظیم کے لیے سر جھکایا اور ادب سے بولی:

"شہنشاہ تاتار کو شہزادہ مبارک ہو۔"

تیمور کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اور مسکراہٹ لبوں سے پھوٹ پڑی۔ اس نے فوراً گلے سے جواہرات کا ہار

اتارا اور دائی کی طرف بڑھا دیا۔ دائی نے پھر جھک کر سلام کیا اور تیمور سے ہار لے کر پہلے اسے چوما پھر اسے گلے میں ڈال لیا۔

تیمور نے مسکرا کر دروازے کی طرف قدم بڑھائے لیکن دائی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ تیمور نے گھور کر دائی کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں شاہانہ جلال اور ایک سوال بھی تھا۔ دائی نے ادب ملحوظ رکھتے ہوئے کہا:

"اے شہنشاہ تاتار۔ ایک حقیر دائی کی کیا مجال ہے کہ وہ امیر عالی مقام کا راستہ روک سکے لیکن یہ حقیر یہ کہنے میں کوئی خوف محسوس نہیں کرتی کہ شہنشاہ تاتار سے بڑا ایک اور بادشاہ ہے جو شہنشاہوں کا شہنشاہ دونوں جہانوں کا خالق ہے۔ وہی خالق جس نے اس ننھی سی جان میں روح پھونکی ہے جسے دیکھنے کو آپ اس قدر بے تاب ہیں۔ اے شہنشاہ! کیا یہ اس خالق کا حق نہیں کہ اس کام کی ابتدا اس کے نام سے کی جائے جبکہ ہم ہر کام کا آغاز اسی سے کرتے ہیں؟"

خالقِ حقیقی کا نام سنتے ہی تیمور کا بدن، جلالِ خداوندی سے کانپ اٹھا۔ دائی کی تنبیہ نے امیر تیمور جلیل القدر بادشاہ کا وجود ہلا کر رکھ دیا۔ وہ دائی کا اشارہ سمجھ گیا اور نرمی سے بولا:

"تم نے ہمیں کوتاہی کا احساس دلایا۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔"

پھر اس نے محل کی خاتون داروغہ کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا:

"قاضیِ شہر کو اطلاع دی جائے کہ وہ آ کر نومولود کے کان میں اذان دیں۔"

قاضیِ شہر دربار میں موجود تھے۔ خاتون داروغہ نے انہیں پردے کے پاس پہنچ کر اندر بلایا اور انہیں امیر تیمور کے حکم سے آگاہ کیا۔

قاضیِ شہر نے فوراً پلٹ کر درباریوں کو شہزادے کی پیدائش کی نوید دی۔ پھر داروغہ کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے محل سرا میں پہنچے۔

امیر تیمور اندر جانے کے بجائے دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ قاضیِ شہر کو دیکھ کر وہ باہر نکلا اور انہیں ساتھ لے کر زچہ خانے میں داخل ہوا۔ ملکہ سرائے ملک خانم کی مسہری کے گرد حریر کے پردے تھے۔ امیر تیمور اور قاضی کے لیے مسہری کے قریب زرنگار کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ دائی خود شہزادے کو گود میں لیے مسہری کے قریب کھڑی تھی۔ قاضیِ شہر بیٹھ گئے تو دائی نے نرم گدے میں لپٹے ہوئے شہزادے کو ان کی گود میں دے دیا۔ قاضی نے شہزادے کو اپنے ہاتھوں میں ذرا بلند کیا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر نہایت خوش الحانی سے اللہ اکبر کی صدا بلند کی اور آہستہ آہستہ اذان کے کلمات سے اس کے دل کو گرم کیا۔

اذان کے اختتام پر امیر تیمور نے شفقت سے اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے آواز دی:

"شہزادے بیٹے!"

شہزادے کی مٹھیاں اور آنکھیں بند تھیں۔ امیر تیمور نے قریب کھڑی دائی کو مخاطب کیا:

"شہزادہ آنکھیں نہیں کھولتا۔ ہماری آواز پر بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔"

"بچے فرشتے ہیں امیر محترم!"

دائی نے برجستہ جواب دیا:

"فرشتے، شہنشاہوں کا حکم نہیں مانا کرتے۔"

امیر تیمور بوڑھی دائی کے جواب سے بہت خوش ہوا اور اسے دوسرا ہار بھی انعام میں دے دیا۔ اسی وقت ننھے شہزادے نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا رخ امیر تیمور کی طرف تھا۔ قریب ہی ملکہ کی صبا نامی شوخ اور منہ پھٹ کنیز کھڑی تھی، اس نے کہا:

"امیر۔ توجہ فرمائیں۔ شہزادے نے آنکھیں کھول دی ہیں اور ان کی نظریں شاہ کے رخ کا طواف کر رہی ہیں۔"

تیمور نے خوش ہو کر ننھے شہزادے کی طرف دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے قاضیِ شہر سے کہا:

"آپ نے غور فرمایا۔ کنیز نے کیا کہا ہے؟"

قاضیِ شہر گھبرا کر بولے:

"کنیز نے شاید، امیر کی توجہ شہزادے کی طرف دلائی تھی۔"

"نہیں..........."

تیمور مسکرایا اور کنیز سے کہا:

"کنیز! پھر کہنا کہ تم نے شہزادے کا کیا نام لیا تھا؟"

کنیز کی ساری خوشی غائب ہو گئی:

"شہزادے کا نام؟"

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر جلدی سے بولی:

"اے امیر۔ میں نے شاید یہ کہا تھا کہ شہزادے کی نظریں رخِ شاہ کا طواف کر رہی ہیں۔"

"ہاں ہاں، یہی۔"

امیر نے قاضی کی طرف کہا:

"کنیز کہتی ہے رُخِ شاہ اور ہم کہتے ہیں شاہ رخ۔ کیا کنیز نے شہزادے کو "شاہ رخ" کا نام دے کر ہمارے کام آسان نہیں کیا؟"

"سبحان اللہ"

قاضی شہر بولے:

"کیا خوبصورت اور مبارک نام ہے، شاہ رخ!"

کنیز جواب تک کھڑی کانپ رہی تھی۔ اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" امیر نے کنیز سے پوچھا۔

"صبا۔ اے شاہِ عالی مقام!" کنیز نے سنبھل کر جواب دیا۔

"خوب۔ تم نے ہمارا دل خوش کیا!"

یہ کہہ کر امیر تیمور نے نہایت قیمتی ہار کنیز کے حوالے کیا اور قاضی شہر سے بولا:

"آپ کی مبارک خدمت کا حساب ہم دربار میں کریں گے۔ شام کو عام اجلاس ہو گا تاکہ عوام کو پیش کرنے میں پریشانی نہ ہو۔"

قاضی صاحب چلے گئے۔ کنیزوں نے حریری پردے کھینچ دیے۔ سراٹے خانم نے اوپر کی طرف آہستہ سے بولی:

"شاہِ تاتار کو شہزادہ مبارک ہو۔"

"صرف شہزادہ نہیں۔ ولی عہد کہو سراٹے خانم۔ تاتاری دستور میں چوتھا بیٹا بھی ولی عہد ہوا کرتا ہے۔"

"خدا نے اسے زندگی دی تو امیر کی غلامی پر فخر کرے گا۔"

سراٹے خانم نے کہا:

"یوں آپ کی اولاد اور خون ہے۔ امیر کے ہاتھ پارس ہیں، چاہیں تو لوہے کو سونا بنا سکتے ہیں۔"

سراٹے خانم نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"نہیں سراٹے خانم!"

تیمور نے اسے روکا:

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ ہم تمہیں دیکھنے پھر آئیں گے۔" تیمور اٹھ کر چلنے لگا۔

"میرے سرتاج!"

سراٹے خانم کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ حالانکہ وہ تیمور کو ہمیشہ امیر یا امیر عالی مقام یا بادشاہ کہا کرتی تھی۔ تیمور چونک پڑا۔ اس کے قدم رک گئے:

"کہو سراٹے خانم۔ ہم سن رہے ہیں۔"

"میرے سرتاج! اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج میں آپ کا استقبال نہ کر سکی۔" سراٹے خانم کی زبان ادا ہو رہے تھے جیسے کوئی غیبی طاقت اس سے کہلوا رہی ہو۔

تیمور کو اپنی پہلی بیوی الجائی خاتون یاد آگئی۔ ایک روز جب وہ سرخ ریگستان میں الجائی خاتون کے ساتھ الجائی نے کہا تھا:

"میرے سرتاج! اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج آپ پیدل چل رہے ہیں۔"

تیمور کی نظریں سراٹے خانم پر جم کر رہ گئیں۔ کس قدر مماثلت تھی الجائی اور سراٹے خانم کی طبیعتوں میں۔

"سراٹے خانم۔ تم اس محل کا سب سے خوبصورت گلاب ہو۔ استقبال کے لیے تو ہم خود چل کر تمہارے پاس ہیں۔"

سراٹے خانم کے مضمحل چہرے پر بحالی آگئی۔ سراٹے خانم حقیقی معنوں میں تیمور کی بیوی اور حرم سرا کی ملکہ تھی۔ تیمور دربار لگانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ جب تیمور ہرات کی مہم پر گیا تھا تو سراٹے خانم باقاعدہ دربار لگاتی تھی موجود تمام امراء اسے تعظیم پیش کرتے تھے۔ اس کا تعلق سپاہ گروں کے خاندان سے تھا۔ اچھی تیر انداز ہونے کے علاوہ وہ شکار کی بھی شوقین تھی اور تیمور کے ساتھ شکار گاہ میں ضرور موجود ہوتی۔

تیمور نے سراٹے خانم کو یہ تاثر دیا تھا کہ وہ اس کے پاس سے اس لیے جلد واپس جا رہا ہے تاکہ وہ مکمل سکے لیکن یہ صرف ایک بہانہ تھا۔ اسے دراصل جلدی اس بات کی تھی کہ وہ باہر پہنچ کر اس خوشی کے موقع پر اور جشن و ضیافت کا ایسا اہتمام کرائے کہ یہ تقریب ایک یادگار بن جائے۔

سراٹے خانم اس کے سالے امیر حسین، والی غزنی کی بیوی تھی جس کے قتل کے بعد تیمور نے اس سے باقاعدہ لی تھی۔ تیمور کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ سراٹے خانم سے شادی کے بعد سے اب تک وہ اس سے بے التفاتی برتتا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی اصل وجہ اس کی بے پناہ مصروفیات تھیں لیکن سراٹے خانم کا گلہ بجا تھا اور اس نے ایک بار تو اس کا کھلے الفاظ میں اظہار بھی کر دیا تھا۔ ان تمام شبہات کو دور کرنے کے جشن منانے کا خواہشمند تھا۔

وہ باہر آیا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اس کے چہیتے بیٹے شہزادہ جہانگیر کی سیاہ بالوں والی خوبصورت بیوی پارچہ جات تقسیم کر رہی تھی۔ ریشمی کپڑوں کے سینکڑوں خوان اس کی کنیزیں سروں پر اٹھائے کھڑی ایک ایک کنیز کو دو دو خوان بانٹ رہی تھی۔

کو دیکھ کر تمام کنیزیں جہاں تھیں وہیں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئیں۔ بکھری ہوئی مسکراہٹیں اور گونجتے قہقہے ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ خانزادہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ کنیزوں کے ایک دم چپ ہو جانے سے

وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر سوالیہ نظروں سے اپنی کنیزوں کو دیکھا۔

"شاہِ تاتار۔ امیر تیمور"۔ قریب کھڑی ایک کنیز نے سرگوشی کی۔

خوارزم کی حسین شہزادی نے جلدی سے ریشمی چادر کا پلو سر پر کھینچا۔ پھر پلٹ کر اس طرف د
اشارہ کیا تھا۔ امیر تیمور زچہ خانے کے دروازے پر کھڑا بڑی دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا
شفقت بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

امیر تیمور کی بہو سر جھکائے آگے بڑھی اور جھک کر آداب بجالائی۔

"اے شاہ تاتار نومولود شہزادے کے لیے دلی مبارکباد"۔

"یوں نہیں خانزادہ"۔

تیمور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اور اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"ہم اپنی بہو کی مبارکباد محل میں قبول کریں گے"۔

"مگر شاہِ تاتار کو اس کے لیے ایک طویل مدت انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑے گی"۔ خانز
ادہ بے دھڑک تھی۔ وہ تیمور کے غصے سے لاپروا ہو کر جو اس کے منہ میں آتا تھا کہہ جاتی تھی۔

"ہم انتظار کریں گے خانزادہ"۔ تیمور کا لہجہ شفقت سے بھرا ہوا تھا۔

"مگر کب تک اے امیرِ عالی؟"

خانزادہ اسی طنطنے سے بولی:

"کنیزوں سے فارغ ہونے کے بعد مجھے شہزادے اور ملکہ مہربان کا صدقہ اتارنا ہے۔ یہ
انتظار کی زحمت دینا آدابِ شاہی کے خلاف سمجھتی ہوں"۔

"ہم تمہیں اس حاضر جوابی اور آدابِ شاہی کی اجازت دیتے ہیں"۔

تیمور مسکرایا:

"ہمیں تو یہ بھی خوشی ہے کہ شہزادہ جہانگیر نے غلط انتخاب نہیں کیا۔ تم یقیناً اس مرتبے
اطمینان رکھو تم جب تک واپس نہیں آؤ گی ہم محل سے باہر نہیں جائیں گے"۔

تیمور نے فوراً قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ جانتا تھا کہ خانزادہ آسانی سے قائل ہونے والی نہ
کی دل خوش کن گفتگو پسند بھی تھی لیکن یہاں کنیزوں کے درمیان کھڑے ہو کر باتیں کرنا ایک شاہ
خلاف تھا۔ چنانچہ وہ خانزادہ کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

خانزادہ کے منہ میں آتی ہوئی بات اس کے ہونٹوں تک پہنچ کر رک گئی۔ ایک لمحہ وہ تیمور کو

پلٹ کر اپنے کام میں لگ گئی۔

○

تیمور کو اپنے وطن شہرِ سبز سے بہت محبت تھی۔ شہرِ سبز یوں بھی بڑا دلکش مقام تھا۔ سب کو یہ خیال تھا کہ تیمور
ن کا صدر مقام شہرِ سبز کو بنائے گا۔ اس نے شہرِ سبز میں خوبصورت عمارتیں بنوائی تھیں۔ اپنے مٹی کے محل
بدانیوں کا ایک وسیع اور عالی شان محل تعمیر کرایا تھا۔ اس میں کئی بڑے بڑے صحن تھے اور اس کے صدر
ی بڑی محراب دور سے نظر آتی تھی۔ تاتاریوں نے اس محل کو آق سرائے یا قصرِ سفید کا نام دیا تھا۔ اس قصر میں
ے اپنی پیاری بیوی الجائی خاتون کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ اسی شہر میں اس کے باپ کی قبر تھی جسے
ا بڑے مقبرے میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن ان باتوں یادوں اور دلکشیوں کے باوجود اس نے سمرقند کو
یح دی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ سمرقند سب سے بڑا شہر تھا بلکہ یہ کہ بخارا کے مدرسوں، کتب خانوں اور
اسے علوم کا گہوارا بنا دیا تھا۔

قند کو دارالسلطنت بنانے کی اصل وجہ اس شہر کی تاریخی حیثیت تھی۔ سمرقند ہی وہ شہر تھا جہاں یونانی فاتح
نے کلائیٹس کو شکست دے کر اس کا خاتمہ کیا تھا اور اسی شہر کے باغوں میں تیمور سے صرف ڈیڑھ سو سال
ا کے طوفانی لشکر نے قیام کیا تھا۔

ر سیاح ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں سمرقند کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

"سمرقند دنیا کے عظیم ترین اور پُرشکوہ شہروں میں سے ایک ہے۔ یہ دریائے صغد کے
ا سے آباد ہے جس پر لاتعداد پن چکیاں ہیں اور اس سے نہروں کے ذریعے پانی کھینچ
باغوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ قرمز کا کپڑا بنتے ہیں۔ اونچے بالاخانے ہیں
ن کے جھروکوں سے دریا کا نظارا کیا جاتا ہے۔ یہاں کا کاغذ دنیا بھر میں مشہور ہے
ال کے لوگ آبی گھڑیوں سے وقت کا شمار کرتے ہیں۔ یہ گھڑیاں خود ان کی ایجاد ہیں
الیے شاندار یادگاریں ہیں لیکن ان میں بیشتر کھنڈر بن چکی ہیں۔ محلات بوسیدہ ہو
ہیں۔ نہ شہر پناہ ہے نہ شہر کے دروازے ہیں۔ امتدادِ زمانہ نے انہیں سرنگوں کر
ہے"۔

نے انہی بوسیدہ محلات کی جگہ وسیع محلات تعمیر کرائے۔ سڑکیں چوڑی ہوئیں۔ کوچہ و بازار کو وسعت

دی گئی۔ غرضیکہ تیمور نے سمرقند کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اس شہر کو لوگ دور دور سے دیکھنے آتے اور اس کی ہمتی کی داد دیتے۔

تیمور فطرتاً سیماب صفت تھا۔ وہ نچلا بیٹھنا نہیں جانتا تھا۔ چوگان یا شطرنج کے سوا اس کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا یا پھر غور و فکر میں ڈوبا ہوا مستقبل کے منصوبے بناتا رہتا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔

خانزادہ کو سرائے خانم کے پاس بھیج کر وہ محل میں آیا۔ اس نے یہ محل بھی سمرقند کے اندر گرا کر بنوایا تھا۔ کشادہ دالان، دالداریاں، وسیع کمرے تھے۔ . . . تیمور اس محل میں یوں گھوم رہا تھا جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ وہ ہر کمرے میں جاتا اور اس کے در و دیوار کو اس طرح دیکھتا جیسے دیکھ رہا ہو۔ کنیزیں اسے آتا دیکھ کر سمٹ کر ادھر ادھر ہو جاتیں اور آپس میں کھسر پھسر کرتیں:

"امیر کو آج کیا ہو گیا ہے۔ اپنے ہی محل میں اس طرح گھوم رہے ہیں جیسے کوئی باغ میں... آج امیر کو کوئی کام نہیں؟"

ادھر کنیزوں کی یہ کھسر پھسر، دوسری طرف شاہی خاندان کی کتنی ہی خواتین اسے مبارکباد دینے آئیں، یہاں تک کہ شہزادہ جہانگیر بھی باپ کی قدم بوسی کو حاضر ہوا تھا لیکن تیمور نے سب کو کہلوا دیا کہ وہ انتظار کریں کیونکہ اس وقت امیر بہت مصروف ہیں۔ حالانکہ تیمور کو کوئی مصروفیت نہ تھی، وہ صرف خانزادہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے خانزادہ سے انتظار کا وعدہ کیا تھا لیکن یہ وعدہ ایسا نہ تھا کہ توڑا نہ جا سکتا ہو۔ خانزادہ کو تو وہ بلوا کر اور کسی وقت بھی گفتگو کر سکتا تھا۔ پھر خانزادہ اسے شہزادوں سے زیادہ عزیز نہ تھی جسے اس نے مہمان خانے میں انتظار کرنے کا حکم بھجوا دیا تھا!۔

دراصل آج تیمور نے اپنی شاہانہ ذمہ داریوں سے کچھ دیر کے لیے فرار اختیار کیا تھا۔ وہ آج جی بھر کر بھرپور خوشی کا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اسے خانزادہ سے کچھ خاص باتیں کرنا تھیں جن کو بھی مرتب کرنا تھا لیکن اس کی یہ فضول چہل قدمی دیکھنے والوں کے لیے ضرور تعجب خیز تھی۔

خانزادہ کو سرائے خانم کے پاس اپنے اندازے سے کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا۔ جب اسے تیمور کے آنے کی اطلاع دی گئی تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ خانزادہ اور سرائے خانم کے اپنے الگ الگ محل تھے۔ دونوں اپنے محلوں میں دربار لگاتیں۔ ان درباروں میں زیادہ تر کنیزوں کے آپس کے جھگڑوں کے مقدمات سنے جاتے۔ شہادتیں گزاری جاتیں اور پھر ناقابلِ تنسیخ فیصلے ہوتے۔ . . . ان محلوں میں ... ہو سکتی تھی۔

دونوں اپنی حدود کی ملکہ اور مختارِ کل تھیں۔ اس سلسلے میں ملکہ سرائے خانم کو فوقیت حاصل تھی کہ وہ تیمور کی عدم موجودگی میں شاہانہ دربار لگانے کی مجاز تھی اور تمام امیروں اور وزیروں پر اس کی تعظیم فرض تھی۔

خانزادہ اگرچہ ملکہ نہ تھی لیکن شہزادہ جہانگیر کی بیوی تھی جو ولی عہدِ سلطنت تھا اور تیمور کے بعد سلطنتِ تاتار کا وارث اسی کو ہونا تھا اس لیے خانزادہ بھی خود کو ملکہ ہی سمجھتی اور سرائے خانم کی ہمسری اور برابری کی دعوے دار تھی۔ ان دونوں کا بہت کم سامنا ہوتا۔ ملتیں تو اجنبیوں کی طرح۔ ذاتی تمکنت کی دیوار ان کے درمیان حائل رہتی۔ سرائے خانم کو بھی اس کا احساس تھا لیکن اس نے جہانگیر کو ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا اس لیے وہ خانزادہ کی خود سری کو نظر انداز کر دے جاتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کے اختلاف کی خبر امیر تیمور تک پہنچے اور باپ بیٹے میں ناچاقی ہو مگر تیمور ان باتوں سے بے خبر نہ تھا۔ اسے ان دلی کدورتوں کا علم تھا اور ہمیشہ یہ خیال رکھتا تھا کہ کوئی بات اپنی زبان سے نہ نکالے جس سے کسی کو احساسِ کمتری کا شکار ہونا پڑے۔ وہ سرائے خانم کو ملکہ اور خانزادہ کو بہو کے مرتبے پر رکھتا۔ اور ان کا اسی طرح خیال رکھتا تھا۔

سرائے خانم اب تک بستر پر لیٹی تھی۔ خانزادہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور کچھ اتنے خلوص اور پیار سے اسے تعظیم پیش کی کہ وہ حیران رہ گئی۔ خانزادہ اسے رسمی طور پر سلام کر کے ادھر ادھر ہو جاتی تھی لیکن اس وقت سلام کر کے وہ بڑی بے تکلفی سے سرائے خانم کی پائنتی بیٹھ گئی تھی اور اس کے پیروں پر اس طرح ہاتھ رکھے جیسے اس کے پیر دبانا چاہتی ہو۔

سرائے خانم نے تکیے سے ذرا سر اونچا کر کے دیکھا اور جلدی سے پیر سمیٹ لیے:

"کیا غضب کرتی ہو شہزادی۔ یہ کام تمہارا نہیں"۔

"کیا آپ شہزادہ جہانگیر کی ماں نہیں؟" خانزادہ مسکرا کر ادب سے بولی۔

"کیوں نہیں شہزادی!"

سرائے خانم نے کہا۔ پھر نومولود بچے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی:

"خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے شہزادے کو ہمیشہ اپنا بیٹا ہی سمجھا اور اس پر اپنی ممتا نچھاور کرتی رہی"۔

خانزادہ اس سوال و جواب اور اس ملاقات کے لیے پوری طرح تیار ہو کر آئی تھی۔ فوراً بولی:

"ملکہ عالم۔ اگر آپ جہانگیر کی ماں ہیں تو میری بھی مادرِ مہربان ہیں۔ ماں کی خدمت کرنا ہر بیٹی کا فرض ہے۔ ماں کے قدموں تلے جنت بیان کی جاتی ہے۔ پھر میں اس نعمت سے کیوں محروم رہوں؟"

سرائے خانم شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی تھی۔ اس کے دل کی کدورت الکدم صاف ہو گئی۔ اسے ان کنیزوں پر غصہ آیا جو اسے خانزادہ کے خلاف دن رات بھڑکایا کرتی تھیں۔

سرائے خانم نے بڑی محبت سے کہا:

"نیک و سعادت مند بیٹی! خدا تمہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ اگر دنیا کی بہویں تمہارے جیسی ہو جائیں تو ساس بہو کا جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔ میرے سرہانے آ کر بیٹھو۔"

"بہتر ہے ملکۂ عالم۔"

کہتے ہوئے خانزادہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی:

"لیکن پہلے مجھے ایک بات کی اجازت دیجیے کہ ننھے شہزادے اور آپ کا صدقہ اتاروں؟"

سرائے خانم کو بتایا گیا کہ شہزادی باہر کی کنیزوں میں بیش قیمت پارچہ جات تقسیم کر چکی ہے۔ اس نے خوش دلی سے صدقہ اتارنے کی اجازت دیدی۔

خانزادہ کی کنیزیں سامان سے بھرے خوان اور تھال لیے باہر انتظار کر رہی تھیں۔ خانزادہ کے صرف اس کی کنیزِ خاص اندر آئی تھی۔ خانزادہ نے اس سے کچھ سرگوشی کی۔ کنیز اٹھ کے باہر گئی۔ چند لمحوں میں آئی تو ایک بڑا تھال اٹھائے ہوئے چار کنیزیں اس کے پیچھے داخل ہوئیں۔ یہ وزنی تھال سونے کا تھا، اس پر گنگا جمنی کامدار خوان پوش ڈھکا تھا۔ خوان پوش ہٹایا گیا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سرائے خانم کو کنیزوں کے پُرحیرت چہرے دیکھ کر اشتیاق ہوا کہ وہ بھی خوان میں رکھی ہوئی اس چیز کو دیکھے جس نے کنیزوں کو اس قدر حیران کر دیا تھا۔

سرائے خانم نے کنیزوں کو اشارہ کیا۔ کنیزوں نے اسے تکیوں کے سہارے بٹھا دیا۔ طلائی تھال میں طلائی ترازو تھا۔ سرائے خانم نے سونے کے اس ترازو کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ خانزادہ نے حکم دیا کہ ترازو کھولا جائے۔ ترازو میں چار پائے لگے تھے جن کے سہارے ترازو کو زمین پر کھڑا کر دیا گیا۔ ترازو کے پلڑے گول پیالوں کی شکل کے تھے۔ ہر پلڑے کا قطر ڈیڑھ فٹ تھا۔ خانزادہ کے اشارے پر کنیزیں باہر سے دو خوان اور لے آئیں۔ ان پر بھی زرنگار خوان پوش پڑے تھے۔

"ملکۂ عالم!"

شہزادی ہاتھ باندھ کر ادب سے بولی:

"نومولود شہزادے کو ایک پلڑے میں لٹانے کی اجازت دی جائے۔"

سرائے خانم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر بھی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کنیزوں نے ترازو کے پیالے میں نرم گدے والا بستر بچھا دیا اور پھر نہایت احتیاط سے بچے کو تکیوں کے سہارے سونے کے

ترازو میں بٹھایا یا لٹایا گیا۔ شہزادے کے بوجھ سے پیالہ جھک گیا۔

خانزادہ نے پھر اشارہ کیا۔ اس کی کنیزوں نے لائے ہوئے دونوں خوانوں سے خوان پوش ہٹا دیے سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ دونوں خوان جواہرات سے بھرے ہوئے تھے۔ کنیزوں نے ترازو کے دوسرے پیالے میں جواہرات بھرنا شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ دونوں پلڑوں کا وزن برابر ہو گیا۔ تولنے والی کنیز نے خانزادہ کی طرف دیکھا۔ خانزادہ نے اسے منع کرنے کے بجائے پیالے کو اور بھرنے کا حکم دیا۔ پیالہ آہستہ آہستہ بھرتا اور نیچے کی طرف جھکتا رہا۔

سرائے خانم حیرت سے دیکھتی رہی۔ تولنے کے بعد شہزادے کو بستر پر پہنچا دیا گیا۔

اس کے بعد خانزادہ کی کنیزیں ڈھکے ہوئے آٹھ اور خوان اندر لائیں۔ یہ سب خوان طلائی سکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ خانزادہ ادب سے بولی:

"مادرِ مہربان۔ ان خوانوں پر ہاتھ لگا کر صدقے کو شرفِ قبولیت بخشیے۔"

ایک ایک کر کے آٹھوں خوان ملکہ سرائے خانم کے قریب لائے گئے۔ اس نے ہر خوان پر ہاتھ رکھ کر اسے رد کیا۔ اس کے بعد تمام خوان اور پیالے کے وہ جواہرات جن سے شہزادہ تولا گیا تھا کمرے سے باہر بھیج دیے گئے اور انہیں شہزادی خانزادہ کے حکم کے مطابق کنیزوں میں لٹا دیا گیا۔ کنیزوں میں اودھم مچ گیا۔ وہ جواہرات لوٹنے کے لیے ایک دوسرے پر چڑھی جاتی تھیں۔ گری پڑتی تھیں۔ کئی کنیزیں تو اس اودھم پچھاڑ میں زخمی ہو گئیں۔

شہزادی خانزادہ کی اس دریا دلی اور خلوص کو دیکھ کر سرائے خانم کو چپ سی لگ گئی۔ اسے اس بات کا ملال تھا کہ وہ خواہ مخواہ شہزادی سے کدورت رکھتی تھی۔

شہزادی خانزادہ وہاں کچھ دیر اور بیٹھی اور ملکہ اور بچے کی تندرستی کے لیے کئی مشورے دیے اور ادویہ بتائیں۔ شہزادی سلام کر کے واپس جانے لگی تو سرائے خانم نے اسے دعا دی:

"خوش رہو شہزادی۔ خوب پھلو پھولو۔ خدا تمہاری گود ہری کرے۔"

سرائے خانم کے ان دعائیہ کلمات سے خانزادہ کے دل پر جیسے چوٹ سی پڑی۔ اس کی شادی کو ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن وہ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ بزرگ عورتیں اپنی نوبیاہتا دلہنوں کو اسی قسم کی دعائیں دیتی تھیں۔ سرائے خانم نے اسے بڑے خلوص سے دعا دی تھی لیکن اس کے الفاظ خانزادہ کے سینے میں تیر کی طرح لگے اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے سرائے خانم نے دعا کے پردے میں اس کی محرومی کا طعنہ دیا ہے۔ اسے اپنی محرومی کا پہلے ہی احساس تھا لیکن اس وقت اسے اس احساس میں اور زیادہ شدت محسوس ہوئی۔

خانزادہ خوشی خوشی آئی تھی لیکن سرائے خانم کے پاس سے اٹھی تو ایک درد اور کسک لے کر اٹھی۔ باہر آ کر

اسے معلوم ہوا کہ امیر تیمور اس کا انتظار کرتے کرتے آرام کرنے چلے گئے ہیں اور اب وہ سو رہے ہیں۔ خانزادہ نے امیر کو جگوانا مناسب نہ سمجھا اور دل برداشتہ ہو کر اپنے محل میں واپس چلی گئی۔

خانزادہ کی کنیز خاص چاندنی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے دونوں خواتین کی گفتگو بڑے غور سے سنی تھی اور جب اس نے سرائے خانم کی دعا سے شہزادی کا مزاج بگڑتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ خانزادہ کو یہ الفاظ برے لگے ہیں اور اس نے یقیناً اس کا الٹا ہی مطلب نکالا ہوگا۔ محلاتی سازشوں میں کنیزوں، خواجہ سراؤں اور غلاموں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ فرقہ اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لگائی بجھائی کرتے تھے۔ وہ اکثر ایسی حرکتیں کر جاتے ہیں جو بڑے بڑے فتنوں کا سبب بن جاتی ہیں۔

چاندنی کو خانزادہ کی افسردگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہاتھ آ گیا اور اس نے فوراً خانزادہ کے معمولی زخم کو کریدنا اور اس پر نمک پاشی کرنا شروع کر دیا۔

ایک دن شہزادی کو بہت افسردہ پایا تو سر جھکا کر بولی:

"واری جاؤں شہزادی کے۔ اس میں افسردگی اور ملال کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے تو ساس کی دلداری کے لیے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ کیا کچھ نچھاور نہیں کیا شہزادے اور ملکہ پر۔ اتنا صدقہ تو شاہ تیمور بھی نہیں دے سکے لیکن کیا ملا اس کا صلہ، طنز اور طعنوں کے تیر۔ میرا دل تو چاہتا تھا کہ سرائے خانم کا منہ نوچ لوں۔ کیا حق تھا انہیں آپ کو اولاد کا طعنہ دینے کا۔"

"چاندنی!"

خانزادہ نے اسے جھڑکا:

"گستاخی مت کر۔ ہر شخص اپنے فعل کا ذمے دار ہے۔ ہم سے جو ہو سکا ہم نے کیا۔ ہم نے صلے کی خواہش کب کی تھی؟"

"صدقے جاؤں آپ کی ایسی محبت پر۔"

چاندنی مسکرا کر بولی:

"انسان احسان کا بدلہ نہ دے۔ محبت کے دو بول تو منہ سے نکال ہی سکتا ہے اور سرائے خانم بولیں تو معلوم ہوا جیسے مردہ کفن پھاڑ کر بولتا ہے۔ ایک بچہ کیا جنا ہے کہ دماغ عرش معلیٰ پر پہنچ گیا ہے..... بڑی بوڑھیاں ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ سوتیلا آخر سوتیلا ہی ہوتا ہے..... سرائے خانم اگر سوتیلی ساس نہ ہوتیں تو ایسے جملے منہ سے ہرگز نہ نکالتیں۔ انہوں نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ آپ ولی عہد کی بیوی ہیں۔ آپ کا رتبہ ان سے بلند ہے۔ پھر ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ یہ ضروری تو نہیں کہ پہلے ہی سال گود ہری ہو جائے۔ میں تو کہتی ہوں شہزادی۔ اگر دو تین سال بچہ نہ ہو تو بھی پریشانی کی ضرورت نہیں۔"

"بس اب چپ بھی ہو جا۔"

شہزادی الجھتے ہوئے بولی:

"کیوں میرے زخموں کو کریدتی ہو؟"

"زخم کھائیں آپ کے دشمن۔"

چاندنی خاموش ہونے کے بجائے اور ٹرائی:

"اللہ نے چاہا تو آپ کے اتنے بیٹے ہوں گے کہ پورے محل میں بھاگتے پھر رہے ہوں گے۔ کوئی چادر کھینچے گا تو کوئی چوٹی۔"

"چاندنی۔ خدا کے لیے۔"

شہزادی نے ٹھنڈی سانس بھری:

"وہ دن آئے گا تو تیرا منہ موتیوں سے بھر دوں گی۔"

○

شہزادے شاہ رخ کی پیدائش پر ایک ہفتہ تک عظیم الشان جشن منایا گیا۔ تیمور نے عوام اور خواص پر انعام کی بارش کر دی۔ کسی امیر کو جاگیر دی تو کسی کا رتبہ بلند کیا۔ خوب خوب ضیافتیں ہوئیں۔ رقص و سرود کی محفلیں جمیں۔ خانزادہ دل میں اک درد لیے ان تمام خوشیوں میں شریک ہوتی رہی۔ وہ ہر وقت اپنے چہرے پر مسرت سجائے رکھتی اور کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیتی کہ ایک چبھن اس کے دل میں کانٹا بن کے کھٹکتی رہتی ہے۔ وہ حسب معمول روزانہ سرائے خانم کی مزاج پرسی کے لیے جاتی۔

سرائے خانم زچہ خانہ سے اپنی حرم سرا میں منتقل ہو گئی تھی۔ اس کے یہاں شاہی خاندان اور امراء کی بیگمات کا ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا۔ تحائف پیش ہوتے۔ نذریں نیازیں ہوتیں۔ صدقے اتارے جاتے۔ خانزادہ ہنستی، مسکراتی، قہقہے لگاتی ہر تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ سرائے خانم بھی اس پر بہت مہربان ہو گئی تھی۔ وہ خانزادہ سے بہت پیار سے گفتگو کرتی لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ سرائے خانم، شہزادی کا دل رکھنے کی خاطر اسے "اولاد" کی دعا دیتی اور امید دلاتی کہ وہ جلد شادکام ہو گی۔ ایسے موقعے پر شہزادی خانزادہ کے دل میں دبی ہوئی چنگاری

بھڑک اٹھتی اور وہ ضبط کے باوجود اپنی بھیگی آنکھوں کو پوشیدہ نہ رکھ سکتی۔ سراۓ خانم ہنس کر اسے پھر تسلی دیتی لیکن سراۓ خانم کا خلوص اس پر نشتر کا کام کرتا اور وہ گھبرا کے وہاں سے اٹھ آتی۔

سراۓ خانم اور خانزادہ محلات میں بڑی اور چھوٹی بیگم کے نام سے مشہور تھیں اور یہ عوامی خطابات ان کے لیے موزوں تھے۔ خانزادہ ہمسری کا دعویٰ کرنے کے باوجود چونکہ عمر میں چھوٹی تھی اس لیے وہ چھوٹی بیگم کے خطاب سے خوش تھی۔ دونوں خطابوں میں "بیگم" کا لفظ مشترک تھا جو خانزادہ کی طمانیت کے لیے کافی تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ دوسروں کی نظروں میں سراۓ خانم اور اس کا مرتبہ برابر ہے لیکن ادھر کچھ دنوں سے اسے ایک وہم سا ہو گیا تھا۔ جب اسے کوئی "چھوٹی بیگم" کہہ کر مخاطب کرتا تو اسے اپنا مرتبہ کم نظر آنے لگتا۔ وہ خود اپنی ہی نظروں میں حقیر دکھائی دیتی۔ حالانکہ اس کا یہ وسوسہ قطعی بے بنیاد نہ تھا۔ کیا ہوا اگر سراۓ خانم ایک شہزادے کی ماں بن گئی تھی۔ اس کا شوہر بھی ولی عہدِ سلطنت تھا اور ملکِ تاتار پر سب سے پہلا حق اس کا تھا مگر اسے یہ بات کون سمجھاتا۔ اس کی کنیزیں، خاص کر چاندنی اس کے غموں، دکھوں اور احساسِ محرومی کو اپنی بدگوئیوں اور جلی کٹی باتوں سے شدید تر کرتی رہتی تھی۔ خانزادہ اپنے اوپر بہت قابو رکھتی اور بات بات پر چاندنی کو ٹوکتی رہتی لیکن جب اس کے محل کی دوسری کنیزیں چاندنی کی ہاں میں ہاں ملاتیں تو خانزادہ کا دل ڈولنے لگتا۔

محلاتی سازشوں کی یہ گونج یک طرفہ تھی۔ سراۓ خانم کے محل میں بھی سازشوں کا جال بنا جاتا۔ ہتھکنڈے اور منصوبے تیار ہوتے اور ہر وہ قدم اٹھانے کی کوشش ہوتی جس سے خانزادہ کا وقار مجروح ہو اور درمیانی فاصلوں میں اور دوریاں ہو جائیں۔ ان سازشوں میں سراۓ خانم کی خاص کنیز آفتابی پیش پیش تھی۔ خانزادہ کی چاندنی میں تو کچھ دھیما پن اور خنکی تھی لیکن آفتابی نہایت گرم مزاج اور سورج ہی کی طرح آگ کا گولہ تھی۔ بڑی سخت مزاج اور چربیلی۔ قد شہتیر کی طرح لانبا۔ بڑے بڑے ڈگ بھرتی چلتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو۔ سراۓ خانم نے شاید اس کے قد کاٹھ کو دیکھتے ہوئے اپنی مسلح کنیزوں کی سردارنی بنایا تھا۔ شہزادہ شاہ رخ پیدا ہوا تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی سراۓ خانم نے اسے سونپ دی۔ آفتابی ایک اچھی دائی اور کھلائی تھی۔ اس نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شہزادے کی حفاظت کے ساتھ اس کی کھلائی کا کام بھی اپنے سر لے لیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ یہ دونوں کام بڑے احسن طریقے سے انجام دے رہی تھی۔ وہ شہزادے کی اس طرح نگہبانی کرتی جیسے مرغی اپنے چوزوں کو پیروں میں چھپائے رکھتی ہے۔ شہزادے کو ذرا تکلیف ہوتی تو اپنا آرام تج دیتی اور رات بھر گود میں اٹھائے ٹہلاتی رہتی۔ سراۓ خانم کی مہربانیاں بھی اس پر روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔

کہتے ہیں چوڑا چوری سے جائے نہ کہ ہیرا پھیری سے۔ آفتابی بد طینت اور حاسد تھی۔ جب بھی موقع ملتا اپنی بد طینتی کا اظہار ضرور کرتی۔ خانزادہ سے اسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ جب تک خانزادہ سراۓ خانم کے پاس ہی

آفتابی شہزادے کو اٹھائے اٹھائے دور ہی رہتی۔ اگر خانزادہ شہزادے کو گود میں لے کر پیار کرنے کی خواہش کرتی تو وہ پاس آ کر شہزادے کو خانزادہ کے ہاتھوں میں اس طرح لرزتے ہوئے دیتی جیسے وہ کسی ڈائن کو دے رہی ہو۔ پھر خانزادہ کے واپس جاتے ہی شہزادے سے شاہ رخ کی نظر اتارتی۔ صدقہ دیتی اور مسجد کے پیش امام کو بلوا کر اس پر پھونک ڈلواتی۔ سراۓ خانم بیٹھی ہنستی رہتی لیکن اسے منع نہ کرتی۔ سراۓ خانم بھی آخر ماں تھی سو ہر اس عمل اور بات کو پسند کرتی ہے جو اس کی اولاد کی سلامتی اور بھلائی کے لیے کیا جائے خواہ وہ روایتی یا مذہبی انداز سے مختلف اور غلط ہی کیوں نہ ہو۔

آفتابی کے دل میں خانزادہ کے خلاف جو لاوا پک رہا تھا، اس سے ہلکی ہلکی چنگاریاں خانزادہ کی بدگوئی کی صورت میں پھوٹتی بھی رہتی تھیں لیکن یہ لاوا اس دن پوری طرح پھٹ پڑا جب خانزادہ سراۓ خانم کے سمجھانے بجھانے اور تسلی دینے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

آفتابی شہزادے کو کاندھے سے لگائے دور کھڑی سخت نظروں سے خانزادہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے واپس جاتے ہی آفتابی تیزی سے سراۓ خانم کے پاس آئی اور شہزادے کو اس کی گود میں دیتے ہوئے بلکہ پٹختے ہوئے غصے سے بولی،

"ملکۂ عالیہ! سنبھالیے شہزادے کو۔ میں شہزادے کی حفاظت سے باز آئی۔" اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھر کر دروازے تک پہنچ گئی۔

"کیا ہوا آفتابی؟"

ملکہ کا منہ حیرت سے کھل گیا: "ادھر آ کے بتاؤ۔" اس نے کہا۔

آفتابی کے قدم دروازے کے پاس جا کے خود ہی رک گئے تھے اور وہ اسی حکم کی منتظر تھی۔ آہستہ آہستہ واپس آئی اور سسکی بھر کے بولی؛

"ملکۂ عالیہ! یہ نحوست ہے، شیر خوار شہزادے کے کانوں میں رونے تک کی آواز نہیں جانی چاہیے۔ ابھی سے اس پر غموں کا سایہ پڑ گیا تو آئندہ...."

"خدا نہ کرے۔" ملکہ نے بات کاٹ دی؛

"آفتابی تم ایسی فضول باتیں کیوں سوچتی ہو؟"

"واہ ملکۂ عالیہ!" آفتابی بھڑک اٹھی:

"آپ تو مجھے ہی الٹا ڈانٹ رہی ہیں۔ ساں تو اپنے بچوں کو ایسی ڈائنوں سے بچاتی ہیں۔ اگر شہزادے کو خدانخواستہ...."

"آفتابی!" ملکہ چیخ پڑی:

"خبردار جو تو نے شہزادے کے بارے میں کوئی برا لفظ نکالا۔ تو خواہ مخواہ خانزادہ کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ وہ دکھی ہے۔ اولاد کی محرومی نے اس کا دل گداز کر دیا ہے جبھی تو اسے ذرا ذرا سی بات پر رونا آ جاتا ہے۔"

اور آفتابی لگی فیل مچانے۔ اس نے سر کے بال نوچ ڈالے اور چیخیں مار مار کر رونے لگی:

"ہائے اللہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ کرے نیکی اور پکڑا جائے بدی میں..... میں کنیز ہوں نا تب ہی آپ میری بات پر دھیان نہیں دیتیں۔ کسی سے پوچھیے تو بانجھ کیا ہوتی ہے۔ وہ تو بلا ہوتی ہے، بدروح۔ وہ ٹسوے بہاتی ہے تو دل پگھل جاتا ہے۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ وہ کیوں روتی ہے۔ وہ بچے کے لیے اپنی قسمت پر روتی ہے۔ شہزادے کو دیکھ کر اس کا کلیجہ سلگ اٹھتا ہے کہ ایک اور وارث پیدا ہو گیا۔ اب تک تو دو شہزادوں کو دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے اور اللہ نے آپ کو بیٹا دیا تو اس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اسے تو بادشاہت اور حکومت کا قلق ہے۔ اس کے گھر سے تو بادشاہت نکل گئی۔ اب منحوس روئے گی نہیں تو اور کیا کرے گی۔"

کہنے سننے سے تو دیواریں اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہیں ملکہ تو آخر انسان تھی۔ روز کی ان باتوں کا کب تک اثر قبول نہ کرتی۔ پھر آفتابی جو کہہ رہی تھی وہ خانزادہ کی بدگوئی سہی لیکن تھی حقیقت ہی۔ خانزادہ کے بیٹا ہوتا تو جہانگیر کے بعد وہی تخت پر بیٹھتا۔ تیمور نے جس طرح اپنے بیٹے کو سلطنت کا وارث قرار دے دیا تھا اسی طرح جہانگیر بھی عمل کرتا اور اس طرح جہانگیر کی نسل میں بادشاہت چلتی رہتی۔ یہ بات ملکہ کے دل میں بھی آخر بیٹھ ہی گئی اور اسے اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنی پڑی۔

"دیکھو آفتابی" سرائے خانم منفعل ہو کر بولی:

"یہ تو ہو نہیں سکتا کہ خانزادہ کو یہاں آنے سے میں روک دوں۔ ہاں وہ خود ہی یہاں آنا چھوڑ دے تو میں نہیں بلاؤں گی۔"

"اس کا انتظام میں خود کر لوں گی۔" آفتابی سینے پر ہاتھ مار کر بڑے وثوق سے بولی:

"آپ بس ایک بار زبان سے یہ کہہ دیں کہ خانزادہ کا یہاں آنا مناسب نہیں۔ پھر میں جانوں اور خانزادہ جانے...."

"آفتابی! میری ایک بات غور سے سنو۔" ملکہ کا غصہ ختم ہو چکا تھا:

"خانزادہ کو اگر روکا گیا تو یہ بات امیر تک ضرور پہنچے گی۔ اس وقت میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔"

"ملکہ عالیہ۔ مجھے جواب مل گیا۔" آفتابی خوش ہو کر بولی:

"اب آپ دیکھتی رہیے کہ میں کس طرح خانزادہ کا پتہ کاٹتی ہوں۔ ایسا کام کروں گی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

دوسرے دن خانزادہ ملاقات کے لیے آئی تو سرائے خانم کے کمرے کے باہر آفتابی کھڑی دکھائی دی۔ وہ قریب پہنچی تو آفتابی نے قدرے تلخ لہجے میں کہا:

"شہزادی صاحبہ۔ مجھے افسوس ہے کہ آج آپ ملکہ عالیہ سے ملاقات نہ کر سکیں گی۔ ان کی طبیعت بے حد ناساز ہے۔"

خانزادہ شاید آفتابی کے تلخ لہجے کو محسوس نہ کر سکی:

"تم اندر جا کر مادر مہربان کو میرے آنے کی اطلاع کر دو۔ میں انہیں کھڑے کھڑے دیکھ کر واپس ہو جاؤں گی۔"

"میں نے عرض کیا ہے شہزادی صاحبہ۔"

آفتابی کا لہجہ اور تلخ ہو گیا:

"ملکہ عالیہ آج کسی سے ملاقات نہیں کریں گی۔ انہوں نے مجھے تاکید کی ہے کہ کسی کو اندر نہ آنے دوں۔ مجھے گستاخی پر مجبور نہ کیجیے شہزادی!"

خانزادہ ایسے تلخ اور کرخت لہجے کی عادی نہ تھی۔ اس نے تعجب سے آفتابی کو دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر خود ہی ارادہ بدل دیا اور خاموشی سے سر جھکائے واپس چلی گئی۔

آفتابی کا منصوبہ پورا ہو رہا تھا۔ اس نے ملکہ کو زبردستی بیمار ڈال دیا تھا تاکہ وہ خانزادہ کو اس بہانے اندر جانے سے روک سکے۔ خانزادہ کے جانے کے بعد آفتابی مسکراتے ہوئے اندر چلی گئی۔

"ملکہ عالیہ۔ آپ ملکہ عالم ہیں۔"

آفتابی سرائے خانم کی گھبراہٹ پر چڑ گئی:

"آپ امیر تیمور شاہِ تاتار کی بیوی ہیں۔ ایک شہزادے کی ماں ہیں۔ پھر آپ کیوں گھبراتی ہیں۔ یہ سب آپ کے ماتحت ہیں۔ آپ حاکمہ ہیں۔ یہ کنیزیں اور غلام ہیں۔"

ملکہ نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے آفتابی کے منصوبے سے اختلاف ہے۔

اگلے دن بھی کچھ اسی طرح کا واقعہ پیش آیا..... خانزادہ کے ساتھ آفتابی کا رویہ بڑا سخت اور گستاخانہ تھا

وہ شہزادی کو دیکھتے ہی بغیر سلام کلام کے بولی:

"شہزادی صاحبہ۔ آپ ملکہ عالیہ کو کیوں پریشان کرنے آجاتی ہیں۔ وہ بیمار ہیں۔ کسی سے نہیں مل سکتیں۔ اب آپ تشریف نہ لائیں۔ ملکہ عالیہ جب آپ کو یاد کریں گی تو آپ کو اطلاع کر دی جائے گی۔"

آفتابی نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ بولتی بھی تو کیا۔ آفتابی کے منہ لگ کر اور زیادہ بے عزتی ہوتی۔ اچھا ہوا کہ وہ خاموش رہی اور چپ چاپ واپس چلی گئی لیکن اس دن وہ اپنے محل میں پہنچ کر خوب روئی۔ کل کے واقعہ کا اس نے کسی سے تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو یہی سمجھی تھی کہ سرائے خانم بیمار ہو گئی ہیں اور انہوں نے ملاقاتیوں کو روک دیا ہے۔ جہاں تک آفتابی کے کھردری اور تلخ گفتگو کا سوال تھا، شہزادی نے اس لیے نظر انداز کر دیا کہ آفتابی تمام محلات میں اپنی بد زبانی اور بد دماغی میں مشہور تھی لیکن آج جو کچھ ہوا وہ ناقابل برداشت تھا۔

شہزادی غصے سے تلملاتی ہوئی آئی اور تکیے میں منہ دے کے رونا شروع کر دیا۔ کنیزوں میں تہلکہ مچ گیا۔ اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ چاندنی نے شہزادی کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ سر دباتی جاتی اور رونے کا سبب پوچھتی جاتی لیکن وہاں تو جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ شہزادی کے آنسو تھمنے ہی میں نہ آتے تھے۔

رو دھو کر جب دل ذرا ہلکا ہوا تو شہزادی نے سسکیوں کے درمیان بتایا:

"میری توہین کی ہے۔ میرا مذاق اڑایا ہے اس نے۔۔۔۔"

"کون، آفتابی؟" چاندنی نے چمک کر پوچھا:

"کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو وہ۔۔۔۔۔ ٹانگیں نہ توڑ کر رکھ دوں تو میرا نام چاندنی نہیں۔"

خانزادہ کو اپنی بے عزتی پر پھر رونا آ گیا۔ سنبھل کر بولی:

"کل میں سرائے خانم سے ملنے گئی تو وہ ذلیل دروازے پر چوکیدار بنی کھڑی تھی۔ کہنے لگی ملکہ عالم سے کوئی نہیں مل سکتا۔ وہ بیمار ہیں۔"

"تو آپ بھی جھاڑو پھیرتے ملکہ کے منہ پر۔" چاندنی نے غصے سے کہا۔

"وہ اپنے نخرے امیر کو دکھائیں۔ آپ پر ان کا کیا زور۔ نہیں ملنی تو نہ ملیں۔ کیا آپ ان کی ملاقات کی بھوکی ہیں۔ اور کیا کہا تھا آفتابی نے؟"

"چاندنی!" شہزادی ٹھنڈی سانس لے کر بولی:

"غلطی میری بھی ہے۔ کل کی بے عزتی کے بعد میں آج کیوں گئی۔ مجھے نہیں جانا چاہیے تھا مگر میں تو اس خیال سے چلی گئی تھی کہ شاید سرائے خانم واقعی بیمار ہوں اور میں نہ جاؤں تو شکوہ کریں۔"

شہزادی نے ایک لمبی سانس لے کر بتایا:

"لیکن چاندنی! آج تو اس بدبخت نے مجھے یوں پھٹکارا جیسے میں فقیرنی ہوں یا اس کی لونڈی ہوں۔ بولی۔۔۔۔ واپس جائیے۔ ملکہ نہیں ملیں گی۔ جب انہیں ضرورت ہو گی تو بلوا لیا جائے گا۔ ملکہ نے اس نے مجھے کیسا ذلیل کیا میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔"

"شہزادی بی بی۔"

چاندنی نے اسے تسلی دی:

"اب آپ تو خاموش ہو کر بیٹھیے اپنے محل میں اور پھر دیکھیے تماشہ۔ ایسا ٹھمکی کا ناچ نچاؤں گی آفتابی کو کہ یاد کرے گی۔"

"میرا تو جی چاہتا ہے اسے قتل کرا دوں۔"

شہزادی کو غصہ آ گیا:

"ہماری بھی منہ چڑھی کنیزیں ہیں لیکن انہیں یہ اجازت تو نہیں دی جا سکتی کہ شاہی خاندان کے کسی فرد کی اس طرح توہین کریں۔" اس نے کہا۔

"آپ اپنے آپ کو گراتی کیوں ہیں شہزادی!" چاندنی نے فوراً کہا:

"آپ شاہی خاندان کی کوئی عام خاتون نہیں۔ آپ خاندانی شہزادی ہیں اور اس وقت ولی عہد سلطنت کی بیگم ہیں۔ خدا نے چاہا تو ایک دن وہ آئے گا کہ شہزادے بہادر ملک تاتار کے بادشاہ بنیں گے اور آپ ان کے پہلو میں تخت پر بیٹھیں گی۔"

"آمین۔۔۔۔ آمین۔۔۔۔" دوسری کنیز وابستہ نے فوراً آواز بلند کی۔

شہزادی کو کچھ تسلی ہوئی تو بولی:

"چاندنی! اب ہمیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ پانی سر سے اونچا ہوا جا رہا ہے۔ آفتابی کا تو ضرور کچھ علاج ہونا چاہیے۔"

اور آفتابی کا علاج دوسرے ہی دن ہو گیا۔

وہ کسی ضرورت سے شہزادی کے محل کے دروازے پر داروغہ کے پاس آئی۔ ان دونوں میں یارانہ تھا۔ اکثر وہ اس سے ملاقات اور باتیں کرنے آیا کرتی تھی۔ خانزادہ کی کنیزیں تو تاک میں لگی ہی تھیں۔ آفتابی اپنے مخصوص طمطراق، نخرے اور ادائیں دکھاتی داروغہ کے پاس آئی اور ابھی اس نے داروغہ سے ہنس ہنس کر دو چار باتیں ہی کی تھیں کہ محل کے اندر سے دس بارہ کنیزیں بھرّا مار کے نکلیں اور آفتابی کو شہد کی مکھیوں کی طرح چمٹ گئیں۔

آفتابی اس اچانک حملے سے گھبرا گئی۔ اس نے کھڑے ہونے کی بہت کوشش کی۔ اگر وہ کھڑی ہو
مزہ چکھا دیتی لیکن خانزادہ کی کنیزوں نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا۔ چار نے اس کی دو
ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ باقی کنیزوں نے اس کی وہ پٹائی کی کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔

آفتابی چیختی چلاتی رہی اور دہائی دیتی رہی مگر اس کی مدد کو کون آتا۔ دروازے کے دو
میں دبک گئے۔ داروغہ بھاگ کر ایک کوٹھری میں گھس گیا اور اندر سے زنجیر چڑھالی۔ غرض چاندنی
مار مار کے آفتابی کا بھرکس نکال دیا۔ وہ بے دم ہو گئی اور اس پر غشی طاری ہو گئی۔ تب کہیں جا
اور پھر اسی طرح لپ جھپ کرتی محل میں گھس گئیں۔

آفتابی دیر تک لہولہان، بے ہوش پڑی رہی۔ دیر تک اس کے پاس کوئی نہ آیا۔ پھر
ہوا کہ کہیں آفتابی مر نہ جائے۔ آخر کو وہ ملکہ کی کنیز تھی اور کنیز بھی بڑی منہ زور اور منہ پھٹ۔ پھر
اس کے پاس آئے۔ آفتابی بھی اس وقت تک ہوش میں آچکی تھی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر
پہرے داروں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس نے کھڑے ہوتے ہی چاندنی کو گالیاں دینی شروع

"آفتابی زبان بند کرو"۔ ایک پہرے دار نے غصے سے کہا:

"چاندنی واپس آگئی تو زندہ بچ کر نہ جا سکو گی"۔

"واہ۔۔۔ کیا میرے ہاتھ نہیں"۔ آفتابی غرائی لیکن جب ہاتھ جھٹکا تو درد سے ب

"اب تو میں بدلہ لے کر رہوں گی"۔

"چپ رہو آفتابی"۔ دوسرا پہرے دار بھی بگڑ گیا:

"یہ تمہارا علاقہ نہیں، شہزادی کا محل ہے۔ خاموشی سے چلی جاؤ۔ ورنہ دوسرا ہنگامہ کھ

اتنے میں داروغہ بھی کوٹھری سے نکل کر آفتابی کے پاس آگیا۔ آفتابی اس پر برس پ

"نامرد کمینے کا۔ مجھے پٹتا دیکھتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تو اتنا بزدل ہے

"تو تو میرے لیے جنجال بن گئی ہے"۔

داروغہ بھی بھرا ہوا آیا تھا:

"مجھے نکلوا کر رہے گی نوکری سے۔ لاکھ بار منع کیا کہ یہاں نہ آیا کر مگر جب دیکھو منہ
وقت اور موقع تو دیکھنا چاہیے"۔

"تو کیا میں چور ہوں جو چھپ کر آؤں؟" آفتابی اکڑ کر بولی:

"تجھ سے شادی کر رہی ہوں۔ کوئی عیب تو نہیں کر رہی۔ میں آؤں گی۔ ہزار بار آؤں گی

نوکری پیاری ہے"۔
ں ہی، ہیں اپنی نوکری پیاری ہے"۔

پہرے دار کو تاؤ آگیا:

بہت کا ڈرامہ ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے۔ آفتابی نے اب ادھر کا رخ کیا تو اچھا نہ ہوگا"۔

آفتابی نے جب سب کو اپنا مخالف دیکھا تو بھنا کر بولی:

"اب نہیں آؤں گی، نہیں آؤں گی۔ تم پر تھوکنے بھی نہیں آؤں گی"۔

پھر داروغہ کو دیکھتے ہوئے بولی:

"تو تیری وجہ سے آئی تھی۔ تو نے میرا یہ حال کرا دیا۔ اب میں تجھ سے شادی بھی نہیں کروں گی"۔

"ہاں۔۔۔ تو شادی نہیں کرے گی تو کیا میں کنوارہ رہ جاؤں گا"۔ داروغہ بھی دھاڑا:

"سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔ ملکہ کی کنیز نہ ہوتی تو کوئی تجھ سے بات بھی نہ کرتا"۔

"ہائے اللہ۔۔۔ کیا تو مجھ سے اس وجہ سے شادی کر رہا ہے کہ میں ملکہ کی کنیز ہوں؟ وہ تیری
محبت، وہ وعدے سب جھوٹے تھے؟ تو مجھے دھوکہ دے رہا تھا؟"

دھوکے نام پر داروغہ گھبرا گیا۔ اس نے آفتابی سے وعدے کیے تھے شادی خانہ آبادی کے۔ باتیں کی
محبت کی۔ اسے واقعی آفتابی سے محبت تھی۔ وہ بے ڈول اور بدصورت سہی، اسے آفتابی سے محبت
محبت تو بس ہو جاتی ہے۔ یہ نہ صورت شکل دیکھتی ہے نہ ذات برادری۔

"آفتابی!"
داروغہ کا پیار امڈ آیا:
"معاف کر دے۔ پتہ نہیں غصے میں کیا کیا کہہ گیا؟"
آفتابی کی محبت بھی پھوٹ پڑی۔ فوراً بولی:
"تو مجھے معاف کر دے مجھے نہیں آنا تھا یہاں لیکن۔۔۔"
آفتابی کا مزاج پھر بگڑ گیا۔ سر سہلاتے ہوئے بولی:
"چاندنی سے تو میں بدلہ لے کے رہوں گی۔ ملکہ کے سامنے مقدمہ پیش کروں گی۔ پھر امیر کے پاس

پہرے دار بڑی دلچسپی سے دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ ہنس رہے تھے اور ایک دوسرے کو کنکھیوں
سے دیکھ رہے تھے۔ آفتابی اسی طرح سر سہلاتی، ہاتھ دباتی، لنگڑاتی اور بڑبڑاتی چلی گئی۔

یہ جھگڑا کچھ زیادہ ہی طول پکڑ گیا۔ وہ جب روتی پیٹتی سرائے خانم کے پاس پہنچی تو اسے آفتابی کی حیثیت کنداں

دیکھ کر افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔

سرائے خانم نے تسلی دیتے ہوئے پوچھا:

"کس بدبخت نے یہ تیرا حال کیا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ تو ملکہ کی کنیز اور شہزاد کھلائی ہے؟"

"ملکہ عالم۔ کیا کہوں یہ سب آپ کی مہربانیوں اور محبت کی وجہ سے ہوا ہے۔"

آفتابی نے ملکہ کے غصے کو ابھارنے کے لیے نمک مرچ لگا کر کہنا شروع کیا:

"میں آپ کی کنیز ہوں نا اور جب سے شہزادے کی خدمت میرے سپرد ہوئی ہے کنیزیں مجھ سے جلنے لگی ہیں۔ راہ چلتے چھیڑتی ہیں۔ طعنے دیتی ہیں اور رہ گئی ہی چاندنی اس ذرا دھر گئی تھی کہ چاندنی پچاس کنیزوں کے ساتھ مجھ پر ٹوٹ پڑی۔"

"آخر کوئی بات تو ہوئی ہوگی؟"

"ملکہ عالیہ۔ قسم لے لیجیے جو کوئی بات ہوئی ہو۔" آفتابی نے داروغہ کو بچانے کی کوشش

"میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کب اور کدھر سے آئیں۔ بس ایک دم ہلہ بول دیا۔ اتنا مارا دو کنیزیں پکڑ کے لائی ہیں مجھے۔ ساری وجہ یہ ہے کہ آپ مجھ پر مہربان کیوں ہیں۔ شہ کیوں نہیں ملی؟"

"چاندنی کو اس کی سزا ملنی چاہیے۔ آخر کیا سمجھ رکھا ہے اس نے؟" ملکہ کو طیش آگیا۔

"خان زادہ پر پھولتی ہے وہ۔"

آفتابی نے جلتی پر تیل چھڑکا:

"اسے زعم ہے کہ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تبھی تو سینے پر مونگ دلتی ہے۔"

"اس معاملہ میں خانزادہ بھی ملوث ہے۔" سرائے خانم نے خود کلامی کے انداز میں کہ

"ہمیں امیر سے بات کرنا ہوگی۔"

"خانزادہ ہی تو اصل جڑ ہے ملکہ عالیہ۔"

آفتابی نے موقع سے فائدہ اٹھایا:

"مجھے دیکھتے ہی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں ان کی۔ آپ کی وجہ سے ان کا بس نہیں چلا دیں مجھے۔"

اب سے پانچ چھ صدی پہلے علم نفسیات کو باقاعدہ علم کا درجہ حاصل نہ تھا۔ (۱)

...واقف تھے۔ علم نفسیات خصوصاً انسانی دل و دماغ اور ذہن و فکر پر تحقیق اُس دور میں بھی ...حکومتوں میں تو بغیر مزاج شناسی کے بادشاہ کی قربت حاصل کرنا ناممکن سمجھا جاتا تھا...... ...عام لوگوں کی نفسیات سے بھی لوگوں کو گہری دلچسپی تھی۔

...کے ایک پرانے دانشور نے کنیزوں اور غلاموں کی نفسیات کے بارے میں ایک بڑی دلچسپ ...ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

"زمانہ قدیم سے ہی اُن غلاموں اور کنیزوں کو شاہی محلات اور امرا کے گھروں میں ...مردوں کی بہ نسبت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے جنہیں بچوں اور خاص طور پر شیر خوار بچوں ...پرورش پر مامور کیا جاتا تھا۔ بچے ان سے اس قدر مانوس ہو جاتے تھے کہ وہ ایک لمحے ...لیے بھی اپنی کھلائی سے جدا ہونا پسند نہیں کرتے تھے اور اگر ذرا دیر کو ان کی گود بدل جاتی تو ...قیامت برپا کر دیتے تھے۔ اس بے پناہ انسیت کا سبب معلوم کرنے کے لیے میں نے ...کھلائیوں اور غلاموں سے گفتگو کی...... تو یہ عقدہ کھلا کہ ہر دائی اور کھلائی بچے ...سے مانوس کرنے کے لیے اسے کسی ایک خاص عادت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ کوئی بچے کو ...کے لیے دھیمے سروں میں گنگناتی تھی۔ کوئی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتی رہتی تھی اور کوئی بچے کی ...میں ایک انگلی سے کھجاتی تھی۔ بچہ آہستہ آہستہ اس کا عادی ہو جاتا اور جب کھلائی کے ...وہ کسی غیر کی گود میں دیا جاتا تو بے تحاشا رونے لگتا۔ اس کی یہ بے چینی اس وقت تک قائم ...جب تک اس کی عادت کے مطابق اسے کھجلایا یا سہلایا نہ جاتا۔ یہ بات آج بھی موجود ہے ...گھرانوں کی کھلائیاں اپنے اسی ہتھیار سے بچے کے والدین کو اپنے قابو میں رکھتی ہیں۔"

(۳)

...ننھا شہزادہ شاہرخ صبح ہی سے اپنی پرانی گود سے جدا تھا۔ آفتابی کی کل پٹائی ہوئی تھی اس کا ...پاؤں تو ...اور چلنے پھرنے سے بھی معذور نظر آتی تھی۔ آفتابی کے بجائے چار چار کنیزیں شاہ رخ کی ...دیکھ بھال لیکن ننھے شہزادے نے جو صبح سے رونا شروع کیا تو اب تک دم نہیں لیا تھا۔ کنیزیں لاکھ ...بار بار گود بدلتیں لیکن شہزادے کو جیسے ہر گود کانٹوں کا بستر محسوس ہوتی۔ اس کا منہ بسورنا

اور ریں ریں کرنا کسی طرح بند نہیں ہو رہا تھا۔

آفتابی کی کوٹھری غلام گردش میں تھی لیکن یہ مکار بار بار کھڑکی سے جھانکتی کنیزوں سے شہزادے کا حال پوچھتی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ شہزادہ مسلسل روئے جا رہا ہے، سنبھالے نہیں سنبھل رہا ہے۔ ہر کنیز سے اسے یہی اطلاع ملتی کہ شہزادے نے نہ تو آب نہ سویا ہے۔ اس اطلاع سے اسے بڑا سکون ملتا اور وہ دل ہی دل میں مسکراتی اور اسے اپنی احساس ہوتا۔ امیر اور سرائے خانم پر اپنی اہمیت جتانا ہی اس کی مکاری کا اصل مقصد تھا۔

حرم سرا میں قیامت برپا تھی۔ سرائے خانم کا منہ فق تھا اور وہ گھبرائی گھبرائی دوڑ گئی۔ پیش امام اور موذن کو بلا کر دم کرایا گیا لیکن شہزادے کو کسی طور آرام نہ آیا۔ وہ ہوا جا رہا تھا۔

سرائے خانم نے مجبور ہو کر امیر کو اطلاع کرائی۔ امیر تیمور دربارِ خاص میں اپنے شمال مغربی سرحد پر ایک شورش کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔ دربارِ خاص میں وہ کسی کی تھا لیکن کنیز نے شہزادے کی بے چینی اور چیخ و پکار کا کچھ ایسے انداز سے ذکر کیا کہ امیر پڑا۔ وہ فوراً حرم سرا میں داخل ہوا۔ سرائے خانم سر جھاڑ منہ پھاڑ اس کے استقبال کو موجود تیز قدم اٹھاتا ہوا شہزادے کے کمرے میں پہنچ گیا۔

شہزادے کے بلک بلک کر رونے سے تیمور بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے فوراً طبیب نے شہزادے کا معائنہ کیا۔ پھر غور و فکر کے بعد بولا:

"امیر عالی مقام۔ خدا کے فضل سے شہزادے کو کوئی بیماری نہیں۔ نبض بالکل ٹھیک میں کچھ تیزی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے شہزادے بہادر کسی طرح کی بے چینی محسوس کر کہ اس کا سبب کوئی خوف ہو یا شہزادے کسی چیز کو دیکھ کر ڈر گئے ہوں۔ شہزادے کی خد روشنی ڈال سکے گی۔ اسے طلب کیا جائے۔ میں خود اس سے دریافت کروں گا۔"

طبیب کی زبان سے نکلتے ہی وہ چار کنیزیں جو آفتابی کی جگہ مامور کی گئی تھیں آ گئیں۔ طبیب نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پوچھا:

"تم میں سے کس کنیز کا زیادہ وقت شہزادے کے پاس گزرتا ہے؟"

کنیزیں اس کا کیا جواب دیتیں۔ انہیں تو اس خدمت پر چند گھنٹے پہلے ہی ما کے بجائے وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔

سرائے خانم چلمن کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اس نے شاہی آداب کا لحاظ نہ کرتے ہوئے وہیں سے جواب دیا:

"طبیب سے کہہ دیا جائے کہ شہزادے کی خدمت گار کنیز بیمار ہے۔ یہ تمام کنیزیں نئی ہیں۔ انہیں شہزادے کی بات کا کوئی علم نہیں۔"

طبیب کے کان میں ملکہ کی آواز آئی تو اس نے بھی شاہی آداب بالائے طاق رکھ دیے اور بولا:

"ملکہ عالیہ سے دریافت کیا جائے کہ شہزادے کی یہ حالت کب سے ہے؟"

"صبح سے۔"

"خدمت گار کنیز کب سے غیر حاضر ہے؟"

"صبح سے۔"

"کیا شہزادہ کنیز کی موجودگی میں بالکل ٹھیک تھا؟"

"طبیب کا خیال درست ہے۔ کنیز کے جاتے ہی شہزادے کی یہ حالت ہو گئی۔"

سرائے خانم اور طبیب میں براہ راست اور بلا واسطہ سوال و جواب ہوتے رہے۔ تیمور بڑے غور اور خاموشی سے سن رہا تھا۔ یہ گفتگو شاہی اصول و آداب کے خلاف تھی لیکن تیمور نے دخل نہیں دیا۔ اس گفتگو سے امیر کو یاد آیا کہ شاہ رخ کی دیکھ بھال پر سرائے خانم نے اپنی خاص کنیز کو لگایا تھا۔ وہ کنیز کا نام نہیں جانتا تھا اس نے دیکھا ضرور تھا۔

امیر تیمور اس کنیز کے بارے میں سرائے خانم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسی وقت اس کا سوال طبیب کے منہ پر آ گیا۔ طبیب نے تیمور سے درخواست کی:

"شاہ نامدار صرف چند لمحوں کے لیے شہزادے کی کنیز کو طلب کیا جائے۔ وہ صبح سے شہزادے کے پاس موجود تھی۔ اس قدر بیمار نہیں ہو سکتی کہ بستر سے اٹھ کر یہاں تک نہ آ سکے۔ اس کا بلوانا بہت ضروری ہے۔"

امیر تیمور نے چلمنوں کی طرف رخ کر کے حکم دیا:

"شاہ رخ کی کنیز، جس حالت میں ہو اسے حاضر کیا جائے۔"

سرائے خانم نے فوراً کئی کنیزیں آفتابی کو بلوانے اور لانے کے لیے ایک ساتھ بھیج دیں۔

آفتابی نے بھی اپنی ہمدرد کنیزیں جاسوسی کے لیے لگا رکھی تھیں۔ امیر نے جیسے ہی اس کو بلوانے کا حکم دیا، اس کی جاسوس کنیز فوراً بھاگ کر اس کے پاس پہنچی اور اس کی طلبی کی خبر سنا دی۔ آفتابی کوٹھری کی کھڑکی سے لگی تھی۔ یہ اطلاع ملتے ہی وہ فوراً بستر پر بیماروں کی طرح دراز ہو گئی اور ہائے ہائے کرنے لگی۔

ذرا دیر بعد کوٹھری کے دروازے پر دستک ہوئی۔ آفتابی نے نحیف آواز بنا کر دستک دینے والی کو اندر

بلایا۔ یہ سرائے خانم کی ایک اور کنیز تھی۔ اس نے آتے ہی امیر کے حکم سے اسے آگاہ کیا اور فوراً اس کرا...
کو کہا۔

"امیر کا حکم ہے تو جانا ہی پڑے گا۔" آفتابی نے کراہتے ہوئے کہا۔ پھر لنگڑاتی ہوئی کنیز کے ساتھ ہو...

آفتابی امیر کے سامنے پہنچی تو اس نے سر میں پٹی، ہاتھ پر پٹی اور پتہ نہیں کتنی پٹیاں باندھ رکھی تھ...
اسے سہارا دیے ہوئے تھیں۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ امیر حیران نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

طبیب نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا:

"تم کیسی کھلائی ہو کہ شہزادے کو روتا چھوڑ کر چلی گئیں؟"

"اے صاحب! بھلا میں شہزادے کو روتا چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی؟"

آفتابی نے بڑے کرارے لہجے میں طبیب کی بات کی تردید کی:

"شہزادے بہادر تو رونا جانتے ہی نہیں۔ ملکہ عالیہ سے دریافت کر لیجیے۔ انہوں نے کبھی شہزاد...
کی آواز سنی ہے۔ میں تو انہیں ہنستا کھیلتا چھوڑ گئی تھی۔"

اسی وقت چلمن کے پیچھے سے شہزادے کے رونے کی آواز آئی۔ سرائے خانم نے اسے اندر منگوا لیا...
سے چمٹائے بیٹھی تھی۔ شہزادے کا رونا تو چند لمحوں کے لیے کم ہوا تھا لیکن منہ برابر بسورے جا رہا تھا پھر...
رونے کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلا۔

طبیب بڑے غور سے آفتابی کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ اس نے آفتابی سے کہا:

"کیا تم اتنی بیمار ہو کہ شہزادے کو گود میں نہیں لے سکتیں؟"

"کیوں نہیں جی!"

آفتابی مکاری بھول کے فوراً تڑ آئی:

"شہزادے تو میری جان ہیں، جگر ہیں۔"

آفتابی دو کنیزوں کے سہارے کھڑی تھی۔ انہیں تو اس نے دھکا دیا اور ڈگ بھرتی چلمن کی طرف بڑ...
اس طرح بلک رہا تھا جیسے کوئی اسے سوئیاں چبھو رہا ہو۔

آفتابی نے اندر پہنچ کر،

"ہائے میرے شہزادے" کہتے ہوئے شہزادے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ شہزادہ شاہ رخ جو...
پہنچ کر اس طرح چپ ہو گیا جیسے اس کے جسم کی تمام سوئیاں نکال کر کسی نے مرہم لگا دیا ہو۔ آفتابی اسے
جھولا جھلا رہی تھی اور شہزادہ چپ چاپ ہچکولے کھا رہا تھا۔

...لے اور کنیزیں دم بخود آفتابی کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تو شہزادہ پارے کی طرح تڑپ رہا تھا۔
...کے ہاتھوں میں جانے کیا جادو تھا کہ شہزادہ بالکل گونگا ہو گیا۔ اس کی ایک معمولی سی سسکی بھی نہیں نکلی۔

آفتابی اسی طرح شہزادے کو کھلاتی چلمن کے باہر آ گئی۔

امیر تیمور اور کنیزوں نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ایک تو شہزادہ بالکل خاموش تھا، دوسرے آفتابی کے پیروں کی
...لڑکھڑاہٹ دور ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر پہلے جیسی مردنی نہیں تھی اور وہ تندرست دکھائی دے رہی تھی۔

امیر کا طبیب واحد شخص تھا جسے شہزادے اور کنیز کی حالت تبدیل ہونے پر کوئی تعجب نہیں تھا۔ اسے یہ اندازہ
لگانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ شہزادے کا رونا صرف اپنی کھلائی کی عدم موجودگی کے سبب تھا۔ جس گود میں وہ کھیلتا تھا اس
کے تبدیل ہونے سے اس میں بے چینی پیدا ہونا ضروری تھا۔ طبیب کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ شہزادے کی کنیز اس قدر
بیمار نہیں ہے جتنا وہ ظاہر کر رہی تھی بلکہ اس نے اپنے اوپر مکاری کا غلاف اوڑھ رکھا تھا۔

طبیب نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود اس مسئلے پر تبصرہ کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ وہ محلاتی سازشوں سے خوب
واقف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ ملکہ کی کنیز اور شہزادے کی کھلائی کی مخالفت مول لے کر کسی مصیبت سے دوچار ہو۔ چند
لمحے بعد اس نے سکوت توڑتے ہوئے کہا:

"امیر عالی مقام! غلام کو جانے کی اجازت دی جائے۔"

تیمور خیالات سے چونکا، بولا:

"شہزادے کو سکون تو مل گیا ہے مگر ممکن ہے کہ یہ وقتی سکون ہو۔ طبیب کچھ دیر اور انتظار کریں۔"

"حکم عالی ہے تو میں کیا عذر کر سکتا ہوں۔"

طبیب زیر لب مسکرایا،

"ورنہ شہزادے کا مرض دور ہو چکا ہے۔ شہزادہ اپنی کھلائی کو نہ پا کر مضطرب ہو گیا تھا۔ یہی سبب اس کے رونے
کا تھا۔ کنیز کو حکم دیا جائے کہ وہ شہزادے سے جدا نہ ہو ورنہ شہزادہ پھر نفسیاتی بے چینی میں مبتلا ہو جائے گا۔"

آفتابی کا سر غرور سے اکڑ گیا۔

تنہائی ہوئی تو امیر تیمور نے کہا:

"سرائے خانم! شہزادے کا خاص خیال رکھا کرو۔ شاہ رخ تمہاری کنیز سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ کس بری طرح
رو رہا تھا۔ کنیز کو ایک لمحے کے لیے اس کے پاس سے نہ ہٹنے دیا جائے۔"

"اے امیر! اس میں نہ میری غفلت کا دخل ہے اور نہ کنیز کی خطا ہے۔" سرائے خانم کی آواز سے غصہ چھلکا،
"وہ بے چاری اپنی کوٹھری میں نہ جاتی تو کیا کرتی۔ اس کی تو مار مار کر ہڈیاں پسلیاں توڑ دی گئی ہیں۔"

"کیا کہا؟"

تیمور نے چونک کر پوچھا: "کس نے مارا ہے اسے؟"

"کیا عرض کروں امیر!" سرائے خانم افسردگی سے بولی:

"زبان کھولوں گی تو امیر سمجھیں گے کہ میں شکایت کر رہی ہوں۔ سوتیلی کا جو داغ ہے میری پیشانی پر....."

"سرائے خانم!"

امیر تیمور کو جلال آ گیا:

"ہمیں سوتیلے سگے کے جھگڑے چکانے کا وقت نہیں۔ جو پوچھا گیا ہے اس کا جواب دیا جائے اور..... جواب مختصر ہو۔"

"خانزادہ کی کنیز چاندنی نے پچاس کنیزوں کے ساتھ آفتابی کو گھیر کر مارا ہے۔" سرائے خانم اپنا غصہ دبا کے بولی:

"یہ صرف امیر کے سوال کا جواب ہے۔ میں شکوہ یا شکایت نہیں کر رہی ہوں۔"

"جھگڑے کی بنا کیا تھی؟" امیر نے تحقیقات شروع کر دی۔

"میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتی امیر!"

سرائے خانم اب سنبھل چکی تھی، اس نے اطمینان سے کہا:

"آفتابی مار کھا کر سیدھی میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اس بات کی تحقیق کر لی ہے۔ آفتابی کو واقعی مارا گیا ہے اور مارنے والی تمام کنیزوں کا تعلق خانزادہ کے محل سے ہے۔ اس کے بعد میں نے بات کو وہیں ختم کر دیا۔"

"ہمیں کیوں نہیں اطلاع دی گئی؟" امیر تیمور نے فوراً اس کی بات پکڑ لی۔

سرائے خانم ذہین اور سمجھدار تھی، فوراً بولی:

"میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ایک معمولی بات کو شاہِ تاتار کے کانوں تک پہنچا کر ان کی اہم مصروفیات میں مخل ہوں۔"

"لیکن ہم ایسی باتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔" تیمور تیوریاں چڑھا کر بولا:

"ہم شاہی محلات میں اس قسم کی بے ہودگیاں پسند نہیں کرتے۔ کل مقدمہ ہمارے سامنے پیش ہو۔ ضرورت ہوئی تو ہم خانزادہ کو بھی طلب کر لیں گے۔"

"میں شاہِ تاتار سے درگزر کرنے کی درخواست کرتی ہوں۔" سرائے خانم اوپری دل سے بولی:

"میں نے آفتابی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اس واقعہ کی تشہیر اور تشریح نہ کرے۔ مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ کنیزوں کے ہاتھوں

ملکۂ سلطنت کی بیوی ایک فریق کی حیثیت میں پیش ہو۔ یہ شاہی خاندان کی بیگمات کے وقار، مرتبے اور شان کے منافی ہے۔"

امیر تیمور نے اس کی ایک نہ سنی اور جب سرائے خانم کے پاس سے اٹھا تو حکم دیا:

"خانزادہ کو اطلاع دی جائے کہ وہ اپنی کنیز چاندنی اور دوسری ان تمام کنیزوں کو ہمارے سامنے پیش کرے جنہوں نے آفتابی کو مارنے میں حصہ لیا ہے۔"

یہ خبر جب خانزادہ کے محل میں پہنچی تو وہاں رونا پیٹنا پڑ گیا۔ ہر کنیز کو اپنی موت نظر آنے لگی۔ سب چاندنی کو ملامت کرنے لگیں۔ شہزادی خانزادہ بھی پریشان ہو گئی۔

سرائے خانم نے اپنے طور پر امیر کو اس جھگڑے کی تفصیل بڑی احتیاط سے بتائی تھی تاکہ خانزادہ پر الزام نہ آئے لیکن خانزادہ کو اس کی کنیزوں نے آ کر بتایا کہ سرائے خانم نے امیر کے کان بھرے ہیں اور وہ سخت برہم ہیں۔ خانزادہ اس معاملے میں وہ خود کو سرائے خانم سے پہلے ہی کمتر سمجھتی تھی۔ اب اسے خطرہ ہوا کہ وہ کہیں امیر کی نظروں سے بالکل ہی نہ گر جائے۔

"کم بخت! میں نے یہ کب کہا تھا کہ تو آفتابی کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دے۔" خانزادہ نے چاندنی کو ڈانٹتے ہوئے کہا: "کل تیرا جو حشر ہوگا سو ہوگا لیکن امیر کی نظروں میں، میں ہمیشہ کے لیے ذلیل ہو جاؤں گی۔"

"شہزادی بیگم! آپ تو یونہی ڈری جا رہی ہیں۔" چاندنی بڑی بے خوفی سے بولی:

"میں نے اور میری ساتھیوں نے آفتابی کی مرمت کی ہے۔ سب کی طرف سے میں امیر کو جواب دوں گی۔"

شہزادی نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ پوچھا:

"آخر تو امیر سے کیا کہے گی؟ مجھے بھی تو بتا!"

"اس بات کا مزہ تو آپ کو کل ہی آئے گا۔" چاندنی مسکرا کر بولی:

"لیکن آپ کا حکم ہے تو بتائے دیتی ہوں۔ جب امیر مجھ سے پوچھیں گے کہ تو نے آفتابی کو کیوں مارا تو امیر سے صاف صاف کہوں گی کہ اے شاہِ تاتار! آپ آفتابی سے دریافت فرمائیں کہ یہ ہمارے محل کے صدر دروازے پر کیا کر رہی تھی اور جس وقت ہم نے اس کی پٹائی کی تو یہ کس کے قریب بیٹھی تھی؟"

شہزادی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ کچھ سوچنے کے بعد بولی:

"چاندنی۔ بات تو تو نے بڑے پتے کی کہی ہے مگر آفتابی بڑی چالاک ہے۔ اگر وہ کہہ دے کہ وہ کسی کا پیغام لے کر گئی تھی، پھر تو کیا کرے گی؟"

"شہزادی صاحبہ! آفتابی کو یہ جواب سوجھے گا ہی نہیں۔" چاندنی نے جواب دیا:

"اور اگر اس نے یہی جواب دیا تو میں داروغہ کے تمام ساتھیوں کو پیش کر دوں گی جو اس بات کے گواہ ہیں گے کہ آفتابی روزانہ داروغہ سے ملنے آتی ہے اور دونوں گھنٹوں ہنسی مذاق کرتے رہتے ہیں۔ آفتابی کو سولی پر چڑھوا دے گی۔"

"خدا کرے ایسا ہو۔"

شہزادی نے اطمینان کا سانس لیا:

"مگر دیکھ چاندنی! میرا نام اس جھگڑے میں بالکل نہ آنے پائے۔ تمام کنیزوں کو اچھی طرح سمجھا دے۔"

دوسری کنیزیں غور سے چاندنی کی باتیں سن رہی تھیں۔ شہزادی کو مطمئن دیکھ کر انہیں بھی کچھ اطمینان ہوا۔ کا خوف کچھ کم ہو گیا۔

جس وقت خانزادہ کے باپ آق صوفی نے امیر تیمور کے سامنے ہتھیار ڈال کر قلعہ کی چابیاں تیمور کے حوالے کی تھیں، اس وقت خوارزم والوں کو اپنی شکست کے باوجود یہ طمانیت تھی کہ خوارزم کی حکومت انہی کے ہاتھوں میں رہے گی کیونکہ صلح کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ خوارزم کی شہزادی خانزادہ کی شادی امیر تیمور کے بیٹے جہانگیر سے ہو گی۔ اس پر عمل بھی کیا اور خانزادہ کو بہو بنا کر سمرقند لے آیا۔

شہزادہ جہانگیر چونکہ ولی عہد سلطنت تھا اس لیے خوارزم کے سرداروں اور امیروں کو امید تھی کہ جہانگیر اور اس کی اولاد ملک تاتار کے تخت و تاج کی وارث ہو گی۔ اسی طرح خانزادہ سے رشتہ داری کے ناتے وہ حکومت میں حصہ پائیں گے۔ ان کا یہ خیال ایک حد تک درست بھی تھا کیونکہ تیمور کے بعد جہانگیر اور اس کے بعد اس کی اولاد ہی کو وراثت میں اوّلیت حاصل ہوتی لیکن نہ تو قدرت کے معاملوں میں کوئی دخل دے سکتا ہے اور نہ شخصی حکومتوں میں اصول کی پابندی ممکن ہے۔ بادشاہت میں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس پر عمل ہوا کرتا تھا۔ ادھر اب تک جہانگیر کے ہاں

نہیں ہوئی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خوارزم کے سرداروں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔

خوارزم کا صدر مقام اور گنج، سمرقند سے کافی فاصلے پر تھا۔ راستے میں سرخ ریگستان کا ناقابل عبور خطہ تھا جس کو رت کی بے حد یادیں تھیں۔ پھر خوارزم کے ترکمان بڑے مغرور، خود سر اور شورہ پشت واقع ہوئے تھے۔ ان کا قبیلہ جلائر تاتاریوں میں سب سے بڑا قبیلہ تھا اور ترکمان سواروں کی تعداد بھی سب سے زیادہ تھی۔

یہی کچھ باتیں تھیں جنہوں نے خوارزم کے ترکمانوں کو ایک بار پھر تیمور کے سامنے کھڑا کر دیا۔ آق صوفی نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ سرکشی اور شورش سے باز نہ آئے۔ آق صوفی نے مجبور ہو کر چند سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ اس سے خوارزم میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اور آق صوفی کو قلعہ بند ہو کر اپنی مدافعت کرنا پڑی۔ آق نے نامہ کے ذریعے امیر تیمور کو اطلاع دی اور مدد کی درخواست کی۔

تیمور اس طرح کی بغاوتوں سے بہت چراغ پا ہوتا تھا۔ اس نے فوراً لشکر تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ لشکر کو شہزادے جہانگیر کی کمان میں روانہ کرے گا کیونکہ خوارزم کا علاقہ اس نے جہانگیر کو جاگیر کے طور پر دے دیا تھا اور اس کا رسمی طور پر اعلان بھی ہو گیا تھا۔

ابھی یہ لشکر روانہ نہ ہو پایا تھا کہ خوارزم کا ایک اور قاصد سمرقند پہنچا۔ اس نے بتایا کہ صدر مقام اور گنج کے قلعہ پر باغی سرداروں کا دباؤ بڑھ گیا ہے اور اگر کوئی مدد نہ پہنچی تو نہ معلوم کیا ہو جائے۔

تیمور ابھی کوئی اور فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ خوارزم سے قاصدوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ روز ایک قاصد سمرقند پہنچتا اور مدد کی درخواست کرتا۔ آق صوفی نے تو یہاں تک کہلوایا تھا کہ اگر امیر خود لشکر لے کر تشریف نہ لائے تو قلعہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

تیمور کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ خود اور گنج جا کر باغیوں کا قلع قمع کرے۔ تیمور نے سمرقند کی حکومت شہزادے جہانگیر کے حوالے کی اور ایک زبردست لشکر لے کر اور گنج کی طرف چلا۔

امیر تیمور نے اور گنج کی مہم پر جانے کا اعلان اس شب کو کیا جس کی صبح کو اس کے سامنے آفتابی کا مقدمہ پیش ہونا تھا۔ اس طرح محل میں کسی اور کو خوشی ہوئی ہو یا نہ لیکن خانزادہ کی کنیزیں امیر تیمور کے خوارزم چلے جانے سے بہت خوش ہو گئیں۔ چاندنی نے انہیں اطمینان تو دلا دیا تھا کہ وہ انہیں امیر تیمور کے عتاب سے بچا لے گی لیکن وہ بہت خوف زدہ تھیں اور اب امیر تیمور کے جانے سے کچھ دن کے لیے ٹل گیا تھا۔

خوارزم جانے والا ریگستانی راستہ بڑا دشوار گزار تھا لیکن امیر تیمور ان راستوں کا اب عادی ہو گیا تھا۔ اس نے اس ریگزار کو پہلے بھی دو بار عبور کیا تھا۔ ایک بار تو اپنی جدوجہد کے آغاز میں جب اس کے پاس ایک مریل گھوڑا اور ایک کمزور اونٹ تھا۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ گھوڑے پر اس نے اپنی وفادار بیوی الجائی اور ننھے جہانگیر کو

بٹھایا تھا اور خود اونٹ کی مہار پکڑے پیدل چل رہا تھا۔

دوسری بار اس نے خوارزم کا یہ راستہ تاتاریوں کے امیر کی حیثیت سے طے کیا تھا اور خوارزم اس کے قدموں میں آگیا تھا۔ اب تیمور نے خوارزم جانے کے کچھ آسان راستے بھی دریافت کر لیے تھے اور انہی راستوں سے وہ اپنے لشکر کو لیے جا رہا تھا۔

امیر تیمور ابھی اور گنج سے ایک منزل دور تھا کہ خوارزم کے باغی جی چھوڑ بیٹھے۔ وہ تیمور کی آمد سے گھبرائے کہ قلعے کا محاصرہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔

تیمور کو ان پر سخت غصہ تھا۔ اس نے اور گنج پہنچتے ہی ان پر حملہ کر دیا۔ امیر کا لشکر تھکا ماندہ تھا اور دفاعی جنگ لڑ رہے تھے لیکن تیمور کا عزم جوان تھا۔ اس میں جذبہ و جوش تھا۔ لشکر کو اس پر کامل اعتماد تھا۔ پہلے ہی حملے میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہزاروں قتل ہوئے۔ تیمور نے باغیوں کا خوارزم کی سرحد تک تعاقب کیا جنگلوں میں مار بھگایا۔

ترکمانوں کے کئی سردار گرفتار کر لیے گئے جنہیں تیمور اپنے ساتھ سمرقند لے آیا۔ تیمور نے سمرقند واپسی قلعے کی فصیلوں کو اور مضبوط کیا اور آق صوفی کی مدد کے لیے ایک لشکر چھوڑ دیا۔

امیر تیمور کی یہ مہم مختصر تھی۔ ترکمانوں نے صرف ایک ہی بار جم کر مقابلہ کیا تھا پھر بھی تیمور کو سمرقند واپسی میں ایک ماہ لگ گیا۔ پھر جب تیمور فتح کے ڈنکے بجاتا سمرقند واپس آیا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ وہ کئی سرداروں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کا اثر سمرقند والوں پر اچھا پڑا۔ استقبال کرنے والوں میں بڑے سردار موجود تھے۔ انہوں نے خوارزم کے سرداروں کو پابہ زنجیر دیکھا تو ان پر بڑا رعب پڑا۔ جلائر قبیلہ کا سردار کے حشر کو دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا کہ اگر انہوں نے کبھی تیمور کے خلاف تلوار اٹھائی تو ان کا بھی یہی انجام ہو

ترکمان سرداروں میں بعض سردار خانزادہ کے بہت قریبی رشتے دار تھے لیکن تیمور نے ان سے کوئی رعا کی۔ انہیں عام قیدیوں کی طرح طوق و سلاسل پہنایا گیا۔

تیموری سرداروں نے سمرقند کی سرحد پر اس کا شاندار استقبال کیا اور جلوس کی شکل میں محل کے دروازے اس کے ساتھ آئے۔ صدر دروازے پر شاہی خاندان کے سبھی لوگ درجہ بدرجہ کھڑے تھے۔ خاندان کی خوا جہانگیر، سرائے خانم سب نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ محلات کی کنیزیں اور غلام طلائی سکے نچھاور کر رہے تھے تاشے پیٹے جا رہے تھے۔ ہر طرف خوشی کا ایک عجب سماں تھا لیکن تیمور کی بے چین نگاہیں استقبال کرنے والوں کو تلاش کر رہی تھیں۔

اسے خانزادہ نظر نہ آئی تو اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

وہ گھوڑے سے اترا اور بڑی برہمی سے جہانگیر کو مخاطب کیا:

"شہزادی نظر نہیں آئی جہانگیر!"

جہانگیر نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر نظریں جھکا لیں۔

"جواب دو جہانگیر۔"

تیمور کا مزاج بگڑ گیا:

"کیا اسے صدمہ ہے کہ ہم نے خوارزمیوں کی سرکشی کو کیوں ختم کیا؟"

"یہ بات نہیں ابا حضور!" شہزادہ گھبرا کر بولا۔ لیکن وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے خانزادہ کی عدم شرکت کا کوئی جواز پیش نہیں کیا۔

"شہزادے!" تیمور گرجا۔

"جاؤ اور خانزادہ سے کہہ دو کہ باغی ہماری نظر میں صرف باغی ہے خواہ وہ ہمارا بیٹا جہانگیر کیوں نہ ہو۔ اسے یہ بھی اطلاع دے دو کہ ہم اس کے تمام باغی رشتے دار قید کر کے لائے ہیں کل انہیں قتل کیا جائے گا۔ اور خانزادہ یہ منظر دیکھنے کے لیے موجود ہو گی۔ یہ ہمارا حکم ہے۔"

تیمور کو اس قدر غصہ آگیا تھا کہ اس نے کسی اور سے بات نہیں کی اور اندر کی طرف چلا۔ وہ دو سیڑھیاں طے کر پایا تھا کہ کسی طرف سے آواز آئی:

"عالی جاہ۔ کنیز کو عرضِ حال کی اجازت دی جائے۔"

تیمور نے پلٹ کر دیکھا۔ خانزادہ کی کنیز چاندنی سر جھکائے کھڑی تھی۔ تیمور نے اسے گھور کے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی لیکن محلات میں تو بے شمار کنیزیں تھیں۔ وہ کس کس کو پہچانتا۔ سرائے خانم نے یہ موقع غنیمت جانا اور آگے بڑھ کے سرگوشی کے انداز میں کہا:

"اے امیر۔ یہ خانزادہ کی کنیزِ خاص چاندنی ہے۔"

"اور۔ تو ہی ہے وہ چاندنی جس نے شاہ رخ کی کھلائی کو پیٹا تھا؟" تیمور سیڑھیوں پر گھوم کر کھڑا ہو گیا۔

"اے شاہِ تاتار۔ میرا مقدمہ ابھی تک آپ کے حضور پیش نہیں ہوا۔ میں اپنی صفائی پیش کرنے کو تیار ہوں لیکن......"

چاندنی ایک طویل سانس لے کر بڑی جرأت سے بولی:

"لیکن اس وقت شہزادیِ خوارزم کی صفائی پیش کرنا چاہتی ہوں۔"

"گستاخ کنیز۔" تیمور کی برہمی انتہا کو پہنچ گئی:

"تو نے ہمارے قدم روکے ہیں۔ بغیر اجازت کے ہمیں مخاطب کرنے کی گستاخی کی ہے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ تیری زبان تراش دی جائے تا کہ آئندہ کوئی ہمارے سامنے اس طرح گستاخی نہ کر سکے۔"

"کنیز، شاہِ تاتار کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرتی ہے۔"

چاندنی نے جیسے سر پہ کفن باندھ لیا تھا:

"لیکن زبان کے تراشے جانے سے پہلے کنیز وہ بات کہہ دینا چاہتی ہے جس کے اظہار سے لب جھجکتے ہیں۔ اے امیرِ عالی مقام! آپ کی بہو اور ولی عہد بہادر کی شریکِ حیات شہزادی خوارزم صاحبِ فراش ہیں۔ شدید بیماری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ بستر سے اٹھ کر شاہِ محترم کے استقبال کو آ سکیں۔"

شہزادی کی بیماری کی خبر سے امیر تیمور کا غصہ یک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے پہلے شہزادے کو اور پھر سرائے خانم کو گھورتے ہوئے بولا:

"سرائے خانم! ہم یہ کیا سن رہے ہیں؟"

"امیرِ محترم!" سرائے خانم گھبرا کر بولی:

"یقین کیجیے کہ مجھے شہزادی کی بیماری کی مطلق خبر نہیں۔ شہزادی پہلے شاہ رخ کو دیکھنے آیا کرتی تھی، مہم پر جانے کے بعد انہوں نے میرے محل میں آنا چھوڑ دیا ہے۔ پھر بھی اگر مجھے شہزادی کی بیماری کی اطلاع ہوتی تو میں انہیں ضرور دیکھنے جاتی۔"

شہزادی نے اپنی بیماری پر خود پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس نے تمام کنیزوں کو خبردار کر دیا تھا کہ اس کے بارے میں ملکہ کے محل تک کوئی اطلاع نہ جانے پائے۔ شہزادے جہانگیر کو بھی اس نے تاکید کر دی تھی کہ امیر کی واپسی کے وقت انہیں بیماری کی اطلاع نہ دے۔

دراصل اس نے ایک خاص مصلحت کی بنا پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب امیر کو اس کی بیماری کی اطلاع کسی سے ملے گی اور وہ اسے دیکھنے آئے گا تو وہ خود اس راز پر سے پردہ اٹھائے گی لیکن امیر نے خانزادہ کی اس وقت عدم موجودگی کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور فوراً تحقیقات شروع کر دی۔ شہزادے سے سوال کیا تو وہ تذبذب میں پڑ گیا لیکن چاندنی نے بات بگڑتے دیکھی تو شہزادہ کی صفائی پیش کی۔

"سرائے خانم۔" امیر نے ترش لہجے میں کہا:

"ہمیں تمہاری بے خبری اور شہزادی کی طرف سے عدم توجہی پر افسوس ہے۔ کم از کم تم ہی ہمیں ضرور مطلع کرتیں اس حالت میں جبکہ شہزادی شدید علیل ہے۔"

"امیرِ محترم۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔" سرائے خانم نے تکرار سے گریز کیا:

"جہاں تک امیر کو اطلاع دینے کا تعلق ہے تو اس کے لیے عرض ہے کہ اگر میں بیماری سے باخبر بھی ہوتی تو بھی یہ اطلاع آپ تک نہ پہنچنے دیتی، کیونکہ امیر کا یہ عام حکم ہے کہ کسی مہم کے دوران انہیں کوئی بھی ایسی خبر نہ پہنچائی جائے جس سے ان کا ذہن کسی انتشار میں مبتلا ہو جائے۔"

تیمور نے واقعی یہ سخت حکم دے رکھا تھا کہ جنگ کے دوران اگر اس کا کوئی قریبی عزیز بھی انتقال کر جائے تو اس کی اطلاع نہ دی جائے۔ چنانچہ جس وقت وہ شمال کے جٹہ مغلوں کے مقابلے میں پسپا ہو کر شہرِ سبز پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ اس کی چہیتی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ الجائی کی بیماری اور وفات کی اطلاع امیر تیمور کو نہیں بھیجی گئی تھی۔

اب امیر تیمور نے پھر چاندنی کی طرف دیکھا اور حکم دیا:

"جا اور اپنی شہزادی کو اطلاع دے کہ ہم سب سے پہلے اس کے محل میں عیادت کے لیے آ رہے ہیں۔"

چاندنی خوش ہو کر آداب بجا لائی۔ پھر فوراً بولی:

"کنیز امید رکھتی ہے کہ شاہِ تاتار اپنے پہلے حکم پر نظرِ ثانی فرمائیں گے۔"

تیمور مسکرا دیا۔ بولا:

"چاندنی! تو اپنی شہزادی سے زیادہ حاضر جواب ہے۔ ہم نے تیرا قصور معاف کیا۔ شہزادی کو اطلاع پہنچا دے۔"

شہزادی خوارزم کی حاضر جوابی تمام محلات میں مشہور تھی۔ وہ امیر تیمور کو بھی فوراً جواب دے دیتی تھی اور تیمور مسکرا کر اس کی شوخ گفتاری کو نظر انداز کر دیتا تھا۔

امیر تیمور شہزادے جہانگیر اور سرائے خانم کو ساتھ لیے خانزادہ کی خوابگاہ پر پہنچا۔ معاً اس کی نظر خوابگاہ کے دروازے پر پڑی۔ وہاں طلائی حروف میں لکھا ہوا ایک طغریٰ آویزاں تھا۔ اس نے دروازے میں قدم رکھا تو کچھ عجیب رنگ کی بھینی بھینی خوشبو محسوس ہوئی۔ خانزادہ کی کنیزیں اس کی مسہری کو گھیرے ہوئے تھیں۔ کچھ عمر رسیدہ دائیں بھی خوابگاہ میں تھیں۔

شہزادی مسہری سے سر ٹیکے تکیوں کے سہارے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر اس وقت ہلکی پیلاہٹ کی اک تہہ جمی ہوئی تھی۔ بال کھلے تھے اور دوپٹہ ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔

امیر کو اندر آتے دیکھ کر سرہانے کھڑی چاندنی نے فوراً شہزادی کے بکھرے بال سمیٹے۔ دوپٹہ درست کیا اور آہستہ سے اس کے کان میں کہا:

"شاہِ تاتار خوابگاہ میں داخل ہو چکے ہیں۔"

شہزادی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور اس طرح کسمسائی جیسے تعظیم کے لیے اٹھنا چاہتی ہو۔ شہزادی کی نقاہت اس کی بیماری ظاہر کر رہی تھی۔

تیمور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اٹھنے سے منع کیا:

"اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ تم بہت کمزور معلوم ہو رہی ہو۔"

شہزادی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

"کس کا علاج ہو رہا ہے شہزادے؟" تیمور نے جہانگیر کی طرف گھومتے ہوئے پوچھا۔

"جی..... وہ..... ابا حضور..... دراصل....." شہزادے کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا
جواب دے۔

اسی وقت شہزادی نے زور کی سانس لی۔ پھر اسے اُچھو ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا جی
اور تے ہو جائے گی۔ کنیزیں ادھر اُدھر بھاگیں اور چاندی کے آفتابے اور اگالدان لے آئیں۔

سرائے خانم کی نظریں خانزادہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا
اسے شہزادی کی بیماری کا علم ہو چکا تھا۔

"سرائے خانم!" امیر فکر مند ہو کر بولا:

"شہزادی تو بہت بیمار معلوم ہوتی ہے۔"

سرائے خانم نے امیر کے کانوں کے پاس منہ لے جا کر کہا:

"مبارک ہو امیر۔ خانزادہ کی گود بھری ہونے والی ہے۔"

امیر تیمور اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ جب سے شہزادہ شاہ رخ پیدا ہوا تھا امیر تیمور کو جہانگیر
دامن گیر تھی۔ وہ اس وقت خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔

"شہزادی بیٹی!" تیمور جذبات سے بے قابو ہو گیا:

"ہم بے حد خوش ہوئے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ....."

"شاہِ تاتار۔" خانزادہ اپنی حالت پر قابو پا چکی تھی۔ وہ اپنی روایتی شوخی سے بولی:

"خدا کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی راہ میں صدقہ دیا جائے اور خیرات بانٹی جا
کی ضرورت پوری کی جائے۔ مصیبت زدوں کو مصیبت سے نجات ملے۔"

"یہ سب کچھ ہو گا شہزادی بیٹی!"

تیمور مسرت سے کھلا جا رہا تھا:

"اس کے علاوہ بھی کوئی خواہش ہو تو بیان کرو۔ ہم تمہاری ہر آرزو پوری کریں گے۔"

شہزادی کی ہمت بندھی۔ اس نے فوراً کہا:

"اے امیر! فاتح کو چاہیے کہ وہ امیر و غریب، شاہ و گدا، ہر ایک کو بخش دے اور اگر وہ غلطی کریں تو عفو
ر سے کام لیتے ہوئے ان کی کوتاہیوں اور غلطیوں کو معاف کر دے۔ اس لیے کہ اگر کوئی معافی کی درخواست پیش
ے تو پھر وہ دشمن نہیں رہتا۔ فاتح کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ جب کوئی چیز کسی کو بخش دے تو پھر اس کے بدلے
کسی اور چیز کی خواہش نہ کرے کیونکہ وہ کسی فرد کی دوستی اور تعاون کا محتاج نہیں ہوتا۔ فاتح سے بڑا کوئی نہیں بلکہ
ہ لوگ اس سے کمتر ہوتے ہیں اس لیے فاتح کو کسی ایک دشمن پر عتاب نازل نہیں کرنا چاہیے۔"

امیر تیمور، شہزادی کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر بولا:

"اے ذہین شہزادی! ہمیں اپنے اور جہانگیر کے انتخاب پر فخر ہے۔ ہم تمہارا مطلب پا گئے۔ درخواست قبول کی
ہے۔ ترکمانوں پر رحم ہو گا..... اور تمہارے رشتے دار رہا کر دیے جائیں گے اور انہیں انعام و اکرام دے کر
ن خوارزم بھیج دیا جائے گا۔"

"اے امیر۔" شہزادی اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی:

"کاش میں سر جھکا کر خلوصِ دل سے آپ کا شکریہ ادا کر سکتی۔"

"تمہیں آرام اور صرف آرام کی ضرورت ہے۔"

تیمور چلنے کے لیے تیار ہوا:

"ہم پھر تمہیں دیکھنے آئیں گے۔"

○

ترکمانوں کی بغاوت کچلنے کے بعد امیر تیمور پورے ماوراء النہر کا بلا شرکتِ غیرے امیر اور بادشاہ ہو گیا۔ کسی
امرائے تھی کہ تیمور کے سامنے زبان کھولے یا اس کی حکم عدولی کرے۔ سلطنت ہرات کو فتح کرنے سے اس کی
لت جنوب میں کافی دور تک پھیل گئی تھی لیکن ابھی تک تیمور نے اپنے علاقے سے باہر قدم نہیں نکالے تھے۔ وہ
ش قسمت تھا۔ قدرت نے اسے دنیا کی..... آسائشوں سے پوری طرح نوازا۔ اس کی ذاتی زندگی بھی قابلِ رشک
ا۔ اسے اپنی بیوی الجائی خاتون سے بے حد محبت تھی۔ اس کی وفات کے بعد تیمور نے اپنی زندگی میں ایک خلا
سوس کیا تھا لیکن سرائے خانم نے اس خلا کو جلد ہی پورا کر دیا۔ شہزادہ جہانگیر اس کا ولی عہد تھا اور تیمور کی
غیر موجودگی کے زمانے میں پورے وقار کے ساتھ انتظامی امور سرانجام دیتا تھا۔ جہانگیر کو اپنا دربار لگانے

طبل اور علم رکھنے کی اجازت تھی۔

امیر تیمور کو اگر کوئی فکر تھی تو جہانگیر کی تھی۔ شہزادے کی شادی کو جوں جوں زمانہ گزر رہا تھا
جاتی تھی۔ اس کی آرزو تھی خانزادہ کے بطن سے جہانگیر کی اولادِ نرینہ پیدا ہو تاکہ وہ جہانگیر کی جا
قدرت نے اس کی یہ آرزو بھی پوری کر دی۔

خانزادہ نے ایک خوبصورت بچے کو جنم دیا۔

اس بچے کی پیدائش پر سمرقند میں جو جشن منایا گیا اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا
کی نصف آبادی اسے مبارک باد دینے سرخ ریگستان کو پار کر کے پہنچی۔ تیمور نے خانزادہ کے
قدر خاطر مدارات کی کہ وہ عش عش کر اٹھے۔ یہاں تک کہ خوارزم سے آنے والوں کو فرداً فرداً خلعتیں دی گ
طلائی سکوں سے بھری ایک ایک تھیلی بھی دی گئی۔

تیمور نے اپنے پوتے کا نام پیر محمد رکھا۔ پیر محمد کی پیدائش پر سب ہی خوش تھے لیکن
ہوتے ہی محلاتی سازشوں میں اضافہ ہو گیا۔ خانزادہ کا احساسِ محرومی ختم ہو چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر
مقابلے پر آ گئی۔ دونوں محلات میں کشیدگی اس قدر بڑھی کہ کنیزوں اور غلاموں کی بھی ایک دوسرے
آمد و رفت بند ہو گئی۔ خانزادہ کی کنیز چاندنی اور سرائے ملک خانم کی کنیز آفتابی میں ہر وقت ٹھنی رہتی۔
نیچا دکھانے میں مصروف رہتیں۔

آخر سرائے خانم کو بھی خانزادہ کے مرتبے کا احساس کرنا پڑا۔ اب وہ کوشش کرتی کہ کوئی بات
کے کانوں تک بات پہنچے۔

امیر تیمور اپنے سمرقند میں مست تھا۔ یہاں شہتوت کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ پانی افرا
خوش و خرم اور چاق و چوبند رہتے تھے۔ دریا پر بند باندھ کر اونچی جگہ ایک جھیل بنائی گئی تھی۔
اور میٹھا پانی سیسے کے نلوں کے ذریعے سمرقند کے مکینوں کو پہنچایا جاتا تھا۔

تیمور جب خنگ او غلن (سنہری گھوڑا) پر سوار ہو کر خیابانوں سے گزرتا تو لوگ راستہ
میں کھڑے ہو جاتے۔ اس کے ارد گرد اس کے امراء و وزراء صبا رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر چلتے
امیر کی شان و شوکت اور اس کے سرداروں کی آن بان دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑتے۔ نماز کے بعد
باہری محراب کے نیچے اوپری منزل پر کھڑا ہوتا تو علماء اس کی تعریف کرتے۔ دعائیں دیتے اور ثنا

...کہ اس وقت اور عروج حاصل ہوا جب اس کے ہاں دوسرا بچہ پیدا ہوا۔ امیر نے اس بچے کا نام سلطان محمد
...خانزادہ اب جہانگیر کے دو ولی عہدوں کی ماں بن گئی تھی۔

ایک وقت تھا کہ سرائے خانم سے ملنے کے لیے خانزادہ جایا کرتی تھی اور اب اس وقت خانزادہ کی
...جاتا تھا۔ اگر کسی محفل میں سرائے خانم کا سامنا ہو جاتا تو منہ پھیر کر نکل جاتی۔ سو سرائے خانم کو سلام کرنا بھی
...آتی تھی۔

امیر تیمور کو سرائے خانم اور خانزادہ کے اختلاف کا علم تھا لیکن اس کے خیال میں یہ کوئی ایسی بات نہیں
...سنجیدگی سے غور کیا جائے کیونکہ امیر اور بادشاہ وہ خود تھا اور مقدمہ اسی کے سامنے پیش ہونا تھا لیکن
...کی ایک طویل زمانے تک نوبت نہ آئی۔

تیمور کا اب سمرقند میں کم ہی قیام رہتا۔ وہ لشکر لے کر شمال اور شمال مغرب کی طرف نکل جاتا۔ اس کا قول تھا
...حملہ آور سے محفوظ رکھنے کا بہترین جنگی اصول یہ ہے کہ دشمن کی سرحدوں پر حملے کرتے رہو تاکہ اسے
...پر مجبور ہونا پڑے اور حملہ کرنے کا وہ تصور بھی نہ کر سکے۔

...ب وہ مہم پر ہوتا تو سانڈنی سوار یا سرحدی محافظ قاصد بن کر سمرقند پہنچتے رہتے اور اپنے امیر کے
...بیان کر کے مغلوں کو گرماتے تھے۔ اگر تیمور کوئی نیا ملک فتح کرتا تو وہ بے شمار تاوانِ جنگ سمرقند بھیجتا تھا۔
...ہوتا کہ وہ مغرب میں خراسان کی تاریخی شاہراہ پر چل پڑتا۔ نیشاپور اور مشہد کی زیارت گاہوں سے گزر کر
...(کیسپین) کے کنارے پہنچ جاتا۔ اس کے کنارے کنارے گھنے جنگل تھے جہاں ہزاروں سال سے
...آباد تھے۔ یہ وحشی اکثر خوارزم کی سرحدوں میں گھس آتے اور قیامت برپا کر دیتے۔ یہ بت پرست تھے اور
...انسانوں کے علاوہ ان کا گوشت بڑی رغبت اور لذت سے کھاتے تھے۔ خوارزم والوں کو ان کے حملوں
...کے لیے بڑے انتظامات کرنے پڑتے پھر بھی ان کا داؤ چل جاتا۔ اور وہ کسی نہ کسی سرحدی قصبے میں گھس کر
...تباہ و برباد کر دیتے۔

...یہ قبیلے سربداری قوم کے نام سے مشہور تھے اور خود کو شمال مغربی بادشاہوں کا رشتے دار بتاتے تھے۔ پھر
...سمرقند میں ایک سانڈنی سوار قاصد آیا اور اس نے وہیں سے چلا چلا کر کہنا شروع کیا:
"اے امیر کا اقبال بلند ہو۔ وحشی سربداری قوم کا قلع قمع کر دیا گیا۔ ان کے تمام سردار گرفتار ہو کر قتل
...ہڈیوں کے سروں کا مینار بنا دیا گیا۔"
...لوگوں نے ان کے خاتمے پر جشن منایا۔ سمرقند والے بھی اس بلا کے قصے سنا کرتے تھے۔ انہیں بھی ان
...سے اطمینان ہوا۔ اس طرح تیمور نے بلادِ شمال کے جتہ مغلوں (چغتائی) کے خلاف فوج کشی کی۔ تیمور کی شمالی

معمات کے بارے میں تفصیلی حالات کہیں دستیاب نہیں ہو سکے۔ وہ ہر سال مغلوں پر حملہ کرتا اور انہیں شمال اور
میں دور دور تک پسپا کرتا رہتا تھا۔ جتہ مغلوں کا زور ان پیہم حملوں سے ٹوٹتا رہا۔ تیمور کا سلوک
کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ مغلوں کا آخری بادشاہ یا خانِ اعظم تھا۔ اس نے تیمور کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی لیکن
زبردست شکست ہوئی۔ اور اسے اپنا صدر مقام یعنی حصار المالیق بھی چھوڑنا پڑا۔ اور اس نے بھاگ کر صحرا
پناہ حاصل کی۔

یہ وہی علاقہ تھا جہاں سے ڈیڑھ سو سال پہلے چنگیز خان ہلاکت و بربریت کا طوفان بن کر اٹھا تھا
جس علاقے سے متعلق تھے انہیں پھر اسی جگہ واپس آنا پڑا۔ اور انہیں واپس کرنے والا تاتار کا امیر تیمور تھا
رگوں میں خود بھی مغلوں کا بعض قبیلوں کا خون دوڑ رہا تھا۔

امیر تیمور جس وقت مغلوں کو صحرائے گوبی کی طرف پسپا کر رہا تھا تو اس نے سمرقند میں اس فتح کی اطلاع
پھر جب اسے مغلوں پر مکمل فتح حاصل ہوئی تو اس نے اپنا خاص قاصد شہزادے جہانگیر کے پاس بھیجا۔ یہ
ہزار میل کا سفر طے کر کے سمرقند پہنچا، تو لوگوں نے اسے گھیر لیا لیکن وہ سیدھا ولی عہد کے محل پہ آیا اور
اطلاع کرائی۔ جہانگیر فوراً اس سے ملنے آیا اور اسے بڑی عزت سے بٹھایا۔

قاصد نے سلام کے بعد جہانگیر کو امیر تیمور کا پیغام دیا۔ اس نے کہا:

"اے ولی عہد سلطنتِ تاتار۔ میرے آقا امیر تیمور نے پیغام دیا ہے کہ پہلے ہم نے جتہ مغلوں کی
چنگاریاں بجھائی تھیں لیکن اب ان کی آگ کو ہمیشہ کے لیے سرد کر دیا ہے۔ ہم نے اس خاکستر میں ایک چنگاری
نہیں چھوڑی۔"

جہانگیر ان دنوں بیمار تھا اور طبیب نے چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا لیکن اس نے یہ گوارا نہ کیا
کے قاصد کو محل میں بلا کر باپ کا پیغام سنے۔ جہانگیر نے بڑے تحمل سے امیر کا پیغام سنا اور قاصد کو انعام دیا
نے سمرقند میں جشنِ عام کا اعلان کرایا۔ اس نے حکم دیا کہ یہ جشن اس وقت تک جاری رہے گا جب تک امیر
واپس نہیں آ جاتے کیونکہ قاصد نے یہ بھی بتایا تھا کہ امیر اب واپسی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

جشن کا آغاز ہو گیا۔

سب کا خیال تھا کہ امیر ہفتے عشرے میں واپس آ جائیں گے لیکن ان دنوں ایک ہزار میل کا راستہ
آسان کام نہیں تھا۔ ادھر جشن جاری تھا ادھر تیمور، شاہراہِ خطا پہ ایک ہزار میل کا سفر طے کرتا ہوا واپس
مغلوں پر مکمل فتح حاصل ہوئی تھی اس لیے وہ بہت خوش تھا اور راستے میں شکار سے دل بہلاتا آ رہا تھا۔
یہ عظیم فتح تھی لیکن اس فتح کی اسے بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

امیر تیمور کے امرا نے اپنے فاتح کا سمرقند کے بیرونی باغوں میں استقبال کیا مگر ان کے
تھے اور زبانیں گنگ ہو گئی تھیں
استقبال کرنے والے امرا کی پیشوائی امیر سیف الدین کر رہا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے امیر تیمور کی طرف
اس کے پیچھے تمام بڑے بڑے سردار تھے اور ان سب نے اپنے کپڑوں پہ خاک ڈال رکھی تھی۔ امیر
کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی رکاب تھام لی۔
تیمور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے پہلو میں ایک درد سا محسوس
نے سیاہ کپڑوں میں ملبوس امیروں پر نظر دوڑائی۔ اس کے دانت ایک نامعلوم خوف سے بھنچ گئے۔ آخر
تیمور کو سنبھالا اور سیف الدین کو مخاطب کیا:

"کیا تم خوف زدہ ہو؟"

تیمور کی آواز لرز رہی تھی:

"سیف الدین بولو... بولو... خوف مت کھاؤ۔"

"میں خوف زدہ نہیں ہوں امیر!"

سیف الدین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"مگر شہزادہ جہانگیر جوانی کی بہاریں بھی نہ دیکھ سکا اور ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔"

حسب دستور اور خود امیر کے اعلان کے مطابق شہزادے کی بیماری کی خبر امیر کو نہیں بھیجی گئی تھی۔ شہزادہ
سخت بیمار ہوا اور تیمور کے سمرقند واپس آنے سے صرف چند روز پہلے انتقال کر گیا۔
تیمور کو محسوس ہوا کہ اس نے شمالی مہم میں جو کچھ حاصل کیا تھا اس سے زیادہ اس نے کھو دیا ہے۔ ہر شخص
کا باپ بھائی یا شوہر ہوتا ہے۔ امیر تیمور کتنا ہی بڑا فاتح کیوں نہ ہو لیکن آخر وہ بھی باپ تھا۔ اسے جہانگیر
کی موت کا بہت صدمہ ہوا لیکن اس نے اس صدمے پر قابو پا لیا اور صرف چند لمحوں کی خاموشی کے بعد امیر
نے حکم دیا:

"گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔"

امیر تیمور نے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ فوج کو شہزادے کی جوان مرگی کا علم ہو چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ
داخل ہوئی۔ سب کے چہرے پھیکے اور دل رو رہے تھے۔
امیر تیمور نے جہانگیر کے نقارے اور طبل منگوا کر توڑ دیے تاکہ اس کے بیٹے کی موت کے بعد کوئی اور

پھر جہانگیر کی بیوہ شہزادی خانزادہ اپنے دونوں بچوں کو لے کر آئی۔
امیر تیمور نے ماتمی لباس میں غمزدہ شہزادی کو دیکھا تو اس کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکی نکل گئی۔
نظریں نیچی کر لیں۔

نہ خانزادہ بولی اور نہ امیر تیمور نے کچھ کہا۔ وہ بولتے بھی تو کیا۔ ان کے پاس کہنے کو کیا رہ گیا تھا!

○

خاقانِ مشرق

بیس گاڑیاں، سو گھوڑے اور دس اونٹ، وہ قیمت تھی جو چشمانیہ خاتون کے باپ نے خود مقرر کی تھی اور شمال
کے سردار شہزادے پارس خان نے اس قیمت کو بے چون و چراں تسلیم کرتے ہوئے اس کی ادائیگی کا وعدہ بھی کر
لیا لیکن شہزادہ اب بھی بے چین تھا۔
"چشمانیہ!"
شہزادہ پارس نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا:
"یہ دس دن مجھے دس سال معلوم ہو رہے ہیں۔ میں اب جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔"
"جدائی . . . . ." خوش جمال چشمانیہ مسکرائی۔
وہ بھی گھوڑے سے اتر گئی اور بولی:
"ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ اسے جدائی کیوں کہہ رہے ہیں؟"
"چشمانیہ! تم نہیں سمجھ سکتیں۔" شہزادہ جذباتی ہو گیا:
"اس طرح کا ساتھ جدائی سے بھی زیادہ کربناک ہے۔ میں تمہارے پاس ہوتے ہوئے بھی خود کو تم سے دور
محسوس کرتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج شام واپسی پر میں اس سلسلے میں تمہارے باپ سے بات کروں گا۔"
اس نے زین میں اڑسی ہوئی لپیٹنے کی چادر کھینچ کر زمین پر بچھا دی۔
"نہیں شہزادے!" چشمانیہ گھبرا گئی:
"جو بات طے ہو چکی ہے آپ کو اس کی پابندی کرنی چاہیے۔ میرے باپ نے آپ سے انکار تو نہیں کیا" چشمانیہ

چادر کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔

"یہ تو ٹھیک ہے چشمانیہ۔" شہزادہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا:

"لیکن بیس دن گزرنے کے باوجود کوئی بھی تمہاری قیمت میں اضافہ نہیں کر سکا۔ میں تو اور بھی زیادہ قیمت دینے کو تیار ہوں۔ پھر تم میرے حوالے کیوں نہیں کی جاتیں۔"

"مجھے معلوم ہے شہزادے۔" چشمانیہ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا:

"آپ شمالی علاقوں کے خاقان کے ولی عہد ہیں۔ یہ قیمت آپ کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی لیکن ہم رسم و رواج سے محبت کرتے ہیں۔ ہم اس کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔"

"مگر میں کب کہتا ہوں کہ تم اپنے رسم و رواج کو چھوڑ دو۔" شہزادے نے الجھتے ہوئے کہا:

"میں خود کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا۔"

"پھر آپ میرے باپ سے کیا کہیں گے؟" چشمانیہ نے اسے برق پاش نظروں سے دیکھا۔

"میں ان سے کہوں گا..... میں کہوں گا....."

شہزادہ اس کی غزالی آنکھوں میں کھو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ پھر ذرا سنبھل کر بولا:

"میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" چشمانیہ تیز لہجے میں بولی:

"ابھی مقررہ وقت میں دس دن باقی ہیں اور آپ نے بولی کا سامان بھی ادا نہیں کیا۔ اگر میرے غریب باپ نے آپ کے رعب میں آ کر مجھے رخصت کر دیا تو ہمارے پرانے رسموں کے تانے بانے بکھر جائیں گے۔ دور دور کے لوگ طعنے دیں گے کہ ملک شمال کا شہزادہ چشمانیہ کو زبردستی اٹھا کے لے گیا۔ میں یہ بے شرمی برداشت نہیں کر سکوں گی۔ یہ طعنے مجھ سے سہے نہیں جائیں گے۔ مجھے آپ سے اس ظلم کی امید نہیں شہزادے۔" چشمانیہ کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

"گھبراؤ نہیں چشمانیہ۔" شہزادہ چشمانیہ کو غمگین دیکھ کر پریشان ہو گیا:

"اگر تمہارے خیال میں یہ ظلم ہے تو میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا جس سے تم یا تمہارے قبیلے کی بدنامی ہو۔ یہ بات یقیناً افسوس ناک ہے کہ لوگ میری زبان کا اعتبار نہیں کرتے۔"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں شہزادے۔"

چشمانیہ نے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا:

"میں جانتی ہوں کہ آپ کے مقابلے پر کوئی نہیں آئے گا اور اگر کوئی دعوے دار کھڑا بھی ہوا تو میرا فیصلہ

نہیں ہوگا۔ میں آپ کو دل سے اپنا شوہر تسلیم کر چکی ہوں۔ اب میرا مرنا جینا آپ کے ساتھ ہے۔"

"میں بھی تمہارا شکر گزار ہوں چشمانیہ۔" شہزادے نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"تم نے مجھے اپنا سمجھا ہے تو تم بھی میری ہو۔ میں تمہیں جان دے کے بھی حاصل کروں گا۔"

٭

وسطی ایشیا کی اس وسیع اور ویران سطح مرتفع کی دوشیزاؤں کی عام قیمت دو گاڑیوں یا دس گھوڑوں سے زیادہ ادا نہ کی جاتی تھی۔ چشمانیہ نے بھی ایک غریب قبیلے میں آنکھ کھولی تھی اور جوان ہونے پر وہ بھی اسی قیمت کی مستحق تھی لیکن اس غریب لڑکی نے شہزادیوں جیسی شکل و صورت پائی تھی۔ اس کا سراپا دست قدرت کا تراشا شاہکار تھا۔ حسن و جمال کی اس خوبی کے علاوہ چشمانیہ کا رجحان بچپن ہی سے رقص و موسیقی کی طرف تھا اور ان دونوں فنوں میں اس نے جوان ہونے سے پہلے ہی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس کے والدین کو اس پر بجا طور سے ناز تھا۔ اس کے باپ نے اعلان کر دیا تھا کہ چشمانیہ کو بیوی بنانے کا قصد صرف وہ شخص کرے جس میں ایک شہزادی خریدنے کی ہمت ہو اور منہ مانگی قیمت ادا کر سکے۔

لڑکی کے بالغ ہوتے ہی شادی کے پیغامات یعنی اس کی قیمت لگنا شروع ہو جاتی تھی لیکن چشمانیہ کے لیے اب تک کوئی پیغام نہیں آیا تھا۔ دور و نزدیک کے قبیلوں میں سے کسی نے بھی چشمانیہ کے باپ سے اس کی قیمت پوچھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ حالانکہ اسے بالغ ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے۔ چشمانیہ ہر دل کی دھڑکن اور آرزو تھی لیکن وہ سوائے حسرت بھری نظروں سے دیکھنے کے اس کی قیمت پوچھنے کی بھی ہمت نہ کرتے تھے۔

جب اس طرح کئی ماہ گزر گئے تو قبیلے کے بزرگوں کو اس کی فکر ہوئی۔ آخر بزرگوں نے چشمانیہ کے باپ کو مجبور کیا کہ وہ اپنی حسین بیٹی کی، جسے عام طور پر شہزادی کہا جاتا تھا، خود ہی قیمت مقرر کرے تا کہ اس کی تشہیر کر کے چشمانیہ کو کسی کے حوالے کیا جا سکے۔

پھر چشمانیہ کے باپ نے اس کی قیمت بیس گاڑیاں، سو گھوڑے اور دس اونٹ مقرر کی اور یہ شرط بھی لگا دی کہ یہ کم از کم قیمت ہے اور اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا بھی اسے اختیار ہے۔

عام لڑکیوں کی قیمت کا فیصلہ ایک ہفتے میں ہو جایا کرتا تھا لیکن چشمانیہ کے باپ نے یہ مدت ایک ماہ مقرر کی تھی۔

چشتمانیہ کی قیمت کا اعلان ہوا تو تمام آرزومندوں کی تمناؤں پر اوس پڑ گئی۔ ان کے خیال میں چشتمانیہ
رقاصہ اور جاذب نظر دوشیزہ کی یہ قیمت بھی کم تھی لیکن اس کی ادائیگی سوائے کسی بڑے سردار یا بادشاہ کے
کسی کے بس میں نہیں تھی۔ سو گھوڑوں اور دس اونٹوں کا تو شاید کوئی قبیلہ انتظام کر لیتا لیکن بیس گاڑیوں کے
کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وسط ایشیا میں شمال سے جنوب اور جنوب مغرب تک پھیلے ہوئے یہ مغل قبائل خانہ بدوش زندگی بسر کر
رہے یہ گھر بناتے تھے اور نہ بستیاں آباد کرتے تھے بلکہ چراگاہوں کی تلاش میں نقل مکانی کرتے رہتے اور ان کی
بستیاں بیشتر وقت متحرک رہتیں۔ یہ اپنے گھر بیل گاڑیوں پر بناتے۔ ہر بیل گاڑی بیس فٹ لمبی اور اتنی
ہوتی تھی۔ بائیس بائیس بیل اس گاڑی کو کھینچتے تھے۔ گاڑی کے اوپر بانسوں کا ڈھانچہ تیار کر کے اس پر سفید
منڈھا جاتا تھا۔ ہر مغل اس گھر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ گھر یعنی گاڑی چلتی رہتی اور چولہا جلتا
تیار ہوتا رہتا۔ انہی گاڑیوں پر مغلوں کی چوبی گنبد نما مسجدیں بھی بار ہوتی تھیں۔

یہ مغل اپنی تمام تر وحشی جبلتوں اور قدیم رسموں کی پابندی کے باوجود مسلمان تھے۔ کہیں قیام کرتے تو ان
زمین پر اتارتے اور نماز ادا کرتے تھے۔ امیر تیمور نے تو لکڑی کی اتنی بڑی مسجد بنوائی تھی جسے کئی حصوں میں
کے بہت سی گاڑیوں پر رکھا جاتا تھا۔ اس کی یہ مسجد ہر معرکے میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ جب اس مسجد
حصے جوڑ کر زمین پر رکھے جاتے تو اس مسجد میں کئی سو آدمی بیک وقت نماز ادا کرتے تھے۔

چشتمانیہ کے باپ نے جو بیس گاڑیاں طلب کی تھیں، اس سے اس کی مراد یہی متحرک گھر تھے۔ ظاہر ہے
بیس گھروں کی تیاری کسی معمولی آدمی کے اختیار میں نہیں تھی لیکن پھر ایک دن ایسا ہوا کہ چشتمانیہ کا خریدار آپ
اس کے پڑاؤ پر پہنچ گیا۔

یہ تھا مغلوں کے نیلے اور سفید غول کے خاقان اُرس خان کا نوجوان بیٹا پارس خان۔ خاقان اُرس
عملداری شمال میں برفستان ٹنڈرا تک پھیلی ہوئی تھی۔

یہ روس کے ایشیائی علاقے سائبیریا کا وہ خطہ ہے جسے پرانے زمانے میں "سرزمین آسیب" کہا جاتا
ایشیا کا یہ علاقہ ہمیشہ سے ناقابل تسخیر کہا جاتا ہے اور آج بھی روس سے ٹکرانے والی ہر طاقت اس خطے تک
بعد بے بس ہو جاتی ہے۔

خاقان اُرس خان کی جنوبی سرحد کریمیا سے ملتی تھی۔ کریمیا کا حاکم بھی ایک مغل شہزادہ توقتمش تھا۔ تو
بدخو اور ظالم تھا۔ اُرس خان اور توقتمش میں ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔ شہزادہ پارس خان نے جب باپ سے جنوب
میں شکار کھیلنے کی اجازت مانگی تو ارس خان نے صاف انکار کر دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں شہزادے اور توقتمش کا

ہو جائے لیکن شہزادہ بضد رہا اور ارس خان کو مجبور ہو کر اجازت دینا پڑی۔ احتیاط کے طور پر شہزادے کے ساتھ
پانچ سو سوار کر دیے۔

شہزادہ پارس خان جنوبی علاقے میں دور تک چلا گیا۔ خاقان نے اسے نصیحت کی تھی کہ کریمیا کے علاقے
میں داخل نہ ہونا اور توقتمش کا سامنا ہو جائے تو جھگڑے سے گریز کرنا لیکن جوان خون بزرگوں کی نصیحت کب مانتا ہے
شہزادہ شکار کھیلتا ہوا کریمیا کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ چونکہ سرحدیں نہ تو قدرتی تھیں اور نہ کوئی اور شناخت موجود
تھی، اس لیے شہزادے یا اس کے ساتھیوں کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کریمیا کے علاقے میں پہنچ چکے ہیں۔

آجکل کی طرح اس زمانے میں شہر اور بستیاں آباد نہیں تھیں جن سے شناخت ہو سکے۔ مغل قبائل کے
متحرک گھر ایک جگہ دو چار ماہ قیام کرتے پھر چارے کی تلاش میں ادھر ادھر ہو جاتے

چشتمانیہ کے پڑاؤ پر پہنچتے ہی اس کے کان میں چشتمانیہ کے حسن و جمال کی بھنک پڑی۔ شہزادے کو اشتیاق
پیدا ہوا اور وہ چشتمانیہ کے پڑاؤ میں پہنچ گیا۔

خیمے والوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ خاقان ارس خان کا بیٹا ہے تو انہوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ شہزادے
کی خواہش پر اسے چشتمانیہ کے باپ کے خیمے پر پہنچا دیا گیا۔ چشتمانیہ اس وقت باہر تھی۔ پردے کا رواج نہیں
چشتمانیہ کسی سہیلی سے مل کر آ رہی تھی۔ اس نے خیمے کے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کو گھوڑے سے اترتے
دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ نسوانی حجاب نے اسے اجازت نہ دی کہ خیمے میں جائے۔ وہ وہیں سے سہیلی کے ہاں واپس
چلی گئی۔

اس کی سہیلی بہت شوخ اور سمجھدار تھی۔ چشتمانیہ کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر بھانپ گئی کہ کچھ دال میں کالا ہے۔
اس نے چشتمانیہ کو چھیڑا اور کریدا لیکن چشتمانیہ نہ کھلی اور بات ٹال گئی۔ اسے سہیلی کے پاس بیٹھے تھوڑی ہی دیر
ہوئی تھی کہ باپ کا بلاوا آ گیا۔

شہزادے نے رسمی گفتگو کے بعد چشتمانیہ کو دیکھنے کی خواہش کی۔ چشتمانیہ کے باپ کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے
اپنی بیٹی کے لیے کسی ایسے ہی شہزادے کا خواب دیکھا تھا اور اب وہی شہزادہ اس سے چشتمانیہ کو دیکھنے کی درخواست
کر رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر شہزادے کو چشتمانیہ پسند آ گئی تو نہ صرف مالا مال ہو جائے گا بلکہ اس کی بیٹی ولی عہد کے
ساتھ بیاہ کر اسے ہم چشموں میں ایک عظیم مقام عطا کر دے گی۔ اس نے فوراً چشتمانیہ کو تلاش کرایا اور اسے خیمے
میں آنے کا حکم دیا۔

اس کی تلاش کے دوران پڑاؤ میں یہ بات پھیل گئی کہ خاقان ارس خان کا بیٹا چشتمانیہ کا آرزومند ہے۔ پڑاؤ

کی تمام دوشیزاؤں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ بعض نے اس کی قسمت پر رشک کیا لیکن بیشتر سلگ اٹھیں۔

نمائش کرنے والی عورت نے چیتمانیہ کے پاس پہنچ کر اسے بھی آگاہ کر دیا۔ چیتمانیہ کی سہیلی بہت خوش ہوئی۔ اس نے چیتمانیہ کا بناؤ سنگھار خود اپنے ہاتھ سے کیا اور اپنا ایک خوبصورت جوڑا پہنا کر خراماں اس خیمے کی طرف لے چلی جہاں اس کا عظیم الشان خریدار خیمے کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھا

پھر چیتمانیہ شعلہ جوالہ بنی، نظریں نیچی کیے، لجاتی شرماتی، خیمے میں داخل ہوئی۔ شہزادے کی اس پر وہ اس حسنِ مجسم کو دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس کی نظریں چیتمانیہ کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ سہیلی نے چی شہزادے کے مقابل بٹھا دیا اور شہزادے کی محویت کو دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

شہزادہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کی نظریں حسن کے پیکر کا طواف کر رہی تھیں اور وہ لا نکلنا چاہتا تھا۔

"عالی نسب شہزادے۔ یہ ہے میری بیٹی چیتمانیہ۔" چیتمانیہ کے باپ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"چیتمانیہ رقص و موسیقی میں بھی اپنا جواب آپ ہے۔"

شہزادہ چونک پڑا۔ جیسے کسی گہرے خواب سے اسے جھنجوڑ کر بیدار کیا گیا ہو۔ اس نے پہلے باپ کو دیکھا۔ پھر چیتمانیہ کو خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"مجھے منظور ہے محترم بزرگ!"

چیتمانیہ کی سہیلی کا دل کھل اٹھا۔ اس نے جھک کر چیتمانیہ سے سرگوشی کی۔ چیتمانیہ نے جھجکتے ہو نظریں اٹھائیں۔ یہ نظریں شہزادے کی بے تاب و بے قرار نظروں سے ٹکرائیں اور فوراً جھک گئیں۔

"بیس گاڑیاں، سو گھوڑے اور دس اونٹ شہزادے کو منظور ہیں؟" اس کے باپ نے ت پوچھا۔ وہ ہر بات پہلے ہی واضح اور صاف کر لینا چاہتا تھا۔

"ہاں محترم۔ مجھے سب کچھ منظور ہے۔" شہزادے نے چیتمانیہ کے چہرے سے نظریں ہٹائے

"تو مجھے بھی منظور ہے۔"

چیتمانیہ کے باپ نے بھی رضامندی کا اظہار کر دیا لیکن فوراً ہی اس کی وضاحت کرتے ہوئے شہزادے۔ اگر ایک ماہ کے اندر اس قیمت سے زیادہ ادا کرنے والا کوئی دوسرا شہزادہ آ گیا تو چیتمانیہ کو شہزادے بہادر کے ساتھ رخصت کر دیا جائے گا۔"

"میں اس سے زیادہ قیمت ادا کرنے پر بھی تیار ہوں۔" شہزادے نے فوراً اعلان کیا:

آپ خصتی کا اعلان کریں۔ جتنی قیمت چاہیں گے وہ ادا کر دی جائے گی۔"

شہزادے بہادر۔" چیتمانیہ کے باپ نے اور وضاحت کی:

رسم کے مطابق میں اپنی مقرر کی ہوئی قیمت کو بڑھا نہیں سکتا۔ اس میں کوئی دوسرا ہی اضافہ کر سکتا ہے۔ پہلے نے اس قیمت کو منظور کر لیا ہے۔ اسی لیے اس میں شہزادے آپ بھی کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ چونکہ فروخت کی مدت ایک ماہ مقرر ہوئی ہے اس لیے شہزادہ محترم ایک ماہ تک ہم آپ کی مہمان نوازی کا فخر حاصل کریں گے او اس عرصے میں شہزادے مطلوبہ چیزیں بھی مہیا کر لیں گے۔"

چیتمانیہ کے باپ نے گفتگو کے تمام دروازے بند کر دیے تھے۔ شہزادے کو سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے چیتمانیہ سے ملنے جلنے اور سیر و تفریح کی اجازت حاصل کر لی۔ شہزادے پارس نے اسی وقت اپنے باپ کے پاس ایک تیز رفتار قاصد روانہ کیا تاکہ وہ چیتمانیہ کے ساتھ اپنی شادی کی رسمی اجازت حاصل کر لے۔ اس قاصد کو شہزادے نے ایک اور خط دیا جس میں مطلوبہ جہیزوں کے علاوہ دوسرے سامانِ عشرت کی ایک طویل فہرست تھی۔ یہ خط اس نے قریب کے ایک سردار کو پہنچانے کا حکم دیا تاکہ باپ کی اجازت کے ساتھ ہی تمام سامان اس تک پہنچ جائے اور وہ چیتمانیہ کو شاہانہ انداز میں رخصت کرا کے اپنے ساتھ لے جائے۔

چیتمانیہ سے وہ رات کے سوا ہر وقت ملاقات کر سکتا تھا لیکن چیتمانیہ سے ہر ملاقات اس کے دل کی بے چینی میں اضافہ کر دیتی تھی۔ قاصد کو گئے ہوئے یہ بیسواں دن تھا کہ شہزادہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے چیتمانیہ سے اظہار کر دیا کہ وہ اس کے باپ سے مل کر فوری رخصتی کی درخواست کرے گا لیکن سمجھدار چیتمانیہ نے اسے دلیلوں سے قائل کر کے اس ارادے سے باز رکھا اور جب وہ سیر سے واپس آئے تو شہزادہ پرسکون تھا اور چیتمانیہ اپنی کامیابی پر خوش تھی۔ چیتمانیہ اپنی سہیلی سے شہزادے سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتی تھی۔ آج کی ملاقات کی تفصیل سن کر اس کی سہیلی شہزادے کی بے چینی پر خوب ہنسی۔

چیتمانیہ اور شہزادے پارس خان کے درمیان اور تلخ اور شیریں گفتگو کے چوتھے روز شہزادے کا منگوایا ہوا تمام سامان شمال سے آ گیا۔ اس نے صرف بیس گاڑیاں منگوائی تھیں لیکن مشفق باپ نے چالیس گاڑیاں بھیج دی تھیں۔ اسی طرح گھوڑوں اور اونٹوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ شادی اور رخصتی کے لیے بھی خاقان نے بہت سامان بھیجا تھا اور شہزادے کو تاکید کر دی تھی کہ بیوی کو شاندار طریقے سے رخصت کرائے اور اس کا ڈولا پوری شان و شوکت اور شاہانہ جلوس کی صورت میں خاقان کے مستقر تک لایا جائے۔

سامان کے ساتھ خاقان نے ایک سو مزید سواروں کو بھی روانہ کیا تھا کیونکہ شہزادے کے قاصد نے چیتمانیہ کے علاقے کی جس جگہ نشاندہی کی تھی وہی سرحدی پٹی تھی اور خاقان کے خیال میں وہی متنازعہ علاقہ تھا۔ نیلے اور سفید خیل کے

خاقان اُرس خان کا مرتبہ توقتمش جیسے علاقائی حاکم سے بہت بلند تھا لیکن توقتمش اور مغلوں کے خاقانِ اعظم [illegible] میں قریبی رشتہ داری ہونے کی وجہ سے توقتمش کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور اُرس خان سے ہمسری کا دعویٰ [illegible]

چشتمانیہ کے باپ کی ایک ماہ کی مدت ختم ہونے میں ایک ہفتے سے بھی کم عرصہ باقی رہ گیا تھا۔ اس لیے جب شہزادے نے چشتمانیہ کی قیمت ادا کرنے کی پیش کش کی تو چشتمانیہ کے باپ نے بلا تکلف اسے قبول کر لیا اور شمال سے آنے والا سامان اس کے حوالے کر دیا گیا۔

بظاہر اب شادی میں کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ دونوں طرف شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور پڑاؤ کے پر خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔

چشتمانیہ کو اس سامان میں سب سے زیادہ گھوڑے پسند آئے۔ یہ گھوڑے نہایت اعلیٰ نسل کے تھے۔ اس نسل کے گھوڑے رفتار کے لحاظ سے تیز ترین سمجھے جاتے تھے۔ ہر گھوڑا انوٹ ساز سے آراستہ تھا۔ چشتمانیہ ایک اچھی شہسوار تھی۔ یہ فن بھی اس نے دل لگا کر سیکھا تھا۔ اس نے اپنی خاص سواری کے لیے ایک گھوڑا پسند کیا اور اس گھوڑے پر وہ شہزادے پارس خان کے ساتھ سیر کو جانے لگی۔

مشہور ہے کہ تقدیر نہ چاہے تو تدبیر کی تمام کوششیں دھری رہ جاتی ہیں۔ چشتمانیہ کی رخصتی میں [illegible] باقی تھے کہ ایک نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شہزادے کو اس پڑاؤ پر ٹھہرے ہوئے ایک مہینہ ہونے والا تھا۔ خاقان اُرس کے بیٹے کا پانچ سو سواروں کے ساتھ سرحدی علاقے میں اتنے طویل عرصے تک پڑاؤ ڈالے رکھنا السانہ تھا جو کریمیا کے حاکم توقتمش کو نہ پہنچتی۔

خبر دینے والے نے اپنی کارکردگی کے اظہار کے لیے اس اطلاع میں خوب نمک مرچ لگایا اور توقتمش [illegible] دیا کہ شہزادے پارس نے کریمیا کے سرحدی علاقے میں ایک بڑے قطعے پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ کریمیا میں مزید [illegible] کی تیاریاں کر رہا ہے۔

توقتمش تو شمالی خاقان کے پہلے ہی خلاف تھا۔ اس خبر کو سن کر وہ بھڑک اٹھا اور فوراً دو ہزار کا لشکر [illegible] سرحد کی طرف چل پڑا۔

توقتمش دو ہزار سواروں کے ساتھ جس وقت شہزادے کے پڑاؤ کے سامنے خیمہ زن ہوا تو متعلقہ خانہ بدوشوں کے خیموں میں تہلکہ مچ گیا۔ سب کو اپنی اپنی جانوں کی فکر پڑ گئی۔ شادی کی پُرکیف اور خوشگوار فضا پر جنگ کے [illegible] چھا گئے۔ اور شادیانوں کی آواز کے بجائے جنگی بگل کا انتظار ہونے لگا۔

توقتمش کو وہاں پہنچتے ہی شہزادے اور چشتمانیہ کی ہونے والی شادی کی پوری تفصیل معلوم ہو گئی [illegible] کو تو ایک طرف رکھ دیا اور ایک قاصد کے ذریعے شہزادے کو اطلاع بھیجی کہ اس نے کریمیا کی حدود میں داخل [illegible]

[illegible] کی خلاف ورزی کی ہے اس لیے شہزادے کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ فوراً کریمیا کی حدود سے باہر [illegible] جائے۔

شہزادہ اس لشکر کو دیکھ کر پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے کوئی سخت جواب دینے کے بجائے نرم رویہ اختیار [illegible] جواب میں صرف یہ کہلوایا کہ اسے علم نہیں تھا کہ یہ علاقہ کریمیا کی حدود میں ہے ورنہ وہ ہرگز یہاں نہ ٹھہرتا۔ اس کے [illegible] اس نے توقتمش سے یہ درخواست کی کہ اسے صرف دو دن کی مہلت دی جائے تاکہ وہ چشتمانیہ سے شادی کر کے [illegible] رخصت کرا سکے۔

توقتمش تو شہزادے کو نیچا دکھانے پر تُلا ہوا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ شہزادے کے ساتھ صرف پانچ سو سوار [illegible] اس نے فوراً چشتمانیہ کے باپ کو اپنے خیمے میں طلب کیا اور اسے چشتمانیہ کی قیمت سے دوگنا سامان ادا کرنے کی پیش کش [illegible] چشتمانیہ کا باپ لالچی ہونے کے علاوہ گرگِ باراں دیدہ تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ انکار کی صورت میں توقتمش زبردستی چشتمانیہ [illegible] حاصل کر لے گا اس لیے اس نے توقتمش کی پیش کش بغیر حیل و حجت تسلیم کر لی۔ اور توقتمش کے حکم پر پڑاؤ میں جا کر [illegible] کر دیا کہ اس نے شہزادے پارس کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ منسوخ کر کے توقتمش کے ساتھ اس کا رشتہ منظور کر [illegible] ہے کیونکہ توقتمش نے چشتمانیہ کی قیمت دوگنی کر دی ہے۔

شہزادے نے یہ اعلان سنا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اپنے ملک سے دور تھا اس لیے [illegible] اس کے مقابلے میں وہ توقتمش کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یہ بھی علم ہو گیا کہ یہ حرکت توقتمش نے اسے زک دینے [illegible] کے لیے کی ہے۔

اس کا دل ٹوٹ گیا۔ پھر ایک آخری کوشش کے طور پر اس نے ایک بڑا عجیب اور قطعی دانشمندانہ قدم اٹھایا۔ ان [illegible] میں تمام دن گزر گیا تھا۔ شام ہوتے ہی شہزادہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے ساتھیوں نے خیال کیا کہ شاید وہ چشتمانیہ [illegible] کے باپ سے ملنے جا رہا ہے اس لیے انہوں نے اس کی کوئی فکر نہیں کی۔

شہزادے نے اپنے گھوڑے کا رخ چشتمانیہ کے خیمے کی طرف کیا۔ وہ اس کے خیمے کے قریب بھی پہنچ گیا لیکن [illegible] اس نے یہ دیکھا کہ چشتمانیہ کے خیمے پر توقتمش کے مسلح سوار پہرہ دے رہے ہیں تو اس نے اپنا گھوڑا روک کر ایک [illegible] لیے کچھ سوچا پھر گھوڑا گھما کر توقتمش کے پڑاؤ کی طرف چل پڑا۔ پتہ نہیں یہ شہزادہ پارس کی غیر معمولی جرأت تھی یا [illegible] کے لیے بے پناہ محبت کا جوش جو اسے دشمن کے خیمے کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہی تھی مگر اس کے اس اقدام کو مصلحت یا [illegible] نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔

[illegible] کہ جب شہزادے پارس خان کے اپنے خیمے پر تنہا اور بے دھڑک آنے کی اطلاع پہنچائی گئی تو وہ گھبرا [illegible] اس نے دل ہی دل میں شہزادے کی جرأت کی داد بھی دی۔ توقتمش کچھ ایسا متاثر اور مرعوب ہوا کہ دل نہ چاہتے

کے باوجود اس نے خیمے سے نکل کر اس کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ لے کر خیمے میں واپس آیا اور اس نے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا:

شہزادے پارس کے تو دل کو لگی ہوئی تھی، اس نے بغیر کسی تمہید کے معذرتانہ لہجے میں کہا:

"اے حاکمِ کریمیا! شہزادہ توقتمش!! میں آپ کے پاس معذرت پیش کرنے آیا ہوں۔"

"شہزادے پارس!" توقتمش مسکرایا:

"آپ کی زبان سے معذرت کا لفظ سن کر تعجب سا ہوتا ہے۔ مغلوں کی روایت ہے کہ وہ کسی ... کے بجائے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں۔ میں آپ کو ایک بہادر جوان سمجھتا تھا لیکن آپ تو میرے ... کی طرح حاضر ہوئے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ مغل اپنے مجرم کو معاف نہیں کیا کرتے۔"

توقتمش نے شہزادے کو بزدلی کا طعنہ دیا تھا اور صاف الفاظ میں مجرم کہا تھا لیکن شہزادے ... کا ثبوت دیا اور ذلت کی پروا نہ کرتے ہوئے نرمی سے بولا:

"معزز توقتمش! میرے خیال میں اسے بہادر ہرگز نہیں کہا جا سکتا جو اپنی بھول یا غلطی کو صحیح ... لیے تلوار کا سہارا لے۔ یقیناً یہ میری غلطی تھی کہ میں بغیر تحقیق کے کریمیا کے علاقے میں داخل ہوا ... نیت نیک تھی۔"

"شہزادے پارس!" توقتمش ایک دم تیز ہو گیا:

"کسی کے علاقے میں پانچ سو سے زیادہ سواروں کو لے کر نہایت خاموشی کے ساتھ داخل ہونا ... اسے بھول تو اس وقت کہا جا سکتا تھا جب آپ غلطی کا احساس کر کے فوراً واپس چلے جاتے۔ کیا آپ نے ... کو زنگ آلود سمجھ لیا ہے کہ ایک ماہ سے میرے علاقے میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔"

"نہیں محترم توقتمش!" شہزادے پارس نے غصے کو پوری سختی سے دباتے ہوئے کہا:

"میں نے شرافت کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ چشتانیہ کو میں نے باقاعدہ قیمت ادا کر کے خرا... رنگ رلیوں کا نام نہیں دیا جا سکتا۔"

"بس شہزادے خاموش ہو جائیے۔" توقتمش قبضۂ شمشیر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:

"چشتانیہ کا نام آپ نہ لیجیے۔ اس کا رشتہ مجھ سے طے ہو چکا ہے۔"

"محترم توقتمش!"

شہزادے پارس کا لہجہ ذرا سا تیز ہوا:

"میں نہیں چاہتا کہ ایک عورت کے لیے برہمی پیدا ہو۔ چشتانیہ کو پہلے میں نے خریدا ہے اور ...

... قیمت ادا کر دی ہے۔ میں اس سلسلے میں شہزادے توقتمش سے بھی درخواست کرنے پر آمادہ ہوں۔ چشتانیہ ... کرنے کے عہد و پیمان ہو چکے ہیں اس لیے آپ براہِ کرم ہمارے درمیان نہ آئیے اور اپنا دعویٰ واپس ... لے لیجیے۔ یہ آپ کا مجھ پر ایسا احسان ہو گا جسے میں عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔"

شہزادے پارس نے منت و خوشامد کا انداز اختیار کیا تھا اور اپنی محبت کا حوالہ بھی دیا تھا لیکن توقتمش کا ... دل نہ پسیجا۔ وہ پہلے جیسے تلخ لہجے میں بولا:

"شہزادے پارس! چشتانیہ بکاؤ مال ہے جو بڑی بولی دے گا اس کی وہ کنیز بن جائے گی۔ میں نے دگنی قیمت ... ہے۔ اس پر میرا حق ہے۔ میں اپنے حق سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

"اے حاکمِ کریمیا! آپ یہ تو غور کریں کہ چشتانیہ پہلے ہی فروخت ہو چکی ہے۔ اس کے باپ نے مجھ سے اس کی قیمت وصول کر لی ہے۔"

پارس نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی:

"چشتانیہ کے باپ کو قیمت وصول کرنے کے بعد اسے دوبارہ فروخت کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

"حق کیوں نہیں ہے شہزادے پارس؟"

توقتمش غرایا:

"چشتانیہ کے فروخت کی مدت ایک ماہ مقرر ہوئی تھی۔ میں نے مدت ختم ہونے سے دو دن پیشتر اس کا سودا ... ہے۔ اس کا باپ با اختیار ہے۔"

شہزادہ پارس بھی آخر مغل تھا۔ اس کی رگوں میں بھی نیلے اور سفید غول کے خاقان کا خون دوڑ رہا تھا۔ آخر ... کب تک ضبط کرتا اسے بھی غصہ آ گیا اور تلخی سے بولا:

"حاکمِ کریمیا! آپ اپنے دو ہزار سواروں کے زور پر مجھے مرعوب کر کے اپنی من مانی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ بھی ... سوچتے کہ میں خود چل کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ حالانکہ میں خاقانِ شرق و غرب کا ولی عہد ہوں۔ اگر چشتانیہ کی ... بڑھا کر اسے حاصل کرنا ہے تو میں آپ سے چار گنی قیمت دے کر خریدنا چاہتا ہوں۔ میں تو رفعِ شر کے ... ایسا کر رہا ہوں ورنہ چشتانیہ پر میرا پہلا حق ہے اور ......"

"پارس......"

توقتمش نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی:

"تم چار گنا قیمت دے سکتے ہو تو میں آٹھ گنا قیمت کی بولی دیتا ہوں۔ بس نہ تم سے ہٹتا ہوں اور نہ تمہارے ... معاہدے توڑتا ہوں۔ تمہارے باپ نے تو میرا علاقہ دبا رکھا ہے، اگر تحقیق کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے

نیلے اور سفید غول میں میرے مغلوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے"۔

پارس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تو قتمش کی اس بے ہودہ گفتگو نے وہ اس قدر چراغ پا ہوا
ہاتھ بھی بے ساختہ اپنی تلوار پر گیا۔

تو قتمش اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے بھی خود کو مدافعت اور حملے کے لیے تیار کر لیا
پارس کو فوراً وقت کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ اس نے تلوار سے ہاتھ ہٹا لیا اور نرمی سے بولا:

"حاکم کریمیا۔ اس طرح قیمت بڑھانے سے سوائے چشتانیہ کے لالچی باپ کے اور کسی کو فائدہ نہ ہو
کون فیصلہ کرے گا کہ کس کی قیمت زیادہ ہے اور وہ اسے ادا بھی کر سکتا ہے"۔

"اس کا فیصلہ بہت آسان ہے شہزادے"۔ تو قتمش نے ہلکا سا لیکن خوفناک قہقہہ لگایا۔

"وہ آسان فیصلہ بیان کیجئے۔ شاید وہ مجھے بھی قابلِ تسلیم ہو"۔ شہزادے نے بھی احترام اور تہذ
دامن نہ چھوڑا۔ اس کا لہجہ غصے سے پاک تھا۔

"بہادروں کا ہر اہم فیصلہ نوکِ تلوار سے ہوا کرتا ہے"۔

تو قتمش نے زانو پر رکھی تلوار کو ذرا سا بلند کیا:

"تلوار کھینچو۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا"۔

"ہاں حاکم کریمیا۔ آپ نے درست فرمایا"۔ شہزادہ بڑے پرسکون لہجے میں بولا:

"بے شک بہادر اسی طرح اپنے ذاتی معاملات نمٹایا کرتے ہیں لیکن سوچنا یہ ہے کہ آخر اس کا
ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں میں سے ایک مارا جائے گا۔ اگر آپ میرے ہاتھ سے قتل ہوئے تو یہ مغلو
عظیم بہادر سردار کی موت ہو گی جس کے لیے میں قطعی تیار نہیں۔ اگر میں مارا گیا تو میرے ساتھ ہزاروں بے
کا خون بہے گا۔ میرا باپ ارس خان پورے کریمیا کو روند کے رکھ دے گا۔ مغلوں کا کوئی غول آپ کی حما
نہیں نکلے گا اور آپ کو خود اپنی سرزمین پر کسی جگہ پناہ نہیں ملے گی"۔

"پارس۔ تم اپنی بزدلی کا جواز دلیلوں میں تلاش کر رہے ہو"۔

"اور مجھے آپ کی ناعاقبت اندیشی کا شکوہ ہے"۔

شہزادے پارس کو یقین ہو گیا کہ تو قتمش کسی طور بھی مصالحت پر آمادہ نہیں اور اگر اس سے زیا
کی گئی تو سوائے بدمزگی کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور خیمے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا:

"امید ہے کہ حاکم کریمیا اس ناگوار ملاقات کو بھولنے کی کوشش کریں گے اور اپنی تلوار کو کسی

مقابلہ کرنے کے لیے محفوظ رکھیں گے"۔

"لیکن مجھے......"

"لیکن کی ضرورت نہیں معزز تو قتمش......"

شہزادے نے اس کی بات کاٹ دی:

"میں آپ سے مزید کوئی معذرت نہیں کرنا چاہتا اور نہ کسی رعایت کا خواہاں ہوں۔ میں نے اپنے مقام
سے نیچے آ کر آپ سے درخواست کی اور کچھ مراعات کا خواہش مند ہوا لیکن آپ نے میری ہر بات اور ہر
تجویز رد کر دی۔ اس لیے میری دور اندیشی مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں صبح کو پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے ہی آپ کا علاقہ
چھوڑ کر واپس چلا جاؤں"۔

"ٹھیک ہے"۔

تو قتمش نے غرور سے گردن اکڑائی:

"میں صبح کو اپنے علاقے میں تمہارا کوئی آدمی نہیں دیکھنا چاہتا۔ تمہیں صرف آج کی رات مہلت دی جا سکتی ہے"۔

"حاکم کریمیا مطمئن رہیں"۔ شہزادے نے لاپروائی سے کہا:

"میں نے جو زبان سے کہا ہے اسے پورا کروں گا"۔

"سنو پارس خان۔ ایک اور بات ذہن نشین کر لو"۔ تو قتمش نے آواز دے کر کہا۔

شہزادہ پارس خیمے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر تو قتمش کو دیکھا اور طنزیہ لہجے میں
بولا:

"کوئی اور نیا حکم ہو تو وہ بھی سنا دیجیے۔ میں اسے بھی بسر و چشم بجا لاؤں گا"۔

"حکم نہیں بلکہ تمہاری بھلائی کی بات ہے"۔ تو قتمش نے جواب دیا:

"اگر تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں چشتانیہ کا ذرا سا بھی خیال ہو تو اسے کھرچ پھینکو۔ اگر اسے حاصل
کرنے کی کوشش کی تو نقصان اٹھاؤ گے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ میں اپنے دشمنوں کو نہیں بخشا کرتا"۔

"اور شہزادہ کا یہ کیا نرالا نظام ہے"۔

شہزادہ مسکرایا:

"اور دشمن کو بخشا نہیں کرتے اور ہم دشمنوں کو معاف کر دینے کے عادی ہیں۔ چشتانیہ کے سلسلے میں یہی کہا جا
سکتا ہے کہ ایک شہزادے نے دوسرے شہزادے سے محبت کی بھیک مانگی مگر دوسرا شہزادہ اس کی خالی جھولی نہ بھر
سکا اور ثابت کر دکھایا ہے کہ بہادروں کا ہر اہم فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا ہے۔ اگر چشتانیہ کی خواہش ہوتی تو

آپ تلوار میرے ہاتھ میں دیکھیں گے۔"

شہزادہ پارس چلا گیا اور تو قتمش اس عجیب و غریب دشمن کے بارے میں سوچنے لگا۔
پہلے تو اسے یہی خیال ہوا کہ شہزادہ پارس بزدل ہے لیکن شہزادے نے نرم لہجے میں جس ...
جواب دیے تھے وہ اس کی شجاعت اور بہادری کا کھلا ہوا ثبوت تھے۔ یہاں تک کہ شہزادے نے
... کا نام بھی لیا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نچلا نہیں بیٹھے گا اور اپنی توہین کا بدلہ لینے آئے گا لیکن ...
نے شہزادے کی دلیری کو پھر بھی تسلیم نہ کیا۔

اس نے خیمے کے ہلتے ہوئے پردے پر نفرت سے نظر ڈالی اور پھر ایک زوردار قہقہہ بلند ...
کا مذاق اڑا رہا ہو یا پھر اپنی کامیابی پر نازاں ہو۔

○

حاکمِ کریمیا تو قتمش کے آنے سے مغل خیموں میں پہلے ہی ہلچل مچ گئی تھی۔ شہزادہ پارس وہاں
تنہا تھا۔ اس کے پاس لشکر تو نہ تھا لیکن پانچ سو سوار بھی بہت ہوتے ہیں۔ پھر جب تو قتمش نے پارس ...
خیمے لگ گئے تو پڑاؤ ایک میدانِ جنگ کی صورت اختیار کر گیا۔

شہزادہ پارس اور حاکمِ کریمیا کے درمیان نامہ و پیام بھی جنگی نوعیت کے ہوئے۔ پھر جب چشت...
تو قتمش نے طلب کیا تو یہ بات مشہور ہو گئی کہ پارس خان اور تو قتمش میں چشتمانیہ کے لیے جھگڑا ...
خیمہ نشین مغلوں کا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ تو قتمش نے چشتمانیہ کے باپ کو مجبور کر دیا کہ وہ چشتمانیہ کا فیصلہ
کرے۔ حالانکہ شہزادے نے مطلوبہ چیزیں بھی اس کے حوالے کر دی تھیں اور تو قتمش نے صرف زبا...
کیا تھا لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ بندھا ہوا مار کھاتا ہے، یہی بات چشتمانیہ کے باپ پر صادق آتی ...
چشتمانیہ تو ہاتھ سے جاتی ہی، ساتھ میں پورے قبیلے پر آفت آجاتی۔ شہزادے پارس سے اس نے ...
لی تھی ..... مگر آئی ہوئی چیزوں کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے اس نے تو قتمش کی زبانی ...
کر لیا اور اس کے حکم پر پارس سے رشتہ توڑ کر تو قتمش سے رشتہ جوڑ دیا۔

چشتمانیہ کے باپ کی اس عہد شکنی کو قبیلے کے بعض غیور اور سمجھ دار لوگوں نے پسند نہ کیا ...
تو قتمش کے چنگل سے پھنسے ہوئے تھے۔ حالات یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ اگر پارس اور تو قتمش میں جنگ ...

...رے گا۔ ان باتوں کو سوچتے ہوئے چشتمانیہ کے باپ کو کسی نے نہ ٹوکا اور نہ مخالفت کی لیکن اس
...ے غریب چشتمانیہ پر قیامت گزر گئی۔

چشتمانیہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ ایک اچھی رقاصہ بھی تھی لیکن اس کا رقص عام طور سے خانہ بدوش
... محدود رہتا تھا۔ وہ نہ پڑھی لکھی تھی اور نہ ہی محلوں کی پروردہ تھی۔ اس کی سہیلیاں بھی اسی کی طرح الہڑ اور
... چشتمانیہ نے لیلیٰ و قیس اور شیریں و فرہاد کے قصے کبھی بھی ترتیب سے نہ سنے تھے کہ عشق و محبت کے
... سمجھتی اور محسوس کرتی۔ اس نے تو بس شہزادے پارس کو گھوڑے سے اترتے دیکھا تھا۔ شہزادہ اسے اچھا لگا
...ملے ہوا اور وہ شہزادے پارس کے ساتھ گھومنے پھرنے لگی۔ اس نے اب تک نہ تو عشق کی چوٹ کھائی تھی
... کی منزل سے گزری تھی۔

لیکن جب تو قتمش کے حکم سے اس کے خیمے پر پہرہ لگ گیا اور اس کے باپ نے شہزادہ پارس سے ملنے سے سختی
... کر دیا تو اس کے دل میں محبت کی آگ ایکدم بھڑک اٹھی اور اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ عشق کا درد کیسا ہوتا
... فراق کسے کہتے ہیں۔

چشتمانیہ کی بہت کم سہیلیاں تھیں۔ ان میں سے بھی صرف یاسو ایسی تھی جس پر وہ اعتماد کر کے اسے اپنا راز ...
...تی۔ یاسو کو بھی چشتمانیہ سے بہت پیار تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسے چشتمانیہ سے عشق تھا۔ اسی نے چشتمانیہ
... تیار کیا تھا اور اپنے کپڑے پہنا کر شہزادے پارس سے ملانے لے گئی تھی ورنہ اس کی بعض سہیلیاں تو اس خبر
... گئی تھیں کہ چشتمانیہ کو دیکھنے کے لیے خاقانِ شرق و غرب کے بیٹے نے طلب کیا ہے۔

"... کیا ہو گا یاسو؟" چشتمانیہ، یاسو کو خیمے میں داخل ہوتے دیکھتے ہی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی..... اور
... سسکنے لگی۔

"سیدھی ہو کر بیٹھو چشتمانیہ۔" یاسو اسے پرے ہٹاتے ہوئے بولی:
"اس طرح آنسو بہانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تجھے کچھ پتہ بھی ہے کہ باہر کیا ہوا ہے؟"
یاسو کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ چشتمانیہ سہم کر دور جا بیٹھی۔ پھر افسردگی سے بولی:
"ہاں مجھے معلوم ہے میرے باپ نے میرا رشتہ شہزادے سے توڑ دیا ہے۔"
"صرف رشتہ توڑا ہی نہیں بلکہ تیرا رشتہ کریمیا کے حاکم سے جوڑنے کا اعلان بھی کیا ہے۔" یاسو نے
...

"ہاں، میں نے یہ اعلان سنا ہے جبھی سے تو پریشان ہوں۔"
چشتمانیہ نے سسکی لی: "میں تیرے پاس آنے والی تھی لیکن اب تو مجھے باہر نکلتے ڈر لگتا ہے۔"

میرے پاس تو آ بھی نہیں سکتی تھی۔"

یاسو کچھ نرم پڑی:

"باہر جھانک کر دیکھ۔ تجھے خیمے میں قید کر دیا گیا ہے۔ تو باہر نہیں نکل سکتی۔"

"مگر کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟" چشتانیہ نے گھبرا کر پوچھا:

"کریمیا کے سردار کا میں نے کیا بگاڑا ہے؟"

"وہ تجھے اپنی کنیز سمجھنے لگا ہے۔" یاسو منہ بنا کر بولی:

"بڑا آیا ہے سردار بن کر۔ ایک کوڑی ادا نہیں کی اور خواہ مخواہ تیرا مالک بن گیا۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ شکل سے پورا بندر لگتا ہے۔"

"میں...... میں...... اس سے شادی نہیں کروں گی۔" چشتانیہ نے ہکلاتے ہوئے کہا:

"میں نے شہزادے سے وعدہ کیا ہے۔ میں اس کے لیے زندہ رہوں گی اور....."

"کیا تجھے شہزادے سے واقعی اتنی محبت ہے؟" یاسو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں یاسو!" چشتانیہ سنبھل کر بولی:

"اگر کسی اور نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو میں اسے قتل کر دوں گی۔"

"تجھ میں اتنا حوصلہ ہے بھی؟" یاسو نے طنز کیا۔

"یاسو۔ تو دیکھ لینا۔ میں جان سے گزر جاؤں گی لیکن سوائے شہزادے کے اور کسی کا منہ نہیں دیکھوں گی۔" چشتانیہ نے بڑی مستقل مزاجی سے کہا۔

"چشتانیہ۔ اگر تجھے شہزادے سے واقعی محبت ہے اور تجھ میں حوصلہ بھی ہے تو دھیان سے سن! میں تجھے بتاتی ہوں کہ باہر کیا کچھ ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔"

یاسو نے ایک لانبا سانس لیا۔

چشتانیہ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئی۔

"کریمیا کے حاکم نے یہاں پہنچتے ہی تیرے باپ کو بلوا بھیجا۔"

یاسو نے کہنا شروع کیا:

"اس نے حکم دیا کہ تیری نسبت شہزادے پارس سے توڑ کر اس سے کر دی جائے۔ تیرا باپ لالچ میں آ گیا۔ شہزادے سے تیرا رشتہ ختم کر دیا اور دوسری طرف اس نے شہزادے پارس کو ایک آدمی کے ذریعے حکم دیا کہ وہ یہ علاقہ خالی کر کے اپنی حکومت میں چلا جائے۔ شہزادے اور حاکم کریمیا کے درمیان دیر تک پیام آتے جاتے

[illegible] نہیں کیا فیصلہ ہوا لیکن اس دوران تیرے خیمے پر پہرہ لگ گیا اور تیرے باپ کو دوسری جگہ قید کر دیا گیا۔ میں [illegible] کی ٹوہ میں تھی اس لیے تیرے پاس نہیں آ سکی۔ اب جو آئی ہوں تو اس پہرے دار سے ایک گھنٹہ جھک جھک [illegible] نے بھی خوب سنائی ہیں اسے۔ کہتا تھا کہ اس خیمے میں تو چشتانیہ کا باپ بھی نہیں جا سکتا مگر میں بھی اپنے [illegible] پاس ہوں۔ میں آگے دہی اور اب ہر وقت آتی جاتی رہوں گی۔ مجھے کوئی نہیں روکے گا۔"

چشتانیہ دم بخود بیٹھی سن رہی تھی۔

یاسو سانس لینے کے لیے رکی تو اس نے پوچھا:

"کچھ شہزادے کے بارے میں بھی معلوم ہوا۔ وہ کیا کہتے ہیں؟"

"وہ..... وہ بھی شاید تیری طرح پریشان ہے۔"

یاسو مسکرائی:

"وہ پریشان ہو کر تیرے پاس آیا تھا۔"

"میرے پاس؟" چشتانیہ گھبرا کر بولی:

"نہیں۔ دھوکا ہوا ہے یاسو۔ یہاں تو صبح سے کوئی بھی نہیں آیا۔"

"تجھے پتہ نہیں چشتانیہ۔"

یاسو نے بتایا:

"شہزادہ جب کریمیا کے حاکم کی باتوں سے مایوس ہوا تو گھوڑے پر سوار ہو کر تیرے خیمے پر آیا تھا لیکن خیمے پر پہرا دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور گھوڑا موڑ کر کریمیا کے حاکم کے پاس چلا گیا۔"

"کس کے پاس؟"

چشتانیہ پریشان ہو گئی:

"کیا شہزادے، حاکم کریمیا کے پاس گئے ہیں؟"

"ہاں ہاں۔ اسی بندر کے پاس گئے تھے۔" یاسو نے جواب دیا:

"میں خیمے کے قریب ہی کھڑی کریمیا کے سواروں سے باتیں کر رہی تھی۔ شہزادے جب کریمیا کے حاکم سے ملاقات کر کے واپس آئے تو تھکے تھکے اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ خاموشی سے گھوڑے پر سوار ہوئے اور اپنے پڑاؤ کی طرف چلے گئے۔"

"اللہ اب کیا ہو گا یاسو؟" چشتانیہ کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

"کیا باتیں ہوئیں وہاں۔ کہیں جنگ نہ ہو جائے؟"

"یانوں کا تو میں پتہ نہیں لگا سکی۔"

یاسو نے انکار میں سر ہلایا:

"میں نے سوچا تھا کہ شہزادہ جب واپس آئے گا تو اس سے ملنے کی کوشش کروں گی لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا۔ ایک تو وہاں بہت سے آدمی موجود تھے۔ پھر شہزادے نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہی گھوڑے کو ایڑ لگا دی تھی۔"

"پھر کیسے معلوم کیا جائے کیا ہونے والا ہے؟ کون بتائے گا؟" چشتانیہ کو پسینے آنے لگے۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

"ابھی تو کچھ پتہ نہیں لگ سکتا۔ ہاں رات ہو جانے دو تو میں شہزادے کے پاس جاؤں گی۔" یاسو نے دلیری سے کہا:

"اب تُو اپنے دل کا حال بتا۔ تُو کیا چاہتی ہے؟"

"میں کیا چاہتی ہوں یاسو۔ تُو مجھ سے پوچھتی ہے؟"

چشتانیہ تیز تیز سانسیں لینے لگی:

"معلوم نہیں یہ بندر کہاں سے آ کے مر گیا۔ دو دن اور نہ آتا تو اس کا کیا بگڑتا۔ میں اپنے گھر لگ جاتی!"

"ان باتوں کو چھوڑ۔ یہ بتا کہ تُو کرنا کیا چاہتی ہے؟"

یاسو نے اسے جھڑکا:

"ابھی تو شہزادہ یہیں ہے۔ کل کلاں وہ واپس چلا گیا تو عمر بھر روتی رہے گی۔ پھر کچھ نہ بنے گا۔"

"ہائے میں کیا کروں؟"

چشتانیہ انگلیاں چٹخانے لگی:

"تُو ہی بتا میں کیا کروں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ بس۔۔۔۔ کسی طرح اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔"

"تُو اس کے پاس جانا چاہتی ہے؟"

"ہاں۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔"

"اگر مگر نہیں۔ صرف ہاں یا نہیں میں جواب دے۔"

"ہاں۔ اگر وہ مجھے لینے آ گیا تو میں انکار نہیں کروں گی۔"

"اگر وہ یہاں نہ آ سکا تو پھر۔۔۔۔؟"

"پھر کیا۔۔۔۔ پھر میں کیا کروں گی؟"

"تجھے وہاں جانا ہو گا۔"

"بھاگ کر۔۔۔۔؟"

چشتانیہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے:

"نہیں یاسو۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ تمام قبیلے میں بدنام ہو جاؤں گی۔ میرے باپ کی ناک کٹ جائے گی۔"

"تیرے باپ نے عہد شکنی کر کے اپنی ناک تو پہلے ہی کٹوا لی ہے۔" یاسو غصے سے بولی:

"پورے قبیلے والے لعنت بھیج رہے ہیں اس پر۔ وہ تو کہتے ہیں کہ اگر کریمیا کا حاکم نہ آیا ہوتا اور تیرا باپ اس طرح وعدہ خلافی کرتا تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے تیرا ہاتھ شہزادے کے ہاتھ میں دے دیتے۔ پورا قبیلہ شہزادے کی طرف ہے مگر خوف کی وجہ سے خاموش ہیں۔ کریمیا کے حاکم کے پاس دو ہزار ہیں۔ کون مقابلہ کر سکتا ہے؟"

چشتانیہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"کن خیالوں میں کھو گئی ہو؟"

یاسو نے اسے چونکایا:

"میں یہ نہیں کہتی کہ تو اسی وقت شہزادے کے پاس چلی جا۔ ابھی تو مجھے شہزادے کا حال معلوم کرنا ہے۔ آخر اس کا کیا ارادہ ہے۔ ہاں اگر ایسا موقع آ گیا تو پھر شہزادے کو حاصل کرنے کی یہی صورت ہو گی۔ تیرے خیمے پر پہرہ ہے۔ شہزادہ یہاں نہیں آ سکتا۔ فوراً جنگ شروع ہو جائے گی۔"

"مگر میں بھی تو باہر نہیں جا سکتی۔" چشتانیہ پریشانی سے بولی:

"پہرے دار مجھے کب جانے دیں گے۔"

"اس کی تُو فکر نہ کر۔۔۔۔ بس اپنا دل کڑا کر لے۔"

پھر یاسو نے اس سے سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ چشتانیہ اس دوران کبھی سر ہلاتی اور کبھی آنکھیں پھیلا پھیلا کر تعجب کا اظہار کرتی رہی۔

سرگوشیوں کے بعد یاسو اٹھ کر خیمے سے باہر چلی گئی اور چشتانیہ پھر سوچ میں کھو گئی۔

رات کو یاسو لوگوں کی نظریں بچاتی شہزادے کے پڑاؤ میں پہنچ گئی۔ شہزادے نے دل برداشتہ ہو کر سامان بندھوانا شروع کرا دیا تھا۔ آدھے سے زیادہ خیمے اکھاڑے جا چکے تھے اور سامان گاڑیوں پر لادا جا رہا تھا۔

شہزادے کو خبر کی گئی کہ چشتانیہ کی سہیلی یاسو آپ سے ملنا چاہتی ہے تو وہ خود خبر دینے والے کے ساتھ بھاگا چلا گیا اور یاسو کو ایک خیمے میں لے جا کر بٹھایا۔

"شہزادے بہادر۔"
یاسو نے فوراً بات شروع کر دی:
"مجھے نہیں معلوم کہ کریمیا کے حاکم اور آپ کے درمیان کیا بات ہوئی لیکن خیمے اکھاڑے جانے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ واپس جا رہے ہیں۔"
"ہاں یاسو۔" شہزادہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:
"میں نے توقتمش سے مصالحت کی بہت کوشش کی۔ میں نے اپنے وقار کی بھی پروا نہیں کی۔ خوشامد سے بھی دریغ نہ کیا لیکن وہ مغرور دو ہزار سواروں پر پھولا ہوا ہے۔ اس نے میری ایک نہ مانی اور مجھے رات کے اندر اندر اپنی حدود سے نکل جانے کا حکم دیا ہے۔"
"مگر شہزادے بہادر۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔"
یاسو نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا:
"یہ تو کوئی دوستی اور محبت نہ ہوئی۔ آپ چشتانیہ کو بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہیں۔ کیا یہی عہد و پیمان ہوئے تھے آپ دونوں میں؟"
"کیا کروں یاسو۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔" شہزادے نے افسردگی سے کہا:
"میں توقتمش سے وہ بدلہ لوں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ وہ میرے ہاتھ سے بچ نہ سکے گا۔"
"شہزادے آپ تو بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔" یاسو جل کر بولی:
"کریمیا کا حاکم جب چشتانیہ کو اپنی لونڈی بنا لے گا تو پھر آپ لاکھ کچھ کرتے رہیں، سب بے کار ہوگا۔ سانپ نکل جائے تو پھر لکیر پیٹنے سے کیا حاصل ہوگا!"
"میری مجبوری بھی دیکھو یاسو۔"
شہزادے کی آواز گہرے غم میں ڈوبی ہوئی تھی:
"میرا اکیلا معاملہ ہوتا تو میں لڑ بھڑ کے مر جاتا لیکن پانچ سو سواروں کو دو ہزار سے لڑا دینا موت کو دعوت دینا ہے۔ ایک بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔"
"تو پھر یوں کہیے کہ آپ کو چشتانیہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"
یاسو نے تیوریاں چڑھا لیں:
"اسے آپ کھلونا سمجھ کے کھیل رہے تھے۔ ذرا سی مصیبت پڑی تو پیٹھ دکھا کر چل دیے۔"
شہزادہ بڑا جز بز ہوا۔ بولا:

"اچھا یہ بتاؤ، چشتانیہ کیا چاہتی ہے؟ اگر وہ کہتی ہے کہ میں توقتمش سے جنگ کروں تو میں اپنی آن کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسی وقت توقتمش پر حملہ کر دوں گا اور چشتانیہ پر ثابت کر دوں گا کہ میں اس سے وفادار ہوں۔"
"چشتانیہ یہ ہرگز نہیں چاہے گی کہ آپ ایک بے کار سی جنگ کر کے خود کو اور اپنے سواروں کو ہلاکت میں ڈال دیں۔"
یاسو نے مستقل مزاجی اور سنجیدگی سے کہنا شروع کیا:
"وہ تو آپ کی اور آپ کے سواروں کی زندگی کی خواہش مند ہے۔ آپ ایسا قدم اٹھائیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"
"یاسو، تم سمجھتی ہو کہ میں نے کوشش نہیں کی؟" شہزادہ بڑے کرب سے بولا:
"یقین کرو کہ میں نے توقتمش کو رام کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اب صرف جنگی حربہ ہی رہ جاتا ہے اور اس کے لیے بھی میں تیار ہوں۔"
"شہزادے بہادر۔ ابھی وقت ہے۔ آپ چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"
یاسو شہزادے کی طرف سے بالکل مطمئن ہونے کے بعد مطلب پر آئی:
"آپ تیار ہوں تو یہ مسئلہ جنگ کے بغیر بھی حل ہو سکتا ہے۔ بس ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔"
"میں ہر طرح تیار ہوں یاسو۔" شہزادے نے بے چینی سے کہا:
"چشتانیہ کے لیے میں ہر قدم اٹھا سکتا ہوں۔"
"شہزادے بہادر، آپ کا سامان بندھ رہا ہے۔ رات کے کسی بھی پہر آپ کوچ کر سکتے ہیں۔" یاسو کہتے کہتے رکی اور اس نے شمع کی روشنی میں شہزادے کو غور سے دیکھا۔
"رکو مت یاسو۔ میں سن رہا ہوں۔" شہزادہ اضطراب سے بولا۔
"میرا مطلب ہے جہاں اتنا سامان لے جا رہے ہیں وہاں اس میں ایک سامان کا اور اضافہ کر لیجیے۔"
"میں سمجھ نہیں سکا یاسو۔" شہزادے نے الجھتے ہوئے پوچھا:
"تم کیے سامان بھیجنا چاہتی ہو؟ کتنا وزن ہے اس کا؟"
"شہزادے۔ چشتانیہ کا وزن کچھ زیادہ نہیں۔"
یاسو نے زیر لب تبسم کیا:
"اسے تو آپ اپنے گھوڑے پر پشت کے ساتھ بھی بٹھا سکتے ہیں۔"
"کیا چشتانیہ......؟"

شہزادے کا منہ حیرت سے کھل گیا:

"کیا وہ اپنے باپ کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہے؟"

"شہزادے بہادر۔ باپ کا گھر تو ہر بیٹی کو ایک نہ ایک دن چھوڑنا پڑتا ہے"۔ یاسو نے سنجیدگی سے کہا:
"کبھی خوشی اور کبھی آج جیسے حالات کی مجبوری سے۔ آپ کو شاید پتہ نہیں کہ چشتانیہ کے باپ کو
ایک الگ خیمے میں قید کر دیا گیا ہے۔ اسے چشتانیہ سے ملنے کی بھی اجازت نہیں۔ پھر اسے چھوڑنے نہ چھوڑنے
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

شہزادے کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے اس کام میں بڑے خطرات نظر آ رہے تھے لیکن چشتانیہ
کا پیکر اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا جو شہزادے کو ہر خطرے سے لاپروا کر رہا تھا۔ یاسو نے بات ختم کی تو شہزادے نے
ایک اندیشے کا اظہار کیا:

"یاسو۔ تم جانتی ہو کہ چشتانیہ کے خیمے پر پہرہ ہے۔ اگر وہاں سے نکلتے ہوئے کچھ گڑبڑ ہو گئی اور چشتانیہ
کو نقصان پہنچا تو کیا ہو گا؟"

"شہزادے۔ دل میں وسوسوں کو جگہ نہ دیجیے"۔ یاسو اطمینان سے بولی:
"خطرہ تو ہر کام میں ہوتا ہے اور بہادروں کا کام ہی خطرات سے کھیلنا ہے۔ آپ بس چشتانیہ کو ساتھ لے
جانے کی حامی بھر لیجیے اور باقی باتیں قسمت پر چھوڑ دیجیے"۔

"میں تیار ہوں یاسو"۔

شہزادے نے فیصلے کا اعلان کر دیا:

"چشتانیہ کے بغیر میری زندگی بھی ادھوری ہے"۔

"آپ کس وقت کوچ کے لیے تیار ہو جائیں گے"۔ یاسو نے پوچھا۔ وہ چاہتی تھی صحیح وقت معلوم ہو جائے
تاکہ وہ اپنا اگلا قدم بھی اس کے مطابق اٹھائے۔

"زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے"۔ شہزادے نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"چشتانیہ کے لیے ایک الگ گھوڑا تیار رکھیے گا"۔ یاسو نے اسے تاکید کی:

"چشتانیہ اچھی شہسوار ہے۔ پھر بھی سفر کے دوران آپ اسے اپنے سے آگے رکھیے گا"۔

شہزادے نے سر ہلا کر یاسو کو مطمئن کر دیا۔

[illegible] ہوا اٹھاتی ہوئی چشتانیہ کے خیمے میں پہنچی۔ یاسو اور پہرے داروں میں پہلے تکرار ہو چکی تھی اس لیے انہوں نے
[illegible] نہیں کیا۔ چشتانیہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے یاسو کو دیکھا۔ یاسو نے
[illegible] کے بجائے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ چشتانیہ کا دھڑکتا ہوا دل اپنی فطری رفتار پر آ گیا۔

یاسو نے اپنے کپڑے اتار کر چشتانیہ کو پہنا دیے اور چشتانیہ کا ایک جوڑا نکال کر خود پہن لیا۔ اس کام کے
[illegible] آہستہ آہستہ چشتانیہ کو وہ باتیں بھی بتاتی رہی جو اس کے اور شہزادے پارس کے درمیان
[illegible] تھیں۔

چشتانیہ اپنی سہیلی کی بڑی احسان مند تھی اور بار بار کبھی اس کے ہاتھ اور کبھی محبت سے اس کا منہ چوم لیتی تھی۔
[illegible] کے مطابق جب ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تو یاسو نے چشتانیہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ چشتانیہ
[illegible] بار اور مخلص سہیلی سے گلے ملی اور پھر بسم اللہ کہہ کر خیمے سے قدم نکالا۔ باہر نکلتے وقت اس کے پیر لرز رہے
[illegible] لیکن اس نے فوراً پیروں پر قابو پا لیا اور قدم جما کے چلنے لگی۔ یاسو پردے سے لگی کھڑی تھی اور دل ہی دل میں
[illegible] مانگ رہی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ پھر صرف ایک شمع ٹمٹما رہی تھی۔ چشتانیہ کے بدن پر یاسو کے کپڑے تھے۔ کسی پہریدار کو
[illegible] شبہ نہیں ہوا اور چشتانیہ صرف دو گز کے فاصلے سے پہریدار کے پاس سے بے جھجک نکل گئی۔ آگے اندھیرا تھا۔
[illegible] اندھیرا ہی چشتانیہ کا پردہ اور مددگار بن گیا۔ وہ شہزادے کے پڑاؤ کو جانے والے ہر موڑ اور راستے سے واقف تھی
[illegible] تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

شہزادہ پارس روانگی کے لیے بالکل تیار تھا۔ تمام خیمے ڈیرے بار کیے جا چکے تھے۔ ہر طرف تاریکی پھیلی تھی۔ اسی
[illegible] میں چشتانیہ سامان کی گاڑیوں کے پاس سے گزرتی ہوئی شہزادے کے قریب پہنچ گئی لیکن تاریکی کی وجہ سے شہزادہ
[illegible] نظر نہیں آ رہا تھا۔

چشتانیہ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک گاڑی کے پاس ایک آدمی شمع لیے کھڑا تھا اور اس کی ہلکی روشنی میں گاڑی
[illegible] سامان بار کیا جا رہا تھا۔ چشتانیہ اس کی طرف بڑھی۔ اسے سب ہی پہچانتے تھے لیکن اس وقت وہ کپڑے پہنے ہوئے تھی جو
[illegible] دو گھنٹے پہلے اس کی سہیلی شہزادے سے ملنے آئی تھی۔ شہزادے کے آدمیوں نے ٹمٹماتی روشنی میں چشتانیہ کو
[illegible] دیکھا تو انہیں گمان ہوا کہ وہ چشتانیہ کی سہیلی یاسو ہے۔

ان میں سے ایک آدمی بھاگتا ہوا شہزادے کے پاس گیا اور آہستہ سے کہا:

"شہزادے بہادر۔ وہی عورت پھر آئی ہے"۔

"کون عورت؟" شہزادہ بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے قدم رک گئے۔

"وہی عورت شہزادے۔ اُن کی سہیلی" آدمی چشتانیہ کا نام لیتے ہوئے ہچکچایا۔

"چشتانیہ کی سہیلی یاسو۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔" شہزادے کا دل دھک سے رہ گیا۔

"جی ہاں۔ وہی دربارہ آئی ہے"۔

شہزادہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیا۔

چشتانیہ گاڑی سے ہٹ کر قدرے تاریکی میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے شہزادے کو آتے دیکھا تو وہ شمع کے پاس آ گئی۔

شہزادے کی نظر اس پر پڑی تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا:

"ارے تم۔۔۔۔؟"

اور وہ جلدی سے شمع اور چشتانیہ کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا:

"یہاں روشنی ہے۔ تم گاڑی کے پیچھے ہو جاؤ"۔ شہزادے نے سرگوشی کی۔

شہزادے نے یہ احتیاط اس لیے برتی کہ اگر توقتمش کا کوئی آدمی اس کی روانگی دیکھنے کہیں چھپا ہو تو وہ چشتانیہ کو نہ دیکھ سکے۔

چشتانیہ گاڑی کے پیچھے ہو گئی۔ شہزادہ بھی وہیں پہنچ گیا۔ بولا:

"چشتانیہ! میں تو گھبرا گیا تھا۔ میرے آدمی نے مجھے خبر دی تھی کہ یاسو دوبارہ آئی ہے"۔

"میں یاسو کے کپڑے پہن کر آئی ہوں"۔ چشتانیہ نے آہستہ سے کہا:

"میں سمجھ گئی تھی کہ انہیں مجھ پہ یاسو کا شبہ ہوا ہے لیکن مجھے انہیں بتانا اور اپنی شناخت کرانا مناسب نہ معلوم ہوا"۔

"تم نے بہت اچھا کیا"۔ شہزادے نے بھی آواز دبا کر کہا:

"میں تمہیں اسی لیے اندھیرے میں لے آیا ہوں۔ اب بتاؤ کیا ارادہ ہے؟"

"آپ میری مرضی پوچھ رہے ہیں"۔ چشتانیہ لرزتے لہجے میں بولی:

"میں تو اپنی دنیا اجاڑ کے آپ کے پاس آ گئی ہوں۔ جو حکم دیں گے بجا لاؤں گی"۔

"گھبراؤ نہیں چشتانیہ"۔ شہزادے نے سنجیدگی سے کہا:

"میں نے تم کو اپنا کہا ہے۔ تم میری ہو۔ میں تمہاری خوشنودی اور حفاظت میں اپنی جان بھی گنوا دوں گا"۔

"ایسا نہ کہیے شہزادے۔ یہ بدشگونی کے الفاظ ہیں"۔ چشتانیہ نے اسے بزرگانہ نصیحت کی۔

"اچھا تو آؤ میرے ساتھ"۔

شہزادہ اس کو ساتھ لیے ہوئے وہاں پہنچا۔ جہاں دو گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ شہزادے کے کئی سردار بھی وہاں

"تمہارے لیے الگ گھوڑا تیار کرا دیا گیا ہے"۔ شہزادے نے کہا:

"اگر چاہو تو میرے ساتھ گھوڑے پر بھی سفر کر سکتی ہو"۔

"نہیں شہزادے"۔

چشتانیہ نے انکار کر دیا:

"مجھے الگ گھوڑے پر سفر کرنا زیادہ پسند ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ میں آپ سے پیچھے نہیں رہوں گی"۔

"چشتانیہ! تم تو سب سے آگے رہو گی"۔

شہزادے نے سہارا دے کر اسے گھوڑے پر سوار کرایا:

"یاسو نے کہا تھا کہ تمہیں آگے ہی رکھا جائے"۔

"اس کی ضرورت نہیں"۔

چشتانیہ سنبھل کر بیٹھ گئی:

"شاید مجھے گھڑ سواری میں اناڑی سمجھتی ہے اس لیے کہہ دیا ہو گا۔ میں آپ کے گھوڑے سے گھوڑا ملا کر

شہزادے پارس کا خیال ٹھیک تھا۔ توقتمش نے اپنے ایک آدمی کو شہزادے پارس کے پڑاؤ پر بھی بھیجا تھا کہ وہ وقت تک موجود رہے جب تک شہزادہ پڑاؤ سے چلا نہیں جاتا۔ توقتمش کا آدمی شہزادے کے پڑاؤ کے قریب چھپ گیا تھا۔

شہزادے نے توقتمش کے پاس سے آتے ہی روانگی کا حکم دے دیا تھا اور خیمے اکھڑنا شروع ہو گئے تھے۔ توقتمش کا آدمی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جب اندھیرا پھیل گیا تو پڑاؤ کے ذرا اور قریب آ گیا۔ سامان لادنے کے لیے شمعیں روشن کی گئی تھیں لیکن جوں جوں سامان نمٹتا گیا شمعیں بھی گل ہوتی گئیں۔ آخر شہزادے کے خیمے کی لکڑی اور سامان سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں کھڑکھڑائی اور شور مچاتی شمال کی طرف چل پڑیں۔

توقتمش کا آدمی پھر بھی وہاں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک اس کے کانوں میں گاڑیوں کے شور کی آواز آتی رہی۔ اطمینان کر لینے کے بعد کہ شہزادہ پارس پڑاؤ سے دور نکل گیا ہے اور اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے تو واپس توقتمش کے پاس پہنچا۔

توقتمش کو شہزادے کے واپس جانے کی اطلاع سے بڑی مسرت ہوئی۔ اس نے اپنے خیال میں شہزادے کو

خوب ذلیل کیا تھا۔ اسے اب کوئی دھڑکا یا خوف نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ چشتانیہ کو اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔

اس نے چشتانیہ کے حسن و جمال اور رقص کی بہت تعریف سنی تھی۔ اس نے سوچا کہ شہزادے پار بر کو شکست دینے کی خوشی میں کیوں نہ جشن منایا جائے اور اس بہانے چشتانیہ کے رقص کے کمال سے بھی محظوظ ہوا جائے۔ اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو بس شہزادے کو شکست دینا تھی اور اس میں وہ کامیاب رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر چشتانیہ اس کے گلے پڑ ہی گئی تو وہ اسے اپنی کنیزوں میں داخل کر لے گا اور اس کی کنیزوں میں ایک کنیز کے اضافے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔

توفتمش کے چار ذاتی محافظ شمعیں اٹھائے ہوئے چشتانیہ کو لینے اس خیمے پر پہنچے جہاں وہ قید تھی۔ ان کو چشتانیہ کے خیمے پر پہرہ دینے والے سوار پہچانتے تھے، شاہی محافظ ہونے کی وجہ سے ان کا مرتبہ سواروں سے بلند تھا۔ سواروں نے فوراً انہیں سلام کیا اور آنے کا سبب پوچھا۔ انہیں بتایا گیا کہ حاکم کریمیا نے چشتانیہ کو فوراً طلب کیا ہے۔ چشتانیہ کے پہرے داروں کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ ان میں سے ایک شمع لیے ہوئے خیمے کے دروازے پر پہنچا اور تحکمانہ لہجے میں بولا:

"چشتانیہ باہر آؤ۔ حاکم کریمیا نے تمہیں طلب کیا ہے۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر خیمے کا پردہ اٹھا اور یاسو باہر آئی۔ یاسو کو دیکھ کر پہرے دار گھبرا گیا۔ اس نے شمع کو چہرے کے بالکل قریب کر دیا اور اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

"کیا گھور گھور کر دیکھ رہے ہو۔ کیا میں کوئی تماشا ہوں؟" یاسو کمر پہ ہاتھ رکھ کر کڑک کر بولی۔

"تم...... تم ہو...... مگر وہ...... وہ" پہرے دار بدحواس ہو گیا۔

"کیا تم تم...... وہ وہ...... لگا رکھی ہے۔" یاسو دراکڑ گئی۔

حاکم کریمیا کے محافظ جو ذرا دور کھڑے تھے وہ یہ تو تو میں میں سن کر شمعیں لیے قریب آ گئے۔

"تم نہیں۔ چشتانیہ کو باہر بھیجو۔" پہرے دار نے سنبھل کر اپنی آواز میں رعب پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"چشتانیہ اندر نہیں ہے۔" یاسو نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔

"اندر نہیں ہے تو پھر کہاں گئی؟"

"اپنے باپ کے پاس گئی ہے۔"

"تو جھوٹ بول رہی ہے۔" پہرے دار چیخ کر بولا۔ پھر شاہی محافظوں کو دیکھتے ہوئے کہا:

"صاحبو۔ یہ جھوٹی ہے۔ چشتانیہ اندر ہے۔ آپ اندر چل کر اسے پکڑ لیجیے۔"

...ظوں کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔ انہیں تو چشتانیہ چاہیے تھی۔ وہ بے دھڑک خیمے کے اندر گھس گئے۔ ...ظوں کا ...رہا تھا۔ محافظوں نے خیمے کا سامان الٹنا پلٹنا شروع کر دیا۔ تمام سامان خیمے میں بکھر گیا مگر چشتانیہ ...

...ہمیں چشتانیہ چاہیے۔" ایک محافظ نے خیمے کے پہرے داروں کو مخاطب کیا:

"...تانیہ جہاں سے بھی ہو پیدا کرو۔ ورنہ تمہاری گردنیں اڑا دی جائیں گی۔ یہ حاکم کریمیا کا حکم ہے۔"

...ے دار ...کو یاسو کی خیمے میں موجودگی سے کچھ شبہ تو پڑ گیا تھا لیکن شبہ کے اظہار سے وہ خود مجرم بن جاتے ...

...ے غلط تاویلوں کا سہارا لینا شروع کیا۔

...پہرے دار نے یاسو کی گردن پکڑ لی اور چیخ کر بولا:

"...ہا ہا بتا چشتانیہ کو کہاں چھپایا ہے، ورنہ میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔"

...نے واقعی یاسو کا گلا دبانا شروع کر دیا تھا اور اس غریب کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ ایک محافظ کو ...گیا۔ اس نے دھکا دے کر اسے یاسو سے الگ کیا۔

"...تانیہ کہاں ہے لڑکی؟" محافظ نے نرمی سے پوچھا:

"...ہمیں چشتانیہ چاہیے۔ تجھے کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"...بتا تو رہی ہوں۔" یاسو گلا سہلاتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں بولی:

"...تانیہ مجھے خیمے میں بٹھا کر باپ سے ملنے گئی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ حاکم کریمیا نے اسے باپ سے ملنے کی ...ہے۔ بس آتی ہی ہو گی۔ ذرا دیر کے لیے کہہ کر گئی ہے۔ یہ تو خواہ مخواہ میرا گلا دبا رہے ہیں۔ شرم نہیں ...ہاتھ اٹھاتے ہوئے"۔

...سسکیاں لینے لگی۔

...نے چشتانیہ کو فرار ہونے کا مشورہ دیا تھا تو جانتی تھی کہ جب بات کھلے گی تو ساری مصیبت اسی پر آئے گی ...سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں لیکن چشتانیہ کو فرار کرانے کا یہی طریقہ تھا کہ یاسو اسے اپنے کپڑے پہنا کر ...وقع فراہم کرے۔ اس نے یہ مصیبت خود مول لی تھی۔ وہ چشتانیہ کی عزیز ترین سہیلی تھی اور اسے دل سے ...شہزادے کے پڑاؤ سے گاڑیوں کی روانگی کا شور بھی سنا تھا اور اپنی کامیابی پر خوش بیٹھی تھی کہ وہ بلا ...صبح سے پہلے امکان نہیں تھا۔ وہ پھر بھی حوصلے سے کام لے رہی تھی اور گفتگو کو زیادہ سے زیادہ ...کوشش کر رہی تھی تاکہ شہزادہ اور چشتانیہ ان لوگوں کی پہنچ سے دور نکل جائیں۔

...سسکیاں بھر چکی تو ایک محافظ نے پوچھا: "چشتانیہ کا باپ کہاں رہتا ہے؟"

"سردار۔ مجھے کیا پتہ کہ اس کا باپ کہاں ہے؟"

یاسو نے انہیں اور الجھانے کی کوشش کی:

"اس کا گھر تو یہی خیمہ ہے۔ چشتانیہ اور اس کا باپ اسی میں رہتے تھے لیکن اسے آپ کے بار
تھا جب سے اس کا کوئی پتہ نہیں۔ ہم کو تو بس یہی معلوم ہے کہ چشتانیہ کے باپ نے آپ کے بار
چشتانیہ کو فروخت کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کے بادشاہ کے پاس ہو اور چشتانیہ اس سے ملنے وہیں گئی

"یہ لڑکی بہت باتونی معلوم ہوتی ہے۔" ایک محافظ نے جھنجھلا کر کہا:

"اس کے ساتھ سر کھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ چشتانیہ کے باپ کا پتہ لگاؤ اس کے پاس چلیں۔"

ایک محافظ ان سے دور کھڑا تھا، قریب آ کر بولا:

"مجھے معلوم ہے اسے کس خیمے میں رکھا گیا ہے۔ میں نے کچھ دیر وہاں پہرہ دیا تھا۔ م
پہنچا سکتا ہوں۔"

محافظ تمام پہرے داروں کو ساتھ لے کر چشتانیہ کے باپ کے خیمے کی طرف چل دیے۔

یاسو چیخ کر بولی:

"چشتانیہ مل جائے تو اس سے کہنا کہ جلدی واپس آ جائے۔ میں اکیلے بیٹھے بیٹھے گھبرا گئی ہوں
خیمے میں اکیلی ہے اور میرا بھائی بیمار ہے۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے۔"

"جہنم میں جا تو لڑکی!"

ایک محافظ کو غصہ آ گیا:

"تو نے تو بک بک کر کے دماغ چاٹ لیا ہے۔"

یاسو نے موقع غنیمت جانا اور اپنے خیمے کی طرف چل پڑی۔

چشتانیہ کے باپ کے خیمے میں نیا جھگڑا ہو گیا۔ اس کے خیمے پر سخت پہرہ لگا تھا۔ ایک محافظ
وہاں کے پہریداروں سے بڑے رعب سے کہا:

"چشتانیہ کو اندر سے بلاؤ۔ ہم اسے ساتھ لے جائیں گے۔"

"اندر سے کوئی باہر نہیں آ سکتا۔" ایک پہریدار نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"پھر ہم خود اندر جا کر اسے پکڑ لائیں گے۔"

"خیمے کے اندر بھی کوئی نہیں جا سکتا۔" پہریدار نے صاف انکار کر دیا۔

"ہم شاہی محافظ ہیں۔ کیا تم ہمیں پہچانتے نہیں؟"

دار نے بھی تلخی سے جواب دیا:

ہماری حفاظت میں دیا گیا ہے اور کریمیا کے حاکم کا حکم ہے کہ نہ کوئی خیمے کے باہر آنے پائے اور نہ
نے دیا جائے۔ ہم اندر جانے کی کسی کو اجازت نہیں دے سکتے۔"

اور اس کے ساتھ آنے والے پہریدار تذبذب اور الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ محافظوں میں ایک
نے خیمے کے محافظ کو سمجھانے کے لیے کہا:

ساتھیو۔ ہم اور تم دونوں ہی کریمیا کے حاکم کے نمک خوار ہیں۔ تمہیں اس خیمے کی حفاظت سپرد ہے اور
نیہ کو لینے بھیجا ہے۔ ہم چشتانیہ کے خیمے پر گئے تھے۔ وہاں کے پہریداروں نے بتایا ہے کہ چشتانیہ
نے اس خیمے میں آئی ہے۔ یقین نہ ہو تو ان پہریداروں سے پوچھ لو۔"

یدہ آدمی نے چشتانیہ کے خیمے کے پہریداروں کی طرف اشارا کیا:

ں اس بات کی تصدیق کریں گے کہ چشتانیہ اپنے باپ سے ملنے آئی ہے۔"

پہریدار بظاہر اس عمر رسیدہ محافظ کی باتیں بڑے غور سے سننے لگے لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا
ہے۔

بعد عمر رسیدہ آدمی نے پوچھا:

نے کیا فیصلہ کیا۔ امید ہے کہ تمہیں ہماری باتوں پر اعتبار آ گیا ہوگا۔ وقت بہت گزر چکا ہے۔ حاکم ہمارا
الگے۔ تم ہمیں اندر جانے دو یا پھر آواز دے کر چشتانیہ کو بلا دو۔ ہم اس سے خود نمٹ لیں گے۔"

ران نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

بھائیو، کچھ تو جواب دو۔" عمر رسیدہ محافظ نے ملتجیانہ لہجے میں کہا:

ا کام نہیں ہے۔ ہم بھی حاکم کے حکم سے آئے ہیں۔"

یا جواب چاہتے ہیں آپ لوگ......؟" پہریدار ترشی سے بولا:

دیا کہ نہ کوئی اندر جا سکتا ہے اور نہ باہر نکل سکتا ہے۔ جب تک حاکم خود ہمیں حکم نہ دے گا، ہم
اندر نہ جانے دیں گے۔"

ں کو غصہ آ گیا۔ انہیں یہ زعم تھا کہ وہ حاکم کریمیا توختمش کے ذاتی محافظ ہیں۔ انہیں چشتانیہ کے حاصل
ائی۔

زبردستی اندر جانے لگے۔ ایک محافظ نے تلوار کھینچ لی۔

ری انہی کی طرح ابھڈ مغل تھے۔ وہ بھی تاؤ میں آ گئے اور سب نے تلواریں نکال لیں۔

ایک پہریدار بولا:

"جس نے اندر جانے کی کوشش کی اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔"

دونوں طرف سے تلواریں بلند ہوئیں اور قریب تھا کہ وہ ٹکرا کر ایک دوسرے کا خون پیتیں کہ محافظ نے ایک بار پھر دخل دیا۔ اس نے پہریداروں کو مخاطب کیا:

"جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی اپنی تلواریں نیام میں کر لو۔ یہ کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں کہ ایک مغل دوسرے مغل کا خون بہائے۔"

عمر رسیدہ مغل کی یہ بات سب کی سمجھ میں آئی۔ انہوں نے تلواریں نیام میں ڈال لیں۔

بوڑھے محافظ نے پوچھا:

"پہریدار دوستو۔ تمہارا اعتراض یہ ہے کہ حاکم کریما کے حکم کے بغیر تم کسی کو اندر جانے نکلنے کی اجازت دو گے؟"

"ہاں ہاں۔ بالکل یہی۔" ایک پہریدار نے کہا۔

"مگر یہ تو سوچو دوستو۔"

بوڑھے نے انہیں سمجھایا:

"حاکم کریما خود تو چل کے یہاں نہیں آئے گا۔ وہ کسی کے ذریعے اپنا حکم بھیجے گا۔ اب میں نے چینتانیہ کو لانے کا حکم دیا ہے۔ وہ اس خیمے میں موجود ہے۔ ہم اسے حاکم کریما کے حکم سے"

"تم کچھ بھی کہو مگر ہم کسی کو اندر نہیں جانے دیں گے۔" پہریداروں نے ان کی ایک نہ سنی تیار ہو گئے۔

آخر بوڑھے محافظ نے پہریداروں کو ایک بات پر راضی کر لیا۔ طے یہ ہوا کہ ایک محافظ کے پاس جا کر حالات سے آگاہ کرے اور اگر حاکم اجازت دے تو محافظ چینتانیہ کے باپ کے پکڑیں۔

تو قتمش نے یہ باتیں سنیں تو غصے سے بھنا گیا۔ اس نے چیخ کر پوچھا:

"چینتانیہ کے خیمے پر پہرہ تھا پھر وہ باپ کے پاس کیسے پہنچ گئی؟"

"پتہ نہیں حاکم۔" ساتھ آنے والے محافظ نے کہا:

"پہرے داروں نے ہمیں بتایا ہے کہ چینتانیہ اپنے باپ سے ملنے گئی ہے اور اسے اجازت دی ہے۔"

کس نے اجازت دی ہے۔ کون کہتا ہے۔ اسے لاؤ میرے سامنے۔" تو قتمش شیر کی طرح غرایا۔

"اے حاکم! جو پہریدار چینتانیہ کے باپ کے خیمے پر کھڑے ہیں انہوں نے بتایا تھا۔" محافظ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ چینتانیہ کے خیمے پر اب کوئی پہرہ نہیں؟" تو قتمش نے چیخ کر پوچھا۔

"اے حاکم! ہم نے اس خیمے کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔"

محافظ نے اپنی کارکردگی بیان کرنا شروع کی:

"ایک ایک سامان الٹ دیا۔ صندوق بھی کھول کر دیکھ لیے۔ چینتانیہ وہاں نہیں تھی۔ اس کی سہیلی نے تصدیق کی کہ چینتانیہ اپنے باپ سے ملنے گئی ہے۔"

"کون سہیلی۔ کس کی سہیلی؟"

تو قتمش غصے میں بل کھاتا ہوا کھڑا ہو گیا:

"ہم نے حکم دیا تھا کہ چینتانیہ کو کسی سے نہ ملنے دیا جائے۔ پھر اس کی سہیلی اس کے پاس کیوں گئی اور چینتانیہ کو باپ کے پاس کیوں جانے دیا گیا۔ پہریداروں کو بلاؤ۔ ہم انہیں قتل کرا دیں گے۔"

محافظ گھبرا کے مڑا اور خیمے کے دروازے کی طرف چلا۔ تو قتمش کو کچھ خیال آیا۔ اس نے محافظ کو روک کر پوچھا:

"کیا تجھے یقین ہے کہ چینتانیہ اپنے باپ کے پاس ہے؟"

"حضور سب یہی کہتے ہیں۔"

پھر محافظ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے پہریدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"یہ اس خیمے کا پہریدار ہے جہاں چینتانیہ کا باپ قید ہے۔ اسے معلوم ہو گا؟"

"کیا تم نے چینتانیہ کو خیمے کے اندر جاتے دیکھا تھا؟"۔۔۔۔ تو قتمش نے پہریدار سے کڑکتی آواز میں دریافت کیا۔

"نہیں۔ میں نے نہ تو چینتانیہ کو دیکھا ہے اور نہ اس کے باپ کو۔" پہریدار نے سادگی سے کہا:

"ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ اس خیمے کے اندر نہ کسی کو جانے دیا جائے اور نہ اندر سے کوئی باہر آ سکے۔ ہم اس حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ اس وقت تک سوائے شاہی محافظوں کے اور کسی نے خیمے کے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ آپ کا حکم ہو تو ہم محافظوں کو اندر جانے دیں گے۔"

"تم سب بے وقوف ہو۔"

تو قتمش مضمحل ہو کر بیٹھ گیا:

"کسی کمبخت کو یہ نہیں معلوم کہ چیشتانیہ اپنے باپ کے خیمے میں ہے بھی یا نہیں اور جھگڑا اس بات پر ہوا خیمے میں کسی کو جانے دیا جائے یا منع کر دیا جائے۔ جاؤ دور ہو جاؤ ہماری نظروں سے۔ چیشتانیہ جہاں بھی ہو اسے لاؤ۔ ورنہ ایک ایک کا دماغ درست کر دیا جائے گا اور ہاں۔ چیشتانیہ کی سہیلی کو بھی پکڑ کر لے آؤ۔"

محافظ اور پہرے دار دونوں سر پہ پیر رکھ کے بھاگے۔ چیشتانیہ کے باپ کے خیمے پر سب ان کی ڈیوٹی کر رہے تھے۔ انہیں حاکم کر میا کا حکم سنایا گیا تو ان کے حواس جاتے رہے۔ جب سے سب ایک ساتھ نیچے پر گر چیشتانیہ کا باپ ایک طرف پڑا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ خیمے کے باہر ہستہ موجود ہیں لیکن باہر جھانکنے اور صورت حال معلوم کرنے کی اسے اس میں ہمت نہ تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے نکالا تو کہیں کوئی اور مصیبت نہ کھڑی نہ ہو جائے۔

مغلوں نے اندر جاتے ہی سامان الٹنا پلٹنا شروع کر دیا۔ چیشتانیہ کا باپ گھبرایا ہوا حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس خیمے میں کوئی سامان نہ تھا۔ پانچ منٹ میں پورے خیمے کی تلاشی ہو گئی۔ مغلوں کے ہاتھ چیشتانیہ نہ آسکی۔

ایک مغل نے بڑھ کر چیشتانیہ کے باپ کی داڑھی پکڑ لی۔ غصے سے بولا:

"بتا بڈھے! چیشتانیہ کو کہاں چھپایا ہے ورنہ تیری داڑھی اکھاڑ پھینکوں گا؟"

چیشتانیہ کا باپ داڑھی کھینچے جانے سے چیخنے لگا:

"مجھے چھوڑ دو۔ میں نے چیشتانیہ کو نہیں چھپایا۔ وہ تو اس خیمے میں آئی ہی نہیں۔ اسے تو تم نے گھر میں...

"تو مکار ہے۔ جھوٹا ہے۔" ایک مغل گرجا:

"چیشتانیہ کی سہیلی نے بتایا ہے کہ وہ تیرے پاس آئی ہے۔ کہاں ہے وہ۔ نکال اسے جہاں چھپایا ہے۔"

"مجھے نہیں پتہ۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں بے گناہ ہوں۔"

چیشتانیہ کا باپ درد کی شدت سے چلانے لگا۔ پھر وہ اک دم چپ ہو گیا اور اس کا سر ڈھلک کر داڑھی پکڑنے والے کے ہاتھوں سے ٹکرایا۔ اس نے گھبرا کر داڑھی چھوڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی چیشتانیہ کا باپ ایک طرف زمین پہ گر پڑا۔

"کہیں مر تو نہیں گیا؟" ایک مغل بولا:

"اگر مر گیا تو حاکم کو کیا جواب دیں گے؟"

داڑھی پکڑنے والا مغل فوراً جھک کر اس کی سانس دیکھنے لگا۔ سانس آہستہ تھی مگر چل ضرور رہی تھی۔

"مرا نہیں۔ بے ہوش ہو گیا ہے۔"

مغل نے اطمینان کا سانس لیا۔

...چیشتانیہ اس خیمے میں بھی نہیں ملی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ ابھی تک محافظوں اور پہریداروں میں ان بن تھی۔ وہ ...سے بولتے نہیں تھے لیکن مصیبت آئی تو سب کے سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور صلاح مشورہ کرنے لگے۔ ...نے حکم دیا تھا کہ چیشتانیہ کو جہاں اور جس طرح ہو سکے وہ پکڑ کے ان کے حوالے کرے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ...وں کے پورے پڑاؤ کی تلاشی لی جائے۔ ممکن ہے کہ چیشتانیہ کسی خیمے میں چھپی ہوئی مل جائے۔

...پھر درجنوں شمعیں ایک ساتھ جل گئیں۔ خانہ بدوشوں میں شور پڑ گیا۔ یہ لوگ ایک ایک خیمے میں گھستے اور سامان کو ...کر چیشتانیہ کو ڈھونڈنے لگے۔ شاہی محافظ چیشتانیہ کو نہ پہچانتے تھے۔ انہوں نے خانہ بدوشوں کی تمام لڑکیوں کو پکڑ کے ...اکٹھا کر لیا۔ پھر پہریداروں سے ایک ایک کی شناخت کرائی۔ کئی لڑکیوں پر شبہ کیا گیا۔ انہیں خوب مارا پیٹا گیا کہ وہ ...ہونے کا اقبال کر لیں۔ وہ لاچار پٹتی رہیں اور دہائیاں دیتی رہیں۔ لڑکیوں کے ماں باپ خوشامدیں کرتے تھے مگر ...ایک نہ سنتے۔ گھنٹوں انہیں مارتے رہے۔

یہ ہنگامہ رات گئے شروع ہوا تھا اور اب دن ہو گیا تھا لیکن محافظ اور پہرے دار اب تک تلاشی لینے اور مار پیٹ ...میں مصروف تھے۔ ان کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ خالی ہاتھ کس منہ سے حاکم کے پاس جائیں۔ وہ اس لیے اور پریشان تھے ...چیشتانیہ کی سہیلی بھی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ وہ مل جاتی تو شاید ان کی بچت ہو جاتی لیکن سہیلی تو اس طرح غائب ہوئی تھی ...جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

○

یاسو چیشتانیہ کے پاس گئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ جب وہ واپس پہنچی تو اس کی ماں نے اسے خوب ڈانٹا۔ یاسو نے ...جواب نہ دیا۔ بھائی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بخار سے تپ رہا تھا۔ یاسو وید کے پاس سے دوا لانے کے لیے ...جانے لگی تو ماں نے منع کیا:

"رات کا وقت ہے وید سو گیا ہو گا۔"

...یاسو نہ مانی اور دوا لینے چلی گئی۔

...وید واقعی سونے کی تیاری کر رہا تھا مگر یاسو کو دیکھ کر رک گیا اور جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی چند گولیاں ...اس کے حوالے کر دیں۔

...یاسو خیمے میں واپس آئی۔ بھائی کو پانی کے ساتھ دو گولیاں کھلائیں اور سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔

گولیاں کھانے سے بھائی کا بخار کچھ کم ہو گیا۔ یاسو کی ماں ایک طرف کونے میں لیٹ گئی لیکن یاسو کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ طرح طرح کے خیالات اسے گھیرے ہوئے تھے۔ چشمانیہ کو روانہ کیے ہوئے اسے کئی گھنٹے ہو چکے تھے لیکن خطرہ ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ بات کسی حد تک کھل چکی تھی اور چشمانیہ کی تلاش جاری تھی۔

وہ انہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ باہر شور ہوا۔

اس نے خیمے سے جھانک کر دیکھا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ اس نے ایک آدمی سے اس افراتفری کی وجہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کریمیا کے حاکم نے تمام خیموں کی تلاشی کا حکم دیا ہے اور اس کے سپاہی خیموں کا سامان باہر پھینک رہے ہیں اور جوان لڑکیوں کو پکڑا جا رہا ہے۔

یاسو کو خطرہ محسوس ہوا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ پکڑی گئی تو خیر نہیں۔ وہ پلٹ کے خیمے میں آئی۔ ایک چادر سر پر ڈال کے باہر نکلی۔ پڑاؤ سے کچھ ہی دور اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ یاسو نے ادھر ہی کا رخ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی پہاڑیوں تک پہنچ گئی۔ وہ ایک اونچی جگہ بیٹھ گئی۔ یہاں سے پڑاؤ صاف نظر آ رہا تھا۔ سینکڑوں مشعلیں جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

یاسو تمام رات پہاڑی پر بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ سویرا ہو گیا۔ لیکن پڑاؤ میں جلنے کی اس کی ہوئی۔ دوپہر کے وقت اس نے دیکھا کہ کریمیا کے تمام سوار اس طرف جا رہے ہیں جدھر شہزادہ پارس اور گئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ حاکم کریمیا شہزادے کے تعاقب میں جا رہا ہے۔

یاسو کو قدرے اطمینان ہوا۔ کیونکہ شہزادہ پارس اس وقت تک اتنی دور نکل چکا ہو گا کہ یہ لوگ پا سکیں گے۔

جب کریمیا کا لشکر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے پلٹ کر پڑاؤ کی طرف دیکھا۔ اسے اب بھی افراتفری نظر آئی۔ لوگ جلدی جلدی خیمے اکھاڑ رہے تھے اور سامان اونٹوں اور گاڑیوں پر لادا جا رہا تھا۔

یاسو پہاڑی سے اتر کر سیدھی اپنے خیمے پر پہنچی۔ اس کی ماں یا تو اسے گالیاں دے رہی تھی یا اب وہ ڈر کر اس سے لپٹ گئی۔ اس کی ماں نے بتایا کہ اس نے صبح کو یاسو کو خیمے میں موجود نہ پایا تو یہ خیال کیا کہ کسی مغل کے ساتھ بھاگ گئی ہے اس لیے وہ اسے گالیاں دے رہی تھی۔

یاسو کی ماں نے اسے یہ بھی بتایا کہ کریمیا کا حاکم شمال میں خاقان سے جنگ کرنے گیا ہے اور ہم لوگ یہاں سے کسی اور جگہ لے جا رہے ہیں تاکہ اس جنگ سے محفوظ رہیں۔

یاسو کا باپ مر چکا تھا اور اس کا چچا ان ماں بیٹے اور بیٹی کی پرورش کر رہا تھا۔ وہ اپنا سامان باندھ کر جب فارغ ہوا تو بیوہ بھاوج کے پاس آیا۔ یاسو نے چچا کی مدد سے اپنا سامان باندھا اور گاڑی پر بار کر دیا۔

گاڑیاں تیار ہوئیں تو سردار نے عورتوں کو گاڑیوں میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ مرد کچھ پیدل کچھ گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور پھر خانہ بدوش اپنے روایتی سفر پر روانہ ہوئے۔ ان کا رخ شمال یا جنوب کی طرف ہونے کے بجائے مغرب کو تھا۔

ان کے سردار نے اعلان کرا دیا تھا کہ مغلوں میں خانہ جنگی شروع ہونے والی ہے اس لیے عام راستوں سے ہٹ کر مغرب کی طرف سفر کیا جا رہا ہے تاکہ قافلہ جنگ کی ہلاکتوں سے محفوظ رہے۔

○

حاکم کریمیا توقتمش کو چشمانیہ کی زیادہ فکر نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے چشمانیہ کے باپ کو مجبور کر کے چشمانیہ کے لیے اپنے حق میں فیصلہ کرا لیا ہے اس لیے چشمانیہ کا ناراض ہو کر کہیں چھپ جانا ایک فطری ردعمل تھا چونکہ اب شہزادہ پارس واپس جا چکا تھا اور چشمانیہ کا باپ بھی قید میں تھا اس لیے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکا کہ یہ اس وقت گرفتار نہ ہو سکی تو اسے دن میں با آسانی تلاش کر لیا جائے گا اس نے یاسو کی گرفتاری کا حکم بھی دے دیا تھا۔

خیال یہ تھا کہ یاسو کو اگر چشمانیہ کے بارے میں کچھ بھی علم ہے تو وہ حاکم کریمیا کے سامنے جھوٹ نہ بول سکے گی اور اس کے ذریعے چشمانیہ کو پکڑا جا سکے گا۔

توقتمش سونے کے لیے چلا گیا مگر طبیعت کچھ بے چین سی تھی اس لیے اسے دیر تک نیند نہ آ سکی۔ رات کے پچھلے حصے میں وہ سویا تو صبح کو دیر سے آنکھ کھلی۔ اس نے سب سے پہلے چشمانیہ کے بارے میں پوچھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ خانہ بدوشوں کے تمام خیموں میں اسے تلاش کر لیا گیا لیکن وہ کہیں نہ مل سکی۔ اس کے ساتھ ہی جب اسے یہ بھی بتایا گیا کہ چشمانیہ کی سہیلی یاسو بھی رات سے غائب ہے تو وہ غصے سے جل اٹھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ چشمانیہ اور یاسو دونوں کسی سازش کے تحت پڑاؤ سے غائب ہوئی ہیں اور شہزادے نے اسے روانگی کا فریب دے کر چشمانیہ کو اڑا لیا ہے۔

زیادہ غور کرنے پر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ شہزادے نے اپنے سواروں کو روانہ کر دیا ہو گا اور خود پڑاؤ کے پاس چھپ گیا ہو گا اور موقع پاتے ہی چشمانیہ اور اس کی سہیلی کو لے گیا ہو گا۔ اس نے اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا کہ چشمانیہ ابھی زیادہ دور نہ جا سکے گی اور اگر اس کا پیچھا کیا جائے تو اسے آسانی کے ساتھ پکڑا جا سکتا ہے۔

توقمتش غصے سے جلا بھنا خیمے سے باہر آیا اور اس نے فوراً روانگی کا حکم دیا۔ حکم دے کر وہ خود فوراً
پچاس سواروں کو ساتھ لے کر شمالی راستے پر چل پڑا اور حکم دیتا گیا کہ اس کا لشکر تیار ہو کر اس تک
توقمتش بڑی تیزی سے گھوڑا اڑاتا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ شہزادے
اس کی روانگی کے دوران تقریباً دس گھنٹے کا فرق تھا اور دس گھنٹے میں شہزادہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہو

شہزادہ پارس اپنی محبوبہ چشتانیہ کو لے کر خود بھی اتنی ہی تیزی سے چلا تھا بلکہ تعاقب کے خطرے
اس کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔ اس نے سامان کی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور برق رفتاری سے اپنے
کی طرف بڑھ رہا تھا۔

صبح ہوتے ہوتے شہزادہ دشمن کی سرحد سے نکل کر اپنے علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں اسے اپنے
بھی شمال سے آتے ہوئے ملے۔ ان سواروں کو اس کے باپ خاقان ارس خان نے یہ پیغام دے کر بھیجا تھا
ہو کے استقبال کے لیے خود بھی ایک لشکر لے کر جنوب کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔

اس اطلاع سے شہزادے کو بڑا اطمینان ہوا لیکن اس کی چھٹی حس ابھی تک خطرے کا اعلان کر رہی
اس نے پڑاؤ کرنے کے بجائے اپنا سفر اسی تیز رفتاری سے جاری رکھا اور دوپہر ڈھلنے تک مسلسل سفر
لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ گھوڑے مسلسل سفر کرنے سے تھک چکے ہیں اور انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ شہزادے
کا دل تو نہ چاہتا تھا لیکن اسے مجبور ہو کر پڑاؤ کا حکم دینا پڑا۔

سامان پیچھے رہ گیا تھا اس لیے انہیں درختوں کے سائے میں ٹھہرنا پڑا۔ گھوڑوں کو چرنے کے لیے
گیا۔ شہزادہ پارس اور چشتانیہ قریب بنے اس چشمے کے کنارے آ بیٹھے اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ شہزادہ
چشتانیہ دونوں بہت خوش تھے۔ دونوں کو اطمینان تھا کہ وہ خطرے سے دور نکل آئے ہیں اور اب ان کے درمیان
کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔

شہزادہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ چشتانیہ خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ اسے اپنا قبیلہ چھوڑنے کا کوئی غم
کیونکہ اب وہ خاقانِ شرق و غرب کی بہو، ولی عہدِ سلطنت کی بیوی بننے والی تھی۔ اسے اپنے باپ کا بھی خیال نہ تھا
اس نے چشتانیہ کو توقمتش کے حوالے کرنے کا جو اعلان کیا تھا اس سے وہ بہت دلبرداشتہ تھی اور اسے اپنے باپ

باپ کی اور وعدہ خلافی پر بہت افسوس تھا۔

شام کے وقت سامان کی گاڑیاں پہنچ گئیں۔ خیمے نصب کر دیے گئے۔ سب سے پہلے شہزادے کا خیمہ لگایا
گیا۔ یہ دونوں خیمے میں آ گئے۔

پڑاؤ میں جلدی جلدی کھانا تیار کیا گیا۔ صبح سے کسی نے کچھ نہ کھایا تھا اس لیے سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔
چشتانیہ کا شاہی کھانا کھانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس کے لیے یہ کھانا نیا تھا۔ شہزادہ کھانے کے دوران ہر کھانے
کا نام بتاتا جاتا اور چشتانیہ مزے لے لے کر کھاتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ پھر باتیں کرنے لگے۔ ادھر ادھر کی باتیں، ضروری اور غیر ضروری باتیں۔ بے سر و پیر کی
محبت کرنے والی باتیں۔ دونوں کے چہرے مسرت سے چمک رہے تھے۔ چشتانیہ کی روشن آنکھوں اور فطری حیا پر
شہزادہ قربان ہوا جا رہا تھا۔

اسی وقت باہر سے کچھ کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ شہزادے کے خیمے پر دو محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ اس نے
آواز دے کر اندر بلایا۔

محافظ اندر آیا اور جھک کر آداب پیش کیا۔

"یہ شور کیسا ہے؟" شہزادے نے ناگوار لہجے میں پوچھا۔

"سامنے دوسرا خیمہ نصب کیا جا رہا ہے۔" محافظ نے ادب سے جواب دیا۔

"دوسرا خیمہ کس کے لیے؟" شہزادے نے حیرت سے دریافت کیا۔ "ہمارے خیمے کے پاس دوسرا خیمہ کیوں لگایا جا رہا ہے؟"

"وہ خیمہ آپ ہی کے لیے نصب ہو رہا ہے شہزادے بہادر۔"

"مگر ہم نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔"

"شہزادے بہادر۔ یہ حکم لشکر کے مولانا نے دیا ہے۔"

"مگر کیوں؟" شہزادہ جھلا کے کھڑا ہو گیا۔

"شہزادے بہادر۔ اس کا تو مجھے علم نہیں۔" محافظ ادب سے بولا۔ "مولانا نے حکم دیا ہے شہزادے کے لیے دوسرا خیمہ لگایا جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ دوسرے خیمے میں تشریف لے جائیں۔"

"نہیں نہیں۔" شہزادہ ترشی سے بولا۔ "دوسرے خیمے کی ضرورت نہیں۔ جا کر کہہ دو کہ ہم اسی خیمے میں رہیں گے۔"

محافظ سر جھکا کر واپس ہونے لگا۔ دو قدم چلا تھا کہ چیشتانیہ کی آواز آئی :

"ٹھہرو محافظ"

چیشتانیہ بھی کھڑی ہو گئی :

"خیمہ لگنے دو اور مولانا کو اطلاع کرا دو کہ شہزادے دوسرے خیمے میں ہی رات گزاریں گے۔ یہ بات تم

طرف سے مولانا سے بڑے ادب سے کہنا"

محافظ قدم بڑھا کر باہر نکل گیا۔

"چیشتانیہ"۔ محافظ کے جانے کے بعد شہزادے نے کہا،

"یہ تم نے کیوں کہا۔ میں اسی خیمے میں رہوں گا۔ آخر اس میں حرج کیا ہے ؟"

"اگر حرج نہ ہوتا تو مولانا کیوں حکم دیتے ؟"

اور چیشتانیہ نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں۔

"ہاں ہاں"۔

شہزادہ بوکھلا گیا :

"لیکن حکم دینے سے پہلے انہیں مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا"۔

"اللہ اور رسول کے حکم کے سامنے بادشاہوں کی مرضی بھی نہیں چلا کرتی"۔ چیشتانیہ سنجیدگی سے بولی :

"میں اور آپ اس وقت تک ایک دوسرے کے لیے غیر ہیں۔ ہمیں الگ الگ خیموں میں سونا چاہیے"۔

"لیکن ہم ایک ہی خیمے میں رہیں گے۔ اسی خیمے میں.... "شہزادے نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

چیشتانیہ نے گھبرا کر شہزادے کو دیکھا :

"شہزادے۔ آپ..... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

پھر شہزادے کو غصے سے گھورتی ہوئی بولی :

"یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنی مرضی سے آپ کے ساتھ آئی ہوں مجھے آپ سے بے انتہا محبت ہے لیکن

مجبور نہیں"۔

یہ کہتے ہوئے چیشتانیہ نے کپڑوں میں چھپا ہوا خنجر کھینچ کے نکالا اور اسے شمع کی روشنی میں چمکاتی

شہزادے سے بولی :

"اگر آپ نے اس خیمے میں رہنے کی کوشش کی تو میں قسم کھاتی ہوں کہ اس خنجر کو خون سے آلودہ کر دوں

گی۔ خواہ وہ خون میرے ہی دل کا کیوں نہ ہو"۔

شہزادہ ایک لمحہ حیرت بھری نظروں سے چیشتانیہ کو دیکھنے کے بعد مسکرایا :

"شاباش چیشتانیہ۔ نیک عورتوں کو اسی طرح اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔ اطمینان رکھو۔ خدا اور رسول ؐ کے حکم کی میں

پابندی کروں گا۔ مولانا کو بھی میں ناراض نہ ہونے دوں گا لیکن رات اس خیمے ہی میں بسر کروں گا۔ تنہا نہیں.....

تم میرے ساتھ یہیں رہو گی"۔

چیشتانیہ کی تیوریاں چڑھ گئیں :

"شہزادے!" وہ تند لہجے میں چیخ کر بولی :

"آپ نے یہ غلطی کی تو یقین کیجیے کہ میں اس خنجر کو اپنے دل میں اتار دوں گی"۔

"اس کی ضرورت پیش نہ آئے گی چیشتانیہ"۔

شہزادہ اب مسکرا رہا تھا اور چیشتانیہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

شہزادے نے ایک بار پھر محافظ کو آواز دی۔ چیشتانیہ نے فوراً خنجر چھپا لیا۔ شہزادے نے محافظ سے کہا :

"چیشتانیہ کا حکم منسوخ کیا جاتا ہے۔ دوسرا خیمہ ہرگز نہ لگایا جائے"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے چیشتانیہ کو شرارت بھری نظروں سے دیکھا۔ چیشتانیہ کی آنکھوں کی چنگاریاں، شعلوں میں

تبدیل ہو گئی تھیں۔

شہزادے نے بڑی لاپروائی سے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور بولا :

"ایک حکم اور ہے"۔

محافظ واپس ہونے کے لیے مڑ چکا تھا۔ اس کے قدم رک گئے۔ وہ گھوم کر کھڑا ہو گیا :

"وہ حکم یہ ہے"۔

شہزادے نے کنکھیوں سے چیشتانیہ کو دیکھا :

"حکم یہ ہے کہ مولانا سے درخواست کی جائے کہ وہ چند سرداروں کو اپنے ساتھ لے کر اس خیمے میں تشریف لائیں۔

ہمارا اور چیشتانیہ کا نکاح اسی وقت ہو گا اور ہم دونوں اسی خیمے میں رات بسر کریں گے"۔

چیشتانیہ اور محافظ کے منہ حیرت سے ایک ساتھ کھل گئے۔

محافظ چلا گیا تو شہزادے پلٹ کر چیشتانیہ کو دیکھا۔ مسکرا کر بولا :

"کہو چیشتانیہ۔ اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔ خنجر کو کسی اہم وقت کے لیے سنبھال کر رکھو"۔

"شہزادے !"

چیشتانیہ کی آواز شدتِ جذبات سے رندھ گئی۔ اس نے خنجر کپڑوں میں چھپا لیا۔

"شہزادے نہیں۔ اب میں تمہارا پارس ہوں"۔

شہزادے نے اسے چھیڑا:

"تمہارا حکم ہو تو اپنے لیے دوسرا خیمہ نصب کروا لوں؟"

چشمانیہ نے لاجواب ہو کر سر جھکا لیا۔

⊙

چنگیز خان کے خاندان کی وہ شاخ جو سب سے پہلے مسلمان ہوئی، وہ سنہری غول کہلاتی تھی۔ اس غول کا پہلا بادشاہ یا خاقان جوجی تھا جو چنگیز خان کا بیٹا تھا لیکن چنگیز خان کے دوسرے بیٹے اسے اپنا بھائی تسلیم نہ کرتے تھے۔ چنگیز خان نے رفع شر کے لیے جوجی خان کو اپنے عروج کے زمانہ میں مغربی ایشیا کا صحرائی علاقہ دے کر اپنی دوسری اولاد سے ہمیشہ کے لیے الگ کر دیا تھا۔ جوجی کی اولاد نے اس ویران صحرا میں اپنی ایک الگ حکومت قائم کر لی جو شمال میں ٹنڈرا اور جنوب میں بحیرۂ کیسپین اور بحیرۂ اسود کے شمال تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرح وسطی ایشیا کے مشرق و مغرب میں مغلوں کی دو زبردست حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ دونوں کے الگ الگ بادشاہ (خاقان) ہوتے۔ مشرقی حکومت کا خاقان قراقرم میں رہتا تھا اور مغربی خاقان نے اپنا صدر مقام دریائے والگا کے مشرقی کنارے پر بنایا تھا۔ چونکہ اسے جوجی کے بیٹے باتو خان نے آباد کیا تھا اس لیے اس کا نام سرائے باتو مشہور ہو گیا۔

سرائے باتو کوئی شہر نہ تھا بلکہ ایک خیمہ بستی تھی جس کے گرد ایک کچا احاطہ بنا دیا گیا تھا۔ یہ لوگ مکان بنانے کے قائل نہ تھے اور خانہ بدوش زندگی گزارتے تھے۔ خاقان باتو خان کے خیمے کے اوپر شناخت کے لیے سنہری پر لگائے گئے تھے اس لیے مغلوں کی یہ شاخ یا قبیلہ سنہری غول کہلاتا تھا۔ جب باتو خان کا چھوٹا بھائی برقائی خان اپنے ایک لاکھ کے لشکر کے ساتھ مسلمان ہوا تو مغلوں میں بڑی تیزی سے اسلام پھیلا۔

ارس خان اور توقتمش اسی سنہری غول سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا موجودہ خاقانِ اعظم ممائی چیما تھا جو سرائے باتو میں رہتا تھا۔ ارس خان تمام شمالی علاقوں کا حاکم تھا اور اس نے بہت طاقت حاصل کر لی تھی۔ خاقان ممائی خان نے خوش ہو کر ارس خان کو خاقانِ شرق و غرب کا خطاب دیا تھا۔ شہزادہ توقتمش، ممائی خان کا بہت قریبی عزیز تھا۔ اس کے پاس کریمیا کی حکومت تھی مگر وہ ارس خان کے علاقے کا بھی دعوے دار تھا کیونکہ ارس خان کے علاقے میں توقتمش کے قبیلے کی کثیر تعداد رہتی تھی۔ ارس خان اور توقتمش کی سرحدیں بھی ملی ہوئی تھیں اس لیے یہ جھگڑا اور بڑھ گیا تھا اور کبھی کبھی

دوبدو جھڑپ بھی ہو جاتی تھی۔

توقتمش پچاس سواروں کے ساتھ بڑے جوش و خروش سے شہزادے پارس کے تعاقب میں جا رہا تھا۔ دوپہر ہونے سے قبل ہی وہ کریمیا کی حد سے نکل کر ارس خان کے علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کا نائب اس کے گھوڑے سے گھوڑا ملا کر چل رہا تھا۔ اس نے توقتمش کو بتایا کہ وہ دشمن کے علاقے میں آ گیا ہے اس لیے رفتار کم کر کے لشکر کے پہنچنے کا انتظار کرے لیکن توقتمش کو شہزادے پر سخت غصہ تھا اور جلد از جلد وہ اس کے پاس پہنچنا چاہتا تھا اس لیے نہ اس نے گھوڑا روکا اور نہ رفتار کم کی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اندھیرا پھیلنے پر اسے مجبوراً رکنا پڑا۔ پھر بھی اس نے اس خیال سے کہ شہزادے پارس نے بھی رات ہو جانے کی وجہ سے ضرور کہیں قیام کیا ہو گا، اپنے دو سوار آگے بھیج دیے تاکہ وہ یہ معلوم کریں کہ پارس خان اس سے کتنے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔

اس تدبیر سے توقتمش کو یہ فائدہ ہوا کہ اس کے جاسوس سوار شہزادے کے پڑاؤ تک نصف شب کے قریب پہنچ گئے۔ کیونکہ توقتمش کی تیز رفتاری کی وجہ سے دونوں پڑاؤ میں نصف منزل سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس کے سوار اچھی طرح دیکھ بھال کر کے اپنے پڑاؤ کی طرف واپس ہوئے اور صبح تک توقتمش کے پاس پہنچ گئے۔

توقتمش کا باقی لشکر بھی رات کو اس سے آ ملا تھا۔ خوش قسمتی سے توقتمش کے لشکر میں ایک ہزار سواروں کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب توقتمش دو ہزار سوار لے کر شہزادے پارس کو روکنے کے لیے کریمیا سے چلا تھا تو احتیاط کے طور پر یہ حکم دے گیا تھا کہ ایک ہزار سوار اس کی کمک کے لیے روانہ کر دیے جائیں۔ اگر پارس سے جنگ ہو جائے تو وہ اسے آسانی سے شکست دے سکے۔ یہ ایک ہزار سوار کریمیا کی سرحد پر اس وقت پہنچے جب توقتمش کا لشکر روانہ ہونے والا تھا۔ پس یہ سوار بھی ساتھ ہو لیے۔ اس طرح توقتمش کے پاس پہنچنے والے لشکر کی تعداد تین ہزار ہو گئی۔

صبح کے وقت جب اس کے جاسوس سوار واپس آ کر اطلاع دی کہ شہزادہ پارس یہاں سے صرف نصف منزل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ اس وقت ارس خان کی سرحد کے اندر تھا لیکن تین ہزار کے لشکر نے اسے تمام خطرات سے بے پروا کر دیا۔ اس نے فوراً روانگی کا حکم دے دیا۔ تجربہ کار نائب نے اسے روکنے کی کوشش کی اور اسے سمجھایا کہ دشمن کے علاقے میں اتنا گھس کر حملہ کرنا عقلمندی نہیں۔ ارس خان کا لشکر گھیرے میں بھی آ سکتا ہے اور اگر خدانخواستہ پسپائی اختیار کرنی پڑی تو کریمیا کی سرحد تک پہنچتے پہنچتے لشکر تباہ ہو جائے گا مگر توقتمش نے کسی کی ایک نہ سنی اور لشکر لے کر روانہ ہو گیا۔

⊙

پہ شہزادے پارس کے پڑاؤ میں بالکل سکون تھا۔ لوگ رات کو اطمینان سے سوتے تھے اور صبح آرام سے اٹھتے تھے۔

شہزادے پارس نے رات کو چشمانیہ سے عقد کر لیا تھا۔ اسی خیمے میں نکاح ہوا تھا اور وہی خیمہ حجلہ عروسی بن گیا تھا۔ شہزادے نے نکاح کے بعد ایک مختصر سی ضیافت بھی کر دی تھی۔ پھر لوگ اپنے اپنے خیموں میں جا کر سو گئے۔ صبح کو شہزادے کو ایک نہایت پُرمسرت خبر سنائی گئی۔

وہ ابھی سو کے اٹھا تھا کہ ایک تیز رفتار قاصد شمال سے اس کے پڑاؤ پہ پہنچا اور فوراً شہزادے سے ملنے کی درخواست کی۔ شہزادے نے اس سے فوراً ملاقات کی۔ کیونکہ شمال سے خبر لانے والا صرف اس کے باپ کا ہو سکتا تھا۔

اس کا خیال صحیح نکلا۔ قاصد نے یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ خاقانِ شرق و غرب ارس خان معہ ایک لاکھ کے اپنی بہو یعنی چشمانیہ کے استقبال کو آ رہا ہے اور وہ آج شام تک یہاں پہنچ جائے گا۔

اس خبر سے شہزادہ بے حد خوش ہوا۔ اس نے قاصد کو انعام دے کر رخصت کیا اور چشمانیہ کے پاس جا کر یہ خوشخبری سنائی۔ چشمانیہ کی خوشی کی بھی انتہا نہ رہی۔ اس کی اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی کہ خاقانِ شرق و غرب اس کے استقبال کو آ رہا تھا۔

پڑاؤ میں بھی اس خبر سے مسرت کی لہر دوڑ گئی اور سب لوگ اپنے خاقان کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

دوپہر کے وقت چشمانیہ اور پارس خیمے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی تھیں کہ باہر سے گھوڑا دوڑانے کی آواز آئی۔ پارس گھبرا گیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر باہر نکلا۔ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا ادھر آ رہا تھا۔ وہ خیمے کے پاس آ کر رکا۔ گھوڑے سے کودا اور پھولی ہوئی سانس کے دوران بولا:

"شہزادے بہادر۔ جنوب... جنوب سے بہت سے سوار ادھر آ رہے ہیں۔"

"سوار؟"

شہزادے کا ماتھا ٹھنکا اور چیخ کر بولا:

"سب کو تیار ہونے کا حکم دو۔"

اتنا کہہ کر شہزادہ تیزی سے اندر گیا اور جسم پہ ہتھیار لگانے لگا:

"وہ لوگ آ گئے چشمانیہ۔"

اس نے چشمانیہ کو خطرے سے آگاہ کیا:

"میں جا رہا ہوں۔ تم بھی تیار ہو کر آ جاؤ۔"

شہزادہ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

چشمانیہ سمجھ گئی کہ جس مصیبت سے نکل کر وہ بھاگی تھی وہ مصیبت پھر نازل ہو گئی۔ اس نے شہزادے سے صبح کہا تھا کہ ہمیں فوراً خاقان کی طرف کوچ کرنا چاہیے لیکن شہزادے نے اسی جگہ ٹھہر کر خاقان کو خوش آمدید کہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"کاش۔ ہم صبح کو آگے بڑھ گئے ہوتے۔" اس نے سوچا اور جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔

اس نے سر کے بالوں کو ایک رومال سے کس کر باندھ لیا۔ ایک سینہ بند خیمہ میں پڑا تھا اسے بھی پہن لیا۔ خنجر کمر میں ہر وقت رہا کرتا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں تلوار پکڑی اور دوسرے میں نیزہ سنبھالتی ہوئی باہر نکلی۔ باہر گھوڑا کھڑا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوئی۔ تلوار کمر میں لگائی اور نیزہ تانے آگے بڑھی۔

حاکمِ کرمیا توقتمش اپنے تین ہزار سواروں کے ساتھ آ پہنچا تھا۔ وہ لشکر کے آگے آگے تھا۔ شہزادے نے پھرتی سے اپنے پانچ سو سواروں کی صفیں ترتیب دے لی تھیں۔ توقتمش اور اس کے لشکر نے دور ہی سے تیر چلانا شروع کر دیے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ شہزادے نے بھی تیروں کا جواب تیروں سے دیا مگر آگے بڑھنے سے گریز کیا۔

توقتمش کا لشکر بڑھتا ہوا پڑاؤ میں داخل ہو گیا۔ تیر کمان بیکار ہو گئے۔ نیزے اور تلواریں نکل آئیں۔ تلوار تلوار سے ٹکرائی اور نیزہ، نیزے سے بھڑ گیا۔ دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ ہر طرف نفسانفسی کا عالم تھا۔ نعرے بلند ہو رہے تھے اور شور و غل سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ چشمانیہ بڑی ہوشمندی سے شہزادے پارس کے شانہ بشانہ مقابلے میں مصروف تھی۔

ایک طرف تین ہزار کا لشکر اور دوسری طرف صرف پانچ سو سوار۔ ایک اور چھ کا مقابلہ تھا لیکن شہزادے کے سوار پہاڑ کی طرح اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ شہزادے پارس کو انہوں نے اپنے حلقے میں لے لیا تھا۔ چشمانیہ اب شہزادے کی پشت کی طرف آ گئی تھی تاکہ پشت پہ ہونے والے حملے کو رد کرے۔

جب لڑائی طول کھینچنے لگی اور توقتمش نے دیکھا کہ پارس کے سواروں کے قدم نہیں اکھڑے تو اس نے دو ہزار سواروں کو ادھر چھوڑا اور ایک ہزار سواروں کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ پیچھے آ کر اس نے ایک لمبا چکر کاٹا اور پھر شہزادے پارس کی پچھلی سمت نمودار ہوا۔ ادھر چشمانیہ موجود تھی۔ اس نے جو توقتمش کو لشکر سمیت پیچھے سے آتے دیکھا تو چلا کر شہزادے کو اس خطرے سے آگاہ کیا لیکن شہزادہ سامنے کی طرف الجھا ہوا تھا۔ اسے پلٹ کر دیکھنے کی مہلت نہ تھی۔

چشتانیہ گھوڑا بڑھا کر شہزادے کے نائب کے پاس پہنچی۔ وہ کچھ دور ایک سو سواروں کا جتھا لیے دشمن کو روکے کھڑا تھا۔

چشتانیہ نے اسے بتایا کہ پشت کی طرف سے حملہ ہو رہا ہے اس کا انتظام کرو۔ نائب اپنے سواروں کو لے کر پلٹا۔ اور آگے بڑھ کر حملے کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس کے سوار کچھ نہ کر سکے اور پسپا ہو کر شہزادے کے قریب پہنچ گئے۔ اب شہزادہ تقریباً چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ شہزادے کے نائب نے اسے میدان سے نکل جانے کا مشورہ دیا۔ پتہ نہیں شہزادے نے میدان چھوڑنے سے انکار کر دیا، یا اسے اتنا موقع ہی نہ مل سکا اور وہ دشمنوں میں گھرتا چلا گیا۔ توقتمش بار بار شہزادے پر یلغار کر رہا تھا مگر شہزادے کے جاں نثار اسے بچا رہے تھے۔

چشتانیہ اپنی اور شہزادے دونوں کی حفاظت کر رہی تھی پھر کسی طرف سے ایک نیزہ آیا اور وہ چشتانیہ کے گھوڑے کی ران میں آویزاں ہو گیا۔ گھوڑا بڑے وحشیانہ انداز میں اچھلا۔ چشتانیہ اچھی شہسوار نہ ہوتی تو گر جاتی۔ وہ مضبوطی سے گھوڑے پر بیٹھی رہی۔ گھوڑا ایک دو بار اچھلنے کے بعد تیزی سے ایک طرف بھاگا اور دشمنوں کی صفوں کو توڑتا ہوا بجلی کی طرح نکل گیا۔ وہ بے تحاشہ بھاگ رہا تھا۔ نیزہ اب تک اس کی ران میں اٹکا ہوا تھا۔ چشتانیہ نے راسیں ڈھیلی کر دی تھیں کیونکہ اس وقت گھوڑے کو روکنا اسے اور غصہ دلاتا تھا اور وہ غصے میں آ کر چشتانیہ کو گرا سکتا تھا۔

زخمی گھوڑا چشتانیہ کو لیے ہوئے پڑاؤ کے قریب جو اب میدان جنگ بنا ہوا تھا، ایک پہاڑی پہ چڑھ گیا۔ اس کی رفتار اب سست ہو گئی تھی۔ شاید وہ تھک گیا تھا یا پھر نیزے کی تکلیف نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ وہ ایک جگہ رک گیا۔ چشتانیہ گھوڑے سے کود کر الگ کھڑی ہو گئی۔

اس پہاڑی کے نیچے جنگ ہو رہی تھی اور میدان جنگ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ چشتانیہ نے ایک ابھری ہوئی چٹان پر کھڑے ہو کر میدان پر نظر ڈالی۔ اس طرف دیکھتے ہی چشتانیہ کا سر چکرانے لگا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اگر وہ چٹان کو پکڑ نہ لیتی تو نیچے گر کر ختم ہو جاتی۔

چشتانیہ نے چند لمحوں بعد آنکھیں کھولیں۔ خود کو سنبھالا اور پھر جھک کر نیچے نظر دوڑائی۔ اس کا خون رگوں میں جمنے لگا۔

دشمن کا ایک سوار اس کے محبوب شوہر شہزادے پارس کا سر نیزے پر اٹھائے ایک دائرے میں چکر لگا رہا تھا۔ دشمن کے تمام سوار اس کے گرد اکٹھے تھے اور فتح کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں سے کود کر جان دے دے لیکن اس نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ اس کے جان دینے سے شہزادہ زندہ تو نہ ہو سکتا تھا۔ پھر اس طرح جان دینا سراسر خودکشی تھی اور مغل خودکشی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اس نے ارادہ بدلا کہ تلوار کھینچ کر دشمن پر حملہ کر دے۔ پھر خیال آیا کہ یہ بھی ایک طرح کی خودکشی تھی۔

چشتانیہ کی آنکھیں خشک تھیں اور طرح طرح کے خیالات نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کر رہی تھی۔ اسی وقت جیسے کسی نے سرگوشی کی:

"انتقام..... انتقام..... جان دینے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اپنے محبوب کی روح کو سکون پہنچانا ہے تو زندہ رہو اور خود کو توقتمش سے انتقام لینے کے لیے تیار کرو..... !"

چشتانیہ کے دل کو سکون سا آ گیا۔ اس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہو گئی:

"میں زندہ رہوں گی..... شہزادے پارس کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے..... توقتمش سے انتقام لینے کے لیے..... !"

نیچے فتح کے نعروں سے پورا میدان گونج رہا تھا۔ چشتانیہ کی نظریں میدان کی طرف تھیں لیکن وہ کچھ نہ دیکھ رہی تھی اور نہ کوئی آواز اس کے کان تک پہنچ رہی تھی۔ وہ گم صم کھڑی تھی۔ وہ اپنے بارے میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ زندگی گزارنے کا طریقہ سوچ رہی تھی۔ انتقام کی تدبیروں پر غور کر رہی تھی۔

پھر فتح کے اس شور میں ایک نیا شور بلند ہوا۔

چشتانیہ نے چونک کر دیکھا۔ شمال کی طرف سے ہزاروں سوار گھوڑے دوڑاتے اور نعرے لگاتے بھاگے آ رہے تھے۔ آگے آگے نیلے اور سفید پرچم بردار تھے۔

"نیلے اور سفید پرچم۔ کہیں یہ نیلے اور سفید غول کا خاقان تو نہیں؟" چشتانیہ نے خود سے سوال کیا۔

اسی وقت اسے ایک سوار نظر آیا۔ اس کے سر پر نیلے اور سفید نمدے کا بنا ہوا ٹوپی نما ایک تاج تھا جس میں موتیوں اور جواہرات کی لڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔

چشتانیہ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

جس وقت توقتمش نے شہزادے پر حملہ کیا تو شہزادے کا ایک سوار فوراً لڑتا ہوا شمال کی طرف چل دیا۔ یہ وہی سوار تھا جس نے شہزادے کو خاقان کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

خاقان ارس خان کو بیٹے اور بہو سے ملنے کا اس قدر اشتیاق تھا کہ وہ بغیر منزل کیے بڑھتا آ رہا تھا اور آج ہی شہزادے کے پڑاؤ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پھر جب میدان جنگ سے گئے ہوئے سوار نے اس کے پاس پہنچ کر بتایا کہ ریبک کے حاکم نے شہزادے کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا ہے تو اس نے اور اس کے لشکر نے راسیں ڈھیلی کر دیں اور گھوڑوں کو اڑا دیتے ہوئے شام سے پہلے ہی شہزادے کے پڑاؤ پر پہنچ گئے مگر شہزادہ پارس مارا جا چکا تھا۔ خاقان کے آنے میں صرف چند ساعتوں کی دیر ہوئی تھی۔

خاقانِ مشرق و مغرب نے شہزادے کا سر نیزے پر چڑھا دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ توقتمش کے سوائے مقابلے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اب مقابلہ برابر کا تھا۔ دونوں کے پاس تقریباً برابر برابر لشکر تھا۔ توقتمش نے بھی صفیں درست کرنا شروع کر دیں لیکن ارس خان نے آتے ہی حملہ کر دیا۔ چشتانیہ اوپر سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا بیٹھا دل ٹھہر گیا۔

ارس خان نے پہلے ہی حملے میں توقتمش کے لشکر کو پیچھے دھکیل دیا۔ توقتمش نے لشکر کے قدم جمانے کی بہت کوشش کی مگر ارس خان کی یلغار ایسی تھی کہ توقتمش کا لشکر پیچھے، اور پیچھے ہی ہٹتا رہا۔ ارس خان سر کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور بڑھ بڑھ کر حملہ کر رہا تھا۔

توقتمش مدافعتی جنگ پر مجبور ہو گیا۔ وہ برابر پسپا ہو رہا تھا۔ دونوں لشکر لڑتے ہوئے اس پڑاؤ سے جنوب سمت دور نکل گئے۔ اور چشتانیہ کی نظروں سے بھی اوجھل ہو گئے۔

چشتانیہ کا دل بے چین ہو گیا۔ وہ تیزی سے پہاڑی کے نیچے آئی اور میدان میں اس جگہ آئی جہاں توقتمش کا سوار شہزادے کا سر نیزے پر چڑھائے کھڑا تھا۔ ارس خان اور توقتمش کی جنگ کے دوران شہزادے کا سر زمین پر گر گیا تھا۔ ابھی میدان میں روشنی تھی۔ چشتانیہ کو اپنے پیارے کا سر تلاش کرنے پر مل گیا۔ اس نے سر کو آنکھوں سے لگایا۔ بار بار چوما۔ آہیں بھر بھر۔ آنسو بہائے۔ شہزادے کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں انتظار جھلک رہا تھا۔

چشتانیہ نے پارسس کا دھڑ بھی ڈھونڈ لیا۔ چشتانیہ اس دھڑ کو پشت پر لاد کر جھاڑیوں کے پاس لے آئی۔ اس نے سر کو دھڑ سے ملا کر رکھ دیا پھر چاروں طرف پتھر رکھے اور اوپر جھاڑیاں ڈال دیں۔

یہ تھی ایک شہزادے کی قبر۔

جس کا باپ مشرق و مغرب کا خاقان تھا۔ پتھروں اور جھاڑیوں کی قبر۔ نہ پھول نہ خوشبو۔ مغلوں کے اس بہادر شہزادے کو کفن بھی نصیب نہ ہوا۔ سوائے چشتانیہ کے کوئی اور آنسو بہانے والا بھی نہ تھا۔

چشتانیہ نے شہزادے کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر قسم کھائی:

"شہزادے۔ میرے محبوب! تیرا باپ انتقام لینے آ گیا ہے۔ وہ توقتمش سے جنگ کر رہا ہے۔ اگر وہ توقتمش کا سر لے کر واپس آیا تو میں خودکشی کا گناہ کر کے تیرے برابر لیٹ جاؤں گی اور اگر وہ خالی ہاتھ پلٹا تو میں زندہ رہوں گی اور اس وقت تک زندہ رہوں گی جب تک خود اسے اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کر دیتی۔"

ارس خان کا لشکر واپس آنا شروع ہوا۔ توقتمش شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اسے پکڑنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔

خاقان ارس خان واپس آیا۔ اس کا سر غم سے جھکا جا رہا تھا۔ پورا لشکر اداس اور خاموش تھا۔ چشتانیہ قبر کے قریب گرد ایک جھاڑی میں چھپ گئی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ارس خان صرف شکست دے سکا، وہ توقتمش کو موت کے گھاٹ نہیں اتار سکا۔

میدان میں پہنچتے ہی ارس خان نے شہزادے کے سر اور دھڑ کی تلاش شروع کرائی۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں مگر شہزادے کا سر اور دھڑ میدان میں کہیں نہ ملا۔ پھر اچانک ایک سپاہی کی نظر پتھر اور جھاڑیوں کے ڈھیر پر پڑی۔ اس نے جھاڑیاں ہٹائیں تو وہیں سے چیخ ماری۔ ارس خان اور دوسرے سردار بھاگ کر پہنچے۔ انہوں نے شہزادے کے دھڑ کے ساتھ سر ملا رکھا دیکھا تو بہت متعجب ہوئے۔ . . . ارس خان غم سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور جھک کر بیٹے کی پیشانی کو چوما۔

"ہم شہزادے کی لاش اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔" خاقان نے غمگین آواز میں کہا۔

اس کے سرداروں کی سمجھ میں نہ آیا کہ خاقان نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا۔ کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ اگر شہزادے کی لاش دستیاب ہو گئی تو ساتھ لے جا کر شمال کے خاندانی قبرستان میں دفن کریں گے۔

خاقان زمین سے اٹھا اور کہا:

"شہزادہ معصوم اور بے گناہ تھا۔ اس کی قبر فرشتوں نے بنائی ہے۔ ہم اسے اس قبر سے کیسے نکال سکتے ہیں۔"

پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور لشکر کو لے کر شمال کی طرف چلا۔ گھوڑے کو ایڑ دینے سے پہلے اس نے قبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اے خاقانِ شرق و غرب کے بہادر بیٹے! توقتمش اس وقت بچ کر نکل گیا ہے لیکن ہم کریمیا پہ پوری قوت سے حملہ کریں گے اور تیرا قاتل دنیا کے جس گوشے میں بھی جائے گا ہم اس کا پیچھا کریں گے۔"

خاقان ارس خان چلا گیا۔ میدانِ جنگ پر خاموشی طاری تھی۔

چشتانیہ جھاڑیوں سے نکل کر قبر کے پاس آ گئی۔ توقتمش کے مارے نہ جانے سے وہ کچھ مضمحل ہو گئی تھی لیکن جب وہ شہزادے کی قبر پر پہنچی تو اس کی آنکھیں ایک نئے عزم سے چمک اٹھیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب نہ تو باپ کے پاس واپس جائے گی اور نہ خاقانِ شرق و غرب کا سہارا ڈھونڈے گی بلکہ کریمیا جا کر توقتمش سے بدلہ لے گی۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ میدان میں سواروں کے مارے جانے کے بعد کتنے ہی گھوڑے آزاد پھر رہے تھے۔ چشتانیہ نے ایک گھوڑے کو پکڑا۔ شہزادے پارسس کی قبر کو آخری بار دیکھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر کریمیا کی

طرف چل پڑی۔

چشتانیہ کو ڈر تھا کہ کہیں وہ راستے میں توقتمش کے آدمیوں کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔ اس لیے اس نے زر
جانے والی شاہراہ سے ہٹ کر سفر اختیار کیا۔ وہ رات بھر اپنے خیال میں سڑک کے ساتھ ساتھ چلتی رہی تھی
جب سویرا ہوا تو سڑک کہیں نظر نہ آئی۔ وہ وسط ایشیا کے ویرانوں میں راہ بھول چکی تھی۔ قدم قدم پر پکڑے
کا خطرہ تھا۔ اسے اپنی جان کی قطعی پروا نہ تھی لیکن وہ زندہ رہنا چاہتی تھی تاکہ شہزادے پارس کے خون کا
لے سکے۔ اس لیے وہ احتیاط سے سفر کر رہی تھی۔

اس احتیاط کے تحت وہ عام طور پر دن کے وقت کسی محفوظ جگہ چھپ جاتی اور رات ہوتے ہی چل پڑتی
پینے کی بھی اسے کچھ زیادہ پروا نہ تھی۔ میدان سے چلتے وقت اس نے خشک پھل وغیرہ خورجی میں بھر لیے تھے۔ راستے
جہاں کہیں تازہ پھل مل جاتے ان سے ہی گزارہ کر لیتی۔

چشتانیہ کو اس احتیاط سے راتوں کو سفر کرتے ہوئے ایک ہفتے سے بھی زیادہ ہو گیا لیکن وہ نہ تو کریمیا پہنچی
اور نہ اسے راستے میں کوئی قبیلہ ہی ملا۔ وہ اپنے خیال میں تو ہر رات جنوب کی طرف روانہ ہوتی لیکن قسمت نہ جانے
کہاں لیے جا رہی تھی۔ پھر اس نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ وہ گھوڑے کو آزاد کر دیتی اور گھوڑے
رخ جدھر ہو جاتا وہ ادھر ہی چل پڑتی۔

O

پندرہ راتوں کے سفر کے بعد ایک صبح وہ ایسی جگہ پہنچی جہاں کچے پکے مکانات کی ایک چھوٹی سی بستی تھی چشتانیہ
کے لیے مٹی اور پتھر کے یہ مکانات تعجب خیز تھے۔ اس نے قصے کہانیوں میں سن رکھا تھا کہ دنیا کے بعض حصوں میں لوگ
پتھر کے مکانات بنا کے رہتے ہیں اور ایک ہی جگہ رہتے رہتے عمر گزار دیتے ہیں۔ قصے کہانیوں کی یہ باتیں آج ایک
حقیقت بن کر اس کے سامنے آ گئی تھیں۔

چشتانیہ بے دھڑک بستی میں پہنچ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ بستی کے مکانات مختلف ہیں تو لوگ بھی مختلف شکل
کے ہوں گے لیکن ان کی صورتیں بھی اس کے قبیلے والوں جیسی تھیں۔ ان کی بولی بھی چشتانیہ کی بولی سے کچھ زیادہ مختلف
نہ تھی۔

چشتانیہ نے عورتوں سے اس بستی کے بارے میں پوچھا۔ عورتیں اسے اپنے ایک بزرگ کے پاس لے گئیں۔
جب معلوم ہوا کہ وہ راستہ بھٹک کر یہاں آ گئی ہے تو اس نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔
چشتانیہ نے کریمیا کے بارے میں دریافت کیا تو بزرگ نے بتایا کہ کریمیا کا علاقہ یہاں سے شمال مغرب میں
وہ راستہ بھول کر اورگنج کے قریب آ گئی ہے جو خوارزم کا صدر مقام ہے اور امیر تیمور کی عملداری میں شامل ہے
امیر تیمور کے نام پر چشتانیہ چونک پڑی۔ تیمور کی بہادری اور فتوحات کی کہانیاں شمالی ویرانوں تک پہنچ
چکی ہیں۔

پھر چشتانیہ نے فوراً ہی ایک عجیب فیصلہ کیا۔ اس نے بزرگ سے کہا کہ وہ دراصل مغلوں کے خاقان شرق و غرب
کی بہو اور شہزادہ پارس کی بیوہ ہے اور شکار کھیلتے ہوئے ادھر آ گئی ہے۔
بستی والے اس انکشاف پر پریشان ہو گئے۔ وہ ہاتھوں ہاتھ چشتانیہ کو اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ چشتانیہ نے
اس سے کہا کہ وہ امیر تیمور سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔
سردار نے اسے اورگنج پہنچوایا اور حاکم اورگنج نے بڑی عزت و احترام سے اسے سمرقند بھیجنے کا انتظام کیا۔
دس دن بعد چشتانیہ سمرقند پہنچ گئی۔

O

اصفہان کا قتل عام

"اے ملکِ تاتار کے سب سے بڑے بادشاہ! میں خاقان ارس خان کی بہو ہوں۔"

چشمانیہ اپنی درد بھری کہانی امیر تیمور کو سنا رہی تھی۔ تیمور کے برابر بڑی بیگم سرائے خانم بیٹھی تھی۔ سرائے
کو جب معلوم ہوا کہ چشمانیہ کا شوہر پارس خان جنگ میں مارا گیا ہے اور یہ بھٹکتی ہوئی ملکِ تاتار آگئی ہے تو وہ
پر بہت مہربان ہوگئی اور اسے اپنے محل میں کسی شاہی مہمان کی طرح رکھا۔

چشمانیہ سے ایک ہفتے تک تیمور یا سرائے خانم نے سوائے رسمی گفتگو کے اور کوئی بات نہیں کی۔ وہ اسے
سے زیادہ سکون دینا چاہتے تھے تاکہ اس کا غم کچھ ہلکا ہو جائے۔

"اے مہربان بادشاہ!"

چشمانیہ نے پھر سے کہنا شروع کیا:

"میرے ملک میں آپ کا نام کوئی نہیں جانتا۔ وہاں تو لوگ آپ کو لنگڑے بادشاہ کے نام سے جانتے ہیں۔"

چشمانیہ ایک دم رک گئی۔ اسے احساس ہوا کہ تیمور کو لنگڑا کہہ کر اس نے اس کی توہین کی ہے۔ تیمور اور سرائے
دونوں کے چہروں پر اس لفظ سے بے چینی اور ناگواری کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ چشمانیہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر
سنبھل کر بولی:

"اے بادشاہ! میرے ملک والے آپ کو حقارت سے نہیں بلکہ انتہائی عزت سے یاد کرتے ہیں۔ ہم لوگ جب الاؤ
آگ پیدا کر کے الاؤ سلگاتے ہیں تو بڑے بوڑھے آپ کے کارنامے قصے کہانیوں کی طرح بیان کرتے ہیں۔ جب میں چھوٹی
سی تھی اور آپ کی جنگوں کا حال سنتی تھی تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اس بہادر بادشاہ کو دیکھوں جس

پر ملک دے کر انہیں ریت کے تودوں اور بگولوں کی سرزمین تک بھگا دیا۔"

چشمانیہ جاہلِ مطلق تھی لیکن اس نے تاتاریوں کی کچھ اس انداز سے تعریف کی کہ سرائے خانم اور تیمور کی بے حد
ہوگئی۔

تیمور نے دلچسپی سے پوچھا:

"تمہارا خاقان ہمارے بارے میں کیا خیالات رکھتا ہے؟"

"اے بادشاہ! ہم مغلوں کے دو گروہ ہیں اور ان کے دو خاقان ہیں۔"

چشمانیہ نے تفصیل سے بتانا شروع کیا:

"ہمارے سب سے بڑے خاقان کا نام مانی خان ہے جو جنوب میں کسی دریا کے کنارے ایک بہت بڑے قلعے میں
رہتا ہے۔ اس کا گروہ سنہری غول کہلاتا ہے اور وہ تمام مغلوں کا حاکم ہے۔ اس نے اپنی طرف سے شمالی علاقوں میں ایک
خاقان مقرر کیا ہے جو خاقانِ شرق و غرب کہلاتا ہے۔ اس کا نام ارس خان ہے۔ میں اسی کی بہو ہوں۔ میں ایک معمولی خانہ بدوش
قبیلے کی عورت ہوں اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ دونوں خاقان آپ کو کس طرح اور کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے
کہ جب مغلوں کا کوئی بڑا سردار ہمارے قبیلے کا مہمان ہوتا ہے، رات کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر ہمارے بزرگ اس سے ملکِ تاتار
اور وہاں کے بادشاہ کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو وہ بڑی حقارت سے زمین پر تھوک کر کہتا ہے کہ "ہم بادشاہ
ہیں اور تاتاری ہماری رعایا ہے۔ ان کا ایک سردار ہے جس کا نام تیمور ہے اور وہ ..... وہ ماوراءالنہر کا ایک معمولی سوار ہے۔"
..... لیکن ہمارے بزرگ اس کی باتوں کا اعتبار نہیں کرتے اور سر جھکا لیتے ہیں کیونکہ وہ سوداگر جو آپ کے ملک سے
گزر کر ہمارے ملک میں پہنچتے ہیں، وہ آپ اور مغلوں کی جنگوں کا حال بڑی تفصیل سے سناتے ہیں تو حقائق کا پتہ
چل جاتا ہے۔"

تیمور سمجھ گیا کہ چشمانیہ سچ کہہ رہی ہے۔ کیونکہ وہ جس صاف گوئی سے باتیں کر رہی ہے اس پر شبہ کرنے کی کوئی
وجہ نہیں تھی۔ تیمور خوش ہوتے ہوئے بولا:

"اس کا مطلب ہے عام مغل ہمارے خلاف نہیں ہیں؟"

"انہیں تو آپ سے اور آپ کے کارناموں سے محبت ہے۔" چشمانیہ نے فوراً ادب سے جواب دیا:

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میرے قبیلے میں لڑکیوں کی خرید و فروخت کا عام رواج ہے۔ پکڑے ہوئے غلام بازاروں میں
بکتے ہیں اور لڑکیوں کی فروخت گھر پر ہوتی ہے۔ باپ لڑکی کے جوان ہوتے ہی اعلان کرتا ہے اور سب سے زیادہ قیمت
دینے والے کے حوالے کر دیتا ہے۔

میں اپنے علاقے کی سب سے مشہور اور باکمال رقاصہ تھی اس لیے میرے باپ نے خود میری قیمت مقرر کی۔

اس قیمت پر خاقانِ شرق و غرب کے بیٹے پارس خان نے مجھے خرید لیا۔ ابھی ہمارا نکاح اور رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ کریمیا کا حاکم شہزادہ توقتمش بیچ میں آ کودا اور میرے باپ کو لالچ اور رعب دے کر مجھے دگنی قیمت پر خریدنے کا اعلان کر دیا۔ چونکہ میں نے شہزادے پارس کو دیکھ لیا تھا اور اسے پسند بھی کر لیا تھا اس لیے میں نے شہزادے پارس سے رابطہ قائم کیا اور اس کے پاس پہنچ کر اس سے نکاح کر لیا۔

حاکمِ کریمیا کو یہ بات ناگوار گزری۔ اس نے اپنے لشکر کے ساتھ شہزادے پارس پر حملہ کر دیا اور اس جنگ میں میرا شوہر شہزادہ پارس ......" چشتانیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"صبر کرو چشتانیہ۔" سرائے خانم نے تسلی دی:

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب یہ بتاؤ کہ ہم سے کیا چاہتی ہو؟ ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو تمہیں ہر طرح کا آرام پہنچائیں گے۔ خدا نے تمہیں اچھی صورت دی ہے۔ پھر تم ایک ماہر رقاصہ ہو جسے ہر مرد پسند کرے گا۔ اگر تم شادی کی خواہش مند ہو تو تم جس تاتاری سردار کو پسند کرو، اس سے تمہارا رشتہ کیا جا سکتا ہے۔"

"مہربان ملکہ ......" چشتانیہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی:

"اس وقت تو مجھے سوائے اس کے اور کوئی خواہش نہیں کہ کریمیا کے حاکم توقتمش سے انتقام لوں۔ میں عرض کروں ایک رات کی بات ہی تھی کہ اس ظالم نے تین ہزار سواروں کے ساتھ میرے شوہر پر حملہ کر دیا۔ ہمارے پاس پانچ سو سوار تھے۔ وہ سب شہزادے پارس پر نثار ہو گئے اور شہزادے نے اپنی آن اور اپنے باپ کی شان کی خاطر گرفتار ہونے کے بجائے موت کو ہنسی خوشی گلے لگا لیا۔"

"دیکھو لڑکی ......" تیمور نے محبت سے سمجھایا:

"کیا شہزادے کے باپ ارس خان کو جسے تم خاقانِ مشرق و مغرب کہتی ہو، اپنے بیٹے کی موت کی خبر نہیں ملی ہو گی۔ کیا توقتمش سے انتقام لینے کے لیے وہ تم سے زیادہ بے چین نہیں ہو گا؟"

"اے مہربان بادشاہ!" چشتانیہ نے سنبھل کر کہا:

"اس غم اور پریشانی نے میرے ہوش و حواس درست نہیں رہنے دیے۔ شہزادے کا باپ ارس خان مجھ سے زیادہ انتقام لینے کے لیے بے چین تھا اور اس نے انتقام لے بھی لیا۔"

"یعنی توقتمش مارا جا چکا ہے؟" تیمور چونک پڑا۔

"اے شاہِ تاتار! توقتمش مارا نہیں جا سکا۔" چشتانیہ افسردگی سے بولی:

"ارس خان اپنے لشکر کے ساتھ میرا ڈولا لینے ہماری خیمہ گاہ کی طرف آ رہا تھا۔ اسی دوران توقتمش نے ہم پر حملہ کیا مگر ارس خان کو آنے میں دیر ہو گئی۔ جب وہ میدان میں آیا تو اسے ایک نیزے پر اپنے بیٹے کا سر چڑھا ہوا

نظر آیا۔ اس نے شدت سے حملہ کیا اور دور تک تعاقب بھی کیا لیکن وہ ارس خان کے ہاتھ نہ آ سکا۔ پھر ارس خان نے بیٹے کی لاش پر کھڑے ہو کر قسم کھائی کہ وہ توقتمش سے انتقام لے گا اور اس کا سر کاٹ کر اسی طرح نیزے پہ چڑھائے گا۔"

"ارس خان بغیر انتقام لیے واپس چلا گیا؟" تیمور نے تعجب کا اظہار کیا۔

"جی ہاں۔ وہ اپنی لشکر گاہ کو لوٹ گیا تاکہ مزید لشکر جمع کر کے کریمیا پر حملہ کر سکے۔" چشتانیہ نے درد بھری آواز میں جواب دیا:

"انتقام لینا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں اور شاہِ تاتار اور ملکۂ تاتار اس سلسلے میں میری رہنمائی کر سکیں تو میں تا زندگی احسان مند رہوں گی۔"

"تم اپنے سسر ارس خان کے پاس بھی تو جا سکتی ہو۔" ملکہ سرائے خانم نے کہا:

"ہم تمہیں وہاں بھیجنے کا انتظام کر سکتے ہیں۔"

"ملکۂ تاتار کا شکریہ۔ لیکن میں ارس خان کے پاس نہیں جا سکتی۔"

"مگر کیوں؟" سرائے خانم نے حیرت سے پوچھا:

"تم ارس خان کے بیٹے کی جائز بیوی ہو۔ اسے تمہاری قدر کرنی چاہیے۔"

"نہیں ملکۂ تاتار۔" چشتانیہ نے غمگین لہجے میں کہا:

"میں ارس خان کی بہو ضرور ہوں لیکن شہزادہ پارس کے قتل کی اصل وجہ بھی تو میں ہی ہوں۔ جھگڑا میری وجہ سے ہوا تھا۔ خطرہ ہے کہ ارس خان مجھے دیکھتے ہی قتل کرا دے گا۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں لیکن میں اس وقت تک نہیں مرنا چاہتی جب تک میرا انتقام پورا نہ ہو جائے۔"

امیر تیمور جو کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، اس نے سر اٹھا کر کہا:

"دیکھو لڑکی۔ یہ ایک دوسرے ملک کا معاملہ ہے۔ ہم محض تمہارے لیے مغلوں کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے۔ پھر یہ دو امیروں کا ذاتی جھگڑا تھا۔ ارس خان ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن تم اسے خاقان تسلیم کرتی ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ اس نے اب تک توقتمش سے اپنے بیٹے کا حساب برابر کر لیا ہو گا کیونکہ ہم تاتاریوں اور مغلوں کی روایت ہے کہ مرد وہ ہے جو اپنے ہم قوم کے قاتل کے ساتھ آسمان تلے نہ سوئے۔"

چشتانیہ دل شکستہ ہو گئی۔ تیمور نے اسے صاف جواب دے دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چھلک آئے۔ سرائے خانم کو بھی تیمور کی یہ صاف گوئی کچھ زیادہ پسند نہ آئی:

"اے امیر! کیا آپ شاہِ تاتار ہوتے ہوئے اس مظلوم کی جھولی میں ہمدردی کے دو بول بھی نہیں ڈال سکتے؟" ...

برلاس خانم نے کچھ اس لہجے میں کہا کہ تیمور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"لڑکی! کاش ہم تمہارے آنسو پونچھ سکتے۔ ہم وعدہ تو نہیں کرتے لیکن تم یہ امید رکھو کہ جب بھی کوئی موقع آیا ہم تمہاری پوری پوری مدد کریں گے۔"

"خدا آپ کو اور آپ کی مہربان ملکہ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔" چشمانیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

"میرے لیے یہ امید ہی کافی ہے۔ میں اس امید پر اپنی پوری زندگی گزار دوں گی۔"

امیر تیمور کے جاسوس شمال سے جنوب تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سفید اور سنہرے غول کے قصوں سے آشنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ارس نے چنگیز خان کے منجھلے بیٹے چغتائی خان کے خانوادے کی طاقت کا خاتمہ کر دیا ہے لیکن ابھی سنہرے غول کا خاقان دریائے والگا کے کنارے اپنے قلعے میں موجود ہے اور وہ اتنا طاقتور ہے کہ پورا مشرقی یورپ اسے خراج دیتا ہے۔

امیر تیمور نے اس معاملے میں کبھی اتنی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا جتنا سنجیدہ وہ چشمانیہ کی روداد سننے کے بعد ہوا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ سنہری غول کسی بھی وقت اس کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔

O

امیر تیمور کی تسلی و تشفی اور ملکہ برلاس خانم کے محبت بھرے سلوک نے چشمانیہ کا غم بہت کم کر دیا۔ برلاس خانم نے چشمانیہ کو سمرقند اور دوسرے مقامات کی سیر کرائی۔ چشمانیہ کے لیے وہاں کی ہر چیز نئی اور عجوبہ تھی۔ برلاس خانم کی صحبت میں رہ کر اس کی طبیعت سنبھل گئی اور اس نے زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

امیر تیمور نے چشمانیہ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنی داستان کسی اور کو نہ سنائے۔ محل والوں کو صرف یہ علم تھا کہ چشمانیہ ایک عالی مرتبت مغل شہزادی ہے اور اپنے خسر ارس خان سے خفا ہو کر یہاں پناہ گزین ہوئی ہے۔

چشمانیہ کو سمرقند میں رہتے ہوئے دو ماہ سے زیادہ گزر گئے۔ ایک دن امیر تیمور اپنے سرداروں سے مل کر محل میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک غلام نے حاضر ہو کر اطلاع دی کہ خوارزم کے حاکم کا قاصد ایک خاص پیغام لایا ہے۔ خوارزم سرحدی علاقہ تھا اور اس کی سرحدیں منگولوں کے سنہرے غول سے ملتی تھیں۔ تیمور نے فوراً قاصد کو بلا لیا۔ خوارزم کے قاصد نے ایک لفافہ پیش کیا۔

امیر خط پڑھ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"کیا زبانی پیغام بھی دیا ہے حاکم نے؟" کچھ دیر بعد تیمور نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

قاصد نے بڑے ادب سے کہا:

"مجھے حکم ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس خط کا جواب لے کر خوارزم پہنچایا جائے۔"

تیمور نے ایک لمبی سانس لی:

"تمہیں معلوم ہے اس خط میں کیا لکھا ہے؟"

"نہیں امیر...."

قاصد گھبرا گیا: "مجھے تو صرف خط پہنچانے اور جواب لانے کا حکم ہے۔"

"تمہیں یہ تو ضرور معلوم ہوگا کہ حاکمِ خوارزم کے پاس کوئی اہم آدمی ٹھہرا ہوا ہے؟" امیر تیمور نے مزید تحقیق کی۔

قاصد کچھ سوچتے ہوئے بولا:

"جی ہاں امیر.... ایک ترکستانی سردار ان کے پاس آیا ہے۔ شاید ان کا دوست ہے۔ انہوں نے اسے اپنے محل میں ٹھہرایا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

تیمور نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا:

"کل تک مہمان خانے میں ٹھہرو۔ تمہیں خط کا جواب مل جائے گا۔"

قاصد سلام کر کے رخصت ہو گیا تو امیر تیمور نے خط کو دوبارہ پڑھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ فکر کے سائے آہستہ آہستہ چہرے سے غائب ہو گئے۔ وہ مسکراتا ہوا اٹھا اور برلاس خانم کی طرف چل دیا۔

ملکہ اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اس نے دروازے کے باہر تیمور کو خوش آمدید کہا اور تیمور کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ تیمور فطرتاً سنجیدہ تھا۔ جب سے اس کی پہلی بیوی الجائی خاتون کا انتقال ہوا تھا وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ رہتا تھا پھر جب اس کے بڑے بیٹے جہانگیر نے عین جوانی میں دنیا سے منہ موڑ لیا تو اس کی رہی سہی شگفتگی بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس وقت تیمور برابر مسکرائے جا رہا تھا:

"ہم تمہیں اس وقت ایک ایسی خبر سنائیں گے کہ تم پھڑک اٹھو گی۔"

"ضرور ارشاد فرمائیے امیر!" برلاس خانم بھی مسکرائی:

"میرے کان خبر سننے کے لیے بے چین ہیں۔"

"وہ لڑکی...." امیر نے باہر کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا:

"ارس خان کی بہو کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہوگی۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کی طبیعت سمرقند میں لگ گئی ہے۔"

"سرائے خانم! کیا یہ قدرت کی ستم ظریفی نہیں کہ دو دشمن ایک جگہ جمع ہو جائیں؟"

تیمور کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

"جسے ہم کل تک ظالم سمجھتے تھے وہ آج مظلوم بن کر ہمارے پاس آیا ہے"۔

"میں امیر کو مسکراتے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی ہوں" سرائے خانم نے دانشمندی سے تیمور کی بات ہوتے بھی سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی کوشش کی۔

"ہم تمہاری محبت کی قدر کرتے ہیں سرائے خانم" تیمور خوش ہو کر بولا۔

"تم ایک مزاج داں اور سمجھ دار عورت ہو۔ تمہیں موقع محل کے مطابق بات کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے، بہر حال کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ہم نے جتہ مغلوں کی طاقت کو ختم کر دیا ہے۔ ہم پر حکومت کرنے والے مستقر یعنی حصار المالیق چھوڑ کر منگولیا کے ریگستانوں سے بھی دور بھاگ چکے ہیں لیکن چنگیز خان کی ایک مضبوط شاخ سفید اغول کہا جاتا ہے اب تک ہماری سرحدوں پہ ایک مستقل خطرہ بنی کھڑی ہے۔ ہم اپنی سرحدوں کو مضبوط کیے بغیر فتوحات کا سلسلہ کسی اور طرف نہیں بڑھا سکتے"۔

"امیر درست فرما رہے ہیں" سرائے خانم نے تیمور کی بات نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کی تائید کی۔

"سرائے خانم! تقدیر کبھی کبھی عجیب طرح کے گل کھلاتی ہے!"

تیمور کے دل میں امڈتے ہوئے جذبات اسے آج بہت کچھ کہنے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ رازداری کا پابند تھا لیکن اس وقت راز کی باتیں بھی اس کی زبان سے نکلی پڑ رہی تھیں۔ وہ بولا:

"ارس خان کی بہو کے سمرقند آنے سے کم از کم ہمیں یہ احساس ضرور ہوا تھا کہ ایک عظیم طاقت ہم سے بہت قریب موجود ہے۔ اس احساس نے ہمیں ایک نامعلوم پریشانی میں الجھا دیا تھا۔ ہم اس خطرے کو دور کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے اور اب یہ خطرہ خود بخود دور ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ تمہاری جوان مغل لڑکی کے شوہر کا قاتل ارس خان کے ہاتھوں شکست کھا کر ہماری حدود میں آ گیا ہے اور اس نے پناہ کی درخواست کی ہے"۔

"امیر کا مطلب ہے......" سرائے خانم یاد کرتے ہوئے بولی:

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے جیشا نیہ نے اس کا نام توقتمش بتایا تھا۔ کیا وہی شخص آپ کے پاس آیا ہے؟"

"ہاں سرائے خانم!" تیمور نے سنجیدگی سے کہا:

"اس کا نام توقتمش ہی ہے۔ خوارزم کے قلعدار نے ایک خفیہ خط کے ذریعے ہمیں اطلاع دی ہے کہ کریمیا کے حاکم شہزادہ توقتمش اور مغلوں کے شمالی خاقان ارس خان کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ توقتمش کو اس جنگ میں زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ جان بچا کر خوارزم پہنچا ہے۔ ارس خان نے توقتمش کا ہماری سرحد تک پیچھا کیا ہے۔ اب وہ ہمارے قلعدار کے ذریعے ہم سے پناہ طلب کر رہا ہے۔ اگر ہم نے پناہ نہ دی تو وہ کسی اور طرف چلا جائے گا"۔

سرائے خانم بڑی صاحبِ تدبیر عورت تھی۔ وہ غور سے تیمور کی باتیں سن رہی تھی۔ تیمور کے خاموش ہوتے ہی بولی:

"توقتمش کا شکست کھا کر پناہ کی درخواست کرنا امیر تاتار کی کامیابی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے بشرطیکہ امیر کی عقل انہیں اس مسئلے پر غور کرنے کی دعوت دے"۔

"بہت خوب سرائے خانم!" تیمور مسکرایا۔

"اب تم ہمیں مشورے بھی دینے لگیں؟"

"ہرگز نہیں امیر......" سرائے خانم نے فوراً بات پلٹ دی:

"میری کیا مجال۔ میں نے تو صرف ایک اندازہ لگایا تھا۔ اسے امیر میری بے عقلی کہہ سکتے ہیں" سرائے خانم گھبرا گئی کہ کہیں تیمور بگڑ نہ جائے۔ اس کے تمام سردار اس معاملے میں بہت محتاط رہتے تھے اور جب تک امیر تیمور خود ان سے مشورہ طلب نہ کرتا وہ اپنی زبانیں بند رکھتے تھے۔

تیمور نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا:

"ہمیں تمہارا مشورہ ناگوار نہیں گزرا کیونکہ ہم نے خود بھی ان خطوط پر غور کیا ہے۔ تمہیں تو ہم اطلاع دینے اس لیے آئے تھے کہ جیشا نیہ، توقتمش کی سخت دشمن ہے۔ تم اسے اچھی طرح سمجھا دینا کہ توقتمش جب تک ہماری پناہ میں رہے وہ اسے الجھنے یا اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے بلکہ فی الحال تو تم توقتمش کے آنے کی اسے اطلاع بھی نہ دو"۔

"آپ اطمینان رکھیں۔ ایسا ہی ہو گا امیر" سرائے خانم نے کہا:

"الیتو جیشا نیہ کو اس کی خبر ہی نہیں ہو پائے گی۔ اگر اسے معلوم ہو بھی گیا تو میں اس پہ یہ واضح کر دوں گی کہ جس طرح وہ امیر تیمور کی پناہ میں ہے اسی طرح توقتمش بھی امیر کی پناہ میں آ گیا ہے اور امیر اپنی پناہ میں آنے والوں کی جان کا نگہبان ہوتا ہے"۔

امیر تیمور نے خوارزم کے قلعدار کو جواب بھیجا تو قاصد کے ساتھ اپنا ایک سوار بھی بھیج دیا تاکہ وہ توقتمش کو عزت و احترام کے ساتھ سمرقند لے آئے۔ امیر نے توقتمش کو یقین دلایا کہ وہ پناہ دینے کے ساتھ ساتھ اس کی حتی الامکان مدد کرے گا۔

توقتمش کے لیے اس کی سرزمین تنگ ہو گئی۔ وہ بھٹکتا ہوا خوارزم آ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تیمور اسے
نہ دے گا کیونکہ مغل، تاتاریوں کو حقیر اور اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور امیر تیمور کو "لنگڑا تاتاری" کہتے تھے لیکن جب تیمور
بھیجے ہوئے سردار نے اسے ادب سے سلام کر کے کہا:

"امیر تیمور آپ سے ملاقات کے مشتاق ہیں اور آپ سمرقند کو اپنا گھر سمجھ کر فوراً چلیے۔"

تو توقتمش بہت خوش ہوا۔ خوارزم کے قلعہ دار نے سواروں کا ایک دستہ بھی اس کے ساتھ کر دیا۔ اس طرح توقتمش
شان سے سمرقند پہنچا۔

امیر تیمور نے توقتمش کو سمرقند سے باہر ٹھہرانے کا انتظام کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ توقتمش کی آمد سے
لوگ واقف ہوں۔ اس کے علاوہ توقتمش سے گفتگو کر کے وہ یہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ مغلوں کا یہ شہزادہ کس
تک اس کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔

توقتمش کو جب قلعے سے باہر ایک حویلی میں اتارا گیا تو اسے کچھ خطرہ محسوس ہوا لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد
امیر تیمور کا پیغام پہنچا کہ وہ بہ نفسِ نفیس کل کسی وقت اس سے ملاقات کے لیے آئیں گے۔

دوسرے روز دوپہر کے بعد امیر تیمور تنہا اس سے ملنے آیا۔ مغل شہزادے نے امیر تیمور کو دیکھا۔ اس تیمور
جس نے بلادِ شمال کے مغلوں کو دور صحراؤں اور ریگستانوں میں مار بھگایا تھا۔ توقتمش پر اس خیال ہی سے کہ
ایک فاتح بادشاہ ہے، رعب پڑ گیا اور وہ تیمور سے اس قدر ادب سے ملا جیسے تیمور اس کا خاقانِ اعظم مانی خان ہو
بھی شفقت سے ملا اور اسے بیٹا اور چھوٹا بھائی کہہ کر مخاطب کیا۔

دونوں میں گفتگو شروع ہوئی۔ امیر تیمور اس کے بارے میں چیتمانیہ سے بہت کچھ سن چکا تھا لیکن اب
توقتمش کا بیان بھی سننا چاہتا تھا تاکہ چیتمانیہ کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق یا تردید ہو سکے اور وہ توقتمش کے مزاج سے
بھی واقف ہو جائے۔

امیر تیمور بلا کا قیافہ شناس تھا۔ اس نے توقتمش کے چہرے سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شخص متلون مزاج
ہے اور ایسے شخص پر مشکل ہی سے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ توقتمش نے پہلے ہی قدم پر تیمور کو فریب دینے کی کوشش کی
اس نے اپنی داستان کا آغاز اس طرح کیا:

"اے شاہِ تاتار! میری اور ارس خان کی پرانی دشمنی ہے کیونکہ جس علاقے کا ارس خان حاکم ہے وہاں میرے
قبیلے کے زیادہ لوگ آباد ہیں لہٰذا اس پر میرا حق ہے۔ چونکہ خاقانِ اعظم مانی خان ایک کمزور خاقان ہے اور وہ ارس خان
سے خوف کھاتا ہے اس لیے اس نے شمال مشرق کا ایک بڑا علاقہ دے کر اسے خاقانِ مشرق و مغرب کا خطاب بھی دے
کر دیا ہے۔ خاقان مانی خان نے میری حق تلفی کی۔ میں پھر بھی خاموش رہا لیکن ابھی کچھ عرصہ پہلے ارس خان کا بیٹا

... کے بغیر میرے علاقے میں لشکر لے کر آ گیا۔ ارس خان کے لشکر کی تعداد زیادہ تھی۔ مجھ اپنے علاقے سے
... نہ پہنچ سکی اس لیے مجھے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ارس خان اس قدر ظالم ہے کہ اس نے مجھے شکست
... اکتفا نہیں کی بلکہ میرے پورے ملک رمیب کو روند کر رکھ دیا۔ میں شکست پر شکست کھاتا اور پسپا ہوتا رہا۔
... امیدیں ٹوٹ گئیں تو میں نے آپ کے دامن میں پناہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور خوارزم پہنچ گیا۔"

امیر تیمور تحمل سے اس کی روداد سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا تو تیمور نے کہا:

"مغل شہزادے! ہم تمہیں پناہ دے چکے ہیں اور پناہ میں آئے ہوئے آدمی کی عزت کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔
... اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ تم نے ارس خان اور اپنی جنگ کے بارے میں یہ باتیں قصداً ہم سے
... رکھی ہیں۔"

توقتمش گھبرا کے تیمور کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر ڈرتے ڈرتے بولا:

"شاہِ تاتار! میں آپ کے قبضے میں ہوں۔ آپ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کر سکتے ہیں لیکن میں یہی کہوں گا کہ
... آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔"

"شہزادے! تم بھول رہے ہو۔" امیر نے سنجیدگی سے کہا:
"تم ہمارے قبضے میں نہیں پناہ میں ہو اور پناہ میں آئے ہوئے آدمی سے ہم کسی قسم کی سختی نہیں کر سکتے۔ تمہاری
... وقت تک خطرہ نہیں جب تک تمہاری طرف سے کسی قسم کی غداری کا اظہار نہیں ہوتا۔ ہم تو صرف یہ پوچھنا چاہتے
... خان کے بیٹے پہ کیا گزری جو تمہاری حدود میں داخل ہو گیا تھا؟"

"شاہِ محترم!" توقتمش نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا:
... نے اپنی روداد مختصر طور پر بیان کی تھی۔ اس لیے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ ارس خان کے بیٹے سے میری جنگ
... میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اسی دوران اس کا باپ آ گیا اور مجھے شکست کھا کر آپ کے پاس پناہ گزین

"شہزادے! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے اور ارس خان کے بیٹے کے درمیان ایک عورت پر جھگڑا ہوا تھا۔"
... کہتے ہوئے توقتمش کے چہرے پر نظریں جما دیں۔
... توقتمش کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اطلاع تیمور تک کیسے پہنچی۔ اس نے خود کو سنبھالا

"... کی اطلاع درست ہے۔ شہزادہ پارس میرے علاقے سے ایک عورت کو لے گیا تھا۔ مجھے یہ بات ناگوار

"توقتمش..... تیمور کا لہجہ سخت ہو گیا:
"شہزادے پارس نے لڑکی کے باپ کو اس کی قیمت ادا کر دی تھی۔ پھر تمہیں لڑکی واپس لینے کا کیا حق؟"
توقتمش کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
تیمور نے نرمی سے کہا:
"توقتمش۔ یاد رکھو کہ وہ بادشاہ یا امیر اپنی سلطنت کو اسی وقت تک قابو میں رکھ سکتا ہے، جو وہ اپنی سرحدوں کے باہر کے حالات سے پوری طرح واقف رہتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم سمرقند میں بے خبر بیٹھے ہیں اور ہمیں اپنی سرحدوں پر رونما ہونے والے واقعات کا علم نہیں۔ ہمیں تمہاری اور ارس خان کی کے تمام حالات معلوم ہیں۔ ہم نے تمہیں آنکھیں بند کر کے پناہ نہیں دی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سنہرا غول سمرقند میں موجودگی برداشت نہیں کرے گا اور اس کا جو کچھ نتیجہ ہو گا، وہ بھی تم جانتے ہو۔"
"شاہِ تاتار آپ واقعی ایک عظیم حکمران ہیں"۔ توقتمش کو اعتراف کرنا پڑا:
"ہم مغلوں نے آپ کی طاقت اور بیدار مغزی کا غلط اندازہ لگایا تھا۔"
"بہرحال تم ہمیں بعض خامیوں کے باوجود عزیز ہو۔"
تیمور نے اسے تسلی دی:
"ہم نے تمہیں مدد دینے کا وعدہ کیا ہے اور وہ پورا کیا جائے گا۔"
"میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں"۔ توقتمش نے عاجزی سے کہا:
"میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا اور مجھے آپ کی غلامی پر ہمیشہ فخر رہے گا۔"
امیر تیمور اپنے مہمان کو تسلی دے کر واپس آ گیا مگر اس کی بے چینیاں بڑھ گئیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ سنہرے غول سے خوفزدہ تھا بلکہ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ توقتمش سے کس طرح کام لے کیونکہ وہ سنہرے غول کے خلاف پہل کرنا نہیں چاہتا تھا۔

○

امیر تیمور نے بلادِ شمال کے خانِ اعظم کو شکست دے کر ان کی طاقت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کوشش میں شمالی پہاڑوں کی مضبوط دیوار پار کر کے آگے بڑھ گیا اور اس کے قبضے میں ایشیا کی وہ شاہراہ

آ گئی جس کے ذریعے ایشیا اور یورپ کے درمیان ایک زمانے سے تجارت ہوتی چلی آ رہی تھی۔ تیمور نے شمال کے شکست دے کر وہ راستہ بند کر دیا تھا جس کے ذریعے ترک، چین اور چنگیز خان کی اولاد آئے دن وسطی ایشیا پر حملے کیا کرتی تھی۔
مغلوں کی طاقت اگرچہ ٹوٹ چکی تھی لیکن سنہرے غول کی بے پناہ طاقت اب بھی تیمور کے لیے ایک خطرہ بنی ہوئی تھی۔ سنہرے غول کا یہ علاقہ تیمور کی سلطنت کے شمال اور مغرب کی جانب واقع تھا۔ سنہرے غول اور خاص کر خاقان ارس خان کے خانہ بدوش مغل ٹنڈرا کے برف پوش میدانوں میں گھومتے رہتے تھے۔ ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور حاکم بھی مسلمان تھے۔ جب یہ لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے تو یوں معلوم ہوتا کہ ایک پورا شہر حرکت میں آ گیا ہے۔ اکثر امیروں کے پاس دو دو سو گاڑیاں ہوتیں۔ یہ گاڑیاں اتنی بڑی ہوتی تھیں جن میں ایک پورا گھر آرام سے سما جاتا اور کھانا بھی انہی گاڑیوں میں پکایا جاتا۔ سفر کے دوران ان گاڑیوں کو ایک دوسری سے باندھ دیا جاتا تھا۔ اور ایک گاڑی بان پچاس پچاس گاڑیوں کو چلاتا تھا۔
ان حکمران مغل خاندانوں کے علاوہ سنہرے غول میں شمالی علاقے کے مختلف مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ دنیا کے جہاں گرد (جپسی) اور جنوآ کی بھی کافی تعداد موجود تھی۔ جہاں ایک طرف مسلمانوں کی چھوٹی مسجدیں بازاروں میں نظر آتیں وہاں ملاؤں کے ساتھ بت پرستوں کے شامان بھی کمر میں بت لٹکائے نظر آتے۔ ان میں بیوی کا رواج تھا اور بیواؤں کی شادی کا رواج نہیں تھا۔
سنہرے غول کے یہ مغل، تاتاریوں کے ہجیرے بھائی تھے۔ وہی ترچھی آنکھیں، چھدری داڑھیاں اور طبع و مزاج۔ یہ مغل ان روسیوں سے زیادہ سنگ تھے جن سے یہ خراج وصول کرتے تھے۔ یہ لوگ سکے بھی ڈھالتے تاکہ ان کے محکوم روسی خراج ادا کر سکیں۔ مغل کاغذ بھی بناتے تھے اور روسیوں سے اس پر معاہدے لکھے جاتے تھے۔ یورپ کا سیاسی توازن ان کے ہاتھ بنتا تھا۔
سنہرے غول نے روسیوں سے صرف ایک بار شکست کھائی تھی لیکن پھر انہوں نے اس قدر زبردست انتقام لیا تھا کہ روسیوں نے سنہرے غول سے بغاوت کرنے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔ امیر تیمور کو اسی سنہرے غول سے سابقہ پڑنے والا تھا جو سفاکی اور بربریت میں چنگیز خان سے کسی طرح کم نہیں تھا۔
تیمور نے توقتمش سے ملاقات کے بعد جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور کسی اہم موقع کا منتظر تھا۔ توقتمش کی آمد کی خبر کو پہلے تو پوشیدہ رکھا گیا لیکن جب یکایک تیموری لشکر میں جنگی تیاریاں شروع ہوئیں تو سمرقند کے باشندوں کے تجسس میں اضافہ ہوتا گیا۔
تیمور نے رازداری ختم کر دی اور توقتمش کو سمرقند کے قلعے میں آنے اور گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی تاکہ

سمرقندیوں اور تیموری لشکر کے لیے توقتمش کی ذات اجنبی نہ رہے۔

امیر تیمور کو وہ موقع یا قدرت کا اشارہ جلد ہی مل گیا جس کا وہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ تیمور ابھی تیاریوں میں مصروف تھا کہ خاقان ارس خان کا قاصد سمرقند پہنچ گیا

تیمور نے صحیح اندازہ لگایا تھا کہ ارس خان، شہزادہ توقتمش کا سمرقند میں قیام برداشت نہیں کرے گا اور اس کی واپسی کا مطالبہ کرے گا۔

تیمور نے ارس خان کے قاصد سے فوراً ملاقات نہیں کی بلکہ اسے مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ دراصل تیمور چاہتا تھا کہ قاصد شہزادہ توقتمش کی وہ شان و شوکت دیکھ لے جو اسے تیمور نے عطا کی تھی۔ امیر تیمور کے حکم سے شہزادے کو تاتاری امیروں کا بیش قیمت لباس دیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ سمرقند کے بازار کی سیر کو آئے۔

تیمور نے درپردہ ایک سردار کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ ارس خان کے قاصد کو سمرقند کی سیر کے بہانے لے جائے اور اسے کسی ایسی جگہ کھڑا کر دے جہاں سے وہ توقتمش کی شاہانہ سواری کا نظارہ کر سکے۔ ان کے ساتھ ہی اس بات کا اہتمام بھی کیا کہ توقتمش کی سیر کے دوران بازاروں میں لوگوں کا زیادہ ہجوم ہو اور وہ شہزادے کو زور شور سے خوش آمدید کہیں اور اس کے حق میں نعرے لگائیں۔

دوسرے دن بازاروں میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ پورا سمرقند توقتمش کے استقبال کو امڈ آیا۔ اس وقت تک چِشتمانیہ کو توقتمش کے سمرقند پہنچنے کی کوئی خبر نہ تھی۔ جب محلات میں یہ خبر اڑی کہ آج کسی اجنبی ملک کا شہزادہ سمرقند کی سیر کو آنے والا ہے تو کنیزوں اور غلاموں نے بھی شہزادے کو دیکھنے کی اجازت چاہی۔ ملکہ سرائے خانم کی کنیزوں نے ملکہ کو مجبور کیا کہ وہ بھی آج سمرقند کی سیر کو چلے تاکہ کنیزیں بھی مغل شہزادے کو دیکھ سکیں۔ ملکہ آمادہ ہو گئی۔

چِشتمانیہ نے جب سے مغل شہزادے کی آمد کے بارے میں سنا تھا وہ ایک الجھن میں گرفتار تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مغلوں کا کون سا شہزادہ سمرقند آ سکتا ہے جبکہ مغلوں کے تمام سردار تیمور کو تیمور لنگ کہا کرتے ہیں۔ اس نے بھی سرائے خانم کے ساتھ جانے کی درخواست کی۔ سرائے خانم نے ایک لمحے کے بعد مسکرا کر ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت سرائے خانم کی مسکراہٹ بڑی پر اسرار تھی جسے سمجھنے سے قاصر تھی۔

"ہٹو بچو۔ مغل شہزادے کی سواری آتی ہے۔"

دو نقیب پرچم اٹھائے، آوازیں لگاتے سمرقند کی شاہراہ پر نمودار ہوئے۔ نقیبوں کے پیچھے تاتاری گھڑ سوار تھے۔ پیدل، نقارے سجی ہوئی گاڑیوں پر رکھے تھے۔ نقاروں پر چوٹ پڑ رہی تھی اور طبل کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر دو سو گھڑسواروں کا دستہ نمودار ہوا۔ تاتاری بانکے سوار نک سک سے درست، چار چار کی قطار میں گھوڑے دوڑاتے آتے دکھائی دیے۔ آخر میں مغل شہزادے کی سواری تھی۔ خلعتِ فاخرہ میں ملبوس، سر پر زرنگار چھتر لیے ہوئے، دائیں بائیں محافظ سوار، پشت پر کنیزیں اور غلام، پھولوں کی بارش کرتے آ رہے تھے۔ شہزادے کی سواری ابھی شاہراہ طے کر چکی تو نقیبوں نے ایک ایسا نعرہ بلند کیا جس پر کچھ لوگ چونک پڑے۔ ایک نقیب نے پرچم سر سے بلند کر کے نعرہ لگایا:

"خوش آمدید مغل خاقانِ شرق و غرب توقتمش خان۔"

یہ نعرہ بلند ہوتے ہی چِشتمانیہ نے گھبرا کر گردن گاڑی سے باہر کی طرف نکال دی۔ وہ ملکہ سرائے خانم کے ساتھ گاڑی میں سوار ایک بلند مقام سے اس سواری کو بڑی بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ توقتمش کا نام سن کر ایک لمحے کے لیے تو اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر وہ گھبرا کر باہر دیکھنے لگی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے شوہر کا قاتل جس سے انتقام لینے کی اس نے قسم کھائی تھی، وہ اس کے اتنے قریب اور اس شان سے نمودار ہو گا۔ اس کی نگاہیں توقتمش پر جمی ہوئی تھیں جس کی سواری اس سے صرف دس قدم دور سے گزر رہی تھی۔ توقتمش غرور سے سر اٹھائے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔

چِشتمانیہ کے ہاتھ پیروں میں سنسناہٹ پیدا ہوئی اور دل بیٹھنے لگا۔ اس نے سر گھما کر ملکہ کو دیکھا۔ ملکہ سرائے خانم بڑی دلچسپی سے توقتمش کی سواری کا جلوس دیکھ رہی تھی لیکن اس نے چِشتمانیہ کی بے چینی اور گھبراہٹ بھی محسوس کر لی تھی مگر اس طرح بیٹھی تھی جیسے اسے کسی بات یا کسی ردعمل کا علم نہ ہو۔

چِشتمانیہ سے ضبط نہ ہو سکا تو اس نے ڈوبتی آواز میں کہا:

"ملکہ تاتار....." اس کا گلا خشک ہو گیا۔

"ہاں چِشتمانیہ..... کہو؟" ملکہ نے بغیر چِشتمانیہ کی طرف دیکھے کہا۔

"ملکہ تاتار....."

چِشتمانیہ نے پوری طاقت ہونٹوں پر جمع کر کے کہا مگر وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا سر چکرانے لگا اور وہ گاڑی کی پشت سے سر لگا کر بے ہوش ہو گئی۔

سرائے خانم کو چِشتمانیہ سے اسی قسم کے ردعمل کی توقع تھی اس لیے فوراً واپسی کا حکم دیا اور چِشتمانیہ کو لے کر محل میں آ گئی۔

ادھر توقتمش کے اس شاہانہ جلوس کا ارس خان کے قاصد پر تقریباً اتنا ہی شدید ردعمل ہوا۔ قاصد کو تیمور کا

ایک سردار قصداً یہ جلوس دکھانے لایا تھا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ تیمور سے توقتمش کا شاندار جلوس کر اُرس خان کو شریفانہ جواب دیا تھا۔ توقتمش کی ایسی آؤ بھگت کے بعد یہ کس طرح ممکن تھا کہ تیمور اسے اُرس کے حوالے کر دے۔ اسے تیمور پر غصہ بھی آ رہا تھا کیونکہ اس نے توقتمش کے لیے "خاقانِ مشرق و مغرب" کا نعرہ لگایا۔ اُرس خان کی سراسر توہین تھی۔

قاصد جلوس گزرنے کے دوران دانت کٹکٹاتا رہا اور دل ہی دل میں تاؤ کھاتا رہا۔ اسے پیغام دیئے ہی تیمور کا جواب مل گیا تھا لیکن وہ پیغام دیئے بغیر واپس نہیں جا سکتا تھا۔

○

چغتانیہ کو محل پہنچتے پہنچتے ہوش آ گیا تھا۔ وہ چپ چاپ ہی گاڑی سے اتری اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کسی نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور کوئی بات نہ کی۔

جب چغتانیہ کے حواس بجا ہوئے تو ملکہ سرائے خانم کے پاس آئی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے اور مختلف قسم کے وسوسوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

چغتانیہ، ملکہ کے پاس جا کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کس طرح کرے۔ ملکہ کو اس کے دلی جذبات کا اندازہ تھا لیکن وہ چاہتی تھی کہ چغتانیہ خود بات کرے۔

"آپ کیسی طبیعت ہے؟" ملکہ نے خاموشی سے اکتا کر پوچھ ہی لیا۔

"شکر ہے۔"

چغتانیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی:

"خدا اپنے بندے کو جس حال میں رکھے، بندے کو اس کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے۔"

"چغتانیہ!" ملکہ نرمی سے بولی:

"تمہیں ہم سے شکایت پیدا ہوئی ہے لیکن تم حالات کا تجزیہ کرو گی تو تمہاری یہ شکایت خود ہی دور ہو جائے گی۔"

"ملکہ تاتار!" چغتانیہ نے سسکی بھر کر کہا:

"میں آپ سے کیا شکایت کر سکتی ہوں۔ تقدیر میں جو ہو گا وہ تو دیکھنا ہی پڑے گا۔ کاش میں یہاں نہ آتی۔ جلوس دیکھنے نہ جاتی۔"

سرائے خانم نے محبت سے کہا:

"جو ہو چکا اس پر پچھتانا بیکار ہے۔ قدرت کس سے کیا کام لینا چاہتی ہے اس کا کسی کو علم نہیں۔ آج توقتمش کے اس عروج پر تمہارا دل کڑھتا ہو گا لیکن کل کیا ہو گا اس کا کسی کو پتہ نہیں۔"

"ملکہ تاتار..... کیا آپ کو علم تھا کہ توقتمش یہاں آیا ہوا ہے؟" چغتانیہ کو جیسے بھولا ہوا سوال یاد آ گیا۔

"ہاں چغتانیہ..... " ملکہ سرائے خانم نے نرم لہجے میں کہا:

"امیر نے ہمیں منع کر دیا تھا۔ وہ تمہاری دل آزاری نہیں چاہتے تھے..... مگر جب تم نے جلوس دیکھنے کی ضد کی تو ہم انکار نہ کر سکے۔"

"شاہِ تاتار کی باتیں میری سمجھ سے بہت بلند ہیں۔" چغتانیہ نے الجھتے ہوئے کہا:

"اگر امیر میرے دشمن کی یوں عزت افزائی کرنا چاہتے تھے تو پھر مجھ غریب کو اپنی پناہ میں کیوں لیا۔ ظالم توقتمش کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا تھا اور دل چاہتا تھا کہ اس کے سینے میں اپنا خنجر اتار دوں۔"

"نادان لڑکی..... " سرائے خانم نے ذرا سختی سے کہا:

"تمہارے لیے یہ سوچنا بھی جرم ہے۔ توقتمش بھی امیر تیمور کی پناہ میں ہے اور امیر اپنی پناہ میں آنے والے کسی کی ٹیڑھی نظر بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو اگر تم نے ایسی غلطی کرنے کی کوشش کی تو امیر کے ہاتھوں ماری جاؤ گی!"

"ملکہ تاتار!" چغتانیہ رونے لگی اور بڑی دکھی آواز میں بولی:

"خدا کے لیے مجھے یہ تو سمجھا دیجئے کہ یہ کون سا دستور ہے کہ ظالم اور مظلوم دونوں کو ایک ہی دامن میں پناہ ملے۔ دشمن ایک ہی درخت کے سائے تلے کیسے گزارا کر سکتے ہیں؟"

"ایسا ممکن ہے اور اس کی مثال تم اور توقتمش ہو۔"

ملکہ نے اسے سمجھایا:

"اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ امیر نے تمہیں پناہ دی تھی تو اس کی وجہ صرف انسانی ہمدردی تھی اور توقتمش کو پناہ دینا امیر کی سیاسی مصلحت اور ملکی ضرورت ہے۔ حکومت کی اپنی الگ مصلحتیں ہوتی ہیں۔ کبھی میدان میں دشمن کے سینے میں تلوار اتاری جاتی ہے تو کبھی اسی دشمن کو سینے سے لگایا جاتا ہے۔ امیر کو تمہارے کرب کا احساس ہے لیکن وہ سیاسی طور پر توقتمش کو بھی پناہ دینے پر مجبور تھے۔ تاہم تمہیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیا توقتمش کو معلوم ہے کہ میں آپ کے قدموں میں موجود ہوں؟" چغتانیہ کو ایک اور سوال یاد آ گیا۔

"ہرگز نہیں"۔ ملکہ نے اسے تسلی دی:

"اگر اسے علم ہو جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ بات تو تیمتش بھی جانتا ہے کہ امیر تیمور کی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا"۔

ملکہ سرائے خانم کا جواب اس قدر واضح تھا کہ چشتانیہ کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے خود کو کے حوالے کر دیا...... اور تقدیر پہ شاکر ہو کے بیٹھ گئی۔

O

دوسرے دن امیر تیمور نے ارس خان کے قاصد کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ دربار میں تاتاریوں بڑے تمام سردار موجود تھے۔ تیمور بعض اہم فیصلوں کے وقت دربار میں صوفیائے کرام اور علمائے دین کو بھ اس وقت وہاں کئی صوفی اور عالم بھی دکھائی دے رہے تھے۔

تیمور روایتی نمدے کی مسند پر بڑی تمکنت سے بیٹھا تھا۔ مغل شہزادے تو تیمتش کو اس نے پہنا کر اپنی پشت پر کھڑا کیا تھا تاکہ قاصد پر یہ واضح ہو جائے کہ امیر تیمور کے دل میں اب تک مغلوں کی عزت وہ مغلوں کو بادشاہ تو سمجھتا ہے لیکن اب ان کی جگہ شاہی مسند نہیں بلکہ امیر تیمور کی پشت پہ کھڑے ہو کر اس کے لیے دعا کرنا اور دربار یہ تیمور کی شان بڑھانا ہے۔

خاقان ارس خان کے قاصد کو دربار میں سرداروں کے درمیان کھڑے ہونے کی اجازت دی گئی میں سناٹا تھا۔

امیر تیمور نے قاصد کو مخاطب کیا:

"اے مغل حاکم ارس خان کے قاصد...... ہم تجھے تیموری دربار میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ آگے قدم وہ پیغام پیش کر، جو مغل حاکم نے ہمیں بھیجا ہے"۔

قاصد نے تیمور کی نظروں سے نظریں ملائیں لیکن مرعوب ہو گیا اور نظر نیچی کرتے ہوئے بولا:

"خاقان کا پیغام زبانی ہے۔ بیان کرنے کی اجازت دی جائے"۔

"اجازت ہے۔ پیغام سب حاضرینِ دربار کے سامنے سنایا جائے"۔ تیمور مسند پہ پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔

قاصد نے دربار پہ طائرانہ نظر ڈالی۔ پھر پوری آواز سے گرج کر کہا:

"اے تیمور لنگ......!"

قاصد کی زبان سے یہ الفاظ نکلنا تھے کہ دربار میں ایک ساتھ کئی تلواریں نیام سے نکل آئیں۔ تاتاری سرداروں کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے، پتلیاں چڑھ گئیں اور سرگوشیوں کی سرسراہٹ یوں بلند ہوئی جیسے کسی نے شہد کی مکھیوں کو چھیڑ دیا ہو۔ اور وہ بھنبھناتی ہوئی کسی تنگ جگہ گھس آئی ہوں مگر تیمور کے چہرے پہ ایک شکن تک نہیں اس تحقیر آمیز خطاب پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

قاصد نے کہنے کو تو جوشِ خطابت میں تیمور کو "تیمور لنگ" کہہ دیا لیکن تاتاری سرداروں کے بگڑے تیور اور نیام سے جھانکتی ہوئی تلواریں دیکھ کر اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ وہ بجائے آگے کچھ کہنے کے، چپ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

ایک مغل سردار آگے بڑھ کر بولا:

"اے امیرِ تاتار! مجھے اجازت دی جائے کہ اس گستاخ کا سر قلم کر دوں"۔

تیمور نے سردار کو جواب دینے کے بجائے سر گھما کر صوفیائے کرام اور علمائے دین کی طرف دیکھا اور متانت سے کہا:

"اے دینِ اسلام کے نقیبو! اگر کسی ملک کا قاصد گستاخی پر آمادہ ہو، جو کہ ہمارے خیال میں گستاخی نہیں ہے تو اس کے بارے میں شرع کیا کہتی ہے؟"

"اے امیرِ تاتار!" ایک عالم نے جواب دیا:

"قاصد کسی ملک اور کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ اسلامی روایات کے تحت وہ صرف قاصد ہے۔ اس کی کسی بات کلام یا اندازِ گفتگو پر نہ تو گرفت کی جا سکتی ہے اور نہ سزا دی جا سکتی ہے"۔

اسی وقت تیمور دربار میں موجود مغل سردار بیان آگے بڑھا۔ یہ نوجوان بڑا جوشیلا تھا اور جتہ مغلوں کے بڑی خاقان کے سپہ سالار بیک جک کا بیٹا تھا جس وقت مغلوں کو شکست ہوئی تھی تو بیک جک گرفتار ہو کر تیمور کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ تیمور نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے دشمن کے سپہ سالار کی جان بخشی کی تھی۔ بیک جک اس سلوک سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ مغل لشکر میں جانے کی بجائے وہ تیمور کا ملازم ہو گیا تھا۔ بیان نے یہ سب کچھ دیکھا تھا دراصل باپ کے بعد اب خود بھی تیموری لشکر میں ایک اعلیٰ سردار کی حیثیت سے ملازم تھا۔ اس نے سر جھکا کر بھاری آواز بلند کہا:

"اے شاہِ تاتار اور امیرِ عالم! میں نہیں جانتا کہ تاتاریوں میں گستاخ قاصدوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے لیکن میں مغل ہوں اور مغل اپنے بادشاہ کی توہین کسی کی زبان سے بھی نہیں سن سکتے۔ اگر تاتاری سرداروں کو اس گستاخ قاصد کا سر قلم کرنے میں ہچکچاہٹ ہے تو مجھے اجازت دی جائے۔ میں اپنے خنجر سے اس کی زبان تراشوں گا تاکہ امیر کی شان میں آئندہ کوئی گستاخی نہ کر سکے"۔

تیمور نے اسے اشارے سے روک دیا اور قاصد سے بولا:

"ارس خان کا نامہ ابنا بیاں جاری رکھے اور ہماری ناراضگی کی قطعی پروا نہ کرتے ہوئے پیغام کے وہ الفاظ دہرائے جو ارس خان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔"

قاصد نے سنبھل کر کہنا شروع کیا:

"میرے خاقان نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو ان الفاظ میں پیغام دوں..... اے تیمور لنگ! ارس خان جو حاکمِ شرق و غرب اور سنہرے غول، نیلے غول اور سفید غول کا خاقان ہے، توقتمش نے اس کے بیٹے کو قتل کر دیا اور تمہارے پاس پناہ لی ہے۔ اسے میرے حوالے کر دو، ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"اے علمائے کرام!" تیمور نے علماء کو مخاطب کیا۔

"پناہ میں آئے ہوئے شخص کے لیے کیا حکم ہے؟"

"پناہ میں آیا ہوا شخص پناہ دینے والے کے لیے اس کی جان سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔" ایک عالم دین نے فوراً جواب دیا۔

"شرافت، دوستی اور مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا کہ پناہ میں آئے ہوئے شخص کو کسی خوف یا لالچ کے تحت اس کے دشمن کے حوالے کر دیا جائے۔"

تیمور ایک لمحے تک خاموش رہا۔ اس نے سر جھکا کر کچھ سوچا۔ شاید وہ جواب کے لیے الفاظ تلاش کر رہا تھا۔ اس نے بڑے وقار سے پہلے اپنے سرداروں کو مخاطب کیا:

"اے سلطنتِ تیموریہ کے وفادارو! تمہیں یہ بات ناگوار گزری کہ ارس خان نے تمہارے امیر کو تیمور لنگ کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ تمہارا غم و غصہ اپنی جگہ۔ لیکن یقین کرو کہ میں اس طرح کے خطاب سے خوش ہوتا ہوں۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ مجھے یہ علم ہو جاتا ہے کہ ابھی میری مملکت کے ارد گرد ایسے خود سر لوگ موجود ہیں جو میری تذلیل اور تحقیر برسرِ عام کرنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب مجھے کوئی تیمور لنگ کہتا ہے تو مجھے اپنے آباؤ اجداد کا یہ قول یاد آ جاتا ہے کہ بہادروں کی اصل جگہ محلاتِ شاہی نہیں بلکہ گھوڑے کی پیٹھ اور میدانِ جنگ ہے اور بہادروں کی مردانگی زخم کھا کر مسکرانا اور زخم پہنچا کر خوش ہونا ہے۔"

تیمور ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے قاصد کی طرف دیکھ کر کہا:

"اے ارس خان کے سفیر! تم نے دیکھ لیا کہ شہزادہ توقتمش ہمارے ساتھ ہے اور اس دربار میں موجود ہے اور ہم اس مغل شہزادے کا کس قدر احترام کرتے ہیں۔ شہزادے کو ہم نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ جاؤ اور ارس خان سے کہہ دو کہ ہم نے اس کا پیغام سن لیا ہے اور پورا تاتاری لشکر مغل شہزادے کی حفاظت کرے گا۔ ہم اسے تمہارے ظلم سے بچائیں گے۔ ارس خان سے یہ بھی کہنا کہ اس نے تاتاریوں کو جنگ کے لیے للکارا ہے تو تاتاری بھی اسے

دعوت دیتے ہیں۔"

تیمور کے اعلان سے دربار میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سرداروں نے نعرے بلند کرنا شروع کر دیے اور قاصد کے جاتے ہی جنگی تیاریوں میں اضافہ کر دیا گیا۔

جنگ ناگزیر ہو چکی تھی۔ تیمور کو سنہرے غول سے جلد یا بدیر جنگ تو کرنا ہی تھی۔ توقتمش کی آمد نے اس جنگ کو قریب کر دیا تھا۔ تیمور نے توقتمش کو سرحد کے دو قلعے دیے۔ یہ قلعے اس نے حال ہی میں مغلوں سے چھینے تھے۔ توقتمش کی ضرورت کے مطابق تاتاری سپاہی اور افسر دیے گئے..... بے شمار زر و جواہر کے علاوہ اس کے لیے ہتھیاروں، اونٹوں، گھوڑوں حتیٰ کہ نقارہ، طبل اور علم کا بھی انتظام کر دیا گیا۔

جب شہزادے توقتمش کا لشکر کیل کانٹے سے درست ہو گیا تو تیمور نے اسے شمال کی طرف بڑھنے اور قسمت آزمائی کی اجازت دے دی۔ تمام بڑے بڑے تاتاری سردار شہزادے کو الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔

توقتمش بے حد خوش تھا۔ وہ بڑی شان سے گھوڑے پر سوار ہوا مگر گھوڑے پر بیٹھتے ہی کچھ ایسا مغرور ہوا کہ اس نے تیمور کو الوداعی سلام بھی نہیں کیا اور لشکر لے کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تیمور نے اس کی اس کوتاہی کو بدحواسی پر محمول کیا اور خاموش رہا۔

O

خاقان ارس خان کو تیمور کا جواب پہنچ چکا تھا اور وہ تیار ہو کر تاتاری سرحدوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ توقتمش کی ارس خان کے لشکر سے جلد ہی مڈبھیڑ ہو گئی۔ ارس خان کے لشکر کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ پہلے بھی توقتمش کو شکست دے چکے تھے۔

توقتمش کو ارس خان سے اس قدر جلد جنگ ہونے کا خیال ہی نہ تھا۔ وہ ارس خان کو اپنے سر پر دیکھ کر گھبرا گیا۔ تاتاری لشکر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن توقتمش کو اپنی پہلی شکست کا خیال آ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ ارس خان کے ہاتھوں مارا جائے اس لیے دباؤ پڑتے ہی اس نے پسپائی اختیار کی۔ توقتمش کے باوجود تاتاری سرداروں نے مشورہ دیا کہ اگر ہم اسی طرح پسپا ہوتے رہے تو ہماری شکست یقینی ہے۔ ہمیں ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے لیکن توقتمش دشمنوں سے اس قدر مرعوب ہو گیا تھا کہ وہ قدم نہ جما سکا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے سرحد تک آ گیا۔ یہاں کچھ دیر تاتاریوں اور مغلوں میں زبردست مقابلہ ہوا لیکن توقتمش کی غلط حکمتِ عملی کی وجہ

سے تاتاری لشکر کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

توقتمش شکست کھا کر سمرقند آیا تو امیر تیمور نے اس سے باز پرس کرنے کے بجائے اس کی دلجوئی کی۔ تاتاری سرداروں نے امیر تیمور سے شکایت کی کہ توقتمش تاتاری لشکر کی سرداری کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس لیے اس کے بجائے کسی تاتاری کو سپہ سالار بنا کر بھیجا جائے لیکن امیر تیمور کو توقتمش کی شکست و فتح کی کچھ زیادہ پروا نہ تھی۔ اس نے تو مغلوں کے خلاف ایک طرح کی آزمائشی جنگ کا آغاز کیا تھا۔ اس جنگ کے ذریعے وہ ارس خان کی طاقت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا تاکہ جب خود میدان میں اترے تو پوری طرح تیار ہو اور ارس خان کی طاقت کا پہلے ہی وار میں خاتمہ کر دے۔

امیر تیمور نے شہزادہ توقتمش کو ایک اور موقع دیا۔ اس کے لیے پہلے سے زیادہ لشکر کا انتظام کیا گیا۔ تیمور کے دل میں کچھ ہی ہو لیکن وہ توقتمش پر بے حد مہربان نظر آتا تھا۔ دراصل وہ سانپ کو دشمن کی لاٹھی سے مارنا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد مغلوں کو مغلوں سے لڑانا تھا اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔

توقتمش خان اور ارس خان کی پہلی جنگ کے موقع پر کئی مغل قبائل توقتمش سے آملے تھے اور وہ توقتمش کی طرف سے ارس خان سے لڑے تھے۔ پھر جب وہ شکست کھا کر واپس آیا تو بہت سے مغل سوار اس کے ساتھ تھے۔ تیمور نے توقتمش کے لشکر کے لیے سرحد پر خیمے لگوا دیے تاکہ توقتمش کا ساتھ دینے والے مغل وہاں تک پہنچ کر اس کے لشکر میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ جب توقتمش نے دوسری بار دریائے سیر کو عبور کیا تو اس کے ساتھ کئی ہزار مغل سوار بھی ہو گئے۔

امیر تیمور نے شکست خوردہ توقتمش کو اس دفعہ بھی پہلے جیسی شان و شوکت اور اہتمام سے رخصت کیا اور اسے یہاں تک اعزاز بخشا کہ اپنا خاص گھوڑا توقتمش کو سواری کے لیے دے دیا۔

توقتمش نے جب دریا عبور کیا تو اس کا خیال تھا کہ ارس خان کا لشکر دوسری جانب موجود ہوگا لیکن وہاں ارس خان کے لشکر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ارس خان نے گو کہ توقتمش کو شکست دے دی تھی لیکن اس مختصر جنگ سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ تاتاری، روسیوں اور مغربی یورپ کے سواروں سے کہیں زیادہ چست چالاک اور بہادر ہیں۔ پھر اسے یہ بھی خیال تھا کہ ممکن ہے توقتمش کے عقب میں تیمور کسی بڑے لشکر کے ساتھ موجود ہو۔ اس لیے وہ اپنی کامیابی کے بعد پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے دریائے سیر سے کئی منزل دور اپنی خیمہ گاہ قائم کی تھی اور وہاں ٹھہر کر مزید لشکر جمع کر رہا تھا۔

توقتمش ٹڈی دل کی طرح شمال کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کی اس بڑھی ہوئی احتیاط پر، جسے تاتاری بزدلی سے تعبیر کرتے تھے، تاتاری سردار دل ہی دل میں ہنستے تھے مگر کوئی اعتراض نہ کر سکتے تھے کیونکہ تیمور نے توقتمش کو سپہ سالار مقرر کیا تھا اور تاتاری سرداروں کو اس کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔

توقتمش چیونٹی کی طرح دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ . . . پھر ایک دن جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ ارس خان اپنے لشکر کے ساتھ آندھی اور طوفان کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے۔ توقتمش نے فوراً پیش قدمی روک دی اور میدان میں مورچہ بندی شروع کر دی . . . حالانکہ اگر وہ چاہتا تو تلاش کر کے کوئی اچھا سا میدان منتخب کر سکتا تھا۔

توقتمش سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ جب ارس خان کا لشکر اس کے سامنے پہنچا تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ تاتاری سرداروں نے ارس خان کے تھکے ہوئے لشکر پر فوراً حملہ کرنے کی درخواست کی لیکن توقتمش شاید مدافعتی جنگ کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے لشکر کو مورچوں سے نکلنے کی اجازت نہ دی۔ دشمن کو آرام کرنے کا موقع مل گیا۔ رات کو سرداروں نے شب خون مارنے کا مشورہ دیا لیکن وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوا۔

. . . . پھر جب صبح ہوئی تو توقتمش، دشمن کی صف بندی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ارس خان اس دفعہ پہلے سے دگنی فوج کے ساتھ مقابل ہوا تھا۔ توقتمش کی ساری مورچہ بندی دھری کی دھری رہ گئی۔ . . . ارس خان کا ٹڈی دل لشکر امڈتا ہوا تاتاریوں پر آپڑا۔ تاتاریوں نے اس آندھی کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ توقتمش نے بھی اس دفعہ بہادری کا ثبوت دیا اور بڑی بہادری سے لڑا۔ اس کے جسم پر کئی زخم آئے مگر اس نے میدان نہ چھوڑا۔

ارس خان کے خاص دستوں نے توقتمش کو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار ان کا گھیرا توڑ کر نکل گیا۔ ارس خان نے اعلان کیا تھا کہ توقتمش کو زندہ پکڑا جائے تاکہ وہ اپنے بیٹے کے قاتل کو مقتول شہزادے کی قبر پر لے جا کر سولی پر چڑھائے لیکن ارس خان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

جب توقتمش لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو گیا اور اسے گھوڑے پر بیٹھنا مشکل ہو گیا تو اس نے تیمور کے جنگی گھوڑے کی گردن پر سر رکھ دیا اور اس کی راسیں چھوڑ کر ایال سے چمٹ گیا۔ سمجھدار گھوڑے نے اپنے سوار کی حالت کا اندازہ لگا لیا اور ان مغلوں پر جا پڑا جو توقتمش کو گھیرے ہوئے تھے۔ مغل سوار گھبرا کر ایک لمحے کے لیے ادھر ادھر ہوئے اور گھوڑا تیر کی طرح ان کے درمیان سے نکل گیا۔ مغل سوار ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

توقتمش کو ارس خان کے ہاتھوں دوبارہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے میدان سے نکلتے ہی تاتاری لشکر نے بھی میدان چھوڑ دیا۔ . . . ارس خان نے اب بھی احتیاط کا دامن نہ چھوڑا۔ اس نے اپنے لشکر کو تعاقب سے روک دیا اور خود پیچھے ہٹتا ہوا اسی جگہ واپس چلا گیا جہاں سے چل کر وہ توقتمش کے مقابلے پر آیا تھا۔

زخمی توقتمش جس وقت میدان سے نکلا تو سہ پہر تھی۔ گھوڑا اپنے سوار کو لیے شام تک بھاگتا رہا۔ جنگی گھوڑے بڑے سمجھدار ہوتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی ادراک ہوتا ہے کہ شکست کی صورت میں انہیں کدھر اور کہاں واپس جانا ہے۔ گھوڑا دریائے سیر پار کر کے شمال کی طرف بڑھتا تھا۔ . . . اندھیرا ہو جانے کے باوجود وہ کہیں نہ رکا۔

اور صبح کے قریب بھوکا پیاسا دریائے سیر کے کنارے پہنچ گیا۔

پھر جب گھوڑا رکا اور توقتمش کی نظر دریائے سیر پر پڑی تو وہ گھوڑے کی سمجھداری پر حیران رہ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے دریا پار کر کے وہ جنوب کی طرف روانہ ہوا تھا۔

توقتمش گھوڑے سے اترا۔ اس نے گھوڑے کے سر اور پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ گھوڑے نے ہنہنا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ توقتمش نے اُسے چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ . . . اور خود اپنے زخموں کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ مرہم پٹی سے فارغ ہوا گھوڑا بھی گھاس چر کر اور پانی پی کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ توقتمش کو اب اپنے پکڑے جانے کا خدشہ تھا اس لیے وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور دریا پار کر کے تاتاری علاقے میں پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر ایک نئے خیال نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا۔

توقتمش کی پہلی شکست کے سلسلے میں تیمور نے اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی تھی حالانکہ تاتاری سرداروں نے اس کی غفلت اور حکمت عملی کی شکایت کی تھی۔ توقتمش کو خوف پیدا ہوا کہ اس دوسری شکست پر تیمور اس سے ضرور باز پرس کرے گا اور پتہ نہیں، اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ پہلے اس نے دریا پار کر کے سمرقند جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب تیمور کے سامنے جاتے ہوئے اسے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر چند کہ اس نے ارس خان کے مقابلے میں بڑی شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا اور آخری وقت تک میدان نہ چھوڑا تھا لیکن بعض تاتاری سردار اس سے ناراض تھے اور وہ تیمور کے سامنے اس کی شجاعت کو گھٹا کر اور اس کی غلطیوں کو بڑھا کر پیش کر سکتے تھے۔ ان حالات اور خیالات نے اس کے قدم روک دیے اور وہ سمرقند کا سفر ملتوی کر کے گھوڑے سے اتر پڑا۔

توقتمش کے زخموں کی تکلیف تو کچھ کم ہو گئی تھی لیکن راستے کی تھکن سے جسم چور چور تھا۔ اس نے کچھ غذا اور تازہ پھل کھا کر پیٹ بھر لیا تھا لیکن اس کا دماغ سخت پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کدھر جائے؟

آخر اس نے گھوڑے کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود ایک سایہ دار درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ تھکن اور نیند کے غلبے نے اس پر ایسا حملہ کیا کہ وہ اسی حالت میں سو گیا اور ایسی گہری نیند سویا کہ دوپہر ڈھلے تک ہوش نہ آیا۔

یہ وہ وقت تھا کہ تاتاری لشکر کے شکست خوردہ، دو دو چار چار کر کے دریائے سیر کے کنارے پہنچ رہے تھے۔ ان سواروں کو شکست سے زیادہ توقتمش کے غائب ہونے کی فکر تھی۔ میدانِ جنگ میں جو سوار توقتمش کے قریب لڑ رہے تھے ان میں ایک سوار ان لوگوں میں موجود تھا۔ اس کا بیان تھا کہ اس نے توقتمش کو زخم کھا کر گھوڑے کی پیٹھ پر جھکتے دیکھا تھا۔ . . . پھر گھوڑا اسے لے کر میدان سے نکل گیا تھا۔ اس سے سواروں کو یہ تو اندازہ ہو گیا کہ توقتمش

زندہ ہے کیونکہ جب گھوڑا اسے لے کر میدان سے نکل گیا تو پھر اس کے پکڑے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"ہمارے امیر کا گھوڑا ہے۔" ایک سوار نے کہا۔

"ہمارے امیر پر خدا کی رحمت ہے اس لیے ان کا گھوڑا بھی سب سے زیادہ تیز رفتار ہے۔"

"پھر کیا عجب کہ وہ اس دریا پر ہم سے پہلے پہنچ گیا ہو۔" ایک بوڑھے برلاس سردار نے خیال ظاہر کیا۔

"ٹھیک ہے۔" دوسرے نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا:

"مجھے یقین ہے کہ وہ دریا پار کر کے سمرقند کی طرف گیا ہے اس لیے ہمیں بھی سمرقند چلنا چاہیے۔"

پھر سب سوار بوڑھے برلاس کے پیچھے پیچھے دریا پار کرنے لگے۔ بوڑھا برلاس سب سے آگے تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک طرف اٹھی اور وہ خوشی سے چلایا:

"امیر کا اقبال بلند ہو۔ اس کا گھوڑا ادھر چر رہا ہے۔"

گھوڑا دریا سے کچھ دور بڑے اطمینان سے ہری ہری گھاس چرنے میں مصروف تھا۔ وہ سب گھوڑے کے نزدیک پہنچے اور اس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ گھوڑا چند لمحوں تک ان کی طرف دیکھتا رہا پھر ہنہناتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا۔ آنے والے سب سوار اس کے پیچھے ہو لیے۔

گھوڑا میدان پار کر کے جنگل میں داخل ہوا اور اس درخت کے نیچے پہنچ گیا جہاں توقتمش گہری نیند میں پڑا تھا۔

"شہزادہ توقتمش . . . . سپہ سالار!" برلاس سردار نے اسے بڑے ادب سے آواز دی۔

توقتمش ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا:

"اوہ . . . . تم . . . . !" یہ کہتے ہوئے اس نے خجالت سے سر جھکا لیا۔

"شہزادے! دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

بوڑھے برلاس نے اسے تسلی دی:

"ہم نے امیر کی ضرور کوئی نافرمانی کی ہے جبھی ہمیں دوسری بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔"

توقتمش کے زخموں میں ابھی تکلیف تھی لیکن وہ خود کو سنبھال کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا:

"یہ امیر کی نافرمانی نہیں بلکہ ہماری اپنی غلطی ہے۔ بہرحال، اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میں تمہارا ہر مشورہ مانوں گا۔ [illegible] ہے تو بھی میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"نہیں شہزادے!" برلاس سردار سر ہلاتے ہوئے بولا:

"ہم نے شکست کھائی ہے۔ ہم امیر کے سامنے اس کا اعتراف کریں گے۔ آپ ہمارے ساتھ سمرقند واپس چلیے۔"

"میں کس منہ سے امیر کا سامنا کروں گا۔" توقتمش بڑے کرب سے بولا،
"اس سے تو بہتر تھا کہ میں میدان ہی میں قتل کر دیا گیا ہوتا۔"
"آپ نے دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی شہزادے۔" بوڑھا سردار نے متانت سے کہا:
"ہم دربار میں اس کی شہادت دیں گے۔ امیر کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے۔ وہ آپ کو معاف کر دیں گے۔ وہ صرف بزدلوں اور میدان سے بھاگنے والوں کو معاف نہیں کرتے۔ . . . . اور انہیں سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتے۔"

شہزادہ توقتمش نے سمرقند پہنچ کر بھی تین روز تک امیر تیمور کا سامنا نہیں کیا۔ تیمور کو معلوم تھا کہ شکست نے توقتمش کے حوصلے پست کر دیے ہیں۔ اس نے بھی توقتمش کو نہیں بلوایا۔ اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔
جب ایک ہفتے کے بعد توقتمش کی شرمندگی ذرا کم ہوئی اور اس کے زخم بھی بھر گئے تو وہ دربار میں گیا۔
تیمور نے اسے سابقہ مرتبے پر رکھا اور شکست کے بارے میں بھی اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ تیمور کو اس کے سرداروں سے شہزادے کی بہادری اور شجاعت کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں توقتمش کے لیے اب بھی ویسی ہی محبت اور مروت موجود تھی۔
توقتمش کے لیے کریمیا کی سرزمین دیارِ غیر ہو گئی اور اس کی بازیابی سے ناامید ہو گیا۔ اس نے یہی غنیمت جانا کہ سمرقند میں رہ کر زندگی کے باقی ایام تاتاریوں کی پناہ میں گزار دے۔ اس دوران اس کا چینتانیہ سے کئی بار آمنا سامنا ہوا۔ وہ چینتانیہ کو نہیں پہچانتا تھا لیکن چینتانیہ اپنے محبوب شوہر کے قاتل کو کس طرح بھول سکتی تھی۔ وہ جب توقتمش کو دیکھتی تو جوشِ انتقام سے سلگ اٹھتی . . . . مگر جلد ہی وہ اپنے جذبات پر قابو پا لیتی۔ اسے سرائے خانم کی تنبیہ اور تاکید یاد آ جاتی . . . . وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جس کی وجہ سے وہ اس پناہ گاہ سے بھی محروم ہو جائے۔
پھر جلد ہی مغلوں کے سنہرے غول میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ توقتمش کی قسمت نے یکایک پلٹا کھایا۔ اس کا طاقتور دشمن خاقانِ شرق و غرب ارس خان کا انتقال ہو گیا۔
اس اطلاع نے توقتمش کو قسمت آزمائی کا ایک سنہرا موقع دیا۔ اس نے تیمور سے کریمیا جانے کی اجازت چاہی۔

تیمور نے اسے غیر مشروط طور پر اجازت دے دی۔
"توقتمش جلد از جلد کریمیا پہنچنا چاہتا ہے۔" تیمور نے احتیاط کے طور پر اس کے ساتھ دس تاتاری سوار کر دیے کہ اگر توقتمش کو اقتدار حاصل ہو جائے تو یہ سوار اسے، امیر تیمور اور اس کے احسانات کی یاد دلاتے رہیں۔
سنہرے غول میں ارس خان کے مرنے سے ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا بیٹا پہلے ہی توقتمش کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی دوسری اولاد نہیں تھی۔ خاقانِ شرق و غرب کی جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوا تو اس علاقے کے کئی دعویدار کھڑے ہو گئے۔ فیصلہ سنہرے غول کے خاقانِ اعظم مائی خان کو کرنا تھا۔ اس فیصلے میں اسے یہ دشواری تھی کہ ارس خان کے علاقے میں شہزادہ توقتمش کے قبیلے کے لوگ زیادہ آباد تھے اور وہ توقتمش کے علاوہ کسی اور کو تسلیم کرنے پر رضامند نہ تھے۔
مائی خان اگرچہ توقتمش کا قریبی عزیز تھا لیکن توقتمش نے ارس خان کے بیٹے کو بلاوجہ قتل کر کے جو فتنہ اٹھایا تھا اس سے وہ توقتمش کے خلاف ہو گیا تھا . . . . پھر وہ دوبارہ ارس خان کے مقابلے پر تاتاری لشکر لے کر آیا، اس نے مائی خان کو توقتمش سے اور زیادہ برگشتہ کر دیا۔
مائی خان ابھی اپنے مرکز سرائے باتو میں بیٹھا اس جانشینی کے مسئلے پر اپنے سرداروں سے مشورہ کر رہا تھا کہ شہزادہ توقتمش بڑی خاموشی سے کریمیا میں داخل ہوا۔
وہ ایک اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ توقتمش بے دھڑک کریمیا کی سرحدی چوکی میں داخل ہوا۔ خیموں پر مشتمل یہ چوکی ارس خان نے قائم کی تھی۔ چوکی کے مغل محافظ آگ کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سواروں کی ٹاپیں سن کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
"کون ہے؟" ایک محافظ نے تلوار کھینچ کر آواز لگائی۔
توقتمش کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ اس نے بغیر رکے جواب دیا:
"والیِ کریمیا، شہزادہ توقتمش۔"
شہزادے کا نام سن کر محافظوں کے ہاتھوں میں تلواریں کانپنے لگیں۔ توقتمش آگ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ تمام محافظ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ توقتمش تلوار بلند کیے بڑی شان سے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ پھر اس کی بارعب آواز گونجی:
"دوست یا دشمن؟ . . . . جنگ یا امن؟ . . . . جواب دو۔"
"آقا! ہم آپ کے سامنے ہتھیار کیسے اٹھا سکتے ہیں؟" ایک محافظ نے سر جھکا کر کہا اور تلوار زمین پر پھینک

دوسرے محافظوں نے بھی تلواریں پھینک دیں۔ توقتمش نے تلوار نیام میں ڈالی اور مسکراتا ہوا گھوڑے سے
اترا۔ تاتاری سوار بھی آگ کے قریب پہنچ چکے تھے اور مغل محافظ انہیں تیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
"ان سے خطرہ نہیں۔ یہ دوست ہیں۔" توقتمش نے مغل محافظوں کی نظریں پڑھتے ہوئے کہا:
"انہیں ایک خیمے میں ٹھہراؤ۔"
تاتاری سواروں کے لیے ایک خیمہ خالی کر دیا گیا۔ انہوں نے گھوڑے قریب ہی باندھ دیے اور خیمے
میں چلے گئے۔
توقتمش کے آنے کی خبر پوری چوکی میں پھیل گئی۔ خیموں میں سونے والے محافظ بھی جاگ پڑے اور شہزادے
کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس کے گرد جمع ہو گئے۔
ارس خان نے کریمیا پر قبضہ کرنے کے بعد وہیں کے ایک سردار کو کریمیا کا عارضی حاکم بنا دیا تھا۔ اس لیے
بھی کریمیا کے فوجی، محافظوں کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ پرانے آقا کو اپنے درمیان دیکھ کر وہ بہت خوش
ہو رہے تھے۔ وہ شہزادے کو ایک بڑے خیمے میں لے گئے اور پھر وہاں باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
توقتمش کے ساتھ آنے والے تاتاری سوار خیمے میں بیٹھے بری طرح پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ ان کا خیمہ
شہزادے کے بڑے خیمے سے کچھ فاصلے پر تھا۔۔۔۔ پھر بھی شہزادے کے خیمے سے بلند ہونے والے قہقہوں کی
آوازیں وہاں تک پہنچ رہی تھیں، جنہیں سن کر انہیں زیادہ تاؤ آ رہا تھا۔ رات کا کھانا انہوں نے ابھی تک نہیں
کھایا تھا۔ حالانکہ ان کے پاس سفری خشک غذا موجود تھی لیکن توقتمش نے انہیں روک دیا تھا اور کہا تھا کہ چوکی
پر پہنچ کر شاندار کھانا کھائیں گے اور اب شہزادہ اپنوں میں پہنچ کر تاتاری سواروں کو بالکل فراموش کر بیٹھا تھا۔
آدھی رات گزر جانے کے باوجود انہیں اب تک کھانا نہیں بھیجا گیا تھا۔۔۔۔ پھر انہوں نے مجبور ہو کر توقتمش کے
کھانے پر لعنت بھیجی اور ایک ساتھی کو باہر بھیجا کہ وہ خورجیوں میں کھانے کو جو کچھ موجود ہو لے آئے۔
ایک تاتاری خیمے سے باہر نکلا۔ انہوں نے گھوڑے ابھی نہیں کھولے تھے، سب سامان ان پر لدا تھا۔ تاتاری
گھوڑے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ توقتمش کے خیمے سے ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اس قہقہے میں بہت سے لوگوں
کی آوازیں شامل تھیں۔
تاتاری کو توقتمش کی اس بے مروتی اور لاپروائی پر سخت غصہ آیا۔ وہ خورجیوں سے کھانا نکالنے کے بجائے
توقتمش کے خیمے کی طرف بڑھا۔
مغل محافظوں کے تمام خیمے اسے خالی معلوم ہوئے۔ وہ سمجھ گیا کہ تمام محافظ، شہزادے کے خیمے میں جمع
خوشیاں منا رہے ہیں۔

تاتاری احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا توقتمش کے خیمے کے پاس پہنچ گیا۔ خیمے کا پردہ اٹھا ہوا تھا اور خیمہ درجنوں
شمعوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ محافظ شہزادے کو گھیرے بیٹھے تھے۔ پھر یہ دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ
لگ گئی کہ یہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ کوئی بکرے کی ٹانگ بھنبھوڑ رہا تھا۔۔۔۔ اور کوئی گوشت کے بڑے بڑے
ٹکڑے نگل رہا تھا۔
تاتاری خیمے کی پشت پر پہنچ گیا۔ خیمے میں خاموشی تھی۔۔۔۔ سب کھانے میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر
بعد ایک محافظ کی آواز سنائی دی۔ وہ توقتمش سے کہہ رہا تھا:
"آقا! تاتاریوں نے آپ کا کتنا ہی ساتھ دیا ہو لیکن مغل، ان کا سایہ تک برداشت نہیں کر سکتے۔"
"ایسا ہی ہونا چاہیے۔" توقتمش نے اطمینان سے جواب دیا:
"میں خود تاتاریوں سے نفرت ہے لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ جب تک ہم پوری طرح طاقت حاصل نہ کر لیں۔
تب تک تاتاریوں سے دوستی رکھیں۔"
"میں آقا کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔" محافظ نے کہا:
"لیکن کریمیا اور شمال علاقوں پر آپ اسی وقت قابو پا سکتے ہیں جب مغل قبائل آپ سے تعاون کریں۔"
"آخر تعاون نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟" توقتمش سخت لہجے میں بولا:
"کیا ہم کریمیا کے حاکم نہیں۔ کیا ہماری رگوں میں مغل خون موجود نہیں ہے؟"
"یہ درست ہے آقا!" محافظ نے جواب دیا:
"لیکن میری درخواست ہے کہ آپ کوئی نیا تجربہ نہ کریں۔ مغل، تاتاریوں کے خلاف ہیں۔ آپ ان تاتاری
سواروں کے ساتھ آگے بڑھیں گے تو کریمیا کے مغل بھڑک اٹھیں گے۔ سمرقند میں پناہ حاصل کرنے سے آپ کے
بارے میں غلط فہمی ہو گئی ہے۔"
تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر توقتمش بولا:
"پھر تمہارا کیا مشورہ ہے؟ ہمیں مغلوں کا تعاون تو ہر صورت میں حاصل کرنا ہے۔"
"آقا! میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں؟" محافظ نے انکسار سے کہا:
"میرے خیال میں اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہم تاتاریوں کو ساتھ لے جانے کی بجائے صرف ان کے
سر نیزوں پر بلند کر کے آگے بڑھیں۔ تاتاریوں کے سر دیکھ کر مغل بہت خوش ہوں گے اور آپ کا ساتھ دینے پر
تیار ہو جائیں گے۔"
تاتاری سوار کو جو خیمے کے پیچھے کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا، اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ اس نے

توقتمش کا جواب بھی سنا اور ذرا پیچھے ہٹ کر اپنے خیمے کی طرف بھاگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہانپتا کانپتا پہنچا تو
اس کے ساتھی گھبرا گئے۔

"بھاگو بھاگو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی بھاگو۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

"کیوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟" اس کے ساتھیوں نے ہر طرف سے اس پر سوالوں کی بوچھار
"وہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مغل ہمیں قتل کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ سب کو مار دیں گے۔" تاتاری نے
سنبھالتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر تیزی سے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

دوسرے ہی لمحے تمام تاتاری اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر کریمیا سے جلد از جلد نکل جانے
گھوڑے بھگائے چلے جا رہے تھے۔ تاتاری جس راستے سے کریمیا میں داخل ہوئے تھے، وہ اس سے
تھے مگر رات کا وقت، پھر گرفتاری کا دھڑکا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پتہ نہیں وہ کدھر کے کدھر نکل گئے۔ اس پر ستم یہ
ہی دیر بعد انہیں اپنے پیچھے گھوڑے بھاگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انہیں یقین ہو گیا کہ مغل ان کا
رہے ہیں۔ اس سے ان پر اور بدحواسی طاری ہو گئی۔ اور وہ زیادہ اندھا دھند بھاگنے لگے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ٹکڑیوں میں بٹ گئے اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر جب
اور انہیں اپنی سرحد قریب دکھائی دی تو ان کی جان میں جان آئی مگر سرحد پر پہنچنے والوں کی تعداد گھٹ
گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باقی پانچ کا پتہ نہ تھا کہ کہاں گئے اور ان پر کیا بیتی۔ دن چڑھے تک انہوں نے ان
کا انتظار کیا۔ پھر مایوس ہو کر سمرقند کی طرف روانہ ہو گئے۔

⊙

تیمور کو توقتمش کی بڑی فکر تھی کیونکہ وہ مغل شہزادہ، جنگی بساط کا ایک اہم مہرہ تھا۔ اس نے اپنے
کو آگے بڑھا کر ارس خان کو شہ دی تھی مگر یہ چال الٹی ہو گئی۔

کریمیا سے واپس آنے والے پانچوں سواروں نے جب کریمیا کی پہلی چوکی پر رونما ہونے والے
حال بتایا تو تیمور سناٹے میں آ گیا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ توقتمش اس سے بے وفائی کر سکتا ہے۔
تیمور نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے ایک سوار سے پوچھا:

"تم میں سے کون توقتمش کے خیمے پر گیا تھا اور اس نے وہاں کیا سنا۔ کیا توقتمش نے
یہ حکم اپنی زبان سے دیا تھا؟"

سواروں کے پاس تیمور کے سوالوں کا کوئی اطمینان بخش جواب نہ تھا۔ پہلے انہوں نے ایک دوسرے کا منہ
دیکھا پھر ان میں سے ایک جرأت کر کے بولا:

"اے امیر۔ ہم آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ وہ سوار جس نے توقتمش کے خیمے پر پہنچ کر اس کی
باتیں سنی تھیں، اس وقت ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ہمارے پانچ سوار جو کریمیا سے واپس نہیں آ سکے، ان میں وہ
بھی تھا۔"

"بے وقوفو!" تیمور چڑ کر بولا:
"تم نے کم از کم اس کی پوری بات تو سنی ہوتی۔ ممکن ہے اسے دھوکا ہوا ہو اور اس نے غلط مطلب نکالا ہو۔"
"امیر۔ ہم سے یہ غلطی ہو گئی۔" ایک نے مسکین صورت بنا کر کہا:
"وہ گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ جلدی بھاگو۔ توقتمش نے ہمارے بارے میں قتل کا حکم دے دیا ہے۔"
"اور تم لوگ بغیر تصدیق کیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ احمق!"
تیمور کو غصہ آ گیا: "جاؤ اور باقی سواروں کا انتظار کرو۔ جب وہ واپس آ جائیں تو ہمیں اطلاع دینا۔"
تاتاری سوار خاموشی سے واپس چلے گئے۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہفتہ، پندرہ دن، مہینہ گزر گیا مگر باقی پانچ سوار واپس نہیں آئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ واپس آتے بھی کیسے؟
ان کو تو مغلوں نے پکڑ کر ختم کر دیا تھا۔ تیمور نے اس واقعے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ تاتاری
سواروں کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ توقتمش کی طرف سے بے فکر ہو کر بحیرۂ خزر کی طرف چلا گیا۔ وہاں کچھ قبائل نے شورش
برپا کر رکھی تھی۔ انہیں سزا دینے کے لیے خود تیمور لشکر لے کر گیا تھا۔ راستے میں اسے اطلاع ملی کہ توقتمش نے ارس خان
کے پورے علاقے پر قبضہ کر کے خاقانِ شرق و غرب کا لقب اختیار کر لیا ہے۔

پھر جب وہ بحیرۂ خزر کی شورش ختم کرنے میں مصروف تھا تو اسے بتایا گیا کہ توقتمش نے مغلوں کے خاقانِ اعظم
کو شکست دے کر اسے سرائے باتو سے نکال دیا ہے اور تمام مغلوں اور سنہرے غول کا خاقانِ اعظم بن بیٹھا ہے۔
اس خبر سے اطمینان ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے سوچا کہ توقتمش کے خاقان ہو جانے کے بعد سنہرے غول سے کسی فوری
خطرے کا امکان نہیں رہا۔ وہ خوارزم کے صدر مقام ارگنج میں دو مہینے اطمینان سے مقیم رہا۔ وہ اس فتنے کو ہمیشہ کے لیے
ختم کر دینا چاہتا تھا۔

⊙

امیر تیمور کی یہ محض خوش فہمی تھی۔ توقتمش نے کریمیا واپس جاتے ہی احسان، مروت اور دوستی کے تار توڑ دیے تھے۔ اس نے کریمیا کے مغلوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے تیموری سواروں کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔ ان میں سے پانچ اپنی جانیں بچا کر سمرقند پہنچ گئے تھے لیکن وہ تیمور کو توقتمش کا اصل چہرہ دکھانے پہنچ رہے تھے۔

توقتمش جب سمرقند میں مقیم تھا تو اسے تاتاریوں کے عالی شان محلات اور خوبصورت خیمے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے سمرقند میں زر و جواہر کے دریا بہتے دیکھے تھے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اسے اقتدار مل گیا تو سمرقند کی دولت اپنے ویرانوں میں سمیٹ لے جائے گا۔ پھر سنہرے غول کا خاقان ہوتے ہی اس نے اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس نے اعلان کیا:

"تاتاری سلطنت، سنہرے غول کے لیے پشت کا ناسور ہے۔ میں اس کا خاتمہ کر دوں گا۔"

"خاقان! آپ مغلوں کے آقا ہیں۔" اس کا ایک سردار دبی زبان سے بولا۔

"لیکن تیمور نے بُرے وقت میں آپ کو پناہ دی تھی۔ تاتاری لشکر آپ کی کمان میں دے دیا تھا۔ اس کے بڑے احسانات ہیں۔"

توقتمش نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا:

"تم نادان ہو۔ تیمور نے میری مدد نہیں کی۔ اس نے مجھے ارس خان کے مقابلے پر بھیج کر جوا کھیلا تھا۔ وہ میرے ذریعے مغل علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اچھا ہوا کہ میں اس کے لشکر کے ذریعے ارس خان کو شکست نہ دے سکا۔ میں نے سنہرے غول کی بادشاہت اپنے آدمیوں کے تعاون سے حاصل کی ہے۔ اس کا مجھ پر کوئی احسان نہیں۔"

"پھر بھی میرے آقا!" مغل سردار نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن توقتمش نے اسے ڈانٹ دیا:

"تم نہیں جانتے۔ مغل حکومت کے لیے تاتاریوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ کیسے رہ سکتے ہیں؟"

توقتمش، مغلوں کا ایک بڑا لشکر لے کر دریائے سیر پار کر آیا۔ اب وہ تاتاریوں کے علاقے میں تھا اور اس نے قتل و غارت کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ تاتاریوں کے سرحدی قلعہ داروں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ تیمور کا بیٹا عمر شیخ اس علاقے میں موجود تھا۔ وہ لشکر لے کر بڑھا۔ توقتمش سے ایک سخت معرکہ ہوا لیکن عمر شیخ بھی اس طوفان کو نہ روک سکا۔ وہ بڑی بے جگری سے لڑا لیکن زخمی ہو کر پسپا ہو گیا۔ توقتمش بخارا کے مضافات تک پہنچ گیا۔ اس نے آبادیاں تہس نہس کر دیں اور بڑے محل کو آگ لگا دی۔

تیمور ان دنوں خوارزم کے مرکز اوزرگاؤں میں مقیم تھا۔ ایک شام ایک شخص اس کے پاس لایا گیا جو بے حد گرد آلود تھا۔

اس نے نحیف آواز میں کہا:

"اے امیر! احسان فراموش توقتمش، تاتاری علاقوں میں قیامت برپا کر رہا ہے۔ آبادیاں ویران ہو گئی ہیں اور بخارا کے محلات میں آگ بھڑک رہی ہے۔"

"یہ کب کا واقعہ ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"میں دس روز پہلے سمرقند سے چلا تھا۔" سوار نے اٹک اٹک کر بتایا۔

"دس روز...!" تیمور نے حیرت سے پوچھا کیونکہ وہاں سے سمرقند کا فاصلہ نو سو میل تھا۔

"جی ہاں۔ اگر میں زخمی نہ ہوتا اور میرے پانچ گھوڑے راستے میں نہ مر گئے ہوتے تو میں کل ہی یہاں پہنچ جاتا۔" اس شخص نے سہارے سے بیٹھتے ہوئے کہا:

"امیر! جلد کوئی قدم اٹھائیں۔ وہ نمک حرام، سمرقند سے صرف چند منزلیں دور ہے۔"

"ہمیں احساس ہے بہادر جوان۔"

تیمور نے گھوڑا لانے کا اشارہ کیا۔ اس کا غلام بھاگ کر گھوڑا لایا۔ تیمور گھوڑے پر سوار ہوا اور مشرق کی طرف رخ کر کے بولا:

"اے بخارا اور سمرقند کی بستیو! تیمور قسم کھاتا ہے کہ جب تک مغل لشکر کو تاتاری علاقوں سے مار کر بھگا نہیں دے گا، گھوڑے کی رکاب سے پیر نہیں نکالے گا۔"

.....اور تیمور نے یہ قسم پوری کی۔

توقتمش تاتاری علاقوں کو پامال کرتا ہوا بڑی تیزی سے سمرقند کی طرف بڑھا لیکن تیمور کی تیز رفتاری نے اسے بے بس کر دیا۔ توقتمش ابھی سمرقند سے دو منزلیں دور تھا کہ تیمور اپنے چند جانثاروں کے ساتھ سمرقند پہنچ گیا۔ اس کا لشکر دوسرے دن پہنچا۔

تیمور کے سمرقند پہنچنے کی خبر نے توقتمش کے قدم روک دیے اور وہ جس تیزی سے حملہ آور ہوا تھا، اسی تیزی سے دریائے سیر عبور کر کے شمالی علاقوں میں غائب ہو گیا۔ بظاہر سمرقند بچ گیا۔ مغل واپس جا چکے تھے لیکن مغلوں کے اس حملے نے تیمور کے دشمنوں کے لیے راہیں کھول دیں۔

بلاد جتال کے جتہ مغل، جنہیں تیمور حصار الالیق سے آگے تک بھگا آیا تھا، مشرقی دروں میں پھر نمودار ہوئے اور اس کی بہو خانزادہ کے صوفی رشتہ داروں نے بھی بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ تیمور کو چومکھی لڑائی کا سامنا تھا۔

وہ اس سے بھی خراب حالات سے دوچار ہو چکا تھا اس لیے ذرا بھی ہراساں نہ ہوا۔ اس نے لشکر کا ایک حصہ
کو شمالی دروں سے نکالنے کے لیے بھیجا اور دوسرا حصہ خوارزم کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ صوفیوں کی بغاوت کا قلع قمع
کر دے۔

تیمور ابھی ان انتظامات سے فارغ ہوا تھا کہ توقتمش ایک بار پھر ایک بڑے لشکر کے ساتھ دریائے سیر کو
میں داخل ہوا۔ اس وقت شدید سردی پڑ رہی تھی اور تیمور کے پاس فوج کا صرف تیسرا حصہ تھا۔ سمرقند سے شمال کو جانا
دعوت دینا تھا۔ تیمور کو کرنا تو اپنی مرضی تھی لیکن وہ سرداروں سے مشورہ ضرور کرتا تھا:
"ہمارے نواحی علاقوں میں توقتمش کا لشکر گھس آیا ہے۔ تمہارے خیال میں ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہیے
نے اپنے سرداروں کی رائے معلوم کرنے کے لیے کہا۔

"اے امیر۔ حالات کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم وقتی طور پر جنوب کی جانب پسپائی اختیار کریں اور موسم بدلتے ہی
مغلوں پر جا پڑیں۔" یہ ایک تاتاری سردار کا بڑا معقول مشورہ تھا۔

تیمور نے اس مشورے پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے دوسرے سرداروں کی طرف دیکھا جیسے
رائے طلب کر رہا ہو۔ اس نے تیمور کو اپنی طرف مخاطب دیکھ کر کہا:
"اے امیر۔ اس سخت سردی میں اگر امیر پسند فرمائیں تو سمرقند میں قلعہ بند ہو کر دفاعی جنگ کر سکتے
موسم ٹھیک ہوتے ہی ہم مغلوں کو مار بھگائیں گے۔ ہمارے پاس فوج کا تیسرا حصہ ہے۔ مغلوں سے مقابلے کے لیے
پورے لشکر کی ضرورت ہے۔ ہمیں باقی فوج کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے۔"
یہ رائے بھی کچھ ایسی غیر معقول نہ تھی لیکن تیمور پر اس کا شدید ردعمل ہوا:
"انتظار..." تیمور شیر کی طرح گرجا:
"کس بات کا انتظار... ہماری آبادیاں پامال ہو رہی ہیں۔ محلات میں آگ لگائی جا رہی ہے اور تم
ہو انتظار کرو... نہ ہم جنوب کی طرف پسپا ہوں گے اور نہ ہی چوڑیاں پہن کر قلعے میں بیٹھیں گے۔ ہم انتظار
نہیں کر سکتے۔ ہم اپنی نواحی بستیوں کو دشمن کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟"
تیمور کے عزم کے سامنے اس کے سرداروں نے سر خم کر دیے۔ وہ اس تہائی لشکر کو ساتھ لے کر سیر کی طرف چلا
وقت برفباری ہو رہی تھی اور سرد ہوائیں چل رہی تھیں مگر تیمور نے موسم کی سختی کی پروا نہ کی۔ راستے میں اتنی دلدل تھی
بعض جگہ گھوڑے پیٹ تک دھنس جاتے تھے۔
تیمور اس عالم میں پرچم بلند کیے توقتمش کی اگلی چوکیوں تک پہنچ گیا اور زوردار حملہ کر کے مغلوں کے قلب لشکر
پہنچ گیا۔ توقتمش گھبرا گیا۔ اسے خیال ہوا کہ کہیں وہ گھیرے میں نہ آ جائے اس لیے اس نے فوراً پسپائی شروع کر دی

تیمور نے اپنے چند دستے مغلوں کے تعاقب میں لگا دیے اور باقی فوج کے ساتھ وہ خوارزم کی طرف چل پڑا۔
خوارزم کے صوفیوں کی یہ تیسری بغاوت تھی۔ وہاں پہلے سے جنگ ہو رہی تھی۔ تیمور نے پہنچتے ہی ایک بڑا
حملہ کر کے صوفیوں کے قدم اکھاڑ دیے اور اورگنج کو تباہ کر کے رکھ دیا۔
وہاں سے فارغ ہو کر اس نے جتہ مغلوں کی خبر لی جو شمالی دروں میں ادھم مچائے ہوئے تھے۔ تیمور نے سمرقند
کر اعلان کیا کہ وہ سنہری غول کے علاقوں میں داخل ہو کر توقتمش سے فیصلہ کن جنگ کرے گا۔

۵

تیمور نے اس جنگ کے لیے زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ چشمانیہ کو جب سے توقتمش کی احسان فراموشی
تاری علاقوں پر یورش کی خبر ملی تھی وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ توقتمش سے
نہ لے سکی تو تیمور اس کی یہ آرزو ضرور پوری کرے گا۔ کیونکہ سرائے خانم نے اسے بتایا تھا کہ امیر تیمور احسان
فراموش امیروں اور سرداروں کو کبھی معاف نہیں کرتا اور جب تک ان کا سر قلم نہیں کرتا چین سے نہیں بیٹھتا۔
لیے موت توقتمش کا مقدر بن گئی ہے۔
چشمانیہ نے سرائے خانم سے بڑی امیدوں سے پوچھا:
"کیا اس جنگ کے دوران ملکہ تاتار بھی امیر تیمور کے ساتھ ہوں گی؟"
دراصل چشمانیہ کو وطن کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ اسے سمرقند میں ہر آرام اور آسائش مہیا تھی۔ وہ ملکہ سرائے خانم
کی ہو گئی تھی لیکن سمرقند کے عالی شان محلات میں اسے گھٹن سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ آزاد اور کھلی فضاؤں کی
پروردہ تھی۔
ملکہ کو چشمانیہ کے دلی جذبات کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے ہنس کر کہا:
"اس بارے میں کچھ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن امیر کا یہ طریقہ ہے کہ جب وہ کسی طویل جنگ پر جاتے
تو عام طور پر خواتین ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ابھی تک امیر نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔"
"ملکہ عالم... اگر آپ..." چشمانیہ کی زبان پر حرفِ مدعا آیا لیکن وہ اس خیال سے چپ ہو گئی کہ
ملکہ کو اس کی بات ناگوار نہ گزرے۔
"تم فکر نہ کرو چشمانیہ..." ملکہ نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا:

"اگر امیر کے ساتھ حرم تنا ہی گیا تو تم بھی جا سکو گی۔ تمہیں یقیناً اپنے ملک کی یاد ستا رہی ہوگی۔ ہم تمہارے لیے اجازت حاصل کر لیں گے۔"

اور چینتانیہ ..... "ملکۂ عالم" کہہ کر اس کے قدموں میں جھک گئی۔

لشکر تیار ہو گیا تو امیر تیمور نے سرائے خانم کو اطلاع بھجوائی کہ وہ اپنی تیاری کر لے۔ ملکہ نے چینتانیہ بغیر اسے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت حاصل کر لی اور جب لشکر روانہ ہوا تو چینتانیہ بھی اس کے ساتھ تھی

سنہری غول کا علاقہ اپنی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت سے آج بھی اسی اہمیت کا حامل ہے جیسا تیمور کے زمانے میں تھا۔ وسطی روس، ٹنڈرا اور سائبیریا کے علاقے تو ہمیشہ سے ناقابل تسخیر رہے ہیں۔ تیمور کے بعد مشہور فاتح اور جنرل نپولین بوناپارٹ نے اس علاقے میں قدم رکھا سو وہ ماسکو تک پہنچ گیا تھا لیکن و برف باری نے اس کے لشکر عظیم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ پھر ۱۷۱۶ء میں پیٹر اعظم کے حکم سے خیوہ اور بخا زیر و زبر کرنے کے لیے روسی لشکر بھیجا گیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ لشکر کا سالار شہزادہ بیکووچ صحرا میں تڑپ ت مر گیا۔ لشکر کا بیشتر حصہ بھوک و پیاس کی وجہ سے موت کا لقمہ بن گیا۔ اس کے سو سال بعد کاؤنٹ پیرووسکی لے کر قزل قم (سرخ ریگستان) اور غیر آباد پہاڑوں میں داخل ہوا۔ گو کہ اس فوج کے لیے پانی کا کافی ذخیرہ کیا گیا تھا مگر اس مہم کے دس ہزار اونٹ، دس ہزار بار برداری کی گاڑیاں اور لشکر کا زیادہ حصہ ان صحرا دفن ہو گیا۔ یہی علاقے سنہری غول کی تگ و تاز کے میدان تھے جن پر وہ صدیوں سے بلا شرکت غیرے کو رہا تھا اور تیمور بڑی بے دردی سے انہیں آبا و اجداد کے اس مسکن سے بے دخل کرنے جا رہا تھا۔

دریائے سیر تک کا علاقہ تیمور اور اس کے لشکر کا دیکھا بھالا تھا۔ تیمور بڑے اطمینان سے کوہ قراتا پہنچ گیا اور سلسلۂ کوہ کے تمام مغل علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

توقتمش کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ تیمور ایک لشکر جرار کے ساتھ اس کے قلعوں کو تہ و بالا کر رہا ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اس قدر خوف زدہ ہو گیا کہ بجائے جنگ کے اس نے مکاری کا راستہ اختیار کیا۔

اس نے تیمور کے پاس سفارت صلح کے لیے بھیجی اور بیش قیمت تحائف کا نذرانہ روانہ کیا۔ ان تحا

الی نسل کے گھوڑے اور ایک شکرا قابل ذکر ہے۔ اس شکرے کی آنکھوں پر جو پٹی بندھی تھی اس پر بیش قیمت ت ٹنکے ہوئے تھے۔

توقتمش کے ایلچی نے تحائف پیش کرنے کے بعد ہاتھ باندھ کر کہا:

"اے ملک تاتار کے عظیم المرتبت بادشاہ! ہمارے خاقان توقتمش نے آپ کے حضور پیغام بھیجا ہے کہ وہ اپنی یوں پر نادم اور شرمندہ ہیں اور آپ کے ساتھ صلح کے خواہش مند ہیں۔"

تیمور سمجھ گیا کہ یہ توقتمش کی نئی چال ہے مگر اس خیال سے وہ دل میں خوش ہوا کہ توقتمش پر اس کا رعب پڑ یا ہے اور اس نے تیمور کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ تیمور کے تھکے ماندے لشکر پر بھی اس کا اچھا اثر ہوا اور اس میں لے سے زیادہ جوش پیدا ہو گیا۔

تیمور ایک لمحہ سوچتا رہا پھر شیر کی طرح گرجا:

"توقتمش مکار، دغاباز اور احسان فراموش ہے۔ وہ ارس خان سے شکست کھا کر بھاگا تو ہم نے اسے پناہ ، اپنا بیٹا بنایا۔ تاتاری سواروں نے اس کے لیے اپنا خون بہایا لیکن طاقت حاصل ہوتے ہی اس نے آنکھیں ر لیں۔ ملک سے میری عدم موجودگی میں اس نے میرے علاقوں کو تاراج کیا۔ اب وہ جنگ سے کیوں کترا رہا ہے! ؤ اور اس سے کہہ دو کہ تیمور کے قدم آگے بڑھ کر کبھی پیچھے نہیں ہٹا کرتے۔ ہم فیصلہ کن جنگ کریں گے۔ ہاں ہ دل سے اپنی غلطیوں پر نادم ہے اور واقعی صلح چاہتا ہے تو اس سے کہو کہ ہم سے گفت و شنید کے لیے اپنے وزیر اعظم لی کو ہمارے پاس بھیجے۔"

توقتمش کا قاصد واپس چلا گیا۔ تیمور نے لشکر کو ایک ہفتے کے پڑاؤ کا حکم دیا۔ اس طرح وہ مغل وزیر اعظم کے نے کے بہانے اپنے لشکر کو آرام دینا چاہتا تھا۔

ایک شام تیمور خیمے کے سامنے اپنے سرداروں کے پاس بیٹھا تھا کہ اس کے جاسوس مغلوں کے ایک خانہ بدوش اندان کو مع ان کے ڈیرے ساز و سامان کے، جانوروں کی طرح ہانکتے ہوئے تیمور کے پاس لے آئے۔ تیمور نے اسوسوں کو حکم دے رکھا تھا کہ جو مغل دکھائی دے اسے پکڑ کر پیش کیا جائے تاکہ وہ اس سے توقتمش کے بار ں معلومات حاصل کر سکے۔

امیر تیمور ابھی ان خانہ بدوشوں سے بات بھی نہ کر پایا تھا کہ اس کی پشت پر ملکہ سرائے خانم کے خیمے کا پردہ اٹھا اور چینتانیہ چیختی ہوئی باہر نکلی۔ وہ "بابا۔ بابا" کہتی ہوئی خانہ بدوشوں کے پاس پہنچ گئی۔

چینتانیہ کو دیکھ کر ایک بوڑھا اس کی طرف بڑھا اور چینتانیہ دوڑ کر اس کے سینے سے چمٹ گئی۔ یہ چینتانیہ کا اگا باپ تھا جس نے دوگنی قیمت پر اسے توقتمش کے ہاتھ فروخت کرنے کا اعلان کیا تھا۔ چینتانیہ کو اپنے باپ سے

صدمہ اٹھا یا تھا۔ لیکن جب ملکہ کے خیمے کے اندر سے اس کی نظر اپنے قبیلے والوں اور باپ پر پڑی تو پدر
محبت کے فطری جذبے کو دبا نہ سکی اور بے تاب ہو کر باپ کے پاس آ گئی۔

چشمانیہ دیر تک باپ سے لپٹی روتی رہی۔ تیمور کو باپ بیٹی کے اس اتفاقیہ ملاپ نے بڑا متاثر کیا۔
امیر تیمور نے بڑی نرمی سے چشمانیہ کو خیمے میں واپس جانے کا حکم دیا۔ چشمانیہ کے جانے کے بعد تیمور نے
اس کے باپ سے پوچھا:

"ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ تم چشمانیہ کے باپ ہو اور یہ اسی کا قبیلہ ہے۔ تم اطمینان رکھو ہم تمہیں
نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ توقتمش اس وقت کہاں ہے؟ یہ وہی شخص ہے جس نے
بیٹی کا گھر اجاڑا ہے...... شہزادہ پدرس کو توقتمش نے قتل کیا تھا......"

"مجھے معلوم ہے اے شہنشاہِ تاتار......" بوڑھے نے گھٹی آواز میں کہا:

"اس نے چشمانیہ کا گھر ہی نہیں اجاڑا بلکہ وہ میرے پورے قبیلے کا دشمن ہے۔ اس نے حکم دے رکھا
ہم لوگوں کو جہاں دیکھا جائے فوراً قتل کر دیا جائے۔ ہم لوگ اس کے خوف سے جنگلوں اور صحراؤں میں چھپتے پھرتے
توقتمش دو ہفتے پہلے یہاں سے دو منزل پر لشکر لیے پڑا تھا لیکن اب وہ شمال میں چلا گیا ہے۔ شاید صحرائے
برفیلے میدانوں میں۔"

امیر تیمور کو یقین ہو گیا کہ اب اسے توقتمش تک پہنچنے کے لیے ایک طویل اور خطرناک سفر اختیار کرنا پڑے گا۔
اس نے سرائے خانم اور دیگر خواتین کو واپس جانے کا حکم دیا۔ چشمانیہ نے ملکہ کے توسط سے اپنے قبیلے میں جانے کی
اجازت مانگی جسے تیمور نے منظور کر لیا۔ چشمانیہ رخصت ہوتے وقت سرائے خانم کے گلے لگ کر خوب روئی اور
کے احسانات کا شکریہ ادا کیا۔

"چشمانیہ......" ملکہ نے اسے بزرگانہ نصیحت کی:

"اب تم اپنے قبیلے میں جا کر کسی معقول آدمی سے شادی کر لو۔ تمہارے غموں کا یہی علاج ہے۔ پوری
اس موہوم امید پر تو نہیں گزاری جا سکتی۔"

"میں ملکہ کے حکم کی تعمیل کروں گی۔" چشمانیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

"لیکن یہ اس وقت ہو گا جب میں توقتمش سے انتقام لے لوں گی۔"

"اس کے لیے تو تمہیں تاتاری لشکر کے ساتھ رہنا چاہیے۔" سرائے خانم نے اسے سمجھایا:

"امیر ایک نہ ایک دن اسے گرفتار کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

"ایسا ہی ہو گا ملکۂ عالیہ۔" چشمانیہ نے بڑے استقلال سے کہا:

"میں اپنے قبیلے کے ساتھ تاتاری لشکر کے قریب ہی رہوں گی اور امیر توقتمش کے بارے میں خبریں
پہنچاؤں گی۔"

"خدا تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔" ملکہ نے اپنی دعاؤں کے ساتھ چشمانیہ کو رخصت کر دیا۔

تیمور کے حکم پر چشمانیہ کے قبیلے والوں کو کئی خیمے دے دیے گئے تھے۔ چشمانیہ قبیلے میں پہنچی تو اس کی نظر سب
سے پہلے اپنی عزیز سہیلی یاسو پر پڑی۔ دونوں سہیلیاں دوڑ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ قبیلے والوں نے اسے
گھیر لیا اور دیر تک امیر تیمور اور سمرقند کے بارے میں پوچھتے رہے۔

یاسو اور چشمانیہ رات بھر باتیں کرتی رہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ کیا اور اس
اتفاقیہ ملاقات پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

O

اٹھارہ ہفتے کے جان لیوا سفر کے بعد امیر تیمور نے توقتمش کو جا لیا۔ اس سفر کے دوران تیمور کے لشکر کو
برفانی طوفانوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ مغل اور تاتاری لشکر اس طرح لڑے، جیسے دو بھیڑیے
آپس میں لڑتے ہیں۔ آخر تیمور کامیاب ہوا۔ اور توقتمش کئی ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ تیمور کو اس
کے زندہ بچ جانے کا افسوس ہوا لیکن اس نے بجائے تعاقب کرنے کے، مغلوں کے جنوبی علاقوں کو تاراج کرنا
شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے توقتمش کی طاقت کا خاتمہ کر دیا ہے اور وہ اب سر اٹھانے کی کوشش
نہیں کرے گا لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ توقتمش جلد ہی نیا لشکر لے کر ایک بار پھر سامنے آ گیا۔ اس بار بھی
شدید جنگ ہوئی۔ تیمور نے اعلان کر دیا کہ جو توقتمش کا سر اتار کر لائے گا اسے تیمور کی طرف سے منہ مانگا
انعام دیا جائے گا۔

دن بھر سخت جنگ کے بعد مغلوں کے قدم میدان میں نہ جم سکے اور انہوں نے میدان سے بھاگنا شروع
کر دیا۔

تیمور کے تاتاریوں کے لشکر میں مغل جوان بیان، ایبک جک کا بیٹا تھا۔ وہ گھوڑا اچھالتا ہوا توقتمش کی طرف چلا۔
توقتمش کے گرد مغلوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ بیان خود بھی مغل تھا۔ اس نے حلقے کے قریب پہنچ کر جھکائی
دی تو توقتمش کے چند محافظ سوار اس کی طرف لپکے۔ بیان تیزی سے پلٹا اور اس جگہ سے اس حلقے میں داخل

ہو گیا، جہاں سے سوار اس کی طرف بڑھے تھے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

بیان نے توقتمش کے سر پر پہنچ کر بھرپور وار کیا۔ توقتمش نے گھبرا کر بیان کا وار اپنی تلوار پر روکا۔ رک تو گیا لیکن توقتمش کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ توقتمش کے ہوش اڑ گئے اور وہ گھوڑا گھما کر بھاگا مگر بیان نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور دونوں میدان سے دور نکل آئے۔

بیان جب توقتمش کے قریب پہنچا تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اور سوار بھی اس کے پیچھے آ رہا ہے لیکن وقت نہیں تھا کہ وہ پلٹ کر دیکھتا۔ اگر وہ ایک لمحہ بھی ضائع کرتا تو توقتمش اس کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ بیان نے توقتمش کے برابر پہنچ کر اس کے سر پر تلوار کا وار کیا لیکن توقتمش سر بچا گیا اور تلوار گھوڑے کی پشت پر لگی۔ گھوڑا زخم کھا کر اس زور سے اچھلا کہ توقتمش توازن برقرار نہ رکھ سکا اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ بیان گھوڑے سے کودا اور فوراً تلوار توقتمش کی پشت میں داخل کر دی۔ توقتمش کے جسم نے ایک ہلکا سا جھٹکا کھایا پھر ڈھیلا پڑ گیا۔

بیان اس کے جسم سے تلوار نکال رہا تھا کہ پشت سے آنے والا سوار اس کے پاس پہنچ گیا۔ بیان نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک خوب صورت لڑکی تیزی کے ساتھ گھوڑے سے اتری اور خنجر نکال کر توقتمش کی لاش کی طرف بڑھی۔

"لاش پر خنجر چلانا بزدلی ہے لڑکی!" بیان نے بڑے پیار سے کہا۔

لڑکی کے قدم رک گئے۔ اس نے بڑی حیرت سے بیان کو دیکھا:

"کیا یہ مر چکا ہے؟"

"ہاں۔"

بیان نے اثبات میں سر ہلایا:

"مگر تم کون ہو۔ اس سے تمہارا کیا تعلق تھا؟"

"یہ۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔ میری مانگ اجاڑنے والا۔۔۔۔ میرے شوہر کا قاتل تھا۔"

اور اس خوبصورت لڑکی یعنی غمزدہ چیشانیہ کے ہاتھ سے خنجر گر گیا۔

"کاش! میں چند لمحے پہلے آئی ہوتی۔ میں نے اسے قتل کرنے کی قسم کھائی تھی۔"

○

تیمور کے سامنے سنہری غول کے سفاک ترین خاقان توقتمش کی لاش پیش کی گئی۔ تیمور کے چہرے

[پر] مسکراہٹ آئی:

"تم اپنا انعام مانگو۔" تیمور نے آہستہ سے کہا۔

تیمور کے الفاظ ختم ہوئے تو بیان نے مجمع پر نظر ڈالی۔ تاتاری سواروں نے توقتمش کی لاش کو گھیر لیا تھا۔

[اس] کی نظریں ایک جگہ رکیں۔ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ، اے امیر تاتار! یہ لڑکی مجھے انعام میں عطا کی جائے۔"

"کون چیشانیہ۔۔۔۔؟" تیمور نے حیران نظروں سے ادھر دیکھا:

"ہم نے چیشانیہ تمہیں بخش دی بشرطیکہ وہ راضی ہو۔"

اور۔۔۔۔ چیشانیہ نے حیا سے اپنا سر جھکا لیا۔

○

اصفہان کا قتلِ عام

اور پھر تیمور کا دوسرا بیٹا عمر شیخ، تیمور کے جنگی جنون کی بھینٹ چڑھ گیا۔

چنگیز خان کے بیٹے جوجی کے سنہری غول نے جو مضبوط حکومت قائم کی تھی، تیمور نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تیمور نے سنہری غول کے صدر مقام سرائے باتو پر حملہ کر کے خیموں اور لکڑی کے مکانوں کے اس شہر میں آگ لگوا دی اور شہری کھلے میدان میں سردی سے اکڑ اکڑ کر مر گئے۔

اس نے مغلوں کے جنوبی شہر استراخان کو بھی تاراج کیا۔ کہتے ہیں کہ اس شہر کی اونچی فصیل برف کی اونچی دیوار تھی۔ اہلِ شہر اس پر پانی ڈالتے رہتے اور پانی برف میں تبدیل ہو کر فصیل کی بلندی بڑھاتا رہتا لیکن تیمور کے سامنے برف کی یہ بلند و بالا فصیل پانی بن کر بہ گئی۔

پھر تیمور نے روس کے دارالسلطنت ماسکو کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ماسکو میں کہرام مچ گیا۔ روس کے عیسائی شہنشاہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ گرجوں کے گھنٹے بجنے لگے اور خداوند یسوع مسیح سے دعائیں مانگی جانے لگیں۔ حضرت مریم کا ایک مجسمہ اس وقت شمال کے برفانی شہر ولیشائی گورو ڈ میں موجود تھا۔ شہنشاہ نے فوراً برفانی گاڑیاں حضرت مریم کے مجسمہ کو لانے کے لیے ولیشائی گورو ڈ میں بھیج دیں۔

مجسمے کے آنے کی اطلاع ملی تو لوگوں نے سرحد پر پہنچ کر اس کا استقبال کیا اور جلوس کی شکل میں مجسمے کو ماسکو پہنچایا گیا۔ تمام عیسائی مع شہنشاہِ روس حضرت مریم کے مجسمے کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

"اے مادرِ خداوند۔ روس کو بچالے"۔

ہر ایک زبان پر یہی دعا تھی۔

تیمور اپنا لشکر لے کر دریائے ڈان کے کنارے آ گئے تو بڑھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ ماسکو صرف چند ہزار باشندوں کا ایک معمولی قصبہ ہے تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ بعض کا خیال ہے کہ تیمور نے ماسکو کا ارادہ کیا تھا لیکن روسی یہی کہتے ہیں کہ ماسکو حضرت مریم کے مجسمے کی وجہ سے محفوظ رہا۔

بلادِ شمال کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد جب تیمور نے وطن واپسی کا ارادہ کیا تو اس نے بجائے سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بحرِ خزر کے مغرب کی طرف سے چکر کاٹ کر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس راستے میں کوہستانِ قفقاز کے اونچے اونچے پہاڑی سلسلے تھے اور جنگلات اس قدر گھنے تھے کہ ان جنگلات کو کاٹ کر ایک سڑک نکالنا، یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی لیکن تیمور کے آہنی ارادوں کے سامنے ہر بات ممکن تھی۔

یہاں تیمور کو جارجیا اور قفقاز کے وحشی قبیلوں سے کئی بار جنگ کرنی پڑی۔ اس نے کلات اور تکریت کے ناقابلِ تسخیر قلعوں کو بھی مسمار کر کے رکھ دیا۔ دریائے دجلہ کے کنارے تکریت کا وہی مشہور قلعہ تھا جس میں دو سو سال پہلے مسلمانوں کے عظیم فاتح سلطان صلاح الدین ایوبی کی پیدائش ہوئی تھی۔ تکریت کا قلعہ فتح کرنے میں تیمور کو سترہ دن لگ گئے تھے۔

اب تیمور کی مملکت میں بلادِ شمال، خوارزم، بحیرۂ خزر اور کوہستانِ قفقاز شامل ہو گئے تھے۔ خراسان کی جانب جانے والی شاہراہ دو ہزار دو سو میل تک اس کی مملکت سے گزرتی تھی لیکن تیمور کو یہ فتوحات بڑی مہنگی پڑیں۔ تیمور کی خاص فوج کے جانباز بہادروں کی تعداد بہت کم ہو چکی تھی۔ خطائی بہادر دریائے سیر کی جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ شیخ علی بہادر بھی زہر آلود خنجر کے ایک جاسوس کے خنجر کا نشانہ بن گیا تھا۔ تیمور کا امیر الامراد سیف الدین اور اس کا تیسرا بیٹا میران شاہ بڑی مشکل سے مرتے مرتے بچے تھے اور کوہِ قفقاز سے گزرتے ہوئے تیمور کے منجھلے بیٹے عمر شیخ کو ایک ایسا تیر لگا جس نے اس کی جان لے کر ہی چھوڑی۔ عمر شیخ کے جسم سے تیر نکال لیا گیا لیکن زخم اس قدر کاری تھا کہ عمر شیخ جانبر نہ ہو سکا۔

عمر شیخ کا انتقال اثنائے راہ میں ایک پڑاؤ پر ہوا۔ ایک امیر نے ڈرتے ڈرتے تیمور کو اطلاع دی:

"بڑے شہزادے۔ جہانگیر نے منجھلے بھائی عمر شیخ کو جنت سے بلاوا بھیجا اور عمر شیخ اس کے پاس چلا گیا"۔

تیمور کو ایک لمحے کے لیے سکتہ سا ہو گیا لیکن فوراً سنبھلا اور اونچی آواز میں بولا:

"خدا ہی نے دیا تھا۔ اس نے واپس لے لیا تو پھر غم کیا؟"

تیمور نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ ولی عہدِ سلطنت شہزادہ جہانگیر پہلے ہی مر چکا تھا۔ عمر شیخ تیمور کو بہت عزیز تھا۔ اس لیے تیمور نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے بعد اسی کو حکومت دے گا لیکن عمر شیخ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔

تیمور کچھ ایسا دلبرداشتہ ہوا کہ اسی وقت کوچ کا حکم دے دیا۔ کچھ دن آق سنجر میں آرام کرنے کے بعد تیمور شہر سبز پہنچا اور قصر سفید میں قیام کیا۔ تیمور نے یہاں کوئی دربار نہیں لگایا صرف مولانا زین الدین سے ملاقات

کی اور ان سے درخواست کی گئی کہ مسجد میں اعلان کر دیں کہ شہزادہ عمر شیخ کی تعزیت کے لیے لوگ اس کے پاس آئیں۔
تیمور کا یہ رویہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ اسے عمر شیخ کے مرنے کا بہت صدمہ ہوا تھا۔

اسی دن شام کو اس نے اپنے تیسرے بیٹے میران شاہ کو طلب کیا۔ میران شاہ بڑا خود سر شہزادہ تھا۔ اس کا زیادہ رجحان عیش و عشرت کی طرف تھا لیکن میدانِ جنگ میں خصوصاً اس وقت جب تیمور لشکر کے ساتھ ہوتا تو بڑی شجاعت دکھاتا تھا۔ توقتمش کے خلاف جنگ میں اس نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا اور بری طرح زخمی ہوا تھا۔ تیمور کو میران شاہ کی عشرت پسندی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا جب خود ہی میران شاہ کو اپنا ولی عہد بنانا پڑے گا۔

تاتاریوں کے خود ساختہ قانون کے مطابق تاتاری امیر کے پہلے چار بیٹے ہی اس کے ولی عہد یا وارث ہو سکتے تھے۔ جہانگیر اور عمر شیخ کے بعد میران شاہ کا نمبر تھا۔ چوتھا بیٹا شاہ رخ بیگم سرائے خانم کے بطن سے پیدا ہونے والا شاہ رخ تھا لیکن وہ ابھی چھوٹا تھا۔ اگر شاہ رخ جوان ہوتا تو تیمور یقیناً اسے میران شاہ پر ترجیح دیتا۔

میران شاہ آداب اور سلام کر کے خاموشی سے باپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ تیمور ذرا دیر اس کے چہرے کو گھورتا رہا، پھر بولا:

"میران شاہ۔ اگر تم یہ سوچ کر کہ تم اس امیر کے بیٹے ہو جس سے بڑا فاتح اور امیر اس وقت روئے زمین پر نہیں تو تم حق بجانب ہو گے۔ بحیثیت ایک شہزادے کے عیش و عشرت کے تمام لوازمات تمہارے قدموں میں ہیں مگر ہر بات میں اعتدال لازم ہے۔ زیادہ آرام انسان کو کاہل بنا دیتا ہے۔ اس طرح شان و شوکت کا بے جا اظہار فضول خرچی اور خود سری کا اظہار ہوتا ہے۔"

"امیر بابا!" میران شاہ ادب سے بولا:

"مجھے معاف کر کے اصلاح کا موقع دیا جائے۔ میں نے ضرور ایسی غلطیاں کی ہوں گی جو امیر کے مزاج کی ناگواری کا باعث ہوئیں۔ آئندہ میں احتیاط برتوں گا۔"

"عزیز بیٹے! ہم تمہارے جواب سے خوش ہوئے۔" تیمور نے اسے محبت سے دیکھا:

"ہم نے تمہیں تنبیہ کے لیے نہیں بلایا تھا اور نہ ہمارا روئے سخن کسی خاص واقعے کی طرف تھا۔ ہم نے عام نصیحت کے طور پر دو باتیں کی تھیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ تم نے ہماری باتیں غور سے سنیں اور گرہ میں باندھ لیں۔"

"امیر بابا اگر مجھے اس طرح نصیحت فرماتے رہے تو میرے تمام عیب دور ہو جائیں گے۔" میران شاہ نے فوراً کہا:

"دراصل امیر بابا کی بڑھتی ہوئی شفقت ہی نے مجھ میں خود سری پیدا کر دی ہے۔"

"میران شاہ!" تیمور رعب سے بولا:

"تم یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ جہانگیر اور عمر شیخ کی وفات کے بعد ہم سلطنتِ تاتار کی ولی عہدی تمہیں تحفے کے طور پر دے دیں گے۔ تاتاری رواج کے مطابق تم حقدار ضرور ہو لیکن تاتاریوں میں ایک مثل مشہور ہے کہ صرف وہی ہاتھ تاجِ حکومت پکڑ سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔ حقدار ہونے کے باوجود تمہیں خود کو ولی عہدی کا اہل ثابت کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ تمہارا حق مار کر ہم کسی اور کے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔ تم نے مغلوں کے مقابلے میں جس بہادری کا مظاہرہ کیا ہے اس کے صلے میں ہم تمہارا مرتبہ بڑھاتے ہیں۔ اب تم بارہ ہزار سواروں کے علاوہ ایک اور ولایت کی آمدنی کے مالک ہو گے۔"

"امیر بابا!"

میران شاہ نے حیرت سے تیمور کو دیکھا۔ اسے اب تک یہی خیال تھا کہ تیمور اس سے ناراض ہے اور اس کا عہدہ گھٹا دے گا لیکن جب تیمور نے اس کا عہدہ گھٹانے کے بجائے اس میں اضافہ کر دیا تو میران شاہ حیران رہ گیا۔ اس نے جرأت پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"امیر بابا کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رہے۔ میں امیر بابا کی نوازشوں کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔"

"دیکھو میران شاہ۔"

تیمور نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں:

"عمر شیخ کی لاش ہم اپنے ساتھ لائے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے جگر کے اس ٹکڑے کو بھی جہانگیر کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ یہ کام تمہارے سپرد کیا جاتا ہے۔"

"بہتر ہے، امیر بابا۔" میران شاہ اٹھتے ہوئے بولا:

"میں شہزادے بھائی کے مقبرے پر جانے ہی والا تھا۔"

تیمور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بہت مختصر گفتگو کرتا تھا۔ اگر وہ حکم دیتا تو یہی چاہتا کہ اس پر فوراً عمل شروع کیا جائے۔ شہزادہ میران شاہ، تیمور کی فطرت سے واقف تھا۔ اس نے تیمور کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور فوراً واپس آ گیا۔

تیمور نے اپنے بیٹوں کے مراتب کا تعین کر دیا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا جہانگیر جب تک زندہ رہا اسے بارہ ہزار سواروں کا علوفہ اور خوارزم کی سلطنت کی آمدنی ملتی رہی۔ علوفہ کے معنی خوراک کے ہوتے ہیں لیکن اس سے مراد تنخواہ بھی ہے۔ جہانگیر کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا گیا تھا اس لیے اسے اپنا دربار لگانے کی بھی اجازت تھی۔ اس کے علاوہ تیمور نے اسے طبل و نقارہ کی بھی اجازت دی اور علم بھی بخشا تھا لیکن جب اسے جہانگیر کے مرنے

کی اطلاع ملی تو اس نے جہانگیر کا طبل و نقارہ منگوا کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا تاکہ اس کا طبل و نقارہ کوئی شہزادہ استعمال نہ کر سکے۔

تیمور نے دوسرے بیٹے عمر شیخ کو دس ہزار کا علوفہ اور ایک ولایت دی تھی۔ میراں شاہ کو نو ہزار اور ایک ولایت کی آمدنی ملتی تھی لیکن ان دونوں شہزادوں کو طبل و نقارہ یا علم استعمال کرنے کی اجازت تیمور نے میراں شاہ کو ولی عہد بنانے کا اعلان تو نہ کیا لیکن بارہ ہزار کا علوفہ بخش کر در پردہ میراں شاہ کو جتلانے کی کوشش کی کہ اگر اس نے اپنے عادات و اطوار درست کر لیے تو اسے ولی عہد بنا دیا جائے گا۔

شہزادہ میراں شاہ قصرِ سفید کے بجائے اپنے احباب کے ساتھ شہرِ سبز کی ایک خوبصورت حویلی میں ٹھہرا تھا۔ اس نے قصداً سفید محل میں تیمور کے ساتھ قیام کرنے سے گریز کیا کیونکہ باپ کی موجودگی میں اس کی سوفی صوفی رہتی تھی اس لیے وہ دوسری جگہ ٹھہرا تاکہ دوستوں کے ساتھ اطمینان اور آرام سے دن گزارے اسے مشکل سے نیند آتی۔ وہ چاہتا تھا کہ تیمور کے حکم کی جلد از جلد تعمیل کر کے سرخروئی حاصل کرے۔

صبح ہوتے ہی اس نے چار سواروں کو ساتھ لیا۔ یہ چاروں اس کے رازدار یار تھے۔ تیمور نے جہانگیر شہرِ سبز میں بنوایا تھا۔ اس پر ایک گنبد تعمیر کیا گیا تھا۔ میراں شاہ نے شہرِ سبز میں موجود تعمیر کے ماہرین کو دیا تھا کہ وہ جہانگیر کے مقبرے پر پہنچ جائیں۔

میراں شاہ دوستوں کے ساتھ خوش فعلیاں کرتا ہوا مقبرے پر پہنچا تو مقبرے کی چہار دیواری کے بڑے پر اسے بتایا گیا کہ جہانگیر کی بیوہ خانزادہ شوہر کے مزار پر فاتحہ کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ خانزادہ کا نام سن کر چونک پڑا۔ خوارزم کی اس خوبصورت شہزادی کو اس نے صرف دو تین بار ہی دیکھا تھا اور جب بھی دیکھا تھا ہی رہ گیا تھا۔ اسے اپنے بھائی کی قسمت پر بڑا رشک آیا تھا۔

مقبرے کے باہر پہرہ لگا ہوا تھا۔ اندر شہزادی کی درجنوں کنیزیں اور سہیلیاں گھومتی دکھائی دے تھیں۔ میراں شاہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر گھوڑے سے اترا۔ اپنے دوستوں اور ماہرینِ تعمیرات کو وہیں انتظار کا حکم دے کر چہار دیواری کے اندر داخل ہو گیا۔

شہزادی خانزادہ نے حکم دے رکھا تھا کہ جب تک وہ مقبرے میں ہے، کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے پہریدار میراں شاہ کو نہ روک سکے۔ میراں شاہ شہزادہ ہی نہ تھا بلکہ عمر شیخ کے مرنے کے بعد اس کے ولی عہد یقین تھا۔ پہریدار سلام کر کے ایک طرف ہو گئے۔

ایک پہریدار نے شاید شہزادے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے زور سے آواز لگائی:

"باادب شہزادہ میراں شاہ، ولی عہد بہادر سلطنتِ تاتار قدم رنجہ فرما رہے ہیں۔"

شہزادہ میراں شاہ اپنے اس نئے خطاب پر مسکرایا۔ مقبرے کے صحن میں چہل قدمی کرتی کنیزیں ٹھٹک کر گئیں۔ شہزادہ شاہانہ قدم اٹھاتا ہوا مقبرے کی طرف بڑھا۔

مقبرے کے باہر چاروں طرف سنگِ مرمر کا چوڑا چبوترہ بنا تھا اور سنگِ مرمر ہی کی چار سیڑھیاں اوپر میراں شاہ نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ ایک جھماکا سا ہوا۔ ایک کوندا لپکا اور میراں شاہ کی آنکھیں ہو کر رہ گئیں۔

خوارزم کی شہزادی مقبرے سے برآمد ہوئی اور شہزادے کو دیکھ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم ایک دم رک خانزادہ سیاہ لباس میں تھی اور اس کا حسین چہرہ ان کپڑوں میں یوں دمک رہا تھا جیسے بدلی سے ایک دم ل آیا ہو۔

دونوں کی حیران نظریں ایک دوسرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ حیرت کا یہ عالم چند لمحے طاری رہا۔ پھر شہزادی ہوش آیا۔ اس نے سر سے ڈھلکا ہوا پلو فوراً سر پر ڈال لیا۔

"ولی عہد بہادر کی خدمت میں خانزادہ تسلیم پیش کرتی ہے۔" خان زادہ نے سر کو ذرا خم کر کے بڑے ادب سے شاہ کو سلام کیا۔

"شہزادی!" میراں شاہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا:

"آپ کو کیسے علم ہوا کہ ہم ولی عہد ہیں؟" اور وہ سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر پہنچ گیا۔

"شہزادے بہادر۔ مشک کی خوشبو ہر طرف خود ہی پھیل جاتی ہے۔" خان زادہ نے دزدیدہ نظروں سے شاہ کو دیکھا:

"آپ بغیر اجازت اور ہماری تاکید کے باوجود اندر تشریف لے آئے۔ ہم جانتے ہیں کہ سلطنتِ تیمور میں امیر تیمور اگر کوئی ہمارے معاملات میں دخل دے یا ہمارے احکامات کی پروا نہ کرے تو وہ ولی عہد اور صرف ولی عہد ہی ہے۔ ان کے سوا کسی کو خانزادہ کے مزاج کے خلاف قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔"

"عقلمند شہزادی۔" شہزادہ مسکرایا:

"ہم ابھی میراں شاہ ہیں۔ سلطنت کے صرف ایک شہزادے۔ امیر بابا نے ہمارا مرتبہ مزید بڑھا دیا ہے۔ اب تک ہم ہزاروں کا علوفہ اور ایک ولایت کے حقدار تھے لیکن آج بارہ ہزار کا علوفہ عطا کر دیا گیا۔"

"شہزادے نے خود ہی ہماری بات کی تصدیق کر دی۔" خانزادہ میراں شاہ کو اسی طرح چور نظروں سے دیکھتی

"آپ جانتے ہیں بارہ ہزار کا علوفہ صرف ولی عہد سلطنت کے لیے مقرر ہے۔ شہزادے عمر کے بعد آپ

ہی اس مرتبے کے اہل تھے۔ ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم آپ کی خدمت میں ولی عہدی کی مبارک باد پیش کریں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ شہر سبز کے رہنے والوں نے شہزادے کی وفات کی خبر سنتے ہی آپ کو دل سے ولی عہد تسلیم کر لیا تھا۔"

شہزادے کو اس خبر سے واقعی خوشی ہوئی۔ اس نے ذرا شوخی سے کہا:

"شہزادی۔ ان باتوں کو چھوڑیے۔ ہم اپنا مرتبہ آپ سے بلند نہیں سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ آپ سر اٹھا کر بات کریں۔ آپ خوارزم کی عالی وقار شہزادی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قدرت نے آپ کو حسن کی شہزادی بھی بنایا ہے۔"

"شہزادے۔ آپ ہماری بیوگی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔" خانزادہ نے بھاری پلکیں اٹھا کر میراں شاہ کو دیکھا تو اس کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔

خانزادہ دو بچوں کی ماں تھی۔ شہزادہ پیر محمد اور شہزادہ سلطان۔ اسے دو خوبصورت بچے خدا نے بہا دیے تھے۔ پھر وہ صرف اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ میراں شاہ کی نظر سے ایسا حسن پہلے کبھی نہ گزرا تھا۔

خانزادہ کو جیسے ایک نئے خیال نے گھیر رکھا تھا۔ آخر وہ جیسے خیال میں بولی:

"شہزادے۔ اگر ہمیں آپ خانزادہ کہہ کر مخاطب کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس بات سے مسرت ہوگی۔" خانزادہ نے میراں شاہ کی حوصلہ افزائی کی۔

میراں شاہ نے خانزادہ کو غور سے دیکھا۔ شاید وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ خانزادہ کے الفاظ میں کس حد تک خلوص اور صداقت ہے۔

"شہزادی۔ دراصل ہمیں بے جا تکلفات پسند نہیں۔ خانزادہ کہنے میں ہمیں کچھ اپنائیت سی محسوس ہوتی ہے اور ہمیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم ایک سوگوار بیوہ سے نہیں بلکہ ایک ایسی ہستی سے مخاطب ہیں جو حسن کی رعنائیوں سے آراستہ ہے اور جسے آنسو بہانے کے بجائے دلوں پر حکومت کرنے کا حق ملنا چاہیے۔"

"شہزادے۔" خانزادہ نے ٹھنڈی سانس لی:

"خوبصورت الفاظ سے ویرانیاں بہار میں نہیں بدلا کرتیں اور نہ دل کے تاریک گوشے امید موہوم کے اجالے کی روشنی سے تابناک ہو سکتے ہیں۔" پھر وہ تیزی سے شہزادے کے پاس سے گزر کر سیڑھیاں اترنے لگی۔

"خانزادہ۔" شہزادے کی بھرائی اور جذبات میں ڈوبی آواز ابھری اور وہ بھی سیڑھیاں اتر گیا۔

"جی!" خانزادہ نے تھم رک کر گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

"ہم دوسری ملاقات کے امید وار ہیں۔" شہزادے نے دلی تمنا کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔

"بیکار ہے شہزادے۔" خانزادہ نے استقلال سے کہا:

"ریگ زاروں میں چشمے نہیں، سراب ہوتے ہیں۔ جگنوؤں کو پکڑنا کوئی عقلمندی نہیں۔"

"خانزادہ۔ ایسا مت کہو۔" میراں شاہ بڑی تمکنت سے بولا:

"ریت کے سمندر میں نخلستان بھی لہلہاتے ہیں اور جگنوؤں کو مقید بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"شہزادے۔" خانزادہ نے بڑی بے بسی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

"شہزادے نہیں۔ ہمیں میراں کہو خانزادہ۔" میراں شاہ نے دل کھول کر رکھ دیا۔

"ہم ولی عہد کے حضور میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتے۔" خانزادہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی:

"ہاں اگر میراں کے بجائے صرف شاہ کہنے کی اجازت دی جائے تو۔۔۔"

"ہمیں تمہاری خاطر منظور ہے خانزادہ۔" میراں شاہ نے جواب دیا:

"تم جس نام سے چاہو ہمیں پکار سکتی ہو۔ اب تم جاؤ۔ ہم سے کب ملو گی؟"

"شاہ۔ یہ باتیں بہت قبل از وقت ہیں۔" خانزادہ نے خدشے کا اظہار کیا:

"ہمیں امیر کے عتاب سے ہر وقت ڈرنا چاہیے۔"

"اس کی بھی کوئی صورت نکال لی جائے گی۔" شہزادہ لاپروائی سے بولا:

"تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟"

"خدا کے لیے ایسا غضب نہ کیجیے گا شاہ۔" خانزادہ گھبرا گئی:

"ہم نے بیوگی کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کوئی نیا خواب دیکھنے سے پہلے ہمیں اپنا ذہن بدلنے کے لیے وقت درکار ہوگا۔"

"ہم آج بہت مصروف ہیں۔" شہزادے نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی:

"امیر بابا نے حکم دیا ہے کہ شہزادے جہانگیر کی قبر چوڑی کرائی جائے۔ عمر شیخ کی لاش اس کے پہلو میں دفن کی جائے گی۔ یہ کام ایک دو روز میں ختم ہو جائے گا۔"

"مگر قبر کو کھولنا تو بڑی بے حرمتی کی بات ہے۔" خانزادہ کو اس خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔

"خانزادہ۔ یہ امیر کا حکم ہے اور اس کی تعمیل ہونا ہے۔"

"بہتر۔" خانزادہ سر جھکا کر بولی:

"ابھی بلانے آپ سے ملاقات ہونا تھی۔ یہ بھی کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ہم سمرقند سے شہر سبز پہنچے۔ ادھر آپ واپس آ گئے۔ پھر ہماری پہلی ملاقات بھی کتنے عجیب ماحول میں ہوئی۔ اچھا خدا حافظ۔ شاہ!"

میراں شاہ نے بھی خدا حافظ کہا۔ اسے محسوس ہوا کہ خانزادہ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ہے۔

"خانزادہ چلنے لگی تو میراں شاہ بولا:
"ہم پھر ملیں گے خانزادہ۔"
"بشرطیکہ حالات نے اجازت دی۔"

خانزادہ احاطہ کا میدان پار کر کے دروازے پر پہنچی۔ اسے آتا دیکھ کر پہریداروں نے تمام لوگوں کو
کر پردہ کرا دیا۔ خانزادہ کی کنیزیں اور سہیلیاں بھی اس کے ساتھ باہر آ گئیں۔ انہیں لے جانے کے لیے سواریاں
تھیں۔ خانزادہ اپنی گاڑی میں بیٹھی اور تمام گاڑیاں آگے پیچھے چلنے لگیں۔

شہزادہ میراں شاہ اس ملاقات پر بڑا مسرور تھا۔ اس نے ماہرین کو اندر بلا کر امیر کے حکم سے آگا
سب نے مل کر جہانگیر کی قبر کا معائنہ کیا اور قبر کو وسیع کرنے کا کام تھوڑی دیر بعد ہی شروع ہو گیا۔ میراں
مقبرے کے میدان میں اپنے لیے ایک خیمہ نصب کرا لیا تاکہ وہ کام کی نگرانی کر سکے اور امیر تیمور کو اپنی م
دے سکے۔

جہانگیر کی قبر کو وسیع کر کے عمر شیخ کی میت کو اس کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ وہ منظر بڑا رقت آمیز
امیر تیمور دونوں بیٹوں کی قبروں کی پائنتی کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ وہ بڑے حوصلے اور دل گردے کا مالک
باوجود اس وقت ضبط کرنے پر بھی اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئی تھیں۔ دائیں بائیں اس کے تمام بڑے
ہاتھ اٹھائے فاتحہ میں شریک تھے۔ فضا میں افسردگی گھلی ہوئی تھی۔

ہر طرف خاموشی تھی لیکن یہ خاموشی اس وقت ٹوٹ جاتی جب کسی سردار کے منہ سے کوئی درد بھ
نکل جاتی۔

فاتحہ کے بعد مولانا زین الدین نے تیمور کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے تھپتھپایا۔ مولانا اس کے
فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ تیمور ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لے کر گنبد سے باہر آ گیا۔ پھر یہ ماتمی جلوس آہستہ آ
ہو کر اپنے ٹھکانوں پر چلا گیا اور تیمور قصرِ سفید واپس آ گیا۔

اسی شام خانزادہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئی۔

تیمور کو معلوم ہو گیا تھا کہ خانزادہ سمرقند آئی ہوئی ہے۔ خانزادہ نے دو بار پہلے بھی باریابی کی

تھی لیکن تیمور نے اسے روک دیا تھا۔ آج تیمور بہت زیادہ مضمحل تھا لیکن خانزادہ کی درخواست رد نہ کر سکا۔

خانزادہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس دبے دبے قدم رکھتی تیمور کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے جھک کر تعظیم
پیش کی لیکن تیمور کی نظریں چھت پر لگی تھیں اور وہ خیالات میں گم تھا۔ اسے خانزادہ کی آمد کی خبر نہ ہوئی۔ خانزادہ دیر
تک اس کے سامنے خاموش کھڑی رہی پھر خود ہی تیمور کے خیالات کا سلسلہ کسی وجہ سے ٹوٹ گیا۔ اس کی نظر
خانزادہ پر پڑی تو چونک اٹھا اور نرمی سے بولا:

"تم آ گئیں خانزادہ۔ کیوں کھڑی ہو، بیٹھ جاؤ۔"

خانزادہ دو زانو ہو کر اس کے سامنے قالین کے فرش پر بیٹھ گئی۔

"خانزادہ ہم نے تمہاری درخواست دو بار رد کی ہے۔"

تیمور کی بھاری آواز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک جملہ کہنے کے بعد تیمور رک کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا:

"ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہیں دیکھ کر اپنے ساتھ ساتھ تمہارے غموں میں بھی اضافہ کریں۔"

"اے شاہِ تاتار!" خانزادہ پُر وقار لہجے میں بولی،

"غم برداشت کرنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ کنیز جانتی تھی کہ امیر کو جس طرح تاتاری لشکر، امراء وزراء اور
مفتوحہ علاقوں کو پوری طرح قابو میں رکھنے کی طاقت ہے۔ اسی طرح شاہِ تاتار غموں کے پہاڑ کو بھی برداشت کرنے کی
قدرت رکھتے ہیں۔ کنیز تو صرف اس وجہ سے حاضری دینا چاہتی تھی کہ امیر کو علم ہو جائے کہ افسردگی اور اندوہ کے اس
طوفان میں وہ اکیلے نہیں بلکہ ایک یہ بھی ان کے قدموں میں موجود ہے۔"

"ایسا نہ کہو خانزادہ۔ تم ہمیں بہت عزیز ہو۔"

تیمور نے مسند پر اس طرح پہلو بدلا جیسے کسی بوجھ تلے دبا جا رہا ہو:

"ہمیں تمہارے غم کا پورا احساس ہے۔ کاش ہم اس کا مداوا کر سکتے۔ ہم لوگوں کی نظروں میں با اختیار ہیں لیکن
حقیقت میں کس قدر بے اختیار اور عاجز ہیں۔ یاد رکھو خانزادہ۔ انسان جہاں پر بے اختیار اور بے بس ہوتا ہے،
وہیں سے خدائی کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ ہماری عاجزی ہی تو ہمیں خدا کے وجود کا یقین دلاتی ہے۔ اس کا علاج
صبر اور صرف صبر ہے اور ایسے موقعوں پر صبر کرنے والا ہی عظمتِ انسانی کا علم بردار کہا جاتا ہے۔"

خانزادہ کو تیمور کی زبان سے بے اختیار، بے اختیاری اور صبر کے فلسفے کی تشریح سن کر بڑا تعجب ہوا۔ وہ
جرار اور بادشاہ جس کی نظروں میں ہزاروں لاشوں کا تڑپنا کوئی معنی نہ رکھتا تھا، اس کا دل اپنے دو بیٹوں کی موت پر
کس قدر گداز ہو گیا تھا۔

"شاہِ تاتار درست فرماتے ہیں۔" خانزادہ کو اس کے سوا کوئی جواب سمجھ ہی نہ آیا۔

"ہم سمرقند جا رہے ہیں۔ چاہو تو تم ہمارے ساتھ چل سکتی ہو"۔ تیمور نے رسماً پوچھا:

"اگر شہرِ سبز میں رہنا چاہو تو ہمارے بعد یہاں منتقل ہو جانا۔ تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی"۔

"امیرِ محترم! کنیز سمرقند میں رہتے رہتے گھبرا گئی تھی۔ اس لیے کچھ دنوں کے واسطے یہاں آ گئی تھی"۔ خانزادہ نے تیمور کا لہجہ نرم دیکھ کر کہا:

"سمرقند اور شہرِ سبز دونوں مقامات اب مجھے اجنبی اجنبی سے لگتے ہیں کیونکہ امیر عام طور سے باہر رہتے ہیں"۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو خانزادہ"۔ تیمور بولا:

"ملکی ضروریات اور مصلحتیں ہمیں سمرقند میں زیادہ دن ٹھہرنے نہیں دیتیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دارالسلطنت سے ہماری غیر حاضری ہمارے لواحقین کو شاق گزرتی ہے لیکن ہم مجبور ہیں"۔

"امیرِ محترم۔ اگر اجازت دی جائے تو کنیز کچھ دنوں کے لیے اُرگاوش چلی جائے"۔ خان زادہ نے موقع غنیمت جان کر فوراً کہا:

"اُرگاوش میں اگرچہ اب کنیز کا کوئی قریبی عزیز موجود نہیں۔ پھر بھی وہاں سے کنیز کی بچپن کی یادیں وابستہ ہیں۔ اگر امیر مناسب سمجھیں تو۔"

خانزادہ نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا تاکہ تیمور اس کی بات کو ضد نہ سمجھ بیٹھے۔ تیمور کا خیال فوراً اپنی دوسری بیوی سرائے خانم کی طرف گیا۔ اسے معلوم تھا کہ خانزادہ اور سرائے خانم میں اَن بن رہتی ہے اور ہر ایک اپنے کو دوسرے سے برتر سمجھتی ہے۔ یہ بات بالکل صحیح تھی۔ تیمور نے خانزادہ کو بہت کافی اختیارات دے رکھے تھے۔ یہاں تک کہ اسے محل میں دربار لگانے کی بھی اجازت تھی۔ خانزادہ کے اخراجات پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جس قدر چاہتی خرچ کر سکتی تھی۔ خانزادہ کو یہ مراعات اس وجہ سے دی گئی تھیں کہ وہ تیمور کے سب سے بڑے اور چہیتے بیٹے کی بیوہ تھی۔

دوسری طرف سرائے خانم تھی۔ تیمور کی پہلی بیوی الجائی خاتون کے مرنے کے بعد سرائے خانم تیمور کی سونی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ وہ ملکۂ عالم تھی اور اسے تمام بیگمات اور شاہی خاندان کی خواتین پر فوقیت حاصل تھی۔ سرائے خانم کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ گئی تھی کہ اس نے تیمور کے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادہ شاہ رُخ کو جنم دیا تھا۔ شاہ رُخ تیمور کا چوتھا لڑکا تھا اور دستور کے مطابق وہ سلطنت کا وارث تھا کیونکہ بادشاہ کے پہلے چار بیٹوں کو وارث سمجھا جاتا تھا۔ سرائے خانم اور خانزادہ میں کئی بار جھگڑا ہو چکا تھا لیکن تیمور کے رعب کی وجہ سے اس نے کوئی خطرناک صورت اختیار نہیں کی تھی۔ خانزادہ با اختیار ہونے کے باوجود احساسِ کمتری کا شکار رہتی۔ سرائے خانم کی شان و شوکت اور آن بان دیکھ کر خانزادہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ سرائے خانم جب شام کے وقت گل گشت کو نکلتی تو ایک درجن حبشی عورتیں اس کی قبا کا دامن اٹھا کے چلتیں اور خوبصورت کنیزیں اس کی زرنگار کلاہ کے مرصع پروں کو سنبھالے رہتیں۔ تیمور کو نیلا رنگ بہت پسند تھا اس لیے

سرائے خانم قصرِ شاہی میں نیلی اینٹوں کے نئے نئے فرش بنواتی اور ان پر گردن بلند کر کے چہل قدمی کرتی تو خانزادہ کے سینے پر چھریاں سی چلنے لگتیں۔

ان باتوں سے تنگ آ کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سمرقند کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے۔ اس لیے کہ اس کے دونوں بیٹے جوان ہو رہے تھے اور اسے خطرہ تھا کہ تیمور کی آنکھ بند ہوتے ہی وراثت کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہو گا اور اسے اپنے لڑکوں کی پرورش مشکل ہو جائے گی۔ خوارزم میں اب بھی لوگ پرانے رشتوں کی بنا پر اس سے محبت کرتے تھے اور وہ خود کو وہاں سمرقند سے زیادہ محفوظ سمجھتی تھی۔

تیمور بھی ان باتوں سے بے خبر نہ تھا۔ خان زادہ کی درخواست پر اسے کچھ زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ وہ ذرا دیر سوچنے کے بعد بولا:

"خانزادہ۔ تمہاری درخواست قبول کی جاتی ہے لیکن تمہیں ایک قربانی دینا ہو گی۔ بظاہر یہ قربانی ہو گی لیکن مستقبل میں اس سے فائدہ پہنچے گا"۔

"امیر، کنیز کی جان و مال کے مالک ہیں"۔ خانزادہ نے بے جھجک کہا:

"کنیز کو کسی بھی قربانی میں عذر نہ ہو گا بلکہ امیر کے حکم کی تعمیل کرنا کنیز کے لیے باعثِ فخر ہو گا"۔

"تم ہمارے بہادر بیٹے کی بیوہ ہو خانزادہ"۔ تیمور نے اسے دیکھا:

"ہمیں جہانگیر سے جس قدر محبت تھی کم و بیش اتنی ہی محبت ہمیں تم سے اور تمہاری اولاد شہزادہ پیر محمد اور خلیل محمد سے ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ باپ کی موت انہیں احساسِ محرومی میں مبتلا کر دے اور وہ اپنا مستقبل نہ بنا سکیں۔ انہیں بہترین تربیت کی ضرورت ہے۔ تم عقلمند ہو ہمارا اشارہ سمجھ گئی ہو گی"۔

"جی نہیں امیر عالی مقام"۔ خانزادہ نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا:

"میرے بیٹے امیر کی محبت اور شفقت کی ضرور قدر کریں گے اور جوان ہونے کے بعد امیر کے احکامات پر اپنی جان کی بازی لگا دیں گے"۔

"ہم یہ چاہتے ہیں خانزادہ"۔ تیمور نے مزید وضاحت کے لیے کہا:

"تمہارے ساتھ رہ کر شہزادے وہ مقام حاصل نہ کر سکیں گے جس کی ہمیں آرزو ہے۔ تم خود تو اپنا مستقبل سنوارنے کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہو ہم اس میں دخل دینا نہیں چاہتے لیکن شہزادوں کی نگہداشت اور تربیت تم ...

"امیر فرمائیں۔ کنیز کو ان کی تربیت کے لیے کیا قدم اٹھانا ہو گا"۔ خانزادہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "شہزادوں کی بھلائی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے"۔

"تمہیں اس سلسلے میں فکر کی ضرورت نہیں خانزادہ" تیمور نے کمالِ شفقت کا اظہار کیا:

"ہم چاہتے ہیں کہ دونوں شہزادے ہماری نگرانی میں فوجی اور غیر فوجی تربیت حاصل کریں۔ اگر تم نے خوشی سے شہزادوں کو ہمارے پاس چھوڑ دیا تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہماری نظروں میں شاہ رخ مرزا اور تمہارے بیٹوں کا ایک ہی مقام ہوگا۔ انہیں یکساں طور پر فنونِ جنگ کی تربیت دی جائے گی۔ اب یہ ان کی کوشش اور صلاحیت ہوگی کہ کون کس پر سبقت لے جاتا ہے۔"

خانزادہ کے لیے اس سے بڑھ کر مسرت اور اطمینان کا اور کیا مقام ہو سکتا تھا کہ تیمور اس کی اولاد کو اپنے بیٹے شاہ رخ مرزا کے برابر درجہ دے رہا تھا۔ خان زادہ نے اپنی مسرت چھپاتے ہوئے کہا:

"امیر کو خدا نے دنیا بھر میں سب سے زیادہ عقل اور فراست عطا کی ہے۔ امیر جو سوچتے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ کنیز کو فخر ہے کہ امیر اپنے مرحوم بیٹے کی اولاد کو اس قدر رغبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کنیز دونوں شہزادوں کو ہمیشہ کے لیے امیر کے حوالے کرتی ہے اور ان کی واپسی کا کبھی مطالبہ نہ کرے گی۔"

"شاباش خانزادہ" تیمور خوش ہو کر بولا:

"آج سے پیر محمد اور سلطان محمد ہمارے پاس مثل اپنی اولاد کے رہیں گے۔ ہم کچھ دنوں بعد ایک مہم پر جا رہے ہیں۔ ہمارے واپس آنے پر تم جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو۔ تمہارے اختیارات میں کوئی کمی نہ ہوگی۔"

تیمور کی بات ختم ہوئی تھی کہ ایک کنیز نے میراں شاہ کے آنے کی اطلاع دی۔ میراں شاہ کے نام پر خانزادہ چونکی۔ امیر نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا:

"شہزادے کو آنے کی اجازت ہے۔"

خانزادہ نے فوراً اپنا رخ ذرا سا دوسری طرف موڑ لیا۔

شہزادہ میراں شاہ نے داخل ہو کر تیمور کو سلام کیا پھر ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے شہزادے۔ کوئی اہم مسئلہ ہے؟" تیمور نے ذرا ترشی سے پوچھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں امیر بابا..." میراں شاہ تیمور کے تیور دیکھ کر گھبرا گیا:

"میں تو صرف سلام کو حاضر ہوا تھا۔"

"سلام قبول ہوا۔ اب تم جا سکتے ہو۔" تیمور نے بڑے روکھے پن سے کہا۔

میراں شاہ اور زیادہ گھبرا گیا اور الٹے پیر واپس ہونے لگا۔ یہ میراں شاہ کی اپنی غلطی تھی۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ امیر اور بڑی بہو شہزادی خانزادہ گفتگو کر رہے ہیں لیکن اس اطلاع کے باوجود اس نے قدبوسی کی اجازت طلب کی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ خانزادہ کا دیدار کرنا چاہتا ہو جس کی محبت اس کے دل میں دبی ہوئی تھی۔

میراں شاہ باہر نکلنے والا تھا کہ تیمور نے آواز دی:

"شہزادے! اب تم آ ہی گئے ہو تو ان سے ملو۔ جانتے ہو یہ کون ہیں؟"

"جی۔ جی" میراں شاہ کی زبان سے اک دم نکل گیا۔ حالانکہ اسے خانزادہ کا پورا چہرہ نظر نہ آ رہا تھا:

"شاید یہ شہزادے جہانگیر بھائی کی بیوہ....."

"شاید نہیں بلکہ یہ یقیناً وہی ہے۔" تیمور نے زور دے کر کہا:

"خان زادہ تمہاری بھابی ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ جب بھی ان سے سامنا ہو تو سلام کرنے میں پہل کرو اور احترام بالکل اسی طرح کیا کرو جیسے شہزادے کی عزت کرتے تھے۔"

"ایسا ہی ہوگا امیر بابا۔"

میراں شاہ نے جھک کر خانزادہ کو سلام کیا۔ ذرا دیر بعد اس نے واپس جانے کی اجازت مانگی۔ امیر تیمور کسی خیال میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میراں شاہ کو ٹھہرنے کا بہانہ مل گیا اور وہ چور نظروں سے بار بار خانزادہ کو دیکھنے لگا۔ خانزادہ کو اس کی یہ چھچھوری حرکت بہت ناگوار گزری۔ اگر شاہی دربار نہ ہوتا تو شاید وہ میراں شاہ کو دھتکار دیتی۔

"ہم سمرقند جا رہے ہیں۔" تیمور نے جیسے خود کلامی کی۔ وہ کسی سے بھی مخاطب نہ تھا۔ میراں شاہ اور خانزادہ خاموش رہے۔

"تم نے سنا شہزادے۔" تیمور نے کہا:

"ہم سمرقند جا رہے ہیں اور تم بحیرۂ خزر (کیسپین) کی طرف کوچ کرو گے..... خوارزم کی ولایت تمہیں عطا کی ہے۔"

"مجھے کب جانا ہوگا امیر بابا؟" شہزادے کا سر غرور سے بلند ہو گیا۔

"کل شام تم یہاں نہیں ہو گے۔" تیمور نے اسے اعزاز بخش کر رخصت کر دیا۔

میراں شاہ باپ سے مل کر واپس آیا تو اس کے قدم زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ خوارزم کی ولایت بحیرۂ خزر

کے مشرق سمت واقع تھی۔ یہ علاقہ اُس دور میں انتہائی خوشحال اور دولت سے مالا مال سمجھا جاتا تھا۔

خوارزم کی حکومت پہلے خانزادہ کے چچا حسین صوفی کے پاس تھی۔ تیمور نے اسے شکست دے کر اس پر قبضہ کیا اور اس ولایت کو اپنے بڑے بیٹے اور ولی عہد جہانگیر کے سپرد کر دیا۔ جب جہانگیر کا انتقال ہوا تو تیمور نے یہ ولایت عمر شیخ کے حوالے کر دی تھی لیکن وہ بھی مارا جا چکا تھا۔

اس مالدار ولایت پر میراں شاہ جس قدر بھی غرور کرتا وہ کم تھا۔ اس نے واپس جاتے ہی روانگی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تیمور نے اگرچہ اس سے دوسرے دن شام تک روانہ ہونے کے لیے کہا تھا لیکن میراں شاہ جانتا تھا کہ یہ تیمور کا حکم ہے اور تیمور اپنی حکم عدولی کسی صورت میں برداشت نہ کرتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صبح ہوتے ہی اپنی ولایت پر روانہ ہو جائے گا۔

پھر کسی چور دروازے سے خانزادہ کا خیال اس کے دل کے نہاں خانے میں اتر آیا۔ اس کی دوسری ملاقات تیمور کے دربار میں ہوئی تھی مگر اسے ملاقات کا نام مشکل ہی سے دیا جا سکتا تھا۔ وہ خانزادہ کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا۔ اس وقت اُس کے دل میں کچھ ایسی بے چینی پیدا ہوئی کہ وہ خانزادہ سے ملنے چل پڑا۔ خانزادہ جس حویلی میں ٹھہری ہوئی تھی اُس کا پتہ میراں شاہ کو معلوم ہو گیا تھا۔ شام کو دربار جاتے وقت وہ اس حویلی کے سامنے سے گزرا تھا۔ اگر اسے دربار جانے کی جلدی نہ ہوتی تو اسی وقت خانزادہ سے ملاقات کرتا۔

خانزادہ تھوڑی دیر پہلے ہی تیمور سے مل کر واپس آئی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کو خوشی خوشی اس مفید ملاقات کی تفصیل بتا رہی تھی۔ ... آج تو اس نے میراں شاہ کو اپنے حسنِ جہاں تاب کی جھلک دکھا کر اس کے دل میں آگ ہی لگا دی تھی۔ اسے میراں شاہ پسند نہ تھا لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ میراں شاہ کو اپنے دام میں گرفتار رکھے اور ضرورت کے وقت اس سے کوئی اہم کام لے۔

اپنے دونوں بیٹوں کی طرف سے اسے جو فکر تھی اسے تیمور نے حل کر دیا تھا۔ شہزادہ پیر محمد اور شہزادہ سلطان محمد کو تیمور نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ جب پہلا شہزادہ پیر محمد پیدا ہوا تھا تو اس نے جہانگیر سے ہنس کر کہا تھا:

"اب بادشاہت میرے گھر میں رہے گی۔"

لیکن جہانگیر عین جوانی میں انتقال کر گیا اور خانزادہ کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا تھا۔ شہزادوں کے تیمور کے زیرِ سایہ پرورش پانے سے اسے یہ امید ہو گئی تھی کہ اس کے بیٹے تیمور کی زندگی میں کم از کم ایسا مرتبہ پا لیں گے کہ تیمور کی وفات کے بعد خواہ کوئی بھی بادشاہ بنے شہزادے اپنی اور خانزادہ کی حفاظت کر سکیں گے۔

خانزادہ سہیلیوں کو رخصت کر کے سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ کنیز نے اسے میراں شاہ کے آنے کی اطلاع دی۔ خانزادہ اس اطلاع سے بہت متوحش ہوئی۔ اسے خوف بھی محسوس ہوا۔ اور میراں شاہ پر غصہ بھی آیا۔ تیمور ابھی شہر میں موجود تھا اگر اسے میراں شاہ کے اس کے پاس اتنی رات گئے آنے کی خبر ہو گئی تو پتہ نہیں کیا قیامت برپا ہو۔ لیکن اس میں خود اس کی غلطی تھی۔ اگر اس نے میراں شاہ کو پہلی ملاقات میں اس قدر بے تکلف ہونے کا موقع نہ دیا ہوتا تو شاید وہ ایسی جرأت نہ کر سکتا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

میراں شاہ سے ملاقات نہ کرنے کا مطلب تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے نکل جاتا لیکن ملاقات میں خوف سدِّ راہ تھا۔

بہت کچھ غور و فکر کے بعد آخر اسے ملاقات کا خطرہ مول لینا پڑا۔ اس نے کنیز کو حکم دیا:

"شہزادے کو مہمان خانے میں بٹھایا جائے۔"

کنیز کو ادھر بھیج کر اس نے دوسرا لباس پہنا۔ چہرے پر غازے کی تہ جمائی اور نئی نویلی دلہن کی طرح سج بن کر میراں شاہ کے پاس گئی۔

میراں شاہ نے تو اسے ماتمی لباس میں ہی پسند کر لیا تھا۔ اب جو وہ سنگار کیے اور شعلہ جوالہ بنی اس کے سامنے پہنچی تو اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ خانزادہ کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس کے دو بیٹے جوانی میں قدم رکھ چکے ہیں۔

میراں شاہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہا تھا اور خانزادہ سامنے کھڑی تبسم کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ میراں شاہ بدحواس ہو گیا۔ اس نے خود ہی خانزادہ کو تعظیم پیش کی۔

"خانزادہ شہزادے کو خوش آمدید کہتی ہے"۔ خانزادہ مسکرا کر ذرا سا خم ہوئی پھر سیدھے ہوتے ہوئے بولی: "خانزادہ جانتی ہے کہ ولی عہد بہادر جان پر کھیل کر ملاقات کے لیے آئے ہیں ورنہ امیر تیمور کی موجودگی میں اس طرح کسی غیر عورت کے گھر اس طرح جانے کے انجام سے کون واقف نہیں۔ یہی سوچتے ہوئے خانزادہ نے بھی سر پر گردن رکھ دی اور شہزادے کو خوش آمدید کہا۔"

"خانزادہ! ہم حسینِ صورت کے ساتھ حسنِ کلام سے بھی آراستہ ہو"۔ میراں شاہ نے سرمستی کے عالم میں کہا: "تم جیسی ہستی کے لیے اگر ہمیں سر بھی گنوانے پڑیں تو ہم دریغ نہیں کریں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اس وقت تکلیف دی۔ ... مگر ہم کیا کرتے۔ صبح ہوتے ہی ہم اپنی ولایت کی طرف روانہ ہو جائیں گے ہم نے سوچا پہلے ہم بارگاہِ حسن میں ایک بار حاضری دے لیں اور تجدید عہد بھی کرتے چلیں۔ خانزادہ! ہم یقینی

دلاتے ہیں کہ میراں شاہ کے دل کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے اور ہماری
ولایت کی سرزمین تمہاری قدمبوسی کے لیے بے چین رہے گی۔"

خانزادہ جواب دینے والی تھی کہ ایک کنیز نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ خانزادہ کچھ پریشان ہو گئی۔ اس نے
میراں شاہ سے کہا:

"ولی عہد شہزادے! جس خطرے کا امکان تھا وہ سر پر آ گیا۔ شہر سبز کے کوتوال نے شہزادے کی سواری
دروازے پر دیکھ لی ہے اور شاید وہ آپ کی واپسی کا انتظار کر رہا ہے۔"

"سر سے کفن باندھنے والے ڈرا نہیں کرتے خانزادہ!" میراں شاہ یہ کہتے ہوئے اٹھا:
"بہرحال ہم نہیں چاہتے کہ تم کسی عذاب میں مبتلا ہو۔ اس موہوم خطرے کا تدارک کر کے ہم ابھی واپس
آتے ہیں۔"

میراں شاہ حویلی کے دروازے پر پہنچا۔ شہر سبز کا کوتوال واقعی گھوڑے پر سوار وہاں کھڑا تھا۔ میراں شاہ کو
دیکھ کر وہ فوراً گھوڑے سے اترا اور جھک کر آداب بجا لایا۔

"شاید تمہیں علم نہیں کہ صبح کو ہم اپنی ولایت کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔" میراں شاہ نے پُر رعب لہجے میں کوتوال
کو مخاطب کیا:

"شہزادیِ خوارزم سے ہمارا جو رشتہ ہے اس سے تم واقف ہو۔ جانے سے پہلے ان سے ملاقات ضروری تھی۔
تمہیں فکر کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے اجازت ہے؟" کوتوال نے پھر آداب پیش کیا۔

"ہاں، تم جا سکتے ہو۔" میراں شاہ لاپروائی سے بولا۔

کوتوال نے باگ سنبھال کر رکاب میں پیر رکھا ہی تھا کہ میراں شاہ نے کہا:

"ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے یہاں آنے کی اطلاع امیر بابا کو نہ دی جائے۔"

"بہتر ہے شہزادے بہادر۔" کوتوال گھوڑے پر سوار ہوا:

"میری کیا مجال ہے کہ ولی عہدِ سلطنت تاتار کے حکم سے سرتابی کروں۔ میں ولی عہد شہزادے کے احسان پر
ہمیشہ فخر کروں گا۔"

کوتوال چلا گیا۔ میراں شاہ نے واپس آ کر کہا:

"بلا آئی مگر بخیر و خوبی ٹل گئی۔ اب ہم اطمینان سے گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"نہیں شہزادے!" خانزادہ نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا:

"اس ملاقات کو یہیں ختم کر دیجیے۔ زندگی ہے تو ہم کسی نہ کسی موڑ پر پھر ملیں گے۔"

میراں شاہ نے محسوس کیا کہ خانزادہ خوفزدہ ہو گئی ہے۔ ایسے ماحول میں کسی پُر لطف گفتگو کی امید بھی نہ
تھی۔ اس نے کہا:

"ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے لیکن ہم تمہارا انتظار کریں گے۔"

"خانزادہ بھی شہزادے کو یقین دلاتی ہے کہ وہ ایک دن اور گنج ضرور پہنچے گی۔" خانزادہ نے پورے وثوق
سے جواب دیا:

"لیکن اس دن کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دن سات روز بعد بھی آ سکتا ہے اور سات سال بعد بھی۔"

"اچھا خدا حافظ۔" شہزادہ واپس ہوا۔

"شب بخیر۔" خانزادہ نے شہزادے کو دروازے تک پہنچایا۔

○

میراں شاہ نے اور گنج پہنچ کر اپنی رنگین محفل جمالی۔ دولت کی افراط نے میراں شاہ کی دل لگی کے ایسے ایسے
سامان پیدا کیے کہ خانزادہ کا خیال اس کے ذہن سے ہلکے ایک جھونکے کی طرح نکل گیا۔

شہر سبز سے چلتے وقت وہ خانزادہ کی محبت سے سرشار تھا۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ اور گنج پہنچتے ہی وہ خانزادہ کو
اپنی ولایت میں لانے کے انتظامات کرے گا۔ میراں شاہ کو اگر دولت نہ بھی حاصل ہوتی تو بھی اس کے آرام و آسائش
میں کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ تاتاری اپنے امیر سے اس قدر مرعوب تھے کہ تیمور کے علاوہ وہ اس کی اولاد کو بھی اپنا
آقا اور ولی نعمت سمجھتے تھے اور اس کے حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرتے تھے۔ بادشاہ کا مذہب، رعایا کے مذہب کے
مصداق لوگوں نے میراں شاہ کی رنگین مزاجی دیکھی تو خود بھی اس رنگ میں رنگ گئے۔

اس دوران خانزادہ ایک بار پوشیدہ طور پر اور گنج آ گئی اور اس نے کسی کے ذریعے میراں شاہ کو
اپنی اور گنج میں موجودگی کی اطلاع دی تھی اور کئی دن تک میراں شاہ کے جواب کا انتظار کیا لیکن پتہ نہیں یہ اطلاع
میراں شاہ کے کانوں تک پہنچی نہیں یا پھر وہ اپنی رنگ رلیوں میں کچھ اس طرح گھر گیا تھا کہ اسے اب خان زادہ
جیسی خوبصورت بیوہ کی پروا نہ رہی تھی۔

خانزادہ کو میراں شاہ کی غفلت یا اس کی طرف سے بے التفاتی سخت ناگوار گزری اور وہ بھی میراں شاہ کو

اس طرح بھول گئی جیسے اس سے ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔

ملکہ سرائے خانم اپنی جگہ خوش تھی۔ اس کا بیٹا شاہرخ مرزا جوان ہو رہا تھا۔ یہ شہزادہ تیمور کے تمام بیٹوں اور پوتوں سے زیادہ نفیس الطبع اور رحمدل تھا۔ امورِ سلطنت سے زیادہ اس کا رجحان علم و ادب کی طرف تھا۔ خالی اوقات میں وہ کتابیں پڑھا کرتا۔ سرائے خانم کو بیٹے سے یہی شکایت تھی۔ یہ نہیں کہ شاہرخ مرزا میں بہادری کے جوہر نہ تھے۔ وہ شہزادے پیر محمد اور سلطان محمد سے شجاعت میں کسی طرح کم نہ تھا لیکن یہ تینوں ہم عمر تھے اس لیے ان میں میل، محبت اور دوستی بھی تھی۔ میدانِ جنگ میں ان کی راہیں بے شک بدل جاتیں اور وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور تیمور انہیں لڑتے دیکھ کر مسکرایا کرتا تھا۔

تیمور کو اب نہ سرائے خانم کی فکر تھی اور نہ خانزادہ کی پروا۔ اس نے اپنے عیاش بیٹے میراں شاہ کی طرف بھی توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ پہلے اس کا یہی خیال تھا کہ اگر میراں شاہ نے اپنی حالت درست کر لی تو وہ اسے ولی عہد بنا دے گا۔ لیکن جب اس کے بیٹے شاہرخ مرزا اور پوتوں پیر محمد اور سلطان محمد نے اس کے ساتھ جنگ میں حصہ لینا شروع کر دیا تو اسے میراں شاہ کی مطلق پروا نہ رہی۔ اس کے سامنے ولی عہدی کے تین نئے امیدوار آ گئے تھے جن میں سے ہر ایک اس مرتبے کا اہل تھا اور ہر جنگ میں ان کی اہلیت پر مہریں لگتی چلی جا رہی تھیں۔

تیمور نے بلادِ شمال کے جتہ خانِ اعظم اور سنہری غول کے خاقان کی سرزمین کو پامال کر کے رکھ دیا تھا۔ اب ان کا ٹھکانا ان کا آبائی وطن صحرائے گوبی یا ٹنڈرا کے برفیلے میدانوں کے سوا اور کہیں نہ رہ گیا تھا۔

تیمور کے حوصلے بلند تھے۔ اس کا لشکر ایک لاکھ سے زیادہ سواروں پر مشتمل تھا جسے معروف اور قابل رکھنے کے لیے تیمور کو نئے جنگی میدانوں کی ضرورت تھی۔ اس نے جنوب اور جنوب مغرب کی طرف اب تک توجہ نہ کی تھی۔ اس کی جنوبی سرحدیں ہندوستان اور ایران سے ملتی تھیں۔ افغانستان کا علاقہ اس کے قبضے میں تھا۔ اس کے بعد ہندوکش کا پہاڑی سلسلہ تھا جس کے دوسری طرف ہندوستان واقع تھا۔ لیکن تیمور کو ہندوستان سے سوائے تجارت کے اور کوئی سروکار نہ تھا۔ ایران کی طرف ضرور اس کی نظریں اٹھتی تھیں لیکن اس کی مملکت اور ایران کے درمیان ایک ہزار میل کا شور صحراؤں کا وسیع سلسلہ حائل تھا جس کو عبور کرنے کے لیے اسے کافی تیاری کی ضرورت تھی۔

ایران کبھی شوکت و سطوت کا مرکز رہا تھا۔ نوشیرواں، کیکاؤس اور خسرو پرویز کا تعلق اسی سرزمین سے تھا۔ زرتشت، مانی اور مزدک نے یہیں نئے نئے مذاہب کی تبلیغ کی تھی اور اوائلِ اسلام میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے گھوڑے اس کے میدانوں میں دوڑتے رہے تھے لیکن اب یہ ایک تباہ حال ملک تھا۔ ہلاکو خان کا ایلخانی خاندان بھی ایران پر ڈیڑھ سو سال تک حکومت کر کے اپنے آپ کو شراب ناب میں ڈبو کر ختم ہو چکا تھا۔ عظیم مسلم فرمانرواؤں کے تخت و تاج کے مالک ان کی نالائق اولاد تھی جو ملکی امور پر توجہ دینے کے بجائے اپنا سارا وقت لہو و لعب اور شراب

میں گنواتے تھے۔ ایران کی عظیم سلطنت ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی جن میں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

تیمور کے دور میں ایران پر خاندانِ مظفریہ کا قبضہ تھا اور وہاں کا بادشاہ جلال الدین شاہ شجاع تھا۔ اس کا اگرچہ صرف کرمان، نیرو، اصفہان اور شیراز تک محدود تھا لیکن وہ خود کو شہنشاہ کہلواتا تھا۔ تیمور کی فتوحات کا ہوا تو شاہ شجاع نے فوراً دوستی کا ہاتھ تیمور کی طرف بڑھایا اور اسے ایک طویل خط لکھا۔

اس خط میں شاہِ ایران نے لکھا:

"جنہوں نے اس دنیا کو غور سے دیکھا وہ جانتے ہیں کہ یہ کتنی ناپائدار ہے۔ عقلمند نہ اس کی فانی اشیاء کی طرف مائل ہوتے ہیں اور نہ اس کے حسن اور لذتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ میرے اور آپ کے درمیان ایک عہد نامہ ہوا تھا (اس عہد نامے کی تفصیل کسی تاریخ میں نہیں ملتی)۔ اس کے سلسلے میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ میں آپ کی دوستی حاصل کر لینے کو ایک بہت بڑی کامیابی سمجھتا ہوں اور میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ عہد نامہ میرے ہاتھ میں ہو تاکہ آپ مجھے عہد شکنی کا ذمے دار قرار نہ دیں۔ ترپن سال کی اس زندگی میں جو میں نے اس دنیائے آب و گل میں بسر کی، کونسا عیش ایسا تھا جس کی لذت میں نے نہیں چکھی، لیکن ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہو۔ بارگاہِ خداوندی میں میری دعا ہے کہ خدا اس بادشاہ (تیمور) کو سلامت رکھے جو سلیمان جیسا دانا اور سکندر جتنا عظیم ہے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ سے اپنے جگر گوشے زین العابدین کی سفارش کرنا ضروری نہیں۔ خدا اسے آپ کے سایہ میں خوش و خرم رکھے۔ میں اسے خدا کے اور آپ کے سپرد کرتا ہوں اور اس بدگمانی کی گستاخی ہرگز نہیں کر سکتا کہ آپ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں گے!"

تیمور ایران پر فوج کشی کا منصوبہ بنا چکا تھا اور اس نے بڑے رازدارانہ طریقے سے اس کی تیاریاں بھی مکمل کر لی تھیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کے اس خط نے اس پر بہت اثر کیا اور اس نے فوری حملے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

پھر جب ۱۳۸۶ء میں شاہ شجاع کا انتقال ہو گیا اور ایران میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو ایران فتح کرنے کی

تمنا پھر تیمور کے دل میں پیدا ہوئی۔ شاہ شجاع نے اپنے بیٹے زین العابدین کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بنا دیا تھا لیکن اس کے مرتے ہی اس کے دس بیٹے سلطنت کے دعویدار بن گئے۔ اصفہان پر زین العابدین کے ایک بھائی سلطان ابویزید نے قبضہ کر لیا۔ دوسرا بھائی احمد بن شجاع کرمان پر قابض ہو گیا۔ تیسرے نے فارس دبا لیا۔ غرض ہر ایک نے اپنی حکومت بنالی اور سکے بھی ڈھال لیے۔ یہ سب بھائی آلِ مظفر تھے لیکن ہر ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔

تیمور نے پھر بھی تحمل سے کام لیا۔ اس نے ہر شہزادے کے پاس الگ الگ اپنا سفیر بھیجا اور انہیں اطاعت کا حکم دیا۔ تیمور کی فتوحات اور لاؤ لشکر کا شہرہ پورے ایران میں پھیلا ہوا تھا۔ تمام شہزادے بھی اس سے خائف تھے لیکن ہر ایک نے تیموری سفیر کو روک لیا اور یہ انتظار کرنے لگا کہ پہلے دوسرا بھائی اطاعت قبول کرے تاکہ بزدلی اور بدنامی کا پہلا داغ اس پر نہ لگ سکے۔ اس انتظار میں تیموری سفیر ایک طویل عرصے تک ایران کی مختلف ریاستوں میں ٹھہرے رہے۔

سفیر جب عرصہ تک جواب لے کر واپس نہ پہنچے تو تیمور کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ ۷۸۹ھ میں تیمور نے ستر ہزار کے عظیم لشکر کے ساتھ جنوب کا رخ کیا۔ یہ لشکر ہزار ہزار کے ستر چھوٹے لشکروں پر مشتمل تھا۔ باربرداری سے متعلق لوگ اس کے علاوہ تھے۔ تیمور نے ہزار میل کا ریت اور شور کا صحرا بڑے سکون سے طے کیا اور اصفہان کے مضافات میں پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔

ایرانیوں کی بے خبری کا یہ عالم تھا کہ انہیں جیسے تیمور کے آنے کی خبر نہ ہوئی تھی یا وہ تاتاری لشکر کو بارات سمجھ رہے تھے۔ ان کے معمولات میں تیمور کے آنے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ تیمور کو جگہ جگہ نیم برہنہ زائرین دھوپ میں تپتے نظر آئے۔ تیمور کے ان نیم قبائلی سرداروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر خچروں پر سوار ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ان سرداروں کے سروں پر ان کے غلام چھتر کا سایہ کیے ہوئے تھے۔

اصفہان چند میل کے فاصلے پر تھا۔ تیمور کی جنگی تیاریاں بھی مکمل تھیں لیکن وہ جنگ کرنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ اسے شاہ شجاع کا خط یاد تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر شہزادے اس کی اطاعت قبول کر لیں تو وہ انہیں سرزنش کر کے واپس چلا جائے گا۔

اصفہان کے مضافات نے تو تیمور کی آمد کی کوئی پروا نہ کی لیکن جب یہ خبر اصفہان پہنچی تو لوگوں کے حواس گم ہو گئے۔ اصفہان میں شاہ زین العابدین کا خالو سید مظفر شمسی موجود تھا۔ اہلِ شہر اس کے پاس گئے اور اس بلا سے نجات دلانے کی درخواست کی۔ مظفر شمسی جانتا تھا کہ جو لشکر ایک ہزار میل کا ریتلا راستہ طے کر کے آیا ہے، خالی ہاتھ واپس نہیں جا سکتا اور شہر کو بچانے کی صرف یہی صورت ہے کہ تیمور کے سامنے اظہارِ اطاعت کے ساتھ اس کی

خواہشات کو پورا کیا جائے۔ مظفر شمسی گھوڑے پر سوار ہوا اور اصفہان کے چند امیروں کو ساتھ لے کر تیمور کی لشکر گاہ میں جا پہنچا۔

تیمور اس وقت اپنے خیمے کے سامنے قالین کے فرش پر ایک مسند کے سہارے بیٹھا تھا اور اپنے سرداروں سے اصفہان ہی کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ اسے زین العابدین کے خالو کے آنے کی خبر ملی تو اس نے اسے مع دیگر سرداروں کے اسی وقت اپنے حضور میں طلب کر لیا۔ مظفر شمسی کو خیال تھا کہ اس پر تیمور ناراض ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کی گرفتاری کا حکم دے دے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تیمور خلافِ امید اس سے بڑی خوش دلی اور محبت سے ملا۔ اس نے مظفر شمسی کو اپنے قریب ہی قالین پر بٹھا لیا۔ اور سوچنے لگا کہ بات کس طرح شروع کرے۔

تیمور نے اس کی پریشانی شاید بھانپ لی۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے بڑی بے تکلفی سے گفتگو کا آغاز کیا۔ اس نے متانت سے کہا،

"شاہ شجاع ہمارا بھائی تھا اور زین العابدین کو ہم اپنا بیٹا سمجھتے ہیں لیکن جب بیٹا نافرمانی کرے تو اس کی سرزنش ضروری ہو جاتی ہے۔"

"شاہِ تاتار درست فرماتے ہیں۔" مظفر شمسی نے بڑے سلیقے سے کہنا شروع کیا۔

"اگر اولاد کی غلطیوں پر گرفت نہ کی جائے تو برے راستے پر چل پڑتی ہے۔ ہم اہلِ شہر، شاہِ تاتار کی خدمت میں اسی لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے معافی مانگیں۔"

"ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں۔" تیمور صاف دلی سے بولا۔

"مگر ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے سفیروں کو کیوں روکا گیا اور ہمیں اب تک اطاعت کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟"

"اے شاہِ تاتار!" مظفر شمسی نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"سمرقند کے تمام سفیروں کو شاہی مہمان خانوں میں ٹھہرایا گیا ہے۔ ان کی خاطر و مدارات میں بھی کسی قسم کی کمی نہیں کی گئی۔ ان کی واپسی میں دراصل تاخیر اس لیے ہوئی کہ تمام شاہزادے یہ چاہتے تھے کہ شاہِ تاتار کو ایک متفقہ نمائندہ سفارت بھیجی جائے جو دربارِ سمرقند میں تحائف پیش کرے اور ہر شہزادے کی نمائندگی کرتے ہوئے اظہارِ اطاعت کرے۔ اس نمائندہ سفارت کی تشکیل کے لیے تمام شہزادوں کو اطلاع دی جا چکی ہے۔ اس تاخیر کے لیے ہم بے حد عذرخواہ ہیں اور معافی کی امید رکھتے ہیں۔"

"دیکھو مظفر!" تیمور نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ہمیں تمہارا یہی نام بتایا گیا ہے۔ ہاں مظفر! ہمیں اصفہان سے کوئی پرخاش نہیں۔ گنبدوں کے اس خوبصورت

شہر کو ہم تباہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اہلِ شہر کو امان دیتے ہیں لیکن تمہاری غلطی کے ازالہ کے لیے ہمیں یہ سفر اختیار کرنا پڑا۔ اس لیے خراج ادا کرنا پڑے گا۔ خراج لیے بغیر لشکر واپس نہیں جائے گا۔“

سید مظفر شمسی نے اپنے ساتھیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ انہوں نے مظفر کو تیمور سے معاملہ طے کرنے کا اختیار پہلے ہی دے دیا تھا۔ اس موقع پر بھی انہوں نے اشاروں کنایوں سے اس کی تصدیق کر دی۔

”اے شاہِ تاتار! ہم مطلوبہ خراج ادا کر دیں گے۔ اہلِ شہر کو امان دی جائے۔“ سید مظفر نے تیمور کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

امیر تیمور نے اپنے ایک امیر کو اشارہ سے قریب بلایا۔

”مظفر سے خراج کی رقم طے کی جائے اور اس کی وصولی کا انتظام کیا جائے۔“

مظفر اور تیمور کے امیر کے درمیان خراج کا فوری تعین ہو گیا۔ اس نے جو رقم کہی مظفر نے اسے تسلیم کر لیا۔ پھر سید شمسی نے تیمور سے درخواست کی:

”اے شاہِ تاتار۔ خراج کی رقم وصول کرنے کے لیے تاتاری لشکر کے سردار میرے ساتھ شہر میں بھیجے جائیں۔ اس طرح خراج کی وصولی میں آسانی بھی ہو گی اور کام بھی جلد نمٹ جائے گا۔“

تیمور نے یہ درخواست منظور کر لی۔ اس نے اپنے ”ستر“ لشکروں میں سے ایک ایک کے سردار کو منتخب کیا اور حکم دیا کہ وہ ایک ایک محلے سے خراج کی وصولی کی نگرانی کریں۔

منتخب سردار سید شمسی کے ساتھ اصفہان میں داخل ہوئے۔ اصفہان کے گرد ایک مضبوط فصیل تھی جس پر چاروں طرف بڑے بڑے دروازے لگے تھے۔ تیمور کے سرداروں کو خراج کی رقم وصول کرنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ اس خانہ جنگی کے زمانے میں لوگوں کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ خراج کی یہ رقم اصفہانیوں کے لیے اس بھیک سے بھی کم تھی جو وہ دو شالوں میں بیٹھے ہوئے بھکاریوں کو دے دیا کرتے تھے۔ انہیں اگر افسوس تھا تو صرف اس بات کا کہ وہ بے دینوں کو بھیک دے رہے تھے۔ ایرانیوں کو تاتاریوں سے سخت نفرت تھی اور وہ تاتاریوں کو بے دین سمجھتے تھے۔

دوسرے دن تیمور اصفہان کی سیر کو روانہ ہوا۔

پانچ ہزار مسلح سواروں کے جلو میں تیمور کا جلوس شہر میں داخل ہوا۔ سیر کا تو محض بہانہ تھا۔ تیمور اصل میں شہر کے تمام دروازوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اہلِ شہر قابو میں رہیں اور کوئی گڑبڑ نہ کر سکیں۔ اس نے شہر کے ہر دروازے پر اپنے ہزار ہزار سواروں کا پہرہ لگا دیا اور گھوم پھر کر اپنی لشکر گاہ میں واپس آ گیا۔

خراج وصول کرنے والے سرداروں نے شہر سے واپس آ کر اس کی خوبصورتی کا کچھ اس طرح ذکر کیا کہ لشکر کا ہر سپاہی اصفہان دیکھنے اور وہاں کی رنگینیوں سے لطف اٹھانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ جو سوار کسی ضرورت سے شہر بھیجے جاتے

وہاں پہنچ کر لہو و لعب میں مشغول ہو جاتے اور کام ختم کرنے کے بعد بھی وہاں دیر تک ٹھہرے رہتے۔ بعض لشکریوں نے شہر جانے کے بہانے تراشنا شروع کر دیے۔ غرض یہ کہ اس رات شہر میں کئی ہزار تاتاری بازاروں میں گھوم رہے تھے یا قہوہ خانوں میں اطمینان سے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔

شام تک شہر میں بالکل امن و سکون تھا لیکن کچھ رات گزرتے ہی اصفہان پر جو بیتی اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دہلی میں نادر شاہ درانی کے حکم سے جو قتلِ عام ہوا تھا کچھ اسی قسم کا واقعہ اصفہان میں بھی پیش آیا۔

کہتے ہیں اصفہان کے ایک قہوہ خانے کے سامنے علی کچھ پا بیان نامی ایک نوجوان نمودار ہوا۔ یہ ذات کا لوہار تھا لیکن بڑا اندڑ اور جوشیلا تھا۔ وہ ایک اونچی جگہ کھڑا ہو گیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا:

”مسلمانو! اٹھو!! ان بے دین تاتاریوں کو ختم کر دو۔ تمہارا مذہب خطرے میں ہے۔ تمہارا دین تباہ ہو رہا ہے۔ تاتاریوں نے دروازوں پر پہرہ لگا دیا ہے۔ تیمور تمہیں چاروں طرف سے گھیر کر ختم کر دے گا۔ تلوار بلند کرو اور قبل اس کے کہ تم قتل ہو جاؤ، تم اپنے قتل کرنے والوں کا خاتمہ کر دو۔ تاتاریوں کی تعداد قلعہ کے اندر بہت کم ہے۔ تم ان پر آسانی کے ساتھ قابو پا سکتے ہو۔“

علی کچھ پا بیان کے گرد لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ ایرانیوں کو تاتاریوں سے پہلے ہی نفرت تھی۔ علی کچھ کی تقریر نے ان میں آگ لگا دی اور محلے محلے شور مچ گیا۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا:

”اٹھو مسلمانو! تمہارا دین خطرے میں ہے۔“

مسلمان خواہ کوئی ہو، کسی ذات، برادری یا گروہ سے تعلق رکھتا ہو، چاہے اس نے دینی فرائض کی کبھی پروا نہ کی ہو لیکن دین و مذہب کے نام پر وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر انجام سے بے خبر ہو کر آگ و خون کی ہولی کھیلنے سے دریغ نہیں کرتا۔

وہ ایرانی جو ذرا دیر پہلے ساغر بکف غل غپاڑہ مچاتے پھر رہے تھے، لمحوں میں مجاہد بن گئے۔ چنگ و رباب کی آوازیں بند ہو گئیں اور شمشیر و سناں کی جھنکار بلند ہوئی۔ ایران والوں نے بغیر سوچے سمجھے تاتاریوں پر حملہ کر دیا۔ تاتاریوں کے تصور میں بھی نہ تھا کہ عشرت پسند ایرانی ان پر حملہ کر سکتے ہیں۔ ان میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ ان کی دو دو چار چار کی ٹولیاں شہر میں گھوم رہی تھیں۔ ایرانی گروہ در گروہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ تاتاریوں نے بھی تلواریں سونت لیں مگر کہاں تک مقابلہ کرتے۔ وہ ایک ایک کر کے قتل ہونا شروع ہو گئے۔

شہر کے سنجیدہ لوگوں کو علم ہوا تو وہ اصفہان کے انجام سے کانپ اٹھے۔ جلالِ تیموری کا انہیں علم تھا۔ وہ جانتے تھے

کہ یہ نادان اپنی موت کو دعوت دے رہے ہیں اور تاتاری لشکر کو اطلاع ہوتے ہی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ عقلمند لوگ گھروں سے نکلے اور بپھرے ہوئے نوجوانوں کو سمجھانا شروع کیا لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ کسی نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ ان سے مایوس ہو کر بعض اصفہانیوں نے تاتاریوں کو اپنے گھروں میں پناہ دی اور جب ان کا گھر گھیر لیا گیا تو وہ بلوائیوں کے سامنے سینہ سپر ہوئے لیکن خونریزی ایک بار شروع ہو جائے تو پھر اس کا روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

تاتاریوں نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی۔ اصفہانیوں کو اس کا پہلے سے خیال تھا۔ انہوں نے بلوہ شروع ہوتے ہی ان تاتاریوں پر حملہ کر دیا جنہیں تیمور نے شہر کے دروازوں پر متعین کیا تھا۔ وہاں تمام رات دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔ شہر کے اندر والے تقریباً تمام تاتاری تہ تیغ کر دیے گئے۔

اصفہانیوں نے دروازوں کے تاتاریوں کو بھی قتل کر کے شہر کے دروازے بند کر لیے۔ اس طرح اس رات تقریباً تین ہزار بے گناہ تاتاری محض ایک بے وقوف لوہار کی آواز پر قتل کر دیے گئے۔ صرف وہ چند تاتاری بچ گئے جنہیں شہر کے شرفا نے اپنے گھروں میں پناہ دی تھی۔

تیمور کی لشکر گاہ اصفہان کے مضافات میں تھی۔ اس بلوہ کی خبر رات میں تیمور تک نہ پہنچ سکی۔ کچھ تاتاری ضرور بچ کر لشکر گاہ میں پہنچ گئے تھے لیکن یہ وہ لشکری تھے جو بغیر اجازت اصفہان کی سیر کو گئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر انہوں نے تیمور کو اصل حالات سے آگاہ کیا تو پہلے ان سے ہی باز پرس ہو گی۔ اس لیے انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ یہ بات چھپنے والی کب تھی۔ صبح ہوتے ہی تیمور کو اس کی خبر مل گئی۔

تیمور کو جس قدر جلال آیا ہو گا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ایک طرف تین ہزار تاتاریوں کا قتل عام ہی تیمور کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھا کہ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا ایک جوان عمر امیر اور بہادر "محمد" بھی مارا گیا ہے۔ محمد مشہور تاتاری سردار حطائی بہادر کا بیٹا تھا۔

تیمور کو اس قدر طیش آیا کہ اس نے اصفہان پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا اور سوائے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے تمام لوگوں کے قتل عام کی اجازت دے دی۔

سید مظفر شمسی چند امراء کے ساتھ اس رات تیمور کی خیمہ گاہ پر موجود تھا۔ اسے اصفہانیوں کی حماقت کا علم ہوا تو اس نے سر پیٹ لیا۔ اور اصفہان کی بھیانک تباہی کا نقشہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ اپنے امیروں کو لے کر تیمور کے پاس پہنچا۔ یہ سب لوگ سر کھولے اور گریباں چاک کیے اس کے سامنے گئے تھے۔ یہ فریاد کی صورت تھی۔ انہیں امید تھی کہ تیمور ان کو اس حال میں دیکھ کر شاید قتل عام کے حکم میں کچھ نرمی کر دے۔ مظفر اور اس کے ساتھی تیمور کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

تیمور کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ زخمی شیر کی طرح ٹہل رہا تھا۔ وہ لنگڑا کر چلتا تھا لیکن اس وقت وہ اتنی تیزی سے خیمے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتا تھا کہ دیکھنے والوں کو اس کا لنگڑانا نظر نہ آتا تھا۔

تیمور نے مظفر شمسی کو دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ مظفر شمسی نے بولنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے حلق سے نہ نکل سکی۔ کچھ دیر بعد تیمور نے پلٹ کر شمسی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ پھر غرایا:

"مظفر ہم جانتے ہیں کہ اس میں تمہارا قصور نہیں لیکن ہمارے تین ہزار تاتاری"۔ تیمور نے غصے سے مٹھیاں بند کر لیں اور ہونٹ بھینچ لیے۔

"رحم اے شاہِ تاتار۔ بے گناہ شہریوں پر رحم کیجیے"۔ مظفر شمسی نے پوری طاقت جمع کر کے کہا۔

"رحم۔ بے گناہ!"

تیمور نے زہر خند کیا:

"تمہارے آدمیوں نے تاتاریوں کو قتل کرتے ہوئے ذرا بھی رحم نہ کیا۔ وہ بھی تو بے گناہ تھے۔ ان کا کیا گناہ تھا۔ ایک باغی کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔ جب تک بلوائیوں کا خون اصفہان کے دروازوں سے باہر نکل کر نہ بہتا۔ قتلِ عام جاری رہے گا"۔

"رحم شاہِ تاتار"۔ مظفر شمسی نے پھر ہمت کی:

"بلوائیوں اور باغیوں کو ضرور قتل کیا جائے۔ یہی ان کی سزا ہے لیکن شہریوں پر رحم کیا جائے۔ پُر امن شہریوں کو معاف کیا جائے"۔

"نہیں مظفر"۔ تیمور بگڑ کر بولا:

"ہمارے تاتاری بھی پُر امن تھے۔ جاؤ ہماری نظروں سے دور ہو جاؤ"۔

سید مظفر شمسی اپنے آدمیوں کے ساتھ بے نیل و مرام واپس آ گیا۔

تیموری لشکر نے اصفہان کے دروازوں پر حملہ کر دیا۔ احمقوں نے تھوڑی دیر تو آگ کا کھیل کھیلا، شہر میں تاتاریوں کو قتل کر دیا۔ فصیل کے دروازے بھی بند کر لیے لیکن تیموری طوفان کو کون روک سکتا تھا۔ تیموری لشکر نے مغلوں کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ بحرِ خزر اور کوہ قاف کی وحشی قوموں کا غرور توڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس سیلاب کو ان کی معمولی فصیلیں کس طرح روک سکتی تھیں۔ ستر ہزار کے لشکر نے چاروں طرف سے یلغار کی تو اصفہان کی فصیل خس و خاشاک کی طرح اڑ گئی۔ فصیل ٹوٹ گئی۔ دروازے اکھاڑ پھینکے گئے اور خونخوار تاتاریوں کا ریلا ہر طرف سے شہر میں گھس گیا۔

ادھر تو شہر کی فصیلیں ٹوٹ رہی تھیں اور ادھر مظفر شمسی ایک بار پھر تیمور کے سامنے کھڑا گڑگڑا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہر کے جتنے آدمی بھی بچ سکیں وہ غنیمت ہے۔ آخر تیمور پر سید شمسی کی مسلسل التجا اور درخواست کا اثر ہوا اس نے قتلِ عام کے حکم میں ذرا لچک پیدا کی اور نیا فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کی رو سے شہر کے شرفا، معززین اور ان محلوں کے لوگوں کو امان دی گئی جہاں کوئی تاتاری قتل نہ ہوا تھا لیکن ساتھ ہی ایک سفاکانہ اضافہ بھی کر دیا اس نے حکم دیا کہ ہر تاتاری سپاہی ایک اصفہانی کا سر کاٹ کر حاضر کرے۔

تاتاری لشکر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ قتلِ عام شروع ہو گیا۔ انہیں اپنے تین ہزار تاتاریوں کا انتقام لینا تھا پھر تازہ حکم یہ تھا کہ ہر تاتاری ایک اصفہانی کا سر پیش کرے۔ اس لیے تیموری لشکر کو لوٹ مار سے زیادہ سر کاٹنے کی فکر پڑ گئی۔

اصفہان میں قصور وار تو ہزار دو ہزار سے زیادہ نہ تھے۔ وہ مقابلے پر نکلے تھے اور پہلے ہی ہلے میں ختم ہو گئے تھے۔ تیموری سرداروں نے حسب الحکم شرفا اور امن پسند لوگوں کو بچانے کی کوشش ضرور کی ہو گی اور ان میں بہتوں کو بچا بھی لیا گیا ہو گا لیکن لشکر کو سروں کی تعداد پوری کرنی تھی چنانچہ تمام مصیبت نہتے اور بے گناہ شہریوں پر آ گئی۔ وہ روتے گڑگڑاتے خوشامد کرتے لیکن کوئی سننے والا نہ تھا، نہ داد نہ فریاد۔ تاتاری قتلِ عام کرتے کرتے تھک گئے۔ ممکن ہے کہ بعض کے دلوں میں انسانیت اور رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا ہو۔ اس لیے سروں کی خرید و فروخت شروع ہو گئی جن کو سر حاصل نہ ہو سکا انہوں نے دوسروں سے سر خریدنا شروع کر دیے۔ یہ نہیں کہ شہر کی آبادی کم تھی، اس وجہ سے قتل کرنے کے لیے آدمی دستیاب نہ ہوتے تھے بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ لوگ جان بچانے کے لیے شہر سے بھاگ نکلے اور جنگلوں، پہاڑوں میں جا کر چھپ گئے تھے۔

ایک متعصب انگریز مورخ کا بیان ہے کہ شروع میں ایک سر کی قیمت بیس ہزار دینار تھی جو گھٹتے گھٹتے دینار تک پہنچ گئی۔

اس بیان میں سراسر مبالغہ ہے۔ دینار سونے کا سکہ تھا اور تیمور کے لشکری اس قدر امیر کسی طرح نہیں ہو سکتے کہ وہ ایک سر کی قیمت بیس ہزار دینار ادا کر سکیں۔

تیمور نے اگرچہ قتلِ عام کا حکم جذبۂ انتقام کے تحت دیا تھا لیکن یہ انتقام نہایت سنگین، ظالمانہ اور سفاکانہ تھا۔ دوسرے دن جب سروں کا شمار کیا گیا تو ان کی تعداد ستر ہزار سے تجاوز کر گئی۔ تیمور کے لشکر کی تعداد بھی اتنی ہی تھی۔ تین ہزار کا انتقام ستر ہزار کو قتل کر کے پورا کرنا کسی طرح جائز نہیں کہا جا سکتا۔ شاید تیمور کو اسی وجہ سے لرزندۂ جہاں اور سفاک کہا جاتا ہے۔

تیمور مسلمان تھا اور ایک مسلمان کو اس قدر سنگین بدلہ لینے کی مذہباً اجازت نہیں۔ حالانکہ اس دور کے

دوسرے مذاہب کے فاتح اس سے کہیں زیادہ سفاکی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بلیک پرنس نے ملوگ کی تاراجی کے وقت لوگوں کو جس بے دردی سے قتل کیا، اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ڈنانٹ کے مقام پر رگنڈی چارلز انسانوں کا یوں شکار کرتا دکھائی دیتا ہے جیسے بھیڑیا بکریوں کا شکار کرتا ہے۔ ہمارے انگریز آقاؤں نے تمام فرانسیسی قیدیوں کو محض اس وجہ سے قتل کرا دیا تھا کہ وہ آخری معرکے سے پہلے ان سے فارغ ہونا چاہتے تھے۔ اسی طرح صلیبی جنگ کے انگریز، جرمن اور فرانسیسی سورماؤں نے سریانی اور ترک اسیرانِ جنگ کا نکوپولس کی جنگ سے پہلے قتلِ عام کرایا تھا۔

تیمور سے پہلے بھی سروں کے مینار بنائے جاتے تھے۔ تیمور نے بھی ان بے گناہ مقتولین کے سروں کو پہلے مکانوں کی دیواروں پر نمائش کے لیے سجوایا۔ پھر شاہراہوں پر ان کے مینار بنوائے اور اس طرح اپنے غصے اور جوشِ انتقام کو ٹھنڈا کیا۔

بلاشبہ تیمور دنیا کا عظیم ترین فاتح تھا لیکن اس کے دامن پر سفاکی کے جو سیاہ داغ ہیں ان داغوں میں اصفہان کا قتلِ عام بہت واضح نظر آتا ہے۔

اصفہان کے قتلِ عام کی خبر ایران میں پھیلی تو آلِ مظفر کانپ اٹھے۔ زین العابدین شاہِ ایران دہشت زدہ ہو کر بھاگ نکلا اور اپنے چچا زاد بھائی منصور بن مظفر کے پاس پناہ حاصل کرنے کے لیے شوستر پہنچا۔ منصور نے اسے پناہ دینے کے بجائے گرفتار کر لیا۔ اس نے زین العابدین پر الزام لگایا کہ اس نے تیموری لشکر کے سامنے بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

زین العابدین کے دوسرے تمام بھائیوں نے فوراً اطاعت کا اعلان کر دیا۔ تیمور کو بتایا گیا کہ مظفری شہزادوں نے لوگوں پر بھاری محصول عاید کیے ہیں۔ اس نے رعایا کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے محصول گھٹا دیے۔ اس طرح عوام میں تیمور کے لیے پہلے جیسی نفرت باقی نہ رہی اور وہ اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔

تیمور نے اصفہان سے شیراز کا رخ کیا۔

شیراز میں اس نے ایک بڑا دربار لگایا۔ تمام مظفری شہزادے اس دربار میں حاضر ہوئے اور تیمور کی اطاعت اور وفاداری کا حلف اٹھایا۔ تیمور نے ان کی ریاستوں کو ختم کر دیا اور ہر ریاست کو سلطنتِ تاتار کا صوبہ بنا دیا۔ جو مظفری شہزادہ جس علاقے پر قابض تھا اسے وہاں کا صوبے دار مقرر کیا گیا جن کا حاکمِ اعلیٰ امیر تیمور تھا۔ اس سلسلے میں تیمور نے ہر شہزادے کو صوبیداری کا سرکاری پروانہ عطا کیا۔ اس پروانے پر تیمور کی مہر ثبت کی گئی۔ تیمور کی شاہی مہر سرخ رنگ سے لگائی جاتی تھی۔ مہر میں فارسی کے دو لفظ "راستی رستی" کندہ تھے جن کے معنی صداقت اور نجات کے ہیں۔ ان الفاظ سے تیمور کے مزاج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسے اپنی طاقت پر اعتماد تھا اور طاقت ہی کو

سب سے بڑی صداقت سمجھتا تھا۔

شیراز بڑا تاریخی شہر ہے۔ علم و ادب کے لحاظ سے بھی اسے ایک اہم مقام حاصل ہے۔ سعدی اور حافظ نے اس سرزمین میں علم و دانش کے چراغ جلائے تھے۔

جس وقت تیمور شیراز پہنچا، حافظ شیرازی شہر میں موجود تھے۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور ان کے اشعار زبان زدِ عام تھے۔ تیمور کو شعر و شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن اس نے حافظ کا کلام لوگوں سے سنا تھا اور ان کے بہت سے اشعار تیمور کو زبانی یاد تھے۔

شیراز میں قیام کے دوران کسی نے تیمور کو بتایا کہ فارسی زبان کا عظیم شاعر شیراز میں موجود ہے۔ تیمور حافظ کے نام پر چونک اٹھا اور فوراً حافظ کو دربار میں طلب کر لیا۔ حکمِ حاکم کے مطابق حافظ کو تیمور کے دربار میں جانا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ حافظ بہت خوش پوش تھے اور اچھے سے اچھا لباس پہنتے تھے لیکن جب وہ دربارِ تیمور میں پہنچے تو ان کے جسم پر معمولی کپڑے تھے اور بظاہر وہ ایک غریب آدمی نظر آتے تھے۔

تیمور کو حافظ کی شاعری کس حد تک پسند تھی اس کا تو علم نہیں لیکن اسے حافظ کے ایک شعر پر سخت اعتراض تھا۔ پس جب حافظ سلام کے بعد تیمور کے سامنے مؤدب ہو کر کھڑے ہوئے تو تیمور نے تیوریوں پہ بل ڈال کر پوچھا:

کیا یہ شعر تمہارا ہے؟

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

ترجمہ: اگر میرا محبوب میری دلداری پر آمادہ ہو جائے تو میں اس کے رخسار پہ چمکنے والے سیاہ تل پہ سمرقند و بخارا کو نچھاور کر دوں۔

حافظ شیرازی کو تیمور لرزندہ جہاں کی زبان سے اپنا شعر سن کر سخت حیرانی ہوئی۔ انہوں نے بڑی حیرت سے تیمور کو دیکھا۔ پھر سر جھکا کر ادب سے بولے:

"جی ہاں شہنشاہ! یہ شعر میرا ہی ہے۔"

تیمور بڑی تلخی سے بولا:

"سمرقند کو ہم نے سینکڑوں قیمتی جانیں گنوا کر بزورِ شمشیر حاصل کیا ہے اور اب دوسرے شہروں سے نوادرات لے جا کر اس کی خوبصورتی میں روز بروز چاند لگا رہے ہیں لیکن تم کہاں کے ایسے رئیس ہو کہ اس عظیم شہر کو شیراز کی کسی دو کوڑی کی چھوکری کو بخشے دے رہے ہو؟"

حافظ نے تیمور کے چہرے پر نظر ڈالی تو انہیں خفگی کے آثار نظر آئے۔ وہ بہت گھبرائے اور سمجھ گئے کہ آج ان کی جان بچنا مشکل ہے پھر بھی انہوں نے ہمت سے کام لیا اور ذرا توقف سے بولے:

"اے امیرِ نامدار و شاہِ شاہان! میری ان شاہ خرچیوں اور غلط بخشیوں ہی کا تو نتیجہ ہے کہ آج امیر کے دربار میں آنے کے لیے میرے پاس ڈھنگ کا کوئی لباس بھی باقی نہیں رہا اور ایک مفلس اور فقیر کی طرح حاضرِ دربار ہوا ہوں۔"

حافظ شیرازی کی ذہانت نے ان کی جان بچالی۔ ان کے اس برجستہ اور برمحل جواب سے تیمور بہت خوش ہوا۔ اس کا غصہ کافور ہو گیا اور اس نے حافظ کو دربار سے انعام و اکرام دے کر بڑی عزت سے رخصت کیا۔ حالانکہ تمام درباری حافظ شیرازی کی سلامتی کی دعا مانگ رہے تھے۔

تیمور کی شکل و صورت اور کردار بڑا امتیازی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ تیمور دراز قامت تھا۔ اس کی پیشانی بلند اور سر بڑا تھا۔ وہ جتنا بہادر تھا، طاقت کے لحاظ سے بھی اتنا ہی زور آور تھا۔ اس کی رنگت نکھری اور جلد گوری تھی۔ شانے چوڑے اعضا مضبوط اور انگلیاں قوی تھیں۔ داڑھی لمبی تھی اور ہتھیلیاں خشک رہتی تھیں۔ آواز میں گونج اور گرج تھی۔ پچاس سال کی عمر کے بعد بھی وہ جوان نظر آتا تھا۔ جھوٹ سے اسے سخت نفرت تھی۔ سچائی اسے پسند تھی اور سچی بات ناگوار بھی ہو تو اسے برداشت کرتا تھا۔ مصیبت میں نہ گھبراتا تھا اور خوشی کے موقعے پر جامے سے باہر نہ ہوتا تھا۔ مورخ اس کا رنگ گندمی بتلاتے ہیں۔ حالانکہ ابنِ عرب شاہ نے اس کا رنگ گورا بتایا ہے۔ ابنِ عرب شاہ اس کا سخت دشمن تھا اور تیمور اسے دمشق سے قید کر کے سمرقند لے گیا تھا۔

تیمور کی سفاکی اور تشدد کے واقعات کے پہلو بہ پہلو اس کی رحمدلی اور مروت کے بھی چرچے ہوتے تھے۔ وہ ہر حملے سے پہلے لشکر کو تاکید کرتا تھا کہ خواتین کا احترام کیا جائے اور ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے۔ انعام و اکرام میں اس کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا۔ حافظ شیرازی کے ساتھ اس کا سلوک اس کا کھلا ثبوت ہے۔ انہیں عزت و اکرام سے رخصت کیا گیا۔ حالانکہ درباریوں کا خیال تھا کہ بلبلِ شیراز کی زندگی چند لمحوں سے زیادہ نہیں۔

O

تیمور ایرانی شہزادوں کے جھگڑے نمٹا کر سمرقند واپس آ گیا لیکن تین سال بعد اسے پھر ایران پر فوج کشی کرنا پڑی۔ ایرانی شہزادوں کو وہ صوبائی گورنر بنا کر چھوڑ آیا تھا انہوں نے پھر لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ اس حملے کی سب سے بڑی وجہ شاہ منصور بن مظفر حاکم شوستر کا وہ سلوک تھا جو اس نے اپنے چچا زاد بھائی زین العابدین کے ساتھ کیا تھا۔

زین العابدین، تیمور کے خوف سے بھاگ کر منصور بن مظفر کے پاس چلا گیا تھا۔ تیمور نے شوشتر کا رخ کیا تو منصور
کر پہاڑوں میں چھپ گیا۔ تیمور اسے اس کے حال پر چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ لیکن تیمور کے واپس آتے ہی منصور بن
نے پھر علمِ بغاوت بلند کیا اور ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر کے شاہِ ایران ہونے کا اعلان کر دیا۔ منصور بڑا
درندہ صفت انسان تھا۔ اس نے شاہ زین العابدین کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر اسے ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیا
وہ کبھی تخت و تاج کی خواہش نہ کر سکے۔ ہر چند کہ تیمور بھی سفاک مشہور تھا لیکن اسے اپنے دوست شاہ شجاع
شاہِ ایران کے خط کا اب بھی پاس تھا۔ شاہ شجاع نے اپنے بیٹے زین العابدین کو تیمور کی حفاظت میں دینے کا
اعلان کیا تھا۔ زین العابدین پر وہ یہ ظلم برداشت نہ کر سکا اور فوراً لشکر لے کر ایران کی طرف چل پڑا۔

ایران کے راستے میں تیمور کے لشکر کو حشیشین کے خونخوار فدائین کا سامنا کرنا پڑا۔ اس فرقے کی تاریخ
عباسی سے شروع ہوتی ہے اور اس کے بارے میں بہت ہی عجیب و غریب قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ اس
بنیاد حسن بن صباح نامی ایک شخص نے رکھی تھی۔ ایران کے شمالی علاقے میں ان کے قبضے میں اٹھارہ مضبوط قلعے
مشرق سے مغرب تک ایک پہاڑی سلسلے سے منسلک تھے۔ ان کا صدر مقام قلعہ الموت تھا اور ان کا امام یا پیشوا
پیغمبر اس قلعہ میں رہتا اور شیخ الجبل کے نام سے مشہور تھا۔

قلعے کے اندر جنت کے نقشے کے مطابق نقلی ہیرے جواہرات کے محل تعمیر کرائے گئے تھے۔ دودھ اور
نہریں بہتی تھیں اور حور و غلمان ساغر سنبھالے مہمان نوازی کرتے تھے۔ لوگوں کو حشیش (بھنگ) پلا کر اس جنت
کرائی جاتی تھی اور پھر ان سے مسلمانوں کے بڑے بڑے بادشاہوں اور علما کو قتل کرایا جاتا تھا۔ ان کی ہیبت کا یہ
کہ قرب و جوار کے تمام امیر اور بعض بادشاہ اسے خراج ادا کرتے تھے۔

تیمور سے ڈیڑھ سو سال پہلے مغل سردار ہلاکو خان نے اس قلعہ پر حملہ کر کے اسے نیست و نابود کر دیا تھا اور
شیخ الجبل خور شاہ قتل کر دیا گیا تھا لیکن حشیشین نے پھر کچھ طاقت پکڑ لی تھی اور اب وہ قتل و غارت گری اور راہزنی
تھے۔ انہیں تیمور کی طاقت کا اندازہ نہ تھا اس لیے حسبِ عادت انہوں نے تیمور کے چار جاسوس سواروں کو قتل
اور جب تیمور کا ہراول دستہ ان کی تلاش میں پہاڑوں میں داخل ہوا تو حشیشیوں نے ان پر بھی حملہ کر دیا۔

تیمور بھلا اس قسم کی شورش کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ اس کی فوجی حکمت عملی یہ تھی کہ آگے بڑھنے
وہ اپنی پشت کو مضبوط کرتا۔ اس نے فوراً ان راہزنوں کے مکمل خاتمے کا حکم دیا۔ تیمور کے پورے لشکر نے پہاڑ
گھیر لیا اور پھر حملے کا آغاز کیا۔

حشیشین بھی مقابلے پر آئے مگر شکست کھا کر پسپا ہوئے۔ انہیں یہ علم ہی نہ تھا کہ انہیں چاروں طرف
گھیرا جا چکا ہے۔ وہ جدھر بھی بھاگ کر جاتے تیموری سوار انہیں نظر آتے۔

تیمور کے ساتھ اس کے دس دس ہزار کے صرف تین لشکر تھے۔ تیمور کا بیٹا شاہ رخ اور دونوں پوتے پیر محمد
اور سلطان محمد اس کے ساتھ تھے۔ یہ تینوں ہم عمر شہزادے اب جوان ہو چکے تھے۔ تیمور نے لشکر کی کمانیں انہیں کے
سپرد کی تھیں۔ شہزادوں کا یہ پہلا امتحان تھا اور ہر شہزادہ دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس
کوشش میں شہزادوں نے ناقابلِ یقین و بیان دلاوری اور شجاعت کے جوہر دکھائے اور حشیشین کو چن چن کر
تہ تیغ کیا۔

تیمور الگ کھڑا اس جنگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ شہزادوں کی بہادری سے وہ بہت خوش ہوا۔ خاص کر پیر محمد جو
شہزادہ کا بڑا بیٹا تھا، اس نے کچھ ایسی بے جگری کا ثبوت دیا کہ تیمور بے ساختہ واہ واہ کہہ اٹھا۔ اسے پیر محمد کے پیکر
میں اپنا ولی عہد نظر آیا۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ اگر یہ شہزادے اسی طرح بہادری کے جوہر دکھاتے رہے اور ان میں یونہی
اتفاق و اتحاد رہا تو اس کی سلطنت پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔

اس جنگ میں تیمور نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی مناسب وقت پر پیر محمد کو اپنا ولی عہد بنانے کا اعلان
کر دے گا۔

حشیشین کا مکمل خاتمہ کرنے کے بعد جب تیموری لشکر ایرانی سرحد کے قریب پہنچا تو وہاں ایک اور دلچسپ واقعہ
پیش آیا۔ تیموری لشکر میں آق بوغا نامی ایک سوار تھا۔ اس کے ماتحت صرف دس سپاہی تھے۔ آق بوغا بڑا قدآور ہیکل اور
دیو پیکر تھا اور جسامت کے لحاظ سے بڑی کثرت سے شراب پیتا تھا۔ مشہور ہے کہ وہ مینڈھے کے سینگ میں دو درہم
شراب بھر کر ایک ہی سانس میں چڑھا جاتا اور اس بری عادت کے باوجود تیمور اس کی بہادری کی قدر کرتا تھا۔ تیمور کے
لشکر میں ہر نسل و قوم اور مختلف عادات و اطوار کے لوگ تھے۔ زاہد و پرہیزگار بھی اور شرابی اور کبابی بھی۔ شراب پینے کی
عام اجازت نہ تھی۔ لوگ خیموں کے اندر چھپ کر شراب پیتے تھے۔ اگر کوئی شراب پی کر غل غپاڑہ مچاتا تو اسے سخت سزا
دی جاتی تھی۔

تیمور نے پڑاؤ ڈالا تو آق بوغا کو شراب کی خواہش ہوئی۔ وہ شراب کی تلاش میں اٹھا اور گھوڑا اڑاتا دور نکل گیا۔ اسے
ایک بستی نظر آئی۔ بستی میں پہنچا تو وہاں ایک شراب خانہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

شراب خانے کا مالک اس دیو کو دیکھ کر پہلے تو گھبرایا لیکن جب آق بوغا نے شراب طلب کی تو وہ مطمئن ہو گیا۔
اس نے آق بوغا کے نقش و نگار سے اندازہ لگا لیا کہ وہ تاتاری سوار ہے۔ آق بوغا کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ
گاؤں تو ایران کے اندر ہے یا اس کی سرحد کے بالکل قریب ہے اس لیے اس نے گھوڑے پر زین کسی رکھی اور کمر
کھول کے جام پر جام چڑھانے شروع کر دیے۔

آق بوغا کو یہاں آئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بستی کا نمبردار گھبرایا ہوا شراب خانے میں داخل ہوا۔ شراب خانے

کا مالک اسے پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے نمبردار سے گھبراہٹ کا سبب پوچھا تو نمبردار نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتانا شروع کیا:

"بستی کے باہر تالاب کے کنارے پچاس کے قریب ایرانی سوار گھوڑوں سے اتر رہے ہیں۔ وہ بستی کو لوٹیں گے۔"

"پھر اب کیا کیا جائے؟" مالک کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اسے اپنے شراب خانے کی فکر پڑ گئی۔

"تم فوراً شراب خانہ بند کر دو اور کہیں جا کر چھپ جاؤ۔" نمبردار نے اسے اپنے خیال میں بڑا نیک مشورہ دیا۔

نمبردار اور شرابِ خانے کے مالک کے درمیان یہ گفتگو آق بوغا کے قریب ہی ہو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں کچھ باتیں پڑی تھیں۔ شراب خانہ بند کرنے کی بات پر وہ چونک پڑا اور تلخ لہجے میں پوچھا:

"کیا قیامت آ گئی ہے۔ شراب خانہ بند نہیں ہو گا۔"

ان دونوں نے حیران نظروں سے آق بوغا کو دیکھا۔ نمبردار اس کے ذرا اور قریب آ گیا اور بڑی رازداری کے ساتھ بولا:

"تاتاری جوان! آپ نے سنا نہیں کہ پچاس ایرانی سوار تالاب پر اپنے گھوڑوں کو پانی پلا رہے ہیں۔ دم میں وہ بستی پر حملہ کر دیں گے۔ آپ اجنبی ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ بھی چپکے سے کسی طرف نکل جائیے۔"

"واہ واہ۔ تم لوگ بھی عجیب آدمی ہو۔" آق بوغا ہنستے ہوئے بولا:

"تم گاؤں کے مسلح آدمیوں کو لے کر آؤ۔ ہم سب مل کر ان سے لڑیں گے۔"

نمبردار کو اور زیادہ حیرت ہوئی۔ شراب خانے کے مالک نے کہا:

"تاتاری جوان! تم ہمارے مہمان ہو۔ نمبردار نے بالکل صحیح مشورہ دیا ہے۔ گاؤں میں دس پانچ سے مسلح سوار نہیں ہیں۔ پچاس سواروں سے لڑنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ تم چپ چاپ یہاں سے نکل جاؤ۔"

"نہیں۔ تم اپنے آدمی لاؤ۔ ہم لڑیں گے۔" آق بوغا نے اس قدر گرجدار اور دہشت ناک آواز میں کہا کہ نمبردار اور شراب خانے کا مالک گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ایرانیوں سے تو وہ پہلے ہی خوفزدہ تھے اب یہ دیو بھی ان کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ انہیں خطرہ ہوا کہ اگر اس دیو کا کہنا نہ مانا گیا تو کہیں کوئی اور فتنہ نہ کھڑا ہو جائے۔ وہ خاموشی سے شراب خانے سے نکلے اور دم کے دم میں دس مسلح سواروں کو ساتھ لے کر واپس آق بوغا کے پاس آ گئے۔

"تم نے اچھا کیا۔" آق بوغا آخری جام حلق میں انڈیلتے ہوئے بولا:

"تم لوگ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ جس وقت میں نعرہ لگاؤں، تم لوگ فوراً گھوڑے دوڑا کر ایرانیوں پر ٹوٹ پڑنا۔"

گاؤں کے سواروں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آق بوغا نے کمر کا پٹکا کسا۔ داڑھی چمڑے کی پٹی سے باندھی۔ ڈھال بازو پہ چڑھائی اور سر پر خود رکھتے ہوئے سواروں سے کہا:

"خبردار۔ اپنے گھوڑے مت روکنا خواہ آندھی اور طوفان آ جائے۔ ایک بار گھوڑا بڑھ جائے تو اسے روکنا بڑی بزدلی ہے۔"

آق بوغا سواروں کو ساتھ لے کر تالاب کی طرف چلا۔ ایرانی اپنے گھوڑوں کو پانی پلا کر کسی بات پر بحث کر رہے تھے یا شاید وہ کچھ دیر تالاب کے کنارے آرام کرنے کی فکر میں تھے۔

آق بوغا نے ذرا اور قریب پہنچ کر گھوڑا روکا۔ سواروں کو اشاروں سے سمجھایا۔ پھر تاتاریوں کا مخصوص نعرہ لگا کر ایڑ لگائی۔ گاؤں والے تو پچاس سواروں کو دیکھ کر ہی حواس باختہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے آق بوغا کو بڑھتے دیکھا تو اپنے گھوڑوں کا رخ گاؤں کی طرف کر کے بھاگنا شروع کر دیا۔

ایرانیوں نے صرف ایک تاتاری کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ سمجھے کہ اس کے پیچھے اس کا دستہ ہو گا۔ ایرانی پہلے بھی تاتاریوں سے مرعوب ہو گئے تھے۔ وہ جلدی جلدی گھوڑوں پر سوار ہوئے اور بے تحاشا بھاگ کھڑے ہوئے۔ آق بوغا بھی ان کے تعاقب میں بھاگنے لگا۔ وہ بار بار نعرے لگاتا اور آواز دے کر کہتا:

"اے ایرانی سردارو! ذرا ٹھہر کر دو دو ہاتھ تو کرتے جاؤ۔"

لیکن ایرانیوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ ان کے گھوڑے زیادہ تیز رفتار تھے۔ ایک بھی آق بوغا کے ہاتھ نہ آ سکا۔

آق بوغا بڑے فاتحانہ انداز سے گاؤں واپس آیا۔ گاؤں والے اس کی بہادری پر عش عش کر رہے تھے مگر اسے ایرانیوں کے بھاگ جانے کا افسوس تھا۔ اس نے بڑی ترشی سے کہا:

"ایرانی تو ایک ہی آواز پر گیدڑوں کی طرح دم دبا کر بھاگ گئے لیکن تم لوگ بھی خرگوش سے زیادہ بزدل ہو۔"

آق بوغا نے جب واپس جا کر تیمور کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسا۔ حالانکہ تیمور مسکراتا بھی کبھی کبھی تھا۔

منصور بن مظفر بھی اپنی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کے جاسوس دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور تیمور کی پیش قدمی کی دم دم خبریں پہنچا رہے تھے۔ منصور نے اپنا آدھا لشکر اپنے نائب کی زیر کمان قلعہ سفید میں بھیج دیا تھا۔ اس قلعہ کا پرانا نام دروازۂ پارس یا دروازۂ شوش تھا اور یہ ہزاروں سال سے ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ قلعہ چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا اور ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس کی دیواریں پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی تھیں جن میں دراڑیں ڈالنا تقریباً ناممکن تھا۔

پہاڑ پر ایک وسیع و عریض میدان تھا جہاں پھل دار درختوں کے علاوہ کاشت بھی ہوتی تھی اس لیے قلعہ کو غذا کی کوئی قلت نہ ہوتی تھی۔ سکندر اعظم بھی اس قلعہ کے سامنے بے بس ہو گیا تھا اور اگر ایک چرواہا اس کی رہنمائی نہ کرتا تو وہ قلعے پر قابض نہ ہو سکتا تھا لیکن تیمور سکندر اعظم سے بھی بڑا فاتح تھا۔ اس نے قلعہ کے سامنے پہنچ کر چرواہے کی مدد کا بھی انتظار نہ کیا اور فوراً حملے کا حکم دے دیا۔

پہاڑ پر نہ تو گھوڑے چڑھائے جا سکتے تھے اور نہ قلعہ شکن آلات پہنچائے جا سکتے تھے۔ تیموری لشکر گاہ پہاڑ کی ترائی میں ایک چٹان پر قائم کی اور اس کے سوار گھوڑوں سے اتر کر چیونٹیوں کی طرح پھیل گئے۔ یہاں سے عمودی چٹانیں شروع ہوتی تھیں جن پر جگہ جگہ برج بنے تھے جن میں ایرانی فوج بیٹھی تھی۔

تاتاریوں نے پہلے موڑ کے برجوں پر حملہ شروع کر دیا۔ اوپر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور بہادر سپاہی سروں پر خود چڑھائے آتے ہوئے تیروں کی سمت عمودی چٹانوں پر چڑھ رہے تھے۔

تیمور دور کھڑا اپنے سپاہیوں کی جرأت دیکھ رہا تھا اور جوش دلانے کے لیے نقارے بجوا رہا تھا۔ سپاہی چٹانوں سے چمٹے ہوئے بڑی احتیاط سے بڑھ رہے تھے لیکن اکثر کے ہاتھ چٹان سے چھوٹ جاتے اور وہ ترائی میں گر کر ختم ہو جاتے تھے۔ اوپر سے تیر باری کے علاوہ بڑے بڑے پتھر بھی لڑھکائے جا رہے تھے جو سپاہیوں پر ٹوٹتے اور تاتاریوں کا خاتمہ کر دیتے۔

قلعہ سفید پر شام تک حملہ جاری رہا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ نہ کوئی برج سر ہوا اور نہ اوپر جانے کا متبادل راستہ ہی دریافت ہو سکا۔

شام کو جب زخمیوں اور مرنے والوں کی لاشوں کو نیچے وادی میں پہنچایا گیا تو یہ تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ تیمور کے چہرے پر اداسی دوڑ گئی۔ کئی بڑے سردار اور بہادر بھی اس ناکام حملے میں جاں بحق ہو گئے۔ ممکن ہے کہ تیمور افسردہ ہوا ہو مگر اس نے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا۔

رات ہونے پر جو سپاہی جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ کچھ نے چٹانوں کے نیچے رات گزاری اور بعض نے برجوں کے کنگروں سے چمٹے چمٹے سویرا کر دیا۔

صبح کو پھر حملہ شروع ہوا۔ وہی نقاروں کی گھن گرج اور وہی نعروں کا شور۔ تاتاری سپاہی مر مر کر گر رہے تھے اور تیروں کا نشانہ بن رہے تھے۔ اوپر سے لڑھکائے جانے والے پتھروں میں دب دب کر ختم ہو رہے تھے لیکن ان کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ عمودی چٹانیں ان کے بڑھتے قدم روکنے سے قاصر تھیں۔ دیو پیکر آق بوغا نے اس جنگ میں بھی دلاوری کا مظاہرہ کیا۔ اسے ایک عمودی چٹان میں شگاف نظر آیا۔ شاید کسی اور نے اس شگاف میں داخل ہونے کی ضرورت محسوس نہ کی یا پھر اسے موت کا دہانہ سمجھ کر اس سے کترا کر نکل گئے۔

آق بوغا اس شگاف میں داخل ہو گیا اور پھر اس میں اس طرح غائب ہوا جیسے اسے شگاف نے نگل لیا ہو۔ آق بوغا نے واقعی بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا لیکن وہ عمودی شگاف اس کی کامیابی اور تیموری فتح کا زینہ بن گیا۔ وہ اپنی ڈھال سنبھالے بہت جلد چوٹی پر پہنچ گیا۔

اوپر پہنچ کر آق بوغا نے ڈھال کو آڑ بنا کر ایرانیوں پر تیر برسانا شروع کر دیے۔ مگر وہ خود تیروں سے بچتا رہا۔ بہت سے ایرانی زخمی ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

اسی دوران کچھ لوگ برج کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس وقت انہوں نے دور اوپر سے آتی ایک آواز سنی۔ انہوں نے نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ آق بوغا پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا زور زور سے اعلان کر رہا تھا:

"شاہِ تاتار فتح مند ہوا۔ ایرانیوں کو شکست ہو گئی۔"

آق بوغا کے اس اعلان کو سن کر سپاہیوں میں اور جوش پیدا ہو گیا۔ ایرانیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ سرائے خانم کے بیٹے شاہ رخ مرزا نے فوراً اپنے دستوں کو یلغار کا حکم دیا اور برج سے آگے نکل گیا۔ برجوں میں بیٹھے ایرانی دستے بیکار ہو کر رہ گئے۔ کچھ سپاہی آق بوغا کی مدد کو پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ شاہ رخ برجوں سے علم لہراتا ہوا چوٹی پر پہنچا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ آق بوغا تلوار سونتے ایرانیوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور ایرانی سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہے تھے۔

نیچے وادی میں نقاروں پر چوٹ پڑ رہی تھی اور تیمور خیمے کے باہر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

تیمور میدانِ جنگ میں بھاگنے والوں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا۔ عام طور پر ایسے لوگوں کا منہ کالا کیا جاتا، گلے میں گھوڑے کے چارے کا توبڑا لٹکایا جاتا۔ پھر اسے خچر پر الٹا بٹھا کر بازاروں میں پھرایا جاتا مگر بہادروں کی قدر کرتا اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے انعام و اکرام سے مالا مال کرتا تھا۔

قلعہ سفید پر قبضہ ہوتے ہی تیمور نے آق بوغا کو بلوایا۔ آق بوغا اب تک پہاڑ کی چوٹی پر بھاگنے والوں کا پیچھا کر رہا تھا۔ لوگوں نے اسے تیمور کا حکم سنایا اور جلوس کی شکل میں اسے تیمور کے سامنے پیش کیا۔

آق بوغا دس سواروں کا رسالدار تھا لیکن اس کے پاس سوائے ایک گھوڑے کے اور کچھ نہ تھا۔ تیمور نے اسے

اپنے پاس بلایا اور شفقت سے پوچھا:

"آق بوغا۔ تمہارے پاس کتنے گھوڑے ہیں؟"

"میں اکیلا ہوں امیر تاتار۔ گھوڑا بھی ایک ہی ہے"۔ آق بوغا نے معصومیت سے جواب دیا۔

امیر نے حکم دیا:

"پچاس گھوڑے لائے جائیں"۔

گھوڑے حاضر کیے گئے۔ امیر نے کہا:

"یہ سب گھوڑے تمہارے لیے ہیں۔ تم ان کے مالک ہو"۔

"اتنے گھوڑے؟" آق بوغا نے حیرت سے کہا:

"میں کیا کروں گا امیر؟"

امیر نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا:

"تمہارے پاس اونٹ کتنے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں امیر"۔

"پچاس اونٹ حاضر کیے جائیں"۔

امیر نے اونٹ منگوا کر آق بوغا کے حوالے کر دیے۔

"کنیزیں کتنی ہیں؟"

"ایک بھی نہیں"۔

تیمور کے حکم سے دس حسین و جمیل کنیزیں آق بوغا کو عطا ہوئیں۔ اس کے علاوہ درہم و دینار، ریشمی زربفت کے تھان، درجنوں خیمے اور ایک سو خچر آق بوغا کو انعام میں دیے گئے۔ یہ تمام سامان لا کر اس کے ڈھیر کر دیا گیا۔

آق بوغا اتنا سامان دیکھ کر بوکھلا گیا۔ اس نے کہا:

"اے امیر تاتار۔ میں اتنا سامان لے کر کیا کروں گا۔ ان گھوڑوں، خچروں اور لونڈیوں کو میں کس طرح سنبھالوں گا"۔

"یہ سب تمہاری ملکیت ہے آق بوغا"۔ امیر بولا:

"تم نے قلعہ سفید کی فتح کو آسان بنایا ہے۔ یہ تمہارا حق ہے اور ہم جوانمردوں کا حق نہیں مارا کرتے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بیان کرو"۔

"آق بوغا کو تو صرف امیر کی نظرِ عنایت چاہیے"۔ آق بوغا نے بھولپن سے کہا:

"امیر خوش ہوں تو فتح حاصل ہوتی ہے اور ان کی ناراضگی ہم لوگوں کو فنا کر دیتی ہے"۔

تیمور نے آق بوغا کا عہدہ بڑھا دیا۔ بیس غلام اور اتنے ہی سائیس جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے عطا کیے گئے۔ آق بوغا جب یہ انعامات غلاموں پر لدوا کر واپس ہوا تو اس کا ایک ساتھی بولا:

"مبارک ہو آق بوغا! امیر نے تمہاری شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ تم نے تو اتنے سامان کا کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا"۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو دوست"۔ آق بوغا جیسے خواب میں بولا:

"کچھ دیر پہلے میرے پاس صرف ایک گھوڑا تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ اب میں اتنے ساز و سامان کا مالک بن گیا ہوں"۔

آق بوغا اب گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی شان سے نکلتا۔ اسے شہزادہ محمد سلطان کے ایک دستے کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا تھا۔

آق بوغا جب تیمور کے ساتھ ہوتا تو اس بات کا خیال رکھتا کہ تیمور کی طرف اس کی پشت نہ ہونے پائے۔ وہ مرا امیر کے خیمے کی طرف پیر کر کے سویا اور تاکید کی کہ جب اسے دفن کیا جائے تو اس کے پیر امیر کے محل کی طرف... خیمے یا محل کی طرف پیر کرنے کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ بعض قبائل میں امیر یا سردار کے خیمے کی طرف پیر کرنے سے اس کا احترام مقصود ہو۔

O

شاہ منصور کے یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ قلعہ سفید پر تیمور کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس نے تو قلعہ دار کو حکم دے رکھا تھا کہ جب تیمور قلعہ کی فتح سے بے بس ہو کر واپس ہو تو اس پر پشت سے حملہ کیا جائے۔ سامنے سے منصور نے حملے کا منصوبہ بنایا تھا مگر قلعۂ سفید تیموری عزم و ارادے کے سامنے چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہ ٹھہر سکا اور اس کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا عقیدہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

شاہ منصور کو کھلے میدان میں مقابلے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ اپنا لشکر لے کر شیراز کی طرف نکل گیا تا کہ چھاپہ مار جنگ کے ذریعے تیمور کو واپس جانے پر مجبور کر دے۔ تیمور بھی اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔

قلعہ سفید کے حملے میں سرائے خانم کے بیٹے شاہ رخ مرزا نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ خانزادہ کے دونوں بیٹوں
پیر محمد اور سلطان محمد کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ تیمور نے بھی
شاید یہ بات محسوس کر لی تھی۔ اس نے میمنہ و میسرہ پر پیر محمد اور سلطان محمد کو کمانڈر مقرر کیا اور خود باقی لشکر لے کر
شیراز کی طرف بڑھا جہاں شاہ منصور کے پہنچنے کی اسے اطلاع ملی تھی۔

یہ خبر درست تھی۔ شاہ منصور چار ہزار سواروں کے ساتھ شیراز کے مضافات میں پہنچ چکا تھا۔ تیمور کے بڑھنے
کی طرف آنے کی خبر سن کر اس نے وہاں سے بھاگنا چاہا لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ وہ بھاگنے کے بجائے تیمور سے
فیصلہ کن جنگ کرنے پر مجبور ہو گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جن دنوں شاہ منصور اپنے سواروں کے ساتھ شیراز کے قریب ہی چھپا ہوا تھا اس نے بھیس
بدل کر گاؤں والوں سے باتیں کیں۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اگر وہ شیراز میں داخل ہو جائے تو شیراز والے اس سے
کس حد تک تعاون کریں گے؟

شاہ منصور نے ایک دیہاتی سے پوچھا:

"شیراز کے باشندے شاہ منصور کے بارے میں کس طرح کے خیالات رکھتے ہیں؟ کیا اسے شیراز کے قلعے میں
پناہ مل جائے گی؟"

دیہاتی نے اس کی بات سن کر تمسخر کے انداز میں کہا:

"اجنبی دوست۔ شیراز والے تو کہتے ہیں کہ شاہ منصور کے سوار جو بھاری ڈھالیں اٹھائے پھرتے ہیں اور جن کے
پاس لانبی کمانیں اور وزنی تیر ہیں وہ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر اس طرح بھاگے ہیں جیسے بھیڑ بکریوں کے غول بھیڑیے
کو آتا دیکھ کر بھاگتے ہیں۔"

شاہ منصور کو دیہاتی کے اس جواب پر بڑی شرم محسوس ہوئی۔ اس نے بھاگنے کا ارادہ ترک کر دیا اور لشکر کو
شیراز کے راستے پر واپس لے آیا۔ تیمور نے مظفری لشکر کو راستہ روکے دیکھا تو اسے شاہ منصور کی جرأت پر بڑا تعجب
ہوا۔ منصور نے فوراً حملہ کر دیا۔

یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ تیموری لشکر نے بڑی مشکل سے قدم جمائے۔ منصور کے ساتھ اس کے سواروں نے
بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ منصور کے دو ہزار سوار یا تو مارے گئے یا منتشر ہو گئے لیکن وہ باقی دو ہزار سواروں
کے ساتھ چھلاوے کی طرح تیموری لشکر پر حملے کرتا رہا۔ تیمور کا باقی لشکر بھی آ پہنچا۔ پیر محمد اور سلطان محمد کو ایسے وقت
کا انتظار ہی تھا۔ دونوں بھائی تلواریں سونت کر منصور پر ٹوٹ پڑے مگر وہ اس پر قابو نہ پا سکے۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ
منصور لڑتا بھڑتا تیمور کے سر پر پہنچ گیا۔ منصور کے ساتھیوں نے تیمور کے محافظوں کو قتل کر دیا۔ شاہ رخ مرزا جو

برابر کھڑا تھا اس نے تیمور پر سامنے سے ہونے والے کئی وار خود پر سہے لیکن تیمور کی پشت بھی غیر محفوظ تھی۔ اس کے
برابر دار اور تلوار بردار مارے جا چکے تھے۔ تیمور کے پاس سوائے ایک خنجر کے اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔

پیر محمد اور سلطان محمد نے تیمور کو دشمن کے نرغے میں دیکھا تو مظفری حملہ آوروں کو راستے کاٹتے اور دھکیلتے ہوئے
تیمور کی پشت پر پہنچ گئے۔ تیمور نے انہیں بڑی تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ منصور کے حملے کا زور ٹوٹ گیا اور
اسے قتل کر دیا گیا۔

شاہ منصور کے خاتمے سے ایران میں مظفری دور حکومت بھی ختم ہو گیا اور وہ تمام علاقے جو اس خاندان کے قبضے میں
تھے براہ راست تیموری سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔

تیمور نے بیٹے شاہ رخ اور پوتوں پیر محمد اور سلطان محمد کو انعام و اکرام سے نوازا لیکن اس دفعہ اس کی
توجہ زیادہ تر پیر محمد کی طرف رہی جو اپنی جان خطرے میں ڈال کر تیمور کی مدد کو پہنچا تھا۔

تیمور تو پیر محمد اور سلطان محمد پر نوازشوں کی بارش کر رہا تھا لیکن ان کی ماں خانزادہ کچھ اور ہی گل کھلا رہی تھی۔

خبطی شہزادہ

خانزادہ نے قصرِ سلطنت سے ایک سوار کو نکلتے دیکھ کر اپنا گھوڑا روک لیا۔

سوار کا لباس نہایت قیمتی تھا۔ سر پر طرّے دار پگڑی جسے ایک زر نگار پٹی سے پیشانی پر کس دیا گیا تھا سونے کے کام والا انگرکھا نما جبہ، جڑاؤ دستے والی زین سے لٹکی تلوار۔ گھوڑے کا ساز چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔

خانزادہ اس عظیم الشان محل کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس طرحدار سوار کا اس پر اور زیادہ رعب پڑا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی بڑا امیر یا وزیر ہے۔ سوار کا رخ خانزادہ کی طرف تھا۔ شاید وہ اسے دیکھ کر ہی صدر دروازے سے باہر آیا تھا۔ خانزادہ اپنے گھوڑے پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ سوار اس کے قریب آیا۔

"السلام علیکم خاتونِ محترم۔" سوار نے ادب سے کہا:

"میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ تبریز میں اجنبی ہیں۔ براہِ کرم میرے خیال کی تصدیق فرمائیے۔"

"آپ نے صحیح فرمایا۔" خانزادہ نے تائید کی:

"تبریز میرے لیے اجنبی ہے۔ میں اُورگنج کی رہنے والی ہوں۔"

"سبحان اللہ۔ اُورگنج بھی کیا عجب شہر ہے۔" سوار متانت سے بولا:

"اُورگنج کو صرف سلطنتِ خوارزم کا دارالسلطنت ہونے کا فخر حاصل نہیں بلکہ اس مبارک شہر سے تو خوہ کے صوفی خاندان کے ترکمانوں کی درخشندہ تاریخ بھی وابستہ ہے۔"

خانزادہ کا تعلق صوفی خاندان سے ہی تھا۔ اپنے خاندان اور شہر کی تعریف سن کر وہ خوش ہو گئی۔ اس نے پوچھا:

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔"

سوار نے انکسار سے جواب دیا:

"تاریخ تو ایک ضمنی علم ہے۔ دراصل میرا میدان شعر و ادب اور رقص و موسیقی ہے۔"

خانزادہ کی دلچسپی بڑھی:

"آپ شاعری کرتے ہیں؟"

"بشرطِ فرصت اپنے شاعر ہونے کا ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔"

"اور موسیقی؟"

"ہر طرح کے ساز بجا کے داد حاصل کر چکا ہوں۔"

"اور رقص سے کس حد تک لگاؤ ہے۔"

"دورِ خسروی کے رقص میں مہارت رکھتا ہوں۔"

"چہ خوب۔ آپ تو ہمہ صفت شخصیت ہیں۔"

"ذرہ نوازی۔ شکریہ۔" سوار نے سر کو ذرا سا جھکا کر جواب دیا:

"لیکن خاتون! میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ فصیلِ شہر کے ناظم نے آپ کی صحیح رہنمائی نہیں کی۔"

"کس کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟" خانزادہ نے حیرت کا اظہار کیا:

"میری کسی ناظم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سیدھی ادھر ہی آ گئی ہوں۔"

"تو پھر یہ سرحد کے محافظوں کی کوتاہی ہے۔ ان سے باز پرس کی جا سکتی ہے۔" سوار نے بڑے تاسف سے کہا۔ "یہ شکایت تو کوتوالِ شہر سے ہونی چاہیے۔"

"میں کچھ نہیں سمجھ سکی۔" خانزادہ الجھتے ہوئے بولی:

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں آپ کو سمجھاتا ہوں خاتونِ محترم۔" سوار نرمی سے بولا:

"اس شہرِ نامدار اور حصارِ نو بہار کا دستور ہے کہ جب کوئی اجنبی سرحد پہ پہنچے تو ناظمِ سرحد کا فرض ہے کہ وہ اسے سرائے تک پہنچائے۔ یہاں کی تمام سرائیں دراصل شاہی مہمان خانے ہیں جن کے اخراجات خزانے سے پورے کیے جاتے ہیں۔ آپ کے سلسلے میں ناظم سرحد اور ناظم فصیلِ شہر دونوں کی کوتاہی قابلِ تعزیر جرم ہے۔ اس سے

چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ آخر آئینِ جہانبانی اور اصولِ سلطانی.... :

"مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں"۔ خانزادہ چڑ گئی :

"میں تو فریاد لے کر آئی ہوں۔ اور گنج کی ایک فریادی ہوں"۔

"فریادی!" سوار گھبرا کر بولا :

"کیا غضب کرتی ہیں خاتون۔ فریادی اور قصرِ شاہی کے سامنے۔ ابھی قیامت آ جائے گی اور دو چار کی گردنیں قلم ہو جائیں گی"۔

"کیوں، کیا فریاد کرنا جرم ہے؟" خانزادہ کو غصہ آ گیا :

"میں اتنی دور سے فریاد لے کر آئی ہوں اور آپ الٹا میرا ہی سر قلم کرا رہے ہیں۔ یہی دستور ہے اس شہر کا!"

"خاتونِ محترم! دستور تو اس شہرِ انتخاب کا یہ ہے"۔ سوار نے عالمی بگھارنا شروع کر دی :

"فریادی کو پہلے کوتوالِ شہر کے دربار میں رجوع کرنا چاہیے۔ اگر وہ شکایت رفع نہ کر سکے تو پھر وزیرِ سلطنت کے دربار میں فریاد کرنی چاہیے۔ وزیر کا فرض ہے کہ وہ فریادی کو مطمئن کرے"۔

خانزادہ، سوار کی دلچسپ باتوں پر مسکرا دی۔ دلچسپی سے پوچھا :

"اگر کوتوالِ شہر اور وزیرِ سلطنت فریادی کو مطمئن نہ کر سکیں تو کیا ہو گا؟"

"ایسا کبھی نہیں ہوا خاتونِ محترم"۔ سوار وثوق سے بولا :

"اگر خدانخواستہ ایسا ہو جائے تو کوتوالِ شہر اور وزیرِ عالی مقام کو تختۂ دار پر چڑھا دیا جائے۔ سلطان تو اپنی بزمِ نشاط میں کسی فریادی کو دیکھنا پسند نہیں کرتے"۔

"سلطان!" خانزادہ نے حیرت کا اظہار کیا :

"تبریز کا گورنر تو میران شاہ ہے"۔

"توبہ توبہ کیجیے خاتون۔ آہستہ بولیے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں"۔ سوار گھبرا کر بولا :

"سلطان ابنِ سلطان کا نام آپ اس قدر گستاخی سے لے رہی ہیں۔ اگر آپ کی فریاد دو چار ہزار دینار سے رفع ہو سکتی ہے تو وہ میں اپنی جیبِ خاص سے ادا کر سکتا ہوں"۔

"دو چار ہزار دینار"۔ خانزادہ نے سوار کو حیرت سے دیکھا :

"آپ یہاں کس عہدے پر فائز ہیں؟"

"میں قصرِ سلطانی کا صدر دروازہ صبح کو کھولتا اور رات کو بند کرتا ہوں"۔ سوار نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

"اوہ..... تو آپ دربان ہیں۔ آپ کا تعلق نگرانی کے معزز پیشے سے ہے"۔ خانزادہ نے بڑی مشکل سے

ہنسی ضبط کی، پھر اسے گھورتے ہوئے بولی :

"کیا یہاں کے سارے ملازمین تمہاری طرح شاعر اور رقاص ہیں؟"

"بے شک۔ لاریب"۔ سوار کی گردن غرور سے تن گئی :

"قصرِ سلطانی میں ایک سے ایک باکمال موجود ہے۔ شاہی سقہ قصیدہ گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور شاہی درجی اپنے فن میں بے نظیر ہے۔ جب شاہی خاصے کا خوان سر پر رکھ کر چلتا ہے تو مطبخ سے کھانے کے کمرے تک طبلے کی تھاپ پہ ایسا رقص کرتا ہوا جاتا ہے کہ دیکھنے والے.... ؟"

"بکواس بند کرو۔ ہم میران شاہ سے ابھی ملنا چاہتے ہیں"۔ خانزادہ نے گھوڑا صدر دروازے کی طرف بڑھایا۔

سوار جلدی سے کودا اور خانزادہ کی رکاب سے لپٹ گیا۔

"مجھ پر رحم کیجیے۔ میں غریب مارا جاؤں گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں"۔ وہ گڑگڑانے لگا۔

"خدا کے لیے اس وقت اندر نہ جائیے"۔ سوار ہاتھ جوڑ کر گھوڑے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیوں؟ اس وقت میران شاہ کیا کر رہا ہے؟"

"خاتون! اس وقت سلطان شعرائے کرام سے قصائد اور غزلیات سماعت فرما رہے ہیں"۔ دربان نے بڑی معصومیت سے بتانا شروع کیا :

"پھر رقص و سرود کی محفل گرم ہو گی جس کا اختتام نصف شب کے بعد ہو گا"۔

"اس کے بعد؟" خانزادہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"اس کے بعد قصہ گو حضرات تشریف لائیں گے اور اعلیٰ حضرت قصے کہانیاں سنتے سنتے نیند کی آغوش میں پہنچ جائیں گے"۔ دربان نے امیر تیمور کے ولی عہد بیٹے کے لیل و نہار کا اوقات نامہ بیان کر دیا۔

خانزادہ کو یہ سن کر حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی۔ اس نے پوچھا :

"اور میران شاہ دربار کس وقت لگاتے ہیں؟"

"سلطان تو سلطان ہیں خاتون۔ انہیں دربار لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ انتظامِ سلطنت کے لیے ہزاروں کارندے موجود ہیں"۔ دربان نے یوں کہا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو۔

خانزادہ کو میران شاہ کا یہ حال سن کر بہت افسوس ہوا۔ اس نے سوچا کہ جب میران شاہ کے عیش و عشرت کا یہ عالم ہے تو وہ کہیں اسے پہچاننے سے ہی انکار نہ کر دے۔ یہ تو اس کی بہت بڑی توہین اور شکست ہو گی۔ اسے میران شاہ کی عیش و عشرت کی تو پروا نہ تھی لیکن اس کی روش سے مطلق العنانی ظاہر ہوتی تھی اور ان حالات میں وہ کوئی غلط قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے میران شاہ سے فوری طور پر ملاقات کا ارادہ ملتوی کر دیا اور دربان کے کہنے

سے مطابق شاہی مہمان خانے میں چلی گئی۔

ایران کی فتح کے بعد امیر تیمور نے میران شاہ کو ایران کا شمالی علاقہ بھی سپرد کر دیا تھا اور میران شاہ نے چھوڑ کر تبریز میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

تیمور کو صرف نئی نئی فتوحات سے دلچسپی تھی۔ اس کا لشکر جس طرف بڑھتا فتح و نصرت اس کے قدم چومتی۔ سلطنت روز بروز پھیلتی جا رہی تھی اور اتنی ہی تیزی سے تیمور بھی بڑھاپے کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ خانزادہ دو مرو رہائش ہمیشہ کے لیے ترک کر کے اورگنج منتقل ہو گئی۔ میران شاہ اس سے پہلے ہی تبریز جا چکا تھا۔ خانزادہ کے ساتھ ساتھ میران شاہ کو بھولتی جا رہی تھی لیکن جب اسے اپنے دونوں بیٹوں شہزادے پیر محمد اور شہزادہ کی فتوحات اور جوانمردی کی خبریں ملیں تو ایک بار پھر اس کے دل میں اپنے بیٹوں کے لیے بادشاہت حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ممکن ہے کہ وہ اورگنج اسی وجہ سے گئی ہو لیکن میران شاہ کی موجودگی میں اس کے بیٹوں کو حکومت ملنا تھا اس لیے اس نے اپنے طور پر منصوبہ بنایا کہ میران شاہ کو کسی طرح راستے سے ہٹا دیا جائے۔

میران شاہ سے ٹکر لینا تو کسی طرح ممکن نہ تھا کیونکہ وہ صاحبِ اقتدار تھا اور اس پر تیمور کی مہربانیاں تھیں۔ ہاں میران شاہ کو بہلا پھسلا کر کسی ایسے جال میں پھانسا جا سکتا تھا جس سے تیمور اس کی طرف سے بدگمان ہو جائے۔ اس کے بعد خانزادہ کے بیٹوں کے لیے میدان صاف تھا۔

خانزادہ جس قدر خوبصورت تھی اس سے کہیں زیادہ عیار اور شاطر تھی۔ اس کی سحر انگیز گفتگو مخاطب کو کر دیتی تھی۔ اس کا تجربہ ایک بار وہ شہر سبز میں میران شاہ پر کر چکی تھی۔ میران شاہ پہلی ہی ملاقات میں خانزادہ کا لگا تھا اور اسے اپنی ولایت میں آنے کی دعوت دی تھی۔ خانزادہ سے زیادہ جاذبِ نظر عورت شاید اب بھی پورے خرا موجود نہیں تھی۔ خانزادہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تبریز پہنچی تھی لیکن شاہی دربان سے میران شاہ کے لیل و نہار کے مشاغل کی تفصیل سن کر وہ بہت پریشان ہوئی۔ محل سے وہ سیدھی سرائے آئی۔ اس نے اب تک چہرے نقاب نہیں اٹھائی تھی لیکن جب سرائے پہنچ کر اس نے نقاب اٹھائی تو سرائے کے داروغہ کا منہ کھلا رہ گیا۔

حسن و جمال کے ساتھ خانزادہ کے چہرے پر ایک شاہانہ جلال بھی تھا۔ وہ خوارزم کے حکمران حسین صوفی کی بھتیجی تھی۔ حسین صوفی کی شکست کے بعد اس کی شادی امیر تیمور کے بیٹے جہانگیر سے ہوئی تھی۔ اس وقت اگرچہ وہ بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی لیکن تیمور کی بہو ہونے کے ناطے اس کی چال ڈھال اور گفتگو سے تیموری رعب داب ظاہر ہوتا تھا۔ داروغہ سرائے تو اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

خانزادہ نے سرائے میں اس لیے قیام کیا تاکہ میران شاہ سے ملاقات سے پہلے اس کے معمولات اور سلطنت کے تمام بڑے بڑے امیروں کے بارے میں معلومات حاصل کر لے۔ اسے کسی وقت بھی ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میران شاہ

دربار اور حرم سرا کی جو باتیں اسے بتائی گئیں، وہ حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد دلچسپ بھی تھیں۔ تیمور، ایران سے اہلِ حرفہ کو اپنے ساتھ سمرقند لایا تھا۔ ان میں معماروں اور انجنیئروں کی تعداد زیادہ تھی لیکن ان کے علاوہ بہت سے مطرب بھی تیمور کے ساتھ سمرقند آ گئے تھے۔

ان ناچنے گانے والوں کو جب معلوم ہوا کہ میران شاہ تبریز میں دادِ عیش دے رہا ہے اور اس کی فیاضیوں سے ہر ایک فائدہ اٹھا رہا ہے تو یہ سب کے سب تبریز پہنچ گئے۔ میران شاہ نے ان لوگوں کی پذیرائی کی اور انہیں محفلِ نشاط تک محدود رکھنے کے بجائے فوجی اور انتظامی عہدوں پر فائز کیا۔

حافظ شیرازی کے بقول ایرانی مغنی اور موسیقار تمام دنیا میں لاثانی تھے کیونکہ وہ ایسی دھنیں بجاتے تھے کہ جنہیں سن کر مدہوش اور ہوش مند سب ہی جھومنے اور رقص کرنے لگتے تھے۔ ایسے اہل اور نااہل ندیموں سے میران شاہ کا دربار بھرا رہتا تھا۔ دربارِ تبریز پر عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے بغداد کے دربار کا شبہ ہوتا تھا۔ مشائخ بھرے دربار میں شاعروں سے مذہبی بحثیں کرتے نظر آتے۔ نقال، مسخرے اور لفظی صنعت گری کے ماہر قصیدہ گو شعراء میران شاہ کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے اور میران شاہ کے گرد مہ وشوں کا ہجوم رہتا۔ شراب اسلام میں حرام ہے لیکن بعض علماء نے نبیذ (کھجور کی تاڑی) کو جائز قرار دے دیا تھا۔ میران شاہ اور اس کے درباری تاڑی کے سرور میں مست رہتے تھے۔

خانزادہ کو تعجب تھا کہ امیر تیمور اپنے ولی عہد سے اس قدر غافل کیوں ہے؟ یہ حالات ایسے تھے کہ ان کی خبر تیمور کو ضرور ہونا چاہیے تھی۔ تیمور شہزادوں کی سخت نگرانی کرتا تھا اور ان کی ذرا سی کوتاہی بھی نظر انداز نہ کرتا تھا۔ تبریز میں دولت کی جو ریل پیل تھی اس کا اندازہ خانزادہ کو سرائے کا ساز و سامان دیکھ کر ہوا۔ شہر میں اس طرح کی دو سو سے زیادہ سرائیں تھیں اور ہر سرائے شاہی مہمان خانہ معلوم ہوتی تھی۔ ان کے اخراجات شاہی خزانے سے ادا ہوتے تھے۔ تبریز میں کوئی گداگر نہ تھا۔ پہلے فقیروں کو حکومت کی طرف سے کھانا کپڑا دیا جاتا تھا اور انہیں کام پر لگایا جاتا تھا لیکن جب یہ فقیر کام سے جی چرانے لگے اور انہوں نے بھیک مانگنے کی عادت نہ چھوڑی تو انہیں پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ تیمور کا حکم تھا۔ جو سیاح تیمور کے دور میں اس کی سلطنت سے گزرے تھے انہوں نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ تیموری سلطنت کے طول و عرض میں انہیں کوئی گداگر نظر نہیں آیا۔

تبریز کے دولت مند ہونے کا اصل سبب اس کا محلِ وقوع تھا۔ تبریز جو آجکل ایک اونگھتا ہوا چھوٹا سا شہر ہے۔ اس زمانے میں چین کے دارالسلطنت کو چھوڑ کر دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ سمرقند، دمشق اور بغداد کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہ تھی۔ تبریز جسے قدیم مؤرخوں نے توریز لکھا ہے، عہدِ تیموری میں عالمی تجارت کا ایک عظیم مرکز تھا۔ اس جگہ شاہراہِ خراسان جنوب سے آنے والی اس سڑک سے ملتی تھی جو بغداد، ایران

اور خلیج فارس کو جاتی تھی۔ اس کی عمارتیں روم اور فارس سے زیادہ وسیع اور شاندار تھیں۔ معابد، دارالعلوم اور شفا خانوں کی سامنے کی دیواروں پر کاشی کی منقش اینٹیں لگائی جاتی تھیں۔ سرایوں اور مسافر خانوں کے علاوہ شہر میں دو لاکھ مکانات تھے۔ آبادی تقریباً بارہ لاکھ تھی۔ ایک سیاح نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ صرف تبریز کی آمدنی حکومتِ فرانس کی آمدنی کے برابر تھی۔

خانزادہ تین روز تک سرائے میں مقیم رہی اور اپنے منصوبے پر غور کرتی رہی۔ پھر اس نے سرائے کے داروغہ کو بلایا۔ داروغہ ایک جہاندیدہ شخص تھا۔ اس نے خانزادہ کو دیکھ کر پہلے ہی دن اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کوئی اہم شخصیت ہے اور کسی مصلحت کے تحت سرائے میں مقیم ہے لیکن اس نے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں کون ہوں؟" خانزادہ نے داروغہ سے پوچھا۔

"میرا اندازہ ہے کہ آپ کا تعلق کسی بہت اونچے گھرانے سے ہے۔" داروغہ نے دست بستہ جواب دیا۔

"اپنے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔" خانزادہ بولی:

"اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

داروغہ نے عاجزی سے کہا:

"مہمانوں کے حکم کی تعمیل میرا فرض ہے۔"

"میں تمہارے سلطان سے ملنا چاہتی ہوں۔" خانزادہ کو دل کی بات زبان پر لانا پڑی۔

داروغہ نے حیرت سے خانزادہ کو دیکھا:

"یہ ناممکن ہے خانم۔" داروغہ نے نفی میں سر ہلایا:

"سلطان عالی مقام اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ کسی سے ملنے کا وقت نکال ہی نہیں سکتے۔ باہر کے سیاح سلطان سے ملاقات کی درخواست کرتے ہیں تو انہیں پہلے دو چار ماہ شاہی مہمان رہنا پڑتا ہے۔"

"سنا ہے کہ تمہارے سلطان کا تمام وقت قصیدے سننے یا رقص و سرود کی محفلوں میں گزرتا ہے۔" خانزادہ نے جل کر کہا:

"اس کے علاوہ کوئی مصروفیت ہو تو بتاؤ۔"

"خانم، آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔" داروغہ معصومیت سے بولا:

"بادشاہوں کا وقت تو اسی طرح گزرتا ہے۔ اسی مصروفیت سے انہیں فرصت کہاں ملتی ہے کہ کسی کو [illegible] اجازت دیں۔"

"مگر مجھے تو سلطان سے ضرور ملنا ہے۔"

خانزادہ کو غصہ تھا کہ میران شاہ نے محض ایک صوبے کا گورنر یا جاگیردار ہوتے ہوئے سلطان کا لقب کیوں …ار کیا جبکہ تیمور نے اب تک اپنے نام میں سوائے امیر کے اور کوئی لقب شامل نہیں کیا تھا۔

"یہ میرے اختیار سے باہر ہے خانم۔" داروغہ نے معذوری ظاہر کی:

"میں آپ کو صرف محل کے دروازے تک پہنچا سکتا ہوں لیکن شاہی دربان آپ کو کسی طرح اندر نہ گھسنے دے گا۔"

داروغہ کا کہنا ٹھیک ہی تھا۔ خانزادہ کو محل کے طرحدار دربانوں سے پہلے ہی سابقہ پڑ چکا تھا۔

"کوئی ترکیب نکالو داروغہ، سوچو۔" خانزادہ نے کہا۔

داروغہ سوچ میں ڈوب گیا۔ ذرا توقف کے بعد بولا:

"آپ کو انتظار کرنا پڑے گا خانم۔ سلطان مہینے دو مہینے میں ایک بار شہر کی سیر کرنے نکلتے ہیں۔ جب ان کا جلوس …گا تو میں آپ کو ایک اونچی جگہ کھڑا کر دوں گا۔ وہاں سے آپ سلطان کا دیدار کر سکیں گی۔"

"مجھے دیدار نہیں کرنا۔" خانزادہ جھلا گئی:

"میں ان سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

"یہ میرے فرائض میں شامل نہیں...." داروغہ نے مجبوری ظاہر کی:

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

خانزادہ نے دوسری ترکیب نکالی۔

"اچھا یوں کرو، میں تمہیں ایک خط دیتی ہوں وہ تم اپنے سلطان کو پہنچا دو۔"

داروغہ سوچنے لگا۔ پھر مسکرا کر بولا:

"آپ خط لکھیے۔ میں کوشش کروں گا۔"

خانزادہ نے اسی وقت چار جملوں کا خط لکھا اور لفافے میں بند کر کے داروغہ کے حوالے کر دیا۔

○

تین دن گزر گئے لیکن داروغہ نے خانزادہ کو کوئی جواب نہ دیا حالانکہ وہ دن میں دو بار اس کی مزاج پرسی کے لیے آتا تھا۔ خانزادہ نے بھی اس سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتی تھی کہ جس ملک کا حاکم عیش و عشرت … ایسے ماحول میں دن گزار رہا ہو اس تک اپنا پیغام پہنچانا اور جواب لانا کتنا مشکل ہے۔

پھر جب تین دن گزر گئے تو خانزادہ کو فکر ہوئی۔ اس نے سوچا کہ کم از کم اسے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ خط میراں شاہ تک پہنچا بھی یا نہیں۔

شام کو حسبِ معمول داروغہ آیا اور ادب سے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"داروغہ!" خانزادہ نے اسے ملائمت سے مخاطب کیا:

"امید ہے کہ تم نے میرا خط پہنچا دیا ہوگا۔"

"جی ہاں خانم، خط پہنچا دیا گیا ہے۔"

"جواب کی کب تک امید ہے؟"

"جواب میرے اختیار سے باہر ہے لیکن مجھے امید ہے کہ آج۔۔۔"

اسی وقت سرائے کا ایک ملازم آیا اور داروغہ کے کان میں کچھ کہہ کے چلا گیا۔

"مبارک ہو خانم"۔ داروغہ مسرت سے بولا:

"آپ کے خط کا جواب آگیا ہے۔"

"آگیا جواب۔ کون لایا؟" خانزادہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ابھی حاضر ہوتا ہوں"۔ یہ کہتا ہوا داروغہ باہر چلا گیا۔

خانزادہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ معلوم نہیں میراں شاہ نے کیا جواب دیا ہے؟ وہ امید و بیم کے درمیان ہچکولے کھانے لگی۔

کچھ دیر بعد داروغہ مسکراتا ہوا واپس آیا اور بولا:

"وزیرِ سلطنت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مجھ سے، وزیرِ سلطنت، مگر کیوں؟" خانزادہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ۔۔۔۔ آپ نے سلطانِ عالم کو خط لکھا تھا؟" داروغہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تو وزیرِ سلطنت جواب لائے ہیں"۔ خانزادہ کو کچھ اطمینان ہوا:

"دیکھو داروغہ۔ وہ وزیرِ سلطنت ہیں۔ حکومت کے ایک اعلیٰ افسر۔ ان کا میرے پاس آنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں خود ان سے ملنے جاؤں گی۔"

"مگر خانم۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ وہ۔"

"تم تیموری سلطنت کے اصول نہیں جانتے"۔ خانزادہ نے تیز لہجے میں کہا:

"جاؤ۔ انہیں اطلاع دو کہ میں آ رہی ہوں۔ پھر آ کے مجھے لے جانا۔"

داروغہ اس کا منہ دیکھتا ہوا چلا گیا۔

خانزادہ کو پھر خیالات نے گھیر لیا لیکن اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور ملاقات کے لیے پوری طرح تیار ہو گئی۔ داروغہ آیا تو خانزادہ چلنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"خانم، وزیرِ سلطنت باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ اندر آنے کی اجازت دیجیے"۔ داروغہ نے سر جھکا کر بتایا۔

"اچھا۔ آنے دو"۔

چند لمحوں کے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص اندر آیا۔ اس کا جگمگاتا لباس دیکھ کر خانزادہ حیران رہ گئی۔ اتنا عمدہ اور قیمتی لباس تو بادشاہ یا شہزادے ہی پہن سکتے تھے۔

"میں وزیرِ سلطنت کو خوش آمدید کہتی ہوں"۔ خانزادہ نے وزیر کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"خانزادہ خانم۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ مصروفیت کی وجہ سے پہلے نہ حاضر ہو سکا"۔ وزیر بڑی بے تکلفی سے بولا اور خانزادہ کا جائزہ لینے لگا۔

خانزادہ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر چونک پڑی۔ داروغہ کو تو اس نے اپنا نام اب تک نہیں بتایا تھا پھر وزیر کو کیسے معلوم ہو گیا۔ اس نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا:

"وزیرِ سلطنت کے منہ سے اپنا نام سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ کیا اس کی وضاحت فرمائی جائیگی"۔

"خانزادہ خانم۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے"۔ وزیر اطمینان سے بولا:

"سلطانِ معظم کے نام آپ نے جو پرچہ بھیجا تھا اس میں آپ کا نام درج تھا۔ پھر یوں بھی شاہی سرائے میں ٹھہرنے والے مہمانوں کی فہرست روز مجھے بھیجی جاتی ہے۔ مہمانوں کی ضروریات کا خیال رکھنا میرے فرائض میں شامل ہے۔"

"میرے خط کا کیا جواب دیا گیا ہے؟" خانزادہ نے گفتگو کو مختصر کرنے کے لیے پوچھا۔

"میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں خانزادہ خانم"۔ وزیرِ سلطنت نے بڑی شائستگی سے کہا:

"کچھ وضاحت کی ضرورت ہے۔ آپ کا خط بے انتہا مختصر ہے"۔

"مجھے جواب چاہیے وزیرِ محترم"۔ خانزادہ کا لہجہ ترش ہو گیا:

"کیا میرا نام کافی نہیں تھا؟"

"میرا مطلب ہے خانزادہ خانم!" وزیر اس کے ترش لہجے سے گھبرا گیا:

"میں . . . . . میں چاہتا ہوں۔"

وزیر محترم!" خانزادہ نے اس کی بات کاٹ دی:

"مجھے صرف یہ بتایا جائے کہ کیا میراں شاہ نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے اور آپ سے [illegible]

طلب کی ہے!"

"سلطانزادہ، سلطان میراں شاہ ابن سلطان۔" وزیر سلطنت بوکھلا کر خانزادہ کو دیکھنے لگا۔

"میرا خط پڑھا تھا تمہارے سلطان نے؟" خانزادہ کا لہجہ اور سخت ہو گیا:

"اگر سلطان نے خط پڑھا تھا یا تم سے پڑھوا کر سنا تھا تو پھر اس کے جواب میں وہ الفاظ دہرا دیجئے جو

انہوں نے کہے اور . . . . . اور کچھ نہیں بس!"

"خانزادہ خانم۔ وہ خط ابھی تو میرے پاس ہے۔"

خانزادہ اچھل پڑی:

"کیا؟ کیا آپ نے میرا خط پڑھ لیا؟" خانزادہ نے اپنی مٹھیاں غصے میں کس لیں:

"آپ کو یہ جرأت کیسے ہوئی؟"

"خانزادہ خانم۔ ناراض نہ ہوں۔ میرا فرض ہے کہ . . . . ."

"میں آپ کے فرائض کی تفصیل نہیں سننا چاہتی۔" خانزادہ غصے سے بولی:

"آپ لوگ باتیں تو بڑی شائستگی سے کرتے ہیں لیکن آپ کو کسی کے ذاتی خط پڑھتے ہوئے شرم

آتی۔ اخلاق کا یہ کون سا اصول اور دستور ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اخلاقی جرم ہے وزیر محترم۔"

وزیر سلطنت نے خانزادہ کی کڑوی باتیں بڑے تحمل سے سنیں اور جواب بھی اسی تحمل سے دیا:

"خانزادہ خانم . . . . . سلطان عالم کا فرمان ہے کہ رعیت کی تمام شکایتیں وزیر سلطنت کو پہنچائی جا

وہی ان کی داد رسی کرے۔ اگر کوئی وزیر رعیت کو مطمئن کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اسے معزول کر دیا جاتا ہے

آپ میری معزولی یا بربادی سے خوش ہو سکتی ہیں تو میں تیار ہوں۔ میں ایک بال بچے دار غریب انسان ہوں۔ مجھے

کر کے آپ کو کیا ملے گا خانزادہ خانم!"

"بال بچے دار اور غریب انسان۔" خانزادہ بڑبڑائی۔

یہی الفاظ اس نے دربان کے منہ سے بھی سنے تھے۔ عجیب لوگ ہیں یہاں کے۔ اتنے امیر اور مال دار ہو

ہوئے بھی ہر ایک خود کو غریب کہتا ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ امیر تیمور کے دور حکومت میں اس کے

ایک ایسی حکومت قائم کر رکھی ہے جس کے قوانین دنیا سے نرالے ہیں بلکہ یہاں تو کوئی قانون ہی نہیں معلوم ہوتا۔

سلطنت پر ترس آ گیا۔ نرمی سے پوچھا:

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے مگر یہ تو بتائیے کہ اگر کوئی قتل ہو جائے۔ کوئی بڑا ڈاکہ پڑے یا کہیں بغاوت ہو

تو آپ کیا قدم اٹھائیں گے؟"

"خانزادہ خانم۔ میری وزارت کے چار سالہ دور میں صرف ایک قتل ہوا تھا۔" وزیر سلطنت نے بڑی سادگی

سے بتایا:

"میں نے قاتل کو گرفتار کرایا اور اسی وقت بیچ بازار میں اسے سولی پر چڑھا دیا۔"

"اس کے قتل کا حکم سلطان یا قاضی شہر نے دیا ہو گا؟" خانزادہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"خانزادہ خانم۔ آپ ہمارے ملک کے قانون سے ناواقف معلوم ہوتی ہیں۔" وزیر سلطنت نے ذرا رعب

سے کہا:

"میں وزیر سلطنت ہوں۔ یہاں صرف میرا حکم چلتا ہے۔ اس ملک میں کوئی قاضی نہیں۔"

"ٹھیک فرما رہے ہیں آپ۔" خانزادہ مسکرائی:

"چوری اور ڈاکے کی صورت میں آپ کیا حکم دیتے ہیں؟"

"ابھی تک تبریز میں کوئی واقعہ نہیں ہوا خانزادہ خانم۔" وزیر سلطنت فخر سے بولا:

"تبریز دنیا کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ ہر شخص مال دار ہے۔ ضرورت مند کو شاہی خزانے سے رقم دے دی جاتی

ہے۔ ایسی صورت میں چوری ڈاکے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"بغاوت کی صورت میں تو سلطان عالی مقام ضرور کچھ ارشاد فرماتے ہوں گے۔" خانزادہ نے طنز کیا:

"کیا اس وقت بھی آپ کے سلطان کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور فوج کو بغاوت کچلنے کا حکم بھی نہیں

دیتے؟"

"خانزادہ خانم۔" وزیر نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا:

"بغاوت ملک میں بے چینی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جس ملک کے باشندے فارغ البال ہوں اور

عیش میسر ہو تو انہیں بغاوت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ فوج کا ذکر کر رہی ہیں اگر عوام کو بھی یہ شبہ

ہو کہ کوئی شخص بغاوت کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ خود ہی مار مار کر اس کا قیمہ بنا دیں۔ میں آپ کو یقین

دلاتا ہوں . . . . ."

"بس کیجیے وزیر محترم۔" خانزادہ نے اسے ٹوکا:

"مجھے آپ کے قانون اور اس کی تفصیل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں سمجھ گئی کہ یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔"

شاید اندھیر نگری چوپٹ راجہ ایسے ہی ملکوں کو کہا جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ لوگ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ مجھے میراں شاہ تک پہنچنے کے لیے خود ہی راستہ بنانا پڑے گا۔"

"ایسا نہ کیجیے گا خانزادہ خانم"۔ وزیر گڑگڑانے لگا:

"میری ملازمت ختم ہو جائے گی۔ میں۔۔۔۔"

"آپ کوئی فکر نہ کریں وزیرِ سلطنت"۔ خانزادہ کو ہنسی آ گئی:

"مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت غریب ہیں اور بال بچے دار آدمی ہیں۔ میں جب آپ کے سلطان سے ملوں گی تو کہہ دوں گی کہ میں سیدھی اس کے پاس آئی ہوں اور میرے آنے کی تبریز میں کسی کو خبر نہیں۔ آپ کا نام بالکل نہ ہو گا۔ میں وعدہ کرتی ہوں"۔

"مجھے آپ سے ایسی ہی امید ہے خانزادہ خانم"۔ وزیرِ سلطنت انکسار سے دُہرا ہوا جا رہا تھا:

"میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں"۔

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا: "میں شرمندہ ہوں کہ میں آپ کے آرام میں مخل ہوا۔ اب مجھے جانے کی اجازت دی جائے"۔

"تشریف رکھیے وزیرِ سلطنت"۔ خانزادہ ملائمت سے بولی:

"آپ کی بات تو ختم ہو گئی مگر میرا مسئلہ باقی ہے۔ میں آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتی لیکن آپ کو میرے لیے دو باتیں کرنا ہوں گی"۔

"فرمائیے فرمائیے۔ میں تعمیلِ حکم کے لیے حاضر ہوں"۔ وزیرِ سلطنت اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔

"ایک تو یہ کہ آپ میرا نام کسی کو نہیں بتائیں گے"۔

خانزادہ نے پہلے ارادہ کیا تھا کہ وہ میراں شاہ کے پاس پہنچ کر اسے اپنی پہلی ملاقات کا حوالہ دے گی اور اس کی تجدید کی کوشش کرے گی لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ میراں شاہ کے پاس پہنچ اور اسے رام کرنا آسان کام نہیں۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ ۔۔۔ میسر نہ ہو کیونکہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ میراں شاہ کے دربار میں کوئی نہ کوئی آدمی اس سے ضرور واقف ہو گا اور ناکامی کی صورت میں شرمندگی کے علاوہ اس کی ذلت اور رسوائی بھی ہو گی۔

"آپ اطمینان رکھیں خانزادہ۔۔۔۔" وزیرِ سلطنت کہتے کہتے رکا پھر سنبھل کر بولا:

"میرا مطلب ہے معزز مہمان خانم! میں اپنے منہ کو سی لوں گا۔ ہونٹوں پر مہر لگا لوں گا"۔

"اور۔۔۔۔" خانزادہ نے داروغہ کی طرف اشارہ کیا:

"اس داروغہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

داروغہ اس تمام گفتگو کے دوران دست بستہ کھڑا تھا۔ وزیر کو اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس نے داروغہ کو دیکھا اور غصے سے بولا:

"کم بخت تو اب تک یہاں کھڑا ہے۔ تو کیا کر رہا ہے۔ جا دفع ہو جا"۔

داروغہ گھبرا کر دروازے کی طرف بڑھا تو وزیرِ سلطنت کو ایک دم خیال آیا۔ اس نے داروغہ کو آواز دی:

"سن، ادھر آ"۔

داروغہ جہاں تک گیا تھا، وہیں سے واپس آ گیا۔

"دیکھ۔ تیری سرائے میں معزز مہمان خانم مقیم ہیں"۔ وزیر نے اسے سمجھانے کے انداز میں تاکید کی:

"خانزادہ نام کی کوئی خاتون تیری سرائے میں کبھی نہیں آئیں۔ خبردار جو یہ نام کسی کے سامنے لیا۔ زبان کٹوا دوں گا تیری۔ سمجھ گیا کہ نہیں؟"

"بالکل سمجھ گیا حضور۔ اگر کبھی خانزادہ خانم کا نام میری زبان سے سنیں تو پھانسی پر چڑھوا دیجیے گا"۔

"دیکھا وزیرِ سلطنت آپ نے"۔ خانزادہ ہنس پڑی:

"اس کو سمجھائیے کہ میرا نام اس طرح بھول جائے جیسے کبھی سنا ہی نہ ہو"۔

"ایسا ہی ہو گا معزز مہمان خانم"۔ وزیرِ سلطنت کے بجائے داروغہ بول پڑا کیونکہ اس نے غلطی سے ابھی نام لے لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔

"اب ٹھیک ہے"۔ خانزادہ نے کہا:

"دوسری بات یہ ہے کہ میں اب سرائے میں نہیں رہنا چاہتی۔ آپ میرے لیے شہر میں کسی اچھے سے مکان کا انتظام کر دیجیے"۔

"خانزا۔۔۔۔ مہمان خانم"۔ وزیرِ سلطنت فوراً سنبھل گیا:

"بھلا یہ کس طرح ممکن ہے۔ سلطانِ معظم تک خبر پہنچی کہ ایک مہمان شاہی سرائے کے بجائے کرائے کے گھر میں رہ رہی ہے تو میرا کیا حشر ہو گا۔ میں بال۔۔۔۔"

"بال بچے دار اور غریب آدمی ہیں"۔ خانزادہ بات کاٹ کر بولی:

"مجھے آپ لوگوں کی غربت کا حال معلوم ہے لیکن میری بھی مجبوری ہے۔ میں ابھی لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی ورنہ ایک دن ضرور پہچان لی جاؤں گی"۔

"مگر خانم۔۔۔۔" وزیر فکرمند ہو گیا:

"آپ کے ارشاد کے مطابق تبریز آپ کے لیے اجنبی شہر ہے۔ پھر آپ کو یہاں کون پہچانے گا؟"

"تبریز میرے لیے اجنبی ہے لیکن میں لوگوں کے لیے اجنبی نہیں ہوں۔" خانزادہ سنجیدہ ہو گئی:

"مجھے خیال پڑتا ہے کہ جب شہزادہ میران شاہ کو خوارزم کی حکومت سونپی گئی تھی تو امیر تیمور نے بعض سواروں کو شہزادے کے ساتھ کر دیا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی فوراً پہچان لیں گے۔"

وزیرِ سلطنت نے اسے حیران نظروں سے دیکھا اور بولا:

"معاف خانم۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ شاید آپ مجھ سے زیادہ عقل مند ہیں۔ یہ آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟"

"عقل مند تو آپ ہی زیادہ ہیں۔" خانزادہ متانت سے بولی:

"لیکن میری باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ آپ اس کے لیے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ زیادہ سے یہ ذہن نشین کر لیں کہ میں میران شاہ کی بہت قریبی رشتے دار ہوں۔"

"یعنی۔۔۔۔ یعنی آپ شاہی خاندان سے ہیں؟" وزیرِ سلطنت بوکھلا گیا۔

"صرف شاہی خاندان سے نہیں بلکہ خود بھی ایک ملک کی شہزادی ہوں۔"

"پھر۔۔۔۔ پھر میں آپ کے سامنے کیسے بیٹھ سکتا ہوں شہزادی عالیہ۔" اور وہ جلدی سے خانزادہ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

"دیکھیے وزیرِ سلطنت۔ جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے وہ اپنے تک محدود رکھیے گا۔" خانزادہ کا لہجہ پُر وقار ہو گیا:

"اور اس سے زیادہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کیجیے گا۔ آپ میرے لیے ایک حویلی کا انتظام کر دیں۔ وہاں میں آپ کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے قیام کروں گی۔ پھر تو آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا نا؟"

"آپ بہت عقل مند ہیں شہزادی عالیہ!" وزیر نے دل سے اعتراف کیا۔

○

وزیرِ سلطنت نے خانزادہ کو ایک آراستہ و پیراستہ عالی شان حویلی میں اتارا۔ خدمت کے لیے کنیزوں اور غلاموں کا بھی انتظام کر دیا۔ خانزادہ کو یہاں بڑا سکون ملا۔ اور اس نے اپنے منصوبے کو از سرِ نو ترتیب

رہ گیا۔

وزیرِ سلطنت خانزادہ سے کچھ ایسا مرعوب ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے معمولات کو چھوڑ کر خود کو خانزادہ کے لیے وقف کر دیا۔ وہ دن میں کئی بار اس کی مزاج پرسی کے لیے آتا اور اس کے حکم کی تعمیل کو اپنا ... خانزادہ بھی اس سے بہت خوش تھی اور اس پر اعتماد کرنے لگی تھی۔

ایک شام جب وزیرِ سلطنت خانزادہ سے ملنے آیا تو خانزادہ نے مسکرا کر کہا:

"وزیرِ سلطنت آپ بہت غریب ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی کچھ غربت دور کر دوں۔"

"بے شک شہزادی عالیہ! میں بہت غریب ہوں۔" وزیر نے بے تکلف جواب دیا:

"میں کثیر الاولاد ہوں اور خاندان کے بعض افراد کی مجھے سرپرستی بھی کرنا پڑتی ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ ان کے اخراجات پورے کرنا کس قدر مشکل ہے جبکہ میری طرح ان کی بھی ضروریات ہیں اور وہ بھی صاحب ... ہیں۔"

"مجھے پورا احساس ہے وزیرِ سلطنت۔" خانزادہ نے خوش دلی سے کہا:

"میرا خیال ہے وہ بھی آپ ہی کی طرح ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہوں گے۔"

"جی۔۔۔۔ جی ہاں بالکل۔" وزیر نے خانزادہ کا طنزیہ لہجہ سمجھتے ہوئے کہنا شروع کیا:

"غور فرمائیے۔ اگر میں انہیں اپنی طرح نہ رکھوں تو دنیا والے کیا کہیں گے۔ آخر رکھ رکھاؤ اور دنیا داری بھی ... ہے۔ میری حیثیت نہ سہی لیکن میں ان کی ہر خواہش پوری کرتا ہوں۔"

"اسی لیے تو میں آپ کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

"مدد۔۔۔۔ میری مدد۔۔۔۔ آپ؟"

وزیرِ سلطنت نے تعجب سے اسے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ غریب الوطن شہزادی اس کی کس طرح مدد کرے گی۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں اور نہ ہی زر و جواہر کے صندوق ہیں۔ اپنے خرچ کے لیے تو اس کے پلّے کچھ ... اور مدد کرنا چاہتی ہے وزیرِ سلطنت کی، جس کے صرف تبریز میں دو محل، گیارہ حویلیاں اور درجنوں باغات ہیں۔

"ہاں وزیرِ سلطنت۔۔۔۔ میں آپ کی مدد کروں گی۔" خانزادہ نے بڑے استقلال سے کہا:

"آپ شاید مجھے خالی ہاتھ سمجھ رہے ہیں؟"

"نہیں نہیں۔۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وزیر نے بات بنائی:

"آپ خالی ہاتھ کیسے ہو سکتی ہیں۔ زر و جواہر کے صندوق آپ نے کسی اور جگہ رکھوا دیے ہوں گے۔"

"وزیرِ سلطنت ۔ بعض چیزیں ایسی نادر ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے زر و جواہر کے صندوق اور چھوٹے شاہی خزانے بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔"

"بے شک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے شک۔" وزیر کو اس کی باتوں کا یقین تو نہیں آرہا تھا لیکن اس نے خانزادہ کا دل رکھنے کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

خانزادہ نے زانو کے نیچے دبی ہوئی ایک صندوقچی کو کھولا اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر رومال میں رکھی۔ پھر بولی:

"آپ کو شاید یاد نہ ہو کہ جب صاحبقران امیر تیمور گورگان ایران کے بادشاہ شاہ شجاع نے دوستی کا خط اپنے بیٹے زین العابدین کی سرپرستی کی سفارش کی تھی، تو اس خط کے ساتھ بہت سے نادر اور نایاب تحائف بھی بھیجے۔ ان تحائف میں کچھ ایسے ہیرے بھی تھے جن کی قیمت کا آج بھی اندازہ لگانا مشکل ہے۔"

یہ کہتے ہوئے خانزادہ نے رومال میں دبی ہوئی چیز اس کی طرف بڑھادی:

"اگر آپ ہیروں کے قدردان ہیں اور آپ کو ان کی شناخت بھی ہے تو اسے دیکھ کر ذرا اس کی قیمت کا اندازہ تو لگائیے۔"

وزیرِ سلطنت نے ہچکچاتے ہوئے رومال لے کر کھولا اور ساتھ ہی اس کا منہ بھی کھل گیا۔ وزیر وزیرِ خزانہ بلکہ سب کچھ وہی تھا۔ اسے ہیرے جواہرات کی پہچان بھی تھی لیکن جس حجم اور آب و تاب کا ہیرا اس نے نکلا، ایسا ہیرا پہلے کبھی اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ دیکھنا تو الگ رہا، اس نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اتنا بڑا ہیرا بھی موجود ہے۔ وہ کبھی ہیرے کو دیکھتا اور کبھی خانزادہ کو دیکھنے لگتا۔

"مہان خانم۔" وزیر شکست خوردہ لہجے میں بولا:

"میں اس نایاب ہیرے کے متعلق کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ میرا خیال تھا کہ تبریز کے خزانے میں جس قدر اتنی دولت دنیا کے اور کسی خزانے میں نہیں ہوگی لیکن یہ نادرِ روزگار ہیرا تو تبریز کے خزانے میں بھی نہیں تھا۔"

"تبریز کے خزانے میں کچھ ہو یا نہ ہو لیکن آپ کے خزانے میں یہ ہیرا ضرور موجود ہے۔" خانزادہ نے بے پروائی سے کہا۔

"جی خانم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا فرمایا آپ نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے پاس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں نہیں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔" وزیر گھبرا گیا۔

"وزیرِ سلطنت۔ اب یہ ہیرا آپ کی ملکیت ہے۔" خانزادہ نے بغیر کسی جھجک کے کہا:

"اس قسم کے چار ہیرے شاہِ ایران نے ہمارے امیر کو تحفے میں بھیجے تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے

جو میں آیا اور اب آپ کی نذر ہے۔ میں نہ تو اس کی قیمت طلب کروں گی اور نہ ہی اس کے صلے میں آپ پر کوئی ذمہ داری ڈالوں گی۔ یہ میری طرف سے دوستی کا ایک تحفہ ہے اور اس خدمت کا انعام ہے جو اس وقت تک آپ میرے لیے انجام دیتے رہے ہیں۔ مجھے آپ کے خلوص اور تعاون کے سوا اور کسی چیز کی خواہش نہیں۔"

یوں خانزادہ نے بڑی ہوشیاری سے وزیرِ سلطنت کے خلوص اور تعاون کا سودا کرلیا جس میں اب تک وہ ناکام رہی تھی۔ وزیرِ سلطنت نے اس کی خدمت میں تو کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن جب بھی خانزادہ اسے میران شاہ سے رابطے کے طور پر استعمال کرنے کی بات کرتی تھی، وہ کسی نہ کسی بہانے ٹال جاتا تھا۔

"مہان خانم۔" وزیر انتہائی عاجزی سے بولا:

"میں آپ کے اس گراں قدر عطیے کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ یہ آپ کی کرم نوازی ہے کہ آپ نے اس ناچیز کو اس عزت افزائی کے قابل سمجھا۔"

خانزادہ نے اس وقت وزیرِ سلطنت سے کوئی سنجیدہ بات کہنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے کچھ وقت دینا چاہتی تھی تاکہ وزیر کو پورا اطمینان ہوجائے کہ ہیرا واقعی اسے بخش دیا گیا ہے۔ خانزادہ نے دراصل اس کی قیمت لگائی تھی اور وزیرِ سلطنت بغیر کچھ کہے اس کا غلام بن گیا تھا۔

خانزادہ کو بچپن ہی سے ہیرے جواہرات سے دلچسپی تھی۔ وہ والیِ خوارزم حسین صوفی کی بھتیجی تھی، حسین صوفی لاولد تھا اس لیے اس نے خانزادہ کو گود لے لیا تھا۔ خوارزم کے خزانے میں کئی بیش قیمت ہیرے تھے۔ خانزادہ انہیں اپنے گھر لے آئی تھی۔ پھر جب اس کی شادی امیر تیمور کے بڑے بیٹے جہانگیر سے ہوئی تب بھی اسے دونوں طرف سے ہیرے تحائف اور نذر میں ملے تھے۔ تیمور، خانزادہ سے بہت محبت کرتا تھا بلکہ اس کے بیوہ ہونے کے بعد تو اور زیادہ مہربان ہوگیا تھا۔ وہ جب بھی کسی مہم سے واپس آتا تو مالِ غنیمت میں سے خانزادہ کو حصہ دیتا۔ خانزادہ کے پاس اس طرح کے بہت سے ہیرے اکٹھے ہوگئے تھے جن میں سے وہ چند ہیرے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

ہیرا دینے کا یہ اثر ہوا کہ اب وزیرِ سلطنت ہر وقت اس کوشش میں رہنے لگا کہ خانزادہ اسے کوئی خدمت سونپے جسے پورا کرکے وہ کچھ تو اس بوجھ کو ہلکا کرسکے۔

خانزادہ اس کی بے چینی محسوس کرتی۔ دل میں خوش ہوتی لیکن زبان بند رکھتی۔ ایک دن وزیرِ سلطنت نے خود ہی کہا:

"مہان خانم! میں کس قدر بدقسمت ہوں کہ آپ کی کوئی خدمت نہ کرسکا۔ حالانکہ آپ مجھ پر اس قدر مہربان ہیں کہ عمر بھر آپ کی خدمت کرنے کے بعد بھی میں حقِ نمک ادا نہیں کرسکتا۔"

"آپ ایک دوست اور وفادار انسان ہیں۔" خانزادہ نے بھی آج اپنا مطلب بیان کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا:

"میراں شاہ نے آپ کو وزیرِ سلطنت منتخب کر کے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو یہی کرتی۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ جب بھی کہیں کی ملکہ یا والیِ ریاست بنی تو آپ کو اپنا وزیر مقرر کروں گی"۔

خانزادہ اپنی گفتگو میں میراں شاہ، تیمور اور امیروں اور وزیروں کا ذکر بڑی بے تکلفی سے کر رہی تھی جس سے اس بات کی تصدیق تو ہو گئی تھی کہ وہ واقعی شہزادی اور میراں شاہ کی رشتے دار ہے لیکن اس سے رشتے کے بارے میں اس نے اب تک زبان نہیں کھولی تھی۔ یہ بات وزیرِ سلطنت کو پریشان کرتی رہتی تھی کیونکہ جب تک اس کی شخصیت کی تحقیق نہ ہو جاتی، یہ پتہ چلنا مشکل تھا کہ وہ تبریز کس مقصد کے تحت آئی ہے اور شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ لوگوں پر خود کو ظاہر کیوں نہیں کرتی۔

"مہمان خانم!" وزیر آج جیسے خانزادہ کی خدمت کا بیڑا اٹھا کر ہی آیا تھا افسردگی سے بولا:

"افسوس۔ آپ مجھے بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی کوئی خدمت کرنے کا موقع نہیں دیتیں۔ آپ نے اپنی نوازش کا تو اظہار کر دیا لیکن مجھے اپنی خدمات بجا لانے کا کوئی مناسب موقع ابھی تک نہیں ملا"۔

خانزادہ نے اب زیادہ انتظار بہتر نہ خیال کیا:

"اچھا۔ آپ صرف ایک معمولی سا کام کر دیجئے۔ مجھے تبریز میں کسی ایسے امیر کا پتہ معلوم کر دیجیے جو میراں شاہ کے ساتھ اس وقت آیا تھا جب امیر نے میراں شاہ کو خوارزم کی حکومت عطا کی تھی۔ امیر نے چھ امیر میراں شاہ کے ساتھ بھیجے تھے ان میں سے ایک نہ ایک تبریز میں ضرور موجود ہوگا۔ یہ کام بھی میں اس لیے آپ کے سپرد کر رہی ہوں کہ آپ بضد ہیں ورنہ یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں"۔

"آپ اطمینان رکھیے مہمان خانم"۔ وزیر نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا:

"میں اس امیر کا نام اور پتہ ضرور معلوم کرلوں گا۔ بشرطیکہ وہ تبریز میں رہتا ہو"۔

"مگر اس بات کا خیال رہے اسے میرے بارے میں کوئی علم نہ ہو سکے"۔ خانزادہ نے اسے تاکید کی:

"میں فی الحال اس پر اپنی شخصیت ظاہر نہیں کرنا چاہتی"۔

وزیر سلام کر کے چل دیا لیکن دروازے پر پہنچ کر کچھ خیال آیا اور واپس آ کر خانزادہ کے سامنے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

"آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں وزیرِ سلطنت"۔ خانزادہ نے پوچھا۔

"آپ ضرور کوئی بڑی شخصیت ہیں"۔ وزیر نے سادگی سے کہا:

"آپ بتا چکی ہیں کہ آپ سلطانِ معظم کی رشتے دار ہیں۔ میں آپ کے نام سے بھی آگاہ ہوں لیکن آپ کون ہیں؟ عالی مقام سے آپ کا کیا رشتہ اور کیا تعلق ہے یہ آپ نے اب تک نہیں بتایا۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟"

خانزادہ مذبذب میں گرفتار ہو گئی۔ انکار کی صورت میں وزیر کی ہمدردیوں سے محروم ہونے کا امکان تھا شاید اقرار ہی صحیح راستہ تھا۔ اس طرح وہ وزیر کا پورا اعتماد حاصل کر سکتی تھی۔

"وزیرِ سلطنت!" خانزادہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی:

"میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی۔ میں بتاتی ہوں کہ میں کون ہوں اور میراں شاہ کا نام اس قدر بے تکلفی سے کیوں لیتی ہوں لیکن میں آپ کو جو کچھ بتاؤں اس کا اظہار آپ کسی سے اس وقت تک نہ کریں جب تک میں اجازت نہ دوں"۔

"میں وعدہ کرتا ہوں بلکہ قسم کھاتا ہوں مہمان خانم!"

خانزادہ نے بتانا شروع کیا:

"اگر آپ کو تیموری خاندان کی تاریخ سے دلچسپی ہے تو آپ نے سنا ہو گا کہ ہمارے امیر کے چار بیٹے تخت و تاج کے وارث ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے شہزادہ جہانگیر تھے جنہیں ولی عہد مقرر کر دیا گیا تھا لیکن وہ عنفوانِ شباب ہی میں انتقال کر گئے۔ دوسرے بیٹے عمر شیخ تھے جو ایک جنگ میں زخمی ہو کر مر گئے۔ تیسرا بیٹا یہی میراں شاہ ہے جسے آپ سلطان ابن سلطان کہتے ہیں حالانکہ امیر نے اب تک خود سلطان کا لقب اپنے نام کے ساتھ لگایا ہی نہیں۔ چوتھا وارثِ سلطنت شہزادہ شاہ رخ ہے جو امیر کی دوسری بیوی سرائے خانم کے بطن سے ہے۔ شہزادے جہانگیر اور شہزادے عمر شیخ کی موت کے بعد اب میراں شاہ ہی سلطنتِ تیمور کے ولی عہد اور وارث ہیں۔ سمجھ میں آیا آپ کی؟"

"بالکل سمجھ گیا مہمان خانم"۔ وزیر جلدی سے بولا:

"میں نے شاہی خاندان کی یہ تفصیل پہلے بھی سنی ہے لیکن آپ نے اپنے بارے میں کچھ ارشاد نہیں فرمایا آپ کا تعلق اس خاندان سے کس واسطے سے ہے۔ میں تو آپ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں مہمان خانم!"

"آپ نے خوارزم کے والی حسین صوفی کا نام ضرور سنا ہو گا؟" خانزادہ نے سوالیہ نظروں سے وزیرِ سلطنت کو دیکھا۔

"کیوں نہیں خانم"۔ وزیر نے اثبات میں سر ہلایا:

"صوفی خاندان خوارزم کا پرانا حاکم تھا۔ پھر ہمارے سلطان کے والدِ محترم صاحبقراں امیر تیمور نے خوارزم فتح کر کے سلطنتِ تیموری میں شامل کر لیا"۔

"آپ نے درست فرمایا"۔ خانزادہ اطمینان سے بولی:

"میں اسی حکمران خاندان کی شہزادی خانزادہ ہوں۔ میں نے خوبرو شہزادہ جہانگیر کو دیکھا تھا اور پھر جب جہانگیر کا رشتہ میرے لیے آیا تو میں انکار نہ کر سکی۔ اس طرح میں ولی عہد کی بیوی بن کر سمرقند چلی گئی لیکن تقدیر نے میرا ساتھ نہ دیا اور چند برسوں بعد ہی بیوہ ہو گئی۔"

"اوہ ۔۔۔۔ تو آپ ولی عہد بہادر کی بیوی ہیں۔" وزیر نے احترام کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیوی نہیں بیوہ ہوں۔" خانزادہ نے ایک آہ بھری۔

"کاش شہزادے جہانگیر زندہ رہتے تو میں بھی آج کسی ملک کی ملکہ ہوتی۔"

"محترمہ خانم ۔۔۔۔ آپ میرے لیے اب بھی ملکہ ہیں۔" وزیرِ سلطنت نے نہایت خلوص سے کہا۔

"میرے لیے یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ آج میں صاحبقران امیر تیمور کی بہو سے ہم کلام ہوں۔ میں اس اعتماد کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں اور آپ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کا عہد کرتا ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ میں بہت جلد آپ کا کام انجام دے کر سرخرو ہوں گا۔"

وزیرِ سلطنت کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں تھا۔ اس نے اپنے محل پہنچتے ہی کوتوالِ شہر کو بلوایا۔ وہ حکم پا کر گھبرا گیا۔ کسی ملک کے افسرانِ بالا، حکومتی مشین کے کل پرزے سمجھے جاتے ہیں اور جب وہ سب مل کر چلتے ہیں تو حکومت کی گاڑی چلتی ہیں لیکن تبریز کی حکومت کے کسی ایک افسر کو دوسرے سے کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ البتہ چھوٹے بڑے کا تو لحاظ تھا اور ہر چھوٹا اپنے بڑے افسر سے بے انتہا ڈرتا تھا کیونکہ ہر ایک کو اپنے ماتحت پر پورا اختیار تھا اور وہ اسے کسی وقت بھی برخاست کر سکتا تھا جس کی کوئی داد فریاد نہ تھی۔

وزیرِ سلطنت کے ہرکارے کو دیکھتے ہی کوتوالِ شہر کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا:

"کیوں جناب! ہمارے وزیرِ سلطنت بہادر کے مزاج تو بخیر ہیں۔"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" ہرکارے نے کھردرے انداز میں کہا۔

"میرا مطلب ہے جس وقت میری طلبی کا حکم دیا گیا اس وقت ان کے چہرے پر جمال تھا یا جلال؟" کوتوال نے بڑی منت سے دوبارہ دریافت کیا۔

"مجھے کیا پتہ!" ہرکارہ یوں بولا جیسے کہیں سے لڑ کر آ رہا ہو۔

"مجھے تو وزیر کے غلام نے محل سے آکر بتایا تھا کہ کوتوال سے کہو کہ وزارت میں فوراً طلبی ہے۔"

"طلبی ۔۔۔۔!" کوتوال سہم گیا مگر اب مزید کچھ پوچھتے ہوئے بھی گھبرا رہا تھا۔

"جلدی کرو کوتوال ۔۔۔۔ مجھے اور بھی کام کرنا ہیں۔" ہرکارے نے یہ کہہ کر اس کی زبان بالکل ہی بند کر دی۔

کوتوال لرزاں و ترساں وزیرِ سلطنت کے محل پر پہنچا۔ وہاں سات کوتوال اور پہلے سے پہنچے ہوئے تھے۔ تبریز دس لاکھ کی آبادی کا شہر تھا۔ اسے آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر حصے پر ایک کوتوال مقرر تھا۔ اس وقت وزیرِ سلطنت نے اپنے غلام کو حکم دیا تھا کہ کوتوالِ شہر کو بلا لائے تو غلام کی یہ ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ وزیر سے یہ پوچھ سکے کہ کس علاقے کے کوتوال کو بلایا جائے۔ وزیر کے تمام غلام اس سے خائف رہتے تھے۔ وزیر نے کئی غلاموں کو ذرا ذرا سی بات پر نکال باہر کیا تھا۔ ایک غلام کو تو اس بات پر نکالا گیا تھا کہ اس غریب نے وزیر کو افسردہ دیکھ کر بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر پوچھ لیا تھا:

"آج حضور کے مزاجِ گرامی کچھ ناساز معلوم ہوتے ہیں۔"

وزیرِ سلطنت کو غلام کی یہ مؤدبانہ مزاج پرسی اتنی گراں گزری کہ اسے گستاخی تصور کرتے ہوئے غلام کی برخاستگی کا حکم صادر کر دیا۔ پھر بھلا غلام کیوں دریافت کرتا کہ حضور وزیرِ سلطنت کس علاقے کے کوتوال کو طلب کر رہے ہیں۔

اسی طرح جب غلام نے باہر جا کر پیادوں کے داروغہ کو کوتوالِ شہر کے بلانے کا حکم دیا تو اس کی ہمت نہ ہوئی کہ محل کے غلام سے پوچھ سکے کہ اے بندۂ خدا! یہ تو بتاتا جا کہ آٹھ کوتوالوں میں سے کس کو حاضرِ خدمت کیا جائے؟

غلام اپنی بلا داروغہ کے سر منڈھ کر واپس آگیا اور داروغہ کے لیے یہی راستہ چھوڑ گیا کہ وہ بیک وقت تمام کوتوالوں کو طلب کرے اور سب کو وزیرِ سلطنت کی خدمت میں ایک ساتھ پیش کر دے۔

وزیرِ سلطنت کو اطلاع دی گئی کہ کوتوال آگئے ہیں۔ وزیر کو معاً خیال آیا کہ اس نے کسی کوتوال کا نام نہ بتایا تھا اور نہ ہی علاقے کی نشاندہی کی تھی۔ پتہ نہیں یہ کس کوتوال کو بلا لایا ہے۔ اگر اس سے پتہ نہ چلا تو دوسرے کو بلانا پڑے گا۔ اس نے غلام سے پوچھا:

"تو کس کوتوال کو لایا ہے۔ میں نے کسی علاقے کا نام تو لیا نہیں تھا۔ تجھے پوچھنا چاہیے تھا کہ کس کوتوال کو حاضر کیا جائے؟"

غلام کی اس میں کوئی غلطی نہ تھی لیکن خوف کے مارے اسے پسینہ آگیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ آج ملازمت کا

خاتمہ ہو گیا کیونکہ اس قسم کے معاملات میں وزیر سارا الزام غلام کے سر ڈال کر اسے نکال دیا کرتا تھا۔ ۔ ۔ بچہ نے حوصلہ کیا اور ڈرتے ڈرتے کہا:

"حضور والا نے نام تو کسی کا نہیں لیا تھا اس لیے میں نے تمام کوتوالوں کو بلا لیا ہے۔ حضور کو جس کام ہو اسے حاضر کیا جائے۔"

"شاباش۔ تو بہت عقلمند ہے۔" وزیر خوش ہو گیا:

"آج سے تجھے تمام غلاموں کا داروغہ بنایا جاتا ہے۔ جاؤ اور سب کو باری باری ہمارے سامنے غلام خوشی خوشی باہر بھاگا۔ ایک تو اس کی ملازمت بچی۔ دوسرے مفت میں اس کی ترقی ہو گئی۔ سب کوتوال بھیگی بلی بنے اپنی جان کی خیر منا رہے تھے۔ غلام کو خوش خوش آتے دیکھ کر انہیں ذرا اطمینان ہوا۔ غلام نے کوتوالوں پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی اور ایک کوتوال کو اشارے سے قریب بلایا۔ کوتوال سہما ہوا اس کے پاس آ گیا۔

"اطمینان سے اندر جاؤ۔ وزیر سلطنت بہت خوش ہیں۔ آج ترقی کا دن ہے۔" غلام نے اسے نوید دی۔ کوتوال اسے متشکر نظروں سے دیکھتا ہوا وزیر کے کمرے میں چلا گیا۔

وزیر کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے کوتوال کے داخل ہونے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ حالانکہ کوتوال بالکل اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

ذرا دیر بعد خود ہی وزیر نے چونک کر کوتوال کو دیکھا اور سختی سے بولا:

"کون ہو تم؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اندر کیوں آئے ہو۔ کس نے آنے دیا تمہیں؟"

کوتوال حواس باختہ ہو گیا:

"وہ حضور نے ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں غلام نے ۔ ۔ ۔ میں کوتوال شہر ۔ ۔ ۔ ۔ شمال مشرقی علاقہ!" کوتوال اس سے اٹک اٹک کر چند بے ربط الفاظ کہہ سکا۔

"شہر کوتوال ۔ ۔ ۔ ہاں ٹھیک ہے۔" وزیر کو یاد آ گیا:

"میری بات غور سے سنو اور ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے علاقے میں کوئی ایسا تیموری موجود ہے جو سلطانِ معظم کے ساتھ یہاں آیا ہو؟"

کوتوال نے اطمینان کا سانس لیا پھر فخر سے بولا:

"وزیرِ سلطنت کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے علاقے میں صرف ایک پرانا تیموری امیر رہتا ہے۔ نام قتلات خان ہے۔ قتلات خان اُن امیروں میں سے ایک ہے جو صاحبقرآن امیر تیمور نے شہر سبز سے سلطان

عالی مقام حضرت میراں شاہ ابنِ سلطان کے ساتھ بھیجے تھے تاکہ وہ ملکی معاملات میں انہیں مشورہ دیں۔ یہ امیر حضرت سلطان کے ساتھ خوارزم کے دارالسلطنت اورگاؤں میں کافی عرصہ تک رہ چکا ہے۔ پھر جب حضور سلطان کو تبریز کی ولایت عطا ہوئی تو قتلات خان ان کے ساتھ تبریز آ گیا۔ قتلات خان جلائری قبیلے کا تاتاری سردار ہے۔ اس کے باپ کا نام ۔ ۔ ۔ ۔؟

"چپ رہو۔ اس کا شجرہ نہیں چاہیے۔" وزیر بگڑ کر بولا:

"وہ کس محلے میں رہتا ہے۔ صحیح پتہ کیا ہے؟"

کوتوال نے قتلات خان کے محلے کا نام اور اس کے گھر کا جائے وقوع کا تفصیل سے نقشہ کھینچا۔ پھر آہستہ سے کہا:

"وزیرِ سلطنت کا حکم ہو تو اسے ابھی گردن سے پکڑ کر حاضر کروں یا پھر گردن اتار کر لے آؤں!"

"نہیں۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاؤ اور دوسرے کوتوالوں کو بھی لے جاؤ۔ لیکن خبردار کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم سے کسی کا پتہ پوچھا گیا ہے۔ اگر تم نے رازداری نہ برتی تو پھر ۔ ۔ ۔ ۔" وزیر نے جملہ ادھورا چھوڑ کر معاملے کی اہمیت اور بڑھا دی۔

کوتوال اپنی خیر مناتا ہوا واپس آیا اور باہر آ کر اس نے حکم کے مطابق سب کوتوالوں کو واپس بھیج دیا۔

امیر قتلات خان کی حویلی بھی کسی چھوٹے بادشاہ سے کم شاندار نہ تھی چنانچہ آج تبریز کے بڑے بازار سے گزر کر آئی تھی۔ بازار میں بھیڑ بھاڑ اور سجی ہوئی دکانیں دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ سمرقند کو امیر نے اس قدر سجایا تھا کہ وہاں ہر قسم کے سامان سے دکانیں بھری تھیں لیکن تبریز کے بازاروں کی شان ہی عجیب تھی۔ ایک بازار الگ الگ بازار تھے۔ پارچہ جات کا بازار، سونے چاندی کا بازار، جواہرات کا بازار دیکھ کر تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ایک بازار اسے مینا بازار کے طرز کا دکھائی دیا۔ اس میں خواتین کے سنگار کا سامان فروخت ہوتا تھا۔ وہاں عورتوں کا بے پناہ ہجوم تھا اور ہر عورت سامان خریدنے پر بے تحاشا رقم خرچ کر رہی تھی۔ زادہ کو تمام راستے کوئی عورت یا مرد بھیک مانگتا نظر نہ آیا۔ وہاں تو سب ہی امیر کبیر نظر آتے تھے۔ مکانات عام طور پر دو منزلہ اور سہ منزلہ تھے۔ سامنے کی دیواروں پر نقش و نگار بنے تھے۔ اوپر سنگی برجیاں اور جھروکے تھے۔

امیر قلات خان کی حویلی کا صدر دروازہ ایک جھلملاتے کپڑوں والے دربان نے کھولا۔ اس نے خانزادہ کا گھوڑا ایک طرف باندھ دیا اور اسے مہمان خانے میں بٹھا کر قلات خان کو اطلاع دینے اندر چلا گیا۔

خانزادہ مہمان خانے کی ہر چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ خوارزم کی شہزادی اور ولی عہدِ تا[illegible] کی بیوہ تھی۔ شہر سبز اور سمرقند کے محلات اس کے دیکھے ہوئے تھے۔ امیر قلات کا یہ مہمان خانہ ان محلات سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ہر چیز سے امارت کا اظہار ہو رہا تھا۔

امیر قلات خان قہوہ کی پیالی لیے مہمان خانے میں داخل ہوا۔ خانزادہ اس کے استقبال کے لیے کھڑی نہیں ہوئی اور بیٹھے بیٹھے پُر وقار لہجے میں کہا:

"میں تاتاری امیر قلات خان کو سلام پیش کرتی ہوں۔"

"مرحبا.... خوش آمدید خانم...." قلات خان کو شاید خانزادہ کا اٹھ کر سلام نہ کرنا گوارا نہ ہوا۔ اس نے خشک لہجے میں کہا:

"میں خانم کی کیا خدمت کر سکتا ہوں.... اگر خانم یہ امید لے کر آئی ہیں کہ میں سلطان ابنِ سلطان سے ان کی کسی معاملے میں سفارش کروں تو مجھے معذور سمجھا جائے۔ میں نے دربارِ سلطانی سے تقریباً اپنا تعلق ختم کر لیا ہے۔"

"قلات خان!" خانزادہ کا لہجہ سخت تھا:

"میں نے تمہیں تاتاری امیر کے معزز الفاظ سے مخاطب کیا لیکن معلوم ہوتا ہے تم نے تاتاری شمشیر اور شہ سواری چھوڑ کر ایرانی عشرت پسندی اختیار کر لی ہے۔ تمہیں تاتاری امیر کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔"

قلات خان نے بڑی حیرت سے خانزادہ کو دیکھا۔ خانزادہ کا نصف چہرہ نقاب میں پوشیدہ تھا اس لیے وہ اس کے صحیح تاثرات کا اندازہ نہ کر سکا لیکن خانزادہ کی تخاطب اور اس سے زیادہ تیز لہجے نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس کی مخاطب کوئی معمولی خاتون نہیں ہو سکتی۔

قلات خان دھیمے لہجے میں بولا:

"خانم.... آپ مہمان کی حیثیت سے تشریف لائی ہیں۔ آپ کا تلخ و ترش لہجہ اگرچہ قابلِ برداشت نہیں لیکن اس سے درگزر کرتے ہوئے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میں نے خانم کو خوش آمدید کہنے کے علاوہ اور کون سی گستاخی کی ہے جس کی بنا پر آپ مجھے تاتاری امیروں کے دائرے سے خارج کرنے پر آمادہ ہو گئی ہیں۔"

"قلات خان۔ اس سے بڑھ کر اور کیا گستاخی ہو گی کہ تم ولایتِ تبریز کے گورنر اور رعایا کو سلطان ابنِ سلطان کہہ رہے ہو۔" خانزادہ کو جلال آ گیا:

"[illegible]میران شاہ، صاحبقران امیر تیمور کا بیٹا ہے۔ تم اسے سلطان کہہ کر نہ صرف لفظ سلطان کی توہین کر رہے ہو بلکہ [illegible]شاہ کو ابنِ سلطان کہنا خود صاحبقران امیر تیمور کی توہین ہے۔ امیر نے اب تک سلطان کا لقب اختیار نہیں [illegible]۔ میران شاہ کا دماغ تم جیسے خوشامدیوں اور ابن الوقت امیروں نے خراب کیا ہے۔"

قلات خان کو اپنے مخاطب کی جرأت اور دلیری پر بڑا تعجب ہوا۔ اس نے جو باتیں کیں اور الزام لگائے [illegible] ذرا بھی شبہ نہ تھا لیکن ان کا برملا اظہار ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے سہمی سہمی آواز میں [illegible]ہے پوچھا:

"محترمہ خانم! آپ نے جو کچھ فرمایا اس کی تائید یا تردید میں بعد میں کروں گا لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ نے [illegible]لفن کیوں باندھا ہے۔ کیا آپ کو اپنی زندگی عزیز نہیں۔ موت کو خواہ مخواہ دعوت دینا نہ تو بہادری ہے اور [illegible]ل مندی.... تبریز کی ولایت میں سلطان کے خلاف زبان کھولنے والے کی زبان تراشی اور گردن جدا [illegible] جاتی ہے۔"

"تمہیں اپنی بہادری پر بڑا ناز ہے قلات خان۔"

خانزادہ نے اپنے نقاب پر ہاتھ ڈالا اور اسے نوچ کر دور پھینک دیا:

"جرأت ہے تو تلوار اٹھاؤ۔ تمہیں ابن الوقت کہنے والی میں ہوں، خانزادہ۔ صاحبقران امیر تیمور کے [illegible]لی عہد شہزادے جہانگیر کی بیوہ.... خوارزم کی شہزادی خانزادہ!"

قلات خان کے ہاتھ سے قہوہ کی پیالی چھوٹ گئی۔ اس نے سر جھکا کر فوراً ہاتھ باندھ لیے:

"محترمہ شہزادی مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھ سے بہت گستاخی ہوئی۔ میں آپ کو بالکل نہیں پہچان سکا۔"

"اب تو پہچان لیا کہ ہم کون ہیں؟" خانزادہ نے فوراً شاہانہ تکلم اختیار کیا۔

[illegible]لے اور گنج کے ترکمان بادشاہ کی بیٹی۔ آپ کو کون نہیں پہچانے گا۔" بوڑھے قلات خان نے کھڑکی سے [illegible] ہوئے کہا:

"[illegible]آپ کے ورودِ سمرقند کی تقریب کو کون بھول سکتا ہے۔ وہ کتنا مبارک دن تھا جب آپ دلہن بنی ہوئی [illegible]پر محمل میں بیٹھی سمرقند کے مغربی دروازے سے داخل ہوئی تھیں۔ دروازے کا خیابان خالی نہ [illegible]تھا۔ امیرِ محترم کی لشکر گاہ میں اطلس و کمخواب کا فرش بچھایا گیا تھا۔ امیر، وزیر، تواچی اور علمبردار [illegible]والے نئے ساز سے سجے ہوئے گھڑ سوار آپ کے استقبال کو نکلے تھے۔ آپ کے چہرۂ مبارک پر [illegible] دائیں بائیں شہسوار کس شان سے چل رہے تھے۔ پیچھے گھوڑوں اور اونٹوں کی بے شمار قطاریں [illegible]پ کا جہیز رکھا ہوا تھا۔"

قلات خان سانس لینے کے لیے رکا تو خانزادہ ایک آہ بھر کر بولی:

"خان، تمہیں سب کچھ یاد ہے؟"

"خوارزم کی شہزادی! وہ دن اور وہ رات بھلا بھولنے کی چیز ہے!" قلات خان نے جواب میں بڑے خلوص سے کہا:

"ایک ایک منظر میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ رات ہوتے ہی درختوں میں لٹکی ہوئی قندیلیں ایک دم جگمگا اٹھی تھیں۔ اس رات تو ہوا بھی خرامِ ناز کا مظاہرہ کر رہی تھی اور قندیلوں میں تھرتھراتی روشنی رنگ برنگی پھولوں کی طرح جھوم رہی تھی۔ تمام خیمے صندل کی چوبوں پر استادہ تھے اور صندل کی بھینی بھینی خوشبو سے پوری فضا مہک اٹھی تھی۔"

"بس بس خان۔ . . . . خدا کے لیے ان شب و روز کی یاد نہ دلاؤ۔" خانزادہ کی آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی:

"وقت واپس نہیں آیا کرتا۔ ایک وہ دن تھا کہ ہماری آواز سے محلسرا تھرتھرا اٹھتی تھی اور ہمارے قہقہوں سے در و دیوار لرز جاتے تھے اور اب یہ حال ہے کہ ہماری باتوں پر کوئی دھیان نہیں دھرتا۔ ہمیں اطلاع دی گئی تھی کہ میران شاہ نے غلط راستہ اختیار کر لیا ہے۔ وہ ولی عہد سلطنت ہے لیکن امورِ سلطنت میں دلچسپی لینے کے بجائے اس نے خود کو عیش و عشرت کے سمندر میں غرق کر دیا ہے۔ ہمارا دل کڑھنے لگا اور ہم یہاں دریافتِ حال کے لیے آئے ہیں۔ افسوس کہ جو سنا تھا حالات اس سے زیادہ بدتر دیکھے۔ امیر محترم نے تم جیسے وفاداروں کو شہزادے کے ساتھ اس لیے روانہ کیا تھا کہ وہ راستے سے بھٹکنے نہ پائے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رہبر اور راہنما خود بھی اسی رنگ میں رنگے گئے۔"

"شہزادی عالیہ آپ درست فرما رہی ہیں۔" قلات خان نے اعتراف کیا۔

"ہم چھ امیر شہزادے کے ساتھ آئے تھے۔ شہزادے بہادر جب تک اور گنج میں رہے انہوں نے اعتدال سے قدم نہیں بڑھایا لیکن برا ہو ان نااہل ندیموں اور نالائق مصاحبوں کا جنہیں امیر عالی مقام شہزادے کی دل بستگی کے لیے تبریز بھیج دیا ہے۔ ان میں زیادہ تعداد شاعروں کی ہے۔ کچھ اپنے آپ کو انشا پرداز کہتے ہیں۔ بعض رقص و موسیقی میں باکمال ہونے کے دعوے دار ہیں۔ انہوں نے شاہی دربار کا رنگ بگاڑ دیا ہے۔ شہزادے نے پرانے ملازموں کو برخاست کر کے ان مسخروں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا ہے۔ باورچی رقاص ہے تو چوبدار انشا پرداز۔ شاعروں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ صفائی والا بھی شعر کہنے لگا ہے۔ اندر رقص و سرود کی محفل تو باہر شعر و شاعری کے اکھاڑے جمتے ہیں۔ جب

تھاپ نہ پڑے مورچھل جھلنے والے کے ہاتھ کو جنبش نہیں ہوتی۔"

"امیروں کا بھی تو کوئی فرض تھا۔ انہوں نے کیا کیا؟" خانزادہ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"ہم نے کوشش کی شہزادی عالیہ"۔ قلات خان بڑے دکھ سے بولا:

"مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ مجبور ہو کر ہم نے دربار میں جانا چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔"

"امیروں کو تو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ اگر شہزادہ غلط راہ پر چلے تو اسے سختی سے منع کیا جائے" خانزادہ نے بات پر زور دے کر کہا:

"سختی کرنے سے امیر ناراض تو نہ ہوتے۔"

"شہزادی عالیہ۔ شہزادے، صاحبقران امیر تیمور کے بیٹے ہیں۔" قلات خان نے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ کہا:

"امیر کے فرزند کا حکم ہم تاتاریوں کے لیے اٹل قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر بھلا ہم انہیں کس طرح ٹوک سکتے ہیں۔"

"قلات خان! یہ بات تو تیموری حکومت کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔" خانزادہ نے متانت سے کہا:

"شہزادے کو ٹوکنا ہی پڑے گا۔ تاتاری لشکر اور عوام کسی نااہل کو اپنا ولی عہد تسلیم کرنے پر کس طرح آمادہ ہو سکتے ہیں؟"

"شہزادی عالیہ!" قلات خان نے تعجب سے خانزادہ کو دیکھا:

"آپ امیر کے بیٹے کو نااہل کہہ رہی ہیں۔ کس میں ہمت ہے کہ ان کے معاملات میں دخل دے سکے؟"

"اہل اور نااہل تو انسان اپنے اعمال سے ہوتا ہے قلات خان۔" خانزادہ استقلال سے بولی:

"اگر صاحبقران کے امیر عقیدت کا نقاب ڈال کر بزدلی کا مظاہرہ کرنے لگے تو یہ فرض ہمیں ادا کرنا ہوگا۔ ہم بھرے دربار میں میران شاہ کو نااہل ثابت کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں ثبوت کی ضرورت ہو گی اور اس کا ثبوت تبریز والے ہی پیش کر سکتے ہیں۔"

قلات خان کی سمجھ میں خانزادہ کی بات آ تو گئی لیکن وہ جواب دیتے ہچکچا رہا تھا۔ خانزادہ کی نظریں قلات خان کے چہرے پر لگی تھیں اور وہ جواب کے لیے بےچینی سے انتظار کر رہی تھی۔ جب قلات خان کی خاموشی طویل ہو گئی تو اس نے بات کا رخ بدل کر کہا:

"اگر تبریز کے امیر یہ سمجھتے ہیں کہ میران شاہ کے معاملات میں خاموشی اختیار کی جائے تو پھر ہمیں بھی کوئی

ضرورت نہیں کہ خواہ مخواہ کسی کی مخالفت مول لیں۔ تاتاری حکومت تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے۔ صاحبقران فتوحات تاتاری خون بہاتے رہیں اور کم عقل ولی عہدان کا ساتھ دینے کے بجائے بنبیذ کے چشموں میں ڈوبا رہے، کسی کا نقصان ہے۔ جب تبریز کے امیر اپنی اپنی حویلیوں کے سائے میں پناہ گزیں ہو جائیں تو ایک بیوہ شہزادی کو ضرورت پڑی ہے کہ وہ میران شاہ کی عیاشیوں کا ڈھنڈورا پیٹتی پھرے۔ کاش آج شہزادے جہانگیر زندہ ہوتے . . . . . "

اور اس کے ساتھ ہی خانزادہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ یہ آنسو حقیقی تھے یا مکاری کے . . . . . یہ تو پتہ نہیں لیکن قلات خان ان آنسوؤں اور خانزادہ کی دبی دبی سسکیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

قلات خان نے ادب سے کہا:

"مت روئیے شہزادی! شہزادے جہانگیر ہم میں موجود نہیں لیکن یقین کیجیے کہ میں اور صاحبقران امیر تیمور کے تمام امیر و سردار آپ کا بالکل اسی طرح احترام کرتے ہیں جیسے ہم شہزادے کی زندگی میں ان کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ ہم بزدل اور بے خبر ہیں لیکن اگر ہم سے امیر نے دریافت کیا تو تبریز کے پورے حالات بغیر خوف و خطر کے بیان کر دیں گے۔"

"تمہاری بات سے ہمارا دل خوش ہو گیا قلات خان۔" خانزادہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"ہمارا خیال غلط تھا کہ امیر کے وقار اور جہانگیر کی بیوہ کا احترام کرنے والے امیر اب باقی نہیں رہے۔ ہم اپنا فرض ادا کریں گے . . . . . امید ہے ہمیں تبریز کے امیروں کا تعاون حاصل رہے گا۔"

"مگر شہزادی عالیہ۔" قلات خان نے تشویش سے کہا:

"آپ شہزادے میران شاہ کی بڑی بھاوج ہیں۔ شہزادے کے حالات امیر کے کانوں تک پہنچانے سے پہلے اگر آپ انہیں سمجھائیں تو شاید زیادہ بہتر ہو۔ وہ آپ کی تنبیہ کا برا نہ مانیں گے۔ ممکن ہے آپ کو دیکھ کر انہیں صاحبقران کا غیظ و غضب اور عتاب کا ڈر پیدا ہو جائے اور وہ خود اپنی اصلاح شروع کر دیں۔"

"ہاں قلات خان۔ ہمارا بھی یہی ارادہ ہے۔" خانزادہ کو قلات خان کا جو فوری تعاون حاصل ہوا تھا وہ کھونا نہیں چاہتی تھی لہٰذا اس کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی:

"تمہارا مشورہ نہایت دانشمندانہ ہے۔ ہم خود نہیں چاہتے کہ شہزادے کی شکایات کا ناگوار فرض ہمیں ادا کرنا پڑے۔ یہ تو سب سے آخری قدم ہو گا۔ ہم تمہارے کہنے کے مطابق میران شاہ سے ملاقات کریں گے اور اپنے طور پر کوشش کریں گے کہ یہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ جب یہ ذکر تیموری دربار تک پہنچے گا تو قیامت برپا ہو جائے گی۔"

"میں شکر گزار ہوں شہزادی عالیہ۔" قلات خان خوش ہو گیا:

"قلات خان کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ شہزادی نے اس کی بات پر توجہ فرمائی۔ میں تبریز کے پرانے امیروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کروں گا تاکہ اگر گواہی شہادت کی ضرورت پڑے تو وہ سب بھی شہزادی کا ساتھ دیں۔"

"ہم بھی تمہارے شکر گزار ہیں قلات خان۔" خانزادہ نے اس کی عزت افزائی کے لیے کہا:

"ہمارے لیے یہ بات بہت اطمینان کا باعث ہے کہ پرانے امیر اب بھی شہزادے کی بیوہ کی عزت کرتے ہیں اور اس سے تعاون کے خواہش مند ہیں۔"

قلات خان سے کامیاب ملاقات کے بعد خانزادہ اپنی حویلی واپس ہوئی تو وہ دل میں بہت خوش تھی۔ خانزادہ جب اوگانڈی سے تبریز کی طرف چلی تھی تو اس کے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ کسی طرح میران شاہ کو راستے سے ہٹا کر اپنے بیٹوں شہزادہ پیر محمد اور شہزادہ سلطان محمد کے لیے فضا ہموار کی جائے کیونکہ میران شاہ کی موجودگی میں یہ کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس کے پاس کوئی واضح منصوبہ نہ تھا اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اس سلسلے میں میران شاہ سے ملنے کے بعد ہی کوئی تدبیر کرے گی۔

میران شاہ کسی زمانے میں خانزادہ کے لیے بہت بے چین تھا لیکن اس بات کو کئی سال گزر چکے تھے۔ میران شاہ کو ولایت تبریز سے بے پناہ دولت اور خزانہ ہاتھ آ گیا تھا اور وہ اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ خانزادہ بھی ایک خود دار شہزادی تھی۔ اس نے میران شاہ کو ذرا سی ڈھیل دی تھی تاکہ وقت ضرورت اس سے کام لے سکے لیکن جب میران شاہ کی طرف سے سلسلہ جنبانی نہ ہوئی تو خانزادہ بھی اکڑ گئی . . . . . پھر جب اسے اپنی مانگ میں چاندی کا تار نظر آیا تو وہ گھبرا اٹھی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے فوری طور پر کوئی قدم نہ اٹھایا تو اس کا بیٹوں کو ولی عہد بنانے کا خواب کبھی پورا نہ ہو گا۔ اسی لیے وہ بن بلائے ایک دم تبریز پہنچی تھی لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ میران شاہ اسے نظر انداز کرتا رہا، اس سے ملاقات بھی ناممکن ہے تو اس نے دوسرا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں اس نے وزیر کا تعاون حاصل کیا۔ پھر اس کی مدد سے قلات خان تک پہنچی۔

قلات خان سے ملاقات کے دوران ہی اس کے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ

ایک تیر سے دو شکار کرے گی۔ اگر اس نے میراں شاہ کو رام کر لیا تو وہ میراں شاہ سے شادی کر کے ایک بار پھر ولی عہد کی بیوی بن کر تاتاریوں میں اپنا پرانا وقار حاصل کر لے گی۔ اور اگر میراں شاہ نے اسے ٹھکرا دیا تو وہ اس کی تمام حرکتوں سے امیر تیمور کو باخبر کر کے اسے امیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرے گی۔ اس کی امید اسے اس لیے تھی کہ اسے قلات خان اور دوسرے امیروں کا تعاون حاصل ہو گیا تھا جو اس کے بیان کی تصدیق کر سکتے تھے۔

خانزادہ اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی حویلی پہنچی تو اس نے وزیر سلطنت کو اپنا منتظر پایا۔ وزیر نے اسے سلام کیا اور ادب سے پوچھا:

"مہمان خانم شاید آج تبریز کی سیر کو تشریف لے گئی تھیں؟"

"میرے ہی سمجھیے وزیر سلطنت!" خانزادہ خوش دلی سے بولی:

"جس امیر کا مجھے پتہ دیا گیا تھا، میں نے آج اس سے ملاقات کی ہے اور یہ ملاقات میری امید سے زیادہ کامیاب رہی"۔

"کامیاب رہی، قلات خان سے آپ کی ملاقات...." وزیر کو گھبراہٹ پیدا ہوئی:

"آپ نے اس سے میرا ذکر تو نہیں کیا۔ میں غریب آدمی ہوں مہمانِ خانم۔ بال بچے دار ہوں"۔

"آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں"۔ خانزادہ نرمی سے بولی:

"آپ کا ذکر قطعی نہیں ہوا۔ دراصل میں قلات خان سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ یہ امیر میری شادی کے وقت سمرقند میں موجود تھا۔ اس نے میرے شاندار استقبال کا نقشہ کچھ ایسے انداز سے کھینچا کہ تمام پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ مجھے تبریز میں ایسے ہی آدمیوں کے تعاون کی ضرورت ہے"۔

"آپ کو اس کے تعاون کی کیا ضرورت ہے خانم؟" وزیر سلطنت کو تشویش پیدا ہوئی:

"میرے سامنے اس گوشہ نشین امیر کی کیا حیثیت ہے۔ اسے تو دربار میں بھی جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے ایسے تمام امیروں کا وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ وہ آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکے گا"۔

خانزادہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ کامیابی کی خوشی میں خود پر قابو نہ رکھ سکی تھی اور کئی ایسی باتیں اس کے منہ سے نکل گئی تھیں جن کا اظہار اس وقت کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اگر وزیر سلطنت کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ خانزادہ میراں شاہ سے شادی کا ارادہ رکھتی ہے یا اس کی اصلاح کے لیے کوشاں ہے تو اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جا سکتے تھے۔ تبریز کے تمام عمائدین و امراء ایرانی تھے اور ان کی بھلائی اسی میں تھی کہ میراں شاہ خوابِ غفلت سے کبھی بیدار نہ ہو اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔

خانزادہ نے وزیر کا شبہ دور کرنے کے لیے کہا: "وزیر سلطنت! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ آپ کو

ہی کہ تیموری سلطنت کے تمام پرانے امیر یا تو مر گئے ہیں یا جنگ میں مارے جا چکے ہیں۔ میں قلات خان سے اس لیے خوش ہوئی کہ واپسی پر میں قلات خان کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ امیر ایک پرانے وفادار کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے"۔

"کیا آپ واپس تشریف لے جا رہی ہیں؟" اس نے فوراً پوچھا۔

وہ خانزادہ کے تبریز میں قیام سے کچھ زیادہ ہی پریشان تھا کیونکہ اس کے قیام کا مقصد واضح نہیں تھا اور اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ خانزادہ، امیر تیمور کی بہو اور جہانگیر کی بیوہ ہے، اس وقت سے وہ خانزادہ سے خائف رہنے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ بلا جس قدر جلد واپس چلی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

خانزادہ اس کی بے چینی محسوس کر رہی تھی لیکن وہ وزیر سلطنت سے زیادہ چالاک تھی۔ . . . . وہ فوراً سنبھل گئی اور بولی:

"وزیر سلطنت کو علم ہے کہ میں میراں شاہ سے ملاقات کے لیے آئی تھی لیکن شہزادے کا جو عالم ہے اس سے ڈر ہے کہ اگر میں نے میراں شاہ سے ملاقات کی اور اس نے حکومت کے زعم میں کوئی سخت بات کہہ دی تو میرا بڑا دکھ ہو گا۔ میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں میراں شاہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپس چلی جاؤں"۔

"مہمان خانم! آپ نے بڑی عقل مندی کی بات سوچی ہے"۔ وہ اس کی واپسی کی خبر سے دل میں خوش ہوا تھا۔ "ایسے دامن بچانا ہی بہتر ہے"۔

"میرا ارادہ ہے کہ تبریز کی ایک دو دن اور سیر کر لوں۔ پھر واپس چلی جاؤں"۔ خانزادہ نے یہ کہہ کر گفتگو کا ہی خاتمہ کر دیا۔

"نہیں نہیں.... اتنی بھی جلدی کیا ہے؟" وزیر نے رسماً کہا:

"آپ ہماری مہمان ہیں۔ جب تک چاہیں قیام فرمائیں۔ آپ جیسی اعلیٰ خاندان کی ہستیوں کی خدمت کرنے کا بار بار نہیں ملتا"۔

خانزادہ نے اپنی ہنسی کو روکا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ سب دکھاوے کی باتیں ہیں۔ وزیر اب اس کے قیام کے دن بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر خانزادہ زیادہ دن ٹھہری تو ضرور کوئی فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا۔

"وزیر سلطنت!" خانزادہ نرمی سے بولی:

"آپ کے خلوص اور محبت کا شکریہ۔ لیکن اب ہمیں جانا ہی ہو گا۔ اورگنج میں ہمارا انتظار ہو رہا ہو گا"۔

"خیر.... یہ آپ کی مرضی خانم!" وزیر سلطنت کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

"آپ کس دن تشریف لے جانا چاہتی ہیں۔ میں آپ کی واپسی کا انتظام کروں۔"

خانزادہ اس کی مکارانہ گفتگو سے جھلا اٹھی۔ بولی:

"کوئی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ خانزادہ جس خاموشی سے تبریز آئی تھی اسی خاموشی سے واپس جائے گی۔"

وزیر سلطنت کو بھی شاید اپنی احمقانہ گفتگو کا احساس ہو گیا۔ وہ شرمندہ شرمندہ سا اٹھا اور سلام کر کے نکل گیا۔ خانزادہ کو قلات خان سے مل کر جو خوشی ہوئی تھی اس سے زیادہ کوفت اسے وزیر سلطنت سے مل کر ہوئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ بغیر وقت ضائع کیے میراں شاہ سے ملاقات کرے گی اور پھر جو صورت پیدا ہو گی اس کے مطابق کوئی قدم اٹھائے گی۔

O

خانزادہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ میراں شاہ نے رات اور دن کی تفریق ختم کر دی ہے اور وہ ہر وقت عیش کی محفل سجائے رہتا ہے۔

خانزادہ بڑے حوصلے والی عورت تھی لیکن اس نے رات کے وقت میراں شاہ سے ملنا مناسب نہ سمجھا۔ دن صبح ہی سے اس نے سلطانی محل جانے کی تیاری شروع کر دی لیکن یہ احتیاط کی کہ اپنے خاص کمرے کا اندر سے بند کر لیا اور کنیز سے کہہ دیا کہ اس کی طبیعت ناساز ہے اس لیے اسے پریشان نہ کیا جائے۔

وزیر سلطنت حسب معمول صبح کو اسے سلام کرنے آیا تو اسے حویلی میں داخل ہوتے ہی خانزادہ کی ناسازی طبیعت کی اطلاع ملی۔ بتایا گیا مہمان خانم آرام فرما رہی ہیں اور انہوں نے حکم دے رکھا ہے کہ انہیں شام تک پریشان نہ کیا جائے۔

وزیر سلطنت کو محض سلام کی رسم ہی ادا کرنا تھی۔ اسے اب خانزادہ سے مزید کسی انعام کی امید نہ تھی اس لیے واپس چلا گیا اور کہتا گیا کہ وہ شام کو بھی نہیں آئے گا۔ اس طرح وہ شام کے سلام کی زحمت سے بچ گیا۔ ادھر خانزادہ کو اطمینان ہوا کہ وزیر سلطنت اب اس کی تیاری میں مخل نہ ہو گا۔

خانزادہ کو میراں شاہ کے پاس جانے کے لیے کوئی خاص تیاری تو کرنی نہیں تھی۔ دراصل وہ خالی الذہن ہو کر سوچنا چاہتی تھی کہ میراں شاہ کے دربار میں وہ کس طرح گفتگو کرے گی اور میراں شاہ کی نرمی یا سختی کی صورت میں اس کا رویہ کیا ہو گا؟

صبح سے دوپہر تک وہ انہی خیالات میں الجھی اور خود کو اس اہم ملاقات کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتی رہی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا۔ اس آرام سے اس کا ذہن و دماغ بالکل تروتازہ ہو گیا اور اب عملی طور سے اس نے جانے کی تیاری شروع کی۔

اب تک وہ کمرہ بند کیے تنہا پڑی تھی لیکن اب اس نے دو کنیزوں کو اندر بلا لیا تاکہ وہ تیاری میں اس کی مدد کریں۔

خانزادہ کے پاس پہننے کے لیے کوئی ڈھنگ کا جوڑا نہیں تھا۔ وہ تو اور گاؤں سے خالی ہاتھ آئی تھی۔ خیال تھا کہ میراں شاہ کے پاس جا رہی ہے، وہاں لباس کی کیا کمی ہو گی۔ لیکن یہاں پہنچ کر کچھ ایسی افتاد پڑی کہ میراں شاہ سے ملاقات نزاع رہی اس کے محل میں داخلہ تک ناممکن ہو گیا۔ یہ تو وزیر سلطنت کی مہربانی تھی کہ اس نے خانزادہ کے لیے دس بارہ جوڑے بھجوا دیے تھے ورنہ اب تک اس کا اکلوتا لباس تو چیتھڑے ہو گیا ہوتا۔

خانزادہ نے وزیر سلطنت کا بھیجا ہوا ایک جوڑا نکلوایا۔ زیورات میں دو جڑاؤ ہار اس کی صندوقچی میں موجود تھے۔ ہیرے کے آویزے بھی وہ ساتھ لائی تھی۔ لباس اور زیورات کی کمی کو اس نے سنگار سے پورا کیا۔ جب بن ٹھن کر تیار ہوئی تو اس عمر میں بھی اس کے چہرے پر دلہنوں جیسا نکھار تھا۔ کنیزیں اسے دیکھے چلی جا رہی تھیں۔

یہاں تک تو خیر غنیمت تھا لیکن جب خانزادہ نے چرمی پیٹی میں لگا ہوا خنجر کمر میں لگایا اور تلوار ہاتھ میں پکڑی تو کنیزیں حیران رہ گئیں۔

ایک شوخ کنیز بولی:

"مہمان خانم! آپ کا لباس اور سنگار تو دلہنوں جیسا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ خنجر اور تلوار کا پیوند سمجھ میں نہیں آیا۔ دلہن تو محفل کی رونق ہوتی ہے۔ سپاہیانہ انداز سے اس کا اسلحہ لے جانا بے جوڑ سا لگ رہا ہے۔"

"تم نے بھی ٹھیک کہا۔" خانزادہ مسکرائی اور دل کی بات چھپاتے ہوئے بولی:

"اس لباس کے ساتھ خنجر و تلوار واقعی بے جوڑ ہیں لیکن یاد رکھو کہ گھر کی چار دیواری عورت کی محفوظ ترین پناہ گاہ ہے اور جب باہر نکلو تو پھر خود کو عورت کے بجائے مرد بنا کر مردانہ وار نکلو۔ کل ہم اپنے ملک واپس جا رہے ہیں۔ چاہا کہ تبریز کی آخری بار سیر کر لیں۔ باہر کی فضا اور ہوا کسی وقت بدل سکتی ہے۔ یہ خنجر اور تلوار اس کی پیش بندی کے لیے ہیں۔"

"خانم سیر کو تشریف لے جا رہی ہیں تو پھر اس کنیز کو بھی ہمرکابی کی اجازت دیجیے۔" وہ شوخ کنیز بولی۔

خانزادہ کے جواب دینے سے پہلے ہی دوسری کنیز نے دخل دیا:

"ہاں خانم! ہم آپ کے گیسو سنواریں گے، جوتیاں اٹھائیں گے اور...... اور......"

خانزادہ ہنس پڑی۔ وہ انہیں کیسے بتاتی کہ وہ جہاں جا رہی ہے وہاں نہ گیسو سنوارنے کی ضرورت ہو گی اور نہ جوتیاں اٹھانے کا موقع ہو گا۔ وہ تو ایک ایسے معرکے پر جا رہی ہے جس کے انجام سے وہ خود واقف نہیں لیکن اسے اندازہ ضرور ہے کہ وہ معرکہ بہت سخت ہو گا اور وہاں جو کچھ بھی نہ ہو جائے وہ کم ہی ہو گا۔ بہر حال خانزادہ نے دونوں کنیزوں کو اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دے دی۔ ممکن ہے خانزادہ نے کنیزوں کو اپنے ساتھ چلنے کی اس لیے پسند کیا ہو کہ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں اور اگر کبھی گواہی شہادت کی ضرورت پڑی تو شاید یہ کنیزیں اس کی معاونت کر سکیں۔

کنیزیں بھی بھاگ کر اپنا لباس تبدیل کر آئیں۔ ایرانی خواتین ہمیشہ سے خوبصورت ہوتی ہیں۔ کنیزوں نے ذرا بھڑکیلا لباس پہنا تو اور زیادہ اچھی معلوم ہونے لگیں۔

باہر تین گھوڑے تیار تھے۔ کنیزیں پردہ نہ کرتی تھیں لیکن خانزادہ نے چہرے پر دوہرا نقاب ڈالا اور جسم ایک سفید چادر میں سمیٹ کر گھوڑے پر سوار ہوئی۔

جب ان کے گھوڑے تبریز کے بڑے بازار میں پہنچے تو وہاں اس قدر بھیڑ تھی کہ انہیں گزرنا مشکل ہو گیا۔ بازار میں ایرانیوں کے علاوہ ارمنی، نسطوری، یعقوبی اور یہاں کے باشندے بھی بے خطر گھوم پھر رہے تھے۔ تبریز کی دلکشی اس وجہ سے اور بڑھ گئی تھی کہ اس کے اندر ایک دریا بھی بہتا تھا۔ یہ دریا دائیں جانب کی پہاڑیوں سے نکلتا تھا۔ اس کا پانی نہروں اور نالیوں کے ذریعے شہر کے مختلف حصوں میں پہنچایا جاتا تھا۔ حدِ نظر تک صاف ستھری گلیاں نظر آ رہی تھیں جن کے دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ ہر عمارت کے کئی کئی دروازے تھے اور دروازوں کے اندر دکانیں تھیں جن میں کپڑا، ریشم، روئی اور ضروریاتِ زندگی کی دیگر چیزیں بڑے قرینے سے رکھی تھیں۔ عورتوں کا زیادہ ہجوم غازہ اور عطریات کی دکانوں پر تھا۔ جواہرات کی دکانوں پر بھی بہت بھیڑ تھی جہاں خوش پوش غلام خواتین کو ہیرے جواہرات دکھا رہے تھے۔ خانزادہ کو یہاں کی خوبصورت مسجدیں اور نفیس حمام دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ایسے حمام اور مسجدیں تو سمرقند میں بھی نہیں تھے۔

یہ محض خواتین کا لحاظ تھا کہ وہ بغیر کسی حادثے کے اس بازار سے بخیر و خوبی نکل گئیں ورنہ اتنی بھیڑ میں تین گھوڑوں کا ایک ساتھ گزرنا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

بازار سے نکل کر جب خانزادہ نے قصرِ سلطان کا رخ کیا تو دونوں کنیزیں چونکیں۔ یہ صاف ستھری سڑک جس قدر ویران تھی اتنی ہی زیادہ مشہور تھی۔ اس پر آمد و رفت بہت کم تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس پر عام لوگوں کا چلنا پھرنا ممنوع تھا۔ کنیزوں نے اس سڑک کا نام سن رکھا تھا اور جب کبھی وہ اس کے قریب سے گزرتیں تو ان پر سلطان کا

ن طاری ہو جاتا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ اس راستے سے صرف سلطانی امیر و وزیر ہی گزرتے ہیں اور اگر کوئی بھولا کا ادھر پہنچ گیا تو اسے بغاوت کے شبہ میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔

"خانم! آپ کدھر جا رہی ہیں؟" ایک کنیز نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"قصرِ سلطانی"۔ خانزادہ جواب دے کر مسکرانے لگی۔

دونوں کنیزوں نے فوراً اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں:

"نہ بابا۔ ہم ادھر نہیں جائیں گے۔ خدا نخواستہ خواری ہو گی۔ کسی نے پکڑ لیا تو کیا جواب دیں گے؟"

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ گھبراتی کیوں ہو؟" خانزادہ نے بھی اپنا گھوڑا روکا:

"تم نے آج تک سلطان کا محل نہ دیکھا ہو گا۔ میں تمہیں پورے محل کی سیر کراؤں گی۔"

"خانم...... کیا...... کیا آپ سلطانِ محترم کو جانتی ہیں؟" دوسری کنیز نے خانزادہ کو شبہ اور حیرت سے دیکھا۔

"تم جاننے کو کہہ رہی ہو، سلطان نے مجھے خود بلایا ہے۔" خانزادہ نے شوخی سے کہا:

"تم دیکھنا محل میں میری کیسی آؤ بھگت ہوتی ہے۔"

"خانم، آپ نے تو بازار کی سیر کو کہا تھا۔"

"وہ تو بس یونہی کہہ دیا تھا...... اگر تم ڈر رہی ہو تو واپس چلی جاؤ۔" خانزادہ نے گھوڑا آگے بڑھایا۔

کنیزیں خوفزدہ تو تھیں لیکن قصرِ سلطانی دیکھنے کا شوق انہیں ستانے لگا۔ خانزادہ آگے بڑھ گئی تھی۔ کنیزیں دیر تک آپس میں باتیں کرتی رہیں پھر گھوڑے بڑھا کر خانزادہ کے قریب پہنچ گئیں۔

"خانم۔ اگر کچھ الٹی سیدھی پڑ گئی تو آپ سنبھال لیں گی؟" ایک کنیز نے کہا۔

"ہم تو محض کنیزیں ہیں۔ ہم صاف کہہ دیں گی کہ ہمیں خانم اپنے ساتھ لائی ہیں۔" دوسری نے اپنا بچاؤ کیا۔

"کیوں ڈری جا رہی ہو؟" خانزادہ نے انہیں حوصلہ دیا:

"میں پہلے بھی ایک بار یہاں آ چکی ہوں۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

"آپ کو کسی نے روکا نہیں تھا؟"

"ہاں روکا تھا۔" خانزادہ نے جواب دیا۔

"کس نے...... سپاہیوں نے یا فوج نے؟"

"ایک کتے نے روکا تھا۔" خانزادہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کُتے نے..... کیا محل کی حفاظت کُتے کرتے ہیں؟"

سامنے میراں شاہ کے محل کا صدر دروازہ نظر آ رہا تھا۔ خانزادہ نے ادھر اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"وہ دیکھو، کتا آ رہا ہے۔"

کنیزیں حیران نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔ کھلے ہوئے دروازے سے ایک سوار نکل کر ان کی طرف آ رہا تھا۔ سوار کا لباس نہایت زرق برق تھا۔

"یہی وہ کتا ہے جو راستہ روکتا ہے۔" خانزادہ نے قریب آتے ہوئے سوار کو دیکھ کر کہا۔

"مگر یہ پالتو جانور ہے۔ کاٹتا نہیں صرف بھونکتا ہے۔ ہے تو دربان..... مگر خود کو پتہ نہیں کیا بتاتا ہے۔ دیکھو وہ قریب آ گیا ہے۔ تم دونوں اس کو سنبھالو۔ بس ایک منٹ کے لیے باتوں میں لگا لو۔ جب میں دروازے میں داخل ہو جاؤں تو تم بھی پیچھا چھڑا کر آ جانا..... بڑھو بڑھو..... آگے بڑھو۔"

کنیزوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کچھ اشارے، کچھ مسکراہٹیں۔ پھر انہوں نے جھرجھری سی لے کر اپنے گھوڑے آگے بڑھا دیے۔ طرحدار سوار بالکل ان کے مقابل آ گیا۔ خانزادہ نے اپنا گھوڑا کنیزوں کے پیچھے کر لیا تھا۔

"خوش آمدید..... خوش آمدید اے نازنینانِ بہار..... اے چمنستانِ نور و نکہت کے گلہائے نودمیدہ..... اے حورانِ ارضی کی نوخیز پیامبرو!"

شاہی دربان نے حسبِ عادت کنیزوں پر گلہائے عقیدت بکھیرنے شروع کر دیے۔ یہ وہی دربان تھا جس نے پہلے دن خانزادہ کو محل میں داخل ہونے سے روکا تھا۔

"سنا ہے آپ شاعر بھی ہیں؟" ایک کنیز نے ذرا شوخی سے پوچھا۔

"اگر آپ واقعی شاعر ہیں تو کوئی ایسا شعر سنائیے کہ بس طبیعت پھڑک اٹھے۔" دوسری نے ٹکڑا لگایا۔

"ماشاءاللہ..... سبحان اللہ..... زہے نصیب! آپ نظر شناس اور باذوق خواتین ہیں۔" دربان نے دونوں کو دلچسپی سے دیکھا:

"خوش نصیب ہے وہ شاعر جسے پری پیکران اور حسینانِ تبریز دعوتِ شعرگوئی عطا فرمائیں۔ براہِ کرم یہ تو فرمائیے کہ شعر شعرائے قدیم، شعرائے جدید کا ہو یا پھر اس حقیر، فقیر، دلگیر، سنان و تیر، برہنہ شمشیر، جوان و پیر ضمیر بے نظیر....."

"بس بس..... اب مزید قافیہ پیمائی کی ضرورت نہیں۔" کنیز نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

کنیز کے ہاتھ میں تازہ مہندی لگی تھی۔ دربان شاعر نے کنیز کا حنا آلود ہاتھ دیکھا تو فوراً بولا:

"سبحان اللہ یہ دستِ حنائی کا اشارہ!"

"شعر سنائیے!" کنیز چڑ کر بولی۔

"شعر..... ہاں شعر..... سنیئے، عرض کیا ہے۔" دربان شاعر آنکھیں بند کر کے یا تو فکرِ شعر میں کھو گیا یا پھر کسی موزوں اور شوخ شعر کی تلاش میں ذہن دوڑانے لگا۔

خانزادہ کے لیے یہ لمحہ غنیمت تھا۔ اسے آج محل میں بہر صورت داخل ہونا تھا لیکن وہ دروازے پر اس دل انسان کی بکواس نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس نے چپکے سے اپنا گھوڑا اچکا کی دے کر آگے کیا اور آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھایا۔

دربان اب تک فکرِ شعر میں غرق تھا۔ اور خانزادہ صدر دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ دربان نے آنکھیں کھولیں اور جھوم کر کہا:

"نازنینانِ تبریز ملاحظہ فرمائیے، عرض کیا ہے، اگر آں ترک شیرازی بدست....."

ابھی مصرعہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس کی نظر خانزادہ پر پڑی جو دروازے سے گزر کر قصرِ سلطانی کی سیڑھیوں پہنچ چکی تھی۔ مصرعہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ آنکھیں پٹ پٹائیں اور گھوڑا بھگا دیا۔ اس کا گھوڑا اندر کی طرف بھاگ رہا تھا اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

"دوڑو..... دوڑو..... پکڑو..... محل میں کون گھسا جا رہا ہے۔ پکڑو پکڑو....."

مگر خانزادہ کو کون روکتا۔ کون پکڑتا۔ محل کے دوسرے دربان بھی اسی قبیل کے لوگ تھے۔ وہ اپنے اپنے دالانوں میں بیٹھے شطرنج و گنجفہ کھیل رہے تھے یا پھر بے ڈھنگی آواز میں شعر پڑھ رہے تھے۔ جب تک وہ کمروں سے باہر خانزادہ کو دیکھتے، وہ قصر کی سیڑھیاں طے کر کے راہداری میں پہنچ چکی تھی۔

خانزادہ بڑی تیزی سے گھوڑے سے کود کر اتری تھی اس لیے تلوار تو اس کے ہاتھ نہ آ سکی لیکن چمڑے کا ایک تازیانہ اس کے ہاتھ لگ گیا جو زین کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ خانزادہ نے اس کوڑے ہی کو غنیمت جانا اور کوڑے کو لہراتی ہوئی راہداری میں بڑھنے لگی۔ اس نے چادر پھینک دی تھی اور نقاب اتار دیا تھا۔

قصرِ شاہی کے اندر اور باہر قیامت برپا ہو گئی تھی۔

محل کے تمام بیرونی محافظ اور دربان سیڑھیوں کے پاس جمع ہو گئے تھے اور وہیں سے چلا چلا کر محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں کو خبردار کر رہے تھے۔ وہ اوپر نہیں جا سکتے تھے کیونکہ بیرونی محافظوں کو سیڑھیوں پر بھی رکھنے کا حکم نہیں تھا۔ اس سے خانزادہ کے ساتھ آنے والی کنیزوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور وہ بھی سیڑھیاں

چڑھ کر اوپر پہنچ گئیں لیکن انہیں خواجہ سراؤں نے فوراً قابو کر لیا کیونکہ وہ نہ تو مسلح تھیں اور نہ اُن کے پاس خانزادہ کی طرح کا کوڑا ہی تھا۔

خانزادہ کو میراں شاہ کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ محل کے ایک حصے سے تیز موسیقی کی آواز آ رہی تھی جس نے خانزادہ کی رہنمائی کی۔ کیونکہ ظاہر تھا کہ موسیقی کی محفل جس جگہ برپا ہے میراں شاہ کی وہاں موجودگی یقینی تھی۔

خانزادہ کوڑا گھماتی بڑی بے خوفی سے موسیقی کی آواز کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جو کنیز یا خواجہ سرا سامنے آ کر اسے روکنے کی کوشش کرتا، خانزادہ اس پہ کوڑوں کی بارش کر دیتی۔ لہٰذا ہر طرف بھگدڑ اور چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ بہت سے خواجہ سرا اور کنیزیں اس دروازے پہ جمع ہو گئے تھے جس کے اندر سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ یہ محل کا بڑا ہال تھا اور اسے دربار کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن جب سے میراں شاہ نے اس ولایت کی گورنری سنبھالی تھی اس میں ایک دن بھی دربار نہ لگا لیکن موسیقی کی محفلیں روز بلکہ دن میں کئی کئی بار لگتی تھیں۔ دربار محفلِ نشاط میں بدل گیا تھا جہاں سے ہر وقت ساز و آواز کی دل خوش کن صدا آتی رہتی تھی۔ اس محفلِ نشاط کے باہر اتنا کچھ اودھم ہو رہا تھا لیکن کسی بھی کنیز یا خواجہ سرا میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اندر جا کر اس کی اطلاع کرتا۔

خانزادہ خود کو کنیزوں سے بچاتی اور کوڑا گھماتی آخر اس دروازے تک پہنچ گئی جہاں کنیزیں اور خواجہ سرا سمٹ کر جمع ہو گئے تھے۔ اتنا مجمع دیکھ کر خانزادہ ایک لمحے کے لیے پریشان ہوئی لیکن اس نے سوچا کہ یہ آخری مرحلہ ہے۔۔۔۔ اگر اس نے ذرا بھی کوتاہی کی اور کنیزوں کے ہاتھوں میں پڑ گئی تو نہ معلوم وہ اس کا کیا حشر کریں۔ اس نے پہلے انہیں چیخ کر دروازے سے ہٹ جانے کا حکم دیا لیکن انھوں نے ذرا بھی جنبش نہ کی تو خانزادہ نے کوڑا ہوا میں لہرایا اور بائیں ہاتھ میں کمر سے خنجر نکال کر پکڑ لیا پھر خنجر گھماتی اور کوڑا لہراتی وہ دروازے پہ اس طرح حملہ آور ہوئی جیسے قلعے کے دروازے پر دشمن فوج یلغار کرتی ہے۔ کنیزیں اور خواجہ سرا فی الفور خانزادہ سے مرعوب اور خوفزدہ ہو گئے۔ وہ خانزادہ کے آگے بڑھتے ہی کائی کی طرح پھٹ گئے۔

خانزادہ نے لات مار کر دروازہ کھول دیا اور بھوکی شیرنی کی طرح ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے میں کوڑا لیے ہال میں داخل ہوئی!

خانزادہ کے اچانک آ جانے سے میراں شاہ کی بزمِ عشرت درہم برہم ہو گئی۔ میراں شاہ نہ بادشاہ تھا اور نہ ہی امیر تھا لیکن اس کا محل اور اس محل کے شب و روز شہنشاہِ قسطنطنیہ اور شاہانِ ایران کے قدیم دن سے کچھ کم نہ تھے۔ تبریز کا شاہی محل، ایوانِ کسریٰ کی طرح آراستہ رہتا تھا۔ میراں شاہ دراصل امرا اور وزیروں کے زیرِ اثر آ گیا تھا اور اس نے تاتاریوں کی آزاد زندگی چھوڑ کر ایرانی شہنشاہوں کے طریقے اختیار کر لیے تھے۔ دولت کی اس قدر فراوانی تھی کہ ایک مورخ کے مطابق ولایت تبریز کی آمدنی فرانس کی آمدنی سے زیادہ تھی۔

غضب یہ ہوا کہ امیر تیمور، ایران کی فتح کے وقت بہت سے کاریگروں اور اپنے خیال میں روشن دماغوں اپنے ساتھ سمرقند لے آیا تھا۔ ایرانی کاریگروں نے تو واقعی سمرقند کی تعمیرات میں اپنے بہترین فن کا مظاہرہ لیکن دانشور بڑے شاعر ثابت ہوئے۔ اگر تیمور اچھے شاعروں کو ساتھ لاتا تو غنیمت بھی تھا لیکن ایران کے دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعر، موسیقار اور رقاص اس کے ساتھ آ گئے۔ تیمور اپنی مصروف ہی خود تو ان کے فن کا مظاہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس نے انہیں اہلِ فن اور اچھے ندیم سمجھتے ہوئے میراں شاہ کے دیا۔ ان لوگوں نے جلد ہی میراں شاہ کو بالکل اپنے ہی رنگ میں رنگ لیا۔ دربار میں ناچنے گانے والوں کو اونچے عہدے دیے گئے اور میراں شاہ نے دربار لگانے کے بجائے رقص و سرود کی محفلیں برپا کرنا شروع اور ابھی ایک محفل میں خانزادہ نے پہنچ کر رنگِ محفل بگاڑ کر رکھ دیا۔

خانزادہ بزمِ نشاط میں یوں داخل ہوئی جیسے کوئی سخت گیر استاد شریر بچوں کی کلاس میں ایک دم آ جائے

ادستہ پیچھے اپنی تمام شرارتیں بھول کر رہ جائیں۔

نازآفریں مغنیوں اور رقاصاؤں کے جسم سمٹ گئے۔ آوازیں ہونٹوں میں دب گئیں۔ نغمے دم توڑ گئے اور ساز بکھر کر خاموش ہو گئے۔

خانزادہ کے ہاتھ کا کوڑا مسلسل ہوا میں مست ناگن کی طرح لہرا رہا تھا مغنی، رقاص اور سازندے خوف وہشت کے مارے حریری پردوں میں چھپے جا رہے تھے۔ میراں شاہ کے حواری اور مصاحبین اکڑوں بیٹھے بھاگ لیے راستہ تلاش کر رہے تھے۔ ہال کے باہر سے کنیزیں اور خواجہ سرا خوفزدہ نظروں سے اندر جھانک رہے ت

میراں شاہ کو اب بھی کوئی خبر نہ ہوئی۔ وہ مسند کے سہارے تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھ بند تھیں۔ وہ اس صاحبقراں امیر تیمور کا ولی عہد تھا جس کی فتوحات اور یلغار سے پورا ایشیا لرز رہا تھا وہی تیمور لوگ "لرزندۂ جہاں" کے نام سے پکارتے تھے۔ تیمور ظالم اور سفاک بھی تھا لیکن اسے مذہب کا کم از کم اتنا پاس تو تھا ہر حملے اور یلغار میں ایک چوبی مسجد ساتھ رکھتا تھا۔ جہاں نماز کا وقت ہوا وہیں اس نے اپنا گھوڑا روک دیا تما اس کے ساتھ رک جاتا۔ پھر لکڑی کے ٹکڑوں والی بنی ہوئی یہ مسجد چھکڑوں پر سے اتاری جاتی۔ مختلف ٹکڑے جوڑ مسجد کھڑی کی جاتی۔ اذان ہوتی۔ پھر نماز ادا کی جاتی اور پھر لشکر کا یہ چلتا پھرتا شہر اپنی منزل کی طرف رواں نظر آ

اسی امیر کا فرزند ایرانی شہنشاہوں کی طرح محفلِ نشاط میں بیٹھا مغنیوں کے رس بھرے نغمات سن رہا تھ محفل کی خاموشی نے طول کھینچا اور اسے گہرے سکوت کا احساس ہوا تو میراں شاہ نے سر کو جھٹکا دے کر آنکھ مست و مخمور آنکھیں۔

اس نے محفل پر نظر ڈالی۔ سب ہی بت بنے خاموش بیٹھے تھے۔ میراں شاہ کی نظریں خانزادہ اور اس کے ہاتھ کے کوڑے پر بھی پڑیں۔ شاید وہ دروازے کے پاس کھڑی خانزادہ کو نہیں پہچان سکا تھا۔ شاید وہ کسی کو نہیں سکا۔ اس کی بصارت پر نشے کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔

خانزادہ کا خیال تھا کہ میراں شاہ اسے دیکھ کر کسی ردعمل کا اظہار کرے گا لیکن جب اسے احساس ہوا کہ نے اسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے تو اس کے شاہانہ وقار کو ٹھیس لگی۔ یہ اس کی بہت بڑی توہین تھی۔۔۔ غیظ و غضب سے تھرا اٹھی اور پھر اس کا چرمی کوڑا حاضرینِ محفل پر بے تحاشہ برسنے لگا۔ خانزادہ نے گانے اور ساقی گری کرنے والیوں کو اندھا دھند مارنا شروع کر دیا۔ اس نے سازوں کو الٹ دیا۔ سازندے ادھر بھاگ کر چھپ گئے۔ شور و غل، چیخ پکار، واویلا اور دہائیاں دی گئیں مگر خانزادہ کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھ سامنے پڑا اسے خانزادہ نے پیٹ کر رکھ دیا۔ وہ پورے ہال میں بھاگ بھاگ کر لوگوں کی پٹائی کر ر لوگ چیخ چلا رہے تھے لیکن خانزادہ کو روکنے اور اس کا ہاتھ پکڑنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

اس قیامت خیز ہنگامے سے میراں شاہ کا نشہ آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ اس نے کئی بار آنکھیں کھولیں اور یں۔ کئی بار سر کو جھٹکے دیے۔ پھر اس کا نشہ اترا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خانزادہ کو دیکھا جو بھاگ بھاگ دوں اور عورتوں پر کوڑے برسا رہی تھی۔ آخر اس نے خانزادہ کو پہچان لیا۔

"خانزادہ" اس نے زیرِ لب کہا۔

"خانزادہ" آواز ہونٹوں سے باہر آئی۔

"خانزادہ" اس بار میراں شاہ اتنے زور سے چیخا کہ پورا ہال گونج اٹھا۔ ہر شخص اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔۔۔۔ ادہ کا ہاتھ بھی رک گیا۔

"میراں شاہ" خانزادہ نے ہانپتے ہوئے مگر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"اے صاحبقراں کے بیٹے! شہزادی کو تمہاری حالت پر رحم آنے کے باوجود اس بات کی خوشی ضرور ہے کہ تمہاری آج بھی تیموری طنطنہ موجود ہے۔ وہی گھن گرج اور دھمک ہے جسے سن کر شاہوں اور شہنشاہوں کا پتا پانی ہو جاتا ر وہ تیمور کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ کاش یہ طنطنہ اور گھن گرج تمہارے کردار میں بھی ہوتی۔"

میراں شاہ اپنی مسند پر کھڑا ہو گیا تھا۔ خانزادہ کے تلخ و ترش جملوں نے اسے بہت متاثر کیا۔ اس کا سر ندامت سے ا۔ چند لمحوں بعد اس نے سر جھکائے تخلیے کا اشارہ کیا اور دوسرے ہی لمحے حاضرین ایک دوسرے کو دھکیلتے ہال سے طرح بھاگے جیسے ان کے تعاقب میں کوئی شیر آ رہا ہو۔

ال خالی ہو گیا تو میراں شاہ نے سر اٹھا کر خانزادہ کی طرف دیکھا۔

"بیٹھو خانزادہ! تم کب آئیں؟"

"شہزادے! تم پہلے ہوش میں آ لو۔ پھر بات کرنا۔"

خانزادہ مسند کے کونے پر بیٹھ گئی۔ میراں شاہ نے بھی تکیوں سے ٹیک لگا لی۔

"ہم ہوش میں ہیں۔ ہم تمہیں پہچان رہے ہیں۔ کیا تم خانزادہ نہیں ہو؟" میراں شاہ نے اکھڑی اکھڑی آواز میں ی آنکھیں اب بھی مشکل ہی سے کھل رہی تھیں۔

"نہیں، تم ہوش میں نہیں ہو شہزادے۔" خانزادہ نرمی سے بولی:

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تھوڑی دیر آرام کر لو تاکہ طبیعت بحال ہو جائے۔"

"نہیں خانزادہ۔ اب تم نہیں جا سکتیں۔ ہم بالکل اکیلے ہیں۔ یہاں ہمارا اپنا کوئی نہیں۔" میراں شاہ کی آواز میں آیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بڑے کرب میں مبتلا ہے۔

"یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے میراں شاہ۔" خانزادہ کی آواز میں محبت کی چاشنی پیدا ہو گئی۔

"ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ کچھ پتہ نہیں۔ تم ہمیں اکیلا نہ چھوڑو۔ ورنہ ۔۔۔۔۔ ورنہ ۔۔۔۔؟"

"گھبراؤ نہیں۔ خانزادہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گی۔" خانزادہ نے بڑے پیار سے کہا:

"لیکن تمہیں اپنی حالت بدلنا ہوگی۔ عیش و عشرت شہزادوں کا حق ہے لیکن یہ حرکتیں تو شاہانہ وقار کے

ہیں۔ اگر صاحبقراں کو علم ہو گیا تو جانتے ہو کیا ہو گا؟"

"صاحبقراں ۔۔۔۔۔" میراں شاہ نے دہرایا:

"ہوگا پھر؟"

"تم ولی عہدی سے معزول کر دیے جاؤ گے۔ ممکن ہے کہ امیر تم سے تبریز کی ولایت بھی چھین لیں۔"

"نہیں نہیں۔ ایسا نہ کہو خانزادہ۔" میراں شاہ نے ادھر ادھر دیکھا:

"مجھے ان سے بچاؤ خانزادہ۔ یہ مجھے ۔۔۔۔۔ یہ مجھے ۔۔۔۔۔"

"میں جانتی ہوں میراں۔"

معاً خانزادہ کو اپنی کنیزوں کا خیال آیا۔ اس نے کہا:

"شہزادے! میرے ساتھ دو کنیزیں بھی آئی تھیں معلوم نہیں ان پر کیا گزری۔ کسی کو بلا کر پوچھو۔ اگر وہ یہیں ہیں تو انہیں آرام سے رکھا جائے۔ وہ ساتھ نہ ہوتیں تو شاید ہم آج بھی تم سے نہ مل سکتے۔"

میراں شاہ نے تالی بجائی۔ ایک خواجہ سرا کسی طرف سے داخل ہو کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"شہزادی کے ساتھ دو کنیزیں آئی تھیں۔" میراں شاہ نے کہا:

"انہیں عزت کے ساتھ حاضر کیا جائے۔"

خواجہ سرا الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

"تم تبریز کب آئیں خانزادہ؟ کہاں ٹھہری ہو؟" میراں شاہ نے پوچھا۔

"ہمیں آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے۔" خانزادہ نے بتایا:

"لیکن یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ ہمیں بتاؤ کہ تمہیں یہ ماحول اور دربار کا یہ رنگ ڈھنگ پسند ہے۔ اگر ماحول میں رہنا چاہتے ہو تو ہمیں اجازت دو۔ ہم اور گاؤس واپس چلے جائیں گے۔"

"ہم کیا کریں خانزادہ؟" میراں شاہ دکھ سے بولا:

"کوئی صلاح دینے والا نہیں۔ ہم کس سے مشورہ کریں ۔۔۔۔! صاحبقراں نے جو امیر ہمارے ساتھ وہ سب ہم سے کنارہ کر گئے ہیں۔ کوئی سلام کرنے کو بھی نہیں آتا۔ تاتاری فوج چھاؤنی میں رہتی ہے۔ اس کا سے ملنے نہیں آتا۔ پھر ہم کیا کرتے۔ دل بہلانے کے لیے کوئی صورت تو نکالنا تھی۔ امیر نے جو ندیم بھیجے ہیں

ہم پیالہ ہیں۔"

"شہزادے! کبھی تم نے دربار لگایا؟"

"دربار کی کیا ضرورت ہے خانزادہ؟" میراں شاہ بولا:

"تبریز میں نہ تو کوئی فتنہ ہے نہ فریادی۔ پھر دربار کس لیے لگایا جائے۔ سب آرام سے زندگی گزار رہے ۔۔۔"

"مگر حکمرانی کا یہ طریقہ تو نہیں کہ حاکم دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر چنگ و رباب میں گم ہو جائے۔" خانزادہ ترش لہجے میں بولی:

"اگر تم نے کبھی کسی امیر یا فوجی سردار کو بلا کر پوچھا ہوتا کہ اس نے دربار میں آ کر تمہیں سلام کرنا کیوں چھوڑ دیا یہاں کے حالات معلوم ہوتے۔ تمہارے گرد خوشامدیوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ ہمیں پورے محل میں ایک ری مرد یا عورت نظر نہیں آئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"ہمیں کچھ پتہ نہیں۔" میراں شاہ نے بچوں جیسی معصومیت سے جواب دیا۔

"میراں شاہ! ہم تمہیں بتلاتے ہیں کہ تبریز میں کیا ہو رہا ہے؟" خانزادہ بڑے وقار سے بولی:

"تمہاری آنکھیں رنگ و نور کی چمک سے خیرہ کر دی گئی ہیں اور کانوں میں حرف طربیہ نغمے ہی ٹھونسے جاتے ہیں۔ نے تمہیں گورنر کے بجائے تبریز کا سلطان ابن سلطان مشہور کر رکھا ہے۔ تم اس سونے کے پنجرے میں تمہارے امیر و وزیر تمہارے نام پر حکومت کر رہے ہیں۔ تاتاری امیروں نے اس لیے گوشہ نشینی اختیار کہ وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں۔ تم امیر تیمور کے بیٹے ہو۔ وہ امیر تیمور کے بیٹے کا ہر حکم بے چون و چرا مانتے تم کو مشورہ دے سکتے ہیں اور نہ تمہارے کاموں میں دخل دینے کی ان میں ہمت ہے۔ یہی حال یہاں ج کا ہے۔ اسے بھی عیش و عشرت کا چسکا پڑ گیا ہے اور ان کی جنگی صلاحیتیں روز بروز زنگ آلود ہوتی یں۔"

"مگر ہم کیا کریں۔ تم بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

میراں شاہ ان حالات کو سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اسی وقت خواجہ سرا ان کنیزوں کو لے کر داخل ہوا جو کے ساتھ آئی تھیں۔

خواجہ سرا نے اندر آتے ہی کہا:

"تعظیم پیش کرو۔ تم سلطان ابن سلطان شاہِ تبریز کے حضور میں ہو۔"

کنیزوں نے اپنے سلطان کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ خواجہ سرا کی آواز سنتے ہی رکوع کی حالت میں جھک گئیں اور

سلام پیش کیا۔

"ہماری طرف دیکھو!" خانزادہ نے مسکرا کر کہا۔

کنیزوں نے سر اٹھائے اور ان کی نظریں خانزادہ پہ جم گئیں۔ خانزادہ سلطان کے ساتھ بیٹھی بڑی کھلے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

میراں شاہ نے خواجہ سرا کو مخاطب کیا:

"گلفام! شہزادی خانزادہ کے لیے قصرِ زفاف فوراً خالی کرا کے آراستہ کیا جائے اور وزیرِ سلطنت کو ذرا کیا جائے۔"

گلفام سلام کر کے فوراً چلا گیا۔

خانزادہ ابھی تک حیرت میں ڈوبی ہوئی کنیزوں کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا:

"تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"آپ تکلیف کا کہہ رہی ہیں خانم..... نہیں شہزادی عالیہ!" کنیز نے رک کر اصلاح کی۔ پھر بولی:

"ان بدبخت خواجہ سراؤں نے مار مار کر ہمارا ابھر کس نکال دیا ہے۔"

خانزادہ ہنسنے لگی۔ اس نے پوچھا:

"اچھا یہ بتاؤ۔ تم ہمارے ساتھ رہنا پسند کرو گی یا وزیرِ سلطنت کے گھر واپس جاؤ گی؟"

"شہزادی عالیہ! اگر آپ ہمیں اپنی خدمت کا موقع عنایت کریں تو یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی۔" ایک فوراً بولی۔

"کیا یہ ہمارے وزیرِ سلطنت کی کنیزیں ہیں؟" میراں شاہ نے دخل دیا۔

"ہاں شہزادے! ہم ابھی تک انہی کی عطا کردہ حویلی میں مقیم ہیں۔" خانزادہ نے بتایا:

"اب یہ دونوں کنیزیں ہماری طرف سے شہزادے کی خدمت پہ مامور کی جاتی ہیں، بشرطیکہ شہزادے پسند فرمائیں۔"

"ضرور ضرور۔" میراں شاہ نے اطمینان کا سانس لیا:

"ہم انہیں محل کی تمام کنیزوں کی سرداری عطا کرتے ہیں۔ محل کے تمام اختیارات انہی کے سپرد کیے جا

کنیزوں نے اس اعزاز پر فوراً جھک کر مجرا پیش کیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں۔ میراں شاہ کو باہر بھیج دیا اور پھر دیر تک خانزادہ سے گفتگو کرتا رہا۔ کچھ شکوے کچھ شکایتیں اور مستقبل کے منصو

مطبخ کے خواجہ سرا داروغہ نے اطلاع دی کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔ میراں شاہ اور خانزادہ اٹھ کر کھانے کے کم

گئے۔

خانزادہ کی دونوں کنیزوں نے باہر جاتے ہی عہدے اور تقرر کا اعلان کر دیا تھا اور اب وہ کھانے کے انتظام ہی پیش پیش نظر آ رہی تھیں۔

آج شب کھانے کے کمرے کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ روز تو یہ ہوتا تھا کہ میراں شاہ کے اعالی موالی اور خوشامد ے اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے تھے لیکن اس وقت صرف میراں شاہ اور خانزادہ کھانے پہ تھے۔ نہ لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں نہ حافظ شیرازی کے شعروں کا گلا گھونٹا جا رہا تھا۔ میراں شاہ اور وہ کھانے کے دوران بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتے رہے۔

کھانے کے بعد وزیرِ سلطنت کو پیش کیا گیا۔ وہ بہت دیر سے باہر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ وزیرِ سلطنت اس وقت طلبی سے کچھ پریشان تھا۔ اگر اس نے پیغام پہنچانے والے سے پوچھا ہوتا تو اسے بہت کچھ معلوم ہو جاتا۔ وزیرِ سلطنت اپنی شان میں تھا۔ وہ محل کے ایک غلام پہ یہ کیوں ظاہر ہونے دیتا کہ وہ پریشان ہے..... غلام کا سوال تو اس کا تعلق قصرِ سلطانی سے تھا اور قصر کا ادنیٰ سے ادنیٰ غلام اپنے آپ کو وزیرِ سلطنت سے کمتر نہ سمجھتا تھا۔

جب وزیرِ سلطنت میراں شاہ کے سامنے حاضر ہوا تو اس کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ میراں شاہ شاہی چھپر کھٹ پہ تکیہ لگائے بیٹھا تھا اور خانزادہ اس کی پائنتی بیٹھی بڑی بے تکلفی سے گفتگو کر رہی تھی۔ اسے سب سے زیادہ حیرت اس بات پہ تھی کہ خانزادہ نے اس سے میراں شاہ کی سینکڑوں برائیاں کی تھیں اور اسے یقین دلایا تھا کہ وہ میراں شاہ کی حرکتوں سے بد دل ہو کر اور گنج واپس جا رہی ہے مگر وہی خانزادہ اس وقت کتنی لگاوٹ اور پیار سے میراں شاہ سے باتیں کر رہی تھی۔ وزیرِ سلطنت ان دونوں کو یکجا دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ تعظیم کے آداب بھول گیا۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے شہزادی کی مہمانی کے فرائض انجام دیے ہیں۔" میراں شاہ نے خود ہی اسے مخاطب کیا:

"اب شہزادی ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ہم نے قصرِ زفاف کو آراستہ کرنے کا حکم دیا ہے۔"

"سلطانِ معظم کا حکم سر آنکھوں پہ۔"

"سلطانِ معظم نہیں، والیِ تبریز۔" خانزادہ نے غصے سے وزیرِ سلطنت کو ٹوکا:

"آج سے شہزادے میراں شاہ کو والیِ تبریز یا حاکمِ ولایتِ تبریز سے مخاطب کیا جائے۔ صاحبقراں امیر تیمور نے شاہ یا سلطان کا لقب اب تک اپنے مبارک نام کے ساتھ نہیں لگایا۔ ولایت کے حاکم کو سلطان کہنا

صاحبقراں کے وقار و جلال کی توہین ہے۔ منادی کرا دی جائے کہ جو شخص والیٔ تبریز کے نام کے ساتھ "سلطان" کا استعمال کرے گا اس کی زبان تراش دی جائے گی۔"

وزیرِ سلطنت تھرا اٹھا۔ وہ خانزادہ کی خاندانی عظمت کا تو قائل تھا لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ خانزادہ اس قدر دبدبے اور جلال والی شہزادی ہے۔ پھر اس نے انہیں ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ خانزادہ کی بددلی اور ناامیدی اب امید میں بدل چکی ہے اور کوئی نہ کوئی نئی بات ہونے والی ہے۔

"حکم کی تعمیل ہو گی شہزادیٔ عالیہ۔" وزیرِ سلطنت نے انکساری اور عاجزی سے سر جھکایا۔

"ایک اور حکم پر بھی عمل کیا جائے۔" شہزادی اسی وقار سے بولی:

"کل شہزادے میران شاہ ابنِ صاحبقراں امیر تیمور گورگان دربار میں جلوس فرمائیں گے۔ یہ دربارِ خاص ہے۔ تمام عمائدینِ سلطنت کو حاضری کا حکم ہے۔ شہزادے سے عالی مقام کے ان تیموری امیروں کو خصوصیت سے دربار میں طلب کیا جائے جو صاحبقراں کے حکم سے شہزادے بہادر کے ساتھ آئے تھے۔ تاتاری فوج کے بڑے بڑے سرداروں کو بھی دربار میں حاضری کا حکم دیا جائے۔"

"تعمیل ہو گی شہزادیٔ عالیہ۔" وزیرِ سلطنت نے لرزتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گیا کہ عنانِ حکومت میران شاہ کے ہاتھ سے نکل کر اس عالی شہزادی کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔

"ایک اور بات ہے وزیرِ سلطنت۔" خانزادہ نے لہجہ بدل کر نرمی سے کہا۔

"ارشاد فرمائیے شہزادیٔ عالیہ۔"

"ہم آج رات آپ کی دی ہوئی حویلی میں ہی قیام کریں گے۔ کل ہم اپنے نئے محل میں منتقل ہوں گے۔"

وزیرِ سلطنت نے تو اس پہ ذرا بھی حیرت کا اظہار نہ کیا لیکن میران شاہ چپ نہ رہ سکا۔ اس نے کہا:

"خانزادہ، تمہارا محل آراستہ ہو چکا ہو گا۔ کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں شہزادے۔ تمہاری مہمان نوازی کل سے شروع ہو گی۔" خانزادہ نے مسکرا کر کہا۔ میران شاہ کو اس کی ہمت نہ ہوئی اور وہ خانزادہ کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

٥

تبریز میں دربارِ تیموری آراستہ کیا گیا، گو کہ اس میں صاحبقراں تیمور کے دربار جیسی شان و شوکت تو

[نہ] تھا لیکن میران شاہ ولی عہدِ سلطنت تھا۔ مرحوم شہزادے جہانگیر کی طرح اسے بھی طبل و علم رکھنے اور دربار لگانے کی اجازت تھی۔

صبح ہوتے ہی طبل پر چوٹ پڑی اور تبریز کے قلعے پر تیموری علم لہرا دیے گئے۔ بڑا جھنڈا دربار ہال کے باہر نصب کیا گیا۔ پانچ سال سے چھاؤنی میں پڑا ہوا دس ہزار کا تاتاری لشکر محض روٹیاں توڑ رہا تھا۔ فوجی سرداروں کو رات ہی احکامات پہنچ چکے تھے۔ وہ تمام رات سلامی کی تیاریاں کرتے رہے تھے۔ صبح ہوتے ہی تاتاری گھڑسوار لشکر گاہ سے قطار اندر قطار محلِ شاہی کے سامنے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ امرا اور وزرا اپنے روایتی لباس میں دربار پہنچ گئے۔

میران شاہ نے تبریز آنے کے بعد صرف ایک بار دربار لگایا تھا جس میں عہدے داروں کی نشستیں مخصوص کی گئی تھیں۔ اب ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ وزیر اور امیر اپنی نشستیں تک بھول چکے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے پوچھ پوچھ کر اپنی نشستوں کا تعین کیا۔ چوبدار، پہرے دار اور محافظ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور تاتاری فوجی [تما]م فضاؤں میں بکھر گئے۔

پہلے کوتوالِ شہر ایک ہوا کرتا تھا لیکن وزیرِ سلطنت نے اپنی آسانی کے لیے یا پھر اپنے حواریوں کو عہدے دینے کے لیے کئی کوتوال مقرر کر دیے تھے۔ کوتوال کا پہرہ دربار کے صدر دروازے پر ہوتا تھا۔ تمام کوتوال دربار کے صدر دروازے پر آ گئے۔

تبریز والوں کے لیے یہ نئی بات تھی۔ جب تاتاری سوار بازاروں سے گزرے تو انہوں نے ان سواروں کو حیرت سے دیکھا۔ انہیں خیال ہوا کہ شاید کہیں بغاوت ہوئی ہے اور یہ لشکر باغیوں کی سرکوبی کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ عوام تماشہ دیکھنے کے لیے ان سواروں کے ساتھ ہو لیے لیکن انہیں دربار سے دور ہی روک دیا گیا کہ حاکمِ ولایت شہزادہ میران شاہ دربارِ خاص میں جلوس فرما رہے ہیں۔ ابھی عوام کو وہاں جانے کی اجازت نہیں۔ عوام کے لیے حاکمِ ولایت اور شہزادہ میران شاہ، یہ دونوں ہی لقب اور نام اجنبی تھے۔ وہ تو تبریز کے سلطان ابنِ سلطان یا سلطانِ معظم کو جانتے تھے۔

کچھ دن چڑھے دربار میں میران شاہ کی آمد کا اعلان ہوا۔ تمام پرانے امیر دربار میں حاضر تھے اور اس اچانک تبدیلی کو تعجب کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر چوبداروں اور نقیبوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ چوبدار شاہی محل کی راہداریوں میں کھڑے "خبردار۔ ہوشیار" کی آوازیں لگا رہے تھے اور شاہی نقیب شہزادہ میران شاہ ولی عہدِ سلطنت صاحبقراں امیر تیمور گورگان کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ حالانکہ امیر تیمور نے اس وقت تک میران شاہ کی باقاعدہ ولی عہدی کا اعلان نہیں کیا تھا۔

میران شاہ پورے تیموری دبدبے کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا راہداریوں سے گزر رہا تھا۔ سب سے آگے نقیب، اس کے پیچھے شاہی علمبردار، پھر میران شاہ تھا۔ اس کے دائیں بائیں مسلح خواجہ سرا اور میران شاہ کے محافظ دستوں کے چیدہ چیدہ حبشی غلام تلواریں سر سے بلند کیے چل رہے تھے۔ راہداریوں میں کنیزیں کھڑی راستے میں گل پاشی کر رہی تھیں۔

میران شاہ واقعی آج تیموری شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے وہ درباری جو چوبیس گھنٹے اسے گھیرے رہتے تھے، ان میں سے کوئی بھی دربار میں موجود نہ تھا۔

دربار ہال میں سب سے پہلے نقیب، پھر علمبردار داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے میران شاہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ نپے تلے قدم اٹھاتا داخل ہوا۔ درباریوں کی گردنیں پہلے ہی جھکی ہوئی تھیں۔ ان میں کچھ اور خم پیدا ہو گیا۔ شمال کی طرف تختِ شاہی پر زر نگار مسند بچھی تھی۔ تخت کے پایوں پر گنگا جمنی کام تھا۔ تین طرف باریک پردے تھے جن میں جواہر ریزے ٹکے ہوئے تھے۔

میران شاہ بڑی بے نیازی سے چلتا ہوا تخت کے پاس پہنچا۔ تخت پر جانے کے لیے چاندی کی تین سیڑھیاں طے کیں اور مسندِ شاہی پر پورے طمطراق سے بیٹھ گیا۔ شاہی علم اس کے تخت کے سامنے استادہ کیا گیا جس کے لیے چاندی کا ایک ٹھوس چوکور چبوترا پہلے سے موجود تھا۔ اس کے درمیان میں ایک سوراخ تھا جس میں علم کا چاندی کا ڈنڈا پھنسا دیا گیا۔ وزیرِ سلطنت تخت سے دس قدم دور دائیں جانب کھڑا تھا۔ وہ نظریں نیچی کیے ہوئے میران شاہ کے سامنے پہنچا اور سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ جواب میں میران شاہ نے صرف سر کو اثبات میں ہلایا۔

"نذریں گزاری جائیں!" وزیرِ سلطنت نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔

سب سے پہلے وزیرِ سلطنت کو نذر پیش کرنی تھی۔ اس نے دور کھڑے ہوئے اپنے غلام کو اشارہ کیا۔ غلام سونے کی صندوقچی، جس پر زربفت کا کپڑا پڑا ہوا تھا، لیے ہوئے وزیر کے پاس آیا۔ وزیر نے صندوقچی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ کھول کر اندر سے کوئی چیز نکالی اور اسے ریشمی رومال میں لپیٹ کر صندوقچی پر رکھا۔ پھر وہ صندوقچی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تخت کے قریب پہنچا۔

میران شاہ نے دایاں ہاتھ اٹھا کر نذر قبول کی۔ وزیرِ سلطنت نے صندوقچی تختِ شاہی پر رکھ دی۔ درباریوں کا تجسس بڑھا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ رومال میں لپٹی ہوئی کیا چیز نذر کی گئی ہے۔ میران شاہ نے بڑی بے پروائی سے نذر قبول تو کر لی تھی لیکن اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس چھوٹے سے رومال میں وہ کیا عجیب چیز ہے جسے وزیرِ سلطنت نے نذرانے کے طور پر پیش کیا ہے۔

وزیرِ سلطنت چونکہ سب سے بڑا عہدے دار تھا اس لیے سب کو توقع تھی کہ اس کا نذرانہ سب سے زیادہ بیش قیمت

…ین رومال کا راز نہ کھل رہا تھا۔ میران شاہ کا خاص ملازم پشت پر کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ اس کا آقا نذر اٹھانے کا …ہے تو وہ بڑھ کر نذرانہ اٹھا کے دوسرے غلاموں کے حوالے کر دے۔ دوسری طرف درباری پس و پیش میں تھے کیونکہ …کے مطابق جب تک پہلا نذرانہ تختِ شاہی سے نہ اٹھایا جائے دوسرا نذرانہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔

آخر میران شاہ نے خود ہی یہ مشکل آسان کر دی۔ اس نے بارعب لہجے میں کہا:

"آئندہ سے ہر نذرانہ کھلا ہوا پیش ہونا چاہیے۔ وزیرِ سلطنت کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنا نذرانہ درباریوں …دکھائیں۔"

وزیرِ سلطنت پر دربار کا کچھ ایسا رعب طاری ہوا تھا کہ وہ اپنے ہوش ٹھکانے نہ رکھ سکا۔ تیموری دربار کا اسے …تجربہ نہ تھا۔ اس نے دربار کو آراستہ کرنے کے لیے میران شاہ کے پرانے تیموری امیروں کی خوشامدیں کی تھیں اور …دربار کی آرائش و زیبائش کے لیے پوری آزادی تھی۔ دربار اگرچہ اس کی موجودگی ہی میں آراستہ ہوا تھا لیکن میران شاہ …ماہانہ آمد اور نئے پرانے امیروں کی موجودگی نے اس کے ہاتھ پیر پھلا دیے تھے۔

میران شاہ کے حکم سے اس کی جان میں جان آئی۔ وہ بڑھ کر تخت کے پاس پہنچا۔ لپٹا ہوا رومال اٹھایا۔۔۔۔ اور …ال الگ کر کے اس میں سے چمکدار سی چیز نکال کر ہتھیلی پر رکھی اور ہاتھ سر سے اونچا کر دیا۔ یہ ایک غیر معمولی جسامت …ہیرا تھا جو روشن چراغ کی طرح دمک رہا تھا۔ اس سے پھوٹنے والی روشنی سے درباریوں کی آنکھیں خیرہ ہوتی جا رہی تھیں …اری حیرت کے ساتھ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں ہیرے پر تبصرہ کرنے لگے۔

"واقعی لاجواب ہیرا ہے۔"

"وزیرِ سلطنت نے شایانِ شان ہیرا پیش کیا ہے۔"

"آخر وزیرِ سلطنت ہے۔ اس نے وزارت کی آن رکھ لی۔"

ہیرے کی رنگت ہر لحظہ تبدیل ہو رہی تھی۔ ابھی سرخ، ابھی زرد اور ابھی نیلا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قوسِ …ح اس ہیرے میں سمٹ آئی ہے اور اپنے مختلف رنگ دکھا رہی ہے۔

میران شاہ کی حیران نظریں ہیرے پر جمی تھیں لیکن ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ درباری چہ میگوئیوں میں معروف …ہیرا اور ہیرے کی قیمت پر قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

یکایک میران شاہ کی بھاری آواز دربار میں گونجی:

"وزیرِ سلطنت کا نذرانہ بے شک نایاب اور بے نظیر ہے لیکن یہ نذرانہ اس وقت تک قبول نہیں کیا جا سکتا …جب تک وزیرِ سلطنت یہ وضاحت نہیں کرتے کہ انہیں یہ ہیرا کہاں سے دستیاب ہوا ہے۔ وزیرِ سلطنت کے کردار …یانت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس قسم اور قبیلے کے تمام ہیرے یا تو تیموری خزانے میں

موجود ہیں یا پھر تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کی ملکیت ہیں۔ وزیرِ سلطنت کو صفائی کا موقع دیا جاتا ہے"۔

وزیرِ سلطنت کو میراں شاہ کے اس حکم سے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ وہ بے خوفی سے کہہ سکتا تھا کہ اسے یہ ہیرا خانزادہ نے دیا ہے۔ صفائی پیش کرنے کے لیے اس کا یہ اظہار ہی کافی تھا لیکن اصل فکر اسے یہ لاحق ہوئی کہ خانزادہ کا نام سرِ دربار کیسے زبان پہ لائے اور اس نے خانزادہ کا نام لے بھی لیا تو وہ اس کا کیا جواز پیش کرے گا۔ وہ خانزادہ سے اپنا کیا تعلق بتائے گا اور ان باتوں کو کیسے بیان کرے گا جو خانزادہ نے میراں شاہ کے بارے میں کہی تھیں۔

"جواب دیا جائے"۔ میراں شاہ کی کرخت آواز گونجی۔

وزیرِ سلطنت سہم گیا:

"سلطانِ معظم ..... " پھر رک کر بولا:

"ولی عہدِ معظم! یہ نایاب ہیرا واقعی شاہی خزانے کی زینت ہونا چاہیے۔ میرے پاس بھی یہ ہیرا ایک شاہی توسط سے آیا ہے لیکن میں خاندانِ تیموریہ کی اس ہستی کا نام دربار میں نہیں لے سکتا کیونکہ ایسا کرنے سے سلطنتِ تیموریہ کی توہین کا امکان ہے"۔

"ہوں"۔ میراں شاہ کا غصہ شاید اس وجہ سے کچھ کم ہوا کہ وزیرِ سلطنت نے "شاہی توسط" کا حوالہ دیا تھا پھر بھی اس نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا:

"اس کا مطلب ہے کہ خاندانِ تیموریہ کے کسی فرد نے تمہیں یہ ہیرا انعام یا تحفے کے طور پر دیا ہے"۔

"عالی جاہ شہزادہ عالی مقام کا ارشاد بالکل درست ہے" وزیرِ سلطنت نے فوراً تائید کی۔

میراں شاہ کی تسلی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے حکم پر مزید زور نہیں دیا اور اپنے خاص غلام کو اشارہ کیا کہ نذرانہ وصول کیا جائے۔ وزیرِ سلطنت نے ہیرا اس کے حوالے کر دیا۔

دوسرا نذرانہ سالارِ لشکر کی طرف سے گزارا گیا۔ پھر باری باری تمام عمائدینِ سلطنت اور روساء نے نذرانے پیش کیے۔ نذرانے کی رسم پوری ہوئی تو وزیرِ سلطنت نے بڑھ کر نہایت مؤدب انداز میں کہا:

"تاتاری لشکر صف آرا ہے۔ شہزادے بہادر معائنے کی زحمت فرمائیے"۔

"لشکر کا معائنہ"۔ میراں شاہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا:

"لشکر کے معائنے کو ہم اکیلے نہیں جائیں گے۔ پہلے قاضیِ شہر کو پیش کیا جائے"۔

"قاضیِ شہر؟" وزیرِ سلطنت نے حیرت سے میراں شاہ کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آج کونسا مقدمہ پیش ہونا ہے جس کی اسے خبر نہیں۔ قاضیِ شہر مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا مگر یہ ذمہ داری وزیرِ سلطنت نے اپنے ذمے لے لی تھی اور

یہ تمام مقدمات اس کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہ اپنی صوابدید پہ جو چاہتا تھا فیصلہ کر دیا کرتا تھا۔

"حکم کی تعمیل ہو"۔ میراں شاہ نے گرج کر کہا:

"قاضیِ شہر کو فوراً طلب کیا جائے"۔

دربار پہ سناٹا چھایا ہوا تھا اور درباری ایک دوسرے کا منہ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ لشکر کے معائنے سے انکار۔ قاضی کا طلب کیا جانا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اور میراں شاہ کیا کرنا چاہتا ہے؟

کچھ دیر بعد قاضیِ شہر تشریف لائے۔ انہوں نے تعظیم پیش کی۔ میراں شاہ نے انہیں تخت پہ آنے کا اشارہ کیا۔ قاضی کے پیر کانپنے لگے۔ انہوں نے پھٹی پھٹی نظروں سے میراں شاہ کو دیکھا۔

"گھبرائیے نہیں۔ ہمارے پاس تشریف لائیے"۔ میراں شاہ نے نرمی سے کہا۔

"معظم ..... شہزادے ..... میں ..... میں تختِ شاہی"۔ قاضی کے حلق میں آواز اٹکنے لگی۔

"ہاں تخت پر ..... ہماری مسند پر ....."

"شاہی مسند؟" قاضی صاحب بوکھلا گئے۔

قاضی نے جوتے سیڑھیوں کے نیچے اتارے اور لرزتے پیروں سے تخت پر چڑھے اور شاہی مسند کے قریب جا کر رک گئے۔

"تشریف رکھیے ہمارے ساتھ"۔ میراں شاہ نے انہیں شاہی مسند پہ ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

قاضیِ شہر ڈرتے ڈرتے مسند کے کونے پہ بیٹھ گئے۔ دل تھا کہ سینے سے نکلا پڑتا تھا۔ تمام بدن پہ رعشہ طاری تھا۔ دعائیں مانگ رہے تھے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ پتہ نہیں ان سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے کہ انہیں دربار میں طلب کیا گیا۔ کیا سزا ملے گی انہیں؟ مگر ..... مگر یہ التفات، یہ شاہی مسند! اے اللہ تو ہی عالم الغیب ہے۔ قاضی کے دل میں ہزاروں خیال آئے اور گزر گئے۔ وہ وہم کی کشمکش میں مبتلا تھے۔

اس وقت دربار میں امیر قلات خان آیا اور جھک کر تعظیم پیش کی:

"کیا سواری آ گئی ہے؟" میراں شاہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں شہزادے بہادر!" قلات خان بولا:

"حکم کی پوری پوری تعمیل کی گئی ہے"۔

میراں شاہ نے دربار پہ طائرانہ نظر ڈالی۔ بولا:

"دربار کے تمام معززین ہمارے ساتھ دلہن کی پیشوائی کے لیے چلیں"۔

میراں شاہ مسند سے اترا اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ تمام درباری اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے لیکن خاموش بُت بنے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان پر سحر کر دیا گیا ہے اور وہ کسی معمول کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ سب کے ذہن لفظ "دلہن" میں الجھے ہوئے تھے۔ قاضیِ شہر کی موجودگی اور لفظ دلہن کی آمد میں کوئی تعلق تو سمجھ میں آ رہا تھا لیکن دلہن کون ہے اور اگر دلہن ہے تو پھر قاضیِ شہر کی کیا ضرورت ہے۔ اسی ادھیڑ بُن میں وہ محل کے دروازے پر پہنچ گئے۔

مسند دروازے کے سامنے ایک آراستہ پیراستہ بند گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے چاروں طرف تاتاری اپنے روایتی انداز میں چوکس، تیر و ترکش پشت پر ڈالے تلواریں زین سے لٹکائے محافظ کے فرائض سر انجام دے رہے تھے۔

میراں شاہ کو آتے دیکھ کر سب گھوڑوں سے اتر پڑے۔ امیر قلات خان میراں شاہ کے ساتھ چل رہا تھا۔ میراں سواریوں کے پاس جا کر رُکا۔

امیر قلات خان چند قدم آگے بڑھا اور گاڑی پہ پڑے ہوئے زرنگار پردوں کی طرف جھک کر بولا:

"شہزادہ میراں شاہ بن صاحبقراں امیر تیمور گورگان استقبال کے منتظر ہیں۔ شہزادی عالیہ سواری سے باہر قدم رنجہ فرمائیں۔"

پردوں میں حرکت ہوئی۔ چھما چھم کرتی چار کنیزیں گاڑی سے اتریں۔ انہوں نے میراں شاہ کو تعظیم پیش کی۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی کے پردے الٹ دیے گئے اور خانزادہ پورے عروسی جوڑے اور بیش قیمت زیورات سے لدی پھندی دو کنیزوں کے سہارے گاڑی سے اتری۔ یہ دونوں کنیزیں وہی تھیں جو وزیرِ سلطنت نے خانزادہ کی خدمت پر لگائی تھیں اور پھر خانزادہ نے انہیں میراں شاہ کی نگہداشت یا جاسوسی پہ مقرر کیا تھا۔

خانزادہ اور میراں شاہ کے درمیان شادی کے تمام معاملات گزشتہ رات ہی طے پا گئے تھے۔ میراں شاہ نے دونوں کنیزوں اور اپنے غلام کو خانزادہ کے ساتھ کر دیا تھا۔

خانزادہ نے اپنی حویلی پہنچ کر امیر قلات خان کو بلوا لیا تھا۔ امیر قلات اور شاہی غلام نے باہر کے تمام انتظامات کیے اور کنیزوں نے حویلی کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ رات بھر خانزادہ کی حویلی کے اندر اور باہر شادی کی تیاریاں ہوتی رہیں۔

خانزادہ کے لیے عروسی جوڑا اور زیورات محل سے منگوائے گئے تھے۔ دلہن کو دربار تک لے جانے کے لیے شاہی سواریوں کا بھی انتظام کر لیا گیا تھا لیکن تمام باتیں بڑی خاموشی اور رازداری سے کی گئی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی تھی۔

میراں شاہ نے خانزادہ کا استقبال کیا۔ امیروں اور وزیروں نے جھک کر سلامی دی۔ پھر دونوں جلوس کی صورت میں دربار میں داخل ہوئے۔ اس وقت محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں کو خبر ہو چکی تھی۔ ان کا پورا ہجوم دربار میں آ گیا۔ اس وقت چھوٹے بڑے کی تمیز مٹ گئی تھی اور ہر ایک ہنس بول رہا تھا۔ کنیزیں خانزادہ پر نثار ہوئی جا رہی تھیں اور خواجہ سرا دولہا دلہن کے گرد حلقہ بنا کر چل رہے تھے۔

جلوس تخت کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔

میراں شاہ اور خانزادہ مسندِ شاہی پہ بیٹھ گئے۔ قاضیِ شہر نے اپنی نشست سنبھال لی۔ اب انہیں بھی حقیقت کا علم ہو گیا تھا۔ وہی کیا سب کو علم ہو گیا تھا کہ قاضی صاحب میراں شاہ اور خانزادہ کا عقد پڑھانے کے لیے بلوائے گئے ہیں۔ وزیرِ سلطنت ضرور کچھ پریشان تھا۔ وہ تمام رات دربارِ شاہی کے انعقاد کے لیے بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی حویلی میں ایک نیا گل کھلنے والا ہے اور خوارزم کی شہزادی کو دلہن بنایا جا رہا تھا۔

میراں شاہ کے اشارے پر قاضیِ شہر نکاح کے لیے تیار ہوا۔ وزیرِ سلطنت نے میراں شاہ کی طرف سے وکالت کی اور خانزادہ کی طرف سے یہ فرض امیر قلات نے ادا کیا۔ اس طرح میراں شاہ بن تیمور اور خانزادہ بنت آق صوفی کا عقد ہو گیا۔

یہ دونوں کا دوسرا عقد تھا۔ میراں شاہ کی بھی دوسری شادی تھی۔ خانزادہ بیوہ تھی۔ اس کی پہلی شادی میراں شاہ کے بڑے بھائی شہزادہ جہانگیر سے ہوئی لیکن جہانگیر کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ خانزادہ کے جہانگیر سے دو لڑکے پیر محمد اور سلطان محمد تھے۔ یہ دونوں جوان ہو گئے تھے اور امیر تیمور کے ساتھ فتوحات میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے۔

خانزادہ کی شروع ہی سے یہ کوشش تھی کہ کسی طرح اپنے بیٹے کو امیر تیمور کا جانشین بنائے مگر میراں شاہ راستے کا سب سے بڑا روڑا تھا۔ خانزادہ اپنے بیٹوں کے لیے تو راستہ نہ صاف کر سکی لیکن میراں شاہ سے عقدِ ثانی کر کے اس نے پہلا مقام ضرور حاصل کر لیا تھا اور وہ ایک بار پھر ولی عہدِ سلطنت کی بیوی بن کر سامنے آئی۔

خانزادہ اور میراں شاہ کی شادی کی اطلاع امیر تیمور کو نہ دی جا سکی۔ وہ اس وقت بغداد کی طرف کوچ کر رہا تھا۔ سمرقند میں جب اس کی اطلاع پہنچی تو ملکہ سرائے خانم نے اطمینان کا سانس لیا۔ سرائے خانم، خانزادہ کی سوتیلی ساس تھی اور دونوں میں چشمک رہا کرتی تھی۔ جب تک خانزادہ سمرقند میں رہی، خوب خوب ہنگامے ہوئے۔ پھر خانزادہ اپنے میکے اور گنج چلی گئی۔ اس وقت بھی سرائے خانم نے اطمینان کا سانس لیا تھا لیکن اب وہ بالکل ہی مطمئن ہو گئی تھی۔

خانزادہ نے میران شاہ کی بیوی بنتے ہی تبریز کے دربار کا رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ وہ صاحبقراں کے دربار کو دیکھ چکی تھی۔ وہ خود بھی خوارزم کی شہزادی تھی اور اس نے اپنے چچا حسین صوفی کا دربار بھی دیکھا تھا۔ اس دربار میں وہی تیموری قوانین رائج کیے جو سمرقند میں برتے جاتے تھے۔

میران شاہ روز دربار لگانے لگا اور باشش قسم کے درباریوں کو وظیفہ دے کر گھر میں بٹھا دیا گیا۔ اس نے کسی کی نوکری چھینی نہ کسی کو برخاست کیا لیکن دربار سے سب کو دور ہی رکھا۔ وزیر سلطنت سے وہ مطمئن نہ تھی پھر بھی اسے اس کے عہدے پر برقرار رکھا گیا۔ وزیر سلطنت نے بھی خود کو حالات کے سانچے میں ڈھال لیا تاکہ خانزادہ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

خانزادہ نے امیر قلات خان کو امیر الامراء کا عہدہ دیا اور مشیر سلطنت کے فرائض اسے سونپے۔ ایک ہی ماہ میں تبریز کی کایا پلٹ ہو گئی۔ یہ انقلاب بڑی خاموشی سے آیا۔ خانزادہ نے کسی پر سختی نہیں کی۔ اب بھی شعراء حضرات دربار میں حاضری دیتے اور قصیدے پڑھتے۔ گاہے گاہے عیش و عشرت کی محفلیں بھی جمتیں جن میں ہمیشہ خانزادہ میران شاہ کے پہلو میں بیٹھتی۔ اور مغنیوں، رقاصاؤں اور سازندوں کو انعام و اکرام سے نوازتی۔ دربار کے اوقات میں خانزادہ کے لیے تختِ شاہی کے پیچھے ایک دوسرا تخت بچھایا گیا۔ درمیان میں ایک ہی پردہ ڈالا گیا۔ میران شاہ کا کام مسائل کو صرف سننا تھا احکامات خانزادہ جاری کرتی تھی۔

مگر برا ہو فطری خیانت، تعصب اور اسلام دشمنی کا کہ اہل قلم اور مؤرخ جو مسلمانوں کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہوں نے میران شاہ اور خانزادہ کے جھگڑے کو ایک بالکل ہی نئے روپ میں پیش کیا ہے وہ تو اس بات کا اقرار ہی نہیں کرتے کہ خانزادہ اور میران شاہ کی شادی ہوئی تھی۔ ان بے خبر مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اسی زمانے میں ایک یورپین جس کا نام "روئے دے گونزالز دیو" ہے، میران شاہ کی ولایت میں سلطانیہ گیا۔ سلطانیہ کو ہلاکو خان کے پڑپوتے سلطان خدا بندہ نے آباد کیا تھا۔ یہ پہلا مغل سلطان تھا جس نے اسلام قبول کیا اور اس نے سلطانیہ کو دارالسلطنت بنایا تھا۔

گونزالز نے سلطانیہ سے واپس آ کر لوگوں سے بیان کیا کہ "میران شاہ کے پاس ایک عورت گان زادہ رہتی تھی جو اسے چھوڑ کر چلی گئی"۔

ایسے غیر محتاط اور بے خبر راوی کو کیسے اہمیت دی جا سکتی ہے جو گانزادہ (خانزادہ) کا ذکر اس طرح کرتا ہے
[گ]ویا کوئی عام سی عورت تھی حالانکہ خانزادہ ولی عہد شہزادے جہانگیر کی بیوہ تھی اور اس کو تقریباً وہی اختیارات
[حاصل] تھے جو امیر تیمور کی بڑی بیگم سرائے خانم کو حاصل تھے۔ ظفر نامہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ خانزادہ اور میران
[شاہ کا ع]قد ہوا تھا۔

خانزادہ نے ملکی انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور کئی سال تک بڑی خوبی سے حکومت کرتی رہی۔ ایک دن
[اس نے] میران شاہ سے کہا:
"شہزادے بہادر، کبھی آپ نے ایک دانشور کے اس قول پر غور کیا ہے کہ جس فرد، قوم یا سلطنت پر جمود طاری
[ہو جا]ئے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے!"

میران شاہ موٹے دماغ کا انسان تھا۔ خانزادہ کی بات اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ بولا:
"خانزادہ! بعض اوقات تم فلسفیوں جیسی باتیں کرنے لگتی ہو۔ تم اپنی بات کی وضاحت کرو۔ ہماری سمجھ میں کچھ
[نہی]ں آیا۔ جہاں تک زوال کا سوال ہے تو ہر کمال کو زوال لازم ہے لیکن ہم ابھی دنیا کے مالک نہیں بنے۔ ابھی ہم کمال
[تک] نہیں پہنچے اس لیے زوال کا مسئلہ غیر ضروری ہے۔"
"شہزادے! نہ میں فلسفی ہوں اور نہ دانشور"۔ خانزادہ نے کہنا شروع کیا:
"میں اس قدر تعلیم یافتہ بھی نہیں ہوں کہ کوئی نئی بات کہوں۔ میں تو وہی باتیں کہتی ہوں جو میں نے بزرگوں سے
[سنی] یا آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ کیا تم نے صاحبقراں کی زبان سے کسی کا یہ یہ قول نہیں سنا کہ حرکت میں برکت ہے
[اور جمود] کا نام موت ہے۔ امیر اس قول پر عمل کرتے ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ اپنے لشکر کو ہمیشہ حرکت میں
[رکھتے ہ]یں اور نئی فتوحات کے لیے آگے ہی آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اگر لشکر کو جنگ و جدل میں مصروف نہ رکھا جائے تو
[اس کا مس]ئلہ کاہل ہو جاتا ہے امیر کا یہ بھی طریقہ ہے کہ امن کے زمانے میں بھی وہ لشکر کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے اور
[شکار] کے بہانے نکل جاتے ہیں۔"
"سیر و شکار" میران شاہ درمیان میں بولا:
"تم نے خوب یاد دلایا خانزادہ۔ ہمیں شکار کھیلے ایک زمانہ ہو گیا۔ کیوں نہ ہم کچھ دن شکار سے بھی
[دل بہلائ]یں۔"
"شہزادے نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔" خانزادہ خوش ہو کر بولی:
"میں خود یہ تجویز پیش کرنے والی تھی۔ شکار سے ایک تو تفریح کا سامان مہیا ہو گا۔ دوسری طرف بیرکوں
[میں پڑ]ی ہوئی فوج کی سستی اور کاہلی دور ہو جائے گی"۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم شکار پر چلیں گے۔"

میراں شاہ نے فیصلہ کر دیا اور خانزادہ کی طویل فلسفیانہ اور عالمانہ تمہید کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ کسی میراں شاہ کو محل کی رنگین فضا سے نکال کر تاتاریوں کی حقیقی زندگی کی طرف مائل کرے اور اس میں وہ کامیاب ہو گئی تھی۔

خانزادہ نے نہ تو وزیر سلطنت کو معزول کیا تھا اور نہ اس کے اختیارات میں کمی آنے دی تھی لیکن امیر قلا کے ابھر کر سامنے آجانے سے وزیر سلطنت کی شخصیت دب کر رہ گئی تھی لیکن اس میں شکوہ شکایت کرنے کا نہ تھی۔ وہ شکایت کرتا تو کس سے۔ میراں شاہ تو برائے نام حکمران رہ گیا تھا۔ اصل طاقت تو خانزادہ کے ہاتھ اور خانزادہ کی مہربانیوں اور نوازشوں کا مرکز امیر الامراء قلات خان کی ذات تھی۔ خانزادہ نے قلات خان کو بلا کر شکار کا مژدہ سنایا اور انتظامات کی ذمہ داری اس کے سپرد کی۔

قلات خان ضعیف ہو چکا تھا۔ اس کے اعضاء میں اب پہلے جیسی طاقت اور پھرتی نہ رہی تھی۔ اس نے کے حکم پر سر جھکا دیا اور اپنے طور پر انتظامات شروع کر دیے لیکن ضعیفی جو بذات خود ایک مرض ہے وہ اس بار رنگ لگی اور قلات خان بیمار پڑ گیا۔

شکار کے سلسلے میں قلات خان کو خانزادہ کے پاس دن میں کئی کئی بار آنا پڑتا تھا۔ ایک دن قلات خان پہنچا تو وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے قلات خان کے گھر غلام بھیجا۔ غلام نے واپس آکر قلات خان کی علالت کی دی۔ اس بے وقت علالت نے خانزادہ کو اور پریشان کر دیا۔ شکار پر روانگی کا وقت مقرر ہو چکا تھا اور انتظامات اپنے آخری مراحل میں تھے۔ ایسے وقت یہ انتظام کسی اور کو سونپنا کچھ مناسب معلوم نہ ہوتا تھا۔ خانزادہ تمام دن مسئلے پر غور کرتی رہی اور پریشان ہوتی رہی۔

شام ہوئی تو اطلاع دی گئی کہ امیر الامراء قلات خان ڈیوڑھی پر حاضر ہیں۔ خانزادہ کی تمام فکر دور ہو نے فوراً قلات خان کو ملاقات کے لیے بلوا لیا۔

قلات خان نے سامنے پہنچ کر خانزادہ کو سلام کیا۔ خانزادہ کی نظریں قلات خان کا جائزہ لے رہی اسے فوراً محسوس ہو گیا کہ قلات خان کی حالت ٹھیک نہیں اور اسے محل تک پہنچنے میں بھی نا معلوم کتنی تکلیف ہو گی۔ خانزادہ نے اس کی بات سننے سے پہلے ہی کہا:

"خان! تمہیں اس حالت میں ہمارے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم فوراً واپس چلے جاؤ۔ اور مکمل آرام کوئی اور انتظام کر لیں گے۔"

"شہزادی عالیہ!" قلات خان نحیف آواز میں بولا:

"میں واقعی چلنے پھرنے سے معذور ہوں لیکن جو ذمہ داری آپ نے میرے سپرد کی تھی اسے ادھورا بھی نہیں سکتا۔ گو کہ انتظامات مکمل نہ کر سکا لیکن میں ایک ایسے شخص کو اس خدمت پر مامور کرنے کی سفارش کر دوں گا جو بلا ہی نہیں بلکہ مجھ سے بھی زیادہ اچھا انتظام کر سکتا ہے۔"

خانزادہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے بڑی امید سے پوچھا:

"خان! کیا تبریز میں تم جیسا انتظام کرنے والا کوئی اور بھی موجود ہو سکتا ہے؟"

"جی شہزادی عالیہ۔ بلاقو خان مجھ سے بہتر کام کر سکتا ہے۔" قلات خان نے نقاہت سے جواب دیا:

"شکار کے سلسلے میں اب تک جو انتظام ہوا ہے اس میں وہ میرا شریک کار رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ سب کا کیا ہوا ہے۔ میں تو پہلے روز ہی سے بیمار ہو گیا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح شہزادی کے سلام کے لیے حاضری رہتا تھا۔"

"خان! تمہاری سفارش ہے تو ہم اس پر ضرور اعتماد کریں گے۔" خانزادہ نرمی سے بولی:

"بلاقو خان کہاں ہے؟ اسے پیش کیا جائے۔"

"وہ میرے ساتھ آیا ہے شہزادی عالیہ۔" قلات خان نے کہا:

"بلاقو خان میرا بیٹا ہے۔ آپ کا غلام ہے وہ۔"

"اوہ۔" خانزادہ مسکرائی:

"ہمیں سن کے بڑی خوشی ہوئی۔ تمہارا بیٹا تمہارے مشورے سے اس کام کو ضرور مکمل کر سکے گا۔ ہم بھی اس کا رکھیں گے اور پوری مدد کریں گی اس کی۔"

قلات خان نے ایک غلام سے کہہ کر اپنے بیٹے کو اندر بلایا۔ بلاقو خان کا خانزادہ کے حضور میں آنے کا یہ موقع تھا۔ وہ ڈرا ڈرا سا سر جھکائے اندر آیا اور حسب دستور خانزادہ کو سلام کیا۔

"اچھا تو تم ہو قلات خان کے بیٹے۔" خانزادہ نے محسوس کیا کہ بلاقو خان کچھ زیادہ ہی ڈر رہا ہے تو اس نے کہا:

"بلاقو خان! ہم سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کام کے سلسلے میں تمہیں ہمارے پاس دن میں کئی بار پڑے گا۔ مطلق خوف نہ کھاؤ۔ سر اٹھا کر بات کرو ہم سے!"

بلاقو خان ڈر ضرور رہا تھا لیکن اس کے کان خانزادہ کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ جب خانزادہ نے سر اٹھا کر نگو کا حکم دیا تو اس نے جھجکتے ہوئے سر اٹھایا اور خانزادہ سے آنکھیں چار کیں۔ بلاقو خان کے چہرے پر نظر پڑتے انزادہ کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ وہ بڑی حیرت سے بلاقو خان کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

تغلات خان اپنی بیماری کی وجہ سے خانزادہ کی آنکھوں اور دل میں نہ جھانک سکا۔ ورنہ وہ کم از کم یہ تو اندازہ ضرور لگا لیتا کہ بلاقوخان کو دیکھ کر خانزادہ اپنے ماضی میں کھو گئی ہے۔ بلاقوخان پر اس قدر رعب طاری ہوا کر وہ چند لمحوں سے زیادہ خانزادہ سے نظریں چار نہ کر سکا اور اس کا سر جھک گیا۔

آخر خانزادہ نے ایک طویل سانس لی۔ بولی :

"بلاقوخان! ہمیں امید ہے کہ تم اس ادھورے کام کو اپنی محنت اور فراست سے تکمیل تک پہنچاؤ گے مشورے کے لیے ہمارے محل کے دروازے تمہارے لیے ہر دم کھلے رہیں گے تم جس وقت چاہو آ سکتے ہو۔"

"شہزادی عالیہ کی خوشنودی کے لیے غلام اپنی جان لڑا دے گا۔" بلاقوخان نے بڑے ادب سے کہا ؛

"خان بابا کی بیماری سے میں کچھ پریشان ضرور ہوں لیکن انشاء اللہ کام میں کوئی کوتاہی نہ ہوگی۔"

"کیا تمہیں امید ہے کہ ہم مقررہ دن پر شکار کے لیے روانہ ہو سکیں گے؟"

"انشاء اللہ شہزادی عالیہ۔"

"ایک بار پھر سوچ لو بلاقوخان۔ تم کہو تو روانگی ایک ہفتے کے لیے روک دی جائے۔"

"شہزادی عالیہ آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔ انتظامات مقررہ دن سے پہلے ہی مکمل ہو جائیں گے۔"

"کیا تمہیں پوری امید ہے؟"

"میں دعویٰ نہیں کرتا لیکن مجھے یقین ہے کہ میں شہزادی عالیہ کا اعتماد اور خوشنودی حاصل کروں گا۔"

"ہم تمہاری خود اعتمادی سے خوش ہوئے۔"

پھر وہ تغلات خان سے مخاطب ہوئی :

"خان! تمہارے بیٹے میں ہم نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ اس میں ترقی کی امنگ ہے اور یہ ترقی کرے گا بھی۔"

O

شکار کی روانگی کو تین چار دن باقی تھے۔ خانزادہ نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر کی سیر کا پروگرام بنایا۔ میران شاہ نے خود کو شاہی محل میں قید کر رکھا تھا۔ کئی کئی ہفتے بعد وہ محل سے نکلتا۔ اس زمانے میں حکمرانوں اور بادشاہوں میں یہ دستور تھا کہ وہ عوام کو "دیدار" کراتے تھے۔ اس سے دو طرفہ فائدہ تھا۔ جب حاکم محل کے جھروکے میں بیٹھ کر یا کوچہ و بازار میں جلوس کی شکل میں جا کر عوام کو دیدار سے نوازتا تو عوام کے دل میں اس کی عظمت بڑھ

۔ دوسری طرف حاکمِ وقت کو بھی یہ خیال رہتا کہ وہ شکرا اور امراء کا ہی حاکم نہیں بلکہ عوام بھی اس سے کچھ توقعات ...تے ہیں۔ خانزادہ نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ عوام میں میران شاہ روشناس ہو جائے۔ سیرِ شہر کا اعلان ...یا۔

اس سیر کا انتظام بھی جواں عمر بلاقوخان کے سپرد ہوا۔

بلاقوخان بڑا خوبصورت تاتاری جوان تھا۔ اس کی ماں ترکمان قبیلے سے تعلق رکھتی تھی اس لیے بلاقوخان میں ...ی اور ترکمانی خون نے مل کر ایک عجیب وجاہت پیدا کر دی تھی جس کا عکس بلاقوخان کے چہرے پر ہر وقت پڑتا ...ا۔

خانزادہ بھی ترکمان باپ کی بیٹی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کا بلاقوخان کی طرف زیادہ جھکاؤ اسی وجہ سے ہو۔ ایک خیال ...ہے کہ خانزادہ کی بلاقوخان میں دلچسپی اس وجہ سے تھی کہ اس کا چہرہ مرحوم شہزادے جہانگیر سے ملتا جلتا تھا۔ ...بھی کہتے ہیں کہ بلاقوخان اور خانزادہ کے بڑے بیٹے پیر محمد میں بہت زیادہ مشابہت تھی۔ اس سلسلے میں ...ت وثوق سے نہیں کہی جا سکتی اور اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں کہ خانزادہ کا کردار کسی طور پر داغدار ...ایک اعلیٰ دماغ اور بڑے رکھ رکھاؤ والی عورت تھی۔ تبریز پہنچنے کے بعد بھی اس کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ ...تک اس کا میران شاہ کے ساتھ عقد نہیں ہو گیا اس نے اس کے شاہی محل میں ایک رات بھی بسر ...

شکار کے انتظامات کے سلسلے میں بلاقوخان کی محل میں آمد و رفت بڑھ گئی۔ دن میں اسے کئی کئی بار خانزاد ...پڑتا۔ اس طرح بلاقوخان کو خانزادہ کے مزاج کو سمجھنے کا بہت موقع ملا۔ اور اسے بڑی حد تک اس کے ...دخل حاصل ہو گیا۔

خانزادہ نے بھی اس جوان کی صلاحیتوں کی پوری پوری پذیرائی کی اور جب اس نے شکار کے مقررہ دن سے ...لے تمام انتظامات مکمل کرنے کی اطلاع دی تو خانزادہ اس قدر خوش ہوئی کہ میران شاہ سے کہہ کر اس نے ...دار و غۂ اصطبل کے اعلیٰ عہدے پر فائز کرا دیا۔ کہنے کو تو بلاقوخان لشکر اور شاہی گھوڑوں کی دیکھ بھال ...ام کا ناظم تھا لیکن اس کے عہدے میں تمام شاہی تفریحات کی نظامت بھی شامل تھی اور بلاقوخان نے اپنے ...گی سے اس قدر خوش کیا کہ وہ اب اپنے ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے بلاقوخان ہی کو طلب ...

...ار پر روانگی کے وقت پانچ ہزار سوار میدان میں صف بستہ ہوئے۔ ان میں تاتاری سواروں کی تعداد ...ان کے علاوہ مفتوحہ علاقوں کے نبرد آزما بھی شامل تھے جو شکست کھانے کے بعد تیموری لشکر میں شامل

ہو گئے تھے۔ اور مختلف مذاہب کے پابند تھے۔

تیمور نے میراں شاہ کے ساتھ کثیر تعداد میں ان نیم وحشی سواروں کا ایک دستہ بھی روانہ کیا تھا جنہوں نے تیموری حملوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ خیمے، ڈیرے، کھانے پینے کا سامان اور تمام ضروری چیزیں ایک روز پیشتر پہلی منزل پر بھیج دی گئی تھیں۔

جلوس روانہ ہوا۔ میراں شاہ اور خانزادہ گھوڑوں پر سوار آگے آگے چل رہے تھے۔ محافظ دستے ان کے دائیں بائیں اور پشت پر تھے۔ یہ جلوس جب شہر کی سڑکوں سے گزرا تو تبریز کے تمام مرد و زن اسے دیکھنے کے لیے سڑکوں اور کوٹھوں پر امڈ آئے۔ ایران کی عورتیں عام طور پر نقاب ڈالتی تھیں جبکہ تاتاری خواتین میں پردہ کا کوئی خاص رواج نہ تھا۔ خانزادہ خود بھی پردہ نہ کرتی تھی لیکن جب عوام میں جاتی تو ہلکا سا اک نقاب چہرے پر ڈال لیتی۔ اس وقت بھی وہ چہرے پر اکہرا نقاب ڈالے ہوئے تھی۔

شاہی سواری تبریز سے دوپہر کے وقت روانہ ہوئی اور بغیر رکے شام تک سفر کرتی رہی۔ کھانے کا انتظام بھی پہلی منزل پر کیا گیا تھا۔ منزل پر پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ کیا۔ رات گزارنے کے لیے خیمے لگے ہوئے تھے۔ آج کا سفر مختصر تھا۔

کھانے کے بعد میراں شاہ نے محفلِ نشاط کی خواہش کی۔ خانزادہ کو اس بات کا پہلے سے خیال تھا۔ اس نے بلاقو خان سے کہہ کر رقاصاؤں اور مغنّی عورتوں کے کئی طائفے ساتھ لے لیے تھے۔ میراں شاہ کثرت سے شراب پیتا تھا لیکن خانزادہ نے اس میں کافی حد تک کمی کرا دی تھی۔

میراں شاہ نے جب شراب حاضر کرنے کا حکم دیا تو خانزادہ نے اسے اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ محفل میں بیٹھ کے شراب پینے کے بجائے شراب پی کر محفل میں جائے تاکہ دوسروں کو محفل میں شراب پینے کی جرأت نہ ہو۔ خانزادہ نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ میراں شاہ کی شراب خوری میں کمی ہو جائے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میراں شاہ شراب کے علاوہ دوسری منشیات کا بھی عادی تھا اور یہ منشیات اسے اپنے خاص خادموں کے ذریعے ملتی رہتی تھیں جس کا علم خانزادہ کو نہ ہو پاتا تھا۔

محفلِ نشاط کا آغاز ہوا۔ ناچ و گانا شروع ہی ہوا تھا کہ میراں شاہ پر مدہوشی طاری ہونے لگی۔ خانزادہ حیران تھی کہ اس قدر کم شراب پینے کے باوجود میراں شاہ پر غشی کیوں طاری ہو رہی ہے؟ میراں شاہ نے سرِ محفل کچھ ایسی ناشائستہ باتیں کیں کہ خانزادہ کو محفل برخاست کرنا پڑی اور وہ میراں شاہ کو لے کر خیمے میں چلی گئی۔

میراں شاہ خیمے میں پہنچتے ہی بے ہوش سا ہو گیا اور بے خبر ہو کر ایک طرف پڑ گیا۔ خانزادہ نے

...کے سرہانے بیٹھ کر گزاری۔

...صبح کو شکار کا آغاز ہونا تھا لیکن میراں شاہ کے پوری طرح حواس درست نہیں ہوئے تھے۔ خانزادہ نے ...کو بلوا کر حکم دیا کہ لشکر کو شکار کھیلنے کی اجازت ہے اور وہ گروہوں میں بٹ کے شکار سے دل بہلا سکتے ...ں شاہ کی حالت اس نے بلاقو خان سے بھی چھپائی۔ اور یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا کہ شہزادے ابھی آرام ...، کچھ دن چڑھے ہم لوگ شکار پر روانہ ہوں گے۔

بلاقو خان مطمئن ہو کر چلا گیا اور اس نے باہر خانزادہ کا حکم سنا دیا۔ تاتاری سوار شکار کی اجازت ملتے ہی ...ی صورت میں شکار کھیلنے چلے گئے۔

دوپہر کے وقت میراں شاہ کے حواس درست ہوئے تو خانزادہ کو اطمینان ہوا۔ خانزادہ چاہتی تھی کہ میراں شاہ ...روز مکمل آرام کر لے تاکہ شکار کا صحیح لطف حاصل ہو سکے لیکن میراں شاہ ضد پکڑ گیا۔ اس نے اسی وقت ...ے کا فیصلہ کیا۔ خانزادہ نے بھی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور شاہی محافظوں کو لے کر شکار کے لیے چل پڑی۔ ...خانزادہ اور میراں شاہ تھے۔ ان کے پیچھے بلاقو خان بھی ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ زمین ہموار مگر پتھریلی تھی۔ ایسی ...ڑے دوڑانا کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ یہ لوگ معمولی رفتار سے گھوڑے دوڑاتے جنگل کے قریب پہنچے۔ ...پتہ نہیں کیا ہوا کہ میراں شاہ کا گھوڑا اک دم بدکا اور پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ ممکن ہے میراں شاہ ...نشے میں ہو لیکن وہ تاتاری باپ کا بیٹا تھا اس نے خود کو گھوڑے کی پیٹھ پر سنبھالے رکھا اور اس پر ...ی کوشش کی۔ گھوڑے کی راسیں کھینچیں تو وہ اور زیادہ الف ہو گیا اور اس نے پچھلے پیر زمین پر ...لو چار پانچ جھٹکے دیے۔ پھر پچھلے پیروں سے دولتیاں جھاڑنا شروع کر دیں۔

...انزادہ فوراً گھوڑا بڑھا کر اس کے قریب پہنچی۔ دوسری طرف سے بلاقو خان بھی آ گیا۔ دونوں نے گھوڑے ...لنے کی کوشش کی لیکن گھوڑا منہ زور اور بے قابو ہو گیا۔ وہ اگلے پچھلے پیر اچھالتا ہوا ایک طرف ...کار خانزادہ نے محافظوں کو حکم دیا کہ میراں شاہ کے گھوڑے کو گھیرے میں لے لیں اور کسی طرح سے ...گھوڑے سے اتار دیں۔

...سوار اس کوشش میں لگ گئے۔ انہوں نے میراں شاہ کے گھوڑے کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ لیکن میراں شاہ ...میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بے قابو گھوڑا اتنی تیزی سے دائرے میں گھوم رہا تھا اور پورے جسم کو کچھ ...ٹ دے رہا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہو گیا۔ اس کشمکش میں گھوڑے کی دم خانزادہ کے منہ پر ...لہرائی اور لکیریں ڈال گئی۔

...ں شاہ کو کبھی ایسے منہ زور گھوڑے پر بیٹھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب گھوڑا کسی طرح قابو میں نہ آیا تو

اس نے یہی بہتر خیال کیا کہ گھوڑے سے کود پڑے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ شاید اس خیال سے اس نے اپنا ایک پیر رکاب سے نکالا لیکن اس کی بدقسمتی کہ گھوڑے نے اسی وقت ایک اونچی جست لگائی۔ میراں شاہ کے ہاتھوں سے رکابیں چھوٹ گئیں۔ دوسرا پیر بھی رکاب سے نکل کر گھوڑے کی پیٹھ سے تقریباً پانچ فٹ ہوا میں بلند ہو گیا اور وہ قلابازی کھاتے ہوئے پتھریلی زمین پر الٹ کر گرا۔ پہلے اس کا سر زمین سے ٹکرایا، پھر دھڑ کسی تختے کی مانند گر پڑا۔ گھوڑا سوار سے آزاد ہو کر تیزی سے ایک طرف بھاگ نکلا۔

خانزادہ، بلاقو خان اور دوسرے تمام لوگ گھوڑوں سے کود کود کر میراں شاہ کے گرد جمع ہو گئے۔ خانزادہ نے میراں شاہ کا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ اس کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی اور خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ ضرب پڑنے سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے زخم میں ریشم جلا کر بھرا گیا پھر پٹی باندھ دی گئی۔ خانزادہ نے تبریز واپس ہونے کا حکم دیا اور اس طرح یہ لوگ شکار چھوڑ کر افسردہ افسردہ اور پریشان واپس تبریز آ گئے۔

تبریز میں ایک سے ایک بڑا جراح اور حکیم موجود تھا لیکن تین دن تک مسلسل کوشش کرنے کے باوجود وہ میراں شاہ کو ہوش میں نہ لا سکے۔ پھر کسی نے بتایا کہ سلطانیہ میں کچھ جراح اور طبیب ایسے ہیں جو زخم ٹھیک کرنے اور بے ہوشی دور کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ خانزادہ نے انہیں فوراً طلب کر لیا۔ پھر تمام طبیب اور جراح صلاح مشورہ کرنے لگے۔ انہوں نے میراں شاہ کے زخم کا پھر سے معائنہ کیا۔ آخر کار وہ ایک نتیجے پر پہنچے۔ پھر وہ سب ہاتھ باندھ کر خانزادہ کے سامنے حاضر ہوئے اور ایک طبیب نے بڑی افسردگی سے کہا:

"شہزادی عالیہ! خداوند تعالیٰ نے ہر مرض کی دوا اور ہر تکلیف کا مداوا پیدا کیا ہے۔ وہ مردے میں بھی جان ڈال سکتا ہے۔ ہم سب شہزادے کا معائنہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر شہزادے بہادر مزید کچھ دن تک بے ہوش رہے تو خاکم بدہن پتہ نہیں کیا ہو جائے۔ زخم تو گہرا نہیں لیکن شہزادے کے دماغ میں چوٹ آئی ہے اور بے ہوشی اسی وجہ سے ہے۔ ہم سوائے دعا کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

شہزادی خانزادہ گیارہ دن اور گیارہ راتوں سے اک مسلسل کرب میں مبتلا تھی۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا دھیان۔ وہ لباس جسے پہن کر وہ میراں شاہ کے ساتھ شکار پر چلی تھی اب تک اس کے جسم پر چپکا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں بے خوابی کی وجہ سے بے نور دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ وہ بڑی امیدوں سے تبریز آئی تھی لیکن اس حادثے نے اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

شہزادی نے بڑے صبر و تحمل سے کہا:

"بزرگ اور باکمال طبیبو! جب آپ یہ کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے تو پھر آپ سے بے ہوشی کی دوا کیوں نہیں حاصل کی جاتی۔ کیا ہمارے مذہب میں خدا کی ذات سے ناامید ہونا گناہ نہیں۔ اگر شہزادے کی

زندگی ان کے ہوش میں آنے پر موقوف ہے تو پھر انہیں ہوش میں لانے کے لیے کوئی اکسیر کیوں نہیں تیار کرتے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ لوگ مل کر کوشش کریں تو خدا ضرور آپ کی مدد کرے گا اور آپ کو کامیاب کرے گا۔ جہاں تک دعا کا تعلق ہے شہزادے کے لیے دعائیں کی جا رہی ہیں۔ قرآن کی تلاوت جاری ہے۔ ہم ایک عام اعلان کے ذریعے رعایا سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری دعاؤں میں شریک ہوں لیکن اس کے ساتھ آپ بھی کوششیں جاری رکھیں۔ نہ ہم ناامید ہیں نہ آپ کو ہونا چاہیے۔"

شہزادی کی باتوں کا اطباء پر بڑا اثر ہوا اور وہ ایک بار پھر کوششیں کرنے لگ گئے۔ دوسری طرف شہزادی نے شہزادے کی صحت یابی کے لیے ایک اعلان کے ذریعے درخواست کی۔ گھر گھر قرآن خوانی ہونے لگی۔ مسجدیں قرآن حکیم کی روح افزا اور ایمان افروز قرأت سے گونج اٹھیں۔ اطباء نے چوبیس گھنٹے کی لگاتار کوشش سے ایک عرق تیار کیا اور پھر شہزادی کی موجودگی میں شہزادے کے بند جبڑے کھول کر عرق کے دو چمچے اس کے حلق سے اتار دیے۔

یہ عرق واقعی اکسیر ثابت ہوا۔ دوا اور دعا نے ایک ساتھ کام کیا اور شہزادے کے حلق سے عرق اترتے ہی اس کی ڈوبتی نبضوں میں حرارت پیدا ہوئی۔ اور جسم میں حرکت آ گئی۔

سب کی نظریں شہزادے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر ذرا دیر بعد شہزادے کے پپوٹے ہلے اور اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔

"مسجدوں میں نمازِ شکرانہ ادا کی جائے۔" خانزادہ کی پُررعب آواز کمرے میں گونجی۔

بلاقو خان آواز سنتے ہی باہر کی طرف لپکا۔ خانزادہ بھی اٹھنے لگی تو میراں شاہ بولا:

"کہاں جا رہی ہو شہزادی؟"

پھر اس نے سر گھما کر کمرے میں دیکھتے ہوئے پوچھا:

"یہ کون لوگ ہیں؟ انہیں کیوں بلایا گیا ہے؟"

"شہزادے!" خانزادہ نے محبت سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا:

"اللہ نے آپ کو شفا دی۔ ہم اس کے حضور شکرانہ پیش کرنے جا رہے ہیں اور یہ لوگ وہ ہیں۔" خانزادہ نے طبیبوں کی طرف دیکھ کے کہا:

"جن کی دوا نے تریاق کا کام کیا اور آپ نے فوراً آنکھ کھول دی۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میراں شاہ کی تیوریاں چڑھ گئیں:

"کیا ہم بیمار تھے؟ کیا ہماری آنکھیں بند تھیں؟"

"ولی عہد بہادر۔" ایک طبیب ادب سے بولا۔ "میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ زیادہ گفتگو سے گریز کیجیے

ابھی آپ میں نقاہت باقی ہے۔"

"گستاخ! تو کون ہے؟" میراں شاہ زور سے چیخا پھر خانزادہ کو دیکھا:

"شہزادی اس شخص کو ہماری گفتگو میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

شہزادی کو کچھ گھبراہٹ پیدا ہوئی مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا اور بولی:

"شہزادے بہادر۔ ہم اور آپ شکار پر گئے تھے۔ وہاں ایک منہ زور گھوڑے نے ٹھوکر مار کر آپ کو زمین پر گرا دیا تھا۔ سر پر شدید چوٹ آنے کی وجہ سے آپ بے ہوش ہو گئے تھے۔ اس کا اثر ابھی تک آپ پر ہے۔"

میراں شاہ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر سر پر ہاتھ پھیرا۔ بولا:

"ہاں شہزادی! ہم بھول گئے تھے۔ ہم گھوڑے سے گر گئے تھے۔ وہ گھوڑا کہاں ہے؟ اس منحوس گھوڑے کے ہمارے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ طبیب ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارا علاج کیا ہے انہیں دس دس ہزار دینار سرخ اور پچاس پچاس گھوڑے انعام دیے جائیں۔"

میراں شاہ کی الٹی سیدھی باتیں سن کے طبیب پہلے تو گھبرا گئے تھے لیکن اب ان سب کو اطمینان ہوا کہ چوٹ کا اثر جلد ہی زائل ہو گیا۔

"اچھا شہزادے ہم نماز پڑھ کے ابھی آتے ہیں۔" خانزادہ نے نرمی سے کہا۔

"نماز۔۔۔! کہاں جا رہی ہو تم؟"

"شکرانے کی نماز پڑھنے۔"

"ہم پوچھتے ہیں تم کہاں جا رہی ہو؟"

شہزادی نے حیرت سے میراں شاہ کو دیکھا۔ پھر فوراً ہی سنبھل گئی اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی:

"ہم آپ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتے ہیں۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ آپ آرام فرمائیے۔"

میراں شاہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ بولا:

"وہ منحوس گھوڑا کہاں ہے؟"

"کون سا گھوڑا؟" خانزادہ نے چونک کے پوچھا۔ اسے پریشانی میں یاد نہ رہا کہ میراں شاہ نے گھوڑے کے ٹکڑے کرنے کو کہا تھا۔

"تم ہمیں بے وقوف سمجھتی ہو خانزادہ؟" شہزادہ وحشیوں کی طرح اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ "کیا یہ جھوٹ ہے کہ ہم اس صاحبقراں امیر تیمور کی اولاد ہیں جو پوری دنیا کا بادشاہ ہے۔"

"شہزادے!" خانزادہ نے بات بنانے کے لیے کہا:

"اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ آپ صاحبقراں امیر تیمور کے ولی عہد ہیں اور آپ ہی تیموری تخت و تاج کے وارث ہیں۔"

"تم بہت عقلمند ہو خانزادہ۔" میراں شاہ نے بے تکا سا قہقہہ لگایا اور پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا:

"وہ منحوس گھوڑا کہاں ہے؟ اس میں بدروح گھسی ہوئی ہے۔ اس کا مارا جانا ضروری ہے۔"

"ابھی حاضر کیا جاتا ہے شہزادے۔ آپ آرام فرمائیے۔"

خانزادہ سخت پریشان تھی۔ اسے علم تھا کہ وہ گھوڑا میراں شاہ کو گرا کر کسی طرف بھاگ گیا تھا اور گڑبڑ کی وجہ سے اسے کسی نے تلاش بھی نہیں کیا تھا۔ اسے ڈھونڈ کے لانے میں وقت لگتا تھا لیکن میراں شاہ اسے فوراً ختم کرانا چاہتا تھا۔ اس نے پریشان نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

باقو خان شکرانے کی نماز کا اعلان کرا کے واپس آ گیا تھا اور دور ایک کونے میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ خانزادہ نے اسے اشارے سے قریب بلایا:

"دیکھو باقو خان!" خانزادہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا:

"شہزادے جس منحوس گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کھیلنے تشریف لے گئے تھے اس گھوڑے کو فوراً حاضر کرو۔ بالکل وہی ساز چڑھا کے۔۔۔ دیکھو باقو خان۔۔۔ وہی ساز۔۔۔ وہی گھوڑا۔۔۔ وہی گھوڑا فوراً یہاں حاضر کیا جائے۔"

باقو خان بڑا ذہین نوجوان تھا۔ وہ شہزادی کا مطلب فوراً سمجھ گیا۔ سر جھکا کے بولا:

"شہزادی عالیہ! ابھی حکم کی تعمیل ہوتی ہے۔ بس ابھی ابھی۔"

باقو خان جلدی سے باہر نکل گیا۔

"خانزادہ! یہ ہمارے سر میں درد کیوں ہو رہا ہے؟" میراں شاہ پھر بہکنے لگا۔

"شہزادے آپ لیٹ جائیے۔ سر میں زخم ہونے کی وجہ سے درد ہو رہا ہے۔"

خانزادہ شکار پر جا کے پھنس گئی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے شکار کا حکم ہی کیوں دیا۔

"ہاں۔ ہمارے سر میں چوٹ لگی ہے۔" میراں شاہ نے سر پر ہاتھ پھیرا:

"مگر وہ گھوڑا۔۔۔ گھوڑا اب تک کیوں نہیں آیا؟"

خانزادہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ باقو خان اندر داخل ہوا۔ خانزادہ نے اسے بڑی پُر امید نظروں سے دیکھا۔ وہ پریشان تھی کہ اس نے باقو خان کو اشاروں کنایوں میں جو بات سمجھائی تھی، خدا جانے وہ سمجھ بھی سکا تھا یا نہیں!

بلاقوخان فوراً سلام کے لیے جھکا اور ادب سے بولا:

"شہزادی صاحبہ! وہ بدسرشت گھوڑا حاضر ہے۔ شہزادے حضور حجرے سے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔"

"ہاں ہاں ہم اسے دیکھیں گے۔" میراں شاہ بستر سے اتر کر حجرے کی طرف بڑھا۔

عقل مند بلاقوخان نے خانزادہ کی گفتگو کو بڑے غور سے سنا تھا۔ وہ داروغۂ اصطبل تھا۔ اس نے فوراً ہی اصطبل پہنچ کے اسی نسل اور قدوقامت کا ایک گھوڑا نکلوایا اور گھوڑے کو ویسا ہی مرصع ساز سے آراستہ کر کے میدان میں لے آیا۔ اس نے جان بوجھ کے گھوڑے کو حجرے کے سے دور کھڑا کیا تاکہ میراں شاہ کی نظریں دھوکہ کھا جائیں اور وہ اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوا۔

میراں شاہ نے گھوڑے کو دیکھتے ہی ایک بھیانک قہقہہ لگایا:

"یہی ہے وہ منحوس گھوڑا جس نے صاحبقراں کے ولی عہد کو اپنی پشت سے گرایا تھا۔"

پھر اس نے حجرے سے گردن نیچے لٹکائی اور چیخ کر بولا:

"او ذلیل گھوڑے تو نے ہمارے ساتھ گستاخی کی۔ تجھے ہمارا ذرا بھی خوف نہ آیا۔ تو نے ہمارے عتاب کو آواز دی ہے۔ دیکھ تیرا کتنا خوفناک انجام ہوتا ہے۔"

میراں شاہ نے حکم دیا کہ گھوڑے کے تمام اعضاء ایک ایک کر کے کاٹے جائیں۔

بلاقوخان نے یہ ناگوار فرض بھی خود ادا کیا۔ اس نے تلوار نکال کر ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ گھوڑے کی گردن اس کے جسم سے الگ ہو گئی۔ اور اس کا مُردہ بدن زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

میراں شاہ حجرے میں بیٹھا برابر قہقہے لگا رہا تھا۔ شاید اسے اس منظر سے فرحت محسوس ہو رہی تھی اور اس کے پاگل پن کو سکون مل رہا تھا۔

بلاقوخان نے چند آدمیوں کی مدد سے بے قصور گھوڑے کے تمام اعضا الگ کرائے۔ پھر انہیں اوپر تلے رکھ کر ایک مینار سا بنا دیا۔

میراں شاہ بالکل پُرسکون ہو گیا۔ وہ حجرے سے واپس آ کر بستر پر لیٹ گیا اور جلد ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔

خانزادہ طبیبوں کو لے کر دوسرے کمرے میں آ گئی اور ان سے دیر تک میراں شاہ کی جنونی کیفیت کے بارے میں گفتگو کرتی رہی۔ طبیبوں نے اسے مشورہ دیا کہ میراں شاہ کے ہر حکم کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے تاکہ اس میں ضد اور چڑچڑاپن نہ پیدا ہو ورنہ یہ مرض جس کا ابھی آغاز ہوا ہے اور زیادہ بڑھ جائے گا۔

میراں شاہ کئی گھنٹے تک گہری نیند سوتا رہا۔ پھر جب وہ بیدار ہوا تو بالکل ہوش و حواس میں تھا اور کوئی اندازہ

سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہی شہزادہ پاگلوں جیسی باتیں کر رہا تھا۔

خانزادہ کی تمام کلفت دور ہو گئی۔ اسے میراں شاہ سے واقعی محبت ہو گئی تھی۔ اس نے کئی راتیں میراں شاہ کے سرہانے جاگ کر گزاری تھیں۔

اب میراں شاہ کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ تمام وقت خاموش خاموش رہتا۔ اس نے دربار کے تمام لوگوں سے قطع تعلق کر لیا اور محل ہی میں گوشہ نشین ہو گیا لیکن یہ گوشہ نشینی پہلے جیسی نہ تھی۔ اسے نہ نشاط کی خواہش تھی اور نہ شراب و کباب کی۔ سوائے خانزادہ کے وہ کسی اور سے بالکل گفتگو نہ کرتا۔ جو کھانے کو ملتا وہ چپ چاپ قبول کر لیتا۔ کسی کسی وقت اس کی طبیعت میں گھبراہٹ پیدا ہوتی تو اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ خانزادہ اسے باغ کی سیر کو لے جاتی یا شاہی سواری میں بٹھا کر دور باغات میں نکل جاتی۔ باغات کی تازہ ہوا سے اس کی طبیعت پر اچھا اثر پڑتا اور اس کی وحشت دور ہو جاتی۔

شہزادی کے لیے یہی غنیمت تھا کہ وہ رات دن اس کی خدمت میں لگی رہتی۔ اسے امید تھی کہ میراں شاہ بہت جلد اصلی حالت میں آ جائے گا۔ طبیبوں نے بھی اسے ایسی ہی تسلیاں دی تھیں۔

دربار کی رونقیں ختم ہو گئی تھیں۔ محل اور باغات پر اداسی طاری ہو گئی تھی۔ کنیزیں سرگوشیوں میں گفتگو کرتیں۔ چلتیں تو جیسے پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی ہوں۔

خانزادہ کی بھاگ دوڑ میراں شاہ کے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وزیر سلطنت اور قلات خان اس سے ملنے آتے، خانزادہ ان سے بہت مختصر گفتگو کرتی۔ اسے ڈر لگا رہتا کہ کہیں میراں شاہ کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔ قلات خان کو شاہی محل کے مہمان خانے میں قیام کرنے کا حکم دیا تھا۔ خانزادہ کو صرف اسی پر اعتماد تھا اور وہ بھی خانزادہ کا کام دیانت داری سے کرتا تھا۔ طبیبوں اور خانزادہ کے درمیان وہی رابطے کا کام کرتا تھا۔ طبیبوں کا خیال تھا کہ میراں شاہ کی یہ خاموشی اور طبیعت کا سکون صحت کی نشانی ہرگز نہیں بلکہ کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ سمندر طوفان سے پہلے پُرسکون ہو جایا کرتا ہے لیکن انہوں نے یہ بات خانزادہ کو نہیں بتائی تھی۔ وہ شہزادی کے حال سے واقف تھے۔ اسے یہ خبر دے کر اور پریشان ہی کرنا تھا۔ وہ اپنی طرف سے علاج جاری رکھے ہوئے تھے۔ بہتر سے بہتر مشروبات اور عرقیات تیار کرتے اور میراں شاہ کو استعمال کراتے۔

پھر ایک سال اسی کشمکش میں گزر گیا۔ شہزادے کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ بد مزاجی کی خاموشی کے سوا اور کوئی بات ایسی نظر نہ آئی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ شہزادے کی دماغی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ طبیبوں کے خیال کے مطابق یہ خاموشی بھی ایک مرض تھا جو کسی وقت بھی خطرناک صورت اختیار کر سکتا تھا۔

خانزادہ کو مشورہ دیا گیا کہ شہزادے کو ہنسنے بولنے پر مجبور کیا جائے تاکہ اس کے دماغ کو فرحت حاصل ہو اور وہ اپنی پہلی حالت کی طرف مائل ہو۔

خانزادہ نے شہزادے کے تمام نااہل اور بیہودہ ندیموں کو برخاست کر دیا تھا۔ رقص و سرود کی محفلیں بھی تقریباً ختم ہو گئی تھیں۔ طبیبوں کے کہنے پر اس نے چند مسخرے قسم کے ندیموں کو طلب کیا اور انہیں ضروری ہدایات دے کر میران شاہ کے حضور پیش کیا۔

یہ لوگ تو کسی ایسے موقعے کے منتظر ہی تھے۔ وہ میران شاہ کے سامنے پہنچ کر کھل کھیلے۔ انہوں نے ایسی شگفتہ گفتگو کی اور ایسے ایسے چٹکلے چھوڑے کہ میران شاہ کے سنجیدہ اور سپاٹ چہرے پر دفعتاً ہنسی آ گئی۔ ایک دن تک وہ ان کی پرلطف باتوں پر صرف مسکراتا رہا۔ پھر اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ خانزادہ کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے ندیموں کو بہت انعام دیا اور حکم دیا کہ شہزادے کو ہر وقت مسرور رکھیں اور طبیعت پر گرانی نہ آنے دیں۔

محلات کی رونقیں دھیرے دھیرے واپس آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی رقص و سرود کی محفلیں بھی جمتیں لیکن محلات سے باہر تاتاری لشکرگاہ میں کچھ اور ہی طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور عجیب عجیب سی افواہیں اڑ رہی تھیں۔ تاتاری لشکر میں بہت سے ایسے مغل بھی تھے جو شکست کھا کر تیمور کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ تیمور کسی لشکری کے مذہب میں دخل نہ دیتا تھا۔ مغل اب تک بے دین تھے اور آسمانی روحوں پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں آسمانی روحیں ہی دنیا کی حاکم تھیں۔ ان کی پسند اور ناپسند سے دنیا میں انقلاب آتے تھے۔

ایک دن ایک مغل سردار نے ایک تاتاری سے کہا:

"سردار، ہمارے حاکم کے جسم میں بدروح حلول کر گئی ہے۔ جبھی تو وہ اب تک اچھے نہیں ہوئے۔ اگر تم پسند کرو تو میں شمال سے کسی اچھے جادوگر کو لے آؤں۔ وہ اس بدروح کو حاکم کے جسم سے نکال کے جلا ڈالے گا پھر حاکم فوراً ہی اچھے ہو جائیں گے۔"

تاتاری بھی مغلوں کی طرح وہمی تھے۔ میدانِ جنگ میں جب وہ موت کے سامنے ہوتے تو پہاڑوں سے بھی ٹکرا جاتے لیکن اگر ان کا گھوڑا گھبرا کر مر جاتا تو وہ خوف زدہ ہو جاتے۔ پھر وہ خواہ کتنی ہی اہم مہم پر کیوں نہ ہوں "اسے فوراً" منحوس سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے اور اس کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد ان میں تغیر پیدا ہوا تھا اور ان کے توہمات بھی کم ہو گئے تھے۔

یہ سردار بھی مسلمان تھا۔ اس نے مغل سردار کی بات غور سے سنی۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا:

"یہ بات نہیں ہے مغل خان۔ دراصل امیر صاحبقراں ہمارے حاکم سے ناراض ہیں۔ اسی لیے خدا شہزادے کو سزا دے رہا ہے۔"

ایک دوسرے تاتاری نے اس بات میں اور قوت پیدا کرنے کے لیے کہا:

"بالکل یہی بات ہے۔ شہزادے کو خدا کی طرف سے سزا مل رہی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں جب شہزادہ گھوڑے سے گرا تھا تو پہلے اس کا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔ یہ سزا کی نشانی ہے۔ اسی وجہ سے تو وہ پاگل ہو گیا ہے۔"

"کیا ہمارے امیر کو اس بات کی خبر ہو گئی ہے؟" مغل نے دخل دیا۔

"ہمارے امیر دنیا کے بادشاہ ہیں۔ وہ اس وقت عراق کو فتح کرنے گئے ہیں۔" تاتاری نے لاپروائی سے کہا۔ گویا یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں جس کی خبر تیمور کو ہونا ضروری تھی۔

مغل کو اطمینان نہ ہوا۔ اس نے کہا:

"شہزادے بہادر ولی عہد ہیں۔ ہمیں ان کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔ اگر آپ سالار حکم دیں تو میں عراق جا کر امیر کو خبر کر دوں۔"

"ہمیں ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں۔" تاتاری نے کہا:

"ہمارا تو فرض یہ ہے کہ شہزادے کے ہر حکم کو مانتے رہیں اور بس۔ آخر وہ ہمارے امیر کے بیٹے ہیں۔"

مغل اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ تاتاری امیر تیمور کے بیٹوں کی بھی اسی طرح عزت کرتے ہیں۔ عزت و تکریم ان کی نظر میں امیر تیمور کی تھی۔ شہزادے کے لیے وہ جان بھی دے سکتے تھے لیکن اس کے صحیح یا غلط حکم سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تبریز کے حالات کی تیمور کو کئی سال تک کوئی صحیح خبر نہ مل سکی۔

دوسرے سال خانزادہ کے بطن سے میران شاہ کا ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام امیرزادہ کراخلیل سلطان رکھا گیا۔ امیرزادے کی پیدائش پر خوب جشن منایا گیا۔

اس وقت میران شاہ پر پاگل پن کا دوسرا دورہ نہ پڑا تھا۔ رسومات بخیر و خوبی ہوئیں۔ خانزادہ نے بچے کی پیدائش کی اطلاع امیر تیمور کے پاس سمرقند بھیجی۔ تیمور کسی اہم مہم پر جانے کی تیاری کر رہا تھا اس لیے اس خبر پر زیادہ توجہ نہ دے سکا لیکن اس نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد تبریز کا دورہ کرے گا اور امرا و وزرا کو انعام و اکرام سے نوازے گا۔

خانزادہ کے لیے اس نے بیش قیمت جواہرات بھیج دیے اور میران شاہ کے منصب میں دو ہزار سواروں کا اضافہ کر دیا یعنی اب میران شاہ اپنے لشکر میں دو ہزار سوار اور بھرتی کر سکتا تھا۔

ایک شب اچانک میراں شاہ کا دماغ پھر گھوم گیا۔ خانزادہ ننھے امیرزادے خلیل سلطان کو گود میں لیے اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ میراں شاہ پہلے تو امیرزادے کو دلچسپی سے دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ پھر معلوم نہیں اسے کیا سوجھی کہ امیرزادے کو خانزادہ کی گود سے لے لیا۔ خانزادہ نے کوئی اعتراض نہ کیا اس لیے کہ میراں شاہ اب بالکل صحیح الدماغ ہو گیا تھا۔ پھر امیرزادہ اس کا اپنا بیٹا تھا۔ وہ منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میراں شاہ بچے کو دونوں ہاتھوں میں لیے مسہری سے اترا۔ خانزادہ بھی خوشی خوشی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ سمجھی کہ شاید آج باپ کی فطری شفقت ایک دم جاگ گئی ہے اور میراں شاہ بچے کو کھلانا چاہتا ہے۔

میراں شاہ کچھ دیر بچے کو لیے ٹہلتا رہا پھر رک کر بولا:

"خانزادہ۔ لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ سر کے بل گرتے ہیں وہ منحوس ہوتے ہیں۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"یہ سب بے دینی کی باتیں ہیں شہزادے۔" خانزادہ نے اس کے خیال کی فوراً تردید کی:

"شہزادے! اس قسم کے وہم اپنے دل میں نہ لایا کیجیے۔ خدا جس کو جو چاہتا ہے بنا دیتا ہے اس میں کسی وہم یا شگون کو دخل نہیں۔"

"نہیں خانزادہ"۔ میراں شاہ کی آواز ایک دم تیز ہو گئی:

"ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے بیٹے کو کوئی منحوس کہے۔ ہمیں لوگوں پر ثابت کرنا ہو گا کہ امیرزادے پر کوئی منحوس سایہ نہیں۔"

"شہزادے۔ کس کی مجال ہے کہ امیرزادے کو منحوس کہے۔" خانزادہ غصے سے بولی:

"ہم ایسے لوگوں کی زبانیں کاٹ دیں گے۔"

"تم بے وقوف ہو خانزادہ۔" میراں شاہ زور سے دھاڑا:

"ہم امیرزادے کا امتحان لیں گے۔ ہم امیرزادے کو ہوا میں اچھالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ سر کے بل تو نہیں گرتا۔"

"نہیں نہیں۔"

خانزادہ چیخ مار کر میراں شاہ کی طرف دوڑی لیکن میراں شاہ نے بچے کو ہوا میں چھت کی طرف اچھال چکا تھا۔ بچے کی بھی چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ قلابازیاں کھاتا چھت تک پہنچا پھر اسی طرح نیچے کی طرف گرنے لگا۔ خانزادہ نے بھوکی شیرنی کی طرح میراں شاہ پر جھپٹ کر اسے دھکا دیا اور زمین پر آتے ہوئے امیرزادے کو اپنے ہاتھوں پر روک لیا۔

امیرزادے کے ہاتھوں میں آتے ہی خانزادہ نے اسے سینے میں بھینچ لیا اور بے تحاشہ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میراں شاہ پر نہ تو خانزادہ کے دھکا دینے کا کوئی اثر ہوا اور نہ اس کے چیخنے چلانے کا۔ وہ بڑے اطمینان سے مسہری پر جا کے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

خانزادہ امیرزادے کو سینے سے لگائے راہداریوں میں بھاگ رہی تھی اور زور زور سے چلا رہی تھی:

"امیرزادے کو بچاؤ۔ میراں شاہ پاگل ہو گیا ہے۔ وہ امیرزادے کو مار ڈالے گا۔"

اور پتہ نہیں وہ غصے، جوش اور خوف میں کیا کیا بک رہی تھی اور شاہی محل کے صدر دروازے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ خواجہ سراؤں اور کنیزوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ حیران نظروں سے خانزادہ کو دیکھ رہی تھیں مگر کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر خانزادہ نے بلاقو خان کو بلایا۔ وہ باہر موجود تھا۔ حکم پاتے ہی گھبرایا ہوا محل کے اندر آیا۔

خانزادہ نے جلدی سے امیرزادہ اس کے ہاتھوں میں دے دیا اور پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی:

"بلاقو خان۔ یہ ہماری امانت ہے۔ اسے کہیں لے جاؤ۔ ورنہ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اسے مار ڈالے گا۔"

"کون ہے وہ؟" بلاقو خان کا ہاتھ شمشیر پر پہنچ گیا:

"مجھے بتائیے شہزادی عالیہ۔ کس نے امیرزادے کی طرف نظر اٹھائی ہے۔ میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔"

"بلاقو خان۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ ہم اپنے محل میں جائیں گے۔ تم ہمارے محل پر پہرہ لگا دو۔ ہمارے پاس کسی کو نہ آنے دینا۔"

خانزادہ اپنی ہی کہتی رہی۔ اس کے کانوں تک جیسے بلاقو خان کی آواز ہی نہیں پہنچی۔ بلاقو خان ہکا بکا سا تھا۔ کنیزوں اور خواجہ سراؤں کو بھی یہ ہمت نہ تھی کہ شہزادی سے کچھ پوچھیں کیونکہ انہوں نے سن لیا تھا کہ شہزادی نے میراں شاہ کو پاگل کہا ہے۔ اور یہ بات ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

بلاقو خان نے آہستہ سے کہا:

"شہزادی عالیہ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں امیرزادے پر قربان ہو جاؤں گا لیکن انہیں کوئی گزند نہ پہنچنے دوں گا۔ میں آپ کو آپ کے محل میں پہنچا دوں گا لیکن یہ سب کیا ہے؟ کس نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے؟"

خانزادہ اب بھی سخت پریشان تھی۔ وہ خوف زدہ سی محل سے باہر نکل آئی۔ محل کا دروازہ باہر سے بند پا کر اسے کچھ اطمینان ہوا تو بولی:

"تم نہیں جانتے بلاقو خان۔ شہزادہ میراں شاہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے امیرزادے کو چھت تک اچھال

دیا تھا۔ اگر ہم موجود نہ ہوتے تو یہ ۔۔۔۔۔۔ یہ !!"

اور خانزادہ رونے لگی۔ منگولی تاتاری ایک عام عورت کی مانند اسے روتا دیکھ کر کنیزیں اور خواجہ سرا رونے لگے۔ ان کی سمجھ میں پوری بات آ گئی تھی۔ سب کو علم تھا کہ دماغ میں چوٹ آنے کی وجہ سے میراں شاہ کا دماغ چل گیا ہے لیکن ان کے منہ پر مہر لگی تھی۔ خانزادہ کی حالت پر انہیں رحم تو آیا لیکن وہ اس کی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ میراں شاہ امیر تیمور کا بیٹا تھا اور تیمور کا بیٹا ان کے لیے تیمور ہی کی طرح قابل احترام تھا۔

بلاقو خان نے شہزادی کو دوسرے محل میں پہنچا دیا اور محل کے گرد تاتاری سواروں کا سخت پہرہ لگا دیا۔ مزید حفاظت کے لیے اس نے محل کے بیرونی حصے میں خود بھی رہائش اختیار کی۔

صبح کو جب میراں شاہ کے حواس درست ہوئے تو وہ رات کے واقعات کو بالکل بھول چکا تھا۔ میراں شاہ نے خانزادہ کے بارے میں دریافت کیا تو کنیزوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ شہزادی دوسرے محل میں منتقل ہو گئی ہیں اور ساتھ ہی انہوں نے رات کو پیش آنے والے واقعات بھی اس کے گوش گزار کیے۔ میراں شاہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔ اس پران باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے اظہارِ شرمندگی کے بجائے خانزادہ کا اپنے محل میں داخلہ بند کر دیا۔

خانزادہ نے اسے اپنے حق میں مفید ہی سمجھا۔ وہ خود چاہتی تھی کہ میراں شاہ سے دور رہے تاکہ وہ خود اور امیرزادہ سلطان اس کی وحشی حرکتوں سے محفوظ رہیں۔

خانزادہ کا محل میں داخلہ بند ہونے سے میراں شاہ کے پرانے ندیموں اور حواریوں کی بن آئی۔ انہوں نے پھر میراں شاہ کو گھیر لیا اور پہلے کی طرح محل کو راجہ اندر کا اکھاڑا بنا دیا۔ مسخرے سازندے اور مفاد پرست ان پڑھ شاعر درباری عہدوں پر فائز ہو گئے۔ میراں شاہ کی مے نوشی میں اضافہ ہو گیا۔ طبیبوں کی دوائیں پہلے ہی بہت کم اثر کر رہی تھیں۔ میراں شاہ نے انہیں بالکل موقوف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے پاگل پن میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

ایک دن ترنگ میں آ کے میراں شاہ نے تبریز کی تمام رعیت کو محل کے نیچے جمع کر لیا اور خود جھروکے میں آ کے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ درہم و دینار حاضر کیے جائیں۔ خزانہ کھول دیا گیا۔ درہم و دینار کے خوان بھر بھر کے میراں شاہ کے پاس بھیجے گئے۔

میراں شاہ خوانوں کو عوام پر الٹوا دیتا۔ رعیت خوش ہو کر بخششیں لوٹنے لگی۔ کہتے ہیں کہ دن بھر میں میراں شاہ نے ایک کروڑ دینار عوام پر نچھاور کر دیے۔

امیر قلات خان اور وزیر سلطنت اس بے جا سخاوت پر گھبرا گئے۔ خزانہ تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ وزیر

نے ادب سے عرض کیا کہ:

"تمام خزانہ خالی ہو گیا ہے۔"

جواب میں میراں شاہ نے جواہرات کی بارش کرنے کا حکم دیا۔ کس میں مجال تھی کہ مخالفت کرتا۔ رات گئے جواہرات کا مینہ برستا رہا اور لوٹنے والے میراں شاہ کے حق میں نعرے لگاتے رہے۔

قلات خان نے دیکھا کہ میراں شاہ کسی طرح نہیں مانتا تو اس نے سازندوں کو حکم دیا کہ وہ موسیقی کی محفل جمائیں۔ ساز و آواز کی محفل نے میراں شاہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور وہ جھروکے سے ہٹ کر محفل میں آ گیا ورنہ خزانہ بالکل ہی خالی ہو جاتا۔

خانزادہ کو خبر ملی تو وہ دل پکڑ کے رہ گئی۔ ایک تو اس کے داخلے پر پابندی تھی۔ پھر وہ خود بھی میراں شاہ سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ خاموش ہو رہی۔ اسے یہ بھی سنایا گیا کہ میراں شاہ کے پرانے ندیم اس کے خلاف اس کے کان بھرتے رہتے ہیں اور وہ اختلاف کی خلیج کو اور وسیع کرنے کی فکر میں ہیں تاکہ خانزادہ کبھی محل میں نہ آ سکے اور وہ کھل کھیلتے رہیں۔

میراں شاہ کے جنون نے ایک اور کروٹ لی۔

اس نے حکم دیا کہ تبریز اور سلطانیہ کی تمام عمارات کو منہدم کر دیا جائے۔ ان عمارات میں شفاخانوں کی عمارات بھی شامل تھیں۔ ایک امیر نے درخواست کی کہ شفاخانوں کو نہ توڑا جائے۔ میراں شاہ نے اس وزیر کو قتل کروا دیا۔

تمام عمارتیں مٹی کا ڈھیر ہو گئیں۔ تبریز اور سلطانیہ کے محلے قبرستان نظر آنے لگے۔ اس کے ندیم ہر حکم کی تعریف کرتے اور ہر بات میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ حد تو یہ کہ میراں شاہ نے ایک ایرانی فلسفی کی قبر کھدوا کر ہڈیاں نکلوائیں اور انہیں یہودیوں کے قبرستان میں دفن کرا دیا۔

میراں شاہ کی ان حرکتوں سے پوری ولایت تبریز میں تہلکہ مچ گیا۔ میراں شاہ کے پرانے تاتاری امیر ان باتوں سے عاجز آ گئے تھے۔ قلات خان ان کا قائد تھا۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا اور طے ہوا کہ تبریز کے حالات سے امیر تیمور کو فوراً مطلع کیا جائے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امیر کو کسی اور ذریعے سے ان باتوں کا علم ہو جائے اور لوگوں سے باز پرس ہو۔ انہوں نے کچھ امیروں کو خفیہ طریقے سے سمرقند بھیج دیا۔

مثل مشہور ہے کہ سیانا کوا گو کھاتا ہے۔

درباری ندیموں نے خانزادہ کا ہمیشہ کے لیے پتا کاٹنے کا فیصلہ کیا اور ایک رات میراں شاہ کے کا میں یہ بات ڈال دی کہ بلاقوخان، شہزادی کے محل میں رہتا ہے۔

میراں شاہ نشے میں دھت تھا۔ یہ سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا اور اسی وقت سواری منگا کر خانزادہ کے محل پہنچ گیا۔ وہاں سخت پہرہ تھا لیکن میراں شاہ کو روکنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی۔ وہ دندناتا ہوا شہزادی کی طرف چلا۔ چار خواجہ سرا اس کے ساتھ تھے۔

خانزادہ کی کنیزوں نے بھاگ کر اسے خبر کی۔ خانزادہ اور بلاقوخان اسی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میراں شاہ کے آنے کی خبر پا کر ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ مگر خانزادہ نے فوراً حواس درست کیے اور امیرزادے کو بلاقوخان کے حوالے کر کے حکم دیا کہ فوراً اسے لے کر نکل جائے۔

بلاقوخان نے بھی پھرتی دکھائی اور امیرزادے کو سنبھالے ہوئے پشت کے دروازے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی میراں شاہ کمرے میں داخل ہوا۔

میراں شاہ نے تیز نظروں سے خانزادہ کو دیکھا۔ خانزادہ بھی شاید آج بغاوت پر آمادہ تھی۔ اس نے میراں کی تیز نظروں کا جواب اس سے زیادہ تیز نظروں سے دیا۔ کچھ لمحے دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر میراں شاہ گرج کر بولا:

"تو گلی گلی بھیک مانگنے والی فقیرنی تھی۔ میں نے تجھے عزت دی۔ اپنی بیوی بنایا مگر تو نے مجھے اس کا کیا صلہ دیا؟"

"میراں شاہ۔ ہوش میں آؤ۔" خانزادہ کڑک کر بولی:

"تم ایک امیر کے بیٹے ہو تو میں خوارزم کی شہزادی ہوں۔ عزت تم نے نہیں، میں نے تمہیں دی۔ تمہیں نااہل ندیموں سے بچا کر انسان بنایا۔۔۔۔"

"تو بدکار ہے خانزادہ۔" میراں شاہ بات کاٹ کر بولا:

"تو نے میری عزت۔۔۔۔"

"میراں شاہ۔۔۔۔" خانزادہ شیرنی کی طرح میراں شاہ پر جھپٹی اور اس کا گریبان پکڑ لیا:

"تم نے خانزادہ پر تہمت دھری۔ خوارزم کی شہزادی پر الزام لگایا۔ میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔"

میراں شاہ کے ساتھ آنے والے خواجہ سرا دوڑ کر درمیان میں آگئے۔ خانزادہ برابر میراں شاہ کے گریبان کو پکڑ کر اسے جھٹکے دے رہی تھی۔ میراں شاہ نشے میں تو پہلے ہی تھا۔ ان مسلسل جھٹکوں سے اس پر بے ہوشی

طاری ہو گئی۔ خانزادہ نے جب اسے چھوڑا تو وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ خواجہ سراؤں نے اسے ہاتھوں پر سنبھالا۔

"لے جاؤ اس پاگل کو اپنے محل میں۔" خانزادہ نے غصے سے کہا:

"خبردار جو اب اس نے یہاں آنے کی کوشش کی۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔ لے جاؤ۔"

خواجہ سرا میراں شاہ کو سنبھالتے ہوئے باہر نکل گئے۔

خانزادہ کے لیے اب اس محل اور شہر میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس نے اپنی پرانی دو کنیزوں کو لیا اور محل سے نکل کر بلاقوخان کی حویلی میں آ گئی۔

بلاقوخان اس کے لیے بہت پریشان تھا۔ خانزادہ نے اسے مختصر طور پر محل کے حالات بتائے اور اسی شہر چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

بلاقوخان نے اس کے ساتھ چلنے کی پیش کش کی لیکن خانزادہ نے مناسب نہ خیال کیا اور چار محافظوں کے ساتھ امیرزادے خلیل سلطان کو لے کر سمرقند روانہ ہو گئی۔

○

صاحبقراں امیر تیمور ہندو پاک کی فتح کے بعد واپس سمرقند آ گیا تھا۔ سمرقند میں اس کا پرتپاک خیر مقدم ہوا۔ ہندوستان سے ہاتھی بھی ساتھ لایا تھا۔ سمرقند والوں نے ان قوی الجثہ جانوروں کو بڑے تعجب سے دیکھا۔ امیر نے فتح کی خوشی میں اپنے امیروں اور سرداروں میں انعامات تقسیم کیے اور جشن منانے کا اعلان کیا۔ سمرقند میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دور دراز کے تمام امیروں اور صوبے داروں کو جشن میں شرکت کے لیے بلایا گیا۔

اسی دوران تبریز سے قلات خان کا بھیجا ہوا وفد بھی سمرقند پہنچ گیا۔ وفد نے فوراً باریابی کی درخواست کی۔ تبریز میں اس کا بیٹا میراں شاہ حاکم تھا اور تیمور کو ہر وقت اس کی فکر لگی رہتی تھی اس لیے فوراً وفد کو طلب کر لیا۔ تبریز کے چھ امیروں کا وفد حاضر ہوا۔ ان میں سے ہر ایک برہنہ سر اور برہنہ پا تھا۔ صدریوں کے چاک سینے سے کھلے تھے اور بالوں میں خاک پڑی تھی۔

امیر تیمور انہیں اس حال میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ یہ ہیئت اس وقت بنائی جاتی تھی جب کسی کی موت کی خبر دینا ہو۔ تیمور کا پتھر دل بھی دھڑک اٹھا۔

وفد تیمور کے سامنے پہنچ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس سے تیمور کے شک کو تقویت ملی مگر وہ اپنے کر
میر کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرتا تھا۔

اس نے ایک لمحہ انتظار کیا۔ جب وفد میں سے کوئی نہ بولا تو اس نے بڑے تحمل سے کہا،

"خاموشی کا سحر توڑ ڈالیے۔ ہم ہر خبر سننے کے لیے تیار ہیں۔ دو شہزادوں کا غم ہم پہلے ہی برداشت
کر چکے ہیں۔ اگر میراں شاہ......"

"خدا شہزادے بہادر کو سلامت رکھے۔ وہ بقید حیات ہیں"۔ ایک امیر نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

تیمور کو اطمینان ہوا۔ بولا:

"پھر تم لوگوں نے یہ صورت کیوں بنائی ہے۔ کون مر گیا ہے؟"

"ولایت تبریز کو موت آ گئی ہے امیر محترم"۔ دوسرے نے بے خوف ہو کر کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" تیمور کی تیوری پر بل پڑ گئے:

"کس نے تبریز پر حملہ کرنے کی ہمت کی؟"

"امیر محترم! تبریز کا سہاگ خود ولی عہد بہادر نے لوٹ لیا"۔ ایک اور نے بتایا:

"خوب صورت عمارتیں زمین بوس کر دی گئیں۔ شفا خانوں تک کو گرا دیا گیا ہے"۔

"کس کے حکم سے...... میراں شاہ...... کیا میراں شاہ......؟" غصے کی وجہ سے تیمور کی زبان
الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ تھر تھراتا ہوا کھڑا ہو گیا:

"ایسا کب ہوا؟" تیمور کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

"امیر عالی مقام! یہ کئی سال سے ہو رہا ہے"۔ سردار نے کہنا شروع کیا:

"شہزادے بہادر کا حکم ہمارے لیے قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم حکم عدولی نہ کر سکے۔ شہر برباد ہوتا رہا
خزانہ لٹایا گیا۔ گلی کوچے ویران ہو گئے۔ نااہل ندیموں نے شہزادے کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے"۔

"کیا اسے ہمارا خوف نہیں۔ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گیا؟" تیمور کا غصہ دم بدم بڑھ رہا تھا۔

"امیر معظم! کچھ لوگ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں"۔ تاتاری سردار نے سہمے لہجے میں کہا:

"وہ قبریں کھدوا کر ہڈیاں باہر نکلوا لیتے ہیں، پاک مقامات کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ شہزادی عالیہ خانزادہ
نے بہت کوشش کی لیکن وہ کسی کی نہیں سنتے"۔

دربار خاص میں تبریز کے وفد کی باتیں سن کر تیمور پیچ و تاب کھا رہا تھا اور ادھر محل کے دروازے پر
نقاب اور سیاہ لباس پہنے ایک عورت پہنچی۔ محافظوں نے بڑھ کر اس کا راستہ روکا مگر عورت نے نہ جانے کیا

یا۔ وہ اچھل کر پیچھے ہو گیا۔ دروازہ فوراً کھول دیا گیا۔ محافظ آگے آگے اور عورت اس کے پیچھے پیچھے
میں داخل ہوئی۔

محل کے اندر تمام راہ داریوں اور روشوں پر جو جہاں تھا وہیں ٹھٹک کے کھڑا ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ
تا کہ یہ پھٹے حال عورت کون ہے جس کے آگے آگے محافظوں کا داروغہ بڑے ادب سے چل رہا ہے
کے اشارے پر سامنے کے تمام دروازے ایک ایک کر کے کھلتے چلے جا رہے ہیں۔

داروغہ ایک لمحے کے لیے بھی کہیں نہیں ٹھہرا اور عورت کی رہنمائی کرتا ہوا دربار خاص کے دروازے
پہنچ گیا۔ اس دروازے پر ایک بار یک مگر مرصع پردہ پڑا ہوا تھا۔ محافظ نے ہاتھ بڑھا کر پردہ ہٹایا اور وہ
دربار خاص میں داخل ہو گئی۔

امیر تیمور نے کمال حیرت سے نقاب پوش عورت کو دیکھا لیکن عورت نے تیمور کو زیادہ دیر حیرت میں
یا اور چہرے سے نقاب الٹ دیا۔

"شہزادی خانزادہ......" تیمور کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

خانزادہ کی عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت مصائب میں گرفتار تھی لیکن اب بھی اس کا چہرہ
تک کے چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ ملک تاتار کی سب سے خوبصورت عورت تھی۔ وہ ولی عہد جہانگیر کی بیوہ
اور کے تیسرے بیٹے میراں شاہ کی بیوی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر شاید تیمور کا دل بھی رو دیا تھا۔

"اے امیر!" خانزادہ نے بغیر کسی القاب و تمہید کے بڑی بے خوفی سے صاحبقراں امیر تیمور کو مخاطب

"آپ کے بیٹے کے خلاف فریادی اور داد طلب بن کر آئی ہوں۔ مجھے اپنی پناہ میں لیجیے۔ میں آپ سے
انصاف کی بھیک مانگتی ہوں"۔

امیر تیمور بہت بنا کھڑا تھا اور اس کی وہ بہو جسے وہ مرحوم شہزادے جہانگیر کے لیے بیاہ کر لایا تھا۔ اس
سامنے میراں شاہ کے کرتوت بیان کر رہی تھی۔ پھر خانزادہ نے تیمور سے نظریں ملائیں اور اس کی آنکھوں میں
ڈال کر غصے اور غم سے کانپتے ہوئے کہا،

"آپ کے ذلیل فرزند نے مجھ پر ذلیل تہمت لگائی ہے"۔

تیمور کو خانزادہ کے لگائے ہوئے الزامات کی تحقیق اور تصدیق کی کوئی ضرورت نہ پڑی۔ تبریز کا وفد اس کے
کھڑا تھا اور وہ یہی باتیں پہلے بیان کر چکا تھا۔

تیمور ایک طویل سفر سے واپس آیا تھا لیکن وہ خانزادہ کی خستہ حالت برداشت نہ کر سکا۔ اس نے فوراً گھوڑا

طلب کیا اور چند سرداروں کو لے کر تبریز کی طرف روانہ ہو گیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے خانزادہ کے تمام اعزازات اور مراعات بحال کیں اور ان میں کچھ اضافہ بھی کر دیا۔

تیمور آندھی اور طوفان کی طرح ہزاروں میل کا سفر کر کے تبریز پہنچا۔ تبریز کی ویرانی دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی ویرانی پھیل گئی۔ تبریز اور سلطانیہ کے ہزاروں فریادیوں نے تیمور کو گھیر لیا۔ تیمور نے لوگوں کے نقصانات کی تلافی کا حکم دیا۔ اور پھر ایک ایسا اعلان کیا جسے سن کر امیر اور سردار بدحواس ہو گئے۔ تیمور نے عوام اور خواص کو بالکل سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا:

"عوام اور خواص کا نقصان ناقابلِ تلافی ہے اور میران شاہ کی حرکتیں تیموری وقار پر بدنما داغ ہیں۔ شہزادے میران شاہ کو اسی وقت سولی پر چڑھا دیا جائے۔"

لوگوں نے سر پیٹ لیے۔ بڑے بڑے سردار تیمور کی رکابوں سے لپٹ کر رونے لگے۔ عوام تیمور کے اس حکم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے نقصانات سے ہاتھ کھینچ لیے اور شہزادے کی زندگی کی بھیک مانگنے لگے۔

تیمور کا جلال کسی طرح کم نہ ہو رہا تھا۔ عوام دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ انہوں نے گریبان پھاڑ لیے تھے اور سر اور پیر سے ننگے ہو گئے تھے۔

شہزادہ میران شاہ پاگل مشہور ہو گیا تھا۔ اس نے حرکتیں ہی ایسی کی تھیں لیکن یہ تیموری جلال تھا کہ تبریز میں تیمور کے داخل ہوتے ہی اس کا دماغ بالکل ٹھکانے آ گیا۔ وہ محل کے ایک کونے میں چھپ گیا اور چیخیں مار کر رونے لگا۔

تیمور کے حکم سے میران شاہ کے گلے میں رسی باندھ کر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ تیمور اب تک گھوڑے پر سوار تھا۔ میراں شاہ نے خود کو تیمور کے گھوڑے کے سامنے گرا دیا اور معافی مانگنے لگا۔

عوام اور خواص کی بے انتہا سفارش پر میران شاہ کی جان بخشی ہو گئی لیکن اس کے تمام اعزازات چھین لیے گئے اور اسے شاہی مراعات سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی جگہ امیر قلات خان کو ولایتِ تبریز کی گورنری عطا ہوئی۔ اس جلتے، سلگتے اور گرم ماحول میں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا جسے دیکھ اور سن کر لوگوں کے لبوں پر بے ساختہ تبسم آ گیا۔

تیمور نے میراں شاہ کے تمام ندیموں اور اس کے خاص مسخرے کو سولی پر چڑھانے کا حکم دیا۔ میدان میں سولی گاڑ دی گئی۔ ندیم اور مسخرے پابہ زنجیر پیش کیے گئے۔ تیمور نے ان کی زنجیریں کھلوا دیں اور انہیں قطار میں کھڑا کرا کے حکم دیا کہ ایک ایک کو باری باری سولی پر چڑھایا جائے۔

جلاد ان کے پاس جا کر کھڑا ہوا اور ایک سے کہا:

"سولی کی طرف چلو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور دوسرے کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"پہلے اسے سولی پر چڑھایا جائے۔"

جلاد جس کی طرف بڑھتا وہ یہی عذر کر کے دوسرے کی طرف اشارہ کر دیتا۔ جلاد نے پریشان ہو کر امیر کی طرف دیکھا لیکن امیر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میران شاہ کا خاص مسخرہ بڑی شان سے اکڑتا ہوا سولی کے پاس پہنچ گیا۔ لوگ اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔

مسخرہ سولی کے پاس پہنچ کر رکا اور پلٹ کر تیمور سے بولا:

"اے صاحبقران! مجھے سولی پر چڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ تو کوئی انصاف نہیں کہ یہ سب ندیم ہمیشہ آگے آگے رہتے تھے اور مجھے دھکے مار کر پیچھے ہٹاتے تھے لیکن اس وقت یہ سب پیچھے ہٹ گئے ہیں اور مجھے آگے کر دیا ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ ان ندیموں کو مرتبے کے مطابق نمبر لگا کر سولی پر چڑھایا جائے اور مجھے آخری نمبر دیا جائے۔"

کہتے ہیں کہ تیمور مسخرے کی اس بات پر مسکرا دیا

اور ـــــ

مسخرے کو معاف کر دیا گیا!

شادی ملک

صبح ہی سے ریگستان میں ہجوم ہونا شروع ہو گیا۔
ریگستان میں داخل ہونے والا ہر تاتاری دوسرے سے سرگوشیوں میں پوچھتا:
"آج ریگستان میں اتنا مجمع کیوں ہے۔ فتح کی خبر آئی ہے کیا؟"
جواب دینے والا بھی اسی رازداری سے کہتا:
"فتح تو ہمارے امیر کے قدم چومنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ ایک قاصد برصغیر سے ضرور آیا ہے لیکن کچھ پتہ نہیں چلتا، کیا خبر ہے، کیا حکم ہے؟"
"سرداروں کو تو علم ہو گیا ہو گا؟"
"وہ کہتے ہیں کہ پیغام ہمارے امیر نے بھیجا ہے۔"
"پھر پردہ داری کیسی؟ خدانخواستہ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا۔ کوئی ناگہانی بات تو نہیں ہوئی۔ امیر کے برصغیر سے آنے والے پیغامات تو خود اُسنا دیے جاتے ہیں۔ اسے راز میں کیوں رکھا جا رہا ہے۔"
ریگستان میں جیوں جیوں مجمع بڑھتا جا رہا تھا اسی اعتبار سے چہ میگوئیاں، شبہات اور وسوسے بھی بڑھتے رہے تھے۔ تاتاریوں کے ذہن میں یہ چیز بیٹھ گئی تھی کہ صاحبقراں امیر تیمور ناقابلِ شکست ہے۔ اس کی یلغار پہاڑ بھی نہیں روک سکتے لیکن جس وقت امیر تیمور نے برصغیر پر حملہ کرنے کے لیے اپنے امیروں سے رائے طلب کی تھی تو سرداروں نے دبے الفاظ میں اس کی مخالفت کی تھی۔
خانزادہ کے بیٹے اور امیر تیمور کے پوتے سلطان محمد نے ادب سے کہا تھا:

"اے امیر بابا! ہم برصغیر کو ضرور فتح کر لیں گے لیکن ہمارے لشکر کو بڑی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بڑے بڑے دریا، جنگل بیابان، ہندوکش کی ترائی کے زرہ پوش سپاہی اور پھر وہ دیو قامت ہاتھی جو انسانوں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالتے ہیں۔"
"برصغیر بڑا گرم ملک ہے صاحبقراں۔" ایک اور امیر نے کہا تھا جو کئی بار برصغیر گھوم آیا تھا:
"وہاں ایک دم اس قدر گرمی پڑنے لگتی ہے کہ زمین لوہے کی طرح تپنے لگتی ہے۔ اس گرمی سے انسان بیمار پڑ جاتا ہے اور اس کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ وہاں پانی بھی کھارا اور خراب ہے۔ وہاں کی بولی ہماری زبان سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری فوج وہاں شاید زیادہ عرصہ نہ رہ سکے۔"
مگر تیمور نے نہ پوتے کی بات مانی اور نہ سردار کی باتوں پر کان دھرے۔ وہ بانوے ہزار سواروں کا لشکر لے کر برصغیر پہنچ گیا۔
برصغیر میں اس پر کیا گزری، اب تک کوئی ایسی واضح خبر نہ آئی تھی۔ اسی وجہ سے تاتاری سردار اور عوام پریشان تھے۔ قاصد کے آنے سے وہ اور زیادہ پریشان ہو گئے تھے کیونکہ قاصد جو پیغام لایا تھا اسے راز میں رکھا جا رہا تھا۔
قاصد کے آنے کی خبرِ وحشت اثر نے دوپہر تک ایک خطرناک افواہ کی صورت اختیار کر لی اور تمام چھوٹے بڑے تاتاری سردار اور دانشور ریگستان میں صلاح اور مشورے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔
"ریگستان" حقیقت میں کوئی صحرا یا ریگ زار نہ تھا جہاں ریت کے تودے اڑتے ہیں اور انسان کو اسے دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ یہ ریگستان سمرقند کا ایک پُر فضا مقام تھا۔ یہ ایک نیچی پہاڑی کے پورے پھیلاؤ پر محیط تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امیر تیمور صحرا نشینوں کی طرح گل و گلزار اور آبِ رواں کا بھی دلدادہ تھا۔ چنانچہ جب اس نے سمرقند کے نشیب میں اس میدان کو ایک عوامی تفریح گاہ میں تبدیل کیا تو اس میں مصنوعی چشمے بنوائے جن میں ہر وقت پانی ابلتا رہتا۔ اس کے گرد مسجدوں اور دارالعلوم کی عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ یہاں پنج وقتہ اور عیدین کی نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگ خوش گپیوں میں مصروف رہتے اور دنیا بھر کی خبروں اور سیاسی امور پر بڑی بے باکی سے تبصرے کرتے تھے۔ امرا اور سردار ایک دوسرے سے اسی جگہ ملاقات کرتے اور تاجر اپنے سودے بھی اسی جگہ چکاتے تھے۔
مگر آج صرف ایک موضوع ہے: "قاصد کیا خبر لایا؟"
ایک طرف سمرقند کے دانشوروں کا ایک گروہ بیٹھا ہے۔ اس میں بوڑھے امیر سیف الدین اور جو دیار لات جیسے تجربہ کار اور جہاندیدہ امیر بھی ہیں جو ضعیفی کی وجہ سے فوجی خدمات سے سبکدوش کیے جا چکے ہیں لیکن یہ امیر تیمور

کے زیرِ کمان جہانگیری اور جہاں بانی کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ انہی لوگوں کے گرد عوام کا زیادہ ہجوم ہے۔ یہ لوگ بھی قاصد کے پیغام سے ناواقف ہیں لیکن اپنے طور پر اندازے لگا رہے ہیں۔

امیر مویدارلات نے بھاری پپوٹے اٹھاتے ہوئے کہا:

"تاتاری فوج ہمارے امیر کی برکت سے درہ خیبر پار کر کے دریائے سندھ پر پل باندھ رہی ہوگی۔"

امیر سیف الدین نے پوپلے منہ سے قہقہہ لگایا جو اس کے منہ میں ہی گونج کر رہ گیا، بولا:

"تم سندھ کے پل کی بات کر رہے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اب تو ملتان فتح ہو چکا ہوگا اور ہمارے امیر اب سلطانِ دہلی پر چڑھائی کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہوں گے۔"

"مگر وہ چلتے پھرتے پہاڑ۔ . . . . ." سمرقند کا ایک بوڑھا آنکھیں پھاڑ کر بولا:

"بھلا امیر نے ان پر کیسے قابو پایا ہوگا؟"

ہاتھی کی طرف سے سب ہی پریشان تھے۔ یہ جانور تاتاریوں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔

"ہاتھی ہمارے امیر کا راستہ نہیں روک سکتے۔" ایک اور امیر بولا:

"ہمارے امیر برِصغیر سے اتنی دولت لائیں گے جس کے بل پر ہم ساری دنیا فتح کر سکیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" دوسرے نے تائید کی:

"دنیا میں چھ عالی مرتبہ بادشاہ ہیں جن میں سے ابھی صرف ایک ہمارے امیر سے شکست کھا کر بھاگا ہے۔"

"بھلا یہ چھ عالی مرتبہ بادشاہ کون ہیں۔ کیا وہ ہمارے امیر سے بڑے ہیں؟" مویدارلات نے اعتراض کیا:

"ہمارے خیال میں تو دنیا میں صرف ایک بادشاہ ہے اور وہ ہمارے امیر ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" پہلے نے تائید کرتے ہوئے کہا:

"مگر مشہور چھ بادشاہ ہیں۔ ایک شہنشاہِ قسطنطنیہ، دوسرا سلطانِ مصر، تیسرا شاہِ بغداد، چوتھا مہاراجہ بھارت، پانچواں فغفورِ چین اور چھٹے ہمارے امیر ہیں۔"

"محترم بزرگو۔" ایک سمرقندی نوجوان جو کسی وجہ سے تیمور کے ساتھ نہ جا سکا تھا، بڑے ادب سے بولا:

"یہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن اصل مسئلہ پر تو بتصرہ کیجیے۔ یہ قاصد کیا پیغام لایا ہے؟"

بزرگ تاتاریوں نے ایک نوجوان کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھے تو وہ جھلائے۔ اس نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ یہ لوگ واقعی غیر متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں میں عقل و تجربے کی بڑی خوبیاں موجود تھیں لیکن اس وقت تو تاتاری عوام اس پیغام کے لیے بے چین تھے جو ان کے امیر نے برِصغیر کے محاذ سے بھیجا تھا اور جس کی کسی کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ قاصد سیدھا سرائے خانم کے پاس پہنچا تھا۔ سرائے خانم امیر کی غیر موجودگی میں باقاعدہ دربار

[illegible]ی تھی۔ اسے طبل و علم کی مراعات بھی حاصل تھیں۔

تیمور کا پیغام زبانی نہیں تحریری تھا۔ قاصد نے بند خط سرائے خانم کے حوالے کیا۔ سرائے خانم نے خط [illegible]ھا اور اس کا پہلا ردِعمل یہ ہوا کہ قاصد کو شاہی مہمان خانے میں نظربند کر دیا گیا اور پہرے داروں کو سخت تاکید [illegible]ی کہ کوئی امیر یا سردار قاصد سے نہ مل سکے۔ اسی وجہ سے یہ عقدہ نہیں کھل رہا تھا کہ پیغام کس کے متعلق ہے اور [illegible]ے راز کیوں رکھا گیا ہے؟

امیر مویدارلات نے جوان کو مطمئن کرنے کے لیے کہا:

"میرا خیال ہے کہ ہمارے امیر نے کچھ دن پہلے منگلی خان کی بیٹی سے شادی کی ہے، اس کی کوئی بات ہو [illegible]ی یا پھر چین کا شہنشاہ مر گیا ہے اس کے بارے میں کوئی پیغام ہوگا۔"

"تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے امیر ارلات۔" امیر سیف الدین نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"ہمارے امیر ایک نئی شاہراہ چین تک کھولنا چاہتے ہیں۔ کشمیر میں بھی راستے تلاش کیے جا رہے ہیں۔"

"یا تو میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا یا پھر آپ لوگوں کی عقل عمر کے ساتھ ساتھ بوڑھی ہو گئی ہے۔" جوان تاتاری [illegible]ڑ کر بولا:

"بھلا ان باتوں کا ہمارے امیر کے پیغام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ انہیں کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔ [illegible]ہر بات کا وہ خود فیصلہ کرتے ہیں اور ان کا ہر فیصلہ درست ہوتا ہے۔"

بوڑھے امیر اس نوجوان کا منہ دیکھ کے رہ گئے۔ جوان کا کہنا ٹھیک تھا۔ یہ تو تمام فوجی راز تھے۔ ان کے [illegible]بارے میں پیغام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔

پورا دن اور پوری رات اسی ادھیڑبن میں گزر گئی۔ قاصد اور پیغام سوالیہ نشان بن کر ہر ایک کی نظروں کے [illegible]سامنے گھومتے رہے۔

دوسری صبح حسبِ معمول پھر ریگستان میں چہل پہل شروع ہوئی لیکن سوال اسوال ہی بنا رہا۔ سوائے اس کے [illegible]کہ بعض لوگوں نے بتایا کہ رات کو شہر کوتوال نے کئی گھروں کی تلاشی لی ہے۔ لیکن کیوں؟ اس کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔

آج امیر ارلات اور امیر سیف الدین کچھ چپ چپ سے تھے۔ ان کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ قاصد [illegible]کے آنے کا مقصد اب تک پردۂ راز میں تھا۔ جہاں تک رات کی تلاشی کی خبر تھی، اس کی اطلاع انہیں بھی مل چکی تھی لیکن یہ [illegible]ایک انتظامی معاملہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ شہر کوتوال کو کسی مجرم کی تلاش ہو اور مجرم کی موجودگی سمرقند میں بتائی گئی ہو۔ یہ [illegible]دونوں بوڑھے امیر اب ان باتوں سے بالا تھے۔ انہیں خدمات کے صلے میں شاندار حویلیاں ملی تھیں۔ امیر سیف الدین [illegible]نے تو خود ایک عالی شان محل تعمیر کرا لیا تھا جس کے تمام اخراجات امیر تیمور کے خزانے سے ادا کیے گئے تھے۔ دونوں

امیر آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے لیکن ان کی گفتگو قاصد کے بجائے امیر کے برِ صغیر کے حملے کے گرد گھوم رہی تھی۔

ان امیروں کے بڑے ٹھاٹ باٹ تھے۔ ایک دو ملازم ہر وقت ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ امیر سیف الدین نے دوپہر کا کھانا ریگستان میں ہی منگا لیا۔ دونوں امیر وہیں بیٹھ کے کھانا کھانے لگے۔ ابھی کھانا ختم نہ ہوا تھا کہ امیر سیف الدین کے محل سے ایک غلام دوڑتا ہوا آیا اور اس نے جھک کر سیف الدین کے کان میں کچھ کہا۔

امیر سیف الدین نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور غصے سے کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے سیف الدین؟" امیر ارلات نے اس کے تیور بگڑتے دیکھ کر پوچھا۔

"یہ۔۔۔۔ یہ توہین ہے امیر ارلات میری سراسر توہین۔" سیف الدین کا چہرہ سرخ ہو گیا:

"اس کی اتنی جرأت۔ نہیں نہیں۔ یہ ناقابلِ برداشت ہے۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی۔" امیر ارلات نے بھی کھانا چھوڑ دیا:

"کس نے توہین کی تمہاری؟"

"غضب خدا کا۔ شہر کوتوال اور میرے گھر کی تلاشی لے۔" سیف الدین کا ہاتھ فوراً خنجر پر پہنچ گیا:

"میں اس کی انتڑیاں باہر نکال دوں گا۔"

"اچھا تو اب یہ سلوک ہوگا ہمارے ساتھ۔" امیر ارلات نے حیرت سے کہا:

"صاحبقران نہیں ہیں تو اس طرح توہین کی جائے گی ہماری۔"

"میں جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں کیسے تلاشی لی جاتی ہے۔" سیف الدین تیز قدموں سے گھر کی طرف چلا۔

"ٹھہرو سیف الدین۔" ارلات نے اس کے پیچھے لپکتے ہوئے کہا:

"یہ ہم سب کا معاملہ ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ آج تمہارے گھر کوتوال آیا ہے تو کل میرے گھر بھی پہنچ سکتا ہے۔"

دونوں امیر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

شہر کوتوال امیر سیف الدین کے محل کو گھیرے کھڑا تھا۔ صدر دروازے پر سیف الدین کے پانچ پہریدار تلواریں کھینچے کھڑے تھے۔ انہوں نے تلاشی دینے سے انکار کر دیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک امیر سیف الدین نہیں آتے کوئی شخص محل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ شہر کوتوال نے غلام بھیج کر سیف الدین کو بلوایا تھا، کیونکہ سیف الدین کے پہرے دار مزاحمت پر آمادہ تھے۔

امیر سیف الدین اور امیر ارلات کو آتا دیکھ کر شہر کوتوال گھوڑے سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ جب یہ لوگ قریب

پہنچے تو کوتوال ادب سے بولا:

"میں امیرانِ گرامی کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

"تم مسلح سپاہیوں کو لے کر میرے گھر پر کیوں آئے ہو؟" سیف الدین نے سلام کا جواب دینے کے بجائے کوتوال سے سوال کیا۔ اس کا پورا بدن غصے سے کانپ رہا تھا۔

"امیر محترم۔۔۔۔"

"تمہیں میرے احترام کا خیال تھا تو آنے سے پہلے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟" سیف الدین نے اس کی بات کاٹ دی:

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے مجرم کو میں نے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے یا میرے گھر سے چوری کا مال برآمد کرنا چاہتے ہو۔"

"میں مجبور ہوں امیر محترم۔" کوتوال سنجیدگی سے بولا:

"میں حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں۔"

"کس کا حکم ہے؟" امیر سیف الدین نے چیخ کر کہا:

"ہم وفادار امیروں پر صرف صاحبقران امیر تیمور کا حکم چلتا ہے۔ ہم اور کسی کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں۔"

"حکم بڑی بیگم ملکہ سرائے خانم کا ہے۔" کوتوال نے اب بھی ادب کو ملحوظ رکھا۔

"ملکہ سرائے خانم نے حکم دیا ہے۔" سیف الدین کا منہ حیرت سے کھل گیا:

"ملکۂ عالم نے ہم پر شک کیا ہے؟"

"حکم ملکۂ عالم اور پیغام صاحبقران امیر تیمور گورگان کا ہے۔" کوتوال نے وضاحت کی:

"شاہی قاصد کوہ ہندوکش کے اس پار سے صاحبقران کا پیغام لایا ہے کہ "شادی ملک" کو فی الفور گرفتار کر دیا جائے۔"

"شادی ملک!" امیر سیف الدین کی آنکھیں پھیل گئیں اور پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ پھر مردہ سی آواز میں بولا:

"کوتوال۔ مجھے اپنی سخت کلامی پر افسوس ہے۔ تم تلاشی لے سکتے ہو۔ ہم اندر پردہ کرائے دیتے ہیں۔"

"پردے کی ضرورت نہیں امیر محترم۔" کوتوال مسکرایا:

"ہمارے ساتھ تلاشی لینے والی عورتیں بھی ہیں۔"

سیف الدین اور ارلات نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ کوتوال شہر کے سپاہیوں کے ساتھ چار عورتیں بھی تھیں۔

سیف الدین نے اپنے پہرے داروں کو اشارہ کیا۔ وہ دروازہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے اور تلواریں نیام میں کر لیں۔ شہر کوتوال کچھ سپاہیوں کو لے کر محل کے احاطے میں چلا گیا اور اس کے ساتھ کی عورتیں زنان خانے میں داخل ہو گئیں۔

امیر ارلات جواب تک آنکھیں پھاڑے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا، شہر کوتوال کے اندر جانے کے بعد اس نے پوچھا:

"سیف الدین! یہ کیا قصہ ہے۔ صاحبقران نے کس کے قتل کا حکم دیا ہے۔ شادی ملک کون ہے۔ تم پر شبہ کیوں کیا گیا ہے؟"

امیر سیف الدین بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے شاید امیر ارلات کی بات نہیں سنی۔ اس نے سر اٹھا کر امیر ارلات کو دیکھا ضرور لیکن جب بولا تو اس انداز سے جیسے خود اپنے آپ سے گفتگو کر رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا:

"سیف الدین! یہ تمہاری غلطی ہے۔ تم نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ شہزادے تو اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ انہیں تو کوئی نہ کوئی بچا لے گا۔ تم صاحبقران کو کیا جواب دو گے۔ عمر بھر کی وفاداریاں خاک میں مل جائیں گی۔"

امیر ارلات پہلے تو سیف الدین کی بڑبڑاہٹ سنتا رہا کہ شاید کوئی مطلب کی بات معلوم ہو جائے۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے سیف الدین کا شانہ پکڑ کر ہلایا:

"کہاں ہو سیف الدین۔ کیا غلطی ہوئی تم سے۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ کوئی مشورہ ہی دے سکتا ہوں۔ صاحبقران میری بات بہت مانتے ہیں۔"

"نہیں ارلات۔ تم اس معاملے میں ہاتھ نہ ڈالنا۔" سیف الدین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

"اس میں کسی کی سفارش کام نہیں کرے گی۔ اس آگ میں جو ہاتھ ڈالے گا جل جائے گا۔"

"سیف الدین"۔ امیر ارلات نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ضرورت کے وقت انسان دیوانوں سے بھی مشورہ کرتا ہے۔ میں تو تمہارا پرانا ساتھی ہوں۔ کم از کم یہ تو بتاؤ کہ شادی ملک کون ہے۔ اس کے قتل کا حکم صاحبقران نے کیوں دیا ہے؟"

"شادی ملک"۔ سیف الدین نے منہ بنایا:

"یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ ایران کی جادوگرنی۔ شہزادہ خلیل سلطان کو اس نے اپنے جال میں پھانس

لیا ہے۔"

"تو شادی ملک کوئی عورت ہے؟"

"عورت نہیں ایک بھڑکتا شعلہ ہے۔ جو دیکھتا ہے اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔"

شہر کوتوال تلاشی لے کر واپس آ رہا تھا۔ دونوں امیر خاموش ہو گئے۔

"میں معذرت چاہتا ہوں امیر محترم۔" کوتوال نے قریب پہنچ کر کہا۔

"چھوٹی بیگم شہزادی خانزادہ کے محل کی تلاشی ہو گئی!" سیف الدین نے کوتوال کی بات سنی ان سنی کر دی۔

"جی ہاں۔ شادی ملک وہاں نہیں ہے۔" شہر کوتوال جواب دے کے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے سپاہی اور عورتیں بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے پیچھے چلی گئیں۔

"ہاں سیف الدین۔" امیر ارلات نے اطمینان کا سانس لیا:

"اب بتاؤ یہ شادی ملک اور شہزادہ خلیل سلطان کا کیا قصہ ہے؟"

"اس وقت نہیں ارلات۔" سیف الدین نے نرمی سے کہا:

"میں بڑی بیگم کے پاس جا رہا ہوں۔ شام کو ملاقات ہو گی تو پوری تفصیل بتاؤں گا۔"

○

امیر تیمور کے بڑے بیٹے جہانگیر کی وفات کے بعد اس کی بیوہ شہزادی خانزادہ نے تیمور کے دوسرے بیٹے میران شاہ سے شادی کر لی تھی لیکن یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی اور دونوں میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانزادہ نے اپنے شوہر کی شکایت امیر تیمور سے کی اور میران شاہ کو نہ صرف تبریز کی گورنری سے معزول کیا گیا بلکہ اسے حق وراثت سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اس وقت تک میران شاہ کا ایک بیٹا شہزادی خانزادہ کے بطن سے پیدا ہو چکا تھا۔ اس کا نام شہزادہ خلیل رکھا گیا۔

تیمور کا یہ پوتا اب چودہ سال کا ہو چکا تھا اور شہزادہ خلیل سلطان کے نام سے مشہور تھا۔ شہزادہ خلیل سلطان اپنی ماں خانزادہ کے ساتھ سمرقند میں رہتا تھا۔ اس کی پرورش بھی شہزادوں کی طرح ہوئی تھی لیکن اس کے بچپن ہی سے بگڑے ہوئے تھے۔ خانزادہ کا پہلا شوہر مر چکا تھا اور دوسرا شوہر اس نے چھوڑ دیا تھا۔ ان باتوں نے اس کے دل و دماغ پر بڑا اثر ڈالا اس لیے شہزادہ خلیل کا کردار عمر کے ساتھ ساتھ بگڑتا چلا گیا۔ خلیل سلطان

کے دو سوتیلے بھائی شہزادہ پیر محمد اور شہزادہ سلطان محمد اپنے دادا کے ساتھ میدانِ جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے اور یہ محل میں پڑا دادِ عیش دیا کرتا تھا۔

خلیل سلطان چونکہ سب سے کم عمر شہزادہ تھا اس لیے شاہی محل کی تمام بیگمات اس سے محبت کرتی تھیں۔ اس بے جا لاڈ پیار نے خلیل سلطان کو اور زیادہ بگاڑ دیا تھا۔ امیر تیمور کا قیام سمرقند میں کم رہتا تھا تاہم اس کے جاسوس تمام شہزادوں کے حالات سے اسے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ برِصغیر پر حملے سے پہلے اسے علم ہو گیا تھا کہ شہزادہ خلیل کے اطوار اچھے نہیں اور یہ کسی وقت بھی کوئی گل کھلا سکتا ہے۔

تیمور اپنے ساتھ شہزادہ خلیل کو لے جانا چاہتا تھا لیکن بعض بیگمات خصوصاً خانزادہ کے اس عذر پر کہ خلیل ابھی بچہ ہے، اسے اتنے طویل سفر پر نہ لے جایا جائے۔ تیمور خاموش ہو گیا۔ حالانکہ شہزادہ خلیل کے دونوں بھائی پیر محمد اور سلطان محمد تو صرف بارہ برس کی عمر سے تیمور کی رکاب سے رکاب ملا کر چلنے لگے تھے۔ تیمور کی عدم موجودگی میں شہزادے نے اور زیادہ ہاتھ پیر نکالے۔ محلات کی کنیزیں ہر وقت اسے گھیرے رہتیں اور وہ علی الاعلان کنیزوں کو ساتھ لیے سمرقند اور دوسرے شہروں میں سیر کرتا پھرتا۔

ادھر کچھ دنوں سے شہزادہ خلیل کا ایک کنیز سے زبردست معاشقہ چل رہا تھا۔ سیاہ بالوں والی یہ ایرانی کنیز اپنے حسن کا آپ ہی جواب تھی۔

مرمریں رخساروں والی اس کنیز کا نام شادی ملک تھا۔

بزرگ ترین امیر سیف الدین ایران گیا تھا۔ وہاں کسی رئیس نے یہ کنیز اس کی خدمت میں پیش کی تھی۔ شادی ملک کے حسب و نسب کا تو پتہ نہیں تھا لیکن اس کی پرورش محل میں ہوئی تھی اور وہ شاہی تکلفات نشست و برخاست، طریق و آداب اور مزاج شناسی کا ملکہ رکھتی تھی۔ شکل و صورت کے علاوہ شادی ملک حسنِ کلام کی بھی ماہر تھی اور اپنی گفتگو سے بہت جلد اپنے مخاطب کو متاثر کر لیتی تھی۔

امیر سیف الدین اسے سمرقند لے کر آیا تو شہزادے کی نظر اس پر اچانک پڑ گئی۔ شہزادہ امیر سے ملنے آیا تھا۔ امیر نے شہزادے کے لیے مشروب منگوایا۔ امیر کے محل میں اور بھی کنیزیں تھیں لیکن شادی ملک نے سب کو روک دیا اور شہزادے کے لیے خود مشروب لے کر گئی۔

شہزادہ خلیل اسے دیکھتے ہی ریشہ خطمی ہو گیا۔ پھر جس غمزے اور سلیقے سے شادی ملک نے شہزادے کو مشروب پیش کیا اسے دیکھ کر امیر سیف الدین بھی دنگ رہ گیا۔

شادی ملک نے بالکل وہی انداز اختیار کیا جو کسی شہنشاہ کے سامنے ایک تربیت یافتہ کنیز اختیار کرتی ہے۔ شہزادہ اس کے حسن اور سلیقہ مندی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے چلتے وقت امیر سے شادی ملک

اپنے لیے مانگا۔

امیر سیف الدین کے لیے یہ ایک مسئلہ اور امتحان بن گیا۔ ایک کنیز دے دینا اس کے لیے کوئی اہم بات نہ تھی لیکن اسے یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ کہیں صاحبقراں امیر تیمور کو یہ شبہ نہ ہو کہ سیف الدین نے شہزادے کو کنیز کا تحفہ دے کر اسے اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات اس کے لیے [illegible] کا باعث تھی۔

سیف الدین نے اس وقت تو شہزادے کو ٹال دیا۔ دوسرے دن شہزادی خانزادہ سے ملا۔ [illegible]زادہ خلیل اپنی ماں سے شادی ملک کا ذکر پہلے ہی کر چکا تھا۔ جب سیف الدین اس سے ملنے پہنچا تو [illegible]ادہ نے خود ہی شہزادے کی سفارش کی۔ اس طرح شادی ملک شہزادے کے حوالے کر دی گئی۔

اور اب برِصغیر کے محاذ سے صاحبقراں کا پیغام آیا تھا کہ شادی ملک کو قتل کر دیا جائے۔

جس وقت امیر تیمور کا قاصد ملکہ سرائے خانم کے محل کی طرف گھوڑا دوڑاتا جا رہا تھا اس وقت نو عمر وہ خلیل سلطان اور ایرانی ماہ پارہ شادی ملک گوشۂ خلوت میں ایک سنگِ مرمر کے چبوترے پر [illegible]مال اور مستقبل کے سنہری مگر خیالی قلعے تعمیر کر رہے تھے۔

شہزادے نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا:

"شادی ملک۔ تمہیں معلوم نہیں کہ امیر دادا مجھ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ وہ میرا کہا ٹال ہی نہیں [illegible] شادی کی اجازت ضرور مل جائے گی۔"

"شہزادے۔ آپ شاہوں کے مزاج سے واقف نہیں۔" شادی ملک بڑی بڑی پلکیں جھپکاتے ہوئے [illegible]لسے بولی:

"امیر، آپ سے اس لیے محبت کرتے ہوں گے کہ آپ سب سے چھوٹے شہزادے ہیں۔ ان کے لیے [illegible]ھی "بچہ" ہیں اور بچوں کو تو کھلونے دے کر بھی بہلایا جا سکتا ہے۔"

"امیر دادا کو میں تم سے زیادہ جانتا ہوں شادی ملک۔" شہزادہ مصنوعی غصے سے بولا:

"ایک بار میں نے ان سے ضد کی تھی کہ مجھے تبریز کا گورنر بنا دیا جائے۔ امیر دادا نے فوراً فرمان جاری [illegible]ردہ تو امی حضور نے مجھے اپنے سے جدا نہیں کیا ورنہ میں اس وقت تبریز کا گورنر ہوتا۔"

"تبریز کی گورنری اور میرے ساتھ آپ کی شادی دو مختلف باتیں ہیں شہزادے۔" شادی ملک اسے [illegible]ہوئے بولی:

[illegible]گورنری عطا کرنے میں صاحبقراں کے پاس سے کچھ نہیں جاتا تھا لیکن ایک مغل شہزادے کو ایک کنیز

کے حوالے کرتے ہوئے انہیں سو بار سوچنا پڑے گا شہزادے ! میں ایرانی ہوں۔ اگر تاتاری ہوتی تو بھی بنا پر کچھ غور کیا جا سکتا تھا۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ اگر انہوں نے آج آپ کو ایک کنیز کے ساتھ شادی کی اجازت دے دی تو پھر یہ رسم پڑ جائے گی اور ہر مغل تاتاری شہزادہ کنیزوں سے شادی کرنے کی اجازت حاصل کرلے گا۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" شہزادہ بے دلی سے بولا:

"میں نے طے کر لیا ہے کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ اب یہ شادی ہو کے رہے گی۔"

"اور اگر صاحبقراں کا جواب انکار میں آیا تو؟"

"تو بھی یہ شادی ہوگی۔ میں نے امی حضور سے کہہ دیا ہے۔"

"مگر میں آپ سے شادی نہیں کروں گی۔" شادی ملک بڑے وقار سے بولی:

"میں نے آپ سے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ میں آپ کے پاس صرف اس صورت میں رہ سکتی ہوں کہ آپ مجھ سے باقاعدہ شادی کر لیں اور اس شادی میں دربار کے تمام امراء اور شاہی خاندان کے تمام افراد شریک ہوں۔"

شادی ملک نے یہ بات شہزادے سے خود نہیں کہی تھی بلکہ امیر سیف الدین نے کہلوائی تھی جس وقت شہزادے نے شادی ملک کو سیف الدین سے مانگا تھا تو سیف الدین نے شادی ملک کی رائے معلوم کی تھی۔ شادی ملک نے اس وقت یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ شہزادے کی عام کنیزوں میں شامل ہونا نہیں چاہتی اور وہ کنیز کی حیثیت سے سیف الدین کی خدمت گزاری کو فوقیت دیتی ہے۔ ہاں اگر شہزادہ اسے حاصل کرنا چاہے تو اسے باقاعدہ شادی کرنا ہوگی اور اس شادی میں تمام امراء اور شاہی خاندان کے افراد کی شرکت ضروری ہوگی۔

دراصل شادی ملک بڑی عقل مند لڑکی تھی۔ وہ اپنے خداداد حسن اور دانائی کا صحیح مصرف کرنا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ شہزادے سے ڈنکے کی چوٹ پر شادی کر کے شاہی خاندان میں شامل ہو جائے ایک بیان یہ بھی ہے کہ شہزادہ خلیل نے امیر تیمور کے برصغیر پر حملے سے پہلے شادی ملک سے شادی کی اجازت مانگی تھی لیکن ابھی کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا کہ تیمور محاذ پر چلا گیا۔

شادی ملک خانزادہ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے خانزادہ پر واضح کر دیا تھا کہ اسے شہزادے سے محبت ہے۔ وہ شہزادے سے شادی کر کے ہی اس کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ اگر اسے عام کنیزوں کی طرح شہزادے کے حوالے کیا گیا تو وہ زہر کھا کر مر جائے گی۔

خانزادہ کو بھی یہ لڑکی پسند تھی لیکن شہزادہ خلیل، صاحبقراں کا پوتا تھا۔ اسے اطلاع دیے بغیر یہ ی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے تیمور کے سامنے ان دونوں کی شادی کی تجویز رکھی گئی تھی جو تیمور کے جانے سے میں پڑ گئی تھی۔ یوں شادی ملک اور شہزادہ خلیل روز ملتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شہزادہ پروانے کی اس شمعِ حسن کے گرد منڈلاتا رہتا تھا لیکن شادی ملک کی دھمکی کی وجہ سے وہ حد سے آگے نہ بڑھتا تھا۔

شہزادہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر افسردگی سے بولا:

"شادی ملک۔ آج تمہیں میری ایک بات کا صاف صاف جواب دینا ہوگا۔"

شادی ملک مسکرائی۔ بولی:

"آپ کی کس بات کا جواب میں نے نہیں دیا۔ اگر آپ کا سوال پھر شادی کے بارے میں ہے تو میرا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کے ہر ممکن سوال کا جواب دے چکی ہوں۔"

"تم مجھ سے بحث نہ کیا کرو شادی ملک۔" شہزادہ چڑ سا گیا:

"تمہیں نہیں معلوم کہ میں کس قدر افسردہ ہوں۔ میرا دل کسی کام میں نہیں لگتا۔"

"چلیے سیر کرتے ہیں۔" شادی ملک کھڑے ہوتے ہوئے بولی:

"گوشۂ عزلت کی ہر چیز صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ ان نادر چیزوں کو دیکھ کر مجھے بڑی فرحت حاصل ہے۔"

پھر وہ دونوں قدم ملا کر اس طرح چلنے لگے جیسے فوجی پریڈ کرتے ہیں۔

شادی ملک جس پودے یا پرندے کے پاس سے گزرتی اس کی جی کھول کر تعریف کرتی لیکن شہزادہ واقعی تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شہزادہ واقعی اس کی محبت اور عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ حالانکہ شاہی ہیں جہاں شہزادے کے گرد حسین کنیزوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا وہاں عشق و محبت جیسی باتوں کا تصور ل تھا۔

"گوشۂ عزلت" سمرقند کی حسین عمارتوں میں سے ایک تھی۔ خالص سنگِ مرمر کی یہ عمارت شاہی خزانے طے میں واقع تھی۔ شاہی خزانے کے اندر جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی لیکن گوشۂ عزلت کی سیر کو شاہی کے افراد جا سکتے تھے سوائے ان دنوں کے جب صاحبقراں امیر تیمور سمرقند میں موجود ہوتے۔ سمرقند میں دوران تیمور اکثر اس خوبصورت عمارت میں آرام کرنے آتا۔ گوشۂ عزلت کے صحن میں ایک ایسا درخت لگایا ا کا تنا خالص سونے کا تھا۔ اس کے تمام پتے اور شاخیں چاندی کی تھیں۔ پھلوں کی جگہ بڑے بڑے سچے بہترین قسم کے جواہرات لگائے گئے تھے۔ جس وقت اس درخت پر سورج کی شعاعیں پڑتیں تو یہ عجیب

دل بار چمک دکھاتا اور آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ دیکھنے والے کو یوں معلوم ہوتا جیسے درخت میں ہیرا اور آویزے لٹکے ہوئے ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ ان پھلوں کے گرد پرندے بھی لٹکائے گئے تھے۔ یہ پرندے چاندی کے بنائے گئے تھے اور ان پہ سبز اور سرخ رنگ کی میناکاری کی گئی تھی۔ یہ پرندے اپنے پَر پھیلائے اس طرح بیٹھے تھے جیسے وہ پھلوں پہ چونچ مار رہے ہوں۔

"تم میرے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتیں؟" شہزادے نے رک رک کر شادی ملک کو دیکھا۔

"کنیز کی کیا مجال ہے کہ شہزادے کے سوال پہ خاموشی اختیار کرے۔" شادی ملک مسکرائی۔

"پھر یہ بتاؤ کہ اگر امیر دادا نے انکار کر دیا تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گی؟" شہزادے کی نظریں شادی ملک کے چہرے پر رک گئیں:

"جھوٹ مت بولنا شادی ملک۔ مجھے صاف جواب چاہیے۔"

"شہزادے!" شادی ملک گمبھیر آواز میں بولی:

"خدا نے پانچوں انگلیاں ایک طرح کی نہیں بنائیں۔ سب کنیزیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ میں کہہ چکی کہ اگر مجھے کنیز ہی رہنا تھا تو میں بابا امیر سیف الدین کو چھوڑ کر کبھی نہیں آتی۔ چاہے آپ مجھے قتل کرا دیتے۔ میں اپنی خوشی سے آپ کے پاس آئی ہوں اور یہ سوچ کے آئی ہوں کہ جب تک زندہ رہوں گی آپ ہی کا نام لے کر جیوں گی اور خدانخواستہ وہ وقت آیا تو میرا جنازہ بھی آپ کے ساتھ ہی اٹھے گا۔"

شہزادے کا پژمردہ چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے بڑے پیار سے شادی ملک کو دیکھا:

"شادی ملک! تم کتنی اچھی ہو۔ تم ہی میری بیوی بننے کے قابل ہو۔"

"بس تو پھر صاحبقران کے جواب کا انتظار کیجیے۔ میری فکر کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کی ہوں اور آپ کی رہوں گی۔"

شادی ملک کا جملہ پورا ہوا تھا کہ صاحبقران امیر تیمور کا جواب برصغیر کے محاذ سے آ گیا۔ شہزادہ خلیل کا ایک غلام گھبرایا ہوا گوشۂ عزلت میں داخل ہوا۔ حالانکہ جس وقت شہزادہ اور شادی ملک اس عمارت میں آتے باہر پہرہ لگا دیا جاتا تھا تاکہ ان کی گفتگو میں کوئی مخل نہ ہو سکے لیکن غلام بے خوف گوشۂ عزلت میں آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اور شہزادے کو دیکھتے ہی دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

شہزادے کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ شادی ملک نے اس کا ہاتھ دبایا اور بولی:

"خیر تو ہے۔ تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ کوئی خاص خبر ہے؟"

"خانم..... خانم....." پھر اس نے شہزادے کی طرف دیکھ کے کہا:

"شہزادے بہادر جلدی کیجیے۔ شادی ملک کو کہیں چھپا دیجیے..... وہ..... وہ صاحبقراں کا قاصد آیا ہے۔"

غلام جلدی سے شادی ملک کی طرف گھوما:

"خانم..... خانم..... آپ کے قتل....." غلام آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"سنا آپ نے شہزادے!" شادی ملک بڑے تحمل سے بولی:

"صاحبقراں نے ہمارے قتل کا حکم دیا ہے۔"

شہزادے خلیل سلطان کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے کبھی غلام کو دیکھتا اور کبھی شادی ملک کو۔

شادی ملک نے اپنے قتل کا حکم بڑے سکون سے سنا لیکن جلد ہی اس پر موت کا خوف طاری ہو گیا۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا اور جسم کانپنے لگا۔

"اب کیا ہو گا شہزادے؟" شادی ملک گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔

شہزادہ خلیل اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ اس نے کچھ عجیب سی نظروں سے شادی ملک کو دیکھا۔ شادی ملک نے شہزادے کی ایسی نظریں پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ شہزادے کی آنکھوں سے بغاوت جھانک رہی تھی۔

"شہزادے ہوش میں آئیے۔ آپ کی آنکھوں سے مجھے خوف آ رہا ہے۔" اور شادی ملک کی اپنی آنکھیں ڈبڈبا گئیں پھر سسکیوں کے ساتھ اس کے آنسو رواں ہو گئے۔

"شادی ملک تمہیں کوئی قتل نہیں کر سکتا۔" شہزادے نے کمر میں لگا ہوا خنجر نکال لیا:

"تمہاری طرف بڑھنے والے ہاتھ کو میں کاٹ دوں گا۔"

"بچوں جیسی باتیں مت کرو خلیل۔" شادی ملک شاہی القاب و آداب کو توڑتی ہوئی بولی:

"تمہارا یہ خنجر کیا۔ اگر تمام دنیا کی تلواریں بھی مجھے بچانے کے لیے بلند ہو جائیں تو بھی میں قتل ہو جاؤں گی۔"

"میں تمہاری حفاظت کروں گا شادی ملک۔" شہزادے کے انداز میں اب بھی بچپنا تھا:

"میں ڈھال بن کے تمہارے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ صاحبقراں اگر اپنا حکم واپس نہ لیں گے تو میں ان سے بغاوت کر دوں گا۔"

"شہزادہ عالم....." غلام نے دخل دیا:

"آپ کی والدہ محترمہ شہزادی خانزادہ نے مشورہ دیا ہے کہ آپ خانم شادی ملک کو کہیں پوشیدہ کر دیں۔"

"کیا ہم امی حضور کے پاس نہیں جا سکتے۔ ان کے محل سے زیادہ محفوظ اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔" شہزادے

نے غلام سے جرح کے انداز میں سوال کیا۔

"شہزادۂ عالم۔ میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں" غلام بے بسی سے بولا:

"شہزادی خانزادہ نے فرمایا ہے کہ آپ شادی ملک کو ان کے محل میں ہرگز نہ آنے دیں کیونکہ خانم کو سب سے پہلے ان کے ہی محل میں تلاش کیا جائے گا"۔

شہزادے نے مایوس ہو کر شادی ملک کو دیکھا۔ شادی ملک کو اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔ ایسے حالات میں انسان میں عام طور پر حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نے سنبھل کے کہا:

"شہزادے۔ اگر تم مجھے اپنے کسی دوست کے گھر نہیں چھپا سکتے تو پھر آخری صورت یہی ہے کہ تم مجھے اس خنجر سے ختم کر دو۔ میرے لیے فوج کے ہاتھوں مارے جانے سے زیادہ بہتر ہو گا"۔

"میں تمہیں اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں"۔ شہزادے نے حیران نظروں سے شادی ملک کو دیکھا:

"اس سے زیادہ مناسب ہے کہ میں اس خنجر سے اپنا ہی خاتمہ کر لوں"۔

"اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا شہزادے"۔ شادی ملک غم ناک لہجے میں بولی:

"میرے قتل کا حکم تو پھر بھی قائم رہے گا اور میں قتل کر دی جاؤں گی"۔

"شہزادۂ عالم"۔ غلام نے پھر دخل دیا:

"جلدی کوئی فیصلہ کیجیے۔ فوراً یہاں سے نکل جائیے"۔

شہزادے کو بھی جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے شادی ملک کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"دروازے سے نہیں شہزادے"۔ غلام نے ٹوکا:

"ممکن ہے کوئی آپ کی تلاش میں ادھر آ رہا ہو۔ آپ پچھلی دیوار پھاند کے نکل جائیے۔ اندھیرا ہو تا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھائیے"۔

شہزادے نے ایک لمحے کو رک کر سوچا اور اپنا رخ موڑ کر دروازے سے دیوار کی طرف کر لیا۔ وہ اور شادی ملک تقریباً بھاگتے ہوئے دیوار کے پاس پہنچے۔ دیوار کی اونچائی صرف پانچ فٹ تھی۔ شہزادہ دیوار پر چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شادی ملک کو بھی اوپر چڑھا لیا۔ پھر دونوں دیوار پھاند کر دوسری طرف گئے۔ غلام ابھی تک اپنی جگہ کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے دیوار پار کر جانے کے بعد وہ بھی اطمینان کا سانس لیتا ہوا واپس ہوا۔

غلام گوشۂ عزلت سے نکل کر تھوڑی دور پہنچا تھا کہ اسے شہر کوتوال سپاہیوں کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ وہ ایک طرف دبک کر کھڑا ہو گیا۔ کوتوال بڑی تیزی سے گوشۂ عزلت کے دروازے پر پہنچا اور گھوڑا باہر چھوڑ کر سپاہیوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ گوشۂ عزلت میں سوائے صاحبقران امیر تیمور کے کسی اور کا گھوڑا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

○

ملکہ سرائے خانم اور شہزادی خانزادہ میں ہمیشہ کا بیر تھا۔ یہ بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم کے نام سے پورے ملک تاتار میں مشہور تھیں۔ خانزادہ جب سے اپنے شوہر میراں شاہ خبطی شہزادے کو چھوڑ کے آئی تھی، سمرقند ہی میں رہائش پذیر تھی۔ امیر تیمور نے اسے الگ محل اور دوسری مراعات دے رکھی تھیں۔ شہزادہ خلیل چونکہ جوان ہو گیا تھا اس لیے اسے تیمور نے رہنے کے لیے الگ محل دے دیا تھا۔

جس وقت شادی ملک کو شہزادے نے سیف الدین سے مانگا تو اس نے اس شرط پر اپنی رضامندی ظاہر کی کہ اسے شہزادے خلیل کے محل کے بجائے اس کی ماں، شہزادی خانزادہ کے محل میں بھیجا جائے چنانچہ شادی ملک کو خانزادہ کے محل میں پہنچا دیا گیا اور شادی ملک وہیں رہنے لگی۔

شہزادہ خلیل اور شادی ملک کے عشق کی داستان امیر تیمور تک کسی نہ کسی طرح پہنچ گئی۔ اس دوران تیمور برصغیر پر حملے کے لیے چلا گیا۔

تیمور اپنے مرکز سمرقند سے خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ چلا جائے اس کا رابطہ سمرقند سے قائم رہتا تھا اور ہر ہفتے ایک قاصد ملک کی خبریں لے کر سمرقند سے محاذ کی طرف روانہ ہوتا تھا۔

تیمور نے ابھی دریائے سندھ پار بھی نہیں کیا تھا کہ سمرقند کے داخلی منتظمین نے تیمور کو لکھ بھیجا کہ شہزادہ خلیل اور شادی ملک بے محابہ باغوں اور بازاروں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ تیمور کچھ پہلے ہی چڑا ہوا تھا اس قسم کی خبروں سے اس کا غصہ کچھ اور بڑھ گیا۔ پھر شہزادہ خلیل نے ایک زبردست حماقت کی جس نے بنا ہوا کھیل بگاڑ دیا۔

شہزادہ خلیل سب سے چھوٹا شہزادہ ہونے کی وجہ سے خود فریبی کا شکار تھا۔ اس کے ذہن میں یہ چیز بیٹھ گئی تھی کہ امیر تیمور کو اس سے سب شہزادوں سے زیادہ محبت ہے اور وہ اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔ اسی خود فریبی کے تحت اس نے قاصد کے ہاتھ ایک خط امیر تیمور کو روانہ کر دیا جس میں اس نے درخواست کی کہ اسے شادی ملک سے شادی کی اجازت دی جائے۔ نیز یہ شادی روایتی شاہی انداز میں منعقد ہو جس میں

امراء، وزراء اور تمام بیگمات شرکت کریں۔

ستم یہ ہوا کہ جس قاصد کے ہاتھ یہ خط بھیجا گیا اس قاصد کے پاس سمرقند کے گورنر کا بھی ایک خط تیمور کے نام تھا جس میں اس نے شہزادہ خلیل کے خلاف بڑا زہر اگلا تھا۔

امیر تیمور کو دونوں خطوط ایک وقت موصول ہوئے۔ امیر تیمور کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ شہزادہ شادی ملک کو اپنی کنیزوں میں شامل کر لے لیکن شہزادہ خلیل نے شادی ملک کے کہنے پر شادی کی درخواست کی تھی۔ اسے یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ ایک کنیز کی شادی تیموری شہزادے کے ساتھ دھوم دھام اور شاہانہ انداز سے ہو۔ اس کی اس درخواست پر تیمور کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے فوراً شادی ملک کے قتل کا فرمان جاری کر دیا۔

ایک ہفتے تک شہزادہ خلیل، شادی ملک کو اپنے دوستوں کے یہاں چھپاتا رہا۔ بعض تیموری امراء نے بھی اس سلسلے میں شہزادہ خلیل سے تعاون کیا۔ کیونکہ یہ امکان پیدا ہو رہا تھا کہ تیمور کے بعد ممکن ہے کہ شہزادہ خلیل ہی تیموری تخت و تاج کا وارث بنے۔

تیمور کے دو بیٹے پہلے ہی مر چکے تھے۔ تیسرا میران شاہ تھا جو خبطی اور پاگل مشہور ہو کر معزول کر دیا گیا تھا۔ شہزادہ خلیل اسی میران شاہ کا بیٹا تھا اور اس کی ماں خانزادہ تھی۔ خانزادہ کے دو اور بیٹے پیر محمد اور سلطان محمد بھی تھے لیکن خانزادہ کی تمام ہمدردیاں شہزادہ خلیل سلطان کے ساتھ تھیں۔

تیمور کا ایک بیٹا شاہ رخ مرزا جو سرائے خانم کے بطن سے تھا، وہ بھی تخت کا حقدار تھا لیکن یہ شہزادہ جنگ و جدل کے بجائے شعر و شاعری اور علمی مشاغل میں دلچسپی رکھتا تھا۔ ان حالات میں شہزادہ خلیل کے وارث ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔

ملکہ عالم سرائے خانم کو شادی ملک کے قتل کا فرمان مل چکا تھا۔ اس نے شہر کوتوال کو تمام محلات کی تلاشی کا حکم دیا۔ سب سے پہلے شہزادہ خلیل کے محل پر چھاپہ مارا گیا۔ پھر شادی ملک کو خانزادہ کے محل میں تلاش کیا گیا۔ یہاں تک کہ منگلی خان کی بیٹی جس سے تیمور نے حال ہی میں شادی کی تھی، اس کے محل کا بھی چپہ چپہ چھانا گیا۔ محلاتِ شاہی کے بعد امیروں کے محلوں پر چھاپے پڑے۔ امیر سیف الدین اس کنیز کو ایران

سے لایا تھا۔ سب سے پہلے اس کے یہاں تلاشی ہوئی۔ پھر امیر موید ارلات اور تمام چھوٹے بڑے امیروں کی تلاشی ہوئی لیکن شادی ملک کہیں سے برآمد نہ ہوئی۔ شہزادہ خلیل بھی شادی ملک کے ساتھ روپوش ہو گیا تھا۔

شادی ملک کی گرفتاری میں ناکامی ملکہ سرائے خانم کے لیے ایک مسئلہ بن گئی۔ اب یہ اس کی عزت اور وقار کا سوال بن گیا۔ اس نے دربار کے تمام امیروں اور سرداروں کو شادی ملک کی تلاش پر لگا دیا اور اعلان کرا دیا کہ اگر شادی ملک گرفتار نہ ہوئی تو اس کی تمامتر ذمہ داری تمام امراء پر ہوگی۔ وہ سب امیر تیمور کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

اس اعلان سے امیروں میں کھلبلی پڑ گئی۔ ان سب نے متحد ہو کر شادی ملک کی تلاش شروع کر دی۔ شہزادہ خلیل کے لیے یہ بات انتہائی پریشان کن تھی۔ اس کے یار دوست اسے اور شادی ملک کو ایک دن سے زیادہ اپنے گھر میں پناہ نہ دیتے اور شہزادہ کو ہر روز ایک نئی پناہ گاہ ڈھونڈنا پڑتی۔

اور پھر ایک رات جب گھڑیال نے بارہ کا گھنٹہ بجا کر نصف شب گزرنے کا اعلان کیا تو خانزادہ کے محل کے صدر دروازے کا پہرے دار اندر داخل ہوا اور راہ داری میں پہرہ دینے والے ایک خواجہ سرا سے سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ خواجہ سرا بھاگتا ہوا شہزادی خانزادہ کی خواب گاہ میں پہنچا اور وہاں مسلح کنیزوں میں سے ایک کو باہر کے پہرے دار کا پیغام پہنچایا۔ کنیز گھبرا گئی۔ پیغام کچھ ایسا تھا کہ وہ شہزادی کو بیدار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے خواجہ سرا کو باہر ہی چھوڑا اور خود دروازہ کھول کر اندر گئی۔

شہزادی خانزادہ اپنے بیٹے شہزادہ خلیل کی طرف سے بہت پریشان تھی۔ وہ عام طور سے راتیں جاگ کر گزارتی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ شادی ملک کی تلاش بڑی سختی سے کی جا رہی ہے۔ ایک ایک گھر کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ اگر رات کے وقت شادی ملک کے کسی گھر میں موجود ہونے کی اطلاع ملتی تو فوراً وہ گھر گھیر لیا جاتا خواہ وہ کسی کا گھر ہو یا محل۔ سرائے خانم نے سرحدیں بھی بند کرا دی تھیں تاکہ شہزادہ خلیل، شادی ملک کو سمرقند سے باہر نہ لے جا سکے۔ اس سے خانزادہ نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ یا تو شہزادہ خلیل، شادی ملک کو سمرقند سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا ہے یا پھر وہ کسی ایسی محفوظ جگہ پناہ حاصل کیے ہوئے ہیں جہاں تک تلاش کرنے والے اب تک نہیں پہنچ سکے مگر خطرہ اب بھی باقی تھا اور شہزادہ خلیل کی یہ حرکت تیمور کے حکم سے کھلی بغاوت تھی

اس لیے خانزادہ ہر وقت ڈری رہتی تھی۔

کنیز دروازہ کھول کر اندر گئی تو کھٹکے سے خانزادہ کی آنکھ کھل گئی اور وہ چونک کر بیٹھ گئی۔

"شہزادی عالم۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ شہزادے تشریف لائے ہیں۔" کنیز نے آہستہ سے کہا۔

"ہمارا بیٹا خلیل ہے۔ شہزادہ خلیل؟" خانزادہ نے جلدی سے پوچھا۔

"جی شہزادئ عالم۔ خواجہ سرا یہی پیغام لایا ہے۔"

"اے خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" خانزادہ نے سر اٹھا کر بڑی حسرت سے کہا۔

وہ اس وقت بہت خوش تھی۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ شہزادہ خلیل اور شادی ملک کہیں ایک ساتھ چھپے ہیں۔ اگر دونوں کو تلاش کر لیا گیا تو تیموری شہزادہ یہ برداشت نہ کر سکے گا کہ اس کے سامنے اس کی محبوبہ کو گرفتار کر لیا جائے۔ وہ ضرور مزاحمت کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ دونوں ہی قتل ہو جائیں۔

خانزادہ، بیٹے کو اندر طلب کرنے کے بجائے خود ہی چل پڑی۔ خانزادہ کو اس شہزادے سے سب سے زیادہ محبت تھی۔ خوشی کے مارے اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ دوسری راہداری میں پہنچ کر خانزادہ کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ رک گئی۔ اس کی تمام مسرت ختم ہو گئی اور چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس کے آگے آگے خواجہ سرا چل رہا تھا۔ شہزادی کو رکتا دیکھ کر وہ بھی کھڑا ہو گیا اور واپس آ کے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

خانزادہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا:

"شہزادہ اکیلا ہے یا اس کے ساتھ۔۔۔"

"غلام کو تو پہرے دار نے شہزادے کے آنے کی اطلاع دی تھی۔" خواجہ سرا نے ادب سے جواب دیا:

"اگر حکم ہو تو صدر دروازے پر جا کر معلوم کروں۔"

"ہاں یہ بہتر ہے۔ ہم یہیں ٹھہریں گے۔ معلوم کرو کہ شہزادہ اکیلا ہے یا اس کے ساتھ شادی ملک بھی ہے۔"

خانزادہ کا حکم پا کر خواجہ سرا واپس ہوا۔ خانزادہ نے اسے روک کر کہا:

"شہزادے بہادر تنہا ہوں تو انہیں اپنے ساتھ لے آنا۔"

خواجہ سرا نے دروازے پر پہنچ کر شہزادے کو سلام کیا اور نرمی سے پوچھا:

"شہزادے بہادر۔ آپ تنہا تشریف لائے ہیں؟"

"ہاں۔" شہزادے نے مختصر سا جواب دیا پھر فوراً ہی سوال کیا:

"کیا امی حضور مجھ سے ملاقات نہیں کرنا چاہتیں؟"

"جی نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" خواجہ سرا نے فوراً کہا:

"تشریف لائیے۔ وہ آپ کی منتظر ہیں۔"

شہزادہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

خانزادہ راہداری میں کھڑی تھی۔ شہزادے کو خواجہ سرا کے ساتھ آتے دیکھا تو فوراً آگے بڑھی اور شہزادے کو گلے سے لگا لیا۔ پھر اسے ساتھ لیے ہوئے خواب گاہ میں آئی۔ اس نے خواب گاہ میں آتے ہی مسیح کنیز کو حکم دیا:

"جب تک ہم گفتگو کر رہے ہیں، کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ خواہ وہ مرائے خانم ہی کے آدمی کیوں نہ ہوں۔"

کنیز نے حیرت اور خوف سے خانزادہ کو دیکھا۔ پھر باہر چلی گئی۔ خانزادہ نے خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا:

"اب بتاؤ شہزادے! تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟" خانزادہ نے محبت سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں امی حضور۔" شہزادہ پریشان لہجے میں بولا:

"میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جس کے یہاں ٹھہرتا ہوں فوراً مخبری ہو جاتی ہے اور مجھے جگہ بدلنی پڑتی ہے۔"

"بچپن کی بعض نادانیاں بڑی خطرناک صورت پیدا کر دیتی ہیں شہزادے۔" خانزادہ نے محبت سے سرزنش کی:

"ہمارا خیال تھا تم اس وقت تک سمرقند سے نکل چکے ہو گے۔"

"نہیں امی حضور۔" شہزادے نے مایوسی سے کہا:

"ہر طرف جاسوس لگے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں۔"

"یہ بھی تم نے غلط قدم اٹھایا ہے خلیل۔" خانزادہ نے کہا:

"تم اکیلے تھے اس لیے یہاں تک پہنچ گئے۔ واپسی پر تمہارا تعاقب بھی کیا جا سکتا ہے اور جاسوس تمہاری پناہ گاہ تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"پھر میں کیا کروں امی حضور۔" شہزادہ خلیل دل گرفتگی سے بولا:

"کیا میں اپنی ماں سے بھی نہیں مل سکتا؟"

"تم پر کوئی پابندی نہیں۔ تمہارے لیے صاحبقراں نے کوئی حکم نہیں دیا لیکن۔۔۔" خانزادہ نے بات ادھوری چھوڑ کر شہزادے کی طرف دیکھا۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں امی حضور۔" شہزادے نے ماں کو تیز نظروں سے دیکھا:

"مجھ پر پابندی نہیں لیکن شادی ملک کے خون کے سب پیاسے ہو رہے ہیں۔"

"تم اسے بچا نہیں سکتے خلیل"۔ خانزادہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں اسے بچاؤں گا امی حضور"۔ شہزادے نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا:

"شادی ملک اب خلیل سے الگ نہیں۔ وہ میری بیوی ہے۔ میں نے اس سے نکاح کر لیا ہے۔"

خانزادہ نے گھبرا کر شہزادے کو دیکھا:

"یہ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کیا کیا شہزادے تم نے۔ صاحبقراں کی اجازت کے بغیر تم شادی نہیں کر سکتے۔"

"یہ میرا شرعی حق ہے امی حضور"۔ شہزادہ استقلال سے بولا:

"دادا امیر دنیا کے حاکم ہیں۔ وہ دین کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے۔"

"میرے بیٹے۔ میرے بچے"۔ خانزادہ نے ٹھنڈی سانس لی:

"تم ابھی نادان ہو۔ یہ راج نیتی ہے۔ سلطنت کا اصول ہے۔ شہزادوں کی شادیاں شاہِ وقت کے حکم سے ہوتی ہیں۔ ہم سب اس کے پابند ہیں۔"

"امی حضور۔ میں تو آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر آیا تھا۔ کیا آپ بھی مجھے نا امید کر دیں گی؟"

"شہزادے۔ ہماری مجبوریوں کو سمجھو"۔ خانزادہ غمگین لہجے میں بولی:

"صاحبقراں کی مہربانی سے ہمیں یہ محل اور مراعات ملی ہوئی ہیں۔ کیا تم ہمیں اس سے محروم کرنا چاہتے ہو؟"

"ٹھیک ہے امی حضور"۔ شہزادہ جھلا کر کھڑا ہو گیا:

"آپ اس محل اور شاہی ٹھاٹ باٹ کو گلے سے لگائے رکھیے۔ میں شادی ملک کو قتل نہیں ہونے دوں گا۔ میں صاحبقراں سے بغاوت کروں گا۔ وہ میرے حاکم ہیں میرے دل کے مالک ہرگز نہیں۔"

"ٹھہرو شہزادے"۔ خانزادہ کا دل لرز گیا، آنکھیں بھر آئیں:

"ہم یہ تمام چیزیں تم پر قربان کرنے کو تیار ہیں۔ بتاؤ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟"

شہزادہ پھر بیٹھ گیا۔ بولا:

"امی حضور۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ صاحبقراں سے میری سفارش کریں۔ ان سے کہیں کہ خلیل نے شادی کر لی ہے۔ اب شادی ملک کو معاف کر دیا جائے۔"

"خلیل۔ ذرا سوچو تو بیٹے!" خانزادہ تحمل سے بولی:

"صاحبقراں یہاں سے ہزاروں میل دور ہیں۔ شادی ملک کے قتل کا حکم ملکہ سرائے خانم کو مل چکا ہے۔ شادی ملک کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ ہم اپنی درخواست صاحبقراں کو بھیجیں گے۔ وہاں سے کب اور کیا جواب آئے گا، اس کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ کیا اتنے طویل عرصے تک تم شادی ملک کو جاسوسوں کی نظروں سے چھپائے رکھ سکتے ہو؟"

یہ بات شاید شہزادے نے سوچی ہی نہ تھی۔ خانزادہ نے بڑے قاعدے کی بات کی تھی۔ اگر صاحبقراں یہاں موجود ہوتے تو پھر بھی یہ امید کی جا سکتی تھی کہ خانزادہ کی درخواست شاید تسلیم کر لی جاتی۔

شہزادہ مایوسی کے عالم میں بولا:

"امی حضور۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا ملکہ سرائے خانم سے آپ سفارش نہیں کر سکتیں؟"

"خلیل! تم بالکل عقل سے کام نہیں لے رہے"۔ خانزادہ نے سمجھاتے ہوئے کہا:

"سرائے خانم اور ہمارے درمیان اختلافات کی جو خلیج حائل ہے اسے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ فرض کرو کہ ہم بے غیرت بن کے ان کے پاس جاتے ہیں تو سب سے پہلے ہم اور تم حکومت کے مجرم قرار دیے جائیں گے۔ کیونکہ ہماری سفارش کا صاف مطلب ہو گا کہ شادی ملک کو ہم نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ ایسی صورت میں ہماری سفارش کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا، سرائے خانم ہمیں اعانتِ جرم میں فوراً گرفتار کرا سکتی ہیں اور پھر تمہیں شادی ملک کو بھی ان کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

شہزادہ خلیل سخت پریشان تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شادی ملک کو کس طرح بچائے۔ اس نے اب شادی ملک سے نکاح بھی کر لیا تھا۔ نکاح کے لیے تو وہ پہلے ہی سے آمادہ تھا۔ شادی ملک بھی اس سے شادی کے لیے تیار تھی لیکن اس نے دھوم دھام سے شادی کی شرط لگا رکھی تھی۔ اب جو اس کے قتل کا حکم ہوا تو بہت ممکن ہے اس نے اپنا مقدمہ مضبوط کرنے کے لیے شہزادے سے فوراً نکاح کر لیا ہو۔

اولاد کو پریشان دیکھ کر ماں کا دل یونہی کڑھتا ہے۔ خلیل تو خانزادہ کا چہیتا بیٹا تھا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر خانزادہ کا کلیجہ کٹا جا رہا تھا۔ آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے کہا:

"خلیل صرف ایک صورت ہے جس سے شادی ملک کی جان بچ سکتی ہے۔"

شہزادے نے چونک کر ماں کو دیکھا اور بے تابی سے پوچھا:

"وہ کیا امی حضور۔ کیا صورت ہے؟"

"شہزادے۔ یہ بات توجہ سے سنو"۔ خانزادہ بڑے وقار سے بولی:

"اس وقت ملک تاتار میں امیر تیمور کے بعد سب سے زیادہ صاحبِ اقتدار ہستی ملکۂ عالم سرائے خانم کی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے امی حضور"۔ شہزادے خلیل نے دخل دیا۔

"بات پوری ہونے دو شہزادے"۔ خانزادہ نے اسے تنبیہ کی:

"صاحبقراں امیر تیمور کے حکم کو اگر کوئی روک سکتا ہے تو وہ صرف سرائے خانم ہے۔ اگر تم سرائے خانم....!"

"امی حضور۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں" شہزادے نے پھر بے صبری دکھائی:

"سرائے خانم اور آپ کے درمیان اختلاف کی خلیج موجود ہے۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ سرائے خانم کو جس قدر آپ سے نفرت ہے اتنا ہی وہ مجھے بھی ناپسند کرتی ہیں۔ انہوں نے شادی ملک کی گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ اب آپ ان سے کیا امید باندھ سکتی ہیں؟"

خانزادہ کو شہزادے کے بار بار دخل دینے پر غصہ آ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے تحمل سے کام لیا۔ نرمی سے بولی "شہزادے۔ ہماری بات سمجھنے کی کوشش کرو صرف سرائے خانم ہی تمہاری بیوی کو قتل ہونے سے بچا سکتی ہے۔"

"وہ کس طرح امی حضور؟"

"تم ہمت سے کام لو اور شادی ملک کو سرائے خانم کے حوالے کر دو۔"

"امی حضور" شہزادہ غصے سے کھڑا ہو گیا۔

"میں آپ کے پاس اپنے غم کا علاج ڈھونڈنے آیا تھا اور آپ مجھے مشورہ دے رہی ہیں کہ بھیڑ کو بھیڑیئے کے حوالے کر دو۔ آپ کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"شہزادے۔ تم سرائے خانم کی فطرت سے واقف نہیں" خانزادہ نے پھر سمجھانا شروع کیا:

"سرائے خانم ملک تاتار کی ملکہ ہونے کے باوجود عورت بھی ہے۔ وہ صاحب اولاد ہے اور کوئی صاحب اولاد عورت کسی کو قتل کرنے کا حکم نہیں دے سکتی۔ خواہ وہ تمہاری ماں خانزادہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں جانتی ہوں کہ شادی ملک تم سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ اس کو گفتگو کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ تم سے نکاح کرنے کے بعد اس میں شاہانہ تمکنت اور رکھ رکھاؤ پیدا ہو گیا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سرائے خانم کو ضرور قائل کر لے گی۔ بشرطیکہ تم اسے سرائے خانم کا سامنا کرنے کی اجازت دو۔"

"مگر امی حضور..... یہ کیسے..... یہ کیسے....." شہزادے کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"شہزادے۔ تمہیں یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا" خانزادہ نے زور دے کر کہا:

"شادی ملک کو آج نہیں تو کل گرفتار ہو کر قتل ہو جانا ہے۔ گرفتاری کے بعد اس کی داد فریاد کوئی نہیں سنے گا۔ ہاں اگر وہ خود سرائے خانم کے حضور پیش ہو جائے تو کیا عجب کہ اس کے قتل کا حکم رک جائے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے خلیل۔ تم شادی ملک سے بات کر کے دیکھو۔"

شہزادے کو ماں کی کوئی اور بات تو اچھی نہ لگی لیکن خانزادہ کا آخری جملہ اس پر اثر کر گیا۔ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے"۔ شہزادہ اس پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ذرا دیر سوچنے کے بعد بولا:

"امی حضور۔ فرض کیجیے کہ شادی ملک وہاں جانے کے لیے آمادہ ہو گئی تو اسے جاسوسوں سے کیسے بچایا جائے گا۔ وہ تو راستے ہی میں گرفتار کر لی جائے گی۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ شادی ملک کو ملکہ کے محل تک پہنچانے کی ذمہ داری ہم لیتے ہیں" خانزادہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ٹھیک ہے امی حضور۔ میں شادی ملک کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا" شہزادے نے بڑے کرب سے کہا۔

خانزادہ مسکرائی۔ شہزادہ کو اس کی مسکراہٹ ناگوار گزری۔ اس نے ماں کو تیز نظروں سے دیکھا:

خانزادہ نے کہا:

"شہزادے۔ تمہیں ہماری مسکراہٹ بری لگی لیکن یہ مسکراہٹ دراصل ہماری کامیابی ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے تھے کہ تم کسی طرح شادی ملک کو سرائے خانم کے سامنے پیش کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔ تم نے اپنی رضامندی کا اظہار کر کے ہمارا کام آسان کر دیا۔ خوش ہو جاؤ کہ شادی ملک کی جان بخشی ہو جائے گی۔"

شہزادے نے حیرت سے خانزادہ کو دیکھا:

"امی حضور۔ کیا یہ ممکن ہے؟"

"ممکن نہیں بلکہ یقینی ہے" خانزادہ نے صاف لہجے میں کہا۔

پھر وہ دیر تک شہزادہ خلیل سے سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہی اور جب شہزادہ واپس ہوا تو بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔

○

باوقار اور صاحبِ اقتدار ملکہ سرائے خانم اپنے محل میں کچھ افسردہ بیٹھی تھی۔ شادی ملک کے گرفتار نہ ہونے سے وہ پریشان تھی۔ حالانکہ سمرقند کا کوئی ایسا گھر نہ تھا جہاں اسے تلاش نہ کیا گیا ہو۔ شہزادے خلیل کے غائب ہو جانے سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ شادی ملک اور شہزادہ دونوں سمرقند میں کسی جگہ پوشیدہ ہیں یا پھر وہ فرار

ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ملکہ کو خانزادہ پر بھی شبہ تھا لیکن اس کے محل کی جس طرح مکمل طور پہ تلاشی ہو چکی تھی۔ دربانوں سے لے کر امیر الامراء کے محلات تک جاسوسوں اور کوتوال کے چھاپہ مار دستوں کی زد میں آ چکے تھے۔ اس سلسلے میں کئی جگہ کچھ ناخوشگوار صورت بھی پیدا ہوئی اور امراء نے زنان خانے کی تلاشی کی مخالفت کی تھی لیکن صاحبقراں کے حکم کی بجا آوری بہر صورت ضروری تھی۔ بظاہر کوئی ایسی جگہ نظر نہ آتی تھی جہاں ان دونوں کے چھپنے کا امکان ہو۔

سرائے خانم اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھی کہ اس کی کنیزِ خاص نے حاضر ہو کر اطلاع دی:

"ایک خاتون قدم بوسی کی متمنی ہے۔"

"خاتون . . . . !" ملکہ چونکی: "لباس اور بشرے سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟"

"خاتون سر تا پا خود کو چادر اور نقاب میں پوشیدہ کیے ہوئے ہے۔" کنیز نے کہا:

"پیر میں نگینے دار جوتیاں ہیں اور نگینے شاید سچے ہیں۔ ایک ہاتھ پر سفید ریشمی دستانہ چڑھا ہے جس سے وہ نقاب کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے۔"

"دوسرا ہاتھ تو کھلا ہو گا۔ کوئی زیور نظر آیا؟" ملکہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"دوسرا ہاتھ . . . ." کنیز سوچنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا:

"دوسرے ہاتھ کی تو میں صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکی۔ ایک پہرے دار قریب سے گزرا تو اس نے گھبرا کر دوسرے ہاتھ سے بھی نقاب پکڑ لیا۔ شاید جڑاؤ کنگن تھا ہاتھ میں۔"

"آواز سے کیا اندازہ لگایا تم نے؟"

"نرم۔ سریلی مگر خوف میں ڈوبی ہوئی۔"

"جاؤ۔ اسے عزت سے لاؤ۔" سرائے خانم نے مسند پر پہلو بدلا:

"وہ شہزادی خانزادہ کے بدقسمت بیٹے شہزادہ خلیل کی خوبصورت محبوبہ شادی ملک ہے۔"

"شادی ملک!" کنیز کا منہ کھل گیا:

"وہی شادی ملک جس کے قتل کا حکم صاحبقراں نے دیا ہے؟"

"ہاں ہاں وہی۔ وہ اپنے پیروں سے آئی ہے اس لیے اسے عزت سے پیش کیا جائے۔"

کنیز باہر گئی اور شادی ملک کو ساتھ لے کر آ گئی۔ شادی ملک اب تک خود کو پوشیدہ کیے ہوئے تھی۔

"شادی ملک! نقاب اٹھا دو۔" سرائے خانم نے لہجے کو نرم کرتے ہوئے حکم دیا۔

شادی ملک کا پورا جسم کانپ گیا اور وہ جس ہاتھ سے نقاب پکڑے ہوئے تھی وہ لرز کر نیچے آ گیا۔

"نقاب الٹ دو شادی ملک۔" ملکہ کی آواز میں ذرا سختی پیدا ہوئی۔

شادی ملک اپنی حیرت پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے نقاب الٹ دیا۔ جسم سے چادر علیحدہ کی اور "ملکۂ عالم" سرائے خانم کے سامنے سربسجدہ ہو گئی۔

"شادی ملک! حاکمِ وقت کی تکریم لازم ہے سجدہ ہرگز نہیں۔" سرائے خانم کا لہجہ پھر نرم ہو گیا۔ شادی اٹھ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"ہماری طرف دیکھو۔" ملکہ نے کہا۔

شادی ملک نے نظریں اٹھائیں۔ غزالی آنکھوں سے سرمے میں غلطیدہ آنسو، رخساروں پر ہلکی سیاہ لکیریں بنا رہے تھے۔ صندلی انگلیوں پہ مہندی کی گہری سرخی لرزاں تھی۔ شادی ملک کا سر بہ پیکر اپسراؤں کو مات کر رہا تھا وہ ایرانی حسن کا بہترین نمونہ تھی۔

ملکہ سرائے خانم پورے شاہانہ وقار کے ساتھ مسند پر بیٹھی تھی۔ شادی ملک نے آنکھیں چار کیں۔

"کیا نظر آ رہا ہے تمہیں؟" ملکہ نے پُر رعب لہجے میں پوچھا۔

"ملکۂ عالم کے چہرے سے تیموری جلال ٹپک رہا ہے۔"

"کیا ہمارے ہونٹوں پر تمہیں اپنی موت منڈلاتی نظر نہیں آتی؟"

"تیموری جلال کے پس منظر میں ملکۂ عالم کا پچاس سالہ جمال بھی جھلکتا دکھائی دے رہا ہے۔" شادی ملک نے دوسرا سوال نظر انداز کر دیا۔

"چالاک بننے کی کوشش مت کرو لڑکی۔" ملکہ کا لہجہ تلخ ہو گیا:

"جوانی اندھی ہوتی ہے۔ تم نے دیکھ کے قدم کیوں نہیں اٹھایا؟"

"ملکۂ عالم۔ جوانی کے اندھا ہونے میں ممکن ہے کہ شبہ کیا جا سکے لیکن . . . . ." شادی ملک نے رک کر ادھر دیکھا۔

سرائے خانم نے تمام کنیزوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ پھر بولی:

"اپنی صفائی میں جو کہنا چاہتی ہو کہہ ڈالو۔ جب تک تم اپنے دل کی بھڑاس نہ نکال لو گی ہم تمہارے قتل کا حکم نہ دیں گے۔"

شادی ملک سنبھل کے بولی:

"ملکۂ عالم! جوانی آنی جانی اور محبت ازلی اور ابدی ہے۔ اگر جذبات کا تعلق صرف جوانی سے ہوتا تو آج جس مسند پہ تشریف فرما ہیں اس پر کوئی چودہ سالہ نوخیز لڑکی کا قبضہ ہوتا۔ صاحبقراں کو کیا ضرورت تھی کہ وہ آپ د

یہ مرتبہ عطا کرتے۔ یہ تو محبت کی کرشمہ سازی ہے ملکۂ عالم! اگر مجھے جوانی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے تو میرزا شہزادے کے محل میں دوسری کنیزوں کی طرح عیش و عشرت سے یہ مختصر زمانہ گزار سکتی تھی۔ مجھے کیا ضرورت تھی میں صاحبقراں کے عتاب کو للکارتی اور آج آپ کی پناہ میں آنے کی درخواست کرتی۔"

سرائے خانم پر شادی ملک کی باتوں کا بہت اثر ہوا۔ اس نے کہا:

"شادی ملک! تم حسن صورت کے ساتھ ساتھ حسن سیرت سے بھی آراستہ ہو۔ کاش ہم تمہیں پناہ دے سکیں لیکن ہمیں افسوس ہے کہ صاحبقراں نے ہمارے ہاتھ میں حکم کی تلوار دی ہے اور حکم ہے تمہارے قتل کا۔"

"ملکۂ عالم! آپ ذی وقار اور صاحب اقتدار ہیں۔" شادی ملک بڑے استقلال سے بول رہی تھی۔

"جو ہستی جلاد کو تلوار اٹھانے کا حکم دے سکتی ہے کیا اس میں یہ طاقت نہیں کہ وہ جلاد کو حکم دے کہ تلوار نیام میں کر لے۔"

شادی ملک نے ٹھہر کر بڑی امید سے سرائے خانم کو دیکھا۔

"شادی ملک!" ملکہ سر اٹھا کر بولی:

"زخم طلبی کا یہ انداز بڑا اثر ہے مستحسن ہے لیکن تلوار کا کام زخم لگانا ہے زخم مندمل کرنا نہیں۔"

"ٹھیک ہے ملکۂ عالم۔" شادی ملک لاپروائی سے بولی:

"آپ مجھے قتل کرا دیجیے لیکن تاریخ آپ کو معاف نہ کر سکے گی۔ کل کا مؤرخ یہی کہے گا ملکہ سرائے خانم نے شادی ملک کو محض اس وجہ سے تہ تیغ کرا دیا کیونکہ وہ شہزادی خانزادہ کی بہو تھی۔ آپ اور خانزادہ کے اختلاف کو پورا ملک تاتار جانتا ہے۔"

"خاموش لڑکی۔ تو ہم پر الزام لگا رہی ہے۔" سرائے خانم بگڑ گئی:

"یہ صاحبقراں کا حکم ہے۔ اس میں کسی کی دشمنی یا محبت کا کوئی دخل نہیں۔"

"ملکۂ عالم!" شادی ملک نے پوری جرأت سے کہا:

"اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے اگر صاحبقراں یہ فرمان بھیجیں کہ آپ کے بیٹے شاہ رخ کی بیوی کا سر قلم کر دیا جائے تو کیا آپ اس حکم کی تعمیل بھی اسی طرح کریں؟"

"لیکن..... لیکن....." سرائے خانم پریشان ہو گئی:

"لیکن بیوی اور کنیز میں بڑا فرق ہے لڑکی۔ تو محض ایک کنیز ہے اور ایک تیموری شہزادے سے شادی کر کے مراعات حاصل کرنا چاہتی ہے۔"

"معاف کیجیے ملکۂ عالم۔" شادی ملک مستقل مزاجی سے بولی:

"میں آپ کو صاحب اقتدار سمجھ کر آپ کی پناہ میں آنا چاہتی تھی تاکہ آپ انصاف کریں اور میرا حق مجھے دلائیں۔ آپ تو مجھ غریب سے وہ بھی چھین لینا چاہتی ہیں جو مجھے حاصل ہو چکا ہے۔"

"لڑکی زبان روک کر بات کرو۔" ملکہ کو غصہ آ گیا:

"ہم نے نہ تجھے کچھ دیا ہے اور نہ چھین رہے ہیں۔ ہم صاحبقراں کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہیں۔ اگر شاہ رخ بھی غلطی کرتا تو اسے بھی معاف نہ کیا جاتا۔ تجھے اگر کسی رعایت کی خواہش تھی تو ہمارے محل میں آنے کے بجائے خانزادہ کے پاس جانا چاہیے تھا۔"

"میں اسی در کی دھتکاری ہوئی آپ کے پاس آئی ہوں۔" شادی ملک بے خوفی سے بولی۔

"تو..... تو کیا تو خانزادہ کے پاس گئی تھی؟" سرائے خانم نے حیران ہو کے پوچھا۔

"جی ہاں ملکۂ عالم۔ مجھے پہلے انہی سے فریاد کرنا تھی۔"

"کیا جواب دیا شہزادی نے؟" سرائے خانم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"شہزادی خانزادہ نے فرمایا کہ اے شادی ملک!" شادی ملک نے ملکہ سے آنکھیں ملا کے کہا:

"انہوں نے کہا کہ میں تجھے اپنی بہو تسلیم کرتی ہوں لیکن تیری فریاد نہیں سن سکتی۔ تو ملکۂ عالم کے پاس جا کر اپنا مقدمہ پیش کر۔ وہ چاہیں تو صاحبقراں کا حکم تعطل میں ڈال جا سکتا ہے۔"

سرائے خانم کو خانزادہ پر جو غصہ آیا تھا وہ کم ہونے لگا۔ ذرا سوچنے کے بعد بولی:

"شادی ملک تیرا کوئی مقدمہ نہیں۔ صاحبقراں کی نظروں میں تو مجرم ہے اور تیرا قتل ضروری ہے۔ ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔"

"ملکۂ عالم! صاحبقراں نے ایرانی کنیز شادی ملک کے قتل کا حکم دیا ہے۔" شادی ملک بلا جھجک بولی:

"صاحبقراں نے یہ حکم کب دیا ہے کہ شہزادے خلیل کی بیوی کو قتل کر دیا جائے۔ میں ایرانی کنیز نہیں بلکہ خلیل کی منکوحہ ہوں۔ میں شرعی حیثیت سے ان کی بیوی ہوں اور مجھے وہی مراعات حاصل ہیں جو دوسرے شہزادوں کی بیگمات کو حاصل ہیں۔ میرا قتل ایک کنیز کا قتل نہیں بلکہ تیموری خاندان کے شہزادے خلیل سلطان کی بیوی کا قتل ہو گا۔"

سرائے خانم اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی:

"شادی ملک۔ کیا تو نے شہزادے سے عقد کر لیا ہے؟"

"جی ہاں ملکۂ عالم۔ ہم دونوں نے اپنی رضامندی سے نکاح پڑھوایا ہے۔"

"یہ سب کچھ کب ہوا؟"

"ملکۂ عالم جس وقت قاصد میرے قتل کا پیغام لے کر سمرقند میں داخل ہوا اس وقت میرا نکاح پڑھایا جا رہا تھا۔" شادی ملک نے بتایا۔

"لیکن تم نے یہ نکاح صاحبقراں کی اجازت کے بغیر کیا ہے۔ اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔" سرائے خانم غصے سے بولی:

"تم نے اپنا مقدمہ مضبوط کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے ملکۂ عالم۔ میں مجرم ہوں۔" شادی ملک لاپروائی سے بولی:

"میں ایک ایرانی کنیز تھی اس لیے شہزادہ خلیل سے شادی کرنے کے بعد بھی آپ کے خیال میں کنیز ہی رہی۔ صاحبقراں نے صرف ایک قتل کا حکم دیا ہے آپ دوسرا قتل....."

"کیا..... کیا یہ ٹھیک ہے؟" سرائے عالم گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔

"اگر آپ حکم دیں تو ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔"

شادی ملک کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ سرائے خانم کو شادی ملک کے قتل کا حکم دیا گیا تھا لیکن شادی ملک اب ایرانی کنیز نہیں بلکہ تیموری خون کی وقار کی امانت دار بن گئی تھی۔

"شادی ملک! اگر یہ سچ ہے تو ہم کیا اب تمہیں شاید صاحبقراں بھی قتل نہ کرا سکیں۔" ملکہ سرائے خانم نے تالی بجا کر کنیز کو بلایا۔

"داروغۂ محلات کو فرمان پہنچایا جائے۔" سرائے خانم نے کہنا شروع کیا:

"شادی ملک کے لیے ایک محل، ایک سو کنیزیں، پچیس خواجہ سرا، پہرے دار، محافظ غرضیکہ وہ تمام انتظامات کیے جائیں جو ایک شاہی خاندان کی بیگم کے لیے ہوتے ہیں۔ ہم شادی ملک کو شاہی خاندان میں شامل کیے جانے کا فرمان جاری کرتے ہیں۔ شادی ملک کو تمام مراعات حاصل ہوں گی لیکن شہزادے خلیل کو اس سے ملاقات یا گفتگو کی ہرگز اجازت نہ ہو گی۔ اگر اس میں کوتاہی برتی گئی تو خطاکار کو سخت سزا دی جائے گی یہ فرمان تمام متعلقہ لوگوں تک فوراً پہنچایا جائے۔"

شادی ملک کا جی چاہا کہ وہ اظہارِ تشکر کے لیے ملکہ کے قدموں پر گر پڑے۔ شاید وہ اسی خیال سے آگے بڑھی تھی لیکن سرائے خانم نے اسے اشارے سے روک دیا:

"شادی ملک! جب تک تمہارا محل آراستہ نہیں ہوتا تم ہمارے ساتھ ٹھہرو گی۔" سرائے خانم کا لہجہ مشفقانہ ہو گیا تھا۔

"ملکۂ عالم۔ میں کن الفاظ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔" شادی ملک بڑی لجاجت سے بولی۔

"شادی ملک!" ملکہ مسکرائی:

"ہماری ہرگز یہ خواہش نہ تھی کہ تمہیں قتل کیا جائے لیکن صاحبقراں کے حکم کے تحت ہم اس ناخوشگوار فرض کو ادا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دنیا کا کوئی قبیلہ، خاندان یا شہنشاہ نہیں چاہتا کہ اس کے جوانوں کی شادیاں غیروں میں ہوں۔ اس وجہ سے صاحبقراں تمہاری شادی کے سلسلے میں متذبذب میں تھے لیکن اب صورتِ حال یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ تمہاری شادی تو غیر قانونی قرار دی جا سکتی تھی لیکن تیموری نسل کو ختم کرنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا صاحبقراں کی برِصغیر سے واپسی تک تم شاہی مہمان کی طرح رہو گی اور جب وہ تشریف لے آئیں گے ہم تمہارا مقدمہ ان کے سامنے پیش کریں گے۔ اطمینان رکھو ہماری تمام ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔"

سرائے خانم کا حکم صاحبقراں کے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ سرائے خانم کی کنیز نے داروغۂ محلات کو فرمان پہنچایا۔ اور اس پر فوری عملدرآمد شروع ہو گیا۔ ابھی شادی ملک، ملکہ کا شکریہ ہی ادا کر رہی تھی کہ ایک درجن سے زیادہ کنیزیں اسے لینے کے لیے ملکہ کے محل میں پہنچ گئیں۔

شادی ملک ایک فریادی کی حیثیت سے منہ چھپائے پا پیادہ شاہی محل تک آئی تھی لیکن جب وہ وہاں سے اپنے محل کو روانہ ہوئی تو کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی ایک مختصر سی فوج اسے اپنے جلو میں لیے ہوئے تھی۔

شادی ملک کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ اس کے محل میں پہنچایا گیا۔ اسے وہاں دنیا کی ہر آسائش میسر تھی، سوائے شہزادے خلیل کی رفاقت کے۔ مسلح پہرے داروں نے شادی ملک کے محل کو پوری طرح گھیر رکھا تھا اور شہزادے کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ وہ شادی ملک کے محل کا رخ نہ کرے۔ شہزادے کو اس کا کوئی غم نہیں تھا۔ وہ تو مسرت سے پھولے نہ سماتا تھا۔ شادی ملک کی جان بچ گئی تھی اس کے لیے یہی سب کچھ تھا۔

شہزادے کی والدہ خانزادہ دن میں ایک بار شادی ملک کے پاس ضرور جاتی تھی۔ شادی ملک اس کی بھی بہت احسانمند تھی کیونکہ یہ ترکیب اسی کی ذہانت کا نتیجہ تھی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا کہ شہزادے اور شادی ملک نے ریگستان سے نکلتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ سمرقند کی ایک غیر معروف مسجد میں پہنچ کر نکاح پڑھوا لیا تھا۔ دوسری بات کے متعلق کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی تھی کیونکہ ایسا کوئی طریقہ اس وقت موجود نہ تھا جس سے شادی ملک کے دعوے کو غلط ثابت کیا جا سکے۔

○

سمرقند کا پورا شہر ایک مضبوط قلعہ تھا لیکن شہر کے اندر ایک پہاڑی پر ایک اور قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں

تاتاری بیگمات کے محل تھے جہاں وہ اپنے اپنے دربار لگاتی تھیں۔ اس قلعے کو جانے والے تمام راستوں پر مسلح تاتاری سوار پہرہ دیتے تھے۔ ہر محل کے ساتھ ایک خانہ باغ تھا۔

ان محلات میں سب سے زیادہ آراستہ اور شاندار محل ملکہ سرائے خانم کا تھا۔ اس محل کا خانہ باغ بھی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ وسیع، عریض اور دلکش تھا۔ اس میں لالہ و گلاب کی بے شمار کیاریاں تھیں جو دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی باغ میں ایک بارہ دری ہے جس کی چھت پگوڈا طرز کی ہے۔ یعنی نیچے سے گول اور اوپر سے نوک دار۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے محرابی دروازے ہیں جن پر سرخ ریشم کے پردے پڑے ہیں۔ چھت اور دیواروں پر چاندی کے پتر چڑھے ہیں جن پر سونے کا ملمع ایسی صنعت کاری سے کیا گیا ہے کہ بالکل سونا نظر آتا ہے۔ ان پر موتیوں سے پھول بنائے گئے ہیں۔ موتیوں کی جھالریں جب ہوا سے ہلتی ہیں تو موتیوں کے یہ پھول عجب بہار دکھاتے ہیں۔

آج اس باغ اور بارہ دری میں بڑی رونق ہے۔ ملکہ سرائے خانم نے دربار خاص کا حکم دیا ہے۔ امیر و وزیر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ شامیانوں کے اندر بخارا اور فرغانہ کے بیش قیمت قالینوں کا فرش ہے اور بیٹھنے کے لیے دیوان رکھے ہیں۔ ہر شامیانے میں ایک خالص سونے کی ڈولی ہوئی تپائی رکھی ہے جس پر عطر کی شیشیاں قرینے سے سجائی گئی ہیں اس کے ساتھ ساتھ بلوریں صراحیاں رکھی ہیں جن میں قسم قسم کے مشروب بھرے ہیں۔ ان صراحیوں پر لعل، زمرد اور فیروزے جڑے ہیں۔ دربار میں تمام بڑے بڑے سرداروں کو بلایا گیا ہے۔ . . . . موید ارلات اور سردار سیف الدین بھی موجود ہیں اور ایک شامیانے میں بیٹھے نیچی آواز میں گفتگو کر رہے ہیں۔

یکایک چوبدار اعلان کرتا ہے کہ ملکۂ عالم سرائے خانم تشریف لانے والی ہیں اس لیے تمام مہمان بارہ دری میں اپنی اپنی جگہ پر آ کے بیٹھ جائیں۔

اعلان سن کر لوگ بارہ دری کی طرف بڑھتے ہیں۔ دھوپ روکنے کے لیے بارہ دری کے چاروں طرف قناتیں لگائی گئی ہیں۔ تمام لوگ بارہ دری میں پہنچ کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی وقت ملکہ سرائے خانم کے آنے کا اعلان ہوتا ہے۔

ملکہ کی شان اور دبدبہ دیکھنے کے قابل ہے۔ آگے آگے حبشی کنیزیں، دائیں بائیں خواصیں چل رہی ہیں۔ سب کی نظریں پاس ادب سے نیچی ہیں۔ ملکہ کے سر پر خود کی طرز کا تاج ہے جس میں جواہرات ٹکے ہیں اور کشیدہ کاری کی گئی ہے۔ پیشانی پر ایک سنہری حلقہ بنا ہے۔

ملکہ سرائے خانم پیرانہ سالی کے باوجود تن کر چل رہی ہے۔ جواہرات جڑے اس تاج کے کنگوروں پر سفید پر لگے ہیں جو ملکہ کے چہرے پر سایہ سا کیے ہوئے ہیں۔ پروں کے درمیان باریک باریک سونے کی زنجیریں ہیں،

ن میں سے شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔

سرائے خانم کی قبا کا رنگ قرمزی ہے۔ قرمز ریشم کے کیڑوں کی طرح ایک کیڑا ہوتا ہے۔ ترکستان میں اس ں کا کپڑا سب سے پہلے تیار کیا گیا تھا اور اس کا نام اس کپڑے کے نام پر قرمزی رکھا گیا۔ قبا کے حاشیوں پر طلائی بانام کیا ہوا ہے۔ قبا کے دامن کو پندرہ کنیزیں سنبھالے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہی ہیں۔ ملکہ کے بال کھلے اور شانوں لہرے ہیں۔ رخساروں پر غازہ ملا ہے اور چہرے پر باریک ریشم کی نقاب ہے۔

ملکہ کے داخلے پر تمام امیروں نے انہیں تعظیم پیش کی۔ ملکہ سرائے خانم نے ہاتھ کے اشارے سے ان کا سلام ل کیا اور پھر ایک زرنگار مسند پر بیٹھ گئی۔

چند ہی لمحوں کے بعد ایک اور ملکہ کنیزوں کے جلو میں داخل ہوئی۔ یہ عمر میں سرائے خانم سے کم ہے اور رعب و دبدبہ بھی اس کا کم ہے لیکن چہرے سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ اس نے سرائے خانم کو ادب سے سلام کیا ملکہ نے دوسری مسند کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ اس کا رنگ گندمی اور آنکھیں ترچھی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مغل نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ دراصل تیمور کی نئی بیوی مغل سردار منگلی خان کی بیٹی ہیں اور سرائے خانم کے بعد ان کا درجہ ہے اور انہیں دوسری ملکہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مہمانوں کی خاطر مدارات کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے دونوں ملکاؤں کو سونے کی کشتیوں اور جڑاؤ بلوری گلاسوں میں مشروب پیش کیا گیا۔ مشروب پیش کرنے والی کنیزوں کے ہاتھوں میں سفید ریشم کے دستانے چڑھے ہیں تاکہ ننگے ہاتھ کشتیوں اور گلاسوں سے مس نہ ہوں۔ کنیزیں دو زانو ہو کر مشروب پیش کرتی ہیں۔ ملکائیں اٹھا کر دو چار گھونٹ بھرتی ہیں۔ پھر گلاس واپس رکھتی ہیں۔ کنیزیں الٹے پیروں واپس جاتی ہیں۔ پھر خدمت گار بڑھتے ہیں اور امیروں کو مشروب پیش کرتے ہیں۔ مشروب پینے کے بعد وہ اپنے اپنے گلاس کشتیوں میں الٹے کر کے اوندھا دیتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ مہمان ملکہ کی مہمان نوازی کے شکر گزار ہیں۔

اب ملکہ کے اشارے پر ایک کنیز حاضرین کو مطلع کرتی ہے کہ ملکۂ عالم کچھ ارشاد فرمانا چاہتی ہیں اس لیے تمام مدعوئین متوجہ ہوں۔

سب لوگ گوش بر آواز ہوتے ہیں لیکن ان کی نظریں نیچی ہیں۔ سرائے خانم بڑی بارعب آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہتی ہے:

"اے تاتاری تخت و تاج کے جاں نثارو!

تمہیں علم ہے کہ صاحبقراں امیر تیمور گورگاں اس وقت برصغیر میں کفار سے جہاد میں مصروف ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے صاحبقراں نے فرمان بھیجا تھا کہ ایرانی النسل شادی ملک کو قتل کر

دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے شادی ملک کی گرفتاری کا حکم دے دیا اور گھر گھر تلاشی ہوئی۔ چونکہ شادی ملک کا تعلق ایک تیموری شہزادے سے تھا اس لیے ہمیں امیروں اور بیگمات کے محلوں کی تلاشی کا بھی حکم جاری کرنا پڑا۔ جس سے ہمارے وفاداروں کی دل آزاری ہوئی اور بعض جگہ کچھ ناخوشگوار واقعات بھی پیش آئے۔ ہم اس سلسلے میں افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ شادی ملک نے خود اپنے آپ کو تاتاری قانون کے حوالے کر دیا ہے لیکن شادی ملک کے قتل کا صاحبقرانی حکم ہماری تاتاری روایات اور خود صاحبقراں کے بنائے ہوئے ایک اصول سے متصادم ہو گیا ہے جس کا فیصلہ کرنے کے ہم مجاز نہیں کیونکہ اگر ہم صاحبقراں کا یہ حکم تسلیم کرتے ہوئے شادی ملک کو قتل کراتے ہیں تو ان کے حکم کی تعمیل تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن اس طرح ہم ایک تاتاری قانون کو توڑنے کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں جس کی کم از کم سزا موت ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر دو باتوں پر صاحبقراں کی رائے معلوم کی جائے۔ چنانچہ شادی ملک کو زیرِ حراست رکھا گیا ہے اور اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ صاحبقراں کی برصغیر سے واپسی پر ہوگا۔

شادی ملک کی گرفتاری کے موقع پر جو ناخوشگوار واقعات پیش آئے یا ہمارے امیروں کی دل شکنی ہوئی اس کے لیے ہم پھر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔"

ملکہ سرائے خانم کے اس اعلان یا تقریر کا یہ اثر ہوا کہ امیر سیف الدین اور امیر مویدارلات جیسے جلیل القدر امیروں کی جو توہین ہوئی تھی اس کا ازالہ ہو گیا۔ دوسری طرف بعض لوگوں کو یہ علم ہو گیا کہ شادی ملک کو ایک شاہی محل میں پوری شاہانہ مراعات کے ساتھ قید کیا گیا ہے تو ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ ملکہ کی اس وضاحت نے ایسے لوگوں کا منہ بند کر دیا تھا۔

ملکہ سرائے خانم نے اپنی تقریر میں امیر تیمور کے برصغیر پر حملے کو "جہاد" کا نام دیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تیمور نے جس وقت برصغیر پر حملہ کی تجویز اپنے سرداروں کے سامنے پیش کی تھی تو اس نے اس مجلس میں علماء کرام کو بلایا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہ برصغیر پر اس وجہ سے حملہ کرنا چاہتا ہے کہ وہاں کفر و الحاد کی بیخ کنی کرے اور برصغیر کو مندروں اور بتوں سے پاک کرے۔ تاریخ یہی کہتی ہے کہ علماء نے اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ بہرحال برصغیر میں جو واقعات پیش آئے وہ تو کم از کم جہاد کی نفی کرتے ہیں کیونکہ طوائف الملوکی کے اس دور میں بھی برصغیر کی سب سے بڑی حکومت، سلطنتِ دہلی ایک مسلمان بادشاہ محمود تغلق کے ہاتھ میں تھی اور اسی کا سکہ و خطبہ جاری تھا۔

تیمور کا پوتا پیر محمد جو خانزادہ کا بیٹا تھا وہ اس وقت کابل کا گورنر تھا۔ تیمور نے اسے برصغیر کے حملے میں بطور اپنے ہراول دستے کے استعمال کیا۔ پیر محمد نے دریائے سندھ عبور کر کے ملتان کا محاصرہ کر لیا اور تیمور کو لکھا کہ سلطنتِ دہلی ڈانواں ڈول ہے اور حملے کے لیے یہ وقت مناسب ہے۔

دہلی کے حالات واقعی بہت ابتر تھے۔ دہلی کی بادشاہت محمود شاہ تغلق کے ہاتھ میں تھی لیکن فیروز آباد میں فتح خان کا ایک بیٹا نصرت شاہ حکومت کر رہا تھا۔ اس طرح دہلی کی حکومت پر بیک وقت دو دو بادشاہ حکومت کر رہے تھے۔

تیمور رجب ۸۰۰ھ بمطابق مارچ ۱۳۹۸ء میں سمرقند سے روانہ ہوا اور آٹھ محرم کو کوہستانی چوٹیوں اور سنگلاخ سرحدوں کو عبور کرتا ہوا دریائے سندھ کے اس پار پہنچ گیا جس جگہ سے جلال الدین خوارزم شاہ معہ اپنے گھوڑے کے دریائے سندھ میں کود کر اس پار نکل گیا تھا اور چنگیز خان اس بہادر کی تعریف کرتے ہوئے واپس ہو گیا تھا لیکن تیمور خود کو چنگیز خان سے بڑا فاتح سمجھتا تھا۔ دریائے سندھ اس کا راستہ نہ روک سکا۔ اس نے کشتیوں کا پل بنانے کا حکم دیا اور دو دن بعد اس کا پورا لشکر اس پل سے گزر کر ملتان کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں اس کے پوتے پیر محمد کا قبضہ ہو چکا تھا۔

تیموری حملے کی خبر سے پنجاب میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دیبل پور (دیپالپور) خالی ہو چکا تھا اور لوگ بھاگ بھاگ کر بھٹنیر کے قلعے میں پناہ لے رہے تھے۔ تیمور نے بھٹنیر کے قلعے پر قبضہ کر کے لوگوں کو تہ تیغ کرا دیا۔ یہی حال فتح آباد کا ہوا۔ سرسوتی یا سرسہ کے لوگ شہر چھوڑ کر جنگلوں میں بھاگ گئے۔ غرض یہ کہ کوئی بھی تیمور کے مقابلے میں نہیں آیا اور تیمور فتح کا پرچم اڑاتا ہوا ۴ ربیع الاول ۸۰۱ھ کو پانی پت کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ پانی پت کے میدان میں برصغیر کی قسمت کا فیصلہ ہوگا لیکن میدان صاف تھا۔

تیمور ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد دہلی کی طرف بڑھا اور ۷ ربیع الثانی کو دہلی پہنچا جہاں تاجدارِ دہلی محمود شاہ تغلق اس کے مقابلے کے لیے تیار تھا۔

تیمور کے بانوے ہزار سواروں کے مقابلے پر محمود شاہ تغلق صرف بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے لا سکا۔ ان کے علاوہ دہلی کے لشکر میں ۱۲۰ آہن پوش ہاتھی بھی تھے جن کے اوپر ہودوں میں تیرانداز اور آگ برسانے والے آتش باز بیٹھے تھے۔

تیمور کے میمنہ پہ پیر محمد اور امیر یادگار اور میسرہ سلطان حسین اور شاہ رخ مرزا کے سپرد تھا۔ تیمور خود قلب میں موجود رہا۔

سلطانِ دہلی کے ساتھ سوائے ملّو اقبال خان کے اور کوئی نامور سردار نہ تھا۔ مقابلہ زیادہ دیر جاری نہ رہا اور

سلطان اور ملّو اقبال کو شکست کھا کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔

دہلی ایک بار پھر تباہ ہوا۔ تین روز تک قتلِ عام ہوتا رہا۔ پھر دہلی کی مساجد میں امیر تیمور کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

میرٹھ میں ایک اور معرکہ ہوا جس میں ایاس افغان اور مولانا احمد تھانیسریؒ نے دادِ شجاعت دی لیکن شکست کھائی۔ پھر ہردوار، سرمور اور شوالک پر یہ قہر نازل ہوا اور اس طرح تیمور بے شمار دولت، لونڈی، غلام اور اہلِ حرفہ کو سمیٹ کر واپس چلا گیا۔

اس کے بعد ایک بار پھر سمرقند میں ایک قاصد گھوڑا دوڑاتا ہوا داخل ہوا۔ لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ قاصد برِصغیر سے خبر لے کر آیا تھا لیکن اس دفعہ اس نے خبر کو پوشیدہ رکھنے کے بجائے اپنے گھوڑے کو دائرے میں چکر دیتے ہوئے خوشی کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا:

"فتح۔ فتح۔ ہمارے امیر کو فتح ہوئی۔ برِصغیر تسخیر ہوا!"

فتح کی نوید پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگوں کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے ملکِ تاتار کے کئی حصوں میں بری بری خبریں اڑ رہی تھیں۔ کوہ قاف میں بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔ سلطانِ بغداد نے عراق پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ امیر پریشان تھے کہ اگر تیمور کو برِصغیر میں شکست ہو گئی تو کیا ہو گا۔ فتح کے اعلان سے ان کو اطمینان ہو گیا اور وہ امیر تیمور کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔

سمرقند میں ابھی سے جشن شروع ہو گیا۔ اب رات کو "ریگستان" میں چراغاں کیا جاتا اور برِصغیر پر حملے اور فتح پر مرزا دیے سے بحث ہوتی۔ علماء سب سے زیادہ خوش تھے۔ ان کے ذہن میں ایک نئی خلافت کا نقشہ ابھرا۔ جس کی حدود بغداد سے لے کر کنارِ گنگا تک نظر آتی تھیں۔

ایک بیان یہ ہے کہ تیمور دہلی کا محاصرہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ محاصرے کی صورت میں دہلی کی تباہی کا اندیشہ تھا۔ اس خیال کے پیشِ نظر اس نے قلعے سے دور کھلے میدان میں اپنی فوج کو اتارا۔ پھر اس نے فوج کے چاروں طرف خندقیں کھدوا کر فوج کو محفوظ کیا۔

اس بیان میں کوئی حقیقت نظر نہیں آتی کیونکہ چنگیز یا تیمور کے نزدیک شہروں کی کوئی حیثیت نہیں تھی بلکہ وہ تو شہروں کو برباد کر کے دہشت پھیلاتے تھے تاکہ ان کے مدِمقابل کے حوصلے پست ہو جائیں۔ تیمور نے اپنی فوج کے گرد خندقیں ضرور کھدوائی تھیں لیکن یہ بھی اس کی ایک جنگی چال تھی۔ جب ان خندقوں کی خبر دہلی کے لشکر میں پہنچی تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ تاتاری خوف زدہ ہیں اور کھلے میدان میں لڑنے سے کترا رہے ہیں چنانچہ دہلی کے لشکر نے آگے بڑھ کر حملے کا فیصلہ کیا۔ تیمور یہی چاہتا تھا کہ دہلی کا لشکر قلعہ بند نہ ہو کیونکہ اس طرح محاصرہ طول

کھینچ سکتا تھا۔ اگر محمود شاہ تغلق عقلمندی سے کام لیتا اور قلعہ بند ہو جاتا تو شاید دہلی ایسی آسانی سے تاتاریوں کے ہاتھ نہ آتا۔ تیمور نے ہاتھیوں سے نمٹنے کے لیے نارِ رومی کا استعمال کیا اس طرح جب آگ کے شعلے ہاتھیوں سے لپٹے تو وہ بے قابو ہو گئے۔

تیمور کا فاتح لشکر برِصغیر کی فتح سے واپس ہوا تو تیمور نے چند دن اپنے وطن یعنی شہرِ سبز میں قیام کیا پھر دشت قراچہ پہنچا۔ یہ ایک قلعہ تھا جو تیمور نے پہاڑی پر سیاہ پتھر سے تعمیر کرایا تھا۔

سمرقند میں لوگ اس کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ فوج کو باب لاجورد سے شہر میں داخل ہونا تھا اس جگہ قالینوں کا فرش بچھایا گیا تھا۔ قلعہ کو جانے والی سڑک پر بانات کا فرش بچھا تھا۔ راستے کے دونوں طرف جتنے مکانات تھے، باغات اور دیواریں تھیں ان پر ریشمی کپڑا منڈھا گیا تھا جس پر زری اور کشیدہ کاری کا کام کیا ہوا تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ دکانوں کو آراستہ کیا گیا تھا۔ لوگ نیا لباس پہنے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

جس وقت تیمور کی سواری شہر کے قریب پہنچی تو امراء، وزراء، معززین شہر، مقامی اور باہر کے روساء نے باب لاجورد سے آگے بڑھ کر تیمور کا استقبال کیا۔ ملکہ سرائے خانم پورے جاہ و جلال اور اپنی کنیزوں اور غلاموں کے ساتھ استقبال کرنے والوں میں موجود تھی۔ اس سے ذرا ہٹ کر شہزادی خانزادہ کھڑی تھی۔ خانزادہ کے دو بیٹے پیر محمد اور سلطان محمد اس حملے میں تیمور کے ساتھ تھے۔ ملکہ سرائے خانم کا بیٹا شہزادہ شاہ رخ بھی برِصغیر گیا ہوا تھا سرائے خانم اور خانزادہ کے دلوں کا حال اس وقت یکساں تھا۔ دونوں میں سے کسی کو علم نہ تھا کہ ان کے بیٹے زندہ سلامت واپس آ رہے ہیں یا ملک گیری کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

آہن پوش سواروں میں پہلے خانزادہ کے بیٹے نظر آئے۔ خانزادہ کی کنیزوں نے ان پر سونے کا برادہ اور موتی نچھاور کیے۔ سرائے خانم کا بیٹا شاہ رخ مرزا بھی زندہ بچ آیا تھا۔ ملکہ نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس پر موتی نچھاور کرائے۔ پھر صاحبقران امیر تیمور کا گھوڑا سامنے آیا۔ اس پر اس قدر زر و جواہر نچھاور کیا گیا کہ ڈھیر سا لگ گیا۔ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت سمرقند میں اور وہاں کے رہنے والوں کے پاس کس قدر دولت تھی۔

تاتاری لشکر شہر میں داخل ہو گیا لیکن لشکر کی آخری صفوں میں جو عجیب الخلقت فوج تھی اسے دیکھ کر سمرقند والے دنگ رہ گئے۔ یہ برِصغیر کے کوہ پیکر ہاتھی تھے۔ اہلِ تاتار اس جانور سے قطعی ناواقف تھے۔ لوگ انہیں

حیرت سے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ تیمور واقعی عظیم ہے جس نے ان متحرک پہاڑوں کو اپنے قابو میں کیا ہے۔

ہاتھیوں کے بدن پر مختلف قسم کے رنگوں سے پٹیاں بنائی گئی تھیں اور وہ اس طرح جھومتے جھامتے آ رہے تھے جیسے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اپنی جڑیں چھوڑ کر تیمور کے لشکر کے ساتھ چلنے لگی ہوں۔ ہاتھیوں کے چلنے سے گرد و غبار کا طوفان اٹھ رہا تھا اور اس میں ہاتھیوں کی مستکیں (سونڈیں) بڑے بڑے اژدہوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ تیمور کے ساتھ جو ہاتھی آ رہے تھے ان کی تعداد سینکڑوں سے اوپر تھی اور ان سب پر مالِ غنیمت لدا ہوا تھا سونے چاندی اور جواہرات کے۔ نیز وہ اپنے ساتھ کئی سو معمار اور کاریگر لایا تھا تاکہ وہ سمرقند میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائے۔

شام کو دربارِ خاص منعقد ہوا جس میں امراء اور بیگمات نے نذریں پیش کیں اور تیمور نے انہیں انعام و اکرام سے نوازا۔ سب سے آخر میں شہزادی خانزادہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئی۔ وہ سخت پریشان نظر آ رہی تھی۔ اسے اب تک علم نہ ہو سکا تھا کہ اس کے بیٹے شہزادہ خلیل اور شادی ملک کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا۔ کیونکہ شادی ملک اس وقت تک اپنے محل میں زیرِ حراست تھی اور اسے باریابی کی اجازت نہ ملی تھی۔

خانزادہ نے ادب سے سلام کر کے جواہرات سے بھرا ہوا ایک تھال تیمور کی نذر کیا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ تمام درباری نظریں سمٹ کر خانزادہ پر آ گئی تھیں۔

"خانزادہ! تم اکیلی آئی ہو۔ شہزادہ خلیل کہاں ہے؟" تیمور نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہا۔

خانزادہ کو پسینہ آ گیا۔ تیمور کے لہجے میں نہ نرمی تھی اور نہ سختی۔ وہ کچھ بھی اندازہ نہ کر سکی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"اے صاحبقراں! خلیل اپنی غلطی پر نادم اور عتابِ تیموری سے خائف ہے۔"

"ہمیں سرائے خانم نے تمام حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔" تیمور کا لہجہ اب بھی کسی تاثر سے خالی تھا:

"شہزادے نے غلطی کی ہے لیکن شادی ملک اب شاہی خاندان میں شامل ہو چکی ہے۔ شہزادے اور شادی ملک کو کسی وقت ہمارے حضور پیش کرو۔"

"صاحبقراں!" شہزادی خانزادہ کا سر ادب سے کچھ اور جھک گیا۔

"فکر نہ کرو خانزادہ۔" تیمور کا لہجہ نرم پڑ گیا:

"سرائے خانم کی سفارش پر ہم نے دونوں کو معاف کر دیا۔"

خانزادہ نے سر اٹھا کر سرائے خانم کو دیکھا جو تیمور کے تخت کے دائیں جانب پوری شاہی تمکنت سے بیٹھی تھی۔

ر کی دوسری جانب منگلی خان کی بیٹی بیٹھی تھی۔

خانزادہ کی آنکھوں میں شکر گزاری کے آنسو لرز رہے تھے لیکن اس کے دل میں یہ خیال ضرور ہو گا کہ آج راس کا شوہر جہانگیر زندہ ہوتا تو اس کا رتبہ اس دربار میں کچھ اور ہوتا۔ لوگوں کا عام تاثر یہی تھا کہ تیمور کے د خانزادہ کا بیٹا پیر محمد اس کا جانشین ہو گا لیکن اس کا حریف سرائے خانم کا بیٹا شاہ رخ تھا جس کی ماں ملکۂ عالم صاحبِ اقتدار تھی۔

صاحبقرانِ امیر تیمور گورگان بلاشبہ دنیا کا عظیم ترین فاتح تھا۔ اس کی تمام تر زندگی مہمات میں گزری۔ اس نے زندگی کے پہلے تیئس سال جنگی مہارت کے حصول میں گزارے اور زندگی کے باقی ایام فتوحات میں صرف ہوئے رنے جب اور جہاں کبھی یلغار کی، فتح نے اس کے قدم چومے۔ اس کے لشکر کے طوفانی حملے کو پہاڑ تک نہ روک تے تھے۔ روس، افغانستان، ایران، خلیج فارس اور ترکی کے بیشتر علاقوں پر اس کا پرچم لہرایا۔ اس جنگجویانہ زندگی سے اپنی ایک ٹانگ سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اسے دو بیٹوں شہزادہ جہانگیر اور شہزادہ عمر شیخ مرزا کی موت مدمہ برداشت کرنا پڑا۔ تیسرے بیٹے میراں شاہ کے پاگل پن نے بھی اسے پریشان کیا لیکن اس نے اپنی فتوحات کا لہ جاری رکھا۔

آخر ۸۰۷ھ (۱۴۰۵ء) میں اس نے چین پر چڑھائی کی۔ ممکن ہے وہ چین اس لیے فتح کرنا چاہتا ہو کہ اس کے اجد چنگیز خان نے اس ملک کو فتح کیا تھا اور وہ چنگیز خان کی سفاکانہ فتوحات سے کسی طرح پیچھے نہیں رہنا چاہتا ین اس کی یہ آرزو اس کے دل ہی میں رہ گئی۔ اس نے شدید سردی کی پروا نہ کی اور دریائے سیحوں سے اتر کر ر کے مقام پر قیام کیا۔ وہاں وہ سخت بیمار پڑا اور اتنی بڑی سلطنت چھوڑ کر اس دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو ہی نہیں بلکہ جب اس کی لاش سمرقند واپس لائی گئی تو شہر کے دروازے اس پر بند تھے۔

امیر تیمور نے آخری وقت میں خانزادہ کے بیٹے شہزادہ پیر محمد کو اپنا جانشین مقرر کیا لیکن اس کی شہادت وہی امیر دے سکتے تھے جو تیمور کی موت کے وقت موجود تھے۔ پیر محمد اس وقت کابل اور پنجاب کے انتظام میں ف تھا۔ سرائے خانم کا بیٹا شاہ رخ مرزا نے تیمور کے مرنے کی خبر پاتے ہی خراسان میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا مرقند کا تخت خالی تھا۔ تیمور کی دونوں بیگمات تیمور کے ساتھ گئی تھیں۔ سمرقند میں اگر کوئی موجود تھا تو وہ خانزا

کا بڑا نام بیٹا شہزادہ خلیل سلطان تھا۔ خانزادہ اب تک درپردہ اسی کے لیے کوشش کر رہی تھی چنانچہ اس نے سمرقند میں موجود تمام امیروں کو خلیل سلطان کے حق میں رام کر لیا اور اس طرح شادی ملک کا شوہر سمرقند کا تاجدار بن گیا۔

سمرقند کا ناظم شہر چونکہ شہزادہ خلیل سلطان کی وفاداری کا اعلان کر چکا تھا اس لیے اس نے شہر کے تمام دروازے بند کرا دیے اور تمام امراء اور دونوں بیگمات جو تیمور کے جنازے کے ساتھ تھیں، رات بھر سردی میں اکڑتے رہے۔ صبح اس وقت ان کو داخلے کی اجازت ملی جب انہوں نے شہزادہ خلیل سلطان کی اطاعت کا اعلان کر دیا۔

خلیل سلطان صرف پانچ سال تک حکومت کر سکا۔ پھر سرائے خانم کے بیٹے شاہ رخ مرزا نے ایک امیر بردائی کے تعاون سے خلیل سلطان کو معزول کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ شاہ رخ مرزا نیک دل انسان تھا۔ اس نے خلیل سلطان کے لیے معقول وظیفہ مقرر کیا لیکن خلیل سلطان یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور چند ہی دن بعد وفات پا گیا۔

خلیل سلطان کی بیوی ایرانی کنیز شادی ملک نے اس کا آخری وقت تک ساتھ دیا اور وفاداری کی انتہا یہ کی کہ خلیل سلطان کی موت کے ساتھ خود بھی ختم ہو گئی۔ اس کی موت کے سلسلے میں عبداللہ رازی لکھتے ہیں،

"این خانم (شادی ملک) ہم طریق وفادار از دست نداد۔ وچوں خلیل سلطان رحلت کرد۔ بافرمود خنجر خود در انگشت وہر دو را در یک قبر دفن کردند"

یعنی:

"شادی ملک بھی ایک وفادار عورت تھی۔ اس نے خلیل سلطان کی موت پر خود کو خنجر مار کر ہلاک کر لیا اور دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔"

ختم شد